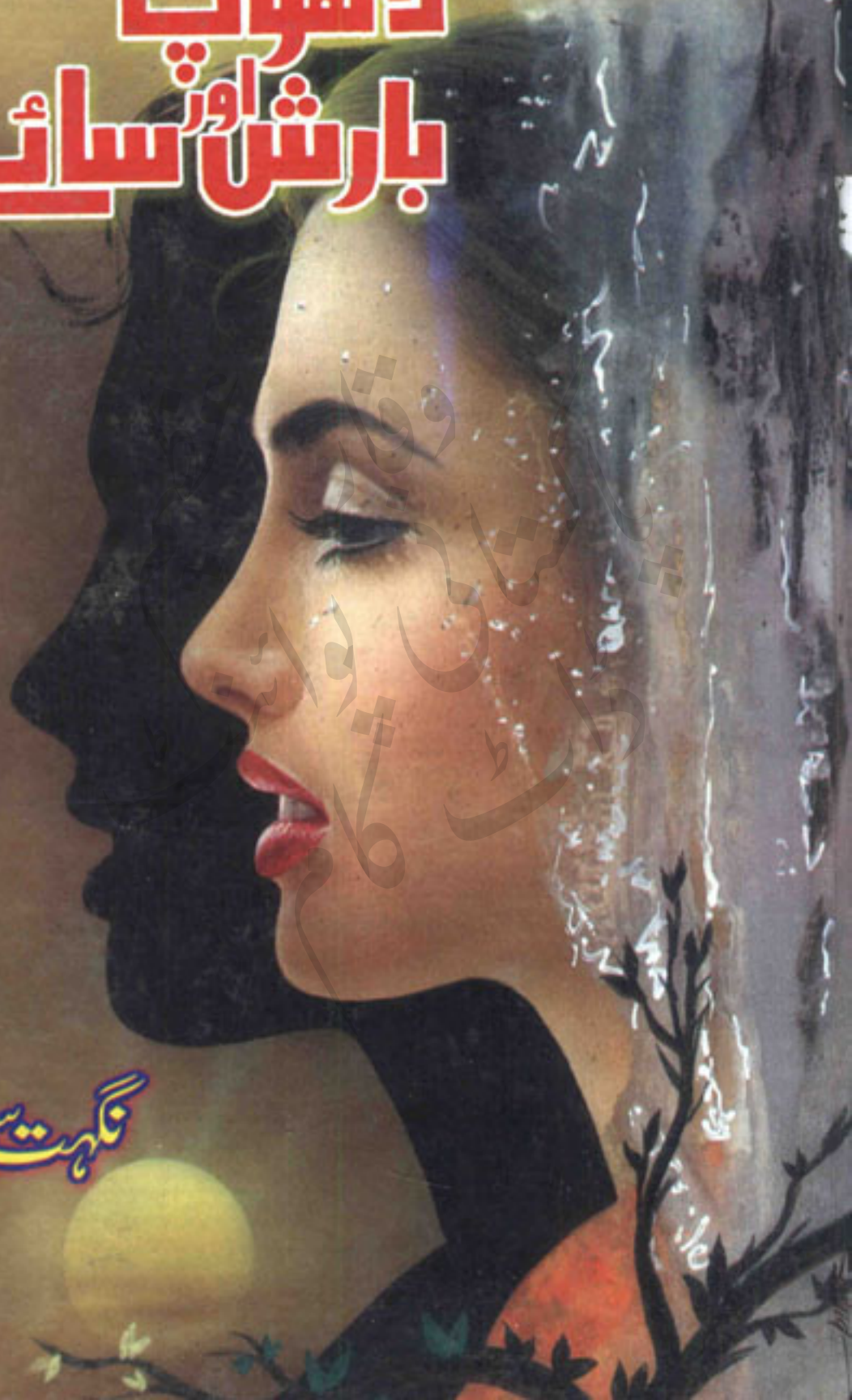


دھوپ بارش اور سائے

نگہت سیمیا





دھوپ، بارش اور سائے یہ ناول پاکستانیہ میں قسط وار چھپتا رہا، تقریباً تین سال یا دو تین ماہ زیادہ..... میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ کہانی لکھنا مجھے اچھا لگتا ہے لیکن میں نے خواتین کے مختلف ڈائجسٹوں میں ناولٹ بھی لکھے..... دھوپ، بارش اور سائے میرا پہلا طویل ناول تھا۔ اس سے پہلے ایک مٹی ناول پندرہ اقساط کا چھپ چکا تھا۔ یہ ناول ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی ماں ایک ماڈل اور اداکارہ تھی اور والد سوتیلے تھے۔ اس میں محبت، معاشرہ، سماجی اور انفرادی سوچ اور ان کا فطری اطلاق سب موجود ہیں۔ میں نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ انسانی شخصیت کے وہ پہلو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو ہر نفس میں موجود ہونے کے باوجود ان کہے ہیں۔

یہ انسانی المیوں، جذبوں اور احساسات کی کہانی ہے..... امید ہے میری پہلی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی آپ کو پسند آئے گی۔

نگہت سیما، چکوال

”مومو۔“

بالوں میں تیزی سے برش کرتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رکے اور اس نے ذرا سارخ موڑ کر پیچھے دیکھا..... زینب احمد، دروازے کی دہلیز پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ ان کے پوٹے سو جے ہوئے تھے اور چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔

”میک اپ کے بغیر ماما کا چہرہ کتنا بے رونق اور ویران لگتا ہے۔“ اس نے سوچا اور بے نیازی سے مڑ کر پھر برش کرنے لگی۔

”مومو۔“ اب کے ان کی آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔

”جی۔“ وہ ان کی طرف رخ کر کے کھڑی ہو گئی اور انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”رات تم نے مچی کے ساتھ بد تمیزی کیوں کی؟“

”بد تمیزی! میں نے ماما؟“ اس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا ”بد تمیزی تو اس نے کی تھی۔ کیا آپ

دیکھ نہیں رہی تھیں کہ اس نے میرا ہاتھ.....“

”اوہ تو جان کیا ہوا تھا؟ ذرا سا ہاتھ ہی تو پکڑا تھا اس نے.....“

”ماما.....“ اس کی آواز بھرا گئی ”یہ آپ کہہ رہی ہیں۔“
”دیکھو جان، وہ اس کمپنی کا مالک ہے جہاں میں کام کرتی ہوں اور تم نے اسے خفا کر دیا۔ دیکھو
مومن زندگی میں چھوٹے مومن سے بچھوتے کرنے پڑتے ہیں اور تم ہو کہ بات سمجھتی ہی نہیں ہو۔ جانو دنیا
بہت آگے نکل گئی ہے۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ جانے تمہارے اندر پندرہویں صدی کی
روح کیوں حلول کر گئی ہے۔“

”مجھے ایسے سمجھوتے نہیں کرتے اور کہہ دیجیے گا اپنے اس شریل مرزا سے۔ آج تو میں نے اس کا
ہاتھ جھٹکا ہے۔ آئندہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو میں اس کے منہ پر ٹھوک دوں گی۔“
”تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو۔“

”میں نے کوئی کام بھی حد سے بڑھ کر کبھی نہیں کیا۔ حد سے تو آپ بڑھ رہی ہیں۔ آپ کو ذرا بھی
یہ احساس نہیں ہے کہ آپ ایک معزز شخص کی بیوی اور تین بیٹیوں کی ماں ہیں۔“
”مومن۔“ انہوں نے ایک دم آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔
وہ منہ پر ہاتھ دھرے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”زینبی..... تم نے اسے مارا۔ ڈارلنگ! پیار سے محبت سے بات کیا کرو۔“
”عثمان! یہ..... مومن بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔“

”مریم بیٹی! ماما سے بدتمیزی نہ کیا کرو۔ تم بڑی ہو۔ تمہیں تو خود اپنی ماما کا خیال رکھنا چاہیے۔
تمہیں پتا ہے کہ تمہاری ماں کو ڈپریشن ہو جاتا ہے.....“ عثمان احمد نے کب وہاں آگئے تھے۔
”پاپا۔“ وہ لمحہ بھر یونہی ہونٹ کاٹتی رہی اور پھر ایک دم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔
”ریلیکس ہنی ریلیکس۔“

عثمان احمد نے ساکت کھڑی زینب کا ہاتھ تھاما اور اسے باہر لے گئے۔
مریم نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی..... بجائے اس کے کہ پاپا اسے تسلی دیتے، اسے پیار کرتے، وہ الٹا اسے سمجھا کر چلے گئے اور
ماما کی تو یہ پرانی عادت تھی، مظلوم بننے کی۔ ذرا کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تھی، انہیں
ڈپریشن ہونے لگتا تھا۔ ذرا پاپا اس کی طرف متوجہ ہوتے، انہیں گھبراہٹ ہونے لگتی۔

”احمد پلیز۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“
”میرے سر میں کچھ ہو رہا ہے۔“
”پلیز احمد۔“
وہ رونے لگتیں۔

اور پاپا سب کچھ بھول کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔
بچپن ہی سے وہ یہ سب دیکھتی چلی آ رہی تھی۔
بارہا شوق سے جیتے ہوئے کپ اور اپنی رپورٹس بک لے کر وہ پاپا کے سامنے گئی تھی۔
”پاپا! یہ.....“

”واہ! ہماری بیٹی نے تو کمال کر دیا۔ بھئی لاؤ ادھر اپنی رپورٹس بک.....“
اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پہلوؤں میں لٹک جاتے تھے۔ عین اسی لمحے ماما کو گھبراہٹ ہونے
لگتی تھی اور پاپا سب کچھ بھول کر ان کے ہاتھ ملنے لگتے تھے۔
اور ایک بار جب وہ چھوٹی سی تھی۔ زیادہ سے زیادہ نو برس کی تو پاپا کے ایک دوست نے جو رائٹر
تھے اور ان دنوں ان ہی کے ہاں مقیم تھے، اسے پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”پتا ہے گڑیا! تمہاری ماما تم سے جیلس اس لیے ہوتی ہیں کہ تم اپنی ماما سے زیادہ خوبصورت ہو۔“
”کیا فضول باتیں کرتے ہو بیٹی! کوئی ماں اپنی بیٹی سے جیلس ہو سکتی ہے بھلا۔ خواہ مخواہ بچی کا
ذہن خراب نہ کرو۔“ پاپا نے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔

”یار! ایک بڑی زبردست کہانی ذہن میں ابھر رہی ہے۔ ماں بیٹی سے جیلس..... واہ۔“
”تم اپنی کہانیاں اپنے تک محدود رکھو۔ کہانیوں اور حقیقتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“
پتا نہیں اتنے بہت سارے سالوں کے بعد اسے یہ بات کیسے یاد آگئی تھی۔ یونہی بیڈ پر لیٹے لیٹے
اس نے سوچا۔

”پتا نہیں! یہ انکل مجھے آج کل کہاں ہوتے ہیں۔“
”اور اگر کبھی جو مل جائیں تو ان سے ضرور پوچھوں گی کہ واقعی ایسا ہو سکتا ہے کہ ماں مجھ سے
جیلس ہوں اور یہ بات انہوں نے مجھ سے کیوں کہی تھی۔“
اتنے سارے لوگ گھر میں آتے ہیں۔

آج نیوا ایر پارٹی ہے۔
آج عید ملن ہے۔
آج برنس ڈنر ہے۔
آج عاشی کا برتھ ڈے ہے۔
آج مور کا برتھ ڈے ہے۔
مگر یہ انکل مجھے پتا نہیں کیوں نہیں آتے۔
جب وہ چھوٹی سی تھی تو وہ بہت آیا کرتے تھے اور رات گئے تک پاپا کے ساتھ گپیں لگاتے۔ اپنی

کہانیوں کے پلاٹ سناتے۔ ان کے کردار پر بحث کرتے اور کبھی ماما کو چھیڑتے۔

”مسز عثمان! آپ کی شخصیت میں بڑا اسرار ہے۔ میں کسی دن ضرور آپ پر کہانی لکھوں گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا کردار میرے یادگار کرداروں میں سے ہوگا۔“

’چنانچہ انہوں نے ماما پر کہانی لکھی تھی یا نہیں؟‘

’اور وہ انہیں یہ بھی بتائے گی کہ اسے بھی ماما کی شخصیت میں اسرار لگتا ہے۔‘

بہت اسرار۔

جیسے انہوں نے چہرے پر کوئی ماسک چڑھا رکھا ہو اور ان کا اصلی چہرہ اس ماسک کے پیچھے چھپا

ہوا ہو۔

وہ پاپا سے آج انکل جتنی کے بارے میں ضرور پوچھے گی۔

مگر نہیں ابھی کچھ دیر پہلے پاپا نے اسے کس بری طرح اگنور کیا تھا۔ وہ پاپا سے بات نہیں کرنے گی۔ کبھی نہیں۔

وہ پھر ہولے ہولے اسکتے گی۔

اس کی ماما نے عثمان احمد پندرہ برس پہلے مشہور ٹی وی آرٹسٹ اور ماڈل ہوا کرتی تھیں لیکن عثمان احمد سے شادی کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے ماڈلنگ اور ٹی وی پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ عثمان احمد ایک بہت بڑی دوائیوں کی کمپنی کے مالک تھے لیکن پچھلے چند سالوں میں نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ان کا کاروبار گھٹانے میں جا رہا تھا۔ حالانکہ لوگ اب بھی بیمار ہوتے تھے بلکہ پہلے سے زیادہ بیمار ہوتے تھے اور ہر حال میں دوائیں خریدتے تھے۔

دواؤں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی عثمان احمد کی کمپنی گھٹانے میں جا رہی تھی۔

تنگ آکر انہوں نے اسے فروخت کر دیا تھا اور اب فارغ تھے اور نوبت کی ناز برداریوں میں مصروف۔

اور نوبت احمد جو پہلے شوقیہ ماڈلنگ کرتی تھیں اور کبھی کبھار کسی ڈرامے میں آ جاتی تھیں اب پچھلے دو سال سے شریل مرزا کی ایڈروٹاژنگ کمپنی میں باقاعدہ ملازمت کر رہی تھیں۔ دوائیوں کی کمپنی کے فیل ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ عثمان احمد کے مالی حالات خراب ہو گئے تھے۔ عثمان احمد ایک جاگیردار تھے اور سرگودھا سائیل پران کی اچھی خاصی زمینیں تھیں اور ان زمینوں کی ٹھیک ٹھاک آمدنی تھی۔ پھر بھی معلوم نہیں کیوں نوبت عثمان نے ملازمت کر لی تھی اور آج بھی اتنی ہی مقبول اور ہر دل عزیز تھیں، جتنی وہ آج سے پندرہ سال پہلے تھیں۔ لوگ ان کی ماڈلنگ کو پسند کرتے تھے اور اگر وہ کسی

ڈرامے میں آتیں تو ان کی شہریت ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

غضب کی ایکٹنگ کرتی تھیں وہ۔

مگر مریم کو ان کا ٹی وی پر آنا اور ماڈلنگ کرنا پسند نہ تھا۔ اس نے پاپا سے بہت بحث کی تھی۔

”پاپا اگر مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں تو اخراجات کم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک گاڑی فروخت کر دیں۔ خانساماں کو چھٹی دی جاسکتی ہے۔ مالی کی تنخواہ بے فائدہ جا رہی ہے۔ ماما کو ملازمت کی کیا ضرورت ہے آخر۔“

”ضرورت تو نہیں بیٹا لیکن شوق ہے ان کا اور میں ان کے شوق میں حائل نہیں ہوتا۔ خدا کے فضل سے زمینوں کی آمدنی کافی ہے۔“

”پاپا آپ انہیں روک تو سکتے ہیں۔“

”نہیں روک سکتا۔ تمہیں تو پتا ہے اسے ڈپریشن ہو جاتا ہے۔ طبیعت بگڑ جاتی ہے اس کی۔“

بات صرف ملازمت کی ہی نہ تھی بلکہ جب سے انہوں نے ملازمت کی تھی، گھر میں طرح طرح کے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ اکثر رات گئے تک پارٹیاں ہوتیں۔

شوہر سے تعلق رکھنے والے لوگ۔

پاپا اور ماما کے دوست احباب۔

سب ان پارٹیوں میں شرکت کرتے تھے اور ماما چاہتی تھیں کہ مریم بھی ان پارٹیوں میں شریک ہوا کرے بلکہ ان کے مہمانوں سے بھی اچھی طرح پیش آئے، جبکہ مریم کو یہ سب پسند نہ تھا۔

اسے ماما کے مہمان بھی پسند نہ تھے۔

چھپھورے، نو دو دلیہ۔

تہذیب و شائستگی کے نام پر بد تہذیبی کا مظاہرہ کرنے والے اداکار۔

جن کے ظاہر اور باطن مختلف تھے۔

اوپر سے چمکتے لگتے، اندر سے میلے گندے۔

سفیدی پھری قبروں کی طرح۔

مریم ان پارٹیوں سے چڑتی تھی اور اسے عثمان احمد پر غصہ آتا تھا کہ وہ انہیں کسی بھی بات پر روکتے نہیں تھے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے، ہر بات پر سر جھکا دیتے تھے۔ ان کی اپنی کوئی رائے تو تھی نہیں۔ بس چابی کے گھوڑے کی طرح نوبت احمد کی مرضی پر چلتے تھے حالانکہ کیا کی تھی ان میں۔

وجہ بہ اداکار۔

دولت مند۔

مطمئن اور خوش باش لوگ۔
اپنی اپنی سائیکلوں کے کیریڈر پر ڈبوں یا ٹنٹوں میں کھانا رکھے کلرک پیشہ لوگ۔
کالج اور اسکول جانے والے طالب علم۔
مزدوری کی تلاش میں جانے والے مزدور۔
اور کیا یہ سب لوگ خوش اور مطمئن ہیں، اپنی اپنی زندگیوں سے یا میری طرح مضطرب اور بے چین ہیں۔

اس نے قریب سے گزرنے والے ایک اخبار بیچنے والے بچے کی طرف دیکھا۔

’اس کے چہرے پر کتنی طمانیت ہے۔‘

حالانکہ یہ ننگے پاؤں ہے اور اس کی قمیص بازو سے پھٹی ہے۔‘

’اور کیا ہی اچھا ہوا اگر زلزلہ آجائے۔‘

چلتے چلتے اس نے سامنے سات منزلہ عمارت کو دیکھا۔

’اور یہ عمارت دھڑام سے گر جائے سب ملے تلے دب جائیں۔‘

’یہ سب۔‘

’یہ اخبار بیچتا ہوا ننگے پاؤں بچہ، یہ سائیکلوں کے کیریڈر پر اپنا کھانا رکھے جاتے کلرک اور..... اور میں۔‘

’اور پھر یہ سب ختم ہو جائے۔‘

یہ بے چینی یہ اذیت۔

کوئی احساس باقی نہ رہے۔

نہ ماما کی زیادتیوں کا۔

نہ پاپا کی بے بسی کا۔

ماما جو اذیت دیتی ہیں۔

اور بابا جو ایک مشین ہیں جس کا کنٹرول ماما کے ہاتھ میں ہے جو بٹن دبا دیں۔

پاپا بس مین

عاشی بیٹا اور مور

’ارے مور.....‘ چھوٹا سا گل کو تھنا سا اپنے نرم نرم موٹے موٹے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتا

اپنا بڑا سایک گھینتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ ایک دم ٹھک کر رک گئی۔ خواب کے سے عالم میں

اس نے دیکھا کہ تیمور آنسو پونچھ رہا ہے۔

ہر لحاظ سے وہ زینب احمد کے مقابل تھے پھر پتا نہیں کیوں..... مریم کو پاپا کا یہ مسکین سا انداز بالکل پسند نہ تھا لیکن پاپا اسی میں مگن تھے۔

’ہوں۔‘ روتے روتے اس نے سر اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات بج رہے تھے ’’اوہ۔‘‘ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔‘‘ آج تو زیور پیر بھی تھا۔ مس یا مینہ کو پریکٹیکل بھی کروانا تھا اور وہ دوبار ایک پریکٹیکل کبھی نہیں کرواتی تھیں۔‘‘

باتھ روم میں جا کر جلدی سے اس نے منہ دھویا۔ بالوں کو یونہی ہاتھوں سے سمیٹ کر پونی بنائی اور بیک کاندھے پر لٹکا کر باہر نکل آئی۔

’مریم بی بی ناشتا۔‘ انماں جیناں نے اسے آواز دی مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

’ناشتا کر کے جاؤ۔‘

زینب احمد ڈائننگ روم کے باہر کھڑی تھیں شاید..... لیکن وہ یوں ہی سر جھکائے چلی گئی۔ سیاہ گیٹ کو اس نے بہت غصے سے کھولا۔ تب ہی عاشی اور نینا ڈائننگ روم سے نکل کر اس کے پیچھے لپکیں۔ تیمور بھی ان کے پیچھے لڑھکتا ہوا آ رہا تھا۔

’آپ کالج جا رہی ہیں؟‘ عاشی نے پوچھا۔

’کس کے ساتھ جائیں گی؟‘ نینا نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بوائے انڈے کو منہ میں ڈالتے

ہوئے پوچھا ’’چاچا سلم چھوڑنے جانے گا نا۔‘‘

’نہیں۔‘ اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

’ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔‘ نینا بسوری ’’کل بھی آپ چلی گئیں تھیں۔‘‘

’مومن! میں بھی آپ کے ساتھ.....‘ تیمور نے اسے بلایا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے گیٹ سے باہر

نکل گئی۔

کتنے دنوں سے وہ یونہی جا رہی تھی۔ کبھی بس میں، کبھی رسٹے میں اور کبھی وگن میں جبکہ گھر میں تین تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شاید اس طرح وہ اپنی خفگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ اپنے رویے سے ماما کو بتانا چاہتی تھی کہ اسے ماما کا طرز عمل پسند نہیں ہے اور نہ ہی شرجیل مرزا کی گھر میں اتنی زیادہ آمد اسے اچھی لگتی ہے۔ پارٹیز اور فنکشنز کے علاوہ بھی جب اس کا دل چاہتا ہے تکلفی سے منہ اٹھائے چلا آتا ہے جبکہ ماما چاہتی تھیں کہ وہ اس سے بے تکلفی سے ملے، بسے بولے اور اس کی چھوٹی موٹی گستاخیوں کا برانہ مانے۔

’ہوں۔ غلیظ انسان۔‘ اس نے سر جھٹکا اور سرمئی سڑک پر سر جھٹکا کر چلنے لگی۔

ارد گرد لوگ آ جا رہے تھے۔

”اور بھلا ان سب کا کیا قصور؟ اور وہ سب تو اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ خواہ مخواہ ماما کا غصہ بھی ان پر نکال رہی ہے اور نینا کا منہ یہ کیسا ذرا سا نکل آیا؟ جب اس نے.....“

قریب سے گزرتے ایک اسکوتر سوار نے فقرہ کسا تو وہ چونکی اور ایک دم پیچھے پلٹ پڑی۔ آہستگی سے اس نے سیاہ گیٹ کھول کر اندر جھانکا، وہ تینوں ابھی تک پورچ میں کھڑے تھے۔ روٹھے روٹھے اور خفا خفا۔

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی پورچ تک آئی اور تینوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ تیور باقاعدہ سکنے لگا۔

”اب آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں جاتیں مومو؟“

تیور اگرچہ صرف چھ سال کا تھا لیکن آپنی بابا جی کے بجائے مومو کہتا تھا اور مریم کو بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ دو ایک بار ماما نے ٹوکا بھی تھا۔

”بیٹے یہ تمہاری بیوی ہیں انہیں بھوکھا کرو۔“

”نہیں ماما۔ مجھے اس کا ایسے بلانا اچھا لگتا ہے۔ یہ میرا ماما سا بھائی، میرا دوست ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی مور۔ میری جان میں بس میں جاتی ہوں نا۔“ اس نے انہیں علیحدہ کرتے ہوئے سمجھایا ”اور وہاں رش ہوتا ہے، کھڑے ہو کر جانا پڑتا ہے اور تم چھوٹے سے ہو۔“

”آپ بس میں کیوں جاتی ہیں ہمارے ساتھ گاڑی میں کیوں نہیں جاتیں؟“ عاشری نے پوچھا۔

”بس یونی۔“

”مجھے پتا ہے۔“ نینا نے سنجیدگی سے کہا ”مومو آپنی ماما سے ناراض ہیں۔“

”ماما گندی پچی ہیں۔“ تیور نے ناراضگی سے کہا۔

”بہری بات۔“ اس نے تیور کے رخساروں پر ہوسہ دیا۔

”ایسا نہیں کہتے ماما اچھی ہیں.....“

”تو پھر ماما آپ سے لڑتی کیوں ہیں۔“

”میں بھی تو ماما سے لڑتی ہوں۔“

”نہیں پہلے تو خود ہی ماما آپ سے لڑتی ہیں۔“ تیور نے بحث کی۔

”اچھا چلو چھوڑو فضول باتیں مجھے پیار کرو۔“

تینوں نے باری باری اس کے رخساروں پر ہوسہ دیا پھر وہ تینوں کو ساتھ لے کر گاڑی تک آئی

جہاں چاچا اسلم کپڑے سے اسے صاف کر رہا تھا۔

”چاچا ان تینوں کو اسکول چھوڑ آؤ۔“

”آپ بھی ہمارے ساتھ جاتی تھیں تو ہمیں بہت اچھا لگتا تھا۔“ نینا نے کہا ”جب ہم اسکول کے گیٹ میں داخل ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتے تو آپ کھڑکی میں سے جھک کر ہاتھ ہلاتی تھیں تو.....“

”ہاں۔“ تیور نے بھی شکوہ کیا ”چاچا اسلم تو بس گاڑی سے اتارتے ہی زوں کر کے نکل جاتا ہے۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو گاڑی ہوتی ہی نہیں۔“

”چاچا اسلم۔“ اس نے نرمی سے اسے بلایا ”بچے اسکول کے گیٹ سے جب تک اندر نہ چلے جائیں رک کر دو ہاں۔“

”جی آپ نہیں چلیں گی؟“

”نہیں۔“

وہ ایک دم بہت تھکی تھکی اور بڑا حال سی لگنے لگی تھی۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی جائے اور کوئی ہلکا سا ٹریکولائزر لے کر آنکھیں موند کر سو جائے۔ رات بھی وہ تقریباً جاگتی ہی رہی تھی۔ بار بار شرجیل مرزا کا خیال آتا تو اس کا خون کھولنے لگتا تھا ”اف“ کتنے خوبصورت ہاتھ ہیں آپ کے مس احمد۔“ کتنی بے تکلفی سے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ پاپا اپنے بیڈروم کے دروازے پر کسی روباٹ کی طرح ساکت کھڑے تھے۔

”تو پاپا کو پتا ہے میں بس سے جاتی ہوں اور پاپا نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا اس نے بیک کو دائیں کندھے سے اتار کر بائیں کندھے پر ڈالا اور سر جھٹک کر باہر نکل آئی پھر وہی طویل سرمئی سڑک تھی اور وہ تھی۔“



شام سے ذرا پہلے جب وہ قصبے کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو اس کے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے لیے بریف کیس نیچے زمین پر رکھا اور چاروں طرف دیکھا۔ آج سے بیس سال قبل اسٹیشن اتنا بارونق اور بڑا نہیں تھا اور شام کے وقت تو صرف دو چار مسافر ہی ہوتے تھے۔ سامنے کی طرف چھوٹا سا ایک کھوکھا تھا جہاں ایک مدقوق سا بوڑھا کا ڈنڈہ پر بیٹھا ہمد وقت بیچ کے دانے گراتا رہتا تھا اور ایک چھوٹا سا انتہائی میلے ہاتھوں اور گندے کپڑوں والا لڑکا تیزی سے چائے بنا کر کنارے چمڑی پیالیوں میں ڈالتا اور اس سے قدرے چھوٹا لڑکا ان پیالیوں کو لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی بیچ نما میزوں پر رکھتا جاتا تھا لیکن اب وہاں کھوکھے کے بجائے ایک صاف ستھرا ریٹورنٹ تھا۔ جس کی پیشانی پر ”الٹان ریٹورنٹ“ لکھا تھا۔

اس کے علاوہ بھی بڑی تہذیبیاں آگئی تھیں۔

”گرم گرم پکڑنے نان۔“

ایک شخص خواہجہ اٹھائے اس کے پاس رکالین اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر زمین سے اپنا بریف کیس اٹھایا۔

”اور کتنی تبدیلیاں آگئی ہیں یہاں، صرف بیس سال میں۔“
”لیکن بیس سال کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ خود میری زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں، میں نہیں رہا۔“

اور جن دنوں وہ لاہور ہاسٹل میں رہتا تھا تو چھٹیاں ہوتے ہی کیسے بے قرار ہو کر گاؤں کی طرف دوڑ پڑتا تھا اور بے جی اسے کیسے چھت پر کھڑی ملتی تھیں۔

”میں تیری ہی راہ دیکھ رہی تھی پتر، جب وہ ماسی رحمتاں کے تندور کے پاس سے موڑ مڑتا تھا تو بے جی اسے چھت پر کھڑی نظر آ جایا کرتی تھیں اور وہ ایسے دیکھتے ہی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی میں نکل آتی تھیں۔ جب وہ اپنے دروازے پر پہنچتا بے جی دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ جاتی تھیں۔“
”بے جی، آپ کو کیسے پتا چلتا ہے کہ میں آ رہا ہوں؟“ وہ ان کے گلے لگتے ہوا پوچھتا۔
”بس پتر صبح سے ہی میرا دل دھڑک رہا تھا کہ آج میرا پتر ضرور آئے گا۔“

”ہاں ہاں تجھے تو الہام ہو جاتا ہے۔“
بابا بھی اس کے پیچھے باہر نکل آتے تھے۔ ہنستے ہوئے خوش باش سے بابا اور بابا کیسے ہمیشہ خوش رہتے تھے۔ ہر مشکل، ہر مصیبت میں ان کے لیوں پر شکر کا کلمہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں بابا کو کبھی پریشان اور ناخوش نہیں دیکھا تھا۔ جب شدید بارشوں میں فصلیں تباہ ہو گئیں تھیں۔ جب جنر ان کی لاڈلی بیٹی، شادی کے ایک سال بعد ہی ایک بچے کو جنم دے کر مر گئی تھی اور جب سلطان چاچا کو گل باز خان کے آدمیوں نے قتل کر دیا تھا۔ تب بھی نہیں۔

”اس کی مرضی یہی تھی۔ بندہ تو عاجز مسکین ہے۔ شکر ہے جس حال میں وہ رکے۔“ ان کے لیوں پر یہی کلمے لگتے رہتے تھے۔ پتا نہیں اب..... اب بھی بابا ایسے ہی ہوں گے اور بے جی..... پتا نہیں بے جی اب بھی چھت پر کھڑے ہو کر میرا انتظار کرتی ہوگی یا نہیں اور ان بیس سالوں میں مجھے یاد تو بہت کیا ہوگا بھابو نے اور بھابو مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں، کتنے لاڈ اٹھاتی تھیں میرے بالکل سکے بھائیوں کی طرح اور بھائیاں میرا کتنا خیال کرتا تھا۔

”اور وہ دونوں بچو، بچو..... بھائیاں کے جڑواں بیٹے ارسلان اور ارمان۔ وہ دونوں کتنے پیارے تھے مجھے۔ اور ان بیس سالوں میں مجھے ان کی بھی یاد نہیں آئی۔“

”کیسا پتر ہو گیا تھا میرا دل۔“
”نہیں بلکہ میں سارے کا سارا ہی پتر ہو گیا تھا۔“

”بابو جی کدھر جاؤ گے جی؟“ ایک تانگے والا اس کے قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔
”کدھر جاؤں گا۔“ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”شاید اپنے گاؤں کا کوئی ہو۔“ بیس سال پہلے یہاں قصبے کے ریلوے اسٹیشن پر دو ہی تانگے والے ہوتے تھے۔ مجید تانگے والا اور کرم الہی تانگے والا۔ مگر آج وہ نہیں بلکہ آٹھ تانگے والے کھڑے تھے اور ان میں شاید کوئی بھی کرم الہی یا مجید انہیں تھا۔

”میں رنگ پور جاؤں گا۔“
”میں روپے ہوں گے جی۔“

”میں روپے!“ وہ پھر بیس سال پہلے کے دور میں پہنچ گیا۔
”ہاں جی۔ سالم تاکہ لیس گے تو بیس روپے اور سواری تاکہ لیس گے جی تو پانچ روپے ہوں گے۔ لیکن انتظار کرنا پڑے گا۔“
”نہیں، نہیں انتظار نہیں..... سالم تاکہ ہی لوں گا۔“ اب وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا تو اب مزید انتظار نہیں ہوتا تھا۔ وہ بریف کیس اٹھائے تانگے میں بیٹھ گیا۔

”اور وہ سب مجھے دیکھ کر کس قدر حیران ہوں گے، اور کتنے خوش، اور میں کیا کہوں گا۔ اپنی ندامتوں اور شرمندگی کو کیسے چھپاؤں گا ان سے کہ بیس سال تک پلٹ کر ان کی خبر تک نہ لی تھی میں نے..... پر نہیں وہ مجھے شرمندہ ہی کہاں ہونے دیں گے۔ بابا تو مجھے گلے سے لگا لیں گے۔“
”کوئی گل نہیں پتر، ہو دیر سے سہی آ تو گئے ہو۔ جاتے سے دیکھ لیا تمہیں..... اوئے بھگوان اٹھ۔“ پھر وہ بے جی سے کہیں گئے۔ ”ارسلان کو بھیج کر حوالدار کی دکان سے بتاشے منگوالے دس روپے کے اور ہانٹ دے۔“

”لو، پہلے تو میں تیل ڈال آؤں مسجد میں۔ خیر سے میرا پتر امریکا سے ڈگری لے کر آیا ہے۔“
”بابو جی، آپ رنگ پور کے ہی ہو؟“

”ہاں۔“ وہ اپنے خیالات سے چونکا ”تم رنگ پور کے ہو؟“
”نہیں جی۔ میں تو ادھر کا ہی ہوں شہر میں ہی رہتا ہوں۔ چھوٹا سا تھا یہی کوئی تین چار سال کا تو جی میرا بابا مر گیا۔ ہوش سنبھالتے ہی تاکہ چلانے لگا۔ میرا بابا بھی تاکہ چلاتا تھا جی۔ سات بہنیں ہیں۔ سب کو پار لگانا ہے۔ چار کو بیاہ چکا ہوں۔ تین رہتی ہیں۔“

”ایک یہ شخص ہے۔ ان پڑھ اور کم علم۔ جو اپنے فرض کو پہچانتا ہے اور اتنی چھوٹی سی عمر سے ہی گھر کو سنبھالے ہوئے ہے اور ایک میں ہوں، اعلیٰ تعلیم یافتہ جو محبتوں کی قدر بھی نہ کر سکا۔“
وہ پھر سوچوں میں کھو گیا تھا۔

تا نگہ اب کچی سڑک کی طرف مڑ گیا تھا۔

کچی کچی فصل کی خوشبو اس کی ناک سے نکرائی۔ پھر اسے جھٹکا سا لگا۔

”یہ سڑک ابھی تک کچی ہے۔“

”جی اوجی، دوٹ والے وعدے تو بڑے کرتے ہیں جی۔ ایک دفعہ جیت جائیں جی، پھر سب سے پہلے سڑک کچی کروائیں گے لیکن پھر جی جیت گئے تو کہاں کے وعدے..... آج تک توئی وعدوں کے سہارے ہی چل رہے ہیں۔“

”ہاں وعدے..... وعدے کون پورے کرتا ہے۔“

اس نے بھی تو وعدہ کیا تھا اور پھر اس وعدے کو باقاعدہ نکاح کی زنجیر پہنادی تھی لیکن پھر وہ اس وعدے کو نہ بھاسکا۔ پتا نہیں، رضوانہ کہاں ہوگی اور پتا نہیں، وہ مجھے یاد بھی کرتی ہوگی یا اپنے گھر شوہر اور بچوں میں مست ہوگی اور اسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ کبھی میں اس کی جھٹک دیکھنے کے لیے گھنٹوں چھت پر کھڑا رہتا تھا اور صرف اس کے لیے اس کی خاطر لاہور سے ہر چندہ دن بعد گاؤں بھاگا چلا آتا تھا اور جب چاچا سلطان قتل ہو گئے تھے تو بابا نے پوچھا تھا۔

”سکندر پتر، رضی اکیلی ہو گئی ہے دل چاہتا ہے اسے گھر لے آؤں۔“

”تو لے آئیں بابا۔“

”اس طرح نہیں۔ تیرا نکاح کر کے پتر۔“

اور لڑکا ہونے کے باوجود اس کی نگاہیں جھک گئی تھیں اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

”جی بابا۔“

”بیٹا تو شہر پڑھتا ہے اگر تیری کہیں اور مرضی ہو تو۔“

”نہیں بابا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جو آپ کریں گے، بہتر کریں گے۔“

پھر کیا ہوا۔ اس نے سارے وعدے تو ڈالے حتیٰ کہ نکاح کی زنجیر بھی کاٹ ڈالی تھی۔

دل دریا سمندروں ڈونگا

کون دلاں دیا جانے ہو
تا نگے والا اسے سوچوں میں کھویا دیکھ کر گانے لگا اور وہ ارد گرد پہلے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔ گندم کی کٹائی ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ گندم کے گٹھے بندھے رکھے تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں کو انگی فصل کی بوائی کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اور ان میں پانی لگا تھا۔ شام کے کلبجے سے اندھیرے میں اسے یہ منظر بہت اچھا لگا۔ اوپر آسمان پر چموری چڑیوں اور کوؤں کے ڈار اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف اڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے کھمبوں کو دیکھا۔

”رنگ پور میں بجلی آگئی ہے؟“

”ہاں جی۔“ تا نگے والے نے گھوڑے کو ہلکا سا چابک مارا ”چل شہزادے۔“

وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے کچی اور ادھ پکی فصل کی خوشبو اپنے اندر اتار رہا تھا۔

”چلو جی، باؤ جی، رنگ پور آ گیا۔“

”ہاں۔“ وہ چونکا۔

”ادھر ہی اترو گئے یا آگے تک لے جاؤں؟“

”نہ یہاں ہی۔“

وہ بریف کیس اٹھا کر اتر گیا۔ سامنے ہی چھوٹا سا میدان پار کر کے ماسی رحمتاں کا تندو تھا۔ وقت ایک دم بیس سال پیچھے چلا گیا تھا۔ اس کے اندر وہی جوش و ولولہ بھر گیا، جو پہلے گاؤں آتے ہوئے ہوتا تھا۔ قدموں میں ایک دم تیزی آگئی۔ ماسی رحمتاں کے تندو کے پاس پہنچ کر اس کی نگاہیں بے اختیار گھر کی چھت کی طرف اٹھ گئیں لیکن منڈیر سنسان پڑی تھی۔ وہ لمحہ بھر یونہی رک کر چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے ابھی بے جی کہیں سے آکر منڈیر پر کھڑی ہو جائیں گی اور پھر ان سے نظریں ملنے ہی وہ دایاں ہاتھ اٹھا کر انہیں دس کر دے گا۔ اور..... ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے ارد گرد کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

”اپنے وطن کی ہواؤں کی خوشبو ہی اور ہوتی ہے!“ ایک بار لاہور آتے ہوئے محسن وقار نے سوہاہ

کے قریب پہنچ کر بس کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر زور سے سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

”بس اپنے علاقے میں داخل ہوتی ہے تو ہواؤں کی خوشبو ہی بدل جاتی ہے۔ سوئدھی سوئدھی

روح میں اتر جانے والی خوشبو.....“

وہ اور محسن دونوں ہی بڑے جذباتی ہوا کرتے تھے۔ وہاں ہاسٹل میں اپنے علاقے کی گاجرا اور

مولیوں کو یاد کرتے تھے ”یار! اپنے علاقے کی مولیوں کی بات ہی کیا ہے۔“ محسن وقار سلاوا کی پلیٹ

میں سے مولی کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھتا تو ضرور کہتا ”کیا بات ہے، بھی اپنے تہال کی مولیوں کی۔“ وہ

تہال کا رہنے والا تھا۔ پورے پاکستان میں کیا پوری دنیا میں ایسی ذائقے والی مولیاں نہیں ملیں گی۔

”یار! اب مولیوں اور گاجروں کی بات چھوڑو۔ برگر اور فاسٹ فوڈ کی بات کیا کرو۔“

کوئی دوست اسے ٹوکتا۔

”لعنت ہو تمہارے برگر وں پر۔ ہمارے سرسوں کے ساگ اور تندوری روٹی پر ایسے ہزاروں

برگر قربان ہوں۔“ اسے کوئی کمپلیکس نہیں تھا کہ وہ گاؤں سے تعلق رکھتا ہے بلکہ وہ تو اس پر فخر کرتا تھا۔

”یہ پانی کے چھینے مار مار کر فریزروں میں رکھی سبزیاں..... ارے کبھی میرے گاؤں آؤ تو بتاؤں

”بے جی اور بابا ٹھیک تو ہیں نا۔“

”بے جی اور بابا۔“ ٹار چوہدری نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے دہرایا ”وہ تو چلے گئے سکندر تیرا انتظار کر کے تھک گئے تھے۔“

”بھا۔“ وہ ایک بار پھر ٹار چوہدری کے گلے لگ گیا اور دونوں بھائی رونے لگے۔

”کیا ہے۔ کون آیا ہے ملک صاحب۔ خیریت تو ہے ناجی۔“ یہ بھابو کی آواز تھی۔

”صالحہ صاحبہ۔“ چوہدری ٹار نے بھڑائی ہوئی آواز کہا ”سکندر آیا ہے..... اپنا سکندر۔“

”سکندر ملک جی۔“

اور پھر چوہدری ٹار اس کے گرد بازو جمائے لیے اسے اندر لے گئے۔ بھابو نے تڑپ کر اسے گلے لگالیا اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ بھابو کے گھٹنوں پر سر رکھے آنسو بہاتا رہا۔

”اب بس بھی کر نیک بخت۔ پتا نہیں کتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ چائے پانی کا کوئی بندوبست کر اپنے دیر کے لیے۔“

اس نے سراٹھا کر ٹار چوہدری کی طرف دیکھا۔

وہی بابا والا انداز۔

وہی آنکھوں سے جھانکتی شفقت و محبت!

وہی پور پور پیار میں ڈوبا لہجہ۔

”چلو اٹھو جھلی گھر آنے والے پر دیسی کا ایسے خیر مقدم نہیں کرتے۔“

بھابو آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ اٹھ کر پھر ٹار چوہدری کے پاس بیٹھ گیا۔

”بھا۔“

”بس بس، اب رونا نہیں..... بہت رو لیا تم نے۔ اب تو آگیا ہے نا تو سب ٹھیک ہے۔“

انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور مسکرائے۔

”بھا، ماں جی اور بابا کب..... اور کیسے؟“

”چھ سات سال پہلے بس چھ ماہ کے وقت سے دونوں ہی چھوڑ گئے۔ پہلے ماں جی اور پھر

بابا۔ تجھے پتا تو ہے نا، ماں جی کو دے کی تکلیف تھی۔ سانس اکھڑ جاتا تھا تو پھر..... بس ایک روز ایسا اکھڑا کہ.....“

ہاں۔ اسے یاد تھا۔ بہت اچھی طرح سے یاد تھا۔ جب وہ چھوٹا سا تھا اور ماں جی کو سانس کی تکلیف ہوتی تھی تو وہ ساری ساری رات بیٹھ کر لڑا رہتی تھیں۔ ذرا لپکتی تھیں تو سانس اکھڑ جاتا تھا اور اٹھ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اپنی چار پائی سے وہ بار بار سراٹھا کر انہیں دیکھتا اور پھر نیچے پر سر رکھتے ہوئے

تہیں توری اور ٹنڈوں کا کیا ذائقہ ہوتا ہے۔ دیسی کھیرے کا کیا مزہ ہے۔“

”بس بس، یہ ٹنڈے اور توریاں تو ہی کھاتا رہ۔“ حمزہ اور اسد تو اس کی ایسی باتوں سے بہت چڑتے تھے اور انہوں نے اس کا نام ہی دیسی کھیرا رکھ چھوڑا تھا۔

پتا نہیں یہ سب لوگ کہاں ہوں گے۔

اپنی اپنی زندگیوں میں سیٹ اور مطمئن یا اس کی طرح بے چین اور مضطرب۔ جی دامن اور خالی ہاتھ یا مالا مال۔

اس نے ایک بار پھر ارد گرد کی خوشبو کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی۔

اور محسن وقار سچ ہی کہتا تھا۔ اپنی مٹی کی خوشبو ہی اور ہوتی ہے۔ دکھراہی ذائقہ ہوتا ہے۔

سامنے ماسی رحمتاں کے تندور کے پیچھے برگد کا اونچا درخت آج بھی اسی آن بان سے کھڑا تھا۔ آسمان پر آج بھی سفید سفید بلیاں راج ہنسوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ سب کچھ کتنا اپنا اپنا اور

خوبصورت لگ رہا تھا لیکن سامنے اس کے گھر کی میڈیر خالی تھی۔ وہاں بے جی نہیں تھیں۔ یکا یک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں لیکن اس نے سر جھٹک کر آنسوؤں کو بہنے سے روکا اور سر جھکا کر گھر کی

طرف چل پڑا۔ گلی سنان پڑی تھی۔ گاؤں میں شام ہوتے ہی ویرانی ہو جاتی تھی۔ رنگ پور کی گلیاں بھی سنان پڑی تھیں۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر کتنی ہی دیر تک وہ یونہی ساکت کھڑا رہا۔ ایک وقت تھا جب وہ دروازے کو دھکا دیتا بھاگتا ہوا اندر پہنچ جاتا تھا اور آج اجلی بنا کھڑا تھا۔ کئی لمبے یوں ہی گزر گئے۔ آخر

حوصلہ کر کے اس نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر بعد کوئی دروازے پر آیا۔

”کون ہے بھئی خیر تو ہے۔“ دروازہ کھولے چوہدری ٹار کھڑے تھے۔

”بھائٹار۔“ وہ بریف کیس پھینک کر ان سے لپٹ گیا۔

”کون تو..... تو سکندر۔ سکندر تو۔“ بھائٹار نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اس کی خشک

آنکھوں میں آنسو اٹھ چلے آئے۔

”ارے کہاں چلا گیا تھا تو ہم سب کو چھوڑ کر۔ کیسے پھر کر لیا تو نے اپنے دل کو۔“ ٹار چوہدری

آنسوؤں سے رو رہے تھے۔

دونوں کے آنسو ایک دوسرے کے کندھوں کو بھگوئے جا رہے تھے۔

”اچھا، اب بس مت رو۔ آگیا ہے نا۔ میرے دل کو یقین تھا کہ تو ضرور آئے گا۔ ضرور تجھے کوئی مصیبت آ پڑی ہوگی۔ تبھی تو رک گیا ہوگا۔ بے جی کہتی تھیں اور بابا بھی کہتے تھے۔ سکندر ہمیں بھولا

نہیں۔ وہ ہمیں بھول نہیں سکتا۔ ضرور کسی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔“

سوچتا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا اور پھر ماں جی کا علاج کرے گا۔ پتا نہیں کیسے ڈاکٹر تھے کہ ماں جی کی تکلیف دور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ بابا کتنی مرتبہ انہیں شہر لے گئے تھے مگر جب سردیاں آتیں ماں جی کا وہی برا حال ہو جاتا۔ چار پائی سے ہی لگ جاتی تھیں تب ہی تو بابا نے بھانٹا کہ بیاہ جلدی کر دیا تھا۔ ادھر خبر کی ڈولی اٹھی تھی ادھر بھانٹا کی دہن گھر آئی تھی۔

”بابا! ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔ ابھی اتنی کم عمری ہیں شادی؟“

”پڑھ لینا پتر۔ پر غبر کے جانے کے بعد تیری ماں اکیلی ہو جائے گی۔ ہمیں روٹی کون پکا کر دے گا۔ گھر کا خیال کون رکھے گا۔ تجھے پتا ہے نا۔ سردیوں میں کتنی اوجھی ہو جاتی ہے وہ۔“

بابا نے سمجھا یا تو شارچپ ہو کر رہ گئے۔ یوں بھابھو صالحہ ان کے گھر آگئی تھیں اور تب بھانٹا میٹرک کر کے نئے نئے شہر گئے تھے۔

ماں جی گرمیوں میں تو بھلی چنگی رہتی تھیں۔ تندو میں روٹیاں لگاتیں۔ سال بھر کے لیے گندم سنبھال کر رکھتیں۔

ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھیں۔ مگر سردیاں.....

تب وہ ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر انہیں یقین دلاتا ”ماں جی دیکھ لینا“ میں ڈاکٹر بنوں گا اور آپ کا علاج کروں گا۔“

وہ ڈاکٹر تو بن گیا تھا لیکن ماں جی کا علاج نہیں کر سکا تھا۔

”اور بابا تو بس ماں جی کے بعد چٹ پٹ ہی چلے گئے۔ چپ سی لگ گئی تھی ان کو۔ کبھی بات بھی کرتے تو تیری یا ماں جی کی۔ پھر وقت برابر آ گیا ان کا۔ تجھے بہت یاد کرتے تھے سکندر..... کہتے تھے اگر کبھی سکندر لوٹ کر آیا تو اسے بتانا کہ ہم اس سے خفا نہیں ہیں۔ ماں باپ بھی کبھی اپنی اولاد سے خفا ہوتے ہیں۔ لیکن رضوانہ پتر سے معافی ضرور مانگ لینا۔ اس کا دل دکھایا ہے تو نے۔“

”رضوانہ.....“ چھم چھم کرتی رضوانہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

سیاہ کا جل بھری آنکھیں

گلابی رنگت

نازک سراپا

کمر کو چھوتے بال

ہنسی تو رخساروں پر گڑھے پڑ جاتے تھے

ہونٹ بند کرتی تو آنکھیں ہنسی نہیں

اس کا پورا وجود ہنستا تھا۔

پتا نہیں کہاں ہوگی وہ۔

اس کا دل چاہا پوچھے کہ وہ کیسی ہے۔ اس کا شوہر کیسا ہے کیسا کرتا ہے۔ اپنے گھر میں خوش ہے یا نہیں..... لیکن ہمت نہیں پڑی۔ بس شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”بھما“ بڑی دیر بعد اس نے سراٹھایا ”گھر میں بڑی خاموشی ہے۔ سب لوگ کدھر ہیں۔ اپنے پیچھے پیچھا اور.....“

”سب شہر ہوتے ہیں یار۔ ہم بڑھاپہ ہی ادھر اکیلے رہتے ہیں۔“

”کہاں بھما! ابھی آپ بڑھے کہاں ہوئے ہیں۔“ اس نے غور سے ان کے کسرتی بدن کو دیکھا۔ سفید کرتے شلوار میں ملبوس سیاہ جھکتے بالوں اور گھنی مونچھوں کے ساتھ وہ بڑے شاندار لگ رہے تھے۔ شاید ابھی تک ان کے بال سفید نہیں ہوئے تھے جب کہ اس کا آدھا سر سفید ہو گیا تھا۔

”بچے جوان ہو جائیں تو ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں یار..... ارسل اور منا یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ چھوٹی ایمن بھی لاہور میں پڑھ رہی ہے۔ بی ایس سی کر رہی ہے۔ تو نے تو اسے نہیں دیکھا۔ تیرے جانے کے بعد پیدا ہوئی تھی اور وہ شہر یار ہے نا! اپنی خبر کا بیٹا وہ ڈاکٹر بن گیا ہے۔ ہاؤس جاب کر رہا ہے۔ چاروں لاہور میں ہی ہوتے ہیں۔ یہ تیری بھابھو نے بڑا منع کیا تھا کہ بچوں کو شہر نہ بھیجے۔ بہت ڈرتی تھی کہ تیری طرح انہیں شہر ڈس نہ لے۔ پر میں نے سمجھایا۔ جھیلے شہر برے نہیں ہوتے ہیں۔ شہر آدمی کو کچھ نہیں کہتے ہیں۔ یہ تو آدمی خود ہی بھٹک جاتا ہے۔ اپنی راہ کھوٹی کر لیتا ہے۔ شہروں نے بھلا کیا کرتا ہے۔ جیسے شہر ویسے گاؤں۔ آدمی نے بھٹکنا ہو تو گاؤں میں رہ کر بھی بھٹک جاتا ہے۔“ شیریں کے ابا کوئی دیکھ لو۔ مڑ کر بھی خبر ہی نہیں لی کہ بیٹا جیتا بھی ہے یا نہیں؟ اب میں بھی تو شہر گیا تھا نا۔“

وہ نادم سا سر جھکائے بیٹھا تھا۔

بھانٹا نے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔

”ارسل کو تو پروفیسر بننے کا شوق ہے۔ انگریزی میں ایم اے کر رہا ہے۔ بڑا شاعر واعر ہو گیا ہے۔ تیرا لاڈلا شاعروں میں جا کر شعر سناتا ہے اور وہ منا تو پورا بقرط ہے۔ ایک دم کامریڈ۔ سیاست میں ایم اے کر رہا ہے۔ اس کی باتیں سن کر تو لگتا ہے جیسے پاکستان کا اگلا وزیر اعظم اسے ہی بننا ہے۔“ شارچو بدری نے قہقہہ لگایا..... اونچا زوردار قہقہہ۔

’اور بھانٹا بالکل بابا کی طرح گلنے گلے ہیں۔‘ سکندر نے سوچا..... ’باتوں کا وہی انداز وہی لہجہ پتا ہی نہیں لگتا کہ انہوں نے زرعی یونیورسٹی سے ماسٹر کیا ہے۔‘

”اور شیریں۔ وہ بڑا ذمے دار لڑکا ہے۔ سنجیدہ اور کم گوسا..... شاید ماں کی موت اور باپ کی بے

”آپ گئے تھے؟“

”نہیں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے اس کی مایوسی کو دیکھنے کا۔ نمائش سے پہلے بڑا پر امید تھا۔“

”کچھ لوگوں نے پسند بھی کیا ہے اس کے کام کو۔ آپ نے شاید پڑھا نہیں۔“

”کونے میں بڑے انہماک سے ایزل چیئر پر بیٹھ کر مسرور صفدر نے بھی ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔“

”آمنہ صفی کا کالم نہیں پڑھا آپ نے۔ بہت تعریف کی ہے اس نے۔ اس کی رائے بہت اہمیت

رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ آج کل وہ تہذیب و ثقافت کے بچاؤ کے لیے بڑا کام کر رہی ہے۔“

”میں نے آمنہ کا کالم نہیں دیکھا۔“ مجتبیٰ حیدر نے مسرور کو جواب دیا۔

”تمہارا کام کب ختم ہوگا۔ سب لوگ آنے والے ہوں گے۔“

”بس ایک آخری سچ دے لوں۔“ مسرور نے پروفیسر عادل کو جواب دیا اور جلدی جلدی برش

پھرنے لگا۔ مجتبیٰ حیدر اسے یوں تصویر پر کام کرتے ہوئے دیکھتے رہے جبکہ پروفیسر عادل سگریٹ پر

سگریٹ پھونکنے جا رہے تھے اور گاہے گاہے گنگنانے لگتے۔

عشق لگا گھر دوسریا دوسریا (عشق ہوا ہے گھر بار بھول چکے ہیں اور زرق برق لباس

بھول چکے ہیں)

”کس سے عشق ہو گیا ہے پروفیسر؟“ مجتبیٰ حیدر نے شرارت سے دیکھا ”ایک ہم ہیں، عمر گزرنی

اس صحرانوردی میں لیکن ایسا عشق نہیں ہوا۔ جس میں گھر بار سب بھول جائیں۔“

”جو عشق فرزانہ ہوتا ہے وہ عشق نہیں ہوتا میری جان۔“

”اور تمہارا عشق کیا دیوانہ ہے؟“

”میرا عشق ابھی میرے خون کے اندر گردش کر رہا ہے۔ ابھی میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں اس

عشق کی ہفت منزلیں طے بھی کر سکوں گا یا نہیں یا زندگی بغیر عشق کیے ہی گزر جائے گی۔ کیا تم سے کسی نے

عشق نہیں کیا؟“

مجتبیٰ نے قہقہہ لگایا۔

پروفیسر عادل نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر اس کی بات کا جواب دیے بغیر

مسرور کی طرف متوجہ ہو گئے ”تمہاری تصویر میں اب کچھ چیز جھلکنے لگی ہے مسرور۔ جو کچھ چلتی ہے اپنی

طرف۔ اسی طرح محنت سے کام کرتے رہے تو ایک دن نام کماد گئے۔“

”تھینک یو پروفیسر۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے ہی آج یہاں تک پہنچا ہوں۔“

”کیا خیال ہے پروفیسر عادل، مصوری کھاتے پیتے لوگوں کا فن نہیں ہے کیا؟“ مجتبیٰ نے خیال

ظاہر کیا۔

اعتنائی نے اس سے اس کی شوخیاں چھین لی ہیں حالانکہ بابا اور ماں جی نے تو اسے ہتھیلی کا

پھپھولا بنا کر رکھا اور اپنی بھال کو تو تجھے پتا ہی ہے۔ کیسا دل ہے اس کا، سمندر..... مجتبیٰ کا سمندر۔“

”ارے تجھے پتا نہیں سمندر سے ماں جی کے بعد اس نے کیسے راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے لیے

دعائیں کی ہیں۔ شیری کے پروفیسر زاس کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔ ایک دفعہ میں لاہور گیا تھا تو اس

کے ایک پروفیسر کہہ رہے تھے کہ شیری ایک دن بہت بڑا سرجن بنے گا۔“

بھابھوچن میں کھڑکھڑ کر رہی تھیں۔

”صالہ چائے تو پلوادے سمندر کو پھر پکاتی رہنا کچھ۔“ چوہدری ثار نے اسے آواز دی اور پھر

سمندر کی طرف دیکھا۔

”تو بتا، یار کہاں کھو گیا تھا۔ مڑ کر خبر ہی نہ لی۔ بیوی بچے کہاں ہیں تمہارے..... بتا دیا، کچھ اپنے

متعلق۔“

”میں سچ سچ دنیا کی اس بھیڑ میں کھو گیا تھا بھابی۔ واپسی کا راستہ ہی گنوا بیٹھا تھا۔ ایسی بھول

بھلیوں میں الجھ گیا تھا کہ جن سے ٹکنا اپنے اختیار میں ہی نہیں رہا تھا۔“

آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے تو چوہدری ثار نے اسے کھینچ کر گلے سے

لگالیا اور وہ ان کے گلے سے لگا ایک بار پھر سکنے لگا۔



”یہ اینٹی کنزیومرا ایکٹیویٹیز میں غیر اسلامی ہیں سب وڈیول آرٹ۔“

”ہوں۔“ مجتبیٰ حیدر نے اخباروں کا پلندہ پروفیسر عادل کی میز کے سامنے پھینکا ”یہ..... یہ پڑھا

ہے سب آپ نے؟“

”پڑھ چکا ہوں۔“

تصدق احمد کے SCULPTURES پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔ جو پرچہ اٹھاؤ اس میں تصدق احمد پر

تقدید۔ اخبارات، ادبی پرچے۔ سب کے سب بھرے ہوئے ہیں۔ کیا گناہ کر دیا ہے اس نے یار

یہ SCULPTURES بنا کر میں نے ایک دوپیں دیکھے ہیں۔ بہت اچھے لگے۔ بڑے نیچرل اور سچے سے۔“

”اپنی اپنی نظر کی بات ہے بھئی۔“ پروفیسر عادل نے الٹش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے

ہوئے کہا۔

”دراصل اس ملک میں ابھی لوگ فن کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔“

”تصدق آیا تھا؟“ مجتبیٰ حیدر نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”اور اس کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ نڈل کلاس لڑکوں نے مصوری شروع کر دی۔“ مسرور صفدر نے مڑ کر شاکی نظروں سے مجھے کو دیکھا۔

”شاید۔“

پروفیسر عادل نے پھر سگریٹ جلایا اور آنکھیں کھول کر سیدھے بیٹھ گئے۔ جب وہ کسی کی باتیں توجہ سے سنتے تھے تو ان کا یہی انداز ہوا کرتا تھا۔

”داتا دربار کے پاس جو کمرشل آرٹسٹ بیٹھے سرورق بنا رہے ہیں وہ بالکل جاہلانا ہے۔ آغا کی نئی کتاب کا سرورق دیکھا تھا تم نے ایک دم فضول۔ دراصل اس جرنیشن نے کمرشلائزیشن کی ہے۔ اس طرح آرٹسٹ اور کتاب میں تعلق بناتا ہے۔“

انہوں نے آدھا پیلا ہوا مگریٹ الیش ٹرے میں پھینک دیا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک دم چمک آگئی تھی اور قدرے سکڑ گئی تھیں۔ پیشانی کی لکیریں گہری لگنے لگی تھیں۔ ایک ہاتھ کی مٹھی بند ہوگئی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ کو انہوں نے سمجھانے کے سے انداز میں اوپر اٹھالیا تھا۔ جب وہ کسی لیکچر کے موڈ میں ہوتے تو ان کا یہی اسٹائل ہوتا تھا۔

”افسانے کو ILLUSTRATE کرنے کی روایت ہمارے ہاں اتنی نہیں ہے۔ انور سجاد کی کتاب ”استعارے کی کہانیاں“ میں ILLUSTRATION ڈیکوریشن کے نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ مجھے حیدر نے پوچھا ”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں پروفیسر۔ میں تو کمرشل آرٹسٹوں کی بات کر رہا تھا جو.....“

”اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ ادبی رسالوں اور ڈائجسٹوں نے مصوری اور ادب کو یک جا کیا ہے۔“ پروفیسر عادل نے انہیں ٹوک دیا۔ وہ جب بولنے پر آتے تھے تو بے ٹکان بولتے تھے۔ بظاہر ان کی گفتگو میں کوئی ربط نہیں لگتا تھا لیکن بعد میں جب غور کیا جاتا تو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کڑی ملتی دکھائی دیتی تھی۔

”انور سجاد افسانہ نگار بھی ہے اور مصور بھی۔ اس کی کہانی ”چوراہے کے بعد“ میں مصوری بھی ہے۔ اس نے کوشش یہ کی ہے کہ گریوٹی لے آئے۔ منو میں بھی یہ بات تھی لیکن اس کی DEATAILS تھوڑی تھیں وہ برش پینٹ نہیں کرتے تھے۔ انتظار حسین کا اپنا اسٹائل ہے۔ آرٹ تو بہر حال وڈیول ہے اور یہ محدود فن ہے۔“

”پاکستان میں ادب کے برعکس مصوری کی کوئی تحریک کیوں نہیں چلی پروفیسر عادل۔“ مجھے حیدر نے پوچھا ”ہندوستانی یا پاکستانی کوئی ایلمنٹ تو بنانا چاہیے تھا نا۔“

”جنگ عظیم اول اور دوم کے بعد جب ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو یہ جنگ کی ضرورت یا جبر

”مجھو تمام دانش ور فاشنزم کے خلاف اکٹھے ہوئے ربط بڑھا۔ وہاں جتنی تحریکیں آئیں سب ادب سے آئیں۔ سرکلوم امپرشنزم۔ یعنی جنگ کے بعد مصوری ادبی شے بن گئی۔“

پروفیسر عادل بول رہے تھے اور مجھے حیدر سن رہے تھے۔ پروفیسر عادل بھی کمال کی شخصیت تھے۔ ہر موضوع پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ بے انتہا مطالعہ تھا ان کا۔ مصوری ہو یا ادب سیاست ہو یا شاعری۔ جس موضوع پر بولتے کوئی ان کی معلومات کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ دنیا میں اکیلے تھے۔ شاید کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا ان کا۔ لوگ ان کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ بس اچانک ہی وہ لاہور کے مختلف حلقوں میں پہچانے جانے لگے۔

کوئی چار سال قبل وہ لاہور آئے تھے اور کالج آف آرٹ میں پڑھا رہے تھے۔ شاید خاندانی رئیس تھے۔ گلبرگ میں بہت بڑی کوٹھی تھی۔ شاعر ہنڈا کارڈ ان کے پاس تھی۔ ان کی شہرت کی ایک وجہ ان کے ہاں منعقد ہونے والی ادبی نشستیں تھیں اور ادبی و علمی نشستوں میں بڑی بڑی معتبر شخصیتوں کے علاوہ نئی نسل بھی شامل ہوتی تھی بلکہ نئی پود کے تو وہ آئیڈیل تھے۔

یونیورسٹی اور کالج کے طلباء انہیں گھیرے رکھتے تھے۔ گھر میں چونکہ وہ اکیلے ہوتے تھے اس لیے وقت بے وقت اسٹوڈنٹ چلے آتے تھے۔ اپنے اسٹوڈنٹس میں وہ بے حد مقبول تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ آئز اسٹوڈنٹس کی مدد بھی کر دیتے تھے۔ کسی کے اندر کوئی صلاحیت دیکھتے تو اسے اجاگر کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے اور ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

مسرور صفدر بھی ایک غریب لڑکا تھا۔ اس کا تعلق کسی گاؤں سے تھا۔ پروفیسر عادل نے اس میں صلاحیت دیکھی تو نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اسے گھر لے آئے تھے اور ہر طرح کی مدد کرتے تھے۔ آج کل مسروران کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔

اس نے اپنا کام ختم کیا۔ ایزل اور برش سنبھال کر رکھے اور ہاتھ دھو کر آ گیا۔

”یار ڈرا بجش کو چائے کے لیے کہہ دو۔“

”جی سر۔“

مسرور چائے کا کہہ آیا تو حافظ احسان اللہ بھی تشریف لا چکے تھے۔ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور پروفیسر عادل کے مداح تھے آج ہفتہ وار ادبی نشست تھی اور اس میں غالباً حافظ صاحب اپنا افسانہ پڑھنے والے تھے۔ یہ ان کا پہلا افسانہ تھا۔ انہوں نے مسودہ مجھے کے حوالے کر دیا۔

”مجھے صاحب ذرا ایک نظر دیکھ لیں اسے۔“

”حافظ صاحب آپ نے لکھا ہے اسے تو یقیناً کوئی بات ہوگی۔“

”ارے نہیں مجھے صاحب ہم تو طفل کتب ہیں۔ آپ اتنے کہنے مشق افسانہ نگار۔ ذرا ایک نظر

دیکھ لیتے تو دل کو تسلی ہو جاتی۔“ لیکن مجتبیٰ صاحب کا موڈ نہیں بن رہا تھا چنانچہ افسانے کے اوراق پلٹتے ہوئے ایک باب پڑا انہوں نے گفتگو کا رخ تصدق احمد کی طرف موڑ دیا۔

”آپ نے تصدق احمد کی نمائش دیکھی تھی؟“

”گیا تو تھا میں لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے آرٹ وارث کی کچھ سمجھ نہیں ہے۔“

”اخبارات نے بہت کچھ لکھا ہے اس پر۔“

”تعریف میں یا تنقید میں؟“

”تنقید زیادہ کی ہے، بلکہ ایک صاحب نے تو یہ آرٹ وغیرہ سب کو غیر اسلامی قرار دے دیا ہے۔“
”در اصل ہم دانش ورانہ سطح پر مفلس ہیں۔“ پروفیسر عادل نے حافظ احسان کی طرف دیکھا ”ہم ذاتی مفاد کو مد نظر رکھنے لگے ہیں تو یہ نہیں۔ اخبارات صرف سنسنی کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ انسان کا ایک قومی نظریہ ہوتا ہے، دوسرا بین الاقوامی۔ ہمارے دونوں اوصاف منفي ہیں۔ نہ ادب نہ مصوری کسی چیز کی اہمیت نہیں رہی۔ فنون صرف انجوائے کرنے کی چیز رہ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں سامری کے پچھڑے کی پوجا ہو رہی ہے۔ یہاں صرف مراعات یافتہ طبقہ ہی فنون پر حق حاصل کر سکتا ہے اور تصدق احمد بے چارہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے سے زمین دار کا بیٹا ہے۔ اسے کوئی حق نہیں کہ وہ فن کی خدمت کا دعویٰ کرے۔“

”خیر یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے اور ہمارے ہاں تو یوں بھی وسائل کی کمی ہے۔“ مجتبیٰ نے افسانے کا مسودہ حافظ احسان اللہ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہر جگہ نہیں۔“ پروفیسر عادل نے سنجیدگی سے کہا ”سارترے نے اعزازات کے ساتھ دفن ہونے کے بجائے عام آدمی کی طرح دفن ہونے کو ترجیح دی تھی۔“

پروفیسر احسان اللہ نے افسانہ سرور کو پکڑا دیا۔

”کیا خیال ہے تمہارا مسرور اس افسانے کو آج محفل میں پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ تم بیک آدمی ہو، ذرا اپنا نقطہ نظر بناؤ۔“ حافظ احسان اللہ خاصے بے چین لگ رہے تھے۔ مجتبیٰ حیدر اور پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔

”سر، کہانی نہ بھی اچھی ہوئی اور اگر محفل میں پڑھی گئی تو یار لوگ اس کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور نکال لیں گے۔“

”یار تم پڑھو تو۔“

مسرور صفحہ کہانی پڑھنے لگا۔ پروفیسر عادل اور مجتبیٰ حیدر پھر سے پاکستان میں مصوری پر باتیں کرنے لگے۔

”ہر حرن چاؤلہ کے افسانے ”گھوڑے کا کرب“ میں انسان کی ENTITY کا جو تجربہ ملتا ہے اس کی ایک جھلک آپ کے ہاں بھی دکھائی دے رہی ہے۔“ مسرور نے افسانے کا مسودہ پروفیسر احسان کو واپس کیا۔

”واقعی۔“ حافظ صاحب کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

”میرے اندر بھی الفاظ کا ایک ہجوم ہے ایک سیلاب ہے جو اُٹ رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں میں بھی لکھنا شروع کر دوں۔“

مسرور نے پروفیسر عادل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سطروں اور رنگوں میں کیا فرق ہے۔ مصور کو الفاظ کے سہارے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟“ پروفیسر عادل نے اس سے پوچھا۔

”پتا نہیں سر لیکن مجھے لگتا ہے میں کسی دن اہل پڑوں گا۔ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ جاؤں گا۔ وہ سب کچھ جس نے میرے اندر اہل چل بچا رکھی ہے۔ اگر اس سب کو باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا تو.....“

”تم مصور ہو..... اپنے اندر کے ہجوم کو رنگوں میں سمیٹ لو۔“

”شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔ شاید میں اتنا بڑا مصور کبھی نہ بن سکوں گا کہ اپنے اندر کے دکھ کو اپنے اندر کی خوشیوں کو رنگوں کی زبان دے سکوں۔“

”لکھو یار۔ ضرور لکھو۔ پروفیسر کی بات پر کان مت دھرو۔“ مجتبیٰ حیدر نے پروفیسر عادل سے اختلاف کیا۔

”کئی بڑے مصوروں نے لکھا اور خوب لکھا۔ رنگ کہیں پڑھو کا بھی دے جاتے ہیں۔ آدمی اپنے اندر کے عذاب کو رنگوں کی زبان نہیں دے سکتا تو قلم کا سہارا لے لیتا ہے۔ اب دیکھو نا ڈالی نے چار پانچ کتابیں لکھیں۔ پکاسو نے نظمیں لکھیں ڈراما لکھا۔“

پروفیسر عادل سر جھکا کر سرگرمی سے لگانے لگے۔ جب انہیں کسی کی بات سے اختلاف ہوتا تھا اور وہ بحث نہیں کرنا چاہتے تھے تو یونہی سرگرمی میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔

”سر۔“ مسرور ایک دم پر جوش دکھائی دینے لگا ”میرے اندر بے شمار کہانیاں ہیں جو باہر آنے کو بے تاب ہیں مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ جیسے یہ کہانیاں باہر آئیں گی تو میرا اپنا آپ ختم ہو جائے گا۔ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“

”لکھو یار لکھو۔ یہ منٹو اور عصمت چغتائی کا دور نہیں ہے۔ ایک اچھے مصنف کو معاشرے کے گھٹاؤ نے پہلوؤں کو ایک سپورڈ کرنے کی جرأت ہونی چاہیے۔“

”چاہے یہ گھٹاؤ نے پہلو معاشرے میں مزید بگاڑ کا سبب بنیں۔“ پروفیسر عادل نے آہستگی سے کہا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہوتا شاید۔“ حافظ صاحب نے بھی گفتگو میں دخل دیا۔

بائے داوے تم نے اب تک معاشرے کے کتنے پہلوؤں کو انکسپوز کیا ہے؟“ پروفیسر عادل اب پوری طرح جتنی حیدر کی طرف متوجہ تھے۔

”میں نے۔“ جتنی نے اپنی طرف اشارہ کیا ”میں تو محبتوں کا داعی ہوں۔ محبتوں کی کہانیاں لکھتا ہوں۔ محبتوں کا درس دیتا ہوں۔“

”یہ محبت ہے کہاں۔ کبھی نظر آئی تمہیں، کبھی ملی تمہیں؟“ پروفیسر عادل تلخ ہونے لگے۔

”کبھی کبھی وہ یونہی تلخ ہونے لگتے تھے۔ ان کے ہونٹ زہر میں بھگ جاتے تھے۔ زبان سے انکارے گرتے۔“

”یہ جن محبتوں کا تم پر چار کرتے ہونا جتنی حیدر۔ کیا یہ محبتیں ہیں کہیں مجھے یہ بتائیں کہاں ہیں یہ محبتیں اس دنیا میں۔ یہ محبتیں دھوکا ہیں، فریب ہیں، ریا کاری ہیں۔ تم جھوٹ بولتے ہو جتنی حیدر اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دھوکا دے رہے ہو۔ دیوانا بنا رہے ہو لوگوں کو۔“

”نہیں پروفیسر۔“ جتنی حیدر سنجیدہ ہو گئے ”محبتیں دھوکا نہیں ہوتی ہیں اور جو دھوکا ہوتا ہے وہ محبتیں نہیں ہوتیں، کچھ اور ہوتا ہے۔“

”ٹھیک..... لیکن جتنی حیدر مجھے یہ بتاؤ تمہیں کبھی ایسی محبت نہیں ملی جو دھوکا نہ ہو، فریب نہ ہو جس کے پیچھے کوئی غرض نہ ہو، کوئی لالچ نہ ہو۔ کوئی مطلب نہ ہو۔“

”ممکن ہے مجھے ایسی محبت نہ ملی ہو لیکن میں محبت کے وجود کا منکر نہیں ہوں۔ اس دنیا میں ایسی بے غرض محبتیں ہیں اور کئی لوگ ہیں جنہیں یہ محبتیں حاصل ہیں۔“

”لیکن یہ جو اتنی خوبصورت دنیا تمہارے ناولوں میں نظر آتی ہے، یہ محض تخیلاتی ہے۔ اتنی شدید اور خالص محبتیں تخیل کی دنیا میں تو تخلیق کی جاسکتی ہیں لیکن حقائق کی دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔“

مان لو..... مان لو یار۔“

”جے میری جان..... ہے ان محبتوں کا وجود۔ اتنا دافرنہ سہی جتنا میری کتابوں میں ہے لیکن ہے ضرور۔“ پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ جتنی حیدر نے ان کی مسکراہٹ میں

چھپے طنز کو دیکھا اور سائنڈ ٹیبل سے ایک کتاب اٹھائی۔

”یہ فرمان صدیقی کی کتاب ہے۔“ مستعار لیے ہوئے گھر ”بقول تمہارے ادب کا شاہکار..... اس کتاب میں بڑے ادارے لکھے گئے۔ ادبی محفلوں میں اسے سراہا گیا۔ بڑے بڑے مضامین پڑھے گئے مگر اب تک اس کا پہلا ایڈیشن ہی بک شاپس پر پڑا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی میرا ناول ”بہار رست“ بھی مارکیٹ میں آیا۔ اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔“

”ہوں۔“ پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر ابھی تک وہی طنزیہ مسکراہٹ تھی ”تمہارے ناول نئی نسل کے لیے بہت اچھا ٹریکیو لائزر تو ہو سکتے ہیں۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز حقائق کی دنیا میں نہیں مل رہی وہ تمہارے ناولوں میں نظر آتی ہے تو نئی نسل جو محبتوں سے نا آشنا ہے اس میں بے پناہ دلچسپی لے رہی ہے۔“

”پروفیسر، یہ بحث طول کھینچ جائے گی۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ محبتوں کا وجود ہے اور یہ دنیا محبتوں کی وجہ سے ہی قائم ہے۔ اگر محبت کا وجود نہ ہوتا تو یہ دنیا بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتی۔ ختم ہو جاتی اور.....“

”السلام علیکم۔“ ایک ساتھ دو تین آوازیں آئیں تو جتنی نے بات ادھوری چھوڑ کے دروازے کی طرف دیکھا۔

”آئیے آئیے حضرات، آپ ہی کا انتظار تھا۔“

ارسلان، ارسلان اور افروز کے ساتھ آج ایک نیا چہرہ بھی تھا۔ پروفیسر عادل نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سر، یہ ڈاکٹر شہریار ہیں۔ میرے کزن۔“ ارسلان نے تعارف کرایا ”انہیں آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔“

”موسٹ ویلکم۔“ پروفیسر عادل نے ہاتھ آگے بڑھایا ”ایک لوگوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔“

”پروفیسر ہماری بحث ابھی جاری ہے۔ فی الحال اسے پینڈنگ میں ڈال دیجیے ہیں۔“

”میں ہاروں گا نہیں۔“

پروفیسر عادل نے قہقہہ لگایا اور نئے آنے والوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔



مس مہرین کا پیریڈ اینڈ کرنے کے بعد مریم باہرنگی تو اس کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے روح پر کوئی بھاری بوجھ آگرا ہو۔ مس مہرین نے کیا پڑھایا تھا، کیا سمجھایا تھا، سب اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ آج کالج ہی نہ آتی مگر مگر..... مگر میں رہ کر بھی کیا کرتی۔ خواہ خواہ کی ٹینشن، ماما آتے جاتے اسے کچھ دیتی رہتیں۔

”پتا نہیں یہ ماما کو کیا ہو گیا۔ دو تین سال پہلے تک تو ایسی نہیں تھیں اور پاپا بھی انہیں کچھ نہیں کہتے۔“

”سبس مین۔“

جب رات شرجیل مرزا نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا تو پاؤں دیکھ رہے تھے لیکن نظریں چرا کر دوسری

طرف دیکھنے لگے تھے۔

’کیسے باپ ہیں یہ۔‘ شرجیل مرزا سے زیادہ اسے باپ پر غصہ تھا۔

پاپا ہی کی وجہ سے وہ رات کی پارٹی میں شریک ہوئی تھی۔ ورنہ اسے ماما کی ان پارٹیوں اور ڈنرز سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ماما کے مہمانوں میں سے اکثر اسے برے لگتے تھے۔

بھوکے گدھ۔

نظروں ہی نظروں میں کھا جانے والے۔

چنانچہ پھر بھی ماما ان سے کیوں تعلقات رکھے ہوئے ہیں۔ ایک بار اس نے پوچھ بھی لیا تھا۔

’تعلق بھانے پڑتے ہیں میری جان۔‘ ماما نے اسے سمجھایا تھا۔

ان میں سے اکثر بیوی بچوں والے بھی تھے لیکن ان کی نظروں کی بھوک ختم نہیں ہوتی تھی۔

’بیٹا لوگ تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں۔ تم اس گھر کی بڑی بیٹی ہو۔ تمہاری ماما کو کتنی شرمندگی

ہوتی ہے جب انہیں بہانہ بنانا پڑتا ہے۔‘ پاپا نے اسے سمجھایا تھا۔

’مگر پاپا! یہ تو آپ لوگوں کے ملنے والے ہیں۔ ماما کے آپ کے۔ میرا کیا کام؟‘

’پرسوں بھی مسز آفندی تمہارا پوچھ رہی تھیں اور میڈم زگس کی بیٹی نے کئی بار تمہارا پوچھا تھا۔‘

’اچھا۔‘

میڈم زگس کی بیٹی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کی باتیں بھی اسے بہت پسند تھیں۔ میٹرک میں

پڑھتی تھی بہت مزے کی باتیں کرتی تھی لیکن بہت کیوٹ تھی اور صرف پاپا کی خاطر وہ رات کے فنکشن

میں شریک ہوئی تھی اور پاپا نے شرجیل مرزا کو اس کا ہاتھ پکڑتے دیکھا تھا اور نظریں چرا لیں۔

اور ماما.....

جانے کیسی ماں تھیں کہ بجائے اس کا ساتھ دینے کے الٹا اسے ڈانٹ رہی تھیں کہ وہ شرجیل مرزا

کی حوصلہ افزائی کیوں نہیں کرتی۔ مائیں تو بیٹیوں کو چھپا چھپا کر رکھتی ہیں۔

اور ماما.....

شاید وقت کے ساتھ غیرت و حمیت کے معنی بھی بدل گئے۔ اب جو اپنی کیٹس میں شامل ہے

وہ پہلے بے غیرتی میں شمار ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے تک سب کچھ کتنا صحیح تھا۔

پاپا صبح اپنے دفتر چلے جاتے تھے۔ ماما گھر پر رہتیں۔ انہوں نے ٹی وی پر کام کرنا اس وقت

چھوڑا تھا جب مریم چھ سال کی تھی اور عاشی سال بھر کی تھی۔ مریم نے ان کے پرانے انٹرویوز کی فائل

کئی بار دیکھی تھی اور ان کے انٹرویوز پڑھے تھے۔

’میری بچیاں بڑی ہو رہی ہیں اور انہیں میری ضرورت ہے۔‘ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو

میں کہا تھا ’ورنہ مجھے تو عثمان نے کبھی بھی ٹی وی پر کام کرنے سے منع نہیں کیا۔‘

اور پاپا بھلا منع بھی کیسے کر سکتے تھے۔ ان کا کنٹرول ویسے بھی ماما کے ہاتھ میں تھا۔

’روبوٹ۔‘ اس نے زیر لب کہا اور واپس لیب میں جا کر بیٹھ گئی۔

اب مسز اماں کا پیریلہ تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنی غیر حاضر دماغی کی وجہ سے مسز اماں کی ڈانٹ

کھائے۔ مسز اماں کو تو بس موقع چاہیے ہوتا تھا۔ ذرا کسی طالبہ سے کوئی غلطی ہوتی تو وہ فوراً تیز آواز

میں طنز کے تیر برسائے لگتی تھیں اور پھر وقفے وقفے سے ان کا لیکچر جاری رہتا تھا۔ آج اگر وہ ان کا

پیریلہ اینڈ کرنی تو یقیناً مسز اماں کی نظر کرم اس پر ہوتی۔

’اچھا تو بی بی کس تصور میں کم ہو جو لیکچر کی طرف دھیان نہیں۔ ایسا ہی تصورات میں بسے رہنے کا

شوق ہے تو بھی گھر بیٹھو..... شادی کرو گھر بساؤ۔ یہاں کیا کرنے آئی ہو۔ کیوں ماں باپ کا پیسہ ضائع

کرتی ہو۔‘

ایک تو ان کی کانوں کو پھاڑتی آواز اوپر سے ایسے کاٹ دار جیسے سننے کی تاب مریم میں کم از کم

نہیں تھی ’چنانچہ ایسے جلع بننے لوگ محکمہ تعلیم میں کیوں آجاتے ہیں۔‘ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل

اسٹول پر رکھ دی۔

نہب عثمان احمد نے اگرچہ ماڈلنگ کرنا اور ٹی وی پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن پھر بھی ان کی سوشل

ایکٹیوٹیز بہت تھیں۔ وہ خواتین کی کئی تنظیموں کی ممبر تھیں۔ ایک این جی او خود چلا رہی تھیں۔ کلب میں

باقاعدگی سے جاتی تھیں۔

عثمان احمد فارغ ہوتے تو دونوں کی اکثر شامیں جیم خانے میں گزرتیں۔ اس لیے وہ بچوں کو بہت

کم وقت دے پاتی تھیں اور مریم ان سے زیادہ عثمان احمد کے قریب تھی۔ وہ اگر کبھی گھر آجاتے تو

اسے وقت دیتے تھے۔ اس سے اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی

دیکھتے تھے اور کبھی اس کے ضد کرنے پر اس کے ساتھ کوئی گیم وغیرہ بھی کھیل لیتے تھے لیکن پھر بھی وہ

نہب عثمان احمد کی محسوس کرتی تھی۔

عاشی اس سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ پاپا گھر پر نہ ہوتے تو وہ سارا وقت اس کی نرسری میں گزارتی

تھی۔ اسے گود میں لینے کی کوشش کرتی۔ اسے ہنساتی۔ آیا سے اس کا فیڈر لے کر خود اسے فیڈ کرنے کی

کوشش کرتی۔ وہ سورہی ہوتی تو اس کی کاٹ کے پاس بیٹھی اسے سکتی رہتی۔ اسے اپنی اس بے حد گلہابی

رنگت والی بہن سے بہت پیار تھا لیکن ماما نے عاشی کو جب وہ چار سال کی ہوئی تو مری کا لونٹ میں

داخل کرادیا تھا۔

وہ اکیلی بولا بولا پھرتی۔ اپنے کمرے میں چھپ چھپ کر روتی۔ وہ اسکول میں بھی اپنی کم گوئی کی وجہ سے کسی کو اپنا دوست نہ بنا سکی تھی۔ اس کی دوست بھی تو صرف عاشی تھی اور پتا نہیں ماما نے عاشی کو اس سے اتنا دور کیوں کر دیا تھا۔

اسے اداس اور تنہا دیکھ کر عثمان احمد نے دو ایک بار دبا دبا احتجاج کیا تھا۔

”زین، مومو عاشی کے بغیر اداس رہتی ہے بہت اور خاموش ہو گئی ہے۔“

”تو“ زینب احمد نے تھنویں اچکا کر انہیں دیکھا تھا۔

”عاشی بھی وہاں ایڈ جسٹ نہیں کر رہی ہے۔“

”ہو جائے گی ایڈ جسٹ۔ میں تین سال کی تھی جب میرے ڈیڈی نے مجھے مری کانوٹ بھیج دیا تھا۔ پہلے ہی مومو مری نے بھیج کر پچھتا رہی ہوں۔ یہ بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ذرا سا بھی کانفیڈنس نہیں ہے اس میں۔ کوئی مہمان آتا ہے تو چھپ جاتی ہے۔“

”پھر اسے بھی وہاں بھیج دو۔“

”اب..... اب یہ یہاں سیٹ ہے۔ وہاں نہیں چل سکے گی۔“ انہوں نے بات ختم کر دی تھی۔

چھٹیوں میں جب عاشی گھر آتی تو وہ دبا دبا انداز اس کے گرد گھومتی رہتی تھی لیکن عاشی بہت خاموش ہو گئی تھی۔ وہ بہت بولتی لیکن وہ چپ بیٹھی رہتی تھی۔ کتنی اجنبی ہو گئی تھی وہ۔

”پاپا عاشی بہت بدل گئی ہے۔“ وہ عثمان احمد سے شکایت کرتی ”اب وہ پہلے کی طرح مجھ سے کھیلتی بھی نہیں، باتیں بھی نہیں کرتی۔“

”بیٹا تم بڑی ہونا اس لیے وہ تم سے جھجکے گی ہے۔ تم تو باجی ہو اس کی۔“

ان دنوں عاشی کے اندر ایک عجیب سا غور آ گیا تھا پھر اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ نخوت سے سراٹھا کر چلتی تھی۔ زینب احمد اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور مریم تو جیسے اس کی چھٹیوں میں زندہ ہو جاتی۔

اس کا اسکول جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری ہوتی تھی۔ ماما چھٹی نہیں کرنے دیتی تھیں۔

وہ چلی جاتی تو پھر وہی اداسیاں اور ایسے ہی اداس لمحوں میں ایک بار پھر اس نے دعا مانگی تھی۔

”کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کا کوئی اور بہن بھائی بھی ہوتا۔“

شاید وہ کوئی قبولیت کی گمڑی تھی کہ جب وہ تیرہ سال کی تھی اور عاشی آٹھ سال کی کہ نینا چلی

آئی۔ وہ دونوں بے تحاشا خوش تھیں اور نینا کے بعد پوریاں آ گئے۔

کہاں تو زینب عثمان بچوں سے الگ تھیں۔ عاشی کی پیدائش پر انہوں نے خوب واویلا کیا تھا

اور اعلان کر دیا تھا کہ اب مزید بچہ نہیں چاہیے اور کہاں اب نینا اور تیمور کا استقبال بڑی خوش دلی سے

کیا تھا۔ ان کی سہیلیاں اکثر حیرت کا اظہار کرتی تھیں۔

”بس اللہ کی دین ہے۔“ وہ مسکرا دیتیں۔

ایک بار مریم نے مسز آفندی کو کہتے سنا تھا۔ وہ شاید میڈم نرس کو بتا رہی تھیں۔

”در اصل زین کو عثمان سے خطرہ ہو چلا تھا کہ کہیں وہ زنجیریں نہ توڑ لے۔ وہ اپنی آفس سیکریٹری

میں بہت انوالو ہو رہا تھا۔ بس زینب نے کھٹا کھٹ بچے پیدا کر کے اسے باندھ لیا۔ اب وہ زین کو

چھوڑنے سے پہلے..... کچھ سوچے گا ضرور۔“

تب اسے مسز آفندی کی بات اچھی طرح سمجھ نہیں آئی تھی لیکن پھر بہت عرصے بعد ایک بار جب

ماما کوڈ پریشن ہو رہا تھا اور وہ بہت چیخ کر بول رہی تھیں اور پاپا کو ان کی آفس سیکریٹری کے حوالے سے

بہت کچھ کہہ رہی تھیں اسے ادراک ہوا تھا کہ مسز آفندی کی بات کا کیا مطلب تھا۔

تینوں ماما کی نسبت اس سے زیادہ قریب تھے۔

تیمور میں تو اس کی جان تھی۔ وہ چھوٹا سا تھا لیکن اسے بڑا مضبوط سہارا لگتا تھا۔ یوں جیسے اگر کوئی

طوفان آیا تو تیمور اسے اور عاشی کو اس طوفان سے بچالے گا۔

اب ماما نے جاب کر لی تھی اور وہ بھی شریں مرزا جیسے غلیظ آدمی کے پاس۔

ماما جتنا اس کی خاطر مدارات کرتیں اتنا ہی یہ شخص اسے زہر لگتا۔ بظاہر اس میں ایسی کوئی خامی بھی

نہ تھی۔ انتالیس چالیس سال کا اسمارٹ آدمی تھا۔ دیکھنے میں اپنی عمر سے بہت چھوٹا لگتا تھا۔ بہت خوش

لباس تھا، گفتگو اچھی کرتا تھا۔ ماما تو اس کے آگے بچھ جاتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ جب وہ آئے تو وہ بھی

اسے انٹرٹین کیا کرے۔

مگر وہ یوں دیکھتا تھا جیسے ایک سرے کر رہا ہو۔

چڑ آتی تھی اسے اور رات کو کتنی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”افوہ.....“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

سر میں درد کی ایک ٹیس سی انھی۔

پچھلے کئی دنوں سے یہ سرد درد اس کی جان کو چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا وہ ڈپنسرت کوئی

پین کمرے کر کھالے لیکن پھر اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔

”خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

پین کمرے کر بھی تھک گئی تھی۔ اس نے آنکھیں موند کر سر کرسی کی پشت سے ٹیک لیا۔

یعنی روشنی اور میرا اسے ڈھونڈتی ہوئی لیب میں آ گئیں۔

”مومو، تم یہاں چھپی بیٹھی ہو اور ہم تمہیں پورے کالج میں تلاش کر چکے ہیں۔“

”تم نے مسز امان کا پیئرڈ انڈینڈ نہیں کیا۔“ مریم نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

”مزمناں کا پیریدہ ختم ہو چکا ہے خاتون۔ آپ کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔“

”اچھا۔۔۔ میں شاید سو گئی تھی۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔“

”چھٹی کر لیتی تھی۔“ یعنی نے کہا۔

”بس پریکٹیکل کی وجہ سے نہیں کی۔ مزمناں نے کچھ پڑھایا۔“

”پڑھایا کم سنا یا زیادہ۔“ میرا نے جواب دیا۔

”کیا.....؟“ اس نے پوچھا۔

”کھری کھری سنائیں۔“ میرا نے کہا۔ ”مثلاً یہ کہ آج کل کی لڑکیاں انتہائی فضول ہیں۔ ادب آداب نام کو نہیں۔ فلمیں دیکھ کر تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔ تہذیب سے نا آشنا ہیں۔ باتوں کی ذہنی ہیں۔ کام کی ٹنگی ہیں۔“

”بس باس۔“ مریم نے ہاتھ اٹھایا ”ٹائٹل سے ساری کہانی سمجھ میں آگئی ہے۔“

”اچھا“ اب یہاں لیب میں ہی مرقی رہو گی یا کینٹین بھی چلنا ہے۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہوں کی پوری فوج دوڑ رہی ہے۔“

روٹی کو ہر وقت بھوک لگتی رہتی تھی حالانکہ وہ دیکھنے میں سب سے کمزور تھی۔

”مری کیوں جا رہی ہو۔ دومنٹ سانس تو لینے دو۔“

یعنی ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”میرا پیٹ تو مزمناں کے لیکچر سے ہی بھر گیا تھا۔ مزید کچھ کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔“

”اچھا تو تم دونوں جاؤ ٹھونس آؤ جا کر۔ ہم دونوں یہاں ہی بیٹھے ہیں۔“

”تمہیں پتا ہے مس مہرین خواجہ لیب میں بیٹھنے سے منع کرتی ہیں۔ تم بھی چلو نا ہمارے ساتھ۔“

وہیں کینٹین میں جا کر بیٹھے ہیں۔ اگلے دونوں پیریڈ فری ہیں۔ مزمرا چاہتیں آئی ہیں۔ ”میرا نے بتایا۔“

”نہیں یا تم جاؤ۔“ مریم نے کہا ”رہی مس مہرین کی بات تو وہ چھٹی پر چلی گئی ہیں۔“

”تمہارے لیے سوسے اور کوک لے آئیں۔“

”لے آنا تمہارا دل چاہے تو لیکن ہم اب یہاں سے انھیں گے نہیں۔ مونی کے سر میں درد ہے

اور مجھے کچھ نوٹس مکمل کرنے ہیں۔“

روٹی اور میرا چلی گئیں تو یعنی نے غور سے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا ”تم کچھ پریشان ہو مریم؟“

”نہیں تو۔“ وہ مسکرائی ”بتایا ہے نا کہ سر میں درد ہے۔“

”ہم تم اچھے دوست نہیں ہیں کیا؟“ یعنی نے پوچھا۔

”وائے ناٹ۔“

”پھر دوستوں سے کیوں چھپاتی ہو مریم۔ میں کئی دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں۔ تم بہت اپ سیٹ لگتی ہو۔“

”نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”مریم میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ ممکن ہے میں تمہاری پریشانی دور نہ کر سکوں لیکن دل کا بوجھ ہلکا

ہو جائے گا۔“

”بلیوی یعنی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ ماما جاب کرتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ وہ جاب نہ کریں۔ گھر

میں رہا کریں۔“

”اوہ۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے دوست۔ آنٹی کو اگر جاب کا شوق ہے تو تمہیں کیا۔ اکثر خواتین کو

جاب کا شوق ہوتا ہے بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ جاب کر لیتی ہیں۔ اب ظاہر ہے تمہیں ان کی زیادہ

ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا تمہاری ماما بھی جاب کرتی ہیں؟“

”اوہ نو۔“ یعنی ہنس پڑی ”میری امی تو ایک سادہ سی دیہاتی خاتون ہیں۔ وہ تو اباسی کی جاب کر رہی ہیں۔“

”کبھی مجھے ان سے ملواؤ نا۔“

”تم چلو نا چھٹیوں میں گاؤں میرے ساتھ۔“

”کیا وہ تمہیں ہاسل میں ملے نہیں آتیں؟“

”نہیں وہ کبھی گاؤں سے باہر نکلی ہی نہیں ہیں۔ انہیں شہروں سے خوف آتا ہے۔ وہ کہتی ہیں شہر اچھے

بھلے لوگوں کو ڈس لیتے ہیں، کھا جاتے ہیں۔“

”وہ ایسا کیوں کہتی ہیں؟“ مریم نے حیرت سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ یعنی نے نفی میں سر ہلایا اور عاشی کے متعلق پوچھنے لگی ”عاشی واپس مری چلی گئی ہے۔“

”نہیں۔“ مریم نے بتایا ”وہ وہاں ہوم سک فیل کرتی ہے۔ بیمار ہو جاتی ہے۔ ان کے پرنسپل نے کہا

کہ اسے لے جائیں وہاں جاتے ہی اسے ٹیپر چڑھ جاتا ہے۔ ڈائمنٹک ہونے لگتی ہے۔ یہاں آتی ہے تو

ٹھیک ہو جاتی ہے۔ مجبوراً ماما کو اسے یہاں داخل کروانا پڑا ہے۔ کیٹھنڈرل میں کروایا ہے۔ مور اور نینا بھی

وہاں ہی پڑھتے ہیں۔ ویسے ماما کو بہت دکھ ہے اس کے واپس آنے کا۔ ماما کی خواہش تھی کہ وہ وہاں سے

ہی سینئر کیئر جرح کرے۔ موز اور نینا کو تو پاپا نے جانے ہی نہیں دیا کہ جب یہاں اتنے اچھے اسکول ہیں تو

پھر مری جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے تو ماما اپنی مرضی کرتی ہیں لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے پاپا کی یہ

بات مان لی۔ شاید وہ خود بھی مور سے جدا نہیں رہ سکتیں۔ مور سے وہ بہت پیار کرتی ہیں۔“

”مائیں سارے بچوں سے یکساں پیار کرتی ہیں لیکن مور چھوٹا ہے نا اس لیے تمہیں لگا کہ آنٹی اس

سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔“

”میں جیلس ہو کر نہیں کہہ رہی ہوں۔ ویسے ہی بتایا ہے تمہیں۔“ مریم نے وضاحت کی۔

”ایک تھال موتیوں سے بھرا۔ سر کے اوپر اوندھا کھڑا۔“

”ہمیں‘ رضی کو سمجھ نہیں ہے۔ چاچا کہتے ہیں وہ بے وقوف ہے۔ اس کا ستارا تو میں ڈھونڈوں گا۔ وہ نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔“

”اچھا تو وہ والا۔ وہ ادھر کونے والا ستارا رضی کا ہو گیا۔ یہ میرا تمہارے ساتھ والا۔ ہم دونوں بھائی ہیں نا۔ دیکھو ابھی بھی ساتھ ساتھ ہماری چار پائیاں ہیں۔“

لیکن وہ بھانڈا کی باتوں میں نہیں آتا تھا۔

”نہیں رضی اتنی دورا کیلی ڈرے گی۔ آپ تو بڑے ہیں نا۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا۔ آپ وہی لے لیں۔“

اور پھر کیا کیا تھا اس نے..... رضی کو اکیلا چھوڑ دیا اکیلا کر دیا۔ عمر بھر ساتھ بھانڈا کی قسمیں کھا کر مگر گیا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ بھانڈا ساتھ والی چار پائی پر سو رہے تھے اور بھابھو نیچے صحن میں تھیں۔ انہوں نے اس کا بستر کمرے میں بچھایا تھا لیکن اس نے کہا۔ کہ وہ چھت پر سوئے گا اور پھر چھت پر اس نے چار پائی پر گدا بھی نہیں بچھانے دیا۔

مذمتیں ہی ہو گئی تھیں یوں بان کی کھر در چار پائی پر سوئے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بھابھو نے در و در چادر بچھا دی تھی۔ بان کا کھر دلس اس کے جسم کو بہت اچھا لگا۔ آخری راتوں کا چاند تھا اور آسمان پر تارے خوب جگمگا رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے گہری لمبی سانس لے کر اس ہوا کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

کتنا صبح کہتا تھا صحن وقار۔ اپنے علاقے کی ہوا کی خوشبو کا مزہ ہی اور ہے۔ روح میں اترتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو..... اس نے پھر کروٹ بدلی تو چوہدری نثار نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”سکندر نیند نہیں آرہی ہے نا۔ تیری بھابھو نے کہا تو تھا کہ نیچے سو جا۔ تجھے کہاں عادت رہی ہوگی یوں کھلی چھت پر سونے کی۔ پھر کھر در چار پائی پر نیند نہیں آئے گی تجھے۔ پتر نیچے بچوں کے کمرے میں میٹر لیں بچھے ہیں۔ مجھے تو کمروں میں نیند نہیں آتی۔ دم گھٹتا ہے اس موسم میں مہس ہو جاتا ہے اندر۔ تو چلا جا نیچے۔“

”نہیں بھائی میں یہیں سوؤں گا۔ آجائے گی نیند آپ سوئیں۔“

”تیری مرضی۔“ بھانڈا نے کروٹ بدلی۔

”آپ کو کیا پتا میٹر لیں کیا آگ لگاتے ہیں۔ تھک گیا ہوں ان میٹر لیں بچھے بستروں پر سو سو کر۔ انہوں نے تو میرا جسم ہی نہیں روح بھی گلا دی ہے۔ اندر سے سزا مند اٹھنے لگی ہے۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

ایک ستارا ٹوٹ کر گم ہو گیا تھا۔

”یہ تارے کیوں ٹوٹتے ہیں ماں جی؟“ وہ اکثر بچپن میں پوچھا کرتا تھا۔

”بیٹا یہ فرشتوں کے گرز ہیں۔ جب شیطان آسمان پر جاتا ہے اور چوری چوری فرشتوں کی باتیں سنتا ہے تو فرشتے اسے اپنے آگ کے گرز مارتے ہیں۔“

”اچھا ماں جی کیا فرشتے بھی باتیں کرتے ہیں۔“ اسے حیرت ہوتی ”پروہ کیا باتیں کرتے ہوں گے

ماں جی؟“

”پتا نہیں پتر میں تو جاہل ان پڑھ ہوں میں کیا جانوں۔“ ماں جی کو جب کوئی جواب نہ سوجھتا تو یوں ہی کہہ کر جان چھڑا لیا کرتی تھیں۔ پھر وہ بابا کے کان کھانے لگتا اور بابا کو جواب نہ سوجھتا تو وہ بھانڈا کو پکڑ لیتا۔ بھانڈا اس سے پانچ سال ہی بڑے تھے لیکن بزرگوں کی طرح اسے ٹریٹ کرتے تھے۔

اور چھت پر لیٹے لیٹے اس نے بھانڈا اور آپو غنیر سے کتنی کہانیاں سنی تھیں۔

بندر یا شہزادی کی۔

نیلی نیلی داڑھی والے بوڑھے کی۔

سنہری پری کی۔

اور کہانیاں سنتے سنتے جب اوپر آسمان پر کوئی موسی سیارا نظر آتا تو وہ سب کچھ بھول کر اسے دیکھنے لگتا تھا۔ لمحوں میں وہ دھوپ کی لکیر چھوڑتا نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔ پہلی بار جب غنیر نے اسے اڑن طشتری والی کہانی سنائی تھی تو اس نے بھانڈا کو چپکے سے بتایا تھا کہ رات کو کوئی باراں نے آسمان پر اڑن طشتریاں دیکھی ہیں اور جب ایک رات اس نے بھانڈا کو سوتے سے جگا کر دکھایا تھا کہ وہ دیکھیں اڑن طشتری بھاگی جا رہی ہے تو بھانڈا نے اسے بتایا تھا کہ بے وقوف یہ موسی سیارے ہیں۔ زمین سے چھوڑے جاتے ہیں موسم کا حال معلوم کرنے کے لیے۔

کاش وقت وہیں کہیں ٹھہر جاتا۔ کتنے اچھے دن تھے وہ۔ خوشیوں سے بھرے۔

ہر غم اور فکر سے بے نیاز وہ سارا دن گلیوں میں کھیلتا پھرتا تھا۔

اسے یہ کھیل کتنے پسند تھے۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ جب اس کے بچے ہوں گے تو وہ انہیں بتائے گا کہ بچپن میں وہ کیا کھیل کھیلا کرتا تھا اور اس کے بچے اپنی خوبصورت آنکھوں میں حیرت بھرے اس کی باتیں سنیں گے۔

نئے زمانے وڈیو اور کمپیوٹرز کے دور کے بچے۔

انہیں بھلا ان کھیلوں کی لذت کا کیا پتا۔

جب پٹھو گرم کھیلنے ہوئے کسی کی پیٹھ پر زور سے بال پڑتا تھا۔ جب بھاگتے ہوئے چوکر کو پکڑا جاتا تھا اور جب سرخ چروں کے ساتھ وہ مخالف ٹیم کے کسی فرد کو اپنی طرف کھینچ کر لے آتے تھے تو کتنا مزہ آتا تھا۔

جب ایلکی ڈالتے ہوئے آنکھوں میں ستارے ناچ اٹھتے تھے اور ارد گرد اوپر نیچے سب کچھ دائروں میں گھومنے لگتا تھا تو.....

وہ رضوانہ کے ساتھ ایلکی ڈالتا تو وہ رونے لگتی تھی۔

”تم لڑکوں والے کھیل کھیلو۔“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ ایٹکی ڈالوں گا۔“

”تم مجھے گرا دو گے، ہاتھ چھوڑ دو گے۔“

”نہیں گراؤں گا ہاتھ بھی نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ وعدہ کرتا لیکن پھر گھومتے گھومتے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک بار تو اس کا سر دیوار کے کونے سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا اور رضوانہ کتنا ڈرتی تھی۔ سچ جج اس نے زندگی کے میلے میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس کی آنکھوں کی تہہ میں نمی سی گھلنے لگی تو اس نے آنکھیں موند لیں۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگا۔

ابھی وہ پورے پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ بابا نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔ بھانڈا کے ساتھ وہ بھی تانگے پر بیٹھ کر قصبے کے اسکول میں جانے لگا تھا۔ بابا نے اسے ایک انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا تھا اور جب وہ ”ٹوٹیکل ٹوٹیکل لائل اسٹارڈ او“ بابلیک شپ“ اشارے کر کے سنا تا تو بابا بہت خوش ہوتے اور رضوانہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت اتر آتی۔ وہ اسے حیران دیکھ کر اپنی کاپیاں اور ڈرائنگ بکس دکھاتا۔

”مجھے دے دو۔ میں بھی رنگ بھروں گی۔“

”ابھی تم چھوٹی ہونا، جب تم بڑی ہو جاؤ گی، میرے جتنی تو پھر چاچا تمہیں بھی اسکول میں داخل کروادیں گے۔“

”نہیں! ابا کہتے ہیں، لڑکیاں نہیں پڑھتی ہیں۔“

”میں ابا سے کہوں گا اور وہ چاچا سے کہیں گے تو وہ تمہیں ضرور اسکول بھیجیں گے۔“ اور اس کی سفارش پر رضی بھی گاؤں کے اسکول جانے لگی تھی۔

گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری اور لڑکوں کا مڈل اسکول تھا لیکن وہاں اساتذہ کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ اس لیے بابا نے ان دونوں کو قصبے کے اسکول میں داخل کروایا تھا اور رضوانہ تو لڑکی تھی اس نے زیادہ پڑھ کر کیا کرنا تھا اس لیے چاچا نے اسے گاؤں کے اسکول میں ہی داخل کروایا تھا حالانکہ اس نے بابا کو کتنا بتایا تھا کہ اس کی کلاس میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں لیکن بابا نے کہا تھا۔

”پڑھتیرے چاچا کی مرضی۔“

تب اس نے مایوس ہو کر چوری چوری اپنی ڈرائنگ بکس اور کھرا سے دے دیے تھے اور خود بابا سے کہہ کر کہ اس کی بکس کہیں گم ہو گئی ہیں، خودی لے لی تھیں۔

وقت کتنی جلدی سے گزر جاتا ہے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب کتنے ماہ و سال گزر گئے تھے وہ میٹرک کر چکا

تھا اور رضوانہ آٹھویں میں آگئی تھی۔ پرائمری اسکول اب مڈل بن گیا تھا۔ اس روز وہ چاچی کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔ چاچی پچھلے چند ماہ سے بیمار تھیں۔ چاچا کئی بار اسے شہر کے اسپتال میں لے کر جا چکا تھا لیکن ڈاکٹروں کو اس کی بیماری سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ بس وہ دوائیں دے کر بھیج دیتے اور چاچی تھی کہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

چاچی صحن میں پیچھی چار پائی پر نیکی سے فیک لگائے بیٹھی تھی اور رضوانہ اس کے پاس بیٹھی اسے دلہ کھلا رہی تھی۔

”السلام علیکم چاچی۔“

”آؤ سکندر پتر آؤ۔“

چاچی نے محبت سے کہا۔ اس نے اپنی سی نظر رضوانہ پر ڈالی تھی لیکن پھر جیسے یہ نظر اس پر سے ہٹا بھول گئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔

اتنے لمبے اتنے سیاہ بال۔

اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”ارے یہ اتنی بڑی ہو گئی ہے۔“ ایک دم ہی اسے احساس ہوا حالانکہ وہ اسے ہفتے میں ایک بار تو ضرور دیکھتا تھا لیکن آج وہ اسے بڑی اجنبی، بڑی نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ اسے لگا کہ جیسے ایٹکی ڈالتے ڈالتے وہ ایک دم بڑی ہو گئی ہو کہانیوں کی طرح۔

رضوانہ دلہے کا پیالہ نیچے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”بھائی سکندر چائے پیو گے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ نہیں۔“ وہ چونک کر نیچے دیکھنے لگا۔

وہ ہولے سے ہنسی۔ ٹھن ٹھن جیسے چاندی کے روپے گر رہے ہوں۔

”ہاں بھی اور نہیں بھی۔ بھائی سکندر ایک بات کہو نا۔“

”نہیں۔“ وہ شرمندہ سا ہو گیا اور چاچی کی طرف دیکھنے لگا۔

”پتر تیرا نتیجہ آ گیا ہے؟“ چاچی نے پوچھا۔

”نہیں چاچی ابھی تو دو مہینے ہیں۔“

”نثار آیا ہے۔“

”نہیں ماں جی ابھی تو وہ فیصل آباد میں ہی ہیں۔“

”بہو ٹھیک ہے۔“



”جی۔ بھابھو کہہ تو رہی تھیں ادھر آنے کو۔ شاید شام کو آئیں گی۔“
وہ چاچی سے باتیں کرنے لگا تھا اور پھر جتنی دیر بھی وہ وہاں بیٹھا رہا، رضوانہ نہیں آئی حالانکہ جب کبھی وہ چاچا کے گھر آتا تھا تو وہ اس کے سامنے ہی بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔
اپنے اسکول کی، سہیلیوں کی، اپنی استانیوں کی۔
مگر آج نہ جانے کہاں غائب تھی۔ جبکہ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اسے دیکھے۔
کیسی انوکھی انوکھی لگ رہی تھی۔
کھلی کھلی، نکھری نکھری سی۔

اس روز گھر آ کر بھی وہ اس کے متعلق سوچتا رہا کہ آج رضی اتنی انوکھی کیوں لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا، وہ اس سے پوچھے گا کہ وہ عجیب عجیب اور انوکھی انوکھی کیوں لگنے لگی ہے لیکن وہ اسے ملی ہی نہیں اور اس کا نتیجہ آ گیا۔ بھانڈا نے اسے لاہور گورنمنٹ کالج میں داخلہ دلا دیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنی پڑھائی میں مگن ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی رضی کا خیال آتا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ جاتی لیکن ابھی وہ اپنے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی واضح بات نہیں آتی تھی۔ رضی اس کے چاچا کی بیٹی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی سب کے ساتھ اسے بھی یاد کر لیتا تھا۔
پہلی بار اپنا آپ اس پر اس وقت کھلا تھا جب چاچی کی وفات کی خبر سن کر وہ گاؤں پہنچا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔
”سکندر بھائی، میری ماں۔“

اس کے لمس نے اس کے اندر ایک سنسنی سے دوڑادی تھی لیکن پھر ہولے سے اسے خود سے علیحدہ کر کے وہ خود بھی رونے لگا تھا۔ پھر جب چاچی کو دفن کر کے آئے تھے اور وہ صحن میں بابا کے گلے سے لگی چیخ چیخ کر رو رہی تھی تو ایک دم اس کا دل کٹنے لگا۔ اس کا جی چاہنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر اسے اپنی ہانہوں میں بھر لے۔ اس کی سوجی سوجی آنکھوں کو چوم لے۔ اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کو چن لے۔ مگر وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔

اس کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے پھر اس سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
”رضی، حوصلہ کر۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔“
مگر وہ تو اور زور زور سے رونے لگی تھی۔

تب چاچا سلطان نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔

”ارے تو روئے گی تو میں کیا کروں گا۔ چل چپ کر میری دھی۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر اوپر چھت پر چلا گیا اور ٹہلنے لگا تھا۔ اس کے اندر بڑی بے چینی اور اضطراب سا



تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ جتنے دن وہ گاؤں میں رہا، مضطرب سا رہا۔ اس کے اندر گھمن گھیریاں سی بی تھیں اور وہ چکرار ہا تھا۔

ادھر سے ادھر لٹو کی طرح۔ کوئی سرا اس کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اسے یوں لگتا، جیسے وہ کوئی چھوٹا سا پتھر ہو جسے بہتے پانی میں کسی نے زور سے پھینک دیا ہو اور وہ پانی کے بھنور میں پھنسا چکرار ہا ہو۔ بچپن میں گاؤں سے باہر والے جو بڑے کے باہر بیٹھ کر وہ زور سے کوئی پتھر یا کسی برتن کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا پانی میں پھینکتے تھے تو بھنور سا بنتا تھا اور گول گول دائرے بن کر ہٹ جاتے اور پتھر نیچے تہہ میں غائب ہو جاتا۔

چاچی کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ۔

مگر یہ کچھ اور تھا۔

کوئی انوکھا احساس تھا، کوئی دل ربا سا خیال۔

جو چٹکی بھی لیتا تھا اور گھبراہٹ بھی پیدا کرتا تھا۔

وہ بے خودی میں رضی کے پاس پہنچ جاتا، گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا، باتیں کرتا رہتا۔

چاچی کی اس کی۔

اسے تسلیاں دیتا، اپنی پڑھائی کا بتاتا۔ اپنے دوستوں کے متعلق بتاتا۔

لیکن جب رات کو اپنے بستر پر آ کر لیتا تو اسے لگتا، جیسے جو کچھ اسے کہنا تھا، وہ تو اس نے کہا ہی نہیں تھا۔

مگر کیا بات؟

یہ خود اسے سمجھ نہیں آتی تھی اسے کیا کہنا ہے۔

جذبات کا ایک سمندر اس کے اندر ابل رہا تھا لیکن جذبات کے سمندر میں جب تک لفظوں کی قدیلیں نہ جلیں تب تک دل کو سکون نہیں ملتا۔

اور لفظ چاہتے نہیں کہاں کھو گئے تھے اور پھر وہ کون سے لفظ تھے جو اسے کہنا تھے۔

بھانڈا نے بھی اس کی خاموشی کو محسوس کیا۔

”کیا بات ہے سکندر، تو بڑا چپ چپ ہے۔“

”کچھ نہیں بھابھ، بس یونہی چاچی کا سوچتا رہتا ہوں۔“

”چاچی نے بڑی تکلیف اٹھائی۔ جانے والوں کو تو جانا ہی ہوتا ہے۔ تیری پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے

بچے۔ تو اب جا۔“

بھانڈا کو جب اس پر پیارا آتا تھا تو وہ اسے نیچے پتھر اور بیٹا کہہ کر بلاتے تھے۔

”جی۔“ اور وہ پھر اٹھ کر رضی کے پاس پہنچ جاتا۔

پھر وہی ڈھیروں باتیں۔

اور اصل بات کہیں اندر ہی گھسن گھسریاں کھاتی رہ جاتی۔

وہ رضی سے اصل بات نہ کر سکا اور اسے واپس آنا پڑا۔ کیونکہ اس کے دسمبر میں ٹیٹ قریب تھے اور لاہور سے صبح صادق کا خط آیا تھا کہ دسمبر ٹیٹ کی ڈیٹ ٹیٹ مل گئی ہے اور اب اسے واپس جانا چاہیے۔ سو وہ یونہی پریشان پریشان سا واپس آ گیا۔

ان دنوں وہ سیکنڈ ایر میں تھا۔ لاہور آ کر بھی اس کی وہی کیفیت رہی۔ بیٹھے بیٹھے کھوسا جاتا۔ دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔

ہونٹ ذرا سے کھل کر بند ہو جاتے اور اندر جیسے طوفان سا آ جاتا۔ ہلچل سی مچ جاتی۔ اور پھر گہرا اندھیرا جیسے سب کچھ کہیں گم ہو گیا ہو۔

”کیا بات ہے یار۔ کیا چکر ہے؟“ ایک روز محسن وقار نے اسے پکڑ لیا۔

”کچھ نہیں۔“

”ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں میری جان۔ سچ بتا دے گاؤں میں کسی الھڑٹیار کے پاس دل چھوڑ آیا ہے یا یہاں کہیں پھنسا بیٹھا ہے۔“

”نہیں..... نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ گھبرا گیا۔ بھلا جو بات اسے خود بھی پتا نہیں تھی وہ اسے کیسے بتا دیتا۔

”نہیں یار کوئی بات تو ضرور ہے۔“ صبح صادق نے بھی محسن وقار کی تائید کی ”جب سے تو گاؤں سے آئے بڑا بدلا بدلا لگ رہا ہے۔ کھویا کھویا گم گم سا۔ دوستوں سے کیا پر دایا، کیسی ہے وہ۔“

ٹھن ٹھن چاندی کے روپے کانوں میں بجنے لگے اور آنکھوں کے سامنے جیسے گلاب پھٹنے لگے۔ اور پھول کھلنے لگے۔

”ہم تو یاروں کے یار ہیں سکندر۔ ہم سے چھپائے گا کیا..... دل آ گیا ہے تو شرمانے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔ دل ہی تو ہے نا کسی پری ویش کو دیکھ کر قابو سے باہر ہو ہی جاتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ ہر حسین چہرے کو دیکھ کر دل پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”میرا دل تمہارے دل کی طرح بے قابو نہیں ہے کہ ہر ایک کے قدموں میں گر پڑے۔“

”شکر ہے تم منہ سے کچھ پھوٹے تو سہی۔ ہر ایک کے نہ سہی کسی ایک کے قدموں میں تو ضرور گر پڑا ہے۔“ وہ بھی ایک کانیاں تھا۔

اور یوں بھی اس فیلڈ میں اس کے تجربے کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بقول صبح صادق کے گاؤں میں دو اور لاہور میں تین اور گاؤں سے قریبی شہر میں جہاں سے اس نے میٹرک کیا تھا اس کی کئی دوستیں موجود تھیں اور اسے ہر ایک پر دل و جان سے فدا ہونے کا دعویٰ تھا۔

”اتنی کم عمری میں۔“ سکندر کو حیرت ہوتی تھی۔

”اس میدان میں اپنے وسیع تجربے کی بنا پر ہم تمہیں مفت مشوروں سے نواز سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم منہ سے کچھ پھوٹو بھی۔ اگر اپنے کالج کی لڑکی ہے تو پیغام رسانی کا فرض یہ بندہ ناچیز ادا کرنے کو تیار ہے۔“

حاضر ہوں دل و جان سے

مگر چہ کیڑا ہوں میں ذرا سا

اس نے کورنش بجالاتے ہوئے شعر پڑھا۔

وقت بے وقت غلط صحیح شعر پڑھنے کا بھی اسے شوق تھا۔ چنانچہ حذرہ کبھی کبھی اسے چڑانے کے لیے دیسی کھیرا عرف نکاشاعر کہہ کر بھی بلاتا تھا لیکن وہ بھی پکینی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

”ارشاد ہم ہمدن گوش ہیں۔“

”کچھ نہیں۔ کوئی بات ہو تو بتاؤں۔“ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اب وہ انہیں کیا بتاتا۔ اسے تو خود پتا نہیں تھا کہ اصل بات کیا ہے۔ یہ کیسی بے خودی سی ہے۔ جو بات وہ نہیں جانتا تھا وہ بات محسن وقار نے جان لی تھی۔

”کیا واقعی..... کیا واقعی اس کا دل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔“ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ اور اپنے پیچھے اسے محسن وقار اور صبح صادق کا تہقہہ سنائی دیا۔

اگرچہ وہ کلاس فیلو تھے لیکن عمر میں اس سے بڑے تھے اور کچھ ان کے تجربات بھی اس سے زیادہ تھے۔ رات جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو صبح صادق اور محسن وقار کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

اور ٹھن ٹھن چاندی کے روپے بجنے لگے۔

سیاہ چمکیلے بالوں کے ہالے میں چھپا چہرہ لبوں پر مسکان لیے۔

”رضی۔“ اس نے سرگوشی کی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہے یار؟“ صبح صادق نے ساتھ والے بیڈ سے سر اٹھا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ پھر گھبرا کر لیٹ گیا۔

”یار! کیوں تھکتا ہے اپنے دماغ کو۔“ محسن وقار نے تکیہ اپنی آنکھوں پر سے اٹھایا ”صبح جا کر اس سے دل کی بات کہہ دے۔ مت بوجھ ڈال اپنے اوپر اتنا۔ کہہ دے جا کر وہ تجھے اچھی لگتی ہے۔ پیار ہو گیا

ہے تجھے اس سے۔“ اس نے پھر تکیہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

جگمگ، جگمگ۔ اس کے اندر چراغاں ہونے لگا۔

”ہی ہی..... یہی بات تو وہ کہنا چاہتا تھا۔“

اس کے اندر لفظوں کی قد ملیں جل اٹھیں تو جذبات کے سمندر میں طوفان سا آگیا۔

پیر ختم ہوتے ہی وہ گاؤں جاے گا اور..... اور اس سے کہہ دے گا۔

”رضی تو مجھے اچھی لگتی ہے، بہت اچھی۔“ بس اتنی سی بات تھی اور وہ اتنے دنوں سے پریشان ہو رہا تھا۔

اس نے مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور تصور ہی تصور میں رضوانہ سے باتیں کرنے لگا۔



”ان پڑھ ہونا، جہالت کی سب سے کمزور اور چھوٹی قسم ہے اور جہالت کو جہالت نہ سمجھنا، جہالت کی سب سے بڑی قسم ہے۔“ پروفیسر عادل نے ارسلان ملک کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”تمہارے نزدیک خدا بخش جاہل ہے لیکن میرے نزدیک وہ جاہل نہیں کیونکہ جہالت کا تعلق دل کی کیفیات سے ہوتا ہے۔ اگر ایک ان پڑھ خدا سے ڈرتا ہے، اور انسانیت کے خلاف کام کرنے کو جرم سمجھتا ہے تو جہالت کے دائرے میں نہیں آتا اور میرے خیال میں خدا بخش نے ایسا کوئی کام کبھی نہیں کیا۔“

”سوری سر۔“ ارسلان شرمندہ ہو گیا ”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“

”لیواٹ۔“ پروفیسر عادل مسکرائے۔

لیکن ارسلان ملک بہت ندامت محسوس کر رہا تھا۔ دراصل کچھ دیر پہلے ہی ادبی نشست ختم ہوئی تھی۔ جس میں حافظ احسان اللہ نے اپنا افسانہ پڑھ کر سنایا تھا اور حسب توقع اس پر کافی تنقید ہوئی تھی۔ چند ایک نے اسے سراہا بھی تھا لیکن زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ ابھی حافظ صاحب کی لفظوں پر گرفت مضبوط نہیں ہے۔ لفظ ان کے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتے ہیں اور کہیں کا لفظ کہیں لگ جاتا ہے۔

مجتبیٰ حیدر کا خیال تھا کہ ابھی انہیں مزید مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاہم پروفیسر فاروق اور عبید اللہ غنی نے پلاٹ کی بہت تعریف کی تھی۔ جب افسانہ پڑھا جا رہا تھا تو خدا بخش نے ادھر ادھر بکھرے ہوئے سگریٹوں کے ٹوٹے اٹھاتے ہوئے رائے دی۔

”اپنے حافظ صاحب کی کہانی میں ”ماسی پتھان“ کا کردار بہت کمزور ہے۔ حافظ صاحب نے اس

کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔“

”کمال ہے۔“ ارسلان کو حیرت ہوئی ”یہ ایک جاہل شخص ہے اور.....“

”تم اسے ان پڑھ کہہ سکتے ہو جاہل نہیں۔“ پروفیسر عادل نے اسے فوراً ٹوکا تھا اور اب ان کی بات

سن کر وہ بے حد ندامت محسوس کر رہا تھا۔

پروفیسر عادل نے اسے غور سے دیکھا۔

”اگر غور کیا جائے تو جہالت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جہالت یہ بھی ہے کہ بنی نوع انسان کو ختم کرنے کے لیے مہلک ہتھیار ایجاد کیے جائیں۔ جہالت یہ بھی ہے کہ ہم جانتے بوجھتے ایک قاتل کو پچالیں کیونکہ قانون احساس کی قوتوں سے محروم ہے اس میں لوپ ہو، نکل آتے ہیں۔ وکیل جھوٹ کے سہارے نئے نئے نکتے پیدا کر کے مجرم کو صاف بچا لیتا ہے اور کبھی کسی معصوم بے گناہ کو پھانسی ہو جاتی ہے۔

جھوٹ بولنا بھی ایک جہالت ہے۔

ایک ڈاکٹر غلط آسرا دیتا ہے۔

وکیل جھوٹ بولنے کا اہتمام کرتا ہے۔

مولوی فرضی باتوں سے عوام کو تباہ کرتا ہے۔

فلسفی تاویلات گھڑ کر جھوٹ بولتا ہے..... تو یہ سب جاہل ہیں۔

ایک استاد اگر غلط پڑھا کر پوری نسل کو تباہ کرتا ہے تو جہالت ہے۔

ہر وہ کام جو تعمیری نہ ہو، تخریبی ہو اور ہم اسے جان بوجھ کر اپنائیں تو وہ جہالت کے مترادف ہے۔

جہالت یہ بھی ہے کہ ہم کسی کو جاہل سمجھیں۔“

ارسلان کا سر مزید جھک گیا۔

”طاقت کے آگے سر خم کرنا، سچائی اور صداقت کو قتل کرنا۔ جو کہنا اس پر عمل نہ کرنا یہ سب جہالت ہے

دوستو۔ جہالت علم کی نفی ہے اور علم صرف ڈگری لینے کا نام نہیں ہے۔“

پروفیسر عادل بول رہے تھے اور وہ تینوں نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ جب وہ بولتے تھے تو

سحر ساطاری ہو جاتا تھا۔ شہر یاران کی گفتگو سے متاثر لگ رہا تھا۔

”خیر چھوڑو۔ میں نے تمہیں بور کر دیا۔“

”نہیں سر! بالکل نہیں۔ ہمیں آپ کی باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ ارمدخان نے فوراً جواب دیا

”ویسے سر! اس طرح تو ہم سب جاہل ہیں۔“

”ہاں شاید۔“ پروفیسر عادل نے سگریٹ سلاگیا۔

”سر! آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں۔ یہ صحت کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”آہا!۔“ پروفیسر عادل نے زوردار اونچا قہقہہ لگایا ”یہ آپ نہیں! آپ کے اندر کا ڈاکٹر بول رہا ہے“

شہر یار میاں۔“

”غلط تو نہیں بول رہا۔“ شہر یار مسکرایا۔

”نہیں لیکن دوست! مجھے سگریٹ کچھ نہیں کہتا۔ سکون پہنچاتا ہے۔“

”مگر سر۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ اس میں زہر ہے۔“ شہر یار نے بحث کی ”کلوٹین.....“

”میاں۔“ پروفیسر عادل نے اس کی بات کاٹ دی ”لو ہالو بے کو کاٹا ہے۔ زہر زہر کو بھلا کیا نقصان پہنچائے گا۔“

”میں سمجھا نہیں سر۔“

”کچھ نہیں یہ مسرور کہاں چلا گیا؟“ انہوں نے بات پلٹ دی۔

”میرے خیال میں وہ باہر چلے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے سگریٹ لے آؤں۔“ ارمغان نے بتایا۔

”اس کو سمجھاؤ میاں۔ ایک آدمی ہے۔ اس کو بتاؤ یہ سارے سگریٹ کے نقصانات۔“

”کیا وہ بھی سگریٹ پیتا ہے؟“ شہر یار نے پوچھا۔

”بے حد۔“ ارسلان نے بتایا۔

”اور سناؤ میاں ارسلان تمہاری شاعری کیسی جارہی ہے۔“

”کچھ زیادہ نہیں لکھا سر۔ موڈ ہی نہیں ہوتا کچھ کہنے کا۔“

”اور جناب کی سیاست کیسی چل رہی ہے؟“ وہ ارمغان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”گزارہ ہو رہا ہے۔ مگر سر وہ..... وہ جو بے ناؤ، برعلی۔ وہ میرے بڑا خلاف ہے۔ ہر وقت پروپیگنڈہ

کرتا رہتا ہے کہ میں جاسوس ہوں کبھی کسی پارٹی کے ساتھ میرا نام لگا دیتا ہے اور کبھی کسی کے ساتھ۔“

”کہنے دو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“ پروفیسر عادل نے سمجھایا۔

”سر مجھے ڈر ہے کہ ہارنے کی صورت میں وہ ہنگامہ کر دے گا۔“

”تمہارے مقابلے میں کھڑا ہو رہا ہے۔“

”جی سر۔“

”اور کون کون ہیں؟“

”پہلے تو چار لڑکے کھڑے ہو رہے تھے۔ پھر دو تو خود ہی بیٹھ گئے۔ شاید مدبرعلی کے خوف سے۔ اب

میں اور مدبرعلی رہ گئے ہیں۔ ابانے تو بہت منع کیا ہے سر کہ مانی یونین کے ایکشن کے لیے نہ کھڑا ہو۔ کل

بھی ایک لمبا چوڑا خط آیا ہے ان کا۔ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ یاد ہے ناں سر آپ کو۔ کالج میں بھی جھگڑا

ہو گیا تھا اور مانی کا سر پھٹ گیا تھا۔“

”ہوں۔ یہ مدبرعلی کون ہے؟“

”کسی وڈیرے کا بیٹا ہے۔ پچارور بھی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی ایک دو باڈی گاڑ بھی ساتھ ہوتے ہیں۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے بیٹھ جاؤ گے۔“

”نوسر۔ امپائیل۔ جہاں تک ممکن ہو میں یونیورسٹی گوئندی سیاست سے پاک رکھنا چاہتا ہوں اور

مدبرعلی جیسے لوگ اگر یونین میں آگئے تو غنڈہ گردی بڑھ جائے گی۔ پہلے ہی کیا کم ہے۔“

”مگر جان کا خطرہ بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”موت کا ایک دن مقرر ہے۔ اگر مدبرعلی کے ہاتھوں ہی مرنا ہے تو یوں ہی سہی۔“

”گڈ۔“ پروفیسر عادل نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا ”مانی“ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کسی بھی

طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔“

”تھینک یوسر۔“

”تم کہو تو ایک دو باڈی گاڑ کا بندوبست تمہارے لیے بھی کر دوں۔“

”نوسر۔“ وہ بے اختیار ہنس دیا ”ہم متوسط طبقے کے لوگ موت سے اتنے خوف زدہ نہیں ہوتے ہیں

اور پھر میرے بابا کہا کرتے تھے بیٹا! موت سے کیا بھاگنا۔ جہاں آتی ہے وہیں آئے گی۔ چاہے زمین کی

تہوں میں چھپ جاؤ۔ اگر میرے مقدر میں مدبرعلی کی گولی لکھی ہے تو وہ گولی میرے نام کی ہے اور اسے

میرے سینے پر آتا ہے۔ کسی اور پر نہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔ کنوینٹ کر رہے ہو یا ابھی شروع نہیں کی ہے؟“

”ایک دور دراز میں کرنے والے ہیں۔ ابھی پوسٹر وغیرہ تیار ہو رہے ہیں۔“

”اچھا۔ گڈ لک۔“ پروفیسر عادل کھڑے ہو گئے اور شہر یار کی طرف ہاتھ بڑھایا ”ٹیک مین۔ کیا

آئندہ بھی تم سے ملاقات کی توقع کی جاسکتی ہے؟“

”کیوں نہیں سر۔ میں انشاء اللہ حاضر ہوتا رہوں گا اگرچہ مجھے ادب سے اتنی دلچسپی تو نہیں ہے۔ پھر

بھی آج کی محفل میں لطف آیا۔ خاص طور پر آپ کی اور مجتبیٰ صاحب کی باتوں نے بہت مزادیا۔“ شہر یار

نے عقیدت سے سلمان کا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے کچھ ضروری فون کرنے تھے آپ لوگ بیٹھیں گے یا.....؟“

”نہیں سر..... اب ہم جائیں گے۔“ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مانی۔ تم مجھے اپنے متعلق باخبر رکھنا۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے یار۔ اب اس مدبرعلی کو دیکھنا

پڑے گا۔“

”نہیں سر۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایکشن تو پہلے ہی ہوتے ہی رہے ہیں اور تھوڑی بہت تڑتڑ تو

ہو ہی جاتی ہے۔ کئی سالوں سے ہو رہا ہے ایسا ہی۔ ہارنے والی پارٹی تھوڑی بہت گڑبڑ ضرور کرتی ہے۔

پروفیسر نظامی بتا رہے تھے پچھلی بار بھی بڑا ہنگامہ ہوا تھا اور جمعیت کے دولہے مارے بھی گئے تھے۔“

”ہاں شاید۔“ پروفیسر عادل کچھ سوچ رہے تھے۔

”اچھا سر خدا حافظ۔“

”خدا حافظ“ انہوں نے تینوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے۔

”خدا بخش“ گاؤں سے کسی کو آئے بہت دن نہیں ہو گئے۔“

”جی مالک“ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ادھر کئی دنوں سے امام بخش بھی نہیں آیا۔ ورنہ مہینے کے مہینے آکر خیر خبر دے جاتا تھا۔“

”امام بخش تو اپنی بیوی کو پیارا ہو گیا ہے۔ خدا بخش اب اس کی بات چھوڑ کوئی اور بندوبست کر۔ میرا خیال ہے یہ ذمے داری دینے پر ڈال دے۔“

”جی مالک“ ایسا ہی کروں گا پر امام بخش ایسا ہے تو نہیں کہ بیوی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جائے۔ ضرور کوئی بات ہے کہیں پیار شانہ بڑ گیا ہو۔“

”اب جو کچھ بھی ہے۔ یا تو خود جا کر پتا کر کے آؤ یا پھر.....“

”خود کیسے جاؤں مالک۔ آپ کو پیچھے سے تکلیف ہوگی۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ تم بے فکر ہو کر گاؤں جاؤ اور امام بخش کی خبر بھی لے آؤ اور گاؤں کا حال چال بھی دیکھ آؤ..... منشی سے کچھ رقم بھی لیتے آنا۔“

”جو حکم مالک، مگر آپ بھی اگر ساتھ چلیں تو بہتر ہے۔“

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے ”جانا تو ہے لیکن ابھی نہیں پہلے تم ہو آؤ۔ مجھے کچھ کام ہے یہاں۔ میں اپنے بیڈروم میں ہوں۔ ایک کپ اچھی سی چائے بنا کر دے جاؤ۔“

”اور ہاں۔“ وہ جاتے جاتے پلٹے ”یہ مسرور سگریٹ لینے گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔“

”وہ تو اسی وقت آگئے تھے مالک اور اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”اچھا۔ اس سے بھی پوچھ لینا۔ کیا خبر وہ بھی چائے پینا چاہے۔ اچھا ایسا کرو۔ میری چائے بھی اسی کے کمرے میں لے آنا۔ میں وہاں ہی چائے پیوں گا۔“

مسرور بیڈ پر اوندھا لیٹا سسکیاں لے رہا تھا۔ پروفیسر عادل لمحہ بھر کو دروازے پر ہی رک گئے۔

”مسرور کیا ہوا خیریت ہے؟“ انہوں نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

مسرور نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور جلدی سے آنکھیں صاف کیں ”کچھ نہیں بس ایسے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔“

”میرے خیال میں تم اتنے چھوٹے بچے نہیں ہو کہ سر درد سے رونے لگو۔“

مسرور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تم اچھے بھلے باہر سگریٹ لینے گئے تھے۔ اتنی دیر میں کیا ہو گیا؟“ مسرور سر جھکا کر بیٹھا رہا۔

”کم آن یار۔ آئی ایم ناٹ“ ان یور ٹیچر بٹ فرینڈ ٹو۔“

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”یہ“ کم آن۔“

”سر۔“ مسرور کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی ”ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس کبھی دل پر چوٹ لگتی رہتی ہے۔ یوں ہی بلا وجہ پھوڑے پڑ رہا سی انگلی بھی لگ جائے تو تکلیف ہوتی ہے نا۔ ایسے ہی میری

حالت ہے۔“

”کچھ بتانا پسند کرو گے؟“ پروفیسر عادل کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

”سر آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔“ مسرور شرمندہ سا ہو گیا ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں باہر گیا تو میں نے اس شخص کو دیکھا جسے میرا باپ ہونے کا دعویٰ

کرتا تھا۔ وہ شخص جو میری پیدائش کا سبب بنا۔ جس کا نام میرے نام کے ساتھ لگا ہے۔ مگر جس نے اپنے نفس کبھی ادا نہیں کیے۔“

”سر۔“ اس کے رخساروں پر سرنخی سی دوڑنے لگی تھی ”میں بارہ تیرہ سال کا تھا جب اس نے دوسری ڈی کر لی حالانکہ میری ماں کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ خوبصورت تھی پڑھی لکھی تھی۔ بہت اچھی بہو اور بہت

ن بیوی تھی۔“

پروفیسر عادل کی مٹھیاں غیر ارادی طور پر بند ہو گئیں۔ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

”دوسری شادی کرنا اتنی معیوب بات نہ تھی لیکن اس نے میری ماں کو چھوڑ دیا۔ کچھ عرصے تک وہ کبھی مارنے کے لیے آتا رہا۔ میں جب میٹرک میں تھا تو اس نے میری ماں کو طلاق دے دی۔ حالانکہ

ی ماں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی تھی۔ بہت بے ضرر رسا وجود تھا اس کا۔ جس روز اس کی رجسٹری ہٹا لی ماں چھینچ کر روئی حالانکہ وہ بہت متحمل مزاج ہے اور سر اس کی چیخیں میرے اندر جمع ہو گئی ہیں۔ کب

لا یہ چیخیں میرے اندر گونجنے لگی ہیں۔ ماں کے وہ آنسو میرے اندر سیلاب لے آتے ہیں۔ میں پاگل ہو جاتا ہوں سر۔ ابھی اس شخص کو یہاں ایک شانپنگ سینٹر کے اندر جاتے دیکھ کر میرے اندر وہی چیخیں

ہو گئی تھیں۔ خون میرے وجود کی دیواروں سے ٹکرانے لگا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں اس شخص کا دھوکا دے۔ مگر میں وہاں سے چلا آیا۔“

اس نے بے دردی سے اپنے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑا بیڈ کے کنارے پر زور سے مکا مارا اور پچھ

ہو گیا۔

”سوری سوری سر۔ بہت سارے بچوں کے باپ دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی انوکھی بات

نہیں ہے۔ چنانچہ میں..... شاید میں بہت حساس ہوں اس لیے.....“

پروفیسر عادل خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے ہمیشہ مسکراتے لب ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے بھینچے

ہوئے تھے اور آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ ایک دم سرخ ہو گئی تھیں۔

”آئی ایم رینکی ویری سوری سر.....“ مسرور بہت نادم اور شرمندہ لگ رہا تھا۔

بھلا یہ بھی کوئی بات تھی رونے والی۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا۔ بیس ایکس سال کا میچور ڈلڑکا تھا لیکن پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی اچھا بھلا میچور ڈلڑکا انسان بھی بچہ بن جاتا ہے۔

شاید آدمی کے اندر جودل ہوتا ہے وہ کبھی بڑا اور میچور ڈلڑکا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ بچہ بنا رہتا ہے۔ بس یہ تو آدمی خود اسے جھوٹے مصنوعی بڑے پن کے لبادے میں لپیٹے رکھتا ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ یہ لبادہ اتار دیتا ہے۔ پھر سے ننھا بچہ بن جاتا ہے۔

چاند کو دیکھ کر مٹھی میں بند کرنے کی ضد کرنے والا بچہ۔

اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو پونچھا اور پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح ساکت بیٹھے تھے اور ان کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں۔

”سر“ مسرور نے گھبرا کر ان کا ہاتھ چھوا۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”سوری سر۔ میں نے.....“

”نہیں۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا ”رونا کوئی بری بات نہیں۔ انسان ہی روتے ہیں“ پھر نہیں روتے اور مجھے انسانوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ مجھے پتھروں سے نفرت ہے۔ ٹیک اٹ ایزی اینڈ آئی ایم پی پی ڈیٹ یو آر ہیومن بی انک۔“

”دراصل سر میری حساسیت مجھے تکلیف دیتی ہے۔ بہت سمجھاتا ہوں اپنے آپ کو۔ بہت نارمل رکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی لگا میں ہاتھ سے جھوٹ جاتی ہیں۔“

”حساس ہونا جرم نہیں ہے۔ بے حس ہونا جرم ہے۔ تم اپنی حساسیت پر شرمندہ مت ہو۔ ہاں اگر کبھی بے حس ہو گئے تو پھر غلامت کی بات ہوگی۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔

”خدا بخش چائے لارہا ہے۔ چائے پو اور ریلیکس ہو جاؤ۔ زندگی نام ہی مختلف حادثات کا ہے۔ ہر دوسرے بندے کی روح پھوڑے کی طرح دکھتی رہتی ہے۔ بس ذرا سا بچ کر ڈوٹ اذیت..... ناقابل بیان اذیت۔“ انہوں نے یوں دانت ختی سے ایک دوسرے پر جھاتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی شدید اذیت سے دوچار ہوں۔ مسرور سر جھکا بے بیضا تھا۔ لمحہ بھر بعد ہی وہ نارمل ہو گئے۔ پہلے ان کا ارادہ تھا کہ وہ مسرور کے ساتھ ہی چائے پیئیں گے لیکن اب ان کا ارادہ بدل گیا تھا۔ ان کے اندر جیسے آگ سی دھنکے لگی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ الاؤ کی پیش بروقتی جاری تھی۔ انہوں نے اپنی پیشانی کو زور سے دبایا۔

بخش سے کہنا ”وہ میری چائے میرے بیڈروم میں دے جائے۔“ وہ جانے کے لیے پلٹے۔ تب

”مالک وہ.....“

وہ اچھے اچھے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مالکن آئی ہیں جی۔ مالکن آگئی ہیں۔“ خدا بخش خوش ہو رہا تھا۔

”کیا کہاں ہیں؟“ انہوں نے حیرت سے کہا اور خدا بخش کا جواب سے بغیر تیزی سے باہر نکل آئے۔



نائب عثمان احمد پھر شدید ڈپریشن کا شکار تھیں اور اس کا اندازہ مریم کو گھر میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔ تیمور ٹی دی لاؤنچ میں اپنے ٹیڈی بیر کو دونوں بازوؤں میں پیچھے پیچھے کارپٹ پر ہی سو رہا تھا۔ نائب تیمور سے خاصی محبت کرتی تھیں اور وہ اس کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی تھیں اور اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ یقیناً اس وقت اپنی زسری میں ہوتا۔ اس نے شولڈر بیگ صوفے پر پھینکا اور جھک کر تیمور کی پیشانی کو چوما اور پھر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھالیا تاکہ اسے اس کے بستر پر لٹا سکے۔ وہ تیمور کو اٹھانے مڑی تو اس نے عثمان احمد کو بیڈروم سے باہر آتے دیکھا۔

”تو گویا ماڈریشن کا شکار ہو کر بیڈر سنبھال چکی ہیں۔“

عثمان احمد نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں عجیب بے بس سا غصہ تھا ”مومو کیوں تنگ کرتی ہو اپنی ماما کو جبکہ تمہیں پتا بھی ہے وہ کتنی جلدی ڈپریشن ہو جاتی ہیں۔“

”میں..... میں تنگ کرتی ہوں ماما کو! پاپا پلیز غلط بات مت کیا کریں۔“ اس نے سوئے ہوئے تیمور کا سر اپنے کندھے پر رکھا ”تنگ تو کیا کرتی ہیں مجھے۔“

تیمور نیند میں بڑبڑایا تو اس کی نیند خراب ہو جانے کے خیال سے اس نے ہولے سے اسے تھکا اور ایک نظر عثمان احمد پر ڈالتی ہوئی تیمور کی زسری کی طرف بڑھ گئی۔ تیمور کو اس کے بیڈ پر لٹا کر وہ ہیں تھکی تھکی سی اس کے بیڈ پر ہی نیم دراز ہو گئی۔

گھر آتے ہی طبیعت پر پھر وہی اضطراب طاری ہونے لگا تھا۔ عجیب سی تھکن تھی جو سارے وجود کو جکڑے ہوئے تھی..... نامعلوم سی اداسیاں تھیں جو تہہ در تہہ کمرے کی مانند اس کے دل پر جمی تھیں۔

تو کیا اب زندگی یوں ہی گزرے گی۔ ایسی ہی تھکی تھکی اور اداس۔

کیا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور کیا ماما کبھی تبدیل نہیں ہوں گی۔

کیا ان کی سوچ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ اتنی ہی موربڈ۔ میرے اور ان کے درمیان جو اختلاف پیدا ہونے لگے ہیں، کیا کبھی ختم نہیں ہوں گے اور کیا ہمارے گھر کے ماحول میں یوں ہی ایثار میاٹی کا احساس رہے گا۔

پتا نہیں۔ یہ اس کی سوچ تھی یا واقعی اس کے گھر کا ماحول دوسرے گھروں سے مختلف تھا۔

وہ اپنے فریڈز کے گھر جاتی تھی تو اسے ایسے بو جھل پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جیسا اپنے گھر میں ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی ایسے گھر میں گئی ہو جہاں کوئی حاضرات کا عمل پڑھا ہو اور نضا بو جھل ہو گئی ہو۔ کہیں کوئی کمی کوئی فرق تھا تو ضرور۔

اور اب اس بو جھل پن میں یوں شور پھیلے گا جیسے رو جھیں حاضر ہو گئی ہوں اور مل کر شور و غوغا کر رہی ہوں۔ ماما جتنے دن ڈپر لیس رہیں گی ان کے احباب ان کے گرد گھیرا ڈالے رکھیں گے۔ جس جس کو چلے گا بھاگتا آئے گا۔ ماما کے کمرے سے وقفے وقفے سے قہقہوں کی آوازیں آئیں گی۔ اونچے بے تکلم قہقہے۔

نقرئی قہقہے۔

دبی دبی ہنسی۔

مردانہ اور زنانہ ملی جلی آوازیں۔

گھر گھر نہیں ریٹورنٹ لگے گا۔

شریف اور صفیہ کی شامت آجائے گی۔

بار بار شرابی سب کی اور شریف بھاگ بھاگ کر تھک جائے گا۔ کبھی کسی مہمان کی فرمائش اور کبھی کسی فرمائش پوری کرتے کرتے اس کا سانس اکھڑ جائے گا اور شرجیل مرزا تو جیسے ماما کی پٹی سے لگ کر ہی پڑ جائے گا اور بے چارے عثمان احمد تو اپنی اسٹڈی سے ماما کے بیڈروم کے کوئی سات سو چکر لگائیں گے۔

”زینی! جان کیسی ہو۔“

”ڈاکٹر ہادی کو فون کروں۔“

”جوس بھجواؤں۔“

بے چارے عثمان احمد زینب عثمان احمد کی بیماری کے دنوں میں بیڈروم سے بے دخل کر دیے جاتے اسٹڈی میں ڈیرہ جمالیتے اور پتا نہیں یہ ماما کا ڈپریشن کس قسم کا ہوتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ چلا اور سگریٹ پیتے ہوئے خوب اونچے اونچے قہقہے لگاتے۔

اپنی سہیلیوں، میڈم نرگس اور مرزا آفندی کے ساتھ فلیش کھیلتیں اور شرجیل مرزا سے گپ ش لگاتیں۔ کئی بار اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ماما سے کہے۔

”آپ ڈپر لیس ہیں آپ کو سکون اور تنہائی چاہیے اس شور شرابے سے تو آپ کی طبیعت اور بو جو پڑے گا لیکن وہ ماما سے یہ سب نہ کہہ پاتی تھی۔ البتہ ایک بار اس نے پاپا سے کہہ دیا تھا۔

”پاپا! جب ماما بیمار ہوں تو ان کے دوستوں کو مت انفارم کیا کریں۔ انہیں سکون چاہیے ہوتا ہے نہ کہ“

”نہیں مومو گڑیا تمہاری ماما کے دوست آتے ہیں تو ان کا دل بہل جاتا ہے۔ سکون محسوس کرتی ہیں وہ

پاپا بھی تو ماما کے دماغ سے سوچتے تھے۔ رو بوٹ جس میں ماما جو فیڈ کرتی تھیں وہی کچھ ان کی زبان پر ہوتا تھا۔

”آپی! آپ آگئی ہیں؟“ عاشری نے زمری میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ہوں۔“ مریم اٹھ بیٹھی ”آجاؤ گڑیا۔ کھانا دانا کھالیا تم نے؟“

”جی آپی! آپ نے کھالیا۔“

”نہیں چندا۔ میں نے کینٹین میں سو سے کھالیے تھے اب جی نہیں چاہ رہا تھا۔“

”آپی! عاشری کمرے کے وسط میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی ”آپ کو پتا ہے ماما کی طبیعت بہت

خراب ہے۔“

”ہاں پتا ہے۔ ڈونٹ وری۔ معمولی ڈپریشن ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ مریم نے اس کی طرف

دیکھا اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

دبلی پتلی بے انتہا خوبصورت عاشری سے ماما ہمیشہ خفا ہی رہتی تھیں کیونکہ وہ ان کی خواہش کے مطابق

مری کا نوٹ سے سینئر کیمرنگ نہیں کر سکتی تھی بلکہ لاہور واپس آگئی تھی۔

”عاشری پریشان نہیں ہوتے گڑیا۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ ماما پہلے بھی تو یوں ہی ڈپر لیس ہو جاتی ہیں۔“

”جی۔“ وہ یوں ہی کھڑی اسے دیکھتی رہی ”آپی اگر میں واپس مری چلی جاؤں تو ماما مجھ سے خوش

ہو جائیں گی۔ وہ میری وجہ سے ڈپر لیس رہتی ہیں۔“

”فضول باتیں نہیں سوچتے اور ماما تم سے خفا نہیں ہیں۔ وقتی طور پر انہیں دکھ ہوا تھا اور انہیں ڈپر لیس

کرنے کے لیے اور بہت سی باتیں ہیں۔“ مریم بیڈ سے اتر کر اس کے قریب چلی آئی۔

”نہیں! آپ کو نہیں معلوم وہ مجھ سے اب پہلے جتنا پیار نہیں کرتیں لیکن آپی میرا تو کوئی قصور نہیں ہے نا۔

مجھے خود بھی نہیں معلوم کیوں وہاں جاتے ہی مجھے ایک دم ہی ولولہ شرو ع ہو جاتی تھی اور ٹیپر چکر رہنے لگتا

تھا۔ پھر میں نے تو ماما یا پاپا کسی سے بھی نہیں کہا تھا کہ مجھے واپس لے آئیں۔ پاپا خود ہی تولائے ہیں مجھے۔“

”پاگل ہو بالکل۔ ماما تم سے بہت پیار کرتی ہیں اور ہم سب بھی۔ میں پاپا اور مور تم اب بڑی

ہو گئی ہوتا۔ مور سب سے چھوٹا ہے اس لیے ماما اس پر زیادہ توجہ دیتی ہیں اور بس اتنی سی بات۔“ مریم

نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

”شاباش! اب جا کر سو جاؤ۔ تھوڑا آرام کرو پھر تمہارے میوٹر آجائیں گے۔“

”آپ سچ کہہ رہی ہیں نا۔ ماما مجھ سے اب بھی پیار کرتی ہیں۔“ وہ جاتے جاتے مڑی۔

”ہاں بالکل سچ۔“ مریم مسکرائی تو اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

مریم نے مڑ کر تیس رو کو دیکھا جو گہری نیند سو رہا تھا اور عاشری کے پیچھے ہی باہر آگئی۔ باہر بھی تپش تھی۔ ٹی



وی لاؤنج تپ رہا تھا لیکن وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں کیوں اپنے کمرے میں جانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جیسے اندر جائے گی تو دم گھٹنے لگے گا۔ مگر اس نے ماما کے کمرے کی طرف دیکھا اور سوچا ایک نظر انہیں جا کر دیکھ آئے..... لیکن کیا خبر وہ آرام کر رہی ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے اسے دیکھ کر ان کی طبیعت مزید خراب ہو جائے۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔

پتا نہیں کب اور کیوں ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا حالانکہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو ماما اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کرتی تھیں ہمہ وقت اسے ساتھ رکھتی تھیں حالانکہ عثمان احمد کی بار بار منع بھی کرتے تھے۔

”اسے گھر چھوڑ جاؤ زین۔ اب کہاں اسے لیے لیے پھر دو گی۔“

لیکن اگر وہ ساتھ چلنے کی ضد کرتی تھی تو پھر وہ عثمان احمد کی بات بالکل نہیں سنتی تھیں۔

”دیکھو عثمان، مومو کے متعلق تم مجھے کچھ نہ کہا کرو پلیز۔“

اور جب عاشی پیدا ہوئی تھی تب بھی وہ اس کا خاص دھیان رکھتی تھیں۔ شریف اور صفیہ کو خاص تاکید تھی کہ مومو کی پسند کا خیال رکھا جائے اور وہ بھی کتنے خمرے کرتی تھی۔ کوئی چیز پسند نہ آتی تو وہ ٹیبل پر سے اٹھ کھڑی ہوتی اور نرنب عثمان احمد بے چین ہو جاتیں۔

”کیا ہو گیا میری جان، کیوں نہیں کھا رہی ہو۔“

اور پھر صفو اور شریف کی شامت آ جاتی کہ تم نے مومو کی پسند کا کھانا کیوں نہیں بنایا۔

”زین تم مومو کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہو۔ بگاڑ دو گی اسے تم۔“ عثمان احمد انہیں سمجھاتے تو وہ درگزر کرتیں لیکن پھر ایک دم کیا ہو گیا تھا۔ اتنی محبت کرنے والی اتنی چاہنے والی ماما ایک دم بدل گئی تھیں حالانکہ وہ کوئی بہت بڑی تو نہیں ہو گئی تھی۔ نو دس سال کی ہی تو تھی لیکن نرنب عثمان احمد نے اس کی پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی تھی۔

نرنب عثمان احمد نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ کلب پارٹیاں، ڈنر بوفے۔ بس عثمان احمد تھے جو کبھی کبھی کہنی دے دیتے تھے اور پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کے اور نرنب عثمان احمد کے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔ پتا نہیں کیوں؟

”کیا وہ خطا دار تھی؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔ تب ہی باہر مین گیٹ پر کھنٹی بجی۔ شاید ماما کا کوئی ملنے والا آ گیا ہے۔ باہر گیٹ کھلنے اور گاڑی اندر آنے کی آواز آئی۔ اور پھر کچھ دیر بعد ہی اندرونی بڑے دروازے پر تیل ہوئی۔ یہ دروازہ ٹی وی لاؤنج میں کھلتا تھا۔ اس نے کچن کی طرف دیکھا۔ شاید صفو اندر ہو لیکن وہ شاید اپنے کوارٹر میں جا چکی تھی۔ کچن کی بیک سائیڈ پر اس کا کوارٹر تھا۔ وہ عموماً



کام ختم کر کے پچھلے دروازے سے ہی اپنے کوارٹر میں چلی جاتی تھی۔ تیل ڈور دوبارہ ہوئی۔ وہ بے دلی سے اٹھی اور دروازہ کھولا۔ سامنے ان کے ٹیلی ڈاکٹر ہادی کھڑے تھے۔

”السلام علیکم اکل۔“ اس نے سلام کیا۔ تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”مسز عثمان کیسی ہیں اب؟“

”شاید سو رہی ہیں۔ آپ آئیں پلیز۔“ وہ ایک طرف ہو گئی۔

عثمان احمد اپنی اسٹڈی سے نکل آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے اندر کوئی کمپیوٹر فٹ ہو۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے انہیں خبر ہو جاتی ہے کہ باہر کون آیا ہے۔

”السلام علیکم ڈاکٹر ہادی۔ آپ نے کچھ دیر نہیں کر دی۔“

”سوری عثمان صاحب۔ ایک زخمی آ گیا تھا۔ نوجوان لڑکا ہے بری طرح کچلا گیا ہے۔ اس کی بائیک ٹرک سے ٹکرا گئی، بری طرح اس کی ٹانگیں کچلی گئی ہیں۔ بچ تو جانے گا لیکن معذور ہو جائے گا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہے یار..... ابھی تک اس کے والد کو نہیں بتایا گیا کہ اس کی ٹانگیں کاٹنی پڑیں گی۔“

”اوہ..... ویری سیڈ۔“ عثمان احمد نے ان کے ہاتھ سے بیک لے لیا۔

”پتا نہیں ہمارے ملک میں اتنے حادثے کیوں ہوتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، روڈ ایکسیڈنٹ جتنے اس ملک میں ہوتے ہیں اتنے کہیں اور نہیں ہوتے ہوں گے۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ ڈاکٹر ہادی نے ان کی تائید کی۔

ڈاکٹر ہادی بھی عجیب انسان تھے۔ اپنے مریضوں اور کلینک کے سوا انہیں کسی بات کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں کیا تغیر و تبدل ہو رہے ہیں۔ سیاست دان کیا داؤچ کھیل رہے ہیں انہیں کسی بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ جب جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی تھی اس روز بھی وہ ماما کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ عثمان احمد نے بتایا۔

”ملک میں فوجی حکومت آگئی ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے ملک کی باگ دوڑ سنبھال لی ہے۔“

”اچھا میرے کلینک میں ایک مریضہ داخل ہوئی ہے۔ عجیب کیس ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سوچ رہا ہوں اس کا کیس ڈاکٹر عرفان ملک کو ریفر کر دوں۔“

”ملک میں انقلاب آ گیا ہے اور تم مریضوں میں الجھے ہوئے ہو۔“

ان دنوں عثمان احمد کو سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ یوں بھی وہ جاگیرداروں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے گھر کے دو چار افراد ہمیشہ سیاست میں رہے تھے۔ یہ تو نرنب سے شادی کر کے وہ سب خاندان سے کٹ سے گئے تھے مگر تب ان دنوں ان کے اندر کچھ خاندانی خوبنوسی۔

”ملک میں انقلاب تو آتا ہی رہتا ہے۔ کبھی ایوب خان کا مارشل لا آ جاتا ہے اور کبھی یحییٰ خان کا، کبھی

عوامی حکومت آجاتی ہے اور کبھی پھر مارشل لا..... یہ آتا جاتا تو لگا ہی رہتا ہے۔ اب میں اپنے مرلیضوں کو بھول کر ادھر کیوں دھیان دوں۔ سیاست دان جانیں اور ان کا کام۔ مجھے اپنے مرلیضوں سے زیادہ کسی کی فکر نہیں ہے۔“

عثمان احمد ڈاکٹر ہادی کے ہمراہ نذیب احمد کے کمرے میں چلے گئے تھے اور وہ دیں ٹی وی لاؤنج میں کھڑی رہ گئی۔ ڈاکٹر ہادی زیادہ دیر کے نہیں۔ ابھی وہ کھڑی ہی تھی کہ وہ باہر نکل آئے۔ عثمان احمد ان کے ساتھ تھے۔ ان کے اندر اتنی جیسی اور انکساری تھی کہ مریم کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کوئی جاگیر دار قسم کی چیز ہوں گے۔ شاید ماما نے شواف کے لیے سب کو بتا رکھا ہے کہ پاپا کی بے شمار زمینیں ہیں۔ یوں بھی ماما کو عادت ہے فضول شواف کی۔ کئی بار اس نے ماما کو بڑی فراخ دلی سے جھوٹ بولتے دیکھا تھا۔ ابھی پچھلی گرمیوں میں وہ سوات گئیں تو بڑی فراخ دلی سے جھوٹ بولا کہ یورپ گئی ہوئی تھیں۔ یقیناً عثمان احمد کے متعلق بھی انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں جو کچھ مشہور کر رکھا تھا، جھوٹ ہی ہوگا۔ اپنے ہوش میں تو اس نے کبھی عثمان احمد کو کسی جاگیر پر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی وہ لوگ کبھی کہیں گئے تھے اور نہ ہی گاؤں سے یازمینوں سے کبھی کوئی آتا تھا..... نہ کوئی ودھیالی رشتے دار آج تک اس نے دیکھے تھے اور پھر عثمان احمد صرف ماما کے سامنے ہی انکساری نہیں کرتے تھے بلکہ دوست احباب کے سامنے بھی اتنے ہی منکسر المزاج دکھائی دیتے تھے تھے حالانکہ اس نے تو جاگیر داروں زمینداروں کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ بڑے کرخت ہوتے ہیں اور پھر اکثر ٹی وی ڈراموں میں بھی اس نے دیکھا تھا۔

عثمان احمد ڈاکٹر ہادی کو ان کی گاڑی تک چھوڑنے باہر چلے گئے تو وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی نذیب عثمان احمد کے بیڈروم میں آئی۔ وہ نکیوں سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے ماما.....؟“

نذیب عثمان احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر آنکھیں موند لیں۔

”ماما“ وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”پلیز“ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈپریشن نہ ہوا کریں۔“

”یہ..... یہ چھوٹی بات تھی مومنو۔ تم نے شجی کا ہاتھ جھٹک دیا، اس کے ساتھ بدتمیزی کی۔ یہ چھوٹی بات تھی۔“

”اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ وہ کوئی حاکم نہیں ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔“

”مومنو۔“

عثمان احمد ڈاکٹر ہادی کو چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔

”تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ اپنی ماما کو ریٹ کرنے دو۔“

”عثمان یہ میری بیٹی ہے لیکن مجھ سے ضد کرتی ہے۔ بحث کرتی ہے۔ میری بات نہیں مانتی۔ مجھے تنگ کرتی ہے، جلاتی ہے۔“

وہ رونے لگیں۔ مریم خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ آتے آتے اس نے سنا۔ عثمان احمد پوچھ رہے تھے۔

”ہنسی تو ہوا اپیل جوس لوگی.....؟ لے لو نا پلیز۔“

وہ باہر آ کر پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی اور ریوٹ اٹھا کر ٹی وی لگایا۔ مختلف چینل بدلے لیکن کہیں کوئی اچھا پرگرام نہیں تھا۔ انڈین چینل پر کوئی انگلش مووی آرہی تھی۔ وہ بے دھیانی سے دیکھنے لگی۔ تب ہی عثمان احمد باہر آ گئے۔

”مومنو بیٹائی وی کی آواز آہستہ کر دو۔ تمہاری ماما ڈسٹرب ہوں گی۔“

اس نے مڑ کر عثمان احمد کو دیکھا اور ٹی وی بند کر دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں پھر وہیں ٹیک لگائے لگائے جانے کب سو گئی۔ رات بھی ٹھیک طرح سے نہیں سوئی تھی اور پھر اس سے پچھلی رات بھی بے چینی سی تھی۔ جانے کتنی دیر تک وہ سوئی رہی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ٹی وی لاؤنج کی لائٹ جل رہی تھی اور ماما کے کمرے سے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔

”تو ماما کی فرینڈز کو بھی ان کی بیماری کی خبر ہو گئی ہے اور اب وہ ان کی مزاج چرسی کے لیے آگئی ہیں.....“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ عجیب سی تھکن تھی اور اضطحال تھا۔ اس نے سوچا وہ ہاتھ لے لے۔ شاید یہ تھکن اور اضطحال کم ہو جائے۔

وہ کھڑی ہو گئی۔

”مومنو..... ڈارلنگ۔“

میڈم نرگس ماما کے بیڈروم سے جھانک رہی تھیں۔

”ڈرامہ کو بھیجنا جانی اور شریف سے کہنا کہ میرے لیے ۵۵۵ کا پیکٹ لے آئے۔“

سلک کی ملٹی کلر ساڈھی میں تیز میک اپ کے ساتھ وہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ لگ رہی تھیں۔

تیز سرخ لپ اسٹک سے لتھڑے ہوٹ۔

”کاش! یہ میڈم نرگس کبھی سرخ لپ اسٹک کی بجائے کسی اور کلر کی لپ اسٹک استعمال کر لیا کریں۔“

وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ جہاں صفو اور شریف حسب معمول بے حد مصروف تھے۔ صفو پکڑے تل

رہی تھی اور شریف چائے بنانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے میڈم نرگس کا پیغام دیا۔

”پکڑے کھانے کو دل چاہ رہا ہے ان کا۔“

صفو نے بتایا۔

”لیکن بین ختم ہو چکا تھا۔ ابھی شریف لے کر آیا ہے۔ بنالوں تو جاتی ہوں۔“

”شریف، تم جاؤ سگریٹ لے آؤ۔“

”جی بہتر۔ میں نے چائے دم کر دی ہے صفو۔“

”اچھا اچھا تم جاؤ۔ سگریٹ لے آؤ۔ میں چائے بنالوں گی۔“

صفو نے پکوڑے نکال کر پلیٹ میں رکھے۔

مریم کو بھوک لگ رہی تھی وہ وہیں کھڑے کھڑے چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر اس نے ایک کیک پیس اور دو تین پکوڑے پلیٹ میں رکھے۔ تب ہی میڈم کی آواز آئی۔

تیز چنتی ہوئی آواز۔

”الو کی پٹھی اتنی دیر ہو گئی ہے ابھی تک تمہارے پکوڑے نہیں بنے۔“

وہ کچن کے دروازے پہ کھڑی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ جوں ہی زبان سے کچھ کہیں تو فوراً پورا ہو جائے اور اگر ذرا دیر ہو جاتی تو بڑی فراخ دلی سے گالیاں دیتی تھیں۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے گالیوں میں ماسٹرز کر رکھا ہو..... ان کے فین اور ان کے چاہنے والے اگر جان لیں کہ ان کی پسندیدہ گلوکارہ جو عوام کے سامنے بہت نزاکتوں سے بہت اداؤں سے بات کرتی ہیں۔ جو شہر کے پوش علاقے میں رہتی ہیں۔ جن کا گھر اپنے علاقے کا سب سے بڑا اور خوبصورت گھر ہے۔ جن کے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور جنہوں نے اپنی ایجوکیشن یورپ میں مکمل کی ہے اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پڑھا ہے۔

وہ میڈم نرگس گھر میں نچلے طبقے کی خواتین سے بھی زیادہ گندے لہجے میں بات کرتی ہیں اور جن کے ہر جملے کے شروع میں ایک گالی ہوتی ہے۔

”دراصل آنتی وہ مین نہیں تھا گھر میں اس لیے دیر ہو گئی ہے اور میں نے شریف کو سگریٹ لینے بھیج دیا ہے۔“

”اوہ میری جان، تم یہاں کچن میں کیا کر رہی ہو؟“ میڈم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میں صفو کو بلانے آئی تھی چائے پینے کو جی چاہ گیا۔“

وہ پلیٹ اور کپ ہاتھ میں اٹھائے باہر آ گئی۔

”جانو یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔“

میڈم نرگس بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی دی لاؤنج میں آ گئی تھیں۔

”کتنی پہلی ہو رہی ہو تم۔ زین سے کہتی ہوں تمہارا خیال رکھا کرے۔ اتنی خوبصورت بیٹی کو مٹی میں

رول رکھا ہے۔“

”کچھ نہیں آئی میں تو اچھی ہوں۔ کالج سے تھکی ہوئی آئی تھی نا اس لیے۔ ابھی چائے پی کر ہاتھ لوں

گی تو فریش ہو جاؤں گی۔“

”جانو اپنا خیال رکھا کرو خود۔ اس عمر میں تو لڑکیاں چسکتی ہیں۔ لٹلش کرتی ہیں۔ تم اتنی بھیجی بھیجی رہتی

ہو۔ ڈارلنگ زندگی انجوائے کرو۔“

انہوں نے اس کے رخساروں پر بوسہ دیا اور مڑ کر صفو کو پکوڑے جلدی لانے کا کہہ کر زینب کے بیڈروم میں چلی گئیں۔ اس نے بے زاری سے کپ میز پر رکھا اور اپنے رخساروں کو صاف کیا۔ پتا نہیں کیوں اسے میڈم نرگس سے گھن آتی تھی۔ کراہت ہوئی تھی ان کے وجود سے۔ وہ جب بھی ملتی تھیں یوں ہی چٹاخ پٹاخ بوسے دیتی تھیں اور کتنی ہی دیر تک وہ گڑ گڑ کر رخسار صاف کرتی رہتی تھی حالانکہ میڈم ہر وقت خوشبودں میں بسی رہتی تھیں۔ اتنے خوبصورت کپڑے پہنتی تھیں کہ عاشری اور نینا تو انہیں بہت اشتیاق سے دیکھتی تھیں۔ ان کے کپڑوں پر بحث کرتی رہتی تھیں اور ان سے باتیں کر کے ان کا پیار وصول کر کے بہت خوش ہوتی تھیں۔

میڈم مشہور گلوکارہ تھیں۔

عوام نے انہیں ملکہ موسیقی کا خطاب دے رکھا تھا۔

اب تو کچھ عرصے سے انہوں نے گانا چھوڑ دیا تھا۔

اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن ان کا کہنا تھا کہ اب نئے لوگوں کو موقع ملنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں کہا تھا کہ ہم لوگوں کا فرض ہے کہ نئے آنے والوں کے لیے راستے خالی کر دیں..... میں مزید دس سال بھی ماسکتی ہوں۔ اتنے ہی سر اور خوبصورتی کے ساتھ لیکن میں نے نئے لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دی ہے۔ جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ انہیں گلے کا کینسر ہو گیا تھا اور امریکا میں دوا ایک آپریشن کروانے کے بعد انہوں نے گانے کو خیر آباد کہا ہے چنانچہ وہ خود ایسے لوگوں کو ہزار ہا گالوں سے نوازتی تھیں۔

کہتے ہیں ان کا تعلق ریڈ ایریا سے تھا۔

انہوں نے تین شادیاں کی تھیں۔

پہلی شادی ایک فلم پروڈیوسر سے کی تھی جنہوں نے ان کی آواز کو روٹاشاس کرایا تھا اور انہیں ریڈ ایریا سے باہر لائے تھے۔ اس شخص سے ان کے صرف دو بیٹے تھے۔

دوسری شادی انہوں نے ایک جاگیردار سے کی تھی جس سے ان کی صرف ایک بیٹی تھی اور اب تیسری شادی انہوں نے ایک ابھرتے ہوئے گلوکار سے کی تھی جو ان کے بیٹے کا دوست تھا۔

سید، گھرانے کا یہ چشم و چراغ جو..... گلوکاری کے شوق میں میڈم نرگس کے گھر تک پہنچا تھا اور پھر میڈم کا طلب گار بن بیٹھا۔

سید امتیاز علی شاہ۔

ابھی حال ہی میں اس کی پہلی کیسٹ مارکیٹ میں آئی تھی اور خوب پک رہی تھی۔

یہ تین شادیاں تو وہ تھیں جو منظر عام پر آئی تھیں اور بقول ربی کے نہ جانے کتنی شادیاں ایسی ہوں گی منظر عام پر نہیں آسکیں۔ اس تیسری شادی سے بھی ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔

سات اور آٹھ سال کے بہت ہی پیارے بچے تھے۔

”صفو۔ صفو۔“ میڈم کی تیز چیخنی آواز آئی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ مقبول سنگر رہی ہوں گی۔ اس نے خود ان کے گانے سنے تھے۔ بہت خوبصورت آواز بھی، روح میں اترتی ہوئی سی لیکن اب تو ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی اور شاید یہ سچ ہی ہو کہ ان کے گلے کا کوئی خطرناک آپریشن ہوا تھا۔ جب وہ تیز بولتی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ جیسے بیٹیاں نعرہ رہی ہوں۔ اب وہ اپنی بیٹی کو گانا سکھا رہی تھیں لیکن ابھی تک اس نے ٹی وی فلم یارڈیوں کے لیے نہیں گایا تھا۔ لیکن نجی محفلوں میں اس کی آواز سننے والوں کا کہنا تھا کہ

لوگ میڈم کی آواز کو بھول جائیں گے۔

اتنا ہی سوز اور رس تھا اس کی آواز میں۔

صفو ٹرائی ڈھکیلتی باہر آ رہی تھی۔

خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”جلدی کرو بھی صفو۔ اگر میڈم کا پارہ چڑھ گیا۔ تو وہ یہ ٹرائی تم پر ہی الٹ دیں گی۔“

”جی جی۔“ صفو بھی مسکرا دی ”ان کا غصہ ایسا ہی ہے جی۔ اس روز شریف پر پانی کا گلاس الٹ دیا تھا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تیمور کے کمرے میں جھانکا۔ تیمور اور نینا ڈر سے پڑھ رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“ ٹیوٹر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”وعلیکم السلام،“ پلیز آپ بیٹھیں۔ میں یوں ہی بچوں کو دیکھنے چلی آئی تھی۔ مور کیا ہے پڑھائی میں؟“

”بہت تیز۔“

اور وہ سر ہلاتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

باتھ لے کر جب وہ باہر آئی تو بچے ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ نینا اور تیمور گیم میں الجھے ہوئے تھے جبکہ شی کوئی میگزین کھولے بیٹھی تھی۔

”اندر بہت مٹھن ہے۔“

وہ تینوں کو لے کر باہر لان میں آگئی۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ چوکیدار کرسی بچائے گیٹ کے پاس بیٹھا تھا۔ تیمور اور نینا کھینے چلے گئے۔ عاشر اور وہ انہیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور ہنسنے کودتے دیکھنے میں۔ کچھ دیر بعد نینا عاشر کو بھی کھینچ کر لے گئی۔

”آئیں نا آئی ہمارے ساتھ کھیلیں۔“

تیمور اپنی ٹرائیکل دوڑانے لگا۔ عاشر اور نینا بیڈ منٹن کھیلنے لگیں۔ شیر خان نے باہر کی بتیاں جلا دی تھیں وہ کھلے بال پشت پر بکھرائے انہماک سے عاشر اور نینا کو کھیلتے دیکھ رہی تھی کہ اندر سے آتے شرجیل مرزا نے اسے دیکھا۔ مدہم روشنی میں پشت پر..... بال بکھرائے عاشر کو دیکھتی وہ شرجیل کو بہت خوبصورت لگی۔ وہ پورچ کی طرف جانے کے بجائے ہولے ہولے چلتا اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

”ہیلو مس احمد۔“

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور شرجیل مرزا کو دیکھ کر اس کی پیشانی حمن آلود ہو گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”اچھی ہوں۔“

”اچھی تو خیر آپ ہیں ہی۔“ وہ مسکرایا۔

اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کوئی سخت سا جواب دے لیکن ماما کے خیال سے وہ چپ کر گئی۔

یہ ضرور ان سے میری شکایت کر دے گا اور پھر خواخواہ ٹینشن بڑھے گی۔

”مس احمد، کیا واقعی آپ کو احساس نہیں ہے کہ آپ کتنی حسین ہیں اور آپ کا حسن کسی کے دل پر بجلیاں گراتا ہے اور...“

”شٹ اپ۔“ وہ ساری احتیاطیں بھول گئی۔

”میں اس طرح کی گفتگو سننے کی عادی نہیں ہوں مسٹر شرجیل۔ ایسی باتیں آپ ماما سے کیا کریں۔“

”آہا۔“ وہ ہنسا۔

”ماما..... تمہاری ماما۔“

”آپ غالباً گھرواپس جا رہے تھے اور آپ کی گاڑی ادھر کھڑی ہے۔ آپ کو راستہ معلوم نہ ہو تو میں شیر خان کو آواز دوں۔“

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

شرجیل مرزا کے مسکراتے ہونٹ بھیج گئے۔

”راستہ تو آپ کو معلوم نہیں مس احمد اور میں ہیکے ہوؤں کو اپنے راستے پر لانا بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ تیز قدم اٹھاتا پورچ کی طرف بڑھ گیا اور بڑھ حال ہی ہو کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔



سکندر کو آگئی کیا ملی تھی، اضطراب اور بڑھ گیا تھا لیکن اب کے اضطراب کی نوعیت مختلف تھی۔ اب اسے استقامت ختم ہونے کا انتظار تھا۔ بابا کا حکم تھا کہ وہ اب امتحان سے پہلے گاؤں نہ آئے اور جانے کب

”نہیں یار چوڑیاں نہیں کوئی اچھا سا پر فیوم قیمتی سا“، محسن وقار کے خیالات ذرا بلند تھے۔

”یوں بھی خوشبو سے بڑھ کر کوئی اور تھوہ نہیں ہو سکتا۔“

”یہ تو ہے یار لیکن یہ بھی تو سوچو وہ ایک دیہاتی لڑکی ہے۔ اس کے لیے چوڑیاں ٹھیک رہیں گی۔“
صبح صادق کو محسن وقار کی باتوں سے اتفاق نہیں تھا۔

”ایسا کرنا یا زخم اس کے لیے چوڑیاں اور ایک اچھا سا سوٹ پیس لے جانا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ“
تم اس لڑکی کے لیے سنجیدہ ہو یا اپنے محسن بھائی کی طرح یوں ہی دل لگی کر رہے ہو۔“

اس کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا۔ وہ جو ہمیشہ لفظوں کی کمی کا شکار رہتا تھا، ایک دم تیز تیز بولنے لگا۔

”نفعلی باتیں مت کرو۔ وہ میرے چاچا کی بیٹی ہے، سکے چاچا کی۔ بس وہ مجھے اچھی لگی ہے اور مستقبل میں میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں اور میں کوئی فلرٹ نہیں کر رہا ہوں، محسن وقار کی طرح۔ نہ میں تم لوگوں جیسا ہوں لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے والا۔“

”سوری یار۔“ صبح صادق شرمندہ ہو گیا۔ ”ہم سمجھ رہے تھے کہ تم۔۔۔۔۔“

”غلط سمجھ رہے تھے تم۔۔۔۔۔“ وہ ابھی تک غصے میں تھا۔

”پلیز، اب غصہ ٹھوک دو۔۔۔۔۔“ صبح صادق نے اسے منایا۔

”اور میں۔۔۔۔۔ میں بھی لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ اپنی اس انیس سال اور پانچ ماہ کی زندگی میں ایک بار بھی کسی لڑکی کے پیچھے نہیں بھاگا، بلکہ لڑکیاں خود میرے پیچھے بھاگتی ہیں۔“

”دراصل یہ جو تیری شکل ہے، بقول تمہارے اس فاسٹ فرینڈ کے دیسی کھیرے جیسی ہے اور وہ بے چاری لڑکیاں دیسی کھیروں کے لیے ترسی ہوئی ہوں گی۔“

صبح صادق نے پھیڑا لیکن اس نے صبح صادق کی بات کا کوئی ٹوٹس نہ لیا اور بدستور سکندر کی طرف متوجہ رہا۔

”یقین نہ آئے تو اس صبح صادق کے وقت پیدا ہونے والے کر لیے سے پوچھ لو۔“

(صبح صادق چونکہ صبح صادق کے وقت پیدا ہوا تھا اس لیے اس کے دادا نے اس کا نام صبح صادق رکھ دیا تھا)

سکندر کا موڈ قدرے بہتر ہو گیا تھا اور وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

”ابھی چھٹیوں میں کیا ہوا تھا، بتاؤ نا اسے۔“

محسن وقار نے صبح صادق کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا تھا؟“

صبح صادق جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

پیر زخم ہوں اور کب وہ گاؤں جائے اور رضوانہ کو بتائے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے۔ وہ اسے سوچتا رہا اور لاہور میں اتنے دن اس نے اس کے بغیر کیسے گزارے ہیں اور یہ کہ اس نے اسے کیسے اور کس طرح یاد کیا ہے۔ اس کے پاس تو اتنے لفظ ہی نہ تھے۔ وہ تو بچپن سے ہی بہت کم گو تھا، اسے تو صحیح طرح سے اپنی خواہشات کا اظہار کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہ تو بھلا اور بابا تھے جو اس کی ضرورتوں کو خود ہی جان لیتے تھے۔ اس کی کاپیاں ختم ہو جاتیں تو وہ سوچتا ہی رہ جاتا کہ بابا کو کیسے بتائے کہ اس کی کاپیاں ختم ہو گئی ہیں۔

بابا خود ہی پوچھ لیتے ”سکندر نے کوئی کاپی کتاب تو نہیں چاہیے۔“

جوتے پھٹ جاتے تو وہ یوں ہی گھینٹا پھرتا۔ اسے خود پروا تک نہ ہوتی۔ بھابو کی یا بھائی کی نظر پڑتی تو وہ اسے ٹوکتے۔

”سکندر پتر تیرے جوتے پھٹ چکے ہیں۔ تو نے بتایا ہی نہیں۔“

”بس یوں ہی بتانا تو تھا۔“

”یاراں کچھ منہ سے خود بھی بولا کر۔“

پراس کے پاس تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے بھی لفظ نہیں ہوتے تھے۔ اسکول میں انعام ملتا تو اس کے اندر جوش سا بھر جاتا تھا اور وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتا ہوا گھبراتا تھا لیکن گھر آتے ہی سارے الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ اور وہ خاموشی سے انعام میں بیٹا ہوا کپ یا کتاب کا ٹکڑا پر رکھ دیتا۔ بابا کی نظر پڑتی تو پورے گھر میں ان کی آواز گونجتی۔

”ارے انعام جیتا ہے میرے سکندر نے۔“

ماں جی بھی ہاتھ پونچھتی باورچی خانے سے باہر آ جاتی تھیں۔ اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چومتیں۔

”کس چیز میں انعام جیتا ہے تو نے۔“

”پڑھائی میں۔“

”کھیلوں میں؟“

بابا پوچھتے رہتے اور وہ صرف ہوں ہاں میں جواب دیتا۔

اور اب اتنی بڑی بات کہنے کے لیے تو بہت سے الفاظ چاہیے تھے نا۔ وہ جب پڑھ پڑھ کر تھک جاتا تو دل ہی دل میں لفظ جوڑنے لگتا۔

”یار ایسا کرنا اس کے لیے کوئی تحفہ لے جانا۔“ محسن وقار اپنے تجربہ کی بنا پر اسے مشورہ دیتا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ سوچتا۔

”لیکن کیا؟ کیا لے کر جاؤں۔“

”چوڑیاں۔“ صبح صادق کہتا۔

”تمہارا سر ہوا تھا۔ یاد نہیں ہے۔ وہ لڑکی نیلی سوزو کی والی۔ تم بھی اس روز میرے ساتھ تھے۔ ہمارے گاڑی بیڑوں پمپ کے پاس رکی تھی تو کیسے اچک اچک کر دیکھ رہی تھی۔“
”ہاں بعض بچے چڑیا گھر جاسیں تو ایسے ہی اچک اچک کر پنجروں میں دیکھتے ہیں۔“
”یکے جاؤ۔“ وقار محسن سکندر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اور پتا ہے سکندر ملک چند دن بعد میں نے اس لڑکی کو اپنے گاؤں میں دیکھا۔ اپنے ماموں کے گھر کے سامنے۔ وہ میری کزن کی دوست تھی اور پھر پتا نہیں کیسے..... کیسے اسے پتا چل گیا اور اس نے کمر طرح میری کزن سے میرا فون نمبر لے لیا اور پھر جتنے دن میں وہاں رہا وہ مسلسل مجھے فون کرتی رہی۔“
”تو ظہرا امیر کبیر جدی پشتی زمین دار کا پتر۔ لڑکیاں تو تیری طرف ایسے لپکتی ہیں جیسے کھیاں شیرے پر لپکتی ہیں اور پھر وہیں چپک کر رہ جاتی ہیں۔ اہمیت تیری نہیں میری جان تیرے ماں باپ کی دولت کی ہے۔“

”مجھ صادق اس کی اہمیت ماننے کے لیے کسی طور تیار نہ تھا۔“
”تو اس سارے قصے کا مقصد یہ ہے سکندر یا رکہ میں لڑکیوں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ اس وقت میں ذمال تک جا رہا ہوں۔ آنکھیں سینکنے بلکہ دل جگر روج سب کچھ سینکنے کا موقع ملے گا۔ جہاں شرفا بھی چاگاہے تم لوگ چلنا چاہو تو بندہ حاضر ہے۔“
”چل اٹھ ملک۔ چوہدری کے پتر کی دوستی کا فائدہ اٹھائیں۔“
”مجھ صادق زبردستی اسے بھی ساتھ لے گیا۔“



آخری پیر دے کر وہ کالج سے ہی اتار رکھی چلا گیا تھا اور پھر ایک گھنٹا بنا بازار اتار رکھی کا چکر لگا کر انے رضوانہ کے لیے سبز چوڑیاں اور سبز سوٹ خریدا تھا۔ پھر بھی وہ متذبذب تھا۔ پتا نہیں رضی کو یہ چوڑیاں اور سوٹ پسند بھی آئے گا یا نہیں۔ خیر پسند نہ آیا تو اس سے اس کی پسند پوچھ لوں گا اور چوڑیاں بھی اگر چھو ہوئیں تو نئی خرید دوں گا اگلی بار آؤں گا تب۔

رضی کے لیے کچھ خریدنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔
کتنا خوش کن اور خوبصورت احساس ہے اس شخص کے لیے کچھ خریدنا جو تمہیں محبوب ہو بہت پیارا اسے بھی انہونی سی خوشی ہو رہی تھی۔ جیسے وہ بڑا معتبر ہو اور اگر کبھی رضی میرے ساتھ ہوتی اور ہم دونوں کر شاپنگ کرتے۔

میں رضی کے لیے مہر ساری شاپنگ کرتا۔
اس نے اپنے ارد گرد شاپنگ کرتے ہوئے کئی جوڑوں کو دیکھا اور سوچا۔
”کسی دن میں اور رضی بھی یوں ہی ان کیلوی کی طرح شاپنگ کریں گے۔ ایک دوسرے سے مشور

کے ایک دوسرے کی پسند پوچھ کر۔“

ہاشل آ کر اس نے چوڑیاں اور سوٹ جلدی سے اٹیچی میں چھپا دیا۔
”مجھ صادق باتھ روم میں تھا اور محسن وقار ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔“
”اب ملک کہاں غائب تھے؟“
”کہیں نہیں باہر گیا تھا۔“

”اور ہاں صندوق میں کیا چھپا رہے تھے؟“
”کچھ نہیں کپڑے نکالے لگا تھا۔ باتھ لینے کے لیے۔ پھر خیال آیا باتھ روم میں تو مجھ صادق ہے۔ تین گھنٹے سے پہلے برآمد نہیں ہوگا۔“
”ہاں یا رکہ جب سے پیدا ہوا ہے نہا نہا کر اپنی کالک اتارنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پھر بھی کالک اسی طرح ہے۔“

محسن وقار نے مجھ صادق کے رنگ پر چوٹ کی۔
باتھ روم سے مجھ صادق کے گنگناؤنے کی آواز آرہی تھی۔
”عاشقاں تو سوئو اکھڑا چھپاؤ لانی
بجائے بونے اگے چک تان لانی..... چک تان لانی
اورے گھر نمی نمی بل دی۔“
”اب بتی بھاکر باہر آ جا تیری کالک اس طرح نہانے سے نہیں اترے گی۔“

محسن وقار نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔
”من کالکس اتار پیارے۔ چرے کی سیاہی خود ہی دھل جائے گی۔“
وہ واپس آ کر سکندر کے پاس بیٹھ گیا۔

”سکندر یا رکہ تیرے پیر تو بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ تیرا تو میڈیکل کالج میں ایڈمیشن پکا۔“
”کیوں کیا تمہارے پیر اچھے نہیں ہوئے؟“

سکندر کو حیرت ہوئی کیونکہ محسن وقار ہمیشہ ان دونوں سے زیادہ نمبر لیتا تھا۔
”ہاں یا رکہ ایک پیر کچھ خراب ہو گیا ہے فزکس کا۔“

”تیرے پیو کا پیسہ کس دن کام آئے گا میری جان۔“
”مجھ صادق تو لیے سے سر پونچھتا ہوا باتھ روم سے باہر نکل آیا۔“
”ہر جگہ پیسہ کام نہیں آتا یا رکہ۔“

”رہنے دے یا رکہ پیسہ ہو تو سب کام یوں ہو جاتا ہے چنگی بجانے میں۔“

”مگر یار۔ میرا تو ایک جواب ہی غلط ہو گیا ہے۔ کیا پیسے سے وہ غلط ٹھیک ہو جائے گا؟“

”تیری معلومات صرف حسیناؤں تک محدود ہیں۔ میری جان کون سا کام ہے جو یہاں نہیں ہو سکتا۔ بس پیسہ چاہیے۔ لاسٹ ایئر میرے ماموں کے بیٹے کے کچھ پیسے رکھنا اچھے نہیں ہوئے تھے۔ وہ شیر کا بچہ ایسا پیسوں کے پیچھے بھاگا کہ اب میڈیکل کالج میں ہے۔“

”واقعی؟“ محسن وقار کو حیرت ہوئی۔

(ان دنوں بوٹی مافیا کا اتنا زور نہیں تھا)

”تو بھی بے فکر رہ اپنے چوہدری باپ کے کان میں یہ بات ڈال دے۔ پھر دیکھنا تیرا باپ تو بلدیہ کا چیئر مین بھی ہے۔ انشاء اللہ تو بھی ہمارے ساتھ ہی ہوگا کالج میں۔“

”تمہارے ساتھ۔ کیا تمہیں اتنا یقین ہے اپنی کامیابی کا۔“

”بالکل۔ ہم ہر کام یقین سے کرتے ہیں چوہدری صاحب۔ یقین کرنے والوں کے بیڑے پار۔“

”کیوں سکندر تمہیں بھی یقین ہے کہ تم اتنے نمبر حاصل کر لو گے کہ میڈیکل میں جاسکو۔“

محسن نے سکندر سے پوچھا تو سکندر سوچ میں پڑ گیا۔

”پتا نہیں یار۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاید میں اتنا پڑ یقین نہیں ہوں۔“

اس نے چوڑیاں بھی خرید لی تھیں اور سوٹ بھی لے لیا تھا لیکن اب اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں رضی کو اس کی یہ جسارت بری نہ لگ جائے۔ کہیں وہ چاچا سے نہ کھدے اور وہ اسے غلط لڑکا نہ سمجھ لیں۔

”یقین پختہ ہو تو منزلیں خود ہی سر ہو جاتی ہیں۔“

صبح صادق نے سکندر کے سر پر ہولے سے چپت لگائی۔

”تو بھی یقین پختہ رکھ میری جان۔“

”تو یہ فلسفی کب سے ہو گیا ہے؟“ محسن ہنسا۔

”ابھی ابھی بنا ہوں۔“

صبح صادق آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنانے لگا۔

”یہ اتنے جگدجگ کس لیے رہے ہو۔ کسی سے ملنے جانا ہے؟“

محسن وقار صبح صادق کو تیار ہوتے دیکھ رہا تھا۔

”ہم نے کس سے ملنا ہے بھی۔ تمہارے سامنے ہماری وال کب گنتی ہے۔ بھائی تمہارے ساتھ جو رہتا ہوں تو لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ تم نے مجھے نظر کے ٹیکے کے طور پر ساتھ رکھا ہوا ہے۔“

”تو نظر کے ٹیکے صاحب یہ بناؤ سنگھار کس خوشی میں؟“

”صبح ہم چلے جائیں گے۔ پھر جانے کب آئیں۔ آئیں یا نا آئیں۔ آج گھومیں گے، اتار کلی

جائیں گے، لبرٹی کا چکر لگائیں گے۔ مال کو اپنے قدموں سے روندیں گے اور پھر چوہدری صاحب سے چرغا کھائیں گے، کوک بیٹیں گے اور واپس آکر سو جائیں گے پھر صبح سویرے اٹھ کر اپنے اپنے گاؤں سدھاریں گے۔ ایک نامعلوم مدت کے لیے اور کون جانے پھر ملیں گے بھی یا نہیں۔ کس کو کہاں داخلہ ملے اور کوئی کہاں چلا جائے۔ سویار تم لوگ بھی جلدی تیار ہو جاؤ۔ آج خوب انجوائے کریں گے۔“

”ہم راہ پر نہیں گے ایک دوسرے سے۔“

محسن وقار اداس ہو گیا۔

”سکندر یار ہمارے خطوط کے جواب ضرور دینا۔ کبھی لاہور آؤ تو فون کر لینا۔ ہمارے گاؤں میں تو فون کی سہولت بھی ہے۔“

”تم لوگ بھی کبھی ہمارے گاؤں میں آنا۔“ سکندر نے دعوت دی۔

”اگرچہ ہمارا گاؤں تمہارے گاؤں کی طرح ترقی یافتہ نہیں ہے۔ وہاں تو ابھی بجلی بھی نہیں ہے۔“

”ہمارے گاؤں میں بھی کبھی بجلی نہیں ہوتی تھی لیکن ہمارا گاؤں شہر سے ملحق ہے۔ صرف پندرہ منٹ کے راستے پر۔ شہر پھیلا تو گاؤں شہر کے زیادہ قریب ہو گیا اور ہر طرح کی سہولت وہاں ہو گئی۔ ورنہ پہلے تو سڑک بھی کچی تھی۔“

”اسٹیشن سے آگے ہمارے گاؤں تک بھی کچا راستہ ہے۔ اسٹیشن سے تانگے مل جاتے ہیں۔ یا رتم ضرور آنا۔ خط لکھ دینا مجھے میں اسٹیشن تک آ جاؤں گا لینے۔“

سکندر بھی اداس ہو رہا تھا۔ محسن وقار اور صبح صادق دونوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ پہلے دن جب وہ بھانڈا کے ساتھ اس کمرے میں آیا تھا تو بہت خوف زدہ تھا۔ جانے کیسے لوگ ہوں گے جن کے ساتھ اس نے اس کمرے میں دو سال تک رہنا تھا۔ بھانڈا نے تو اسے بہت ڈرایا تھا۔ خوف زدہ کیا تھا۔

”بہت جلدی کسی پر اعتبار مت کرنا۔ اپنی پڑھائی پر زیادہ دھیان دینا تمہیں ڈاکٹر بننا ہے اور یہ صرف تمہاری ہی نہیں، ہم سب کی خواہش ہے۔ ہمارے گاؤں کو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے سکندر۔“

وہ اندر سے سہما سہما بیٹھا تھا کہ وہ دونوں آگئے۔ محسن وقار اور صبح صادق۔ ہنستے مسکراتے بہت مطمئن اور پر اعتماد۔ دونوں کا تعلق ایک ہی گاؤں سے تھا۔ شاید اسی لیے وہ بہت پر اعتماد لگ رہے تھے۔ تعارف کے بعد وہ فوراً ہی بے تکلف ہو گئے تھے لیکن اسے ان کے ساتھ گھلنے ملنے میں بہت وقت لگا تھا۔

”یار دُیہ دو سال کا عرصہ بہت جلدی نہیں گزر گیا۔“

صبح صادق آئینے پر نظر ڈال کر ان کے قریب آ بیٹھا۔

”ہاں شاید لیکن بہت اچھا وقت گزرا اور خدا کا شکر ہے کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے تھے اسے حاصل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔“

سکندر نے شکر ادا کیا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ گھومنا پھرنا، شوخیاں شرارتیں اپنی جگہ۔ پڑھائی اپنی جگہ۔“

محسن وقار نے اس کی تائید کی۔

”میرے والدین کو بڑا ڈر تھا کہ میں لاہور جا کر پکا پکڑ جاؤں گا۔ اسی لیے تو ان کا خیال تھا کہ میں اپنے شہر سے ہی ایف ایس سی کروں لیکن میں نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا جہاں اپنا یار جائے گا وہاں ہم۔ چلو اب تم دونوں اٹھو۔ اس نے تو ابھی اپنی چیتوں کو خدا حافظ کہتا ہے۔ اس آدھے جاگیر دار نے۔“

”کہہ دیا ہے یار۔“ محسن نے بتایا۔

”اس پیلانے تو رو کر آنکھیں سجائی تھیں۔“

”ویسے یار یہ لڑکیاں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں۔ کتنی آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہیں۔“

”کبھی کبھی بے وقوف بنا بھی دیتی ہیں۔“

”ہاں لیکن کبھی کبھی زیادہ بے وقوف تو خود ہی بنتی ہیں۔“

”ویسے ایک بات ہے یہ آج کل کی لڑکیاں کچھ زیادہ ہی ماڈ ہو گئی ہیں۔“

محسن وقار اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ ماڈ لڑکیاں دیکھنے اور وقت گزارنے کے لیے ہوتی ہیں، گھر بسانے کے لیے نہیں۔“

اور سکندر کے سامنے رضوانہ آگئی۔ نازک سی چھوٹی موٹی، شرماتی ہوئی، بھاگ کر کام کرتی، چاچی کا سر دباتی، چاچا کے حقے کے لیے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ٹین کے پترے پر آگ رکھ کر لاتی ہوئی، ”گھر تو رضی جیسی لڑکیاں ہی بسا سکتی ہیں۔“

پھر وہ تینوں باہر نکل گئے۔ اس رات انہوں نے بہت انجوائے کیا، خوب گھومے۔ نو سے بارہ کا قلم کا شوق دیکھ کر جب وہ واپس آئے تو بہت تھک چکے تھے لیکن پھر بھی کسی کا سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ محسن صادق اپنے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”آج کوئی نہیں سوئے گا۔“

تینوں کا سامان پیک کیا ہوا کمرے کے وسط میں پڑا تھا اور کمرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ریلوے اسٹیشن کا وینٹک روم ہو۔ محسن وقار نے اپنا بستر بھی ہولڈال میں بند کر دیا تھا اور ابنگلی چار پائی پر سو رہا تھا۔ سکندر نے اپنی چار پائی سے چادر اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔

”یار یہ بچھا لو۔“

محسن صادق اور سکندر نے اپنے بستر نہیں باندھے تھے۔

محسن وقار نے متاثر ہو کر کہا اور اٹھ کر اپنے بیگ سے کارڈ نکالے یا پھر وہ کارڈ زکھیلے رہے۔ ہنستے رہے اور گزرے ہوئے دوسالوں کا ایک ایک لمحہ یاد کرتے رہے اور جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو دور کی مسجد

بھی میں یوں ہی کبھی کبھی کھروری چار پائی پر سو جایا کرتا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا، نیلے آسمان تلے تاروں کو نکتے ہوئے کھروری چار پائی پر سونا۔ روح میں نازکی سی آجاتی تھی۔ ہمیں پتا ہے، میں اپنے چاچا کے گھر صرف اس لیے نہیں رہا کہ وہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ فوم کے گدے آگ لگا دیتے ہیں بدن میں۔ سوچتا ہوں، ان نرم ملائم گدوں پر سونے والوں کا جسم سڑ نہیں جاتا کیا؟ اور یاریہ بات جب میں نے اپنے ابا کو بتائی تھی..... تو وہ دیر تک ہنستے رہے تھے اور پھر کہا تھا۔

”یار تو بچ کہتا ہے۔ مجھے بھی تیرے چاچا کے گھر نیند نہیں آتی اور تیری ماں کا بھی دم گھٹتا ہے۔ ہم تو پرانے وقتوں کے لوگ ہیں۔ پر تو تو نئے زمانے کا ہے، تجھے کیوں پسند نہیں ہے، ان گدوں پر سونا۔ تیری ماں تو کہتی ہے یار۔ ان فوم کے گدوں پر بند کمروں میں سونے والوں کی روئیں سڑ جاتی ہیں۔ بسا نہ آنے لگتی ہے ان کی روئوں سے۔ اب دیکھ لے تیرا چاچا بھی اپنی مٹی کی خوشبو کو بھول گیا ہے۔ انہی گلیوں میں، اسی مٹی میں رل کر پلا ہے وہ اور اب گاؤں آئے تو دودن رہنا محال ہو جاتا ہے اس کے لیے۔“

”یار تیرا باپ بھی تیری طرح وڈا چوہدری نہیں لگتا۔ چوہدریوں والی کوئی خوبی ہی نہیں ہے اس میں۔ سب سے انکساری سے ملتا ہے۔ گاؤں والوں کے مرن جین میں شریک ہوتا ہے۔ یار اپنے باپ سے کہہ کوئی چوہدریوں والا رعب شوب پیدا کرے۔ کوئی آداب سکھا دے اسے چوہدریوں والے.....“ صبح صادق نے اسے مشورہ دیا۔

”تو یہ مشورہ خود ہی دے دینا جا کر۔“ محسن وقار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تیرا باپ بھی کیا ایسا ہی چوہدری ہے اپنے محسن وقار کے ابا کی طرح۔ سیدھا سا مسلمان۔ نہ آگے نہ پیچھے بندوق بردار نہ کرائے کے غنڈے۔“

محسن صادق نے خاموش بیٹھے سکندر سے پوچھا۔

”ہاں میرے ابا تو اس کے ابا سے بھی گئے گزرے ہیں۔ سیدھے سادھے منکسر المزاج۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر عمل کرنے والے کہ کوئی ایک مال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گل بھی آگے کر دیں۔ یوں بھی ہم چھوٹے موٹے چوہدری ہیں۔ تھوڑی سی زمین ہے خوشحالی ہے بس۔ وہ حویلیوں والے چوہدری یا وڈیرے نہیں ہیں۔ تم لوگ گاؤں آنا، بابا سے ملنا۔ بہت محبت کرنے والے چاہنے والے ہیں میرے بابا۔ وہ تمہیں بھی اپنی محبتوں کے سائے تلے لے لیں گے۔ اپنی محبتوں کی بارش میں بھگو دیں گے تمہیں اور میری ماں جی۔ ان کی تخلیق ہی محبتوں کی مٹی سے ہوئی ہے۔ تم ضرور آنا یار۔“

”انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔“

محسن وقار نے متاثر ہو کر کہا اور اٹھ کر اپنے بیگ سے کارڈ نکالے یا پھر وہ کارڈ زکھیلے رہے۔ ہنستے رہے اور گزرے ہوئے دوسالوں کا ایک ایک لمحہ یاد کرتے رہے اور جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو دور کی مسجد



”ماں جی خیریت ہے نا، آپ اچانک کیسے آگئیں۔“ پروفیسر عادل گھبرائے ہوئے سے کمرے میں داخل ہوئے۔

”خیریت ہی ہے پتر۔ بس تمہارے لیے دل بہت پریشان تھا۔ دیکھنا چاہتی تھی تمہیں۔“

”آپ نے کیوں تکلیف کی ماں جی۔ مجھے بلالیا ہوتا۔ میں آجاتا۔ یوں بھی مجھے آنا تو تھا ہی۔“ پروفیسر عادل نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں اور پھر آنکھوں سے لگایا۔

ماں جی نے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام کر ان کی پیشانی چومی۔

”تم کہاں ہوتے ہو عادل۔ انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ تین تین ماہ گزر جاتے ہیں، تم حویلی نہیں آتے۔ اب بھی چار ماہ ہو گئے تھے تمہیں حویلی آئے۔ پتا نہیں یہاں تم نے کیا کیا بکھیرے ڈال رکھے ہیں۔“

”کوئی بکھیرا نہیں ماں جی، بس زندگی گزارنے کے بہانے ہیں اور کیا۔“

”پتا نہیں عادل پتر تو زندگی سے اتنا خفا کیوں ہے۔“

”نہیں ماں جی، کہاں خفا ہوں۔“ وہ ہنسے، ”وہم ہے آپ کا۔“

”کئی دنوں سے بہت دل چاہ رہا تھا تمہیں دیکھنے کا۔ ایسے جیسے تمہیں نہ دیکھا، تمہیں نہ ملی تو دل پھٹ جائے گا۔“

”آپ نے مجھے فون کر دیا ہوتا تو میں حاضر ہو جاتا۔“ انہوں نے ماں جی کے ہاتھ پھر اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”میں نے سوچا تیرے کاموں کا حرج ہو گا اس لیے خود ہی مل آتی ہوں۔“

”نہیں ماں جی، کوئی بھی کام آپ کے حکم سے افضل نہیں ہے۔ میں آپ کی ایک پکار پر دنیا کا ہر کام چھوڑ سکتا ہوں۔ خواہ وہ میرے لیے کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ آپ کو سفر میں تکلیف ہوئی ہوگی۔“

”نہ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ فشی تھا ساتھ۔ پھر سنہراں تھی اور پھر سفر بھی کتنا ہے۔“

”خیر ماں جی، سفر تو بہت ہے۔ چھ گھنٹے کم تو نہیں ہوتے۔ میں خود تھک جاتا ہوں۔ میں بہت ندامت محسوس کر رہا ہوں ماں جی۔ آپ ایک فون ہی کروادیتیں۔“

”تم کہاں آتے ہو عادل۔ جب بھی تم سے فون پر آنے کو کہا تم نے ٹال دیا۔“

پروفیسر عادل نے نگاہیں جھکا لیں۔

”مگر آپ نے مجھ سے یہ تو نہیں کہا کہ آپ مجھے مس کر رہی ہیں۔“

”میں تو تمہیں ہر بل مس کرتی ہوں پتر لیکن تم پتا نہیں کیوں دھکے کھاتے پھر رہے ہو۔ کیا رکھا ہے اس نوکری میں۔ تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی۔ اپنے علاقے کو بناؤ۔ زمینوں کا کام دیکھو اور پھر علاقے میں تمہاری کتنی ضرورت ہے، تم کیا جانو۔“

”ماں جی، وہاں چاچا عبدالرحمن ہیں۔ بھائی سلطان اور مہران ہے۔ میری وہاں کیا ضرورت ہے۔ میرا اور طرح کا مزاج ہے۔ آپ جانتی ہیں، میں یہ زمین جائیدادوں اور ان کے چکروں میں اپنا آپ نہیں گوانا چاہتا۔“

”پر پھر بھی پتر، اپنی زمینوں کی کبھی کبھار تو خیر خبر لے لیا کرو۔ پتر تم تو بالکل ہی الگ ہو گئے ہو۔“

”فشی بابا ہیں اتنے دیانت دار دادا ان پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ یاد ہے کئی بار انہوں نے کہا تھا، فشی فضل داد جب تک ہے ہمیں اپنی زمینوں کی فکر نہیں ہے۔“

”پر پتر، فضل داد بھی کب تک ہے۔ بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہمت جواب دے رہی ہے اس کی۔“

”چاچا بھی تو ہیں نا ماں جی، ان کے ہوتے ہوئے آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ انہوں نے خود مجھے کہا تھا کہ میں اپنے علاقے اور زمینوں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔ وہ اور سلطان ہیں، سب دیکھ بھال کرنے کے لیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پتر۔ پر ایک بار تو حساب دیکھ لے سارا۔ زندگی کا کیا بھر سہا ہے۔ ایک بار اپنے چاچا سے بھی پوچھ لے، دیکھ لے تیری زمین کہاں کہاں ہے۔ کیا کچھ ہے تمہارے دادا نے مرنے سے پہلے ملتان والے مرنے بھی تیرے نام کر دیے تھے۔ تو ایک بار تو وہاں جا کر دیکھ آ۔“

”ٹھیک ہے ماں جی، چلا جاؤں گا۔ آپ کھانا کھا کر آرام کریں۔ اتنے لمبے سفر سے آئی ہیں۔“

”کھانا تو ہم نے راستے میں کھالیا تھا۔ چائے پیوں گی۔ اس کے میں نے بخشو بابا سے کہہ دیا ہے اور تم بیٹھو ادھر میرے پاس بہت باتیں کرنا ہیں تم سے بہت اداس ہو رہی تھی تمہارے لیے۔“

”کیا بات ہے ماں جی، آپ کچھ پریشان ہیں۔“

”نہیں ایسی کوئی خاص پریشان بھی نہیں ہوں لیکن۔“

”لیکن کیا ماں جی؟“ عادل نے بے چینی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں پتر۔ بس ایسے ہی وہم ہے شاید میرا۔“

”کیسا وہم ماں جی؟“

”ایسے ہی وہم ستاتے رہتے ہیں پتا نہیں کیوں۔ کچھ دنوں سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی میری مگرانی کر رہا ہو۔ کئی بار ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیچھے چل رہا ہو۔ مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔“

”حویلی کے ملازم ہی ہوں گے ماں جی۔ ان کے علاوہ کون ہو سکتا ہے کس کی جرأت ہے جو حویلی میں آئے۔“

”ہاں جرأت تو نہیں لیکن اس روز میں گودام میں گئی تو ایسے لگا جیسے کوئی میرے پیچھے اتر رہا ہو۔ مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ سنہرا اس آگے تھی میرے۔“

”گودام.....“ عادل کو حیرت ہوئی ”آپ وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟“

”نشی چاچا ضد کر رہا تھا کہ میں خود چل کر ایک بار گودام میں دیکھ لوں کہ گندم بیج سے کہیں بہت زیادہ بڑی ہوئی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دوڑک نکال دیں لیکن تمہارے چاچا کا خیال تھا کہ گودام میں جو اناج ہے وہ بس بیج کے لیے ہے یا سال بھر کے لیے۔ نشی کا خیال تھا کہ پچھلے سال بھی گندم ضرورت سے زیادہ رکھ لی گئی تھی۔ بعد میں تمہارے چاچا نے بتایا تھا کہ اسے گھن لگ گیا ہے اور یوں ہی اونے پونے فروخت کر دی گئی۔ یوں بھی پرانی اور گھن لگی ہوئی گندم کا آٹا بے کار ہوتا ہے۔ نہ روٹی کا حزانہ ذائقہ۔ ادھر بیڑا ہاتھ میں لو ادھر روٹی لٹک جاتی ہے۔ نرا چھان کا چھان۔ میں نے بھی سوچا ضرورت سے زیادہ رکھ کر کیا کرنی ہے۔ ماشاء اللہ خوب اناج ہوتا ہے۔ فکر کا ہے کی۔ چلی گئی دیکھنے۔“

”پھر.....؟“ عادل نے نظریں اٹھائیں۔

”واقعی گندم زیادہ تھی بہت زیادہ۔ اوپر سے نیچے تک گودام بھرا تھا۔ کئی ٹرک نکل سکتے تھے۔ میں نے عبدالرحمن بھائی سے کہا بے شک سودا کر دیں۔ گوجرانوالہ کے حاجی صاحب کئی دفعہ پوچھ چکے تھے کہ ہم نے انہیں گندم دینی کم کیوں کر دی ہے۔ ان کی فکورل کے لیے تمہارے دادا کے زمانے میں گندم ہمارے ہاں سے ہی جاتی تھی۔ اب جبکہ گندم پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو رہی ہے۔“

”پھر چاچا نے کیا کہا؟“

”کہہ رہے تھے کہ وہ گودام میں نہیں گئے تھے۔ یوں بھی گندم کی خرید و فروخت سلطان کے ذمے ہی ہے اور سلطان کا تو تمہیں پتا ہی ہے کتنا لا پرواہ ہے۔ یوں ہی کہہ دیا ہوگا۔ کام سے بھاگتا ہے۔“

”ہوں۔ نشی بابا سے کہیں نا، وہ خود دھیان رکھا کریں۔“

”ہاں وہ بے چارہ تو بہت دھیان رکھتا ہے۔ اسی کے کہنے پر تو میں گودام میں گئی تھی۔“

”مگر ماں جی یہ آپ کا وہم ہی ہے۔ اگر گودام کی سیڑھیوں پر کوئی آپ کے پیچھے ہوتا تو نظر آتا۔ اتنی

جلدی کہاں کہاں غائب ہوتا تھا اسے۔“

”ہاں شاید وہم ہی ہو لیکن ایک بار عجیب بات ہوئی۔ میں نہا کر نکلی تو کیلے کے چھلکے پر سے پاؤں

پھسل گیا۔ سنہرا اس پیچھے تھی اس نے تمام لیا۔“

”کیلے کا چھلکا.....!“ عادل کو حیرت ہوئی۔

”گھر میں کوئی بچہ نہیں۔ مٹی کا ذرہ تک تو حویلی میں نظر نہیں آتا پھر کیلے کا چھلکا کہاں سے آگیا۔“

”ہاں یہی تو حیرت ہے۔ سارا دن تو اپنی نوکرائیاں کام میں جتی رہتی ہیں۔“

”آپ نے پوچھا نہیں کہ چھلکا کہاں سے آیا؟“

”ایک ایک سے پوچھا سنہرا نے۔“

”کامل تو نہیں آیا تھا باہر۔“

”کہاں پتہ وہ کہاں آتا ہے باہر۔ پھر دو دن پہلے ہی تو بے چارہ پلنگ سے گر پڑا تھا۔ ماتھے پر چوٹ لگی۔ ٹانگے لگے تھے۔“

”مگر ماں جی کارپنٹ پر گرنے سے سر پر چوٹ کیسے لگی؟“

”پلنگ کا پایہ لگا تھا شاید۔“

”پر فیسر عادل کچھ لٹھ سے گئے۔“

”وہ پلنگ سے گرا کیسے۔ وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ گر جائے پھر کرم داد کہاں تھا؟“

”کرم داد کو تیرے چاچا نے کچھ دیر کے لیے باہر مردانے میں بلایا تھا۔ کوئی ضروری بات پوچھنی تھی۔

وہ واپس آیا تو گرا پڑا تھا اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔“

”اب کیسا ہے ماں جی وہ؟“

”زخم تو خشک ہو گیا ہے پتر۔ پرویسے اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو مجھے بھی

کبھی کبھی نہیں پہچانتا۔ حالانکہ پہلے کرم داد کے ہاتھ سے نہیں کھانا تھا تو میرے ہاتھ سے کھالیتا تھا مگر اب

موڈ نہ ہوتا مجھ سے بھی نہیں کھاتا۔ بیٹھے بیٹھے چیخنے لگتا ہے۔ تیرا چاچا کہہ رہا تھا کہ لاہور میں معذوروں کے

بڑے ادارے ہیں جہاں اس طرح کے ایٹارل بچے رکھے جاتے ہیں۔ وہاں ان کا بڑا خیال

رکھا جاتا ہے۔ اب تو کبھی کبھی کرم داد سے بھی نہیں سنبھالا جاتا۔ دروازہ بند رکھنا پڑتا ہے۔ تیرا چاچا تو کئی

دفعہ کہہ چکا ہے کہ اسے کچھ دنوں کے لیے کسی ادارے میں چھوڑ آتا ہوں لیکن میں نے منع کر دیا۔ ناراض

ہو رہا تھا کہہ رہا تھا بھر جانی ضد نہ کرو کامل کے لیے یہی بہتر ہے۔ عادل بھی ادھر نہیں ہوتا۔“

”مگر ماں جی میرے ادھر ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اتنے ملازم ہیں حویلی میں اور کرم

داد تو کامل کے لیے ہی مخصوص ہے اور پھر تین ماہ پہلے تو کامل کی حالت ایسی نہیں تھی۔“

”ہاں لیکن اب تو بہت جلدی جلدی دورے پڑنے لگے ہیں اور جب اسے دورہ پڑتا ہے تو مجھ سے

برداشت نہیں ہو سکتا۔ اس کی اذیت ناک چیخیں میں نہیں سن سکتی عادل۔“ ان کی آواز بھر گئی۔

”اچھا ماں جی ریلیکس ہو جائیں۔ میں دیکھوں گا کوئی ادارہ جہاں کچھ عرصے کے لیے اس کا علاج

ہو سکے تاکہ اس کی حالت قدرے بہتر ہو جائے۔“

”وہاں شاید کامی کی وجہ سے ہی میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ بس بغیر اطلاع کے ہی چلی آئی۔“

”ٹھیک ہے ماں جی اچھا کیا آپ نے۔“

پروفیسر عادل اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ خدا بخش چائے لے آیا تھا۔

”سنہرا، تم چائے بناؤ اور خدا بخش تم ماں جی کے لیے گیسٹ روم کھول دو۔“

”گیسٹ روم مت کھلو! عادل۔ ہم رات تک نہیں بٹھریں گے۔“

”اتنا لمبا سفر کر کے پھر آپ واپس جائیں گی۔ نہیں میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ کچھ دن یہاں

رہیں آپ میرے پاس۔ وہاں..... ایک ہی جیسے ماحول میں صبح سے شام کرنا۔ تھکا دیا ہے اس لگی بندھی زندگی نے آپ کو۔“

”پر میں وہاں کسی کو بتا کر نہیں آئی۔ تیرے چاچا کو بھی نہیں پتا اور گھر میں کرم داد اور مہر وز سے کہہ

دیا تھا کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ میں گئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، منشی بابا کو واپس بھیج دیتے ہیں اور آپ میرے ساتھ دو تین روز بعد چلی جانا۔ میں ایک

دو تین روز سرجن ہیں ان سے بات کروں گا، کامی کے متعلق کوئی ادارہ بھی دیکھوں گا، جہاں کچھ عرصے کے

لیے کامی کو رکھا جاسکے۔“

”میری عدم موجودگی میں کوئی کامی کو نقصان نہ پہنچا دے۔“

”کیوں ماں جی اس معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟“

”اس نے کسی کا کچھ بگاڑا تو نہیں ہے لیکن اس کے نام بھی زمین جائیداد تو ہے نا۔ تیرے دادا کو منہ بھی

کیا تھا کہ اس معصوم کے نام جائیداد کرنے کا فائدہ۔ پر کہتے تھے خدا خواستہ کوئی نہ رہا تو اس جائیداد کے

لیے ہی سہی کوئی اس کی دیکھ بھال تو کرے گا۔ جان انکی ہوئی تھی ان کی اس میں۔“

”ہاں ماں جی۔ دادا کامی کو بہت چاہتے تھے۔ وہ بھی انہیں بہت مس کرتا ہوگا۔“

”بہت بہت زیادہ۔ کہیں سے ان کی چھڑی اور ٹوپی اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ ہر وقت اٹھائے رکھتا

ہے..... رات کو سوتا ہے تو چھڑی پاس رکھ کر کہتا ہے کہ دادا ہے۔“ کبھی کبھی تو ٹوپی اور چھڑی کو سینے سے بھیج

کرایے بلک بلک کر روتا ہے کہ کرم داد بھی رو پڑتا ہے، دیکھا نہیں جاتا۔“

”مختبوت کی اپنی پہچان ہوتی ہے ماں جی۔ کامی ہوش و حواس بے گانہ ہے لیکن محبتوں کو پہچانتا ہے۔“

”ہاں، کبھی میرے کمرے میں آتا ہے تو تمہاری تصویر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ ”بھائی“ اور پھر تصویر کو

چومتا ہے۔“

پروفیسر عادل کی آنکھوں میں بھائی کے خیال سے آنسو آ گئے۔ ان کا یہ چھوٹا بھائی دماغی طور پر پیدا

معدور تھا۔ چھ سات سال کی عمر تک تو وہ اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بولتا بھی نہیں تھا۔ پھر مشہور نورو سرجن

ڈاکٹر جمعہ نے اس کے دماغ کے دو تین آپریشن کیے تو اس قابل ہوا کہ اٹھنے بیٹھنے لگا اور ایک ایک لفظ بولنے

لگا۔ پورا جملہ تو نہیں لیکن کوئی کوئی لفظ بولتا تھا۔ جیسے ماں دادا بھائی، کرم داد وغیرہ۔ جن دنوں وہ اعلیٰ تعلیم کے

لیے باہر گئے ہوئے تھے تو دادا نے اسے کسی ادارے میں داخل کروایا تھا جہاں اس نے اپنا کام خود کرنا سیکھ لیا

تھا۔ ہاتھ روم چلا جاتا تھا۔ اپنے کپڑے خود بدل لیتا۔ کھانا کھاتے ہوئے بابا باندھ لیتا۔ اپنی کھانسی کرتا تھا۔

عادل نے واپس آ کر اسے دیکھا تھا تو انہیں بہت خوش ہوئی تھی۔ جب وہ گاؤں جاتے تو ان کے ہاتھ پکڑ کر

ان کے ہاتھوں پر پیار کرتا۔ حلق سے خوشی بھری آوازیں نکالتا۔ ان کے ساتھ چٹ کر بیٹھ جاتا۔

”میں بھی کس قدر غرض ہو جاتا ہوں۔ اپنے آپ میں گم ہو کر ماں جی اور کامی کو بھول جاتا ہوں۔“

انہوں نے سوچا اور ماں جی کی طرف دیکھا۔

”ماں جی میں اب انشاء اللہ ہر ہفتے چکر لگایا کروں گا۔ دراصل ان دنوں کچھ زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔“

”..... نہ پتہ۔ ہر ہفتے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہم سا ہو گیا ہے کہ کوئی ہمیں

نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ تو اپنا دھیان رکھا کر۔ زیادہ گاؤں آنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں تو سوچ رہی

ہوں کہ یہاں کوئی باڈی گارڈ رکھ لوں۔ علاقے سے ہی کسی کو بھیج دوں گی۔“

”ماں جی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہ گھٹایا جاسکتا ہے اور نہ بڑھایا جاسکتا ہے۔ چاہے لاکھ باڈی گارڈز

ہوں۔ آپ کو یوں ہی وہم سا ہو گیا ہے۔ ہمارا بھلا کون دشمن ہے۔ جہاں تک کیلے کے چھلکے کی بات ہے تو

کوئی بھی پھینک سکتا ہے۔ کوڑے دان خالی کرتے وقت گر گیا ہوگا اور پھر کیلے کے چھلکے سے کوئی مرتا تو

نہیں ہے۔“

”دشمن جن تو خیر سب کے ہی ہوتے ہیں۔“ ماں جی نے چائے کا خالی کپ رکھا۔

”تم بھول گئے ہو۔ پچھلے سال جو نہر کے پیچھے والی زمین پر چاہ مراد کے چوہدری اللہ یار سے کھٹ

پٹ ہو گئی تھی اور اس نے دھمکی دی تھی۔“

”اوہ ماں جی۔ چوہدری اللہ یار بہت اچھا آدمی ہے۔ میں خود گیا تھا اس کے پاس اور اس کی بات غلط

ہرگز نہ تھی۔ زمین کا وہ ٹکڑا اسی کا تھا۔ میں نے اسی وقت وہ ٹکڑا اس کے حوالے کر دیا تھا۔ دستخط وغیرہ کر کے

رجسٹری بھی ہو گئی تھی۔ جب بھی ملتا ہے جھک کر ملتا ہے۔“

”ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھائی عبدالرحمن ہی کہہ رہے تھے کہ اس کے تیور صحیح نہیں لگتے۔ عادل کی

بکدوری نے اسے شیر کر دیا ہے۔ دراصل عادل نے زمین کا وہ ٹکڑا اس کے حوالے کر کے اس کے حوصلے

بڑھادیے ہیں۔ اب وہ نہروالی ساری زمین کا دعوے دار بننا چاہتا ہے۔“

”ارے نہیں، ماں جی۔“ عادل ہنس پڑے ”پتا نہیں کون چاچا جی کو الٹی سیدھی باتیں بتاتا رہتا

ہے۔ یقیناً سلطان ہی ہوگا۔ وہ قہر ل پیدا کر کے خوش ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ وہ سلطان کو

ادھر میرے پاس بھیج دیں۔ وہ یقیناً وہاں رہ کر نہیں سہر سکتا ہے۔“

”تیرے چاچا کی شہ ہے اسے۔ اللہ نے زمین دی لیکن یہ نہیں کہا کہ اس پر اکڑ کر چلو لیکن سلطان کیا کہوں بیٹا۔ بڑی اکڑ ہے اس میں۔ نشی بتا رہا تھا کہ ذرا سی بات پر غریب مزارعوں کو دھنک کر رکھ دیتا ہے۔“

”لیکن یہ تو غلط بات ہے ماں جی۔“ عادل کو فسوس ہوا۔

”غلط تو ہے بیٹا لیکن عبدالرحمن بھائی بھی تو اسے روکتے ٹوکتے نہیں۔“

”میں اب جاؤں گا تو اسے سمجھاؤں گا بلکہ اسے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ میرے پاس رہے گا۔ اہل علم و ہنر کی صحبت ہوگی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی کہوں گی عبدالرحمن بھائی سے کہ وہ سلطان کو تیرے ساتھ ہی بھیج دیں۔“

”اور مہراں کیسا ہے ماں جی۔ پچھلی بار گیا تھا تب بھی ملاقات نہ ہوئی۔“

”وہ اور مزاج کا ہے بالکل تمہارے دادا کی طرح خاموش اور اپنے آپ میں مگن۔“

”ہاں مہراں کا مزاج بہت مختلف ہے۔ باقی لوگ کیسے ہیں۔ چاچی بی آ یا اور حریم۔“

”سب اچھے ہیں۔“ ماں جی نے بغور ان کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔

”میرا خیال ہے آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ بہت ضروری ہے آپ کے لیے آرام۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔

”میری بات مان پڑ۔ تو مجھے آج رات جانے ہی دے۔ تجھے دیکھ لیا ہے تو سکون مل گیا ہے۔ دل پر جو ایک گھبراہٹ سی تھی وہ دور ہو گئی ہے۔“

واقعی کامل ان کے لیے بہت بڑی آزمائش تھا اور کبھی کبھی تو وہ خود اپنے آپ کو اس کی حالت کا ذمہ دار سمجھتی تھیں۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں انہوں نے کہ وہ اس دنیا میں نہ آئے۔ کتنے جتن کیے تھے لیکن جس روح نے دنیا میں آنا تھا وہ آ کر رہی۔ وہ جب پیدا ہوا تو صرف ساڑھے تین پونڈ کا تھا۔ ان کے سر نے اس کے لیے چوپیس گھنٹے کے واسطے نرس رکھ لی تھی اور پھر جب وہ ذرا بڑا ہوا اور وہ اسے گود میں لیتیں تو انہیں خیال آتا کہ وہ عام بچوں سے مختلف ہے۔ عادل تو بچپن میں ایسا نہیں تھا۔ کئی بار انہوں نے سوچا تھا۔ یہ تو ہنستا بھی نہیں۔ منہ کھول کر زبان باہر نکالے لڑکتا ہے۔ تب انہوں نے اپنے سر سے بات کی۔ لاہور کراچی کے بڑے اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا۔ سب نے کہا کہ بچہ نارمل نہیں ہے۔

”تو پھر ٹھیک ہے ماں جی۔ آج رات آپ رک جائیں۔ میں رات کو سفر کرنے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔ صبح انشاء اللہ میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گا۔ حویلی میں فون کر دیتا ہوں۔ چلیں اب انہیں اور آرام

کریں۔ رات کو باتیں کریں گے۔“

انہوں نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔

”آئیے۔ میں آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ ماں جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور وہ ان کا ہاتھ تھامے انہیں ساتھ لیے باہر نکل آئے۔



نہیب عثمان احمد کی بیماری اس دفعہ کچھ طول ہی پکڑ گئی تھی۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا انہیں بیڈ ریٹ لیتے ہوئے اور گھر گھر نہیں تفرق گاہ بنا ہوا تھا۔ مریم بے زار تھی۔ گھر میں دل لگانا نہ کالج میں۔ گھر آ کر پڑھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس ہفتے ہونے والے دونوں ٹیسٹوں میں وہ بری طرح ٹیل ہو گئی تھی۔ مس مہرین نے اسے اچھا خاصا ڈانٹ دیا تھا مگر وہ کیا کرتی۔ کتاب کھول کر سامنے رکھتی تو ماما کے کمرے سے آنے والی آوازیں اسے ڈسٹرب کرتی لگتیں۔ اس کا کمر ابھی تو ماما کے بیڈروم کے ساتھ تھا۔ نہیب عثمان کے دوست احباب مسلسل ان کی مزاج پر سی کے لیے آ رہے تھے۔ ہر وقت جھگھٹا لگا رہتا تھا۔ شرجیل مرزا باقاعدگی سے آتا تھا اور میڈم نرس نے تو ادھر ہی ڈیرے ڈال رکھے تھے اور جب میڈم نرس اور نہیب عثمان اکیلی ہوتیں تو وی سی آر لگا لیتیں اور پھر وی سی آر کے ساتھ میڈم نرس کے بلند و بانگ تہقے۔ مریم کا جی چاہتا، وہ گھر سے کہیں چلی جائے۔ ان کی تیز بیٹیاں بجاتی آواز سارے گھر میں گونجتی رہتی تھی۔ دن بھر لوگ ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ جانے ان کا حلقہ احباب کتنا وسیع تھا اور جانے لوگوں کے ان سے کیا ضروری کام انکے ہوئے تھے کہ وہ چند دن صبر نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا پتا پوچھتے ہوئے عثمان احمد کے گھر تک پہنچ جاتے تھے اور پھر بی بی لاؤنج میں بیٹھ کر میڈم نرس ان سے اونچی آواز میں تبادلہ خیال کرتیں تو مریم کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ ایک صاحب کو بھگتا کر کمرے میں گئی تھیں اور وہاں جاتے ہی اونچی آواز میں وی سی آر لگا دیا تھا۔ کوئی انڈین فلم گئی ہوئی تھی۔ مریم اپنے کمرے میں تھی۔ عاشر اور نینا ٹیوٹر سے پڑھ رہی تھیں۔ تیور کو ہلکا سا فلو ہو رہا تھا لہذا مریم نے اسے پڑھنے نہیں بھیجا تھا اور وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھ لیٹا اس سے باتیں کر رہا تھا۔

”پتا نہیں یہ آئی نرس اتنی اونچی آواز میں وی سی آر کیوں لگاتی ہیں۔ کہیں گلے کے ساتھ ان کے کان بھی تو متاثر نہیں ہو گئے ہیں۔“ اس نے بیزار سی سوچا۔

”مومو۔“ تیور نے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

”کیا بات ہے چندا!“

”ماما کب اچھی ہوں گی؟“

”تم دعا کرو تو جلدی سے اچھی ہو جائیں گی۔“

”میں تو ہر روز دعا کرتا ہوں مگر ماما اچھی ہوتی ہی نہیں ہیں۔“

”چلو تمہیں ماما کے پاس لے چلوں۔“

”نہیں“ میں ادھر آپ کے پاس ہی رہوں گا۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ ماما جلدی سے اچھی ہو جائیں تو آئی اپنے گھر چلی جائیں۔“

”کیوں کیا تمہیں آئی اچھی نہیں لگتی۔ تم سے تو اتنا پیار کرتی ہیں۔“

”ہاں پیار تو کرتی ہیں لیکن شور بہت کرتی ہیں۔ کل آپ کالج گئی تھیں تو انہوں نے شریف بھائی کو بہت ڈانٹا تھا۔“

”کیوں ڈانٹا تھا.....؟“

”انہوں نے ماما کے لیے اسے اپیل جوس بنانے کو کہا تھا تو اس نے دیر کر دی تھی۔ آپ ڈاکٹر انکل سے کہیں ماما کو جلدی اچھا کر دیں۔“

”اچھا کہہ دوں گی۔“

”ابھی ہمارے سر چلے جائیں گے تو آپ انکل کو فون کر کے کہہ دیں گی؟“

”نہیں فون کی کیا ضرورت ہے ابھی شام کو وہ ماما کو دیکھنے آئیں گے تو کہہ دوں گی۔“

”مگر انکل تو نہیں آتے ماما کو دیکھنے وہ تو کوئی اور ڈاکٹر آتے ہیں۔“

”اچھا شاید انکل بڑی ہوں گے۔“

”لیکن یہ نئے ڈاکٹر روز آتے ہیں انکل ڈاکٹر تو صرف ایک ہی دن آئے تھے بس۔ ہم سر سے پڑھ رہے ہوتے ہیں نا تو یہ نئے والے ڈاکٹر ہمارے پاس سے گزر کر جاتے ہیں بہت اچھے ہیں۔“

”اچھا تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ اچھے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”بس پتا چل گیا نا۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں اور انہوں نے مجھ سے تھوڑی دوسری بھی کر لی ہے۔“

”اچھا۔“

وہ یوں ہی بے مقصد تیور سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ صبح پھر فرس کس کا ٹیسٹ تھا لیکن اس کا پڑھنے کا قطعی کوئی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ کتاب اٹھا کر دیکھ لے خواہ وہ پھر میڈم نسرین کی ڈانٹ سننا پڑے گی۔ ایک تو وہ ڈانٹ ہی بھی اس بری طرح تھیں کہ مر جانے کو جی چاہتا تھا۔ آخر انسان کے کچھ پراہلو ہوتے ہیں کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کبھی آدمی تیاری نہیں بھی کر سکتا لیکن وہ کسی کی وضاحت سنیں بھی تب نا ڈانٹتے ہوئے ذرا جو انہیں خیال آتا ہو کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتی ہے۔

”مومو!“ تیور نے اسے ٹیبل پر پڑی کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے پا کر کہا ”آپ کو پڑھنا ہے میں آپ کو تنگ کر رہا ہوں۔“

”ارے نہیں میری جان۔“ مریم نے بے اختیار جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”تم مجھے بالکل تنگ نہیں کر رہے ہو بلکہ مجھے تم سے باتیں کرنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تم میرے اتنے پیارے پیارے سنے سنے سے بھائی ہو۔“

”پھر آپ اپنی کتابوں کی طرف کیوں دیکھ رہی ہو؟“ وہ بلا کا ذہین تھا۔

”میری جان!“ مریم نے پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

”میں یوں ہی بے دھیانی میں دیکھ رہی تھی۔“

”مومو۔“ تیور غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا ”آپ کو کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں چند!“ مریم نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”نہیں آپ بیمار ہیں۔“

”ارے کہاں اتنی موٹی تازی تو ہوں۔“

”ہاں ماما بھی تو موٹی تازی ہیں لیکن بیمار ہیں۔ آپ بھی ایسے ہی بیمار ہیں ماما کی طرح۔“

”مور..... مور۔“ مریم کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”مت کیا کرو اتنی بڑی بڑی باتیں نظر لگ جائے گی۔“

”مومو!“ وہ اپنی چمکیلی آنکھوں میں سنجیدگی لیے اسے دیکھ رہا تھا ”آپ بھی ڈاکٹر انکل سے دوا لے لیں۔“

”مگر میں بیمار نہیں ہوں۔“

”آپ بیمار ہیں۔ میں ڈاکٹر انکل سے کہوں گا وہ آپ کو بھی دوا دے دیں۔“

”مور۔“ مریم کی پلکیں یک دم بھگ گئیں۔ تیور یہ چھ سال کا بچہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے بیمار ہے۔ ماما کی طرح ڈپر لیس ہے لیکن ماما اور پاپا کو کچھ نظر نہیں آتا۔ ماما تو اپنے احباب میں مست رہتی ہیں۔ وہ تو اپنی انکٹی ویٹیز میں کھوتی رہتی ہیں لیکن پاپا..... پاپا کیوں نہیں دیکھتے۔

کیوں نہیں پوچھتے اس سے کہ اسے کیا ہوا ہے۔

وہ کیوں اتنی اپ سیٹ ہے۔

اس کے اور ماما کے درمیان اتنے فاصلے کیوں ہیں۔

خود اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔

کیا شکوے بھرے ہیں اس کے اندر۔

کیا الجھنیں ہیں۔

اور پاپا اس کی ہیلپ نہیں کرتے تھے۔

ماما کی ایکٹی وئیر تو ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں۔ ان کی دوستیاں ان کے ریلیشنز سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔
ہاں شرجیل مرزا۔ یہ شرجیل مرزا پہلے اتنا ذلیل نہیں تھا ان کی زندگی میں۔
شاید وہ شرجیل مرزا کی وجہ سے اتنی ڈپر لیس ہے۔

خاص طور پر اس لیے بھی کہ ماما سے بہت اہمیت دیتی ہیں کہ وہ بھی اسے اہمیت دے۔
پتا نہیں ماما ایسا کیوں چاہتی ہیں۔

ان کے دل میں کیا ہے۔

وہ خود بھی شرجیل مرزا کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور خود شرجیل مرزا اپنی حرکات و گفتگو سے سو جان سے
ان پر فدا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی باتوں سے تو اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اگر ماما مسز عثمان نہ ہوتیں اور
اتنے بچوں کی ماں نہ ہوتیں تو وہ اب تک انہیں پروپوز کر چکا ہوتا۔ پھر اس کی طرف اس کا التفات اور ماما کی
ضد کہ وہ اسے توجہ دے، مریم کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

شاید اس کے ڈپر لیس ہونے کی ایک وجہ ماما کا رویہ بھی تھا۔ پہلے ان کا رویہ اتنا عجیب نہیں تھا۔

پتا نہیں وہ کیوں چاہتی تھیں کہ وہ شرجیل مرزا کو وقت دے، اس کے ساتھ بیٹے بولے وہ باہر جانے
کو کہے تو اس کے ساتھ باہر چلی جائے۔ حالانکہ وہ عمر میں پاپا سے ذرا ہی چھوٹا ہوگا۔ وہ جتنا شرجیل مرزا
سے دور ہوتی، اسے پیچھے ہٹائی ماما کا رویہ اتنا ہی جارحانہ ہو جاتا تھا۔ اس روز بھی وہ تین دنوں بعد ماما کے
کمرے میں آئی تھی۔ میڈم نرس کچھ دیر پہلے ہی سید امتیاز علی شاہ کے ساتھ باہر گئی تھیں اور گھر میں جیسے
سکون آگیا تھا۔ وہ اس روز کے بعد سے ماما کے کمرے میں نہیں گئی تھی۔ پتا نہیں ماما کی طبیعت کیسی ہے۔
وہ بے اختیار ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اسکا لکڑی ٹائپ پیپہ وہ نیم دراز تھیں اور انہوں نے اپنی
آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

”اب کیسی ہیں ماما آپ؟“ اس نے ان کے قریب جاتے ہوئے غور سے انہیں دیکھا تو اسے ان کا
رنگ بہت زرد زرد لگا۔ اس کا دل ایک دم گداز ہو گیا۔ ”کیسی بیٹی ہوں میں، میری ماں بیمار ہے اور میں آج
تین دن بعد ان کا حال دریافت کرنے آئی ہوں مگر میں بھی کیا کروں، ماما کے پاس بھی تو ہر وقت
جتنا درازوں کا جھگھا لگا رہتا ہے۔“

”ماما!“ بے اختیار اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ننب عثمان احمد نے آنکھیں کھول کر اسے
دیکھا۔ ان کے چہرے اور ان کی آنکھوں میں ایک نرم نرم سا تاثر تھا۔

”بیٹہ جاؤ مومو۔“

وہ ان کے بیڈ پر ہی بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ مسکرائیں۔

”کیسی ہو جانو!“

”بالکل ٹھیک۔“

”کالچہ جا رہی ہو؟“

”جی۔“ اس نے سر ہلایا۔

”اپنا خیال رکھا کرو۔ نرس کہہ رہی تھی کہ تم اپنا خیال بالکل نہیں رکھتی ہو۔ بہت لا پرواہ ہو۔“

”آپ بھی اپنا خیال رکھا کریں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان نہ ہوا کریں۔“ اسے ماما کا اتنی نرمی

اور محبت سے بات کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے ماما اس سے بھی ناراض نہیں ہوئی تھیں۔ جیسے وہ ایک
بہت شفیق اور محبت کرنے والی ماں تھیں بالکل ایسی اور روشنی کی طرح۔ کاش زندگی ہمیشہ ایسے ہی گزرے، ماما
کبھی اس سے خفا نہ ہوں۔

کبھی ان کے درمیان فاصلے نہ ہوں۔

اس کا جی چاہا وہ ان سے لاڈ کرے

”ماما پلیز اٹھ جائیں۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھا دیا۔

”میں آپ کے کپڑے نکال دیتی ہوں، آپ چیچ کر لیں۔“

”نہیں جانو رہنے دو۔ ایسے ہی سستی ہو رہی ہے۔ شام کو چیچ کر دوں گی۔“

”ماما، آپ بستر سے نکلیں گی تو خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ چلیں، کپڑے چیچ کریں، باہر لان میں
چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، نکال دو۔“ وہ مسکرائیں۔

”ایک تو یہ جو آپ کے احباب ہیں نا، الٹا آپ کی بیماری بڑھا دیتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے سر پر سوار
رہتے ہیں۔ آرام تو بالکل کرنے ہی نہیں دیتے۔ آپ ان کو منع کر دیا کریں نا، وقت بے وقت آپ کو
ڈسٹرب نہ کیا کریں۔“ وہ وارڈ روب سے کپڑے نکالتے ہوئے بولتی چلی جا رہی تھی اور ننب عثمان احمد
اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ بات کرتے کرتے ایک دو بار اس نے مڑ کر انہیں دیکھا اور اسے ماما کو اس
طرح اپنی طرف اتنی محبت سے دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ”کاش زندگی ہمیشہ ایسے ہی گزرے۔ محبت کے
اسی احساس کے ساتھ۔“

”ماما، یہ گرین کلر کا سوٹ نکال دوں۔ آپ پر بہت اچھا لگے گا۔“ وہ سوٹ ہاتھ میں لے کر مڑی تو
دروازے میں سے شرجیل مرزا کو دیکھ کر ٹھٹھکی گئی۔ ”ارے شخی تم، آؤ نا بیٹھو آکر۔“

ننب عثمان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ مریم نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا جو ایک دم کھل اٹھا تھا۔

”آؤ، آؤ، تم کل کیوں نہیں آئے تھے۔ بہت بے چین رہی میں۔“

”کچھ مصروفیات تھیں۔“ وہ کن آنکھوں سے مریم کو دیکھتا ہوا کرسی کیچنگ کر بیٹھ گیا۔ ”تم کیسی ہوزنی مجھے

تمہاری بہت فکر رہی۔ یار بہت پھنسا ہوا تھا، تمہیں فون بھی نہ کر سکا۔
”کچھ بہتر ہوں۔“

ان کے رخسار گل رنگ ہو رہے تھے۔ مریم حیرت سے ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔
”زینی! اب تمہیں ٹھیک ہو جانا چاہیے۔ یار بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ تمہاری وجہ سے کام رکا ہوا ہے۔
تمہیں خود اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر کسی کو تمہاری پروا نہیں ہے تو اپنی پروا خود کرو۔“
اس نے آنکھ کے کونے سے مریم کو دیکھا جسے شرجیل مرزا کی یہ بے تکلفی زہر لگ رہی تھی۔

پاپا کے سامنے تو کیسے مسز احمد کہتا ہے اور اب کسی بے تکلفی سے زینی زینی کہہ کر بلارہا ہے۔ کیا حق ہے اسے ماما کو زینی کہہ کر بلانے کا یہ حق تو صرف پاپا کا تھا اور ماما کو دیکھو اسے منع ہی نہیں کرتیں کہ تمیز سے بلائے اور ماما تو اس کی ہر غلطی صحیح بات پر کچھ نہیں کہتی ہیں۔ غصے سے اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔
”ماما! میں جاؤں پڑے استری کروا کے بھجوا دیتی ہوں۔“

”ارے نہیں مس احمد بیٹھے نا۔ بڑے دنوں بعد آپ کو دیکھا ہے کیسی ہیں آپ۔ آپ کی ماما اتنی بیمار تھیں اور آپ کبھی نظر ہی نہیں آئیں۔ اچھی بیٹیاں تو ماؤں کی حصار داریاں کرتی ہیں۔“
اس کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ آپ جیسے حصار داروں کی موجودگی میں ماما کو کسی اور حصار دار کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔

”ہاں مومو بیٹھ جاؤ۔“ ماما نے خوش ہو کر تائیدی ”میرا بھی موڈ نہیں ہو رہا چہنچ کرنے کا۔ تم بیٹھ جاؤ۔“
”نہیں ماما، وہ مجھے تیمور کو ہوم ورک بھی کروانا ہے۔ آج اس کا ٹیوٹر چھٹی پر ہے۔“ اس نے بات بنائی۔
”زینی! یہ تمہاری بیٹی مجھ سے بھاگتی کیوں ہے۔ کیا میں اسے کاٹا ہوں۔“ وہ مسلسل ماما کی طرف دیکھ رہا تھا۔
باریک تائمی سے ان کا خوبصورت جسم جھلک رہا تھا اور شرجیل مرزا کی نگاہیں ان کا جائزہ لے رہی تھیں۔
”ارے نہیں شچی، وہم ہے تمہارا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ مومو ذرا کم گو ہے اور لوگوں سے گھبراتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”غلیظ۔“ مریم نے اسے مسلسل ماما کی طرف دیکھتے پا کر زیر لب کہا۔

”جی کیا کہا۔“ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی طرف گھوم گیا۔

”آپ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے ورنہ.....“ اس نے دانت پیستے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
”ورنہ کیا؟“

وہ زور سے ہنسا ”جودل چاہے با آواز کہہ سکتی ہیں برا نہیں مانوں گا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ
کتے شیریں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مرزا نہ ہوئے

”بہت شریر ہو چکی!“

زینب عثمان بلا وجہ ہنس دیں۔ مریم کو ان کا اس طرح ہنسا بہت برا لگا۔ اسے ایک دم ماما پر غصہ آ گیا۔
”کیسی ہیں ماما۔ کیسی فطرت ہے ان کی۔ ایک مرد ایک اجنبی مردان کی بیٹی کے لیے غلیظ شعر پڑھ رہا ہے اور وہ کہہ رہی ہیں۔ شریر۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ماما کا ڈریس صوفے پر پھینکا اور جانے کے لیے قدم بڑھایا۔

”مومو۔“ ماما نے اسے روکا ”بیٹھ جاؤ۔“

”ماما۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”شچی کو کمپنی دو۔“

”پلیز۔“ اس نے ملتی نظروں سے ماما کی طرف دیکھا لیکن ان کا چہرہ ایک دم سخت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے والی نرمی اور گداز بالکل غائب تھا۔ شرجیل مرزا نے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ یوں ہی کھڑی تھی۔

”تمہاری ماما کا ڈیپریشن بڑھ جائے گا۔“

شرجیل مرزا کی آنکھوں میں غصیت سی چمک تھی۔ وہ بے بسی سے کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی۔
”ڈاکٹر کہتے ہیں، بعض اوقات ڈیپریشن خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ موت کی حدوں تک لے جا سکتا ہے۔“
بظاہر وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا لیکن مریم اس کے اندر کی خباثت کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر زینب عثمان کی طرف دیکھا تو اسے ان کا رنگ پھر سے زرد زرد سا لگا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی لگنے لگیں۔ وہ یوں لمبے لمبے سانس لے رہی تھیں جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔
وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”زینی! یہ تمہاری بیٹی کی شکل اس سے نہیں ملتی۔ وہ جو بیٹی ماڈل ہے نتاشا۔“ اب اس کی نظریں براہ راست اس کا ایک سرے کر رہی تھیں اور مریم کو یہ نظریں گویا اپنے وجود میں گھتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس کی آنکھیں نوچ لیتی۔

وہ انتہائی ڈھٹائی سے اس کے لب و رخسار پر تہمرہ کر رہا تھا اور ماما نہ صرف سن رہی تھیں بلکہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا ساتھ بھی دے رہی تھیں۔

”نہیں، نہیں! اپنی مومو کے ہونٹ تو بہت خوبصورت ہیں اور نتاشا کے ہونٹ تو بہت باریک ہیں اور مومو کی آنکھیں بھی تو بہت خوبصورت ہیں، بس نتاشا کا رنگ ذرا زیادہ فیروزہ ہے لیکن مومو کا تو کمپلیکشن غصب کا ہے۔“

”ہوں واقعی۔“ شرجیل مرزا کی نگاہیں اندر تک اتری جا رہی تھیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ شرجیل مرزا کی غلیظ نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی۔

”افوہ! کہیں سے کوئی آجائے۔“ اس نے بے آواز دعا کی اور تب ہی عثمان احمد ناک کر کے اندر آگئے۔

”آما! یہاں تو بڑے لوگ اکٹھے ہیں۔ بیلو۔“ انہوں نے شرجیل مرزا سے ہاتھ ملایا اور پھر نہت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”پہلے سے بہت بہتر فیمل کر رہی ہوں۔“

”تھینک گاڈ۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ شرجیل مرزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ماما نے گھورا۔

”مس احمد! آپ کی ماما نے آپ سے کچھ کہا تھا۔“

”جی معلوم ہے مجھے۔“

”تو پھر بڑوں کا کچھ لحاظ و احترام کیا جاتا ہے۔“

”جی اور یہ بات آپ کو بھی جان لینی چاہیے کہ بڑوں کا کچھ لحاظ و احترام کیا جاتا ہے اور میرے خیال میں ماما آپ سے عمر میں چھ سات سال تو بڑی ہوں گی ہی اور شاید اسی احترام کا نتیجہ ہے کہ آپ ماما کو مسز احمد کہنے کے بجائے ”زینی تم“ کہہ کر بلارہے تھے۔“ اس نے اپنا غصہ نکالا۔ شرجیل مرزا کا رنگ ذرا کی ذرا بدلا تو اس نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر پاپا کی طرف۔ اس کا خیال تھا کہ پاپا یقیناً اسے اس کی بدتمیزی پر برا بھلا کہیں گے لیکن پاپا بے نیازی سے سائیڈ ٹیبل پر پڑی پلیٹ میں سے انگور کے دانے توڑ توڑ کر منہ میں ڈال رہے تھے۔ شرجیل مرزا نے تسخر سے اسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ”تمہارے پاپا۔۔۔۔۔“ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل آئی تھی اور بہت دیر تک ٹیکے پر سر رکھ کر روتی رہی۔

اسے ماما کے اس بل و پل بدلنے والے رویے کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پاپا سے پوچھے۔ ان سے بات کرے اور ماما کے اس رویے کا سبب پوچھے۔ اپنی الجھن انہیں بتائے۔ اسے ماما اور شرجیل مرزا کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ ماما اس کی کہنی میں ملازم ہیں وہ ماما سے عمر میں چھوٹا تھا اور زیادہ بے تکلف تھا۔ دوسری طرف ماما چاہتی تھیں کہ وہ بھی شرجیل مرزا سے بے تکلف ہو جائے۔ ایک بار ابی نے کہا تھا کہ مجھے لگتا ہے تمہاری ماما شرجیل مرزا کو داماد بنانا چاہتی ہیں۔

اس روز ابی اس کے گھر آئی ہوئی تھی اور ماما نے بطور خاص ابی کا تعارف شرجیل مرزا سے کرایا تھا اور پھر اس کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں اور بار بار مریم کو اس کی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔

”مومو! شچی کو چائے دو۔“

”یہ کہا بوں کی پلیٹ شچی کو دو۔“ وغیرہ وغیرہ۔

”ہو نہ ہو! وال میں کچھ کالا ہے۔“

ابی اسے کالج میں بھی چھیڑ رہی تھی لیکن ابی کی بات اسے کچھ ہضم نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو یوں لگتا تھا جیسے ماما خود شرجیل مرزا میں انٹرنلڈ ہوں اور اتنی زیادہ کہ اس کی ہر بات ماننا فرض سمجھتی ہوں لیکن وہ یہ باتیں ابی سے ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔ ابی کیا کسی سے بھی نہیں۔ ایک پاپا تھے جن سے بات کی جا سکتی تھی لیکن وہ جب بھی پاپا کے پاس اس غرض سے گئی اور اس نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے بات بدل دی۔ وہ لب کھولتی تو وہ نگاہیں چرا لیتے جیسے وہ جانتے ہوں کہ وہ ان سے کیا پوچھنا چاہتی ہے کیا کہنا چاہتی ہے اور وہ اس سے یہ بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔ ماما کے اشاروں پر چلنے والے پاپا بھی کبھی کتنے بے حس لگتے تھے۔

بالکل رو بوٹ۔

لیکن ماما کے معاملے میں وہ رو بوٹ نہیں تھے۔ ماما کی ذرا سی بیماری پر پریشان ہو جاتے اور مریم کا انہیں احساس تک نہ تھا وہ کتنی اپ سیٹ ہے پریشان ہے۔

اور اس وقت اسے ان کی رفاقت کی کتنی ضرورت ہے۔ عاشر اور نینا بچیاں تھیں۔ وہ اپنی پریشانیاں انہیں منتقل نہیں کر سکتی تھیں۔ عاشر اگرچہ عمر کے اعتبار سے اتنی چھوٹی نہیں تھی لیکن اس کی سوچ بالکل بچوں جیسی تھی۔ اندر سے وہ بہت ننھی بچی تھی جب کہ اس عمر کی لڑکیاں کافی تیز ہوتی ہیں۔ مگر وہ۔۔۔۔۔ وہ کس سے اپنا بوجھ بانٹتی۔ اس کی نگاہیں بار بار پاپا کی طرف ہی اٹھتی تھیں مگر پاپا نگاہیں چرا لیتے تھے۔

”مومو! آپ کیا سوچنے لگی ہو۔ میں ڈاکٹر انکل سے کہوں گا کہ وہ آپ کو بھی دوا دے دیں۔“

”نہیں! میری زندگی! میں بالکل اچھی ہوں! بالکل بھی بیمار نہیں ہوں۔“

”لیکن مجھے آپ بیمار لگتی ہیں۔“

”کیوں بھلا! آپ کو میں کیوں بیمار لگتی ہوں۔ دیکھ لو مجھے کوئی ٹیپر بچر ہے؟“

”مجھے پتا ہے کہ آپ کو ٹیپر بچر نہیں ہے لیکن آپ اب پہلے کی طرح جو کھلتی نہیں ہو میرے ساتھ۔ ہنسی بھی نہیں ہو اور مجھے کہانیاں بھی نہیں سناتی ہو۔ پتا ہے عاشر جی کہہ رہی تھیں (وہ عاشر کو باجی کے بجائے جی کہتا تھا) کہ مومو بیمار ہے۔“

”پتا ہے میں بیمار نہیں ہوں۔ وہ میرے ٹیٹ ہو رہے تھے نا! اب ٹیٹ ختم ہو جائیں گے تو پھر تمہیں ڈھیر ساری کہانیاں سناؤں گی اور پھر تم نے کبھی کہا ہی نہیں کہ مجھے کہانی سناؤ۔“

”آپ کا موڈ صحیح نہیں ہوتا تھا۔“

وہ مسکرائی۔

”کیوں خراب ہوتا ہے آپ کا موڈ۔“

”وہ جو ہماری میڈم ہیں نا، قیل ہونے پر کان پکڑوا کر کھڑا کروادیتی ہیں بیٹھ پر۔“

”مرغا بنا دیتی ہیں۔“

تیمور جو اس کے گھٹنوں پر سر رکھے لیٹا تھا دچپی سے اٹھ بیٹھا۔

”نہیں خیر، مرغا تو نہیں بناتیں لیکن ڈانٹتی بہت ہیں۔“

”ہمارے جو بیٹی سر ہیں نا، وہ بڑے لڑکوں کو ہماری کلاس روم کے سامنے مرغا بنا دیتے ہیں۔ وہ۔۔۔“

چارے بڑا اثر مانتے ہیں اور ہمیں بڑا مزا آتا ہے۔“

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ تیمور کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن ان کا رنگ بہت

سفید تھا۔ چھوٹی سی ناک اور دانت بہت خوب صورت تھے۔ بہت پیارا اور گلبوسا لگتا تھا۔

”اور ہمارے ایک اور سر ہیں وہ تو دھڑا دھڑا ڈنڈے مارتے ہیں ہاتھوں پر۔“

”اچھا۔“

”ہوں۔“ اس نے کہا پھر ایک دم اچھلتے ہوئے بولا ”ارے“ کارٹون پروگرام کا وقت ہو گیا ہے۔“

”چلو آؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ چل کر دیکھتی ہوں۔ تمہارے پسندیدہ کارٹون پروگرام کو۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹی کی وی لاؤنج میں لے آئی۔ ابھی اس نے ریورٹ اٹھایا ہی تھا کہ نذب عثمان کے

بیڈ روم سے میڈم نرگس کے زور زور سے چیخنے کی آواز آئی پھر زور سے دروازہ کھلا اور وہ کسی شخص کے

ساتھ زور زور سے بولتی ہوئی باہر نکلیں۔

”ارے وہ سمجھتا کیا ہے۔ اپنے آپ کو گدھا۔۔۔۔۔“

ان کی آواز پورے لاؤنج میں گونج رہی تھی ”میں چاہوں تو کھڑے کھڑے اس کا ہوٹل خرید لوں۔“

پوچھو جا کر اس۔۔۔۔۔ سے کتنے میں دے گا اپنا ہوٹل۔ جتنی رقم مانگتا ہے اس سے دس بیس ہزار زیادہ دے کر

اس سے ہوٹل خرید لو۔“

وہ بڑی روانی سے گالیاں بھی دیتی جا رہی تھیں۔ خدا جانے کس کی شامت آئی تھی۔ مریم برا سامنے بنا کر

بیٹھ گئی۔ غالباً اس شخص نے انہیں کوئی اطلاع دی تھی۔ وہ اس شخص کو تقریباً دھکے دیتی ہوئی داخلی دروازے

تک لے گئی تھیں۔ بے چارہ غریب شخص میڈم میڈم کر رہا تھا لیکن انہوں نے اسے باہر نکال دیا۔

”اب دوبارہ یہ شکل اٹھا کر میرے پاس نہ آنا۔ ہوٹل کے کاغذات لانا یا ہال کی بکنگ کروا کے آنا اور

اسی دن کی جس دن کی شاہ نے کہی ہے۔“

جب وہ پلٹیں تو مریم نے انہیں سلام کیا۔

”خیریت ہے آئی؟“

”خیریت کہاں۔ وہ الوکا پٹھا کہہ رہا تھا کہ ہال کی بکنگ نہیں ہو سکتی۔ شاہ شوکرنا چاہتا ہے وہاں اور

ہوٹل کے مینیجر نے بکنگ سے انکار کر دیا کہ اس روز اور اس سے اگلے دو تین روز کے لیے ہال بک ہو چکا

ہے۔ جانے یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ انہیں میڈم نرگس کا علم نہیں ہے۔ میں اس جیسے دس ہوٹل

خرید سکتی ہوں اور اگر۔۔۔۔۔“

”آئی اگر ہوٹل کا مالک ہوٹل نہ بیچنا چاہے تو۔“ تیمور کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”تو خاک میں ملا دوں گی اس کا ہوٹل۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔“ وہ روانی سے بولتے بولتے

رک کر تیمور کو دیکھنے لگیں ”یہ۔ یہ تم نے کیا کہا بونے! بہت شریہ اور چالاک ہو گئے ہو تم۔“ وہ اس کے رخسار

کو تھپتھا کر جھپاک سے نذب عثمان کے کمرے میں گھس گئیں۔

”اوہ خدا یا!“ مریم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ”کیا چیز ہیں یہ میڈم نرگس بھی پتا نہیں ماما

انہیں کس طرح برداشت کرتی ہیں۔“

تیمور بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھ رہا تھا اور خود ہی ہولے ہولے ہنس رہا تھا۔

”یہ آپوں آپ کیوں ہنسا جا رہا ہے۔“

”آپ دیکھیں نا دھر کی ماؤز کو۔“

”تم بھی تو کی ماؤز ہو۔“ مریم نے اسے گد گدایا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تیمور سے باتیں کرتی

رہے۔ یوں ہی بے معنی بے مقصد۔ ہنسے اور اسے ہنسائے تاکہ ذہن کے سارے جالے صاف

ہو جائیں۔

”سنو مور تم پروگرام دیکھ لو تو پھر واک کرنے چلیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ بجی اور نینا کو بھی ساتھ لے لیں گے۔“

مریم نے سر ہلایا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ابھی پروگرام ختم نہیں ہوا تھا کہ ماما کے کمرے کا

دروازہ کھلا اور کوئی کمرے سے باہر آیا۔ آنے والا ٹی وی لاؤنج میں آکر لکھ بھر کور کا۔ مریم نے مڑ کر نہیں

دیکھا۔ ماما کا کوئی دوست ہوگا۔

”ہائے ڈاکٹر۔“ تیمور صوفے سے نیچے کودا۔

”ہائے بوائے۔“ ایک خوشگوار سی آواز سن کر مریم نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت

پرنسپل کا مالک شخص کھڑا تھا۔

”السلام علیکم۔“ مریم غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی۔

”وعلیکم السلام۔“ ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا۔

”مومو!“ تیمور مسکرایا ”مامی سسر۔“

”اوہ آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”جی میں نے بھی آپ کو نہیں دیکھا۔“ مریم بھی اب سنہیل چکی تھی۔ پہلے ہمیشہ انکل ہادی خود آتے تھے۔ آپ غالباً ان کے ہاسپٹل میں.....“

”جی میں ان کا بھتیجا ہوں ڈاکٹر معید!“ اس نے مریم کی بات کاٹ دی ”اور ایک ماہ پیشتر انگلینڈ سے آیا ہوں۔“

لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ اس شخص نے اپنی زندگی باہر ہی گزاری ہے۔

”انکل کہاں ہیں؟“

”انکل ایک سینار میں شرکت کرنے مری گئے ہیں۔“

”اچھا، تب ہی آپ آرہے ہیں۔“

”وہ مجھے تاکید کر گئے تھے اور پھر عثمان صاحب بھی ہر روز یاد دہانی کر دیتے ہیں کہ بے شک میں کھانا کھانا بھول جاؤں لیکن مسز احمد کو چیک کرنا نہ بھولوں۔“

”ماما کب ٹھیک ہوں گی؟“ تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”انشاء اللہ بہت جلد۔“

”مومو، ابھی کوئی دوا دے دیں۔“

”مور۔“ مریم نے اسے ہاتھوں ہی آگے بٹھایا۔

”کیوں خیریت! انہیں کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں ڈاکٹر، پلیز اس کی بات پر دھیان نہ دیں۔ ویسے ہی کہہ رہا ہے۔“

”میں ویسے نہیں کہہ رہا۔ مومو بہت دنوں سے بیمار ہیں۔ یہ کسی کو بتاتی نہیں ہیں۔“

”نمبر پچر رہتا ہے؟“ ڈاکٹر معید نے براہ راست اس سے پوچھا۔

”نہیں بالکل نہیں۔“ وہ زور سے ہو گئی ”بس یوں ہی آج کل ذرا تھک جاتی ہوں تو مور نے سمجھا بیمار ہوں۔“

”کیا کرتی ہیں جو تھک جاتی ہیں؟“ اب وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں، بس پڑھتی ہوں۔“

”صرف پڑھنے سے تھک جاتی ہیں۔ لائیں، نبض دکھائیں ادھر۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ مریم بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تب ہی ماما کے کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور میڈم نرگس تیزی سے باہر نکلیں اور پھر ڈاکٹر معید کو دیکھ کر زور سے چیخیں۔

”تھینک گاڈ ڈاکٹر معید! تم ابھی یہاں ہی ہو۔ میں تمہارے پیچھے کسی کو دوڑانے لگی تھی۔ جلدی چلو“

زینی کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔“ وہ بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر معید کو ہینچنے لگیں۔

”مگر ابھی تو بھلی چٹکی تھیں۔“ ڈاکٹر معید نے میڈم سے اپنے بازو چھڑا لیے اور ان کے ساتھ زینب

عثمان کے بیڈروم میں چلے گئے۔ مریم اور تیمور وہیں کھڑے تھے۔

”کیا ہوا ہے ماما کو؟“ تیمور نے مریم سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“

”وہ مرنے تو نہیں لگیں۔“

”خدا نہ کرے۔“ مریم نے تیمور کا بازو پکڑا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی بیڈ پر ماما بیٹھی تھیں اور زار و زور رہی تھیں۔ ڈاکٹر معید ان کا بازو دھلا رہے تھے۔

”کیا ہوا۔ کیا ہوا مسز احمد، پلیز کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ بی ایزی ریلیکس ہو جائیں۔ پلیز۔“

چند لمحوں بعد زینب عثمان نے ٹخنوں سے سر اٹھا کر ڈاکٹر معید کی طرف دیکھا اور اپنے بے حد خوبصورت ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے، ڈوب رہا ہے۔ پلیز ڈاکٹر کچھ کریں۔ سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک ہیں، مسز احمد۔ سب کچھ نارمل ہے۔ نبض بالکل ٹھیک ہے۔ بلڈ پریشر نارمل ہے۔

بس اب آپ بستر چھوڑ دیں اور میڈم پلیز، آپ نے ان کی تیمارداری کر کے انہیں مزید بیمار کر دیا ہے۔ انہیں معمول کے مطابق کام کرنے دیں۔“

”ڈاکٹر! میں نے انہیں بیمار نہیں کیا تم نے کیا ہے۔“ وہ بائیں آنکھ کا کونا دبا کر مسکرائیں۔

”میں نے۔“ ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا ”میں نے کیسے میڈم!“

”بھئی، تم صحیح طرح سے ان کا علاج جو نہیں کر رہے ہو۔“

”میڈم علاج تو صحیح ہو رہا ہے۔ مسز احمد خود ہی ٹھیک ہونے کے موڈ میں نہیں ہیں۔“

”لو جانی، یہ سب کھالو۔“ میڈم نے سیب کاٹ کر زینب عثمان احمد کی طرف بڑھایا ”اس سے دل کو تقویت ملے گی۔“

”میں کل آؤں تو آپ مجھے فریش ملیں گی مسز احمد!“ ڈاکٹر معید نے مضبوطی سے کہا اور تیمور کا ہاتھ تھامے خاموش کھڑی مریم کی طرف دیکھا ”پلیز، ریلیکس کی ایک ٹیبلٹ ان کو دے دیں۔ وہاں سائینڈ ٹیبل پر پڑی ہوں گی اور کچھ دیر ان کے کمرے میں سکون ہو۔ کوئی شور نہ ہو۔“

لحہ بھر کو اس کی نگاہیں مریم کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ بہت بے ریائی سا وہی نظریں تھیں اس کی۔ زینب عثمان احمد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”ڈاکٹر پلیز۔“

”جی۔“ وہ فوراً ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ڈاکٹر پلیز۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ سیاہ لیس کی شرٹ کے اندر سے ان کا گورا بدن جھانک

ڈاکٹر معید نے نظریں جھکا لیں ”ماما کتنی خوب صورت اور دلکش ہیں۔“ مریم نے سوچا۔

”پلیز ڈاکٹر کچھ کرو نہیں تو میں مرجاؤں گی۔“

”کچھ نہیں ہوگا مسز احمد۔“ ڈاکٹر معید نے انہیں تسلی دی اور ان کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور ہولے سے

سہلایا ”ریلیکس پلیز۔“

مریم ریلیکس لے کر بلی تو ڈاکٹر معید نے ماما کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ماما کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور چہرے پر ہلکی سی مسرخی۔ اس نے میڈم نرگس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے والے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھی تھیں اور زور زور سے پاؤں ہلاتی تھیں اور آنکھیں مڑا رہی تھیں۔ اس عمر میں بھی ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور اس وقت مریم کو یہ چمک اور بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ اس نے پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ نہب عثمان کی طرف بڑھائے۔

”ماما پلیز۔“

ڈاکٹر معید نے ایک دم ان کا ہاتھ چھوڑ دیا ”یہ لے لیں مسز احمد ابھی پرسکون ہو جائیں گی۔“

”جی۔“ نہب عثمان احمد نے کسی معصوم بچے کی طرح اس کے ہاتھ سے پانی اور ٹیبلٹ لے لی۔

”بائے داوے آپ کو پریشانی کیا ہے مسز احمد اگر آپ شیز کرنا چاہیں تو۔“

مسز احمد کی نظریں قریب کھڑی مریم کی طرف اٹھیں اور ڈاکٹر معید نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں مریم کی طرف دیکھا۔ اس کے رخسار ایک دم تپ گئے۔

”مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

نہب عثمان احمد کی نظریں مریم کے چہرے سے ہٹ کر ڈاکٹر معید کے چہرے پر پڑھ گئیں۔

”مجھے خود سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ڈیپریشن کا سبب کیا ہے۔“

”کوئی نہ کوئی ریزن تو ہے نا مسز احمد!“

”نہیں کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی“ ڈاکٹر ہادی جانتے ہیں سب۔ بہت عرصے سے ایسا ہو جاتا ہے جب

مومو چھ سال کی بھی تب سے۔“

”جب تک وجہ نہ تلاش کی جائے علاج کیسے کیا جاسکتا ہے۔“

”پھر پھر میں کیا کروں مجھے خود نہیں پتا۔“ وہ پھر رونے لگیں۔

”پلیز۔ پلیز مسز احمد! اب مت رویئے اور سکون سے سو جائیے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں نہیں ڈاکٹر پلیز ابھی مت جاؤ۔ رک جاؤ پلیز، نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا۔“ نہب عثمان

نے ڈاکٹر معید کا ہاتھ تھام لیا۔

”مگر مسز احمد وہاں کلینک میں مریض میرے منتظر ہوں گے اور آپ کو پتا ہے اُنکل کتنے بچے ہیں اپنے

مریضوں کے متعلق۔ یہ میرے راولڈ کا ناٹم ہے۔“

”نہیں پلیز مت جاؤ۔“ وہ پھر رونے لگیں۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ پلیز روکیں نہیں۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔“

اس نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر لٹا دیا اور کبل ان پر ڈال دیا ”اب اچھے بچوں کی طرح آنکھیں بند

کر کے سو جائیں۔ میں اور میڈم ادھر ہیں۔“

مریم جو خاموش کھڑی تھی باہر جانے کے لیے مڑی تو میڈم نرگس نے جو بدستور ٹانگیں ہلاتی تھیں اور

آنکھیں چمک رہی تھیں اسے روکا۔

”جاؤ تم کہاں جا رہی ہو؟ کبھی اپنی ماما کو اور ہمیں بھی کمپنی دے دیا کرو۔“

ان کی بے حد چمکی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور چہرہ ایسے بچے کی طرح لگ رہا تھا جو دل ہی دل میں

کوئی بات سوچ کر محظوظ ہو رہا ہو۔

”وہ آئیڈل دراصل میں نے تیور سے پراس کیا تھا کہ ابھی ہم واک کے لیے چلیں گے۔“

”چلی جانا کچھ دیر ہمارے پاس بھی بیٹھو۔“

”جی اچھا۔“ اس نے بے بسی سے میڈم نرگس کو دیکھا اور بیٹھ گئی۔ تیور کو بھی اس نے پاس بٹھالیا۔ وہ

خاموشی سے نہب عثمان کو دیکھ رہا تھا۔

”مورڈارنگ! ادھر پاس آؤ میرے۔“ نہب عثمان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

وہ اٹھ کر ان کے بیڈ کے پاس آکھڑا ہوا۔

”جانی اپنی ماما کو کس کرو۔“

اس نے جھک کر اپنے ہونٹ ان کی پیشانی پر رکھ دیے۔

”ناراض ہوا اپنی ماما سے؟“

”نو۔ آئی لو یو ماما۔“

”تو پھر میرے چاند! آپ میرے پاس کیوں نہیں آتے تھے؟“

”ماما، جی کہتی تھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ بے حد سنجیدہ اور مدبر لگ رہا تھا۔

”بیٹا اپنی ماما کے پاس بیٹھو ان سے باتیں کرو ان کا دل بہلاؤ اپنی پیاری پیاری باتوں سے۔“ ڈاکٹر

معید تیور کی طرف دیکھ کر ٹکرائے۔

”جی اچھا۔“ وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھا ”ماما آپ کا سر دباؤں؟“

”نہیں میری جان اتنے چھوٹے چھوٹے تو تمہارے ہاتھ ہیں۔“

”مگر آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے ناں۔ میں دبا دیتا ہوں۔“

”بہت کیوٹ بچہ ہے۔“ ڈاکٹر معید نے مڑ کر مریم کی طرف دیکھا جو بہت الجھی الجھی سی بیٹھی تھی۔

”جی۔“ اس نے چونک کر ڈاکٹر معید کی طرف دیکھا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”مومن۔“ زنب عثمان نے تیور کے ہاتھ کو پیشانی سے ہٹا کر چومتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”تم جاؤ دیکھو نینا اور عاشر کیا کر رہی ہیں یہ ان کی پڑھائی کا وقت ہے۔ ان کا ٹیوٹر پتا نہیں آیا ہے یا

نہیں۔ ایک تو یہ ٹیوٹر بھی روز ہی غائب ہو جاتے ہیں۔“

”نہیں جانو تم اپنی ماما کے پاس بیٹھو ان کی طبیعت اب سیٹ ہے اور زینی تم بے فکر رہو ٹیوٹر پڑھا رہا

ہے انہیں۔ کافی دیر پہلے آیا تھا اور اب تو جانے والا ہی ہوگا۔“ میڈم نے مریم کو ہاتھ بڑھا کر اٹھتے اٹھتے

بٹھا دیا۔

”یہ انکل عثمان کہیں نظر نہیں آ رہے کل بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔“ ڈاکٹر معید بوریٹ محسوس

کر رہا تھا۔

”اپنی اسٹڈی میں ہوں گے۔“ زنب عثمان نے بتایا۔

”اوہ میں سمجھی کہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ حد ہوگئی بے پروائی کی اتنی تمہاری طبیعت خراب ہے اور یہ

عثمان بھائی اسٹڈی میں گھسے بیٹھے ہیں۔ دیکھتی ہوں میں انہیں۔“ میڈم ٹرس ایک دم کھڑی ہو گئیں۔

”آئی میں پاپا کو بتاتی ہوں۔“ مریم باہر جانا چاہتی تھی یکا یک اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

”نہیں نہیں میں خود دیکھتی ہوں عثمان کو کس قدر لا پرواہ ہو گئے ہیں وہ۔“ وہ نیزی سے کمرے سے باہر

نکل گئیں۔

اس عمر میں بھی اتنی پھر تیلی تھیں وہ۔ مریم حیرت سے انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد عثمان احمد

گھبرائے ہوئے سے اندر داخل ہوئے۔

”کیا ہوا۔ کیا ہوا زینی ڈیر۔ صبح تو تم بہت بہتر تھیں۔“

زنب عثمان نے آنکھیں موند لیں۔

”مومن۔“ اچانک ان کی نظر مریم پر پڑی۔ ”تم نے کچھ کہا پھر ڈسٹرب کر دیا اپنی ماما کو۔ مت آیا کرو اپنی

ماما کے کمرے میں۔ کیوں اپنی ماما کی زندگی کے پیچھے پڑی ہو۔ کیوں مارنا چاہتی ہو اسے۔ اسے کچھ ہوا تو

میں بھی ساتھ ہی مر جاؤں گا اور تم۔“

”پاپا! مومنو ماما کو کچھ نہیں کہا۔ ماما تو خود ہی۔۔۔۔۔“ تیور نے ان کی بات کاٹتے ہوئے احتجاج کیا۔

ڈاکٹر معید کی حیران نظریں مریم پر آکر ٹھہر گئیں۔ احساس تو ہیں سے اس کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔

”مومن۔“ بولوچ میں۔“ بات ٹوکنے پر عثمان احمد نے الجھ کر تیور کو دیکھا اور پھر مریم کی طرف متوجہ

ہو گئے۔ ”کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں مومن۔ تم الجھا کر اپنی ماما سے۔ کھودو گی ایک دن اسے۔“

مریم نے سب کی طرف دیکھا ایک دم انھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔



سکندر نے رضوانہ سے اپنے جذبول کا اظہار کیا کیا تھا اسے یوں لگتا تھا جیسے کائنات میں رنگ ہی

رنگ بکھر گئے ہوں۔ جیسے ہر شے خوش ہو۔ چاند سورج ستارے پھول کھیت سب اسے خوبصورت اسے

کبھی نہیں لگے تھے جتنے اب لگنے لگے تھے۔

کیا دنیا پہلے بھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔

وہ حیران ہو کر سوچتا۔

کھیتوں سے باہر کھڑے ہو کر وہ دور تک پھیلے سرسوں کے پھولوں کو دیکھتا۔ یہ پیلا رنگ کتنا

خوبصورت لگتا ہے اسے۔

حیرت ہے کہ اس نے آج تک ان خوب صورتیوں کو محسوس کیوں نہیں کیا تھا۔

لاہور سے رنگ پور تک کا سفر اس نے رضوانہ سے متعلق ہی سوچتے ہوئے گزارا تھا۔ پتا نہیں اب وہ

کیسی ہوگئی ہوگی۔ شاید زیادہ بڑی اور سمجھ دار ہوگئی ہو۔ حالانکہ چند ماہ پہلے ہی تو اس نے اسے دیکھا تھا

لیکن اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بڑی مدت بعد گاؤں جا رہا ہو۔ جیسے وہ ایک طویل عرصے بعد اسے دیکھے

گا۔ وہ اس سے کہے گا کہ وہ اسے بہت یاد کرتا رہا ہے اور یہ کہ وہ بہت اچھی ہے۔ ستر ہزار باتیں اس نے

سوچ ڈالی تھیں کہ یوں کہے گا یوں کہے گا اور وقت گزرنے کا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ جب وہ قصبے کے

ریلوے اسٹیشن پر اترا تو چونک پڑا۔

”ارے اتنی جلدی شہر آ گیا۔“

حالانکہ یہی سفر پہلے کتنا لمبا ہو جاتا تھا۔ کتنا ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتا رہتا تھا۔ پہلو بدلتا رہتا

تھا۔ اسے لاہور بہت دور لگتا تھا اور گھر آ کر وہ ضرور ماں جی سے کہتا۔ بہت لمبا سفر ہے ماں جی لیکن آج تو

اسے ذرا سی بھی ٹکان نہیں محسوس ہو رہی تھی اور وہ جب تانگے میں بیٹھا تھا تب بھی اسی کے متعلق سوچ رہا

تھا اور اپنے دھیان میں اتنا گنگناتا تھا کہ اس نے اوپر چھت پر کھڑی ماں جی کی طرف دیکھا تک نہیں حالانکہ

پہلے ہمیشہ تانگے سے اتر کر وہ اوپر اپنے گھر کی چھت کی طرف دیکھتا تھا اور پھر ماں جی کو منڈیر کے پاس

دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تھا اور پھر ماں جی اسے دیکھ کر مسکراتی تھیں اور پھر وہاں سے ہٹ جاتی تھیں کہ نیچے آ کر

بیٹے کا استقبال کریں اور آج جب ماں جی نے آواز دی تب وہ چونکا اور اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ماں

جی منڈیر پر جھکی ہوئی تھیں۔

”پتر تو آگیا ہے۔ بیمار تو نہیں ہے؟“ انہوں نے چھت پر سے ہی آواز لگائی تھی۔
 ”نہاں جی۔“ اس نے اوپر دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کچھ دیر بعد ہی اس کے گھر کے گیٹ پر پہنچنے سے پہلے
 ہی ماں جی کنڈی کھول کر باہر گئی میں آچکی تھیں۔
 ”میری طبیعت تو ٹھیک ہے کا کے!“ کبھی کبھی لاڈ میں آکر وہ اسے یونہی کہتی تھی۔
 ”ہاں ماں جی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو یہ وہم کیوں ہو رہا ہے؟“
 ”پتر میں نے تمہیں دو آوازیں دیں لیکن تم اپنے دھیان میں ہی مست تھے۔ میں نے سمجھا کہیں
 طبیعت نہ خراب ہو۔“

”نہیں ماں جی وہ بس ایسے ہی اپنے پیپر کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

”اب کے بہت دنوں بعد آیا ہے تو؟“

”ہاں بابا نے کہا تھا تا کہ پیپر ہونے سے پہلے نہ آتا۔ وقت ضائع ہوگا۔“

”تیرے پیپر کیسے ہوئے ہیں؟“

”بہت اچھے۔“

”اب تو ڈاکٹر بن جائے گا؟“

”نہیں ماں جی ابھی تو اس کالج میں داخلہ ہے گا جہاں میں ڈاکٹری پڑھوں گا اور پھر ڈاکٹر بنوں گا۔“
 اپنا بیک برآمدے میں ہی پھینک کر وہ باورچی خانے میں آگیا جہاں بھابھاس کے لیے گرم گرم پھلکے بنانے
 لگیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ وہ ہوں ہاں کرتا رہا۔
 ”سکندر کیا ابھی لاہور میں ہی ہے؟“ بھابی نے چنگیر میں پھلکار کتے ہوئے اسے دیکھا۔
 ”نہ۔ نہیں تو۔“ وہ چونک پڑا۔

”سنائے جو بندہ شہر جاتا ہے اس کا بھر گاؤں آنے کو دل نہیں چاہتا۔ وہاں بڑی رونقیں ہوتی ہیں۔“
 ”نہیں تو۔ میں تو ایک ایک دن گن کر گزارتا ہوں۔ چاچا کیسے ہیں اور رضو۔۔۔۔۔۔“ بات کرتے
 کرتے وہ جھجک سا گیا جیسے بھابھاس کے من کا چور پالیں گی۔
 ”اچھا ہے اور رضو بھی ٹھیک ہے۔ چاچا صبح کام پر جاتے ہوئے اسے ادھر ہی چھوڑ جاتا ہے اور پھر
 شام کو لے جاتا ہے۔ دن بھرا کیلی کیسے رہے۔“

”ہاں چاچا اچھا کرتا ہے۔“ اس نے باہر نظر دوڑائی اور سوچا اگر وہ ادھر تھی تو پھر اب کہاں ہے۔ میری
 آوازیں کر باہر کیوں نہیں نکلی۔ شاید اندر کسی کمرے میں سو رہی ہو۔
 ”تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے چاچا اسے لے کر گیا ہے۔“

اوہ! اسے افسوس ہوا اگر قصبے میں کرم دین نے سوار یوں کے انتظار میں دیر نہ کی ہوتی تو وہ رضوانہ کو

دیکھ سکتا تھا۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ رضوانہ اس کے گھر ہے تو وہ سوار یوں کا انتظار نہ کرتا اور سالم تا نگہ لے
 لیتا۔ اس نے جلدی جلدی تین چار لقمے لیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا سکندر!“ بھابھو کو حیرت ہوئی ”قیمہ آلو تو تمہیں بہت پسند ہے۔“

”وہ دراصل راستے میں کچھ کھالیا تھا تا اب بھوک نہیں ہے۔“

”اچھا بیٹھنا کہاں چلا۔ چائے بناتی ہوں۔“

”نہیں بھابھو چائے کو بھی جی نہیں ہے۔ میں ذرا چاچا سے مل آؤں بابا کو بھی دیکھتا ہوں کیا خبر وہ چاچا
 کی طرف ہی گئے ہوں۔“

”نہیں بابا تو کہہ کر گئے تھے کہ وہ ذرا چوہدری اشرف کی طرف جا رہے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں ذرا چاچا کو دیکھ آؤں۔“

”صبح چلے جانا اب آئے ہو تو رہو گے ہی ناں۔“

”ہاں وہ تو ہے لیکن بس دل اداس ہو رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ چاچی کے بعد اب ہی آیا ہوں ناں۔“
 وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ رضوانہ اپنے گھر کے صحن میں ہی کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔
 ”رضوانہ!“

”ارے سکندر!“ وہ خوشی سے چیخی ”کب آئے ہو؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے۔“

اس کی پرشوق نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ کامل بھری آنکھیں گلابی صحت مند چہرہ پیاری سی
 ناک میں دکٹی ہوئی لونگ وہ کتنی بے تحاشا خوبصورت تھی۔ اسے اپنی طرف یوں مسلسل دیکھتا پا کر رضوانہ
 کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”تم ٹھیک تو رہی ہوتا۔“

”ہاں ٹھیک ہوں۔“

”چاچا کیسے ہیں؟“

”ابا بھی ٹھیک ہیں۔ آج کچھ طبیعت گری گری سی لگتی ہے ان کی کچھ ہلکا سا بخار ہو رہا ہے اندر لیٹے ہیں۔“

”رضو! کون ہے؟“ اندر سے چاچا کی آواز آئی۔

”ابا! سکندر آیا ہے۔“

”ارے پتر! اندر ہی آجا۔ آج کچھ تھکن سی ہو گئی تھی اندر لیٹا ہوں۔“

وہ رضوانہ کو ایک نظر دیکھتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ چاچا اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

”چاچا کیسے ہو؟“ وہ جھکا تو چاچا نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

چائے کی بالکل عادت نہیں ہے۔“

”ارے شہر میں تو لوگ بہت چائے پیتے ہیں۔“

”مگر مجھے چائے زیادہ پسند نہیں ہے۔ میں منع کر دیتا ہوں رضو کو۔“ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ رضی باورچی خانے میں بیڑی پر بیٹھی تھی۔ باورچی خانے کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اس نے آہستہ سے اسے بلایا۔

”رضی!“

”ارے تم باہر کیوں آ گئے ہو سکندر! میں چائے بنا کر لا رہی ہوں۔“ اس نے چونک کر کہا۔

”رضی چائے مت بناؤ۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے چلا آیا ہوں۔ بابا گھر پر نہیں تھے۔ آکر انتظار کر رہے ہوں گے۔ میرا دل چاہ رہا تھا تم سے ملنے کو تمہیں دیکھنے کو۔“

رضوانہ نے مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”پہلے تو تمہارا اس طرح کبھی مجھ سے ملنے کو جی نہیں چاہا۔ تم دو دو تین تین دن آتے ہی نہیں تھے ادھر۔“

”ہاں مگر ہمارے رضی اس بار میں نے تمہیں بہت یاد کیا ہے۔ رات کو جب بستر پر لیٹا ہوں تو تمہاری شکل آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ میں جب گیا تھا ناں تو تم رو رہی تھیں۔ تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ میرا جانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں یہاں رہنا چاہتا تھا تا کہ تمہارا دکھ بنا سکوں لیکن مجھے جانا تھا۔ میرا بڑھائی کا جو نقصان ہو رہا تھا۔ بابا اور چاچا جانے کتنا تھا میں اب چلا جاؤں مگر میں نے وہاں تمہیں بہت یاد کیا۔ کیا تم نے بھی کبھی مجھے یاد کیا رضی؟“

”ہاں میں تو سب کو ہی یاد کرتی ہوں سکندر تمہیں بھی اور بھانڈا کو بھی۔ میرا کوئی بھائی بھی تو نہیں ہے۔ تم لوگ ہی تو ہمارا سب کچھ ہو۔ اماں بھی جب زندہ تھیں تو ہر وقت تمہاری اور بھانڈا کی باتیں کرتی رہتی تھیں! بابا بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔“

”رضی۔ رضی میں تم سے شادی کروں گا۔ تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

اس نے ایک دم کہہ دیا اور رضوانہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر ایک ایسی ہی اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے اور چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔

”کرو گی نا مجھ سے شادی؟“

اس نے پر شوق نظروں سے اس کے چہرے پر کھلتے رنگوں کو دیکھا۔

”ہاں نہیں۔“ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

”رضی۔ رضی ادھر دیکھو نا پلیر بناؤ ناں۔“ اس نے اصرار کیا لیکن رضی نے گھٹنوں سے سر نہیں اٹھایا ”اچھا ٹھیک ہے تم نہیں کرو گی تو پھر میں بھابھ سے کہوں گا کہ وہ میری شادی تمہیں سے کروا دے ٹھیک ہے نا۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ اس نے ایک دم گہرا کر سر اٹھایا ”میں کروں گی۔ میں کروں گی۔“

”ٹھیک ہوں۔ تو سنا، تیرے پرچے ہو گئے؟“

”جی چاچا ہو گئے۔“

”پاس ہو جائے گا ناں۔“

”جی چاچا اور سنا میں کیسی گزر رہی ہے؟“

”کیا سناؤں پتر گزر رہی ہے بھلی چنگی۔ مرد عورت کا بھی عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ گھر میں ہوتی ہے۔ تو بعض اوقات مرد کو دکھائی نہیں دیتی۔ چلی جاتی ہے تو ہر طرف وہی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لگتا ہے جیسے ابھی یہاں تھی اور ابھی وہاں۔ جیسے ہر طرف وہی وہ تیری چاچی کے بغیر گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ جیسے صرف ایک اس کے جانے سے گھر خالی خالی ہو گیا ہے۔ رضوانہ ہوتی تو گھر میں گھسنے کو بھی جی نہ چاہتا۔“

”چاچا! آپ ہمارے گھر آجائیں نا تو سب مل جل کر رہ لیں گے۔“

”جھلا۔ کبھی اپنا گھر بھی کسی نے چھوڑا ہے۔ آدمی گھر سے ہی تو معتبر ہوتا ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر تو آدمی بے وقعت ہو جاتا ہے۔ تنکے سے بھی ہلکا۔ گھر آدمی کی بہت بڑی ٹیک ہوتے ہیں یا۔ تیری چاچی اللہ جنت نصیب کرے کبھی تھی آدمی کے پاس اپنا گھر نہ ہوتا تو گلیوں کے کھک سے بھی ہولا ہو جاتا ہے۔ تیری چاچی پڑھی لکھی نہیں تھی پر باتیں بڑی پڑھ لکھوں جیسی کرتی تھی یا۔“

”چاچا! آپ کو چاچی بہت یاد آتی ہے؟“

”ہاں یاد آتا تو بڑی آتی ہے۔ جب بھی تو مجھے دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ اب نہیں ہے تو چاروں طرف وہی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل مرد جو ہوتا ہے نا پتر وہ جب عورت کو بیوی بنا کر گھر لا ڈالتا ہے نا تو اسے خود سے دیکھتا ہی نہیں۔ عورت کو خود دیکھنا پڑتا ہے اور جو تیری چاچی تھی نا اسے یہ فن آتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس نظر ہی نہیں آتی تھی۔ نہ بری نہ بھلی۔ دس سنا تھا تو سن لیتی تھی۔ زندگی بھر کوئی فرمائش نہیں کی جنتی نے اور وہ اپنا آپ جتنا ہی نہیں تھی تو میں بھی نہیں دیکھتا تھا اسے۔“ انہوں نے قمیص کی آستین سے آنکھیں پونچھیں۔

”چاچا! سکندر نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا ”چاچی تمہیں ہی بہت اچھی۔“

”ہاں یا میں نے ہی اس کی قدر نہیں کی۔“ چاچا دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا ”ارے میں بھی کن باتوں پڑ گیا ہوں۔ تجھ سے چائے پانی کا تو پوچھا ہی نہیں۔ تیری چاچی کو ہی ان باتوں کا خیال رہتا تھا۔ رضو تو ابھی بچی ہے۔“ بات ختم کر کے انہوں نے رضوانہ کو آواز دی ”رضو رضو پتر! چائے بنا لے سکندر کے لیے۔“

”بنارہی ہوں ابا!“ رضوانہ نے کمرے میں جھانک کر بتایا اور پھر واپس چلی گئی۔

”نہیں۔ نہیں چاچا! مجھے چائے نہیں پینا۔ میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا ابھی کھانا کھا کر آیا ہوں۔ مجھے

”کیا کروں گی؟“ سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”شادی۔“ اس نے کہہ کر فوراً دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا تو وہ بے اختیار فحش دیا۔ اسے یوں لگا جیسے چاروں طرف پھول ہی پھول کھل اٹھے ہوں اور وہ جو پچھلے کئی مہینوں سے اپنے دل پر بوجھ لیے پھر رہا تھا وہ بوجھ یک دم اتر گیا ہو۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں تم سے ہی شادی کروں گا۔ متوں سے نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی تھی ”ویسے منوں بھی بری نہیں تھی، ہے ناں۔“

”نہیں وہ بالکل بھی نہیں اچھی۔“ اس نے ایک دم چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے ”اتنا تو کالا رنگ ہے اس کا اور پھر اتنی لڑا کا بھی ہے۔“

”اچھا پھر تم ہی ٹھیک ہو۔“

”تم شہر جا کر بہت شرارتی ہو گئے ہو۔“

”پتا ہے رضی! وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔“ اس سے پہلے میں نے کبھی تمہارے متعلق نہیں سوچا تھا لیکن اب جب میں نے سوچا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں تم سے ہی شادی کروں گا اور تمہارے سوا کسی اور سے نہیں چاہے آسمان سے حور اتر آئے۔“

اس کی آنکھیں یک دم برسنے لگی۔

”ارے!“ وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا ”توئی کیوں ہے تھکتی میں، کیا میں نے کوئی بری بات کہ دی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر کیوں زور ہی ہے؟“

”بس ایسے ہی دل بھرا آیا ہے۔“

”دیکھ تو نہ رویا کر۔ میں تیرے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ تیرے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ پتا ہے تیرے آنسوؤں نے ہی تو مجھے کتنے دن سوئے نہیں دیا۔ بہت بے چین رکھا مجھے۔ اسی لیے تو میں تجھ سے شادی کروں گا کہ تجھے کبھی رونے نہ دوں۔ میں تجھے ہمیشہ خوش رکھوں گا رضی۔ ہمیشہ۔“

رضوانہ آنسو پونچھ کر مسکرا دی۔

”ہوں! بس ایسے ہی مسکراتی رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔“

وہ شرما گئی۔

”سنو میں تمہارے لیے شہر سے چوڑیاں اور ایک سوٹ لایا ہوں۔ پتا نہیں تجھے پسند بھی آئیں گی یا نہیں۔“

”تم لائے ہو تو کیوں نہ پسند آئیں گی۔ اصل بات تو یہ ہوتی ہے کہ اسے کون لایا ہے۔“

”ارے وہ تو چاچی کی طرح بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے رضی۔ میں صبح تمہیں دوں گا۔ تم آؤ گی نا

مگر تو ابھی تو میں بس ایسے ہی اٹھ کر آ گیا تھا۔ بابا سے بھی نہیں ملا۔ اب چاہا سے مل کر گھر جاؤں گا۔“

”اچھا!“ رضی نے سر ہلادیا اور وہ اندر چاچا کے پاس چلا گیا۔



اس روز جب وہ گھر واپس آیا تو بے حد خوش تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے پوری کائنات اس کی خوشی میں سر یک ہو۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ رضوانہ کو دیکھتا رہے اس سے باتیں کرتا رہے اسے بتائے کہ اس نے اسے کتنا سوچا۔ کتنا مضطرب اور بے چین رہا لیکن یہ سب کہنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں ہوتے تھے۔ وہ رضوانہ کو دیکھتا تھا اسے سراہتا تھا لیکن اس سے کچھ کہنے کے لیے جتنے الفاظ اس نے اکٹھے کر رکھے ہوتے تھے وہ سب گم ہو جاتے تھے ”رضوانہ تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ وہ اتنا ہی کہہ پاتا اور صرف اتنا کہنے سے ہی اس کے چہرے پر جو رنگ بکھر جاتے تھے وہ دیکھنے والے ہوتے اور اگر وہ سب کچھ اسے بتائے جو سوچتا ہے تو پتا نہیں..... کیا خدا الہی کے چہرے پر کیسے رنگ اتریں۔

پتا نہیں وہ کتنی خوب صورت لگنے لگے۔

وہ سوٹ اور چوڑیاں لے کر بہت خوش ہوئی تھی۔

کتنی معصوم اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں اس کی۔

اس نے چوڑیاں اور سوٹ بھاڑا ہوا جی چاچا بابا۔ سب کو دکھایا تھا اور وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا تھا کہ یہ سب لوگ کیا کہیں گے کہ میں رضوانہ کے لیے سوٹ کیوں لایا ہوں لیکن کسی نے کوئی ٹوٹس ہی نہیں لیا۔ بھابھو نے کہا بھی تو صرف اتنا کہ تم نے اچھا کیا سکندر۔ رضوانہ کو بہت خوشی ہوئی ہے۔ چاچی کے بعد وہ بہت اداس رہتی ہے۔

وہ صبح ہی ادھر آ جاتی تھی اور پھر اسے ادھر ادھر بھاڑا ہوا جی کے ساتھ گھومتے پھرتے اور کام کرتے دیکھتا رہتا تھا۔ بظاہر برآمدے میں کرسی بچھائے کتاب سامنے رکھے وہ پڑھنے کی کوشش کرتا رہتا لیکن اس کی نگاہیں رضوانہ کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ جس دن چاچا گھر ہوتا اور رضوانہ ادھر نہ آتی تو وہ گھنٹوں چھت پر کھڑا رہتا کہ شاید وہ آتے جاتے اسے کہیں نظر آ جائے۔ وہ سوچتا تھا کہ اب کے لاہور میں وہ اسے زیادہ یاد آئے گی۔

پہلے اور طرح کی بے چینی تھی۔

اب اور طرح کا اضطراب ہو گا۔

وہ سوچتا۔

رضوانہ دنیا کی ساری لڑکیوں سے مختلف ہے۔

ان تمام لڑکیوں سے مختلف جن کو اس نے دیکھ رکھا تھا۔

سے آٹھ یا سات سال بعد بھی تم اس کے لیے ایسا سوچ بھی سکو گے یا نہیں۔ مرے چاچا کی طرح نہ کرنا یار۔ کنیز پھوپھو میرے ابا کی کزن تھیں اور چاچا کی منگیتر۔ سنا ہے چاچا نے کم عمری میں اس کی خاطر چاچا غلام علی کا سر بھاڑ دیا تھا۔ چاچا غلام علی بھی ابا کے کزن تھے۔ چاچا اور کنیز پھوپھو کی انڈراستینڈنگ کا سب کو ہی پتا تھا اور پھر وہ چاچا کی منگیتر بھی تھی لیکن چاچا جب بڑے افسر بن گئے تو انہیں کنیز پھوپھو زہر لگنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ پھوپھو کنیز اس فاسٹ زندگی میں ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گی اور پھر پتا ہے پھوپھو کنیز نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے محن میں جو کنواں تھا اس کی منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی اور رات کے اندھیرے میں ان کا پاؤں پھسل گیا تھا لیکن میرے ابا جی کہتے ہیں کہ کنیز چاچا کی بے وفائی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور اس نے خود ہی کنویں میں چھلانگ لگائی تھی۔ یہ لڑکیاں بڑی معصوم ہوتی ہیں یار اگر تمہیں چاچا کی بیٹی سے شادی کرنا بھی ہے تو جب وقت آئے تو کر لینا ابھی اسے کچھ مت کہنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی مستقبل میں بڑا نام کماد گئے بڑے ڈاکٹر بنو گے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی اپنی کزن ان فٹ لگنے لگے۔“

”میں ایسا نہیں ہوں محسن یار مجھے اپنی منچر کا پتا ہے۔ مجھے مصنوعی چیزیں متاثر نہیں کرتیں میں دیہاتی آدمی ہوں۔ مجھے خالص چیزیں پسند ہیں اور یہ الزما ڈارن لڑکیاں تمہاری جیسی وہ مجھے اٹریکٹ نہیں کر سکتیں۔ میں اندر سے بہت مختلف ہوں۔ میں کتنا بڑا آدمی بن گیا۔ رضی کا مقام میرے دل میں بہت اونچا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں رضی کے علاوہ کسی اور کا تصور کروں۔“ سکندر نے اسے اطمینان دلایا۔ ”پتا ہے سکندر یار میں بہت چھوٹا سا تھا جب پھوپھو کنیز نے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی لیکن میرے دل پر ان کی موت کا بہت اثر رہا۔ وہ مجھے کبھی کبھی جب چاچا گھر آتا تو پاس بلا کر چاچا کی باتیں پوچھتی تھیں۔ مجھے کہتی تھیں، تیرا چاچا کیسا لگ رہا ہے۔ خوش تھا، کیسے کپڑے پہنتے تھے۔ تیری چاچا کی کیسی تھی۔ بس اسی کی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں..... اور پھر جب میں بتاتا کہ چاچا آج بہت خوش تھا، ہنس رہا تھا تو پھر وہ رو پڑتی تھیں۔ آنسو لڑیوں کی طرح ان کی آنکھوں سے بہتے تھے۔ یار پتا نہیں کیوں آج تیری کزن کو دیکھ کر مجھے اپنی پھوپھو کنیز یاد آ گئیں۔“

”چل چھوڑ یار ہر بندہ تو تیرے چاچا جیسا نہیں ہوتا۔“ صبح صادق نے اسے ٹوک دیا ”ہاں ایک بات بتا تو جو اتنی لڑکیوں سے چکر چلائے ہوئے ہے۔ تو کیا وہ معصوم اور نازک نہیں ہوتیں۔ کیا ان کا دل نہیں ٹوٹتا۔“ ”نہیں یار ہم کوئی محبت کا کھیل توڑا ہی کھیلے ہیں۔ بس انجوائے منٹ، مگ شپ۔ ان لڑکیوں کو بھی پتا ہے کہ یہ بس ایسے ہی ہے۔ یار اگر ان ہی لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کے ساتھ میں بنجیدہ ہو جاؤں اسے اپنی محبتوں کا یقین دلاؤں تو وہ لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگے گی۔ اتنی شدید محبت جتنی پھوپھو کنیز نے چاچا سے کی تھی۔ یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کے دل ان کو بتا دیتے ہیں کہ یہ محبت ہے یا فٹلٹ اور اس

محسن وقار کی جن لڑکیوں سے دوستی تھی۔

صبح صادق کی طرف جن لڑکیوں کے فون آتے تھے۔

رضوانہ ان سب سے الگ اور مختلف تھی۔

کوئی بھی رضوانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

کتنی معصوم تھی۔

کتنا دلکش تھا اس کا حسن۔

ان ہی دنوں جب وہ رضوانہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا، صبح صادق اور محسن وقار اس کے گاؤں آ گئے۔

”یار بہت بور ہو رہے تھے۔“ صبح صادق نے بیک برآمدے میں پھینکتے ہوئے کہا ”اور تو ہمیں دیکھ کر زیادہ حیران نہ ہو۔ ہم ایسے ہی بادشاہ لوگ ہیں۔ یوں ہی نوازتے ہیں۔ سوچا اس بار اپنے یار سکندر کو اپنی مہمان نوازی سے نوازتے ہیں۔ جتنے دن دل چاہے ہماری میزبانی کرو۔“

”نہیں میں حیران بالکل بھی نہیں ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے تمہارا آنا۔ بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہم سب تمہارے آنے سے بہت خوش ہیں۔ جتنے دن جی چاہے جی بھر کر رہو۔“ سکندر نے اسے گلے لگا لیا۔ ”دراصل محسن کو اپنی فرینڈز بہت یاد آ رہی تھیں۔ بے چارہ بہت اداس تھا۔ اپنی فرینڈز کو فون نمبر تو دے آیا تھا، لیکن یار خرابی یہ ہوئی کہ فون کا سیٹ اس کے ابا کے کمرے میں ہے اور بے چارے جب بھی فون کرتی ہیں ایک زوردار ”ہالو“ سن کر رکھ دیتی ہیں۔ ادھر محسن وقار کے دل پر سانپ لوٹ جاتے تھے۔ میں نے سوچا چلو اپنے یار کا دل بہلا لائیں۔ اپنا سکندر بھی خوش ہو جائے گا۔“

”بہت اچھا کیا بہت اچھا کیا تم نے یار۔“ سکندر ان کے آنے سے بہت خوش تھا۔

رات کو جب وہ تینوں مونس کے لیے لینے تو صبح صادق نے پوچھا ”یار تو نے اپنے دل کی بات کہہ دی؟“

سکندر مسکرایا۔

”یار وہ تیرے چاچا کی بیٹی ہے۔ تجھے اس سے شادی کرنا ہے تو پھر یار ابھی تمہیں اس سے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔“ محسن وقار بنجیدہ تھا۔

”کیوں یار؟“ صبح صادق کو حیرت ہوئی ”اس میں کیا حرج ہے۔ کیا چاچا کی بیٹی کو پسند کرنا جرم ہے۔“ ”نہیں یار یہ بات نہیں ہے۔ یہ لڑکیاں بڑی بے وقوف ہوتی ہیں۔ لمحوں میں محل کھڑے کر لیتی ہیں۔ مرد تو پتھر ہوتا ہے اور لڑکیاں کالج ہوتی ہیں۔ کرچی کرچی ہو جاتی ہیں۔“

”یہ؟ یہ اپنے یار محسن کو کیا ہو گیا ہے بھائی سکندر۔“ صبح صادق ہنسا ”یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔“

”یار سکندر۔“ محسن سکندر کی طرف متوجہ ہو گیا ”دیکھو یار اسے کوئی خواب مت دکھانا۔ پتا نہیں آج

کے بعد میں بے وفائی کر جاؤں تو اس کا دل بھی ایسے ہی ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح کرچی کرچی ہو جائے گا۔ جیسے پھوپھو کینڑ کا ہوا تھا۔ محبت یقین کا نام ہے اور یہ یقین ٹوٹ جائے تو بندہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔“

”یار یہ محسن آج کچھ زیادہ ہی غلط نہیں بول رہا۔“ صبح صادق نے سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

جونہ جانے کیا سوچ رہا تھا ایک دم چونک پڑا۔

”ہاں یار! کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ بندہ فلسفہ بولنے لگتا ہے۔“

”کیا اپنا محسن سچ مچ دل تو نہیں لگا بیٹھا؟“

”نہیں۔“ محسن ہنسا ”ابھی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بس وہ پھوپھو کینڑ یاد آگئی تھیں۔ تو ذرا اداسی اتر آئی تھی دل میں۔ چل ذرا کارڈز نکال لا، تھوڑا کھیلے ہیں۔“

صبح صادق اس کے بیک سے کارڈز نکالنے چلا گیا اور سکندر سوچنے لگا ”کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی کسی سے اتنی شدید محبت کرتا ہو جتنی میں رضوانہ سے کرنے لگا ہوں اور پھر بے وفائی کر جائے ناممکن۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ محسن کے چاچا نے کینڑ سے محبت کی ہی نہیں ہوگی۔“

اس نے مطمئن ہو کر سوچا اور صبح صادق کے ہاتھ سے کارڈز لے کر پتے پھینٹنے لگا۔



پروفیسر عادل گاؤں گئے تو ایک دو دن کے لیے تھے لیکن وہاں الجھ کر ہی رہ گئے تھے۔ وہ جتنی جلدی واپس جانا چاہتے تھے اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ انہیں سرور کی بہت فکر تھی۔ آتے ہوئے وہ خدا بخش کو اس کا خیال رکھنے کو کہہ آئے تھے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کافی تیز بخار تھا اور انہوں نے اسے منع کیا تھا کہ وہ اس حالت میں گاؤں نہ جائے۔ میں آ جاؤں گا تو تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ انہیں سچ مچ اس کی بہت فکر تھی ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد اسے پھر ٹیپر پیچر ہو جاتا تھا۔ کتنی دفعہ وہ اسے کہہ چکے تھے کہ وہ کسی اسپیشلسٹ کو دکھائے لیکن وہ دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ ایک گھریلو حالات نے اسے بہت اپ سیٹ کر کے رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اسے گھٹنوں پریشان رکھتی تھیں۔

”یار مرد ہو! مردوں کی طرح سوچا کرو۔“ انہوں نے کتنی بار اسے سمجھایا تھا ”یہ کیا لڑکیوں کی طرح کڑھتے رہتے ہو۔ دنیا میں ایسے حادثات ہوتے ہیں اور آدمی برداشت کرتا ہے۔ اپنی تعلیم اور اپنے شوق کی طرف توجہ دو۔“

پتا نہیں کیوں انہیں اس لڑکے سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ بہت محبت محسوس کرتے تھے وہ اس کے لیے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ کچھ بن جائے اور یہاں آ کر وہ بری طرح پھنس گئے تھے۔ کامل کی طبیعت کافی خراب تھی اور وہ جو ماں جی نے انہیں بتایا تھا کہ اسے دور سے پڑتے ہیں تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تو واقعی اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس بار وہ آئے تو وہ ان سے خفا تھا۔ پہلے جب وہ حویلی آتے

تھے تو وہ ان سے لپٹ جاتا تھا ان کے ہاتھوں پر پیار کرتا تھا۔ بھائی بھائی کہہ کرتا لیاں بجاتا اور خوشی کا اظہار کرتا لیکن اب کہ جب وہ ہاتھ وغیرہ لے کر اس کے کمرے میں گئے تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹا سانسے دیوار کو گھور رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”کامی بیٹا کیسے ہو۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور کروت بدل لی۔ وہ اداس سے ہو کر باہر آگئے اور کرم داد سے پوچھا۔

”کرم داد یہ کامی نے کیا اب چپ سادھ لی ہے۔ کیا اس کی طبیعت اس وقت خراب ہے؟“

”نہیں اس وقت تو وہ ٹھیک ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بہت خوش تھا لیکن آپ سے ناراضی کا اظہار کر رہا ہے۔ اتنے دنوں بعد جو آپ آئے ہیں۔“

”اوہ۔“ انہیں حیرت ہوئی کہ وہ ایسا سنس رکھتا ہے۔ وہ پلٹ کر اس کے کمرے میں چلے آئے اور پھر اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لے کر اسے خوب پیار کیا۔ تب کہیں جا کر اس کا موز ٹھیک ہوا تھا۔ وہ بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اس کی لالچنی اور بے معنی باتیں سنتے رہے تھے۔ کبھی وہ ان کی گھڑی پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کرتا اور منہ سے آوازیں نکالتا کہ یہ اچھی ہے۔ کبھی کپڑوں پر ہاتھ پھیرتا۔ وہ اس کے پاس جتنی دیر تک بیٹھے اندر ہی اندر ان کا دل گداز ہوتا رہا۔ آنسو ان کے اندر گرتے رہے یہ ان کا بھائی تھا۔ انہیں بہت پیار تھا۔

وہ چھوٹے سے تھے تب سے وہ اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن کتنے بے بس تھے کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ کوئی خوشی اسے نہیں دے سکتے تھے۔

کتنا بڑا المیہ ہوتا ہے یہ بھی۔

ان سب کے لیے جن کو یہ سب دیکھنا پڑتا ہے۔

وہ کامل کے کمرے سے آئے تو بہت اداس اور افسردہ سے تھے۔ باہر کہیں جانے کے بجائے وہ ماں جی کے کمرے میں ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

”کیا ہوا عادل پتر؟“ ماں جی انہیں یوں لیتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟“

”ہاں ماں جی! بس کامی کا سوچ رہا تھا۔ جب بھی اسے دیکھتا ہوں نا تو دل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔“

”میرا کلیجہ بھی ہر وقت کھتا رہتا ہے اسے دیکھ دیکھ کر۔ سوچتی ہوں میں اس کی مجرم ہوں۔ یہ میری سزا ہے۔ اس کی نہیں وہ تو ناجسم ہے۔ اسے تو کچھ خبر نہیں ہے۔ سزا تو ہمارے لیے ہے نا عادل پتر۔ میں چاہتی تھی کہ وہ دنیا میں نہ آئے لیکن وہ آ گیا کسی طرح۔“ وہ رونے لگیں تو عادل اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”اچھا ماں جی! حوصلہ کریں۔ پلیز یہ قدرت کے امتحان ہیں اور اللہ میاں اپنے بندوں کا امتحان لیتا

ہے۔ خدا سے دعا کیا کریں ماں جی کہ وہ آپ کو حوصلہ دے ہمت دے۔“

”اللہ کا شکر ہے پتر۔ میں تو ہر وقت خدا سے ڈرتی رہتی ہوں۔ شکر ادا کرتی رہتی ہوں اس کا۔ تم ہوتا میرا سہارا میرا آسرا اللہ تمہیں زندگی دے۔“

”ماں جی! میں انشاء اللہ واپس جاتے ہی ڈاکٹروں سے مشورہ کروں گا اور کامل کو لے جاؤں گا۔ اسے اپنے پاس رکھوں گا۔ آپ اسے دیکھ کر پریشان ہوتی ہیں ناں۔ آپ بھی ریلیکس ہو جائیں گی۔“

”نہیں پتر تو کہاں رکھے گا اسے پھر مجھے اس کے بغیر چین کہاں آئے گا؟“

”مگر آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ اسے کسی ادارے میں.....“

”میں نے نہیں کہا تھا تیرا۔ چاچا کہہ رہا تھا۔“ ماں جی نے اس کی بات کاٹ دی ”میں نے تو صرف علاج کے لیے اسے لے جانے کو کہا تھا۔ آج کل اس کو زیادہ دورے پڑنے لگے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ماں جی جیسے آپ کہیں گی۔“

ایک دم ہی ان کے اندر تھکن سی اتر آئی تھی۔ وہ آنکھیں موند کر پھر لیٹ گئے اور ابھی انہوں نے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ کامل کی چیخیں سن کر ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا کرم داد؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا جی! بس وہ دورہ پڑ گیا ہے اسے۔“

ماں جی بھی ان کے پیچھے ہی آئی تھیں۔

”پتر تم جاؤ اندر کرم داد سنبھال لے گا اسے۔ سفر کر کے آئے ہو تھکے ہوئے ہو۔ جب دورہ پڑتا ہے تو یہ اسی بری طرح چیختا ہے۔ روتا ہے۔ کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ کرم داد ہی سنبھالتا ہے اسے۔“

انہوں نے اس سے پہلے اسے یوں چیختے چلاتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ابھی چھوٹا سا تھا کہ دادا نے اسے ایجوکیشن کے لیے باہر بھیجا دیا تھا۔ باہر سے آکر وہ زیادہ عرصے حویلی میں نہیں رہے تھے اور جتنا عرصہ رہے تھے انہوں نے کامل کو دورے پڑتے نہیں دیکھے تھے۔ دادا اب کہ ساتھ ساتھ چلتا ان کے ہاتھ پکڑ کر پیار کرتا ہوا ہنستا ہوا کھیلتا ہوا ہی انہوں نے دیکھا تھا۔ اتنی اذیت میں انہوں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اسے اپنے بازوؤں میں بھینپے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال ہو کر ان کے بازوؤں میں ہی سو گیا۔

”ماں جی! پہلے تو کامی کو یہ دورے نہیں پڑے تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔“

”ہاں بیٹا بس یہی کوئی چار چھ ماہ سے پڑنے لگے ہیں۔“

”تو آپ نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔ مجھے فون کرتیں! میں کسی ڈاکٹر کو ساتھ لے آتا۔“

”پتر تمہارے چاچا شہر سے ایک ڈاکٹر لائے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ دماغی امراض کا ماہر ڈاکٹر ہے۔“

”پھر ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

”یہی کہ اس طرح کے بچوں کو بعض اوقات دورے پڑنے لگتے ہیں کسی بھی عمر میں اور پھر شدت اختیار کر جاتے ہیں۔“

”حیرت ہے ماں جی! آپ نے مجھے تو اطلاع کرنا تھی۔ میں لاہور میں بھی کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیتا۔“

”تمہارے چاچا نے ہی منع کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ تمہیں پریشان کرنے کا فائدہ۔“

”کمال ہے ماں جی! میں آپ کی یا کامی کی کسی بات سے پریشان نہیں ہوتا۔ آپ دونوں ہی تو سب کچھ ہو میرے لیے۔ آپ نہیں ہوں گی تو میں نہیں ہوں گا۔ پلیز ماں جی! مجھے اپنی پریشانیاں اپنی تکلیفیں نہ چھپایا کریں۔ میری زندگی آپ دونوں کے کام آجائے تو کچھ نہیں ہے ماں جی۔ پلیز ماں جی!“ ان کی آواز بھر اگئی۔

”اچھا اچھا! ٹھیک ہے پتر!“ انہوں نے جھک کر پروفیسر عادل کی پیشانی پر بوسہ دیا ”چلو اٹھو اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ اب یہ تین چار گھنٹے سوتا رہے گا۔“

پروفیسر عادل نے آہستگی سے کامل کا سر نیچے پر رکھا۔ اسے کبھل اوڑھ لیا اور اس کی پیشانی پر پیار کر کے اپنے کمرے میں آگئے۔ اس رات انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ کامل کو ساتھ لے جائیں گے۔ اسے علاج کی ضرورت تھی۔ بہتر ٹریٹمنٹ سے اس کی تکلیف کم کی جاسکتی تھی۔

لیکن صبح اور ہی بکھیرے ہو گئے تھے۔ لوگوں کو جیسے ہی پتا چلا کہ وہ آئے ہوئے ہیں وہ نہ جانے کیا مسائل لے کر ان کے پاس آنے لگے تھے اور ان کے مسائل حل کرتے کرتے دودن گزر گئے تھے اور وہ سخت جھنجھلائے ہوئے تھے۔ اس روز بھی ماں جی کے پاس آکر بیٹھے ہی تھے کہ نشی نے آکر کہا کہ اللہ دتا ملنے آیا ہے! اس کا بیٹا بھی ہے ساتھ۔

”نشی چاچا! آخر میاں چاچا ہیں! سلطان ہیں! یہ لوگ اپنے مسائل ان کے پاس لے کر کیوں نہیں جاتے۔ میں یہاں صرف ایک دودن کے لیے آیا ہوں اور وہ ایک دودن میں ماں جی اور کامل کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

”بیٹا! یہ لوگ تمہارے اپنے ہیں! اوکھے ہو کر تمہارے پاس ہی آئیں گے۔“ ماں جی نے سمجھایا ”جاؤ جا کر ان کے مسائل سنو اور حتی الامکان حل کرنے کی کوشش کرو۔“

”مگر وہ چاچا تو ہیں! یہاں۔“ وہ کابلی سے آرام کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھے رہے۔

”بیٹا! بھائی صاحب تو اب دلچسپی کم ہی لیتے ہیں۔ سب کچھ انہوں نے سلطان کے حوالے کر رکھا ہے اور سلطان کا تمہیں پتا ہے ناں۔ اس کا مزاج اور طرح کا ہے۔ بے چارے غریب مزارع ڈرتے ہیں اس سے۔ چلو اٹھو! سن لو بات جا کر۔ جو بندہ آس لے کر آتا ہے اسے مایوس نہیں کرنا چاہیے۔“

وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر مردانے میں آئے۔

راجہ اللہ دتا انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی پگڑی ان کے پاؤں پر رکھ دی۔

”ارے ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ انہوں نے جھک کر پگڑی اٹھالی ”بیٹھیں پلیز“ آپ اور

بتائیں کیا مسئلہ ہے؟“

”ہم جی آپ کے پردادا کے زمانے سے آپ کی زمینوں پر کام کر رہے ہیں اور اب جی وہ چوہدری

صاحب نے ہمیں کہا ہے کہ ہم پنڈ چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ جی ہم کہاں جائیں۔ ہمارے باپ دادا کی

بڑیاں اسی زمین میں ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ”آخر چاچا جی نے ایسا کیوں کہا؟“

”وہ جی ملک صاحب نے نہیں چوہدری سلطان صاحب نے کہا ہے جی۔“ اللہ دتا کا بیٹا احسان اللہ

ایک دم بیچ میں بول پڑا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں لیکن سلطان نے کیوں کہا ہے؟ تم لوگوں کو گاؤں چھوڑنے کو۔“

”وہ جی دراصل بات یہ ہے جی کہ.....“ احسان اللہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اللہ دتا نے اسے ٹوک دیا۔

”نہ جی ہمیں کچھ نہیں بتا۔ بس جی وہ پرسوں چوہدری صاحب نے ہمیں بلایا ہے اور کہا کہ کل سے ہم

زمینوں پر کام نہ کریں اور ایک دودن میں پنڈ بھی چھوڑ دیں۔“

پروفیسر عادل نے محسوس کیا تھا کہ اللہ دتا وجہ نہیں بتانا چاہتا شاید وہ سلطان سے خوف زدہ ہے۔

”ٹھیک ہے“ آپ لوگوں کو گاؤں چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ زمینوں پر بدستور کام

کرتے رہیں۔ میں چاچا جی سے بات کر لوں گا۔“

وہ دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے تو وہ پریشان ہو کر اندر آ گئے۔

”ماں جی لوگ سلطان سے بہت خفا ہیں بہت شکایتیں ہیں سلطان کی آپ چاچا جی سے بات کریں نا۔“

”بیٹا تم خود بات کر لو اور پھر جب سے تم آئے ہو گھر پر ہی ہو۔ چاچا سے مل بھی آؤ اور بات بھی

کر لیتا ہاں ابھی کون آیا تھا۔“

”اللہ دتا تھا۔“

”کیا کہتا تھا؟ اللہ بخشے تمہارے دادا اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کوئی رقم وغیرہ کی تو ضرورت نہیں

جوان بیٹیاں ہیں شادی وادی کے سلسلے میں تو مدد لینے نہیں آیا تھا۔“

”نہیں ماں جی۔“

پروفیسر عادل نے تفصیل بتائی اور ماں جی سے اجازت لے کر اسی وقت چاچا جی سے ملنے چلے آئے۔



”آؤ آؤ پتر سنا تھا تم آئے ہو لیکن بس کچھ بکھیر لوں میں پڑا ہوا تھا“ آبی نہیں سکا۔“ ملک عبدالرحمن

نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ اصولاً انہیں ملنے آنا چاہیے تھا۔

”چاچا جی، بس وہ میں بھی کال کی وجہ سے پریشان تھا، گھر سے نہ نکل سکا۔ اسے میرے آتے ہی دورہ

پڑ گیا تھا۔ بہت بری حالت ہو گئی تھی۔“

”ہاں پتر اس کی حالت اب خراب ہی ہے۔ میں ڈاکٹر لایا تھا شہر سے، وہ کہتا تھا کہ ایسے بچوں کو اس عمر

میں اس طرح کے دورے اچانک پڑنے لگتے ہیں پھر شدت اختیار کر جاتے ہیں ایسے بچوں کی اوسط عمر

بس یہی نہیں اکیس سال ہوتی ہے۔ میں نے بھابی سے بات ہی نہیں کی کہ خواخوہ پریشان ہوں گی۔“

”اچھا کیا آپ نے ورنہ ماں جی پریشان ہو جاتیں۔“

ان کے اپنے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں، کال کو ساتھ لاہور لے جاؤں گا۔“

”بیٹا کہاں خوار ہو گئے ابا جان نے کہاں کہاں اسے نہیں دکھایا۔ کس ڈاکٹر کے پاس لے کر نہیں گئے۔

اس مرض کا کوئی علاج ہے۔“

”مگر چاچا جی تکلیف اور اذیت بہتر علاج سے کچھ کم تو کی جاسکتی ہے نا۔“

”ہاں، کوشش کر دیکھو۔“

”یہ سلطان کہاں ہے؟“

”بیٹا شہر سے کچھ دوست آئے ہوئے تھے ان کو ساتھ لے کر شکار کے لیے گیا ہے۔“

”چاچا جی، اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔“

”ہاں ہاں کہو اپنی اولاد کی بات کا بھی کوئی برا مناتا ہے۔“

”چاچا جی، لوگ سلطان کی بہت شکایتیں کرتے ہیں۔“

”کیا شکایتیں کرتے ہیں پتر؟ جوان خون ہے ذرا جلدی ابال آ جاتا ہے۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔“

انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

”وہ اس نے اللہ دتا کو منع کر دیا ہے زمینوں پر کام کرنے سے۔ کچھ بتا ہے آپ کو کیوں؟“

”نہیں۔ مجھے تو نہیں معلوم۔ اللہ دتا تو بہت پرانا بندہ ہے۔ بڑا نمک خوار ہے حویلی کا۔“

”جی ماں جی بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ دادا ان کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن سلطان شاہ نے اسے گاؤں

چھوڑنے کو کہا ہے۔ بے چارے کہاں جائیں گے بنے بنائے گھر چھوڑ کر۔ میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ

انہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ وہ بدستور زمینوں پر کام کرتے رہیں۔“

”ٹھیک کیا تم نے پتر میں سلطان کو سمجھا دوں گا۔“

چا چا جی آپ اس سے ضرور کہیے گا کہ وہ ذرا نرم رویہ رکھے۔ بے چارے غریب مزارع انسان ہی ہوتے ہیں۔“

”پتر، تجھے نہیں پتا، انہیں ذرا سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ نہیں تو سر پر ہی چڑھ جائیں لیکن سلطان ذرا تیزی دکھاتا ہے۔ جلدی غصہ آجاتا ہے اسے اور اپنی ماں کی طرح غصے میں اسے پھر کچھ نہیں سو جھتا۔“ وہ زور سے ہنسنے تو عادل بھی مسکرا دیے۔

”اچھا چا چا جی، میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ”سلطان سے کہیے گا کہ حویلی آئے۔ بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کچھ باری بھی آیا تھا تو گھر پر نہیں تھا۔“

”ہاں ہاں! اسے سمجھوں گا حویلی اور تم کیا اپنی چاچی سے نہیں ملو گے؟ باہر باہر ہی جا رہے ہو۔ اندر چلو میں بھی ابھی آتا ہوں۔ وہ نور خاں گیا ہے ملک سرفراز کو بلانے۔ ایک کام تھا اسے بننا کرتا ہوں۔“ ان کا مودت نہیں تھا اندر جانے کا۔ وہ حریم کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اس کی خاموش نگاہوں سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ جب بھی آتے تھے عجیب نظروں سے وہ انہیں دیکھتی تھی۔ اس کی نگاہیں سوال کرتی تھیں۔

التجا کرتی تھیں۔

ہزاروں سوال، ہزاروں التجائیں لپٹی ہوتی تھیں اس کی خاموش نظروں میں لیکن اب اس طرح باہر مردانے سے ہو کر چلے جانا بھی مناسب نہیں تھا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے بے دلی سے اندر چلے آئے اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے کہ حریم سے ملاقات نہ ہو لیکن اندر قدم دھرتے ہی ان کی پہلی نظر حریم پر پڑی۔ وہ بال کھولے پیڑھی پر بیٹھی تھی اور شاید کوئی ملازم اس کے سر میں تیل لگا رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام!“ ان کی آواز سن کر وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور قریب پڑا دو ٹپا اٹھا کر سر پر لے لیا۔

”آپ کب آئے؟“

”دو تین دن ہو گئے ہیں چاچا کہاں ہیں؟“

”ان کے سر میں درد تھا، سو رہی ہیں۔ میں چکا گئی ہوں۔“

”نہیں نہیں، چکائیے نہیں، میں پھل لوں گا کسی دن۔“ وہ جانے کے لیے پلٹے اور انہیں لگا جیسے حریم کی لمبی نظریں ان کے قدموں سے لپٹ گئی ہوں۔

وہی کچھ کہتی ہوئی نظریں۔

سوال کرتی۔

التجا کرتی۔

جن سے وہ گھبراتے تھے۔

ان کا اٹھا ہوا قدم رک گیا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

حریم کی نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنی طرف دیکھنا پھر اس کے لب ہلے۔

”بیٹھ جائیں ناں اب ایسی بھی کیا جلدی ہے اماں جاگ جاتی ہیں۔ آپ چائے تو پیئیں۔“

اس نے ملازمہ کو اشارہ کیا، وہ باہر چلی گئی۔

وہ بے بس سے ہو کر بیٹھ گئے۔ کئی لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ وہ ان کی نظروں کو خود پر مرکوز محسوس کر کے اندر ہی اندر الجھتے رہے اور پھر ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے حریم، آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے آپ کا کوئی نقصان کیا ہے یا جیسے آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔ آج پوچھ لیں، کیا پوچھتا ہے اور یہ بھی بتادیں کہ کیا نقصان کیا ہے میں نے آپ کا؟“

”جی۔“ حریم گھبرا گئی ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے بھلا میرا کیا نقصان کرتا ہے اور مجھے بھلا آپ سے کیا پوچھنا ہے۔“

”حریم، یہ تو مجھے بھی نہیں پتا اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔ پر میں جب بھی آتا ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے تمہاری نظریں مجھ سے کوئی سوال کر رہی ہیں۔“

”نہیں، آپ کا وہم ہے۔ شاید۔۔۔۔۔“

اب کے اس نے اعتماد سے کہا۔

”اچھا شاید ایسا ہی ہو لیکن حریم اگر تمہارے ذہن میں کوئی بات ہے، کچھ پوچھنا چاہتی ہو تو بلا جھجک پوچھ لو، کوئی گلہ ہے۔ مجھ سے تو وہ بھی بتادو۔ میں کوشش کروں گا کہ میں تم کو مطمئن کر سکوں۔“

حریم کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے پروفیسر عادل کی بات کا جواب نہیں دیا۔

یہ دادا جان کی خواہش تھی کہ عادل اور حریم کی شادی ہو جائے لیکن انہوں نے اس کا فیصلہ عادل پر چھوڑ دیا تھا کہ اگر عادل کی مرضی ہو تو ورنہ زبردستی نہ کی جائے۔ وہ حویلی میں ایک اور مظلوم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے اور عادل نے ان سے معذرت کر لی تھی۔

”دادا جان، میں فی الحال اپنے آپ کو اس فمے داری کا اہل نہیں پاتا۔ حریم خوش شکل ہے۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی ہے۔ بظاہر اسے رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چاچا عبدالرحمن کی بیٹی ہے لیکن دادا جان اسے دیکھ کر کبھی بھی میرے دل میں اس کی رفاقت کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے لاکر حویلی میں قید کروں اور اپنے وجود کی ہر ایسی کوئی خوشی اسے نہ دے سکوں۔“

لیکن دل کہتا تھا کہ کوئی ہے یہیں اسی دنیا میں۔

اور کہیں نہ کہیں ملے گا۔

اور اسی موہوم انتظار میں وہ حریم سے دامن بچا رہے تھے۔

حریم نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

”حریم“ انہوں نے بے حد آہستگی سے اسے دیکھا ”تم بہت اچھی ہو۔ تم کسی بھی شخص کی زندگی کا حسن بن سکتی ہو۔ اس کی زندگی میں رنگ بھر سکتی ہو۔ تم میں وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی بہت اچھی لڑکی میں ہو سکتا ہے اور جس پر کوئی بھی مرد غر کر سکتا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں..... میں نے تمہیں رو نہیں کیا۔ تم اتنی غلطی سے مجھے مت دیکھا کہ حریم۔ میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ جو میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔ میں تمہیں دیکھی نہیں کرنا چاہتا۔ میری رفاقت تمہیں کچھ نہیں دے گی۔ اگر میں نے انجانے میں تمہیں ہرٹ کیا ہے دھک پہنچایا ہے تو مجھے معاف کر دینا پلیز۔“

حریم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

”مجھے تو آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے اور نہ ہی آپ نے مجھے کوئی دھک دیا ہے۔ میں تو..... میں..... اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں ٹکے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ آئے۔ وہ خاموشی سے آنسو بہا گئی رہی۔

”رو نہیں پلیز، میرا مقصد تمہیں دھک پہنچانا ہرگز نہیں تھا۔“

لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی اور پروفیسر عادل بے بسی سے اسے روتا دیکھ رہے تھے۔



مریم سر جھکائے اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ آج اسے دیر ہو گئی تھی۔ مس مہرین نے اسے آف ٹائم انہیں پکینکل کروانے تھے۔ مس مہرین کئی دنوں سے چھٹی پر تھیں اس لیے آج انہوں نے آف ٹائم روک لیا تھا۔ روش نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ڈراپ کر دے گی لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔

”نہیں میں وین میں چلی جاؤں گی۔“

”آج کل چاچا اسلم لینے نہیں آ رہے خیریت ہے؟“

”ہاں..... وہ دراصل اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں اور بابا بڑی ہوتے ہیں اس وقت۔“

”مگر مومتم کیسے..... کیسے جاتی ہوگی وین بائس میں۔ مشکل نہیں لگتا۔“

”اچھا لگتا ہے۔ زندگی کے تجربات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نئے نئے چہرے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ یوں بھی ہمیں خود کو ہر طرح کی زندگی گزارنے کا عادی بنانا چاہیے۔ کون جانے کب حالات آدمی کو کس اسٹیج پر لے جائیں اور پھر یہ لوگ جو دیکھوں اور بسوں میں سفر کرتے ہیں ہماری تمہاری طرح کے لوگ ہوتے

اور دادا جان نے اس کے بعد اصرار نہ کیا اور عبدالرحمن سے کہہ دیا کہ وہ کسی اچھے خاندانی لڑکے کے ساتھ حریم کی شادی کر دیں کیونکہ عادل اور مزاج کا ہے۔ شہر میں رہتا ہے۔ پتا نہیں اس کی پسند ناپسند کیا ہے۔ کل کو حریم دیکھی نہ ہو۔ سو بات ختم ہو گئی تھی لیکن چاچا عبدالرحمن نے ابھی تک حریم کا رشتہ طے نہیں کیا تھا اور پروفیسر عادل کو حریم کی نظریں سوال کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ عجیب سی ٹینشن ہوتی تھی انہیں۔ کئی بار انہوں نے خلوص دل سے سوچا تھا کہ وہ حریم کو اپنالیں۔ وہ ان کے چچا کی بیٹی ہے۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی بھی نہیں اور پھر دادا جان کی بھی اور شاید ماں جی کی بھی یہی خواہش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دادا جان اور ماں جی دونوں میں سے کوئی بھی انہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن باوجود کوشش کے وہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار نہ کر سکے۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے کہیں کوئی ہے ان کا منتظر جس کی محبتوں کی لذت سے انہیں آشنا ہونا ہے۔ جیسے ایک گہرا جذبہ۔

پہاڑوں تک کوریزہ ریزہ کر ڈالنے والا جذبہ۔

ان کے خون میں گردش کر رہا ہے۔

اتل رہا ہے۔

اور ایک دن اس جذبے کو باہر آنے کا راستہ مل جاتا ہے۔

اور اگر انہوں نے خود کو پابند کر ڈالا تو وہ شاید یہ جذبہ چنپ نہ سکے شاید انہیں خود اپنے ہاتھوں اس جذبے کا گلا گھونٹنا پڑے۔ اس لیے وہ حریم سے گھبراتے تھے۔

انہیں لگتا تھا جیسے انہیں بہت کڑی سزا مل رہی ہے۔

ایک بہت شدید جذبے کی کہانی رقم کرنی ہے۔

وہ محبتوں کے وجود کے منکر بھی نہیں تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے سچا جذبہ دنیا میں کہیں نہیں ہے اور وہ محبت

کرنے کے لیے بے چین بھی تھے۔

ایک اضطراب تھا۔

ایک بے قراری سی تھی جو انہیں کہیں ٹھہرنے کہیں رکنے نہیں دیتی تھی۔ حریم تو خیر ان کے چچا کی لڑکی

تھی، ان کی زندگی میں اور بھی کئی لڑکیاں آئی تھیں۔ ان کی شخصیت کے سحر میں جکڑی ان کے آس پاس

گردش کرتی رہی تھیں جیسے زمین سورج کے گرد اور چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے لیکن پتا

نہیں کیوں انہیں کسی کی آنکھوں میں سچے جذبے کی وہ کرن نظر نہیں آتی تھی جس کے وہ متلاشی تھے۔ انہیں

لگتا تھا جیسے یہ سب لڑکیاں کسی غرض کے تار سے بندھی ان کی طرف کھینچی چلی آتی ہیں۔ ان کے خون میں

گردش کرتے اس جنونی جذبے نے انہیں ان کی طرف متوجہ ہی نہ ہونے دیا۔ جانے وہ کون تھا۔

اور کہاں تھا۔

”اس روٹ پر یہاں سے اس وقت بس یا وین لمبا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں تو عموماً پچھلے اسٹاپ پر جاتی ہوں۔ آج ویسے ہی ادھر آئی تھی۔ یہاں کھڑے رہنے سے بہتر ہے کہ وہاں ہی چلیں۔“

”جی۔“ مریم اس کے ساتھ چل پڑی۔
”روز یہاں سے ہی ہٹھکتی ہو؟“

”نہیں تو وہ دراصل آج ڈرائیور لینے نہیں آیا تھا۔“

”اچھا..... تمہارے ڈیڑی کیا کرتے ہیں؟“

خاتون کافی باتونی تھیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مسلسل سوال کر رہی تھیں۔

”کون سے کالج میں پڑھتی ہو؟“ انہوں نے ایک جگہ رکتے ہوئے سوال کیا۔
”جی وہ.....“

تب ہی ایک گاڑی ان کے پاس آ کر کی اور اندر سے ڈاکٹر معید نے سر نکالا۔
”مس احمد..... یہاں کہاں؟“

”وہ ذرا اگلے اسٹاپ تک جا رہے ہیں۔“

”اوہ آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“

”نہیں..... فوگھن..... پبلینز آپ جانیں ابھی وین مل جائے گی۔“

”کم آن مس احمد۔ بس آپ ہی کی طرف جا رہا تھا۔“

”کیوں خیریت۔ ماما تو ٹھیک ہیں ناں؟“ وہ پریشان ہوئی ”صبح تو ماما ٹھیک ٹھاک تھیں۔“

”ہاں خیریت ہے بہت دن ہو گئے تھے سوچا آپ کی ماما کی خیریت دریافت کر لی جائے۔ کہیں پھر تو ڈپریشن نہیں ہو گیا۔ آئیے۔“ اس نے مڑ کر درنگ دو مین کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تسخر تھا۔
”ہاں ہاں جاؤ بی بی۔“ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر خاتون نے کہا۔

”وہ دراصل یہ ڈاکٹر معید ہیں۔ ہماری فیملی ڈاکٹر ہیں نا..... ڈاکٹر عاصم ہادی۔“ عاصم اسپتال نام تو سنا ہوگا نا..... ان کے بھتیجے ہیں..... میری ماما بیمار تھیں نا، ان کو دیکھنے آتے ہیں..... وہ انکل ہادی نہیں تھے یہاں اس لیے۔“

اس کی آنکھوں میں جھانکتے تسخر کو شاید مریم نے بھانپ لیا تھا۔ اس لیے گھبرا کر تعارف کروادیا۔
خاتون نے سر ہلایا لیکن اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور تسخر بدستور موجود تھا۔ جیسے اسے اس کی بات کا یقین نہ ہو۔

”کم آن مس احمد۔“ ڈاکٹر معید نے آواز دی۔ تو ایک نظر خاتون پر ڈال کر وہ جلدی سے دروازہ کھول کی بیٹھ گئی۔

”دیکھی ہیں آپ؟“ ڈاکٹر معید نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔
”قائن۔“

”آریو شور؟“ ڈاکٹر معید مسکرائے۔

”لیں۔“

”مگر مجھے تو آپ بیمار لگ رہی ہیں۔“

”نہیں بالکل بھی نہیں بس ذرا تھکاوٹ ہو گئی تھی۔“ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

اس روز کے بعد سے ڈاکٹر معید سے سامنا نہیں ہوا تھا حالانکہ ڈاکٹر معید تقریباً روز ہی وزٹ کرتے تھے۔ انکل ہادی کے آنے کے بعد بھی وہی آتے رہے تھے لیکن وہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی۔ اس روز کس قدر شرمندگی ہوئی تھی اسے۔ پتا نہیں کیا سوچا ہوگا ڈاکٹر معید نے اس کے متعلق کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ جو اپنی ماما کی بیماری کا باعث بنی ہوئی ہے۔

جانے کیا حرکت کی ہے اس نے۔ ڈاکٹر معید نے سوچا تو ہوگا۔

اور نہ جانے کیا کیا اندازے لگائے ہوں گے۔

پاپا بھی تو بعض اوقات حد کرتے ہیں۔ کم از کم وہ اتنا تو سوچ لیتے کہ ڈاکٹر معید ایک اجنبی آدمی ہیں۔

لیکن پاپا شاید ماما سے متعلق بہت حساس تھے۔ ان کی ذرا سی بیماری پر پریشان ہو جاتے تھے۔

خدا کا شکر تھا کہ ماما اب ٹھیک تھیں اور وہ دو تین دن سے اپنے آفس بھی جا رہی تھیں۔

شکر ہے گھر میں سکون ہو گیا تھا۔

”مس احمد۔“ ڈاکٹر معید نے آئینے میں اسے دیکھا۔

”جی..... وہ چوکی۔“

”آپ سے ایک ذاتی سا سوال کر سکتا ہوں؟“

”جی۔“

”کیا مسز عثمان آپ کی اسٹیپ مدر ہیں؟“

”نہیں۔“ مریم کو حیرت ہوئی ”وہ میری اپنی ماما ہیں، سگی۔“

”سوری۔ آپ کو شاید برا لگا۔“

”نہیں بلکہ حیرت ہوئی کہ آپ نے یہ کیوں پوچھا ہے؟“

”وہ دراصل.....“ ڈاکٹر معید خاموش ہو گئے اور وہ اندر ہی اندر شرمندہ سی ہو گئی۔

یقیناً اس روز پاپا کی بات سے ڈاکٹر معید نے یہ اندازہ لگایا ہوگا۔ شرمندگی سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو باہر نکلنے سے روکا۔ یہ آنسو ہمیشہ بے وقت ہی آتے تھے۔ جب

ان کی ضرورت ہوتی تھی تو آنکھیں خشک صحرا بن جاتی تھیں اور جب ضرورت نہیں ہوتی تھی تو دریا اند پڑتے تھے۔ اس روز اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ پاپا سے لڑے جھگڑے، گلے شکوے کرے اور انہیں بتائے کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہے اور ماما کے ساتھ ساتھ وہ بھی اسے انور کر رہے ہیں۔ بری طرح سے وہ چیخیں مار مار کر روئے لیکن جب وہ پاپا کی اسٹڈی میں گئی تو ایک آنسو بھی اس کی آنکھ میں نہ آسکا بلکہ آنسوؤں کے ساتھ وہ الفاظ بھی بغاوت کر گئے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے پاپا کی باتیں سنتی رہی اور پاپا اسے سمجھاتے رہے کہ وہ گھر کی بڑی بیٹی ہے اور اسے اپنی ماما کا خیال رکھنا چاہیے نہ کہ ماما کو تنگ کرنا چاہیے۔ وہ پاپا کو بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ماما کو کبھی تنگ نہیں کیا اور یہ کہ وہ ماما سے بہت محبت کرتی ہے لیکن کچھ باتیں جن پر وہ ماما سے کپڑا مارتی تھیں۔

شاید اس کے اندر بقول ماما کے کسی متوسط طبقے کی لڑکی کی روح سما گئی ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی تھی اور چپ چاپ سر جھکائے اپنے کمرے میں آگئی تھی اور اپنے کمرے میں آتے ہی جیسے آنکھوں سے دریا ابل پڑے تھے اور کیا تھا یہ آنسو اگر پاپا کے سامنے آجاتے۔ پاپا کو بھی پتا چلتا کہ وہ بھی ہرٹ ہوتی ہے اور اب..... اب جبکہ وہ رونا نہیں چاہتی تھی تو آنسو اندر کرا رہے تھے۔

”مس احمد! اپنی پراہم؟“

”نوو..... نوو۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ڈاکٹر معید نے ڈرائیو کرتے کرتے ایک نظر مڑ کر اسے دیکھا۔

”مس احمد۔“

”جی۔“

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“

”نہیں سر، مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل اچھی ہوں۔“

”ایز یوش مسز احمد۔“

باقی راستہ خاموشی سے گزرا۔ ڈاکٹر معید کبھی کبھی اسے نظر اٹھا کر..... دیکھ لیتے تھے لیکن وہ نظریں جھکائے اپنی فائل پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ گیٹ کھلتا تھا۔ معید گاڑی سیدھی اندر نے گئے۔

مافیروز سیلک ساڑھی میں جی سنوری پورچ میں کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر معید کی گاڑی سے اسے اترتے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”ہیلو مسز عثمان کیسی ہیں آپ؟“ ڈاکٹر معید نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا لیکن وہ مریم کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر معید نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا۔

”میں ادھر ہی آرہا تھا راستے میں مس احمد نظر آگئیں اسٹاپ پر۔ میں نے کہا چلیے میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

”اوہ ہاں تھینک یو ڈاکٹر معید۔ یہ آپ نے اچھا کیا۔ دراصل مومو صندی بہت ہے۔ آج کل اسے یہ

نیا شوق چرایا ہے بس اور وگن میں سفر کرنے کا۔ شاید اس کی فرینڈز ہوتی ہیں اس کے ساتھ انہی کے کہنے پر ایسا کر رہی ہے۔“

مریم نے ان کی پوری بات نہیں سنی تھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

”آپ شاید کہیں جا رہی تھی۔“ ڈاکٹر معید نے ان کے سر پرے پر نظر ڈالی۔

”اوہ نہیں۔ میں تو نرگس کو خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ آئیں بیٹھیں۔“

”آپ کی خیریت ہی پوچھنا تھی۔ آپ ماشاء اللہ بہت فریش لگ رہی ہیں۔ میں چلتا ہوں اب۔“

”ارے نہیں ڈاکٹر معید! آئیے..... اب آئے ہیں تو بیٹھئے۔ چائے پی کر جائیے گا۔“

”عثمان صاحب کیسے ہیں؟“ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ڈاکٹر معید نے پوچھا۔

”ہمیشہ کی طرح۔“ مسز عثمان اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

”گھر پر ہی ہیں کیا؟“

”ہاں گھر پر ہی ہیں۔ انہیں کہاں جانا ہے۔“

”کیوں؟ کیا ان کی کوئی سوشل انکٹیوٹیوٹیز نہیں ہیں کیا؟“

”ہاں ہیں تو لیکن کم..... دراصل جب سے انہوں نے بزنس ختم کیا ہے تو تقریباً فارغ ہی رہتے ہیں۔ میں نے تو کہا بھی ہے کہ کوئی نیا بزنس شروع کر دیں۔ ایسے فارغ بیٹھے بیٹھے تو زندگی لگنے لگتا ہے۔

ویسے حقیقت یہ ہے کہ بزنس کی انہیں کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ زمینوں سے اتنا آجاتا ہے کہ گزر ہو رہی ہے۔ بزنس تو خواہاں کارسک ہی ہے۔“

”زندگی میں رسک تو لینے ہی پڑتے ہیں مسز عثمان۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ انہوں نے کہا اور ڈاکٹر معید کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں اور وہیں سے صفو کو

آواز دی کہ وہ چائے بنائے۔ مریم نے ڈاکٹر معید کو ماما کے ساتھ آتے دیکھا تو وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے

بیٹھے ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور عاشی کے کمرے میں چلی گئی۔ عاشی نینا کو ہوم ورک کر رہی تھی۔ اسے

دیکھ کر اس کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔

”بجوا آج آپ نے دیر کر دی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ مسکرائی ”بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی پہلے بھی

ہو جاتی تھی۔“

”مگر پہلے تو چاچا اسلم جاتے تھے تاہم۔ بجوا آپ گاڑی پر کیوں نہیں آتی ہیں۔“

”ویسے ہی عاشو جان۔“ وہ فائل اور کتاب نینا کے بیڈ پر پھینکتے ہوئے وہیں اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

”مور کہاں ہے؟“

”سورہا ہے۔“ عاشری نے بتایا اور غور سے مریم کو دیکھا۔

”بجو آپ خفا ہیں ماما سے اور پاپا سے؟“

اس کا دل چاہا وہ کہہ دے ہاں وہ سب سے خفا ہے۔ ماما سے اور پاپا سے۔ ساری دنیا سے، لیکن وہ مسکرائی۔

”عاشری ڈیر..... میں تو کسی سے بھی خفا نہیں ہوں۔“

”ماما کہہ رہی تھیں۔“

”کیا؟“ اس نے چونک کر اس کی بات کاٹی ”کیا کہہ رہی تھیں ماما؟“

”میں نے ماما سے کہا تھا کہ دیر ہوگئی ہے آج شاید بجو کو۔ وین نہیں ملی چاچا کو بھیج دیتے ہیں لیکن ماما

نے کہا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے دو اسے کچھ دن دھکے۔ آپ ماما سے خفا ہیں ناں۔“

”نہیں گڑیا۔“ اس نے ہولے سے گڑیا کا ہاتھ تھپتھپایا ”میں ماما سے خفا نہیں ہوں، وہ مجھ سے خفا ہیں لیکن ڈونٹ وری میں ان سے سوری کر لوں گی۔ ذرا ان کا غصہ اتر جائے نا پھر۔“

”ریٹیل بجو۔“

”ہوں ریٹیل۔“ وہ مسکرائی۔

عاشری کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

”عاشری آئی لو ماما۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”ہماری ماما تو بہت پیاری ہیں۔“

نینا نے ہوم ورک کرتے کرتے سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا ”میری ساری فرینڈز کہتی ہیں نینا کی ماما بہت پیاری ہیں.....“

”اچھا.....“ مریم نے اس کے رخسار پر پیار کیا ”اور کیا کہتی ہیں تمہاری فرینڈز؟“

”وہ کہتی ہیں تمہاری بجو بھی خوبصورت ہیں مگر عاشری زیادہ خوبصورت ہے۔“

عاشری کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔

”وہ تو ہے۔“ مریم نے محبت میں عاشری کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”ہاں وہ تو ڈاکٹر معید بھی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تمہاری عاشری آپنی بہت پیاری ہیں۔“

عاشری مزید سرخ پڑ گئی۔

”بھئی جو پیارا ہوگا اسے پیارا ہی کہا جائے گا نا۔ ہماری نینا بھی تو بہت پیاری ہے۔“

مریم ہلکے ہلکے موڈ میں دونوں سے باتیں کرتی رہی۔ ماما کی بیماری اور خود اپنی ہی الجھنوں میں الجھ کر وہ

ان تینوں کو وقت نہیں دے پاری تھی اور اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ تینوں اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہیں، خصوصاً مور اور آج مس مہرین نے کلاس میں کہا تھا کہ انسان کو صرف اپنے لیے ہی تو نہیں جینا ہوتا ہے اس کے ارد گرد بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں اور اسے ان کے لیے بھی جینا ہوتا ہے۔ وہ انسان ہی کیا جو صرف اپنے لیے سوچے اور اپنے لیے جیے۔

مس مہرین کی باتیں اسے ہمیشہ اڑکیٹ کرتی تھیں اور وہ ان پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرتی تھی۔ اس نے کالج میں ہی سوچ لیا تھا کہ وہ آج تینوں سے خوب باتیں کرے گی۔ ان سے کلاس فیلوز کا کلاس ٹیچرز کا پوچھے گی پھر وہ ان کے ساتھ کھیلے گی۔

”تو اور کیا۔“

نینا نے اپنی کاپی بند کی اور اسے بیک میں رکھتے ہوئے عاشری کی طرف مسکرا کے دیکھا۔

”انگل فچی بھی تو کہتے ہیں عاشری بہت پیاری ہے۔“ وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”کب..... کب کہا انہوں نے تم سے یہ؟“

”اس روز نہیں کہا تھا انہوں نے، جب میں اور عاشری لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیوں آپنی کہا تھا نا انہوں نے۔“

”ہاں شاید کہا ہو۔“ عاشری کو کچھ یاد نہیں تھا۔

”اور وہ تو کہتے ہیں کہ ماما بھی بہت پیاری ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے لیکن یہ جو تمہارے فچی انکل ہیں نا، ان سے زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔“

فچی کے ذکر پر وہ خواہ مخواہ چڑ جاتی تھی۔ تب سے جب پہلی بار ماما نے اسے کہا تھا کہ وہ فچی کا خیال رکھا کرے۔

”وہ آخر کیوں خیال رکھے اور کس طرح؟“

تب اسے ماما کی بات بالکل سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ شرجیل مرزا کا احترام کرتی تھی۔ ان کے دوسرے دوستوں کی طرح۔ اگر کبھی اتفاقاً نظر پڑ جاتی تھی تو سلیقے سے سلام کرتی۔ حال چال دریافت کرتے تو جواب دیتی۔ وہ ماما کے پاس تھے اس سے زیادہ ان سے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی لیکن اس روز وہ ٹی وی لاؤنج میں عاشری کے ساتھ اسکرین کیل رہی تھی کہ وہ اچانک آگئے تھے۔

”بیلوگرلز۔“

وہ دونوں کھڑی ہو گئی تھیں۔

”آپ بیٹھیں پلیز۔“ اس نے اخلاق نبھایا۔

”ماما تو آئی زمرگس کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں۔ آپ پلیز ان کا انتظار کریں گے یا.....؟“

”تھوڑا انتظار کر لیتا ہوں۔“

اسے وہیں صوفے پر بیٹھتے دیکھ کر عاشر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ لمحہ بھر کو وہیں کھڑی رہی اور پھر مڑ کر کچن میں صوفو کو چائے کا کھہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد ماما آگئی تھیں اور فی وی روم سے ماما اور شرجیل کے تہہوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

”چلو اچھا ہوا، ماما آگئیں ورنہ نہ جانے بے چارے کو کب تک انتظار کرنا پڑتا۔“

وہ کیمسٹری کی بک نکال کر پڑھنے لگی تھی کہ ماما شرجیل کے ساتھ ایک دم اس کے کمرے میں آگئیں وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔

”کیا ہو رہا تھا مومو؟“

”پڑھ رہی تھی۔“ اس نے کتاب بند کر دی تھی اور سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”مومو تم نے آج بہت بدتمیزی کی۔“

”جی.....“ اس کی آنکھوں میں ایک دم حیرت اتر آئی۔

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔“

”میں نے صوفو کو چائے کا کھہہ دیا تھا۔“ وہ روہانسی ہوگئی۔

”لیکن غیروں کی طرح ہمیں اکیلا چھوڑ کر خود یہاں آگئیں۔“ شرجیل مرزا نے شکایت کی۔

تو وہ..... وہ کیا کرتی، شرجیل مرزا ماما کے دوست تھے۔ اس نے سوچا۔

”مومو تم اب بچی نہیں ہو۔“

ماما اسے سمجھا کر چلی گئی تھیں اور تب سے ہی وہ شرجیل مرزا سے چڑنے لگی تھی۔ جتنا ماما سے زیادہ اس کا خیال رکھنے کو کہتیں وہ اتنا ہی زیادہ چڑتی تھی۔

”کیوں سچی انکل برے آدمی ہیں۔“ نینا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔

”نہیں چندا، ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ چھوٹوں کو بڑوں سے زیادہ فری نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے غور سے عاشر کی طرف دیکھا۔

معصوم سی عاشر تیرہ سال کی ہی تو تھی اور شرجیل مرزا ایک غلیظ انسان۔

افوہ۔ اسے خود ہی اپنی سوچ پر ندامت سی ہوئی..... میں یہ کیا ایلی سیدھی باتیں سوچنے لگتی ہوں۔

بھلا شرجیل مرزا نے کسی غلط خیال سے تھوڑا ہی اس کی تعریف کی ہوگی۔ وہ تو بے ایسی پیاری سی۔ دیکھ کر بے اختیار پیرا آتا ہے۔ اس کی عمر کی تو اس کی اپنی بچیاں ہوتیں اگر اس نے شادی کر لی ہوتی..... اور پتا

نہیں اس نے شادی کیوں نہیں کی تھی۔ ورنہ ایسے شخص کے گرد تو بقول آنٹی زمر گس کے لڑکیاں اس طرح چکراتی ہیں جیسے کھیاں شیر پر۔

آنٹی زمر گس کی بات یاد کر کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ یہ آنٹی زمر گس بھی بس عجیب عجیب

مثالیں دیتی ہیں۔ تب ہی صفو نے اندر جھانکا۔

”مومو بی بی، آپ کو بیگم صاحبہ بلارہی ہیں۔“

”کیا ڈاکٹر معید چلے گئے؟“

”ہاں جی۔ بیگم صاحبہ اپنے بیڈروم میں ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ بے دلی سے اٹھ کھڑی ہوئی حالانکہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سو جائے۔

”پتا نہیں ماما نے کیوں بلایا ہے۔ کہیں ڈاکٹر معید نے تو میری کوئی شکایت نہیں کر دی لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ میرا وہ بہ ان کے ساتھ ٹارل تھا، گستاخانہ تو بالکل نہیں تھا۔ پھر وہ ایک اچھے آدمی ہیں۔

یقیناً انہوں نے ماما سے کچھ نہیں کہا ہوگا۔ ماما نے کسی اور ہی وجہ سے بلایا ہے۔“

زینب عثمان احمد آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ماما آپ نے مجھے بلایا ہے؟“ اس نے ان کے بیڈروم میں آ کر پوچھا۔

”ہاں بیٹھ جاؤ۔“

بیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس کی بات کا جواب دے کر وہ پھر آئینے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ لپ اسٹک کا ایک اور سچ دیا..... بھوڑ کو اچکا کر دیکھا۔ بالوں میں برش پھیرا اور پھر اس کی طرف مڑیں۔

”یہ کیا تمنا شایاں رکھا ہے تم نے مومو۔ آخر تم کیا ظاہر کرنا چاہتی ہو دوسروں پر؟“

”ماما میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ماما کی بات نہیں سمجھ سکی تھی۔

”تم بڑی ہو گئی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنی من مانی کرو۔“

”مگر ماما میں نے کیا کیا ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”تمہیں نہیں پتا، تم نے کیا کیا ہے۔ یہ جو تم گھٹنا گھٹنا بھرا شاپ پر کھڑی رہتی ہو تو اس کا کیا مطلب

ہے۔ کیا باور کرانا چاہتی ہو تم لوگوں کو کہ تم ہماری بیٹی نہیں ہو، لے پاک ہو۔ کیا سوچتا ہو گا معید اپنے دل

میں کہ ہم اپنی بیٹی کی طرف سے اتنے بے پروا ہیں کہ گھر میں دو دو گاڑیاں ہیں اور وہ ویکوں اور بسوں کے

دھکے کھا کر آتی ہے۔“

”ماما۔“

”کچھ نہیں سننا چاہتی۔“ انہوں نے اس کی بات کا ٹڈی ”کل سے تم اسلم کے ساتھ جاؤ گی اور وہی

تمہیں لینے بھی جائے گا۔ تمہیں کسی کی عزت بے عزتی کا خیال ہی کچھ نہیں ہے۔“

وہ پھر آئینے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کیوں اسے ماما کا اس طرح

ڈانٹنا برا نہیں لگتا تھا بلکہ اچھا لگتا تھا جیسے ماما جج ماں ہوں۔ یعنی اور میرا کی ماؤں کی طرح۔

”چلو ماما کو احساس تو ہوا۔“

ایک عجیب طمانیت کے احساس کے ساتھ وہ بیڈروم سے باہر نکلی تو باہرٹی وی لاؤنج میں شرجیل مرزا شریف سے کوئی بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھنکی۔

شرجیل مرزا کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

”آہ۔ بڑے دنوں بعد نظر آئیں۔ نصیب دشمنان مزاج تو اچھے تھے۔“

وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر عاشی کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

”شریف جی، خیر تو ہے یہ آج کل ڈاکٹر معید بڑے چکر لگا رہے ہیں۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا تا کہ وہ بھی سن لے۔

”نہیں جی۔ بڑے دنوں بعد آئے ہیں آج۔“ شریف نے وضاحت کی ”وہ اپنے ڈاکٹر صاحب ذرا مصروف تھے اس لیے۔“

”اچھا۔“ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

مریم نے غصے سے دروازہ بند کیا۔

”عاشی میں تمہارے بیڈ پر سونے لگی ہوں اور دیکھو ٹیوٹر آجائے تو تم مور کو جگالینا۔“ اس نے عاشی سے جو نینا کی کاپیاں کھولے دیکھ رہی تھی کہا۔

عاشی نے سر ہلایا۔

”پتا ہے بجو نینا کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔ اسے آرٹ کالج میں بھیجیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“

مریم نے نیکی پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔



سکندر صبح صادق اور محسن وقار تینوں دوست نہ صرف یہ کہ ایف ایس سی میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے تھے بلکہ تینوں کو علامہ اقبال میڈیکل کالج میں داخلہ بھی مل گیا تھا اور چند دنوں بعد سکندر کو لاہور جانا تھا۔ بھانشار بھی اس کے ساتھ جا رہے تھے لیکن اب کی بار سکندر کو لاہور جانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کاش یہ چند دن پھیل کر اتنے طویل ہو جائیں کہ صدیوں پر محیط ہو جائیں۔ پہلے بھی تو وہ لاہور جاتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس کا دل ہی نہ چاہے جانے کو۔ وہ اداس تو ہوتا تھا لیکن ایسی بے چینی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب کے تو یوں لگ رہا تھا جیسے دل کو کسی نے منھی میں بند کر رکھا ہو..... اب کے تو شاید بہت دنوں بعد آؤں۔ ایک ماہ بعد یا دو ماہ بعد اور وہ اتنے سارے دن رضوانہ کو دیکھے بغیر اس سے باتیں کیے بغیر کیے کیسں گے۔

وہ لاہور رزلٹ لینے اور داخلے کے سلسلے میں ایک دو دن کے لیے گیا تھا تو کتنی بے چینی رہی تھی اور پھر جب وہ محسن وقار اور صبح صادق کے ساتھ ان کے گاؤں گیا تھا تو کتنی مشکل سے وقت کٹا تھا وہاں۔ اس کا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن محسن وقار اور صبح صادق اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

”کیا قنوطیت ہے یار۔ یہ چند ماہ ہی تو ہیں ہمارے پاس پھر تو چار پانچ سال پڑھائی سے فرصت ہی نہیں ملے گی۔ اب ذرا گھوم پھر لیں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمیں میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا؟“

”ہاں امید تو ہے۔“

صبح صادق کو یقین تھا اور اس نے سکندر کی ایک نہیں سنی تھی اور وہ اسے زبردستی لے گئے تھے۔ ان کا گاؤں شہر سے صرف پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا بلکہ وہ شہر کا ہی ایک حصہ لگتا تھا اور وہاں ساری سہولتیں موجود تھیں۔

صبح صادق نے اسے خوب سیر کروائی تھی۔ وہ اسے تیزال پکنک پوائنٹس پر لیے لیے پھرے۔ کلر کیاڑ کیوڑ ڈھوک ٹالیاں سارے پہاڑی علاقے کس قدر خوبصورت تھے۔ وہ ان پہاڑوں کی خوبصورتی میں کھوسا گیا تھا۔ سحر سا طاری ہو گیا تھا اس پر۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ان جگہوں کو بار بار دیکھے اور ان کی خوبصورتی کو محسوس کرے۔ یہ خوبصورتیاں اسے بہت متاثر کر رہی تھیں لیکن وہ رضوانہ کے لیے بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کاش وہ بھی اس کے ساتھ ہو جی اور پھر وہ دونوں ان خوبصورتیوں کو ایک ساتھ محسوس کرتے۔ سر مٹی پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک بار رضوانہ کے ساتھ بھی یہاں آئے گا۔

وہ بابا سے پندرہ دن کا کہہ کر آیا تھا لیکن چھپنے دن ہی تیار ہو گیا۔

”کمال ہے یار، ہم تو شکار کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ دراصل ہمیں چاچا کا انتظار تھا۔ کمال کا نشانہ ہے ان کا۔ تیر بہت ہیں ادھر ہمارے علاقے میں۔“ محسن وقار کے ایک کزن نے اسے روکا۔

”نہیں۔ مجھے تو شکار کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”میرے ابا کہتے ہیں تیر کا گوشت سب سے لذیذ ہوتا ہے۔“ صبح صادق نے اسے اکسایا ”اور تیر کچے ہوئے ہوں محسن کی اماں کے ہاتھ کے تو پھر کتنا مزہ ہوتا ہے ان میں۔ زندگی بھر یاد رکھو گے یار۔“

”مجھے کوئی اتنا شوق نہیں ہے تیروں وغیرہ کا۔“

اس نے تو واپسی کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

”اچھا پھر ایسا کرتے ہیں صبح مچھلی کے شکار کے لیے ڈیم پر چلتے ہیں۔ رک جاؤ تم۔“ محسن نے روکا۔

”نہیں یار۔ میں اب جاؤں گا ہی۔“

”اوس ہوں اب بات نہ بناؤ۔ مجھے پتا ہے تمہارے دوستوں نے کہا ہوگا کہ یہ مہمان تو بلائے جان ہی بن جائے گا۔ نکالو اسے اپنے گاؤں سے۔“

چھن چھن چاندی کے سکے بجنے لگے تو وہ بھی اس کی شرارت سمجھ کر مسکرا دیا۔

”رضی کیا تمہیں پتا نہیں کہ میں اتنی جلدی کیوں واپس آ گیا ہوں؟“

”بتایا تو ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

”ادھر میری طرف دیکھ کر بتاؤ نا، کیوں آ گیا ہوں۔“

اور رضوانہ کی آنکھوں میں جگنو اتر آئے۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اس کی پلکیں جھمک گئیں۔ رخساروں پر گھایاں دوڑنے لگیں۔

”رضی تم وہاں مجھے یاد آتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تم سے جدا ہوئے، تم سے باتیں کیے ہوئے، تمہیں دیکھے ہوئے مدتیں گزر گئی ہوں۔ ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا تم نے بھی مجھے یاد کیا تھا؟ سچ بتانا۔“

”ہاں کچھ کچھ۔“ اس نے سر ہلایا۔

”بس کچھ کچھ۔“ سکندر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں، سکندر کو دیکھا۔

”نہیں..... بہت زیادہ..... یہی سننا چاہتے تھے نا۔“

وہ کھل کھل کر کے ہنس دی اور تیزی سے باورچی خانے میں گھس گئی۔ وہ مسکراتا ہوا برآمدے میں آیا اور بیک زمین پر رکھ کر کمرے سے باہر آتی ہوئی ماں جی سے لپٹ گیا۔ بھابھو ماں جی بابا سب ہی اسے دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ تو پندرہ دن کے لیے گیا تھا اور چھٹے روز ہی واپس آ گیا تھا۔

”بس بابا آپ سب لوگوں کے لیے اداس ہو گیا تھا۔“

”تمہارے دوستوں کے گھر والے تو سب اچھے تھے نا۔“ ماں جی کو تشویش ہوئی۔

”جی ماں جی، محسن کے بابا تو بالکل بابا جیسے ہی ہیں۔ بہت محبت کرنے والے اور اس کے بھائی جان بھی بہت اچھے تھے۔ بہت عزت کی سب نے وہاں آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ محسن تو اچھا خاصا ناراض بھی ہو گیا تھا کہ ہم تو اتنے دن تیرے گاؤں رہے اور تو ایک ہفتہ بھی نہیں رک رہا۔“

”تو پتہ رہ جاتا تھا ایک دو دن اور۔“

”بس ماں جی دل گھبرا گیا تھا۔“

سب سے مل کر وہ اپنے کمرے میں آیا تو اسے خود اپنے جذلوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تو اپنے آپ میں اپنی دنیا میں گن رہنے والا انسان تھا، پھر یہ کیسی کایا پلٹ گئی تھی کہ ہر وقت ہر لمحہ وہ رضوانہ کو سوچتا رہتا تھا۔ شاید جب آدمی کے اندر یہ جذبہ نیا نیا سراٹھاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے اسی طرح بے چینی اور اضطراب دل کو جکڑے رکھتا ہے۔ یوں ہی جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا اور دل ہر لمحہ آنکھوں کے

”دراصل یہ جوانا سکندر ہے نا اسے اپنی کزن کی یاد تازہ ہی ہے۔ ورنہ کچھ لحاظ ہمارا ہی کر لیتا۔“
صبح صادق تو ہمیشہ کا منہ پھٹ تھا۔ اس نے محسن وقار کے کزنوں کے سامنے ہی کہہ دیا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

”نہیں یا، ایسی کوئی بات نہیں، دل ہی نہیں لگا یہاں میرا۔“

”دل نہ لگنے کی کوئی وجہ تو ہوگی ناں میرے بھائی۔ جبکہ ہمارا یہ چھوٹا سا گاؤں بقول میرے ابا کے منی انگینڈ ہے۔“

صبح صادق زیر لب مسکرایا۔

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گھورا۔

”کوئی وجہ نہیں، بس یونہی جب آیا تھا تو بابا کی طبیعت کچھ نا ساز تھی اس لیے ذرا پریشانی ہے۔“ اس نے بات بتائی۔

”لیکن بابا نے تو تمہیں ہنسی خوشی ہمارے ساتھ آنے کی اجازت دی تھی اور کہا تھا بیٹے جتنے دن چاہے رہو۔“ صبح صادق بھی اسے تنگ کرنے پر تڑپا ہوا تھا۔

”یا، ایک دن رک جاؤ نا، بے چارے صبح صادق کا پروگرام خراب ہو رہا ہے۔ بے چارہ اپنے ہاتھ سے مچھلیاں پکڑ کر تمہاری دعوت کرنا چاہتا ہے۔“ محسن وقار نے بھی صبح صادق کو چھیڑا اور اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکنا نہیں۔ محسن کے بابا نے بھی کہا کہ زیادہ نہیں تو ایک دو دن اور رک جائے لیکن بکا ایک اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ دل چاہتا تھا، اڑ کر رضوانہ کے پاس پہنچے۔ یوں لگتا تھا جیسے رضوانہ کو دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ وہ صبح ہوتے ہی روانہ ہو گیا تھا اور مغرب کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو سب سے پہلے بس رضوانہ ہی اسے ملی۔ وہ محسن میں کھڑی مرغیوں کو دانا ڈال رہی تھی۔ سارا رستہ وہ دعا کرتا آیا تھا کہ خدا کرے اسے سب سے پہلے بس رضوانہ ہی ملے اور اسے رضوانہ ہی ملی تھی۔ کبھی کبھی دعائیں کیسے مستجاب ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی دعا نہیں مانگتے صدیاں بیت جاتی ہیں اور در مقبولیت دا نہیں ہوتا۔

”رضی۔“ اس نے آہستگی سے پکارا تو اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

”ارے تم سکندر..... تم اتنی جلدی کیسے آگئے۔ تم تو پندرہ دنوں کے لیے گئے تھے۔ کیا دوستوں نے اچھا سلوک نہیں کیا؟“

اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”نہیں تو۔“ اس کی شرارت سمجھ بغیر اس نے وضاحت کی۔

”میرے دوست تو بہت اچھے ہیں۔ وہ تو بہت روک رہے تھے بلکہ وہی نہیں ان کے گھر والے حتیٰ کہ ان کے کزن بھی۔“

کھڑے کر لیتی ہیں اور لڑکیوں کو اپنے خواب لڑکوں سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہوتے ہیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے خواب بنتی رہتی ہیں۔ تم انہیں اوجھڑ مت دینا۔“

”رضو... رضی..... یہ تو اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی ہے۔ اتنی چھوٹی سی تو تو ہے۔ کہاں سے سیکھ لیں تو نے یہ باتیں۔“

”اتنی چھوٹی سی بھی نہیں ہوں۔ تم سے صرف دو سال چھوٹی ہوں اور یہ باتیں کسی سے سیکھی نہیں جاتیں۔ یہ باتیں تو اندر سے خود بخود پھوٹی ہیں اور لڑکیاں تو گڑیاں کھینے کی عمر سے ہی خواب بننا شروع کر دیتی ہیں۔“

اس روزِ رضوانہ نے سکندر کو بہت حیران کیا تھا۔ بعد میں بھی کئی دن تک وہ اس کی باتیں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا تھا۔ اسے خود تو اس طرح کی باتیں کرتا بالکل نہ آتا تھا۔ کپڑے پھیلا کر وہ بھاؤ کو بتا کر وہ اس کے پاس چھت پر ہی بیٹھ گئی تھی اور انہوں نے کتنی باتیں کی تھیں۔ اس نے رضوانہ کو کنیز پھوپھو کے بارے میں بتایا تھا۔

”ہتا ہے رُضیٰ محسن مجھے اپنی پھوپھی کی قبر پر۔“ کھڑا تھا۔ ہم نے فاتحہ پڑھی اور میں نے سوچا تھا وہاں کھڑے کھڑے کہتا نہیں کنیز پھوپھو کے دل میں کیا؟ کیا خیال آیا ہوگا۔ ہتا نہیں کہاں کس مقام پر وہ کس طرح حثرت ہوئی ہوں گی۔ شاید انہوں نے اپنی توہین محسوس کی ہوگی یا شاید انہوں نے سوچا ہو کہ وہ اب اس ناقدری کے بعد جی نہ پائیں گی یا پھر نارسائی کا کرب انہیں زندگی سے دور لے گیا ہو۔ کوئی بہت ہی شدید تکلیف آدمی کو اتنا بہادر بناتی ہے کہ وہ اپنی زندگی سے کھیلے۔ اپنے ہاتھوں عذاب مول لے لے۔ کیا ملا پھوپھو کنیز کو نہ دنیا میں کچھ پاسکیں اور نہ آخرت کا سامان کر سکیں۔“

”بے وفائی سے بڑا دکھ اور کوئی نہیں ہوتا سکندر اور تارسانی کا کرب جینے کے عذاب سے بڑا کرب ہے۔ تم بھی کہیں محسن کے چاچا کی طرح نہ کرنا..... بڑے ڈاکٹر بن کر مجھے بھول نہ جانا۔ میں بھی کثیر پھپھو کی طرح مر جاؤں گی۔“

”نہیں، ایسی باتیں مت کرو رضی، میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں لیکن تم وعدہ کرو رضی، میری زندگی کی قسم کھاؤ کہ تم کبھی ایسی حرکت نہیں کرو گی۔ فرض کرو، میں بے وفائی کر جاؤں پھر بھی نہیں۔“ وہ سر جھکائے بیٹھ ہی رہی۔

”پلیز رضی، میری قسم کھاؤ۔“

اور تب اس نے قسم کھائی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”تم بھی وعدہ کرو سکندر کہ تم بھی شہر میں رہ کر ڈاکٹر بن کر بدلوئے مجھے نہیں۔“

”وعدہ..... کبھی نہیں بدلوں گا۔ تم ہمیشہ مجھے اتنی ہی عزیز رہو گی جتنی آج ہو۔“

سامنے اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ رضوانہ کا دل بھی ایسا ہی چاہتا ہے یا صرف میرا دل ہی اتنا پاگل ہے۔ اس روز بستر پر لیٹا وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا کہ وہ رضوانہ سے پوچھنے کا تو سہی کہ کیا اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کی نظروں کے سامنے رہے۔

کیا وہ بھی یہاں اسی طرح بے چین اور مضطرب رہی تھی۔ جس طرح وہ وہاں محسن کے گاؤں میں مضطرب رہا تھا لیکن پھر بہت سارے دن اس کی رضوانہ سے بات ہی نہ ہوئی۔ چاچا کی طبیعت خراب تھی اور رضوانہ گھر پر ہی رہی تھی..... وہ ایک دو بار چاچا کی طبیعت کا پتا کرنے گیا تھا تو وہ چاچا کے پاس بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔ بس وہ ایک نظر اسے دیکھ کر اور چاچا سے باتیں کر کے واپس آ گیا تھا اور پھر کئی دنوں بعد جب چاچا دوبارہ کام پر جانے لگا تھا تو وہ اس کے گھر آئی تھی۔ وہ چھت پر کرسی ڈالے یونہی دھوپ سینک رہا تھا کہ وہ کپڑے پھیلانے اوپر آئی۔

”تم یہاں بیٹھے ہو سکندر۔ میں نے سمجھا کہ تم کہیں باہر گئے ہو۔“

”ارے رضی، تم کب آئیں۔ چا چا کیسے ہیں؟“

”ابا اب ٹھیک ہیں اور کام پر گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے بھابو نے کہا شاید باہر گیا ہے۔“

”ہاں بس یوں ہی اداس ہو رہا تھا۔ اوپر آ گیا۔“

”تم کیوں ادا اس ہو رہے تھے سکندر؟“

”رضی انجان کیوں بنتی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تمہارے لیے اداس ہو رہا تھا۔ میں تمہیں سوچتا ہوں، تمہارے حوالے سے خواب دیکھتا ہوں۔ اتنے دنوں سے تم ادھر نہیں آئی تھیں تو اداس ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد تمہیں دیکھنے جاؤں گا۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ منڈیر کے ساتھ ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔

”رضی۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بڑے جذب سے پوچھا ”کیا تم نے کبھی سوچا ہے رضی۔ کبھی میرے حوالے سے خواب دیکھے ہیں کبھی میرے لیے ادا اس ہوئی ہو۔ تمہارا دل چاہا ہے کہ میں ہمیشہ تمہارے سامنے رہوں۔ ہم زندگی کا سفر اکٹھا طے کر سں۔ یا یہ صرف تمہارا خواب ہے۔“

”ایسا کیسے ممکن ہے سکندر کہ تم مجھے سوچو اور میں تمہیں نہ سوچوں۔ تم میرے حوالے سے خواب دیکھو اور میں نہ دیکھوں۔ تم میرے لیے اداس ہو اور میں نہ ہوں۔“ رضوانہ واقعی ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

وہ حیران رہ گیا۔ وہ رضوانہ سے ایسی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شرما کر سر جھکا لے گی یا اثبات میں سر ہلا کر نیچے بھاگ جائے گی اور وہ خود ہی اس کے انداز سے مطلب اخذ کرتا رہے گا۔

”لڑکیاں تو لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ تصوراتی ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ تیزی سے خواب بنتی اور محل

اس روز رضوانہ سے اس طرح اتنی زیادہ باتیں کرنا اسے کتنا اچھا لگا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ آپوں آپ مسکراتا رہا تھا۔

بھلا وہ کبھی زندگی میں رضوانہ کو بھول سکتا ہے۔ رضوانہ جو اتنی اچھی اتنی پیاری ہے اور جو اتنی پیاری باتیں کرتی ہے۔ پتا نہیں اسے اتنی باتیں کرنا کیسے آگیا ہے۔ محسن کے چاچا اگر کینز پھوپھو کو بھول گئے تھے تو یقیناً کینز پھوپھو رضوانہ جتنی اچھی نہیں ہوگی یا پھر محسن کے چاچا ہی بے وفا ہوں گے لیکن میں تو ایسا نہیں ہوں..... اور میرے لیے تو ابھی لاہور جانا ہی مشکل ہو رہا ہے۔ شاید ایک ماہ یا شاید دو ماہ بعد چکر لگاؤں لیکن یہ ایک دو ماہ کی دوری بھی عذاب لگ رہی ہے۔ پھر بھلا عمر بھر کے لیے اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ لاہور جانے سے دو تین دن پہلے تو وہ بڑا مضطرب سا رہا تھا۔ سب نے اس کی اداسی کو محسوس کیا۔

”کیا بات ہے یا بڑا چپ چپ لگ رہا ہے۔“ بھانٹار نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہے یا راداس ہو رہے ہو۔“

”ہوں شاید۔“ اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی ”جانے کو جی نہیں چاہ رہا ایسے ہی دل گھبرا رہا ہے۔“

”تم کوئی پہلی بار تو نہیں جا رہے ہو بھائی۔ پہلے بھی تو دو سال رہ کر آئے ہو۔“

”جی۔“

”کہیں میڈیکل میں جانے سے تو نہیں گھبرا رہے ہو۔ ایسا ہے پتر تو بی ایس سی کر لو۔ کوئی زبردستی تو نہیں ہے۔ اب دیکھو بابا مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن میرا دل نہیں لگا میڈیکل میں۔ سو میں زرعی یونیورسٹی میں چلا گیا۔ بس بابا کی خواہش تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ڈاکٹر بن جاتا لیکن پتر دل پر بوجھ مت ڈالو۔ میں بابا سے بات کر لیتا ہوں۔“

”نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

”میں تو خود ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں، میری اپنی خواہش ہے بچپن سے۔ دراصل اتنے دن فارغ ہو رہا ہوں اس لیے پڑھائی کے تصور سے دل گھبرا رہا ہے۔ وہاں جا کر دو ایک روز میں سیٹ ہو جاؤں گا۔“

”بس دل لگا کر پڑھنا یا راداس کی رنگینوں میں الجھ مت جانا۔ ویسے تیرے دوست اچھے ہیں۔ تیری ہی طرح پڑھا کو سے۔ اچھا دوست بھی بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ اچھے دوست مل جائیں تو زندگی بہت سہل ہو جاتی ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے بھائی محسن اور صبح صادق دونوں ہی بہت مخلص اور محبت کرنے والے ہیں۔ محسن اچھی فطرت اور بڑے دل کا مالک ہے۔“

اس روز وہ بھانٹار کے ساتھ کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ دونوں بھائی دیر تک ٹہکتے رہے اور باتیں کرتے

رہے اس روز بھانٹار نے اسے بہت ساری باتیں سمجھائیں اور ان کی ہر بات اس کے دل میں اترتی رہی۔ وہ کتنے شفیق اور کتنے مہربان لگتے تھے۔ بالکل بابا کی طرح شفیق اور دوستوں کی طرح مہربان۔ وہ گھر میں سب سے بڑے تھے۔ پھر عزیزتی اور پھر وہ..... عزیز کا سرال قریب ہی کے گاؤں میں تھا۔

”افو۔ جب سے وہ آیا تھا صرف ایک بار ذرا سی دیر کے لیے ان سے ملنے گیا تھا۔ عزیز نے کتنی التجا کی تھی کہ وہ کبھی کبھی ملنے آجایا کرے۔ دل بہت گھبراتا ہے سنو۔“

”جی بھائی اور سب۔“

”آپ یہاں خوش تو ہونا عزیز آپو۔ سب لوگ اچھے ہیں نا؟“

”ہاں سب اچھے ہیں۔ پر تم سب یاد آتے ہو۔“

اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ چکر لگا تار ہے گا لیکن کیسا ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا وہ۔ رضوانہ گھر میں ہوتی تو وہ اسے دیکھتا رہتا۔ نہ ہوتی تو اسے سوچتا رہتا۔

”عزیز سے ملنے گیا تھا؟“ بھانٹار نے چلتے چلتے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر ایسا کرتے ہیں صبح اس سے مل کر ٹھیکس گھر سے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تم نے سامان وغیرہ تو پیک کر لیا تھا نا؟“

”جی۔“

”صبح عزیز کی طرف جانا ہے تو ایسا کر چاچا سے ابھی مل لے۔“

اس کے دل میں پھول کھل اٹھے۔

”جی بہتر۔“

کتنا دل چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے ایک بار پھر اسے دیکھ لے حالانکہ صبح وہ اسے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔

”یہ کیسے عجیب و غریب جذبے ہیں۔“

چاچا سے باتیں کرتے ہوئے رضوانہ کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھتے ہوئے وہ سوچتا رہا۔ چاچا بھانٹار اس سے اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

”تیری پڑھائی کب ختم ہوگی یا راداس؟“ بچے بھی آجائیں گے اور تو پڑھتا ہی رہے گا۔“

”بس چاچا ایک سال ہی رہ گیا ہے۔“

”تم نے کب جانا ہے؟“

”دونوں صبح اکٹھے ہی جا رہے ہیں۔ اسے لاہور چھوڑ کر میں فیصل آباد چلا جاؤں گا۔“ اور جب وہ جا

غیرہ کی تکلیف ہو جاتی ہے۔
”بے جی کون۔“

”یار ماں جی اور کون..... وہ عزرا آپا انہیں بچپن سے بے جی ہی کہتی تھیں تو بس ہم بھی کبھی بے جی کہہ دیتے ہیں۔“

”اچھا اچھا تو تم ماں جی کو یہاں کیوں لا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتے۔“

”دکھایا تھا۔ ابھی چھ سات ماہ پہلے ہی انہیں ساتھ لائے تھے۔ اسپیشلسٹ کو دکھایا تھا۔“

”خط لکھو تو میرا سلام لکھ دینا۔“

سکندر نے سر ہلایا۔

”ہیلو تم دونوں یہاں بیٹھے کیا سازش کر رہے ہو۔“ محسن وقار اپنی ساتھی لڑکی سے باتیں کرتا ہوا ان کے قریب ہی آ گیا تھا۔

”ہم دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ تمہارے سابقہ کارناموں کی ایک رپورٹ تیار کر کے یہاں کالج کے انڈر لگا دی جائے تاکہ یہاں کے مکین تم سے خیردار رہیں۔“ صبح صادق نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

محسن وقار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گھورا اور اپنی ساتھی لڑکی کی طرف دیکھا۔

”نئی ان سے ملو۔ یہ میرے دوست ہیں صبح صادق اور سکندر۔ ہم تینوں نے ایف ایس سی اکٹھے کیا۔

دو سال تک ایک ہی کمرے میں رہے اور اب بھی ایک ہی ہاسٹل میں ہیں۔“

وہ مسکرائی ”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”یقیناً ہمیں بھی ہوگی لیکن پہلے باقاعدہ تعارف ہو جائے۔“ صبح صادق بولنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔

”یہ نیلوفر ہیں، تھوڑا بزرگی طالبہ ہیں۔“ محسن نے تعارف کرایا۔

”ٹھیک ہے اب ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مزاج گرامی کیسے ہیں؟“

نیلوفر کھل کر ہنس دی ”بہت جولی ہیں آپ۔“

”اللہ کی دین ہے۔“ صبح صادق نے انکساری سے کہا۔

”آپ بہت خاموش ہیں سکندر صاحب۔“ وہ سکندر کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہاں نہیں تو.....“ وہ چونکا۔

”میں آپ کی اور صبح صادق کی گفتگو سن رہا تھا۔“

”دراصل آج یہ غم کی کیفیت میں ہیں۔ میڈم نے ذرا ان کے کان کھینچے ہیں۔“

صبح صادق کو بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی۔ سکندر نے شرمندگی محسوس کی۔

رہے تھے تو اس نے دیکھا تھا رضوانہ کو اڑکی اوٹ میں کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کا اپنا دل بھی بھرا آیا تھا لیکن وہ جلدی سے باہر نکل آیا اور پھر لاہور جا کر کبھی کئی دن تک رضوانہ کی آنسو بھری آنکھیں اس کے تصور میں آتی رہیں۔ صبح صادق اور محسن اسے اداس دیکھ کر چھیڑتے رہے۔

”یار تو نہیں بن سکتا ڈاکٹر۔“ میڈم شیرازی کی ڈانٹ کھا کر وہ اداس سالان میں بیٹھا تھا کہ صبح صادق نے آکر فیصلہ سنایا۔

”کیوں؟“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اس لیے کہ تو خود مریض ہے۔ ایک مریض بے چارہ ڈاکٹر کیسے بن سکتا ہے۔“

”نہیں میں تو بالکل صحت مند ہوں یار۔“

”نہیں یار تو بالکل صحت مند نہیں ہے۔“ صبح صادق بھی اس کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا ”اب دیکھو نا..... میڈم شیرازی لیکچر دے رہی تھیں اور تو پہنچا ہوا تھا رنگ پورا اپنی کزن کے حضور۔ یہ حال رہا تو بن چکا ڈاکٹر۔ پہلے اپنے عارضے کا علاج کر دل کو سنبھال۔ اتنی چھوٹی عمر میں کیا روگ لگا کر بیٹھ گیا ہے۔“

”میڈم شیرازی بھی تو حد ہی کرتی ہیں یار۔ اب میرا دھیان نہیں تھا۔ میں نے نہیں سنا کہ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں اور انہوں نے انسٹل کر کے رکھ دی۔“

”یار وہ تو بہت سخت ہیں۔ تمہیں پتا نہیں وہ سینئر لڑکے کیا کہہ رہے تھے۔ بہت با اصول ہیں اور نالائق اور بدتمیزی تو بالکل ہی برداشت نہیں کرتیں۔ میں تو بہت ڈرتا ہوں یاران سے۔ اتنا تو میں ڈاکٹر اصغر سے بھی نہیں ڈرتا جتنا میڈم شیرازی سے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ ڈاکٹر اصغر کا غصہ بھی بہت ہے۔“

”ہاں یار میڈم سے ڈرتو مجھے بھی بہت لگتا ہے اور میں بہت دھیان سے ان کا لیکچر سنتا ہوں بس آہ یونہی بے دھیان ہو گیا تھا۔“

”اتنا بے دھیان مت ہوا کہ میری جان۔ ادھر دیکھ اپنے یار محسن کو کیسے دل ہتھیلی پر لیے پھر رہا ہے۔ چاری بیلا اسے دیکھ لے تو کہیں اسی وقت ہارٹ ایٹک ہو جائے اسے۔“ صبح صادق نے محسن وقار طرف اشارہ کیا جو کچھ فاصلے پر کھڑا کسی سینئر لڑکی کے ساتھ گپ لگا رہا تھا۔

”اب دیکھو نا کتنے مزے میں رہتا ہے جب کوئی اچھا لگا شخص کھول کر اسے دل پیش کر دیا اور جب دل واپس لے لیا۔ اب تمہاری طرح تو نہیں ہے نا کہ ایک کو دے کر خود خالی خالی ہو جاؤ اور میڈم کی ڈانٹ کھاؤ۔“

”یار صبح صادق تم بہت بولتے ہو۔“ سکندر نے بیزاری سے کہا۔

”بولنا اچھا ہوتا ہے تم بھی بولا کرو اور ہاں سنو خیریت تو ہے نا..... کل تیرے گھر سے خط آیا تھا۔“

”ٹھیک ہیں نا.....؟“ صبح صادق ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں سب ٹھیک ہیں۔ بس ذرا بے جی کو پھر کھانسی ہو گئی ہے۔ ذرا سا موسم بدلتا ہے تو ان کو کھانسی

”تو نے سنا نہیں، وہ کیا کہہ رہی تھی کہ می بہت اصول پرست ہیں۔ لہذا تو منہ میں پانی مت بھر۔“
 ”ارے۔“ صبح صادق نے اس کی بات کاٹ دی ”وہ دیکھو سامنے تمہارے بھائی سکندر ہیں نا۔“
 ”ہاں؟“ سکندر ایک دم کھڑا ہو گیا ”وہ تو بھابی ہی ہیں۔ خدا خیر کرے ابھی دو دن پہلے ہی تول کر گئے ہیں۔“

محسن اور صادق تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ سکندر وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔
 ”سکندر“ غار محسن اور صادق کے ساتھ اس کے قریب آئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا
 ”سکندر چاچا.....“

”کیا..... کیا ہوا چاچا کو.....؟“ سکندر کے حلق سے بہ مشکل آواز نکلی۔
 ”چاچا قتل ہو گئے ہیں۔“
 ”نہیں.....“ وہ بے اختیار ان کے گلے لگ گیا اور وہ ہولے ہولے اسے تھپکنے لگے۔



مرے زخم پوچھتے ہیں
 مرے دوست کیوں خفا ہیں
 کئی دن سے کوئی خبر
 کوئی نیزہ کوئی نشتر
 مسرور آنکھیں موندے رن براگے پیچھے جھومتا ہوا قدرے بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔
 نہ ہوا مرقد
 کوئی تازہ جرم میرا
 کوئی بھول کوئی غفلت

”بہت خوب شاعری ہو رہی ہے کیا؟“
 پروفیسر عادل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ نہیں سر۔“ مسرور چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”بیٹو، بیٹھو یار۔“ عادل نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا ”کیا پڑھ رہے تھے سناؤ ذرا۔ بہت اچھی تھی، کس کی ہے؟“

”جائیں سر چند دن پہلے پڑھی تھی، ذہن میں رہ گئی۔“
 ”ہاں اچھی شاعری خود خود ذہن میں ثبت ہو جاتی ہے۔“ وہ بیٹھ گئے اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
 ”ہاں کیا تھا؟“

”کون میڈم..... میڈم انصاری؟“
 ”نہیں میڈم شیرازی۔“ صبح صادق نے وضاحت کی۔
 ”ہاں شروع شروع میں میڈم ڈرا اسٹوڈنٹ کو خوب ڈراتی ہیں۔“
 ”مم..... می۔“ صبح صادق نے ایکٹنگ کی۔
 ”ہاں یہ میڈم شیرازی کی بیٹی ہیں۔“ محسن نے بتایا۔
 ”یار تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ صبح صادق ایک دم کھڑے ہو کر کونش بجالایا ”محترمہ اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو انجان سمجھ کر انور کر دیجئے گا۔“
 ”یہ مکھن کس لیے؟“ وہ مسکرائی۔
 ”آپ خود عقل مند ہیں خاتون۔ مستقبل میں کبھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑسکتی ہے۔“
 ”سوری بھائی، می بہت اصول پرست ہیں لہذا مستقبل کے لیے آپ کو خود اپنی ذات پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔“

”ہائے۔“ صبح صادق کراہا۔
 ”خیریت.....؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں ایک تو آپ نے بھائی کہہ دیا۔ دوسرا مستقبل میں کسی قسم کی مدد کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ میرا تو دل ہی توڑ دیا آپ نے۔“
 وہ پھر ہنس پڑی۔
 ”آپ سے ملاقات بہت دلچسپ رہی۔ انشاء اللہ پھر ہوتی رہے گی۔ اب مجھے ذرا دیر ہو رہی ہے۔“
 ”می انتظار کر رہی ہوں گی..... خدا حافظ۔“
 ”خدا حافظ۔“

محسن دور تک اسے جاتے دیکھتا رہا۔
 ”اب واپس آ جاؤ یار مگر وہ۔“ صبح صادق نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔
 ”بہت اچھی نیچر کی ہے یار۔“
 محسن وقار سکندر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
 ”یار تو اس سے کہاں نکل گیا۔“

”میں نہیں نکلا۔ یار تجھے پتا ہے کہ لڑکیاں خود مجھ سے ٹکراتی ہیں۔“
 ”ہاں یار پتا تو ہے لیکن اب کی بار صبح لڑکی سے ٹکرایا ہے۔ سنا ہے میڈم بڑی سخت مارنگ کرتی ہیں اور ایک نمبر بھی نہیں بڑھاتیں چاہے سلی ہی کیوں نہ لگ جائے۔ دوستی بنائے رکھنا یا اس سے کام آئے گی۔“

مرے زخم پوچھتے ہیں

مرے دوست کیوں خفا ہیں

کوئی ناقبول لہجہ

کہ زبان کی کوئی لکنت

نہ کوئی سنانے آیا

نہ ہوئی کوئی ملامت نہ لگی کوئی عدالت

”بہت خوب۔ یا رکھی کبھی یہ لفظ بہت متاثر کرتے ہیں جیسے اندر سے نکلے ہوں۔“

”جی سر کبھی تو لگتا ہے جیسے کہنے والے نے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہو۔ جیسے الفاظ اس کے قلم سے

نہیں ہمارے دل کی بجٹی میں تپ کے نکلے ہوں۔“

”ہاں تم سناؤ میرے جانے کے بعد کچھ کام کیا۔“

”نوسر میں گاؤں چلا گیا تھا اور آپ کے آنے سے ایک دن پہلے ہی آیا ہوں۔ آپ نے بہت دن

لگا دیے وہاں۔“

”بس کیا کہوں۔ بھنس گیا تھا۔ مجھے تمہاری وہاں بڑی فکر رہی۔ نمبر پچر تھا تمہیں جب گیا تھا۔ لیکن بس

کامل کی وجہ سے بڑی پریشانی رہی۔ پھر وہاں کچھ اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ گیا تھا۔“

”سر نمبر پچر تو دوسرے دن ہی کم ہو گیا تھا لیکن گھبراہٹ سی تھی۔ اس لیے گاؤں چلا گیا تھا۔ پھر ای

سے ملے بھی بہت دن ہو گئے تھے۔“

”ہاں اچھا کیا تم نے گاؤں ہوائے۔ اب سکون سے کام کر سکو گے۔“

”جی سر بس آج کام شروع کر ہی دوں گا۔ آپ گئے تھے کامل کی طرف۔“

”ہاں گیا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ صبح سے پرسکون ہے۔“

”چھپچھپے دنوں تو بہت پریشان کیا اس نے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں نے اسے نظر انداز کیا ہوا تھا۔“

”تو سر ڈاکٹر نے کیا کہا ہے کہ کس وجہ سے اس کو دورے پڑ رہے ہیں۔“

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ سرور میاں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کسی بھی عمر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب نارمل تو وہ

پیدا نشی ہے لیکن اس طرح دورے نہیں پڑتے تھے۔ ایک مشہور نیرورس جن سے بات کی ہے۔ سوچ رہا ہوں

کہ اگر یہاں اس کی حالت بہتر نہیں ہوتی تو اسے کراچی لے جاؤں۔“

”ٹھیک ہے سر لیکن پہلے آپ کچھ دن دیکھ لیں۔ چند دن بعد ہی پتا چل سکے گا کہ دوا سے کچھ فرق

پڑ رہا ہے یا نہیں۔“

”ہاں چند دن تو دیکھیں گے ہی۔ خدا بخش..... خدا بخش۔“ انہوں نے سرور کی بات کا جواب دے

کرا سے آواز دی۔

”تمہاری چائے کب آئے گی؟“

”آگئی سر۔“ وہ ٹرائی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

”سرور میاں تم بھی چائے پیو گے۔ میں کہتا ہوں دودھ پی لو۔ بخار نے نچوڑ دیا ہے تمہیں۔“

”نہیں نہیں چائے میرے لیے چائے ہی بنا دو۔ بہت طلب ہو رہی ہے۔“

”تمہاری مرض میاں۔“

خدا بخش چائے بنانے لگا۔

”تم رات کو سونے سے پہلے سرور کو دودھ دے دیا کرو۔“ پروفیسر عادل نے تاکید کی۔

”نخرے کرتے ہیں کبھی پی لیتے ہیں کبھی گلاس یوں ہی سر ہانے دھرا رہتا ہے۔“

”بجی سرور تم خدا بخش کو تنگ نہ کیا کرو۔“

سرور مسکرایا۔

”اور ہاں وہ اپنے مجتبیٰ صاحب نے کئی چکر لگائے آپ کے بعد۔“ انہیں چائے کا کپ پکڑاتے

ہوئے خدا بخش نے بتایا۔

”اچھا.....“ پروفیسر عادل بنے ”انہیں اپنی بحث مکمل کرنے کی بے چینی ہوگی۔“

”صح فون بھی آیا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ صاحب آگئے ہیں لیکن فی الحال مصروف ہیں۔“

”اچھا یا خدا بخش یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ مصروف ہوں۔ وہ آجاتے تو کپ شپ ہو جاتی۔“

”ارے جناب اس کے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بندہ خود ہی حاضر ہو گیا ہے بلکہ اکیلا نہیں آیا

ساتھ میں اپنے حافظ صاحب بھی ہیں۔“

مجتبیٰ حیدر نے اندر قدم رکھا۔ ان کے پیچھے حافظ احسان اللہ بھی تھے۔

”مگر شریفوں کے گھر آنے کا یہ کوئی طریقہ ہے کہ نہ دستک نہ تیل اور سیدھے دندنا تے ہوئے اندر

گھسے چلے آ رہے ہیں۔“

پروفیسر عادل نے کھڑے ہو کر ان سے ہاتھ ملایا۔

”ہاں بشرطیکہ گھر شریفوں کا ہو۔“ مجتبیٰ حیدر نے قہقہہ لگایا۔

”آپ کو میری شرافت پر شک کب سے ہونے لگا۔“

پروفیسر عادل نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جب سے تم نے ان جیسوں سے دوستی کی۔“ مجتبیٰ حیدر نے حافظ احسان اللہ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا.....!“ حافظ صاحب نے آنکھیں پھاڑیں۔

”یعنی آپ کو ان کی شرافت پر بھی شک ہے۔ کچھ ان کی داڑھی کا ہی خیال کر لیں۔“ پروفیسر عادل مسکرائے۔

”ان کی داڑھی ہی کا خیال ہے ورنہ.....“ مجتبیٰ حیدر مسرور کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

”ورنہ کیا.....؟“ عادل نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ورنہ اس سے بڑی بات بھی کی جاسکتی تھی۔ آج کل اپنے حافظ صاحب کو حقیقت نگاری کا شوق چرایا ہے اور انہوں نے منٹو کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یاران کی داڑھی کو مت دیکھو۔“

”سر حقیقت نگاری کیا ہے؟“ مسرور نے پروفیسر سے پوچھا۔

”لفظ حقیقت مختلف ادوار میں مختلف مفاہیم کا حامل رہا ہے۔ افلاطون کے نزدیک حقیقت کا تعلق اشیاء سے نہیں اشیاء کے عین سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عالم وجود کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ محض عالم خیال یا اعیان کا عکس ہے۔“

پروفیسر عادل نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ جب کوئی موضوع انہیں اپنی دلچسپی کا مل جاتا تو وہ ایک دم الارٹ ہو جاتے تھے اور پھر اس پر بے تکان بولتے تھے۔

”افلاطون کے نزدیک وہ اشیاء جن میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، حقیقت نہیں ہو سکتیں۔ حقیقت وہی ہے جو عین آئینہ دل ہے۔ عہد وسطیٰ میں بھی یہی تصور تھا کہ اصل حقیقت تو ذات خداوندی ہے۔ عالم وجود ذات کا عکس یا سایہ ہے۔ پھر مختلف ادوار میں یہ نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں..... جدید انگریزی یعنی امپریکل فلاسوفیں یہ کہا گیا ہے کہ حقیقت ٹھوس اشیاء میں موجود ہے۔ سترھویں صدی میں ”ہیکن“ نے کہا کہ انجیل مقدس خدا کا قول ہے اور فطرت خدا کا فعل ہے۔ اس طرح فطرت کو انہوں نے حقیقت کا درجہ دیا۔“

”یار پروفیسر یہ کیا فلاسفی شروع کر دی ہے۔ ہمارے سر کے اوپر سے گزر رہا ہے سب کچھ۔“ مجتبیٰ حیدر نے انہیں ٹوکا ”تم اصل موضوع سے ہٹ گئے ہو یار۔“

”میں اصل موضوع سے ہٹا نہیں ہوں یار۔ اسی طرف آ رہا ہوں کہ حقیقت نگاری کیا ہے۔ واقعہ نگاری کیا ہے اور جسے ہم حقیقت نگاری کہتے ہیں، کیا واقعی وہ حقیقت نگاری ہے۔“

”چھوڑو میاں، کن چکروں میں پڑ گئے ہو..... مسرور میاں حقیقت نگاری ہی جانتا چاہتے ہو تو اپنے حافظ صاحب کی کہانیاں پڑھ لو۔ خود ہی پتا چل جائے گا کہ حقیقت نگاری کیا ہے۔ ان پندرہ دنوں میں انہوں نے سات کہانیاں لکھ ڈالی ہیں۔“

”سر حافظ صاحب کی کہانیاں تو کسی بھی وقت پڑھی جاسکتی ہیں لیکن پروفیسر صاحب جو بتانے جا رہے تھے وہ شاید پھر پتا نہ چل سکے۔“

”ارے چھوڑو یار اسے خواہ مخواہ ادھی ادھی باتیں کرنے کا شوق ہے۔“

”نہیں سر، ان کے سمجھانے کا انداز اتنا خوبصورت ہے کہ ہر بات دل میں اتر جاتی ہے یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ واضح ہو گیا ہو آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔“

”بتاؤ میاں اسے ہم آنکھیں اور کان بند کر لیتے ہیں۔“ مجتبیٰ حیدر عادل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں ہاں، کہو کیا کہہ رہے تھے۔“

”رہنے دیجیے پھر کبھی سہی۔“

”یار اتنی مشکل سے تو زمین تیار کی ہے۔ تمہاری مشکل سننے کے لیے اور تم اینٹھ رہے ہو۔“

”ہم بھی یہاں ہیں تم بھی..... پھر کبھی سہی۔ اس وقت تو حافظ صاحب سے باتیں کرتے ہیں، کیوں حافظ صاحب۔“ پروفیسر عادل حافظ احسان اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”جی..... جی۔“ حافظ احسان اللہ کھل اٹھے ”میں نے کچھ کہانیاں لکھی تھیں۔ آپ دیکھ لیتے تو دل کو اطمینان ہو جاتا۔“

”میں.....“ پروفیسر عادل ہنسے ”نہ میں نقاد ہوں نہ ادیب۔ یہ اپنے مجتبیٰ صاحب جو ہیں اٹھارہ نادلوں کے مصنف۔“

”مگر عادل صاحب۔ میری کہانیاں.....“ حافظ احسان اللہ نے کچھ کہتا چاہا لیکن مجتبیٰ حیدر نے انہیں بات مکمل نہیں کرنے دی اور قہقہہ لگاتے ہوئے حافظ صاحب کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”ان کے خیال میں ان کی کہانیاں سمجھنے کے لیے بندے کا بہت زیادہ انجیو کیڈ ہونا ضروری ہے جبکہ میں ٹھہر ایک کم پڑھا لکھا آدمی۔“

مسرور گوان کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی تو وہ اٹھ کر باہر چلا آیا حالانکہ مجتبیٰ حیدر کی شخصیت میں بھی کوئی ایسی بات تھی جو اپیل کرتی تھی۔

خوش مزاج

ہنس کھڑا اور بے تکلف انسان

کشادہ پیشانی

بڑی بڑی آنکھیں

ستواں ناک

شخصیت میں بھی ایک خاص کشش تھی۔

ان کی صحبت میں بیٹھ کر بندہ کبھی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ کھلے دل اور کھرے آدمی تھے۔ جو کچھ منہ میں آتا تھا، کہہ دیتے تھے۔ خود اپنی ذات پر تنقید کرتے اور مزہ لیتے تھے۔ مگر اس وقت مسرور کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

سو وہ باہر آ کر کچھ دیر خدا بخش کے ساتھ باورچی خانے میں کھڑا اسے چائے بناتے اور چائے کا سامان

ٹرائی میں رکھتے دیکھتا رہا۔

”کیوں بیٹا تم کیوں اٹھ آئے؟“ خدا بخش نے پوچھا۔

”یوں ہی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔“

”خوش رہا کرو بیٹا اور اہل علم کی صحبت سے فائدہ اٹھایا کرو۔ کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہوتا ہے۔ اپنے جتنی صاحب اور حافظ صاحب بھی علمی گفتگو کرتے ہیں۔ جو پلے پڑ جائے۔“

خدا بخش چائے کی ٹرائی دھکیلتا ہوا چلا گیا تو مسرور نے سوچا ”پروفیسر عادل صبح کہتے ہیں کہ خدا بخش ان پڑھ ضرور ہے مگر جاہل نہیں۔“ مسرور سگریٹ سگا کر ٹیرس پر کھڑا ہو گیا۔

”امی کافی کمزور لگ رہی تھیں۔“ اس نے رینگ پر جھکتے ہوئے سوچا ”اور کتنی اکیلی ہو گئی ہیں وہ میرے یہاں آنے سے اور میں پتا نہیں وہ سب کچھ ان کے لیے کربھی پاؤں گا یا نہیں۔ شاید میں نے بھی انجانے میں انہیں دکھ دیا ہے۔ وہ مجھے ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتی تھیں اور میں کیا بن رہا ہوں۔ پتا نہیں اس ملک میں ایک آرٹسٹ کا کیا مقام ہے۔ کیا وہ اپنے آرٹ سے اتنا پیسا کما سکتا ہے کہ اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکے۔ پتا نہیں میں اپنی ماں کے خوابوں کو پورا بھی کر سکوں گا یا نہیں اور میری ماں نے کتنے دکھ سہے ہیں۔“

ٹھکرا دینے کا

رد کر دینے کا دکھ۔

اور وہ بھی بغیر کسی وجہ کے۔ یہ دکھ کتابتِ اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ ماں کے چہرے پر لکھا ہے۔

کاش! میں ماں کے چہرے پر کندہ اس دکھ کی اذیت کو کم کر سکتے کا ہنر جانتا ہوتا۔

مسرور نے ایک گہری سانس لی اور وہیں ٹیرس پر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور بیتے دنوں کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

ماں کے آنسو

اپنے فائدے

اور اپنے نقصان

کہاں کہاں۔

کس کس مقام پر چوٹ لگی تھی۔

کہاں کہاں اپنا آپ بے مایہ اور بے وقعت لگتا تھا۔ کب کب دل چاہا کہ چپکے سے دنیا ہی چھوڑ جائیں۔

”ارے یار! تم یہاں بیٹھے ہو۔“ پروفیسر عادل جتنی حیدر اور حافظ صاحب کو گیت تک چھوڑ کر واپس پلٹے تو اسے ٹیرس پر بیٹھے دیکھ کر ادھر ہی آگئے ”میں سمجھا کہ تم کہیں باہر چلے گئے ہو۔“

”جتنی صاحب جلدی چلے گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں خیر! ایسی جلدی بھی نہیں تھی“ کافی دلچسپ گفتگو رہی۔

پروفیسر عادل نے بغور اسے دیکھا۔

”تم کہاں تھے مسرور.....؟“

”کہیں نہیں یہیں تو تھا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”انتہات سوچا کرو..... جو گزر گیا وہ تمہارا ماضی تھا اسے تم بدلنے پر قادر نہیں ہو..... جو گزر رہا ہے وہ

حال ہے اور یہ تمہارا ہے تم اسے چاہو تو بدل سکتے ہو اپنی قوت ارادی سے۔“

”مگر سرائیک چیز ہوتی ہے تقدیر اور مقدر..... انسان اسے بدلنے پر قادر نہیں ہے۔“

”ٹھیک..... لیکن یہ ایک لمبی بحث ہے پھر کبھی تم سے اس موضوع پر بات کروں گا..... اس وقت تو مجھے ہاسپٹل جانا ہے“ کال کو دیکھتے تم چلو گے ساتھ؟“

”جی سر۔“

”رائے تو تم گاڑی نکالو میں ماں جی کو فون کر کے آتا ہوں۔ وہ پریشان ہوں گی کال کے لیے۔ کل بھی بات نہیں ہو سکی تھی۔“

”ماں جی کو بھی آپ ساتھ ہی لے آتے۔“ مسرور نے کہا۔

”نہیں! ماں جی کا آنا بہت مشکل ہے وہاں بڑے بکھیرے ہیں کبھی فرصت ملے گی تو بتاؤں گا۔“

”لیکن ماں جی وہ اکیلی ہوتی ہیں تو زیادہ پریشان ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنا تو کوئی نہیں ہے جتنے دن کال ہسپتال میں تھا تو.....“

”ارے نہیں! آج کل ماں جی اکیلی نہیں ہیں۔ بی آپا ان کے پاس ہیں وہ ہوں تو مجھے ماں جی کی بالکل فکر نہیں ہوتی۔ جیسے وہ نہیں! میں خود ہوں ان کے پاس۔“

مسرور کو بتا کر وہ فون کرنے گئے تو ماں جی نے انہیں بتایا کہ بی آپا ان دنوں بھائی عبدالرحمن کے گھر ہیں کیونکہ حریم کی طبیعت خراب تھی اسے کچھ ٹیپر چکر ہو گیا تھا.....

ماں جی کو فون کر کے وہ باہر آئے تو غیر ارادی طور پر حریم کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی ان کے ذہن میں حریم کا وہ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ آ رہا تھا۔ اس روز وہ چوہدری عبدالرحمن کے گھر سے اٹھے تو ان کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دل پر کوئی بوجھ آگرا ہو۔ وہ حریم کے آنسوؤں سے اور اس کے اس طرح خاموش ہونے سے بہت ڈسٹرب ہو گئے تھے۔

”پتا نہیں یہ لڑکیاں ایسی کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی نازک دل خود ہی آپوں آپ ذرا سی بات پر محل کھڑے کر لیتی ہیں اور جب محل گرے ہیں تو پھر روتی ہیں! آنسو بہاتی ہیں۔“

حریم کا چہرہ بار بار ان کے تصور میں آ رہا تھا۔ کیا کی تھی پھر پتا نہیں کیوں ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ شادی

کہیں نہ کہیں تو کرنی تھی پھر حریم سے کیوں نہ سہی۔ اس کے آنسوؤں کا مداوا تو..... ہو جائے گا۔ حالانکہ حریم نے ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ ندامت محسوس کر رہے تھے۔ وہ ایک لڑکی کے آنسو پونچھ لینے پر قادر تھے لیکن اس سے اجتناب کر رہے تھے جو ان کی شخصیت کے منافی تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ ماں جی سے کہہ دیں گے کہ ٹھیک ہے انہیں حریم کی رفاقت سے انکار نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ وہ ایک خواب جو ابھی دھند کے پیچھے چھپا ہے کبھی اس دھند سے نکل کر آنکھوں میں آئے اور پھر اس خواب کی تعبیر بھی پالی جائے۔

ضروری تو نہیں کہ وہ ایک ساتھی..... ان کے تصورات جیسا ساتھی اس دنیا میں کہیں موجود ہی ہو..... اور پھر زندگی یہ تو نہیں جو انسان اپنے لیے صرف اپنے لیے گزارتا ہے۔ اس زندگی پر دوسروں کا بھی اتنا ہی حق ہوتا ہے جتنا کہ ہمارا بلکہ ہماری زندگیاں تو ہم سے زیادہ دوسرے گزارتے ہیں۔ شاید دوسروں کے حقوق خود ہمارے اپنے حقوق سے زیادہ ہوتے ہیں۔

وہ بھاری دل کے ساتھ گھر آئے تھے لیکن بی آپا کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئے۔

”ارے بی آپا آپ۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئے تھے ”آپ کب آئیں بہت جی چاہ رہا تھا آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے کو۔“ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے آنکھوں سے لگا لگا اور پیار کیا۔

”تب ہی تو ہمیں بعد آتے ہو۔ ماں جی بتا رہی تھیں کہ اب بھی وہ نہ جاتیں تو نہ جانے کب تک نہ آتے۔“ ”نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی بس کچھ مصروفیت رہی لیکن آپ کہاں تھیں۔ اس سے پہلے دوبار میں آیا تو آپ نہیں تھیں۔“

”بھائی مراد علی کے پاس چلی گئی تھی لیکن سچ تو یہ ہے کہ دل نہیں لگا میرا وہاں حالانکہ بھائی مراد علی اور بچے بہت خیال رکھتے تھے۔“

”کیسے تھے بھائی صاحب؟“

”اچھے تھے۔“

”انہوں نے تو گاؤں ایسا چھوڑا کہ پھر مڑ کر آئے ہی نہیں۔“ عادل ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”ہاں“ کہتے تھے ماں باپ کی زندگی میں نہیں آیا تو اب آکر کیا کروں گا۔ انہوں نے جس گھر سے نکالا تھا اب اس گھر میں کیا جانا۔“

”بھائی مراد علی بھی اپنے ارادوں میں بہت پختہ ہیں، بہت جی چاہتا ہے انہیں دیکھنے کو..... انہیں میں نے بہت بچپن میں دیکھا تھا۔“

”تم فارغ ہو تو کبھی میرے ساتھ چلنا..... بچوں نے بہت تاکید کی تھی کہ پھر آؤں..... سچ تو یہ ہے کہ بچوں سے جدا ہوتے ہوئے مجھے بھی بہت دکھ ہوا..... بھابی نے بہت اچھی تربیت کی ہے ان کی۔ بہت

سلجھ ہوئے اور سمجھ دار بن چکے ہیں.....“

”ہاں ضرور چلوں گا۔“

پرنسیر عادل کو بہت اشتیاق تھا ان سے ملنے کا۔ بی آپا اور مراد علی ان کے والد کے چچا زاد بھائی کی اولاد تھے۔ مراد علی نے اپنی پسند سے شادی کر لی تھی جس پر ان کے والد نے انہیں اپنی جائداد سے عاق کر دیا تھا۔ وہ مڑ کر واپس نہیں آئے تھے۔ بی آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

وجہ وہی خاندان میں جوڑ کا رشتہ نہ ہونا۔ بی آپا کے مزاج میں بہت نرمابٹ اور شفقت تھی۔ وہ بچپن میں اکثر ان کی طرف چلے جاتے تھے اور ان سے اپنے دکھ کہہ کہتے تھے۔

کئی بار ان کی گود میں سر رکھ کر روئے بھی تھے اور بی آپا نے ان کے آنسو پونچھے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر روئی تھیں۔

انہیں بی آپا سے بے حد محبت تھی اور بی آپا بھی ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ گھر بھی ساتھ ساتھ تھے بلکہ حویلی کے اندر سے بھی راستہ جاتا تھا۔ ان کا جب دل چاہتا تھا وہ ان کے پاس چلے جاتے تھے اور گھنٹوں ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پھر انہیں اپنے اسکول کی باتیں..... دوستوں کی باتیں بتاتے۔ اپنے مستقبل کے پلان ان سے ڈسکس کرتے اور وہ بھی بڑے دھیان سے ان کی باتیں سنتی تھیں۔ وہ گھر میں اکیلے تھے.....

بابا تھے جن کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ ماں جی تھیں جو سارا وقت اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی رہتی تھیں یا روتی رہتی تھیں۔

کامل تھا ننھا سا.....

جونہ بنتا تھا نہ کھیلتا تھا.....

سو وہ اپنے دل کی باتیں آپا سے کیا کرتے تھے۔

بی آپا بھی اکیلی تھیں۔

مراد علی کو عاق کر دیا گیا تھا۔

اور گھر میں ماں باپ تھے جن کے ساتھ دوستی نہیں کی جاسکتی تھی ہاں بہت بچپن میں ہی دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا حالانکہ بی آپا ان سے عمر میں بیس سال بڑی ہوں گی اور یہ دوستی کا رشتہ ابھی بھی قائم تھا۔ اب بھی وہ اپنے اندر کے دکھ بی آپا کو بتا دیتے تھے۔

والدین کے مرنے کے بعد بابا انہیں گھر ہی لے آئے تھے اور بی آپا کے آنے سے انہیں لگتا تھا جیسے گھر میں زندگی آگئی ہے اور اب اتنے سارے دنوں کے بعد بی آپا کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے تھے کہ وقتی طور پر سب کچھ بھول گئے تھے اور ان کا ہاتھ ہاتھ میں پکڑے بیٹھے اشتیاق سے ان کی باتیں سن رہے تھے اور بی

آپا نہیں مراد علی اور ان کے بیوی بچوں کے متعلق بتا رہی تھیں۔

”ارے عادل! تم کب شادی کر رہے ہو.....“ باتیں کرتے کرتے انہیں اچانک خیال آیا ”بابا کی کتنی خواہش تھی کہ وہ زندگی میں ہی تمہاری شادی کر دیتے لیکن ان کی قسمت کسی پوتے پوتی کی شادی ان کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ تم سب سے بڑے تھے اور تم ولایت جا کر بیٹھ گئے۔“

”بابا جان نے خود بھیجا تھا مجھے میں کب جانا چاہ رہا تھا۔ آپ کو پتا نہیں کہ میں ماں جی اور آپ کو اکیلا چھوڑ کر جانے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ مگر مجھے بابا جان نے زبردستی بھیج دیا۔“

”خیر وہ تو ضروری تھا تمہارے مستقبل کے لیے لیکن اب شادی کا پروگرام بناؤ بھیا..... عمر گزری جا رہی ہے۔“

”خیر ایسی بھی نہیں گزری۔“ وہ ہنس پڑے تھے۔

”کوئی لڑکی پسند کر لی ہے تو بتادو۔ ماں جی تک بات پہنچانا میرے ذمے۔“

”ماں جی کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئے۔

”مسئلہ تو میرا اپنا ہے بی آبا! میرا دل خود میرے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔“

”مگر عادل شادی میں اب تمہیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ انہوں نے سمجھایا۔

تب ہی اندر سے کامل کے چیخنے کی آواز آئی تو وہ بی آبا کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے کامل کے کمرے کی طرف لپکے۔ اسے دورہ پڑ گیا تھا اور وہ زور زور سے چیخیں مارتے ہوئے سرخ رہا تھا۔

پھر کامل کی پریشانی میں تو وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔

بی آبا کا اصرار حریم کے آنسو اپنا خیال۔

سب ان کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ عارضی طور پر تو قصبے سے ڈاکٹر آکر کامل کو سکون کے انجکشن لگا گیا تھا۔ لیکن نیند کے انجکشن اس کا مستقل حل تو نہ تھے۔ اس لیے وہ کامل اور کرم داد کو ساتھ ہی لے آئے تھے اور کامل کو یہاں اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ یہ نجی اسپتال تھا اس لیے اچھی دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ کرم داد بھی اس کے پاس تھا۔

گاڑی اسپتال کے قریب پارکنگ ایریا میں پارک کر کے وہ نیچے اترے اور سرور کو اترنے کا اشارہ کیا۔

”نجی اسپتال میں کارکردگی نسبتاً تسلی بخش ہوتی ہے۔“ سرور کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”لیکن سر یہاں کے چار جز بھی تو اتنے زیادہ ہیں کہ عام بندہ بے نہیں کر سکتا۔ اسے تو بہر حال انہی اسپتالوں کا رخ کرنا پڑتا ہے جہاں ایک ایک ہفتہ مریض کا حال نہیں پوچھا جاتا۔“ وہ سرور کی بات کا جواب دینا چاہ رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر سلطان پر پڑی جو کامل کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر ان پر نظر پڑتے ہی ان کی طرف لپکا۔

”کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

”تم کیسے آگئے یہاں اچانک؟“ عادل نے اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”بابا جان نے کہا تھا کہ کامل کا حال دریافت کر آؤں۔“

”بہت اچھا کیا یا رتم نے..... اب آئے ہو تو میں کچھ دن تمہیں جانے نہیں دوں گا۔“ پروفیسر عادل نے بولے اور سرور سے اس کا تعارف کروایا۔

”یہ میرا چچا زاد بھائی ہے۔ نام تو اس کا عمران ہے لیکن خود کو سلطان کہلوانا پسند کرتا ہے۔“ سرور نے اس سے ہاتھ ملایا۔

اور پروفیسر عادل دونوں کو ساتھ لے کر کامل کے کمرے میں داخل ہو گئے۔



”مومو۔ مومو۔“ نذیب عثمان احمد اسے پکارتی ہوئی ٹی وی لائونج میں آگئیں جہاں وہ تیمور کے ساتھ لڑوکیل رہی تھی۔

”میرا چچا آگیا مومو۔“ تیمور زور سے اچھلا۔

”جسٹ آمنٹ ڈارلنگ!“ انہوں نے تیمور کے گال کو انگلیوں سے چھپتایا۔

”جی ماما۔“ مریم ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”جانائیں ذرا ڈاکٹر معید کی طرف جا رہی ہوں۔ اگر شچی کا فون آئے تو بتا دینا۔“

”خیریت! آپ کی طبیعت تو اچھی ہے نا.....“ مریم پریشان ہو گئی۔

”ہاں خیریت ہے ڈنیر! وہ قاسم صاحب ہیں نا..... معید کے ڈیڈی، پچھلے دنوں لندن میں ان کا..... ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا ذرا خیریت معلوم کر لیں۔ عام ہادی ملے تھے پرسوں مجھے انہوں نے بتایا تھا۔“

”اوہ اچھا ٹھیک ہے۔“ مریم مطمئن ہو گئی۔

”انگل ہادی ملیں تو انہیں کہیے گا تیمور آپ کو یاد کر رہا تھا۔“

”اور ڈاکٹر معید۔“

”میں ان کو تو یاد نہیں کر رہا۔“

”کیوں بھی؟ ڈاکٹر معید نے کیا تصور کیا ہے؟“ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اس لیے کہ انگل ہادی نے مجھ سے ایک پراس کر رکھا ہے اور انہیں یاد کرنے کا مطلب ہے کہ میں ان کا پراس یاد دلارہا ہوں جب کہ ڈاکٹر معید نے مجھ سے کوئی پراس نہیں کر رکھا۔“

”نانی بوائے۔“ نذیب عثمان نے اس کے رخسار پر چٹکی لی اور شریف کو بلا کر کچھ ہدایات دیے لگیں۔



مریم سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہی تھی۔ موف کلر کی نفیس کام والی ساڑی، نفاست سے کیا ہوا میک اپ، صراغ دار گردن میں موف کلر کے اسٹون والا ٹاؤک سلاکٹ وہ بے تحاشا خوبصورت لگ رہی تھیں۔

”میری ماما کتنی خوبصورت ہیں اور کتنی دلکش۔“ بہت باریک سوچی ہوئی بات اس نے ایک بار پھر سوچی۔

”MOMO! IT IS YOUR TURN“ (مومو! اب تمہاری باری ہے)

”اوہ لیس۔“ اس نے چونک کر تیمور کی طرف دیکھا اور اپنی ٹرم لی۔

مسز عثمان شریف کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ ان دنوں وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہی تھیں۔ عثمان احمد بھی اسٹڈی سے اپنے بیڈروم میں منتقل ہو گئے تھے اور وہ نہ صرف عثمان احمد کا خیال رکھ رہی تھیں بلکہ ان سب پر بھی توجہ دے رہی تھیں۔

آتے جاتے مریم سے کپ بھی لگ جاتی تھی۔ عاشی اور نینا سے بھی ان کے اسکول کا حال احوال پوچھتی تھیں۔ تیمور کو بھی ایک دو بار ساتھ باہر لے گئی تھیں۔ سب ہی خوش تھے اور مریم بھی بہت پرسکون اور مطمئن تھی۔ ایک ماما کے رویے سے جیسے سارے گھر کی فضا بدل ہی جاتی تھی۔ جیسے یہ گھر گھر نہ تھا کوئی جادو نکری تھا۔ ماما ہنسیں تو جیسے پورے گھر میں ہنسی کی لہر دوڑ جاتی تھیں۔

وہ خوش ہوتیں تو جیسے پورے گھر سے ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑتے تھے۔ وہ اداس ہوتیں تو سارے گھر کے درود یوار سے اداسی ٹپکنے لگتی تھی۔ اتنی خاموشی اور سکوت چھا جاتا تھا کہ مریم کو گھر کے درود یوار سے خوف آنے لگتا تھا اور اب مسز عثمان احمد پرسکون اور خوش تھیں تو مریم کو یوں لگ رہا تھا جیسے پورے گھر میں ہنسی کی کلکاریاں بکھری ہوئی ہوں۔

اس کا دل چاہتا تھا وہ خود بھی ہنسنے خوش ہو۔

ماما۔

پاپا سے لاؤ کرے۔

فرمائش کرے۔

عاشی نینا اور تیمور کے ساتھ خوب کھیلے اور رات کو کھانے کے بعد سب مل کر گپیں لگائیں اور وہ بالکل دوستوں کی طرح ماما پاپا کے ساتھ اپنی اور اپنی سہیلیوں کی باتیں کرے۔ ان کو بتائے کہ اسے اس طرح رہنا بہت اچھا لگتا ہے اور جب کبھی ماما موڈ میں ہوں تو وہ ان سے پوچھے۔

ان کی ٹینشن اور پریشانی کی وجہ۔

اور پھر وہ سب مل کر ماما کا مسئلہ حل کر دیں۔

اسے ماما کا سختی سے روکنا کتنا اچھا لگتا تھا۔

اس نے ایک بار بھی ضد نہیں کی تھی اور اگلی صبح سے ہی چاچا اسلم کے ساتھ کالج جانے لگی تھی۔ عاشی



نینا اور مورتیوں بہت خوش ہوئے تھے۔ خاص طور پر تیمور۔

”مومو! اب آپ ماما سے ناراض نہ ہونا۔“

اسے اپنے ساتھ جاتا دیکھ کر تیمور نے بنجیدگی سے کہا تھا تو وہ ہنس دی تھی۔

”میں پہلے بھی ماما سے ناراض نہیں تھی مور۔“

”لیکن آپ ہمارے ساتھ تو نہیں جاتی تھیں اور پھر کتنی تکلیف ہوتی تھی آپ کو اتنی دیر تک بس

اسٹاپ پر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔“

”ہاں۔“ عاشی نے بھی تائید کی تھی۔

”ماما آپ پر غصہ ہوں بھی تو اب آپ ایسا نہ کریں گھر کی بات گھر میں ہی رہنی چاہیے ناں۔ آپ کی فرینڈز کیا

کہتی ہوں گی۔“

”اوہ گڑیا! مریم شرمندہ ہوئی۔“

وہ اس سے اتنی چھوٹی تھی اور اسے سمجھا رہی تھی۔

واقعی اس سے غلطی ہوئی تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن شاید وہ کچھ جذباتی تھی۔ کچھ کیا بلکہ

زیادہ ہی جذباتی تھی اور مس مہرین کہتی تھیں کہ زندگی کے مسائل کو بہتر طریقے سے حل کرنے کے لیے

ضروری ہے کہ آدمی اتنا جذباتی نہ ہو اور پتا نہیں کیوں وہ اتنا جذباتی تھی کہ سمجھوتا کری نہیں پاتی تھی۔

”مومو! آپ کیا سوچنے لگی ہو دھیان سے کھیلنا۔ مزے نہیں آ رہا۔“ تیمور نے اسے سوچتے دیکھ کر کہا

تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کچھ بھی نہیں بس ایسے ہی سوچ رہی تھی اب گھر میں کتنا سکون ہے۔“

”ہاں وہ آئی زگس جو نہیں آ رہی ہیں آج کل۔“

”بائے داوے! یہ آئی زگس آج کل کہاں ہیں؟ کیوں نہیں آ رہی ہیں؟“ مریم پوری طرح تیمور کی

طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”ماما کہہ رہی تھیں کہ آئی زگس کراچی گئی ہوئی ہیں اپنے بیٹے کے پاس۔“

”اچھا اچھا۔ تب ہی۔“ مریم نے اپنی گوٹ اگلے خانے میں رکھی۔

اچانک گیٹ کی بیل ہوئی۔ تیمور کھیل چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”سراگے ہیں۔ میں عاشی بچی اور نینا کو بلا لاؤں۔“

”یہ دونوں ابھی تک سو رہی ہیں کیا؟“

”نہیں تو عاشی بچی تو بڑھ رہی تھیں اور۔۔۔ یوم روک کر رہی تھی۔ تب ہی تو میں آپ کو بلا کر لایا تھا۔

میرے ساتھ کوئی کھیل نہیں رہا تھا۔“ تیمور نے بتایا اور عاشی اور نینا کو بلانے چلا گیا۔

مریم نے گوئیں بیٹیں اور آنکھیں موند کر صوفے کی پشت سے سرٹیک لیا۔ اندرونی دروازے کی تیل ہو رہی تھی اور شریف دروازہ کھولنے جا چکا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر مریم نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

”شریف! ایک کپ چائے بنا دو۔“

”ایک نہیں دو کپ۔“ چمکتی ہوئی آواز آئی تو وہ چونک کر آنکھیں کھولتے ہوئے ایک دم سیدھی ہو گئی۔ سائے شربیل مرزا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مریم کی پیشانی شکن آلود ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو تارل کر لیا۔

”ماما گھر نہیں ہیں۔“

”میرے خیال میں پہلے سلام دعا کی جاتی ہے۔“

”السلام علیکم۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ شربیل مرزا کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر جمی تھیں ”ہاں اب کہیں کیا کہہ رہی تھیں؟“

”ماما گھر نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ کا فون آئے تو آپ کو بتا دوں کہ وہ ڈاکٹر معید کی طرف گئی ہیں۔“

”اوہ!“ اس نے ہونٹ سکڑے ”ڈاکٹر معید کی طرف۔ کیا وہ پھر کچھ بیمار ہیں؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ مریم نے جلدی سے کہا ”وہ اچھی ہیں۔“

”خیر اچھی تو وہ بہت ہیں۔“ شربیل مرزا مسکرایا ”آج آپ کچھ بدلی بدلی لگ رہی ہیں۔“

مریم اس کی بات کا جواب دیے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ماما ابھی کچھ دیر پہلے گئی ہیں۔ ظاہر ہے دیر سے لوٹیں گی اور پاپا بھی کسی کام سے باہر گئے ہیں۔“

”مگر آپ تو گھر پر ہیں نا۔“

مریم نے وہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

”ارے ارے کہاں چلیں۔ بیٹھیں، گپ شپ لگائیں۔“ شربیل مرزا نے اس کے بازو کو پکڑ کر روکا۔

مریم کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور شریف کو آواز دی۔

”شریف۔“

”شریف کو کیوں بلا رہی ہیں، میں آپ کو کھا جاؤں گا۔ بیٹھ جائیں، آج میں جانتا چاہتا ہوں کہ آپ

کے اس گریز کی وجہ کیا ہے۔“

مریم نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مرزا کی بیٹھ گئی۔

شریف نے کچن سے جھانک کر پوچھا ”جی مریم بی بی۔“

”چائے جلدی لاؤ، شربیل صاحب کو جانا ہے۔“

”اچھا جی۔“

شربیل مرزا دلچسپی سے اس کے چہرے کے بدلنے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتی تھی کہ شربیل مرزا ماما سے اس کی شکایت کرے اور وہ ایک بار پھر ڈپریشن ہو جائیں۔ اسے ماما کی بیماری سے کس قدر تکلیف ہوتی تھی۔ کتنی اذیت محسوس کرتی تھی وہ۔ اپنا آپ بہت برا لگتا ہے کہ ہر بار وہ ان کی بیماری کا باعث بن جاتی تھی۔ دل چاہتا تھا اپنی زندگی ختم کر لے۔ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے لیکن حرام موت سے اسے ڈر لگتا تھا۔ وہ حرام موت نہیں مرنے چاہتی تھی۔ یہ کیا بندہ مرنے کے بعد بھی عذاب سہتا رہے۔ سو وہ دل پر جبر کیے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے کے رنگ لمحہ لمحہ بدل رہے تھے۔

”جی کیسے میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ اس نے چونک کر شربیل مرزا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ کے گریز کی وجہ جاننے کا خواہش مند ہوں۔“

”جی۔“

”کوئی ایسا مشکل سوال تو نہیں ہے سادہ سی بات پوچھی ہے کہ آپ مجھ سے بھاگتی کیوں ہیں۔ میں جتنا قریب آنا چاہتا ہوں آپ اتنا ہی دور بھاگتی ہیں لیکن کب تک بھاگیں گی۔“

مریم کی برداشت اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کاٹ رہی تھی۔

”مجھے اس طرح کی کسی فضول بات کا جواب نہیں دینا۔ آپ کا تعلق اور دوستی صرف ماما سے ہے اور وہ انہی تک محدود رکھیں۔“

”یہ تو آپ کا خیال ہے نا۔“

”یہ صرف میرا خیال نہیں ہے بلکہ حقیقت بھی یہی ہے۔“

”حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہاں صرف آپ کے لیے آتا ہوں۔“

”مثبت۔“ مریم کے ہاتھ سے ضبط کی ٹٹائی چھوٹ گئیں۔ وہ یکدم کھڑی ہو گئی ”آپ پلیز یہاں سے جاسکتے ہیں۔ ماما کو آپ کی آمد کی اطلاع دے دی جائے گی۔“

”چلا جاؤں گا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ چند لمحوں کا ساتھ آپ کو گوارا نہیں اور اگر زندگی بھر کا ساتھ ہو گیا تو کیا کریں گی پھر۔“

”دماغ صحیح ہے آپ کا اپنی عمر دیکھیں اور میری۔ بیٹیوں جتنی ہوں آپ کی۔“ مریم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو کیا جواب دے۔

”جی انکل بہت اچھی دوست مل گئی ہیں اور ٹیچر زبھی بہت اچھی ہیں۔“ عاشری نے خوش ہو کر کہا۔
”مری والا اسکول یاڈ نہیں آتا؟“

وہ جان بوجھ کر سوال کر رہا تھا۔

”آتا ہے بہت یاد آتا ہے خاص طور پر سسٹر مرینا اور مدر جو اُس بہت یاد آتی ہیں۔ جب بھی پیار پر جاتی تھی تو مدر جو اُس بہت پیار کرتی تھیں اور بہت خیال کرتی تھیں میرا اور سسٹر مرینا کی آواز بہت پیاری تھی۔ وہ بہت خوبصورت گاتی بھی تھیں اور جب پڑھاتی تھیں تب بھی ان کی آواز دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔“ عاشری خوش ہو کر بتا رہی تھی اور مریم بیچ و تاب کھا رہی تھی۔

”عاشری دیکھو یہ مور اور نینا کہاں رہ گئے ہیں۔ تمہارے ٹیوٹر آنے والے ہوں گے جا کر بیٹھو۔“

”آپنی وہ نینا نے کائنوں فلم لگائی ہوئی تھی تو وہ دونوں دیکھ رہے تھے۔ نینا نے کہا تھا۔ ختم ہونے والی ہے ایک منٹ میں آ رہے ہیں۔“

”ہاں تو عاشری جی آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ وہاں جا کر پڑھیں۔“

مریم نے غصیلی نظروں سے شرجیل مرزا کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کوسے ہوئے سوچنے لگی
”کس قدر ذلیل انسان ہے یہ۔“

”نہیں اب تو نہیں چاہتا۔ شروع شروع میں دل چاہتا تھا لیکن اب نہیں۔ یہاں سب جو ہیں۔ آپنی ماما مور اور نینا۔ ان سب کے بغیر وہاں اچھا نہیں لگے گا۔ یہاں اب بالکل ٹھیک ہے۔“

شریف ٹرائی دھکیلا ہوا آیا تو مریم نے غصے سے کہا ”اتنی دیر لگا دی تم نے چائے گھنٹے کے لیے رکھی ہوئی تھی!“

”جی مریم بی بی۔“ شریف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مریم نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی
”وہ جی میں.....“

”اچھا اچھا“ ٹھیک ہے۔ چائے بناؤ اور شرجیل صاحب!“ اس نے شرجیل کی طرف دیکھا ”چائے پیجئے“ شریف آپ کو کپنی دیتا ہے۔ شاید ماما اس اثنا میں آجائیں۔“ اور عاشری کا ہاتھ پکڑ کر وہ فی لاؤنچ سے باہر نکل گئی۔

شرجیل مرزا لمحہ بھر اسے باہر جاتے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر شریف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”یار جلدی سے چائے کا ایک کپ دو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بہت ضروری کام سے جانا تھا۔“

”سزئیہ نکو اور کٹت تولیں۔“ شریف نے دانت نکالے۔

”نہیں یار شریف جلدی ہے۔“

”بیٹھیں گے نہیں آپ بیگم صاحب آتی ہی ہوں گی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور اطلاعات عرض ہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ شادی نہیں کی ابھی تک بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں شادی کے چکروں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن آپ کو دیکھ کر ارادہ بدل گیا۔ سوچا گھر سائیں اور آپ کی ماما کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”آپ چلے جائیں یہاں سے پلیز۔“ مریم کو کوئی بات نہیں سوچ رہی تھی۔

”بہت مشکل ہو جائے گی بی بی۔ اپنے آپ کو سمجھالیں۔“

”میں تم جیسے غلیظ آدمی سے شادی کرنے کے بجائے زہر کھالوں گی۔“

”اوہ!“ اس نے آنکھیں پھاڑیں ”ضرورت پڑے تو مجھے کہیے گا۔ لا دوں گا۔“

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور سامنے سے آتی ہوئی عاشری کی طرف دیکھا۔

”مسز احمد مجھے داماد بنانے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ آپ زہر کھالیں گی تو.....“ اس کی نگاہیں عاشری کے چہرے پر پھٹ رہی تھیں۔

مریم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور غصے سے اس کا پورا وجود کاچنے لگا۔

”اپنی غلیظ نظریں اس محسوم کے چہرے سے ہٹالو۔“ اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔

”ہٹالیں گے صاحب بشرطیکہ آپ.....“

”آپنی۔“ عاشری کتابیں اٹھائے اس کے قریب آگئی ”السلام علیکم انکل شی۔“ عاشری نے شرجیل مرزا کو

سلام کیا اور مریم کی طرف دیکھا ”تیوڑ کہہ رہا تھا سرائے میں لیکن سر تو نہیں ہیں۔“

”ہاں“ شرجیل صاحب آئے تھے میں سمجھی کہ سرائے میں۔ تم چلو کمرے میں وہ آنے والے ہی ہوں گے۔“ مریم نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

”اور یہ ماما کہاں گئی ہیں؟“

”ڈاکٹر معید کی طرف گئی ہیں۔“

”کیوں؟“ عاشری بھی پریشان ہو گئی ”ماما ٹھیک تو تھیں نا؟“

”ہاں ٹھیک تھیں۔“ مریم نے جلدی سے کہا ”تم چلو اندر میں بھی آتی ہوں۔“

وہ چاہہا رہی تھی کہ عاشری جلد از جلد اس کی غلیظ نظروں کے سامنے سے ہٹ جائے۔ کیسی ایکسرے کرتی ہوئی سی نظریں تھیں شرجیل مرزا کی۔ اوپر سے نیچے تک دیکھتی ہوئی۔ شرجیل مرزا اس کی کیفیت کو سمجھ کر ہولے سے مسکرایا۔

”ہاں تو عاشری بی بی آپ کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“

”فائن انکل۔“ عاشری اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”دل لگ گیا ہے یہاں؟“



شریف کو جب شرجیل مرزا یا رکھ کر بلاتا تو وہ بہت خوش ہوتا تھا اور اس کے جانے کے بعد بھی۔ سو آج وہ بہت خوش ہو رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ وہ رک جائے۔

نہیں یا رباب چلوں گا۔ اپنی نیگم صاحب کو بتا دینا کہ میں آیا تھا۔“ شرجیل مرزا چائے پینے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اپنے شچی صاحب تو چلے گئے جی۔“ اس نے شرجیل مرزا کے جانے کے بعد مریم کو اصرار کیا۔
”میں نے تو بہت روکا لیکن وہ رکنے ہی نہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ مریم نے جو عاشی کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی بیزاری سے کہا۔
”وہ جی ٹیڈ بھی آگیا ہے۔“ شریف نے جاتے جاتے بتایا۔ عاشی کتابیں اٹھائے اٹھائے باہر چلی گئی تو بہت دیر سے رکنے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

”تو..... تو یہ بات تھی۔ ایسی صحیح کہتی تھی کہ ماما شرجیل مرزا کے متعلق۔“
”اف۔ او۔ نہیں، ہرگز نہیں، کبھی نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“
”بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ ماما کو خدا جانے اس میں کیا نظر آتا ہے۔“

”صرف دولت ہے نا..... اور پھر..... پھر وہ تو ماما کو پسند کرتا تھا۔ ایک دن ماما خود آٹنی زنگس کو تا رہی تھیں کشتی ان سے کہتا ہے کہ اگر وہ مسز عثمان نہ ہوتیں تو وہ انہیں پو پوز کر دیتا۔“
اور ماما اور آٹنی زنگس کتنا ہنس رہی تھیں۔

اور پھر وہ پاپا سے عمر میں ذرا سا ہی تو چھوٹا ہے۔
پھر وہ۔ وہ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔
انہوں نے شرجیل مرزا سے اس طرح کی بات کیوں کی ہے۔

یقیناً پاپا کو اس بات کا علم نہیں ہوگا۔
یہ صرف ماما کی اپنی رائے اپنی خواہش ہوگی۔
اور ماما تو یونہی الٹی سیدی باتیں سوچتی ہیں۔
اور الٹی سیدی خواہشیں رکھتی ہیں۔

اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی ادھر سے ادھر۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔

ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔ ابھی تو..... اور ماما نے ابھی سے یہ کیا سوچنا شروع کر دیا ہے۔
اور اس سے..... اس شرجیل مرزا سے بھی کہہ دیا ہے تب ہی تو وہ اتنا شوخ اور بولڈ ہو کر بات کرتا ہے۔



اور تب ہی تو اس کی اتنی جرأت ہوتی ہے۔

خدا جانے ماما نے اس سے کیا کہہ دیا ہوگا۔
کیسے کیسے وعدے کیے ہیں۔

لیکن وہ ماما کی یہ بات ہرگز نہیں مان سکتی۔
کبھی نہیں ہرگز لگتا ہے اسے یہ شخص۔

نفرت ہے اسے اس سے۔
آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔

تب ہی باہر سے پاپا کی آواز آئی تو وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی باہر آگئی۔
”پاپا! اس نے ایک دم ان کے ہاتھ تھام لیے پاپا!“

”کیا ہوا۔ کیا ہوا مومنو خیریت تو ہے؟“ عثمان احمد نے اس کے روئے چہرے کو دیکھا۔
”پاپا وہ.....“ اور لفظ آنسوؤں میں بھیک کر گم ہو گئے۔ وہ بے اختیار ان سے لپٹ کر زور زور سے

رونے لگی۔ اونچا اونچا۔
عثمان احمد نے بے اختیار اپنے بازو اس کے گرد لپیٹ لیے۔

”بیتا کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟“
مگر وہ روئے چلی گئی۔ تب ہی مسز آفندی سے باتیں کرتی ہوئی نرب عثمان احمد اندر داخل ہوئیں اور وہیں ٹھنک کر رک گئیں۔



سکندر جب سے گاؤں سے واپس آیا تھا، چپ چاپ سا تھا۔ نہ اس کا دل پڑھنے میں لگتا اور نہ ہی صبح صادق اور محسن وقاری کی باتیں اس کا دل بہلا سکتی تھیں۔ چاچا کی اچانک موت کا سانحہ ہی کچھ کم نہ تھا کہ عزیز پاپا چاچا کی وفات کے صرف اٹھارہ دن بعد بیٹے کی پیدائش پر زندگی ہار بیٹھیں۔ ابھی تو چاچا کی موت کا دکھ ہی کم نہیں ہوا تھا کہ عزیز آپ چلی گئیں۔

بالکل اچانک چاچا کی وفات پر وہ آئی تھیں تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں لیکن پھر صرف اٹھارہ دن بعد..... اچانک ہی ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ ان سب کی کتنی خواہش تھی کہ وہ عزیز آپ کو شوہر لے جائیں لیکن سسرال والے نہیں مان رہے تھے۔

”سکندر مجھے بچالو۔ میرے بھائی مجھے بچالو۔ مجھے شوہر لے چلو۔“ اس نے سکندر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ اس کے اندر زندہ رہنے کی کتنی خواہش تھی۔

کتنی تنہا تھی۔ بھانٹار نے اس کے شوہر سے کہا ”عزیز کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور گاؤں میں تو کوئی



ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ اگر تم اجازت دو تو ہم اسے شہر لے جائیں۔“
”نہ پتر۔“ عبر کی ساس نے ہنس کر کہا ”بچی ہے۔ پہلی بار ہے تو گھبرار ہی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے“
اللہ خیر کرے گا۔ اپنی ماسی حلیمہ کا بڑا تجربہ ہے۔ اپنے سارے بچے اسی کے ہاتھوں میں ہوئے ہیں۔“
لیکن ہوا کیا؟ غبر آپامر گئیں۔

انہوں نے آنکھیں کھول کر اس معصوم فرشتے کو دیکھا تک نہیں جس کے لیے اتنی اذیت اٹھانی تھی۔
سکندر کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔
غبر آپا کی وہ التجا بھری نظریں اسے بھولتی ہی نہیں تھیں۔
شاید انہیں پہلے ہی ادراک ہو گیا تھا۔
شاید وہ بہت زیادہ تکلیف میں تھیں۔

”اے ساس! میں نے کون سا دنگہ بابا سے یہ بات کہی تھی اور ہر بابا نے اپنے آپ کو پتہ بولے اسے سمجھایا تھا۔“

”بیٹا! اس کی قسمت میں اسی طرح لکھا تھا پتر وہ اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھی اگر زندگی ہوتی تو یہاں ہی کوئی سبب بن جاتا۔ وہ رب جب بلا دیا بھیجے تو آدمی کو جانا تو ہوتا ہے نا پتر۔“
لیکن پتا نہیں کیوں وہ بابا کی طرح راضی و شاکر کیوں نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جا کر غبر آپا کے شوہر سے لڑے ان کی ساس سے کہے کہ صرف ان کی بے جا ضد کی وجہ سے غبر آپا مری ہیں۔
صرف ان کی وجہ سے۔

لیکن وہ دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ بابا اسے سمجھاتے۔
”پاگل ہو گیا ہے پتر ایسی باتیں مت کر۔ زندگی کا ایک لمحہ بھی گھٹایا یا بڑھایا نہیں جاسکتا۔ ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے پتر۔“ اور وہ بہت دل گرفتہ اور دل شکستہ ہو کر واپس آ گیا تھا۔
لیکن یہاں آ کر بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔
صبح صادق اور محسن وقار اسے بہت زیادہ کمپنی دے رہے تھے۔ اس وقت بھی دونوں اس کے پاس بیٹھے تھے۔

”یار سکندر اپنے آپ کو سنبھال اور سنجیدگی سے پڑھائی شروع کر دے۔ میڈم کا تجھے پتا ہے۔ ایک نمبر بھی کم ہوا تو سبکی لگ جائے گی۔ وہ کسی کی نہیں سنتی ہیں۔“
”ہاں یار۔“

صبح صادق نے بھی محسن کی تائید کی ”اس کی دوستی بھی کسی کام نہیں آئے گی یار میڈم کی بیٹی بھی اصولوں کے معاملے میں میڈم سے کم نہیں ہیں بلکہ دو ہاتھ آگے ہی ہیں۔“



”ہاں یار بڑی چیز ہے وہ بھی۔“ محسن نے بتایا۔
”کل کہہ رہی تھی تم اگر میرے قریب آئے ہو کہ ماما سے تمہاری سفارش کروں گی تو سوری تمہیں مایوسی ہوگی۔“

”چھا تو تم بات بھی کر چکے ہو۔“ صبح صادق اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”نہیں یار یونی بات کی تھی کہ تیاری صبح نہیں ہو رہی ہے۔“

”اور اس نے پر گن لیے؟“

”ہاں بڑی تیز ہے۔“

”تو پھر بچ کر رہنا کہیں مارے ہی نہ جاؤ۔“

”مارا ہی تو گیا ہوں یار۔“

”کیا! صبح صادق اپنی جگہ سے اچھلا۔“

”ہاں یار۔“

محسن نے بے بسی سے کہا ”ایسا لگتا ہے کہ اب قدم یہاں ہی ٹھہر جائیں گے۔“

”ابھی تو زندگی پڑی ہے میری جان۔ کہاں کہاں ٹھہرو گے؟“

”نہیں یار۔ لگتا ہے یہاں ہی ٹھہر گیا ہوں۔“

”اللہ بھلی کرے گا۔ لڑکی بہر حال بری نہیں ہے۔“ صبح صادق نے دعادی اور خاموش بیٹھے سکندر کی طرف دیکھا۔

”یار تم نے ابھی تک بتایا ہی نہیں کہ چاچا کا قتل کیسے ہوا۔ کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔“

”چاچا تو بہت مسکین آدمی تھے یار۔ انہوں نے کسی سے کیا جھگڑا کرنا تھا۔ وہ تو بیچ بچاؤ کراتے ہوئے ارباز خان کے آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ تم تو ان سے مل چکے ہو کس قدر محبت کرنے والے آدمی تھے۔“

”ہاں یار مجھے ان کی باتیں اکثر یاد آتی ہیں۔“ محسن نے افسردگی سے کہا۔

”کچھ لوگ دنیا میں صرف محبت کرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ چاچا بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ لیکن جب سے چاچی مری گئیں۔ ان کے اندر زندگی کی امنگ جیسے ختم ہو گئی تھی۔
گری گری باتیں کرتے تھے۔

ٹوٹی ہوئی سی۔

چاچی کو بہت یاد کرتے تھے۔

مجھے کہتے تھے میں نے تیری چاچی پر کبھی توجہ نہیں دی۔

عورت کا حق ہوتا ہے کہ مرد اسے سراہے اس کی تعریف کرے۔
اسے محبت کی نظر سے دیکھے۔
اس کی تھکاوٹوں کو بانٹے۔

اس کی تعریف کا ایک بول عورت کی ساری تھکاوٹیں ختم کر دیتا ہے لیکن اگر مرد اسے نہ سراہے تو وہ اندر سے مرجھا جاتی ہے۔ پیلی پڑ جاتی ہے۔ باہر سے ہنستی بولتی اور زندگی کے سارے کام کرتی ہے لیکن اندر سے تھک جاتی ہے۔

میں نے بھی تیری چاچی کو نہیں سراہا تھا۔
اس لیے وہ اندر سے مرجھا گئی تھی۔
پیلی ہو گئی تھی۔

سکندر نے گاؤں سے آنے کے بعد پہلی بار چاچا کے متعلق اتنی باتیں کی تھیں۔

”تیرے چاچا بڑے پتے کی باتیں کرتے تھے یار۔“ محسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ تیری کزن کا کیا حال ہے؟ وہ تو بہت تنہا ہو گئی ہوگی۔“
”ہاں۔ بابا اسے گھر ہی لے آئے ہیں۔ میں تو صحیح طرح سے اسے ٹکلی بھی نہیں دے سکا۔ خبر آپا کا دکھ اچانک ہی آن پڑا۔“

”یار ڈاکٹر لوگ جو گاؤں میں نہیں جاتے تو بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ آخر ان کو بھی تو ڈاکٹر زکی ضرورت ہوتی ہے تا میرا کزن ہے۔ ہاؤس جاب کے فوراً بعد اسے جاب مل گئی۔ گورنمنٹ کی جاب تھی۔ شیخوپورہ سے بہت آگے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا وہاں لیکن ہفتے میں دو دن جاتا تھا۔ سیشنل کر رکھا تھا اس نے اور پھر وہاں جونرسیں اور ڈسپنسرو وغیرہ تھے انہوں نے اپنی اجارہ داری بنا رکھی تھی وہ خود پسند نہیں کرتے تھے کہ وہاں کوئی ڈاکٹر رہے۔“ صحیح صادق نے تفصیل سے بتایا ”حالانکہ میرا کزن جب ابتدا میں گیا تو وہ خاصا مخلص تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ دو سال تک گاؤں میں جاب کرے گا لیکن انہوں نے تو وہاں اسے ٹکنے ہی نہ دیا۔ میں ایک دو بار گیا تھا وہاں اس کے ساتھ۔ اس ڈسپنسر اور نرس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ وہاں نہ آیا کرے۔“

”ڈاکٹر صاحب آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ روز کی خواری۔ اول تو یہاں کوئی مریض آتا ہی نہیں ہے۔ کوئی آیا بھی تو دیکھ لیں گے۔“

”ہاں یار ہمارے ہاں یہ بڑی خرابی ہے۔ کوئی مخلص ہو بھی تو رکاوٹیں کھڑی کرنے والے اتنے ہوتے ہیں کہ بندہ بہت ہار جاتا ہے۔ چاہے کتنا بھی آئیڈل سک کیوں نہ ہو۔ میرے چچا بھی کبھی بڑے آئیڈل سک ہوتے تھے۔ کینر پھوپھو سے انہوں نے جو بے وفائی کی وہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن انہیں پاکستان سے بہت

محبت تھی۔ بڑی باتیں کرتے تھے۔ کرپشن کے خلاف، رشوت کے خلاف لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ سیدھے راستے پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ یار تم چلوٹاں کسی دن میرے ساتھ چچا سے ملو اؤں گا۔ بہت خوش مزاج آدمی ہیں۔ تم سے مل کر خوش ہوں گے۔ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں، تین سال سے زیادہ ہونے والے ہیں ہمیں اکٹھا رہتے ہوئے اور میں تمہیں ایک بار بھی چچا کے گھر لے کر نہیں گیا۔“

”ہاں خیر تمہاری بے وقوفی پر تو ہمیں بھی کوئی شک نہیں۔ کیوں سکندر یار۔“ صحیح صادق نے شرارت سے محسن کی طرف دیکھتے ہوئے سکندر سے پوچھا۔
”ہاں۔“ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہے تھے تم؟“

”تم کہاں کھو گئے تھے؟“

”میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے گاؤں میں ہی پریکٹس کروں گا۔ تمہیں پتا ہے کہ ہمارے گاؤں میں ایک بھی ڈاکٹر نہیں ہے۔ بس ایک حکیم ہے۔ کافی سیانا ہے لیکن یار ڈاکٹر کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔“

”وش یو گڈ لک مائی فرینڈ۔“ محسن نے اس کا کندھا تھپکا ”لیکن سب ڈاکٹروں کی طرح ڈاکٹر بن کر اپنا عہد بھول نہ جانا۔“

”نہیں انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ بابا کی تو ہمیشہ سے ہی یہی خواہش تھی۔ بھانٹا بھی چاہتے تھے کہ میں گاؤں میں ہی کلینک بناؤں بلکہ انہوں نے تو وہ جگہ بھی سوچ رکھی ہے جہاں میرا کلینک بننا ہے اور میں نے خبر آپا کے مرنے کے بعد خود سے یہ عہد کیا تھا کہ میں گاؤں میں ہی رہوں گا۔“

”اور جناب ہم بھی عہد کرتے ہیں کہ کبھی کبھار تمہارے کلینک میں آیا کریں گے اور تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں کے مریضوں کا مفت علاج کیا کریں گے۔“ محسن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”تم کیا اپنے گاؤں میں کلینک بناؤ گے؟“ سکندر نے پوچھا۔

”نہیں یار میرے گاؤں والوں کو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم نے دیکھا تو تھا کہ ہمارا گاؤں شہر کا ہی ایک حصہ ہے۔ پندرہ منٹ کا تو راستہ ہے بلکہ لوگ پیدل بھی شہر جاتے ہیں۔ میں تو یہیں لاہور میں ہی جاب کروں گا۔ بڑے اسپتالوں میں تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ بہت مریض آتے ہیں۔ وہاں کیا کھیاں ماروں گا۔ ٹھہراؤ آجائے گا۔ کوئی اضافہ نہیں ہوگا علم اور تجربے میں صرف کتابی علم بے کار ہے۔ یہاں سیکھنے کا موقع ملے گا۔ سو ہم تو یہیں رہیں گے۔ لاہور میں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو یا لیکن میرے گاؤں کو میری ضرورت ہے۔“ سکندر نے یقین سے کہا ”مجھے تو بہر صورت گاؤں جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے یار ہم اپنے تجربے سے تمہیں مستفید کرتے رہیں گے۔“ صبح صادق خوش دلی سے بولا
”اب اٹھو یار جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج رات کا کھانا ہم محسن کے چچا کے ہاں کھائیں گے۔“
”واہ میں نے تو ایسی کوئی دعوت نہیں دی۔“ محسن نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ابھی تو تم اپنی بے وقوفی کا اعتراف کر رہے تھے۔ عقل مند بن جاؤ میں اپنے یار کو بے وقوف نہیں
دیکھ سکتا۔ بہت دن ہو گئے گھر کا کھانا نہیں کھایا۔ اس میڈیکل کی پڑھائی نے تو موت ہی مار دی ہے۔ سوچا
تھا ایف ایس سی تک ہی محنت کرنا پڑے گی۔ آگے تو عیش ہی عیش ہوں گے۔ بھاگ بھاگ کر گاؤں آیا
کریں گے لیکن پتا چلا وہ کیا محنت تھی۔ چار کتابیں رٹ لیں۔ پڑھائی تو اب کرنا ہے۔“
”یار تم بہت پیڑ ہو۔“

محسن ہنس دیا ”میں پتا کرتا ہوں“ چچا ابھی گھر پر بھی ہیں یا نہیں بلکہ ان کو اطلاع بھی کر دیتا ہوں کہ
میرے دوست ساتھ ہیں میری چچی ان چیزوں کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔“
”کیا انہیں ہمارا جانا برا لگے گا؟“

”ارے نہیں یار وہ تو بہت سوشل ہیں خوش ہوں گی لیکن ذرا اپنی کیلنس وغیرہ کا بہت دھیان رکھتی
ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں فون کر کے آتا ہوں۔“
”محسن رہنے دو پلیر پھر کسی دن چلے جائیں گے۔“ سکندر کا جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا لیکن صبح
صادق اور محسن نے اسے زبردستی تیار کر ہی لیا۔

”ذرا پہنچ ہو جائے گا تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔“ صبح صادق نے اسے زبردستی ہاتھ روم کی طرف
دھکیل دیا۔



نیو گارڈن ٹاؤن میں محسن کے چچا کا بہت خوبصورت اور شاندار گھر تھا۔ وسیع ڈرائنگ روم میں چاروں
طرف دیکھتے ہوئے صبح صادق نے سرگوشی کی۔

”یار تمہارے چچا کا ذوق بہت اعلیٰ ہے یا چچی کا؟“

”چچا کا..... یہ گھر اور اس گھر کی سجاوٹ میں چچا کا ذوق کام کر رہا ہے۔ چچی کی دلچسپی اتنی ہی ہے کہ
انہوں نے گھر بننے کے بعد ایک اچھے انٹیریئر ڈیکوریٹر کو بلوایا۔ یہ جو پینٹنگ دیکھ رہے ہوتا یہ چچا نے خود
بنائی ہے حالانکہ ان کا شعبہ ان کے ذوق کے لطیف سے میل نہیں کھاتا۔ اس قدر خشک کام اور اس پر یہ
ذوق۔“ محسن نے تفصیل سے بتایا۔

”چچا بہت اچھی شاعری بھی لکھتے ہیں۔ میں نے ان کی ایک دو نظمیں پڑھی ہیں بلکہ سنی ہیں۔ دل کو
چھوتی ہیں۔“

”کمال ہے!“ صادق کو بھر حیرت ہوئی۔

”پھر تمہارے چچا نے کینئر بچپو سے بے وفائی کیوں کی۔ سنا ہے ایسے لوگ تو۔ میرا مطلب ہے یہ
ذوق رکھنے والے لوگ بڑے حساس ہوتے ہیں اور اپنے وعدوں پر جان دیتے ہیں۔ نازک احساس
ہوتے ہیں ان کے اس لیے دوسروں کے احساسات کی نزاکتوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا جن کے متعلق ہم پڑ یقین ہوتے ہیں وہ ہمیں سچ
منجھدار میں چھوڑ دیتے ہیں اور جن کے لیے ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا وہ ہمارے لیے جان سے گزر جاتے
ہیں۔ کبھی کبھی آدمی کہیں پھنس جاتا ہے۔ الجھ جاتا ہے اب کبھی کبھی میں بھی سوچتا ہوں شاید چچا بھی کہیں
الجھ ہی گئے تھے۔ درندہ ایسے تو نہیں ہیں۔“

سکندر خاموشی سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔

بہت نفاس سے ہر چیز اپنے مقام پر مناسب لگ رہی تھی۔ بڑے لوگوں کے ڈرائنگ روم کی طرح
کسی چیز کی افراط نہ تھی۔

ڈیکوریشن پیسز بہت قیمتی اور نفیس تھے۔

شیشے کی دیوار سے باہر رات کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

شاخوں کے سروں پر لہلہاتے گلاب۔

اور پانی اچھالتا فوارہ۔

سب بہت دلکش لگ رہے تھے۔

واقعی کسی باذوق نے ہی اسے ڈیزائن کیا تھا۔

ابھی وہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ محسن کے چچا آگئے اور محسن کے چچا سے مل کر ان سے
باتیں کر کے انہیں بہت لطف آیا۔ وہ بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے اور ان کا مطالعہ بے حساب تھا۔
ہر موضوع پر بے شکانہ بولتے تھے۔ سکندر ان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ صبح صادق کے اصرار پر انہوں نے
اپنی دو تین نظمیں بھی سنائی تھیں۔ بہت خوبصورتی تھی ان نظموں میں۔
بڑا گداز لہجہ تھا۔

کچھ کھودینے کا احساس۔

کسی اندرونی دکھ کی جھلک ان تینوں نظموں میں مل رہی تھی۔ خاص طور پر ان کی نظم "MYSWEET
MAID" سے بہت اچھی لگی تھی اور اس نے دل ہی دل میں کئی بار اس کی لائنوں کو ہرایا تھا۔

محسن کے چچا انہیں بالکل اجنبی نہیں لگے۔ جیسے وہ انہیں برسوں سے جانتے ہوں۔ انہوں نے اپنی
گفتگو اور اپنے رویے سے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ پہلی بار ان سے

ملے ہیں اور نہ ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے عمر میں بڑے ہیں۔ بالکل دوستوں کی طرح بی بیو کر رہے تھے۔

ان کے لہجے میں ان کے عہدے کا غور نہیں جھلکتا تھا۔

”میں نے کتنی بار محسن سے کہا ہے کہ یار کبھی اپنے دوستوں کو لاؤ۔ کبھی ویک اینڈ پر آ جایا کرو۔ چینیج آ جاتا ہے۔ ہاسٹل میں رہ کر بندہ ترسا ہوتا ہے گھر بلو فضا کو۔ ادب جاتا ہے ایک ہی سے کھانے کو کھا کھا کر۔“

”ہاں جی۔“ صبح صادق اپنی عادت کے مطابق فوراً ہی بے تکلف ہو گیا تھا ”یہ محسن کا بچہ ہے ہی پورا بے وقوف۔ خود نہیں آتا تھا تو کم از کم ہمیں ہی بھیج دیا کرتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بھئی میں ترس جاتا ہوں گھر بلو فضا کو۔ یہ آئے نہ آئے میرا تو آنا پکا۔ میں تو ہر ویک اینڈ پر آ جایا کروں گا۔“

”ضرور کیوں نہیں۔“ انہوں نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”مجھے تو دکھ ہو رہا ہے کہ اتنا عرصہ آپ سے ملاقات کیوں نہ ہوئی۔ اس محسن کے بچے نے اتنے سوئٹ چچا کو ہم سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اور آپ سے کبھی گاؤں میں بھی ملاقات نہ ہو سکی۔“

”گاؤں میں۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔

”جی۔“ محسن کے بجائے صبح صادق نے ہی جواب دیا ”ہم ایک ہی گاؤں کے ہیں، میں ملک فضل داد کا بیٹا ہوں۔“

”اچھا اچھا، فضل داد تو میرا جماعتی تھا۔ کیسا ہے وہ اب۔ کیا کر رہا ہے؟“

”ابا آڑھت کا کام کرتے ہیں۔“

”ہاں میٹرک کے بعد اس نے چھوڑ دیا تھا۔ بڑا جولی ہوتا تھا۔ بڑے لطیف یاد دہوتے تھے اسے۔“

”یہ بھی پورا بھانڈ ہے۔“ محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یار، کچھ نہ کچھ تو ورثے میں ملنا ہی تھا۔“

”بھئی بہت خوشی ہوئی ہے تم لوگوں سے مل کر۔“ محسن کے چچا نے ایک بار پھر کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ایک ضروری فون کرنا تھا جس کے لیے انہوں نے معذرت چاہی ”تم لوگ گپ لگاؤ چائے پیو اور میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ محسن یار اپنے دوستوں کو بورت ہونے دینا۔“

”نہیں چچا، آپ بے فکر رہیں۔ یہ بالکل بور نہیں ہوں گے۔“

”یار تمہارے چچا بالکل ارسٹو کریٹ نہیں لگتے۔“ ان کے باہر جاتے ہی صبح صادق نے تبصرہ کیا۔

”تم یہ تبصرہ ہاسٹل جانے تک محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔“ محسن نے اسے گھڑا۔

”نہیں یار میرے پیٹ میں مروڑا ٹھہر رہی ہے۔ تم نے تو اپنے چچا کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے میرے ذہن میں جو خاکہ بنا تھا وہ اس کی شخصیت سے بالکل مختلف تھا۔“

”تمہاری اپنی سمجھ کا فتور ہے۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”یار یہ ارسٹو کریٹ تو کلف لگے کپڑوں کی طرح اکڑے ہوئے ہوتے ہیں جب کہ تمہارے چچا کے

لباس سے تو اپنے گاؤں کی مٹی کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ خوشبو ان کے پورے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔“

”چچا بھی سچی کلف لگے کپڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ چچا کو سمجھنا بہت مشکل ہے لیکن اس کے

دوہ ایک خوش اخلاق اور ملنسار آدمی ہیں۔ تمہیں بہر حال ان سے مل کر کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔“

محسن نے صبح صادق کی بات کا جواب دیا اور سکندر کی طرف متوجہ ہو گیا جو ایک بار پھر ڈرائنگ روم کا

جائزہ لینے لگا تھا۔

کھانے پر گھر کے دوسرے افراد سے بھی ملاقات ہوئی۔ محسن کے چچا کے دو بیٹے تھے۔ تیرہ اور بارہ

سال کے، ایک بیٹی تھی سات آٹھ سال کی۔ تینوں بچے بہت پیارے اور سنبھلے ہوئے تھے۔ سکندر نے دل

ہی دل میں انہیں سراہا۔

بچوں کی تربیت میں ماں کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔

اور یقیناً ان بچوں کی تربیت میں محسن کی چچی کا بہت ہاتھ تھا۔

اگر ان کی جگہ کینز پھوپھو ہوتیں تو شاید بچے اتنے ویل میٹرڈ نہ ہوتے۔

سکندر نے محسن کی چچی کی طرف دیکھا جو ملازم کو آواز دے رہی تھیں۔

”بھئی ڈولی کہاں ہے؟ اس کو بلاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئیں ”یہ ڈولی

بھی بہت لا پرواہ ہے۔ میری بھانجی ہے، انہوں نے تعارف کروایا ”اس کے والدین امریکا میں ہیں۔

ایجوکیشن کے لیے میرے پاس آئی ہوئی ہے۔ کم آن ڈولی جان!“ انہوں نے میٹرھیوں سے اترتی ڈولی کو

آواز دی۔

سکندر کی نگاہ غیر ارادی طور پر اس کی طرف اٹھ گئی۔

حسن کیا ہوتا ہے۔

خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔

دلکشی اور کشش کیا ہے۔

اس سب کا جواب ڈولی کے وجود میں موجود تھا۔

بے حد سفید رنگت۔

یوں جیسے دودھ میں گلابیاں گھول دی ہوں۔ لمبی صراحی دار گردن اور باریک سی گولڈن چینیں۔

دلکش ہونٹ۔

لانچی چمکدار روشن آنکھیں۔

دوسرے لمحے سکندر نے نگاہیں جھکا لیں۔

”یہ سکندر اور صبح صادق ہیں! اپنے محسن کے دوست اس کے ساتھ ہی میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں۔“
چچی نے تعارف کروایا۔

ڈولی نے ایک ادا سے سر کو جھکایا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔ چچی کھانے کے دوران مسلسل باتیں کرتی رہیں۔
سکندر اور صبح صادق سے باری باری ان کے خاندان ان کے بہن بھائیوں کے متعلق پوچھتی رہیں۔
البتہ چچا خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ بقول صبح صادق کے کلف لگ چکا تھا۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہ
وہی کچھ دیر پہلے والے چچا ہیں جو انہیں اپنی نظمیں سنارہے تھے۔ کرپشن پر سیاست پر محبت پر ہر موضوع پر
بات کر رہے تھے۔

”حیات۔“ انہوں نے ملازم کو پکارا تو ان کے لہجے کی کرختگی پر سکندر کو بے حد حیرت ہوئی۔ اتنی نرمی
سے بات کرنے والے شخص کے لہجے میں اتنی کرختگی بھی ہو سکتی ہے۔
ڈولی کھانے کے دوران مسلسل چپکتی رہی۔

اس کی بات چیت میں اس کے اٹھنے بیٹھنے میں ہر بات میں ایک خاص اداسی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی
نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔



کھانے کے بعد چچا اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے لیکن چچی اور ڈولی کافی دیر تک بیٹھیں ان سے گپ
لگاتی رہی تھیں۔ ڈولی اگرچہ قہر ڈالیر کی طالبہ تھی لیکن اس میں ہلاکی خود اعتمادی تھی۔ کسی بھی بات کو پورے
یقین سے رد کر دیتی تھی۔

محسن اس کی اس بات سے بہت چڑا جاتا تھا۔

”ڈولی میں اسی لیے تم سے کوئی بحث نہیں کرتا کہ تم کوئی بات تسلیم نہیں کرتی ہو۔“

محسن نے اس کے مسلسل اس بات پر ڈٹے رہنے پر کہ ویسٹ لینڈ ورڈز درتھ کی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ
کی نہیں چڑ کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”لٹرچر کی طالب علم میں ہوں یا تم؟“

وہ مسلسل اسے چڑا رہی تھی۔

”لٹرچر کی طالب علم ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم نے لٹرچر پڑھ بھی رکھا ہے۔“

صبح صادق اور سکندر دلچسپی سے دونوں کی بحث سن رہے تھے۔ محسن کو لٹرچر سے بہت دلچسپی تھی۔
اگرچہ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا لیکن جب بھی اسے موقع ملتا وہ کچھ نہ کچھ مطالعہ کرتا رہتا۔ خصوصاً انگلش
لٹرچر سے اسے خصوصی لگاؤ تھا۔

”سکندر؟“ ڈولی نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا ”ذرا بتاؤ تو ویسٹ لینڈ“ کس کی ہے؟“

”ایس۔ ایس۔“ سکندر کو بھی محسن کی وجہ سے لٹرچر سے لگاؤ ہو گیا تھا۔

”اچھا آپ کیسے ہیں تو مان لیتی ہوں۔“

”بہت دیر ہو گئی ہے یا زاب چلنا چاہیے۔“ صبح صادق بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

پھر وہ چچی سے اجازت لے کر آ گئے۔

”زہر لگتی ہے یہ لڑکی مجھے۔ غلط باتوں پر اڑ جاتی ہے اور کسی صورت اسے تسلیم نہیں کرتی۔“ راستے میں
محسن نے کہا۔

”یاز یہ بھی ایک ادا ہوتی ہے۔ کمال ہے اتنی لڑکیوں سے دوستی ہے تمہاری اور تم ابھی تک ان کی

اداؤں سے ناواقف ہو۔“

”اداؤں کچھ نہیں، معلومات ہی صفر ہیں اس کی۔ سارا دن تو ویڈیو لگا کر بیٹھی رہتی ہے۔ فلموں کے

متعلق پوچھ لو تو سب پتا ہوگا لیکن شواہیہ کرتی ہے جیسے دنیا کے ہر علم کی استاد ہو۔“

”ویسے ایک بات ہے یا را ہے بہت خوبصورت۔ تمہاری میڈم کی بیٹی سے زیادہ خوبصورت ہے۔

سوچ لے۔“

”خدا نہ کرے کہ میں کبھی چچی کے خاندان کی کسی لڑکی کو اپنی شریک زندگی بناؤں۔“

”وائے؟“

سکندر نے پوچھا ”تمہاری چچی تو بہت اچھی ہیں۔ بہت ایجوکیٹڈ اور خوش اخلاق ہیں۔“

”ہاں یاز یہ تو ہے۔ بس ویسے ہی۔“ محسن نے بات بدل دی۔

”مجھے ایسی تیز طرار لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ پتا نہیں کیوں مصنوعی لگتی ہیں اور پھر ابھی سے کیا سوچنا

ابھی تو بہت وقت بڑا ہے۔ پہلے ایم بی بی ایس کی کٹھن منزل تو طے کر لیں۔“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ کبھی کبھی تو میں کتابوں کے انبار دیکھ کر گھبرا جاتا ہوں۔“ صبح صادق نے کہا ”جی

چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھا کر گاؤں چلا جاؤں اور مزے کی نیند سوؤں۔ اس پڑھائی نے تو نیند پر حرام

کر دی ہیں۔“

صبح صادق کی بات پر محسن نے اس کا کندھا تھپکا۔

”اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں میری جان! اس وقت نیند کے تصور کے علاوہ کوئی اور

تصور خوبصورت نہیں ہو سکتا۔ جا۔ وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی کا ہی کیوں نہ ہو۔ میری آنکھیں خود نیند سے

بھری جا رہی ہیں۔ پچھلی کئی راتوں سے ہم دو بجے سو رہے ہیں۔ لہذا اگلے دس منٹ میں ہم ہاسٹل پہنچ

جائیں گے اور ہاسٹل پہنچتے ہی اپنے بستر پر دھڑام سے گر جائیں گے اور خبردار اے صبح صادق کے وقت

جلوہ افروز ہونے والے تو نے سونے سے پہلے موسیقی سننے کی کوشش کی تو تیرا وہ ۱۹۵۰ء کا ٹیپ ریکارڈر کھڑکی سے باہر ہوگا۔

محسن نے گاڑی ہاسٹل کے قریب پارکنگ میں کھڑی کرتے ہوئے دھمکی دی اور گاڑی لاک کر کے وہ تینوں جھوٹے جھانٹے ڈاکٹر ز ہاسٹل کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔



”مانی۔ یار تم ادھر ہو میں سمجھ رہا تھا۔ گاؤں چلے گئے ہو۔“ پروفیسر عادل نے مسرور کے کمرے میں سلطان کو بیٹھ دیکھ کر کہا۔ مسرور جو سلطان کے پاس ہی بیٹھا تھا ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو یار۔ یہ فارملینز رہنے دیا کرو۔ کتنی بار تمہیں بتایا ہے کہ تم میرے اپنے بھائی جیسے ہو۔“

”ٹھیک یوسر!“ مسرور کے ہونٹوں پر ایک ممنونیت بھری مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے بٹھادیا اور خود بھی سانسے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

”ہاں تو مانی یار۔“ وہ پھر سلطان کی طرف متوجہ ہو گئے ”تم اپنے کمرے میں نظر نہیں آئے تو میں سمجھا کہ بھاگ گئے ہو۔“

”آپ کی اجازت کے بغیر کیسے جاسکتا تھا عادل بھائی۔“

”ابھی کچھ دن رہو میرے پاس۔ یار مجھے تو اپنوں کے پاس رہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تم یہاں ہو تو بڑی مضبوطی اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے میں اکیلا نہیں ہوں۔“

”میرا خود بھی جانے کو دل نہیں چاہتا۔ مسرور بھائی سے بات کر کے مزا آیا۔ مدت بعد اتنے دن آپ کے ساتھ رہا ہوں تو بہت اچھا لگ رہا ہے لیکن وہاں گاؤں میں بھی بابا جان اکیلے ہوں گے۔ ہزار مسائل ہوتے ہیں زمینوں کے۔ میں تو صرف کامی کو دیکھنے آیا تھا۔“

”ہاں! یا یار مانی، وہ میں نے چاچا جی سے تو بات کی تھی۔ چوہدری اللہ دتا ہیں نا، ان لوگوں کو زمین سے بے دخل مت کرنا۔ دادا کے زمانے سے ہیں۔ پرانے نمک خوار ہیں۔“

”عادل بھائی، آپ تو شہر آکر بیٹھ گئے ہیں۔“ سلطان کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں ”آپ کو کیا خبر زمینوں کے کیا مسائل ہوتے ہیں اور کس کس طرح ان سے نمٹنا پڑتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بھائی لیکن چھوٹی موٹی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرو۔ آج کل ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں پسینے کی جگہ خون بہانے والے۔“

”وہ اس کا بیٹا دراصل سرچڑھ رہا تھا۔ پڑھ لکھ گیا ہے تا کچھ بہر حال بابا جان نے اسے بلا کر سمجھا دیا ہے۔“

”نرم رویہ رکھا کرو یار۔ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔“ انہوں نے پھر سمجھایا تو سلطان نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے بھائی صاحب لیکن پتا نہیں کیوں مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ آپ لگایا کریں نا کبھی بکھار چکر

کبھی آکر دیکھیں۔“

”تم سنبھالو اپنی زمینیں، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے اپنے حال میں مست رہنے دو۔“

”تو مجھے اجازت ہے میں آج شام کسی بھی وقت گاؤں کے لیے نکل جاؤں۔“

”ٹھیک ہے چلے جانا اور دیکھو اگر ماں جی کامی کو دیکھنے آنا چاہیں تو نشی چاچا سے کہنا یا پھر تم مجھے فون کر دینا۔ میں خود ماں جی کو آکر لے جاؤں گا۔“

”اب کیہ اسے وہ آپ ہاسپٹل گئے تھے؟“ مسرور نے پوچھا ”ہاں میں کالج سے سیدھا ہاسپٹل ہی گیا تھا۔ کافی امپروو کر رہا ہے۔ چھ سات دفعہ ماں جی کو بلایا اور میرے پیچھے سے اچک اچک کر دیکھتا رہا کہ ماں جی پیچھے آ رہی ہیں کہ نہیں۔ بڑے دنوں بعد اس نے میرے ہاتھوں پر پیار کیا اور بھائی کہا۔“ پروفیسر عادل کی آواز بھینگ گئی ”میں نے بڑی زیادتی کی اس کی خبر نہ رکھ کر۔ اس کا علاج پہلے ہی ہو جاتا تو وہ اتنی تکلیف نہ اٹھاتا۔ نہ جانے وہ ڈاکٹر کیسا تھا جو کہتا تھا کوئی علاج نہیں ہے۔“

”چھوٹے شہروں میں تو ایسے ہی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ نہ تو تجربہ ہوتا ہے اور نہ اتنی سمجھ بوجھ۔ جانے کیسے ڈگری لے لیتے ہیں۔“ سلطان نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلے جانا یار۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ پروفیسر عادل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھادیا ”اور کبھی کبھی آتے رہا کرو میرے پاس بہت خوش ہوا ہوں میں۔“

”جی بھائی صاحب میں آتا رہا کروں گا۔ اب مسرور سے میری دوستی ہو گئی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے، چلو میرے لیے نہ سہی مسرور کے لیے تو آؤ گے۔“ پروفیسر عادل مسکرائے

”ویسے اس دوستی کا ہو جانا حیران کن ہے میرے لیے۔ تمہارے اور اس کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔“

”کبھی کبھی کوئی ایک قدر مشترک بھی دوستی کا باعث بن جاتی ہے۔“ سلطان نے کہا۔

”واہ بڑی پتے کی بات کی ہے تم نے۔“ پروفیسر عادل نے بے اختیار سراہا۔

تب ہی خدا بخش نے آکرفون کی اطلاع دی۔

”کس کا ہے بھائی؟“ پروفیسر عادل نے سستی سے پوچھا۔

”بھتیجی صاحب ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ”میں ابھی فون سن کر آتا ہوں، تم جانا نہیں میرے آنے تک اور خدا

بخش اچھی سی جائے پلا دو۔“

”یار کبھی آؤ ذریعے پر تمہیں اپنے گاؤں کی سیر کرائیں گے۔“ سلطان نے خاموش بیٹھے مسرور کو دیکھ کر کہا۔

”ہاں کوشش کروں گا۔“ مسرور چونکا۔

”پتا نہیں کیا بات ہے۔ تمہارے اندر کوئی ایسی بات ہے کہ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ خود بخود دل چاہا

کہ تمہیں اپنا دوست کہوں۔ تمہاری بے تکلفی اچھی لگی۔ تمہارے بات کرنے کا انداز اچھا لگا۔ تم اپنے لگے۔ وہاں گاؤں میں میرے دوست ہیں لیکن وہ سب پیسے کے یار ہیں۔ میں رات کو دن کوں کہوں تو وہ دن کہتے ہیں۔ تم نے پہلی بار میری کسی بات سے اختلاف کیا تو شاید تمہاری یہی بات مجھے اچھی لگی۔ شاید کسی خاص لمحے کی بات ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہاں گاؤں میں کوئی ایسی بات کرتا۔ میری بات کو رد کرتا تو مجھے غصہ آجاتا۔ میرے دوست بنو گے؟ شاید میں تمہارے جیسا نہیں ہوں۔ نہ ہی عادل بھائی جیسا ہوں نہیں دوستوں کے ساتھ دوستیاں بھانا جانتا ہوں۔“

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو سرور نے اسے تھام لیا۔

”میرے خیال میں دوستی کے لیے صرف ایک دوسرے کے لیے دل میں خلوص کا ہونا ہی ایک مضبوط بنیاد ہو سکتی ہے۔“

”میں آتا رہوں گا اب صرف تمہارے لیے۔“ سلطان نے اس کے ہاتھ کو گرم جوشی سے دبایا۔

”تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔“

”ہاں۔“ سرور نے اعتراف کیا۔

سلطان کو پہلی نظر دیکھ کر اس نے جو رائے قائم کی تھی وہ اس وقت سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ اس روز اسپتال میں وہ اسے ایک مغرور جاگیردار لگا تھا جو اپنے سوا سب کو کمتر سمجھتا ہے۔ شاید وہ بائے پنجرا یا ہو۔ بہر حال اس کے دوستی کے لیے بڑے ہوئے ہاتھ کو اس نے اتنے ہی خلوص سے تھام لیا تھا۔

پروفیسر عادل فون کر کے واپس آئے تو سرور نے پوچھا۔

”کیا جتنی صاحب آ رہے ہیں سر؟“

”نہیں یار وہ سب اس وقت تو نہیں آ رہے شاید شام کو چکر لگے۔ دراصل اس وقت انہوں نے کامی کے لیے فون کیا تھا۔ میں نے انہیں کسی ادارے کا پتا کرنے کے لیے کہا تھا۔ جہاں کامی کو کچھ عرصہ رکھا جاتا۔ میں اس کے دوروں کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ ماں جی کے لیے بہت تکلیف دہ تھا وہ سب دیکھنا اور برداشت کرتا۔ میرا خیال تھا کہ اگر یہ دورے اسی طرح اتنی شدت سے پڑتے رہتے ہیں تو کامی کو کسی ادارے میں کچھ عرصے کے لیے داخل کروادیتے ہیں۔ اسپتال میں کب تک رکھا جاسکتا ہے۔“

”تو پھر کیا بنا؟“ سلطان نے پوچھا۔ بابا جان کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ ماں جی بہت اپ سیٹ رہنے لگی تھیں۔“

”ہاں چچا کے کہنے پر ہی مجھے خیال آیا تھا۔“ پروفیسر عادل سرور کے بیڑ پر بیٹھ گئے۔ ”لیکن اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ میں نے ایک دو ادارے دیکھے ہیں۔ بہت برا حال ہے وہاں کا۔ بہت ہی خراب سلوک کیا جاتا ہے ان بچوں کے ساتھ۔ جب کسی نے آنا ہوتا ہے تو بچوں کو تیار کر دیا جاتا ہے ورنہ عام

حالات میں تو صبح خوراک بھی نہیں دی جاتی۔ بہت دکھ ہوا یہ دیکھ کر کہ کھیاں بجنھتا رہی ہیں۔ کپڑے گندے ہیں۔ مائی گاڈ! مختصر حضرات اتنا کچھ دیتے ہیں ان اداروں کو۔ میں جن اداروں میں گیا ہوں وہاں کامی کی عمر کا کوئی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ سال تک کی عمر کے بچے تھے۔“

”آپ نے اچھا فیصلہ کیا۔ کامی کو گھر ہی رہنا چاہیے۔ ماں جی کے لیے بہت مشکل ہوگا۔“

سرور نے تائید کی۔

”ممکن ہے کچھ اچھے ادارے بھی ہوں لیکن یہاں بہر حال مجھے کوئی ایسا ادارہ نہیں ملا۔ جتنی صاحب نے ابھی جس ادارے کا ذکر کیا ہے ممکن ہے وہ کچھ بہتر ہو لیکن میں فی الحال اب اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

”عادل بھائی اب چلوں پھر بہت دیر ہو جائے گی۔“ سلطان کھڑا ہو گیا۔

”چائے نہیں پو گے؟“

”میں چائے کا اتنا شائق نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھار کچھ لیتا ہوں۔“

”اچھا سب کو وہاں سلام کہنا۔ ماں جی کو مل دینا اور وہاں جا کر فون کر دینا مجھے فکر ہے گی۔“

پروفیسر عادل گلے ملنے کے بعد اس کے ساتھ ہی باہر چلے وہ سرور سے گلے مل کر مڑا۔

”عادل بھائی آپ بیٹھیں۔“

”نہیں چلو گاڑی تک تمہیں چھوڑ آؤں۔“

سلطان کے ساتھ گاؤں سے ڈرائیور کے علاوہ بھی ایک باڈی گاڑ ٹائپ بندہ تھا۔ پتا نہیں کیوں پروفیسر عادل کو وہ اچھا نہیں لگا تھا۔

”بہت وفادار شخص ہے۔“ اس نے عادل سے تعارف کروایا تھا۔ ”آپ چاہیں تو اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ ہر قسم کے اسلئے کا ماہر ہے۔“

”نہیں یار۔“

پروفیسر عادل ہنس دیے تھے۔ ”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

”مگر بابا جان کا بھی یہی خیال ہے کہ آپ کے پاس ایک باڈی گاڑ ضرور ہونا چاہیے۔“

”ہمارا کون دشمن ہے بھائی۔“

”کوئی دشمن نہ ہو لیکن ڈرا باڈی گاڑ سے رعب ہوتا ہے۔ لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ ہم کون ہیں۔“

”مائی ڈائیر! میرے خیال میں دوسروں کو یہ بتانا کہ ہم کون ہیں اتنا ضروری نہیں جتنا کہ خود یہ جاننا کہ

ہم کون ہیں اور میرے خیال میں میں سمجھتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔“

”آپ کی تعلقانی باتیں مجھے سمجھ میں نہیں آسکتی۔“ سلطان نے بات ختم کر دی تھی۔

ڈرائیور نے انہیں دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور ادب سے ڈرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے



قریب ہی سلطان کا باڈی گاڑ کھڑا تھا جس نے انہیں دیکھ کر سلام کیا۔ پروفیسر عادل نے اس کے سلام کا جواب دیا اور سلطان سے ہاتھ ملایا۔
”اللہ حافظ۔ فون ضرور کروینا۔“
”جی ضرور۔“

اسے خدا حافظ کہہ کر وہ واپس آئے تو خدا بخش چائے بنا رہا تھا اور مسرور آنکھیں موندے بینک کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

”مسرور تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“
پروفیسر عادل اس کے ہانسنے صوفے پر بیٹھ گئے۔
”ہاں۔“ وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔
”کیا سوچ رہے تھے؟“

”یوں ہی سلطان صاحب کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

”تم نے دیکھا یا رجب مانی پہلے دن آیا تھا تو اس کے مزاج میں رعونت سی تھی۔ غرور جھلکتا تھا اس کے لہجے سے بڑائی کی بو آتی تھی لیکن یہاں چھ سات دن رہا تو خود بہ خود ارد گرد کے ماحول کا اثر قبول گیا۔ وہ فطرتاً اچھا انسان ہے۔ چچا جان اور چچی کے لاڈ نے اسے کچھ لگا ڈیا ہے۔ اس پر اس کے دوست وغیرہ سب فضول ہیں۔ میں ملا تھا ان سے۔ وہی اسے اٹلے سیدھے مشورے دیتے رہتے ہیں اور یہ اس کا باڈی گاڑ دیکھا تھا شکل سے ہی قاتل لگتا ہے۔ پتا نہیں کیسے کیسے لوگ اس نے اپنے گرد اکٹھے کیے ہوئے ہیں۔ بہر حال مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس نے تمہیں پسند کیا ہے دوستی کے لیے۔ اسی بہانے کبھی کبھار یہاں آئے گا تو اہل علم کی صحبت ملے گی تو کچھ تبدیلیاں ضرور ہوں گی اس کے اندر۔“

انہوں نے بات مکمل کر کے خدا بخش سے چائے کا کپ لیا ”ہاں تم بتاؤ اب کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ کامل کی وجہ سے اور پھر مانی کے آجانے سے میں بہت مصروف رہا۔ تمہیں وقت ہی نہیں دے پایا۔ خوش رہا کرو مسرور۔ گھر میں سب خیریت ہے امی ٹھیک ہیں تمہاری؟“

”امی کا خط آیا تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ کچھ سانس کی تکلیف ہے۔“

”تمہیں پہلے بھی میں نے کہا تھا کہ امی کو یہاں لے آؤ۔ یہاں کسی اسپیشلسٹ کو دکھاتے ہیں۔ وہاں گاؤں میں بھلا ٹھیک سے علاج کہاں ہوتا ہوگا۔ ایسا کرو مسرور تم صبح گاڑی لے جاؤ اور اپنی امی کو لے آؤ یہاں۔“

”جی سر۔“ مسرور نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا ”میں خود بھی سوچ رہا تھا۔“

”سوچو مت میاں۔ صبح میں مرید علی سے کہہ دوں گا۔ تم گاڑی لے جانا۔“



”تھینک یوسر میں دین سے چلا جاؤں گا۔“
”نہیں نہیں امی کو تکلیف ہوگی۔ وہ بیمار ہیں۔ مرید علی کے ساتھ تم گاڑی لے کر جاؤ گے۔“
”اور آپ کو یہاں گاڑی کی ضرورت نہیں ہوگی۔“
”یاز میں ایک دو دن ٹیکسی رکشے سے کام چلاؤں گا لیکن تم اپنی امی کے لیے گاڑی لے جاؤ بس بات ختم اور ہاں کچھ نیا کام کیا ہے تم نے تو دکھاؤ۔“
”بس وہی لینڈ اسکیپ ہی کمپلیٹ کیا تھا۔ موڈ ہی نہیں بنا۔“
”موڈ بنایا کرو میاں۔ میں تمہارے اندر بہت ٹیلنٹ دیکھتا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم ایک دن بڑے مصور بنو گے۔“

”پتا نہیں سر بہت بے ٹیلنٹ یونہی مٹی میں مل جاتے ہیں۔ کبھی معاشی مسائل اور کبھی غم جاناں، کبھی کوئی دکھ، کبھی کوئی مسئلہ۔ پتا نہیں کیسے کیسے ٹیلنٹ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔“
”لیکن میں تمہارے ٹیلنٹ کو مرنے نہیں دوں گا مسرور۔“
”ایک مسرور کو بچا لینے سے کیا فرق پڑتا ہے سر۔“

”فرق پڑے یا نہ پڑے میں اس بات کا قائل ہوں کہ جن زمینوں تک تمہاری رسائی ہے ان سے کانٹے ضرور چنواؤ تم بھی میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا مسرور۔ تم جہاں کہیں بھی ہو جن زمینوں تک تمہاری رسائی ہو ان کے کانٹے ضرور چننا۔“
”جی سر میں کوشش کروں گا۔“
”ہاں اب دکھاؤ لینڈ اسکیپ۔“

مسرور اٹھا ہی تھا کہ خدا بخش نے جوڑالی لیے باہر جا رہا تھا مڑ کر بتایا۔

”اپنے ڈاکٹر شہر یار اور ارسلان وغیرہ آ رہے ہیں۔“

”بڑے دنوں بعد آئے یہ سب۔ خدا بخش انہیں اندر ہی بھیج دو۔ بہت سلجھے ہوئے لڑکے ہیں۔ مجھے ایسے بچوں سے مل کر ان کے ساتھ باتیں کر کے بہت خوشی ہوتی ہے۔“ پروفیسر عادل خوش ہو گئے تھے۔
خدا بخش کے باہر نکلنے ہی تئیں اندر داخل ہو گئے تھے۔

”السلام علیکم سر!“

”وعلیکم السلام۔ یاز یہ اسٹوڈنٹ یونین پر پابندی کیا لگی تم لوگوں نے آنا ہی چھوڑ دیا۔“

”نہیں سر کچھ مصروفیت تھی اس لیے نہ آ سکے۔“

”ہوں۔“ پروفیسر عادل نے سر ہلایا اور شہر یار کی طرف متوجہ ہو گئے ”آپ کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب!“

”تھینک یوسر فائن۔ ہاں سر آپ آمنہ صبی کو جانتے ہیں؟“

”کون۔ کالم کجاری؟“

”جی سر وہی۔“

”ہاں ایک دفعہ شاید ملاقات ہوئی تھی ایک فنکشن میں۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ وہ تو شاید اسلام آباد میں ہوتی ہیں۔“

”سر وہ ہمارے اسپتال میں داخل ہیں۔ ان دنوں لاہور آئی تھیں۔ بیمار پڑ گئیں۔“

”کیا ہوا ان کو؟“

”کوئی ایسی خطرناک بات تو نہیں، معمولی سا برو نکائش ہے۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں۔ میں کل شام ان کے روم میں تھا جب ارسلان آیا تو اس نے پوچھا پرو فیسر عادل کی طرف چل رہے ہو تو پوچھنے لگیں کہ کون پرو فیسر عادل۔ ارسلان نے بتایا تو کہنے لگیں، مجھے ان کا پتہ دے دو یا فون نمبر، میں بھی ملنا چاہتی ہوں ان سے۔“ شہر یار نے تفصیل بتائی۔

”اچھا مگر مجھ سے وہ کیوں ملنا چاہ رہی ہیں۔“

پرو فیسر عادل نے پرسوج انداز میں شہر یار کو دیکھا۔

”خیر تم نے بتا دیا تھا نمبر وغیرہ۔“

”جی سر بتا دیا تھا۔“

”ہاں میاں ارسلان، کچھ نئی چیز لکھی ہو تو سناؤ۔ بہت بوریٹ محسوس ہو رہی ہے۔“

”ہاں سر ایک دو نظمیں لکھی ہیں۔“ ارسلان نے بتایا۔

”تو سناؤ نامیاں۔“

”نظم ہے۔ یہ سبھی نصیب کے کھیل ہیں۔“ ارسلان نے بتایا اور سنانے لگا۔

کسی	ہاتھ	میں	تو	گلاب	ہوں
کوئی	ہاتھ	خالی	ہوں	اس	طرح
سبھی	زخم	زخم	ہو	انگلیاں	

”واہ!“ ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ بہت اچھی چیزیں لکھنے لگے ہو۔ سناؤ خاموش مت ہو۔ تمہارے لفظ دل کو چھو رہے ہیں۔“ انہوں نے ناگئیں پھیلاتے ہوئے آنکھیں موند کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور پورے دھیان سے ارسلان کو سننے لگے۔



”پاپا!..... پاپا!“ مریم کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”رہلیکس..... رہلیکس بیٹا!“ عثمان احمد نے اس کے کندھے تھپتپائے۔

”وہ..... وہ پاپا شرجیل مرزا!.....“ وہ پھر اونچا اونچا روئے لگی۔

”کیا..... کیا ہوا!.....؟“ شہجی نے کوئی بد تمیزی کی؟“ عثمان احمد چونکے۔ ان کی پیشانی پر لکیریں سی پڑ گئی تھیں اور لہجے سے بے چینی جھلکنے لگی تھی۔

”مرزا عثمان احمد!.....“ مرزا آفندی نے زنب عثمان کے کندھے پر رکھا ”مجھے اجازت دیں، یوں بھی مجھے ذرا نرس کے ہاں جانا تھا۔“

زنب عثمان نے سر ہلایا، گویا انہیں مرزا آفندی کے جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مرزا آفندی نے ایک نظر عثمان احمد پر ڈالی جو بے چینی سے پوچھ رہے تھے۔

”مومو! بتاؤ کیا ہوا؟“

”اچھا مرزا عثمان! خدا حافظ۔“ وہ وہاں سے واپس مڑ گئیں اور زنب عثمان چند قدم آگے بڑھ آئیں۔

”وہ ماما!..... ماما، میری اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔“ مریم نے سر اٹھا کر عثمان احمد کو دیکھا ”پاپا!..... وہ..... مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔“

اور تب ہی اس کی نگاہ ساکت کھڑی زنب عثمان احمد پر پڑی تو وہ ایک دم خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ عثمان احمد نے بھی مڑ کر دیکھا۔

”زینی، تم کب آئی ہو؟“

”ابھی آئی ہوں اور یہ کیا تماشا ہو رہا ہے مومو!“ ان کے لہجے میں غصہ تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئیں ”یہ روٹا دھونا کس سلسلے میں ہے؟“

وہ آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ان کی نگاہیں عثمان احمد پر تھیں۔

”ماما!..... پلیز!.....“ مریم نے انہیں اپنی طرف متوجہ نہ پا کر آہستگی سے کہا لیکن زنب عثمان احمد بدستور عثمان احمد کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں! بتاؤ!..... یہ کیا سلسلہ ہے۔ یہ مومو نے کیا تماشا کھڑا کر رکھا ہے؟“

”شاید شہجی نے مریم سے کچھ کہا ہے، میں تو گھر پر نہیں تھا۔ ابھی آیا ہی تھا کہ مومو روئے لگی۔ شاید کوئی شادی کی بات کی ہے اس نے مومو سے۔“ عثمان احمد نے وضاحت کرتے ہوئے ماتھے کا پسینا پونچھا۔

”ہنہائیں پاپا! ماما سے اتنے خوف زدہ کیوں رہتے ہیں؟“ مریم نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا جو ابھی تک رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

”مومو!“ زنب عثمان احمد نے اب اس کی طرف رخ کیا ”یہ کیا تماشا ہے؟“

”ماما!“ مریم نے ایک دم ان کے قریب نیچے بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے ”ماما!“ آنسو ایک بار پھر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے ”ماما! میں شہجی سے شادی نہیں کروں گی۔ مجھے ابھی

پڑھنا ہے پھر..... پھر ماما، وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔“

”مومو..... پہلے یہ رونا دھونا ختم کرو اور سکون سے بتاؤ کہ شعی نے تم سے کیا کہا ہے؟“

”وہ..... وہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے ان سے کہا ہے کہ آپ میری شادی ان سے کریں گی۔“ مریم نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ آج نہ جانے آنسو کہاں سے اٹھ چلے آئے تھے کہ باوجود کوشش کے نہیں رک رہے تھے۔

”نان سنس.....“ وہ زیر لب بولیں ”کوئی ایسی بات میں نے شعی سے نہیں کی۔ تم جاؤ منہ ہاتھ دھو کر ریلیکس ہو جاؤ..... اور اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو۔ میں فی الحال تمہاری شادی وادی نہیں کر رہی ہوں۔“

”رلیکس ماما.....!“ مریم نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور پھر کوئی جواب نہ پا کر ان کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی ”تھیک یو!“ اس نے آہستگی سے کہا اور مرکز عثمان احمد کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑے تھے اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد عثمان احمد نے نذیب عثمان کی طرف دیکھا جو کچھ ابھی ابھی بیٹھی تھیں وہ ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

”زینی! یہ کیا چکر ہے بھی، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ شعی کو یہ بات مومو سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ بچی ہے پریشان ہو گئی ہے۔“

”ہاں..... مومو سے..... نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مومو نے میرے بجائے تم سے کیوں شکایت کی اور پھر.....“

”زینی، میری جان! فضول باتوں سے اپنا ذہن نہ تھکاؤ۔ باپ ہوں میں اس کا۔“

”لیکن میں اس کی ماں ہوں مگر وہ ہمیشہ میرے بجائے تم سے اپنے مسائل ڈسکس کرتی ہے۔“

”وہ تم سے خوفزدہ رہتی ہے اور پھر بیٹیاں قدرتی طور پر باپ سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ نینا اور عاشی بھی تو مجھ سے زیادہ قریب ہیں جبکہ مومو تم سے زیادہ قریب ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے لیکن اس میں اتنا رونا اور چلانے کی کیا بات تھی۔ میں سمجھی خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ یہ مومو مجھے نفسیاتی مریض لگنے لگی ہے۔ ایک تو اس کے تعلقات سارے متوسط طبقے کے پیئڈ قسم کی لڑکیوں سے ہیں۔ جو نہ جانے اسے کیا کیا سبق پڑھاتی رہتی ہیں.....“

”مگر جان یہاں اس کی فریڈ زکا کیا ذکر بات تو شعی کی ہے۔ اگر وہ شعی کو پسند نہیں کرتی تو ٹھیک ہے۔ یوں بھی ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ مت الجھاؤ اسے زینی ڈارلنگ۔ وہ الجھتی ہے تو باقی سب بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ عاشی نینا حتیٰ کے مور بھی۔“

”ہاں میں دیکھ رہی ہوں، وہ سب اس سے بہت زیادہ اٹیچڈ ہو گئے ہیں..... اور مجھے اتنی شدید انوالومنٹ پسند نہیں ہے۔ اس طرح بچے ساری زندگی دوسروں کے مشق رچے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں

کہ کم از کم مور کو تو ہاسٹل بھجوا دینا چاہیے۔“

”یہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ فی الحال تو تم شعی کو منع کر دو بلکہ صاف صاف کہہ دو کہ تم مومو کی شادی اس سے نہیں کر سکتیں۔“

”میں نے شعی سے مومو کے متعلق کوئی کٹ منٹ نہیں کی ہے۔ یوں ہی ایک بار باتوں باتوں میں میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے مومو کے لیے موزوں لگتا ہے۔“

”خیر یہ تمہاری رائے ہے ورنہ میرے خیال میں وہ مومو کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ عموں میں بھی دیکھو، کتنا فرق ہے۔“

”خیر عموں کا فرق تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ شعی بہت بہترین انسان ہے۔ اسمارٹ ہے، بے تحاشا دولت مند ہے۔ میں بہتر سمجھتی ہوں کہ مومو کے لیے وہ کتنا موزوں ہے لیکن فی الحال میرا مومو کی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہ شعی بھی بس.....“

”دیکھو زینی، بعض اوقات تم مومو کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہو۔ حیرت ہے کہ تم اپنی ہی بچی کی نیچر کو نہیں سمجھتیں۔ زینی وہ اور مزاج کی ہے۔ شعی اس کے لیے کسی صورت موزوں نہیں ہے۔ میں خود شعی سے کہہ دوں گا کہ.....“

”نہیں نہیں، تمہیں شعی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا باس ہے۔ مجھے بہر حال اس کے احساسات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مومو کو پسند کرنے لگا ہے۔“

”تم اپنے مفادات کو مومو پر ترجیح دے رہی ہو زینی!“ عثمان احمد نے حیرت سے کہا ”چھوڑ دو یہ جا ب..... اور پھر تمہیں جا ب کی ضرورت بھی کیا ہے..... سب کچھ تو ہے..... ابھی کل ہی منشی آیا ہے اور گندم کی فروخت سے جو رقم ملی ہے وہ چا چا جی نے بھجوا دی ہے۔ میں نے ایک لاکھ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے ہیں۔ تم مومو کے ساتھ مت کروا لیا۔“

”عثمان..... تم..... تم بھی مومو کو مجھ پر ترجیح دے رہے ہو۔ مومو کے لیے تم مجھ سے بحث کر رہے ہو۔“

”نہیں میری جان، میں تم پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔ مومو کو بھی نہیں اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں..... میں نے تمہاری خاطر بہت کچھ قربان کیا ہے اور تم اس بات کو جانتی ہو..... پھر کیوں ایسا کہتی ہو تم کہہ کر اویسا۔“

”کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میرے لیے قربانی دو؟“

”نہیں تم نے تو نہیں کہا تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ تم جانتی ہو زینی کہ جب میں نے یونیورسٹی میں پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ.....“

”یہ کہانی میں بہت دفعہ سن چکی ہوں۔“ نذیب عثمان احمد نے انہیں ٹوک دیا۔

اور عثمان احمد نے انہیں غور سے دیکھا۔

یہ نذب احمد تھی۔

جو کبھی نذب سجاد ہوا کرتی تھی۔

اور جسے پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھ کر ان کا دل یکبارگی سے بڑے زور سے دھڑکا تھا اور نگاہیں اس کے چہرے پر سے ہٹنا بھول گئی تھیں۔ وہ انہیں بے تحاشا خوب صورت لگی تھی۔

بے حد سفید رنگت، دلکش براؤن آنکھیں، گلابی ہونٹ۔

اپنے بالوں کو بار بار ایک اداسے پیچھے جھکتی ہوئی سرغیاٹ خان سے تیز باتیں کرتی ہوئی وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ اتنی اچھی کہ ان کی نگاہیں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں اور ان کی اس نگاہوں کی چوری کو ان کے بے حد عزیز دوست ابرار حسن نے پکڑ لیا تھا۔

”عثمان احمد خیریت ہے.....؟“ اس نے ان کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

”ہاں.....“ وہ چونکے تھے۔ ”یہ لڑکی کون ہے۔ اس سے پہلے تو میں نے نہیں دیکھا۔“

”یہ لڑکی یہاں یونیورسٹی میں پڑھتی ہے میرے بھائی، غالباً سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ہے اور کافی اونچی چیز ہے۔ سنا ہے اس کے والدین امریکا میں ہوتے ہیں اور یہ یہاں تعلیمی سلسلے میں آئی ہے۔“ ابرار حسن نے اس کے متعلق تفصیل سے بتایا

اگر وہ اونچی چیز تھی تو معمولی تو وہ بھی نہ تھے۔ ان کے والدین بڑے جاگیردار تھے۔ بہت پیسہ تھا ان کے پاس اور بے حساب زمینیں تھیں پھر وہ بڑے لاڈلے تھے۔ آج تک انہوں نے اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کروائی تھی اور انہیں یقین تھا کہ اگر انہوں نے نذب سجاد کو اپنانا چاہا تو ان کے والد کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس روز سینما ہال سے نکل کر انہوں نے غیر ارادی طور پر اسے ادھر ادھر دیکھا تھا پھر وہ انہیں سیاہ ہنڈا کارڈ میں بیٹھی نظر آگئی تھی اور پھر اس کے بعد کئی بار انہوں نے اسے دیکھا تھا۔

یونیورسٹی میں آتے جاتے۔

کبھی کسی فنکشن میں۔

کبھی یونی پارکنگ میں، کبھی کیفے ٹیریا میں۔

اور جب کبھی بہت سارے دن وہ انہیں دکھائی نہ دیتی تو وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں چلے جاتے اور اسے دیکھ کر جیسے انہیں سکون سا حاصل ہو جاتا تھا۔ اور ایک روز جب وہ بہت دنوں سے یونیورسٹی نہیں آئی تو ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگاتے لگاتے تھک گئے تھے تو انہوں نے نہر کے کنارے ابرار حسن کے ساتھ ٹہلنے ٹہلنے سوچا۔

”نذب بنت سجاد ان کی خواہش بن چکی تھی۔“

”شاید یہی محبت ہے کہ وہ اس کے لیے بے قرار اور مضطرب ہیں اور انہوں نے پہلی بار اپنے ارد گرد کے ماحول پر غور کیا تھا۔ سائنڈ پر فاطمہ رباب اور عباس علی ہاتھوں میں ہاتھ دیے ٹہل رہے تھے اور ایک طرف چہروں پر حسین اور منزہ خان بیٹھے کئی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔

”کیا ہی اچھا ہو کہ کسی دن میں اور نذب سجاد یونیورسٹی کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو دیوانوں کی طرح ٹکیں اور نذب سجاد اپنے خوب صورت بالوں والے سر کو جھٹک کر اداسے مسکرائے اور اس کی دلکش آنکھوں میں کوندنے والے ستارے اور اس کی صبیح رخساروں میں پڑنے والے ڈھیل میں قریب سے دیکھوں۔“

”کیا سوچنے لگے ہو عثمان!“ ابرار حسن نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑے ”کیا بات ہے یا زکون یاد آ رہا ہے؟“

”یا زکون نذب سجاد سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”ڈائریکٹ شادی!“ ابرار شرارت سے ہنسا ”کوئی ڈیٹ شیٹ، کوئی محبت شجبت، کوئی ملنا ملنا۔“

”کچھ نہیں ڈائریکٹ شادی!“ انہوں نے حتی انداز میں کہا تھا ”میں کل ہی جا کر کہا سے بات کرتا ہوں۔“ ”مگر میرے دوست پہلے اس سے بھی تو پوچھ لودہ کیا کرتی ہے یا پھر چپکے چپکے کٹ منٹ ہو چکی ہے۔“ ”نہیں، میری تو کبھی اس سے بات نہیں ہوئی۔“

”تو پھر.....“ ابرار ہنسا ”تمہیں کیا خبر وہ کہیں انکیچڈ ہو نکارج شدہ ہو کسی اور کو پسند کرتی ہو۔“

اور انہیں ابرار کی بات صحیح لگی تھی۔

”ٹھیک ہے پہلے میں اس سے بات کر لوں پھر بابا سے بارت کر دوں گا۔“ انہوں نے کہا۔

”ویسے ایک بات ہے۔“ ابرار حسن نے کان کھجایا ”سنا ہے وہ اپنے کسی ڈاکٹر کزن میں انٹرنسڈ ہے۔“ ”تمہیں..... تمہیں بہ رازن باتیں کہاں سے پتا چلتی ہیں ابرار!“ انہیں حیرت ہوئی تھی۔

”بس چل بآئے ہے یا زکون لیکن تم اس سے بات کر لینا۔ کیا پتا خبر غلط ہی ہو۔“

لیکن ان کو بت ہی نہ آئی تھی انہوں نے اس کے ڈاکٹر کزن کو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ ”سارو زوہ نذب“ جو دے ساتھ ہی یونیورسٹی آیا تھا۔ بڑی بڑی کھوئی کھوئی آنکھوں والا اسمارٹ سا ٹیکا۔ شاید اپنا ٹریڈرز سے ملوانا ہے ساتھ آئی تھی۔

ادراک کے جانے کے بعد اس نے دوا اپنے ہاتھوں سے سنا تھا وہ ردا اور نیلی وغیرہ کو بتا رہی تھی۔

”بہر افیانی ہے۔“

اور انہیں ڈرامی میں یونان تھا جیسے ان کے ارد گرد ساری روشنیار بجھ گئی ہوں۔ سورج بھی انہیں میلا میلا دروہہ کوئی کلاس انیڈ کیے بغیر ہی ہائل واپس آ گئے تھے..... اور وہ بہت

”جی اچھا جی..... بہتر جی۔“

زینب عثمان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی وہ کہہ رہے تھے کہ جب آپ آئیں تو انہیں فون کر لیں۔ وہ جی کسی اشتہار کے سلسلے میں بات کرنا ہے انہیں آپ سے۔“

”زینی ڈیر!“ عثمان احمد ان کے قریب آکر بیٹھ گئے ”شعی کا فون آئے تو تم اس سے بات کر لینا۔ اسے مومو سے اس طرح کی بات نہیں کرنا چاہیے بلکہ تم اسے صاف بتا دینا کہ مومو کے لیے وہ مناسب نہیں ہے۔“

”تم..... جنہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہیں عثمان!“ زینب عثمان کا موڈ ابھی تک خراب تھا ”میں..... میں جو ہوں اس کی ماں اس کی فکر کرنے والی۔ میں اس کا برا بھلا زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتی ہوں اور شعی سے اگر وہ اخلاق سے بات کر لے تو اس کا کیا بگڑتا ہے۔ اسے اپنی کیلنس آنے چاہیں۔ مجھے یقین ہے اس نے شعی سے بدتمیزی کی ہوگی۔“

”وہ بچی ہے زینی اس کے ساتھ بچوں سے بے سانس کر۔“

”عثمان احمد!“ ان کی آنکھیں پھیل سی گئیں ”تم..... تم اس کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہے ہو۔ کیوں ترجیح دے رہے ہو؟“

”میں نے اسے تم پر ترجیح نہیں دی ہے زینی۔ سمجھنے کی کوشش کرو پلیز۔“

”نہیں..... تم اسے مجھ پر ترجیح دیتے ہو ہمیشہ ہی.....“ وہ زور زور سے چیخنے لگیں۔

”زینی..... پلیز!“ عثمان احمد نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے۔ ”تم..... تم نے اسے مجھ پر ترجیح دی۔“ وہ مسلسل ایک ہی بات کی تکرار کر رہی تھیں اور آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

چارول بچے اپنے کمروں سے نکل آئے تھے اور ایک طرف کھڑے سب سے سب سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ مریم نے اپنی سوچی ہوئی آنکھوں کو جو مسلسل رونے سے بوجھل ہو رہی تھیں، ہتھیلیوں سے ہلکا سا دبایا اور پھر زینب عثمان اور عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ زینب عثمان کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ اگر چہ ان کی آواز اب.... دھیمی ہو گئی تھی لیکن وہ اپنی بات دہرا رہی تھیں اور عثمان احمد بار بار ان کا ہاتھ پکڑ رہے تھے۔

”پلیز زینی! زینی سمجھنے کی کوشش کرو ایسا نہیں ہے ایسا بالکل نہیں ہے۔“

مریم نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی اور پھر جیسے ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”کون..... کون کس کو پاپا نے ماما پر ترجیح دی ہے؟“

دیر تک یونہی چپ چاپ آنکھیں موندے لیٹے رہے تھے۔

اور اس بے تحاشا خوب صورت لڑکی کو کبھی خبر بھی نہ ہوگی کہ کسی نے اسے بڑی شدتوں سے اور بڑے خلوص سے سوچا تھا اور اسے اپنانے کے خواب دیکھے تھے۔

بعض محبتیں کیسے چپ چاپ دلوں میں جنم لیتی ہیں اور وہیں مرجاتی ہیں۔ انہیں اظہار کے پیرائے کبھی نہیں ملتے۔

وہ دونوں، ہفتوں، مہینوں اداس اور کھوئے کھوئے سے رہے تھے۔ اب بھی ادھر ادھر جاتے ہوئے اگر اتفاق سے وہ نظر آ جاتی تو ان کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا بھول جاتی تھیں۔

ہاں انہوں نے اس کے ڈیپارٹمنٹ میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ ایرا حسن ان کی توجہ کسی لڑکی کی طرف دلاتا تو وہ سرسری سی نظر ڈال کر نگاہیں ہٹا لیتے۔ اس کے بعد کوئی لڑکی ان کی نظروں میں بچی ہی نہیں تھی اور جب تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ گھر واپس آئے اور بابا نے انہیں کہا کہ وہ زیون بانو سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔

زیون بانو ان کے تایا کی بیٹی تھی۔

سادہ سی زیون بانو جو اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد ان ہی کی حویلی میں رہتی تھی۔ جسے انہوں نے بہت کم بات کرتے سنا تھا۔

اور جس کے متعلق انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ان کے سامنے زینب سجاد آئی تھی۔

اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے سر جھٹک کر بابا کی طرف دیکھا تھا۔

”بابا، جو آپ کی مرضی ہو کر میں۔“ وہ نہیں تو کوئی بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

ٹیلی فون کی بیل نے انہیں چونکا یا۔

انہوں نے ایک بار پھر زینب عثمان کو دیکھا۔

وہ آج بھی اتنی ہی خوب صورت تھی۔ جتنی یونیورسٹی کے زمانے میں لگا کرتی تھی۔

چار بچوں کی ماں بن کر بھی اس کے چہرے کی چاندنی ماند نہیں پڑی تھی۔

شریف نے آکر فون اٹینڈ کیا۔

”شریف صاحب ہیں جی پوچھ رہے ہیں بیگم صاحبہ آگئی ہیں؟“

زینب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

”بیگم صاحبہ تو نہیں ہیں جی صاحب ہیں ان سے بات کریں گے؟“

شاید دوسری طرف سے شریف ہر زمانے انکار کیا تھا اور کچھ کہا تھا۔ شریف سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”جاؤ بیٹا۔ آپ اپنے کمرے میں اور بچوں کو بھی لے جاؤ۔“
”مگر بابا! ماما اتنا رو کیوں رہی ہیں۔ آپ نے ان سے کیا کہا ہے۔ پاپا پلیز!“ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب سی تھیں۔

وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے ماں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بہت مضبوطی سے کھڑی تھی اب پھر پہلے والی مریم بن گئی تھی۔

”پاپا پلیز“ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے ماما کو تکلیف ہو..... ماما بہت اچھی ہیں، بہت خوب صورت ہیں، ان جیسا کوئی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ماما سے زیادہ خوب صورت ہرگز نہیں ہوگی۔“ ایک باہر پر اس کے لہجے میں مضبوطی آگئی تھی ”اور آپ جو ہمیشہ مجھ سے کہتے رہتے ہیں کہ ماما میری وجہ سے بیمار ہوتی ہیں تو وہ غلط تھا، ماما آپ کی وجہ سے بیمار ہوتی ہیں اور اگر ماما یہاں نہ رہیں تو ہم سب بھی یہاں نہیں رہیں گے۔ میں عاشی، نینا اور مور۔“

اس نے مڑ کر کچھ فاصلے پر کھڑے تینوں بہن بھائیوں کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم واپس مڑ گئی اور اسے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر وہ تینوں بھی مڑ کر عثمان احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے چلے گئے۔
”دیکھا..... دیکھا تم نے زینبی!“ عثمان احمد کے لہجے میں عجیب سی خوشی تھی ”تم..... یونہی بلا وجہ اس سے خفا رہتی ہو۔ اسے کتنا خیال ہے تمہارا، کتنی محبت کرتی ہے وہ تم سے کہ اپنی تکلیف بھول کر تمہارے لیے مجھ سے لڑنے آگئی ہے۔“

نائب عثمان احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود اس کی جرأت پر حیران تھیں۔ وہ تو اسے بہت دلو اور ڈری کبھی لڑکی سمجھتی تھیں۔ ان کے خیال میں اس کے اندر متوسط طبقے کے سارے خوف سا گئے تھے۔ کہاں تو وہ شجاعت تک سے بات نہیں کر سکتی تھی اور کہاں اب عثمان احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی اور ان کا حساب کر رہی تھی۔ مریم کی جرأت سے وہ اپنا رونا دھونا بھول گئی تھیں اور وہ جو کچھ دیر پہلے بے حد شیش ہو رہی تھیں، اس وقت نارمل تھیں لیکن سر میں ہلکی ہلکی ٹیسس اٹھ رہی تھیں..... جب کبھی ان پر اس طرح کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو ان کا سر درد سے پھٹنے لگتا تھا۔ ایک طویل عرصے تک تو ڈاکٹر زان کے در و کوئی گرین کہتے رہے اور اس کی وجہ ٹینشن بتاتے رہے حالانکہ میگرین کی کوئی ریزن نہیں دی جاسکتی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ ٹینشن بھی اور کوئی دوسری وجہ بھی۔

بعد میں ڈاکٹر ہادی نے اسے نفسیاتی دورہ قرار دیا۔ جب بھی کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تھی وہ اس طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتی تھیں اور یہ شدید درد پہلی بار انہیں اس وقت ہوا تھا جب بختی حیدر نے نوجوبی میں اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا تھا۔

”سوری زنب ڈیر! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“

اور پھر..... پھر جیسے میڈم نرگس اور بیگم آفندی کی سرگوشیاں اس کے دماغ پر تھوڑے برساتے لگیں۔
”عثمان احمد! اپنی سیکرٹری کو پسند کرتے ہیں۔“

”دیکھ لیتا، ایک دن وہ نئیب عثمان کو چھوڑ دیں گے۔“
بہت پہلے کی کبھی باتیں مریم کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

تیسرے ہاتھ چمڑا کر (جسے کچھ دیر پہلے تیسرے ہاتھ پر کپڑا لیا تھا) وہ ایک دم دو تین قدم آگے بڑھی اور پھر عثمان احمد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کون..... کون ہے؟ وہ پاپا جیسے آپ ماما پر ترجیح دیتے ہیں؟“ اچانک عثمان احمد نے نئیب کا ہاتھ چھوڑ کر مریم کو دیکھا جو یوڈی خود اعتمادی سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آواز دھیمی لیکن مضبوط تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے کی مریم سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ ایک سہمی ہوئی، ڈری ہوئی خوف زدہ بچی جیسی لگ رہی تھی۔

روتے ہوئے ان کے سینے سے لگی وہ انہیں بہت چھوٹی، بہت معصوم لگ رہی تھی جیسے کبھی بچپن میں جب کبھی نئیب کسی پارٹی یا پھر فنکشن میں چلی جاتی تھی اور وہ آفس سے آتے تو وہ پورج کی سیڑھیوں پر بیٹھی ان کی راہ نکالتی تھی اور انہیں دیکھتے ہی ان سے لپٹ کر رونے لگتی تھی اور نئیب کی شکایت کرتی تھی کہ وہ اسے ساتھ لے کر نہیں گئیں اور وہ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے بھلاتے ہوئے اس کی نرسری میں لے آتے تھے۔

”ٹھیک ہے مومو، جب تمہاری ماما آئیں گی تو ہم ان کے کان کھینچیں گے۔“
لیکن یہ مریم جو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی کتنی پر اعتماد لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا آواز دھیمی رکھی ہوئی تھی تاکہ عاشی وغیرہ تک نہ جائے لیکن اس کا لہجہ بہت مضبوط اور پر اعتماد تھا۔

”پاپا، کون ہے وہ.....؟ کیا وہ ماما سے زیادہ خوب صورت ہے؟“
عثمان احمد نے نئیب عثمان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک بے اختیار مسکراہٹ ان کے لبوں پر آگئی۔ مریم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ شاید اس نے ان کو اس طرح مسکراتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔ انہوں نے ایک نظر نئیب عثمان پر ڈالی اور پھر مریم کی طرف دیکھا۔

”کوئی نہیں..... کوئی نہیں بیٹا۔ تمہاری ماما کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے جب ان کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو جو بھی بات یہ فرض کر لیں اس پر جم جاتی ہیں۔“

”تم مجھے پاگل سمجھتے ہو۔“ نئیب عثمان نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔
”نہیں..... زینبی ہرگز نہیں۔“

مریم کی آنکھوں میں الجھن تھی۔



تو ایک دم ان کے سر میں روشنیاں ہی کوئٹے لگی تھیں اور ان کی کپٹیوں میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں..... اور یہ لہریں اتنی شدید تھیں کہ کچھ دیر کے لیے جیسے ان کی آنکھوں کے آگے دھندلی چھا گئی تھی۔ شاید مجتبیٰ حیدر کا یہ انکار ان کی توقع کے خلاف تھا۔

خوب صورت رومانی کہانیاں لکھنے والا مجتبیٰ حیدر ان کی طرف پیٹھ کیے کھڑکی سے باہر جانے کیادیکھ رہا تھا اور ان کے سر میں جیسے کوئی میخیں ٹھونک رہا تھا اور اذیت سے آنکھوں کی روشنیاں بجھتی جا رہی تھیں۔

”زینی! چلو ڈیر اپنے بیڈ روم میں کچھ دیر آرام کر لو۔“ عثمان احمد نے بے حد نرمی سے کہا۔

”اچھا۔“ وہ بڑی خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مریم کے روم سے انہیں بڑا سکون ملا تھا، جیسے ایک اطمینان سا ان کے اندر اتر آیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور پاورفل ہیں اور جیسے نرم صبح کہتی تھی کہ بچے بہت مضبوط زنجیریں ہوتی ہیں۔ عثمان احمد کو ادھر ادھر ملنے نہیں دیں گے۔ اگر تم نے خود نہ چاہا تو۔“

”وہ چار بچوں کی ماں تھیں اور عثمان احمد کی جرأت تھی کہ وہ ان چار بچوں کی موجودگی میں انہیں چھوڑنے کا تصور بھی کرے جبکہ وہ خود یونیورسٹی کے زمانے سے ان کا شیدائی ہے۔“

انہوں نے نخوت سے سر اٹھاتے ہوئے سوچا۔

انہیں اپنی خوب صورتیوں اور عثمان احمد کی کمزوریوں کا احساس تھا۔

”جان! کیا سوچ رہی ہو اگر طبیعت زیادہ خراب محسوس ہو رہی ہے تو ڈاکٹر ہادی کو فون کروں۔“

”نہیں.....“ انہوں نے مڑ کر عثمان احمد کی طرف دیکھا ”میں کوئی ہلکا سا ٹراکولائزر لے کر سو جاؤں گی۔“

”بہتر ہے لیکن اگر تم ان ایزی فیل کرو تو بتانا میں ڈاکٹر ہادی کو فون کر دوں گا۔“

وہ عثمان احمد کی بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھیں۔ عثمان احمد ان کے پیچھے ان کی لمبی صراحی دار گردن میں لپٹی ہوئی چین کو دیکھ رہے تھے۔

مریم نے اپنے دروازے سے جھانک کر پایا کو سر جھکائے غلاموں کی طرح ماما کے پیچھے جاتے دیکھا اور نرنب عثمان کو شہزادوں کی طرح گردن اونچی کیے دیرے دیرے قدم اٹھاتے پایا تو مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ گویا ماما پایا میں صلح ہو گئی ہے اور پایا نے پھر وہی رو بوٹ والا چوٹا پن لیا ہے۔ اس نے سوچا شاید ماما کو پایا کا یہی انداز پسند ہے۔ ذرا وہ اپنا چولا بدلتے ہیں کہ ماما ڈسٹرب ہو جاتی ہیں حالانکہ اسے پایا کا یہ اسٹائل قطعی ناپسند تھا لیکن ماما کی خوشی کی خاطر اس نے کندھے اچکائے اور ٹیبل سے کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔



صبح صادق نے شیو بناتے بناتے سکندر کی طرف دیکھا جو اپنے بستر پر بیٹھا آنکھیں بند کیے آگے پیچھے



جھول رہا تھا۔

”کیا آج کالج نہیں جاتا ہے؟“

”جاتا ہے یار! آنکھ ہی نہیں کھل رہی تھی۔ رات ٹھیک سے نیند ہی نہیں آئی۔“

”کیوں خیریت، نیند کیوں نہیں آرہی تھی.....؟“

”پتا نہیں یار!“

”ڈولی تو ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی؟“

”نہیں یار! ڈولیاں وولیاں مجھے ڈسٹرب نہیں کر سکتیں۔“

”ویسے یار ہے بہت خوب صورت!“

”ہاں۔“ سکندر نے آنکھیں ملیں۔

”اور اسے اپنی خوب صورتی کا احساس بھی ہے بہت شدت سے۔ تم نے محسوس کیا تھا؟“ صبح صادق نے تویے سے چہرہ پوچھا۔

”پتا نہیں یار! میں نے اتنا دھیان نہیں دیا تھا اس پر۔“

”یار مجبوتوں کا یہ مطلب تو ہوا ہی ہوتا ہے کہ بندہ ادھر ادھر دیکھے بھی نہیں۔ اب اپنے یار محسن کو دیکھو نا“

جب بھی موقع ملتا ہے آنکھیں سینکنے سے باز نہیں آتا۔ اس وقت محترم کہاں ہیں؟“

”گیلری میں کھڑے ہیں۔“

”کیوں! کیا صبح صبح اٹھ کر کسی کا دیدار کرنا ہوتا ہے؟“

”پتا نہیں یار!“ سکندر بیزار سا بیٹھا تھا۔

”اے یار! زندگی پیدا کر اپنے اندر۔ یہ کیا ہر وقت اداس نگہ بنا رہتا ہے۔“

”نیند آ رہی ہے میرے بھائی! میں آج کالج نہیں جاؤں گا۔“

”میری جان! آج میڈم شیرازی کے تین پیریڈز ہیں۔“

”کیا..... کیا ہوا میڈم شیرازی کو؟“ محسن نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں ہوا اور میں میڈم کا ذکر کر رہا ہوں ان کی دختر نیک اختر کا نہیں۔ آپ کو اتار لٹ ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا میں نہیں ہوتا لٹ۔ تم بکتے رہو جو بک رہے تھے۔“

”نہیں میں ارشاد فرما رہا تھا کہ میڈم کے آج تین پیریڈز ہیں۔“

”اچھا تو کیا ہوا میں بھی نہیں جا رہا آج کالج!“ محسن وقار بھی چپل اتار کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”تم کہاں پڑھنے آئے ہو آرام کرنے نہیں۔“

”کم آن یار کیا توطیت ہے۔“

”توطیت نہیں یار بس یونہی ٹھکن ہو رہی ہے۔“ سکندر پھر بستر میں گھس گیا۔

”اب ٹھیک ہو جا“ نہیں تو مار کھائے گا مجھ سے۔“ صبح صادق نے ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی اٹھایا۔

”ٹھیک تو ہوں یار۔“ وہ ہنسی کی ہنسی ہنسا۔

”تو پھر یہ راتوں کو نیند نہ آنا دن بھر اداس رہنا پڑھائی میں دلچسپی نہ لینا۔ یہ سب صحیح نہیں ہے دوست!

زندگی میں ایسے حادثات آتے رہتے ہیں اور انسان کو انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔“ صبح صادق سنجیدہ ہو گیا۔

”بس یونہی کبھی کبھی غمزہ آتا ہے۔ ہماری ایک ہی بہن تھی صبح صادق اور بہت چاہتی تھی

ہمیں۔ بہت پیار کرتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رہتا تھا اسے۔ جب گھر میں ہوتی تھیں تو میری

کتاب میں سنبھال کر رکھنا ہمارے کپڑے استری کرنا۔ مجھے یاد ہے استری میں کونسلے ڈال کر وہ برآمدے میں

کھل بچھا کر ہمارے کپڑے استری کیا کرتی تھی۔ بھانٹا شہرے آتے تو ان کے لیے بھی کبھی چائے لا

رہی ہے۔ کبھی انہیں چائے پھیل کر دے رہی ہے، کبھی موگ پھلی، کبھی بابا کی ٹانگیں دہا رہی ہے اور کبھی

بے بے کی۔ یار یہ نہیں بھی بڑی پیاری ہوتی ہیں بہت محبت کرنے والی۔ جب میں آخری بار ان سے ملا تھا

تو کتنی ہی دیر تک میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھی رہی تھی اور جب میں آ رہا تھا تو انہوں نے

میری پیشانی کو چومنا اور میرے ہاتھوں پر کتنے ہی بوسے دیے تھے۔ شاید انہیں اندر سے ادراک ہو گیا تھا

کہ اب وہ نہیں بچے گی۔ کل سے مجھے ان کے بچے کا خیال آ رہا ہے۔ اللہ میاں کی ذات بھی کتنی بے نیاز

ہوتی ہے ماں کے بغیر بچہ کیسے پلے گا؟“

”بل جائے گا۔۔۔۔۔ بل جائے گا وہ“ تیری غمزہ آتا ہے واپس نہیں آئیں گی۔ دنیا کا کاروبار تو چلتا ہی رہتا

ہے۔“ محسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”چلو اب اٹھو۔“ صبح صادق نے چہرے پر بے بسی پیدا کرنے کی کوشش کی ”اور کل سے میں تمہیں

بالکل فراموش دیکھنا چاہتا ہوں۔ زندگی اس طرح تو بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے۔“

”میں سوچ رہا ہوں اس ویک اینڈ پر گاؤں چلا جاؤں۔“ سکندر نے اٹھ کر جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

”ہاں چلے جانا اچھی بات ہے۔ سب سے مل لو گے تو طبیعت بہل جائے گی۔“ صبح صادق نے تائید کی۔

ناشتا کر کے وہ واپس آیا تو پھر بستر میں گھس گیا اور کچھ دیر تک یونہی آنکھیں موندے لیٹا رہا۔

”ہاں نہیں رضوانہ کیسی ہو گی۔“

بہت اداس رہتی ہو گی۔ چاچا اور چاچی تو بہت یاد آتے ہوں گے اسے۔ کاش میں اس کے قریب ہوتا

اسے تسلی دے سکتا اس کے آنسو پونچھ سکتا۔ کوئی غم بانٹنے والا ہو تو دکھ قابل برداشت ہو جاتے ہیں۔

بھابھو اس کا خیال تو بہت رکھتی ہو گی۔ بھابھو ہیں بھی تو بہت اچھی۔ بہت چاہنے والی بہت محبت کرنے

”ایک دن آرام کرنے دے یار ایک تو تو ہر وقت اماں جان بنا رہتا ہے۔“ محسن نے چادر کھینچ کر

اپنے اوپر کی اور آرام سے لیٹ گیا۔

”اگر میں اماں جان نہ ہوں تو تم تو بے لگام ہی ہو جاؤ۔“ صبح صادق نے اس پر سے چادر کھینچ لی۔

”اور رات بچا جان کے گھر ویرکس نے کروائی تھی تم نے۔ چٹ ہی گئے تھے ڈانٹنگ ٹیبل سے۔“

”ویسے ایک بات ہے یار تمہارے چچا بہت لگی ہیں۔“ صبح صادق سنجیدہ ہو گیا ”کتنی کھل لائف ہے

ان کی۔ ڈینٹ سے بچے انجو کیڈ یوی۔ بہترین جاب۔ بندہ اتنا کلی ہو تو پھر دنیا میں ہی اس کے لیے

جنت ہے۔“

”یہ صبح صادق تو بس رات سے تمہارے چچا کے ہی قصیدے پڑھ رہا ہے۔ ایسا کرو یار چچا سے کہہ کر

ان کے سروٹ کو ارٹریں کوئی جگہ وغیرہ اس کے لیے پیدا کرو۔“ سکندر نے سر جھٹک کر نیند کو بھگا یا۔

”اسے اور جو کوئی نہیں ملتا قصیدے پڑھنے کے لیے۔ لڑکیاں تو اس کی شکل دیکھ کر ہی بھاگ جاتی ہیں۔“

”خیر اب ایسی بھی بری شکل نہیں ہے۔“ صبح صادق نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا ”کیوں یار سکندر“

ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”اور ایسی اچھی بھی نہیں ہے کہ کوئی گھاس ڈالے۔“ محسن اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”گھاس کھانے کے لیے تم جو ہو اور یہ صبح غالباً گھاس کھانے کے لیے ہی جو بدری صاحب گیلری میں

برامجنا تھے۔“

”ہائے یار کیا بتاؤں۔۔۔۔۔ وہاں سامنے گرلز ہاسٹل کے ایک فلیٹ کی کھڑکی سے وہ دکھائی دیتی ہے۔

یہ لے لے بالوں میں برش کرتی ہوئی ادھر سے ادھر چلتی ہوئی بالکل ریکھا کی کاپی لگتی ہے۔ پتا نہیں کس

ایئر میں ہے۔“

”دور سے دیکھا تو ایک دو شیزہ چلی آ رہی تھی۔۔۔۔۔“

”قریب جا کر دیکھا تو ہمیں۔۔۔۔۔“

”بس بس اپنی یہ خوب صورت شاعری اپنے تک ہی محدود رکھو۔ صبح صبح منہ کا مزہ خراب کر دیا۔“ سکندر

نے برا سا منہ بنایا۔

”اور اب بتاؤ ناشتے کا کیا پروگرام ہے؟ اپنے مارکو پولو کے ہاتھ کا چاہیے یا پھر۔۔۔۔۔“

”ناشتا باہر ہو گا۔“ محسن نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔

”تو پھر تشریف لے بھی چلیں ورنہ فرسٹ پیر پڑ رہ جائے گا۔“

”تم دونوں جاؤ یار میں نہیں جاؤں گا“ ناشتا کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا بلکہ میں تو سونے لگا ہوں۔“

سکندر نے صبح صادق کی طرف دیکھا۔

والی۔ میں اب کے گاؤں جاؤں گا تو بھابھو سے کہوں گا کہ وہ رضی کا پہلے سے زیادہ خیال رکھا کریں۔
رضوانہ رضی ردا۔

میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش۔

میں اسے اتنی خوشیاں دوں گا اتنی خوشیاں دوں گا کہ وہ یہ سارے دکھ بھول جائے گی۔

یہ اکیلے پن کا دکھ۔

یہ چاچا اور چاچی کے بے وقت چلے جانے کا دکھ۔

پھر اس کی آنکھیں رونا بھول جائیں گی۔

وہ نہیں گی، ہنسی آنکھیں کتنی اچھی لگتی ہیں اور اس کے تصور میں لمحہ بھر کے لیے ڈولی کی آنکھیں آئیں۔

ہنسی ہوئی شوخ، شریر آنکھیں۔

براؤن براؤن سی۔

اور رضوانہ کی آنکھیں ایک دم سیاہ تھیں۔

بھونرا سی۔

وہ غیر ارادی طور پر ڈولی اور رضوانہ کا موازنہ کرنے لگا۔

بھلا ڈولی اور رضوانہ کا کیا مقابلہ!

یہ صبح صادق بھی بس پاگل ہے۔ میں نے تو دھیان سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ کیسی ہے اور پھر کتنا آک ورڈ لگتا ہے وہاں اس کی طرف دیکھنا۔ محسن کی چچی کیا سوچتیں؟

اور یہ صبح صادق نے بھلا اتنی تفصیل سے کیسے دیکھ لیا تھا اسے اس کے سارے نقوش ازبر ہو گئے تھے۔

ناک ایسی ہے، ہونٹ ایسے ہیں..... بات ایسے کر رہی تھی، ہنس ایسے رہی تھی۔

یہ صبح صادق کی نظر بھی خاصی تیز ہو گئی ہے۔ محسن کی محبت کا کچھ تو اثر ہونا ہی تھا آخر۔

وہ آپ ہی آپ مسکرایا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن باوجود کوشش کے نیند نہیں

آ رہی تھی حالانکہ سربو جمل اور آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا

ہوا اور اس نے سوچا کہ وہ ہاتھ لے کر ایک چکر اردو بازار کا ہی لگا لے۔ ایک دو ضروری کتا میں لیتی تھیں۔

نیند تو آنے سے رہی اور پھر وہ ہاتھ لے کر ہاسٹل سے باہر نکل آیا..... اور جب اردو بازار میں ”احمد یہ بک

ڈپو“ پر اپنی مطلوبہ کتاب لے رہا تھا تو کسی نے قریب سے پکارا۔

”ہیلو سکندر صاحب! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ چونک کر مڑا۔

وہ شاید نہیں بلکہ یقیناً ڈولی ہی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹے قد کی سانو سی ایک لڑکی تھی جو غالباً اس

کی دوست تھی۔ ڈولی نے سیاہ چیز اور ریڈ شرٹ پہن رکھی تھی اور ریڈی اسکارف گلے میں ڈالا ہوا تھا۔

”آپ.....“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

”ڈولی..... میں ڈولی ہوں، آپ نے پہچانا نہیں.....؟“ وہ مسکرائی ”رات ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔“

”پہچان لیا۔ آپ یہاں کیسے.....؟“

”جیسے آپ۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”میں تو ایک ضروری کتاب خریدنے آیا تھا۔“ سکندر نے سادگی سے کہا۔

”اور میں کچھ برتھ ڈے کارڈز لینے آئی تھی۔ میری ماما کی برتھ ڈے ہے انہیں بھیجتا تھا اور یہ میری فریڈ ہے بچی۔“

سکندر نے سر کو ذرا سا خم کیا اور پھر ڈولی کی طرف دیکھا۔

”آپ نے کارڈز خرید لیے؟“

”ہاں اور آپ کتاب لے چکے ہیں؟“

”نہیں، بس لینے ہی لگا تھا۔“ سکندر نے کتاب کی قیمت ادا کی۔

”آپ کیسے آئے ہیں، میرا مطلب ہے گاڑی ہے آپ کے پاس؟“

”نہیں رکشے سے آیا تھا۔“

”تو آئیے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ کہاں جائیں گے آپ؟“

”مجھے ہاسٹل ہی جانا ہے لیکن آپ کو تکلیف ہوگی۔ شکریہ میں چلا جاؤں گا۔“

”ارے نہیں، تکلیف کسی میں تو بالکل فارغ ہوں اور اسی بہانے آپ کا ہاسٹل بھی دیکھ لیا جائے گا۔“

”یہ ڈاکٹر ڈا ہاسٹل ہے ادھر گلبرگ کی طرف۔ محسن کی وجہ سے ہمیں یہاں فلیٹ مل گیا ہے۔ ورنہ جو میرز کو کہاں ملتا ہے۔ آپ کو نا حق تکلیف ہوگی میں چلا جاتا ہوں۔“ سکندر ہچکچا رہا تھا۔

”اوہ آپ تو بہت تکلف کر رہے ہیں سکندر صاحب۔ اگر آپ کی جگہ وہ ہوتے، آپ کے دوست

کیا نام تھا ان کا.....؟“

”صبح صادق!“

”ہاں صبح صادق تو وہ بالکل تکلف نہ کرتے۔“

سکندر خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

”بچی! یہ سکندر صاحب ہیں، محسن کے دوست۔ محسن کو تو تم جانتی ہی ہو، میرا کزن ہے۔ اس سے رات

ہی ملاقات ہوئی ہے۔ یہ محسن کے ساتھ آٹنی کی طرف آئے تھے۔“ وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بچی سے اس

کا تعارف بھی کر رہی تھی۔

پنگی نے دو ایک بار سناٹے نظروں سے اسے دیکھا اور پھر پوچھا ”یہ بھی میڈیکل میں ہیں؟“
 ”ہاں۔“

”اؤہ مجھے تو بہت مشکل لگتی ہے میڈیکل کی پڑھائی۔ آپ کو مشکل نہیں لگتی سکندر صاحب!“ پنگی نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیا جائے تو کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔“

”ہاں یہ تو صحیح ہے۔ میرے ڈیڈی بھی یہی کہتے ہیں کہ پختہ ارادے کے سامنے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے اور میں بھی جب کوئی ارادہ کر لیتی ہوں تو وہ کام چاہے کتنا بھی مشکل ہو کر ہی لیتی ہوں۔“
 ڈولی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور مڑ کر سکندر کی طرف دیکھا۔

”آئیے نا، آپ وہاں ہی کیوں کھڑے ہو گئے ہیں۔“

سکندر نے ایک بار پھر انکار کرنا چاہا ”ڈولی پلیز!“
 ”مان کر رہے ہیں آپ، پلیز تشریف لائیں۔“ اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے اشارہ کیا ”اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو میں پہلے پنگی کو ڈراپ کر دوں اسے آج جلدی گھر جانا تھا۔“ اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ رکھے مڑ کر اس سے پوچھا۔

”بے شک مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“

”کتنی بااعتماد لڑکی ہے یہ۔“ سکندر نے حیرت سے سوچا ”رات سرسری سی ملاقات ہوئی ہے اور اس وقت اچانک مل جانے پر وہ کتنی بے تکلفی سے اسے مل رہی ہے حالانکہ رات تو وہ اسے کچھ کچھ مغرور سی لگی تھی۔ مگر اس وقت وہ بہت بے تکلف لگ رہی تھی۔ دراصل اس طبقے کی لڑکیوں کو ایسی کیسٹس بھانے آتے ہیں اور ان میں کوئی جھجک بھی نہیں ہوتی۔“

کتنی بے پروائی سے وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کبھی کبھی مڑ کر اس سے کوئی بات کر لیتی تھی اور اسے اپنی بے تحاشا خوبصورتی کا کوئی احساس بھی نہیں تھا۔ جب وہ اپنی دلکش براؤن آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتی تو جیسے نگاہیں لمحہ بھر کو اس کی نظروں میں آنکس جاتی تھیں۔ سکندر گہرا کرنگا ہیں جھکا لیتا تھا۔ صبح صادق نے شاید صبح کہا تھا کہ ڈولی بے تحاشا خوب صورت لڑکی ہے۔

پنگی کو اس کے گھر کے سامنے ڈراپ کر کے ڈولی نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی کر لی۔
 ”سکندر صاحب! پلیز یہاں کی کافی اور چمچ بہت مشہور ہیں اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں چمچ بھی کھاؤں گی اور کافی بھی پیوں گی اور آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ پلیز!“

”مگر.....“ سکندر نے انکار کرنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ نہیں سکندر صاحب! پلیز آئیں۔ زیادہ دیر نہیں ہوگی۔ پھر ہاسٹل جا کر آپ نے کیا کرتا ہے“

محسن وغیرہ تو ابھی کالج سے نزلوٹے ہوں گے۔“

”آج کالج نہیں گئیں کیا.....؟“ سکندر نے پوچھا۔

”کئی تھی..... پنگی کو گھر جانا تھا مجھے کارڈ لینے تھے سو پہلے دو پیریڈز اینڈ کر کے آگئے۔“ ڈولی نے بتایا اور اندر داخل ہوتے ہوئے کوئے والی میز کی طرف اشارہ کیا ”میں اکثر یہاں آتی ہوں اور ہمیشہ اسی ٹیبل پر بیٹھتی ہوں۔ مجھے یہاں کی کافی بہت پسند ہے۔“

سکندر نے چاروں طرف دیکھا۔ چند ایک میزوں پر لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ کئی نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ ہال میں ڈولی کے سوا اور کوئی لڑکی نہیں تھی اور لوگوں کی نظریں اس کی طرف تھیں۔

”شروع شروع میں جب میں امریکا سے آئی تو مجھے بہت الجھن ہوتی تھی جب لوگ مجھے اس طرح سراٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتے تھے لیکن اب میں عادی ہو گئی ہوں۔“ ڈولی نے بیٹھے ہوئے بتایا۔

”دراصل یہاں ابھی پاکستان میں لڑکیاں اس طرح کافی شاپس پر اکیلے نہیں جاتیں۔“ سکندر نے کہا اور اس کا دل چاہا وہ کہہ دے کہ جب لڑکی تم جیسی خوبصورت بھی ہو..... لیکن وہ خاموش ہی رہا۔
 ”ارے ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ وہ ہنسی۔

ہنسنے والے اس کے رخساروں پر ڈچمپل پڑے تو اسے رضوانہ کا خیال آ گیا۔ اس کے دائیں رخسار پر بھی یوں ہی گڑھا پڑ جاتا تھا..... اور اس کا دل چاہتا تھا کہ رضوانہ بار بار ہنسنے اور بار بار اس کے رخساروں پر وہ اس بھونک کو ڈوڑھے ابھرتے دیکھے۔ تب رضوانہ بہت دلکش لگتی تھی۔

”تمہارا شہر کون سا ہے سکندر!“ کافی اور چمچ کا آڈروے کر اس نے سکندر سے پوچھا۔ وہ یکدم ہی آپ سے تم پر اترا آئی تھی۔

”میرا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔“

”ریلی!“ اس نے خوشی سے پوچھا ”مجھے یہاں کے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے سکندر۔ کسی دن ہمیں اپنے گاؤں لے چلیے نا۔ میں نے تو محسن سے بھی کہا تھا..... کہ اب کے چھٹیوں میں انکل کے ساتھ اس کے گاؤں ضرور آؤں گی۔“

”گاؤں دور سے ہی اچھے لگتے ہیں۔ وہاں کی زندگی بہت ٹھنک ہوتی ہے اور پھر ہمارے گاؤں میں تو ابھی بجلی بھی نہیں ہے۔ ہاں محسن کے گاؤں میں سب سہولتیں ہیں۔“

”مجھے گاؤں کا ماحول بہت متاثر کرتا ہے۔ میں نے دو چار فلمیں دیکھی تھیں۔

کنویں پر پانی بھرنے والی لڑکیاں

کپے ٹٹی کے بنے ہوئے مکانات یا جھونپڑیاں

کھیتوں میں جانے والے کسان اور ان کے بیل

سرسوں کے کھیت

یہ سب کچھ بہت ہی حسین اور دلکش لگتا ہے۔

سج میں سوچتی ہوں، کتنا اچھا ہوتا اگر میں کسی گاؤں میں رہتی۔“

سکندر نے اس کے نازک ہاتھوں اور ناخنوں پر نفاست سے لگی ہوئی کیوکس کو دیکھا اور ہولے سے مسکرایا۔ میڈیکل کالج میں آنے کے بعد اس میں خاصی خود اعتمادی آگئی تھی۔

”قلموں اور کہانیوں میں دکھائے جانے والے گاؤں اور اصل گاؤں میں بہت فرق ہوتا ہے ڈولی جی! گاؤں میں دکھائی جانے والی یہ خوبصورتیاں صرف کتابی اور افسانوی ہوتی ہیں۔ اصل رنگ بہت مختلف ہوتا ہے۔ آپ چند دن سے زیادہ وہاں نہیں رہ پائیں گی۔ جب پینے کے لیے پانی خود لانا پڑے گا۔

جب لکڑیوں کو دھوئیں سے آکھیں چلیں گی

جب کچی گلیوں میں چلتے ہوئے پاؤں پھسلیں گے

اور جب مریض کے لیے ڈاکٹر نہیں ملے گا

تو خود ہی کہیں گی کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ وہاں تو وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو برسوں سے رہتے آ رہے ہیں۔ شہری لوگوں کا تو وہاں دم گھٹنے لگے گا اور آپ جیسی نازک اندام لڑکی تو دو دن بھی نہ رہ سکے۔ آپ کا تو تیل کی بو سے ہی دم اٹھنے لگے۔ جب رات کو لائٹن چلتی ہے تو مٹی کے تیل کی بوسارے گھر میں پھیل جاتی ہے۔“

”اوہ آپ تو گاؤں کا بے حد بھیا تک نقشہ پیش کر رہے ہیں۔“

”میں صرف اور صرف حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“

”کہیں یہ سب تفصیل صرف اس لیے تو نہیں بتائی جا رہی ہے کہ تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں آؤں.....؟“

”ارے نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ڈولی جی۔ ہم دیہاتی بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس

محبتیں بہت ہوتی ہیں..... سچی اور کھری محبتیں۔ ہم بہت چاہنے والے لوگ ہیں۔“

”آزمائیں گے کبھی۔“ ڈولی کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی تھی۔

”بے شک۔“ سکندر نے یقین سے کہا ”کبھی آپ آئیں ضرور۔ میرے بابا، بے جی اور بھابھ سب

بہت ہی چاہنے والے ہیں سب آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ ان کے دل محبتوں سے مالا مال ہیں۔“

”اور تمہارا دل سکندر.....؟“

”میرا دل.....“ سکندر نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے دلکش لبوں

پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی ”ظاہر ہے میرا دل بھی محبتوں سے لبریز ہے۔ میرے والدین نے مجھے کسی

سے نفرت کرنا نہیں سکھایا۔“

”رات میں سمجھ رہی تھی کہ آپ کو بولنا نہیں آتا لیکن اب پتا چلا کہ فرسٹ امپریشن لاسٹ نہیں ہوتا۔“

”ہاں شاید ایسا ہی ہوتا ہے..... لیکن آپ کا فرسٹ امپریشن بھی کچھ غلط نہیں تھا۔ میں کم گوئی ہوں

لیکن یہاں آپ نے بات ہی کچھ ایسی کی کہ بولنا پڑا۔“

”ہمارے ساتھ ملنا رہا تو آپ کو بولنا بھی آ جائے گا۔“ وہ ہنسی اور سکندر نے سوچا۔

”اس کی ہنسی بھی رضوانہ سے کتنی ملتی جلتی ہے حالانکہ اس میں اور رضوانہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”یا پھر ممکن ہے ساری لڑکیاں ایک ہی جیسا ہنستی ہوں، کھل کھل کر کے جیسے بھٹی میں کئی کے دانے

بھنتے ہیں۔“

”کیا سوچنے لگے ہو؟“

”کچھ نہیں.....“ اس نے بیرے کو اشارے سے بلایا۔ سکندر نے جیب سے پیسے نکالے۔

”نہیں! یہ دعوت میری طرف سے تھی۔“

”لیکن ہم گاؤں والے عورت سے پیسہ خرچ کروانا پسند نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے جناب! لیکن آج کا مل تو میں ہی ادا کروں گی۔ دل چاہے تو پھر کسی دن تم مجھے دعوت

دے کر حساب برابر کر لیتا۔“ اس نے سکندر کی ایک نہ سنی..... مجبوراً سکندر کو خاموش ہو جانا پڑا اور جب وہ

اسے ڈراپ کر کے ہاتھ ہلاتی چلی گئی تو وہ کتنی دیر تک اپنے ہاتھ کے گیت پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ ڈولی کیسی

عجیب و غریب لڑکی ہے۔

”کس قدر جلدی بے تکلف ہو گئی ہے۔“

”اور جب میں صبح صادق اور محسن کو بتاؤں گا تو وہ کس قدر حیران ہوں گے۔ محسن تو شاید نہ ہو لیکن صبح

صادق ضرور حیران ہو گا۔“

”کمال لڑکی ہے بھئی۔“

”بہت ہی بولندہ..... کم از کم اس نے پہلے تو اس طرح کی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی اور یہ جو محسن کی جن

لڑکیوں کے ساتھ دوستی ہوتی ہے وہ شاید ایسی ہی ہوتی ہوں گی اتنی ہی بولندہ اور فریک۔“

”تم یہاں کھڑے ہو یا ز کہاں چلے گئے تھے؟“ صبح صادق نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

”تم لوگ آگے کالج سے، میں ذرا اردو بازار تک چلا گیا تھا۔“

”ہاں یا تیرے بغیر میرا تو دل ہی نہیں لگا اور محسن کی نیلوفر صاحبہ بھی چھٹی پر تھیں، سو میڈم شیرازی کو

بھٹکا کر ہم آگے تو جناب ندارد تھے اور بابا آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“

”بابا..... میرے بابا!“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار تمہارے بابا!“

”خیریت ہے نا؟“

”ہاں ہاں خیریت ہے۔“ صبح صادق نے اسے تسلی دی ”بابا کہہ رہے تھے کہ وہ کسی کام سے لاہور آئے تھے تو انہوں نے سوچا کہ تم سے بھی ملتے چلیں۔“

”اچھا!“

وہ کچھ کچھ حیران صبح صادق کے ساتھ بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بابا بہت کم لاہور آتے تھے۔ اگر کوئی کام ہوتا بھی تو بھانڈا ہی کر لیتے تھے۔ بابا کے گلے سے لگتے ہی خود بخود اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بابا نے ہولے سے اس کے کندھے تھپتھپائے۔

”حوصلہ پتر..... خدا سے ہمارا بھگنا نہیں ہوتا۔ جو چیز اس کی ہے وہ جب چاہے اسے واپس لے لے۔“ آنسو پونچھ کر وہ ان کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ صبح صادق اسے کمرے میں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا اور محسن بھی کہیں نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بابا کی طرف توجہ ہو گیا۔

”جی بابا! آپ اچانک کیسے آگئے۔ کیا کام تھا؟ مجھ سے یا بھانڈا سے کہہ دیا ہوتا، ہم کر لیتے۔“ خواجہ سفر کی تکلیف اٹھائی۔

”نہیں بیٹا، مجھے خود ہی آنا تھا۔ یہاں تیرا چاچا ہوتا ہے۔ تو نہیں جانتا، میرا یار ہے وہ۔ بڑے دنوں سے بلارہا تھا اور خود میرے دل میں بھی بڑے دنوں سے ”کھچ“ پڑ رہی تھی۔ سوچا مل لوں گا، کئی سال ہو گئے ملے ہوئے۔ ہر آتے جاتے کے ساتھ پیغام بھیجتا تھا کہ ایک بار آ کر میرے پاس رہ۔“

”پھر ملے آپ اس سے؟“

”ہاں کل ملا تھا میں، ایسے پیار سے ملا پتا ہی نہیں چلا کہ برسوں بعد ملے ہیں۔ تو سن کیسی پڑھائی چل رہی ہے تیری؟“

”میں تو ٹھیک ہوں اور پڑھائی بھی اچھی ہو رہی ہے۔“ عزیز آپا کا بیٹا کیسا ہے؟“

”تیری بھابھو اسے گھر لے آئی ہے۔ وہاں کوئی سنبھالنے والا تو تھا نہیں۔ بوڑھی دادی سے تو سنبھلا نہیں تھا۔ تیرے بہنوئی نے خود ہی کہا کہ بچے کو لے جائیں۔“

”یہ اچھا ہو گیا بابا۔ ہماری عزیز آپا کی نشانی ہے۔ بھابھو اسے بہت پیار سے پالیں گی اور پھر بے جی بھی تو ہیں نا؟“

”ہاں رضوانہ تو ہر وقت اسے اٹھائے پھرتی ہے۔“

اس کا دل یکدم زور سے دھڑکا۔ جب سے وہ آیا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بابا سے اس کے متعلق

پوچھ لکھ کر چکے۔ جی آجانی تھی لیکن بابا نے ذکر کیا تو بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

”کیسی ہے وہ؟“

”ٹھیک ہے شہری کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ تیری بھابھو نے عزیز کے بیٹے کا نام شہریار رکھا ہے۔“

”اچھا بہت خوبصورت نام ہے۔“

”بیٹا، مجھے تم سے بھی ایک بات پوچھنا تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دوست محمد سے تو ملنے کا ایک بہانہ تھا ورنہ برسوں سے وہ بلارہا ہے میرا آنا ہی نہیں ہوتا۔“

”جی بابا، حکم کیجئے، اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو میں خود حاضر ہو جاتا۔“

”نہیں پتر، میرا دل تھا میں یہاں آ کر تم سے بات کر لوں۔ وہاں تمہیں بلانا، تیری پڑھائی کا بھی حرج ہوتا اور پھر میں چاہتا تھا کہ یہاں کل کر تم سے بات کروں۔“

”جی بابا!“

”بیٹا، رضوانہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟“

”جی.....!“ بابا کی بات ایک لمحے کے لیے اسے سمجھ ہی نہیں آئی۔

”بیٹا، میری خواہش ہے کہ تمہارا بیابا رضوانہ سے ہو۔ اگر چہ میں نے سوچا تھا کہ تیری پڑھائی ختم ہو جائے گی تو پھر ہی تم سے بات کروں گا لیکن اب تیرے چاچا کے مرنے کے بعد رضوانہ کو ہمارے گھر ہی رہنا ہے۔ اکیلی لڑکی تنہا تو نہیں رہ سکتی نا تو میں سوچتا ہوں کہ وہ ایک مضبوط حیثیت کے ساتھ میرے گھر میں رہے۔“

میری خواہش ہے کہ تمہارا نکاح رضوانہ سے ہو جائے، رخصتی تمہارے ڈاکٹر بننے کے بعد.....“

اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ خواہشیں اس طرح بھی پوری ہوتی ہیں۔ وہ سوچتا تھا کہ اپنی بھابھو کو راز دار بنائے گا، انہیں اپنے دل کی بات بتائے گا اور پھر.....

”بیٹا!“ بابا نے اسے خاموش دیکھ کر افسردگی سے کہا ”تمہارے اوپر کوئی جبر نہیں ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ رضوانہ زندگی کے سفر میں تمہارے ساتھی کی حیثیت سے مناسب نہیں ہے تو کوئی بات نہیں ہے۔ رضوانہ کے لیے اس کے ماموں بہت کدھر رہے تھے اس لیے میں جلدی بھی کر رہا ہوں کیونکہ پہلا حق ہمارا ہے۔“

اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے خفیال والوں کو پتا چل جائے کہ..... ورنہ ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ بہر حال..... وہ نجیب اچھا لڑکا ہے، دس جماعتیں پاس ہے۔“

”بابا..... بابا!“ اس نے سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے ”بابا! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”پتر، ایک بار پھر سوچ لے۔“

بابا پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اولاد کے ساتھ بیوی کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ پڑھے لکھے لوگوں جیسا

ہی رہا تھا۔ اسے اپنے بابا پر بہت فخر محسوس ہوا۔ وہ چاہتے تو زبردستی بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس کی مرضی اور رائے کو اولیت دی تھی۔ اس نے ان کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

”آپ کی خوشی میری خوشی ہے بابا!“

”خوش رہ پتر!“ انہوں نے اس کے ہاتھ چھپتے ہوئے اور کھڑے ہو گئے ”تو پھر ٹھیک ہے تو ایسا کر اس جمعرات کو گھر آ جا جسے کو اللہ کا نام لے کر تیرا اور رضوانہ کا نکاح کر دیتے ہیں۔“

”جی بہتر!“

”اور اب میں چلوں میں چاہتا ہوں کہ رات تک گھر پہنچ جاؤں۔ بہت دیر ہو گئی تو آگے سے تازہ وغیرہ نہیں ملے گا۔“

”ارے بابا! آپ کہاں چلے؟“ صبح صادق نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”بس پتر اب جاؤں گا۔“

”نہیں بابا! محسن کھانا لینے گیا ہے۔“

”مگر دیر ہو جائے گی پتر!“

”دیر نہیں ہوتی بابا! ہم خود آپ کو اسٹاپ پر پہنچائیں گے۔ محسن آنے ہی والا ہوگا۔“ صبح صادق نے انہیں پکڑ کر بٹھا دیا۔

”اچھا! تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے مگر بیٹا ذرا جلدی فارغ کر دو ورنہ مجھے بہت دیر ہو جائے گی۔“

”بابا! دیر ہو گئی تو رات ادھر ہی رہ جائے گا۔“

”دوست محمد نے اتنی منٹیں کیں میں نہیں رکا۔ یا ز گھر سے باہر مجھے نیند ہی نہیں آتی۔“ انہوں نے بے تکلفی سے کہا اور پھر سکندر کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور صبح صادق کو اس کے نکاح کا بتایا۔

”ارے جی!.....!“ صبح صادق نے خوش ہو کر کہا اور بے اختیار اٹھ کر بھٹکڑا ڈالنے لگا۔ ”میرا یار بنے گا دو لہا!“

وہ پورے کمرے میں تھرک رہا تھا اور بابا اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔



مسرور نے کالج سے آ کر فائل ٹیبل پر رکھی ہی تھی کہ خدا بخش نے آ کر بتایا کہ چھوٹی حویلی سے فون آیا ہے جی۔

”اچھا خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں جی! خیریت ہی ہے۔“

”کیا سر ابھی نہیں آئے؟“

”وہ تو جی کب سے آئے ہوئے ہیں۔ فون تو آپ کے لیے ہے۔ چھوٹے ملک صاحب کا جی!“

”کون! سلطان صاحب کا.....؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں جی! آپ کو بلا رہے ہیں۔“

اور مسرور کچھ حیران سا..... باہر آ گیا اور کوریڈور میں رکھے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

”خیریت! چوہدری سلطان! کیسے یاد کیا؟“

”سلطان دوسروں کے لیے ہوں تمہارے لیے صرف عمران ہوں۔ جو دل چاہے بلاؤ عمران کو یا

عادل بھائی کی طرح مانی کہہ لو..... تمہیں اجازت ہے یا را!“

”اس ذرہ نوازی کے لیے کیا کہوں؟“

”کچھ بھی نہیں! میرے دوست۔ چوہدری سلطان کو کبھی کبھی کوئی بندہ پسند آتا ہے اور تم مجھے بے حد

اچھے لگے ہو۔ تو بڑی کڑوی باتیں کرتا ہے لیکن تیری باتیں دل کو بھاتی ہیں..... میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں

ہوں! عادل بھائی اور تیری طرح..... پر یاری بھانا جانتا ہوں۔“

مسرور کو سلطان کے فون کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اس نے اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا

خیال تھا اور جیسا کہ اس کی باتوں سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک قدرے مغرور اور خود سر سالک کا ہے جسے

اپنی زمینوں اور دولت پر ناز ہے۔ بقول پروفیسر عادل ”قدرے بگڑا ہوا سا۔“

”کبھی چکر لگاؤ گا کوس کا۔“ اس نے مسرور کو دعوت دی۔

”انشاء اللہ! لیکن فی الحال تو بہت مصروف ہوں۔ ہمارے کالج میں ایگزیکٹیشن (نمائش) ہو رہی ہے

اس کے لیے کام کرنا ہے۔“

”لگتا ہے! ہمیں ہی آنا پڑے گا تم سے ملنے کے لیے۔“ سلطان ہنسا ”کامل کیسا ہے اب۔ عادل

بھائی اسے گھر لے آئے ہیں یا نہیں؟“

”نہیں! ابھی تو نہیں لائے! شاید ایک دو روز میں لے آئیں۔“

”اس نے کیا ٹھیک ہوتا ہے بھئی..... عادل بھائی بھی خوا خواہ پیسہ ضائع کر رہے ہیں! اس کے علان پر۔“

”اب اسے تکلیف میں مبتلا بھی تو نہیں دیکھا جا سکتا..... بہر حال وہ انسان ہے۔“

”اچھا خیر..... عادل بھائی کو میرا سلام کہہ دیتا۔“

مسرور سیور کریڈل پر رکھ کر مڑا تو پروفیسر عادل کمرے سے باہر نکلے۔

”کس کا فون تھا میاں؟“

”سلطان صاحب کا۔“

”مانی کا..... خیریت تھی؟“

”جی سر، بس یونہی مجھ سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔“

”کمال ہے یا روتھم سے کیسے متاثر ہو گیا حالانکہ اس کے اور تمہارے حراج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”ہاں نہیں سر مجھے خود حیرت ہے۔“

”چلو اچھا ہے..... تمہاری دوستی شاید کبھی اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔“ بات کرتے کرتے

انہوں نے خدا بخش کو آواز دی ”خدا بخش! کھانا لگاؤ۔“

اور پھر وہ سرور کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ڈائننگ ہال میں آگئے اور کھانے کے دوران ہونے والی نمائش کی باتیں ہوتی رہیں۔

”میرا دل چاہ رہا تھا کہ تم کچھ نمایاں کام کرو۔ نظروں میں آؤ کسی کی۔“

”جی سر، کوشش تو کر رہا ہوں۔“

”نہیں یار، تم محنت نہیں کر رہے ہو۔ تمہارے کام میں یکسوئی نہیں رہی۔ تمہارا ادھیان بٹا رہتا ہے۔“

بھول جاؤ سب کچھ اور پوری یکسوئی سے کام کرو۔“

”جی سر!“ سرور کی اپنی خواہش بھی تھی کہ وہ پروفیسر عادل کی امیدوں پر پورا اتر سکے۔ وہ ابھی

کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آمنہ صفی بھی آگئیں۔

سرور اور پروفیسر عادل کھڑے ہو گئے۔

”میں شاید غلط وقت پر آگئی ہوں، آپ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔“

”نہیں ہم کھانا کھا چکے تھے۔ آپ بتائیے، آپ کے لیے کیا منگوایا جائے؟“ پروفیسر عادل نے

شائستگی سے کہا۔

”نہیں، شکریہ عادل صاحب، میں کھانا کھا کر آئی ہوں۔ آپ بہت دیر سے کھانا کھاتے ہیں۔“

”بس کبھی کبھار دیر ہو جاتی ہے۔“ انہوں نے کہا پھر خدا بخش کو آواز دے کر برتن سمیٹنے کا حکم دیتے ہوئے

بولے ”چائے ڈرائنگ روم میں لے آنا..... آئیے پلیز.....!“ پھر انہوں نے سرور کی طرف دیکھا ”یہ

میرے چھوٹے بھائی ہیں سرور..... اور سرور یہ آمنہ صفی ہیں ان کا نام یقیناً تمہارے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔“

”جی!“ سرور نے آمنہ صفی کو سلام کیا اور اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”آپ نے مجھے پہچان لیا عادل صاحب!“ آمنہ صفی نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی تصویر اکثر ویسٹ اخبارات میں دیکھتا رہتا ہوں اور پھر آپ کے متعلق ڈاکٹر شہریار سے علم

ہو چکا تھا کہ آپ ملنا چاہ رہی ہیں مجھ سے..... خیریت..... کوئی کام تھا آپ کو مجھ سے؟“

”نہیں!“ آمنہ صفی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا ”آپ کو شاید یاد ہوگا کہ ایک بار اسلام آباد میں ایک نجی

محفل میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ سے ادھوری سی گفتگو ہوئی تھی..... گفتگی سی رہی تھی دل چاہتا تھا

کہ کبھی آپ سے دوبارہ ملاقات ہو اور دیر تک گفتگو ہو۔“

”نہیں، مجھے بالکل یاد نہیں۔“ انہیں شرمندگی سی ہوئی ”لیکن میں آپ کے کالم پڑھتا رہتا ہوں۔ بہت

بولڈ تحریر ہے آپ کی۔ آپ کی شاعری کے بالکل برعکس۔ آپ کی شاعری میں ایک ڈری، سبھی اور خوف

زدہ لڑکی نظر آتی ہے۔ جو بہت نازک احساسات رکھتی ہے۔ کالج جیسا دل ہے جس کا ”

”شاید وہ اصل آمنہ صفی ہے..... یا شاید یہ اصل آمنہ صفی ہے جو بہت بولڈ کالم لکھتی ہے۔ میں خود

بھی آج تک نہیں جان سکی۔“

پروفیسر عادل نے پہلی بار نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

ہوائے کٹ بال

بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے

پیاری سی ناک

گندی رنگ

میک اپ سے بے نیاز چہرے کے ساتھ وہ اچھی خاصی دلکش لگ رہی تھی۔ کریم کلر کا کھدر کا سوٹ

اور اس کا اسکارف نما دو پٹا گلے میں ڈالے اپنے آپ سے بے نیاز، آمنہ صفی جوان کے سامنے کچھ کھوئی

کھوئی سی بیٹھی تھی۔ اس آمنہ صفی سے قطعی مختلف لگ رہی تھی جس کا تصور اس کے کالموں سے ابھرتا تھا۔

منہ پھٹ اور بے لحاظ۔

گلی لپٹی کے بغیر بات کہہ دینے والی آمنہ صفی جیسے اپنے آپ سے محو گفتگو تھی۔

”شاعری شاید اپنے پرسنل محسوسات کا نام ہے۔ شاید دل کی زبان!“

”بجا ارشاد فرمایا، لاہور کیسے آنا ہوا تھا اور طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟“

پروفیسر عادل نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

”لاہور میں میرا گھر ہے۔ میں یہاں ہی پیدا ہوئی ہوں، پلی بڑھی ہوں، انجوائمن حاصل کی ہے۔

بہت عرصہ ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے۔ بہت جی چاہ رہا تھا۔ یہاں آئی تو بیمار پڑ گئی..... دراصل.....“ اس

نے تہتہ لگایا، اونچا تہتہ۔

”دراصل اپنے گھر اور اماں کو دیکھ کر آرام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دم سے جیسے جھکن اتر آئی تھی جسم

وجہ میں..... سوچا.....“

اس نے پھر تہتہ لگایا پہلے سے زیادہ بلند۔

”کچھ دن عیش کر لیں، کالم تو ساری زندگی ہی لکھتے ہیں..... اور کام بھی عمر بھر کرنا ہی ہے۔“

پروفیسر عادل گہری نظر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی اس لڑکی کے ساتھ۔ بظاہر بہت بولڈ نظر آنے والی یہ لڑکی انہیں اپنے اندر سے بہت ٹوٹی اور بکھری ہوئی لگی۔ شہریار کچھ بتا تو رہا تھا اس کی بیماری کے متعلق لیکن اس وقت انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا بتایا تھا۔ خود بخود ہی آمنہ صفی کے لیے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا..... انہیں لگا جیسے اس لڑکی کو ان کی ضرورت ہو۔

ان کی مدد کی۔

لیکن کس طرح کی مدد؟

بیان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

تب ہی آمنہ صفی نے سراٹھایا۔

”کیا سوچ رہے ہیں عادل صاحب!“

”ہاں!“ وہ چونکے ”سوچ رہا تھا آپ نے جس پہلی ملاقات کا ذکر کیا تھا وہ کہاں ہوئی تھی؟“

”پروفیسر ظہور الحسن کے ہاں!“

”اچھا!“ انہیں اچانک یاد آ گیا۔ تین چار سال پہلے ظہور الحسن کی ویڈیو اینیورسری میں ظہور نے انہیں ایک دہلی پتلی لڑکی سے متعارف کروایا تھا۔

”یہ آمنہ صفی ہیں ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ۔ ان کی پہلی کتاب حال ہی میں آئی ہے اور بیک جزیئین نے اسے بہت پسند کیا ہے۔“

تب انہوں نے سرسری نظر سے اسے دیکھا تھا۔ دراصل اس وقت وہ یورپ میں تھیرڈ کی تاریخ پر ملک شیردل سے بات چیت کر رہے تھے۔ سر کو ہلکا سا ٹم کر کے وہ پھر سے شیردل کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”اس کے بعد پھر آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“ آمنہ صفی نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا۔

”ہاں آپ کے آرٹ کے متعلق مضامین مختلف میگزین میں پڑھتی رہی۔ انگلش لٹریچر سے متعلق آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔“

”یونہی بس تھوڑی بہت اسٹڈی کرتا رہتا ہوں۔“ انہوں نے انکار سے کام لیا۔

تب ہی خدا بخش چائے لے آیا اور ساتھ ہی اس نے مجتبیٰ حیدر کے فون کے متعلق بتایا تو وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مس آمنہ چند منٹ پلیز!“

مجتبیٰ حیدر نے انہیں ایک ادبی محفل میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

”تم تیار ہوئیں ابھی چندرہ منٹ تک تمہیں پک کر لیتا ہوں۔“

”مگر اس وقت ممکن نہیں۔“

”یار بڑے خوب صورت چہرے ملیں گے دیکھنے کو۔ کیا خبر تمہارے عشق کو بھی کوئی بیکر محسوس مل جائے۔“

اگرچہ عمر میں مجتبیٰ حیدر ان سے بہت بڑے تھے لیکن آپس میں بے تکلفی تھی۔

”شاید وہ بیکر محسوس اس دنیا میں کہیں نہیں ہے۔“ پروفیسر عادل ہولے سے ہنسنے پر ابلم یہ ہے مجتبیٰ حیدر صاحب کما اس وقت ایک مہمان خاتون موجود ہیں۔“

”آہا ہا..... خاتون!“ مجتبیٰ حیدر نے قہقہہ لگایا ”کیا اسم مبارک پوچھا جاسکتا ہے؟“

”آمنہ صفی!“

”آمنہ صفی؟“ مجتبیٰ حیدر نے دہرایا ”ہمیں بھی بہت اشتیاق ہے ان سے ملنے کا۔ پچھلے دنوں ان کے کالموں نے خاصی دھوم مچا رکھی تھی۔ آج کل تو عائب ہیں۔ بہت دنوں سے ان کا کوئی کالم نظر نہیں آ رہا۔

بائے دیوئے تمہارے پاس کیسے پہنچ گئیں؟“

”جس طرح آپ پہنچے تھے ایک دن۔“

”بہت خوب!“ مجتبیٰ حیدر ہنسا ”بہر حال آمنہ صفی سے ملنے کے لیے اس ادبی تقریب کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ سو میں چندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

”آمنہ صفی تمہارے نادلوں کی ہیر دھنوں سے بالکل مختلف ہیں۔“ پروفیسر عادل نے جتایا۔

”کوئی بات نہیں میں پھر بھی آ رہا ہوں۔“

پروفیسر عادل، مجتبیٰ حیدر کو خدا حافظ کہہ کر واپس آئے تو خدا بخش قالین پر بڑے آرام سے بیٹھا ہوا آمنہ صفی سے باتیں کر رہا تھا اور آمنہ صفی بڑے انتہاک سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”خدا بخش ابھی مجتبیٰ صاحب آئیں گے انہیں ادھر ہی بھیج دیتا۔“ پروفیسر عادل نے بیٹھتے ہوئے خدا

بخش کی طرف دیکھا۔

”جی بہتر آپ کے لیے چائے بناؤں؟“

”ہاں بنا دو۔“

”بہی مس آمنہ!“ چائے کا کپ لے کر وہ آمنہ صفی کی طرف متوجہ ہو گئے ”تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟“

”پروفیسر ظہور الحسن کے ہاں کی پارٹی میں ہونے والی ملاقات کا ذکر ہو رہا تھا اور کیا آپ یقین کریں

گے عادل صاحب کہ میں اس روز آپ کی ادھوری رہ جانے والی گفتگو سننے آئی ہوں۔“

”کمال ہے!“ پروفیسر عادل نے حیرت سے اسے دیکھا ”اتنے سالوں بعد آپ کو اس ادھوری گفتگو

کو سننے کا خیال کیسے آ گیا۔“

”دراصل.....“ آمنہ صفی نے وضاحت کی ”کئی بار خیال آیا تھا۔ بہت مدلل گفتگو تھی آپ کی۔ کئی دفعہ

سوچا تھا کہ کبھی آپ سے ملاقات ہو تو اس موضوع پر آپ سے بات کی جائے آپ کو سنا جائے۔ اتنی کم

عمری میں اتنی تاج لیکن پھر آپ سے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی۔ اب لاہور آئی تو ڈاکٹر شہریار نے آپ کا ذکر کیا تو بے اختیار آپ سے ملنے کو جی چاہا۔

آمنہ صفی نے بات مکمل ہی کی تھی کہ بھتیجی حیدر السلام علیکم کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

”یہ آمنہ صفی ہیں..... اور یہ بھتیجی حیدر ہیں ناول نگار۔“ پروفیسر عادل نے تعارف کروایا ”پچیس سال سے رومانوی ناول لکھ رہے ہیں اور ابھی تک ان کا موضوع پرانا نہیں ہوا..... وہی ایک لڑکا اور ایک لڑکی..... ان کے ناولوں میں روپ بدل بدل کر آتے ہیں۔“

”عادل میاں، تم چاہے جو بھی کہتے رہو، لڑکا اور لڑکی میرے ناولوں میں روپ بدل بدل کر آئیدہ بھی آتے رہیں گے اس لیے کہ محبت کا موضوع کبھی پرانا نہیں ہوتا۔“

آمنہ صفی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”اپنے اسکول اور کالج کے ابتدائی دور میں میں نے آپ کے ناول پڑھے..... بڑی خوب صورت دنیا ہوتی ہے آپ کے ناولوں میں۔ بہت اثر کیونو دیا، میں اتنی میں تو وہ ناول پڑھتے ہوئے خود کو ناول کا ایک کردار ہی سمجھنے لگتا ہے آدمی۔ ویسے بھتیجی صاحبہ یہ اتنی خوب صورت دنیا جو آپ کے ناولوں میں ہوتی ہے، حقیقت میں بھی ایسی دنیا آپ نے دیکھی؟“

”کہانیاں حقیقتوں سے ہی جنم لیتی ہیں مس آمنہ!“ بھتیجی حیدر نے بیٹھتے ہوئے گول مول سا جواب دیا۔

”کیا اتنی بچی اتنی شدید محبتیں ہوتی ہیں دنیا میں..... آپ کا ایک ناول پڑھا تھا میں نے ”خواب اور تعبیریں“ اس میں جتنی شدید محبت آپ کا ہیر و کرتا ہے..... اور آپ کی ہیر و کرتی ہے۔ کیا اتنی شدید محبت ہو سکتی ہے..... کیا محبتوں میں اتنی قربانیاں دی جاسکتی ہیں جیسی قربانیاں آپ کا ہیر و کرتا ہے؟“

”ہاں بالکل!“

”مس آمنہ ان کے سارے ناول خوابوں پر ہی مبنی ہیں۔“ پروفیسر عادل نے چوٹ کی۔

”نہیں خوابوں پر مبنی نہیں ہیں ان میں پچاس فیصد حقیقتیں ہیں۔“

”یعنی جو آپ نے لکھا وہ آپ نے مشاہدہ کیا؟“

”کچھ مشاہدہ، کچھ میرا تجربہ۔“

”یعنی وہ آپ کی محبتیں ہیں؟“ آمنہ صفی نے تہقیر لگایا۔

”میری بھی ہو سکتی ہیں۔“ بھتیجی حیدر سنجیدہ نظر آ رہے تھے ”میں نے عارفہ سے محبت کی۔ یہ بڑا طوفانی قسم کا عشق تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر عارفہ مجھے نہ ملی تو میں مرجاؤں گا۔ تب میں اسٹوڈنٹ تھا۔ میرا کوئی فیوچر نہ تھا۔ میرے پاس رہنے کو ڈھنگ کا مکان بھی نہ تھا۔ عارفہ کے والدین اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں کیسے دیتے بھلا۔ سو عارفہ کی شادی ہو گئی..... کچھ عرصہ میں درد دل لیے پھر پھر ہولے ہولے سنبھل

گیا..... اب سنبھل میری بیوی ہے۔ میری محبت ہے ہماری شادی محبت کی شادی ہے۔ میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے عارفہ سے محبت نہیں کی تھی یا پھر اب میں سنبھل سے محبت نہیں کرتا۔ جب میں عارفہ سے محبت کر رہا تھا تو اپنی پوری شدت کے ساتھ کر رہا تھا اور اب میں سنبھل سے محبت کرتا ہوں تو اتنی ہی شدتوں کے ساتھ..... ایک دفعہ عارفہ مجھے ملی تھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بہت خوش اور بہت مطمئن..... حالانکہ اس نے مجھ سے محبت کی تھی..... یہ نہیں کہ نہیں کی تھی اور اب اسے اپنے شوہر سے بھی محبت ہے۔“

”بھتیجی صاحبہ یہ آپ کن الجھاؤں میں ڈال رہے ہیں؟“ پروفیسر عادل نے انہیں ٹوکا۔

”تیری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں عادل ملک!“ بھتیجی حیدر نے ایک نظر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا اور پھر آمنہ صفی کی طرف متوجہ ہو گئے ”ہاں تو مس آمنہ میں کیا کہہ رہا تھا..... کہ محبت جب ہوتی ہے تو محبت ہوتی ہے فرق آتا ہے حالات میں تبدیلیاں حالات میں ہوتی ہیں۔ آج اگر آپ کسی سے انتہائی شدت سے محبت کر رہے ہیں تو دس سال بعد ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ کیا حماقت تھی..... دس سال بعد وہ محبت آپ کو فضول لگے گی۔ یہ حالات کی تبدیلی ہے محبت کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ محبت تو جب تھی تو تھی۔“

”بہت بڑا کر رہے ہیں آپ بھتیجی!“ پروفیسر عادل نے سگریٹ سلگایا۔

”ایک طرف تم محبتوں کے متلاشی ہو اور دوسری طرف ان کے ذکر سے گریزاں۔ یا تم ان محبتوں کی نفی نہیں کر سکتے۔“

”مگر میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ آپ اور آمنہ بات کر رہے تھے۔ میں تو خود کو اس سے خارج از بحث سمجھ رہا ہوں۔“

”محبت تاپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا پھر کیسے پتا چلتا ہے کہ یہ محبت سچ ہے، کھری ہے، جھوٹ نہیں ہے؟“ آمنہ صفی نے بھتیجی حیدر کی طرف دیکھا۔

”بس ایک ادراک ہوتا ہے جو اندر سے اٹھتا ہے کہ ہاں یہ سچ ہے۔“

”یہ ادراک اور یہ آگہی کیا آگہی جھوٹ ہو سکتی ہے؟“

”نہیں آگہی جھوٹ نہیں ہوتی، ادراک سچ ہوتا ہے۔“ بھتیجی حیدر نے پروفیسر عادل کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا ”ہر آدمی کی اپنی حد ہوتی ہے۔ ممکن ہے میری انتہا وہ ہو جو دوسروں کی ابتدا ہو۔ میں نے اپنی انتہا تک پہنچ کر محبت کی ہو..... اور.....“

”وہ جی.....“ خدا بخش حواس باختہ سا اندر داخل ہوا ”ہسپتال سے فون آیا ہے۔ کال میاں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔“

پروفیسر عادل ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ آمنہ صفی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میرا بھائی ہے۔“ وہ تارکیزی سے باہر نکلے۔ آمنہ صفی اور یحییٰ حیدر بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر آ گئے۔



ڈاکٹر معید آج بڑے دنوں بعد گھر آئے تھے۔ عاشی، مریم اور نینا تینوں لان میں کچھی کرسیوں پر بیٹھی کپ لگا رہی تھیں۔ ڈاکٹر معید سیدھے ان ہی کی طرف آئے۔

”ماما گھر پر نہیں ہیں۔“ مریم نے بے پروائی سے بتایا۔

”آپ سب لوگ تو ہیں نا۔“ وہ مسکرائے ”اور آج تو میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

”جی تشریف رکھیے۔“ مریم بہت مہذب ہو رہی تھی۔

”تھیک یو۔“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے وضاحت کی۔۔۔۔۔ ”در اصل میں آج بہت ہوم سیک فیل کر رہا تھا۔ انکل بھی گھر پر نہیں تھے۔ ایک دم دل گھبرا گیا تو سوچا کیوں نا۔ آپ لوگوں سے ملا جائے۔“

”کیا آپ کے والدین یہاں نہیں ہوتے؟“ عاشی نے پوچھا۔

ڈاکٹر معید نے جو مریم سے مخاطب تھے چونک کر اسے دیکھا۔۔۔۔۔ ”میری ماما تو میرے بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں۔ ڈیڈی انگلینڈ میں ہیں۔“

”آپ کے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟“ عاشی کی طبیعت میں تجسس بہت تھا اور وہ ہر شخص کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔

”میرے ڈیڈی سرجن ہیں۔“ ڈاکٹر معید اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”آپ کے ڈیڈی سرجن آپ کے انکل سرجن اور خود آپ بھی ڈاکٹر۔۔۔۔۔ اور کیا اب اپنے بچوں کو بھی ڈاکٹر بنائیں گے۔“ نینا نے جیوگم منہ میں ڈالتے ہوئے مصومیت سے پوچھا۔

”گڑیا۔“ ڈاکٹر معید نے ”ابھی تو بچے ہیں ہی نہیں۔ جب ہو جائیں گے تو پھر سوچیں گے کہ انہیں کیا بننا چاہیے۔۔۔۔۔“

”کیا آپ کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔۔۔۔۔؟“ عاشی نے حیرت سے پوچھا۔

”بد قسمتی سے۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائے۔

”کیوں آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ آپ تو اتنے اچھے ہیں۔“ عاشی کو بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی۔

ڈاکٹر معید کی نظریں مریم کے چہرے پر سے ہوتی ہوئی عاشی کے چہرے پر آئیں ”بہت سارے اچھے لوگوں کی بھی شادی نہیں ہوتی۔“

”لیکن آپ تو ڈاکٹر ہیں نا۔“ عاشی نے پھر بیوقوفوں کی طرح کہا تو ڈاکٹر معید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے لڑکیوں کو کریر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آرمی افسر، انجینئر وغیرہ ان کے آئیڈیل ہوتے ہیں۔“

”اور آپ کا آئیڈیل کیا ہے۔“ ڈاکٹر معید کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”میرا آئیڈیل۔“ عاشی نے حیرانی سے کہا ”میں نے تو ابھی تک کوئی آئیڈیل نہیں بتایا اور پھر ہماری ٹیچر کہتی ہیں آئیڈیل کبھی نہیں ملا کرتے اس لیے نہیں بنانا چاہیے۔“

”آپ کی ٹیچر تھیک کہتی ہیں۔ اس دنیا میں بہت کم لوگوں کو آئیڈیل ملا کرتے ہیں۔“

”اچھا تو کیا آپ کو بھی اپنا آئیڈیل نہیں ملا۔ اسی لیے آپ نے شادی نہیں کی؟“

”نہیں ایسی بھی کوئی بات نہ تھی۔ میں بھی کبھی آئیڈیل وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑا۔“

مریم کو ان کے گفتگو سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر معید کو مخاطب کیا۔

”آپ ہوم سیک فیل کر رہے ہیں تو پھر گھر۔۔۔۔۔ آئی مین انگلینڈ کیوں نہیں چلے جاتے۔“

”جانا تو چاہ رہا تھا لیکن۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر معید کی نظروں نے مریم کا جائزہ لیا۔ ”بہ جانے کی دو وجوہات ہیں ایک تو جس مقصد کے لیے ڈیڈی نے بھیجا تھا وہ پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ دوسرے انکل ہادی کی تنہائی جانے سے روکتی ہے۔ وہ منع تو نہیں کرتے لیکن میں جب بھی جانے کا نام لیتا ہوں ادا اس ہو جاتے ہیں۔“

”انکل ہادی نے بھی تو شادی نہیں کی۔“ عاشی نے کہا۔

”ہاں ان کو اپنے پروفیشن سے بہت محبت تھی۔ آج بھی کہتے ہیں کہ ان کی شادی اپنے پروفیشن سے ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ ہمارے ننھے دوست کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“

”مور ڈیڈی کے ساتھ باہر گیا ہے۔“ نینا نے بتایا ”اور ڈیڈی مجھے ساتھ لے کر نہیں گئے۔“

”تو ہم کسی دن اپنی گڑیا کو ساتھ لے جائیں گے۔“

”سچ۔۔۔۔۔“ نینا خوش ہو گئی۔۔۔۔۔ ”میرے سب دوستوں کے ڈیڈی می ان کو باہر لے کر جاتے ہیں۔ بنگلی کے می ڈیڈی تو ہر ویک اینڈ پر انہیں گھمانے لے جاتے ہیں اور ہماری ماما۔۔۔۔۔ یا تو بیمار رہتی ہیں یا پھر آنٹی نرگس کے ساتھ اکیلی گھومنے چلی جاتی ہیں اور پاپا اپنی اسٹڈی میں گھسے رہتے ہیں اور باہر جاتے ہیں تو ہمیں لے کر ہی نہیں جاتے۔۔۔۔۔“

”نینا۔۔۔۔۔“ مریم نے اسے گھورا ”نری بات۔ اس طرح ماما پاپا کے متعلق بات نہیں کرتے۔“

”تو وہ کیوں نہیں ہمیں لے کر جاتے۔“ اس نے منہ بتایا اور پیکٹ میں سے ایک چوونگ نکال کر ڈاکٹر معید کی طرف بڑھائی۔

”تھیک یو گڑیا۔“ انہوں نے چوونگ لے لی ”ہم اس ویک اینڈ پر تمہیں باہر لے کر جائیں گے۔۔۔۔۔ کہاں جائیں گی آپ؟“

”چھانگا مانگا۔۔۔۔۔ میں نے ابھی تک چھانگا مانگا بھی نہیں دیکھا۔“ اس نے خوشی سے بتایا۔

”تو یہ طے ہوا۔ میں نے بھی ابھی تک چھانگنا نہ دیکھا اور اگلے ویک اینڈ پر ہم سب چھانگنا جا سکیں گے۔“

”ڈاکٹر معید.....“

مریم نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے روک دیا۔

”مس احمد پلیر..... بچوں کو اپنی خواہشات کا اظہار کرنے دینا چاہیے..... نہیں تو یہ منہ می منہ خواہشیں جب اندر جمع ہوتی رہتی ہیں تو ان کے بوجھ سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ معمولی سی خواہشیں ان کا پورا کرنا تو ہمارے اختیار میں ہوتا ہے نا۔“

”لیکن وہ ماما اور پاپا.....“

”ان سے میں خود بات کر لوں گا بلکہ ہم سب جائیں گے۔ ان کو بھی ساتھ لے کر چلیں گے اور اب آپ جائیں۔ ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لائیں۔“

”اور ساتھ میں پکڑے اور کباب بھی۔“ نینا کو پکڑے اور کباب بہت پسند تھے۔

”آئی نرس۔“ عاشری نے اسے چھیڑا۔

میڈم نرس کو چٹ پٹی چیزیں بہت پسند تھیں۔ جب بھی وہ آتیں پکڑوں اور کہاؤں کی فرمائش ضرور کرتیں۔ دراصل ساری زندگی تو گلے کی حفاظت کے خیال سے انہوں نے چٹ پٹی چیزیں کھانے سے پرہیز کیا تھا اور اب ساری کسر نکال رہی تھیں..... بانو بازار سے چاٹ کھانے جاتیں یا کرش سے لڈو بیڑے کھا کر آتیں تو ضرور تینا اور نرب عثمان کو حیرت ہوتی۔

”ہائے نرس! تم نے وہاں کھڑے ہو کر لڈو بیڑے کھائے۔ لوگ اکٹھے نہیں ہو گئے تھے کیا.....“

”بھائو میں جائیں لوگ۔“ وہ ایک شاندار گالی سے انجانے لوگوں کو نواز تیں ”اب کیا ان کے خوف سے اپنی خواہشیں بھی پوری نہ کریں۔ زینی ڈیر کتنا دل چاہتا ہے کہ کسی دن بانو بازار میں کھڑے ہو کر چاٹ کھائیں اور منہ اور آنکھوں سے پانی نہ بہے۔ لیکن لوگ۔ ہمارے ملک کے یہ لوگ..... شاپنگ کرنے کے لیے بھی بعض اوقات برقع اوڑھ کر نکلتا پڑتا ہے۔“

”یہ دراصل ان کی محبت ہے۔“

”بھائو میں جائے ان کی محبت۔“

”دیکھیں آپ انہیں منع کریں جی کو۔ مجھے چھیڑتی ہیں۔“ نینا نے شکایت لگائی تو ڈاکٹر معید جو مریم کے جانے کے بعد نہ جانے کیا سوچنے لگے تھے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

”میں کوئی آئی نرس ہوں اور میری آواز کوئی ان جیسی ہے۔“

”ارے نہیں ہماری گڑباز بہت اچھی ہے اور اس کی آواز تو بہت پیاری ہے۔ بھلا کوئی میڈم جیسی ہے۔“

عاشری چہرہ نیچے کر کے ہنسنے لگی۔

اور معید کو ہنسنی ہوئی وہ بے حد دلکش لگی اور یہ حقیقت ہے کہ عثمان احمد اور مسر عثمان کے سارے بچے ہی بہت دلکش اور بہت سلجھے ہوئے تھے حالانکہ مسر عثمان شاید اپنی بیماری کی وجہ سے انہیں زیادہ توجہ نہیں دے پاتیں.....

”ڈاکٹر معید۔“ نینا نے انہیں مخاطب کیا۔

”نینا۔“ عاشری نے اسے ٹوکا..... ”ایسے نہیں بلاتے۔“

”پھر کیسے بلاؤں۔“

”معید بھائی کہہ لیں۔ میرے کوئی چھوٹے بہن بھائی نہیں ہیں نا.....“

”ٹھیک ہے.....“ نینا نے سر ہلایا۔

”تو معید بھائی، ویک اینڈ کا پروگرام پکا ہے نا۔“

”ایک دم پکا.....“ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا اور نینا نے اپنا ننھا سا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ماما منع تو نہیں کریں گی۔“ نینا کو خوف تھا۔

”منع کریں گی تو ہم سنالیں گے.....“ ڈاکٹر معید نے اسے تسلی دی اور سوچا۔

”یہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں اگر بچپن میں پوری نہ ہوں تو زندگی بھر بہت تنگ کرتی ہیں۔ وہ خود جب چھوٹے سے تھے تو ان کا بھی کتنا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی ڈیڈی اور مری کے ساتھ کبھی چمک پر یا کبھی سیر کرنے جایا کریں..... اور کبھی آئس کریم کھانے لیکن امی بیمار رہتی تھیں اور ڈیڈی کے پاس کبھی وقت ہی نہیں ہوتا تھا اور اب بھی جب کبھی بچپن کی نا آسودہ خواہشوں کا خیال آتا تھا دل کو جیسے کوئی ٹشٹی میں لے لیتا تھا۔

”آپ اندر چل کر چائے پیئیں گے یا یہاں ہی؟“ شریف نے آکر بولو چھا تو وہ چونکے۔

”یہاں ہی لے آؤں۔“ یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔ اندر تو اس وقت ٹھنڈ کا احساس ہوتا ہے۔“

مریم ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

”معید بھائی، معید بھائی، میں آپ کو اپنی ڈرائنگ بک دکھاؤں۔“ نینا نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں ضرور.....“

وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی تو وہ عاشری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”پڑھائی کے علاوہ آپ کے کیا شوق ہیں.....؟“

”کچھ نہیں۔“ عاشری نے بتایا ”بس ایسے ہی ٹی وی وغیرہ دیکھ لیتی ہوں لیکن جب میں مری میں تھی تو

سکڑ مرنا بیچنے کا سنا تھا یا کرتی تھیں۔“

”اچھا“ پہلے آپ مری میں پڑھتی تھیں۔ میں نے بھی ابتدائی تعلیم مری میں حاصل کی ہے اور پھر پاپا

انگلینڈ گئے تو میں بھی ان کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ مجھے مری کا اسکول اور مدر اور سکڑ ابھی تک یاد ہیں۔“

ڈاکٹر معید کو اپنے بچپن کی باتیں اس سے کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عاشی بھی خوش ہو کر اپنے اسکول کے متعلق اسے بتانے لگی۔

”جہاں وہ کثیر پوائنٹ پر پہنچا اتر کر جائیں تو کونے میں چھوٹی سی دکان پر ایک بابا سا بیٹھا ہوتا ہے۔ سفید داڑھی والا۔ مختلف ڈیزائن کی ٹوکریاں بیچتا ہے۔ ساتھ ساتھ بنا جاتا ہے۔ میں جب بھی کثیر پوائنٹ پر جاتی تھی تا تو اس سے ضرور کوئی چیز خریدتی تھی۔ وہ ہم سب بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ گل شیر خان.....“

”ارے گل شیر خان۔“ ڈاکٹر معید نے خوشی سے کہا ”وہی نا جس کا ایک بیٹا ٹرک کے نیچے آگیا تھا اور جسے وہ مری کا نوٹ میں پڑھا رہا تھا۔“

”ہاں ہاں وہی.....“ عاشی نے بھی خوشی سے جواب دیا ”وہ ہم سے اکثر اپنے بیٹے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔“

”اور ہم سے بھی..... لیکن تب اس کے بال سفید نہیں تھے۔ کوئی کوئی سفید بال تھا زیادہ کالے تھے۔“

”کمال ہے۔“ عاشی کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک دم روشنی سی اتر آئی تھی اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بہت جوش سے ڈاکٹر معید کو مری کی مختلف جگہوں کے متعلق بتا رہی تھی اور ڈاکٹر معید بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ اس کے چہرے پر بھی نظر ڈال لیتے تھے۔

تب ہی زینب عثمان احمد کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی اور وہ گاڑی سے اتر کر سیدھی لان میں آگئیں۔ ڈاکٹر معید کی ان کی طرف سے پیٹھ تھی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔

”السلام علیکم مسز عثمان۔“

”وعلیکم السلام ڈاکٹر معید“ آپ کب آئے؟“

ان کی نظریں عاشی کے چہرے پر تھیں جس کے رخساروں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں انوکھی سی چمک..... یہ عاشی..... انہوں نے پھر غور سے اسے دیکھا اور پھر ڈاکٹر معید کو۔

”میں کچھ ہی دیر قبل آئی تھا۔ بچوں سے ملنے۔ خاص طور پر تیمور سے۔ بہت مزے کی باتیں کرتا ہے۔“

”لیکن تیمور.....“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے عاشی کی طرف دیکھا۔

”وہ پاپا کے ساتھ گیا ہے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔“ عاشی نے بتایا۔

”اور یہ مومو اور نینا کہاں ہیں؟“ انہوں نے ڈاکٹر معید کو بالکل نظر انداز کیا ہوا تھا۔

”مومو چائے کا کپنے گئی ہے اور نینا اپنی ڈرائنگ بک لینے۔“

عاشی کو اس طرح دیکھنے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ عجیب کھوجتی ہوئی نظریں تھیں ان کی۔ تب ہی نینا اندر سے ڈرائنگ بک اٹھائے بھاگتی ہوئی آئی اور ڈرائنگ بک ڈاکٹر معید کے ہاتھوں میں دے دی اور پھر زینب عثمان کی طرف دیکھا۔

”ماما..... ہم معید بھائی کے ساتھ پکنک پر جائیں گے چھانگا مانگا۔“

”اچھا۔“ انہوں نے اس کے رخسار پر تھپتھپائے ”ضرور جانا۔“

اور ڈاکٹر معید کی طرف دیکھا..... ”بیٹھے نا ڈاکٹر پلیز۔“

”جھینک نو۔“ ڈاکٹر معید ڈرائنگ بک ہاتھ میں لیے بیٹھ گئے۔

”اور یہ ہم سے چوری چوری پکنک کا کیا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔“

”چوری چوری نہیں مسز عثمان۔“ انہوں نے نینا کی طرف دیکھا ”یہ ہماری گڑیا کی خواہش ہے اور ہم

نے کہا ٹھیک ہے اس ویک اینڈ پر چلیں گے اور آپ سب کو ہم نے شامل کرنا ہی تھا۔ آپ عثمان صاحب

سب ساتھ چلیں گے۔ بچوں کی یہی تو چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں۔“

”ہاں ضرور چلیں گے اتنی بڑی لائف گزری ہے نا۔ ان باتوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔“

”آپ نے مسز عثمان میرے آنے کا سنا تو نہیں کیا۔ میں گھریلو زندگی کو ترسا ہوا ہوں۔ آپ کے

بچے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ بہت سلجھے ہوئے اور پیارے بچے ہیں۔“ ڈاکٹر معید سنجیدہ ہو گئے۔

”نہیں بالکل نہیں معید ڈیر۔“ مسز عثمان نے بے تکلفی سے کہا..... ”میں خود تمہیں بہت مس کر رہی

تھی۔ سوچا تھا کہ بیماری پر ہی تم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ سو جب کسی دن بہت دل چاہا تم سے ملنے کا تو

پیار بن جائیں گے۔“

”ارے نہیں مسز عثمان، بیمار ہرگز نہیں ہوئے گا۔ جب آپ حکم دیں گی حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ کی

بیماری سے خوف آتا ہے۔“

”ہائیں یہ کیا بیماری ہے۔ میں تو خود دھک آجاتی ہوں۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے خود کشی کر لوں.....“

وہ افسردہ لگنے لگیں۔

”ارے نہیں مسز عثمان..... سچ تو یہ ہے کہ ہماری وغیرہ کچھ نہیں ہے آپ کو۔ معمولی ڈپریشن ہوتا ہے۔

آپ معمولی معمولی باتیں اپنے اوپر طاری مت کیا کریں۔ زندگی میں تو بڑے بڑے الیے ہو جاتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے آپ کی زندگی میں کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ اسٹیشن ہے، پیارے پیارے بچے ہیں۔ محبت

کرنے والے چاہنے والے شوہر ہیں۔“ انہوں نے خلوص سے کہا۔

”شاید.....“ زینب عثمان نے آنکھوں سے کہنا۔

”شاید نہیں یقیناً مسز عثمان۔ یہ شاید ہی تو گڑبڑ کرتا ہے۔“ ڈاکٹر معید کا لہجہ ناصحانہ تھا ”اس بات کا

یقین رکھیں کہ آپ خوش قسمت خواتین میں سے ایک ہیں۔“

عاشی بور ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر معید نے بات کرتے کرتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ مناسب قد

دکھن نقوش۔ وہ بہت حد تک زینب عثمان سے مشابہ تھی۔ ان کی آنکھوں میں واضح ستائش تھی۔

”آپ جاری ہیں عاشری؟“

اس نے سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر معید کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔

”آپ کے نزدیک خوش قسمتی کیا ہے ڈاکٹر معید؟“ مسز عثمان نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونکے۔
”نواز نے والے نے آپ کو جی بھر کے نوازا ہے مسز عثمان، پھر بھی آپ پوچھ رہی ہیں کہ خوش قسمتی کیا ہے۔“

”بعض اوقات لوگوں کی نظر میں جو بہت خوش قسمت ہوتا ہے وہ حقیقت میں خوش قسمت نہیں ہوتا۔“
نہن عثمان نے گہری سانس لی ”خوش قسمتی صرف پر آسائش گھر، بچوں، دولت اور اسٹیٹس پر ہی تو مبنی نہیں ہے۔ خوش قسمتی کا تعلق دل کی خوشی سے بھی ہوتا ہے۔“

”اور کیا آپ اس خوشی سے محروم ہیں؟“ ڈاکٹر معید نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔
سیلیطے سے کیا ہوا میک اپ۔

سانچے میں ڈھلا ہوا جسم۔

وائٹ ساڑھی میں تو اور بھی دلکش لگ رہا تھا۔

اور یہ حقیقت تھی کہ ان پر ہر رنگ سوٹ کرتا تھا اور یہ وائٹ رنگ تو جیسے ان کے حسن میں اضافے کے لیے تخلیق ہوا تھا۔

”پہلے۔“ انہوں نے نظریں جھکا لیں ”آج بتا ہی دیں کہ آپ کا دل کیا چاہتا ہے۔ اس طرح آپ کو ٹریٹ کرنے میں آسانی رہے گی۔“

”میرا دل.....“ نہن عثمان نے آنکھیں زور سے بھیج کر کھولیں تو ان میں نمی سی تھی ”پتا نہیں میرا دل کیا چاہتا ہے معید۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی لیکن یہ بہت نا آسودہ ہے۔ بہت نامطمئن ہے تمہیں کیا خبر معید کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت تو وہ عورت ہے جو ایک کچے گھر میں رہتی ہے لیکن جس کا دل آسودہ ہے۔“
ان کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ڈاکٹر معید نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

یہ اتنے بڑے گھروں میں رہنے والوں کے دل بھی اتنے نا آسودہ ہوتے ہیں اور اتنے نامطمئن اور یہ مسز عثمان کا دل بھلا کیوں نا آسودہ ہے۔ ان کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کہ دروازہ کھلا اور مریم موبائل لیے ہوئے باہر آئی۔

”ماما آپ کی کال ہے۔“

”ہیلو۔“ آنکھیں پونچھتے ہوئے انہوں نے کال اٹینڈ کی۔ مریم نے کسی قدر حیرت سے ان کی بیگلی ہوئی پلکوں کو دیکھا اور معید سے سرگوشی کی۔

”کیا ماما کی طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے؟“

”نہیں تو۔“ ڈاکٹر معید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرائے۔

”پھر یہ ماما۔“ اس نے نہن عثمان کی طرف اشارہ کیا۔

”ڈونٹ وری۔“ ان کے لہجے میں شفقت تھی لیکن وہ پریشان ہو کر ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”نرس کا فون ہے۔ لالہ کو اسپتال میں داخل کروایا ہے۔“

”کیا ہوا لالہ کو.....“ مریم کو اس سے بہت لگاؤ تھا۔

”اینڈ کس ہے اچانک درد اٹھا ہے۔ آپ ریٹ ہی ہوگا۔“

”اوہ.....“ مریم کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور اس نے ڈاکٹر معید کی طرف دیکھا ”کیا خطرناک ہوتا ہے؟“

”خطرناک تو معمولی سرجری بھی ہو سکتی ہے لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بہت عام ہے اب تو یہ..... زندگی ہو تو کوئی خوف نہیں ہوتا۔“

”مومو..... یہ شریف کیا کر رہا ہے جا کر دیکھو کب سے ڈاکٹر معید آئے ہوئے ہیں اور.....“

”وہ چائے لا رہا ہے۔“ مریم نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور نہن عثمان سے پوچھا ”ماما آپ اسپتال جائیں گی نا؟“

”ہوں۔“

”تو پھر مجھے بھی لے چلیے گا۔“

”لے جاؤں گی۔“

انہوں نے شریف کی طرف دیکھا جو قریب آ کر چائے ٹیبل پر لگا رہا تھا۔

”چائے بناؤ اور معید، یہ کباب لو..... شریف بہت مزے کے بنا تا ہے۔“ انہوں نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”تھینک یو مسز عثمان.....“ معید نے کباب اٹھا کر پلیٹ میں رکھا۔

مریم چند لمحوں ہی کھڑی رہی اور پھر پوچھا۔

”ماما آپ کب جائیں گی اسپتال؟“

”رات میں عثمان آ جائیں تو پھر.....“

”مجھے ضرور ساتھ لے کر جائیے گا۔“ اس نے جاتے جاتے تاکید کی اور نہن عثمان سر ہلا کر ڈاکٹر معید کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

لالہ کے چہرے پر زردی سی کھنڈی ہوئی تھی اور مریم اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔
”لالہ بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“

”ارے نہیں بالکل اچھی ہوں۔“ وہ مسکرائی ”اور پتا ہے مجھے بہت اچھا لگا ہے کہ تم آئی ہو مجھے دیکھنے۔
”مومن تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔“
”اور مجھے بھی۔“ مریم نے اس کا ہاتھ دبایا۔

میڈم نرس اور نرس عثمان باہر کوریڈور میں کھڑی زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ میڈم نرس کے قہقہوں کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔

”اور تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔“ لالہ نے سرگوشی کی۔
”کیا.....؟“

”مجھے اپنڈکس وغیرہ کا کوئی درد نہیں ہوا تھا۔“
”پھر یہ آپریشن.....“

”یہ.....“ وہ ہنسی ”میں دراصل امتحان نہیں دینا چاہتی تھی اور کل میرا پہلا ہیہ تھا۔“
”اور تم نے امتحان نہ دینے کے لیے آپریشن کروا لیا۔“ مریم کو حیرت ہوئی۔
”ہاں۔“

”اتنی تکلیف برداشت کی اور ڈاکٹرز نے کیسے کہہ دیا کہ یہ اپنڈکس ہے جب کہ نہیں تھا۔“
”درد ڈاکٹرز کو تو ہوا ہی نظر آتا ہے مومن جی..... اور پتا ہے آج کل تو لوگ ویسے ہی اپنڈکس کو آپریٹ کر دیتے ہیں کہ نہ رہے گا بانس نہ بچے گی بانسری۔“

”اور ڈاکٹر کو پتا ہی نہ چلا کہ انہوں نے بلاوجہ آپریٹ کر دیا۔“

”چل گیا تھا۔“ اس نے منہ بتایا ”یہ ڈاکٹر شہر یار بہت تیز ہیں۔ میں نے بھی انہیں ساری بات بتادی، سچ اور وعدہ لے لیا کہ می سے نہیں کہیں گے۔“
”لالہ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”یار کر لو نا یقین.....“

”مگر تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..... تمہیں پتا ہے میں پرسوں رات بھی آئی تھی ماما کے ساتھ تمہیں دیکھنے اور تمہاری حالت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ میں گھر جا کر بہت روئی۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو.....؟“
”تو جو ہوتا دیکھا جاتا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا ”اور پتا ہے ایک بار می کو کراچی جانا تھا ایک کنسرٹ میں شرکت کرنے..... اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائیں۔ بس میں نے می کی نیند کی گولیاں حرا کر کھالیں۔ زیادہ نہیں کھائی تھیں۔ اپنے حساب سے اتنی ہی کھائی تھیں کہ مر مرانہ جاؤں۔“

مریم حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی کہ ڈاکٹر شہر یار نرس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ مریم لالہ کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ شہر یار نے ایک اپنڈکس کی نظر اس پر ڈالی اور پھر نظرس جیسے اس کے چہرے سے ہٹا ہی بھول گئیں۔ میک اپ سے بے نیاز..... گندی رنگت والی لڑکی میں بلا کی کشش تھی۔

آنکھیں جو کاجل کی مہون منت نہ ہوئی تھیں..... بے حد لمبی اور سیاہ تھیں۔
اور اس پر پلکوں کے کھنکھنے جنگل۔

ہونٹوں کی بناوٹ بے انتہا خوبصورت۔
لمبی صراحی دار گردن۔

مریم ان کی نظرس اپنے چہرے پر محسوس کر کے بلش ہو گئی۔ تو شہر یار کو یوں لگا جیسے سنہری رنگ میں کسی نے گلابی رنگ گھول دیا ہو یا سورج ان گلابیوں کے پیچھے ڈوب رہا ہو۔
”السلام علیکم ڈاکٹر شہر یار۔“ لالہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونکے۔
”ہاؤ آریو ناٹی گرل.....“

”فائن۔“ وہ مسکرائی ”آپ کیسے ہیں.....؟“

”میں بھی فائن ہیں۔ میڈم کو پتا چلا آپ کی حماقت کا۔“

”ارے نہیں۔“ وہ کھل کر ہنسی ”می کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا میری حماقتوں کا حال سننے کا۔“

”اور آپ مزید حماقتیں کرتی رہیں گی۔“ ڈاکٹر شہر یار نے میز پر سے اس کی فائل اٹھائی۔

تب ہی نرس عثمان کے ہاتھ پر مردوں کی طرح ہاتھ مارتے ہوئے میڈم نرس اندر داخل ہو گئیں اور ڈاکٹر شہر یار سے بحث کرنے لگیں۔

”یہ کیسا اسپتال ہے۔ وقت پر نرس ہی نہیں ملتی۔ کوئی امینڈمنٹ نہیں ملتا۔ افوہ لالی کو صبح سے وائٹنگ ہو رہی تھی اور کوئی مل ہی نہیں رہا تھا۔ یہ تو خیال کرنا چاہیے کہ لالی کس کی بیٹی ہے میڈم نرس کی جو چاہے تو یہاں کھڑے کھڑے پورا اسپتال خرید لے۔“

وہ تیز تیز بول رہی تھیں۔ ڈاکٹر شہر یار نے فائل میں کچھ لکھا اور فائل بند کر کے میڈم نرس کی طرف دیکھا۔ ”ڈاکٹر کے لیے سب مریض ایک جیسے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کوئی بھی ہوں۔ اگر انہیں کسی نے امینڈمنٹ کیا تو یہ شکایت ڈاکٹر رافع تک پہنچا دوں گا۔“ انہوں نے تحمل سے جواب دیا اور لالہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ نے وائٹنگ کا نہیں بتایا۔ آج نہیں ہونی چاہیے تھیں۔“ انہوں نے فائل گھول کر پھر کچھ آ اور ساتھ کھڑی نرس کو ہدایت دینے لگے۔

”لوگ پرائیوٹ اسپتال میں اس لیے آتے ہیں کہ زیادہ کچر ہوگی۔ اتنا پیسہ خرچ کرتے ہیں لیکن اب تو یہاں بھی وہی حال ہو گیا ہے۔ کوئی خبر لینے والا ہی نہیں۔“ میڈم نرگس پھر بول رہی تھیں۔
”ڈاکٹر رافع اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں جو بھی شکایات ہیں ان سے کرنل چائیس اور لالہ بی بی.....“ میڈم نرگس کی بات کا جواب دے کر انہوں نے اسے مخاطب کیا ”جو ٹیلیفون وغیرہ آپ کو دی جائیں گی انہیں پھینکنا نہیں۔“

”وہ ایک ٹیلیفون پلینز.....“ لالہ نے براہ راست بنایا۔
”سب کھاتی ہیں۔“ شہریار نے سختی سے کہا ”ورنہ کئی دن بستر پر پڑی رہیں گی۔“
”یہاں بڑا مزا آ رہا ہے۔“

اس نے آہستہ سے کہا لیکن شہریار نے سن لیا۔ اس نے اسے دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد نذیب عثمان نے مریم کی طرف دیکھا۔

”تم چلو گی مومو یا ابھی بیٹھو گی؟“
”نہیں ماما، اب چلے ہیں مجھے جا کر ابھی ٹیٹ کی تیاری بھی کرنا ہے۔“
”اوکے لالہ۔“ اس نے لالہ کے رخساروں کو چوما ”تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر تمہارے گھر آؤ“

گی اور باتیں کریں گے ڈھیر ساری.....
”تو کیا اب پھر یہاں دیکھنے نہیں آؤ گی؟“ اس نے پوچھا۔
”اچھا آؤں گی لیکن کل نہیں پرسوں۔“
”پر اس۔“

”پر اس۔“ وہ مسکرائی۔
”اچھا آؤں گی خدا حافظ۔“
”خدا حافظ جانو۔“ میڈم نرگس نے اس کے رخساروں کو چوم لیا۔

”تمہاری بیٹی روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی ہے زینبی۔“
”ہوں۔“ نذیب عثمان نے اسے کسی قدر فخر سے دیکھا۔
”اچھا نرگس میں انشاء اللہ کل آؤں گی۔“
”ضرور آنا۔“

انہوں نے سر ہلا کر مریم کی طرف دیکھا ”کم آن مومو“ اور پھر یک دم جاتے جاتے پلٹیں۔
”تو نرگس پھر تم رومی اور فاروق مری بھیج رہی ہوتا۔“
”ہاں امتیاز لے کر گیا ہوا ہے انہیں ایڈمیشن دلوانے۔“

(رومی اور فاروق دونوں میڈم نرگس کے بیٹی اور بیٹا تھے جو امتیاز علی شاہ کی اولاد تھے۔)

”ہائے می“ آپ فاروق کو بھی مری بھیج رہی ہیں اور رومی کو بھی۔“

”ہاں یہ تو امتیاز کی ضد تھی ورنہ بہت پہلے بھیج دیتی۔“

”اس معاملے میں عثمان نے بھی مجھے بہت مایوس کیا تھا۔“ نذیب عثمان نے افسوس کا اظہار کیا ”اب کھو عاشری اچھا خاصا وہاں پڑھ رہی تھی۔ ذرا سی بیمار ہوئی تو لے آئے لیکن میں نے وہاں بات کر لی ہے..... اور نیکسٹ منٹھ تینوں کو وہاں بھیج رہی ہوں..... عاشری نینا اور مورتیوں کو..... نیو ایڈمیشن ہو رہے ہیں نا..... کلاسز آئندہ ماہ سے اسٹارٹ ہوں گی۔“

”عاشری نینا مورتیوں کو۔“ مریم کا دروازے پر رکھا ہاتھ وہیں ساکت ہو گیا۔ ”تینوں چلے جائیں گے تو میں اکیلی کیا کروں گی۔“ اس نے بے وقوفی کی طرح سوچا اور مسز عثمان کی طرف دیکھا۔ جو ”مینٹھ اتھونی“ کی مدد جو اس کی تعریفیں کرتے ہوئے بتا رہی تھیں کہ میرے ان سے بہت پرانے تعلقات ہیں۔
”دراصل وہ میری ماما کی دوست ہیں۔ میرے اصرار پر وہ مان گئیں کہ عاشری کو بھی لے لیں گے۔ چند ماہ جو اس نے یہاں گزارے ہیں وہ ضائع ہو جائیں گے۔ اب نئی کلاس کے ساتھ اسٹارٹ کرے گی۔“
اور میڈم نرگس ان کے اس فیصلے کو زور و شور سے سراہ رہی تھیں۔ جب کہ کم آنکھوں کے ساتھ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ دھرے مریم حیرت سے سوچے جا رہی تھی کہ آخر کار ماما نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کر لیا اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیوں؟



بعض خواہشیں کیسے اچانک پوری ہو جاتی ہیں۔ سکندر اپنے بیٹے پر لینا سوچ رہا تھا۔ ایک دن اچانک رضوانہ کو دیکھ کر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ رضوانہ کو اپنی زندگی کا رفیق بنائے اور شاید کوئی شہنائی کا لمحہ تھا۔ کوئی قبولیت کی گھڑی تھی کہ رضوانہ کے نام کے ساتھ اس کا نام شامل ہو گیا تھا۔ عجیب سی خوشی تھی جو اس سے سنبھلے نہیں سنبھل رہی تھی۔
اور رضوانہ۔

وہ بھی خوش ہوگی یقیناً۔ ہاں چاچا اور چاچی کو یاد کر کے ضرور روئی ہوگی۔ بھابھو نے بتایا تو تھا۔ خود اسے بھی چاچا کا خیال آیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ وہ رضوانہ کو اتنی خوشیاں دے گا کہ وہ اس دکھ کو..... چاچا اور چاچی کے دکھ کو بھول جائے گی۔

وہ نکاح کے دوسرے دن ہی واپس آ گیا تھا اور رضوانہ اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا اس کا کہ وہ ایک نظر اسے دیکھ لے کہ اس نے بندھن نے اس کے چہرے کو کون سے نئے رنگ عطا کیے ہیں۔

آنکھوں میں کیسے جگنو بھر گئے ہوں گے۔

کیا پہلے کی طرح ہی بات کرے گی۔

یابات کرتے ہوئے شرمائے گی، جھجکے گی۔

اور رخساروں پر گلاب کھل اٹھیں گے۔

وہ کتنی بے تنہا شاخو بصورت ہے۔

شاہد ڈولی سے بھی زیادہ۔

لیکن نہیں، ڈولی کی اپنی خوبصورتی ہے۔

ایسا حسن جس میں خود آگاہی ہے۔

شعلوں کی سی لپک ہے۔

تیز آنچ محسوس ہوتی ہے اس کی قربت میں۔

اور رضوانہ کی خوبصورتی میں بے نیازی ہے۔

معصومیت ہے۔

چاندنی کی سی ٹھنڈک ہے۔

جو ہولے ہولے اترتی ہے اور پورے وجود پر چھا جاتی ہے۔

اس کا حسن جلاتا نہیں۔ مرہم رکھتا ہے۔

لیکن بھلا ڈولی اور رضوانہ کا کیا موازنہ۔

اسے اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔

”ڈولی کا مجھ سے کیا رشتہ کیا تعلق صرف دوبار ہی تو اس سے ملا ہوں..... اور رضوانہ تو میری زندگی

حصہ ہے..... اسے میری زندگی کا حصہ بننا ہے۔“

محسن اور صبح صادق بھی اس کے نکاح پر بہت خوش تھے۔

”یار تو بہت خوش قسمت ہے۔ نہ ظالم سماج ٹکرایا۔ نہ ماں باپ نے رکاوٹیں ڈالیں۔ تو نے بچے

اسے پالیا۔ ایسے خوش قسمت تو کوئی کوئی ہی ہوتے ہیں۔“

اور اسے خود اپنی خوش قسمتی پر رشک آ رہا تھا۔

اس کے واپس آنے پر سب نے خوب ہلاکلا مچایا تھا۔ اس سے زبردستی ٹریٹ لی تھی۔ محسن

دوسرے دوستوں کے علاوہ نیلو فر کو بھی بلایا تھا اور نیلو فر نے بھی خلوص سے اسے مبارک باد دی تھی۔

کے جانے کے بعد جب صرف نیلو فر صبح صادق اور محسن رہ گئے تو محسن نے کہا۔

”بچ سکندر مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ چچا نے یہ اچھا کیا کہ تمہارے رشتے کو

دیا۔ یہ نہیں کیوں مجھے کبھی کبھی خوف آتا ہے جیسے کہیں تو بھی..... چچا کی طرح..... خیر اب تو تمہارا بندھن

بہت مضبوط ہو گیا ہے۔ ٹوٹنے کا امکان نہیں۔“

”کوئی بندھن بھی اتنا مضبوط نہیں ہوتا جو نہ ٹوٹ سکے۔“ نیلو فر نے سنجیدگی سے کہا۔

”خواہ وہ نکاح کا بندھن ہی کیوں نہ ہو؟“ محسن نے پوچھا۔

”ہاں خواہ وہ نکاح کا بندھن ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مرد اسے توڑنے پر آجائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے

روک نہیں سکتی اور اگر وہ نہ توڑنا چاہے تو ایک معمولی وعدے پر بھی قائم ہو جانے والے بندھن کو بھی نہ

توڑے۔“ نیلو فر نے اپنی بات کو دہرایا.....

”نیلو صبح کہہ رہی ہے۔“ صبح صادق نے اس کی تائید کی ”لیکن خوشی کے موقع پر اچھی باتیں

ہونی چاہیں۔“

اور موضوع بدل گیا۔

صبح صادق اسے چھیڑنے لگا۔

”یار کیا چپ چاپ بے غیر ہنگامے کے محبت مل جائے۔ ایسی محبت مل جانے کا کیا مزاجب تک ظالم

سماج نہ آڑے آئے۔ والد محترم بڑک نہ ماریں اوئے ایسی شادی نہیں ہو سکتی۔“ (یہ شادی نہیں ہو سکتی)



صبح صادق اور محسن کالج سے آ کر نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ سکندر نے اٹھ کر کولر سے پانی پیا۔ ایک

دم ہی گرمی پڑنے لگی تھی۔ شیشوں سے آتی دھوپ آنکھوں کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پردے

آگے کر دیے اور سوچا تھوڑی دیر سولے پھر اٹھ کر تھوڑی سی اسٹڈی کر لے گا لیکن ابھی اس نے آنکھیں

موندی ہی تھیں کہ اس کے فلیٹ کی تیل ہونے لگی۔

شاہد محسن اور صبح صادق واپس آ گئے ہیں۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور سامنے ڈولی کو دیکھ کر

حیران رہ گیا۔

”کیوں کیا میری آمد بہت غیر متوقع ہے؟“ اس نے اپنی دلکش آنکھیں سکندر کے چہرے پر

گاڑ دیں۔

”اوہ ہاں۔“ وہ چونکا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

”آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔ ہم نے سوچا ہم ہی چکر لگا آتے ہیں۔“ ڈولی نے اندر آ کر تنقیدی

نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”ہاں نہیں، بتا کر نہیں گئے۔“ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں یہاں سے گزر رہی تھی۔ سوچا تم لوگوں سے ملتی جاؤں۔ آنٹی بھی کہہ رہی تھیں بہت دنوں سے محسن نہیں آیا۔“ وہ محسن کے بیڑ پر بیٹھ گئی۔

سکندر کے لیے اس کی آمد قطعی غیر متوقع اور حیران کن تھی۔ یہ تیسرا سال تھا اور اس سے پہلے تو وہ کبھی آئی نہ تھی۔

ڈارک براؤن بے حد خوبصورت لباس۔ اس کے سانسے میں ڈھلے ہوئے جسم پر بہت بچ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے کو جھکی۔ اپنی بے حد دلکش آنکھیں بار بار اس کی طرف اٹھاتی اور پھر جھکا لیتی۔ پلکوں کا بار بار اٹھنا اور گرنا..... سکندر کنفیوز ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈولی سے کیا بات کرے۔ کاش محسن اور صبح صادق اس وقت یہاں ہوتے تو اتنی مشکل پیش نہ آتی۔

”خیریت ہے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ وہ مسکرائی۔

”ہاں نہیں تو۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا ”یوں ہی کچھ تھکن سی ہے۔ دراصل میں سونے جا رہا تھا۔“

”اودہ پھر تو میں نے یہاں آ کر آپ کو ڈسٹرب کیا۔“

”نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے مجھے نیند آتی ہی نہیں.....“

وہ محسن کی عزیمت بھی اور سکندر نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دل آزاری ہو۔

”آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں چائے کی ضرورت نہیں۔ آپ کہاں تکلیف کریں گے۔“

”اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ وہ سانسے ہوٹل ہے۔ بچہ دے جائے گا۔“

”نہیں سکندر بیٹھ جاؤ..... کچھ دیر بات کرتے ہیں پھر میں چلوں گی۔ مجھے اپنی فریڈ کی طرف جانا تھا۔ اس روز تم سے بات کرنا بہت اچھا لگا تھا.....“

”جی.....“ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

ڈولی ایک دم ہی اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ اس روز راتے میں اتفاقاً ملاقات کے بعد وہ گاؤں چلا گیا تھا..... اور آج پھر ڈولی یہاں موجود تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آج کی آمد اتفاقاً نہ ہو۔ جیسے ڈولی صرف اور صرف اس سے ملنے آئی ہو۔ اس کی گفتگو بات چیت۔

اس کے دیکھنے کا انداز۔

یہ سب اسے پزل کر رہے تھے اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب محسن اور صبح صادق آگئے۔ ان دونوں کو بھی اسے وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

”دیر از م تھنک رائگ ان دا باٹم۔ وال میں کچھ کالا ہے۔“ اس کے جانے کے بعد صبح صادق نے تبصرہ کیا۔

”ارے نہیں۔“ محسن ہنس پڑا ”ڈولی لا ابالی سی لڑکی ہے۔ جب جس وقت اس کے ذہن میں جو بات آتی ہے، مگر گزرتی ہے۔ وہ حقیقتاً یہاں سے گزر رہی ہوگی۔ سوچا ہوگا، گپ لگائے گی۔ یا اس نے بہت سارے سال امریکا میں گزارے ہیں۔ وہ ان باتوں کو نہیں سوچتی کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔“

”مجھے تو لگتا ہے بارش کا دل یہاں کہیں انک گیا ہے۔ اپنا یا سکندر ہے بھی تو شہزادوں کی طرح۔“

صبح صادق کو شک تھا۔

”وہ بڑی میٹریٹک لڑکی ہے۔ اگر اس نے کہیں دل انکا یا تو بہت سوچ سمجھ کر انکائے گی۔ پہلے مالی پوزیشن دیکھے گی۔ اسٹیشن کا جائزہ لے گی اور.....“

محسن کو صبح صادق کی بات سے اتفاق نہ تھا۔ لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ صبح صادق کا خیال صحیح اور محسن کی رائے غلط تھی۔ ڈولی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ سکندر پر مہربان ہو گئی تھی اور سکندر اس سے دامن بچا نہ پار رہا تھا لیکن اس کی مہربانیاں بڑھتی جا رہی تھی اور سکندر غیر محسوس طریقے پر اس پر ہورہا تھا اور اسے خود کچھ خبر نہ تھی کہ انجانی زنجیریں اسے جکڑ رہی ہیں۔ دوران تعلیم ڈولی سے بار بار اس کی ملاقات ہوئی۔ اور ہر بار اس کا دل ہی دل میں اس کی خوبصورتیوں کو سراہا۔

کتنا مکمل حسن تھا اس کا۔

ہر لحاظ سے۔

سب کچھ تھا اس کے پاس۔

دولت اسٹیشن حسن۔

پھر بھی وہ سکندر پر مہربان تھی۔

کیا تھا سکندر ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا سادہ سا لڑکا۔

سکندر دل ہی دل میں اس کی محبتوں پر ممنون ہوتا رہتا تھا۔

بارہا وہ محسن کے ساتھ اس کے بچپن کے گھر گیا تھا۔

اور وہ اس کی چچی سے بھی بہت متاثر تھا۔

کتنا مکمل گھر تھا ان کا۔

اور کتنی مکمل عورت تھیں محسن کی چچی۔

یقیناً محسن کے بچپن کا ایک خوش قسمت انسان تھے۔

وہ ڈولی کی خوبصورتیوں کو سراہتا رہتا تھا۔

اس کی محبتوں کا ممنون تھا۔

لیکن اس نے ڈولی کے ساتھ زندگی گزارنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔

زندگی کا سفر تو اس نے رضوانہ کی ہمراہی میں ہی طے کرنا تھا۔

رضوانہ کے ساتھ وہ کومید تھا۔

رضوانہ اس کی اولین پسند تھی۔

اس کی محبت تھی۔

ڈولی اس کی محبت نہیں تھی۔

ہاں وہ اسے پسند ضرور کرنے لگا تھا۔

محسن نے ڈولی کی اس میں بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر بار بار اسے کہا تھا۔

”سکندر یار، بھول نہ جانا کہ گاؤں میں بھی کوئی تمہارا منتظر ہے۔“

”ارے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

وہ گاؤں جاتا تھا تو اسے ڈولی کا خیال نہیں آتا تھا۔ رضوانہ اس کے سامنے ہوتی تو وہ اسے دیکھتا رہتا۔

ستار ہوتا اور محسوس کرتا رہتا۔ رضوانہ سے بات کر کے اسے جو خوشی محسوس ہوتی تھی وہ ڈولی کی رفاقت میں

نہیں ہوتی تھی۔ سواس کے ذہن کے دور دراز گوشے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کبھی وہ ڈولی کو رفیق حیات

بنانے کا سوچے گا اور یہ لمحے کبھی اس کی زندگی میں آئیں گے کہ وہ دورا ہے پر کھڑا ہوگا اور اسے رضوانہ

یا ڈولی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اس لیے جب ڈولی نے ایک دوپہر ڈاکٹر ز ہاسٹل کے فلیٹ

میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”سکندر یو نو آئی لو یو..... اور میرے پاپا ایک سال سے مجھے امریکا بلوا رہے ہیں لیکن مجھے تمہارا انتظار

تھا۔ اب جب کہ تم ہاؤس جاب کر چکے ہو۔ تو میں چاہتی ہوں کہ تم آئی سے میرے لیے بات کرو۔ شادی

کے بعد میرے ساتھ ہی امریکا چلنا۔ وہاں سے اسپیشلائزیشن کر لینا۔“

وہ لمحہ بھر کو حیران سا رہ گیا تھا۔ اس لمحے کے متعلق اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ لمحہ بھی اس کی زندگی

میں آئے گا۔ حالانکہ صبح صادق نے کئی بار اسے اس لمحے سے ڈرایا تھا اور جب یہ لمحہ اس کی زندگی میں آ گیا تھا

تو اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس لمحے کے جال سے باہر نکلے۔ ڈولی سے ہزاروں باتیں ہوتی تھیں

لیکن کبھی اس کی گھریلو زندگی زیر بحث نہیں آئی تھی اور نہ ہی آج تک اس نے ڈولی کو رضوانہ کے بارے میں

بتایا تھا۔ دراصل اسے کبھی موقع ہی نہ ملا تھا۔ زیادہ تر ڈولی ہی بولتی تھی۔ وہ تو صرف اسے سنتا تھا۔

اسے باتیں کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔

وہ باتیں کرتی تو وہ ایک طرح سے مسرور سا ہو جاتا تھا۔

اس کے پاس کرنے کے لیے بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ اپنی سہیلیوں کی اپنے ماما پاپا کی امریکا کی۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے سکندر..... کیا میں..... تمہاری رفاقت کے قابل نہیں ہوں؟“ وہ کھڑکی کے

پاس سے جھٹ کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

اس کے لباس کے اٹھنے والی خوشبو

اس کا خوبصورت لباس۔

اور بے تحاشا حسن۔

سکندر نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”ایسا نہیں ہے ڈولی۔ تمہاری رفاقت تو کسی بھی شخص کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ بہت خوش

نصیب ہوگا وہ شخص جس کی رفیق زندگی تم ہوگی۔ میں ہی شاید تمہاری رفاقت کے قابل نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ ڈولی نے بحث کی ”کیا کمی ہے تم میں.....؟ اسماٹ ہو ڈاکٹر بن چکے ہو تمہارا مستقبل

روشن ہے۔ پھر..... میں..... میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہارے علاوہ کسی دوسرے شخص کا تصور نہیں کر سکتی

اور میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”یہ کیا ہو گیا تھا۔“

سکندر نے بے بسی سے ہاتھوں کو مسلا۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

اس نے ڈولی کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں بے تحاشا محبتیں لیے اسے تنک رہی تھی۔

اور یہ سراسر اس کی غلطی تھی کہ اس نے ڈولی کو پہلے دن ہی کیوں منع نہ کیا۔ اس کی آنکھیں تو ہمیشہ سے

ی اپنے جذبوں کا اظہار ہی کر رہی تھیں اور وہ اگر وہ ڈولی کی مہربانیوں کو محض دوستی اور فریڈ

شب سمجھ رہا تھا تو یہ اس کی حماقت تھی۔

”دراصل..... دراصل میرا نکاح ہو چکا ہے.....“ اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ ڈولی ایک دم پیچھے

بٹ گئی۔

”نہیں.....“ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی..... ”نہیں۔“ اس نے بے یقینی سے کہا..... ”تم جھوٹ

بول رہے ہو.....“

”یہ سچ ہے ڈولی.....“ سکندر شرمندہ سا تھا۔

”لیکن تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا سکندر.....“ اس کی آواز گری گئی۔

”پہلے تم نے کبھی پوچھا ہی نہیں اور شاید کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا کہ میں خود سے تمہیں بتاتا۔ آئی ایم

سوری ڈولی۔“

ڈولی کی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر شکستگی تھی۔

”کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے.....؟“

”وہ..... چاہیں.....“ وہ الجھ سا گیا ”ڈولی تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔“

”میں نے تمہیں الجھا دیا ہے اور تم نے..... تم نے کچھ نہیں کیا..... تم نے مجھے ککڑے ککڑے کر دیا ہے..... تم نے میری انسلٹ کی ہے..... میرے جذباتوں کی توہین کی ہے..... میرے دل کو توڑا ہے..... تم نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے.....“

”نہیں پلیز۔ ایسا تم کو ڈولی۔ ایسا نہیں ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا..... مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ تم اس طرح سوچتی ہو اور تمہارے ذہن میں.....“

”جھوٹ بولتے ہو تم..... غلط کہتے ہو۔“ وہ اسے جھنجھوڑنے لگی..... ”تم اتنے نادان نہیں ہو کہ میری محبتوں کو نہیں جان سکتے۔ کوئی لڑکی کسی سے کیوں ملتی ہے۔ کیوں بات کرتی ہے۔ اس کے تو چہرے کے رنگ بتاتے ہیں کہ.....“

”ہاں شاید ایسا ہو۔“ سکندر نے ایک گہری سانس لی..... ”لیکن مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں تھا کہ میں بھلا کیا ہوں..... ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا معمولی سا لڑکا..... مجھ میں کیا ہے کہ تم جیسی خوبصورت لڑکی میرے ساتھ رفاقت کی خواہش مند ہو۔ میں اسے صرف تمہاری دوستی سمجھتا تھا۔ یقین کرو ڈولی میرے ذہن میں یہ نہیں تھا۔ نہیں تو ابتدا ہی میں تمہیں بتا دیتا کہ میرا نکاح ہو چکا ہے۔“

”محبت تو یہ سب نہیں دیکھتی نا سکندر۔ میں تو تم سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس پہلے روز سے ہی جب تم آئی کے گھر میں سر جھکائے کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور پھر ہر گزرتے دن اور ملاقات کے بعد یہ محبت بڑھتی رہی..... کیا یہ ضروری تھا کہ میں زبان سے تمہیں کہتی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں چاہتی ہوں اور تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی ہوں۔“

”ڈولی.....“ سکندر نے اس کے ہاتھ تھام لیے..... ”انجانے میں میری ذات سے تمہیں جو دکھ پہنچا ہے اس کے لیے ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ نہ معاف کر سکو تو جو سزا چاہو دے لو۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔“

”میں..... میں کیا سزا دوں گی تمہیں۔“ وہ ہاتھ چمڑا کر پیچھے ہٹ گئی..... ”مجھے تو خود ساری زندگی اس محبت کی سزا بھگتی ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی اور سکندر کو کسی بہت بڑے زیاں کا احساس ہونے لگا۔

جیسے اس کا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔

بہت بڑا زیاں اور لمحہ بہ لمحہ یہ احساس زیاں بڑھتا جا رہا تھا



”یار وہ تم اور تمہارا عشق۔“

مجتبیٰ حیدر نے بے تکلفی سے پروفیسر عادل کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا اور سوالیہ نظروں سے انہیں

دیکھا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ جب بھی پروفیسر عادل سے ملتے، ان سے یہ سوال ضرور کرتے تھے۔ ”کہیں وہ چہرہ دیکھا؟“

”جانے اس کے حسن تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے ان خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں
جانے وہ کون ہے میں نے اسے سمجھا کیا ہے
جانے اس کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں“

پروفیسر عادل نے بڑے جذب سے حمایت علی شاعر کی کسی نظم کے شعر پڑھے۔

”کسی نادیدہ ہستی کے عشق نے شاعر بنا دیا ہے تمہیں۔ چلو ای کے طفیل شاعر ہو گئے ہو، انہوں نے سگریٹ کی راکھ الٹیں ٹرے میں جھاڑی۔“

”ہمیشہ سے ہوں۔“

پروفیسر عادل نے صوفے کی پشت سے سر ٹپکتے ہوئے پاؤں پھیلانے۔

”ہر آدمی کے اندر ایک شاعر چھپا ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حیدر۔ نازک احساسات اور جلیے لفظوں والا شاعر۔ کچھ لوگ ان نازک احساسات کو لفظوں کا روپ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو شاعر کہلانے لگتے ہیں اور کچھ میرے جیسے نکلے ہوتے ہیں جو ساری زندگی لفظوں کی تلاش میں ٹانگ ٹوٹیاں مارتے رہتے ہیں اور کوئی لفظ ہاتھ نہیں آتا..... اگر کبھی یہ لفظ میری گرفت میں آگئے مجتبیٰ حیدر تو آپ دیکھنا کیا تخلیق ہوتا ہے۔ سرور کی طرح میرے اندر بھی کبھی کبھی طوفان اٹھتا ہے۔ بڑے جوار بھائے آتے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ ان احساسات کو زبان دے دوں اور زندگی کے کسی موڑ پر جب وہ اچانک میرے سامنے آئے تو اسے بتاؤں کہ میں نے اس سے ملنے سے پہلے ہی اس کے ہجر کے دکھ اوڑھے ہیں۔“

اسے دیکھنے سے پہلے ہی اسے چاہا ہے۔

اسے چھونے سے پہلے ہی اس کے وجود کی نزاکتوں کو محسوس کیا ہے۔

اس کی خوشبو نے میرے دل کی بہتی کوہنکا رکھا ہے۔“

پروفیسر عادل بڑی بے تکلفی سے مجتبیٰ حیدر سے اپنی کیفیات بیان کر جاتے تھے۔

”یار کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ ہستی..... ایسی کسی ہستی کا وجود ہے۔“

مجتبیٰ حیدر لمحہ بھر کے لیے سنجیدہ ہو گئے۔

انہیں کبھی پروفیسر عادل پر حیرت ہوتی تھی۔

اتنا بچو کیڈ آدمی۔

اتنا علم رکھنے والا۔

ڈال لیں اور حوالوں سے بات کرنے والا شخص کبھی کتنا آئینہ لنگ ہو جاتا تھا۔ خوابوں کی باتیں کرنے والا۔ خواب دیکھنے والا ایک شاعر آدمی بن جاتا تھا۔ جس نے ان دیکھے عشق کے انتظار میں عمر بتا دی ہو۔

”ہاں بختی حیدر۔“ پروفیسر عادل کے لہجے میں مکمل طمانیت اور یقین تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ ہستی یہاں اسی دنیا میں کہیں موجود ہے۔ وہ جب کبھی اچانک میرے سامنے آئے گی تو میں رک جاؤں گا، ٹھہر جاؤں گا۔ اگر اس ہستی کا وجود نہ ہوتا تو میرے دل میں ایسا خیال آتا ہی کیوں۔ لندن کی ایک کھراؤد شام میں جب میں اور میرا دوست چارلس ٹم ہلسن کے سیاہ فام مجسم کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ تو اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

”عادل تمہارے ملک میں اربن شادیاں ہوتی ہیں اور تم لوگ ایک ان دیکھی لڑکی سے شادی کر کے تمام عمر بہت خوشی اور سکون سے گزار دیتے ہو۔ چاہے وہ سوچ اور فکر میں تم سے کتنی بھی مختلف کیوں نہ ہو اور چاہے وہ تمہارے معیار حسن پر ذرا بھی پوری نہ اترتی ہو۔ یہ سب کتنا پین اسبل ہوتا ہوگا تمہارے لیے اور کیا تم بھی..... عادل کیا تم بھی ایسی اربن میرج کرو گے اور خوش رہو گے؟“ اور اس وقت میرے ذہن میں آیا تھا کہ نہیں، چارلس ٹم۔ میرے ساتھ شاید ایسا نہ ہو اور وہیں اچانک مجھے اور اک ہوا تھا کہ کہیں کوئی ہے۔ کسی جگہ پر جو میرا منتظر ہے۔ اور وہیں چارلس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اس عشق نے میرے اندر اچھڑائی لی تھی۔ جس کا میں آج بھی منتظر ہوں۔ وہ ہستی کہیں ہے بختی حیدر۔“

انہوں نے بات کرتے کرتے بختی حیدر کی طرف دیکھا پھر بولے۔

”ہاں یہ خوف کبھی کبھی میرے دل کو ٹھٹھی میں لے کر بھیجتا ہے کہ شاید یہ لحد میری زندگی میں اس وقت آئے۔ جب چوڑا ٹوٹ چکے ہوں اور کشتی ڈوبنے کو ہو۔ یا پھر یہ لحد اس وقت آئے جب میں تھک ہار کر راستے ہی میں بیٹھ چکا ہوں اور اس تک پہنچنے کے سارے راستے میں نے خود ہی مسدود کر دیے ہوں۔“

بختی حیدر کی نظریں انہیں ٹول رہی تھیں ”تم ہارنے والے یا جھٹنے والے آدمی نہیں ہو۔ پروفیسر عادل۔“

”ہاں شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں بختی حیدر۔“ ان کے لہجے میں ایک دم ٹھکن اتر آئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان کی آواز میں جو سرخوشی اور جوش تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔

”میں جھٹنے والا نہیں ہوں بختی حیدر۔ میں آخری سانس تک انتظار کر سکتا ہوں لیکن کبھی کبھی کچھ شکستیں ہم دوسروں کی خاطر بھی تو قبول کرتے ہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہوتے بختی حیدر۔ بہت سے لوگوں کی خواہشیں اور آرزوئیں خوشیاں اور دکھ ہمارے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم ان دوسروں کے لیے ہار جاتے ہیں حالانکہ ہمارے اندر موت تک کے راستوں پر چلنے کے لیے حوصلہ ہوتا ہے۔“

”میری دعا ہے کہ یہ ہستی زندگی کے راستوں ہی میں تمہیں مل جائے۔“ بختی حیدر نے خلوص دل سے دعا کی اور پھر بے ”ایک کہانی میرے قلم کے نیچے آنے کو بے تاب ہو رہی ہے۔“

محبت کی ایک انوکھی داستان۔

ان دیکھے عشق کی لازوال کہانی۔

دیکھنا پروفیسر عادل، میں یہ کہانی ضرور لکھوں گا۔ لفظ ابھی سے میرے اندر بننے سنورنے لگے ہیں اور تم دیکھنا پروفیسر میری اس کہانی کو کتنی پذیرائی ملے گی۔“

”ایسے عشق اور لوگوں نے بھی کیے ہوں گے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ہر آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ ایسے عشق کا انتظار ہر ایک کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس عشق کی کہانی آپ رقم کرو گے اور ان کی کہانیاں کسی نے رقم نہیں کی ہوں گی۔ سچ کہو کہ کیا کبھی تمہارے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی کہ تم بھی کسی کو چاہو۔ کسی سے عشق کرو اور کوئی تمہیں چاہے۔“

”ایسی ویسی۔“ بختی حیدر نے قہقہہ لگایا۔ ”ہمارا مزاج تو لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ہم نے تو پیدا ہوتے ہی عاشق ہونے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ میری ماں مجھے بتاتی ہے کہ میں بچپن سے ہی حسن پرست تھا اور.....“

”اور ابھی تک ہیں.....“ آمنہ صنفی نے انداز آتے ہوئے بات اچک لی۔

”آہا آپ آمنہ صنفی۔“ بختی حیدر نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ پروفیسر عادل نے اٹھ کر ان کی پذیرائی کی۔

”آئیے آئیے مس آمنہ۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ اسلام آباد چلی گئی ہیں۔“

”موڈ ہی نہیں بن رہا ہے جانے کا..... میری اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اور پھر.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور بختی حیدر کی طرف دیکھا ”پچھلے اسی بہانے ان سے بھی ملاقات ہو گئی۔“ وہ بیٹھتے ہوئے پروفیسر عادل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”اور آپ کیسے ہیں پروفیسر عادل؟“

”ایک دم فائن۔“ انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ کامل کے گاؤں جانے کے بعد سے وہ بہت ریلیکس ہو گئے تھے۔ وہ یہاں تھا تو ٹینشن سی رہتی تھی اور اطمینان کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت بہتر تھا۔ اس کے دورے کم ہو گئے تھے اور صحت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ جاتے ہوئے وہ بار بار ان کے ہاتھ چومتا اور بھائی کہہ کر لپٹ جاتا تھا۔ کئی اداروں کا بذات خود جائزہ لینے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کامل کا گھر پر رہنا ہی بہتر ہے۔ جتنی بہتر نگہداشت اس کی گھر پر ہو رہی تھی اتنی یہاں نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر انہوں نے سوچا تھا کہ اب وہ خود دس چودہ دن بعد حویلی کا پتھر ضرور لگائیں گے اور ماں جی سے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ آتے رہیں گے اور انہیں گھبراتا نہیں چاہیے۔

”آپ نے آج کل لکھنا چھوڑ رکھا ہے آمنہ صنفی۔ آپ کے کالم نظر نہیں آرہے۔“ بختی حیدر آمنہ صنفی سے پوچھ رہے تھے۔ پروفیسر عادل بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آج کل آرام ہو رہا ہے۔“

آمنہ صفی نے ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ پروفیسر عادل اسے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے اور پھر سلگاتے ہوئے کسی قدر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”یہ صحیح نہیں ہے مس آمنہ۔“

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔

”کیا..... سگریٹ پینا۔“ آمنہ صفی نے ایک کش لگا کر دھواں چھوڑا وضاحت کی..... ”کبھی کبھی پی

لیتی ہوں۔“

”کیوں؟“ پروفیسر عادل کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”آپ کیوں پیتے ہیں؟“

”میں.....“ پروفیسر عادل شپٹا گئے..... ”یونہی۔“

”اور میں بھی یونہی۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”لیکن سگریٹ پیتے ہوئے عورت کی نسوانیت مجروح ہوتی ہے۔“

”عورت کی نسوانیت مجروح کرنے کو اس معاشرے میں اور بھی بہت کچھ ہے پروفیسر عادل۔“ آمنہ صفی نے سگریٹ بجھا کر ایش ٹرے میں ڈال دیا ”بہر حال اگر آپ کو اس سے کوفت ہوتی ہے تو لیجئے نہیں جیتی.....“ پروفیسر عادل گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور آمنہ صفی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس روز اگرچہ آمنہ صفی بہت دیر تک بیٹھی تھیں اور بہت دیر تک گفتگو ہوتی تھی۔ وہ اس کی ذہانت اور اس کی اسٹڈی سے بہت متاثر ہوئے تھے..... بہت مطالعہ تھا اس کا.....

انہوں نے اس کی ذہانت کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

”عورت کی ذہانت بعض اوقات خود اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے پروفیسر عادل۔“ آمنہ صفی کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے کانچ کی جھین تھی..... ”اس کے لیے بھی اور اس سے متعلق لوگوں کے لیے بھی۔“ کم ذہن عورتیں شاید زیادہ مطمئن اور پرسکون زندگی گزارتی ہیں۔“

”آپ کو زندگی سے کیا گلے ہیں مس آمنہ۔“ پروفیسر عادل نے خوش دلی سے پوچھا تھا۔

”ہاں نہیں پروفیسر مجھے زندگی سے گلے ہیں یا زندگی کو مجھ سے۔“ وہ ہنس دی تھی اور پروفیسر عادل نے سوچا تھا کہ آمنہ صفی کی زندگی میں کہیں نہ کہیں کوئی حادثہ ہوا ہے اور اس حادثے کے اثرات ابھی بھی اس کے لہجے اور اس کے لفظوں میں بولتے ہیں۔ شاید یہ حادثہ اتنا پرانا نہیں ہے۔ تازہ چوٹ کا کرب جھلکتا تھا اس کی گفتگو سے جتنی اس کی آمدان کے لیے حیران کن تھی اتنی ہی اس کی گفتگو بھی۔ جس میں ایک طویل مسافت کی تھکن تھی۔ ایک بولڈ اور بے باک شاعرہ اور کالم نگار کا جو خاکہ ان کے ذہن نے تریب دیا تھا

اور جو کچھ وہ آمنہ صفی کے متعلق سنتے آئے تھے وہ اس سے بالکل مختلف تھی۔

”کیا دیکھ رہے ہیں عادل صاحب؟“

وہ جو بے دھیانی میں مسلسل آمنہ صفی کو دیکھتے جا رہے تھے ایک دم چونک کر بولے ”کچھ نہیں۔“

”ہر ایک چہرے میں اس کے چہرے کو کھوجتا تھا

ہر ایک صورت میں اس کی صورت دکھائی دیتی تھی۔“

مجتبیٰ حیدر نے لہک کر شعر پڑھا تو پروفیسر عادل نے تنبیہی نظروں سے انہیں دیکھا۔ آمنہ صفی کی آنکھوں میں شرارت کوندی۔

”وہ صورت اور چہرہ کس کا ہے عادل صاحب؟“

”ابھی وہ چہرہ پردہ افکار میں ہے۔“ مجتبیٰ حیدر نے شریر نظروں سے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پر اس وقت ایک نرم تاثر تھا۔ وہ گمبیر شید کی جوان کا خاصہ تھی اس وقت کہیں نہیں تھی۔

”کیا۔“ آمنہ صفی نے مجتبیٰ حیدر کی طرف دیکھا۔

”پردہ ہٹا دو اگر چہرہ افکار سے

لانہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب“

”مجتبیٰ آپ بعض اوقات فضول بولتے ہیں۔“

پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ آکر معدوم ہو گئی۔ آمنہ صفی ذرا سے ہونٹ کھولے دلچسپی سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ سلطان اندر داخل ہوا۔

”ارے مائی تم.....“ پروفیسر عادل ایک دم کھڑے ہو گئے ”گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔ کامل اور ماں جی۔“

سلطان توان کے اصرار کے باوجود لاہور نہیں آتا تھا۔ سو اسی ماہ میں اس کی دوبارہ آمدان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ پریشان ہو گئے تھے۔

”سب ٹھیک ہے عادل بھائی۔ میں تو یونہی اپنے کام سے آیا تھا۔ آپ سے اور سرور سے ملنے چلا آیا.....“

”اوہ جینک گاڈ۔“ انہوں نے بڑی دیر سے روکی ہوئی سانس کو آزاد کیا اور مرکز آمنہ صفی کی طرف دیکھا۔

”یہ میرا کزن ہے سلطان ملک اور یہ مشہور کالم نگار آمنہ صفی۔“

سلطان نے آمنہ صفی کی طرف دیکھ کر سر کو ہلکا سا خم کیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا کوند اچکا تھا اور اس نے ایک ہی نظر میں آمنہ صفی کا سر تاپا جائزہ لے لیا تھا اور دل ہی دل میں اسے سراہا تھا۔ آمنہ صفی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”پروفیسر عادل آپ کا کزن اسراٹ آدمی ہے۔“

سلطان کی آنکھوں میں پھر چمک لہرائی اور بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔
 ”خوش قسمت ہو میاں۔“ مجتبیٰ حیدر چپکے ”ہم اتنی دیر سے اسی انتظار میں بیٹھے ہیں کہ شاید آمنہ صفی ہماری طرف بھی دیکھ لیں لیکن افسوس۔“
 ”میکڑوں حیناؤں سے اپنے لیے تعریفی کلمات سننے کے بعد بھی آپ کا جی نہیں بھرا۔“ آمنہ صفی نے قہقہہ لگایا۔

”آپ کی خودنوشت کی کچھ اقتضا کسی ماہنامے میں پڑھی تھیں جس میں آپ نے لکھا تھا کہ آپ کو میکڑوں خطوط ہر مہینے موصول ہوتے ہیں، صنف نازک کی طرف سے جو آپ کی تعریفوں سے بھرے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”ویسے مجتبیٰ آپس کی بات ہے اس میں صداقت کتنی ہے۔۔۔۔۔۔“ پروفیسر عادل آج بہت ہلکے ہلکے موڑ میں تھے اور اپنے مزاج کے برخلاف شوخ لہجے میں بات کر رہے تھے۔
 ”سو فی صد صداقت۔“ مجتبیٰ حیدر نے زور دے کر کہا ”چاہو تو خود آکر اپنی آنکھوں سے ان خطوط کا مطالعہ کر لو۔“

”کیا اب اس عمر میں بھی ایسے خطوط آتے ہیں؟“

”بالکل آجاتے ہیں۔ جب تک یہ کائنات موجود ہے اور مرد اور عورت کے درمیان کشش کا رشتہ ہے۔ یہ سب تو چلتا رہے گا۔۔۔۔۔۔ ہم نہیں ہوں گے کوئی اور ہوگا ہماری جگہ اور محبتوں کے معاملے میں صنف نازک ہمیشہ حماقتیں کرتی رہی ہیں۔ مس آمنہ یقین کریں کہ کئی دفعہ ایسے خطوط آئے ہیں میری طرف کہ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ یہ لڑکیاں کیسے تصورات میں عمل بنالیتی ہیں۔۔۔۔۔۔ اور خواب بن لیتی ہیں۔۔۔۔۔۔ بہت تصوراتی ہیں یہ لڑکیاں۔“

”محبت کے معاملے میں صنف نازک کی حماقتوں کے ذمے دار بھی تم مرد ہی ہوتے ہو۔“

”شاید۔۔۔۔۔۔“ مجتبیٰ حیدر کچھ سنجیدہ ہو گئے ”میں نے اکثر سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ شاید گھٹے ہوئے ماحول میں رہنے والی لڑکیاں یوں تصورات میں پناہ لے کر اس ماحول سے فرار حاصل کرتی ہیں۔“

”مجتبیٰ حیدر صاحب۔“ آمنہ صفی کے لہجے میں ہلکی سے تلخی تھی ”آپ اپنے افسانوں میں محبتوں کی جو دنیا تخلیق کرتے ہیں اس کی ذمے دار یہ دنیا بھی ہے۔۔۔۔۔۔ اور وہ خوبصورت لفظ۔۔۔۔۔۔ وہ شدید محبتیں جو انہی آپ کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہیں وہ غیر ارادی طور پر اس کی تمنا کرنے لگتی ہیں۔ جو خطوط آپ کو ملتے تھے یا ملتے ہیں ان لڑکیوں کے ہوتے ہوں گے جو بقول آپ کے گھٹے ہوئے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں اور کچی عمروں کی ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اتنے خوبصورت الفاظ تخلیق کرنے والا خود بھی اتنا ہی خوبصورت ہوگا اور ان کی محبتوں کو اتنی ہی پذیرائی دے گا جتنا اس کا ہیرودیتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن آج کل۔۔۔۔۔۔ یہ

خوشی کی بات ہے کہ ہماری نسل خود آگاہ ہے اور وہ خوابوں کی دنیا میں کم رہتی ہے اور افسانہ یا کہانی کو افسانہ یا کہانی ہی سمجھا جاتا ہے۔“

”ہاں۔“ مجتبیٰ حیدر نے آمنہ صفی سے اتفاق کیا ”لیکن اس کے باوجود محبت کا وجود ہر دور اور زمانے میں رہا ہے اور رہے گا اور محبتوں کے معاملے میں مرد اور عورت یکساں بے وقوف بنتے رہیں گے۔ کہیں پر مرد اور کہیں پر عورت۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمیشہ عورت ہی بے وقوف بنتی ہیں۔“

سلطان جو ابھی تک کھڑا یہ ادبیانہ گفتگو سن رہا تھا اس نے مجتبیٰ حیدر کے بات ختم کرتے ہی پروفیسر عادل سے پوچھا۔

”یہ مسرور کدھر ہے؟“

”اپنے کمرے میں ہوگا۔۔۔۔۔۔ اور تم نے کھانا وغیرہ کھانا ہوگا۔ خدا بخش سے کہو کھانا لگا دے تمہارے لیے اور ادھر چائے بھجوا دو۔“ پروفیسر عادل کو خیال آیا کہ وہ گاؤں سے آیا ہے اور انہوں نے ابھی تک اس سے کھانے وغیرہ کے لیے نہیں پوچھا۔

”کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں۔ دراصل کچھ دوست بھی ہیں ساتھ۔ ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ ہاں چائے میں آپ کا ساتھ ہی دوں گا۔ فی الحال مسرور سے مل لوں۔“

اس نے ایک نظر آمنہ صفی پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

”ارے آپ سلطان صاحب۔“

”مانی میرے دوست صرف مانی۔“ سلطان نے اسے گلے لگاتے ہوئے تنبیہ کی۔

”ہائیں مسرور میں اسے کیا نظر آگیا تھا اور نہ وہ تو بہت اکھڑا ہوا اور مسرور سا تھا۔“

”کیسے آتا ہوا؟“ مسرور نے پوچھا۔

”ج پوچھو تو ادھر تم سے ملے آیا ہوں اور لاہور کے چکر تو پہلے بھی لگتے ہی رہے ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ۔“ اس نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا ”بس یہ تھا کہ باہر باہر سے چلا جاتا تھا۔ عادل بھائی سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔“

مسرور نے غور سے اسے دیکھا۔

خوش مطمئن اور پرسکون سا۔ اپنے کسی بھی عمل پر ندامت نہیں بلکہ فخر کا احساس لیے۔ دولت ہو۔ فراغت ہو اور زندگی میں کوئی غم نہ ہو تو یہ انداز آہی جاتے ہیں لیکن پروفیسر عادل کتنے مختلف ہیں اپنے ماحول اور اپنے اس کزن سے۔

نرم و صاف دل۔

ستھرا ذہن۔

اخبار دیکھ رہی تھی۔
”ارے تم یہاں ہو مومو۔“ یعنی نیل پر اپنا بیگ پھینک کر سامنے بیٹھ گئی ”ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم گھر چلی آئی ہو گی۔ میرا کہہ رہی تھی وہ جنہیں بھی ڈراپ کر دے گی۔“

”ہاں میرا نے کہا تو تھا مگر میرا موڈ نہیں تھا۔“ مریم نے اخبار سے نظریں ہٹالیں۔
گھر جا کر بھی کیا کرتی۔ عاشی نینا اور مور کے جانے سے گھر کتنا دیر ان لگنے لگا تھا۔ کسی خاموشی ہو گئی تھی حالانکہ نینب عثمان احمد ان کے جانے کے بعد دو پارٹیاں اور ڈنر رینج کر چکی تھیں۔ پھر بھی مریم کو بہت سناٹا لگتا تھا گھر میں۔

”پھر بیڑا ٹینڈ کیوں نہیں کیا؟“ یعنی بھی اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔
”میڈم مہرین تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ روشی نے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، گھر چلی گئی ہے۔“
”کہنا مومو نہیں تھا اور تم اس وقت یہاں کیوں رہی ہو۔ کلاس نہیں ہو رہی کیا؟“
”ہاں کلاس نہیں ہو رہی اور باہر بہت گرمی ہے۔ ہم نے سوچا اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ لوم یہ چسپ کھاؤ۔“ یعنی نے لفاظی اس کی طرف بڑھایا۔

”تو تھینک یو یعنی۔“ میرا دل نہیں چاہ رہا۔
”ابنی پرا بلیم؟“ روشی نے اس کے سامنے پڑا ہوا اخبار اپنی طرف کھسکا لیا۔
”تھینک۔“ وہ مسکرائی ”عاشی وغیرہ سیٹ ہو گئے ہیں۔“
یعنی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ہاں شاید۔“
وہ تو سیٹ ہو گئے ہوں مگر لیکن وہ جو سیٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تینوں جاتے ہوئے کتنے افسردہ تھے اور مور بڑا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔
”مومو! اس نہیں ہوتا۔“

”اچھا۔“ وہ افسردگی سے ہنس دی تھی۔
”ماما! آپ مومو کو بھی وہاں مری میں ہمارے ساتھ کیوں نہیں بھیج دیتیں۔“ اس نے نینب عثمان سے سفارش کی تھی اور نینب عثمان احمد نے اسے جھڑک دیا تھا۔
”اب مومو ہر جگہ تو تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی نا۔۔۔۔۔۔“
”کیا ان کے لیے وہاں کوئی کالج نہیں ہے؟“ وہ مسلسل سوال کر رہا تھا اور انہیں الجھن ہو رہی تھی۔

عثمان احمد نے کافی مخالفت کی تھی لیکن حسب معمول جلد ہی سرینڈر کر دیا تھا۔ ان میں نینب عثمان احمد کی کبھی بھی بات کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں تھی حالانکہ انہوں نے دبے دبے لفظوں میں عاشی کی طبیعت کی خرابی کا ذکر بھی کر دیا تھا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی جاگیر دار کی اولاد ہیں اور خود بہت بڑی جاگیر کے مالک ہیں اور ایک یہ جس کے ایک ایک انداز سے اس کا پس منظر بتا چل رہا تھا۔
ہر ماہ لاہور آنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

مسرور کچھ رہا تھا۔
”یار مسرور! تم اتنے کم گوار خاموش طبع کیوں ہو۔“ سلطان نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا ”چلو میرے ساتھ میں تمہیں لینے ہی آیا ہوں۔ میرے دوست میرے منتظر ہوں گے۔ آج تم بھی میرے ساتھ انجوائے کرو اور زندگی کے حسن کو قریب سے دیکھو۔“

”میں۔“ مسرور ہولے سے ہنسا اور اس نے سوچا۔
عمران ملک آپ کی اور میری زندگی کے رنگ بالکل مختلف ہیں۔ میرے سامنے میری ماں کے خواب ہیں۔ جنہیں میں نے پورا کرنا ہے۔ اس کی صعوبتیں ہیں اس کے درد اور اس کے آنسو ہیں۔ جنہیں میں نے چننا ہے۔ میں اتنی فراخوں کا تحمل نہیں ہو سکتا، عمران ملک۔
”ہاں تم۔“ سلطان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”چلو گے نا۔“

”نہیں، عمران ملک۔ آپ کی محفلوں میں بھلا میرا کیا کام۔“
”عمران نہیں صرف مانی اور تم۔“ تمہاری زبان سے یہ سننا بہت اچھا لگے گا مجھے۔“
اس نے خلوص سے اس کا ہاتھ دبایا ”اگر تم نہیں چاہتے تو مت چلو۔ ہم ہی کچھ دیر تمہارے پاس جا جاتے ہیں لیکن دوست، کبھی کسی دن مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔ اتنے اداس اور خفا کیوں لگتے ہو۔“
مسرور صرف سلطان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”کہیں جا رہے تھے؟“
”نہیں اس وقت مجھے ٹیرس پر بیٹھنا اور اوپر نیلے آسمان پر چمکیلی بدلیوں کو اور پرندوں کو واپس آ۔“
آشیانوں کی طرف جاتے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم سب بھی سفر میں ہوں اور آ دن ہم سب نے بھی اپنے آشیانوں کی طرف واپس لوٹنا ہے۔“
”تم بہت خوبصورت باتیں کرتے ہو مسرور۔“ سلطان نے مسکرا کر اسے دیکھا ”چلو وہیں ٹیرس چل کر بیٹھتے ہیں۔“

اور پھر خدا بخش کو چائے کا کہہ کر وہ دونوں ٹیرس پر آ گئے۔
یعنی اور روشی چپس کھاتی ہوئی لائبریری میں داخل ہوئیں۔ مریم نیل پر دونوں کہیاں نیچے جتا

”لالہ..... اچھا اچھا“ آج کل میڈم کے لالہ کے متعلق بڑے بیانات چھپ رہے ہیں اخباروں میں۔“ روشی نے بتایا۔

”شٹا کیا؟“ مریم چونکی ہوئی۔

”تم اخبار نہیں پڑھتی ہو؟“ یعنی نے پوچھا۔

”بہت کم۔“ مریم نے روشی کی طرف دیکھا ”تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”یہ کہ لالہ موسیقی کی دنیا میں انقلاب پیدا کرے گی اور یہ کہ اس کی آواز لوگوں کو حیران کر دے گی وغیرہ وغیرہ..... جس پر اس کے جاگیردار باپ نے میڈم سے کہا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کوئی وی اور فلم کے لیے گانے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ بس اسی بات پر دونوں کی ٹھن گئی ہے۔ میڈم نے فوراً ہی پریس کانفرنس بلالی..... اور خوب خوب سنائیں اپنے سابقہ شوہر کو کہ وہ صرف اس کی نہیں میڈم نرس کی بھی بیٹی ہے..... جو ایک معروف گلوکارہ ہیں..... اور سر اور آواز لالہ کو ڈرٹے میں ملے ہیں..... اور یہ کہ وہ انہیں ضائع نہیں ہونے دیں گی وغیرہ وغیرہ۔“

”لالہ تو بہت پریشان ہوگی اس صورت حال سے۔“ مریم نے سوچا ”وہ تو یوں بھی جذباتی سی لڑکی ہے۔ انٹی سیدی حماقتیں کرتی رہتی ہے.....“ اور پھر اسے فون بھی نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ اسپتال میں اس نے لالہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے گھر آئے گی۔ مگر پھر عاشی نینا اور مور کے جانے کا سن کر اس کا دل بھگ سا گیا تھا۔ رات پارٹی میں تو اس سے سرسری سی ملاقات رہی تھی اور وہ خوش لگ رہی تھی۔

”آخر لالہ کی اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوگی نا؟“ یعنی نے پوچھا۔

”ارے وہ تو اتنی چھوٹی سی ہے ابھی میٹرک میں تو ہے اور اپنی ماما سے بہت محبت کرتی ہے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی ہے۔“ مریم نے بتایا۔

”میڈم کی ایک سی بیٹی ہے کیا؟“ روشی کو فلی ستاروں اور گلوکاروں کے بارے میں جاننے کا کرب تھا۔

”نہیں دو ہیں۔ ایک چھوٹی سی ہے سات آٹھ سال کی۔ دونوں بہت پیاری ہیں۔“

”میڈم بھی تو کافی خوبصورت رہی ہوں گی۔“ یعنی نے تبصرہ کیا ”اور ابھی بھی ہیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ حالانکہ ان کے گیت مجھے بہت پسند ہیں اور ارسل بھائی کے پاس تو ان کے سارے گانوں کا ریکارڈ ہے۔“

”انہی اپنی پسند ہوتی ہے نا۔“ روشی نے چپس کا پیکٹ خالی کر کے یعنی کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”پتو یہ میرا ہے۔“ اس نے پیکٹ اپنی طرف کھسکایا۔

”ایک سی بات ہے تم کھاؤ یا میں۔“ روشی نے مسکرا کر پیکٹ اٹھالیا۔

”بائے داوے تم وہاں رافع اسپتال میں کیا کر رہی تھیں؟“

”زینب عاشی کومری کی آب و ہوا سوٹ نہیں کرتی۔“

”میرے خیال میں اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے ڈاکٹر ہادی سے تفصیلی بات کی ہے اس سلسلے میں دو ابھی انہوں نے تجویز کر دی ہیں جو کچھ عرصہ عاشی کو استعمال کرنی ہیں۔“

”مور ہمیں بہت مس کرے گا۔“

”ہم ہر ویک اینڈ پر جایا کریں گے انہیں دیکھنے۔“ ان کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

”دیکھو بھائی ان کی شخصیت کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں باہر بھیج دیا جائے۔ تم نے وہ نہیں وہ مومو پر کتنا انھارا کرنے لگے ہیں۔ کتنا زیادہ اٹچڈ ہو گئے ہیں اس سے۔ میں نہیں چاہتی کہ سب مومو کی کاپی ہوں۔“

اور مریم جو ماما کی طرف جارہی تھی وہیں بول کر بند کر گئی تھی۔

”کیا میری وجہ سے ماما ان تینوں کومری بھیج رہی ہیں؟“ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔

”کیا میری شخصیت میں کوئی خامی ہے..... کیا میں غلط ہوں کہیں پر.....“ ایک عجیب احساس کنز

نے اسے آگھیرا۔

”لیکن ان تینوں کومری بھیجنے کے بجائے ماما نے مجھے ہی کیوں نہی اور شہر کے کسی کالج کے ہاسٹل؟

بھیج دیا۔“

”لیکن پھر عاشی..... میرا مطلب ہے عاشی کو.....“ عثمان احمد منمنارہے تھے۔

”افوہ عاشی کو بھیجنا تو بہت ضروری تھا۔“

انہوں نے جھنجھلا کر بات ختم کر دی تھی اور مریم وہاں سے ہی پلٹ آئی تھی۔ حالانکہ وہ ان سے بڑے

مور کے سامان کی پیننگ کے لیے پوچھنے جارہی تھی۔

”پتا نہیں ماما مجھ سے کیا چاہتی ہیں کہ میں کیسی بنوں۔“ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اب ماما اس سے خوش؟

اس روز بھی وہ اسپتال میں میڈم نرس سے کہہ رہی تھیں کہ مومو اب سوشل ہوتی جارہی ہے..... اب

اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں۔“ روشی نے اس کے سامنے چپس کا پیکٹ لہرایا تو وہ چونک کر

طرف متوجہ ہو گئی.....

”مومو چند دن ہوئے میں نے تمہاری ماما کو ”رافع اسپتال“ میں دیکھا تھا۔ میڈم نرس بھی

ساتھ تھیں۔ مجھے تم سے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔ کون اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔“ یعنی کو اچانک

”تمہارے پاپا تو ٹھیک ہیں نا.....؟“

”ہاں وہ دراصل لالہ..... میڈم نرس کی بیٹی لالہ وہ ایڈمٹ تھی وہاں۔“

”تم جانتی تو ہو شیری بھائی وہیں جا ب کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھی۔ شیری بھائی کو کسی مریض کو ضروری دیکھنا تھا۔ انہوں نے کہا، پہلے میں ذرا اپنے مریض کو دیکھ لوں پھر تمہیں ہاسٹل چھوڑ آتا ہوں۔“

”گاؤں میں سب ٹھیک تھے نا؟“ مریم نے پوچھا۔

”ہاں سب ٹھیک تھے۔ امی اور اباجی سب ٹھیک تھے۔ امی بہت ایکی ہو گئی ہیں۔ میرے آنے سے۔ ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا، مجھے بھیجے کو۔ مگر پھر شیری بھائی نے کہا کہ میری پڑھائی کا ہرج ہو گا۔“

”اور اگر شیری بھائی نہ کہتے تو تجھے وہیں بیٹھ جانا تھا۔“ روشی نے یقین سے کہا۔

”ہاں۔“ یعنی ٹیسی ”جی میرا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا اگلے ہفتے ہی آؤں گی۔“

”اور مسز ارمان نے تیرا جنازہ نکال دینا تھا۔“

”ارے.....“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی ”مسز ارمان کا بیڑ شروع ہو گیا ہے۔“

”اوہ.....“ روشی نے بھی بیک اٹھا کر کندھے پر لٹکایا ”وہ تو ہم سے بھی پہلے ہی پہنچ چکی ہوں گی۔“

”تم نہیں چلو گی مومو؟“ یعنی نے اسے یوں ہی بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں میرا موڈ نہیں ہے۔“

مریم دونوں کے اصرار کے باوجود نہیں گئی۔ ایک تو تھکن سے جسم بڑھ حال ہو رہا تھا۔ دوسرے گزری رات کی باتیں ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ اسے آج کالج نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے اخبار اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سوچا۔

لیکن گھر رہ کر بھی وہ کیا کرتی۔

گھر میں تو طبیعت اور بھی بوجھل ہو جاتی تھی۔

تیوڑ عاشری اور نینا کے کمرے کتنے اداس اور خاموش لگتے تھے اور تیوڑ کتنا یاد آرہا تھا۔ اسے اس کی باتیں اس کی شراتیں اس کا ہنسنا۔ رات میڈم نرس کے ہاں پارٹی میں بھی ان کے بیٹے کو دیکھ کر تیوڑ یاد آتا رہا تھا۔ وہ بالکل تیوڑ کی طرح سر کو ذرا سا جھٹک کر اور دائیں ہاتھ کو اوپر اٹھا کر مٹھی بند کر کے بات کرتا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی سید امتیاز علی شاہ کے ساتھ مری سے آیا تھا اور بڑے جوش سے لالہ سے باتیں کر رہا تھا۔

میڈم نرس نے لالہ کی صحت یابی کی خوشی میں پارٹی دی تھی۔ لالہ نے بطور خاص اسے فون کر کے کہا تھا کہ وہ ضرور آئے۔ حالانکہ اس کا جانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا اور مانے بھی اسے جانے کے لیے نہیں کہا لیکن لالہ ضد کر رہی تھی۔

”یار تم آؤ نا۔ تمہیں ایک فنفا سنک خبر سناؤں گی۔“

”لیکن لالہ وہ مانے تو مجھے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔“

”تو میں آنٹی سے کہتی ہوں کہ وہ تمہیں ضرور ساتھ لائیں۔“

”ہاں اگر مانے نہ کہا تو آ جاؤں گی۔ ویسے بھی تو اب گھر میں بہت دل گھبراتا ہے۔ عاشری اور نینا جو

نہیں ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں آنٹی سے بات کرتی ہوں۔“

اور لالہ نے فون بند کر دیا۔

شام کو جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو ماما اپنے بیڈروم سے باہر آرہی تھیں۔ اسے دیکھ کر جیسے

انہیں یاد آیا.....

”مومو آج نرس کے ہاں ڈنر پارٹی ہے۔ لالہ کی صحت یابی کی خوشی میں۔ لالہ ضد کر رہی تھی کہ تمہیں

بھی ساتھ لاؤں۔ تم چلو گی.....؟“

”جی ماما۔“

نائب عثمان احمد کے چہرے پر ہلکا سا تحیر نظر آیا اور انہوں نے مڑ کر عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ جوان

کے پیچھے ہی بیڈروم سے باہر آئے تھے۔

”مومو میں پیچ آ رہا ہے۔“

”وقت کے ساتھ ہر آدمی میں پیچ آتا ہے زینی اور مومو میں تو ابھی اور بھی تبدیلیاں آئیں گی۔“

عثمان احمد ہمیشہ کی طرح سنجیدہ لگ رہے تھے۔ مریم کو ان کا یہ انداز اچھا لگتا تھا لیکن جب اس سنجیدگی میں مسکینیت آ جاتی اور عثمان احمد سے ”لیس مین“ بن جاتے اور نائب عثمان احمد کی ہر غلط بات پر انگریزی کرتے جاتے تو پھر مریم کو بے حد الجھن ہوتی تھی..... اس کا جی چاہتا تھا، پاپا ایسے کبھی نہ بنا کریں۔

”مجھے تو ڈر تھا کہ اپنے باپ کی طرح کمپلیکسز کا ہی شکار رہے گی ساری زندگی۔“

عثمان احمد نے یک دم سر اٹھا کر نائب عثمان کی طرف دیکھا۔

”زینی.....“

نائب عثمان نے ہولے سے سر جھٹکا۔ مریم کی نگاہیں عثمان احمد کے چہرے پر تھیں۔

”آخر پاپا کو کیا کمپلیکس ہو سکتا ہے۔ اتنے وجہیہ و شکیل تو ہیں۔ اتنی زبردست پر سنائی ہے۔ شاید پاپا کا فیملی بیک گراؤ ٹیڈی کے فیملی بیک گراؤ ٹیڈی سے کمزور ہے.....“ برسوں پرانا شک پھر اس کے ذہن میں کھلبلا..... کہ پاپا کا تعلق شاید کسی غریب یا متوسط فیملی سے ہے اور مانے یونہی انہیں جاگیر دار مشہور کر رکھا ہے۔ اسے ایک دم پاپا پر ترس آنے لگا۔

”بے چارے پاپا اس وقت کتنی بے بسی سے ماما کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ کہنے کے

لیے ہونٹ کھولے تھے پھر بند کر لیے تھے اور ماما بھی تو ان کا ذرا لحاظ نہیں کرتیں۔ اب کیا تھا اگر وہ یہ بات

نہ کہتیں..... اور پھر میں..... مجھے کوئی کمپلیکس کہاں ہے۔“

”پاپا کا تعلق اگر کسی غریب گھرانے سے ہے تو بھی وہ میرے پاپا ہیں۔ مجھے پاپا کے حوالے سے تو کوئی کمپلیکس نہیں ہے۔“

اس کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے۔

”آپ کی فرسٹریشن“

آپ کی دوستیاں“

آپ کے رویے“

یہ سب میرا کمپلیکس ہیں۔“

”ٹھیک ہے مومو بیٹا آپ تیار ہو جانا۔ ہم آپ کو لے جائیں گے۔“ عثمان احمد نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونکی۔

”جی پاپا کب تک جانا ہے؟“

”آٹھ بجے کے بعد ہی جائیں گے، فی الحال تو تمہاری ماں پارلر جا رہی ہیں۔“

”تم بھی حد کرتی ہو کبھی کبھی زینی۔“

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے سنا پاپا دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔

”پلیز عثمان۔ میں اس وقت تمہارا لپکھر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

نہن عثمان کی بیزار سی آواز سن کر اس نے ایک بار پھر مڑ کر انہیں دیکھا تھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ بہت دیر تک وہ وارڈروب کھولے کھڑی رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ڈریس منتخب کرے کسا کو پھر پاپا پر طنز کرنے کا موقع نہ ملے۔ عاشی ہوتی تو ضرور اس کی مدد کرتی۔ اس کی چو اُس بہت اچھی تھی اور مریم کو تو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جو سامنے آتا پہن لیتی تھی اور نہن عثمان اس پر بڑی جبر ہوتی تھیں۔

”آخر میں ہر ماہ اتنی شاپنگ کس لیے کرتی ہوں۔“

”اتنے مہنگے بوتیک سے تم لوگوں کے کپڑے خریدتی ہوں۔“

”ہمیشہ اپورٹینڈ جوتے لیتی ہوں اور جب بھی کوئی فنکشن ہوتا ہے، مومو یونی گھر میں پہنا ہوا ڈریس پہن کر آ جاتی ہے۔ مجھے جلانے کے لیے۔“

وہ ہر فنکشن کے بعد عثمان احمد سے ضرور گلہ کیا کرتی تھیں۔ اس پر بھی ناراض ہوتی تھیں۔

”اس عمر میں ان باتوں کا اتنا خیال نہیں ہوتا زینی۔“ شروع شروع میں پاپا دبے لفظوں میں اسے ڈیفنڈ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

”میں جب اس عمر میں تھی تو مجھے ان سب باتوں کا خیال رہتا تھا۔“

”تم تم تھیں زینی اور یہ..... اس کا اپنا مزاج ہے اپنی سوچ ہے۔“

”تم اسے ڈیفنڈ نہ کیا کرو عثمان۔ یہ میری بیٹی ہے اس کی سوچ اور مزاج میرے جیسا ہونا چاہیے۔“ وہ چڑ جاتی تھیں۔

اور اب تو پاپا نے اسے اس طرح ڈیفنڈ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

بہت سارے کپڑے رنچکٹ کرنے کے بعد اس نے میٹ کا بلیک ڈریس جو زینی عثمان احمد عید پر اس کے لیے لائی تھیں، منتخب کیا۔ شرٹ کے گلے اور بازوؤں پر نفاست سے کام کیا ہوا تھا۔ رات کے فنکشن کے لیے یہ لباس ٹھیک رہے گا.....

اور جب تیار ہو کر وہ باہر آئی تو نہن عثمان جولاؤنگ میں کھڑی شریف اور مفکو کچھ ہدایات دے رہی تھیں، لمحہ بھر کے لیے ان کی نظریں مریم پر پھری گئیں۔ ان کی نظروں میں سٹائش سی اتر آئی اور بے اختیار ان کے ہونٹوں سے نکلا..... ”گڈ..... بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

مریم شرمائی۔ ماما نے کبھی اس کی اس طرح تعریف نہیں کی تھی۔ نہن عثمان نے مڑ کر عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ جو مریم کی طرف ایک اچھتی سی نظر ڈال کر فون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جس کی تیل ہو رہی تھی اور نہن عثمان تو حسب معمول بہت دل کش لگ رہی تھیں۔ مریم نے دل ہی دل میں انہیں سراہا تھا اور میڈمز گس کے گھر میں بھی سب لوگ کھلے دل سے نہن عثمان احمد کی تعریف کر رہے تھے۔

ڈنر کا انتظام باہر لان میں تھا۔ ٹیبل لگے ہوئے تھے اور خوب سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف کوئلے دہک رہے تھے۔ باربی کیو کا انتظام تھا۔ سارے میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لالہ نے دور سے ہی دیکھ کر اسے ہاتھ ہلایا تھا اور سیدی اس کی طرف آئی تھی۔

”جی، مومو تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے مریم کے رخسار کو چوم لیا تھا۔

لالہ خود بھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

بڑے سے گھیر دار فراک میں وہ کوئی مغلیہ شہزادی لگ رہی تھی۔

”اور تم بھی۔“

میڈمز گس نے بے شمار لوگوں کو بلا رکھا تھا۔ ڈاکٹر رافع کے اسپتال کے کئی ڈاکٹر ز وہاں موجود تھے۔ مریم نے ڈاکٹر شہریار کو ایک کونے میں بیٹھے ڈاکٹر معید سے باتیں کرتے دیکھا تو چونک اٹھی۔

”لو ڈاکٹر معید بھی ہیں۔“

اور عین اسی لمحے ڈاکٹر شہریار کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ ذرا سا چونکا..... ”وہ لڑکی۔ یہ لڑکی وہی تو نہیں جو دو بار اسپتال میں نظر آئی تھی لالہ کے کمرے میں۔“

اور پھر سارا وقت اس کی نظریں مریم کو اپنے حصار میں لیے رہی تھیں۔ مریم نے بھی کئی بار اس کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا۔ بیگم آفندی بھی اسے دیکھ کر لکھ بھر کو حیران ہوئی تھیں۔
”اللہ زبانی یہ مومن ہے۔ کتنی مختلف لگ رہی ہے آج اور بہت پیاری نکل آئی ہے یہ تو۔“
زینب عثمان احمد کے چہرے پر قفا خر تھا۔

”مسز آفندی آپ تو جانتی ہیں اس نے خود اپنے آپ کو رلا رکھا تھا۔“
اور نہ جانے کہاں سے نکل کر شرجیل مرزا زینب عثمان کے چہچہے آکھڑا ہوا تھا..... خباثت سے اس کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیتا ہوا..... اور اس کے ساتھ ایک بیک سا لڑکا بھی تھا جس نے فوراً ہی مسز عثمان سے کہا تھا۔

”یہ آپ کی بیٹی ہیں مسز عثمان.....؟“
”ہاں۔“ مسز عثمان نے مڑ کر اسے دیکھا..... ”ارے شچی، تم کب آئے ہو۔ نظریں نہیں آئے۔“
”بندہ تو بڑی دیر سے آپ کی نظر کرم کا خطر تھا۔ آپ کو یہی فرصت نہیں مل رہی تھی.....“ وہ شرارت سے سرخم کرتے ہوئے جھکا۔

”خود ہی کہیں چھپے بیٹھے تھے۔ میں نے تو آتے ہی نرگس سے تمہارا پوچھا تھا.....“ انہوں نے ایک ادا سے کہا۔

”مسز عثمان میں تو بڑی دیر سے سوچ رہا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو اگر اس مہندی والے ایڈ کے لیے آپ کے ساتھ لیا جائے تو.....“
بیک لڑکا منمنایا تو مریم نے اسے غصے سے دیکھا۔

”میں تو بڑے دنوں سے انہیں کہہ رہا ہوں کہ مس احمد کو ماڈلنگ کی طرف لائیں، تمہلکے بچ جانے گا۔ اتنا فریش اور دلکش چہرہ عرصے بعد متعارف ہوگا یہ بات ہی نہیں کہ ابھی پڑھ رہی ہے..... اب تم کہہ کر دیکھ لو۔“
”مجھے ماڈلنگ کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ مریم نے گھور کر شرجیل مرزا اور اس کے سامنے کود دیکھا تھا اور لالہ کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

شرجیل مرزا نے جانے خود کیا کہا تھا کہ زینب عثمان اور اس کے مشترکہ تہقے نے اسے چونکا دیا۔
ایک نظر مڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے وہ ایک کونے میں کولڈ ڈرنکس لیتی لالہ کی طرف بڑھ گئی۔

”لالہ! تم مجھے کہاں چھوڑ آئی تھیں میں بور ہونے لگی تھی۔“
”اتنی رنگ برنگی محفل میں بھی بوریت۔“ لالہ نے اپنی آنکھیں مٹکا لیں۔
”تمہیں پتا ہے میں صرف تمہارے لیے آئی ہوں لالہ۔“
لالہ نے نیپل سے کوک کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا ”تمہارا فیورٹ۔“

مریم نے گلاس لے لیا۔
”دراصل میں نے مجھے ادھر کچھ مہمانوں کو ریو کرنا بھیج دیا تھا۔“ اس نے تفصیل بتائی ”اور پھر میں ڈراڈا کنٹریریار وغیرہ کو ویلو ہائیکر نے چلی گئی تھی۔ وہ بہت نفیس آدمی ہیں اور تم کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ میں ایک خاص بندے کو فون کرنے جا رہی ہوں۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا۔“
”کون؟“ مریم نے پوچھا۔

”ہے ایک۔“ وہ مسکرائی ”آجائے تو تمہاری ملاقات کرواتی ہوں۔“
اور وہ اسے وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ مریم ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔ لالہ کی ایک دوست بھی وہاں تھی۔ جو اس سے اس کے متعلق پوچھنے لگی کہ وہ کون ہے۔ کس کی بیٹی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مریم بے دلی سے اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی کہ ڈاکٹر معید اس کی طرف چلے آئے۔
”کیا حال ہے مس احمد؟“

مریم کو ان کا آنا بہت قیمت لگا کیونکہ وہ اس لڑکی کے تفتیشی سوالوں سے خاصی بیزار ہو رہی تھی۔
”اچھی ہوں۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔
”عاشی نینا اور تیمور وغیرہ نہیں آئے۔ انہیں نہیں لائیں؟“
”وہ..... وہ تو مری چلے گئے ہیں۔ ایڈیشن دلوادیا ہے ماما نے ان کو۔“ وہ ادا سی ہو گئی۔

”کمال ہے، مسز عثمان نے تو ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ کل بھی ملی تھیں اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ آج کل میں چکر لگاؤں گا۔ نینا سے پراس کیا تھا؟ چھانگنا لگا جانے کا۔“
”ہاں اس نے کہا تھا کہ جب آپ آئیں تو آپ سے کہہ دوں کہ وہ جب چھٹیوں پر گھر آئے گی تو آپ کے ساتھ چھانگنا لگا جائے گی۔“

”ضرور.....“ وہ مسکرائے۔ پتا نہیں کیوں مریم کو لگا جیسے وہ بھی ان کے جانے کا سن کر اداس ہو گئے ہوں۔
”ہیلو معید! ابھی شچی نے بتایا کہ تم آئے ہوئے ہو۔“ زینب عثمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مڑے۔

”آپ کا حکم تھا..... کیسے نہ آتا۔“
”تھینک یو معید۔“ ان کی آنکھوں میں ایک دم چمک سی اتر آئی تھی۔
”یہ بچہ مری چلے گئے اور آپ نے ذکر تک نہ کیا۔ مجھے پتا ہوتا تو ان کے جانے سے پہلے اپنا وعدہ نبھا جاتا..... انکل کچھ دنوں کے لیے کراچی چلے گئے تھے۔ آپ کو پتا تو ہے، کتنی مصروفیت ہو گئی تھی۔ جا ہی نہ سکا۔ بچے کیا سوچتے ہوں گے۔“
”بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ ایڈیشن ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا یہاں لاڈ میں بگڑ رہے

ہیں۔" انہوں نے ہنسی نظروں سے مریم کو دیکھا اور پھر معید کی طرف۔

"کم آن معید۔ وہاں بیگم آفندی اور دوسرے لوگ تمہیں پوچھ رہے ہیں۔"

زینب عثمان احمد معید کو لے کر چلی گئیں تو مریم نے پورے ہال میں نظر دوڑائی۔ عثمان احمد امتیاز شاہ کے پاس بیٹھے سر جھکائے ان کی باتیں سن رہے تھے اور بیگم عثمان احمد بے تکلفی سے ڈاکٹر معید کا ہاتھ تھامے ادھر ادھر انہیں متعارف کراتی پھر رہی تھیں..... لالہ مڑ کر آئی ہی نہیں تھی اور مریم پیچھے تار ہی تھی کہ وہ کیوں آئی ہے۔ ہال میں سگریٹوں کا دھواں تھا۔ اونچے اونچے قہقہے تھے۔ نقری ہنسی تھی اور کبھی کبھی میڈم نرگس کی وہ سیٹیاں بجاتی تیز آواز ہال میں گونجنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے تیز آواز میں سب کو کھانے کے لیے باہر چلنے کو کہا تو مریم سب کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب ہی لالہ نے پیچھے سے آکر اسے بلایا اور پھر اس کا ہاتھ چمتی ہوئی باہر لے آئی۔

"کیا بات ہے لالہ؟" مریم نے اپنا ہاتھ اس سے چھڑایا۔

"تم یہاں کھڑی رہو۔ تمہیں ایک خاص بندے سے ملوانا ہے۔"

لان میں ہلکی روشنیاں تھیں۔ کہیں کہیں درختوں پر رنگین بلب جل اور بچھ رہے تھے۔ لوگ میزوں کے گرد کھڑے اپنی اپنی پلیٹوں میں کچھ نہ کچھ ڈال رہے تھے۔ کوئی کسی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ لالہ اسے وہاں کھڑا کر کے چلی گئی تھی۔ مریم ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اپنی پلیٹ میں گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھے شرجیل مرزا اس کے قریب آیا۔

"کس کا انتظار ہو رہا ہے مس احمد؟"

"آپ کا۔" اس کی آواز سن کر مریم نے جل کر کہا۔

"زہے نصیب۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں سرخم کیا "پھر تو آج یہاں چراغاں ہونا چاہیے۔"

"آپ یہاں سے تشریف لے جاسکتے ہیں۔"

"اتنی دیر سے تو انتظار کر رہا تھا کہ کہیں اکیلی نظر آئیں۔ اب کیسے جاسکتا ہوں۔" اس نے پلیٹ سے گوشت کا ٹکڑا اٹھا کر دانتوں سے توڑا۔

مریم کو وہ غاروں کے زمانے کا کوئی جنگلی لگا۔ اس نے منہ موڑ لیا۔

"دور دور سے دیکھ کر سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ آج تو آپ غضب ڈھا رہی ہیں مس مریم"

احمد دل چاہ رہا ہے.....

"آپ مہذب گفتگو نہیں کر سکتے تو پلیز یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

"آپ کی کمپنی چھوڑ کر جانے کو کس کا فرائڈل چاہے گا۔" وہ مسلسل اسے زچ کرنے پر حلا ہوا تھا۔

"میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ آپ کی فریڈ شپ ماما سے ہے۔ ان کی ہی کمپنی تلاش کریں۔"

"ان کی کمپنی....." وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کھنڈی سانس لیتا ہوا بولا "آج کل تو ان کی کمپنی کے لیے بھی ترس گئے ہیں۔ سامنے ڈاکٹر معید جیسا یک بندہ ہو تو ہمیں کون لفٹ کراتا ہے۔"

"سٹ اپ۔" مریم کے رخسار پر اٹھے اور آواز غصے سے کپکپا گئی۔

وہ زور سے ہنسا۔

"جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ تمہیں پتا ہے تمہاری ماما نے عاشری کو کیوں مری بھیجا ہے۔ ڈاکٹر معید کو اس سے بچانے کے لیے۔"

مریم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ غصے کی شدت سے اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ یہاں سے چلی ہی جائے تو بہتر ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھایا۔

"آپ کی ماما سائیکس کیس ہیں مس احمد۔"

شرجیل مرزا نے اسے جاتے جاتے آواز دی لیکن وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھی۔ سامنے ہی پھولی سانپوں کے ساتھ لالہ آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک سو بر سال کا تھا۔

"سوری مومو مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اعزاز مل ہی نہیں رہا تھا۔ اعزاز یہ میری دوست ہیں مومو۔ اگرچہ تھوڑی بڑی ہیں لیکن اچھی دوست ہیں۔" اس نے مڑ کر مریم کا تعارف کروایا..... "اور یہ اعزاز ہیں..... سید امتیاز شاہ کے چھوٹے بھائی۔"

"سید امتیاز شاہ....." مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہیں۔" وہ مسکرائی "سید امتیاز شاہ جی کے سپینڈ....."

"تم..... تم انہیں ڈیڈی یا پاپا نہیں کہتی ہو۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ ڈیڈی اور پاپا ان کے ساتھ سوٹ ہی نہیں کرتا۔" اس نے اطمینان سے کہا "بلکہ جب بھائی لوگ انہیں ڈیڈی کہہ کر بلاتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔" وہ ہنسی۔

تب ہی قریب سے شرجیل مرزا نے ایک نظران پر ڈالی اور پھر گرم جوشی سے اعزاز شاہ کی طرف ہاتھ بڑھایا..... "آہا اعزاز میاں آپ یہاں۔"

اور اعزاز شاہ ان سے معذرت کرتا ہوا شرجیل مرزا کے ساتھ سامنے والی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا ہے؟"

"کون؟" مریم چونکی۔ اس کا ذہن شرجیل مرزا کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

"اعزاز....."

"پتا نہیں۔ میں نے دھیان سے نہیں دیکھا اور پھر صرف دیکھ کر کسی کے متعلق کیسے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

”مجھے اچھا لگتا ہے۔“ ملگجی روشنی میں لالہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں ”میں شاید اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔“

”تم اتنی چھوٹی سی تو ہو۔“ مریم کو حیرت ہوئی۔

”نہیں، خیر اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوں۔“ اس نے اپنے سر اُپے پر نظر ڈالی۔

”مگر وہ تمہارے ڈیڑی کا بھائی ہے۔“

”وہ میرے ڈیڑی نہیں ہیں مومو۔ ماما کے مہینڈ ہیں۔ میرے ڈیڑی تو ارباب سومرو ہیں اور یہ جو

اعزاز ہے نا پتا ہے یہ بھی مجھے لائیک کرتا ہے۔“

لالہ اعزاز کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی لیکن مریم کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ لالہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ادھر لے آئی جہاں سالم بکرے پنوں پر لٹکے ہوئے تھے۔

”مومو تم لونا کچھ۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے پلیٹ لے کر آتی ہوں۔“

مریم نے ادھر ادھر دیکھا۔ نہ نب عثمان معید کے پاس کھڑی کسی بات پر زور سے ہنس رہی تھیں۔

ان کے ہاتھ میں پلیٹ تھی اور وہ کھانے کے بجائے ڈاکٹر معید کی طرف متوجہ تھیں اور عثمان احمد حسب

معمول ان سے بے نیاز کسی صاحب سے باتوں میں مشغول تھے۔۔۔۔۔ مریم کو لگا جیسے وہ ان سے بے نیاز نہ

ہوں لیکن بے نیاز ہونا ظاہر کر رہے ہوں۔

”تو کیا شرجیل مرزا صحیح کہہ رہا تھا۔“ اس نے پھر ماما کی طرف دیکھا، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ماما نے اس کی

وجہ سے عاشی کو بھی بھیجا ہے۔ اس روز انہوں نے پاپا پر تو یہی ظاہر کیا تھا لیکن یہ شرجیل مرزا۔۔۔۔۔ بھلا عاشی

اور ڈاکٹر معید۔۔۔۔۔

”یاز تم ابھی تک یہیں بیٹھی اخبار چاٹ رہی ہو۔“ یعنی اور روشی پیریلے لے کر واپس آگئی تھیں۔

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔۔۔۔۔ اخبار یونہی کھلا پڑا تھا۔ اس نے تو ایک لفظ نہیں پڑھا تھا۔

”دوستوں سے کبھی کبھی شیئر کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا مومو۔“ یعنی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ

رکھتے ہوئے بڑے غلوں سے کہا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ افرنگی سے مسکرائی ”رات کی پارٹی سے سھکن ہو گئی تھی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”تو پھر گھر چلی جاؤ نا۔ یوں بھی ایک پیریلے ہی تو رہ گیا ہے۔“ روشی نے مشورہ دیا۔

”میرا خیال ہے تمہاری گاڑی آگئی ہے۔“ یعنی نے بتایا ”میں گیٹ پر گئی تھی۔ آج ارسل نے آنا تھا

انہیں دیکھئے۔ تو تمہارا ڈرائیور نظر آیا تھا۔“

”ہاں میں نے اسے جلدی آنے کو کہا تھا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”اچھا ابھی خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔۔۔۔۔“

دونوں نے ایک ساتھ کہا اور وہ اپنا ایک سنبھالتی ہوئی لائبریری سے باہر نکل آئی۔



سکندر کا ایک دورا ہے پر آکھڑا ہوا تھا اور اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک طرف اس کے وعدے تھے جو اس نے اپنے آپ سے بھٹا ثار سے اور بابا سے کیے تھے اور دوسری طرف وہ حقائق تھے جن کا احساس ڈولی نے اسے دلایا تھا۔

اس روز ڈولی کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک شرمندہ شرمندہ سا بیٹھا رہا تھا اور ایک جرم کا سا

احساس اسے ہوتا رہا تھا۔

اسے ڈولی کو بتا دینا چاہیے تھا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔ آخر وہ اتنا نادان تو نہیں تھا کہ وہ ڈولی کے

الٹفات کو نہ سمجھ سکا تھا۔ جب کوئی لڑکی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ کسی پر مہربان ہوتی ہے تو اس کا کیا

مطلب ہوتا ہے۔ کیا وہ اتنا انجان تھا کہ اس کا مطلب نہ جانتا ہو۔

شاید اس کی مردانہ انوکھ ڈولی کی یہ مہربانیاں اور الٹفات سکون پہنچاتے تھے۔ تبھی تو۔۔۔۔۔

اگرچہ اس روز اس نے ڈولی سے بار بار معذرت کی تھی۔ اپنی مجبوریاں بتائی تھیں۔ اس کی

خوبصورتیوں کو سراہا تھا۔ یہ اعتراف کیا تھا کہ اس کی رفاقت کسی بھی شخص کی زندگی کے لیے باعث فخر ہو سکتی

ہے اور یہ اس کی بد نصیبی ہے کہ وہ اس کی رفاقت سے محروم رہے گا۔ لیکن جیسے دل کو اطمینان نہیں ہوا

تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے ڈولی کا دل دکھا کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ وہ کتنی شاکہ ہوئی تھی۔ کس طرح

اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی۔ دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے۔

لیکن وہ بے چین سا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ ایک بار پھر۔۔۔۔۔ ایک بار پھر وہ ڈولی سے معذرت

کر لے۔ کہیں ڈولی کی آہ اس کی آئندہ زندگی پر نہ پڑ جائے۔ تب وہ صبح صادق اور محسن کو بتائے بغیر اس

کے چچا کے گھر چلا گیا تھا۔

اتفاق سے اس وقت ڈولی گھر میں اکیلی تھی۔

محسن کے چچا اور چچی کہیں گئے ہوئے تھے۔ ملازم نے اسے بتایا کہ صرف ڈولی بی بی اور بچے گھر پر ہیں۔

”اچھا تو ڈولی بی بی کو بتا دیجیے کہ سکندر آیا ہے۔“

ڈولی ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے ملی۔ کسی دکھ یا کسی ناراضگی کی پرچھائیں اس کے چہرے پر نہ تھیں۔

”سوری ڈولی۔۔۔۔۔ میں نے انجانے میں تمہارا دل دکھایا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں بہت اپ

سیٹ ہوں۔“

”شاید غلطی میری بھی تھی۔ میں جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ہم دونوں فارگیت اٹ.....“

اس نے خوش دلی سے کہا۔

”تو تم مجھے سے خفا نہیں ہونا ڈولی۔“ سکندر کے دل کو جیسے سکون سا مل گیا تھا۔

”نہیں..... سکندر، ہم اچھے دوست ہیں۔ کیا ہم ہمیشہ اچھے دوست نہیں رہ سکتے۔“

”کیوں نہیں۔“

”ہر محبت کا انجام شادی تو نہیں ہوتا۔“ ڈولی مسکرائی ”اور پھر یہ تو یک طرفہ محبت تھی۔ تم پہلے سے ہی انوالو تھے، تصور تمہارا بھی نہیں تھا۔ اچھا بتاؤ وہ کیسی ہے تمہاری کزن؟“

اس نے ملازم کو چائے لانے کے لیے کہا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”اچھی ہے..... بہت پیاری ہے۔“

”ابجو کیشن کیا ہے اس کی.....؟“

”میٹرک کیا ہے اس نے۔“

”کبھی ملو آؤ اس سے۔ ہم بھی تو دیکھیں جس کو اس درجہ چاہتے ہو تم اس میں میری ہی کوئی بات بھی ہے۔“

ڈولی کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ..... وہ ہے اور تم، تم دو دنوں کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔“

اور یوں ڈولی سے رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ کتنا بڑا ظرف ہے اس کا اور کوئی لڑکی ہوتی تو اسے کبھی منہ ہی نہ لگاتی لیکن وہ اسے مخلصانہ مشورہ دیتی تھی۔ اس کے گاؤں جا کر پریکٹس کرنے کا سن کر اسے بے حد حیرت ہوئی تھی۔

”پاکل ہو گئے ہو سکندر۔ وہاں گاؤں میں کیا ہوگا۔ تمہاری تو ساری صلاحیتوں کو زندگی لگ جائے گا۔ سارا دن کلینک پر بیٹھ کر کلیاں مارو گے یا پھر زکام بخار اور خسرہ کی دوائیاں دیتے رہو گے۔ یہ دوائیاں تو ایک حکیم بھی بے آسانی دے سکتا ہے۔“

”لیکن ڈولی یہ میرا اپنے بابا اور اپنے آپ سے عہد تھا کہ میں ڈاکٹر بننے کے بعد گاؤں میں ہی پریکٹس کروں گا..... وہاں ہی کلینک بناؤں گا۔“

”دیکھو سکندر میں تمہاری دوست ہوں۔ تمہارے ساتھ مخلص ہوں۔ خالی خولی ایم بی بی ایس کی ڈگری لینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک تجربہ نہ ہو۔ کسی بڑے شہر کے بڑے اسپتال میں کام کرو گے تو تمہیں تجربہ حاصل ہوگا۔ نئے نئے مریض آتے ہیں۔ کم از کم دو سال تو تمہیں یہ کام کرنا چاہیے اور پھر تمہارا رجحان سرجری کی طرف ہے۔ وہاں گاؤں میں کیا سیکھو گے؟“

ڈولی کی باتیں اسے صبح گئی تھیں۔ لیکن وہ جو خیر کی وفات پر اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا اور محسن اور صبح صادق سے کہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اپنے گاؤں میں ہی رہے گا پھر بابا کے بھی دو خطوط آچکے تھے کہ اس کی ہاؤس جاب کب کی مکمل ہو چکی ہے تو وہ گاؤں کیوں نہیں آ رہا..... اور وہ دورا ہے پر کھڑا تھا اور فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔

”بہر حال۔“ اس نے بیگ بند کرتے ہوئے سوچا۔

فی الحال تو گاؤں جایا جائے بہت دن ہو گئے تھے اسے گاؤں گئے ہوئے۔ سب کے لیے دل ادا اس ہو رہا تھا۔ رضوانہ بھی ادا اس ہوگی۔ اتنے بہت دنوں بعد گھر جاتا تھا تو رضوانہ شام کی نظروں سے اسے دیکھتی تھی۔ کہتی تو کچھ نہ تھی مگر اس کی آنکھیں شکوہ کرتی تھیں۔

”خیر اس بار زیادہ دن رہوں گا۔ سارے شکوے دور ہو جائیں گے۔“ وہ مسکرایا۔

تب ہی صبح صادق جھلایا ہوا سا اندر داخل ہوا اور دم سے بیڈ پر گر گیا۔

”خیریت ہے۔ کیا اسپتال پسند نہیں آیا؟“ اس نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”اسپتال کیا چھوٹا سا کلینک ہے اور وہاں کے مالک ڈاکٹر صاحب کے جو خیرے تھے تو بے اتنے بجے آنا ہوگا۔ یہ کرنا ہوگا۔ وہ کرنا ہوگا اور تنخواہ ہوگی تین ہزار۔ میں نے تو انکار کر دیا۔ یا رہم نے تو وقت ہی ضائع کیا ہے۔ کیا عزت ہے اس ملک میں ڈاکٹر کی۔ ہاؤس جاب کر رہے تھے تو پندرہ سول رہے تھے۔ جس سے دو وقت کی روٹی بھی پوری نہیں ہوتی۔ اس سے اچھا تو میرا کزن رہا جو ایک پرائمری اسکول میں ماسٹر ہے اور ہم سے اچھی تنخواہ پا رہا ہے۔“

صبح صادق کا موڈ بہت خراب تھا وہ کسی پرائیوٹ کلینک میں جاب کرنے کے لیے گیا تھا۔

”پھر.....؟“ سکندر نے پوچھا۔

”گورنمنٹ جاب کا ہی انتظار کروں گا۔ ایلانی تو کر دیا ہے۔ فی الحال تو میں بھی تمہارے ساتھ گاؤں جا رہا ہوں۔ محسن بھی وہاں ہی ہے انجوائے کریں گے گھوٹیں گے۔ پھر میں گے۔“

”محسن، ہم سب سے اچھا رہے گا۔ باہر سے اسپتال نرک کے آئے گا تو ظاہر ہے قدر ہوگی اس کی۔“ سکندر نے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں یا زید تو ہے۔ محسن کو شش تو کر رہا ہے کہ ان ہی دو تین ماہ میں چلا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے سکندر۔ گاؤں میں ہی سیٹل ہو گے یا پھر.....؟“

”پتا نہیں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا ایلانی تو میں نے بھی کر دیا ہے۔“

”مگر سکندر تم نے تو بہت پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔“ صبح صادق کو کچھ حیرت ہوئی۔

”فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن صبح صادق میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ایک دو سال میں یہاں کسی اسپتال میں کام

کر لیتا تو کچھ تجربہ ہوتا۔ ابھی تو صرف کتابی علم ہے۔ ہاؤس جاب کے دوران جو کچھ سیکھا ہے وہ بہت کم ہے۔
”پھر اپنا پروگرام ضرور بنانا۔“ صبح صادق جوتے اتار کر لیٹ گیا۔ ”میں تو اب لگا ہوں سونے۔ صبح
ہی گاؤں جاؤں گا۔ تمہارا کیا پروگرام ہے ابھی جاؤ گے؟“

”ہاں میں اب نکلنے ہی لگا تھا۔“

”واپسی کا کیا پروگرام ہے۔۔۔؟“

”ہفتے ڈیڑھ ہفتے تک لوٹ آؤں گا۔ اور تم۔۔۔۔۔“

”میں اپنی کال کا انتظار کروں گا اور اتنے دن اماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیاں کھاؤں گا اور اپنے
گاؤں کی لگیوں میں گھوموں پھروں گا۔ تم اپنے واپس آنے کی اطلاع ضرور دینا۔“
صبح صادق نے آنکھیں موند لیں اور آنکھیں موندے موندے ہی ہاتھ بڑھا دیا۔ سکندر نے اس سے
ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

ماں جی اور بابا جی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بھانشار بھابو اور رضوانہ بھی بہت خوش
تھی۔۔۔۔۔ اسے دیکھتے ہی رضوانہ کی آنکھوں میں جیسے قدیلیں جل اٹھی تھیں۔ وہ زیادہ تر بھابو کے ساتھ کچن
میں مصروف رہتی یا پھر شیری کو گود میں اٹھائے رکھتی۔ وہ برآمدے میں کرسی بچھائے اسے ادھر ادھر چلنے
پھرتے اور کام کرتے دیکھتا رہتا اور دل میں ڈولی اور اس کا موازنہ کرتا رہتا۔
کبھی ڈولی کا پلڑا آسمان پر جا لگتا اور کبھی رضوانہ کا۔

دونوں میں سے کون زیادہ خوبصورت تھا یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

ڈولی کے حسن میں شعلوں کی سی لپک تھی تو رضوانہ کے حسن میں چاندنی کی سی ٹھنڈک۔

اور پھر رضوانہ جیت جاتی۔ وہ اس کی اولین محبت تھی۔ اس کی منکوحہ تھی۔ اس کے دل میں شگوفے سے
پھوٹنے لگتے تھے۔ اس کی نظریں اس کے تعاقب میں رہتیں۔ رضوانہ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا
دیتی۔ شرمیلی سی مسکراہٹ۔۔۔۔۔ اور اس کے رخسار پر سرخی سی دوڑ جاتی۔ ایسے میں وہ اسے بہت اچھی لگتی
تھی۔ کبھی کبھی وہ اسے بلاتا۔ اس سے بات بھی کر لیتا۔ پتا نہیں کیوں اب وہ اس سے بات کرتے ہوئے
جھجکتی لگتی تھی۔ شاید وہ بہت دنوں بعد آتا تھا اس لیے۔۔۔۔۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے باتیں کرے۔

اور اس کی وہ دلکش آواز

اس کی وہ مترنم ہنسی

وہ محسوس کرے اور اس کے دل پر کہیں اگر ڈولی کا کوئی ہلکا سا نقش ہے بھی تو یہ دلکش آواز یہ خوبصورت
ہنسی اس نقش کو مٹا ڈالے لیکن جب وہ اس سے بات کر رہا ہوتا تو پتا نہیں کہاں سے ڈولی کی باتیں آکر
اسے ڈسٹرب کرنے لگتیں۔۔۔۔۔

اس کی گفتگو

اس کا انداز

اس کی ادائیں

وہ چھتلا سا جاتا۔

”کیا بات ہے سکندر؟“ ایک روز رضوانہ نے نگاہیں جھکائے جھکائے پوچھا ”تم کچھ پریشان ہو۔“
”نہیں تو۔“ اسے حیرانی ہوئی کہ رضوانہ کو کیسے پتا چلا کہ وہ کچھ اپ سیٹ ہے۔
”نہیں۔ شاید تمہارا گاؤں میں دل نہیں لگ رہا۔“

اس نے رضوانہ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور اس کی گود سے شہریار کو لے کر اوپر اچھالنے
لگا تھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ رضوانہ کی موجودگی کے باوجود وہ ادب گیا تھا۔ گاؤں
کی عورتیں اکثر اپنے بچوں کو لے کر آ جاتیں۔ کسی کو زلہ کسی کو بخار کسی کو اسہال کی شکایت ہوتی تھی۔
اسے ڈولی کی باتیں سچ لگنے لگی تھیں ”تو کیا وہ ساری زندگی زلہ بخار اور اسہال کی دوائیں دیتا رہے گا
اور کلینک میں بیٹھ کر کھیاں مارتا رہے گا۔ جو اس کے اندر اتنا ٹیلنٹ ہے۔۔۔۔۔ آگے بڑھنے کا جذبہ
ہے۔۔۔۔۔ کیا سب ایک نقطے پر ٹھہر جائے گا۔ کیسی جامد لائف ہوگی اور پھر اس میں اور حکیم صابرخان میں کیا
فرق رہ جائے گا۔ وہ بھی تو زلہ بخار اور اسہال کے لیے ہی ڈاکٹری دوائیں دیتا ہے۔ کسی کو ڈسپرین دے
دئی کسی کو کمکول دے دیا۔“

اس روز جب بھانشار بابا کے آگے حقد رکھ کر اس کے کمرے میں آئے تو وہ سنجیدگی سے واپس جانے
کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈولی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اسے لاہور میں ہی جاب کرنا ہے تو وہ
انگل سے کہہ کر اس کے لیے بہت جلد جاب کا بندوبست کروا دے گی۔

”ہاں یار۔“ وہ اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئے۔

”اب تو کافی آرام کر لیا ہے۔ کیا ارادے ہیں؟ کل سے اپنی دکانداری شروع کر دو۔ ملک فتح خان
آج بھی پوچھ رہے تھے کہ سکندر کب سے کلینک پر بیٹھے گا اور مریم یوں کو دیکھنا شروع کرے گا۔ فی الحال
میں نے اسے بیٹھک دینے کو کہا ہے۔ بعد میں ذرا فصل ہو جائے تو ادھر پیچھے والی زمین پر تیرا کلینک بھی
بن جائے گا۔ نقشہ وغیرہ تو بنوایا ہے۔“

”بھائی دراصل وہ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی ایک دو سال کسی بڑے اسپتال میں نوکری کر لوں۔“

بھانشار نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میرا ارادہ ہے کہ ساتھ پڑھ بھی لوں۔ پارٹ ون کی تیاری کروں گا۔ یہاں رہ کر تیاری نہیں
ہو سکتی۔ وہاں دوستوں کے ساتھ مل کر اور پھر سر بھی ہیں مدد کے لیے۔“ وہ کچھ دیر رکا اور بھانشار کے چہرے

کی طرف دیکھا۔ جس پر کچھ پہلے والی چپک نہیں تھی۔

”پر یہاں سب خوش تھے تیرے آنے سے۔ گاؤں والے بھی اور بابا بھی۔ بابا نے تو سب سے کہہ رکھا ہے کہ اب کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تم لوگوں کے لیے تو اپنے پتر کوڑا کٹری پڑھائی ہے۔“

”پر بھابی۔“ اس نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی ”یہ خالی خولی ایم بی بی ایس کی ڈگری تو بے فائدہ ہے۔ جب تک.....“ اس نے وہ ساری باتیں چوہدری ثار کے سامنے دہرا دی تھیں جو ڈولی نے وقتاً فوقتاً اس سے کہی تھیں۔

”ٹھیک ہے یار جیسی تیری مرضی۔“

بھانٹار نے بات ختم کر دی تھی لیکن ان کے چہرے پر افسردگی چھا گئی تھی۔ جیسے اس کا فیصلہ انہیں بھی پسند نہ آیا ہو۔ بابا بھی اس فیصلے پر خوش نہ تھے۔

”میں نے تو سوچا تھا پتر چند ماہ تک تیری شادی کروں گا۔“ انہوں نے اسے بیک بند کرتے دیکھ کر کہا۔ ”شادی بھی ہوئی رہے گی بابا ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ فی الحال تو مجھے اور پڑھنا ہے۔ کم از کم دو سال تک میں شادی نہیں کروں گا۔“

”مجھے اپنے چاچا کی روح کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔“

”ارے نہیں بابا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”رضوانہ بہت اچھی لڑکی ہے پتر بہت نازک دل ہے۔“

”میری طرف سے آپ بالکل بے فکر ہیں بابا۔“ اس نے ان کے ہاتھ چوم لیے ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے رضوانہ کو میں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔“

”جیتے رہو۔ خوش رہو۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

بیک بند کر کے جب وہ بھابھو کو ڈھونڈتا ہوا کچن کی طرف آیا تو رضوانہ کچن سے باہر آ رہی تھی۔

”رضی۔“ میں لاہور جا رہا ہوں۔“

”جی۔“ رضوانہ کی آنکھیں یک دم آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

”رضی اتنی اداس مت رہا کرو۔ تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔“

”تمہارا لاہور جانا کیا ضروری ہے سکندر۔“

”ہاں ضروری ہے نارضی..... میں کچھ اور پڑھنا چاہتا ہوں۔ کچھ اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”بھابی کہتے تھے کہ اب آپ یہاں ہی رہیں گے۔“

”یہاں میری صلاحیتوں کو رنگ لگ جائے گا رضی۔ میں ایک دفعہ سیمٹل ہو جاؤں پھر تم سب کو ساتھ

لے جاؤں گا۔“

اس نے سر ہلایا۔

”ادھر اوپر دیکھو رضی۔“

رضوانہ نے بے مشکل بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

وہ تڑپ اٹھا۔

”رضی پلیز مت رو۔ تمہارے یہ آنسو مجھے بے چین رکھیں گے۔“

”مجھے خوف آتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے سکندر کہیں تم مجھے بھول نہ جاؤ۔“

”میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں نے تو تمہیں خدا اور رسول کو گواہ بنا کر اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔ تم میری زندگی کا حصہ ہو۔ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ تم میری پہلی محبت ہو اور ہم نے اکٹھے زندگی گزارنی ہے۔“

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ مجھے یاد نہیں کرتے۔ جیسے آپ کی آنکھوں کو کوئی اور بھا گیا ہے۔ اب آپ کی نظر میری طرف اٹھتی ہیں تو ان میں وہ اشتیاق نہیں ہوتا۔ وہ محبت مجھے محسوس نہیں ہوتی جو پہلے ہوتی تھی۔“

”تم پاگل ہو رضی..... وقت کے ساتھ ساتھ آدمی میچورڈ ہو جاتا ہے۔ جب آدمی ٹین ایجر ہوتا ہے تو اسے اپنے جذباتوں پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھیں اور اس کا پورا وجود اس کے جذباتوں کا اظہار کرتا ہے۔ تمہیں کیا خبر رضوانہ۔“ وہ ایک دم جذباتی ہو گیا..... ”میں تمہیں کتنا یاد کرتا ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جب میں نے تمہیں نہ سوچا ہو۔ جب ہم ایک ہوں گے تو میں تمہیں ان سارے بے قرار دنوں اور راتوں کی باتیں بتاؤں گا۔ اچھا چلو اب مسکرا دو۔ ورنہ تمہارے آنسو مجھے ہفتوں بے چین رکھیں گے۔“

اور رضوانہ روتے روتے مسکرا دی تھی اور وہ سب کو تسلیاں دے کر لاہور واپس آ گیا تھا۔ ڈولی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”یہ تم نے اچھا کیا سکندر گاؤں میں اپنی زندگی ضائع کرنے کے بجائے یہاں آ گئے ہو۔“

اور پھر ڈولی نے ہی جاب دلوانے میں اس کی مدد کی تھی۔

صبح صادق گاؤں میں تھا۔ اسے جاب نہیں ملی تھی۔ محسن باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں۔ بس وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے نیلوفر کو پابند کر دے اور اس مقصد کے لیے گاؤں سے اس کے والد اور والدہ آئے ہوئے تھے۔ اس نے فون پر سکندر کو بتایا تو سکندر ان سے ملنے کے لیے اس کے چچا کے گھر آیا۔

”یار تم نے یہاں جاب کر لی۔ تمہیں تو گاؤں جانا تھا۔“ محسن کو حیرت تھی۔

”دراصل مجھے پارٹ ون کی تیاری کرنی ہے جو گاؤں میں رہ کر ممکن نہ تھی۔ جانا تو بہر حال مجھے گاؤں ہی ہے۔ بس کچھ لیٹ ہو جاؤں گا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”بیٹا، تم بھی باہر کیوں نہیں چلے جاتے محسن کے ساتھ۔“ محسن کے والد نے مشورہ دیا تو وہ اداس ہو گیا۔ وہ تو خود باہر جانا چاہتا تھا..... لیکن یہ اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ بابا اس کو باہر بھیجنا انور ڈنہیں کر سکتے تھے۔

”انگل صحیح کہہ رہے ہیں سکندر۔ تمہیں باہر ضرور جانا چاہیے۔“

ڈولی نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ اس وقت تو وہ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ اس کے لیے فی الحال باہر جانا مشکل ہے لیکن ایک دن ڈولی جب اس کے اسپتال آئی تو اس نے تفصیل سے اسے بتایا کہ اس کے لیے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنا کیوں مشکل ہے۔

”ایک دفعہ تم وہاں چلے جاؤ تو پھر وہاں تم کوئی جاب کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر سکتے ہو۔“

پاپا کچھ دنوں میں آنے والے ہیں میں ان سے بات کروں گی۔“

”نہیں پلیز ڈولی، تم اپنے پاپا سے کچھ مت کہنا۔ میں اتنے احسانات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے انجانے میں تمہیں دکھ پہنچایا ہے۔ میں تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکتا اور تم.....“

”پلیز سکندر میں تمہیں کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ ہم اچھے دوست ہیں اور کیا دوست دوستوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ بھول جاؤ اس بات کو جو میں نے تم سے کہی تھی۔“

”کیسے بھول جاؤں بہت مٹائی فیل کرتا ہوں ڈولی۔“

”.....“

ڈولی نے اسے مزید اس موضوع پر بات کرنے سے روک دیا تھا اور اس کے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنے پاپا سے بات کر لی تھی۔ اس کے والد نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ واپس جا کر امریکا جاتے ہی وہ اسے وہاں بلانے کی کوشش کریں گے اور جاتے ہوئے وہ اس کے کاغذات وغیرہ لے گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ محض ڈولی کے کہنے پر اس سے کاغذات وغیرہ لے لیے ہیں۔ وہاں جا کر وہ بھول جائیں گے لیکن وہ بھولے نہیں تھے اور ایک دن انہوں نے اسے وہاں بلوانے کے سب انتظامات کر لیے۔ ڈولی بہت خوش تھی۔

”اب تمہارا فوج بہت برائٹ ہو گا سکندر۔ جب تم وہاں سے اسپیشلائز کر کے آؤ گے تو پھر دیکھنا اس ملک میں تمہاری کتنی قدر ہوگی۔“

”ڈولی.....“ و فور جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی ”میں تمہارے اس خلوص اور محبت کا قرض کبھی نہیں چکا سکتا۔“

”دوستوں کے درمیان کوئی قرض نہیں ہوتا۔“ ڈولی نے مسکرا کر اسے دیکھا ”اور پھر یہ تو میری اپنی

خواہش تھی کہ تم ہائر ایجوکیشن کے لیے باہر جاؤ۔ دو ماہ تک میں بھی آ جاؤں گی۔ پاپا تمہاری رہائش کا بندوبست کر دیں گے۔ گھبرانائیں اور پھر محسن بھی تو وہاں ہو گا نا۔“

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ڈولی کا شکریہ ادا کرے اور وہ کس طرح اس کے احسانات کا بار لے..... وہ کتنی مخلص تھی..... کتنی بے غرض اور بے لوث دوستی تھی اس کی۔

کاش! وہ رضوانہ سے محبت نہ کرتا ہوتا۔

کاش! اس کا نکاح رضوانہ سے نہ ہو چکا ہوتا تو وہ ڈولی کو اپنا رفیق سفر بنا لیتا۔ ڈولی ہر لحاظ سے ایک مکمل لڑکی تھی۔

خوبصورت، ایجوکیٹڈ، مخلص اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی لیکن وہ اس کی محبتوں کا جواب محبتوں سے نہیں دے سکتا تھا کہ اس کے پاؤں میں تو بہت مضبوط زنجیریں تھیں۔

رضوانہ صرف اس کی منکوحہ تو نہیں تھی۔

اس کی چاہت بھی تھی۔

اس کے دل کی بستی میں کھلنے والا اولین محبت کا شگوفہ اسی کے نام سے کھلا تھا اور اس کی خوشبو مست کیے رکھتی تھی۔ ڈولی سے ملنے کے باوجود کبھی اس کے دل میں خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کبھی رضوانہ سے بے وفائی کرے گا۔ تب ہی تو جب بابا اور بے جی نے اسے مجبور کیا تھا کہ اگر وہ باہر جا رہا ہے تو رضوانہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائے تو وہ چڑ گیا تھا۔

”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے بابا۔“

”تمہ پر اعتبار ہے بیٹا۔ زمانے پر نہیں ہے۔“

”بابا! میں بڑھنے کے لیے جا رہا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا اور پھر ایک سال تک جاب کر کے جتنے پیسے میں نے جمع کیے ہیں وہ میرا ایک طرف کا کرایہ بھی نہیں بنتا۔ یہ تو ایک دوست نے میرے جانے کا سارا انتظام کیا ہے۔ میں رضوانہ کو بھلا کیسے لے جا سکتا ہوں۔ اس کا جانا ایسا بھی آسان نہیں ہے۔“

”تو کیا جانا ایسا ضروری ہے پتر تو بھی نہ جا۔“ بے جی نے اسے سمجھایا ”کیوں خواہو وہ دوست کا احسان لیتا ہے اور پتر تو تو اپنی ضروریات ہم سے بھی نہیں کہتا تھا دوست کے سامنے ہاتھ کیسے پھیلا یا۔“

”بے جی.....“ اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا ”میں نے اپنے دوست کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا بلکہ اس نے خود سارا انتظام کیا ہے۔ بے جی وہ بہت مخلص دوست ہے میرا۔“

بھانٹار نے بھی اسے سمجھایا تھا کہ وہ نہ جائے۔

”آپ بھی بھانجی..... آپ تو اس کی اہمیت سمجھتے ہیں آپ بھی ایسا کہہ رہے ہیں۔“ اسے حیرت ہوئی۔

”میں بے جی اور بابا کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ وہ تیری اتنی طویل جدائی برداشت نہیں کر سکتے۔ تو

لاہور میں ہوتا ہے۔ مہینے بعد گھر کا چکر بھی لگاتا ہے پھر بھی بے جی بے قرار رہتی ہیں۔ غمزدگی بے وقت موت نے ان کا دل کمزور کر دیا ہے۔ ماں باپ کو جب جوان اولاد کی جدائی سہنی پڑتی ہے تو ان کے دلوں کو دیمک ہولے ہولے چائے لگتی ہے۔ ڈھسے جاتے ہیں وہ اندر سے۔ تم نے کبھی محسوس کیا سکندرؑ نہ ماں جی کی آواز میں وہ رعب رہا ہے اور نہ بابا کے لہجے میں وہ کھٹک رہی ہے۔ تم نہ جاؤ سکندر۔“

لیکن اسے تو بہر حال جانا ہی تھا۔ سب انتظام ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھانڈا کی باتیں سن کر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے لیکن پھر ڈولی کو شرمسار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پاپا سے کیا کہتی کہ جس شخص کے لیے انہوں نے اتنی کوشش کی وہ ارادے کا اتنا کمزور ہے کہ ماں باپ کے آنسو دیکھ کر ارادے توڑ بیٹھا۔ نہیں پہلے بھی اس نے ایک بار ڈولی کو ہرٹ کیا تھا۔ اب وہ اسے ہرٹ نہیں کر سکتا تھا۔ سوسب کو تسلیاں دے کر بھلا کر وہ امریکا جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔



”تو ساری بات یہ ہے دوستو کہ حقیقت نگار جتنا بھی باکمال ہوگا اتنا ہی اس کا نقطہ نظر غیر فحش ہوگا.....“ پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ مسکراہٹ تھی اور ان کی نگاہیں ارسلان، ارمنان اور مسرور پر تھیں۔

”سر کیا فطرت نگاری اور حقیقت نگاری الگ الگ ہیں؟“ ارسلان جو بہت دھیان سے ان کی باتیں سن رہا تھا اس نے ان کی بات ختم کر دینے کے بعد پوچھا۔

”فطرت نگاری حقیقت نگاری کی وہ قسم ہے جو زندگی کے ان پہلوؤں کا اجاگر کرتی ہے جن کو روایتی رومانیت نے فراموش کر دیا تھا۔ گستاخ فلائیر، گوگور، برادران، زولا اور موباسان ادبی فطرت نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ موباسان نے مختصر افسانے پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ زولا کے خیالات میں ناول ایک سائنسی تجربے کے مماثل ہے۔ اس کے خیال میں جب یہ طے کر لیا کہ کردار کیسا ہے تو پھر وہ فلاں فلاں کام کرے گا۔ یہ نظریہ ناقص ہے۔ زولا نے بھی اس کی پابندی نہیں کی۔ اس کے کردار عام طور پر قابل نفرت ہیں۔“ انہوں نے جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی..... ”انسانی زندگی اور سائنسی تجربات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انسان کا عمل تو پیچ در پیچ ہوتا ہے۔“ مسرور نے رائے دی۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“ انہوں نے باقی ماندہ سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک کر نیا سگریٹ جلایا۔ تم نے فلائیر کے ناول ”مادام باورسی“ کو پڑھا ہے؟“

”سر ہمارا مطالعہ بہت معمولی سا ہے، بہت کم پڑھا ہے۔“ ارسلان نے شرمندگی سے کہا۔

”سلا میو تارینچی ناول ہے۔ اس میں قرطاجتہ کی زندگی بیان کی ہے اس نے اور ”مادام باورسی“ کی عشقہ زندگی کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔“ بات ختم کر کے انہوں نے ارسلان اور ارمنان کو مخاطب کیا۔

چاہو تو میری لائبریری سے استفادہ کر سکتے ہو۔ میرے پاس بہت اچھا انتخاب ہے۔ ایسی کتابیں ہیں جو پاکستان میں کہیں نہیں ملیں گی۔“

”شکریہ سر۔“ ارسلان نے عقیدت سے انہیں دیکھا۔ وہ ان کی ذات اور شخصیت سے بے حد متاثر تھا۔

”سر تجنی صاحب نہیں آئے؟“ ارمنان نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”انہیں آنا تو تھا، پتا نہیں کیوں نہیں آئے۔“

جب ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے مسرور کی طرف دیکھا۔ مسرور نے اٹھ کر فون اٹینڈ کیا۔

”سر تجنی صاحب ہیں۔ نہ آسکتے پر معذرت کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک زبردست خبر ہے ان کے پاس آپ کے لیے۔“ مسرور نے ریسور ہاتھ میں پکڑے پکڑے انہیں بتایا۔

”اچھا۔“ وہ بد دلی سے اٹھے اور ریسور اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔

”کیا خبر ہے تجنی صاحب؟“

”اوه نہیں۔“ تجنی صاحب کی بات سن کر انہیں واقعی حیرت ہوئی تھی

”تمہارا مطلب ہے میرے گھر سے نکلے ہوئے۔ آر یو شیور..... مگر کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

تمہیں کہاں سے خبر ملی؟“ پروفیسر عادل کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”خبریت ہے سر؟“ وہ فون کر کے پلٹے تو ارسلان نے پوچھا۔

”آمنہ صفی کو کل رات کسی نے اغوا کر لیا۔“ انہوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے بتایا ”اور تشویش کی بات یہ ہے کہ وہ کل رات اس وقت اغوا ہوئیں جب میرے گھر سے باہر نکل کر سڑک پر ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھیں۔“

”شاید کوئی خاندانی دشمنی۔“ ارمنان نے رائے ظاہر کی۔

”کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ کچھ پریشان پریشان تو لگتی تھیں۔ جب سے وہ یہاں آ رہی تھیں۔“

”آپ کب سے انہیں جانتے ہیں؟“

”چند ہی دن ہوئے ہیں۔ غالباً تیسری بار وہ کل رات تجنی کے ساتھ آئی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ایک دو روز میں اسلام آباد چلی جائیں گی۔ تجنی تو بہت دیر سے گیا تھا۔ وہ مغرب کے کچھ دیر بعد ہی اٹھ گئی تھیں۔“ انہوں نے تفصیل بتائی۔

مسرور گہری سوچ میں تھا۔ اس روز ٹیرس پر وہ سلطان کے ساتھ بیٹھا تھا جب آمنہ صفی کو گیٹ تک چھوڑنے کو پروفیسر عادل آئے تھے اور آمنہ صفی کی طرف دیکھ کر سلطان مسکرایا تھا۔

”بہت زبردست عورت ہے یار۔ تم نے غور کیا۔“

”نہیں۔“ مسرور کو اس طرح کسی بھی عورت کو موضوع بنانا پسند نہ تھا۔

”بہت بے باک اور بولڈی ہے۔ ایسی عورتیں مجھے بہت اپیل کرتی ہیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی عورتیں..... مکمل عورت ہے یہ۔“
مسرور خاموش ہی رہا۔

”ڈریس اگرچہ بہت ڈھیلا ڈھالا اور بے ڈھنگا سا پہنا ہوا ہے لیکن پتا چل رہا ہے کہ اس بے ڈھنگے ڈریس کے اندر ایک زیر دست جسم ہے۔“ سلطان مسلسل تبصرہ کرتا رہا تھا اور مسرور بیزاری کے باوجود اسے منع بھی نہیں کر سکا تھا۔

”اس طرح کی عورتیں بہت جلد پکھل جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی رفاقت سے خوش کرتی ہیں۔“

”لیکن ضروری تو نہیں کہ آمنہ مہنی بھی ایسی ہی ہو۔ بعض اوقات آدمی کے اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں.....“ مسرور کو سلطان کے انداز گفتگو سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک ہر عورت قابل احترام تھی۔

”میں نے بہت عورتوں کو جانچا اور پرکھا ہے مسرور میاں۔ تم کیا جانو تمہارے اس دوست پر عورتیں کس طرح فدا ہوتی ہیں کس طرح شہد کی مکھڑ کی طرح لپکتی ہیں میری طرف۔ میں سلطان کو یہی تو نہیں کہلاتا۔“ بہت غرور اور تفاخر تھا اس کے لہجے میں اور وہ چند لمحے پہلے کے سلطان سے بہت مختلف لگ رہا تھا۔

”اور دیکھ لیتا..... یہ آمنہ مہنی بھی زیر ہو جائے گی خود ہی۔ پھر میں تمہیں بھی بتاؤں گا کہ میرا اندازہ غلط تھا یا صحیح۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی..... ”میں اگر آج اس وقت باہر ہوتا اور اسے نہ کرتا اپنے ساتھ جانے کی تو وہ میرے ساتھ چل پڑتی۔ خیر چھوڑو۔ میں ابھی کچھ دن یہاں ہوں۔ تم سب..... بیٹا..... نیش کرواؤ گے تمہیں بھی..... آج تمہارا بی بی نہیں چاہ رہا تو پھر سہی۔“

مسرور حیران تھا کہ اس کی اور سلطان کی دوستی کیسے نیچے گی۔ وہ دونوں مزاج کے اعتبار سے دو مختلف انسان تھے اور سلطان تھا کہ اسے دوست بنانے پر تلا ہوا تھا..... اور پھر کل شام کو بھی تو وہ آیا تھا۔ کچھ خاموش اور چپ چاپ تھا۔ مسرور نے فوراً ہی اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔

”کیا بات ہے مانی اتنے چپ چاپ سے کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں ٹھکن ہے۔ رات بالکل نہیں سویا۔ یوں بھی یہاں آکر راتیں سونے کے لیے تھوڑی ہوتی ہیں۔“ وہ ہاتھ کاٹکیے بنا کر اس کے بیڈ پر ہی لیٹ گیا تھا۔

”یہ آمنہ مہنی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے بھلا۔“ وہ لیٹے لیٹے ایک دم ہی اٹھ بیٹھا۔

”کیوں خیریت؟“ مسرور کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی ”کیا آمنہ مہنی کے متعلق تمہارا اندازہ غلط ہو گیا؟“

”ہوں۔“ اس کے ہونٹوں سے ایک غراہٹ سی نکلی۔
”یہ بڑھی لکھی لڑکیاں اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتی ہیں۔ کچھ اونچی چیز حالانکہ ملک سلطان کے سامنے ان کی کیا حیثیت ہے۔ ایک چوٹی سے بھی کم تر۔ جب دل چاہے پاؤں سے مسل دوں۔“
”تمہیں آمنہ مہنی کہاں مل گئی.....؟“ مسرور نے پوچھا تھا۔

”میں چار دن سے مسلسل اس کے اخبار کے دفتر کے باہر اس کا انتظار کرتا رہا ہوں..... اسے ساتھ چلنے کی آفر کی..... لیکن اس نے انکار کر دیا۔“
”تمہیں اگر وہ اتنی ہی اچھی لگی ہے تو اس سے شادی کر لو۔“

”شادی.....“ اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا ”سلطان ملک اپنے پاؤں میں زنجیریں نہیں ڈالتا اور یوں اخباروں کے دفاتروں میں خوار ہونے والی اور گلی گلی پھرنے والی عورتیں جن پر ہر مرد کی نظر پڑتی ہے۔ گھر میں بٹھانے کے لیے نہیں ہوتی ہیں۔ سلطان ملک جس عورت سے شادی کرے گا اسے غیر مرد کی نظر نے چھوہا تک نہیں ہوگا۔ مجھے اخلاقیات پڑھاری تھی آمنہ مہنی..... اخلاقیات تو میں بڑھاؤں گا اسے۔ ایک دفعہ ہاتھ آجائے۔ اب تو وہ دو دن سے دفتر بھی نہیں جا رہی۔ یا تمہیں پتا ہے اس کا گھر کہاں ہے؟“
”نہیں۔“ مسرور سنجیدہ ہو گیا ”تم دفتر سے پوچھ لیتے۔“

”وہ وہاں مستقل کام نہیں کرتی صرف چند دنوں کے لیے آئی تھی۔ ساری معلومات حاصل کر چکا ہوں۔“ وہ پھر لیٹ گیا اور چند لمحوں بعد پھر اٹھ کر کمرے ٹہلنے لگا۔

”آگ لگی ہوئی ہے میرے اندر۔ تو بہن کی تھی اس نے میری۔ کہہ رہی تھی تم مرد پر عورت کو ایک نظر سے مت دیکھا کرو۔ اگر کسی عورت نے تمہیں مسکرا کر دیکھ لیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ دل و جان سے تم پر فدا ہو گئی ہے مسرور۔“
وہ ٹہلنے ٹہلنے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم میری مدد کرو معمولی سی۔ عادل بھائی کو یقیناً اس کے گھر پتا ہوگا۔ میں اسے ایک بار بتانا چاہتا ہوں کہ مرد مردہ ہوتا ہے اور عورت عورت ہوتی ہے۔ کوئی بھی مرد کسی عورت کے ہاتھوں اپنی تو بہن برداشت نہیں کر سکتا۔“

”جہاں تک میرا خیال ہے سراسر اسے زیادہ نہیں جانتے۔ وہ غالباً مستقل اسلام آباد میں رہتی ہیں اور یہاں صرف دو بار ہی آئی ہیں پروفیسر صاحب سے ملنے۔ اس سے پہلے وہ یہاں کبھی نہیں آئی تھیں۔ یوں بھی مانی.....“ مسرور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے اسے سمجھایا ”کسی عورت کو زیر کرنا

”عادل صاحب کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں ہوں گے۔ آپ پلیز ڈرائنگ روم میں آئیں۔ میں انہیں اطلاع کرتا ہوں۔“
اور جب وہ پروفیسر عادل کو اطلاع دے کر آیا تو سلطان جاچکا تھا۔ خدا بخش نے بتایا تھا کہ انہیں
اچانک کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا سو وہ چلے گئے اور اب پتا نہیں اس وقت کیوں بار بار اس کے ذہن میں
آ رہا تھا کہ آمنہ صفی کے اغوا میں ضرور سلطان کا ہاتھ ہوگا۔

”شام کے اخبار میں خبر لگی ہے کہ پروفیسر عادل کے گھر کے باہر والی سڑک پر ایک گاڑی سے دو
کلاشکوف بردار نکلے اور انہوں نے آمنہ صفی کو زبردستی گاڑی میں ڈال لیا۔ گاڑی کا نمبر وغیرہ کوئی نوٹ نہیں
کر سکا۔“ پروفیسر عادل ارسلان وغیرہ کو تفصیل بتا رہے تھے جو انہیں بختی حیدر سے پتا چلی تھی۔ مسرور نے
چونک کر انہیں دیکھا۔
”سر وہ.....“

”ہاں کیا.....؟“ اسے خیال آیا کہ اسے اس طرح سلطان کا نام نہیں لینا چاہیے اور یہ دوستی کا تقاضا
بھی نہیں تھا۔ اسے بہر حال پہلے سلطان سے بات کرنی چاہیے۔

”کچھ نہیں سر وہ میں پوچھ رہا تھا کہ پولیس آپ کو تنگ تو نہیں کرے گی۔“
”پولیس..... ضرور تنگ کرے گی۔ آخر ہمارے ملک کی پولیس کو تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔“ پروفیسر
عادل نے خوش دلی سے کہا ”بہر حال ایسی پریشانی کی بات بھی نہیں ہے اپنے بھی کچھ جاننے والے ہیں
اس محکمے میں..... لیکن آمنہ صفی..... میں اس کے لیے پریشان ہوں۔“

”اچھا سر اب ہم چلتے ہیں۔“ ارسلان اور ارمغان اٹھ کھڑے ہوئے ”پھر کبھی آپ سے اس موضوع
پر گفتگو رہے گی۔ یقین کریں آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ذہن میں اتر جاتا ہے اور ہم مہینوں اس کی چاشنی
سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔“

ارسلان نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو پروفیسر عادل مسکرا دیے۔

”مجھے بھی ذہین لوگوں سے مل کر اور ان کی کمپنی سے بہت خوشی ہوتی ہے۔ ان سے باتیں کر کے
انجائے کرتا ہوں۔ آتے رہا کرو۔ اس وقت تو واقعی کسی گفتگو کا موڈ نہیں رہا۔ آمنہ صفی کا خیال آ رہا
ہے۔ عورت کتنی بھی بولڈ کیوں نہ ہو جب گھر کی چار دیواری سے نکل آتی ہے تو محفوظ نہیں رہ سکتی۔ بیٹھیوں
کا معاشرہ ہے یہ..... وہ بھی کھڑے ہو گئے۔

”پتا نہیں اس کے گھروالوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔“ مسرور نے سوچا۔ ”نہ جانے اس کی فیملی میں کون کون
ہے۔ بھائی بہنیں ناں باپ۔ کسی گردنیں جھک گئی ہوں گی ان کی۔ عزیز رشتے دار کیا کیا کہانیاں گھڑ رہے
ہوں گے۔“ مسرور بھی سوچتا ہوا ارمغان کے ساتھ ہی باہر آگیا۔

مردا لگی تو نہیں ہے۔ جبر اور زبردستی کہیں بھی جائز نہیں ہوتی۔ اگر آمنہ صفی تمہاری سوچ سے مختلف ہے
تو میرے خیال میں یہ کوئی ایسا قصور نہیں ہے جس کی تم اسے کوئی سزا دو۔“

”لیکن ملک سلطان کو ایک بار جو چیز پسند آجائے وہ اسے حاصل کر کے ہی رہتا ہے۔“

”چیزوں اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے مانی۔ آمنہ صفی کوئی چیز نہیں ہے..... ایک جیتی جاگتی
انسان ہے جو اپنی سوچ اور فکر رکھتی ہے۔ اس کی بولڈنٹس اس کی بیک ہے۔ اس کی کمزوری نہیں ہے۔ تمہارا
اندازہ اس کے متعلق غلط تھا۔ وہ اس طرح کی عورت نہیں ہے جیسا تم نے اسے جانا تھا۔ وہ ایک کھری اور
چکی عورت ہے۔ تم نے اس کے کالم نہیں پڑھے۔ وہ نہ یہ اندازہ نہ لگاتے۔“

سلطان نے پھر بحث نہیں کی تھی لیکن وہ جتنی دیر بھی وہاں رہا بہت بے چین اور مضطرب رہا تھا۔
پروفیسر عادل جو کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد بھی وہ ان کے کمرے میں ہی رہا۔ کبھی
مٹھیاں بچھنے لیتا، کبھی کھول لیتا اور کبھی پیشانی پر لکیریں پڑ جاتیں۔

”وہ عورت میرے لیے چیخ بن چکی ہے یار۔“

”ریلیکس مانی۔ بھول جاؤ اسے۔“ مسرور نے اسے سمجھایا تھا ”اور چلو آؤ سر کے کمرے میں چل
کر بیٹھتے ہیں۔“

”رہنے دو۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ تمہیں نہیں معلوم میرا دماغ کھول رہا ہے اور میں تمہارے پاس
اس لیے آیا تھا کہ تمہاری باتوں سے ذرا ذہن کی گرمی گھٹے گی۔ تم چلو نا یا میرے ساتھ۔ ادھر گلبرگ میں
میرے ایک یار کا بنگلا ہے۔ میں ہوٹل سے ادھر ہی منتقل ہو گیا ہوں۔ دس پندرہ دن ادھر ہی رہوں گا۔ ایک
بڑی زبردست شے ہے۔ کراچی سے آئی ہے۔ کیا جسم ہے کیا خوبصورتی ہے اس میں۔ رنگت سانولی ہے
پر بڑی چیز ہے یار.....“ وہ ایک دم موج میں آگیا تھا۔

”بات یہ ہے مانی کہ مجھے ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ میرے نزدیک عورت بہت محترم ہے۔ وہ
کوئی کھلونا نہیں ہے اور نہ ہی وہ مرد کے بہلاوے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ میرے نزدیک عورت صرف
ماں بہن بیوی اور بیٹی ہے۔“

”دس صدی میں رہتے ہو میرے دوست۔ تمہاری اداؤں نے تو مجھے تمہارا اسیر کر دیا ہے..... خیر
ویسے تم کسی دن آنا۔ چکر لگانا۔ مجھے اب روز روز آنا اچھا نہیں لگتا یار۔ عادل بھائی کہیں گے اتنے دن سے
یہاں ہے۔ تو ادھر آدھر بہت ریزور ہوتا پڑتا ہے۔“

اس کا موڈ کافی حد تک بہتر ہو گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہی باتیں کرتا ہوا باہر آگیا تھا۔ سانسے
راہداری میں بختی حیدر آمنہ صفی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ آمنہ صفی نے ایک تیز نظر
سلطان پر ڈالی تھی اور پھر اسے انور کر کے مسرور سے مخاطب ہو گئی تھی۔

”کہیں جارہے ہو کیا.....؟“ پروفیسر عادل نے پوچھا۔

”جی سرائی آ جاؤں گا۔ ذرا ایک دوست کی طرف جانا ہے۔“

”میں بھی ذرا جتنی کی طرف جاؤں گا۔ ایک دم سے دل پر بوجھ آن پڑا ہے۔ نا انصافی، ظلم اور زیادتی کہیں بھی ہو طبیعت میں گرانی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر میں دیر سے آؤں تو کھانے پر انتظار مرت کرنا۔ شاید میں جتنی کے ساتھ آئمہ صفی کے گھر جاؤں۔“

پروفیسر عادل اسے بتا کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تو وہ خدا بخش کو اپنے جانے کا بتا کر باہر آ گیا۔



سلطان لمحہ بھر مسرور کو دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر اس نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا۔

”تم نے تو حیران کر دیا یا۔“ مسرور نے ادھر ادھر دیکھا۔

کارپٹ پر گاؤنٹیکے لگے تھے۔ سامنے ایک طرف کچھ سازندے بیٹھے تھے اور ایک نو عمری درمیانی شکل و صورت کی لڑکی درمیان میں بیٹھی پاؤں میں تھکڑو باندھ رہی تھی۔ ایک خزانہ شکل کی عورت بھی سامنے ہی بھڑکیلے سے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔

”بیٹھ جاؤ یا۔“ سلطان نے اسے الگ کرتے ہوئے اس کی گھبراہٹ محسوس کی۔ ”آج تک عادل بھائی کی محفلوں کو دیکھا دماغ کو خشک کرنے والی محفلیں۔ آج ہماری محفل بھی دیکھو۔ میرے یار آقا نے آج میرے لیے یہ محفل سجائی ہے.....“ اس نے قریب ہی گاؤنٹیکے سے ٹپک لگائے فحش کی طرف اشارہ کیا ”یہ میرے دوست ہیں آقا صاحب۔ بڑے دل کے آدمی ہیں۔ یہ کوشی خاص طور سے انہوں نے اسی لیے رکھی ہے اور یہ میرا یار ہے مسرور..... مصورا آدمی ہے۔ ایسی محفلوں سے نا آشنا ہے۔“

آقا صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھایا۔ مسرور نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ سلطان سے دنی عمر کا فحش رہا ہوگا۔ کثرت شراب نوشی سے آنکھوں کے پوٹے لگے ہوئے تھے ”یہ سلطان کے دوستوں میں بھی کس کس عمر کے لوگ شامل ہیں۔“

”تارا بیگم آج ہمارے یار کو خوش کر دو..... ایسا ناچو کہ پہلے کبھی ایسا رقص تم نے نہ کیا ہو۔“

لڑکی نے بڑی اداسے مسرور کی طرف دیکھا۔

”یار اس کے جسم میں بڑا لوج ہے۔ دیکھنا کیسا رقص کرتی ہے۔“

”مائی، میں یہاں رقص دیکھنے نہیں آیا۔“ مسرور کے چہرے پر گہری بنجیدگی تھی ”تمہیں پتا ہے مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آئمہ صفی کہاں ہے؟“

”آئمہ صفی.....!“ سلطان نے بھوئیں اچکا کیں ”اپنے گھر میں ہوگی۔ میں اب کوئی اس کی جاسوسی پر

تو مامور نہیں ہوں.....“

”مائی.....“ مسرور کی نگاہیں اس کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں ”وہ کل رات جب عادل صاحب کے گھر سے باہر نکلے تو اغوا ہو گئی۔“

”اوہ.....“ اس نے ہونٹوں سے سیٹی بجائی ”ایسی لڑکیوں کا جو اس طرح ”تزی“ دکھاتی ہیں یہی انجام ہوتا ہے۔“

”کیا تم نے اسے اغوا کروایا ہے؟“

”میں نے یار کمال کرتے ہو۔ میں یہاں لاہور میں اسے کیسے اغوا کروا سکتا ہوں۔ اپنا علاقہ ہوتا تو ممکن بھی تھا..... یہاں اپنے بندے کہاں۔“

مسرور نے آقا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے ان کی گفتگو سے بالکل بے نیاز شکل سے نوشی میں مشغول تھا ”کیا یہ شخص جو سلطان کے لیے ایسی محفلیں سجا سکتا ہے ایک لڑکی اغوا نہیں کروا سکتا۔“ اس نے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم انجوائے کرو میں چلتا ہوں۔ میں خواہ مخواہ غل ہوا۔“

”ہرگز نہیں۔ تم غل نہیں ہوئے ہو اور اس طرح مشکوک ذہن کے ساتھ مت جاؤ۔“ سلطان بھی اس کے ساتھ باہر آ گیا۔

”مجھے اس پر غصہ ضرور تھا اور میں اسے سبق بھی سکھانا چاہتا تھا لیکن پھر تمہارے سمجھانے پر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔“ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا گیٹ تک آ گیا تھا۔

”یار اب آئے ہو تو کچھ دیر بیٹھ کر تارا کا رقص دیکھتے اور پھر رات کو تمہیں اس سے ملواتے۔ کراچی والی پٹاخہ سے۔“ وہ زور سے ہنسا۔

”مائی.....“ مسرور نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں ”اگر وہ تمہارے پاس ہے تو اسے رہا کر دو..... یہ انتہائی ظلم ہے مائی کہ تم ایک لڑکی کو اس جرم کی پاداش میں اغوا کرالو کہ اس نے تمہاری خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنا آپ تمہارے حوالے نہیں کیا۔ میں اپنے دوست سے ایسے ظلم کی توقع نہیں رکھتا۔“

”بے فکر ہو یا۔ تمہارے دوست نے ایسا کوئی ظلم نہیں کیا۔“

”ٹھیک ہے تم کہہ رہے ہو تو تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں لیکن پتا نہیں کیوں ذہن و دل تمہاری طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔“

”تم اس کے لیے اتنے پریشان کیوں ہو؟“ سلطان نے سوال کیا ”اور کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑی ہے اور میں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ میں اس کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا اور میں پریشان تو تمہارے لیے ہوں کہ تم نے اگر جذباتی ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا ہے تو ابھی

مر جائے گی۔“

”بھلے مر جائے۔ سلطان ملک ہاتھ آئے شکار کو اتنی آسانی سے نہیں جانے دیتا..... تمہیں گھر بھیج دوں..... اپنی توہین کا بدلہ لیے بغیر۔“

”میں نے تمہاری توہین نہیں کی تھی پلیز، سہیلی تمہیں یہ بتایا تھا کہ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔“

”چلو تمہاری بات مان بھی لیں تو.....“ اس نے اس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اٹھایا..... ”یوں دریا کے کنارے سے پیاسا لوٹ آنا تلکندی تو نہیں ہے اور سلطان ملک اتنا بیوقوف بھی نہیں.....“ وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

”تم جاسکتی ہو۔ ایک دوست کی دوستی کی خاطر آج زندگی میں پہلی بار سلطان ملک ہاتھ آئے شکار کو چھوڑ رہا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا آمنہ مہنی۔ تمہارے لب پر کبھی میرا نام نہیں آنا چاہیے..... اگر ایسا ہوا تو تمہیں تو میں چھوڑ دوں گا نہیں تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد کے کٹوے کر کے سڑک پر پھینک دوں گا۔“ اس کی آواز میں سانپ کی سی پھونکنے کی آواز تھی۔ آمنہ مہنی نے جھرجھری سی لی۔

”تم جاسکتی ہو.....“

اور وہ ایک نظر اس پر ڈالتا ہوا کھلے دروازے سے باہر نکل گیا اور جھپکتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی۔



ٹی وی لاؤنج والے کمرے میں فون کی تیل وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ شریف اور صفیہ شاید اپنے کوارٹر میں تھے۔ مریم نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں اور تھوڑی دیر انتظار کیا کہ شاید کوئی فون اٹھالے لیکن تیل بند ہو کر پھر ہونے لگی تھی۔ اس نے کتاب الٹ کر بیڈ پر رکھی اور باہر آگئی لیکن تیل پھر بند ہوگئی تھی۔ ٹی وی لاؤنج کے وسط میں کھڑے کھڑے اس نے ادھر ادھر دیکھا ”کس قدر خاموشی اور سناٹا ہے۔“

”جیسے اس گھر میں انسان بستے ہی نہ ہوں۔ ماما اور پاپا شاید اپنے بیڈروم میں ہیں۔“

ہنگامے بھی اچھے نہیں لگتے تھے اور اب یہ سناٹا اور بھی برا لگتا ہے۔ ماما کے فرینڈز بھی بہت دنوں سے نہیں آئے تھے۔ پتا نہیں ماما بہت مصروف ہوگئی ہیں یا ان کے فرینڈز کے پاس وقت نہیں رہا اور انہوں نے بہت دنوں سے کوئی فنکشن بھی ارینج نہیں کیا تھا۔ اسے ماما کی ان فنکشن اور پارٹیوں سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی گھر میں خاموشی اور سکون ہو اور اب جبکہ کئی دن سے گھر میں سکون تھا تو اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی ہنگامہ ہو۔ ماما کے فرینڈز ہی آجائیں تاکہ یہ سکوت تو ٹوٹے۔

عجیب بے زاری اور بے دلی کی سی کیفیت تھی۔ کوئی چیز مطمئن اور خوش نہیں کرتی تھی اور نہ ہی پڑھائی میں دل لگتا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑی تو تیل پھر ہونے لگی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا..... مجھے ڈر ہے کہ شاید میں خود کو اس شخص کی دوستی کے قابل نہ سمجھوں جو انو جیسے جرم میں ملوث ہو چکا ہو۔“ مسرور نے بات ختم کر کے اسے خدا حافظ کہا اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔ سلطان لکھ بھر کے لیے وہیں کھڑا بند گیٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر واپس پلٹ آیا۔

اندر ہال میں گھنگوروں کی آواز آرہی تھی لیکن وہ اندر جانے کے بجائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا..... اور بڑے ہال سے گزر کر ایک بیڈروم کے سامنے ذرا سار کا اور پھر پاگٹ سے چابی نکال کر اس کا لاک کھولا۔ سامنے بیڈ پر آمنہ مہنی گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی اور بیڈ کی سائڈ پر کھانے کی ٹرے پڑی تھی۔ شاید اس نے رات کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔

”اچھا تو یہ تم ہو۔“

سلطان عجیب انداز میں مسکرایا۔

”کیا حیرت ہوئی؟“

”کچھ زیادہ نہیں لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟“

”مقصد تو کچھ خاص نہیں۔ بس تم دل کو بھاگائی ہو۔“ اس نے کان کھجایا اور دروازے سے ہٹ کر کمرے کے وسط میں آکھڑا ہوا۔ آمنہ مہنی بیڈ کے ساتھ کھڑی تھی۔

”یقین تو نہیں آتا کہ تم پروفیسر عادل جیسے شریف آدمی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔“

”کمال ہے جی، اتنا پڑھ لکھ کر بھی تم کو معلوم نہیں کہ ولی کے گھر شیطان اور شیطان کے گھر ولی پیدا ہو جاتا ہے۔“

”پلیز“ مجھے گھر جانے دو۔ میری ماں بہت پریشان ہو رہی ہوگی۔“ آمنہ مہنی نے نرم لہجے میں درخواست کی ”پتا نہیں ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے خفا رہتی ہیں۔“

”سلطان ملک نے کبھی کسی کے منہ سے نہ نہیں سنی۔ اس کے تو ایک اشارے پر لڑکیاں اپنے دل اس کے قدموں میں ڈال دیتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ آمنہ مہنی کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی ”ڈال دیتی ہوں گی مگر میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔ دیکھو میں تو عمر میں بھی تم سے کافی بڑی ہوں۔“

”آہا۔“ سلطان تہہ بہ لگا کر ایک دم آگے بڑھا ”تمہیں اپنی کشش کا پتا ہی نہیں ہے آمنہ مہنی۔ میری نظروں سے ذرا خود کو دیکھو۔ مجھے تو ہمیشہ تمہاری ہی عمر کی لڑکیاں اٹریکٹ کرتی ہیں۔“

آمنہ مہنی بہت بولڈ ہونے کے باوجود پیش ہوگئی۔

سلطان نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”پلیز.....“ آمنہ مہنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں اس نے بہ مشکل روکا ”میری ماں رو رو کر

”ہیلو.....!“ اس نے ریسپورٹ اٹھایا۔

دوسری طرف تیمورتھا۔

”مور..... مور! کیسے ہو تم؟“ وہ ایک دم ایکسٹینڈ ہو گئی۔

”آپ کیسی ہو مومو! میں تو بالکل اچھا ہوں۔ آج ہم شاپنگ کے لیے آئے تھے میرا دل چاہا آپ

سے بات کر لوں۔ ماما اور پاپا سے بات ہوتی ہے آپ کیوں نہیں بات کرتیں؟“

”مجھے تو خبر ہی نہیں مور ماما اور پاپا کب تم سے بات کرتے ہیں۔ میں تو خود تمہارے لیے بہت اداس

ہوں۔ پاپا نے پرامس کیا تھا کہ ویک اینڈ پر وہ مجھے تم سے ملوانے لے چلیں گے۔“

”رینکی۔“ (REALY) تیمور ایک دم خوش ہو گیا ”ماما بھی آئیں گی؟“

”ہاں۔“

”نینا اور جی بہت خوش ہوں گی میں جا کر بتاؤں گا۔“

”اچھا کیسی ہیں دونوں؟“

”ایک دم ٹھیک ہیں۔“

”عاشی کو وائٹنگ تو نہیں ہوتی؟“

”نہیں..... وہ کہہ رہی تھی اب کچھ نہیں ہوتا۔ اب وہ بڑی ہو گئی ہیں۔“

”اچھا!“ وہ بلاوجہ ہنس دی۔

”ماما اور پاپا کہاں ہیں؟“

”اپنے بیڈ روم میں ہوں گے۔ تم ہولڈ کرو میں ماما کو بتاتی ہوں۔ دراصل ان کے بیڈ روم والا فون

خراب ہے۔“

ریسیور نیچے رکھ کر وہ نینب عثمان کے بیڈ روم میں چلی آئی۔

”ماما!..... ماما!“ اس نے دروازے سے اندر جاتے ہی پکارا ”مور کا فون ہے۔“

”مومو!“ انہوں نے کسی قدر ناگواری سے اسے دیکھا۔

”جی“ مریم نے گہرا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ براؤن کبیل کندھے تک لیے لیٹی تھیں اور ان کی آنکھیں

سرخ ہو رہی تھیں جیسے ابھی نیند سے جاگی ہوں۔

”سوری (SORRY) ماما مجھے پتا نہیں تھا آپ سوری ہیں۔“ وہ نادان تھی۔

”چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنی ایکسٹینڈ مت ہوا کرو۔“ ان کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی ”اور مور کو

میرا پیار کہہ دو۔ اس وقت میری طبیعت اچھی نہیں ہے، کبھی پھر میں خود ہی فون کر لوں گی۔“

”جی!“ اس کے اندر جو ایک دم خوشی کے چراغ سے جل اٹھے تھے، مجھ سے گئے۔ وہ سر جھکائے

واپس آ گئی۔

”مور! وہ..... ماما سوری ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں پیار کہہ رہی ہیں۔ وہ تم سے پھر

خود ہی بات کر لیں گی۔“

”تھنک یو!“ وہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”میں نے تو صرف آپ سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔“

”کب کو میرا پیار کہنا..... اور تم سب اپنا اپنا خیال رکھنا۔“

”جی اور مومو! آپ بھی اپنا خیال رکھا کریں۔“ وہ بڑا مدبر لگ رہا تھا۔ وہ ہنس دی۔

تیمور اپنی عمر کے حساب سے بہت بڑی باتیں کرتا تھا۔

تیمور کو خدا حافظ کہہ کر وہ وہیں ٹی لاؤنچ میں بیٹھ گئی۔ اب پڑھنے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تیمور

نینا اور عاشی تینوں اسے بے تحاشا یاد آرہے تھے۔

اور عاشی کتنی بے تحاشا خوبصورت ہے بالکل ماما جیسی۔

اور یہ ڈاکٹر معید..... یعنی ڈاکٹر معید!

اس کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔

اور ڈاکٹر معید بھی اچھے ہیں۔

اس روز نینب عثمان اور عثمان احمد دونوں گھر پر نہیں تھے۔ وہ اندر کی کھٹن سے گھبرا کر باہر لان میں

کل آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں شام ہوتے ہی اسے اندر کے کمروں میں کھٹن کیوں ہونے لگتی تھی۔ اے سی

کی خشکی بری لگتی تھی۔ عجیب سی اداسی دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔

”پتا نہیں شامیں اتنی اداس کیوں ہوتی ہیں؟“

اور پتا نہیں یہ شامیں سچ سچ اداس ہوتی ہیں یا صرف اسے ہی لگتی ہیں؟

گلاب کے بڑے بڑے سرخ پھولوں کو جھک کر سونگھتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور ایک خوبصورت

گلاب توڑنے لگی تھی کہ ڈاکٹر معید گاڑی سے اتر کر سیدھے اس کی طرف چلے آئے۔

”مس احمد! کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں گلاب دیکھ رہی تھی۔“ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

چہرے کے تاثرات سے یہ شخص بے حد کھرا سچا اور مخلص لگتا تھا اور اس کی بے ریا آنکھیں بتاتی تھیں

کہ کردار کا بہت مضبوط ہے۔

”اور یہ تم کب سے چہرہ شناس ہو گئیں مریم احمد!“ اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔

میڈم ٹرنس کے ہاں اس نے میڈم کو مرنز آئندی سے کہتے سنا تھا کہ نینب عثمان آج کل معید میں

انٹرنیٹ ہیں اور یہ کہ مسز نرب عثمان جوان مردوں کی کمپنی کو انجوائے کرتی ہیں۔

”اور جنگ مرد؟“ مسز آفندی نے اپنی نچی ہوئی بھویں اچکا کی تھیں۔

”اور جنگ مرد نرب عثمان کی کمپنی کو انجوائے کرتے ہیں۔“

میڈم نرگس کی آنکھوں میں عیارانہ چمک تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ میڈم نرگس کی آنکھیں جو اس وقت لومڑی کی طرح لگ رہی تھیں ان کے چہرے سے نوج کر پھینک دے اور پھر کیسا لگے ان کا چہرہ بغیر آنکھوں کے کوئی (MONSTER) عفریت۔

اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ کیوں لالہ کہنے پر پارٹی میں آئی تھی۔

”یازید مجھے زینی کی سمجھ نہیں آتی ابھی کل تک تو شریل کے قصیدے پڑھ رہی تھی اور آج معید کے“
”وہ سائیکی کیس ہے۔“

میڈم نرگس کا اونچا قہقہہ اسے بہت برا لگا تھا لیکن اس نے خود بھی تو دیکھا تھا کہ مسز عثمان سارا وقت ڈاکٹر معید سے چپکی رہی تھیں اور وہ شریل مرزا بھی ایسی ہی بات کر رہا تھا۔ اس کا سارا خون چپے رخساروں پر آکر اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس نے بے حد ناگواری سے ڈاکٹر معید کو دیکھا تھا۔

”ماما گھر پر نہیں ہیں۔“

وہ مڑ کر گلاب کی پیوں کو اپنی انگلیوں سے پھینرنے لگی۔

”یہ بات مجھے گیٹ پر معلوم ہو چکی ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر پر غلوس مسکراہٹ تھی۔

”دراصل میں چند دنوں تک انگلینڈ واپس جا رہا ہوں اس لیے ملنے آیا تھا۔“

”کب جا رہے ہیں؟“

اس نے یونہی اخلاقا پوچھ لیا تھا اور نہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کیے بغیر اندر چلی جائے۔

اس کے سر میں میڈم نرگس کا قہقہہ اور مسز آفندی کی باتیں جیسے پتھر مار رہی تھیں۔

”ابھی سیٹ کنفرم نہیں ہوئی تاہم تین چار دن تک جانا ہے۔ مس احمد! ڈاکٹر معید کی نظریں اس کے

چہرے پر تھیں۔

”آپ سے ایک بات کہنا تھی۔“

”اب یہ شخص بتائیں اس سے کیا کہنے والا ہے؟“ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”جی کہیے۔“

”میں ابھی جانا نہیں چاہ رہا تھا بلکہ میں سوچ رہا تھا ڈیڈی کو یہاں ہی بلوالوں۔ یہاں انکل بھی اکیلے

ہیں اور پھر اپنا وطن تو اپنا ہی ہوتا ہے باہر زندگیاں گزار لی جائیں لیکن کبھی نہ کبھی کوئی ایسا لمحہ ضرور آتا

ہے کہ جب دل چاہتا ہے کہ اپنے وطن میں اپنے لوگوں کے درمیان رہیں۔ میں صرف تھوڑے عرصے

کے لیے آیا تھا لیکن اب جانے کو جی نہیں چاہتا مگر ڈیڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ مجھے مسلسل بلا رہے ہیں سو مجھے جانا پڑ رہا ہے مگر مجھے پھر واپس آنا ہے ڈیڈی کے ساتھ۔ لیکن نہ جانے اس میں کتنا عرصہ لگ جائے۔ ڈیڈی کو پاکستان رہنے کے لیے رضامند کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے سو جانے سے پہلے آپ کو اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری امین بنیں گی، مس احمد؟“

مریم نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ڈاکٹر معید کیا کہنا چاہ رہے ہیں اور کس بات کا امین بنانا چاہتے ہیں اسے؟

”بتائیں آپ کو میری بات اچھی لگے یا نہ لگے، بتائیں آپ میرے متعلق کیا سوچیں۔۔۔۔۔ اور بتائیں مجھے آپ سے یہ بات کہنی بھی چاہیے یا نہیں۔ لیکن جانے کیوں مسز احمد کی نسبت آپ مجھے زیادہ معتبر لگی ہیں یہ بات کہنے کے لیے۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر معید اضطراب سے اپنی انگلیاں مڑوڑ رہے تھے جیسے خود انہیں سمجھ نہ آرہی ہو کہ وہ اپنی بات کس طرح کریں۔

مریم کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”کبھی کبھی۔۔۔۔۔“ انہوں نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا ”آدی بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے اور کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔۔۔۔۔ دراصل یہ دل کے معاملے ہوتے ہیں یہاں آدی بے بس ہوتا ہے۔ بالکل

بے بس اور میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی کبھی دل کے معاملے میں اتنا بے اختیار ہو جاؤں گا۔“

انہوں نے ذرا سار کر مریم کو دیکھا جو کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کی کیفیت میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”تو کیا۔۔۔۔۔“ اس کا دل سینے کے اندر زور سے دھڑکا۔

”کیا ڈاکٹر معید کے دل کے معاملے کا تعلق اس کی ماما سے ہے؟ اور مسز آفندی اور میڈم نرگس کی

مشکلات۔۔۔۔۔؟“

اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکانے لگے۔ وہ اتنی معتبر

کہاں تھی۔۔۔۔۔ ابھی تو وہ بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ تھی اور پورے بیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ

ڈاکٹر معید کتنا بڑا بوجھ اسے نھنل کرنے والے تھے نہیں وہ ان کی بات نہیں سنے گی۔ اس کا دل اس راز کا

بوجھ نہیں سہار سکے گا۔

وہ تو غم کی شدت سے دھڑکنابند ہو جائے گا۔

”کیا ڈاکٹر معید ماما سے۔۔۔۔۔؟“

”اور پھر ہمارا کیا ہوگا۔۔۔۔۔ میں عاشی، مور۔۔۔۔۔ نینا اور پاپا!“

اس نے احمقوں کی طرح سوچا اور اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرزنے لگے۔

”یہ سب صحیح نہیں ہے ڈاکٹر معید!..... اور جو راز آپ بتانے والے ہیں اسے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔“

اس نے کہنا چاہا لیکن اس کے ہونٹ ذرا سا کھل کر رہ گئے۔

ڈاکٹر معید اس کی حالت سے بے نیاز ایک سرشاری کیفیت میں پھر بولنے لگے تھے۔

”میں تو بالکل مختلف مزاج کا آدمی رہا ہوں۔ دل کو میں نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ نہ اس کی بات کبھی سنی، نہ دل نے ہی کہیں ٹھہرنے یا رکنے کی ضد کی۔ مجھے تو خود خبر نہ تھی کہ میں دل کے ہاتھوں یوں بے خبری میں مارا جاؤں گا۔“

مریم جیسے سانس روکے سفید ہوتی رنگت کے ساتھ اپنی پوری تو تیں جمع کیے ان کی بات سن رہی تھی۔

”مجھے قطعی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک منہمی سی، معصومی لڑکی میرے دل میں اتنی شان سے براجمان ہو جائے گی کہ مجھے خود خبر تک نہ ہوگی۔ مس احمد میں عاشی کے متعلق آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”عاشی.....؟“ مریم نے بہت دیر کا روکا ہوا سانس خارج کیا اور اس کی رنگت کا گلابی پن ہو لے

ہو لے واپس آنے لگا۔

”کل شام جب انکل ہادی نے مجھ سے میری شادی کی بات کی تو اچانک مجھے اور اک ہوا کہ وہ ایک پیاری سی معصومی لڑکی جس سے ایک شام باتیں کر کے مجھے یوں لگا تھا جیسے ہمارے پاس بہت سی باتیں مشترک ہیں کرنے کو..... اور جس سے پھر بات کرنے کو دل چاہا، بار بار چاہا۔ وہ لڑکی میرے دل کے اندر ہی کہیں چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ جب انکل نے میری پسند پوچھی تو بار بار اس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آنے لگا۔“

اس کا بات کرنے کا وہ معصوم سا انداز

اس کی وہ دلکش سی مسکراہٹ

اور اس کی وہ بے اختیار باتیں۔

انکل ہادی کے کہنے پر میں نے بہت ایمان داری سے آپ کے متعلق سوچنا چاہا۔“

”میرے متعلق.....؟“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں انکل ہادی کو آپ بہت پسند ہیں۔ انہوں نے مجھے کئی لڑکیوں کے متعلق بتایا لیکن ان کا دوٹ

آپ کی طرف تھا۔“

آپ بہت پیاری ہیں مس احمد!

بہت اچھی! شاید عاشی سے زیادہ سمجھ دار اور ذہین..... لیکن دل نے یہیں ٹھہر جانے کی خواہش کی

ہے۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا کہ کیوں؟“

”دل نے ایسا کیوں چاہا ہے؟“

”مگر وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے، صرف سولہ سال کی؟“

مریم کو بے حد حیرت تھی۔

”میں انتظار کر سکتا ہوں۔ چار پانچ چھ سال۔ اس لیے تو میں نے آپ کو اپنا امین بنایا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس گھر میں کوئی ایک فرد ایسا ہو جو میرے جذباتوں کو جانتا ہو۔ عاشی سے ابھی اس طرح کی بات

میں نہیں کرنا چاہتا۔“

ڈاکٹر معید اور عاشی

یعنی عاشی اور ڈاکٹر معید!

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر سوچا اور اسے دونوں ایک دوسرے کے لیے بہت موزوں لگے۔

”لیکن ماما.....“ اس نے امتحان کی طرح پوچھا۔

”ماما کیا؟“ ڈاکٹر معید کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر آنکلیں ”کیا آپ کی ماما نے عاشی کے لیے

کچھ اور سوچ رکھا ہے؟“

”نہیں..... نہیں تو۔“ اس نے بات بتائی ”میں پوچھ رہی تھی آپ نے ماما سے بات کی.....؟“

”نہیں فی الحال ان سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہاں میں انکل کو اپنی پسند سے آگاہ کر دوں گا اور وہ مناسب موقع دیکھ کر عثمان صاحب سے بات کر لیں گے..... لیکن فی الحال نہیں۔“

وہ مسکرائے اور مریم کو اچانک خیال آیا کہ وہ اتنی دیر سے کھڑے ہیں۔

”آپ پلزی بیٹھیے نا..... اندر چلیں گے یا یہیں بیٹھیں گے؟“

”اس وقت تو یہیں بیٹھنا اچھا لگے گا۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر لان چیئر پر بیٹھ گئے ”آپ کو میری

بات بری تو نہیں لگی؟“

”کیا بری لگتی چاہیے تھی؟“

مریم کو عاشی کے حوالے سے وہ یکدم ہی اپنے اپنے سے لگنے لگے تھے اور اس کے لہجے میں خود بخود شوفی درا آئی تھی۔

”میرے خیال میں تو نہیں..... دل کے معاملے میں آدمی بے بس ہوتا ہے۔“

”تو مجھے بھی بری نہیں لگی۔ ہاں حیرت ضرور ہوئی۔“

وہ کلکھلا کر ہنس دی تھی۔ یہ ہنسی جیسے اندر سے کہیں خود بخود پھوٹ پڑی تھی۔ کتنی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی

وہ۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے دل سے اتر گیا ہو۔

اور وہ مسز آندری اور میڈم نرگس!

دراصل ماما سے چلیس ہوتی ہیں۔

ماما کی خوبصورتی سے ان کی مقبولیت اور ان کی شخصیت کے بحر سے۔

اس لیے الٹی سیدھی باتیں کر کے اپنے دل کو تسکین پہنچاتی ہیں۔

اور ماما کو خبر بھی نہیں کہ ان کی یہ فاسٹ فرینڈز ان کی کتنی بڑی دشمن ہیں اور اگر ان کو پتا چل جائے کہ وہ ان کے متعلق ایسی چپ باتیں کرتی ہیں تو وہ شاید کبھی بھی ان سے بات نہ کریں۔

اس روز کافی دیر تک وہ بڑے خوش گواموڈ کے ساتھ ڈاکٹر معید سے باتیں کرتی رہی تھی۔

اور اس نے ان سے بہت سارے ذاتی سوالات کیے تھے۔

ان کی پسند ناپسند

ان کی سوچ اور فکر

ان کی دوستیاں اور وابستگیاں۔

اور ڈاکٹر معید نے بھی پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اس کے ہر سوال کا جواب دیا تھا اور اسے ہر لحاظ سے ڈاکٹر معید اچھے لگنے لگے تھے۔

ان کی سوچ بلند تھی۔

اور خیالات اعلیٰ تھے۔

ان کے دل میں محبت اور قربانی کا جذبہ ہر ایک کے لیے یکساں تھا اور اس نے ایک بار پھر بے حد خوش ہو کر سوچا کہ عاشری اور ڈاکٹر معید ایک دوسرے کے لیے بہت موزوں ہیں۔

اور یہ بات میں لالہ کو ضرور بتاؤں گی۔

اور لالہ نے بھی تو مجھے اعزاز کے متعلق بتایا ہے۔

اور لالہ اور اعزاز کی عمروں میں بھی اتنا ہی فرق ہے جتنا عاشری اور ڈاکٹر معید کی عمروں میں۔



اس نے سوچا کہ اٹھ کر لالہ کو فون کرے۔

اور پچھلے کئی دنوں سے وہ لالہ کو فون کرنے کا سوچ رہی تھی اور لالہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ اب کبھی اسے فون نہیں کرے گی۔ وہ خود تو اسے نہیں کرتی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ خود اسے فون کرے گی

لیکن دن گزر گئے تھے۔ پتا نہیں وہ اتنی سست کیوں تھی؟

کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ہفتوں سوچتی رہتی تھی اور جب حوصلہ کرتی تو اس کی اہمیت ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔

پتا نہیں اس کے اندر حوصلے کی اتنی کمی کیوں تھی؟

اور اگر زندگی میں اسے تنہا کچھ کرنا پڑا تو وہ کیا کرے گی اور اب یہاں دو گھنٹے سے وہ ٹی وی لاؤنج میں پونہ بیے کا ریٹھی تھی۔ اتنی دیر میں تو وہ ایک چپٹر ختم کر لیتی۔

وہ اٹھی تاکہ لالہ کو فون کر کے اپنے کمرے میں چلی جائے کہ ماما کے بیڈروم کا دروازہ کھلا اور ماما خوشبوؤں میں بسی ہوئی باہر نکلیں۔

بلکے فیروزی رنگ کے شلوار سوٹ میں وہ بہت کم عمر اور دلکش لگ رہی تھیں۔

”موموڈ نیر میں ڈراڈاکٹر معید کو سی آف کرنے جا رہی ہوں۔ تمہارے پاپا پوچھیں تو بتا دیتا۔“

”جی۔“ مریم نے ان کا نزہ لیا۔

وہ بہت فریش لگ رہی تھیں۔

سوٹ کی ہم رنگ جیولری ہلکا ہلکا سلیقے سے کیا ہوا میک اپ مدھم خوشبو۔

اس نے دل ہی دل میں انہیں سراہا۔

”میڈم نرگس اور مسز آفندی پوری حاسد ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

مسز آفندی کا بے ڈول سراپا۔ اور میڈم نرگس کی بڑھتی عمر جواب پلاسٹک سرجری کے باوجود چہرے سے جھانکنے لگی تھی۔

”او کے جانو!“ زینب عثمان نے کارزنمیل سے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ تب ہی اسٹڈی کا دروازہ کھلا اور عثمان احمد باہر آئے۔

ان کی رنگت بے حد پھیکسی پھیکسی لگ رہی تھی اور آنکھیں تھکی تھکی سی تھیں۔

”کہیں جا رہی ہو؟“ انہوں نے اسٹڈی کے دروازے پر جیسے سہارے کے لیے ہاتھ رکھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ زینب عثمان نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

مریم کی نگاہیں بھی عثمان احمد کی طرف اٹھیں اور اسے لگا جیسے ان کا رنگ بے حد زرد ہو رہا ہو۔

”پاپا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

عثمان احمد کی نظریں زینب عثمان کے چہرے سے ہٹ کر اس کے چہرے پر آئیں۔ وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”نہیں۔“ مریم کو ان کی بات پر یقین نہ آیا۔

”آپ کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی۔“ اس نے دروازے پر رکھے ان کے ہاتھ کو چھوا اور مرکز زینب عثمان کی طرف دیکھا جو خود بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ ”ماما پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

انہوں نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ مسکراتے ہوئے بھینچ گئے اور وہ عثمان احمد سے مخاطب ہوئیں۔

”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔

”مومنو ڈاکٹر ہادی کو فون کر دو کہ وہ کلینک سے اٹھتے ہوئے تمہارے پاپا کو دیکھ جائیں۔“

”زینی! اس وقت تمہارا جانا بہت ضروری ہے کیا؟“ ان کے لہجے میں التجائی تھی۔

”میں ڈاکٹر معید کو سی آف کرنے جا رہی ہوں۔ میں نے پراس کیا تھا کہ میں ان پورٹ پر آؤں گی۔“

یہ چار دن نئے کمرشل کی شوٹنگ میں اتنی بڑی رہی کہ ملنے بھی نہیں جاسکی۔“

”اچھا۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

”ٹھیک ہے جاؤ لیکن جلدی آجانا۔“

”آخر تم یہ تین دن سے اسٹڈی میں گھسے کیا کر رہے ہو۔ ساری رات جاگو گے تو ظاہر ہے تھکن تو

ہوگی۔ آرام اس عمر میں بہت ضروری ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر سکون سے سو جاؤ طبیعت پرسکون ہو جائے گی۔

احتیاطاً ڈاکٹر ہادی کو بھی فون کر دینا۔“

پھر وہ مریم کی طرف متوجہ ہو گئیں ”اور مومنو یہ تم ہر وقت ٹی وی لاونچ میں نظر آتی ہو! پنا وقت ضائع نہ

کیا کرو۔ تمہیں اپنی پوزیشن برقرار رکھنی ہے۔“

مریم خاموش ہی رہی۔ انہوں نے بات مکمل کر کے بے چینی سے رسٹ واج پر نظر ڈالی۔

”فلائٹ میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ گیارہ ہے۔ اوکے! دین۔“

”او۔ کے!“ عثمان احمد نے آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت سے ٹیک لیا۔

مریم کو ماما کا اس وقت پاپا کو اس طرح چھوڑ کر جانا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک پاپا تھے ماما کو ذرا

سر درد بھی ہوتا تو بے چین ہو جاتے تھے! اپنا کھانا پینا بھول جاتے تھے اور ماما.....!

کاش پاپا اپنا حق جتا کر انہیں زبردستی روک لیتے اور جانے نہ دیتے۔

اس نے عثمان احمد کی طرف دیکھا اور اسے لگا جیسے ان کے جسم سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

ایک دم سفید ہو رہا تھا ان کا رنگ۔

”پاپا!“

نیچے کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ اس نے ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ انہوں نے آنکھیں کھول

کر اسے دیکھا۔

”بیٹا! آپ جاؤ پڑھائی کرو۔“

”نہیں پاپا! میں ادھر آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟ کہیں تکلیف ہے کیا؟“

اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کی پیشانی پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطرے کو صاف کیا۔

”جہاں نہیں بیٹا! آگے پیچھے یہاں وہاں ہر جگہ درد ہی درد ہے۔“

”پاپا میں انکل ہادی کو فون کروں؟“

”ہوں!“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تیزی سے اٹھ کر ان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

جہاں نہیں وہ بھی ہوں گے یا ڈاکٹر معید کو سی آف کرنے گئے ہوں گے لیکن کوئی نہ کوئی ڈاکٹر تو ہو گا ہی نا۔

اتفاق سے ڈاکٹر ہادی مل گئے تھے۔

”انکل.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”خیریت بیٹا! ماما تو ٹھیک ہیں؟“

”جی..... وہ پاپا.....“ وہ رونے لگی ”پاپا کے بہت شدید درد ہو رہا ہے اور اتنا پسینا آ رہا ہے.....“

”اگر وہ قریب ہیں تو ان کو فون دو۔“

ڈاکٹر ہادی نے کہا تو اس نے کارڈ لیس اٹھا کر پاپا کو دیا پھر جانے پاپا نے کیا بتایا تھا اور ڈاکٹر ہادی کو

کیا سمجھ آئی تھی کہ انہوں نے کہا کہ وہ فوراً آ رہے ہیں۔

فون رکھ کر وہ پھر عثمان احمد کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور بے چینی سے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے

لیے۔ آنسو آہستگی سے اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

عثمان احمد نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، مسکرائے۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر تسکین دیا۔

”ڈونٹ وری بیٹا! ٹھیک ہو جاؤں گا ابھی۔“

”پاپا..... پاپا!“ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں ”پھر ڈاکٹر ہادی اتنے پریشان کیوں ہو گئے تھے۔“

انہوں نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ ایوبیونس لے کر آ رہے ہیں؟“

”وہ ڈاکٹر ہیں نا بیٹا! تمام امکانات پر ان کی نظر ہوتی ہے۔“

انہوں نے پھر آنکھیں موند لیں۔ پسینا پانی کی طرح ان کی پیشانی پر بہہ رہا تھا اور ہونٹ بھی سفید ہو

رہے تھے۔ ان کا ہاتھ چھوڑ کر مریم باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکل کر صفیہ اور شریف کو آوازیں

دینے لگی اور انہیں بلا کر جب وہ واپس آئی تو باہر گیٹ پر نکل ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر ہادی نے صرف پندرہ منٹ لگائے تھے۔ شکر ہے ان کا اسپتال نزدیک تھا۔ اندرونی گیٹ کی

تھکی بیچنے سے پہلے ہی دوڑ کر اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔

”ہیلو گریٹ!“ ڈاکٹر ہادی نے ہمیشہ کی طرح خوش مزاجی سے کہا ”عثمان صاحب کدھر ہیں؟“

”ٹی وی لاونچ میں صوفے پر لیٹے ہیں۔“

”اور مسز عثمان!“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”وہ ڈاکٹر معید کو سی آف کرنے گئی ہیں۔“

”اودہ ہاں مجھے بھی جانا تھا لیکن میں نے معذرت کر لی۔ عین وقت پر ایک سرجری کا کیس آگیا تھا اور اس سے فارغ ہوا ہی تھا کہ تمہارا فون آگیا۔“

مریم سے بات کر کے انہوں نے عثمان احمد کی طرف دیکھا جو صوفے پر اوندھے لیٹے تھے۔

”یہ کیا کر لیا عثمان صاحب!“ اپنے مخصوص انداز میں..... بات کرتے ہوئے انہوں نے عثمان صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن وہ درد کی شدت سے بے ہوش ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر ہادی نے انہیں جلدی سے سیدھا کیا اور چیک کرنے لگے۔

”میرا خدہ صبح تھا۔ ہارٹ ایک ہوا ہے تاہم صحیح صورت حال تو مکمل چیک اپ کے بعد ہی معلوم ہوگی۔ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جا رہا ہوں..... بلکہ انہیں اسپتال کے بجائے ڈاکٹر رافع کے اسپتال لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر رافع خود بھی ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں اور وہاں اور بھی ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔“

مریم بری طرح رونے لگی۔

”حصولہ کرو بیٹا!“ ڈاکٹر ہادی نے مڑ کر اسے تسلی دی اور پھر عثمان احمد کی طرف متوجہ ہو گئے۔



زندگی میں بعض باتیں کتنی اچانک اور غیر متوقع ہوتی ہیں جن کے متعلق آدمی نے پہلے کبھی نہیں سوچا ہوتا کہ یوں ہو جائے گا اور نہ ہی کوئی پلان یا منصوبہ بنایا ہوتا ہے اور بہت ساری باتیں جن کے متعلق وہ سالوں سوچتا ہے پلان بناتا ہے غور کرتا ہے وہ باتیں نہیں ہو پاتیں۔ اب جیسے کہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی دن یہاں امریکا میں پڑھنے کی غرض سے آئے گا۔

ایک چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے سے زمیندار کا بیٹا جس کے ماں باپ نے اس کے لیے بس اتنا ہی سوچا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن جائے گا اور گاؤں کے لوگوں کا علاج کرے گا اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لائق ہو جائے گا اور خود اس کی اپنی خواہشیں بھی بڑی محدود تھیں۔

ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر۔

رضوانہ..... وہ اور اس کے بچے۔

ایک مکمل پرسکون زندگی۔

پھر جانے کہاں سے یہ خواہشوں کا سیل بے پناہ اس کے اندر اٹھ آیا تھا کہ اس کو کوئی بھی نہ روک سکا۔

نہ بے جی اور بابا کی التجا۔

نہ رضوانہ کے آنسو۔

نہ بھابھ اور بھانٹا کا سمجھنا۔

کبھی کبھی کتنی مضبوط زنجیریں بھی کتنی کمزور ہو جایا کرتی ہیں۔ محض ایک خواہش کتنی زور آور ہو گئی تھی کہ

سارے رشتوں کی زنجیریں اس خواہش کی شدت کے سامنے کمزور پڑ گئی تھیں۔ حالانکہ وہ کبھی سوچا کرتا تھا کہ یہ زنجیریں اتنی مضبوط ہیں کہ وہ کہیں بھی ہوان کو نہیں کاٹ سکتا..... لیکن شاید کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا اور یہ زنجیریں آپوں آپ ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔

یوں جیسے مزید کچھ پکڑنے کی خواہش میں پہلے سے موجود چیز مٹھی سے پھسل کر گر جائے۔

سکندر نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور نیچے جھانک کر دیکھا نیچے سڑک پر گاڑیاں کھلونوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

یہاں اس ملک میں زندگی کتنی تیز بھاگتی ہوئی سی لگتی ہے..... اسے یہاں آئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا لیکن لگتا تھا جیسے ابھی ابھی آیا ہو۔

اور جیسے رضوانہ ابھی بھی ارسلان، ارمغان کے ”پگھڑوں“ پر ہاتھ رکھے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی ہو۔

اور کیا تھا اگر وہ امریکا نہ آتا کم از کم وہ سب لوگ رضوانہ بے جی اور بھانٹا زسب خوش اور مطمئن تو ہوتے۔ اس نے پینٹ کی پاکیٹ میں موجود بھانٹا کے خط کو ہاتھ سے تھپتھا کر محسوس کیا۔ بھانٹا نے لکھا تھا۔

”بابا اور بے جی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ جلد لوٹنا کہیں اپنے خواہوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے یہ نہ بھول جانا کہ یہاں اس گاؤں میں بہت سی آنکھیں تمہاری منتظر ہیں۔“

اس نے تو کوئی خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کم از کم امریکا آنے کا خواب تو کبھی نہیں۔

لیکن بعض خواب خود بخود کیسے جھولی میں آگرتے ہیں۔ جنہیں ہم نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ کبھی نہ سوچا ہو۔

اور یہ خواب تو ڈولی نے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

اور نہ صرف اس کی آنکھوں کو خواب دیا تھا بلکہ اس کی تعبیر بھی مہیا کر دی تھی۔ SHE IS

REALLY GREAT (شی ازربکلی گریٹ) اس نے دل ہی دل میں اسے سراہا اور قدرے جھکتے ہوئے پھر نیچے جھانکا۔

نیچے زندگی رواں دواں تھی۔

کھلونوں جیسی گاڑیاں اور بونوں جیسے لوگ۔ جیسے گلیور بونوں کی دنیا میں آٹکلا ہو۔

آدمی اگر بلند یورپ کھڑا ہو تو اسے نیچے کھڑے ہوئے لوگ کتنے بونے لگتے ہیں اور کیا یہ ممکن ہے کہ

کبھی میں اتنی بلند یوں پر چلا جاؤں کہ مجھے سب بونے لگنے لگیں گے۔

وہ جو میرے اپنے ہیں۔

اور جنہیں پیچھے میں چھوڑ آیا ہوں۔

نہیں۔ IMPOSSIBLE (ناممکن) ایسا کبھی ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔

خود جب وہ آ رہا تھا تو اس کا دل کتنا اداس تھا۔

یوں جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے دل پر آگرا ہو۔

وہ کتنی ہی دیر تک بے جی کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا رہا تھا اور بند آنکھوں میں آنسو بھلجے رہے تھے اور بے جی ہوئے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی تھیں اور کبھی کوئی آنسو بغاوت کر کے اس کے چہرے پر آگرتا تو وہ چونک کر آنکھیں کھول دیتا۔

”بے جی، پلیز مت روئیں چند سالوں کی تو بات ہے پھر میں آ جاؤں گا۔“

”ایک گھڑی کا بھی بھروسہ نہیں پتر چند سال تو بہت طویل ہوتے ہیں۔“ وہ جلدی سے آنسو صاف کر لیتی تھیں۔

”ماں جی!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ اس طرح کی باتیں کریں گی تو..... میں پھر نہیں جاتا۔“

اور بابا نے حقے کی تے منہ سے نکالتے ہوئے بے جی کو سرزنش کی۔

”اب ایسی باتیں کر کے اس کا دل میلانہ کر۔ جب سامان بندھ جاتا ہے تو پھر کیا روکنا..... اور یوں بھی اپنے آنسوؤں کی زنجیریں اس کے پاؤں میں ڈال کر اسے روک بھی لیا تو یہ خوش نہیں رہ سکے گا“ بھاکوان!

اور پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے ”حیری ماں کا تو بس چلے تو آج ساری رات اپنے پاس بٹھائے رکھے۔ نہ خود سوئے گی اور نہ تجھے سونے دے گی۔ چل اٹھ جا کر آرام کر۔ صبح سویرے نکلنا ہوگا تجھے۔“

”جی بابا!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ خود اسے بے حد تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ کل شام ہی تو وہ سیٹ کنفرم کر کے لاہور سے آیا تھا اور پھر یہاں صبح سے بہت مصروف تھا۔

”اپنی سب چیزیں تو رکھ لیں تا تو نے؟“ بے جی کو فکر ہوئی۔

”جی!“

اس نے بابا اور بے جی پر نظر ڈالی۔

دونوں بہت تھکے تھکے اور پشمرہ لگ رہے تھے۔

”آپ بھی پلیز آرام کریں۔“

”کر لیں گے ہم بھی آرام.....“ بابا نے حقہ ایک طرف کر کے پائنتی کی طرف پڑا کھیں اٹھا کر اپنے

گرد لپیٹا۔

”بس پتر ایک بات کا دھیان رکھنا“ مجھے تیرے چاچا کی روح کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔“

”بابا! انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کیا آپ کو مجھ پر اپنے بیٹے پر اعتبار نہیں ہے۔“

”ہے..... تجھ پر تو اعتبار ہے پتر! لیکن حالات پر اعتبار نہیں ہے۔ بعض اوقات آدمی حالات کے گرداب میں ایسا بھٹس جاتا ہے کہ چاہنے کے باوجود اس گرداب سے نکل ہی نہیں پاتا اور سارے اعتبار کھودیتا ہے۔ بیٹا، کوشش کرنا کہ حالات کے گرداب تجھے بے اعتبار نہ کر دیں۔“

”جی بابا!“

اور انہیں خدا حافظ کہہ کر جب وہ ان کے کمرے سے نکلا تو رضوانہ برآمدے میں ارسلان اور ارمان خان کے بالنے کے پاس کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اس کے قریب رک گیا۔

”ابھی تک جاگ رہی ہو رضی!“

رضوانہ نے ذرا کی ذرا ٹانگیں اٹھائیں اور پھر جھک لیں۔

”یہ چچو میچو کدھر گئے؟“

”بھابھو لگتی ہیں کرنے میں سو گئے تھے۔“ رضوانہ نے ٹکاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

سکندر کی ٹکاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔

لانی سیاہ پلکیں بیٹکی بیٹکی تھیں۔

رخساروں سے خون جیسے چھلک جانے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

وہ ٹکاہیں جھکائے بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ کئی بار اس نے ہونٹ کھولے اور پھر بند کر لیے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔

کئی لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ سکندر اسے دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہا وہ اسے ہانپوں میں لے لے۔

اس کی بیٹکی پلکوں پر اٹکے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے چن لے اور اس کے صلیج رخساروں پر اٹکے ہوئے موتی اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لے اور پھر اس کے کان میں سرگوشی کرے۔

”رضی! میں تمہارا ہوں! ہمیشہ تمہارا رہوں گا لگی! کیوں رو رہی ہو کیوں خوف زدہ ہو؟“

مگر اس نے اسے کچھ نہیں کہا۔ ذرا فاصلے پر کھڑا وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی تصویر اپنے اندر اتار رہا ہو۔ یہاں تک کے پلکوں پر اٹکے ہوئے موتی اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے اسی کے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے۔

”ایسا مت کرو رضی! ورنہ میرے لیے مشکل ہو جائے گا“ میں نہیں جا پاؤں گا۔“

”تو نہ جاؤ نا!“ اس نے ٹکاہوں کی زبان سے کہا۔

”مجھے جانا ہے..... مجھے جانا ہے رضی! لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔“ اس نے نرمی سے اسے سمجھایا ”پھر

وہ پاکستان سے سیدھا محسن کے پاس ہی آیا تھا۔ جو اس سے چند ماہ پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اور پھر محسن کی وجہ سے اسے زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ چھٹیوں میں جو جاب بھی ملتی، کر لیتا۔ اس طرح کچھ رقم جمع ہو جاتی تھی اور بڑھائی کے دوران بھی کئی بار بے بی سنگ کے لیے چلا جاتا تھا۔ ڈولی بھی اس کے آنے کے تین ماہ بعد آگئی تھی اور ڈولی کے آنے سے اسے بہت تقویت ملی تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے مہیا پیا بھی سکندر کو بہت اہمیت دیتے تھے بلکہ مہانے تو ایک بار بڑی دل گرفتگی سے کہا بھی تھا۔

”ڈولی تمہیں بہت لائیک (LIKE) کرتی ہے اور ہمیں بھی تم بہت پسند ہو..... لیکن کاش!“

اور وہ تادم سا ہو گیا تھا۔

کیا حق تھا؟ اسے ایک لڑکی کے اتنا قریب آنے کا کہ وہ اس کے حوالے سے خواب دیکھنے لگے اور اگر ڈولی نے اس کے لیے اس طرح کی کوئی بات سوچی تھی تو اس میں اس کا بھی قصور تھا۔ کاش..... کاش! کبھی زندگی میں وہ ڈولی کے اس دکھ کا کفارہ ادا کر سکتا جو انجانے میں اس نے اسے دیا تھا۔ ڈولی نے تو پھر کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ اس کی عنایتوں اس کے خلوص اور اس کی محبتوں پر اندر ہی اندر شرمندہ ہوتا رہتا تھا۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے سکندر؟ چھٹیوں میں کہیں جانا ہے یا ادھر ہی رہتا ہے۔“ محسن نے اخبار سے نظریں اٹھائیں۔

”میرا..... ڈولی کا خیال ہے کہ ان چھٹیوں میں کہیں باہر آؤنگ کے لیے جایا جائے..... فرانس کا پروگرام بتا رہی ہے لیکن میں شاید انفرڈ نہ کر سکوں۔ بہر حال ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔“

”یار سکندر!“ محسن نے اخبار گول گول پلیٹ کر دو بارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”یہ ڈولی تمہاری زندگی میں کچھ زیادہ دخل نہیں ہوتی جا رہی ہے؟“

”کس طرح؟“ سکندر نے بھوٹا اچکا کیں۔

”ہر طرح..... تمہارے سارے فیصلے وہ کرنے لگی ہے۔ تمہیں خود اپنے اوپر اختیار نہیں رہا۔ تمہیں کس شعبے میں اسپیشلائز کرنا ہے۔ ڈولی کی جو مرضی۔ تمہیں محسن وقار کے ساتھ رہنا ہے۔ جیسا ڈولی نے کہا۔ تمہیں فلاں اسٹور پر جاب کرنا ہے۔ ڈولی سے پوچھوں گا۔ تمہیں چھٹیاں کہاں گزارنی ہیں۔ جہاں ڈولی کہے گی۔ یا یہ سب کیا ہے؟“

محسن بے حد سنجیدہ تھا۔

”کچھ بھی نہیں یار!“ سکندر مسکرایا۔

”SHE IS ONLY MY FRIEND.“

پلٹ کر مجھے یہیں تو آنا ہے۔“

اب آنسو تو اسے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

”مت رو روضی!“ اس نے دل گرفتگی سے کہا۔ ”کیا تمہیں میرا یقین نہیں ہے۔ اپنی محبتوں پر اعتبار نہیں ہے..... پھر میرا اور تمہارا بندھن تو بہت مضبوط ہے، کبھی نہ ٹوٹے والا۔ اتنی مضبوط زنجیروں میں بند کر کبھی خوف زدہ ہو ڈر رہی ہو۔“ وہ ہولے سے مسکرایا۔

”کوئی بندھن بھی اتنا مضبوط نہیں ہوتا کہ ٹوٹ نہ سکے۔“ رضوانہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”آدمی اگر توڑنا چاہے تو مضبوط سے مضبوط بندھن بھی ٹوٹ جاتا ہے۔“

”ہاں۔“ لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کبھی یہ بندھن توڑنا چاہوں گا؟ لگی صرف موت ہی اس بندھن کو توڑ سکتی ہے..... تم جانتی ہونا کہ میں صرف بابا اور بے جی کی خواہش پر نہیں باندھا گیا بلکہ یہ میری اولین خواہش بھی تھی۔“

”لیکن سکندر وہ دلیس جس میں تم جا رہے ہو سنا ہے وہاں بہت حسن ہے..... اور وہاں جا کر ہمارے پاکستانی کسی مارگریٹ کسی الزبتھ کی زلفوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔“

”اوہ.....“ سکندر ہنس دیا۔ ”اس لیے رو رہی ہو۔ میں سمجھا مجھ سے جدا ہونے کا غم منایا جا رہا ہے۔“ رضوانہ کی پلمکیں پھر گیلی ہونے لگیں تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”کوئی نیلی، چیلی، گوری، مارگریٹ، الزبتھ تمہاری جگہ نہیں لے سکتی..... میرا یقین رکھنا روضی! کبھی بے یقین مت ہونا۔“

اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی اور سر چکرا رہا تھا لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک وہاں ہی برآمدے میں کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے سمجھا تھا روم اور بہت سے وعدے بہت سی تسلیاں اس کی جھولی میں ڈال کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”کیا دیکھا جا رہا ہے یار؟“

محسن بال پونچھتے ہوئے واش روم سے باہر نکلا تو اس نے چونک کر محسن کو دیکھا۔

”کچھ نہیں یار یونی بے سبب نیچے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تمہارے فلیٹ کی اس کھڑکی سے نیچے بڑک بڑ چلنے والے لوگ کیسے بونے لگتے ہیں۔“

”وہ پرانا والا تو طیت کا دورہ تو نہیں پڑا۔“ محسن نے تویہ صوفے پر پھینکا اور خود رانگ چیر پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔

”نہیں یار!“ وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر بیڈ پر آ بیٹھا۔ ”اب تو ایڈ جسٹ ہو ہی گیا ہوں۔“

”ہونا ہی پڑتا ہے میری جان!“ محسن نے ٹیبل سے اخبار اٹھایا اور دیکھنے لگا۔

"ARE YOU SURE?"

محسن نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ آف کورس۔"

"یارو یکنہ! کہیں ہماری بھابی کو دکھ نہ دے جانا۔ جب میں تمہیں ڈولی کی طرف اتنا ملٹت دیکھتا ہوں تو مجھے پتا نہیں کیوں پھوپھو کنیز اور چاچا کا خیال آ جاتا ہے۔ یہو کنہ کا وہ خاموش رہنا میرے تصور سے کبھی نہیں نکلتا۔"

"ارے نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے محسن کو ہلکی سی ڈولی کو میں نے رضوانہ کے متعلق سب کچھ

بتا رکھا ہے۔ شی ازویری گریٹ بار!"

"پتا نہیں مجھے تو ہمیشہ وہ سچی سی لڑکی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ آئی تھی چاچا کے گھر اور میں

وہاں جاتا تھا تو وہ مجھ پر بھی بڑی مہربان تھی مگر میں نے توہ نہیں دی اور چاچا کے گھر ہی جانا چھوڑ دیا تھا۔"

"لیکن محسن تمہاری تو اکثر لڑکیوں سے فرینڈ شپ تھی اور تم خوش ہوتے تھے اس طرح کی فرینڈ شپ

سے پھر تم نے اتنی خوبصورت لڑکی کی دوستی کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

سکندر کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا جسے محسن نے محسوس نہیں کیا اور سادگی سے بولا۔

"ہاں۔ اگر وہ چچی کی رشتہ دار نہ ہوتی تو اس سے دوستی کی جاسکتی تھی لیکن یار! میں نہیں چاہتا تھا کہ

بعد میں کوئی مسئلہ بنے۔ یہ لڑکیاں بعض اوقات سیریس ہو جاتی ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کوئی مسئلہ

ہو تو بعد میں بچا کے لیے زندگی کو عذاب بنا دیا جائے۔ چچی تو یوں بھی خوش نہیں رہتی ہیں بچا بے چارے

انہیں خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔"

"ارے نہیں۔" سکندر کو حیرت ہوئی "تمہاری چچی کی تو بہت امپرسیو شخصیت ہے اور وہ ایک مکمل

عورت ہیں۔ بہترین بیوی اور بہترین ماں۔"

"بعض اوقات ظاہر میں جو کچھ نظر آتا ہے اصل اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے میرے دوست۔ میری

چچی کو کہیں سے پتا چل گیا تھا۔ شاید خاندان کی کسی خاتون نے ہی انہیں بتایا ہوگا، کنیز بھوپو کے متعلق کہ

ماضی میں کبھی چچا نے ان سے محبت کی تھی حالانکہ چچا نے ہی انہیں رد بھی کر دیا تھا مگر چچی نے آج تک

اس بات کے لیے انہیں معاف نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ یار! تمہیں نہیں معلوم میری چچی بہت عجیب ہیں۔"

مگر پتا نہیں کیوں سکندر کو محسن کی بات کا یقین نہیں آیا۔ یقیناً محسن کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ تو اتنی نفیس

خاتون ہیں۔

"یہ میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا۔" محسن کو خود ہی اس طرح چچی اور چچا کے متعلق باتیں کرنا عجیب سا لگا۔

"تم بتاؤ چائے کا موڈ ہے تو بنائی جائے۔"

"نہیں یار! اس وقت بالکل موڈ نہیں ہو رہا تم اپنا پروگرام بتاؤ۔ چھٹیاں کیسے گزارو گے؟"

"یار! باجی تو کہہ رہے تھے کہ پاکستان آ جاؤ لیکن ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے کیا جاؤں۔ خواہ آہ آنے

جانے کا خرچ۔ بہر حال ابھی کچھ بھی ڈیڑھ نہیں کیا۔"

"یار! یہیں کہیں آؤنگ کا پروگرام بتائیں گے۔ وہ جارج نے بھی تو انوائٹ کیا ہے۔ کچھ دن اس کی

طرف رہیں گے اور پھر کہیں اور نکل جائیں گے۔" سکندر نے رائے دی۔

"ہاں! ایسا ہو تو سکتا ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ تم میرا ساتھ دے سکو گے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ سکندر ملک صاحب کہ مجھے یقین ہے کہ مس ڈولی آپ کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے

جائیں گی اور آپ انکار نہیں کر سکیں گے اور ہم رہ جائیں گے اکیلے۔ ایسے موقعوں پر صبح صادق بہت

یاد آتا ہے یار۔۔۔۔۔۔"

"ایسا نہیں ہوگا! میں فرانس جانا انور ڈنہیں کر سکتا۔" سکندر نے حتمی بات کی۔

"تم کوئی پروگرام بناؤ۔ عاشر وغیرہ سے بھی پوچھ لینا۔"

لیکن ہوا یوں کہ اس کا سارا پروگرام دھرا کا دھرا رہ گیا اور ڈولی اسے زبردستی ساتھ لے گئی۔

"کمال ہے! میں کب سے تمہاری چھٹیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈیڑی تو اتنے بڑی

ہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ مئی میں اور تم۔۔۔۔۔۔ اکٹھے جائیں گے پیرس۔"

"مگر ڈولی میں۔۔۔۔۔۔"

اس نے انکار کرنا۔ ہاتھ لیکن ڈولی نے اس کی ایک نہ سنی اور محسن کی بات سچ ہو گئی۔ وہ محسن سے

معذرت کر کے ڈولی کی فینلی کے ساتھ فرانس میں چھٹیاں گزارنے چلا گیا۔



"تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم فی الحال پاکستان نہیں جا رہے ہو۔"

محسن بہت حیران حیران سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں یار! سکندر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا وہیلکی میگزین ایک طرف رکھ دیا "بہت اچھی جاب مل رہی

ہے مجھے۔ میں کچھ دن یہاں رہنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یار! وہ تمہارے آدرش۔۔۔۔۔۔ وہ جو تم کہا کرتے تھے کہ تم گاؤں میں وہاں کے لوگوں کی خدمت

کرو گے۔ مگر آپا کی وفات کے بعد تم نے عہد کیا تھا کہ تم۔۔۔۔۔۔"

"میرا عہد اب بھی قائم ہے۔ میں اپنا کلینک گاؤں میں ہی بناؤں گا۔" اس نے محسن کی بات کا ٹ دی

"لیکن اس کے لیے کچھ رقم تو ہو میرے پاس۔ میں چاہتا ہوں ایک دو سال جاب کروں۔ اتنا پیسہ

تو ہو جائے نا میرے پاس کراچیا سا کلینک بنا سکوں۔ جہاں ساری سہولتیں میسر ہوں..... اگر میں یوں ہی جا کر ایک کمرے میں بیٹھ جاؤں تو پھر میرے اور حکیم فضل دین کی دکان میں کیا فرق رہ جائے گا؟“
محسن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

یہ وہی سکندر تھا جو ضروری بات بھی بہت مختصر کرتا تھا۔ اب خوب بولنے لگا تھا۔ شاید ڈولی کی صحبت کا اعجاز تھا۔

”کیا یہ فیصلہ تم نے ڈولی کے کہنے پر کیا ہے؟“

محسن کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ سکندر نے نگاہیں چرائیں۔

”نہیں میرا اپنا فیصلہ بھی یہی ہے۔“

”سکندر! ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ دوست کہیں تم اور ڈولی.....“

”یہ بات تم پہلے بھی کئی بار پوچھ چکے ہو اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم صرف دوست ہیں۔“

"WE ARE ONLY FRIENDS"

”سکندر! محسن کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر تھیں۔ ”ڈولی کے جال سے نکل آؤ دوست کہ تم نے ایک معصوم لڑکی کو اپنے وعدوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔ خدا اور رسول کو گواہ بنا کر تم نے اسے پابند بنا کر رکھا ہے۔“

”میں کسی کے جال میں نہیں ہوں محسن!“ اس کا لہجہ کمزور تھا۔ ”اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں کوئی میرا منتظر ہے۔“

”اگر میری بات مانو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ بابا اور ماں جی بھانڈا سب سے مل آؤ..... پھر لوٹ آنا رضوانہ بھابھی کو ساتھ لے کر۔“
سکندر خاموش ہی رہا۔

وہ کیسے جاسکتا تھا۔ اس نے ڈولی سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مزید چند سال یہیں جاب کرے گا۔ ڈولی نے ہمیشہ اس کے لیے اچھا سوچا تھا اور اب بھی اس کا مشورہ بالکل صحیح تھا۔ اتنے سال دیار غیر میں رہنے کے بعد بھی کیا وہ خالی ہاتھ چلا جاتا..... اور پھر وہاں گاؤں میں کتنا کمالیتا؟ یہاں اتنا عرصہ امریکا میں رہنے کے بعد زندگی سے متعلق اس کا نظریہ کچھ بدل گیا تھا۔ وہ سیدھا سادہ سا گاؤں کی کھلی فضاؤں میں رہنے والا سکندر شاید اب وہاں خوش نہ رہ پاتا۔ وہ جن سہولتوں کا عادی ہو چکا تھا ان کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور اب اسے بہت مشکل لگنے لگا تھا۔ گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور گندگی کے ڈھیر کے تصور سے ہی گھبرا جاتا..... اور پھر ڈولی کا قائل کرنے والا انداز۔

”میں تمہیں اپنے لیے تو نہیں کہہ رہی ہوں سکندر! تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ یہ بہت اچھی جاب ہے۔ صرف دو سال میں تمہارے پاس اتنا پیسہ اکٹھا ہو جائے گا کہ تم وہاں ایک کلینک بنا سکو۔ اچھی اور بہترین زندگی گزار سکو گے۔ جن سے محبت کی جاتی ہے سکندر ان کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا جاتا ہے۔ میں پتی ہوں کہ تم ایک مکمل اور کامیاب زندگی گزارو اور اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ آئیڈیل ملک ہونا بری بات نہیں ہے سکندر! میں تمہارے خیالات کی قدر کرتی ہوں لیکن یہ خیالات صرف سوچنے کی حد تک اچھے لگتے ہیں، عملی زندگی میں آدمی جلد ہی ان سے ادب جاتا ہے۔“

وہ جب چاپ سر جھکا کر اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں ایک ایک بات کی تائید کر رہا تھا۔ ڈولی کبھی کوئی غلط بات نہیں کرتی تھی۔ وہ زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ بہتر جانتی تھی۔ اس کی رائے بہت ٹھوس ہوتی تھی لیکن وہ سب لوگ جو اس کے منتظر تھے۔ ماں جی کیسے لحوہ لحوہ کن گزار رہی تھیں اور وہ رضوانہ بھی۔ وہ وقت رخصت اس کی بھیگی پلکیں، پتی نظریں۔ شاید ماں جی اب بھی چھت پر چڑھ کر اس کا انتظار کرتی ہوں۔ جھانک جھانک کر نیچے دیکھتی ہوں۔ میں یونہی جاؤں گا بغیر اطلاع کے..... تو ماں جی مجھے دیکھ کر کتنا حیران ہوں گی، کتنی خوش ہوں گی۔

”سکندر!“ ڈولی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ”رک جاؤ پلیز..... آخر کو تو تمہیں جانا ہی ہے۔ دو سال اور رک جاؤ۔ پہلے تو تم اتنے مصروف رہے ہو۔ ان سالوں میں بہت کم وقت ہم نے اکٹھے ساتھ گزارا ہے۔ میں گھڑنے سے پہلے بہت سارا وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ دو سال تو پلک جھپکنے میں ہی گزر جائیں گے سکندر۔ میں پھر تمہیں نہیں روکوں گی۔“

سکندر کو یوں لگا تھا جیسے وہ یکا یک دورا ہے پر آکھڑا ہوا ہے۔ ڈولی اپنی بے تحاشا خوبصورتیوں کے ساتھ آنکھوں میں آنسو لیے اسے تک رہی تھی..... کیا تھا وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے معمولی زمیندار کا معمولی سا لڑکا۔

جیسے اس اتنی بے تحاشا خوبصورت لڑکی نے اتنا چاہا تھا۔

اس کے لیے اتنا کچھ کہا تھا۔

اس اجنبی ملک میں کہیں بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔

جس کے پاس سب کچھ تھا۔

دولت، حسن، انیشنس۔

پھر بھی..... پھر بھی وہ اسے چاہتی تھی۔

اس کی رفاقت کی تمنی تھی۔

کتنی بے غرض، کتنی بے لوث چاہت تھی اس کی۔ کتنا کھرا پیار تھا۔

کاش! اے کاش! اس کا نکاح رضوانہ کے ساتھ نہ ہو چکا ہوتا..... جب بابا نے اس کی مرضی پوچھی تھی تو اس نے انکار کر دیا ہوتا۔ کہہ دیا ہوتا کہ ابھی نہیں..... تو پھر آج بڑے سکون سے اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا۔ اتنے سالوں میں پہلی بار اس کے اندر پچھتاوا جاگ اٹھا۔ پہلی بار اسے رضوانہ کے ساتھ اپنی چاہت پر ندامت ہوئی۔

دراصل وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ نادان اور نا سمجھ۔ رضوانہ خوب صورت تھی۔ اس کے چاچا کی بیٹی تھی اور شاید اس عمر میں جوڑی کی قریب ہوتی ہے وہی اچھی لگنے لگتی ہے۔ شاید رضوانہ بھی اسے اسی لیے اچھی لگنے لگی تھی کہ وہ اس کی رسائی میں تھی۔

”رک جاؤ نا پلیز!“ ڈولی کی بے تحاشا خوبصورت آنکھوں میں ایسی التجا تھی کہ وہ اندر تک پٹھلتا چلا گیا۔ جیسے کوئی بھی فیصلہ اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ ماں جی یا رضوانہ سب کے چہرے پس منظر میں چلے گئے تھے۔ سامنے صرف ڈولی تھی اس کی بھیگی پلکیں تھیں۔

اس کا بے تحاشا حسن تھا۔

ماتنی نظریں تھیں۔

اس کی محبتیں تھیں۔ کیا ہے اگر میں اس کی محبت کا بھرم رکھ لوں۔

میں اسے عمر بھر رفاقت نہیں دے سکتا کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ اتنی بھاری زنجیریں کہ انہیں توڑنے کے لیے مجھے بہت سارے دلوں پر پاؤں رکھنا پڑے گا جو میں نہیں کر سکتا۔ سو اگر کچھ عرصہ ہم اس ملک میں ایک دوسرے کو رفاقت دے لیں تو کیا ہے؟ جہاں اتنے سال گزار گئے وہاں دو سال اور بھی گزر جائیں گے۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہے ڈولی آخر کو تو مجھے واپس ہی جانا ہے۔

”ٹھیک ہے ڈولی نہیں جاؤں گا۔ اب مسکرا دو۔ روتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہو۔“

”پھر کیا خیال ہے سکندر!“ اسے خاموش دیکھ کر محسن نے پھر پوچھا ”چلے چلو۔ میں کچھ دن ٹھہر جاتا ہوں۔“

”نہیں یا! ایک ہی بار آؤں گا۔ تم بابا اور ماں جی کو سمجھا دینا۔“

”لیکن سکندر.....“ محسن نے کچھ کہنا چاہا لیکن سکندر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”پلیز محسن، کچھ مت کہو۔ میں اب فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم ماں جی کو حوصلہ دینا اور سنو اگر موقع ملے تو

رضوانہ سے بھی کہہ دینا کہ میں لوٹ آؤں گا۔“

”سکندر! کوشش کرنا کہ جلدی آسکو۔ بعض انتظار بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں اور لڑکیاں بہت نازک ہوتی ہیں۔ چنانچہ کیوں مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم ڈولی کے اسیر ہو کر یہاں ہی نہ رہ جاؤ۔“

”پاگل ہو تم۔“ سکندر ہنس دیا ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں یا! تمہیں نہیں معلوم اس خاندان کی عورتوں میں حسن کے علاوہ بھی کوئی طاقت ہے ایسی جو

اسیر کر لیتی، جیسے چچی نے چچا کو اسیر بنا لیا۔“

چنانچہ کیوں وہ اپنی چچی سے اتنا خفا رہتا تھا۔ شاید اسے کینز پھپھو سے بہت پیار تھا..... ورنہ چچی بہت پیاری اور محبت کرنے والی عورت تھیں بالکل ڈولی کی طرح۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ محسن اٹھ کھڑا ہوا ”چلو مجھے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ یا رہا مارا خاندان ماشاء اللہ اتنا بڑا ہے کہ اپنی طرف سے سب کے لیے کچھ نہ کچھ خرید چکا ہوں پھر یاد آتا ہے ارے نہیں فلاں کے لیے تو کچھ گفٹ لیا ہی نہیں..... اور میرے ابا جی کا حکم ہے کہ سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آؤں۔ کسی کو بھول نہ جاؤں۔ اور ہتا ہے اگر کسی کو بھول گیا تو کیا پتا، ابا جی حکم دیں کہ ابھی ٹکٹ کٹاؤ اور واپس جاؤ اور میرے مامے کے پتر کے لیے کچھ گفٹ لے کر آؤ۔“ وہ ہنس دیا۔

اور پھر محسن کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے رضوانہ بھائیو ماں جی بھائیو میچو اور شہر یار کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتے ہوئے کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ محسن کی بات مان لے اور محسن کے ساتھ چلا جائے اور چند ماہ رہ کر پھر لوٹ آئے لیکن ڈولی..... اس نے کہا تھا۔

”سکندر! تم ایک بار چلے گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ وہاں سب تمہارے اپنے ہیں..... وہ تمہیں نہیں آنے دیں گے۔“

”اور یہاں تم ہو ڈولی! تمہاری کشش! تمہاری محبت مجھے واپس لائے گی۔ وہاں ماں جی اور بابا میرے لیے بہت ادا ہیں۔ میں ان سب سے مل کر واپس آ جاؤں گا۔ میرا وعدہ ہے پھر تمہاری خواہش کے مطابق دو سال جاب کروں گا اور ہم ہر روز ملا کریں گے۔ اپنی جاب کے بعد جتنا وقت باقی بچے گا سب تمہارے سنگ گزاردوں گا۔“

لیکن ڈولی روتی رہی اور وہ کمزور پڑتا گیا تھا۔

اور اب بھی محسن کے ساتھ سب کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے کئی بار اس نے سوچا اور پھر اپنی سوچ کو

خود ہی رد کر دیا..... ”نہیں ایک بار ہی جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے اور پھر بابا اور ماں جی سب کو مٹا لوں گا۔“

اور محسن وقار چلا گیا۔ اسے جلد آنے کی تاکید کر کے اور چند دن ادا اس رہ کر وہ نئی جاب میں بڑی ہو گیا۔



”اگر COMPLIMENTRY COLOURS کو سرخ اور سبز، کیٹوس کے بڑے حصے پر لگایا جائے تو وہ رنگ کیٹوس کی سطح کو گہرا تر بنا سکتے ہیں اور اگر ان امدادی رنگوں کو کم مقدار میں کیٹوس کے چھوٹے حصوں پر استعمال کیا جائے تو اعتدال اور ٹون پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں.....“

پروفیسر عادل نے جو مسرور کے پیچھے کھڑے اسے کیٹوس پر برش چلاتے دیکھ رہے تھے کہا تو مسرور

چونکہ کران کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی سر!“ اس نے برش ایک طرف رکھا۔

”مسرور مجھے خوشی ہے کہ تم پھر ایک بار اپنے کام کی طرف توجہ دینے لگے ہو۔“ وہ مسکرائے اور پیچھے پڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

”سر میری خواہش ہے کہ میں ایک ہی موضوع پر سیریز پیشنگ بناؤں۔“

”اچھی بات ہے۔ مومن نے ایک موضوع کی سیریز پیشنگ بتائیں۔ اس میں اس نے واٹر لوئل لندن کے سولہ پہلو پیش کیے۔ کلیسائے روم کے چھبیس مناظر نقش کیے۔ ناقدین نے مومن پر الزام لگایا کہ اس نے تلون آشنا ماحولاتی اثرات دکھانے کی خاطر فارم یا پیکروں کو تجربے کی حد تک برباد کر دیا لیکن یہ مومن کی تصویروں کا کمال تھا کہ اس نے روشنی کو ایک مکمل فارم جانا۔“

مسرور بہت توجہ سے ان کی بات سن رہا تھا کہ حسب معمول انہوں نے اپنی بات کو دوہیں چھوڑ کر موضوع بدل دیا اور پوچھا ”تمہارے ذہن میں کوئی موضوع ہے ایسا جس پر تم یہ سیریز بنانا چاہ رہے ہو؟“

”کوئی خاص نہیں سر ایک دو خیال ہیں ذہن میں۔“

”مگذا!“ انہوں نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی ”پھر کسی دن ہم اس پر ڈسکن کریں گے۔۔۔۔۔ اور مجھے امید ہے کہ کوئی بہت پاورفل موضوع ہوگا تمہارے ذہن میں جب ہی تو یہ خیال آیا ہے تمہیں۔“

”پتا نہیں سر اب پاورفل ہے یا بس یونہی۔“

”خیر! اس وقت تو میں ذرا آمنہ صنفی کی طرف جارہا تھا۔ سوچا تمہیں بتانا جاؤں لیکن پھر تمہیں کام کرتے دیکھ کر رک گیا۔ جتنی بتا رہے تھے بہت اپ سیٹ ہے وہ۔“

”جی سر کسی بھی عورت کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ ہے چاہے وہ ورکنگ ویمن ہو چاہے گھریلو۔“

مسرور نے تائید کی۔

”مگر یار سمجھ میں نہیں آتا کہ کن لوگوں نے اسے اغوا کیا اور کیوں۔۔۔۔۔ اور پھر میرے گھر کے سامنے ہی سے کیوں؟“ انہوں نے نئی سگریٹ سلگائی اور پر خیال انداز میں مسرور کی طرف دیکھنے لگے۔

”وہ ایک کالم نگار ہیں۔ کیا خبر کوئی ایسا ویسا کالم لکھ دیا ہو کسی بڑے آدمی کے خلاف۔ کوئی ایم این اے کوئی وڈیرا خفا ہو گیا ہو ان سے اور اس طرح انہیں اغوا کر لیا ہو۔“

”اور پھر چھوڑ بھی دیا۔۔۔۔۔“ پروفیسر عادل کی نظریں مسرور پر ہی تھیں۔

”جی شاید ڈرا دھکا کر تجبیہ کر کے۔“

”اب ایسی بھی دھاندلی نہیں ہے مسرور۔“ ان کے ہونٹوں سے ہلکا سا تبسم ابھرا ”کہ ایک صحافی

خاتون کو محض اس لیے اغوا کر لیا جائے کہ اس کے کسی کالم نے کسی وزیریاب بڑے آدمی کو خفا کر دیا ہوگا۔“

”سر! آپ نے زندگی کا ایک بہت سارا حصہ ملک سے باہر گزارا ہے اس لیے آپ بہت کچھ نہیں جانتے۔ یہاں کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس کی خبر نہیں ہے۔ معمولی باتوں پر لوگوں کے گھر جلاتا، اغوا کرنا، قتل کر دینا یہ تو بہت عام سی باتیں ہیں۔“

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو مسرور! لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل ہمیشہ مثبت باتیں سوچتا ہے اور منفی پر مشکل سے ہی یقین کرتا ہے پھر کیا خیال ہے تم چلو گے آمنہ کی طرف؟“

”میں سر!“ مسرور نے اپنی طرف اشارہ کیا ”مگر معلوم نہیں سر وہ ملنا بھی پسند کریں گی یا نہیں اور پھر ہمارا جانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ خاص طور پر اس طرح کے حادثات کے بعد تو آدمی بہت حساس ہو جاتا ہے اور پھر آس پاس رہنے والے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے متوسط طبقے میں تو ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر آمنہ صنفی بھی جہاں رہتی ہیں وہاں انہی جیسے متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہوں گے۔ اس حادثے کے بعد تو اور بھی تجسس اور کھوجی ہو جاتے ہیں لوگ۔۔۔۔۔“

”ٹھیک کہتے ہو شاید تم۔“ پروفیسر عادل مسکرائے ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اچھا بولنے لگے ہو۔“

”نوسر! کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جنہیں آپ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ آپ کا تعلق جس طبقے سے ہے وہاں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ آپ جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں ساتھ والے گھر میں کوئی مرجائے تو خبر نہیں ہوتی، جبکہ ہمارے طبقے میں تو ذرا سا خلاف معمول کچھ ہو جائے تو کھڑکیاں کھل جاتی ہیں، لوگ چونک چونک کر دیکھنے لگتے ہیں۔“

”صحیح ہے۔ بس یونہی جتنی سے اس کی حالت کا سن کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسے سمجھاؤں، تسلی دوں۔ اسے بتاؤں کہ زندگی بعض اوقات انسان سے بڑے بڑے امتحان بھی لیتی ہے۔ شاید یہ بھی اس کے لیے کوئی آزمائش تھی۔ میں پتا نہیں کیوں، کلنی فیل کر رہا تھا کہ میرے گھر سے نکلے ہوئے یہ حادثہ پیش آیا۔ سو۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ حادثہ کہیں بھی ہو سکتا تھا لیکن اتفاق۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا۔ بہر حال وہ ایک بولڈ لڑکی ہے جلد سنبھل جائے گی۔“

”جی سر! محض اتفاق تھا۔ شاید وہ لوگ بہت پہلے سے ہی کہیں ان کا تعاقب کر رہے تھے اور باہر منتظر تھے ان کے ادھر کا علاقہ یوں بھی سنسان ہی ہے۔“ مسرور نے خیال ظاہر کیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے آنکھیں موندتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر نکال لیا لیکن پھر ایک دم کچھ یاد کرتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے۔

”اے مسرور! یہ مانی نے کوئی فون وغیرہ تو نہیں کیا تھا۔ ایک تو اس لڑکے کے نہ آنے کا پتا چلتا ہے اور نہ جانے کا۔ اس روز کے بعد پھر مڑ کر آیا ہی نہیں تو میں سمجھا کہ حویلی واپس چلا گیا ہوگا مگر جتنی نے بتایا کہ

اس نے کل رات مال پر اسے دیکھا تھا۔ کتنا جی چاہتا ہے میرا کہ وہ یہاں لاہور آئے تو میرے پاس ٹھہرا کرے..... بڑی تقویت ہوتی ہے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے بھی کوئی اپنے ہیں۔“

”سرور اصل ان کی اپنی دلچسپیاں اور اپنی دوستیاں ہیں۔“ سرور کی آنکھوں کے سامنے اس کمرے کا منظر آگیا جہاں اس نے سلطان کو دیکھا تھا۔

”ہاں۔“ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے مانی کا حلقہ احباب بہت مختلف ہے۔ اس کے طور پر تھے اس کے انداز..... اس کی دلچسپیاں قابل فخر نہیں ہیں۔ یا تم سمجھایا کرو اسے تم سے بہت متاثر ہے وہ۔ خیال رکھا کرو اس کا۔ یہاں آئے تو ضد کر کے روک لیا کرو اپنے پاس۔“

”جی سر!“

تب ہی فون کی کھنٹی بج پڑی۔ سرور نے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھایا۔ یہ سیٹ چند دن قبل ہی انہوں نے سرور کے کمرے میں رکھوایا تھا۔

”دیکھا تم کہہ رہے تھے ضرورت نہیں ہے۔ اب کام آگیا نا، اٹھ کر باہر جانا پڑا۔“ سرور نے ہلکا سا سرخم کیا اور ماؤتھ پیس میں ”ہیلو“ کہا۔

دوسری طرف سلطان تھا ”کیسے ہو یا ز ابھی تک ناراض ہو۔ اب تو تمہاری آمنہ صغی مل گئی ہے نا اور اس نے اخبار میں بیان بھی دیا ہے کہ کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔“

”سوری یار میں نے تم پر شک کیا۔“ سرور شرمندہ ہو گیا ”دراصل.....“

”کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے میری جان دوست کہا ہے تمہیں چاہو تو گردن کاٹ کر رکھ دو اف نہیں کروں گا۔ ویسے تم نے اخبار میں پڑھا؟“

”نہیں۔“ سرور اور بھی شرمندہ ہو گیا تھا اس کی محبت پر۔

”اصل میں وہ لوگ کسی اور غوا کرنا چاہتے تھے۔ غلطی سے آمنہ کو کر لیا۔“

”ان کی غلطی نے ایک لڑکی کی زندگی کو کتنا پر خراب بنا دیا ہوگا یہ شاید انہوں نے والوں کو کبھی احساس نہ ہو۔“ سرور کے لہجے میں انفرادی در آئی۔

”ارے“ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو آمنہ صغی جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں نا آزاد بولڈ گھونٹنے پھرنے والی۔ یہ ایسی معمولی باتوں کی پروا نہیں کرتیں۔ تم سناؤ کب آؤ گے میرے گاؤں؟“

”نمائش کے بعد انشاء اللہ آؤں گا۔ سر بھی کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ چلوں تم کب جا رہے ہو؟“

”ابھی بس نکلنے والا تھا۔“

”پروفیسر صاحب سے ملنے نہیں آؤ گے؟“

”نہیں اس وقت جلدی ہے۔“

”پاس بیٹھے ہیں بات کرلو۔“

اس نے ریسور پر دوسرے عاقل کی طرف بڑھا دیا۔ بات کر کے انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہے تھے تم کس بات کا شک کیا تم نے مانی پر؟“

”سر!“ سرور شرمندہ ہو گیا۔

”کیا سوچیں گے سر کہ میں نے ان کے بھائی پر آمنہ صغی کے اغوا کا شک کیا۔“

اس نے نظریں جھکائے جھکائے ساری بات پر دوسرے عاقل کو بتادی۔

بے چینی سے دھوپ کے مرغوں کے چھوڑتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سرور نے دو تین بار سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر وہ یونہی الجھے الجھے سے بیٹھے رہے پھر ایک دم کھڑے ہو گئے۔

”چلو اٹھو یا زور ابھی ڈرائیو پر چلتے ہیں دل گھبرا رہا ہے۔“

سرور اٹھ کھڑا ہوا اور ہولے ہولے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اس سے بی آپا کا می اور ماں جی کی باتیں کرنے لگے۔

”بی آپا بہت یاد کر رہی تھیں کل فون پر۔ میری بات ہوئی تھی ان سے۔ تم بھی میرے ساتھ چلتا۔ بی آپا سے مل کر تمہیں خوشی ہوگی۔“

”مگر سر میں چاہ رہا تھا کہ پہلے کام ختم کر لوں تو پھر۔“

”ریلیکس ہو جاؤ گے۔ گاؤں کی فضاؤں میں شاید کچھ انسپائریشن بھی ہو۔“

”جی بہتر!“

”جتا ہے ماں جی بھی بہت محبت کرنے والی ہیں۔ جب بھی فون کرتا ہوں تمہارا ضرور پوچھتی ہیں۔“

”سر! سرور نے جھجکتے ہوئے پوچھا ”آپ نے اپنے والد صاحب کا کبھی ذکر نہیں کیا وہ.....“

”میرے والد.....!“ پروفیسر عاقل نے یکدم سرور کی طرف دیکھا۔ اسٹیئرنگ پر ان کی گرفت سخت ہو گئی ”میرے والد.....؟“ انہوں نے پھر دہرایا اور اچانک ہی ان کی نظر فٹ پاتھ پر جاتی آمنہ صغی پر پڑ گئی۔

”آمنہ صغی!“ ان کے لبوں سے نکلا اور سرور نے بھی چونک کر باہر دیکھا۔

وہ آمنہ صغی ہی تھی۔ سر جھکائے گردن پیش سے بے نیاز ہولے ہولے چلتی ہوئی۔ پروفیسر عاقل نے گاڑی بالکل اس کے قریب جا کر کھڑکی کی اور کھڑکی میں سے جھانکا۔

”کس آمنہ آئے آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

”آمنہ صغی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ لمحہ بھر کچھ سوچا اور پھر آہستگی سے سر ہلا دیا۔ سرور نے اگلی

اس میں ان کا کیا قصور تھا؟ یہ حادثہ تو کہیں بھی ہو سکتا تھا۔
 ”اگرچہ یہ محض اتفاق تھا کہ میرے گھر سے جاتے ہوئے یہ حادثہ آپ کے ساتھ ہوا..... پھر بھی مس آمنہ بی بیوی میں دل میں اس پر شرمندہ ہوں۔“
 ”ہوں۔“ اس کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ آکر معدوم ہو گئی۔
 ”مس آمنہ!“ اس کی اس طنزیہ کراہٹ نے پروفیسر عادل کو اور بھی الجھا دیا ”پلیز مس آمنہ میں آپ کی بات سمجھ نہیں رہا ہوں۔ آپ کھل کر بات کریں۔“

”کچھ نہیں۔ سوری عادل خان، میں شاید اپنے آپ میں نہیں ہوں۔“ آمنہ صغی باہر دیکھنے لگی۔
 ”آمنہ صغی میں اس ناکردہ جرم کا کفارہ کس طرح ادا کر سکتا ہوں۔“
 ان کے لہجے میں گداز تھا۔ آمنہ صغی کے لیے ہمدردی تھی، دکھ تھا۔ وہ سچ اس اوچے اونچے تہقے لگانے والی لڑکی کے لیے دل گرفتہ ہو رہے تھے جو پہلے والی آمنہ صغی سے قطعی مختلف لگ رہی تھی۔
 ”کفارہ؟“ آمنہ صغی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا ”کیا آپ واقعی کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”کوشش تو کر سکتا ہوں خاتون!“ وہ نرمی سے مسکرائے۔
 ”تو آپ مجھ سے شادی کر لیں۔“

اسٹیرنگ پر رکھے ان کے ہاتھ لٹکے بھر کو کانپ گئے۔ انہیں لگا، جیسے کسی نے ان کے کانوں کے قریب دھماکا کر دیا ہو۔ انہوں نے بے حد حیران ہو کر آمنہ صغی کی طرف دیکھا۔
 یہ بھلا کیسے ممکن ہے..... اور یہ آمنہ صغی کیا کہہ رہی ہے۔ کہیں ان کے کانوں نے غلط تو نہیں سنا۔ انہوں نے تصدیق کے لیے آمنہ صغی کی طرف دیکھا جو بات کر کے بے نیازی بنی ویڈ اسکرین پر جانے لگا دیکھ رہی تھیں۔

اور یہ کفارہ..... اور اس سارے حادثے میں وہ بھلا کہاں فٹ ہوتے ہیں..... اور اس میں ان کی غلطی کیا ہے؟

انہوں نے بے حد الجھ کر پیچھے دیکھا۔ جیسے وہ مسرور سے مدد چاہتے ہوں اور جیسے مسرور انہیں اس الجھن سے باہر نکال لے گا لیکن مسرور آنکھیں بند کیے ان دونوں کی گفتگو سے انجان جانے کس سوچ میں غرق تھا۔ وہ مایوس ہو کر پھر سامنے دیکھنے لگے۔ آمنہ صغی اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ غیر ارادی طور پر ہی ایک میٹر پر ان کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔ آمنہ صغی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پیشانی پر بے شمار شکنیں لیے ہونٹ پیچھے وہ گہری سوچ میں تھے۔

یہ آمنہ صغی نے کیوں کہا؟
 کیوں اتنی بڑی بات کر دی؟

نشست اس کے لیے خالی کر دی۔ آمنہ نے ایک نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کھلے اور پھر بند ہو گئے۔ شاید اس نے شکریہ کہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور آنکھوں کے گرد موجود حلقے پہلے سے گہرے ہو گئے تھے۔
 ”اس وقت کہاں سے آ رہی ہیں اور کہاں جائیں گی؟“ پروفیسر عادل نے گیسر لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”اخبار کے دفتر گئی تھی مزید چھٹی کے لیے درخواست دینے اور اب گھر جا رہی ہوں۔“
 ”کیسی ہیں آپ؟“ پروفیسر عادل نے نظر اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔
 ”اچھی ہوں۔“ وہ ویڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہی تھی۔
 ”مس آمنہ.....“

”پلیز!“ آمنہ صغی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ جیسے وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہے ہیں ”اس حادثے کے متعلق کچھ مت کہیے گا۔ سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ کاش! کاش میں اس روز آپ کے گھر نہ آتی، پروفیسر عادل خان۔ مجھے آپ کے گھر آنا بہت مہنگا پڑا..... بہت مہنگا۔“
 ”خاتون! میں خود بہت شرمندہ ہوں۔“ پروفیسر عادل نے شائستگی سے کہا۔

”کیا آپ کی شرمندگی اس داغ کو دھو سکتی ہے جو میرے وجود کو لگ گیا ہے۔ میں آمنہ صغی جو مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی تھی، کیا اب کسی سے نظریں ملا سکو گی۔ میں جس کا قلم کسی سے خوف نہیں کھاتا تھا، کیا اب اتنی روانی سے لکھ سکوں گی؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”پروفیسر عادل، میرے جیسے متوسط طبقے کی لڑکی، جس پر پہلے ہی بغاوت کا الزام لگ چکا ہو اور جس کا منگیتر اسے یہ کہہ کر ٹھکرا چکا ہو کہ کام کرنے والی لڑکی کی شرافت مشکوک ہوتی ہے اس حادثے کے بعد اس کی معاشرے میں کیا پوزیشن ہو سکتی ہے؟“

”مس آمنہ زندگی میں بعض اوقات ایسے حادثات اچانک رونما ہوتے ہیں اور میں مانتا ہوں کہ یہ حادثات بہت دور تک اپنا اثر چھوڑتے ہیں پھر بھی کہوں گا پلیز..... بی بریو BE BRAVE لوگ آہستہ آہستہ بھول جائیں گے سب کچھ۔“

”لوگ بھول جائیں گے سب کچھ..... لیکن میں..... کیا میں بھول جاؤں گی۔“ آمنہ صغی کے چہرے کی وحشت بڑھ گئی تھی۔

”کیا میں بھول جاؤں گی کہ میں نے ایک اچھے انسان سے ملنے کے شوق میں اس سے کچھ حاصل کرنے کے شوق میں کیا کر لیا اپنے ساتھ۔ کاش! کاش میں آپ کے گھر نہ آتی عادل خان۔“
 گاڑی شفاف سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پروفیسر عادل نے کسی قدر الجھ کر آمنہ صغی کی طرف دیکھا۔ آخر

میں مجھے ڈال دیا ہے، میرے انتخاب کی کوئی وجہ تو ہوگی آپ کے پاس کوئی جواز.....“ ان کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا اور بکھرا بکھرا سا تھا، جیسے کوئی اپنی ساری پونجی بار بیٹھا تھا۔
آمنہ صغی خاموش بیٹھی جیسے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہی تھی۔

”آمنہ صغی۔ میں ایک COMMITED شخص ہوں اور.....“ انہوں نے جیسے اندر کے کسی دکھ بے گھبرا کر بات نامکمل چھوڑ کر سر سیٹ کی پشت سے ٹیک لیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بے چینی سے ملنے لگے۔

آمنہ نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی اور اپنا لایاں ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا۔
”بے شمار لوگوں کا کہنا ہے کہ پروفیسر عادل ازائے گریٹ مین۔ لیکن عادل بڑا مشہور ہونے میں اور سچ بڑا ہونے میں بہت فرق ہے۔“

پروفیسر عادل چونک کر سیدھے ہو گئے۔ اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔
”آمنہ صغی!“ پروفیسر عادل کے لب کھلے اور بند ہو گئے۔ وہ اسے بلانا چاہتے تھے اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ ابھی ابھی کیا کہہ گئی ہے۔

اس نے ان کو خود ہی اس امتحان کے لیے منتخب کیا تھا اور پھر خود ہی انہیں پرچہ حل کرنے کا موقع دیے بغیر نتائج بنا کر جاری ہی تھی۔ کیسی عجیب عورت ہے یہ آمنہ صغی۔ لحوں میں ان کے اندر بھونچال اٹھا کر خود اطمینان سے چل دی۔

”سر یہ آمنہ صغی راستے میں ہی اتر گئیں؟“ سرور نے جو آمنہ صغی کے اترنے سے اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آگیا تھا، پوچھا لیکن پروفیسر عادل نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔



رائف اسپتال کے گیٹ پر کھڑی مریم کو دیکھ کر ڈاکٹر شہباز راکر گئے۔ وہ کچھ پریشان سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”آپ یہاں! خیریت ہے نامس مریم۔ کہیں آپ کی سہیلی نے پھر کوئی جھڑپ تو نہیں کر دی۔“
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اس کی پرشوق نظریں مریم کے چہرے پر جمیں۔
”ہاں۔ نہیں تو وہ میرے پاپا.....“ مریم نے چونک کر شہباز کی طرف دیکھا۔
”کیا ہوا آپ کے پاپا کو؟“ شہباز سنجیدہ ہو گیا۔

”وہ..... ان کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے۔“ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں ضبط کرنے کی کوشش میں وہ بار بار پلکیں جھپک رہی تھی ”وہ آئی سی یو میں ہیں۔“ اس کی آواز بھر گئی۔
”کون ہے آپ کے ساتھ۔“

کیوں ڈال دیا انہیں اتنے بڑے امتحان میں۔

اور کیا وہ اس امتحان میں سرخ رو ہو سکیں گے؟

اور..... اس امتحان کا کوئی جواز تو ہوگا، کوئی وجہ تو ہوگی آمنہ صغی کے پاس..... ورنہ میں جو آج سے چند دن پہلے تک آمنہ صغی کو ٹھیک طرح سے جانتا تک نہ تھا بس نام سن رکھا تھا صرف وہ مجھے کیوں ڈالتیں اس امتحان میں۔ کوئی ریزن ضرور ہوگا اور اگر وہ ریزن اتنا مضبوط ہوا کہ وہ.....

ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔

یہ آمنہ صغی..... جس نے بڑی بے باکی سے اپنی خواہش بیان کر دی اور..... اور وہ حریم عبدالرحمن۔

ان کی چچا کی بیٹی جو کچھ نہیں کہتی تھی۔

لیکن جس کی آنکھیں بولی تھیں۔

جو کوئی شکوہ نہیں کرتی تھی لیکن اس کا پورا وجود شکوہ لگتا تھا۔

سر تا پاشکایت۔

وہ دلکش سی حریم جس کے لیے بڑی آپا اور ماں جی کے کہنے کے باوجود وہ اپنے دل کے دروازے وا نہیں کر پارہے تھے حالانکہ کتنی بار انہوں نے پورے غلوں سے اس کے لیے سوچا تھا لیکن ہر بار ان کا دل ان کے لیے رکاوٹ بن جاتا۔

مچلنے لگتا۔

خند کرنے لگتا۔

پتا نہیں کیا چاہتا تھا وہ؟

کہاں قیام کرتا تھا اسے۔

اور کہاں ٹھہرتا تھا؟

کون سی آس تھی جو انہیں اب تک کوئی بندھن باندھنے سے روکے ہوئی تھی۔

تو کیا اس ساری جدوجہد ساری تک و دو اور انتظار کا حاصل یہ تھا۔

ایک ناکردہ جرم کی سزا۔

ایک ان جاہا امتحان۔

ایک دم ہی جیسے صدیوں کی تحن ان کی رگوں میں اتر آئی۔ انہیں لگا جیسے وہ اب تک جس ٹھنڈے مٹھے پانی کے چشمے کی طلب میں بھاگ رہے تھے وہ تو ایک سراب تھا۔ ان کا حلق پیاس سے خشک ہونے لگا۔ انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک گہرا السبائلس لیا اور ایک دم بریک لگائے۔

”آمنہ صغی!“ انہوں نے اپنی سکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں ”آپ نے یہ جس امتحان

”انکل ہادی لائے ہیں انہیں ڈاکٹر عاصم ہادی۔ عاصم کلینک والے۔“

”اچھا اچھا۔ لیکن آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ اندر ہسپتال میں آکر بیٹھیں۔“

”وہ..... وہ دراصل میں ماما کو دیکھنے آئی تھی۔ وہ گھر پر نہیں تھیں۔ بعد میں..... ان کے جانے کے بعد

پاپا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“

”آپ پلیز اندر چلیں یہاں کھڑا ہونا اچھا نہیں لگ رہا۔ کم آن آپ کی ماما آجائیں گی، ڈور

وری۔ پاپا ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ.....“ شہر یار نے اسے تسلی دی اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ کوریڈور میں ہی اسے ڈاکٹر ہادی مل گئے۔

”پاپا کیسے ہیں؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”ٹریٹمنٹ دیا جا رہا ہے تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”باہر گئی تھی۔ ماما کو دیکھنے۔ صفیہ اور شریف سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ماما کو بتادیں۔ یہاں کا۔“

”سر السلام علیکم۔“ شہر یار جو ایک طرف خاموش کھڑا تھا اس نے ڈاکٹر ہادی کو سلام کیا تو وہ اس کی

طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارے شہر یار بیٹا، کیسے ہو؟“

”فائن سر!“

”تم یہاں کیسے تمہیں تو ہائز ایجوکیشن کے لیے باہر نہیں جانا تھا کیا.....؟“

”ہاں، لیکن بابا کی مرضی نہیں تھی اور بابا کو ناخوش نہیں کر سکتا سو یہاں جوائن کر لیا۔“

”یہ ڈاکٹر شہر یار ہیں میرے اچھے اسٹوڈنٹ رہے ہیں۔“ انہوں نے تعارف کرایا ”اور یہ مریم ہے

میرے بہت عزیز دوست کی بیٹی ہے۔“

”ان سے تعارف ہے پہلے سے۔“

”ارے کیسے؟“ ڈاکٹر ہادی کو حیرت ہوئی۔

”محض اتفاق.....!“ وہ مسکرایا اور اس نے کن آنکھوں سے مریم کی طرف دیکھا جو اس کی طرف سے

بے نیازی کھڑی پریشانی کے عالم میں نچلے ہونٹ کا کونا چبانے جا رہی تھی۔

”چند دن قبل یہاں میڈم ہرگس کی بیٹی ایڈمٹ تھیں جو غالباً ان کی سہیلی ہیں۔“

”ہوں.....“ ڈاکٹر ہادی نے سر ہلایا اور مریم کی طرف دیکھا ”بیٹی تم بالکل پریشان نہیں ہونا۔ تمہارے پاپا کو معمولی سا ایک ہوا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم ادھر بیٹھ جاؤ میں ذرا

دیکھتا ہوں۔“

مریم پیچھے ہٹ کر ایک بیچ پر بیٹھ گئی۔

شہر یار نے ڈاکٹر ہادی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے غیر ارادی طور پر مرکز کر ایک نظر اسے دیکھا۔

یہ لڑکی

پچھلے کئی دنوں سے وہ اس کے متعلق ارادی اور غیر ارادی طور پر سوچے چلا جا رہا تھا۔

کتنی معصومیت ہے اس کے چہرے پر اور کتنی دلکشی اور جاذبیت ہے۔ عجیب طرح کی کشش ہے۔

دل خود بخود اس کی طرف کھینچتا ہے۔

جب پہلی بار اس نے اسے لالہ کے کمرے میں دیکھا تھا۔ تو دل ہی دل میں سراہا تھا۔ معصومیت اور

دلکشی کا ایسا امتزاج بہت کم لڑکیوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔

اور پھر اس کی آنکھیں۔

کتنی بے تحاشا خوب صورت تھیں۔

ایک دم سیاہ چمکتی ہوئی سی۔

اور ٹکلیں اتنی کھنٹی اتنی لمبی پہلی نظر غیر ارادی تھی۔

دوسری بار اس نے اراداً اسے دیکھا تھا اور لمحہ بھر دیکھتا رہا تھا اور پھر گھر جا کر بھی یہ چہرہ کتنی ہی دیر

تک اس کے تصور میں رہا۔

اور جب کچھ دنوں تک اس کا خیال اس کے ذہن سے نکل گیا تو اس نے اسے میڈم ہرگس کی پارٹی

میں دیکھا اور وہ اسے وہاں موجود تمام لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت لگی اور وہیں لمحہ بھر کے لیے اسے خیال

آیا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوا اگر یہ..... یہ لڑکی زندگی کے سفر میں اس کی ہم سفر بن جائے۔

اور پھر خود ہی اپنے اس خیال پر اسے ہنسی آ گئی تھی۔

کمال ہے شہر یار خان!

ایک لڑکی جسے صرف دو بار دیکھا ہے تم نے اس کی ہم سفری کے خواب دیکھنے لگے ہو۔

پتا نہیں کون ہے؟

کیا خبر لگتی ہو۔

کیا خبر کہیں انٹر سٹڈ ہو اور پتا نہیں پھر کبھی اسے دیکھوں بھی یا نہیں۔

اپنا اس ایجوکسوج پر اسے بڑی حیرت ہوئی تھی۔

اور آج پھر وہ اس کے سامنے تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھے اس سے بات

کرے۔ وہ اتنی پریشان ہے اسے تسلی دے لیکن ڈاکٹر ہادی کی وجہ سے وہ رک رہا..... اس کی کتنی ہی کلاس

فلوڑ تھیں۔

جو خوب صورت بھی تھیں ذہین بھی۔

لیکن اس سے پہلے کبھی اس نے کسی کے متعلق اس طرح نہیں سوچا تھا۔

کیا یہ کوئی اور جذبہ ہے؟

پہلی ہی نظر میں کسی کو پسند کر لینے کا جذبہ۔

آئی سی یو کی طرف مڑتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا لیکن مریم کے قریب کوئی اور نہ تھا۔
آکر بیٹھ گئی تھیں لہذا وہ اسے نظر نہ آسکی تو وہ ڈاکٹر ہادی کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے معید کے جانے کا بتا رہے تھے۔

مریم سر جھکائے پریشان سی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ لیتی تھی۔ ماما ابھی تک نہ آئی تھیں۔ شاید وہ ڈاکٹر معید کو سی آف کر کے کہیں اور چلی گئی ہوں گی۔

میڈم نرس یا مسز آفندی کی طرف۔

یا پھر کہیں اور

مجھے چاہیے تھا آئی سی یو نرس کو فون کر دیتی۔

ماما نہ آتیں تو وہ خود آ جاتیں۔

یہ خوبی تو تھی ان میں۔ سننے ہی بھاگی چلی آتیں۔ مسز آفندی کے میاں بیمار ہوئے تھے تو مسز آفندی ایران میں تھیں۔ اسپتال میں باقاعدہ ڈیوٹی دی تھی انہوں نے۔ پاپا آئی سی یو میں ہیں اور پتا نہیں..... پتا نہیں.....
اس نے بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بہ مشکل روکا۔

عاشی، نینا اور مورمری میں ہیں۔

اور وہ تینوں بھی اس کی طرح پاپا کو کتنا چاہتے ہیں۔

اور کتنا پریشان ہوں گے وہ جب انہیں پتا چلے گا کہ پاپا اتنے بیمار ہیں۔

اس نے پھر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور اس کی نظر اچانک ماما پر پڑی۔ وہ ادھر ہی آرہی تھیں۔

”ماما!“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی اور ان کے قریب آتے ہی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

”مومو!“ انہوں نے آہستگی سے اسے لگ کرتے ہوئے گھورا ”یہ کیا حماقت ہے“ لوگ کیا کہیں گے؟“

”ماما..... وہ..... وہ پاپا.....“

”کہاں ہیں؟“ انہوں نے بدستور سخت لہجے میں پوچھا۔

”آئی سی یو میں ہارٹ ایک ہے۔“

”ہوں۔“ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر سامنے سے ڈاکٹر ہادی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہیں رک گئیں جنہوں نے انہیں دیکھ لیا تھا اور دور سے ہی ہاتھ کا اشارہ کر کے جیسے تسلی دی تھی۔ مریم

سے نہ تو ابھی تک بہہ رہے تھے اور وہ ہلکے ہلکے سسکیاں لے رہی تھی۔

”مومو صاف کرو اپنا چہرہ۔ مجھے تمہاری یہ جذباتیت بالکل پسند نہیں ہے۔ کیا کبھی کوئی بیمار نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ہو جائیں گے تمہارے پاپا۔“

”ماما!“ مریم نے ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

بابا ذرا بھی پریشان نہیں لگ رہی تھیں اور پاپا..... ماما کی ذرا سی بیماری پر کتنے پریشان ہو جایا کرتے

تھے۔ بار بار ڈاکٹر ہادی کو فون کرتے۔ ان کے آرام کی خاطر اسٹڈی میں چلے جاتے لیکن تھوڑی تھوڑی دیر

بعد جا کر انہیں دیکھا کرتے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رات بھر سوتے ہی نہ ہوں۔

”کیا ماما کو پاپا سے محبت نہیں ہے ذرا بھی؟“

اس نے بے نیکی پن سے سوچا۔

”اوہ مسز عثمان، شکر ہے آپ آگئیں۔“ ڈاکٹر ہادی ان کے قریب آگئے ”مومو بہت پریشان ہو رہی تھی۔“

”عثمان کو کیا ہوا؟ میں تو اچھا بھلا چھوڑ کر گئی تھی۔“

”جھوٹ!“ مریم نے دل ہی دل میں سوچا پاپا کی طبیعت تو اس وقت بھی خراب ہو رہی تھی بلکہ

انہوں نے روکا بھی تھا لیکن ماما کتنی صفائی سے جھوٹ بول رہی ہیں۔ اس وقت اسے ماما بالکل اچھی نہیں

لگ رہی تھیں۔

”شاید اچانک درد ہوا لیکن ٹھیک گاڈ کہ وہ خطرے سے باہر ہیں۔ کچھ دیر تک انہیں روم میں لے

آتے ہیں۔ ہارٹ ایک میں بیڈ ریست اور احتیاط بہت ضروری ہے۔ فی الحال تو کچھ دن اسپتال میں ہی

رہیں گے۔“

”میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟“

”بالکل..... بلکہ ابھی انہیں کمرے میں لا رہے ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر رافع بہت

اچھے ڈاکٹر ہیں۔ میں ڈاکٹر رافع کی وجہ سے تو عثمان صاحب کو ادھر لایا ہوں ورنہ اپنے اسپتال میں مجھے

زیادہ بھولت تھی۔“

”جی ڈاکٹر ہادی جیسا آپ نے بہتر سمجھا۔“ زینب عثمان سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔

”اچھا اب چلتا ہوں مسز عثمان۔ ڈاکٹر شہریار یہاں ہیں۔ انہیں میں نے سمجھا دیا ہے۔ کوئی پرالیم ہو تو

ان سے کہیے گا۔ میں چکر لگانا رہوں گا۔ غالباً روم نمبر ۱۱ میں انہیں منتقل کیا جائے گا۔ آپ شہریار سے کنفرم

کر لیجیے گا۔“

مسز عثمان نے سر ہلادیا۔

”اور مریم بیٹی اپنے پاپا کا خیال رکھنا۔“

وہ مسکرائے۔

”بہت چھوٹا دل ہے ہماری بیٹی کا، مسز عثمان۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا اور کی آنکھیں پھر گیلی ہونے لگیں۔

”میرے پاپا ٹھیک تو ہو جائیں گے؟“ اس نے پھٹکی آواز میں پوچھا۔

”انشاء اللہ۔ تم دعا کرنا تو جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

وہ مسز عثمان سے اجازت لے کر چلے گئے تو مریم نے کہا۔

”ماما، عاشی، نینا اور مور کو فون کر کے بتا دیں نانا پاپا کا۔“

”کیوں؟“ انہوں نے تیوری چڑھائی۔ ”انہیں بھلا ڈسٹرب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بچے بہت احقر لڑکی ہو مومو۔“ اسے سمجھ کر کے اور اسے وہیں کھڑا رہنے کا کہہ کر وہ آئی سی یو کی طرف چلی گئیں اور مریم ایک بار پھر کوریڈور میں اکیلی رہ گئی۔



”پاپا پلیز یہ تھوڑا سا سوپ لے لیں۔“ مریم نے آہستگی سے ان کا ہاتھ چھوا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرائے۔ ”بچے سے ٹیک لگائے وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر فقاہت تھی۔ اگرچہ انہیں آج اسپتال میں داخل ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو تھا لیکن پھر بھی ابھی تک وہ بہت بہتر محسوس نہیں کر رہے تھے۔ زمین پر پاؤں رکھتے تو ٹانگیں کانچتی تھیں۔

”یہ اتنی کمزوری کیوں ہے ڈاکٹر؟“ انہوں نے دو تین بار ڈاکٹر رافع سے پوچھا تھا۔

”ہو جاتی ہے، ٹیکس، عثمان صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ انہوں نے تسلی دی تھی۔

”پاپا۔“ مریم نے بھی مسکرا کر انہیں دیکھا ”میں نے آج خود آپ کے لیے سوپ بنایا ہے۔ بہت اچھا ہے۔“

”آپ چکھ کر تو دیکھیں۔“

”ہماری بیٹی نے بنایا ہے تو ہم ضرور چیکس گے۔“ انہوں نے سوپ اس کے ہاتھوں سے لے

لیا۔۔۔۔۔ ”آج کالج گئی تھیں بیٹی؟“

”جی پاپا۔“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”جانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن ماما کے ڈر سے

چلی گئی۔ میری فریڈ زبھی آپ کا پوچھ رہی تھیں۔ عینی کہہ رہی تھی کہ وہ آپ کو دیکھنے آئے گی ادھر اس

کے بھائی بھی ادھر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شہر یار۔۔۔۔۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ ڈاکٹر شہر یار اس کے بھائی ہیں۔“

تو میں نے آج اسے بتایا کہ پاپا رافع اسپتال میں ہیں تو تب اس نے بتایا۔“

”اچھا تو ڈاکٹر شہر یار تمہاری فریڈ کے بھائی ہیں۔“ عثمان احمد نے اس کی باتوں کو دلچسپی سے سنا

اور سوپ کا پل لیا۔

”جی پاپا۔ کیا وہ راولپنڈی پر آئے تھے؟“

”ہوں۔“ صبح تو چکر لگا گئے تھے۔ اب شاید وہ آئیں یا کوئی اور۔“

”وہ آئیں تو میں ان کو عینی کے متعلق بتاؤں گی۔“

”ضرور بتانا بھی۔ شاید وہ اپنی وزٹ فیس چھوڑ دیں۔“ عثمان احمد مسکرائے۔

”نہیں پاپا۔ میں اس لیے تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

عثمان احمد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”مومو بیٹا، کالج باقاعدگی سے جایا کرو۔ اب چھٹی نہیں کرنا۔ میں تو اب بالکل اچھا ہوں۔“

”لیکن پاپا، آپ گھر کب آئیں گے۔“

”ایک دو روز میں انشاء اللہ۔“

سوپ کے ہلکے ہلکے پلے پلے لیتے ہوئے وہ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتے رہے۔ وہ محبت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اور یہ مومو کتنی لوگ اور کتنی کیرنگ ہے۔ کتنا خیال رکھا ہے اس نے میرا زبنی سے بھی زیادہ۔ اپنی

ماں سے بہت مختلف، حساس اور سمجھ دار۔ پتا نہیں نینا اور عاشی بھی ایسی ہی ہوں گی یا پھر اپنی ماں جیسی۔ ان

چند دنوں میں انہیں احساس ہوا تھا کہ شاید وہ مومو سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ نینا، عاشی اور

مور سے بھی زیادہ۔

اور وہ جو کبھی کبھی اس سے خفا ہوتے تھے تو اس کی وجہ غالباً زنب تھی۔

اس کی ناراضگیاں اور خفگی تھی۔

اس کے ڈر اور خوف تھے کہ وہ اپنی اولاد تک سے دور ہو گئے تھے۔ خاص طور پر مریم سے۔

حالانکہ جب مریم پیدا ہوئی تھی تو وہ کتنے خوش ہوئے تھے۔ کسی گڑبائی لگتی تھی انہیں۔ خود وہ دو بھائی

تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ کتنی خواہش تھی ان کی کہ ان کی کوئی بہن ہوتی۔

ان کی والدہ کی بھی بڑی خواہش تھی لیکن خدا نے انہیں بہن نہیں دی تھی اور اب مریم آئی تھی تو وہ بہت

خوش تھے۔ بے حد۔ زنب کو حیرت ہوتی تھی جب وہ اسے گود میں اٹھاتے تھے۔ پیار کرتے۔

”عثمان تم بہت پیار کرتے ہو مریم سے۔“

”ہاں۔ اپنی بیٹی سے کون پیار نہیں کرتا۔“

لیکن پھر زبنی کی بیماری نے انہیں مریم سے دور کر دیا تھا اور وہ بھی زنب کی طرح کھینچے لگے تھے کہ مریم

ہی زنب کی بیماری کا سبب ہے حالانکہ مریم تو اتنی پیاری اتنی بے ضرر تھی اور کتنا چاہتی تھی وہ زبنی کو اور انہیں۔

”پاپا، آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“ مریم نے ان کے ہاتھ سے سوپ کا خالی پیالہ لے کر میز پر رکھا۔

”کچھ نہیں بیٹا۔ تمہاری ماما نہیں آئیں تمہارے ساتھ؟“

وہ تو عثمان احمد کے سامنے نظریں جھکائے رکھتی تھیں۔
وہ گھر آتے تو بچہ بچہ جاتیں۔

پڑھ رہے ہوتے تو یوں دبے پاؤں چلتیں جیسے ان کی چاب بھی عثمان احمد کو سٹرب کر دے گی۔
ہر وقت ان کے آرام کے لیے کوشاں رہتیں۔
لیکن عثمان کے خالی دل میں یوں ہی سناٹے رہتے۔
زیتون بانو کا کوئی رنگ بھی ان کی آنکھوں میں نہ کھینا۔

باباجان حیران ہو کر سوچتے تھے کہ انہوں نے تو عثمان احمد کی خاموشی اور اداسی کا علاج ڈھونڈا تھا لیکن
عثمان احمد پہلے سے زیادہ خاموش اور چپ چاپ رہنے لگے تھے۔

”کیا بات ہے پتر اتنے چپ کیوں رہنے لگے ہو؟“ ایک روز انہوں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بابا، بس بوریت ہو گئی ہے۔ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ایکیش ہونے والے ہیں۔ اس بار تم کھڑے ہو جاؤ۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”نہیں باباجان، مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی مثبت کام۔“

”تو ایسا کرو کوئی انڈسٹری وغیرہ لگا لو۔“

”جی باباجان، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ عثمان احمد خوش ہو گئے۔

”مصرفیت ہو جائے گی تو۔۔۔۔۔“

شاید اس طرح نذیب کا نیل دل سے نکل جائے۔ شاید یہ دل میں مجھد ہو جانے والی اداسیاں
ختم ہو جائیں اور شاید وہ رنگ جو پچھلے پڑ گئے ہیں ایک بار پھر کھر۔ دو بائیں اور باباجان کے ایک
دوست سے جو خود بھی ایک بہت بڑے صنعت کار تھے مشورہ کر کے وہ اس سلسلے میں مصروف ہو گئے اور
ان ہی دنوں وہ ایک بیٹے کے باپ بھی بن گئے۔ اور بیٹے کو گود میں لے کر لہو بھر کے لیے انہیں یوں لگا
تھا کہ دل میں ایک برف سی جی جی تھی اس میں حرارت سی پیدا ہوئی ہو۔ ان دنوں زیادہ تر لاہور یا ممبئی میں
رہتے تھے۔ حویلی بہت کم جا پاتے تھے۔ باباجان کے دوست کے مشورے سے انہوں نے ممبئی ٹیکسٹائل
مل کے لیے زمین وغیرہ خرید لی تھی اور اس سلسلے میں بہت مصروف ہو گئے تھے۔ لون وغیرہ کے لیے اسلام
آباد کے چکر بھی لگا رہے تھے لیکن جب بھی فرصت ملتی، بیٹے کا خیال دل میں چٹکی لیتا تو وقت نکال کر وہ
حویلی ضرور آ جاتے۔ اسے گود میں لے کر پیار کرتے تو جیسے دل میں جی اداسیاں کھیلنے لگتی تھیں۔

اور وہاں ہی ایک روز جب وہ ایک دوست سے ملنے نوجری گئے تو انہوں نے نذیب کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے
اسی ڈاکٹر کزن کے ساتھ ایک اسٹور سے نکل رہی تھی۔ وہ وہیں ٹھک کر کرک گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ

”آئی تھیں لیکن وہ باہر کوریڈور میں ایک صاحب مل گئے تھے ان سے بات کرنے لگی تھیں۔“
”اچھا۔۔۔۔۔“ انہوں نے آنکھیں موندتے ہوئے نیچے سے ٹیک لگالی۔

کتنا ہے تماشا جا ہا تھا انہوں نے نذیب کو۔ کتنی محبتیں دی تھیں اسے اور نذیب شاید۔۔۔۔۔ اسے محبتیں کرنا
آتا ہی نہیں تھا۔ نہ محبتیں کرنا نہ محبتوں کا سپنوس دینا۔ جو اس نے چاہا انہوں نے وہی کیا۔ اپنی شخصیت
مسخ ہو کر رہ گئی تھی ان کی اور نذیب عثمان۔۔۔۔۔ نذیب عثمان کے دل میں کیا تھا۔۔۔۔۔ کون جانے۔۔۔۔۔
جب برسوں پہلے یونیورسٹی میں انہیں پتا چلا تھا کہ وہ انگریز ہے تو کتنے بہت سارے دن انہوں نے
ہاسٹل کے کمرے میں خاموش لیٹ کر گزار دیے تھے جیسے ایک دم زندگی کا مقصد ختم ہو گیا ہو اور جیسے جیٹا
اب بے معنی ہو۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے گرد سارے رنگ مر گئے ہوں۔

اور ساری روشنیاں بجھ گئی ہوں۔

نہ محبتوں کا اظہار کیا تھا نہ دل کھول کر اس کے سامنے رکھا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ابرار حسن زبردستی
انہیں ہاسٹل سے باہر لائے تھے۔

”یہ قنوطیت ہے بھائی۔ زندگی میں ایسے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں اور پھر کون سا تم اس کے شوق
میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بس وہ تمہیں اچھی ہی تو لگی تھی اور خوبصورت چہرے کسے اچھے نہیں لگتے۔ بارہا
اپنی یونیورسٹی میں ایک سے ایک قاتل ادا موجود ہے۔ تم ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو تو سہی۔“

لیکن پھر کوئی چہرہ عثمان احمد کی نظر میں بچا ہی نہیں۔

کوئی لڑکی انہیں نذیب سجاد کے ہم پلہ دکھائی نہیں دی۔

کسی لڑکی نے در دل پر دستک نہ دی۔

حتیٰ کہ انہوں نے باباجان کے کہنے پر زیتون بانو کو زندگی کا ساتھی بنا لیا لیکن کبھی غور سے انہیں دیکھا
ہی نہیں۔۔۔۔۔ نہ ان کی خدمتیں نہ ان کی محبتیں۔

کوئی بھی چیز دل کے اندر بچھ جانے والے چراغوں کو روشن نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ غور سے دیکھنے تو
زیتون بانو بھی خوبصورتی میں نذیب سجاد سے کچھ کم نہ تھیں۔

ہاں ان کے پاس وہ انداز نہیں تھے۔

وہ ادائیں نہیں تھیں۔

وہ خود آگئی نہیں تھی۔

جو حسن کو جلا بخشی ہے۔

حسن خود آگاہ نہ ہو تو سنی میں لے ہوئے ہیرے کی طرح ہوتا ہے۔ جس پر کم ہی نگاہ ٹھہرتی ہے۔

زیتون بانو کے حسن میں بھی آگاہی نہ تھی۔

خوبصورت اور دلکش ہو گئی تھی۔ وہ وہیں ایک طرف کھڑے ابے دیکھتے رہے تھے اور وہ نہ جانے کس بات پر بے تحاشا ہنستی ہوئی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو انہیں ایسا لگا جیسے ان کے دل میں لمحہ بھر کے لیے جو زندگی سی ابھری تھی پھر مر گئی ہو۔ خالی خالی دل لیے وہ وہاں سے واپس آ گئے۔

لیکن انہیں یقین ہو گیا کہ نذیب سجاد کبھی ان کے دل سے نہیں نکل سکتی اور یہ کہ شاید وہ زندگی میں کبھی اس کے بغیر خوش نہیں ہو پائیں گے اور شاید کبھی زندگی میں زیتون بانو کو وہ جگہ نہیں دے سکیں گے جو نذیب سجاد کو انہوں نے دی تھی۔

حالانکہ زیتون بانو ان کے بیٹے کی ماں تھیں اور بیٹا خود بخود ہی انہیں عزیز ہو گیا تھا۔ بہت پیارا لگتا تھا وہ انہیں۔ حوصلی میں آتے تو زیادہ وقت اس کے ساتھ ہی گزارتے لیکن بیٹے کی محبت بھی انہیں زیتون بانو کی طرف مائل نہ کر سکتی تھی۔ وہ ہر سال نہ جانے کس موقع میں امریکا جاتے لیکن پھر کبھی نذیب سجاد انہیں نظر نہ آئیں۔ زیتون بانو کو کبھی محسوس نہیں ہو سکا کہ عثمان احمد کے دل میں کوئی اور ہے۔ وہ ان کی خاموشی اور پیچیدگی کو ان کی عادت سمجھتی تھی لیکن ٹھیک سات سال بعد امریکا میں مجتبیٰ حیدر کے فلیٹ میں وہ انہیں مل گئی۔ بالکل ویسے ہی فریش اور دلکش۔

جیسے درمیان میں اتنے بہت سارے سال بیٹے ہی نہ تھے۔

جیسے وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے نکل کر آئی تھی۔

”نذیب سجاد کیسی ہیں آپ؟“ بے اختیار وہ ایک قدم آگے بڑھ آئے تھے اور ان کی آنکھوں میں روشنیاں سی کووندنے لگی تھیں۔

”آپ.....“ نذیب سجاد نے انگلی سے ان کی طرف اشارہ کیا ”عثمان احمد ہیں نا؟“

”آپ نے پہچان لیا نذیب۔“ انہیں بے حد حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔“ وہ مسکرائی تھی اور اس کی مسکراہٹ نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔

”آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے پوچھا۔

”ہم یونیورسٹی فیلو تھے۔“ نذیب عثمان نے بتایا۔

”چلو میں تعارف کی زحمت سے بچ گیا۔“ مجتبیٰ حیدر نے یوں ہاتھ جھاڑے جیسے تعارف کرانا ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔ جس سے وہ بچ گئے ہوں۔

مجتبیٰ حیدر ایک نوجوان کہانی کا رتھے جوانی بے حد رومینک کہانیوں کی وجہ سے نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہو رہے تھے اور چار سال قبل لاہور میں ابراہن حسن نے عثمان احمد سے ان کا تعارف کرایا تھا۔ آج کل وہ واکس آف امریکا میں ملازم تھے اور عثمان احمد جب بھی امریکا آتے ان سے ضرور ملتے۔ مجتبیٰ حیدر

کے مزاج کی شوخیاں۔

ان کی برجستہ گفتگو۔

ان کا خلوص اور محبتیں عثمان احمد کو ان کے پاس لے آتے تھے۔ بڑا سحر تھا ان کی شخصیت میں۔

ان کی موجودگی میں کوئی یونہیں ہوتا تھا۔

زندگی سے بھرپور گفتگو کرتے تھے۔ زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہوتی تھی۔

”تعارف کی ضرورت تو ابھی بھی ہے مجتبیٰ اس لیے کہ ہم تقریباً دس سال کے بعد مل رہے ہیں اور یونیورسٹی میں صرف دیکھا تھا۔ تعارف نہیں ہوا تھا باقاعدہ بس نام کی حد تک واقفیت تھی۔“

نذیب سجاد کی نظریں عثمان احمد کے چہرے پر تھیں اور عثمان احمد کو یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات کی گردش ختم ہو۔

”میں نے سات سال قبل بھی آپ کو دیکھا تھا نیو جرسی میں۔“ عثمان احمد جیسے خواب کی سی کیفیت میں تھے ”آپ اسٹور سے نکل رہی تھیں اور آپ کے ساتھ شاید آپ کے وہ ڈاکٹر کزن تھے جو ایک دوبار یونیورسٹی بھی آئے تھے۔“

”اوہ تو آپ نے ہمیں پکارا بھی نہیں۔“

”میں نے سوچا شاید آپ مجھے نہ پہچان سکیں۔“

”اور دیکھیں میں نے آپ کو دس سال بعد بھی پہچان لیا۔“ نذیب پھر ہنسی۔

اور وہ اس کی ہنسی میں گم سے ہو گئے

”تو جناب تعارف یہ ہے۔“ مجتبیٰ حیدر نے کھنکار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا ”یہ عثمان احمد ہیں جاگیر دار ہیں اور ہر جاگیر دار کی طرح ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک بھی ہیں اور یہ مسز نذیب ملک ہیں، مجتبیٰ خوبصورت ہیں اتنی خوبصورت باتیں بھی کرتی ہیں۔ میاں ڈاکٹر ہیں اور یہ آج کل ماڈلنگ کر رہی ہیں۔“

”ماڈلنگ؟“ عثمان احمد کو حیرت ہوئی تھی۔

”حسن ہو دلکشی ہو خوبصورتی ہو تو.....“

”مجتبیٰ.....“ نذیب عثمان نے ایک دلکش مسکراہٹ اس کی طرف پھینکی..... ”کہانیاں لکھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بدمذہب ہر وقت کہانیاں ہی بولتا رہے۔“

”کہانیاں بھی تو آپ جیسی حسین خواتین ہی تخلیق کرواتی ہیں۔ آپ یقین کریں گی مسز ملک کہ جب آپ سے ملاقات ہوتی ہے تو ایک نئی کہانی تخلیق کے مراحل سے گزرنے لگتی ہے۔ نہ جانے اب تک کتنی کہانیاں تخلیق کر چکا ہوں صرف آپ سے مل کر۔“

”جموٹ کم بولا کرو مجتبیٰ۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”جھوٹ کہاں.....“ جتنی حیدر نے کانوں کو ہاتھ لگائے ”ہزار پہلو ہیں آپ کے حسن دل نواز کے۔ کبھی ہونٹوں کی ہنسی، کبھی آنکھوں کی چمک، کبھی گالوں کے گلال، کبھی زلفوں کی سیاہی کسی کہانی کی تخلیق کا باعث بن جاتی ہے لیکن پھر بھی جیسے کئی پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ کیوں عثمان! صبح کہہ رہا ہوں نا؟“ اور عثمان احمد چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ کیا کہتے۔ انہیں تو کچھ پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں لائے تھے۔ ہونٹوں کی ہنسی نے انہیں زنجیر کیا تھا یا آنکھوں کے سمندر لے ڈوبے تھے۔ ہونٹوں کی دل آویزی نے حرطاری کیا تھا یا رخساروں پر کھلتی شفق اور سانچے میں ڈھلے جسم نے اسیر کیا تھا۔

وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ دس سال سے وہ اس نرنب ملک کے اسیر ہیں اور انہوں نے خدا جانتا ہے زندگی میں کبھی اس اسیری سے رہائی کی خواہش نہیں کی اور نہ ہی کوئی انہیں اس اسیری سے آزاد کر سکا ہے۔

نزیون بانو کی خدمت گزاریاں اور محبتیں۔

نہ نغصے بیٹے کی پیاری پیاری باتیں۔

اور نہ بے تحاشا مصروفیات۔

”خیر تم ابھی کیا کہہ سکتے ہو۔ رنگ تو بولے ہو لے اکلے گے۔“ جتنی حیدر نے خودی جواب دے دیا تھا۔ اور اس ملاقات کے بعد بھی وہ تقی باجتنی حیدر کے قیام میں نرنب ملک سے باہر نہیں بڑی شدت سے احساس زیاں ہوا۔ جیسے ان کا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ نرنب عثمان ہر بار ہی ان سے اچھی طرح ملیں۔

اور اگر..... ہر ملاقات پر انہوں نے سوچا دس برس پہلے وہ نرنب عثمان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے تو..... تو شاید.....

نرنب عثمان کا ہر انداز دلربا تھا اور جتنی حیدر نے اسے بتایا تھا کہ ”نرنب کا اپنے شوہر کے ساتھ اختلاف ہے۔ وہ اچھا سرجن تو ہے لیکن شاید ایک اچھا شوہر نہیں اور پچھلے ایک سال سے یہ اختلافات شدت اختیار کر گئے ہیں۔ نوبت طلاق تک پہنچ چکی ہے لیکن.....“

”لیکن شاید بچے۔“ عثمان احمد نے خیال ظاہر کیا ”شاید بچوں کی وجہ سے وہ کبیر و ماز کر لیتے ہوں گے۔“

”نہیں۔ بچے تو ہیں ہی نہیں۔ دراصل ملک صاحب شریف آدمی ہیں، مونہر ہی ہے اور نرنب بھی نباہ رہی ہیں۔ اگر نرنب طلاق لے لیں تو کوئی بھی شخص ان سے شادی کر لے گا۔“

اور عثمان احمد نے گہری نظروں سے جتنی حیدر کو دیکھا کہ کیا جتنی حیدر ایسا چاہتے ہیں کیونکہ جتنی بھی اپنی

ذاتی زندگی میں بھی بہت رومینٹک مشہور تھے۔ ابھی تک بچلے تھے۔ اس لیے لڑکیاں ان کے ارد گرد موجود ہی رہتی تھیں اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ خوبصورت لفظوں اور خوبصورت باتوں سے سب کو مالا مال کرتے رہتے تھے۔

”کیا آپ بھی جتنی.....؟“

”ارے نہیں، ہرگز نہیں۔“ جتنی حیدر نے قہقہہ لگایا تھا ”میں ایک شادی شدہ عورت سے شادی نہیں کروں گا چاہے وہ عورت نرنب ملک جیسی خوبصورت ہی کیوں نہ ہو۔ شادی کے متعلق نقطہ نظر بالکل الگ ہے میرا۔“

”محبت۔ شدید اور گہری محبت

اور پھر اس کے بعد شادی۔

چوٹی موٹی محبتیں تو میں نے بہت کی ہیں لیکن ابھی تک اتنی شدید اور گہری محبت مجھے کسی سے نہیں ملی۔ کیا یہ ممکن ہے۔“

اور اس رات عثمان احمد بہت رات سو جاتے رہے تھے اور سوچتے رہے تھے کہ نرنب کیون ہے شوہر سے علیحدگی لے لے تو کیا وہ..... وہ اس سے شادی کر سکتے ہیں..... تو انہیں لگا جیسے یہ ایک بہت مشکل کام ہے.....

نزیون بانو

باباجان

اور پھر ان کا بیٹا.....

بہت ساری رکاوٹیں تھیں۔

باباجان کبھی نہیں مانیں گے۔

نزیون بانو بھی اجازت نہیں دیں گی۔

انہیں لگا جیسے وہ منزل پر آکر بھی پیاسے ہی رہیں گے۔ جیسے اب کچھ بھی اختیار میں نہیں رہا تھا۔

انہیں باباجان کے غصے سے خوف آتا تھا۔

وہ خاندان کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

صرف نزیون بانو تو نہیں تھیں۔

ان کا بیٹا تھا۔

باباجان تھے ماں تھیں۔

اتنی شدید محبت کرنے کے باوجود وہ نرنب ملک کی ہر ایسی کا خواب نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ان کے

لیے شاید ہمیشہ ہی دور آسمان پر چمکتا ستارہ رہیں گی۔ ان کی دسترس اور رسائی سے دور.....

اور جیسے ہار کر انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں اور بند آنکھوں کے اندر آنسو چھلنے لگے تھے اور نارسائی کا کرب دل کو پھیلنے لگا تھا اور انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اب کبھی جتنی حیدر کے فلیٹ نہیں جائیں گے تاکہ نہ وہ انہیں دیکھیں اور نہ دل کا درد سوا ہو.....

اور پورے ایک ماہ وہ درد چھپائے ادھر ادھر گھومتے رہے اور ایک ماہ بعد جب وہ پاکستان واپس آ رہے تھے تو ملنے کی غرض سے جتنی کی طرف گئے اور جتنی حیدر کے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اترتی ہوئی ننب ملک کی بے تحاشا سرخ آنکھیں اور بھیگی پلکیں دیکھ کر وہ جتنی حیدر کی طرف جانے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک قریبی ریستورنٹ میں لے گئے تھے اور پھر خوشبو میں بے نشوز سے بار بار ناک صاف کرتے اور آنکھیں پونچھتے ہوئے ننب ملک نے بتایا کہ انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی حاصل کر لی ہے۔

اور اس کی بھیگی پلکیں جیسے ان کے دل میں ترازو ہو گئیں اور آنسوؤں نے ان کا تن من بھگو دیا۔
”زینتی.....“ ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر اور سارے خوف بھلا کر انہوں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا اور وہ پوری آنکھیں کھولے حیرت سے ان کی بے تابیوں کے قصے سنتی رہی اور جب وہ ریستورنٹ سے باہر نکل رہے تھے تو یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ عدت کے بعد وہ اس سے شادی کر لیں گے۔ انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

نہ اپنا بیٹا۔

نہ زینتوں بانو۔

نہ بابا جان کا خوف۔

خیال تھا تو صرف ننب ملک کے آنسوؤں کا۔

تصور میں تھیں تو صرف وہ بھیگی پلکیں۔

وہ دلکش لب۔

وہ گلابی رخسار۔

”پاپا..... پاپا کیا ہوا ہے آپ کو؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ انہیں اتنی دیر سے آنکھیں موندے خاموشی سے تکیے سے ٹیک لگائے ایک ہی انداز میں بیٹھے دیکھ کر مریم گھبرا گئی۔

”ہاں..... ہوں۔“ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں ”بالکل ٹھیک ہوں۔ بس یونہی شاید آنکھ لگ گئی تھی۔“

”سوری پاپا۔“ وہ شرمندہ ہو گئی ”میں نے آپ کو جگا دیا۔ جبکہ ڈاکٹر شہر یار کہتے ہیں کہ جب آپ سو رہے ہوں تو آپ کو بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ آئی ایم ریلی دیری سوری پاپا۔“

”پاپا! میں تو ابھی سو کر ہی اٹھا تھا، جانے کیوں آنکھ لگ گئی اور ہماری بیٹی کیا کہہ رہی تھی کڈا کٹر شہر یار آپ کے دوست یعنی کے بھائی ہیں۔“ انہوں نے اس کے احساس شرمندگی کو کم کرنے کے لیے خوش دلی سے کہا۔

”جی پاپا۔“ اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

جب ہی ماما کسی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اندر آئیں۔ مریم نے مڑ کر دیکھا۔ یہ غالباً وہی شخص تھا جو کوریڈور میں ملا تھا اور ماما اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

”ارے عثمان احمد یہ کیا کر لیا بھی۔ اس عمر میں دل کی بیماری سوٹ نہیں کرتی“ کیا خیال ہے۔“

”جتنی حیدر تم۔“ عثمان احمد کی آنکھوں میں حیرت تھی ”کہاں تھے تم اتنے عرصے سے بغیر اطلاع کے غائب ہو گئے تھے۔“

عثمان احمد نے ہاتھ آگے بڑھایا اور بہت خلوص اور گرم جوشی سے جتنی حیدر کے ہاتھ کو دبا دیا۔

”ہم آوارہ گرد ہیں۔ جہاں گردش لگتی ہے۔“ جتنی حیدر ان کے بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”تم سناؤ یہ روگ کب سے لگا لیا ہے؟“

”کچھ روگ پیدا اُنشی ہوتے ہیں جتنی۔ بس آدمی کو خبر نہیں ہوتی، اچانک پتا چلتا ہے۔“

”یعنی.....“ جتنی حیدر نے قہقہہ لگایا۔ اونچا کو بختا ہوا قہقہہ اور مریم جو جتنی حیدر کے آنے پر کھڑی ہو گئی تھی چونک کر جتنی حیدر کو دیکھنے لگی۔

اونچے قہقہہ لگانے والے جتنی انکل۔

ویسا ہی اونچا قہقہہ۔

وہی ہنسی آنکھیں۔

”مسز احمد آپ اپنی بیٹی سے جیلس۔ اور میں ایک کہانی لکھوں گا۔ اچھوتا آئیڈیا۔“

”ماں بیٹی کے حسن سے خائف اور جیلس۔“

اور شاید یہی وہ شخص تھا جس نے اس کے اور ماما کے درمیان فاصلے پیدا کیے تھے اور مریم کے دماغ میں جیسے روشنیوں کے جھماکے سے ہونے لگے تھے اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر جتنی حیدر کو دیکھنے لگی۔



سکندر کو یوں لگا جیسے وہ یکا یک دورا ہے پر آکھڑا ہوا اور یہ وہ لمحہ تھا جس سے وہ پچھلے دو سالوں سے خوف کھاتا آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین سا تھا کہ یہ لمحہ ضرور اس کی زندگی میں آئے گا اور جب یہ لمحہ آئے گا تو پھر وہ..... پتا نہیں کیا فیصلہ کرے گا۔

اور پتا نہیں اس کا فیصلہ صحیح ہو گا یا غلط۔

دونوں ہاتھ میز پر دھرے ڈولی اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے مضطرب ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ ہال میں تاریکی تھی لیکن ڈانسنگ فلور پر روشنی کے زرد دائرے میں ایک اطالوی کبیرے ڈانسٹر تھرک رہی تھی۔

”تو یہ لمحہ خراس کی زندگی میں آئی گیا۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

ان بیٹے دو سالوں میں ڈولی نے اسے بے تحاشا چاہا تھا۔ بے حد محبت دی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ سارے کا سارا اس کی محبتوں میں بھیگ گیا ہو اور جیسے وہ اب کبھی اس سے جدا ہو کر نہیں رہ سکے گا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ ڈولی سے کہے کہ..... آؤ ڈولی ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں اور عمر کے آخری حصے تک اکٹھے رہیں..... لیکن پھر جیسے بابا اس کے سامنے آکھڑے ہوتے۔

”سنو سکندر پتر“ مجھے اپنے چاچا کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔“

اور وہ ایک بندھن جو وہ باندھ چکا تھا۔

اس کی بندھن جیسے گوشت میں اترنے لگتیں اور وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتا۔

”تم کچھ کہتے کیوں نہیں ہو سکندر؟ کہو جو کہنا چاہتے ہو۔“

”کیا کہوں۔“ اس کی آواز میں جھکن اتر آتی۔

”میں نے کئی بار محسوس کیا ہے جیسے تم کچھ کہتے کہتے رک جاتے ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان ایسی

اجنبیت بھی نہیں ہے۔“

”کچھ کہنے کا فائدہ بھی تو نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں جیسے خواب چلنے لگتے اور آواز بھیگ جاتی۔

”تم مجھے دوست نہیں سمجھتے سکندر۔“

”تم سے زیادہ میرا کوئی دوست ہے ہی نہیں ڈولی۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے میرے سارے رشتے بھی

ٹوٹ کر تم سے ہی شروع ہو کر تم تک ہی ختم ہو جاتے ہوں۔ تم ہو تو سب ہیں۔ تم نہیں ہوگی تو کوئی نہیں

ہوگا۔ پتا نہیں ڈولی تم نے کیا سحر کر دیا ہے مجھے مہینے گزر جاتے ہیں مگر خط نہیں لکھ پاتا۔“

”تو پھر اپنا مسئلہ اپنی الجھن مجھ سے شیر کیوں نہیں کرتے۔“

”ڈولی..... اس الجھن کا کوئی حل نہیں ہے۔ سو تمہیں بھی کیوں پریشان کروں۔“

”کیا تم یہ سمجھتے ہو سکندر کہ مجھے تمہاری الجھن کا علم نہیں ہے۔ مجھے سب خبر ہے۔“

”تو پھر پوچھتی کیوں ہو؟“

”تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں سکندر۔“

اور وہ کچھ نہ کہہ پاتا۔ وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ کیا کہتا وہ اس سے۔ اپنی بے تابیوں اپنی

محبتوں کا اظہار کرتا اور پھر معذرت کر لیتا کہ اسے واپس جانا ہے۔ کوئی اس کا منظر ہے..... اسے کوئی وعدہ

بھانا ہے اور بابا کو چاچا کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دینا۔ ان دو سالوں میں کتنے ہی خط آئے تھے بھائیاں کے.....

”سکندر لوٹ آؤ۔“

اتنا پیسا اکٹھا کر کے کیا کرو گے۔

ماں جی اور بابا سب اداس ہیں تمہارے لیے۔

تم تو بڑے قناعت پسند تھے یار۔“

بھائیاں اسے لکھتے۔

”تمہیں تو اپنے جوتے کپڑوں کی چیز کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ پھر اتنا لالچ کہاں سے آگیا تمہارے اندر۔“

اس کے اندر تو لالچ اب بھی نہیں تھا لیکن وہ بھائیاں کو کیا لکھتا کہ وہ تو ڈولی نے اسیر کر رکھا

ہے..... اپنے وعدے کی زنجیر میں باندھ لیا ہے۔

اور شاید اندر سے وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے جدا ہو۔ جب ہی تو چپ چاپ وعدہ کر لیا ہے

اور اب اسے نباہ رہا ہے۔

”بھائی! بس پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے دو سال۔“ وہ انہیں تسلی دیتا۔

اور اب جب دو سال گزر گئے تھے اور اس کے پاس اچھا خاصا بینک بیلنس تھا تو ڈولی پھر اس کے لیے

آزمائش بن گئی تھی۔

”سکندر! وہ لوگ میرے بغیر مجھ سے جدا ہو کر؟“

یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ ڈولی کے بغیر زندگی کا رنگ کیا ہوگا اور یہ وہ سوال تھا جو وہ پچھلے کئی دنوں

سے اپنے آپ سے کر رہا تھا اور اس کے پاس اس کا کوئی واضح جواب نہیں تھا۔

”سکندر! تم بے شک اقرار نہ کرو لیکن میں جانتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔

چاہتے ہو مجھے اور تم رضوانہ کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ کبھی نہیں۔“

”ہاں شاید۔“ اس نے نگاہیں جھکا لی تھیں.....

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو ڈولی۔ لیکن شاید میری قسمت میں ایسا ہی لکھا ہے یوں ہی۔ کچھ لوگ ہمارا مقدر

نہیں ہوتے اور وہ لوگ جو ہمارا مقدر ہوتے ہیں ان کے ہمراہی میں ہم خوش نہیں رہ پاتے۔“

”سکندر! یہ زندگی تمہاری ہے۔ اسے دوسروں کی خواہشات پر قربان نہ کرو۔ اس زندگی پر تمہارا حق

ہے..... میں اپنے لیے نہیں کہہ رہی ہوں سکندر۔ میں نے تو اسی روز جب تم نے کہا تھا کہ تمہارا نکاح ہو چکا

ہے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ لیکن تم..... تم خوش نہیں رہ

سکو گے! میں جانتی ہوں۔ پلیز! اپنے لیے سوچو۔ مجھے الگ کر کے صرف اپنی ذات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرو۔“

اسے رضوانہ کا خیال آیا تھا نہ بابا کا۔ دونوں بے حد خوش ہاتھوں میں ہاتھ دیے آواز ملا کر گنگنا رہے تھے۔

”ہاؤ آئی لیو وڈاؤٹ یو“

اینڈ آئی سے دیٹ آئی ڈونٹ نو

ہاؤ آئی لیو وڈاؤٹ یو

آئی لیو یو سو

آئی لیو یو سو“

ہاں یہ زندگی میری اپنی ہے اور اس پر میرا اپنا حق ہے۔ سوائے میں دوسروں کی خواہشات پر کیوں قربان کروں۔

بہت مطمئن بے حد پرسکون سادہ ڈولی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے فٹ ہاتھ پر چلتا رہا۔



رضوانہ کو طلاق نامہ بھیجتے ہوئے لمحے بھر کو اس کے ہاتھ کاٹے۔

دلکش اور معصوم سی رضوانہ۔

جس نے پہلے پہل اس کے دل پر دستک دی تھی۔

جب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ جذبہ جو اس کے دل میں پیدا ہوا ہے وہ کیا ہے لیکن اب۔ اب وہ

اپنے اس دل کا کیا کرتا جس نے اب صرف ڈولی کا ساتھ چاہا تھا۔

اس کی ہی رفاقت کی خواہش کی تھی۔

رضوانہ کی محبت تو بہت دور کہیں ماضی کا حصہ بن گئی تھی۔

میں شاید رضوانہ کے ساتھ خوش نہ رہ سکتا۔

اس نے خود ہی فیصلہ کیا۔

وقت نے مجھ میں اور رضوانہ میں بہت سارے فاصلے پیدا کر دیے ہیں اور شاید محسن ٹھیک ہی کہتا

تھا کہ مجھے رضوانہ سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا..... کیا خبر وقت میری سوچ بدل دے۔

اور وقت نے میری سوچ بدل دی۔

اب میں بیچور ہوں۔

اور میں اپنے متعلق پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر سوچ سکتا ہوں کہ میرے لیے کیا مناسب ہے

اور کیا نامناسب!

اور میرا فیصلہ بالکل صحیح ہے۔

اس کی نگاہوں کے سامنے محسن کے چچا کا گھر آ گیا۔ شائستہ اطوار۔ بیوی مہذب اور سلجھے ہوئے

اور اسے اس گرداب میں چھوڑ کر وہ چلی گئی تھی اور وہ دن گزرنے کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اور اب اس کے سامنے اپنی مومی انگلیوں والے بے حد خوبصورت ہاتھ میز پر دھرے وہ بڑے یقین سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اعتماد تھا، بھرپور تھا اور ایک ایسا یقین کے سکندر ڈول گیا۔

کیا وہ اس اعتماد کو اس اعتبار کو کرجی کر چلی کر سکتا ہے!

کیا ان پر یقین آنکھوں میں مایوسی دیکھ سکتا ہے۔

”نہیں۔“

اور وہاں جو سب مایوس ہو جائیں گے۔ وہ رضوانہ اس کے خدشے خوف۔

کتنا ڈر رہی تھی وہ۔

کتنی خوف زدہ تھی۔

وہ اس کے نوخیز دل میں محبت کا اولین پھول کھلانے والی رضوانہ.....

”ڈولی۔“ اس نے گھبرا کر ڈولی کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ”بابا ہر چلو میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہاں

بہت ٹھن ہے۔“

اور بابا ہر کھلی فضا میں ڈولی کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر چلتی بھتی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے اسے لگا۔ جیسے وہ

دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے۔

اتنی حسین عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے تو جیسے اور کوئی چاہ نہیں رہی۔ پاس سے گزرتے ہوئے

ایک لڑکی نے ان کی طرف دیکھا اور اپنی ساتھی لڑکی سے کہا ”ہاؤ بیوٹی فل کپل۔“

اور سکندر کے دل میں بڑی شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ..... کاش! اے کاش! یہ ہاتھ ہمیشہ میرے

ہاتھ میں رہے اور اس خواہش سے مغلوب ہو کر اس نے ڈولی کے ہاتھ کو ہلکا سا دبا تے ہوئے تھوڑا سا اس

کی طرف بھینکتے ہوئے کہا۔

”ڈولی۔ آئی وانٹ ٹو میری یو۔“

ڈولی چلتے چلتے رک گئی اور اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے دک اٹھا۔ آنکھوں میں جگمگا تر آئے۔

”آئی کانٹ لیو وڈاؤٹ یو۔“

”می ٹو سکندر می ٹو۔“

ڈولی کی آواز بھیک گئی۔

”اینڈ آئی لیو یو..... پینل اس کی ہاؤ ہاؤ۔“ وہ گنگنا لگا۔

زندگی کا ایک بڑا اور اہم فیصلہ خود بخود ہو گیا تھا۔ وہ فیصلہ جو پچھلے دو سالوں سے وہ کہیں پار ہاتھ اور

جس سے خوف زدہ تھا۔ اب ہو گیا تھا تو جیسے اس کے ذہن سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اس وقت نہ

مے اور بابا کی خوشی کے لیے وہاں ایک خوبصورت اسپتال بنواؤں گا اور بابا میری ساری غلطیاں معاف کر دیں گے اور میں رضوانہ سے بھی معافی مانگ لوں گا..... اور اگر اس نے اب تک شادی نہ کی ہو تو اسے اپنی قسم دے کر کسی بہت اچھے لڑکے سے خود اس کی شادی کر ادوں گا۔ محسن سے کہوں گا۔ صبح صادق اور محسن سے کہوں گا کہ وہ کوئی بہت اچھا سالز کا بتائیں اور وہ ضرور میری مدد کریں گے بلکہ محسن تو مجھ سے لڑے گا۔ برا بھلا کہے گا۔ خفا ہوگا۔ اسے تو رضوانہ سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔

وہ سوچتا رہا لیکن ان... سوچوں کو عملی شکل نہ دے سکا۔
لاشعوری طور پر وہ مہینوں پاکستان سے کسی خط کا منتظر رہا اور خود شرمندگی نے اسے دوبارہ خط ہی نہ لکھنے دیا۔
پھر وہ واشٹن آگئے۔

زندگی ایک دم بہت مصروف ہو گئی تھی اور ڈولی کی قربت اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ بہت دفعہ اس نے سوچا کہ دوبارہ خط لکھے۔ بابا جان سے ماں جی سے سب سے ایک بار پھر معذرت کر لے لیکن شدید خواہش کے باوجود وہ خط نہ لکھ سکا۔ زندگی نے کچھ ایسے ہی جکڑ لیا تھا اسے۔
اسے لگتا تھا جیسے وہ دنیا کا خوش قسمت ترین مرد ہے جسے ڈولی جیسی حسین بیوی کی رفاقت ملی ہے۔
وہ جو ذرا سا ملال کا رنگ کبھی کبھی اس کے دل پر آجاتا تھا کہ اس نے رضوانہ سے زیادتی کی ہے۔ وہ بھی ہولے ہوئے ختم ہو گیا۔

کبھی واپس جانے پلٹ کر دیکھنے کا خیال ہی نہ آیا اسے اور مزید تین برس بیت گئے اور ان تین برسوں میں اس نے بہت کمایا، بہت محنت کی، اپنا آپ بھی جیسے بھول گیا تھا۔ اسے آگے بڑھنا تھا۔ اپنے آپ کو ڈولی کے قابل بنانا تھا۔ ثابت کرنا تھا کہ ڈولی نے اگر اس سے محبتیں کی تھیں تو وہ تھا ہی محبت کے قابل۔ اس کی زندگی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اسے اپنے ارد گرد اس پاس دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔

اس روز وہ اپنے ایک دوست سے ملنے ہارڈ یونیورسٹی گیا تھا۔ ڈاکٹر جان کچھ عرصہ اس کے مریض رہے تھے۔ وہ ہارڈ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور اسپتال کے قیام کے دوران ان سے بہت... دوستی ہو گئی تھی اور ان کے بے حد اصرار پر وہ اس اتوار کو ان سے ملنے چلا گیا تھا اور وہاں اچانک ہی اس کی ملاقات صبح صادق سے ہو گئی تھی۔ وہ بھی وہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔

”صبح صادق“ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں مل مل کر اسے دیکھتا رہا..... ”یہ تم ہی ہونا۔“ اسے گلے لگاتے ہوئے جیسے اس کے اندر کچھ کھلنے لگا۔

”بے وفا“ صبح صادق اس سے بہت خفا، بہت ناراض ہوا۔ بہت سارے گلے شکوے کیے۔
وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ کتنے سالوں بعد آج اسے سب یاد آ رہے تھے۔

بچے۔ کتنا پرسکون گھر تھا اور اگر وہ کتنے بچھو سے شادی کر لیتے تو شاید اتنا پرسکون گھر نہ ہوتا۔ بچے ایسے نہ ہوتے اس نے اپنے آپ کو اطمینان دلایا۔

بابا کو ماں جی کو بہت دکھ ہوگا۔
بھابھ اور بھانجا بھی شاید خفا ہوں۔

اور رضوانہ.....

کیا خبر رضوانہ بھی کتنے بچھو کی طرح اپنے زندگی ختم کر لے۔

تو کیا اسے طلاق نہ دوں۔

لیکن نہیں! یہ تو ظلم ہوگا کہ ساری زندگی انتظار کی سولی پر لٹتی رہے۔

نہیں..... میں ایسا نہیں کر سکتا۔

مجھے حق ہے کہ میں اسے ساری زندگی کے لیے پابند رکھوں۔ شاید بابا اس کی شادی کر دیں۔ کہیں کسی اچھے آدمی سے اور کچھ عرصے بعد وہ مجھے بھول جائے۔

اسے یاد بھی نہ رہے کہ کبھی سکندر ملک نے اس سے محبت کے عہد و پیمان باندھے تھے۔

لیکن..... لیکن اگر اس نے.....

نہیں وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں بے وفائی کر بھی جاؤں تو وہ کتنے بچھو کی طرح نہیں کرے گی.....

اور اپنے آپ کو بہت بھلاوے اور بہت سی تسلیاں دے کر اس نے خط ارسال کر دیا تھا۔

بہت سی معذرتیں تھیں۔

بہت سی مجبوریوں کی کہانیاں سنائی تھیں۔

اور رضوانہ کی کسی اچھی جگہ کسی اچھے لڑکے سے شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا اور پھر بہت سارے دن وہ منتظر رہا تھا کہ شاید بھانجا بابا اس سے ناراضگی کا اظہار کریں۔

وہ اسے ڈانٹیں، برا بھلا کہیں۔

لیکن اسے پاکستان سے کوئی خط نہیں ملا۔

شاید وہ سب بہت زیادہ خفا ہو گئے تھے۔

اس نے سوچا کہ جب ان کا غصہ کم ہوگا تو وہ اسے خط لکھیں گے۔ پھر وہ ایک بار پھر ان سے معافی مانگ لے گا اور ڈولی کو لے کر پاکستان جائے گا اور ماں جی اور بابا بھانجا اور بھابھو سب اسے ان دونوں کے سامنے پا کر ساری ناراضگی بھول جائیں گے..... ماں جی کا دل تو محبتوں سے گنہگار ہوا ہے..... چاہتوں سمندر ہے وہ ڈولی سے بھی اتنی ہی محبت کریں گی جتنی بھابھو سے کرتی ہیں اور پھر ہم گاؤں میں رہیں

”چنانچہ سب اس سے خفا ہوں گے۔“

”لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا صاف صادق۔“ اس نے وضاحت کی ”ڈولی نے میرے لیے اتنا کچھ کیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں کیسے اس کی اتنی شدید محبتوں سے اپنا دامن بچا سکتا تھا۔“

”محبت تو تم نے رضوانہ بھی کرتی تھی سکندر۔“ صاف صادق کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

”ہاں لیکن میں شاید اس کے ساتھ اتنی مکمل اتنی مطمئن اتنی پرسکون زندگی نہ گزار سکتا۔ میں بہت آگے نکل آیا تھا۔ اپنے گھر اور گاؤں کے ماحول سے بالکل مختلف ماحول میں رچ بس گیا تھا اور رضوانہ شاید اس ماحول میں میرے ساتھ نہ چل پاتی۔“

”صاف صادق نے تانتف سے اسے دیکھا ”خوش ہو بہت؟“

اور پتا نہیں کیوں سکندر کو لگا جیسے اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے ”کیا وہ بہت خوش ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن شاید اس کے پاس یہ جاننے کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ بہت خوش ہے یا کم۔

”بچے کتنے ہیں؟“

”بچے.....“ اس نے سوالیہ نظروں سے صاف صادق کو دیکھا ”کوئی نہیں۔“

”صاف صادق کو حیرت ہوئی ”پھر تمہاری زندگی مکمل کیسے ہوئی؟“

ہاں زندگی کی تکمیل کے لیے بچوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس نے تو سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی کسی دھیان دیا تھا اور ڈولی نے تو کبھی اس سے بچوں کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔

”زندگی تو مکمل ہے بھئی۔“ وہ ہنسا لیکن اسے اپنی ہنسی خود ہی اجنبی اور کھوکھلی سی لگی ”میرے پاس وہ سب ہے جس کی تمنا کوئی بھی شخص کر سکتا ہے۔ رہے بچے تو..... بچے بھی ہو جائیں گے۔ کون سی عمر بیت گئی ہے۔“

”صاف صادق سے تو اس نے کہہ دیا تھا لیکن خود جیسے اس کے دل میں ایک ننھی سی خواہش ہٹکنے لگی تھی..... اسے چھو مچھو یاد آ رہے تھے۔

شیر یا یاد آ رہا تھا۔

جسے وہ گود میں اٹھاتا تھا تو وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس کی ناک پکڑ لیتا تھا۔

”صاف صادق کسی سیمینار میں شرکت کے لیے آیا تھا اور اس کے بے حد اصرار کے باوجود بھی اس کے گھر نہیں گیا تھا کیونکہ اسے ایک روز بعد واپس جانا تھا۔

”ڈولی تمہیں دیکھ کر تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔“

”اے میری طرف سے آداب کہنا اور یار کبھی پاکستان تو آؤ۔ کیا پاکستان سے بالکل ہی نانا

توڑ لیا ہے۔“

”ہاں آؤں گا۔ میرا خود دل چاہ رہا ہے۔“

اس نے وعدہ کیا اور صاف صادق کو خدا حافظ کہہ کر گھر آ گیا اور اس روز پہلی بار اپنے شاندار اپارٹمنٹ میں اسے بے حد سناٹے کا احساس ہوا۔ لاشعور میں ہٹکنے والی خواہش شعور میں آ کر اودھم مچانے لگی۔

ڈولی کا حلقہ احباب وسیع تھا۔

اس کی دوستیاں اور رفائقیں بہت گہری تھیں۔ وہ یہیں پٹی بڑھی تھی اور ابتدائی تعلیم بھی اس نے یہیں سے حاصل کی تھی۔ سو وہ کبھی اس کے معمولات پر متحضر نہ ہوا تھا لیکن پتا نہیں آج صاف صادق سے ملنے کاڑھا یا پرانے دنوں کی یاد تھی کہ اسے ڈولی کا گھر پر نہ ہونا بہت کھل رہا تھا..... غیر ارادی طور پر بد توں بعد اس نے رضوانہ کو سوچا اور دونوں کا موازنہ کرنے لگا۔

اور اگر آج ڈولی کی جگہ رضوانہ اس کی شریک حیات ہوتی تو..... تو شاید وہ اس کی منتظر ہوتی..... اس کے آنے پر مسکرا کر اس کا استقبال کرتی ”اس کے لیے کھانا لگاتی“ چائے بناتی۔

اور اگر اسے یوں چپ چاپ لیٹے ہوئے دیکھتی تو پریشان ہو کر بار بار اس کا حال پوچھتی۔

”تو کیا وہ بچپتا رہا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر سوچا اور اپنے اندر جھانکا لیکن دور تک کوئی بچپتا اور مال نہیں تھا بلکہ یہاں سے وہاں تک ایک جذبہ ”ممنونیت“ تھا جیسے ڈولی نے اس سے محبت کر کے..... اسے اپنا کر اس پر احسان کیا ہو.....

وہ بہت دیر تک یونہی آنکھیں موندے پڑا رہا اور سوچتا رہا اور جب ڈولی آئی تو وہ سو رہا تھا..... اسے حیرت ہوئی۔

”ارے تم آگے سکندر.....“ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تھوڑا سا اس کی طرف جھکی۔ وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اپنا ہاتھ اوپر کیا۔

”شرارت نہیں۔“ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بلیک جینز ریڈ شرٹ پر بلیک اسکارف لیے وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دلکش آنکھوں میں ہلکے سرخ ڈورے تھے۔

”میرا خیال تھا کہ تم تین دن کو گے۔“

”ارادہ تو تھا لیکن پھر موڈ نہیں رہا۔ ڈولی میں یہ چھٹیاں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں..... پتا ہے تمہیں بہت عرصہ ہو گیا ہے ہمیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر باتیں کیے ہوئے۔ آج اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیسے ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہوں۔“

”وہم ہے تمہارا۔“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ کر آ کر بیٹھ گئی ”یہاں کی زندگی دراصل بہت مصروف ہے

نا اس لیے۔“

”ڈولی.....“ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا ”چلو ہم کہیں ویک اینڈ گزارنے جاتے ہیں۔ باہر۔ انجوائے کریں گے باتیں کریں گے۔ بہت اداس ہو رہا ہوں تمہارے لیے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مدتوں سے تم سے نہیں ملا ہوں۔“

”یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے سکندر؟“ ڈولی ہنس دی ”کوئی انڈین مووی تو نہیں دیکھی لی۔“

”نہیں۔“ وہ بھی ہنس دیا ”زندگی کی مصروفیات تو یونہی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی کچھ وقت اپنے ساتھ بھی تو گزار لینا چاہیے نا۔ چلو یا پروگرام بناؤ کہاں چلیں۔“

”مگر.....“ وہ کچھ ابھی ابھی سیٹھی..... ”مگر سکندر میں نہیں جاسکتی ان دنوں۔ پھر بعد میں کبھی پروگرام بنالیں گے.....“

”مگر کیوں؟“

”وہ میری شوٹنگ ہے۔“

”شوٹنگ، کیسی شوٹنگ ہے۔“ اسے حیرت ہوئی۔

”دراصل پاپا کے دوست ہیں ہمدانی صاحب۔ ان کی اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے وہاں پاکستان میں۔ وہ آج کل یہاں آئے ہوئے ہیں اور یہاں ہی وہ ایک ایڈیٹار کر رہے ہیں۔ وہ جس ماڈل کو لینا چاہ رہے تھے وہ نہیں مل سکی تو انہوں نے مجھے آفر کر دی اور مجھے کسی زمانے میں بہت شوق تھا ماڈلنگ کا سو میں نے آفر قبول کر لی تھی۔ آج اسی سلسلے میں گئی ہوئی تھی فائل بات کرنے۔“

”لیکن تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔“ سکندر نے تاتف سے اسے دیکھا ”اور مجھے تمہارا ماڈلنگ کرنا بالکل پسند نہیں ہے۔“

”کمال کرتے ہو سکندر۔“ اس نے اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں ”اس میں بھلا کیا برائی ہے اور تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور پھر تم نے کون سا مجھے منع کرنا تھا۔“

اس نے محبت لٹاتی نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی شرٹ کے بٹن سے کھیلنے لگی اور سکندر نے اس کے ہاتھ.... پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کہ ٹی وی پر اس کا ایڈ آئے اور لوگ اسے دیکھیں۔ وہ شاید اندر سے دقتاؤں سے ہے۔

لیکن وہ یہ سب نہ کہہ سکا بلکہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کے نیچے دبائے وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکراتا رہا۔

”خیریت ہے سکندر؟“ ڈولی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی اور اس نے ہولے سے اپنا ہاتھ کھینچا۔

”ڈولی ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔“

”تین سال۔“

”تو ڈولی کبھی تمہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی کسی بچے کی۔“

”نہیں۔“ ڈولی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

سکندر کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی لیکن اس نے اپنی حیرت چھپائی۔

”لیکن مجھے ڈولی بچے کی خواہش ہے۔“

”لیکن میں ابھی اس جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ابھی تو میں.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی

اور اٹھ کھڑی ہوئی ”میں ذرا کپڑے چھینچ کر لوں۔“

”ڈولی آج صبح صادق ملا تھا۔ بچوں کا پوچھ رہا تھا کہ کتنے بچے ہیں..... اور مجھے چانک احساس ہوا کہ.....“

”اوہ یہ صبح صادق کہاں سے مل گیا تمہیں؟“ ڈولی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”وہاں ہی یونیورسٹی میں ملا تھا۔ تمہیں آداب کہہ رہا تھا۔“

”مجھے پسند نہیں ہے ایسے لوگوں سے میل جول رکھنا۔ اب تم روز روز اس کی طرف نہ بھاگتے رہنا۔“

”وہ تو جارہا ہے واپس لیکن تمہیں کیوں پسند نہیں ہے اس سے میل جول رکھنا۔“ سکندر کو ڈولی کی بات پر افسوس ہوا۔

”مجھے پسند نہیں ہے کہ تم اپنے ماضی کے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے فرسودہ ماضی کو یاد کرو۔“

وہ کھٹ کھٹ کر کے باہر چلی گئی اور وہ عجیب سی کیفیت میں بیڈ پر بیٹھا رہا۔

ڈولی کو اس کا ماضی پسند نہیں۔

وہ نہیں چاہتی کہ وہ کبھی ماضی کو یاد کرے۔

لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ کبھی آدمی ماضی سے جان چھڑا سکتا ہے۔ ماضی تو آدمی کی بنیاد ہوتا ہے۔

اس کی جڑ ہوتی ہے ماضی میں۔

بھلا وہ بابا کو، اس جی کو، بھانڈا اور بھابھ کو اپنی زندگی سے کاٹ کر الگ کر سکتا ہے۔ بھلے وہ اتنے سالوں

سے ان سے نہیں ملا لیکن اس کا ان سے رشتہ تو نہیں ٹوٹا نا۔

ڈولی کی بات سے اسے بے حد دکھ ہوا تھا لیکن اس نے ڈولی سے کچھ کہا نہیں۔ ڈولی نے بھی اپنی بات

کو پھر دہرایا نہیں لیکن سکندر کے دل میں بچے کی جو خواہش پیدا ہوئی تھی وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ شدت اختیار

کرتی گئی اور اکثر و بیشتر وہ ڈولی سے اس خواہش کا اظہار کرنے لگا تھا اور ڈولی اس بات سے چڑتی تھی۔

”تم کسی عورت ہو ڈولی۔ تمہیں بچے کی خواہش نہیں ہے۔“ سکندر کو حیرت ہوتی تھی۔

”ہاں نہیں ہے مجھے خواہش۔ ایسی ہی عورت ہوں میں۔ کیوں کی بھی مجھ جیسی عورت سے شادی۔

کر لی ہوئی اپنی اسی دیہاتی معیتر سے شادی۔“

اور سکندر حیران تھا کہ ڈولی کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ بات بات پر الجھنے لگی تھی۔ اسے بچوں کی خواہش نہیں تھی تو وہ آرام سے اپنا موقف سمجھا سکتی تھی لیکن بات صرف بچوں کی نہیں تھی۔

اس کے دل میں یکا یک ہی شہرت کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا ایذا آنے والا ہوتا ہی کئی کمپنیوں نے اسے آفر دی تھی کہ وہ ان کے لیے بھی کام کرے جبکہ ہمدانی صاحب پاکستان سے بار بار مذاکرات کر رہے تھے کہ وہ پاکستان آئے اور نذر برادرز کی کسی پروڈکٹ کے لیے ماڈلنگ کرے۔ سکندر نے شدید مخالفت کی۔

”ڈولی مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔“ ایک روز بڑے دنوں بعد جب ڈولی بہت خوش گوار موڈ میں تھی اس نے کہا۔

”کیا؟“

”یہی کہ تم مزید کسی ایڈ کے لیے کام کرو۔“
”لیکن میں نے انکل ہمدانی سے پرامس کر لیا ہے کہ میں ”نذر برادرز“ کی پروڈکٹس کے لیے ماڈلنگ کروں گی۔“

”ڈولی فارگا ڈیسک.....“

سکندر کا لہجہ نرم تھا لیکن ڈولی کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

”سکندر میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں انٹرفیرمت کرو۔“

”تمہارا ذاتی معاملہ میرا بھی ذاتی معاملہ ہے۔ میں اور تم الگ نہیں ہیں۔“ سکندر کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

”میں اور تم اگر الگ نہیں ہیں تو پھر تم میرے مفادات کو سمجھتے کیوں نہیں ہو۔“

”تمہارے مفادات.....“ سکندر کی نظریں لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف اٹھیں اور پھر اسے خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی بات مکمل کی ”اس میں بھلا کیا مفاد ہے تمہارا؟“

”بہت پیسہ ہے۔“

”لیکن پیسے کی کوئی کمی تو نہیں ہے تمہارے پاس..... ہمارے پاس بہت کچھ ہے ڈولی۔“ اس کے

لہجے میں ناصحانہ رنگ آ گیا ”اور پھر تم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہو۔ پاپا اور ماما کا بھی سب کچھ تمہارے

ساتھ ہی ہے۔ صرف پیسے کے لیے مت کرو وہ سب کچھ جو مجھے پسند نہیں ہے۔“

”مجھے تمہاری پسند سے کیا مطلب ہے سکندر۔ میں نے ہمیشہ وہی کیا ہے جو مجھے پسند ہے۔“ اس کی

آنکھیں سرخ ہو گئیں اور رخسار تپ گئے ”اور اب بھی میں وہی کروں گی جو مجھے پسند ہے۔ میں نے انکل

ہمدانی کی آفر قبول کر لی ہے۔ کتنا لگیسر ہے کتنی شہرت ہے اور میں بہت جلد پاکستان جا رہی ہوں۔“ وہ

ایک دم غصے میں اٹھ کر چلی گئی تھی۔

اور سکندر حیران سا سوچتا رہا کہ یہ ایک دم اچانک ڈولی اتنی بدلی بدلی اتنی مختلف کیوں لگنے لگی ہے۔ پتا نہیں کس بات کا غصہ اور ناراضی ہے اسے..... شاید اس سے ہی کہیں کوئی کوتاہی ہو گئی ہے۔ وہ اس سے ناراض اور خفا ہے اس لیے اس طرح بی بیو کر رہی ہے۔

شاید وہ بہت مصروف ہو گیا ہے۔..... اس نے اپنا تجزیہ کیا پیسہ کمانے کے شوق میں مشین بن گیا ہے۔

اس نے بیٹے سالوں پر ایک نظر ڈالی..... ان سارے سالوں میں وہ کتنا کم وقت ایک دوسرے کے

ساتھ رہے تھے۔ بس رات کے چند گھنٹے تھکن سے بڑھا حال۔ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ۔ وہ تو ٹھیک طرح

سے اسے دیکھ بھی نہیں پاتا تھا..... مجھے ڈولی کو وقت دینا چاہیے تھا۔

عورت کو مرد کی رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

صرف پیسہ اور دولت اسے مطمئن نہیں کرتا۔

مرد کی مکمل اور بھرپور رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے اسے۔

بل بل کا ساتھ مانگتی ہے عورت۔

مکمل توجہ چاہتی ہے.....

وہ ڈولی کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے خود کو ہی مجرم ٹھہرا رہا تھا۔

”شاید ساری غلطی میری ہی ہے۔“

”میں نے اسے تنہا کر دیا تھا..... جب ہی تو وہ اتنی ناراض ہے اور خفا ہے۔ بات بات پر الجھتی ہے۔“

وہ خود ہی نادم ہو رہا تھا۔

ٹھیک ہے میں اسے منالوں گا..... اس نے سوچا اور ہولے ہولے اپنے ورنگل آور کم کر لیے لیکن

ڈولی گھر پر ملتی ہی نہیں تھی۔

وہ گھر پر ہوتا تو ڈولی کو کہیں نہ کہیں جانا ہوتا تھا۔ وہ شدید خواہش کے باوجود اس فاصلے کو کم نہیں کر پار

تھا۔ جو اس کے اور ڈولی کے درمیان اچانک ہی پیدا ہو گیا تھا۔

جیسے اچانک زلزلہ آ جائے یا طوفان۔

بالکل بے خبری میں۔

اسے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب اور کیسے اس کے اور ڈولی کے درمیان اتنے فاصلے پیدا ہو گئے تھے اور

ڈولی کو اس سے اتنی شکایتیں ہو گئی تھیں۔

وہ اس فاصلے کو ختم کرنا اور ان شکایتوں کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی دن وہ ڈولی سے

پوچھے کہ وہ کیوں اتنی خفا ہے اور اسے کیوں اس سے اتنی شکایتیں ہیں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور

ڈولی اسے بتائے بغیر اس سے پوچھے بغیر ہی پاکستان چلی گئی۔

وہ ایک سیمینار میں شرکت کرنے فرانس گیا ہوا تھا۔ جہاں اسے عورتوں میں تیزی سے پھیلنے والے بریسٹ کینسر کے متعلق مقالہ پڑھنا تھا۔

یہ اس کی کئی سالوں کی تحقیق کا نچوڑ تھا۔ اسے بہت سراہا گیا تھا اور وہ بہت خوش واپس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ڈولی کے ساتھ اب کچھ دنوں کے لیے پاکستان جائے گا۔

بابا اور ماں جی کہتے بھی خنا ہوں وہ انہیں منالے گا۔

رضوانہ سے معافی مانگ لے گا۔

لیکن ڈولی تو اس کے آنے سے پہلے ہی جا چکی تھی۔

”نہیں“ اسے یقین ہی نہ آیا کیا ایسا ممکن تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر اس سے پوچھے بغیر پاکستان چلی جائے۔

بہر حال وہ اس کی بیوی تھی۔

اما اور پاپائے بھی اس کی سائیڈ لی۔

”ماڈلنگ اس کا شوق ہے اور تمہیں اس کے شوق کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کوئی بچی نہیں ہے کہ بھٹک جائے گی۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہے۔“

”مگر ایک شادی شدہ عورت کو اپنے شوہر کی مرضی کا پابند ہونا چاہیے۔“ اس نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

”وہ بہت لاڈلی ہے۔ بچپن سے ہی ہم.... نے اس کی ہر ضد پوری کی ہے۔ کچھ دن کا شوق ہے پورا

ہو جائے گا۔“ پاپائے نرمی سے کہا

”تمہارے معاملے میں بھی ہم نے اس کی ضد ہی پوری کی تھی ورنہ تم ہمیں اس کے لیے ہرگز پسند نہ تھے۔“

ماما نے پہلی بار انکشاف کیا۔ پاپائے تنبیہی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”خیر اس کی ضد اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ ہمیں سکندر سے بھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔“ انہوں نے اس کا

کندھا تھپکا ”ریلیکس ہو جاؤ اور گھر جا کر آرام کرو۔ میں رات بات کروں گا پاکستان۔ سمجھاؤں گا میں

اسے کہ تمہاری مرضی کا بھی اسے خیال رکھنا چاہیے۔“

وہ اپنے اپارٹمنٹ میں چلا آیا لیکن بہت سارے دن بہت اداس اور دل گرفتہ رہا۔ ڈولی تھی تو

اپارٹمنٹ کتنا بھرا بھرا اور بارونق لگتا تھا۔ اب جیسے ہر طرف ویرانی تھی۔ درود یوار کاٹ کھانے کو دوڑ رہے

تھے۔ چند دن بعد گھبرا کر اس نے فون کیا۔

”ڈولی بہت اداس ہوں تمہارے بغیر کب آ رہی ہو؟“

”جلد ہی۔“ وہ بہت خوش تھی ”یہاں سب نے مجھے اپریٹھٹ کیا ہے اور پتا ہے یہاں ایک ڈرامے

میں بھی کام کرنے کی مجھے آفر ہوئی ہے۔“

”ڈولی پلیز اتنا آگے مت جاؤ کہ پلٹ ہی نہ سکو۔“ وہ کانپ گیا۔

”ڈونٹ وری سکندر۔“ وہ بہت خوش گوار موڈ میں تھی ”یہاں اخبارات کے سنڈے ایڈیشن میری

تعریفوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میرا پہلا ہی ایڈ بہت کامیاب رہا ہے۔ سب میرے حسن، میری

خوبصورتی کی تعریف کر رہے ہیں سکندر۔“

”کیا تمہیں میرے علاوہ کسی کی تعریفوں کی ضرورت تھی ڈولی؟“

سکندر نے دل گرفتگی سے.... سوچا اور اسے جلد آنے اور ڈرامے میں کام نہ کرنے کی تلقین کرتے

ہوئے فون بند کر دیا۔

لیکن اس کا قیام طویل ہوتا گیا۔

اس نے ڈرامے میں کام کرنے کی آفر قبول کر لی تھی۔ اس دوران وہ امریکا واپس بھی آئی..... لیکن

اختلافات بڑھتے جا رہے تھے۔ سکندر نے ایک بار پھر خود کو مصروف کر لیا تھا۔

ڈرامے کی تمام اقساط کی ریکارڈنگ کے بعد وہ واپس آئی تو پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت اور دل

کش لگ رہی تھی۔ سکندر سارے اختلافات بھلا کر پوری شدتوں سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

”ڈولی آؤ۔ ہم تمام اختلافات بھلا کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں..... ایک مکمل پرسکون زندگی۔“

”ہمارا گھر جس میں ہماری محبتوں کی حرارت ہو، اور بچوں کے وجود کی روشنی اور خوشبو ہو۔“

ڈولی خاموش ہی رہی تھی۔

لیکن کہیں کچھ بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

وہ فاصلے کو اچانک پیدا ہوئے تھے، ختم ہونے کے بجائے بڑھ رہے تھے اور ہر گز رتا دن جیسے ان

فاصلوں کو اور بڑھا رہا تھا۔

ڈولی ایک دم بیگانی اور اجنبی لگنے لگی تھی۔

اور سکندر کو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

وہ گھبرا گھبرا کر اپنا تجزیہ کرتا۔

اسے طرز عمل کو پرکھتا۔

لیکن کہیں کوئی کجی نظر نہ آتی تھی۔

پھر وہ ڈولی کی طرف دیکھتا۔

ان دنوں وہ یہاں ہی تھی اور اس نے کوئی نیا ایڈ بھی نہیں لیا تھا اور نہ ہی پاکستان جانے کی بات کی تھی

پھر کیا تھا جو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بظاہر تو سب کچھ ٹھیک تھا۔

پھر غلط کیا تھا۔

اور جو کچھ غلط تھا اس کی طرف اس کی توجہ صاف صاف ہی دلائی تھی۔ وہ انگلیٹڈ میں سیٹل ہو گیا تھا اور اپنی وائف اور دو بچوں کے ساتھ امریکا اپنے برادران لاکے پاس چھٹیاں گزارنے آیا ہوا تھا اور بطور خاص اس سے ملنے آیا تھا۔ ڈولی گھر پر نہیں تھی۔

”سکندر اگر تم برانڈمناؤ تو ایک بات کہوں۔“ وہ جاتے جاتے رک گیا تھا۔

”ہاں ہاں کہو۔۔۔۔۔“

”عرفان میری بیوی کا بھائی۔۔۔ وائس آف امریکا میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ ان دنوں۔۔۔ پلیز مائنڈ نہ کرنا۔۔۔“ اس نے بات کرتے ہوئے پھر کہا جیسے اسے خوف ہو کہ سکندر برامان جائے گا۔

”نہیں پلیز تم کہو۔ تمہاری بات کا میں برا نہیں مناسکتا۔“

”ان دنوں ڈولی بھابی وہاں۔۔۔۔۔ آئی مین وہاں ہی کام کرتا ہے ایک نوجوان اسٹوری رائٹر ہے۔ اس کے ساتھ بہت دوستی ہے بھابی کی بلکہ عرفان کہہ رہا تھا کہ شاید۔۔۔ شاید وہ دونوں عنقریب شادی کر لیں۔“

”نہیں۔“ سکندر کو یقین نہیں آیا ”دوستی کی حد تک ہو سکتا ہے لیکن باقی بات غلط ہے۔ یار تمہیں تو پتا ہے کہ ڈولی کی طبیعت کیسی ہے۔ وہ مختلف ماحول کی پروردہ ہے اور لوگ یونہی کہانیاں بنا لیتے ہیں اس کی نیچر ہے۔ ہر ایک سے خوش دلی سے ملتی ہے۔۔۔۔۔“ اس نے صاف صاف سے زیادہ جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔

صبح صادق نے ایک گہری سانس لے کر سکندر کی طرف دیکھا۔

”چند ماہ پہلے میں پاکستان گیا تھا۔ وہاں بھی صحافتی حلقوں میں دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ دراصل بھابی نے جس ڈرامے میں کام کیا تھا اس کا رائٹر یہی تھا۔ دو ماہ ہی ہوئے ہیں غالباً اسے یہاں آئے ہوئے۔ عرفان بتا تو رہا تھا۔“

”یہ صحافی برادری یونہی پروں کے کیو تر بناتے ہیں۔“ سکندر نے تہہ بہہ لگایا۔

لیکن اپنے قہقہے کے کھوکھلے پن کا اسے خود شدت سے احساس ہوا اور اس نے صبح صادق کے چہرے سے نگاہیں ہٹائیں اور سوچا۔

”تو ڈولی کے پاکستان نہ جانے اور مزید کسی ایڈ کے لیے ماڈلنگ نہ کرنے کی وجہ کیا یہ رائٹر ہے۔ کیا اسی لیے اس نے ہمدانی صاحب کو انکار کر دیا تھا کہ فی الحال وہ کام کرنا نہیں چاہ رہی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کا شوق ختم ہو گیا ہے اور۔۔۔۔۔“

”سکندر بھابی کو بہت آگے بڑھنے سے روک لو۔“ صبح صادق نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”ایسا نہ ہو کہ تمہارے پاس صرف پچھتاوے رہ جائیں۔“

وہ اسے سمجھا کر چلا گیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنا آسان نہیں ہوتا۔

”تم نے بالکل صحیح سنا ہے سکندر۔“ ڈولی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اعتماد سے کہا

”وہ میرا دوست ہے اور بہت نفیس انسان ہے۔“

سکندر کو اپنی رگوں میں خون جتا ہوا احساس ہوا۔ وہ کتنی ہی دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ بڑی دیر بعد اس کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔

”کیا تم دونوں شادی کرنا چاہتے ہو؟“ عجیب ٹوٹی ہوئی سی آواز تھی اس کی۔

”ہاں شاید۔ لیکن ابھی ہم نے اس سلسلے میں بات نہیں کی۔“ وہ بڑے اطمینان سے نیل پالش ریموو کرتی رہی۔ جیسے یہ ایک روزمرہ کی ایک بالکل عام سی بات ہو۔ سکندر کو اس کے اس حد درجہ اطمینان پر حیرت ہوئی اور وہ چپ چاپ اسے نیل پالش ریموو کرتے دیکھتا رہا۔ بے یقین سا جیسے ابھی وہ کہے گی۔

”کمال کرتے ہو سکندر۔ کسی کے ساتھ بات کر لینے یا ملنے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اس سے شادی کرنے لگے ہیں۔ ہونا پینڈ ڈنگ دل اور تنگ نظر۔“ اور پھر وہ ہنس کر اسے اپنی باتوں میں لے لے گا۔

”ہاں میں ہوں تنگ نظر تنگ دل تمہاری محبت نے بنا دیا ہے مجھے تنگ نظر۔ میں نہیں برداشت کر سکتا کہ کوئی تمہارا نام کسی اور کے ساتھ لے۔ اس معاملے میں پینڈ وہی ہوں۔“

لیکن وہ اطمینان سے نیل پالش ریموو کرتی رہی۔ دونوں کے درمیان ایک طویل خاموشی کا وقفہ چل رہا تھا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر اس نے بڑی دیر بعد سر اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا۔

”اب جبکہ ہمارے درمیان یہ بات چھڑی گئی ہے سکندر ملک تو پلیز مجھے طلاق دے دو۔۔۔۔۔“

”کیا۔۔۔۔۔! ڈولی تمہیں خبر ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ وہ ایک دم چیخ پڑا۔ زمین آسمان جیسے سکندر کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے۔

”ہاں۔“ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ”جلد یا بدیر یہ بات تو ہونی ہی تھی۔ اچھا ہے آج ہو ہی گئی۔۔۔۔۔“

”ڈولی۔“ اس کی آواز ڈوب سی گئی ”یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”کیوں ممکن نہیں ہے۔“ ڈولی نے ہمنویں اچکائیں ”سب کچھ ممکن ہے۔ تمہارا نکاح تمہاری کزن سے ہو چکا تھا اور تم نے کہا تھا کہ ہماری شادی ناممکن ہے لیکن تم نے دیکھا کہ وہ ممکن ہو گئی اور اسی طرح ہماری علیحدگی بھی ناممکن نہیں ہے۔“

سکندر کو یوں لگا تھا جیسے اس پر آسمانوں کا بوجھ آ پڑا ہو۔ اس کے پورے جسم میں درد کی لہریں سی اٹھنے لگی تھیں۔ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا۔

”تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“

”کوئی شکایت نہیں۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔“

ماما پاپا نے سمجھایا۔

اس نے اسے اپنی محبت کا واسطہ دیا۔

”کون سی محبت؟“ وہ تسخر سے ہنسی ”وہ محبت تو اسی دن رخصت ہو گئی تھی جس دن ڈاکٹر ہاسل کے فلیٹ میں تم نے کہا تھا کہ تم اپنی منکوحہ سے محبت کرتے ہو۔“

”پھر..... پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی..... یہاں تک کیوں لائیں۔ کیوں مہربان رہیں مجھ پر.....؟“ سکندر اندر سے ٹوٹ رہا تھا لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈولی سچ کہہ رہی ہے۔ یقیناً کوئی اور وجہ ہے۔

”محبت رخصت ہو گئی تھی سکندر ملک لیکن ضد بیدار ہو گئی تھی۔ تم نے میری توہین کی تھی۔ میرے حسن کی میری خوبصورتی کی اور اس جذبے کی جو تمہارے لیے میرے دل میں پیدا ہوا تھا..... میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا سکندر ملک کہ تمہیں جھکاؤں گی..... تمہیں حاصل کر کے رہوں گی..... ایک کمزور دیہاتی، کم پڑھی لکھی لڑکی کو تم مجھ پر ترجیح دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری محبت ہے، تم اسے چاہتے ہو۔“

”نہیں، میں نے تمہاری توہین نہیں کی تھی ڈولی۔“ سکندر کے لہجے میں تحسین اتر آئی ”میں نے ہمیشہ تمہاری خوبصورتی اور حسن کو سراہا ہے۔ تمہارا پلڑا ہمیشہ ہی بھاری رہا ڈولی..... ہاں رضوانہ میری زندگی میں تم سے پہلے آئی تھی۔ ساری بات یہ تھی۔ اگر تم پہلے آ گئی ہوتیں تو.....“

”ہوں۔“ وہ پھر وہی تسخرانہ ہنسی ہنسی ”تم سے میں نے کبھی بھی محبت نہیں کی تھی سکندر ملک۔ تم ایک خوبصورت مرد تھے۔ میرے دل نے تمہیں سراہا تھا اور تمہیں پانے کی خواہش کی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی بہت ہی خوبصورت شے کو دیکھ کر اسے پانے کی خواہش کی جائے حالانکہ تم میرے ایشیئس کے نہیں تھے لیکن میں نے سوچا تھا کہ میری زندگی میں شامل ہو کر تمہارا ایشیئس خود بخود بدل جائے گا۔ لیکن وہ ایک منہمی کی کونسل جو شاید کبھی محبت بن جاتی اسی روز اپنی موت آپ مر گئی تھی اور اس کی جگہ ضد نے جنم لیا تھا اور اس بات کی مجھے خود خبر نہ تھی کہ یہ ضد ہے، محبت نہیں۔“

”سکندر ملک۔“ اس نے ساکت بیٹھے سکندر کو دیکھا ”تم میرے لیے ہمیشہ چیخ رہے۔ ایک ایسا علاقہ جسے مجھے ہر دمیر سے فتح کرنا تھا..... اور میں نے تمہیں فتح کر لیا۔ تم میرا مفتوحہ علاقہ تھے۔ میری محبت ہرگز نہیں اور مفتوحہ علاقے ہماری محبت ہرگز نہیں ہونے چاہئیں انہیں فتح کرنا کتنی بھی بڑی خواہش

کیوں نہ رہی ہو۔“

وہ حیران سا اس کی عجیب و غریب باتیں سنتا رہا۔

”اور محبت تو میں نے اب کی ہے۔“ اس کی آنکھیں لودہ پئے لگیں ”اور سکندر مجھ سے بھی اب محبت کی گئی ہے..... آزاد اور سچی محبت..... تمہاری محبت میں غلامی کی بو بھی سکندر ملک۔“

”تم میرا مفتوحہ علاقہ تھے۔“

اور تمہاری محبت بھی ایک غلام کی محبت تھی۔

ایک قیدی کی مجبور محبت۔“

”نہیں ڈولی میں نے تم سے سچ محبت کی ہے۔ میں رضوانہ کو بھول چکا تھا۔ وہ لڑکپن کی بات تھی۔ میچور ہونے کے بعد تم میرے سامنے تھیں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ..... اور میں نے تمہارے ساتھ کبھی بھی بے ایمانی بددیانتی نہیں کی۔ اگر کوئی بات مجھے تمہارے پاس آنے سے روکتی تھی تو وہ محض مجبوریاں تھیں۔ نکاح کی وہ زنجیر تھی جسے توڑنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا لیکن میں نے تمہاری خاطر اسے توڑ دیا۔“

”تم نے نہیں سکندر ملک۔ یہ تمہارا کمال نہیں تھا اور نہ ہی تم میں اتنا حوصلہ تھا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہی تھی..... ”یہ میرا کمال تھا اور میری بہترین حکمت عملی تھی کہ یہ زنجیر ٹوٹی اور میں نے تمہیں فتح کر لیا۔“

”چلو تم نے ہی سہی۔“ سکندر ہر صورت میں اس رشتے کو بچانا چاہتا تھا ”لیکن اب کیوں دست بردار ہو رہی ہو؟“

”اس لیے کہ مجھے اس غلامانہ محبت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”سوچ لو ڈولی۔“ وہ تھک سا گیا تھا ”اچھی طرح سوچ لو۔ بعد میں کہیں بچھتاؤ نہیں۔“

لیکن ڈولی فیصلہ کر چکی تھی اور سکندر کو بالآخر اس کے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ڈولی نے خود کو آخر اس بندھن سے آزاد کر لیا جسے اس نے اپنی مرضی اور خواہش سے باندھا تھا۔



”سر۔“

”ہوں۔“

پروفیسر عادل نے جو سامنے اخبار پھیلانے بڑی دیر سے یونہی ساکت بیٹھے تھے، چونک کر سرور کی طرف دیکھا۔ جو بالکل ان کے مقابل بیٹھا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سر آپ کچھ پریشان ہیں؟“

”ہاں۔ نہیں تو۔“ اخبار رول کر کے تھوڑی کے نیچے کا کر مسکرا کر انہوں نے اسے دیکھا۔

”نہیں سر، کوئی بات ہے جو آپ کو اپ سیٹ کیے ہوئے ہے۔“
 ”وہم ہے تمہارا۔“

اب وہ اسے کیا بتاتے کہ آمنہ صفی نے اچانک ہی انہیں الجھا دیا ہے اور ایک نادیدہ بوجھ جیسے ان کے دل پر آگرہ ہے اور وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ کیسی خواہش کر بیٹھی تھی یہ آمنہ صفی اور پھر ان کی معذرت سے بغیر کوئی جواز دیے بغیر خود ہی اپنی خواہش سے دستبردار ہو کر چلی گئی تھی۔ لیکن ان کے لیے سوچوں کا ایسا دروازہ کھل گیا تھا کہ وہ الجھتے ہی جا رہے تھے اور کوئی سرااں سے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

”میں اسے وہم نہیں سمجھتا۔“ سرور کی نظرس مستقل ان کے چہرے پر تھیں۔

”یادِ جب کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو آدمی یونہی بے کار سوچوں میں الجھا رہتا ہے۔ میرے پاس جیسے آج کل کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ عجیب بورنگ سے دن ہیں۔ ڈل اور بے کار۔ بہت سارے دنوں سے کوئی ادھر آیا بھی نہیں۔ نہ جتنی صاحب ندرسلان وغیرہ۔“
 ”ارسلان وغیرہ تو اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں۔ فائل ایر ہے۔ آپ حویلی گئے ہوئے تھے تو آئے تھے ایک دن ارمغان اور شہریار۔“

”ہاں کیسے تھے۔“

”ٹھیک ٹھاک تھے۔ ارمغان کو اپنے قمیص کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت تھی۔ کہہ رہا تھا پھر آؤں گا۔“
 ”اچھا بہت اچھے لڑکے ہیں۔ سمجھ دار اور سلجھے ہوئے۔“

پروفیسر عادل نے خوبصورتی کے ساتھ موضوع بدل دیا تھا۔ سرور نے بھی مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہر وقت الجھے الجھے سے رہتے ہیں۔ جیسے اندر سے کوئی بات انہیں ڈسٹرب کر رہی ہو۔ وہ حویلی جانے سے پہلے ہی ڈسٹرب دکھائی دیتے تھے ورنہ سمجھتا کہ شاید وہاں کوئی بات ہوگئی ہے اور خلاف معمول وہ وہاں رہے بھی بہت تھے۔

”سر اس بار آپ بہت دن حویلی ٹھہرے۔ ماں جی تو بہت خوش ہوئی ہوں گی۔“

”ہاں یار.....“ انہوں نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے سرکسی کی پشت سے نکالیا ”کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ شہر کے ہنگاموں سے دور وہاں ہی ڈیرا ڈال لوں۔ آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔“

”آپ کچھ دن اور ٹھہر جاتے۔“

”نہیں سرور میاں۔ بہت دن وہ لیا تھا۔ یہاں لڑکوں کا ہرج ہو رہا تھا۔ وہ افتخار نے نیا کام شروع کیا

تھا اسے گائیڈنس کی ضرورت تھی۔“

”افتخار کا کام بہت اچھا ہے۔ سر حنیف بھی اس کی تعریف کر رہے تھے۔“

”ہوں۔ اس لڑکے میں بہت ٹیلنٹ ہے۔“ پروفیسر عادل نے آنکھیں موند لیں۔ سرور نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا سر، میں ذرا کچھ کام کر لوں۔“

”ہاں شام کو کہیں باہر چلیں گے اور ذرا خدا بخش سے کہہ جانا گرم چائے کا ایک کپ مجھے اور دے دے۔“ انہوں نے آنکھیں موندے موندے ہی کہا اور سوچا۔

”تو کیا میں بہت ڈسٹرب ہوں..... اتنا کہ سرور نے بھی محسوس کر لیا۔ حالانکہ وہ اپنے آپ میں کم رہنے والا لڑکا ہے اور وہاں بی آپا بھی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ پریشان لگ رہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کتنی تردید کی تھی۔ لیکن بی آپا کو یقین نہیں آیا تھا۔“

”نہیں عادل، تم ازم مجھے نہیں چھٹا سکتے۔ میں بچپن سے تمہیں جانتی ہوں۔“

اس روز شام کو جب وہ کال کے کمرے میں بیٹھے یونہی سوئے ہوئے کال کو دیکھ رہے تھے تو بی آپا بھی وہاں آ گئی تھیں۔

”تم یہاں ہو۔ میں سمجھی شاید چچا جان کی طرف چلے گئے ہو۔“

”ہاں میں ذرا کال کو دیکھنے آیا تھا مگر یہ سو رہا تھا تو ادھر ہی بیٹھ گیا۔“

”تم مجھے پریشان لگتے ہو۔“

”نہیں تو.....“ وہ مسکرائے ”آپ کا وہم ہے۔“

”خیر وہم تو نہیں۔“ انہوں نے اصرار کیا ”تم مجھے جھٹلا نہیں سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم مجھے جھٹلا نا نہ چاہو۔“ وہ ان کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھیں ”عادل تم جب سے آئے ہو چچا جان کے گھر نہیں گئے۔ تمہیں وہاں جانا چاہیے تھا۔“

”ہاں جاؤں گا۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا ”ماں جی بھی کہہ رہی تھیں۔ ویسے چاچا جی ٹھیک تو ہیں نا؟“
 ”عادل.....“ بی آپا نے گہری نظروں سے انہیں دیکھا ”بچھلی بار بھی تم آئے تو میں تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر کامی کی بیماری کی وجہ سے بات نہ ہو سکی۔“

”جی۔“ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ بی آپا ان سے کیا بات کرنا چاہ رہی ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔

”تم نے حریم کے متعلق کیا سوچا ہے؟“

”میں.....“ انہوں نے اضطراب سے دونوں ہاتھوں کی انگلیں جھٹک کر ایک دوسرے میں پھنسا لیں ”میں نے بہت پہلے دادا جان کو بتا دیا تھا ان کے متعلق۔“

”ہاں لیکن تم نے اپنی پسند کے متعلق بھی تو کچھ نہیں بتایا۔ ماں جی کی بڑی خواہش ہے کہ اب تمہاری

شادی کر دی جائے۔“

بات مکمل کر کے انہوں نے جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھا لیکن وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ اب وہ بھلا انہیں کیا بتاتے۔ کیا کہتے کہ ان کی کوئی پسند ہے بھی یا نہیں۔

”آخر حریم میں کیا کمی ہے عادل؟“

”کوئی کمی نہیں آپا۔“ وہ نادم ہو گئے تھے۔ اس بات سے وہ ہمیشہ نادم ہو جاتے تھے کہ وہ ایک انہی بھلی لڑکی کو بلا جواز رد کیے جا رہے ہیں۔

”پھر.....؟“ بی آپا کی سوالیہ نظریں ان پر جمی تھیں۔

”بی آپا میں کیا کہوں۔“ وہ پریشان ہو گئے تھے۔

ایک وہ آمنہ صفی تھی جو انہیں الجھا گئی تھی وہ گھبرا کر حویلی آئے تھے تو یہاں بی آپا نے پھر حریم کا ہاتھ چھیڑ دیا تھا۔

”جانتے ہو عادل! خاندان میں ادھر ادھر دور پار کہیں بھی کوئی حریم کا جوڑ نہیں ہے۔ چچا اور چاچی بہت پریشان ہیں اس کے لیے اور کئی بار چاچی نے مجھ سے تمہارے لیے کہا ہے۔ عادل! تمہیں کہیں نہ لگیں تو شادی کرنا ہی ہے..... تو پھر حریم سے کرلو۔ بہت سہارا ہو جائے گا تمہیں بھی۔ بہت اکیلے اور تنہا ہو..... کامی ہے تو سہی لیکن..... جانتے ہونا۔ مانی اور مہراں بازو بن جائیں گے تمہارے..... اکیلے نہیں رہو گے۔ مضبوط سہارے ہوں گے تمہارے۔“

”کیا بیاب میرے لیے مضبوط سہارے نہیں ہیں۔ کیا اب یہ میرے بازو نہیں ہیں؟“

”لیکن میری جان۔“ بی آپا کی آنکھوں میں ان کے لیے بے حد شفقت اور محبت تھی ”حریم سے شادی کرنے کے بعد بات اور ہو جائے گی۔ ابھی تو ان کے دلوں میں تھوڑی بہت خفگی ہے ظاہر کریں یا نہ کریں..... اور پھر تم تو بڑے دل کے بڑے ظرف والے ہو عادل۔ اپنے لیے نہ سہی ان کے لیے۔ سب کی خوشی کے لیے حریم سے شادی کرلو۔ مجھے تم سے توقع ہے کہ تم ہم سب کو مایوس نہیں کرو گے۔“

انہوں نے بڑی ہی بے بسی سے انہیں دیکھا۔ ایک دم ہی بہت ساری تھکن ان کی رگوں میں بڑھ آئی۔ پتا نہیں کیوں سب ہی ان سے حق ڈرتے رکھے ہوئے تھے۔ بڑا ہونا بھی کتنا بڑا اعذاب ہوتا ہے۔ ایک وہ آمنہ صفی تھی جو ان پرانے پچھلے..... رہ رہ کر اس کے لفظ ان کے کانوں میں گونجنے لگتے تھے۔

”بڑا مشہور ہونے اور بڑا اہل رابطہ میں بڑا فرق ہوتا ہے عادل خان۔“

اس کی تسخراڑاتی آنکھیں جیسے ان کے سامنے آگئیں اور ان کا جی چاہا وہ بی آپا سے چیخ کر کہہ دیں کہ نہیں ہیں وہ بڑے دل اور بڑے ظرف والے۔

بہت چھوٹا دل ہے ان کا۔

بہت تنگ سا۔

اور وہ کسی کاماں نہیں رکھ سکتے۔ نہ آمنہ صفی کا جسے وہ بہت زیادہ جانتے بھی نہیں ہیں اور نہ بی آپا کا۔

نہ حریم کا۔

اس حریم کا جو شاید انہیں جانتی ہے۔

جس کا چہرہ اور جس کی نم آنکھوں نے ہمیشہ خاموش گواہی دی کہ وہ ان کے متعلق سوچتی ہے..... اس کی آنکھیں ان کے حوالے سے خواب دیکھتی ہیں۔

”بی آپا۔“ انہوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر دہرایا ”میں سوچوں گا۔“

ان کے اندر کی تھکن ان کے لہجے میں در آئی تھی۔ ابھی تو انہیں آمنہ صفی سے بھی ملنا تھا اور اس سے پوچھنا تھا کہ اس نے وہ سب کیوں کہا تھا اور وہ اس سارے معاملے میں کہاں فٹ ہوتے ہیں۔

”لیکن سوچنے میں دیر نہ کرنا۔“ وہ مسکرائیں ”جو بھی فیصلہ کرو جلدی کرنا۔“

انہوں نے سر ہلا دیا۔

تب ہی ماں جی کھوجتی ہوئی کامل کے کمرے میں آگئیں۔

”ارے! تم دونوں بہن بھائی یہاں ہو اور میں سمجھ رہی تھی کہ شاید عادل آرام کر رہا ہے۔“

”نہیں ماں جی۔ میں تو ذرا کامل کے پاس آیا تھا کہ اس سے باتیں کروں گا لیکن یہ بہت گہری نیند سو رہا ہے۔“

”ہاں! دوائی لینے کے بعد یہ یونہی گہری نیند سو جاتا ہے۔“ وہ کامل کے بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں اور آہستگی سے اس کی پیشانی پر نکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔

کشادہ پیشانی

بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں

اونچی اٹھی ہوئی ناک

وہ اپنے دادا سے بہت مشابہ تھا۔

ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور شاید کامل کی اس حالت کی فتنے دار میں بھی ہوں۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی انہیں لگتا تھا جیسے وہ اگر

وہ سب کچھ نہ کرتیں تو کامل ایک نارمل بچہ ہوتا۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں انہوں نے کہ وہ اس دنیا میں نہ

آئے۔ کتنا علاج کیا تھا۔ کسی الٹی سیدھی دوائی کھائی تھیں۔

خود ان کی جان کے لالے بڑھ گئے تھے لیکن آنے والی روح کو وہ دنیا میں آنے سے نہ روک سکی

تھیں..... اور یہ کتنا بڑا الیہ تھا..... کتنی بڑی آزمائش تھی ان کے لیے۔

یہ جیتا جاگتا دکھ اس دکھ سے بھی بڑا تھا شاید۔ جو ان کے خاوند نے شہر میں اپنی پسند سے شادی کر کے انہیں پہنچایا تھا۔ کئی دن تک انہیں یقین ہی نہ آیا تھا۔ ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ بد صورت نہیں تھیں۔ ان پڑھ نہیں تھیں اور پھر صاحب جاند اٹھیں۔ آدھے نور پور کی مالک تھیں وہ۔ چچا نے ماں باپ کے مرنے کے بعد پرورش کی تھی اور پھر بیٹے سے بیاہ دیا تھا اور شادی کے صرف تین سال بعد مئی..... انہیں تیار ہاتھا۔

”کہ ملک صاحب نے شادی کر لی ہے۔“

عادل سال بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔

اتنا فریب اتنا دھوکا۔

اس سے ذکر تک نہیں کیا۔

چچا کو پتا چلا تو وہ اسی وقت.... شہر روانہ ہو گئے تھے۔ پتا نہیں باپ بیٹے میں کیا باتیں ہوئیں لیکن انہوں نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اب حویلی نہ آئے۔ مئی اس کے حصے کی رقم اسے پہنچا رہا ہے گا۔

”مردود و شادیاں کر لیتے ہیں لیکن وہ بتاتا تو سہی کہ ان کی بھتیجی میں کیا کمی ہے۔“

”بیٹی تم چاہو تو طلاق لے کر دوسری شادی کر لو۔“ انہوں نے سمجھا ہاتھا۔

لیکن انہیں طلاق پسند نہیں تھی۔ بیٹا تھا ان کا عادل۔ زندگی اس کے سہارے گزر جائے گی۔ سر پر باپ سے بڑھ کر چاہنے والے چچا کا سائبان تھا لیکن ان دنوں ان کی ذہنی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ چاہتے تھیں کوئی اور روح دنیا میں نہ آئے۔

انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے رخساروں پر ڈھلک آئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”ماں جی۔“ عادل نے اٹھ کر ان کے کندھوں پر پر ہاتھ رکھ دیے ”کبھی کبھی خدا اپنے بندوں کو یوں

بھی آزماتا رہتا ہے۔“

”میرے لیے تو ایک ہی آزمائش بہت تھی بیٹے۔“ ان کے لہجے میں کسی نادیدہ درد کی چھین تھی

انہوں نے ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے۔

”ماں جی زیادہ نہ سوچا کریں۔ بعض فیصلے اوپر آسمانوں پر ہوتے ہیں اور آدمی کا اس میں کوئی قصہ

نہیں ہوتا۔“

”ہاں اپنے آپ کو یہی کہہ کر تسلی دی جاسکتی ہے۔ میں نے کب گلہ کیا ہے۔ ہاں کامی کا دکھ کبھی بکڑ

دل میں برچھیاں مارتا ہے بس۔“

پروفیسر عادل نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ان کے ہاتھوں کو محبت سے دبایا اور مسکرائے پھر مڑ کر

آپا کی طرف دیکھا۔

”ہاں ماں جی۔“ بی آپا نے بھی ان کی تصدیق کی ”جو گزر گیا ہے سو گزر گیا ہے اسے بھول جائیں اور

اب تو بس عادل کا سوچا کریں۔ آپ کی ساری خوشیاں تو اسی سے وابستہ ہیں۔“

”ہاں اب تو جی یہی چاہتا ہے کہ یہ جلدی سے شادی کر لے اور اس کے بچوں کی خوشی دیکھ لوں مگر پتا

نہیں اس نے اپنے دل میں کیا سوچ رکھا ہے۔“ ان کی آواز میں افسردگی در آئی۔

عادل نے ان کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ان کے ہونٹ میچ گئے اور دل پر ایک بوجھ سا آگرا۔

”کاش وہ اپنے دل کو رضامند کر سکتے ان سب کی خوشی کے لیے۔“

اور پھر جتنے دن وہ یہاں رہے بی آپا اور ماں جی سے نظریں چراتے رہے کہیں بی آپا پھر ان سے اپنا

جواب نہ مانگیں۔ وہ چاچا عبدالرحمن کے گھر بھی کھڑے کھڑے گئے تھے اور باہر سے چاچا سے مل کر آگئے

تھے۔ سلطان باہر ڈیرے پر تھا۔ اس کے کچھ دوست وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ سوان کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

اور اب یہاں آکر بھی ٹھٹھن کم نہیں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیا احساس تھا جو دل کو کھینچے جاتا تھا۔ آمنہ صنفی

بھی تو نہیں ملتی تھی کہ ایک بار وہ کھل کر اس سے بات کر لیتے تو شاید دل پر دھرا بوجھ کم ہو جاتا لیکن پتا نہیں

کہاں تھی وہ۔ شاید اسلام آباد چلی گئی تھی۔ مجتبیٰ صاحب سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ شاید

انہیں ہی کچھ علم ہوتا اس کے متعلق۔ وہ ایک بار اس سے کلیمز کر کے پھر حرم کے متعلق سوچنا چاہتے تھے کہ آیا

وہ بی آپا اور ماں جی کی بات مان سکتے ہیں یا نہیں۔ کیا وہ اپنے آپ کو اس قربانی کے لیے تیار کر سکتے ہیں کیا

وہ حرم کو اپنانے کے بعد اسے وہ خوشیاں دے سکتے ہیں جن کی وہ حق دار ہے؟

”چائے لے لیں عادل میاں۔“ خدا بخش نے چائے لاکر ٹیبل پر رکھی۔

”ہاں۔“ وہ چونکے۔

”پہلے بھی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی۔ خدا جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔“ خدا بخش نے بڑبڑاتے

ہوئے پہلے رکھی ہوئی چائے کی پیالی اٹھالی۔

انہوں نے سر اٹھا کر خدا بخش کو دیکھا اور یکا یک کھڑے ہو گئے۔

”ایسا کرو خدا بخش یہ چائے تم ہی لو میرے حصے کی۔ اور میں ذرا جا رہا ہوں مجتبیٰ صاحب کی طرف۔

مسرور کو بتا دیتا۔“

”میں بی لوں.....“ خدا بخش نے سر ہلایا ”مجھے شوق نہیں جی اپنا اندر جلانے کا۔“

وہ مسکرائے اور گاڑی کی چابی اٹھا کر یونہی سلیر پر پنے ہوئے پورچ کی طرف بڑھ گئے۔

”جوتے تو پہن لیتے کم از کم۔ اب پتا نہیں کیسے کیسے ادیب لوگ آئے ہوں گے۔ کیا سوچیں گے

وہ۔“ خدا بخش بڑبڑاتا ہو ٹیبل سے پیالیاں اٹھانے لگا۔



جبتی حیدر کے ہاں محفل جمی تھی۔

حافظ احسان اللہ تقی صاحب ارسلان ارمنان سب موجود تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ فضا میں سگریٹوں کا دھواں تھا۔

”ابا ہا، عادل خان!۔“ جبتی حیدر نے اٹھ کر ان کا سواگت کیا۔ کبھی وہ موڈ میں ہوتے تو انہیں یونہی کہہ کر بلاتے تھے ”آج غریب خانے کو کیسی رونق بخشی۔“

پروفیسر عادل نے کمرے میں موجود لوگوں کی طرف دیکھا اور مسکرائے ”بس یونہی بہت دن ہو رہے تھے آپ سے ملے۔“

جبتی حیدر نے گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔۔۔۔۔ سیاہ بیڈروم سلیر پہنے۔ پیشانی پر بکھرے بال۔ گہرے رنگ کا شلوار سوٹ جس کی شلینیں بتا رہی تھیں کہ رات ہی کا پہنا ہوا ہے۔ حالانکہ پروفیسر عادل بہت خوش لباس آدمی تھے اور گھر سے باہر نکلنے وقت تک سب سے درست ہو کر نکلتے تھے۔

”خیریت ہے عادل خان؟“ جبتی حیدر نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”ہاں بالکل خیریت۔“ وہ مسکرائے ”بس یونہی بیٹھے بیٹھے جی چاہا کہ آپ سے ملا جائے لیکن مجھے خیال نہیں تھا کہ یہاں اتنے لوگ ہوں گے۔“

”بس کبھی کبھی کے دن محفل ہو جاتی ہے۔“ انہوں نے پروفیسر عادل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”حالانکہ چھٹی کے دن گیارہ بجے لوگ سو کر اٹھتے ہیں جبکہ گیارہ بجے ہم یہاں موجود تھے۔“ حافظ احسان اللہ نے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”کیسے ہیں آپ حافظ صاحب بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی۔“ ان کے قریب بیٹھے ہوئے پروفیسر عادل نے پوچھا اور پھر باری باری سب کی خیریت دریافت کرتے ہوئے ان کی نگاہ کو نے میں کرسی پر بیٹھی آمنہ صفی پر پڑی تو لمحہ بھر کو وہ ارسلان کو کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

جبتی کے یہاں فرشی نشست تھی۔ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں فلور کشن بھی تھے۔ قیمتی کارپٹ بھی تھا اور جب کبھی وہ سب جبتی حیدر کے ہاں اکٹھے ہوتے تھے تو یونہی کارپٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔ سوان کی نظر پہلے کو نے میں کرسی پر بیٹھی آمنہ صفی پر پڑی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ جبتی حیدر کی طرف آئے بھی اسی لیے تھے کہ وہ ان سے آمنہ کے متعلق پوچھیں۔ کرسی کے ہتھے پر کبھی رکھے اور تھیلی پر چہرہ دکھائے وہ انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

”ان سے نظر ملتے ہی سر کو ہلکا سا جھکا کر وہ مسکرائی۔“

آنکھوں میں کا جل لگائے۔

دھلے دھلے چہرے کے ساتھ وہ اس دن کی آمنہ صفی سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر

آج وہ دھشت نہیں برس رہی تھی۔ شاید وہ اپنے آپ کو اس تکلیف دہ صورت حال سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے اطمینان نے پروفیسر عادل کو پرسکون سا کر دیا۔ اطمینان سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے انہوں نے سوچا کہ جب آمنہ صفی جانے کے لیے اٹھے گی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ جائیں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ کچھ دیر اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ الجھنیں سلجھانا چاہتے ہیں اور یہ کہ اگر اس سارے معاملے میں ان کا کوئی ذرا سا بھی قصور ہے تو وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔

”ہاں تو جبتی! آپ کیا کہہ رہے تھے عادل کے آنے سے پہلے۔“ حافظ احسان اللہ نے اپنی داڑھی کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”میں کہہ رہا تھا کہ مرد نہ عورت کی ذہانت سے متاثر ہوتا ہے نہ خوبصورتی سے بلکہ وہ عورت کے عورت پن سے متاثر ہوتا ہے۔“

”اور یہ عورت پن.....؟“ حافظ احسان اللہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ عورت پن مرد کی اپنی نظروں میں ہوتا ہے۔“

جبتی حیدر کو بات کرنے کے لیے کوئی پسندیدہ موضوع مل جاتا تو وہ بے مکان اور بہت خوش ہو کر بولتے تھے ”کوئی اسے سیکسول یعنی جنسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور کوئی چہرے کی خوبصورتی میں کسی کو جسم میں نظر آتا ہے تو کسی کو چال میں اور کوئی آواز کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“ ۹۹.۹ فی صد مرد اندر سے ایک سے ہوئے ہیں۔“

”لیکن وہ میری کہانی کا ہیرو۔“ حافظ احسان اللہ منمنائے۔

”آپ پینٹل کیسز آر دیر۔“

جبتی حیدر نے ان کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ مارا تو وہ ذرا سے دور کھسک گئے اور جبتی حیدر مسکراتی اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے جو کو نے میں بیٹھی آمنہ صفی کو گاہے گاہے نظر اٹھا کر دیکھ لیتے تھے۔

”شریف سے شریف مرد بھی جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو سامنے آ جانے والی عورت کو کالی آنکھ سے ضرور دیکھتا ہے۔“

تقی اللہ گھبرا کر کارپٹ کو گھومنے لگے تو بے اختیار امداد آنے والی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے جبتی حیدر نے سگریٹ سلگایا۔

”جبتی صاحب۔“ آمنہ صفی کے لہجے میں.... اول روز والی کھنک تھی۔ اور وہ اپنی کرسی پر تھوڑا سا آگے کو بٹکی ان کی طرف دیکھ رہی تھی ”دراصل مرد ازل سے بے وفا ہے۔ وہ بہت جلد اپنی بیوی سے اکتا جاتا ہے اور باہر توجہ ڈھونڈتا ہے اور فریب دیتا ہے۔“

”بجائے فرمایا آپ نے آمنہ۔“ حافظ احسان نے فوراً تائید کی۔

جبجتی حیدر کو بھر آکھیں نیچے کیے مسکراتے رہے پھر سنگریٹ کی راکھ الیش ٹرے میں جھماڑی اور آمنہ کی طرف دیکھا۔

”اسی طرح عورتیں بے وفا ہوتی ہیں۔“

”مگر ان کی بے وفائی کی وجہ ہوتی ہے وہ مجبور ہوتی ہیں۔“ آمنہ نے جواب دیا۔

”مرد بھی اتنا ہی مجبور ہوتا ہے جتنا کہ عورت ہوتی ہے لیکن عورت سمجھتی ہے کہ مرد نے محبت نہیں کی وہ بے وفا ہے۔ حالانکہ مرد سمجھوتا کرتا ہے۔ مرد جتنا سمجھوتا کرتا ہے۔ عورت اس کا آدھا بھی سمجھوتا نہیں کرتی..... مرد اگر سمجھوتا نہ کرے تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ معاشرہ تباہ ہو جائے۔“

سب بہت دھیان سے جبجتی حیدر کی گفتگوں رہے تھے۔

”عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔“

سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر جبجتی حیدر کے لہجے میں ایک خاص رنگ آ گیا تھا اور جب یہ رنگ ان کے لہجے سے جھلکا تھا تو وہ بڑے پتے کی بات کہتے تھے ”اگر روک ٹوک نہ ہو تو ۹۹ فی صد عورتیں بگڑ جائیں جبکہ ۶۰ فی صد مرد بگڑیں گے۔“

”لیکن جبجتی صاحب۔“ آمنہ معنی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب چلی آئیں ”میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی ہوں جن کی روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں تھا لیکن وہ نہیں بگڑیں۔“

”میں نے کہا نا آمنہ معنی کہ آپ کی کھڑی کیوں ہو گئیں؟“

”دراصل مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ یہاں تو آپ سے مصطفیٰ صاحب کا نمبر لینے آئی تھی۔ اتنی اچھی محفل دیکھ کر رک گئی تھی اب اجازت دیں۔“

”ارے نہیں، کچھ دیر تو بیٹھیں۔“ تقی صاحب نے بنا اختیار کہا ”آپ کی موجودگی سے رونق پڑی ہے۔“

”شکریہ تقی صاحب، پھر کبھی سہی۔“ آمنہ نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر جانے کے لیے قدم اٹھایا

تھا کہ پروفیسر عادل بھی کھڑے ہو گئے۔

”اچھا جبجتی صاحب میں بھی اب چلوں گا۔ یوں ہی سرور کو بتائے بغیر چلا آیا تھا۔“ وہ تیزی سے آمنہ

معنی کے پیچھے لپکے کہ نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔

”سینے مس آمنہ معنی، مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔“

آمنہ معنی نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ جب ہی جبجتی حیدر نے پیچھے سے پروفیسر عادل کو آواز دی۔ جوان کے

پیچھے ہی باہر نکلے تھے۔

”یار عادل خانائے کیا ایک دم آئے ایک دم اٹھ کر چل دیے۔ میں سوچ رہا تھا کہ سب کے جانے

کے بعد ابھی تم سے پوچھتا ہوں کہ خیریت تھی نا۔ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔“

”بالکل خیریت ہے۔“ پروفیسر عادل نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرائے۔

”آر پو شور؟“ جبجتی حیدر نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

”دیں۔“ پروفیسر عادل نے ان سے ہاتھ ملایا ”خدا حافظ پھر ملیں گے بلکہ آئیے گا آپ۔“

”ضرور۔“ جبجتی حیدر نے خوش دلی سے کہا اور واپس جاتے جاتے جیسے کچھ یاد کر کے ایک دم پلٹ

پڑے ”ارے ہاں وہ تمہارے والد ملے تھے یار۔ بہت عرصے بعد۔“

اور پروفیسر عادل کے بڑھتے ہوئے قدم کہ گئے اور وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر جبجتی حیدر کی طرف دیکھنے لگے۔



”تم بالکل ویسی ہی ہو زینی ذرا بھی تو نہیں بدلی ہو۔“ جبجتی حیدر نے گہری نظروں سے زینب عثمان کو

دیکھا ”ویسی ہی فریش اور دلکش۔ ماہ و سال کی گردش نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔“

زینب عثمان نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ کسی تکلیف دہ یاد نے ان کے اندر چٹکی سی لی لیکن وہ

مسکرائیں ”تم بھی تو ویسے ہی ہو۔ کچھ زیادہ نہیں بدلے۔“

”ارے نہیں یار ہم تو بوڑھے ہو گئے۔“ جبجتی حیدر نے اپنا سر ذرا سا جھکاتے ہوئے کہیں کہیں سے

جھانکتے سفید بالوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر سر اٹھا کر زینب کو دیکھتے ہوئے ان کے لبوں پر ایک شریری

مسکراہٹ آ کر بھر گئی۔

”اور تم..... خدا کی قسم آج بھی کسی کے دل کو اپنے ہاتھوں میں لے لینے کی طاقت رکھتی ہو۔ اس روز

تمہیں اتنے سالوں بعد اسپتال میں دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ عثمان بہت لگی ہے۔ اس کی

خوش قسمتی پر رشک آیا۔ ایک ہماری بیگم ہیں کہ اٹھارہ سال پہلے کے حسن کی کوئی نشانی بھی باقی نہیں رہی۔“

”جبجتی پلیز۔“ ان کی آنکھوں میں کوندے سے لپکے ”اب تم مجھے نہیں بنا سکتے۔“

”بنانا تو تمہیں میں نے پہلے بھی نہیں تھا، جب تم میرے سامنے ہوتی تھیں۔ میرے ارد گرد تمہارے

وجود کی روشنیوں سے رنگ ہی رنگ بکھر جاتے تھے۔“

”جب ہی تو..... جب ہی تو.....“ زینب عثمان کے ہونٹ مل کھا کر رہ گئے اور اندر ہی اندر کہیں

وجود میں زہر گھلنے لگا اور انہیں برسوں پہلے کی وہ شام یاد آ گئی، جب جبجتی حیدر کی مقناطیسی آنکھوں میں ایک

دم حیرت آئی تھی۔

”بھلا یہ کیسے ممکن ہے..... بھلا یہ کیسے ممکن ہے مسز ملک۔“ اس نے اپنی بات کو دہرایا تھا۔

”بٹ ناؤ آئی ایم ناٹ مسز ملک۔“

”اوہ! پس آئی تو۔“

وہ ایک دم کچھ مضطرب سے نظر آنے لگے تھے اور پھر ایک دم کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے انہوں نے وہ بات کہہ دی تھی۔ جو آج بھی کبھی کبھی زینب عثمان احمد کو بے کل کر دیتی تھی اور یہی بے کلی تھی جو کبھی کبھی انہیں ڈپریشن کر دیتی تھی۔ بلاوجہ ہی۔

مجتبیٰ حیدر

مقتنا طبعی آنکھوں

اور پرکشش شخصیت کا حامل مجتبیٰ حیدر

جسے باتیں کرنے کا فن آتا تھا۔

جو سراہنا جانتا تھا۔

جو جانتا تھا کب کس وقت کہاں کون سی بات کرنی ہے۔

اور جب پہلی بار وہ اس سے ملی تھیں تو اس نے بے حد بے باکی سے ان کے حسن کو سراہا تھا۔ ان کی تعریف میں نہ جانے کہاں کہاں سے تشبیہات ڈھونڈ لایا تھا اور زینب عثمان احمد کو جو تب زینب ملک تھیں اس نو جوان کہانی نگار کی بے باکی بری نہیں لگی تھی بلکہ اپنے اندر وہ کچھ مغروری ہو گئی تھیں۔

وہ اس قابل تھیں کہ انہیں چاہا جاتا۔

ان کی تعریف کی جاتی۔

اور ان دنوں تو انہیں بے تحاشا سراہا جا رہا تھا اور وہ ایک ماڈل کی حیثیت سے اپنی پہچان کر رہی تھیں۔ ٹی وی سے انہیں آفر بھی ہو چکی تھی اور پھر جتنے دن بھی وہ پاکستان میں رہیں، کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی محفل میں ان سے ملاقات مجتبیٰ حیدر سے ضرور ہوتی اور پھر ہر بار وہ یوں لپک کر ان کی طرف آیا جیسے صدیوں سے ان کا منتظر ہو اور ہر بار اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

”کاش! آپ مجھے بہت پہلے ملی ہوتیں۔“

گہری گہری نظروں سے نکتے ہوئے جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہے جاتا۔

”کوئی بھی کہانی لکھتے ہوئے میں سوچا کرتا تھا کہ ایک مکمل حسن کیا ہوتا ہے اور اس حسن کو میں لفظوں کا پیرا بن کیسے پہناؤں گا اور اب آپ میرے سامنے ہیں تو مجھے کچھ مشکل نہیں رہا۔ آپ کا حسن مکمل ہے منزل ملک۔“

”مجتبیٰ! تم کہانیاں لکھتے لکھتے کہانیاں بولنے بھی لگے ہو۔“ وہ اٹھلاتیں۔

”آپ کے سامنے تو لفظ خود بخود اندر سے پھوٹتے ہیں اور یہ لفظ آپ کی خوبصورتی کے سامنے بہت کمزور لگتے ہیں۔ کاش! میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت لفظوں میں آپ کے حسن کو خراج تحسین پیش

کر سکتا۔ اپنی کم ہائیکگی کا احساس بڑھ جاتا ہے اور آپ میرے خلوص پر شبہ کر رہی ہیں۔“ وہ مسکرا دیتیں۔

یہ تعریفیں ان کا حق تھیں۔

”میں ملک میں تو اس شخص سے حسد کرنے لگا ہوں جس کی دسترس میں یہ خوبصورتیاں ہیں۔“

اور انہیں لگتا جیسے واقعی دنیا میں ان جیسا کوئی نہیں ہے اور اسی احساس تفاخر کے ساتھ جب وہ واپس امریکا آئیں تو انہیں بہت شدت سے اپنی جلدی بازی کا احساس ہوا۔

شاید انہوں نے انتخاب میں غلطی کی تھی۔

زندگی کا ساتھی تو مجتبیٰ حیدر جیسا ہونا چاہیے تھا۔

زندہ دل اور ہر لمحہ سراہنے والا۔

ہر قدم پر پھول بچھانے والا۔

نہ کہ سکندر ملک جیسا مٹی کا مادھو۔

جسے نہ بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا نہ سراہنے کا فن۔ ہر لمحہ بس شکر گزاری کے جذبے سے بیجا رہتا کہ اس نے اسے سرفراز کیا تھا اپنی محبتوں سے نوازا کر۔

”اور کیا واقعی انہوں نے اس سے محبت کی تھی۔“

پاکستان سے واپس آ کر کئی بار انہوں نے اپنے دل کو ٹٹولا تھا لیکن وہاں سناٹے ہی سناٹے تھے۔ وہ اس کی پرکشش شخصیت سے متاثر ضرور ہوئی تھیں اور انہوں نے اس کی رفاقت کی خواہش بھی کی تھی لیکن شاید محبت کبھی نہیں کی تھی۔

وہ جو اس نے ان کی بے تحاشا خوبصورتیوں کو نظر انداز کیا تھا اس سے ان کی اتنا پرکاری ضرب لگی تھی۔

انہیں اس دیہاتی لڑکی سے نفرت سی محسوس ہوئی تھی جس کی وجہ سے سکندر ملک نے انہیں ٹھکرانے کی جرات کی تھی۔ خود بخود ہی وہ انجان لڑکی ان کے مد مقابل آکھڑی ہوئی تھی اور انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اس انجان بی لڑکی کو ہرانے میں صرف کر دی تھیں اور بالآخر فتح یاب ہوئی تھیں اور بہت

سارے دن وہ اس فتح کی خوشی میں سرشار رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی انہیں اپنی زندگی ڈل لگنے لگی تھی اور ایسے ماحول میں ماڈلنگ کی آفر سکندر کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے قبول کر لی تھی۔

خدا نے انہیں بے تحاشا حسن سے نوازا تھا تو پھر کیوں نہ وہ اس کا خراج وصول کرتیں۔

پاکستان سے آ کر بھی وہ کئی دن تک مجتبیٰ حیدر کی باتیں یاد کر کے تڑپ اٹھتی تھیں اور ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ جاتی۔

مجتبیٰ حیدر کے لفظوں میں جو حدت تھی۔



جملوں میں جو گرم جوش تھی۔

سکندر ملک کے پاس نہیں تھی، سو اختلافات بڑھتے جا رہے تھے اور مجتبیٰ حیدر کی امریکا آمد نے اس اختلاف کو مزید ہوا دی۔ وہ سمجھتی تھیں، مجتبیٰ حیدر ان کی محبتوں میں پور پور ڈوپ چکا ہے اور مجتبیٰ نے سیکڑوں بار اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

مجتبیٰ حیدر جیسا گرم جوش، ہم سفر ہو تو زندگی کا لطف دو بالا ہو جائے۔

وہ زندگی کے ایک ایک لمحے سے خوشیاں کشید کرنے کا قائل تھا اور خود ان کی بھی یہی رائے تھی کہ زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ جائے۔

انہیں یقین تھا کہ اس کے حسن کو سراہنے والا ان کے حوالے سے کئی کہانیاں تخلیق کرنے والا مجتبیٰ حیدر سکندر ملک سے ان کی علیحدگی کا سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا لیکن اس کی محرکینز آنکھوں میں حیرتیں اتر آئیں۔

”کیا اختلافات اتنے شدید ہو گئے تھے ڈولی کہ تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔“ (مسز ملک والا تکلف بہت دن پہلے ختم ہو چکا تھا اور اب وہ انہیں کبھی ان کے یک نیم سے پکارتا۔ کبھی ان کے نام سے۔۔۔ جو زینب سے زینبی ہو چکا تھا۔)

”کیا سمجھوتے کی کوئی صورت نہ تھی؟“

”نہیں۔“ وہ اس کے بالکل قریب کھڑی تھیں ”مجتبیٰ کیا تم جانتے نہیں کہ میں نے یہ اتنا بڑا قدم کس

لیے اٹھایا ہے؟“

”اوہ نہیں۔“ وہ اس کے قریب سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا تھا ”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا ڈولی۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا ”شادی کے لیے میں اپنا الگ نظر یہ رکھتا ہوں۔ میں تمہارا مداح ہوں زینبی۔ تم واقعی پوجے جانے کے قابل ہو۔ لیکن سوری میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں۔ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔“

ان کی آنکھوں میں نیلے پیلے دائرے سے بنے لگے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجتبیٰ حیدر کے عشق میں جتلا ہو گئی تھیں اور اب مجتبیٰ حیدر کے بغیر وہ جی نہ پائیں۔ بلکہ اپنی ذات کی تذلیل کے احساس نے ان کے اندر جیسے آگ سی بھردی تھی۔ اور کنپٹیوں پر جیسے کوئی ہتھوڑے برس رہا تھا۔

اور درو۔

شدید اور گہرا درو

ان کے سر اور کنپٹیوں سے یوں اٹھ رہا تھا جیسے کوئی رگوں کو ہاتھ میں لے کر بل دے رہا ہو۔

”کہاں گم ہو گئیں خاتون؟“ مجتبیٰ حیدر نے قدرے جھکتے ہوئے شوخی سے پوچھا تو وہ چونکیں اور جھکی

نظروں سے مجتبیٰ حیدر کو دیکھا۔



”میں تمہارے کسی ناول کا کردار نہیں ہوں۔ ایک معزز شخص کی بیوی اور چار بچوں کی ماں ہوں۔“

”اس کے باوجود آج بھی کسی کے ہوش و خرد پر بھجائی گرا سکتی ہو۔“

”مجتبیٰ،“ انہوں نے مصنوعی غصے سے اسے ٹھورا ”تم آج بھی اتنے ہی بے باک اور شوخ ہو لیکن

اب میں بچی نہیں ہوں۔“

”بچی تو تم تب بھی نہیں تھیں زینبی۔“ مجتبیٰ نے قہقہہ لگایا۔

ان کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چھوئی۔ لمحہ بھران کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئیں۔ مجتبیٰ کو تو احساس تک نہیں ہوا تھا کہ ان کے دل پر کیا گزری ہے۔ بلکہ عثمان احمد سے شادی

کاسن کر اس نے بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا۔ عثمان احمد سے شادی کے کئی برسوں بعد جب وہ ڈولی کے ایک پلے میں کام کر رہی تھیں اور ہر طرف ان کا چہرہ چاٹتا۔ مجتبیٰ حیدر انہیں اچانک ٹی وی اسٹیشن پر ل گیا تھا۔

”آہا مسز ملک کیسی ہیں آپ بہت برسوں بعد دیکھا۔“

”مسز ملک نہیں زینب عثمان احمد۔“ انہوں نے تصحیح کی تھی۔

”یعنی عثمان احمد۔“ مجتبیٰ حیدر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہیں میں نے عثمان سے شادی کر لی تھی۔“

”بہت خوب بہت ناکس آدمی ہے۔ آج کل کہاں ہے وہ؟“

”یہاں ہی لاہور میں۔“

انہوں نے بہت چاہا تھا کہ وہ ان سے رکھائی سے پیش آئیں لیکن یہ ممکن ہی نہ ہو سکا تھا۔ مجتبیٰ ایک بے تکلف آدمی تھے۔ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ انہوں نے کبھی زینب عثمان احمد کو ہرٹ کیا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے گھر آتے اور زینب عثمان سے گھنٹوں گپ لگاتے۔ ان کے اچھے دوستوں میں ان کا شمار

ہوتا تھا۔ زینب عثمان بھی بظاہر اس بات کو بھول چکی تھیں لیکن کبھی کبھی ان کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی۔ وہ کتنی بے تحاشا خوبصورت تھیں۔ پھر بھی..... پھر بھی پہلے سکندر ملک نے۔

اور پھر مجتبیٰ حیدر نے۔

ایسے میں کبھی کبھی وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو جاتی تھیں اور عثمان احمد کی شامت آ جاتی تھی۔ حالانکہ عثمان احمد نے انہیں بے تحاشا محبتیں دی تھیں۔

ان کی ہر جائز ناجائز بات پر سر جھکا یا تھا۔

محبتیں تو سکندر ملک نے بھی ان سے کی تھیں۔

لیکن پتا نہیں کیوں سکندر ملک ہمیشہ انہیں اپنا کوئی مفتوحہ علاقہ لگتا تھا جسے انہوں نے اپنی ذہانت اور

چالوں سے جیتا ہو۔

”خیریت ہے زینؑ یہ تم بار بار کہاں کھو جاتی ہو؟“ مجتبیٰ بنجیدہ ہو گئے ”عثمان کی وجہ سے پریشان ہو؟“
”ہاں..... نہیں تو“ وہ چونکیں ”وہ کافی بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔
بس ریٹ لازمی ہے۔“

”تو ریٹ ہو رہا ہے۔“ مجتبیٰ حیدر کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں۔

”ہوں..... تم بتاؤ تم اچانک غائب ہو گئے اور پھر اتنے عرصے بعد اب خبر لی۔“

”میں امریکا چلا گیا تھا۔ ابھی تقریباً ایک سال قبل ہی واپس آیا ہوں۔ تمہارے پرانے گھر کی طرف
ایک چکر لگایا تھا لیکن تم لوگ وہ جگہ چھوڑ چکے تھے۔“

”ہاں ہم لوگوں نے ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی فروخت کر دی تھی۔ تم آج کل کہاں رہ رہے ہو؟“

”وہاں ہی ماڈل ٹاؤن میں۔ ہم ٹھہرے غریب کہانی نگار۔“

”تمہارے جیسے دو چار غریب اور ہو جائیں۔“ زینب عثمان مسکرائیں ”شاہ خرچ آدمی ہو۔ جتنا کمایا
ہے اتنا خرچ بھی کر دیا ہے..... آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

”آج کل.....“ اس نے لمحہ بھر سوچا ”آج کل ٹی وی کے لیے ایک پلے لکھ رہا ہوں..... لانگ
پلے..... ارے تم..... تم کیوں نہیں کام کرتیں میزے اس پلے میں۔ تمہارے اوپر بہت سوٹ کرے گا وہ
کردار..... کمال ہے مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا۔“

”لیکن میں نے بہت عرصے سے ٹی وی کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔“

”ماڈلنگ کر رہی ہو تو اس میں کیا حرج ہے اور پھر وہ کردار..... تم پر ہی سوٹ کرے گا۔“

”کیا ہیروئن بننا ڈرے اس عمر میں؟“

”ہیروئن کی بڑی بہن کا کردار ہے۔ لیکن تم ہیروئن بھی بن سکتی ہو۔ وقت تمہیں چھوئے بغیر گزر گیا
ہے۔ مجھے تو آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے تم بالکل ویسے ہی ہو جیسا میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ پوری
محفل تمہارے وجود سے جھی ہوئی تھی۔“

”مجتبیٰ“ انہوں نے تشبیہی نظروں سے انہیں دیکھا ”تم پھر بتانے لگے مجھے۔“

”ہرگز نہیں.....“ مجتبیٰ حیدر نے قہقہہ لگایا۔

اونچا زوردار قہقہہ۔



”اف..... او۔“ مریم نے کتاب بند کر کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے کنپٹیوں کو دبایا۔

کوئی ایک لفظ بھی تو ذہن میں نہیں بیٹھ رہا۔ پاپا کی بیماری کی وجہ سے وہ کئی دن کالج نہیں آئی تھی
اور بہت کچھ پڑھنے کو باقی تھا اور مس مہرین تو خواہواہ ہی خفا ہو جاتی ہیں اور جب سے عثمان احمد گھر آئے

تھے ان کے بلکہ ان سے زیادہ ماما کے دوستوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ایک آرہا تھا ایک جا رہا تھا اور یہ انکل
مجتبیٰ تو ہر دوسرے تیسرے دن چلے آتے تھے اور اگر نہ آتے تو پاپا خود فون کر کے بلا لیتے تھے اور اب پتا
نہیں کیوں ماما ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی تھیں۔ وقفے وقفے سے مجتبیٰ حیدر کے اونچے زوردار قہقہے مریم کو
ڈسٹرب کر رہے تھے۔

اور یہ انکل مجتبیٰ۔

”پتا نہیں آج بھی کہانیاں لکھتے ہیں یا نہیں..... اور پتا نہیں وہ کہانی انہوں نے لکھی بھی تھی یا نہیں۔“
اس کا جی چاہا وہ ان سے پوچھے کہ انہوں نے وہ کہانی لکھی تھی اور..... اور یہ کہ کیا واقعی ماما اس سے مجلس
ہوتی ہیں۔

اور بھلا کوئی ماں بھی اپنی بیٹی سے مجلس ہوتی ہے۔

اور پتا نہیں یہ انکل مجتبیٰ ایسا کیوں کہتے تھے۔

اور پھر وہ ماما جیسی خوبصورت بھی نہیں۔

وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔ زینب عثمان سے باتیں کرتے کرتے مجتبیٰ حیدر نے
سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”السلام علیکم انکل۔“

مجتبیٰ حیدر نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر زینب عثمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ.....“

”مومو ڈراؤ دیکھو تمہارے پاپا اگر جاگ رہے ہوں تو انہیں مجتبیٰ صاحب کا بتا دو۔“ زینب عثمان نے
ذرا سی گردن موڑ کر مریم کی طرف دیکھا۔ جوان کے پیچھے کھڑی تھی۔

عثمان احمد جاگ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرائے اور وہ انہیں مجتبیٰ حیدر کا بتا کر باہر لان میں آ گئی۔

خدا کا شکر ہے کہ پاپا ٹھیک ہو کر گھر آ گئے ہیں۔ اس نے بیٹھے ہوئے سوچا۔

اگر پاپا کو کچھ ہو جاتا تو..... اس نے جھر جھری سی لی۔

اسے یوں لگتا تھا جیسے پاپا کو کچھ ہو گیا تو وہ اکیلی رہ جائے گی۔

بالکل تنہا اور اکیلی۔

عاشی نینا اور تیور مری میں تھے۔

اور ماما..... ماما پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور لگتی تھیں۔ کبھی کبھی تو بالکل اجنبی لگنے لگتی تھیں۔

اجنبی اور غیر۔

وہ پاپا کے عاجز انداز اور مسکین انداز سے چڑتی تھی، الجھتی تھی لیکن وہ ان سے شدید محبت کرتی تھی۔ اس کا

”انکل جتنی۔“ اس نے انہیں پکارا تو اپنی گاڑی کی طرف جاتے جاتے جتنی حیدر نے پلٹ کر

دیکھا۔

”انکل جتنی۔“ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ ”آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔“

”ضرور۔“ وہ شفقت سے مسکرائے ”جب میں یہاں سے گیا تھا تو تم اتنی سی تھیں۔“ انہوں نے ہاتھ

برابر کیا۔ ”اور اب اتنی بڑی ہو گئی ہو۔“

”اور جب میں اتنی سی تھی۔“ مریم بے حد سنجیدہ تھی ”تو آپ نے کہا تھا مومنو تمہاری ماما تم سے جلیس

ہوتی ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ آپ نے کیوں کہا تھا؟“

جتنی حیدر کی پیشانی پر سوچ کی کیریں ابھر آئیں۔ انہیں بالکل یاد نہیں تھا کہ انہوں نے ایسی کوئی

بات کہی تھی۔

”اور کیا آپ نے ایسی کوئی کہانی لکھی جس میں ایک ماں اپنی بیٹی سے جلیس ہوتی ہے۔“

مریم کی سوالیہ نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں لیکن پھر انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں بیٹا۔ میں نے ایسی کوئی کہانی کبھی نہیں لکھی اور یہ کہ میں نے آپ سے کبھی

ایسی کوئی بات کہی تھی؟“

”آپ نے کہا تھا انکل۔“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔

”شاید کہا ہو۔“ جتنی حیدر نے اپنی نگاہیں جھکا لیں ”لیکن بیٹا میں تو یوں ہی اول فول بکرا رہتا ہوں

بعض اوقات یوں ہی بغیر سوچے سمجھے بول دیتا ہوں۔ شاید ایسی کوئی بات مذاق میں کہہ دی ہو میں نے۔“

”اور آپ کی مذاق میں کبھی ہوئی بات نے مجھے برسوں الجھائے رکھا۔ میں آج بھی خوف زدہ اور کبھی

ہوئی ہوں کہ جانے کب ماما مجھ سے۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم پلٹ گئی۔

”آئی ایم سوری۔ آئی ایم ریلی دیری سوری۔“ انہوں نے معذرت کی۔ وہ دل ہی دل میں عذامت

محسوس کر رہے تھے۔

اس نے مڑ کر انہیں دیکھا اور کیاری پھلانگ کر واپس لان میں چلی آئی۔ وہ لمحہ بھر نام سے وہاں ہی

کھڑے رہے۔ بعض اوقات آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس کی یوں ہی کبھی ہوئی کوئی بات کسی دل کو کتنی

تکلیف دیتی ہے اور اس لڑکی نے جو جب ذرا سی تھی اس بات کو یاد رکھا ہوا ہے جو شاید یوں ہی انہوں نے

مذاق میں کہہ دی ہوگی۔

وہ نام سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے اور مریم کو یوں لگا جیسے ایک کاٹا سا جو اس کے دل میں چھا

تھا نکل گیا ہوا اور وہ جو ایک خوف کا ڈر کا حصار سا اس کے گرد گھنپا ہوا تھا وہ اس حصار سے باہر نکل آئی ہو۔

اس کے ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ آگئی۔

اندازہ اسے اب ہوا۔ جتنے دن وہ اسپتال میں رہے وہ کالج نہیں گئی تھی۔ سارا وقت اسپتال میں رہتی تھی

حالانکہ ماما نے کتنی بار اسے ڈانٹا تھا۔ چڑتی تھیں کہ وہ کالج کیوں مس کر رہی ہے لیکن اسے تو لگتا تھا کہ وہ

کالج جانے کی تو پیچھے سے پاپا کو کچھ ہو جائے گا۔

”یہ مومنو تو دیوانی ہو گئی ہے۔“ ماما نے مس آفندی سے شکایت کی تھی ”چوبیس گھنٹے کے لیے نرس موجود

ہے لیکن۔۔۔۔۔ ذرا احساس نہیں کہ کتنا حرج ہو رہا ہے اس کا۔“

”ماما پلٹے مجھے رہنے دیں پاپا کے پاس میں اپنی کمر پوری کر لوں گی۔ بس پاپا اچھے ہو جائیں ایک بار۔“

اور پاپا نے بھی ان دنوں کتنی باتیں کی تھیں اس سے اور اس نے بھی اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا

۔۔۔۔۔ ساری شکایتیں سارے گلے شکوے۔

”باگل ہو تم۔“ انہوں نے اسے سمجھایا تھا ”میں اور تمہاری ماما ہم دونوں تم سے بہت پیار کرتے ہیں

اور کبھی کبھی زہنی جو تم پر غصہ ہوتی ہے تو وہ اپ سیٹ ہوتی ہے تب۔ تمہیں تو پتا ہے کہ اپنی بیماری کی وجہ سے

کبھی کبھی شینس ہو جاتی ہیں۔“

”وہ تو بیمار ہوتی ہیں لیکن پاپا آپ بھی تو بدل جاتے ہیں۔ آپ نے بھی تو کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ

مومنو تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تم اپنی کنوینس کے باوجود دیگر لوگوں پر کیوں جاتی ہو؟“

اس نے پرانی بات یاد دلائی تو وہ مسکرا دیے۔ ہولے سے اس کے ہاتھ تھپتھپائے۔

”بیٹا، ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، میں رہوں یا نہ رہوں۔ تم مجھے نینا، عاشی اور تیور سے زیادہ عزیز

اور زیادہ پیاری ہو۔“

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے ”آئی نو پاپا۔۔۔۔۔“

اور وہ ہیں اسپتالی میں ہی کتنی بے تکلفی سے اس نے پاپا کو بتا دیا تھا کہ اسے ان کا وہ یس مین والا

رویہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ پاپا کو بس پاپا ہونا چاہیے جو ماما کو کسی غلط بات پر ڈانٹ بھی سکیں اور باز پرس

بھی کر سکیں۔

اور عثمان احمد کھل کھلا کر غصے پڑے تھے۔

”تمہاری ماما جب بیمار ہوتی ہیں تو وہ چاہتی ہیں کہ ان کی ہر بات پر ایگری کیا جائے۔“ پاپا اسے دیر

تک سمجھاتے رہے تھے۔

اور جیسے اس کے سارے گھج گھل گئے تھے اور وہ بہت ہلکی پھلکی ہوئی تھی کہ نہ جانے یہ انکل جتنی کہاں

سے آچکے تھے کہ ایک برسوں پرانی بات کی یاد نے اسے بھی ڈسٹرب کر دیا تھا۔

تب ہی دروازہ کھلا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جتنی حیدر باہر آرہے تھے۔ وہ ایک دم کھڑی ہوئی

تھی۔ ماما انہیں وہیں سے خدا حافظ کہہ کر پلٹ گئیں۔ وہ کیاریاں پھلانگ کر مین گیٹ کے قریب آگئی۔

اسے لگا جیسے وہ آج سے ایک مختلف لڑکی ہے۔ ایک دم ہی اس کی کایا پلٹ گئی ہو۔ اب کوئی خور کوئی ڈرنہیں ہے اور پھر اب تو پاپا نے بھی اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی ہر بات ہر خوف ہر ڈر ہر سوچ ان ڈسکس کر سکتی ہے۔

اس نے سوچا۔

کسی دن وہ پاپا کو ڈاکٹر معید کے متعلق بھی بتا دے گی۔

ڈاکٹر معید اور عاشی۔

ہے ناں عجیب بات۔

اور عاشی کو پتا بھی نہیں کہ..... ڈاکٹر معید بہت اچھے ہیں۔ مسز آفندی اور ڈاکٹر نرگس فضول بولتی ہیں۔ اور جب عاشی کو کبھی پتا چلے گا کہ ڈاکٹر معید نے اسے آج نہیں بلکہ بہت پہلے پسند کیا تھا تو وہ کس قدر حیران ہوگی.....

اور..... اور.....

اس نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے کھول دیں۔

وہ ڈاکٹر شہریار..... یعنی کے بھائی کس قدر مہربان ہیں۔ بالکل ڈاکٹر معید کی طرح اور ڈاکٹر دل کو اب بھی ہونا چاہیے۔ مہربان اور شفیق۔

اور ڈاکٹر شہریار۔

کبھی کبھی کس طرح دیکھتے تھے، گہری گہری نظروں سے۔

”بی بی آپ کو صاحب بلارہے ہیں۔“ شریف نے باہر آ کر کہا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔



مریم، تیمور اور نینا کا ہاتھ تھا جسے ہنسی مسکراتی گھر میں آئی تو ڈرائنگ روم سے قہقہوں کی آواز آ رہی تھیں.....

”شاید ماما آگئی ہیں۔“ وہ وہیں کوریڈور میں رک گئی۔

تیمور نے ہولے سے اس کا ہاتھ بلایا ”مومو میں ماما کے پاس جاؤں؟“ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے ہونٹ کھل گئے تھے۔

”ہوں۔“ اس نے تیمور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”میں بھی۔“ نینا نے تو پچھا تو اس نے سر ہلادیا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم کی طرف بھاگ گئے۔ ماما کو پتا بھی تھا کہ نینا، مورا اور عاشی آنے والے ہیں پھر بھی وہ چلی گئی تھیں۔ تیمور اور نینا کا کیسا ذرا منہ نکل آیا تھا جب گھر آ کر انہیں ماما نظر نہیں آئی تھیں۔ نینا تو باقاعدہ روئے لگی تھی اور عثمان احمد نے بہا

پیارے اسے سمجھا تھا کہ ماما کو بہت ضروری کام سے جانا تھا اس لیے وہ چلی گئیں اور یہ کہ وہ جلد ہی واپس آ جائیں گی..... انہوں نے نینا اور تیمور کو بہلا لیا تھا۔

دراصل نذیب عثمان نے مجتبیٰ حیدر کے لاٹک پلے میں کام کرنا منظور کر لیا تھا اور اس ڈرامے کی آؤٹ ڈور شوٹنگ سوات میں ہونا تھی سو جب بچے گھر پر آئے تو وہ گھر پر نہیں تھیں۔ تیمور اور نینا تو انہیں بہت یاد کرتے تھے۔ مریم انہیں بہلائے رکھتی تھی۔ وہ ان دنوں بہت پر اعتماد ہو گئی تھی۔

جیسے وہ یک دم بہت بہادر ہو گئی ہو۔

اور بہت محفوظ۔

عثمان احمد نے اسے یہ اعتماد اور یقین دیا تھا۔

اور مجتبیٰ حیدر کی آمد نے اس کے خوف اور ڈر ختم کر دیے تھے۔ اب وہ ماما کے دوستوں کی آمد پر برا نہیں مناتی تھی۔ جب سے انہوں نے ڈرامے میں کام کرنے کی ہامی بھری تھی ایک بار پھر ان کے گھر میں مٹھلیں جسنے لگی تھیں۔

مجتبیٰ حیدر

شرجیل مرزا

میڈم نرگس

آئی آفندی

اور دوسرے بہت سے لوگ جنہیں وہ اچھی طرح جانتی بھی نہیں تھی ان میں سے کئی لوگ نذیب عثمان کے ساتھ اس پلے میں کام کر رہے تھے۔

اس نے بہت حد تک گھر کے ماحول سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ پاپا کے سمجھانے پر وہ شرجیل مرزا کی بات تحمل سے سن لیتی۔ مجتبیٰ حیدر کا احترام کرتی۔ ماما بھی اب اس سے خوش تھیں اور انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اچھے نمبروں سے سی ایس سی کرنے کے بعد وہ اسے گاڑی گفٹ کریں گی۔ ان بیٹے دنوں میں اس نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور کبھی بکھار پاپا کی گاڑی لے کر ڈرائیو کے لیے چلی جاتی تھی۔ آج بھی وہ تینوں کو لے کر باہر گئی تھی۔ عاشی کو اس کی دوست کے گھر ڈراپ کر کے اس نے نینا اور تیمور کو آنسکریم کھلائی تھی، شاٹنگ کروائی تھی۔ وہ بہت دیر تک یوں ہی گھومتے رہے تھے۔

اندرا ڈرائنگ روم میں ایک شوراٹھا تو وہ چونکی۔ سب نہ جانے کس بات پر نرس رہے تھے اور مجتبیٰ حیدر کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

”اور یہ انکل مجتبیٰ کتنا اونچا قہقہہ لگا رہے ہیں۔“

ہر عمر کا مرد چاہے وہ کتنا بھی شریف کیوں نہ ہو عورت کو کافی آنکھ سے ضرور دیکھتا ہے۔

مجتنی حیدر کی آواز بھی ان کے قہقہے کی طرح بلند تھی۔

جو مرد کمزور ہوتا ہے گھر میں بیوی سے دہتا ہے بیوی کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے۔ جسے عرف عام میں جوڑو کا غلام کہتے ہیں وہ باہر بڑا کھل کر کھیلتے ہیں۔ وہ دراصل بے وقار مرد ہوتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ گھر میں بھی باہر بھی۔

”کیا پاپا بھی۔“ مریم کے تصور میں عثمان احمد آئے۔ ماما کے پیچھے پیچھے غلاموں کی طرح ہر غلام کی بات پر لیس کہتے ہوئے۔ مگر نہیں انکل مجتنی کی تو عادت ہے یوں ہی بات کر دیتے ہیں بنیر کی دلیں اور ثبوت کے۔

”مومو! آپ ابھی تک یہیں کھڑی ہیں۔“ تیمور نے نب عثمان سے مل کر واپس آ گیا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو وہ چونگی۔

”ماما سے مل لے؟“

”وہ مصروف تھیں۔“ تیمور نے منہ بنایا ”انہوں نے مجھے کس کیا اور کوئی بات ہی نہیں کی۔“

”ہاں! مہمان جو آئے ہوئے ہیں۔“ وہ اسے بہلاتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔ نینا بھی آگئی تھی۔

کچھ دیر تک وہ ان سے باتیں کرتی رہی پھر انہیں ٹی وی کیم میں مصروف کر کے باہر آگئی۔ ڈرائنگ روم سے اب بھی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید ابھی تک سب موجود تھے۔ اس نے کچن میں جھانکا۔ صفواں شریف کچن میں نہیں تھے۔ شاید دونوں ہی ڈرائنگ روم میں تھے۔ چائے وغیرہ سرو کر رہے ہوں گے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے سوچا خود ہی چائے بنالے لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسٹڈی کا دروازہ نیم وا تھا۔

”کیا پاپا اسٹڈی میں ہیں؟“ اس نے سوچا۔

”اور یہ آج کل پاپا مہمانوں کو کم ہی ایڈیٹ کرتے ہیں حالانکہ آج تو انکل مجتنی بھی ہیں اور انکل مجتنی کی کپنی کو تو پاپا بہت انجوائے کرتے ہیں اور پھر ماما پورے ایک ہفتے بعد آتی ہیں۔ پاپا کو تو وہیں ہونا چاہیے تھا۔ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی۔“ ہتا نہیں کیوں اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں پاپا پہلے کی طرح اچانک بیمار نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر رافع نے کتنی تاکید کی تھی انہیں احتیاط کی اور وہ ذرا احتیاط نہیں کرتے تھے۔

پریشان ہو کر اس نے دروازے کو دھکیلا۔ سامنے ہی عثمان احمد کرسی کی پشت سے سر نکالے آنکھیں موندے جانے کیا سوچ رہے تھے اور ان کی گود میں کوئی کتاب دھری تھی۔

”شاید پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے۔“

”پاپا!.....“ مریم نے اندر قدم رکھتے ہوئے آہستگی سے انہیں آواز دی تو انہوں نے چونک کر آنکھیں

کھول دیں اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”تم لوگ آگئے؟“

”جی پاپا۔“ موراد رینا اپنے کمرے میں ہیں اور عاشر اپنی دوست کے گھر۔ میں نے چاچا اسلم سے کہہ دیا ہے۔ وہ دو گھنٹے تک اسے جا کر لے آئے گا۔“ وہ آگے بڑھ کر قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی اور ان گھنٹوں پر اب ہاتھ رکھ دیے۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا پاپا؟“

”بالکل فائن۔“ وہ مسکرائے۔

”تو پھر آپ ادھر اکیلے کیوں بیٹھے ہیں ادھر سب کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھے؟“

”دراصل وہ کسی نئی ڈراما سیریز پر بحث کر رہے تھے۔ میں بور ہو رہا تھا سوا دھڑچلا آیا۔ یوں بھی میں

بہت دلچسپ کتاب پڑھ رہا تھا۔“

”پاپا آپ ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں۔ تھکتے نہیں ہیں؟“

”نہیں۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔“

”پاپا ایک بات پوچھوں؟“ مریم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”ضرور۔“ انہوں نے شفیق لہجے میں کہا۔

”پاپا کیا ماما کا ڈرامے میں کام کرنا اچھا لگا ہے آپ کو؟“

انہوں نے لمحہ بھر سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا ”نہیں۔“

”تو پھر آپ نے انہیں منع کیوں نہیں کیا کہ وہ کام نہ کریں۔“

”انہیں جو پسند ہے بیٹا۔“

”لیکن انہیں آپ کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔“

اس کے لہجے میں زور تھا۔ عثمان احمد نے غور سے اسے دیکھا۔

اعتماد کی روشنی اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔

ان کی ڈرامی توجہ نے اسے کتنا بدل کر رکھ دیا تھا اور زینی نے خواجہ اسے اگتور کر رکھا تھا۔

ہتا نہیں کیوں واہموں میں پڑی رہتی ہے۔

جانے کیا خوف ستاتے رہتے ہیں اسے۔ اپنی ہی بیٹی سے خفا رہتی ہے۔

”جیہا۔ میں ماما سے کہوں کہ آپ کو پسند نہیں ہے ان کا ٹی وی ڈراموں کے لیے کام کرنا۔“

”نہیں بیٹا اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اچھا!.....“ لمحہ بھر کو اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر نارمل ہوگئی۔

”پاپا! انکل بھتی کیسے آدمی ہیں؟“

”بہت نفیس، بہت اچھے۔“

”مگر پاپا وہ تو بہت عجیب باتیں کرتے ہیں۔ بالکل انوکھی باتیں۔“

”ادیب آدمی ہے۔ باتوں میں بھی کہانیاں بولتا ہے۔“

”مگر پاپا! یہ تو صحیح بات نہیں ہے۔ لوگ ان کی باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہوں گے اور پتا ہے پاپا!..... وہ“

کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے بھتی حیدر کی باتوں کو ذہن سے جھٹکا اور غور سے انہیں دیکھا۔

کتنی زبردست پرنسپلٹی ہے پاپا کی۔

اتنے اسرار اور وجہہ لگتے ہیں اب بھی پھر بھی ماما کے سامنے بھیگی ملی بن جاتے ہیں پتا نہیں کیوں

اور وہ بھتی انکل کہہ رہے تھے کہ ایسے مرد.....

اف یہ باتیں تو ذہن سے ہی چپک گئی ہیں۔ اس نے شعوری کوشش سے ان باتوں کو ذہن سے جھٹکنے

کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”پاپا! میں اپنے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں آپ پیئیں گے؟“

”اپنی بیٹی کے ہاتھ کی ضرورت یوں گا۔“

وہ بڑے مان کے ساتھ مسکراتی ہوئی باہر آئی۔ شرجیل مرزا ایک دم سامنے آگیا۔ اس نے کترا کر گزرتا

چاہا تو اس نے راستہ روک لیا۔

”تم مجھ سے اتنا کتراتی کیوں ہو مریم؟“

”اس لیے کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔“

لحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہنسنے لگا۔

”لیکن ہم تو تم سے محبت کرتے ہیں۔“

”سٹ اپ۔“ بے اختیار ہی اس کا ہاتھ اٹھ گیا۔ شرجیل کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت

نظر آئی پھر ان میں سرخ ڈور سے تیرنے لگے۔

”تم.....“

ابھی لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ زنب عثمان ڈرائنگ روم سے باہر آئیں۔

”ارے شچی! تم ابھی یہاں ہی ہو۔“ بہت محبت بھرا لہجہ تھا ان کا۔ مریم سگ کر رہ گئی۔

”ماما! اس گھٹیا آدمی کو یہاں آنے سے منع کر دیں۔“

”مومو۔“ وہ غصے سے چیخیں ”سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔“

”سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہی ہوں۔“

اس سے حلق میں ڈھیر سارے آنسو اکٹھے ہو گئے تو وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی

اور ستر پر لیٹ کر رونے لگی۔

”تم نے اس سے کیا کہا تھا شچی؟“ ماما کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”کچھ نہیں زینی۔ تمہاری یہ لڑکی تو پاگل ہے۔“

”گھٹیا! کمینڈو غلا۔“ روتے روتے وہ سر اٹھا کر..... بڑبڑائی اور پھر رونے لگی۔

بہت دیر بعد عثمان احمد نے اندر آ کر ہولے سے اسے آواز دی۔

”مومو۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ”مومو! میں تو سمجھ رہا تھا اب تم بہت سمجھ دار ہو گئی ہو لیکن.....“ وہ بے حد

خجندہ لگ رہے تھے۔ اس کے بہتے آنسو ایک دم رک گئے ”تم نے شرجیل کو تھپڑ مارا۔“

”پاپا! وہ۔“

”نہیں مومو! تمہارا یہ رویہ قابل برداشت نہیں ہے۔ گھر آئے مہمانوں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے؟“

ماما نے جانے کیا کیا شکایتیں لگائی تھیں کہ وہ اتنے غصے میں تھے۔

”تو کیا اس کی خوشی اتنی ہی عارضی اور مختصر تھی صرف چند دنوں کے لیے۔“

”اور کیا پاپا اب پھر اس سے ناراض ہو جائیں گے۔“

”اور پھر وہ مستحب ٹھہرا دی جائے گی اور ماما اس سے بات کرنا چھوڑ دیں گی۔“

”یا اللہ اس کی خوشیاں اتنی مختصر کیوں ہوتی ہیں۔“

اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

”تم نے..... تم نے اس سے پوچھا عثمان اس نے شچی کو تھپڑ کیوں مارا تھا؟“ زنب عثمان غالباً شرجیل

کو نصحت کر کے آئی تھیں۔

”یہ..... یہ نارمل نہیں ہے عثمان۔ تم خواہو اس کی سرائیڈ لیتے ہو۔“

”مومو! میں آئندہ تمہاری شکایت نہ سنوں۔“ انہوں نے مرکز زنب عثمان کی طرف دیکھا اور پھر اس

کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”آپ میری بھی تو بات سنیں پاپا۔“ اسے غصہ آ گیا تھا ”وہ گھٹیا آدمی مجھ سے فلت کر رہا تھا۔“

عثمان احمد کی نظریں جھک گئیں۔

”لیکن مومو! وہ تمہاری ماما کا.....“

انہوں نے پھر مرکز زنب عثمان کی طرف دیکھا جو دروازے پر ایک ہاتھ دھرے انتہائی غصے سے اسے

دیکھ رہی تھیں۔

مریم نے ان کی بھیجی ہوئی نظروں کو دیکھا اور پھر ان کے پیچھے کھڑی ماما کو۔

”میں اسے پھر بھی تھپڑ مار سکتی ہوں اگر اس نے پھرے ساتھ بدتمیزی کی اور ماما اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں شرجیل مرزا کی عزت کروں تو اسے سمجھا دیں کہ وہ اپنی حدود میں رہا کرے۔“

عثمان احمد نے اس کے پتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئے۔ زینب عثمان نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”مومنو! مجھ سے تمہاری یہ بدتمیزی برداشت نہیں ہو سکتی۔ اگر آئندہ تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں تمہیں.....“

”زینی کم آن ریلیکس ڈیز ہجی ہے۔“ عثمان احمد واپس پلٹ آئے تھے۔

”یہ سب تمہاری شہ ہے عثمان۔“ وہ ان کی طرف مڑیں ”تم نے آج کل اسے بہت سرچڑھا رکھا ہے۔ ورنہ اس کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ یہ شرجیل مرزا پر ہاتھ اٹھاتی۔“

اس نے کن آنکھوں سے دیکھا۔ پاپا ماما کا بازو تھامے مضطرب مضطرب سے باہر جا رہے تھے اور وہ مسلسل ان سے الجھ رہی تھیں۔

اس کا دل پاپا کے لیے دکھا اور اسے افسوس ہوا کہ کیوں اسے اتنا غصہ آ گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ایسی باتیں برداشت نہ کر پاتی تھی۔ کیا تھا اگر وہ شرجیل مرزا کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر واپس پاپا کی اسٹڈی میں چلی جاتی۔

جانے اسے کب عقل آئے گی۔ کب سمجھے گی وہ مصلحتیں اور وقت کے تقاضے۔

اور شکر ہے کہ سب لوگ جا چکے تھے۔ ورنہ.....

ورنہ وہ میڈم نرگس کیسے تسخیر سے دیکھتی تھیں ایسے موقعوں پر جب ماما پاپا سے الجھتی تھیں۔

”پلیز زینی۔“ باہر سے پاپا کی نرم آواز آئی ”جانی حوصلہ کیا کرو۔ برداشت پیدا کرو اپنے اندر۔“

”میں فچی سے کیسے نظریں ملاؤں گی۔ باس ہے وہ میرا۔“

”میں خود معذرت کر لوں گا اس سے۔ تم شوٹنگ سے تھکی ہوئی آئی ہو۔ ریٹ کرو۔“

اور پھر زینب عثمان کی سکیوں کی آوازیں۔

اور اب پھر وہی ڈراما دہرایا جائے گا۔

ماما کا شدید سر درد۔

ڈیپریشن۔

صبح شام ڈاکٹر بادی کی آمد۔

میڈم نرگس کا مستقل قیام اور.....

”افوہ تو بہ.....“ اس کے اپنے سر میں بیسیں سی اٹھنے لگیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا

اور ہولے ہولے دبانے لگی۔



ڈولی نے علیحدگی حاصل کر لی تھی۔

ممی ڈیڈی نے سمجھایا۔

دوست احباب نے صلح کی کوشش کی لیکن بے سود۔

تمام ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر وہ اپنے اپارٹمنٹ میں آیا تو اس کا دل گھبرانے لگا۔ ڈولی جا چکی تھی لیکن سکندر کوگا جیسے وہ اپنے وجود کا کوئی حصہ وہاں ہی چھوڑ گئی ہے۔

بیڈروم میں

سٹنگ میں

لاؤنج میں ہر جگہ اسے اس کے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

لاؤنج کے صوفے پر اس کا کوئی بیکار پرس پڑا تھا۔

بیڈروم میں جو تھے تھے جنہیں وہ چھوڑ گئی تھی۔

کچھ دیر تک وہ یوں ہی بے دھیانی میں بیڈروم کے وسط میں کھڑا رہا اور پھر لاؤنج میں آکر صوفے پر گر سا گیا۔

”تو اس سارے قصے کا انجام یہ ہوا.....“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ڈولی کو کیا یک اس سے اتنی شدید شکایتیں کیوں پیدا ہو گئی تھیں۔ اگر کچھ تھا بھی تو کوئی سمجھوتا کیا جاسکتا تھا۔ اس نے تو ڈولی کی ہزبات مان لی تھی۔ حتیٰ کہ بچوں کی خواہش بھی ختم کر دی تھی۔

پھر بھی وہ دونوں ایک چھت تلے نہ رہ سکے تھے۔

اور ڈولی چلی گئی تھی۔

جس طرح وہ خود اس کی زندگی میں اپنی مرضی اور خواہش سے شامل ہوئی تھی اسی طرح اپنی مرضی سے چلی گئی تھی۔

آج بڑے دنوں بعد اسے رضوانہ کا خیال آیا۔

محسن وقار یاد آیا۔

اس کی معصوم باتیں یاد آئیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ رضوانہ بہت سادہ دل اور معصوم ہے۔ بالکل کنیز پھوپھو کی طرح۔ اس کا دل نہ دکھانا۔

شاید میں نے اس کا دل دکھایا تھا۔

اور خدا نے مجھے سزا دی ہے۔

وہ روئی تو بہت ہوگی۔

اور شاید اب بھی راتوں کو روتی ہو چھپ چھپ کے۔

کیا پتا بابا نے اس کی شادی کر دی ہو۔

اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بہت خوش ہو اور اس نے کبھی مجھے یاد ہی نہ کیا ہو۔

اور بابا ماں جی۔

بھابھو بھاننار۔

پتا نہیں سب کیسے ہوں گے۔ اسے یاد کرتے ہوں گے یا نہیں۔

بابا تو اس سے بہت خفا ہوں گے۔

اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں چاچا کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دے گا لیکن پھر.....

کیا وہ اب بابا کا سامنا کر سکے گا۔

نہیں، کبھی نہیں۔

وہ کبھی بھی بابا کے سامنے نہیں جاسکے گا۔

اس نے بابا کا مان توڑ دیا تھا۔

رضوانہ کے یقین کو کرچی کرچی کیا تھا۔

اسے اتنے مضبوط بندھن میں باندھ کر بھلا دیا تھا اور کتنی آسانی سے اس بندھن کو توڑ دیا تھا۔

وہ رات گئے تک یوں ہی صوفے پر آنکھیں موندے لیٹا رہا۔

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے وہ اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نہیں نکلا۔ جاب پر نہیں گیا اور اپنے آپ سے

البتہ رہا۔ خود کو سینہ مارا۔

اس کے اندر بے تحاشا ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ ڈولی نے اس طرح علیحدگی حاصل کر کے خود اسے

اس کی نظر میں میں گرا دیا تھا۔ اپنی توہن کا بدلہ لیتا تھا اس سے۔

یہ احساس اسے کچھ کے لگا تا رہتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اڑتا ہوا اپنے گاؤں پہنچ جائے۔ ماں جی

اور بابا کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگ لے۔ یقیناً وہ اسے معاف کر دیں گے۔

لیکن پھر خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دیتا۔

”نہیں نہیں وہ نہیں جائے گا۔ وہ ماں جی کا سامنا نہیں کر سکتا..... وہ رضوانہ سے نظریں نہیں ملا سکتا۔“

اسے بہت سارے دن سنبھلنے میں لگ گئے لیکن ہولے ہولے سنبھل گیا اور زندگی کی دلچسپیوں میں خود

کو گم کر کے ڈولی کے دیے ہوئے زخم بھلانے کی کوششیں کرنے لگا۔ اکثر رات گئے تک کسی بے بیضا

غم غلط کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ بہت ساری لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں لیکن وہ کہیں کسی کے پاس

نہیں رکا۔

مارتھا، جینی، غزالہ، رافہ اور وہ ہندو لڑکی ربی۔ وہ تو مذہب تک چھوڑنے پر تیار ہو گئی تھی۔ ربی جو اس کی مریدہ

تھی۔ اسے فٹس پڑتے تھے۔ اسے اپنے والدین سے بہت شکایتیں تھیں۔ بہت خفا، حتیٰ کہ وہ سب سے

”ڈاکٹر مجھے شادی کرلو۔ میں مسلمان ہو جاؤں گی۔“

اسے لگا جیسے ربی..... ربی نہیں ڈولی ہے۔ وہ وہاں سے جاب چھوڑ کر انگلینڈ آ گیا۔

وہ کسی ایک جگہ ٹھہرا نہیں۔ کبھی انگلینڈ، کبھی ہالینڈ، کبھی فرانس، کبھی جرمنی۔ جانے کس سے بھاگ رہا

تھا وہ۔ کس سے فرار حاصل کر رہا تھا وہ۔ اسے خود سمجھ نہیں آتی تھی۔

اور مسلسل بیس سال بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا۔

آخر اپنے آپ سے بھاگ کر آدمی کہاں جاسکتا ہے۔

وہ بے دم ہو کر گرا تو اسے اپنے سب پھر بہت یاد آئے۔ بھولا تو وہ انہیں کبھی بھی نہیں تھا۔ ہاں بھلانے

کی کوشش ضرور کرتا رہا تھا لیکن بھلا نہیں پایا تھا۔

اس رات ڈاکٹر حامد خاں کے گھر سے کھانا کھاتے ہوئے وہ بے طرح اداس تھا۔ اس پر ڈاکٹر حامد کا

فیصلہ اسے اور اداس کر گیا۔

”ہم لوگ بہت جلد واپس پاکستان جا رہے ہیں۔“ مسز حامد نے بتایا۔

”کیوں؟“ اسے حیرت ہوئی۔ پاکستان میں تو ان کا کوئی نہ تھا۔ پھر.....

”یار میں نے سوچا ہے، آخر عمر اپنے وطن ہی میں گزارنا چاہیے۔ مرنے کے بعد اپنے وطن کی مٹی تو

نصیب ہو۔“ ڈاکٹر حامد نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر حامد اس کے کوئی تھے۔ یہاں ہالینڈ کے اس اسپتال میں اسے جاب کیے زیادہ عرصہ نہیں ہوا

تھا اور اس تھوڑے سے عرصے میں ہی ڈاکٹر حامد اور ان کی فیملی کے ساتھ وہ بہت گھل مل گیا تھا اور اکثر

ویک اینڈز ان کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ ان کے بچوں میں اس کا دل خوب لگتا تھا۔

اس رات اپنے گھر آ کر وہ بہت دیر تک ڈاکٹر حامد کی بات پر غور کرتا رہا۔

”ہاں موت کے بعد تو اپنے وطن کی مٹی ہی نصیب ہوئی چاہیے۔“ اس نے سوچا اور وطن جانے

کا فیصلہ کر لیا۔



دور کہیں کسی مکان کی چھت پر مرنے والا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

کہیں کہیں انکا دکا ستارے چمک رہے تھے۔

شاید صبح ہونے والی ہے۔ اس نے کروٹ بدل کر چوہدری بٹار کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔
 ”بھائی آپ جاگ رہے ہیں؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
 ”لیٹنا رہ سکندر۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں بھائی، نیند نہیں آ رہی اور اب تو ویسے بھی صبح ہونے والی ہے۔“
 دور کہیں پھر مرغا بولا۔
 بھانٹا اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”تم رات بھر سوئے نہیں سکندر۔“

”جی ہاں نہیں کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ مدتوں بعد یہ خنک ہوا محسوس کی ہے میں نے۔ جی چاہ رہا تھا ان ہواؤں کو اپنی مٹھیوں میں بند کر لوں۔ لپٹ جاؤں ان کے ساتھ۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔
 چوہدری بٹار نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے ہاتھ کو ہولے سے تھپکا۔
 ”بھائی.....“ اس نے جھپکتے ہوئے پوچھا..... ”رضوانہ کیسی ہے..... خوش ہے نا اپنے گھر میں؟“
 ٹکجے سے اندھیرے میں چوہدری بٹار کچھ دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتے رہے پھر آہستگی سے کہا۔
 ”ہاں ایک بیٹا ہے اس کا۔ لاہور میں پڑھتا ہے۔ بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار لڑکا ہے۔“
 ”اور اس کا شوہر کیا کرتا ہے۔ کہاں شادی ہوئی تھی اس کی۔ اپنے عزیزوں میں؟“ اس نے گاہیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

”نہیں غیروں میں۔ یہ ساتھ والے پنڈ کے چوہدری البصار ہیں ناں۔ ان کے بیٹے سے۔ پڑھا لکھا تھا۔ شہر میں رہتا تھا۔ بہت دیکھ بھال کے بعد شادی کی تھی بابا نے اس کی۔ بہت شرمندہ تھے وہ اس سے لیکن۔“
 ”لیکن کیا؟“ اس نے تڑپ کر بھانٹار کی طرف دیکھا۔
 ”بس اس کے حق میں اچھا نہیں لگلا اس کا شوہر۔“
 ”اوہ.....“ اس نے لب سمجھنے لیے۔ دل میں جیسے خنجر سا آگیا..... ”ممناء گار تو وہ تھا اسے کس قصور کی سزا ملی تھی۔“

اس نے سوچا۔ ”لیکن شاید بعض اوقات کسی ایک کے گناہوں کی سزا بہت دور تک چلی جاتی ہے۔“
 ”رضوانہ نہیں مانتی تھی شادی کے لیے۔ بابا نے اپنی قسم دے دی۔ پکڑی اتار کر اس کے پاؤں پر رکھ دی اور وہ خاموش ہو گئی۔“ بھانٹار نے بتایا۔
 وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”چل نیچے چلے ہیں۔ تیری بھابھ بھی جاگ رہی ہوگی۔ کہاں نیند آئی ہوگی اسے۔ بہت یاد کرتی تھی تجھے۔ ماں جی اور بابا کے بعد تو اس نے عادت ہی بنالی تھی کہ ہر شام چراغ شاہ کے مزار پر دیا جلاتی۔ مسجد

میں تل ڈالتی اور تیری سلامتی کی دعا مانگتی تھی۔“

”اور وہ ان سب ان کی محبتوں سے دور رہا اتنا عرصہ۔“ وہ نادم سا اٹھ کھڑا ہوا۔

بھابھ بھی جاگ رہی تھیں۔ وہ تھکا تھکا سا منہ میں بچے پٹنگ پر بیٹھ گیا۔ بھانٹار بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔
 ”تو سوئی نہیں صالو۔“

”نیند نہیں آئی۔ بس بابا اور ماں جی کا سوچتی رہی۔ وہ ہوتے تو آج کتنے خوش ہوتے۔“ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

”کاش اس نے آنے میں اتنی دیر نہ کی ہوتی۔ پتا نہیں ماں جی اور بابا نے کس کس طرح اسے یاد کیا ہوگا۔“ آنسو اس کی آنکھوں میں مچلنے لگے لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔

”ذرا سو راج نکل آئے تو لاہور فون کرتا ہوں۔ سب بہت خوش ہوں گے تیرے آنے کا سن کر۔ میں انہیں تیری باتیں بتایا کرتا تھا اور یعنی تو بہت سوال کرتی تھی تیرے متعلق۔“

”فون..... کیا فون کی سہولت ہے یہاں؟“
 ”ہاں یار! ابھی گھروں میں نہیں ہے لیکن پوسٹ آفس میں ہے۔“

”سکندر تو کچھ دن رہے گا نا اب۔“ بھابھ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
 ”پتا نہیں.....“

اس نے تو ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہاں سے چلا تھا تو سوچا تھا اس نے کہ سب سے مل کر واپس آجائے گا..... لیکن اب آئے ہوئے اسے ایک رات ہی ہوئی تھی اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس مٹی نے اسے جکڑ لیا ہو۔ جیسے اس کے پاؤں میں زنجیریں پڑ گئی ہوں اور جیسے وہ ان خنک ہواؤں اور خوشبودار فضاؤں کو چھوڑ کر واپس کبھی نہ جاسکے گا۔

”سکندر.....“ اسے خاموش دیکھ کر صالو نے پھر پوچھا ”تیرے بیوی بچے کیسے ہیں انہیں بھی ساتھ لے آتا۔ وہ بھی تیرا گائے تیرا ملک دیکھ لیتے۔“

”بیوی بچے تو نہیں ہے بھابھ۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔
 ”کیا.....!“ انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا ”کیا تم نے شادی نہیں کی سکندر مگر تم نے تو لکھا تھا کہ.....“

”شادی کی تھی بھابھ لیکن زیادہ عرصہ نہ نہیں سکی۔“
 ”اور بچے.....“ بھابھ کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”بچے تھے ہی نہیں۔“
 ”بچے ہوتے تو شاید.....“ وہ آپ ہی آپ بولیں اور پھر بات نامکمل چھوڑ دی۔

دھوب بارش اور سانے

”شاید پھر بھی نہیں۔“ اس نے سوچا ”اگر اس نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے روک نہیں سکتی تھی۔ بچے بھی نہیں۔“

”تم نے پھر شادی نہیں کی سکندر؟“

”جی ہی نہیں چاہا بھابو۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”وطن ہی لوٹ آتے۔“ انہوں نے گلہ کیا۔

شاید.....

”بس شرمندہ تھا، بھابو سب سے بابا سے، ماں جی سے۔ اور..... اور رضوانہ سے۔“

”ماں جی اور بابا کا دل تو سمندر تھا سکندر۔ تجھے بہت یاد کرتے تھے۔ ذرا بھی ناراض نہیں تھے۔ پر تم نے کوئی رابطہ بھی تو نہیں رکھا تھا نا۔“

”بس بھابو.....“

”کیا گزری ہوئی باتوں کو لے کر بیٹھ گئی ہے بھاکوان..... جو گزر گیا، سو گزر گیا..... نصیب سے کون لڑ سکا ہے۔ پر یار سکندر تجھے شادی کر لینی چاہیے تھی..... دنیا میں اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔“

”بس بھابی۔“

دور مسجد میں اذان کی آواز آئی تو چوہدری ٹاراٹھ کھڑے ہوئے ”میں تو چلتا ہوں مسجد پھر وہاں سے نماز پڑھ کر فون کرنے چلا جاؤں گا۔ سکندر تو غسل وغیرہ کر لے۔ رات بھر کا جاگا اور تھکا ہوا ہے۔ چائے پی کر سو جا۔ جو گزر گیا، اب اسے کیا سوچنا.....“ انہوں نے اس کے کندھے تھپکے اور صالحہ کی طرف دیکھا

”نماز پڑھ کر جلدی سے چائے بنا دینا سکندر کو۔ میں فون کر کے آجاتا ہوں۔“

”شیری تو تیری طرح ڈاکٹر بنا ہے۔“ چوہدری ٹاراٹھ کے جانے کے بعد بھابو نے بتایا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ بھابو سے رضوانہ کے متعلق پوچھے۔

”کیا وہ اسے یاد کرتی تھی۔“

”کیا روتی تھی وہ.....“

مگر اس کی ہمت نہ ہوئی..... ”کیا کہیں گی بھابو کہ اب.....“

اور وہ بولتی رہیں۔

شیری کے متعلق ارسل اور مونی کے متعلق۔

اور عینی کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔

ماں جی اور بابا کی بے قرار یوں کی داستان سناتی رہیں۔

لیکن رضوانہ کے متعلق انہوں نے ایک لفظ تک نہ کہا اور وہ چاہنے کے باوجود ان سے کچھ نہ پوچھ سکا

اور سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔



یعنی ارسلان ارمغان، شہر یار سب اسے گھیرے بیٹھے تھے۔

”سکندر چاچا میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔“ عینی نے منہ پھلایا۔

”ارے وہ کیوں بیٹا۔“ سکندر نے قریب بیٹھی عینی کے گرد اپنے بازو حائل کر دیے۔

”اتنے عرصے تک ہمیں آپ نے یاد ہی نہیں کیا۔“

”تم تو وجود میں ہی نہیں آئی تھیں تب، جب چاچو یہاں سے گئے تھے۔ تمہیں بھلا وہ کیوں یاد کرتے۔“ ارسلان نے اسے چڑایا۔

”جیسے تم تو پورے پہاڑ تھے تب۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”پہاڑ تو نہیں تھے لیکن پوچھ لو چاچو سے وہ ہمیں بہت یاد کرتے تھے۔ کیوں چاچو.....؟“

”ہوں۔“ سکندر نے سر ہلایا۔ اس کے سامنے پنگوڑوں میں لیٹے ہاتھ پاؤں مارتے ارسلان اور

ارمغان آگئے تھے ”بہت یاد کرتا تھا سب کو۔“ سکندر نے گہری سانس لی۔

”چاچو آپ کو پتا تھا کہ میں بھی ہوں۔“

”دیکھا چاچو آپ نے کس قدر پاگل ہے یہ۔“

”چلو میری بیٹی کو تنگ نہ کرو۔“ سکندر نے اسے پیار سے دیکھا۔

”تو اور کیا چاچو یہ مجھے خواہ مخواہ میں تنگ کرتے ہیں۔“

”دیکھ لیتا.....“ عینی نے اس کی طرف دیکھا ”میں تمہاری شادی کسی تک چڑھی لڑکی سے کرادوں گی۔“

”جیسے میں تو تمہاری پسند کی ہوئی لڑکی سے ہی شادی کروں گا۔ میں تو خود ڈھونڈ لوں گا لڑکی۔“

”اور مجھے ضرورت بھی نہیں ہے تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی میں تو اپنے شیریں بھائی کے لیے

ڈھونڈوں گی لڑکی بلکہ میں نے تو ڈھونڈ بھی لی ہے۔“ اس نے شہر یار کی طرف دیکھا۔

”ارے کیا واقعی..... شیریں بھائی آپ اس کی پسند پر بالکل اعتبار نہیں کرتا۔ ضرور کوئی اپنی جیسی لڑکی

تلاش کی ہوگی اور اس کی نظر تو ویسے بھی کمزور ہے۔ شکل و صورت کی جھنگن ہوگی۔“

”جی نہیں وہ بہت خوبصورت ہے۔ کیوں شیریں بھائی، خوبصورت ہے نا؟“

”کون.....؟“ شہر یار چونکا۔

”آپ کہاں تھے بھائی؟“ ارمغان نے اس کا کندھا ہلایا ”یعنی نے آپ کے لیے دلہن تلاش کر لی

ہے اور اس کے اعزاز میں یہ جملہ بولا جا رہا ہے۔“

شہر یار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”شیری بھائی وہ..... وہ میری دوست نہیں ہے مریم جس کے پاس آپ کے اسپتال میں تھے۔ خوبصورت ہے نا وہ..... میری سب فرینڈز سے زیادہ پیاری ہے وہ اور پھر اس کی نچر بھی اتنی اچھی ہے.....“

”مریم.....“

شہر یار کے دل میں کہیں گھنٹیاں ہی نہیں اور ہونٹوں پر مدھم مدھم میسکراہٹ آگئی۔

”مریم.....“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”بتائیں نا..... ہے نا خوبصورت.....“ یعنی نے ضد کی۔

”ہاں.....“ شہر یار نے سر ہلادیا ”بہت سی لڑکیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں پھر.....؟“

”مگر وہ سب لڑکیاں مریم تو نہیں ہوتیں نا..... میں نے مریم کو آپ کے لیے پسند کر لیا ہے۔ بس اتنی.....“

وہ صالح کی طرف مڑی جو ایک طرف بیٹھی انہیں سکندر کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”امی اس بار میں آپ کو ساتھ لے جاؤں گی اور مریم سے ملواؤں گی۔ سچ امی وہ آپ کو بھی اچھی لگے گی۔“

”میرے اچھے لگنے کا کیا ہے پتر۔ تیرے بھائی کو بھی اچھی لگے تب تا مذم کی تو اس نے گزاری ہے۔“

”ان کو اچھی لگی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہیں؟“ شیری بھائی نے۔ ”کیوں شیری بھائی؟“ وہ پھر اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر ہونٹوں پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے شہر یار کے دم سکندر کی طرف مڑ گئے جو بہت دلچسپی سے یعنی اور ارسلان کی لوک جھونک سن رہے تھے اور ان جی خوشیوں اور محبتوں سے اتنے عرصے تک محروم رکھا تھا اس نے اپنے آپ کو۔

خود ساختہ جلا وطنی۔

خود اپنے لیے تجویز کردہ سزا بھگتتا رہا تھا۔

بہت سزا بھگت لی تھی اس نے۔

ان سب سے دور رہ کر بہت اذیتیں اٹھائی تھیں اس نے۔

بہت کرب سہا تھا اس نے۔

اپنی ناقدری کا احساس۔

رکے جانے کا دکھ۔

اپنوں سے جدائی کی اذیت۔

بابا کا مان نہ رکھنے کا غم۔

اور..... اور رضوانہ سے بے وفائی کا رنج۔

کتنے درد سہے تھے اس نے۔

مگر اب نہیں.....

اب وہ واپس نہیں جائے گا۔

اب اس میں تنہا جینے کا حوصلہ نہیں رہا۔

ان سب اپنوں میں آکر وہ ہمت ہار بیٹھا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہاں ہی رہے گا..... اور برسوں پرانا خواب جسے بابا نے دیکھا تھا اسے پورا کرے گا۔

گاؤں میں کلینک بنانے کا خواب۔

اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی گاؤں میں ڈاکٹر نایاب تھے۔ ایک چھوٹی سی ڈسپنسری تو بن گئی تھی۔ ایک ہیلتھ سینٹر بھی بن گیا تھا لیکن وہاں ڈاکٹر شاذ و نادر ہی ملتا تھا۔

”سکندر ماموں! آپ نے کیا سوچا ہے۔ واپس جائیں گے یا پاکستان میں ہی سہل ہوں گے؟“ شہر یار نے پوچھا۔

”اب واپس نہیں جاؤں گا۔“ سکندر نے یقین سے کہا ”یہاں گاؤں میں ہی کلینک بناؤں گا۔“

”سکندر میرا دل لگ جائے گا یہاں؟“ صالح نے پوچھا۔ ان کی آواز بھیگ رہی تھی۔

”ہاں بھابو..... بہت سزا دے لی خود کو۔ اب آپ سب کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”ظاہر ہے! میں اس میں تو وقت لگے گا۔ جب تک کے لیے آپ ہمارے اسپتال میں آجائیں۔ سرجن منیر چمٹی پر گئے ہیں۔ ڈاکٹر رافع کو ایک اچھے سرجن کی تلاش ہے۔“

”سوچوں گا بھی..... فی الحال تو اپنی بھابو اور بھابی کی محبتوں اور شفقتوں کے مزے اٹھا لوں۔“ وہ خوش دلی سے بولے اور محبت سے شہر یار کی طرف دیکھا۔

انہیں شہر یار بہت اچھا لگا تھا۔ سو برا اور سنجیدہ سا۔ عزیز آپ کا بیٹا اور عزیز آپ کو کتنا پیار کرتی تھیں اس سے۔ وہ آخری ملاقات اس کے تصور میں آگئی۔

وہ عزیز آپ کی ملتی بھگی آنکھیں اور اس یاد سے بے قرار ہو کر اس نے شہر یار کو ایک دم اپنے ساتھ سمجھ لیا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

”سکندر چاچو یہ فاول ہے۔“ ارسل نے احتجاج کیا ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں لیکن جب سے آئے ہیں ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ شیری پر زیادہ فریفتہ ہیں۔ ہم یہ نا انصافی برداشت نہیں کر سکتے..... احتجاج زبردست احتجاج۔“

”اسے دیکھتا ہوں تو عزیز آپا یاد آ جاتی ہیں۔“ سکندر نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ بھابو کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ ذرا سی دیر کے لیے فضا افسردہ ہو گئی لیکن کچھ دیر بعد ارسلان نے کوئی لطیفہ بنا کر

سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

ارسلان، ارغمان اور عینی کے انگیزام شروع ہونے والے تھے۔ اس لیے وہ جلدی واپس چلے گئے تھے۔ لیکن شہر یار ہفتہ بھر ہا اور جانے سے پہلے فیصلہ کر گیا کہ سب..... بھابھو بھابھو اور سکندر..... وہ سب کچھ دن آکر لاہور ہیں گے اس کے پاس..... اسے اسپتال کی طرف سے گھر ملا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ سب وہاں اکٹھے رہیں لیکن بھابھو اور بھابھو رگڑیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔

”چلیں ہفتہ بھر کے لیے سہی۔“ اس نے اصرار کیا تو وہ مان گئے اور وہ بہت خوش خوش واپس لاہور چلا گیا۔



”آمنہ معنی“ کیا آپ بتائیں گی کہ آپ نے مجھے..... مجھے ہی کیوں منتخب کیا اس اعزاز کے لیے جس کے قابل میں ہرگز نہیں تھا۔“

پروفیسر عادل اس کے مقابل بیٹھے تھے اور اضطراب سے بار بار سرگٹ جلاتے، ایک کس لیتے اور پھر پھینک دیتے۔

”سوری عادل خان میں شرمندہ ہوں بہت۔ اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔“ آمنہ معنی نے نگاہیں جھکا لیں۔

”لیکن میرے اندر بہت سی الجھنیں ہیں۔ بہت سے مکمل پڑ گئے ہیں۔ بہت پریشان رہا ہوں بہت سوچا ہے میں نے کہ اگر آپ کے ساتھ یہ سانحہ میرے گھر سے نکلے ہوئے پیش آیا ہے تو اس میں کس حد تک میں قصور وار ہوں۔“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے کہا نا اس وقت مجھے ہوش ہی نہیں تھا۔ اس حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں خود اپنی نظروں میں غیر معیاری ہو گئی تھی۔ آپ کے سامنے آئے ہوئے تو نہ جانے کیوں میں نے سوچا کہ اس طرح شاید میں معیتر ہو جاؤں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس سے بھی کم ہوتی۔ میں..... میں شرمندہ ہوں عادل خان۔ میری وجہ سے آپ پریشان رہے۔“ اس کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

انہوں نے گہری نظروں سے پھر اسے دیکھا۔ لمحہ بھر دیکھتے رہے پھر نیا سرگٹ سلگایا۔

”شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہوں کہ آمنہ معنی لیکن میرے دل نے اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ نہیں آمنہ معنی اتنی بڑی بات آپ بغیر کسی وجہ سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔ پس پردہ کوئی اور ہی بات ہے۔“

”مثلاً.....“ آمنہ معنی نے جھنویں اچکائیں پھر ذرا سا مسکرائی۔

”مثلاً یہ کہ مجھے آپ سے عشق ہو گیا تھا۔“

”نہیں۔“ عادل خان سنجیدہ تھے ”میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات ہو سکتی ہے۔“

”تو پھر عادل خان میری بات پر یقین کریں میرے جیسی متوسط گھرانے کی لڑکی کے ساتھ اگر ایسا سانحہ ہو جاتا ہے تو اس کے ہوش کھو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ میں اگر صحیح سلامت آپ کے سامنے ہوں تو یہ میری دل پاور ہے ورنہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

پروفیسر عادل نے آمنہ معنی کی طرف دیکھا جو بہت متحیل لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی تھی۔

”آمنہ معنی.....“ ان کے لہجے میں ہمدردی کا گداز تھا ”میرے ساتھ دو مسئلے ہیں اگر کبھی میں ان کے حصار سے نکل سکا تو میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اس وقت تک اگر آپ کو کسی کی رفاقت میسر نہ آئی تو میں.....“

”پلیز.....“ آمنہ معنی نے بے اختیار اپنا ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بات کرنے سے روکا ”میری بات کو اہمیت نہ دیں عادل خان..... وہ ایک بات تھی گزر گئی پلیز بھول جائیں اس کو۔“

”میرا دل کہتا ہے“ آمنہ معنی کہ کہیں نہ کہیں میری ذات کا کوئی حصہ اس سارے معاملے میں انوالو ضرور ہے۔ ورنہ آپ جیسی لڑکی مجھ سے وہ سب کچھ نہ کہتی جو آپ نے مجھ سے اس روز کہا تھا۔ آپ کچھ بتانا نہیں چاہتیں اور خود مجھے اس الجھاؤ کا کوئی سرا نہیں مل رہا۔ لیکن جس روز میں نے کہیں بھی خود کو اس جرم کا شریک پایا تو میرا وعدہ ہے کہ میں اسی روز آپ سے شادی کر لوں گا۔ اپنے مسائل کے باوجود۔“

بات ختم کر کے انہوں نے ہیرے کو بلا کر ٹیل لانے کے لیے کہا۔ چلتی حیدر کے گھر سے وہ آمنہ معنی کے ساتھ یہاں آئے تھے تاکہ کچھ دیر بیٹھ کر وہ ان سے بات کر سکیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا وہ الجھن جو کئی روز سے انہیں مضطرب کیے ہوئے تھی اس طرح تھی۔

”بہر حال دیکھا جائے گا۔ وقت اور حالات خود بخود سب کچھ ایکسپوز کر دیں گے۔“ انہوں نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

آمنہ معنی کو ڈراپ کر کے جب وہ گھر آئے تو اسی طرح الجھے ہوئے تھے لیکن ان کی الجھن کی نوعیت مختلف تھی۔ اب وہ چلتی حیدر کے متعلق سوچ رہے تھے۔

”تمہارے والد بیمار ہیں۔“ چلتی حیدر نے انہیں بتایا تھا۔

اس وقت آمنہ معنی کے سامنے انہوں نے چلتی سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ان سے تفصیل پوچھیں۔ بہت سال پہلے جب وہ نئے نئے لاہور آئے تھے تو انہوں نے چلتی حیدر سے اپنا تعارف کروایا تھا۔

”اے تم وہاں کے رہنے والے ہو۔ تمہارے والد کیا کرتے ہیں۔ کیا نام ہے؟“ تب نہ جاننے کیوں انہوں نے چلتی حیدر کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔

اور چلتی حیدر کو حیرت ہوئی تھی۔

”اے کمال ہے تمہارے والد کو تو میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اکثر ان کے گھر جاتا تھا۔“

بچپنی سے انہوں نے انگلیاں چٹخائیں۔ سامنے رکھے ٹیلی فون کو دیکھا۔ ریسپور انٹایا پھر رکھ دیا ہو، پھر اٹھایا اور ڈائل پر انگلیاں رکھے کتنے ہی لمحے انہوں نے یونہی گزار دیے۔ پھر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے انہوں نے نمبر ملائے۔

”ارے عادل خیریت؟“ مجتبیٰ حیدر نے ان کی آواز سن کر پوچھا۔

”مجتبیٰ! آپ اس وقت کیا کہہ رہے تھے؟“

”کب؟“ مجتبیٰ سمجھ نہ سکے۔

”میرے والد کے متعلق۔“

”اوہ ہاں یار چند دن ہوئے میں ایک دوست کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال گیا تھا وہاں اچانک تمہارے والد مل گئے۔ ہارٹ کی تکلیف تھی انہیں۔ بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی۔ میں کل بھی گیا تھا انہیں دیکھنے۔ اب بہتر ہیں۔ شاید ایک دو روز میں گھر چلے جائیں۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے۔ جھینک پوچھتی۔“

”عادل یار ایک بات کہوں اگر مائنڈ نہ کرو تو اپنے والد کو دیکھنے اسپتال چلے جاؤ۔ مل لو ان سے۔ ہمارے تمہیں یاد کر رہے تھے بہت..... مجھ سے تمہارے بچپن کی باتیں کرتے رہے جب میں نے بتایا کہ میں انہیں جانتا ہوں تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا انہیں۔ بار بار تمہارے متعلق پوچھتے رہے۔ تمہاری شکل و صورت، تمہاری عادات و مزاج۔“

مجتبیٰ حیدر نے تفصیل سے بتایا۔

”اگر تم انہیں معاف کر سکو عادل خان تو مل لیتا ان سے۔ روم نمبر آٹھ ہے اور پرائیوٹ اسپتال ہے۔ رافع اسپتال۔“

انہوں نے مجتبیٰ حیدر کی اس تفصیلی بات پر تبصرہ کیے بغیر خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر یوں ہی آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آگے پیچھے جھولتے رہے۔

”کیا حرج ہے اگر میں انہیں دیکھ آؤں۔“

”ایک نظر۔“

”بغیر ملے بغیر اپنا تعارف کروائے۔“

”یوں ہی دروازے میں سے ایک جھلک۔“

”ہاں نہیں وہ دیکھنے میں کیسے ہوں گے۔“

”دادا کی طرح۔“

”یا چاچا جیسے یا پھر میرے جیسے۔“

لیکن پھر امریکا چلا گیا اور پھر وہاں سے آکر میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بہت نفیس اور پیارا آدمی ہے وہ۔“

اور آج اتنے سالوں بعد وہ انہیں بتا رہے تھے کہ تمہارے والد بیمار ہیں۔

”میرے والد۔“ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے انہیں تصور میں لانا چاہا لیکن پتا نہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ حالانکہ دادا کے کمرے میں آج بھی ان کی تصویر لگی ہوئی تھی اور جب دادا نے حویلی میں آنے سے منع کیا تھا تب وہ اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے سات آٹھ سال کے تھے اور انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ حویلی آتے تو اسے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے لیے طرح طرح کے کھلونے لاتے تھے اور اسے اپنے پاس بٹھا کر اس سے ڈھیروں باتیں کرتے تھے۔ اسے کہانیاں سناتے تھے..... اور

جب دادا نے انہیں ہمیشہ کے لیے حویلی میں آنے سے منع کر دیا تھا تو وہ بہت روئے تھے۔ جب وہ جارہے تھے تو انہوں نے جھک کر اسے پیار کیا تھا۔ بہت دیر تک اپنے بازوؤں میں بچھپے رہے تھے اور پھر یوں ہی بازوؤں میں لیے لیے سر اٹھا کر دادا کی طرف دیکھا۔

”میں کبھی کبھی اسے دیکھنے کے لیے آسکتا ہوں؟“

”نہیں.....“ دادا کا لہجہ کیسا پتھر ہو گیا تھا ”اس حویلی سے تمہارے تمام رشتے ختم ہو گئے ہیں۔“

”میرا جرم اتنا بڑا نہیں ہے تا جان..... دوسری شادی گناہ نہیں ہے۔“

”ہاں۔ لیکن اس کے باوجود.....“

”یہ میرا بیٹا ہے۔ میں اس کے بغیر کیسے رہوں گا۔“

”خدا تمہیں اور بیٹے دے گا۔“

اور بابا اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر حویلی میں چلے گئے تھے اور انہیں خود بخود ادراک ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی سانحہ ہو گیا ہے۔ سو وہ بہت دیر تک بستر پر گر کر روتے رہے تھے۔

اور پھر ہفتوں مہینوں انہوں نے ان کا انتظار کیا تھا۔

اور ماں جی سے دادا سے ان کے متعلق پوچھا تھا۔

دن میں کئی بار وہ اپنا سوال دہراتے۔

”ابواب گھر کیوں نہیں آتے؟“

”وہ کب آئیں گے؟“

”اتنی دیر اس مرتبہ کیوں لگا دی انہوں نے؟“

اور پھر رفتہ رفتہ انہوں نے سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جیسے انہیں پتا چل گیا کہ اب اب کبھی نہیں آئیں گے۔ انہوں نے کہیں اور گھر لے لیا ہے۔

ایک دم وہ اٹھنے ٹپل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور رافع اسپتال کی طرف چل پڑے۔ وہ کوریڈور میں ادھر ادھر کمرؤں کے نمبر دیکھتے ہوئے جا رہے تھے کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کی نظریں اچانک ہی اس پر پڑی تھیں اور پھر ہٹنا بھول گئی تھیں۔ سفید لباس میں ملبوس وہ ایک طرف کھڑی شاید کی نرس سے باتیں کر رہی تھی۔ نرس سے بات کر کے اس کی نظریں لحد بھر کے لیے ان پر پڑیں۔ ہلکے ہلکے کاہل سے جی بھر پور محو کن آنکھیں مقناطیس ہی تو تھیں کہ ان کی نظریں اس کے چہرے پر جمی گئی تھیں۔ جیسے یکا یک وہ انسان سے لوہے کے ٹکڑے میں بدل گئے تھے اور یوں اس طرح اس اجنبی لڑکی کو دیکھنے کی حرکت ان سے غیر اختیاری طور پر سرزد ہو رہی تھی۔

لڑکی کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑ گئیں۔ اس نے ذرا سارخ موڑ لیا تو وہ چونکے اور بے اختیار چند قدم آگے بڑھ کر اسے آواز دی۔

”سینے پلین۔“

”جی۔“ لانی پلکیں اوپر اٹھیں۔

”وہ..... وہ روم نمبر آٹھ کہاں ہے۔“

”جی روم نمبر آٹھ اوپر ہے۔“

”اوہ۔“ جھپک یو۔“ لانی اس کے چہرے پر ہی تھیں۔

اس کی آواز اس کا لہجہ اس کی آنکھیں اس کا سارا وجود جیسے مقناطیس تھا اور وہ لوہے کے ایک معمولی ٹکڑے تھے۔

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت اور ناگواری کے رنگ ایک ساتھ نظر آئے اور وہ تیزی سے مڑ کر نرس کے پیچھے چل دی۔

اور وہ عجیب سی خود فراموشی کے عالم میں وہاں ہی کھڑے رہ گئے۔

”یہ لڑکی کون تھی۔“

”اور ایک جھلک دکھا کر کہاں غائب ہو گئی۔“

وہ تیزی سے ادھر ہی لپکے، جدھر وہ گئی تھی لیکن کوریڈور خالی پڑا تھا۔ شاید وہ کسی کمرے میں گئی تھی..... دونوں طرف کمرے تھے..... اور پتا نہیں وہ کس کمرے میں گئی تھی۔

اور..... اور کیا یہ وہی لڑکی تھی جس کا انہیں انتظار تھا؟ انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور انہیں لگا جیسے ان کے اندر یہاں وہاں ہر جگہ چراغاں ہو گیا ہو۔

انہیں کسی انجانی ہستی کا انتظار تو تھا لیکن یہ..... یہ وہ ہرگز نہیں جانتے تھے کہ یوں ہوگا۔

اس طرح صرف ایک نظر۔

ایک نظر انہیں بے خود کر دے گی۔

کون تھی وہ اور پتا نہیں وہ اسے دوبارہ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں اور ان کے اندر طلال کے بادل چھا گئے۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا وہ کمرہ نمبر ۸ کے سامنے کھڑے تھے۔

”کمرہ نمبر آٹھ۔“ انہوں نے زیر لب پڑھا۔ ایک قدم آگے بڑھایا اور لحد بھریوں ہی کھڑے رہے۔ پھر ایک دم واپس مڑ آئے۔ اضطرابی انداز سے انگلیوں کو مسلتے وہ کچھ دیر تک اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے رہے۔ اس وقت ان کی حالت اس مسافر کی طرح ہو رہی تھی جو کونوئیں کے پاس سے پیاسا لوت آیا ہو۔

”کیا تھا اگر ایک نظر میں انہیں دیکھ لیتا۔“

وہ ایک شخص جس کی ذات میرے وجود کی تخلیق کا سبب بنی۔

لیکن..... انہوں نے ہونٹ بھیج لیے۔

ان کے تصور میں ماں جی کا چہرہ آگیا۔

ماں جی شاید اس پسند نہ کریں۔

ان کی انا کوٹھیں پہنچے۔

لیکن ماں جی کو کیسے پتا چلے گا..... پھر میں نے کون سا ان سے بات کرنی ہے۔ صرف دیکھوں گا بس۔

انہوں نے سگریٹ سلگایا۔ دو تین لمبے لمبے کش لیے اور پھر زمین پر پھینک کر جوتے کی ایڑی سے مسل کر اسپتال کی طرف بڑھ گئے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھے روم نمبر ۸ کے سامنے آکھڑے ہوئے اور چند لمبے یوں ہی کھڑے رہے۔ پھر آہستگی سے دروازے پر ہاتھ رکھا لیکن ایک دم یوں اٹھالیا جیسے آگ کو چھو لیا ہو۔

”نہیں۔“ سروران کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”سر میری ماں کی چٹخیں میرے اندر اکٹھا ہو گئی ہیں سر..... وہ شخص جو میرا باپ ہے اس نے میری ماں پر ظلم کیا۔ حالانکہ وہ بے قصور تھی.....“

”نہیں۔“ وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گئے۔ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق نہیں دی تھی لیکن ظلم تو اس نے بھی کیا ہے اور میں ایک ظالم کے لیے اتنا مضطرب ہو رہا ہوں اور اتنا بے چین۔

وہاں سے ہٹ کر بہت دیر تک وہ ادھر ادھر اسپتال کے برآمدوں میں پکراتے پھرے۔

”کسے ڈھونڈ رہے ہیں وہ؟“ انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

وہ جو ذرا سی ایک جھلک دکھا کر کہیں غائب ہو گئی تھی۔

اور کیا واقعی یہ وہی ہستی ہے جس کے وہ برسوں سے منتظر رہے تھے۔

کیسی مصیبت تھی اس کے چہرے پر۔

کسی قاتل آنکھیں تھیں۔

کسی دلبرار گت تھی۔

کیسے دلکش ہونٹ تھے۔

کیسادل نشین سراپا تھا۔

”یہ وہی تھی۔“ ان کے دل نے تائید کی۔

”ہاں یہ وہی ہے۔“ انہوں نے زیر لب دہرایا۔ لیکن کیا انہوں نے اسے پا کر گنوا دیا ہے۔ نہیں اگر انہوں نے اسے گنوا ہوتا تو وہ ملتی ہی نہیں۔

ان کے اندر یقین کا دیا جل اٹھا۔

ہاں وہ انہیں پھر ملے گی۔

یہیں کہیں ادھر ادھر۔

اندر کے یقین نے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی اور واپسی کے لیے مڑے اور کوریو کی طرف آتے شہر یار نے انہیں دیکھا۔

”سر آپ یہاں خیریت.....؟“ وہ تیزی سے ان کے قریب آیا۔

”ہاں خیریت یوں ہی ایک دوست کو دیکھنے آیا تھا لیکن شاید وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”کیا نام تھا ان کا اور کیا ہوا تھا؟“ شہر یار نے پوچھا۔

”ہارٹ ٹریل تھا انہیں۔“

تب ہی پاس سے گزرتے ہوئے کسی پشعٹ کے اٹینڈنٹ نے شہر یار کو اپنی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ وہ نام بتانے کی زحمت سے بچ گئے ہیں۔

”آئیے سر بیٹھے ایک کپ چائے۔“ اسے مطمئن کر کے شہر یار پھر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”نہیں شہر یار پھر کسی دن چائے کے لیے آ جاؤں گا اب اجازت اور تم لوگوں نے بہت دنوں سے چکر نہیں لگایا۔“

”آئیں گے سر۔ ارسل اور مونی تو ان دنوں پڑھائی میں بری طرح مصروف ہیں۔ امتحان بھی تو سر پر ہیں۔“ شہر یار نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے بتایا ”میں البتہ کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔“

”میں انتظار کروں گا۔“

”مجتبیٰ صاحب کیسے ہیں اور اپنے حافظ صاحب کی افسانہ نگاری کس منزل میں ہے؟“ ان سے مصافحہ کرتے ہوئے شہر یار نے پوچھا۔

تب ہی ڈاکٹر زویونی روم کی طرف سے تیز تیز چلتی ہوئی وہ ان کے قریب آ گئی۔ پروفیسر عادل کی

نظروں نے پھر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

”ڈاکٹر پلیز آپ کو پایا بلار ہے ہیں۔“ پروفیسر عادل کی طرف دیکھے بغیر اس نے شہر یار کو مخاطب کیا۔

”ابنی پراہلم؟“

”چاہئیں پلیز آپ آ جائیں۔“

”آ رہا ہوں۔ آپ چلیں۔“

اور وہ اسی طرح تیز تیز چلتی ہوئی واپس مڑ گئی۔ پروفیسر عادل چونکے اور ان کے اندر جلتا یقین کا دیا ایک دم تیز نو دینے لگا۔

جیسے انہیں یقین ہو کہ اب وہ اسے گنوائیں گے نہیں۔ شہر یار اسے جانتا ہے تو وہ اسے پائی لیں گے۔ بہت مطمئن بہت پرسکون ہو کر وہ شہر یار کو خدا حافظ کہہ کر واپس آ گئے اور بہت دیر تک یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر ڈرائیو کرنے کے بعد جب گھر واپس آئے تو مسرور پریشان ہو رہا تھا۔

”سر آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”یوں ہی ذرا جتنی کی طرف چلا گیا تھا۔ تم کھانا لگواؤ۔“

اور کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے مسرور کی طرف دیکھا۔

”مسرور اگر کبھی تمہارے والد تمہیں..... میرا مطلب ہے تم سے ملنا چاہیں تو تم ملو گے ان سے یا پھر تمہیں پتا چلے کہ وہ بیمار ہیں تو تم انہیں دیکھنا چاہو گے؟“

”نہیں ہرگز نہیں.....“ مسرور نے پورے یقین سے کہا اور ان کی طرف دیکھا۔

”کیا کسی نے آپ کو ان کی بیماری کی اطلاع دی ہے؟“

”نہیں یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ مسرور کبھی کبھی آدمی دل کے ہاتھوں بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ کہیں کسی مقام پر وہ کسی سے زیادتی بھی کر جاتا ہے۔ شاید وہ اس کے لیے اتنا قصور وار نہیں ہوتا۔ جو دل ہے ناں یہ تو پل بل نئے احساسات کو جنم دینے والا آلہ ہے..... کیا خبر تمہارے والد کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو۔“

مسرور سے زیادہ جیسے وہ اپنے آپ کو دلیل دے رہے تھے۔

”جی سر..... لیکن میرا باپ ایک ظالم شخص تھا..... اس نے میری ماں کو طلاق دے دی تھی۔“ مسرور کے لہجے میں سختی درآئی تھی ”وہ چاہتا تھا تو ایسا نہ کرتا۔“

لیکن ان کے والد نے تو ایسا کچھ نہ کیا تھا۔ بلکہ طویل عرصے تک وہ خط لکھ لکھ کر داد اسے معافیاں مانگتے رہے تھے۔ دادا کی وفات کے بعد انہوں نے ان کی سیف میں ان کے خط دیکھے تھے لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے کبھی بھی انہیں تلاش کرنے یا کھوجنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی حالانکہ ان خطوط میں اپنے لیے ان کے بے قراری اور تڑپ کو بھی محسوس کیا تھا اور جب بھی وہ حویلی جاتے ان خطوط کو نکال کر ضرور

پڑھتے..... اور کبھی کبھی اپنی اس بچکانہ حرکت پر انہیں حیرت بھی ہوتی تھی لیکن وہ خود ہی دلیل دے کر خود کو مطمئن کر لیتے۔

شاید اس طرح ان کے اندر کی اس تشنگی کو جو دادا کے بے انتہا پیار کے باوجود اندر رکھیں موجود تھی، تھوڑی دیر کے لیے سکون مل جاتا تھا۔

”سر۔“ مسرور نے انہیں مخاطب کیا تو وہ چونکے ”کیا میرے والد آپ کو ملے ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ مسکرائے ”بس یونہی ایک خیال آگیا تھا۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔“

اور مسرور فوراً انہیں دیکھ کر پلیٹ پر جھک گیا۔

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ دل کے خلفشار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بیک وقت وہ کئی متضاد کیفیتوں کی زد میں تھے۔

کبھی انہیں آمنہ صغی کا خیال آتا۔

کبھی اپنے والد کا تصور۔

اور کبھی وہ اس بڑائی کے متعلق سوچنے لگتے جس کے نام سے بھی وہ واقف نہیں تھے لیکن جسے دیکھ کر دل نے گواہی دی تھی کہ ان کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔

”سر حافظ صاحب کا فون ہے۔“ مسرور نے اندر جھانکتے ہوئے بتایا۔

”یاز تم ہی اٹینڈ کر لو۔“ انہوں نے ہتھکے ہوئے انداز میں کہا ”میں کچھ دیر آرام کروں گا۔“

ایک دم ہی بہت ساری جھکن ان کے وجود میں اتر آئی تھی۔ یوں جیسے صدیوں چلتے چلتے منزل کا نشان نظر آئے تو آدمی تھک کر ستانے کو بیٹھ جائے۔

یا کسی خوبصورت حادثے کا مضحل خیال ذہن دول اور روح و جسم کو بیک وقت تھکا دے۔

مسرور کے جانے کے بعد انہوں نے نیکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔



اس کے رخسار دکھ رہے تھے۔ آنکھیں خون اگل رہی تھیں۔ وہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہل کر اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن رہ رہ کر اس کے کانوں میں الوینا کی طنزیہ ہنسی کو بجھنے لگتی۔

”مومنم اخبار پڑھتی ہوتا۔“

آج جب لائبریری میں بیٹھی فزکس کے ضروری نوٹس بنارہی تھی تو الوینا نے اس کے قریب آ کر کہا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ الوینا سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ شروع ہی سے وہ مریم سے جلیس تھی اور وہ اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ حالانکہ تمام کلاس فیلوز کے ساتھ مریم کے

تعلقات بہت اچھے تھے۔ اپنی نرم مزاجی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے سب میں ہی یکساں مقبول تھی۔

”بہت کم۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ نوٹس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”مگر آج کل تمہیں ضرور پڑھنا چاہیے۔“

”کیوں.....؟“ اس نے پھر ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں۔

”تمہاری ماما اور غنفر ملک کے متعلق بڑی دلچسپ خبریں آ رہی ہیں۔“ وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکی۔

نیل پر ہاتھ رکھ کر لکھ بھراس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور بڑے تسخرے ہنسی..... ”ویری انٹرٹیننگ۔“

مریم کا رنگ ایک دم سرخ ہوا اور پھر زرد ہونے لگا۔ وہ یوں ہی طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے باہر نکل گئی اور مریم تپتی دیر تک یوں ہی میز پر کھدیاں ٹیکے ساکت بیٹھی رہی۔

بچتی حیدر کے اٹک پلے کے بعد نذیب عثمان احمد نے بچتی حیدر کی سیریز میں کام کرنا شروع کر دیا تھا

اور اس سیریز میں غنفر ملک ایک نیا اداکاران کے مقابل ہیر تھا۔ نذیب عثمان احمد نے اس تیرہ اقساط پر

مشتمل ڈرامے میں ایک بیوہ عورت کا کردار ادا کیا تھا اور غنفر ملک اس کا ایک کرایہ دار تھا جو اس بیوہ

عورت کی محبت میں جلا ہو گیا تھا۔ ڈراما خاصا کامیاب رہا تھا۔ نذیب عثمان اور غنفر ملک کی پرفارمنس کو

بہت سراہا گیا اور دو ایک اخباروں نے تب بھی دبے دبے لفظوں میں نذیب عثمان اور غنفر ملک کے اکثر

ساتھ دیکھے جانے کے متعلق لکھا تھا اور تب بھی الوینا نے ہی اس کا دھیان اس کی طرف دلوایا تھا اور اس

نے سوچا تھا کہ وہ ماما سے بات کرے گی پوچھے گی اور ان سے کہے گی کہ وہ لن اخبار والوں کے متعلق

کارروائی کریں جو الٹی سیدھی باتیں چھاپ دیتے ہیں۔ تب پاپانے اسے سمجھا تھا۔

”جو آدمی شوہر سے متعلق ہوتے ہیں ان کے بارے میں ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں ان کی پروا

نہیں کرنی چاہیے.....“

لیکن وہ کیسے پروا نہ کرتی۔ الوینا فری پریڈز میں اسے جان بوجھ کر ستانے کے لیے شوہر کے متعلق

لوگوں کے اسکیڈل اپنی گروپ کی لڑکیوں سے اونچی آواز میں ڈسکس کرتی۔

”شوہر کے لوگ بہت برے ہوتے ہیں۔“ وہ اکثر تہمرہ کرتی تھی ”بہت گند ہے یہاں۔“

اور اس کے کانوں کی لوں تک سرخ ہو جاتیں اور آنکھوں میں مرجھیں سی جیسے لگتی تھیں۔

”یعنی، کیا واقعی شوہر سے متعلق سب لوگ برے ہوتے ہیں؟“ اس نے کئی بار یعنی سے پوچھا تھا۔

”نہیں مریم۔ اچھے برے لوگ تو سب جگہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح شوہر میں بھی ہے۔ کچھ اچھے کچھ برے۔ بلکہ میرے بابا کہتے ہیں اچھے لوگ دنیا میں زیادہ ہوتے ہیں برے کم۔“ یعنی نے اسے تسلی دی تھی

”اور تم الوینا کی باتوں پر غصہ نہ کیا کرو۔ دراصل وہ جلتی ہے تم سے۔“

ایک کو بھی الوینا سے چڑھتی۔



لیکن عینی اور ایم کی باتوں سے وہ مطمئن نہیں ہو پائی تھی حالانکہ عثمان احمد نے بھی اس سے یہی بات کہی تھی۔ مگر اب وہ ہر بات پر غور کرنے لگی تھی اور اپنے گھر آنے والے ہر فرد کے متعلق عثمان احمد سے پوچھتی اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتی۔ جب سے انہوں نے بھتیجی حیدر کے ڈراموں میں کام کرنا شروع کیا تھا ان کا حلقہ احباب بڑھ گیا تھا اور اب گھر میں ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگ بھی آنے لگے تھے۔ اکثر وی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ان کے ڈرامے کی قسط دیکھی جاتی تھی اور اس پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ عثمان احمد بہت کم ان محفلوں میں شریک..... ہوتے تھے۔ زیادہ تر وہ اسٹڈی میں رہتے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی لیکن پھر بھی ماما نے تقریباً سب ہی سے اسے متعارف کروایا تھا۔ جب تیرہ اقساط کے اختتام پر ان کے یہاں ڈنر پارٹی تھی تو اسے بھی اس میں شامل ہونا پڑا تھا۔ اس رات لالہ بھی میڈم نرگس کے ساتھ آئی تھی اور وہ بہت دیر تک اس سے اعزاز کی باتیں کرتی رہی تھی.....

”اعزاز کو میرا گلوکارہ بننا پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ریاض کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ورنہ مجھے ڈیڈی یامی کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“

مریم کے استفسار پر اس نے بتایا تھا۔

”ممی اور ڈیڈی یونہی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔“

”دراصل۔“ اس نے مریم کے کان میں سرگوشی کی ”ممی اور ڈیڈی دونوں اس طرح خبروں میں رہتے ہیں ڈیڈی بے چارے ممی کو طلاق دینے کے بعد باوجود جاگیر دار ہونے کے پس منظر میں چلے گئے تھے۔ اسی بہانے اخبار میں ان کا ذکر ہونے لگا ہے۔ میری کسی کو پروا نہیں ہے۔“

اور وہ بہت دیر تک لالہ کے خوبصورت چہرے اور چمکتی آنکھوں کو دیکھتی رہی تھی وہ ہمیشہ ہی لالہ سے مل کر متاثر ہوتی تھی۔ اس میں سچ کہنے کا حوصلہ تھا اور وہ کبھی بھی سچ کہتے ہوئے ڈرتی نہیں تھی۔

اس ڈنر پارٹی میں اس نے ہر شخص کو بہت گہری اور باریک بین نظروں سے دیکھا تھا حتیٰ کہ شرجیل مرزا سے بھی کچھ دیر بات کی تھی اور اس نے غضنفر ملک کو بھی خوش کیا تھا۔ جس نے ماما کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا اور بہت سی چیزیں اپنے اصلی رنگوں کے ساتھ واضح ہو کر اس کے سامنے آگئی تھیں اور یہ سارے رنگ اب اس کی نظروں کے سامنے بھللا رہے تھے۔ الگ الگ اور واضح واضح۔ بعض رنگ اپنی اصلی شکل میں کتنے بھدے اور کریمہ لگتے ہیں۔

اس نے اپنے سامنے آجانے والے کالج بیک کوٹھو کر ماری جو کالج سے آتے ہی اس نے کمرے کے عین وسط میں پھینک دیا تھا اور سوچا کیا ہی اچھا ہو کہ وہ ان سارے رنگوں کو پہلے کی طرح گڈمڈ کرنے ملا دے اور سب اپنی شناخت کھودیں۔ اسے کچھ پتا نہ چلے کچھ خبر نہ ہو کہ کون سا رنگ کیا ہے اور کون سا کیا۔ ان رنگوں نے واضح ہو کر اسے اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میڈم نرگس جان بوجھ کر ماما



گھنفر ملک کی طرف متوجہ کرتی تھیں اور غضنفر ملک سے جانے چکے چکے کیا سرگوشیاں کرتی تھیں کہ وہ مسکرا کر ماما کو دکھاتا تھا۔

اور میڈم نرگس بائیں آنکھ کا کونا دبا کر جب مسز آفندی کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر زور سے قہقہہ لگائیں تو اس کے وجود میں آگ ہی لگ جاتی تھی۔

اور یہ سب صحیح نہیں تھا۔

کم از کم اس کی نظر میں۔

اور مسز آفندی میڈم نرگس کے پاس سے اٹھ کر عثمان احمد سے ہولے ہولے کچھ کہتیں تو وہ مضطرب سے ہو جاتے۔

وہ دونوں اسے خونی بلائیں لگتیں۔

جو ماما اور پاپا کو ایک دوسرے سے دور کر رہی تھیں اور خود اس سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

اور شرجیل مرزا جو بھوکے نظروں سے سب کو دکھاتا تھا۔

”آخر یہ شخص شادی کیوں نہیں کر لیتا۔“

اس نے چڑ کر لالہ سے کہا تھا۔

”اس لیے مائی فرینڈ کہ پھر اس کی شخصیت کا چارم ختم ہو جائے گا۔“

لالہ کو خود اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر چڑ ہو رہی تھی۔

وہ کئی دن تک ڈسٹرب رہی تھی اور اب ذرا سنبھلی تھی کہ لوہا نے.....

اس نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھی فرسٹ ایئر کی اس لڑکی کی طرف دیکھا جو میز پر اخبار پھیلانے بڑے

دھیان سے فلمی صفحہ پڑھ رہی تھی۔

”پلیز ایک منٹ کے لیے اخبار دیں گی۔“

لڑکی نے خاموشی سے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

نائب عثمان اور غضنفر ملک کی تصاویر ساتھ ساتھ تھیں۔

”بھتیجی حیدر کے ڈرامے سے شہرت پانے والے غضنفر ملک نائب عثمان کے ساتھ فلم میں بھی کام کریں گے۔ نائب عثمان اس فلم کی ہیروئن ہوں گی اور غضنفر ملک ہیرو۔“

”ماما اس عمر میں ہیروئن نہیں گی..... اور ان سے آدمی عمر کا غضنفر ملک.....“

”نہیں یہ غلط ہے۔ یہ اخبار والے یونہی بے پرکی اڑاتے ہیں۔ ماما فلم میں کام نہیں کر سکتیں۔“

اس نے اخبار کو ہاتھوں سے پرے دھکیل دیا تھا اور بظاہر خود کو مطمئن کر کے پھر سے نوٹس بنانے لگی تھی۔

مگر گھر آتے ہی صفو نے اسے اطلاع دی تھی۔

”بیگم صاحبہ فلم میں بھی کام کریں گی۔“

”نہیں۔“ اسے یقین نہیں آیا۔ ”کیا پاپا نے انہیں منع نہیں کیا۔“ اس کی آواز خود دکھائی کی طرح مدھم تھی۔

”جی نہیں جی..... آج بہت لوگ آئے تھے۔ بہت ہنگامہ رہا۔ بیگم صاحبہ تو بہت خوش تھیں پھر وہ سب چلے گئے۔“

”اور ماما۔“

”وہ بھی۔“ صفو نے بتایا۔

”کھانا لگاؤں جی؟“

”نہیں۔ پاپا کہاں ہیں؟“

”اسٹڈی میں۔“

اور وہ کالج بیک یونی شولڈر پر لٹکائے عثمان احمد کے پاس چلی آئی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔

”پاپا.....“ اس نے قریب جا کر آہستگی سے کہا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت محفے محفے اور غڑ حال لگ رہے تھے۔

”پاپا آپ کیا لکھ رہے ہیں؟“

”کچھ ضروری باتیں نوٹ کر رہا تھا۔“ انھوں نے فائل بند کر دی۔ ”تمہیں کچھ کام تھا کیا؟“

”پاپا کیا ماما فلم میں بھی کام کریں گی؟“

”ہاں۔“ انھوں نے گہری سانس لی۔

”آپ نے ان کو منع نہیں کیا؟“

”تمہاری ماما کو پراسرار بننے کا شوق چرایا ہے۔“

”اب پاپا..... اب جب کہ میں ہوں عاشری ہے، نینا اور تیرہ ہے اور مجھے یہ پسند نہیں ہے پاپا۔ آپ کو بتا ہے اخبار الٹی سیدھی باتیں لکھتے رہتے ہیں اور میں..... میں آج ماما سے بات کروں گی انہیں منع کروں گی۔“

ایک دم ہی اس کے اندر بلا کی خود اعتمادی در آئی تھی۔

”اتنا تنگ نظر نہیں بننے بیٹا۔“ عثمان احمد نے ہولے سے اس کا ہاتھ چپچپایا۔

”یہ تنگ نظری نہیں ہے پاپا خیال اور سوچ کی بات ہے۔“

”ہاں بیٹا لیکن تمہاری ماں کسی کے روکے سے رک نہیں سکتیں۔ وہ جو کرنا چاہتی ہیں کریں گی ہر

صورت..... جاؤ کھانا کھاؤ۔ ریلیکس ہو جاؤ۔ خواجہ اپنے ذہن کو مت تھکایا کرو۔“

اور وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی لیکن بہت مضطرب تھی اور ادھر ادھر ٹھہل کر اس اضطراب کو کم کرنے کی

کوشش کر رہی تھی مگر وہ ٹپٹپٹے ٹپٹے رکی۔ الوینا کی طنزیہ ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپتے ہوئے وہ کارپٹ پر بیٹھ گئی اور کچھ دیر تک یونی کان ڈھانپے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔

”اور میں کس بات سے خوف زدہ ہوں۔“ اس نے کانوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔

”اور ماما پہلے بھی..... میری پیدائش سے پہلے بھی توئی وی ڈراموں کے لیے کام کرتی تھیں پھر اب

اگر وہ کام کر رہی ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

”اور اب میری ماما بہت مضبوط ہیں۔ شو بیز کی دنیا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جب وہ بیک

تھیں، خوبصورت تھیں، تب بھی تو..... اور اب تو وہ چار بچوں کی ماں ہیں۔“

”اور پاپا صحیح کہتے ہیں۔ مجھے تنگ نظر نہیں بننا چاہیے۔“

”اور اگر ماما سے بات کروں گی تو انہیں خواجہ غصہ آجائے گا اور پھر..... ڈیپریس ہو جائیں گی۔“

”مجھے ماما کا خیال رکھنا چاہیے..... اور اب کتنا عرصہ ہو گیا ہے ماما کو میگزین نہیں ہوا اور نہ ہی وہ اس

طرح ڈیپریس ہوئی ہیں۔“

اور الوینا کی تو عادت ہے الٹی سیدھی باتوں کی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ماما ہم سب کو چھوڑ کر غنیمت

ملک..... وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں یونی فضول سوچتی رہوں گی۔ کیوں نہ لالہ سے بات کروں۔

اس نے کمرے سے باہر آکر لالہ کا نمبر ملایا لیکن وہ گھر پر نہیں تھی۔ ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ مڑی ہی

تھی کہ تیل ہونے لگی۔

دوسری طرف ڈاکٹر معید تھے۔

”ارے آپ۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”فائن۔“

وہ بڑی خوش دلی سے بات کرتی رہی۔ ”پاکستان کب آرہے ہیں؟“

”بہت جلد۔ ہمیشہ کے لیے۔“

انہوں نے خوش خبری سنائی اور فون بند کر دیا اور وہ واپس کمرے میں آنے کی بجائے وہاں ہی لاؤنج

میں بیٹھ کر ماما انتظار کرنے لگی۔



”مومو۔ مومو کی بچی، تم کہاں کھو گئی تھیں۔ تمہیں کیا خبر میں تمہارے لیے کتنا پریشان تھی۔“

بھئی نے اسے گیٹ پر ہی جالیا۔ ”اور کیا تم بیمار تھیں کس قدر زرد ہو رہی ہو۔ مجھے پتا تھا تم بیمار ہو گئی مگر

اس روز وہ بہت دیر تک ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ماما کا انتظار کرتی رہی تھی اور وقت گزاری کے لیے پرانے اخبار اٹھا کر دیکھتی رہی تھی۔ ایک مختصر درزہ نہ تو ماما اور غضنفر کے متعلق بہت سی فضول باتیں لکھی تھیں۔

تو کیا پاپا نے یہ سب کچھ پڑھ رکھا ہے، پھر بھی خاموش ہیں کیسے مرد ہیں وہ..... اگر وہ پاپا کی جگہ ہوتی تو غضنفر ملک کو گھر آنے سے روک دیتی اور ماما پر پابندی لگا دیتی کہ وہ کسی ڈرامے یا فلم میں کام نہ کریں مگر پاپا.....

اس کا جی چاہا تھا، وہ اٹھ کر پاپا کے پاس جائے اور انہیں یہ اخبارات اور میگزین دکھائے۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے پاپا کے ملے جلنے والے اور..... اور میڈم نرگس بھی اتنا ہنستی ہیں اور مسز آفندی پاپا سے سرگوشیاں کرتی ہیں لیکن وہ اخبار گفتگوں تلے دبائے بیٹھی رہی۔ ماما بہت دیر سے آئی تھیں لیکن وہ ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔

”ماما مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ نہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”جانو! اس وقت میں بہت تھکی ہوئی ہوں، صبح بات کر لینا اور سنو تم نے اور تمہارے پاپا نے کھانا کھا لیا تھا؟“

”صاحب نے تو صرف دودھ لیا تھا اور مریم بی بی نے نہ دو پہر کو کھایا نہ اب۔“ صفو جانے کب ٹی وی لاؤنج میں آ گئی تھی۔

”ابنی پراہلم؟“

”ہیں ماما.....“ اس نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

فریش اور تروتازہ۔ وہ کہیں سے بھی چار بچوں کی ماں نہیں لگتی تھیں اور اگر اخبار ان کے اور غضنفر ملک کے متعلق لکھ رہے تھے تو.....

”ماما پلیز۔“ اس نے ایک دم ان کے ہاتھ تھام لیے ”ماما پلیز، آپ فلم میں کام مت کریں۔“

”افوہ..... کیا حقاقت ہے مومو۔“ انھوں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے ”میں فلم سائن کر چکی ہوں۔“

”آپ اور غضنفر ملک اس میں ہیر وادیر ہیر وٹن آرہے ہیں۔“

”ہاں۔“ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور رخساروں پر رنگ سے جھللا اٹھے ”مومو تم دیکھنا تمہاری ماما کو اس فلم کے بعد کتنی شہرت ملتی ہے۔ کتنا نام ہوگا۔“

”کیا کریں گی اتنی شہرت کا ماما۔“ اس کی آواز گری گئی ”ماما پلیز آپ انکار کریں۔“ اس نے پھر التجا کی۔

”مومو میں تھکی ہوئی ہوں بہت۔ تم فضول باتیں مت کرو۔“

”آپ..... آپ جانتی ہیں یہ اخبار والے کیا لکھتے ہیں۔“ اس نے نیچے سے جھک کر اخبار اٹھایا۔

”فضول بکتے ہیں یہ۔“ ان کا لہجہ میڈم نرگس کی طرح ہو گیا تھا ”چلو جاؤ آرام کرو اور زیادہ مت سوچا کرو۔“

”زین۔“ عثمان احمد جانے کب اپنے بیڈروم سے باہر آ گئے تھے اور ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے

مجھے تمہارا گھر بھی تو معلوم نہیں تھا ورنہ ارسل یا مونی کسی کو ساتھ کے کرتہ ہارے گھر ضرور آتی اور اگر وہ نہ آتے تو پاپا کو لے آتی۔“ وہ ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

”مگر تمہارے بابا تو گاؤں میں رہتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مریم نے کہا۔

”ہاں یار! تمہیں بتایا تو تھا میں نے کہ شیری اور ارسل بھائی کے بے حد اصرار پر سب لوگ ادھر ہی شفٹ ہو گئے ہیں۔ بس کبھی کبھار گاؤں جاتے ہیں اور تمہیں ایک خوش خبری بھی سنائی تھی میں۔“

میرے چاچا ایک طویل عرصے بعد وطن واپس آئے ہیں۔ بہت بڑے سرجن ہیں۔ فی الحال وہ شیری بھائی کے ساتھ ہی ”رائف اسپتال“ میں کام کر رہے ہیں لیکن ان کا ارادہ گاؤں میں کلینک بنوانے کا ہے بلکہ وہ

اس سلسلے میں مصروف بھی ہیں اور دراصل بابا اور ماں جی نے سکندر چاچو کی وجہ سے ہی تو یہاں رہنا منظور کیا ہے۔ دراصل وہ اتنے عرصے بعد آئے ہیں نا تو ان سے جدا رہنا اب بابا کو بہت مشکل لگتا ہے۔“

یہی تفصیل بتائی ”اور پتا ہے میں نے تو سوچ لیا تھا کہ آج شیری بھائی سے بات کروں گی۔ تمہارے پاپا ان کے اسپتال میں داخل رہے تھے۔ انہیں یقیناً تمہارا پتا معلوم ہوگا۔“

”جھٹک پو یعنی۔ میں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں۔“

”کوئی ضرورت نہیں شکریہ ادا کرنے کی۔ محبتوں کے شکریے ادا نہیں کیے جاتے۔ تم یہ بتاؤ تمہیں ہوا کیا تھا؟“

”مجھے.....“ اس نے یعنی کی طرف دیکھا۔

”کتنی مطمئن، کتنی پرسکون ہے یہ لڑکی۔ ماں باپ کی محبتوں سے سرشار بھائیوں کے پیار سے آشنا..... کیا یہ میرا دکھ کچھ سکے گی اور میرے کرب کی شدت کو پا سکے گی۔“

”تم کچھ پریشان ہو مومو۔ گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔ تمہاری ماما پاپا سب ٹھیک ہیں نا۔ عاشری نینا، تیمور وغیرہ۔“

”ہاں وہ تو ٹھیک ہیں لیکن میں شاید ٹھیک نہیں ہوں۔“

”ہاں وہ تو نظر آرہا ہے لیکن تمہیں ہوا کیا ہے۔ کوئی گھریلو مسئلہ ہے؟“

”ہاں یعنی۔“ اس نے گہرا سانس لیا ”پتا نہیں، تم سمجھ پاؤ گی یا نہیں لیکن میرے اندر بہت گرد ہے بہت اندھیرے ہیں بہت جالے ہیں کچھ بھائی نہیں دیتا۔“

”مومو۔“ اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا ”تم کہو میں سمجھنے کی کوشش کروں گی اور اگر نہ بھی سمجھ سکے تو اتنا یقین رکھو کہ تمہارے درد کو محسوس ضرور کروں گی۔“

”تو پھر چلو لاہریری میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ اور وہ دونوں کلاس میں جانے کی بجائے لاہریری میں آ گئیں۔

اور پاپا بھی..... میں نے پہلی بار پاپا کو اونچی آواز میں بولتے سنا..... اور پھر صبح ماما بیمار ہو گئیں۔ وہ ہی پرانا سردرد اور ڈیپریشن پاپا تو ان کی پٹی سے ہی لگ کر بیٹھ گئے حالانکہ وہ خود اتنے کمزور ہیں۔ شکر ہے، آنٹی زمر باہر گئی ہوئی ہیں ورنہ وہ تو پھر ادھر ہی ڈیرہ ڈال دیتیں۔“

”ساری بات یہ ہے مومو کہ تم بہت حساس ہو۔“ اس کی ساری بات سننے کے بعد عینی نے کہا ”ورنہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ تمہاری ماما کا تعلق شوہر سے ہے۔ تو ظاہر ہے شوہر بس سے متعلق لوگ ان سے ملیں گے جلسے بھی اور یہ اخبارات تو بس بے پرکی اڑاتے ہیں۔ آخر انہیں اپنے اخبارات بھی تو فروخت کرنے ہوتے ہیں۔“

”لیکن کیا تھا عینی اگر ماما میری اور پاپا کی بات مان لیتیں۔ میں کتنا خوش ہوتی اور مجھے ماما پر کتنا فخر ہوتا۔ آخر مائیں اپنی اولاد کے لیے قربانیاں بھی دیتی ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مومو لیکن تمہاری ماما ذرا مختلف ہیں تو تمہیں ہی حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے نا.....“ عینی نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا ”تمہاری ماما اب جس مقام پر ہیں اور اس سیریل سے جو انہیں شہرت ملی ہے نا ان کا واپس پلٹنا مشکل ہے اور تم اتنی حساس مت بنو مومو۔“

”مجھے..... مجھے دراصل ڈر لگتا ہے خوف محسوس ہوتا ہے عینی جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی بہت بڑا حادثہ کہیں کوئی بڑا المیہ جنم نہ لے لے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”پگل مت بنو۔ کچھ نہیں ہونے والا۔ یہ سب تمہارے اندر کے خوف ہیں۔“

”ماما کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں..... ان کا رویہ ان کی باتیں ان کے ری ایکشن..... کیا میری ماما بچ کوئی نفسیاتی کیس ہیں۔ پتا ہے عینی ایک بار شرجیل مرزا نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری ماما دراصل نفسیاتی کیس ہیں۔“

”فضول۔“ عینی نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹ دیے۔ ”وہ شرجیل مرزا جو شخص بھی ہے فضول بولتا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ دراصل تمہاری ماما بھی تمہاری طرح ضرورت سے زیادہ حساس ہیں اور پھر شاید ان کے اندر حاکمیت بہت ہے۔ شاید ہمیشہ ان کی بات مانی گئی ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں انہیں اولیت دی گئی ہے اور تم جب ان کی بات کی مخالفت کرتی ہو تو انہیں غصہ آ جاتا ہے اور بس۔“

”تم..... تمہیں تو ماہر نفسیات ہونا چاہیے۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”جھجک گاؤ تم مسکرائیں تو.....“ عینی نے اپنے بازو ہٹا لیے ”اور جاتی ہو مس مہرین کا پیر یڈ کب کا گزر بھی گیا اور انہوں نے ہمیں دیکھا بھی تھا ادھر آتے ہوئے۔ اب کل وہ ہماری کلاس لیں گی۔ خیر دیکھا جائے گا۔“

”اوہ.....“ مریم کو افسوس ہوا کہ مس مہرین کا پیر یڈ کس ہو گیا ہے۔ یوں بھی وہ آج پورے ایک ہفتے دیر آئی تھی۔

”کیا حرج ہے اگر تم مومو کی بات مان لو تو.....“

نہن عثمان احمد نے کسی قدر غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”عثمان پلیز تم مومو کی حمایت مت کرو۔ یہ تو بے وقوف ہے۔ تم تو.....“

”لیکن زینی.....“ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ ”میں بھی سمجھتا ہوں کہ تمہیں مومو کی بات مان لینی چاہیے۔ ٹی وی ڈرامے کی حد تک تو گوارا تھا لیکن یہ فلم میڈیا.....“

”عثمان.....“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں تھیں ”تم جانتے ہو شرجیل نے اس فلم پر بہت پیسہ لگایا ہے میں انگریز سنٹ سائن کر چکی ہوں۔“

تو شرجیل مرزا یہ فلم بنا رہے ہیں۔ مریم نے عثمان احمد کی طرف دیکھا جنہوں نے سہارے کے لیے دیوار پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”تم جانتی ہو زینی اخبارات.....“

”اخبارات اخبارات۔“ انہوں نے غصے سے کشن اٹھا کر زمین پر پھینکا ”بکواس کرتے ہیں سب اخبارات۔“ وہ غصے سے کشن اٹھا اٹھا کر پھینکے لگیں۔ ان کی پیشانی کی رکیں ابھرنی لگیں۔ مریم سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

”تم.....“ انہوں نے مریم کی طرف دیکھا..... ”تم ہمیشہ سے میری دشمن ہو۔ جاہل و دقنا نوی روح ہے تمہارے اندر اپنے باپ کے خاندان پر مبنی ہو۔“

اس نے گھبرا کر عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ جو لب بھینچے یونہی دیوار پر ہاتھ ٹکے کھڑے تھے۔

”مومو تم اندر جاؤ اپنے کمرے میں۔“ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر انہوں نے کہا اور پھر نہن عثمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ریلیکس زینی۔ تم اتنی جلدی حواس کو بیٹھتی ہو جھل سے سنو..... غور کرو اور پھر.....“

”تم..... تم اب مجھے مشورہ دو گے۔ مجھے سمجھاؤ گے عثمان حالانکہ تم نے کہا تھا کہ تم میری کسی سرگرمی کی بات پر اعتراض نہیں کرو گے۔ یاد کرو وہ شام جب میں.....“

”مجھے سب یاد ہے زینی۔“ انہوں نے دیوار سے ہاتھ ہٹا لیا ”لیکن ہمیں اب اپنے بچوں کی خواہشات اور مرضی کا بھی کچھ خیال رکھنا ہے۔ اگر مومو کو یہ پسند نہیں ہے تو.....“

”بچوں کی نہیں صرف مومو کی۔“ ان کی تیز آواز کمرے میں بھی آ رہی تھی ”تم ہمیشہ مومو کی غلط حمایت کرتے ہو عثمان اور میں دیکھ رہی ہوں آج کل تم نے اسے بہت سرچڑھا رکھا ہے اور.....“

”پلیز زینی.....“ بیٹی ہے وہ میری اگر میں اس کی حمایت کرتا ہوں تو.....“

”اور پتا ہے۔“ مریم نے ساری بات یہ کر عینی کی طرف دیکھا۔ ماما اس رات بہت دیر تک بولتی رہیں

”خیر کوئی بات نہیں۔“ یعنی نے بے پروائی سے کہا ”تم آج میرے ساتھ گھر چلو۔“
”تمہارے گھر؟“

”ہاں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیا تم میرے گھر نہیں آ سکتیں۔“
”ہاں آ سکتی ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ تم آج چھٹی کے بعد میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ مجھے یقین ہے میرے
اور ماں جی سے مل کر تم ملکی ہسٹلکی ہو جاؤ گی۔ میرے بابا منٹوں میں تمہارے ذہن کے جالے صاف کر دیں
گے۔ میں شاید تمہیں بہتر تسلی نہیں دے سکتی لیکن میرے بابا کو یہ ہنر آتا ہے اور میری ماں جی..... تم دیکھا
تم سے کتنی محبت سے پیش آتی ہیں۔“

”لیکن یعنی۔“ اس نے تشویش سے اسے دیکھا ”کیا تمہاری ماں جی اور بابا اس بات کو پسند کریں گے
کہ تمہاری دوستی ایک فلم ایکٹریس کی بیٹی سے ہو۔“
”ہاں۔“ یعنی نے یقین سے کہا ”میرے بابا اور ماں جی ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے کبھی کوئی ایسی
بات نہیں کہتے جو مجھے پسند نہ ہو اور ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم میری دوست ہو۔“
”لیکن پھر بھی۔“ اس نے ہنسی نظروں سے اسے دیکھا ”تم انہیں مت بتانا کہ میں نے نب عثمان احمد کی
بیٹی ہوں جو.....“

”لیواٹ مومو۔ تم خوا خواہ واہموں میں مت پڑا کرو اور چلو اب اٹھو۔ آخری دو پیریز تو اینڈ
کر لیں۔“ یعنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور دونوں لائبریری سے باہر نکل آئیں۔



مریم کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ بظاہر اس نے خود کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ اس نے اس بات
پر کڑھنا چھوڑ دیا تھا کہ ماما کب گھر آئیں ہیں اور کب جاتی ہیں۔ گھر میں کون آتا ہے اور کتنی دیر بیٹھا ہے
اور پاپا ایسے کیوں ہیں۔

ماما کی طرف سے اتنے بے نیاز اور لاپرواہ۔

ان کی ہر صحیح غلط بات پر ”لیس“ کہنے والے۔

اخبارات کیا کہتے ہیں۔

انہیں تو اپنا پیٹ بھرنا ہے۔

اس نے خود کو سمجھا لیا تھا۔

کبھی شرجیل مرزا اور ماما کا اسکیڈل چھاپ دیتے

اور کبھی ماما اور غضنفر ملک۔

جانے کیا ملتا ہے یہ سب فضول باتیں کر کے ان کو۔

”جو جس طرح ہے اسے اسی طرح چلنے دو بیٹا تم اسے سنوار نہیں سکتیں۔“ یعنی کے بابا نے اسے

سمجھایا تھا۔

یعنی نے جی ہی کہا تھا۔ اس کے بابا کی باتوں میں ایک سحر تھا، ایک عجیب سی مقناطیسی تھی۔ دل خود
خود ان کی باتوں پر یقین کرتا چلا جاتا تھا اور یعنی کی ماں جی..... سچ سچ ان کا وجود تو محبتوں سے گندھا ہوا تھا۔

کتنا پیار کیا تھا انہوں نے اس سے

کتنی مقدس سی خوشبو آ رہی تھی ان کے وجود سے

ہاتھ کی خوشبو۔

اور ماما کے وجود سے یہ خوشبو کبھی نہیں آئی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا وہ ان کے سینے سے لگی اس خوشبو کو
اپنے اندر اتارتی رہے وہ کتنی شفقت اور محبت سے سب گھروالوں کا حال پوچھ رہی تھیں جیسے سب کو بہت
قریب سے جانتی ہوں۔

”اور ماں تو ایسی ہوتی ہیں۔“ اس نے انہیں دیکھ کر سوچا تھا۔

انہیں ہر ایک کی فکرتھی، ارسل کی، مونی کی اور شہر یار کی اور اسے بھی انہوں نے کتنے پیار سے سمجھایا تھا۔

”بیٹا تم میرے لیے یعنی کی طرح ہی ہو۔ پریشان نہ ہو کرو۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو اور جب دل
چاہے آ جایا کرو۔“

اور یعنی کے گھر سے وہ کافی مطمئن ہو کر آئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو پڑھائی میں مگن کر لیا تھا۔ یوں
بھی فائل امتحان نزدیک تھا۔ کالج سے آ کر وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ کبھی کبھی تھک جاتی تو
عثمان احمد کی اسٹڈی میں چلی جاتی ان کے لیے کافی بیانی اور انہیں مطالعہ کرتے دیکھتی رہتی تھی یا پھر یونی
اور اصرار بے مقصد گھر کا چکر لگاتی ماما زیادہ تر گھر سے باہر رہتیں۔ جب گھر پر ہوتیں تو کوئی نہ کوئی موجود ہوتا۔
شرجیل مرزا، غضنفر ملک اور بھتیجی حیدر۔

کبھی کبھار وہ سب بہت دیر تک بیٹھتے اور وہ متضاد کیفیٹوں کا شکار ہو جاتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ان
سب کو دھکے دے کر گھر سے نکال دے۔ یہ سب جن کی اٹھلی نظریں ماما کے چہرے کا طواف کرتی تھیں۔ وہ
نغمیاں بھینچ بھینچ کر اپنے غصے کو کم کرنے کی کوشش کرتی۔

اور یعنی کے بابا نے کہا تھا۔

”وہ ابھی بہت کم عمر ہے اور اسے اپنے ذہن پر اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ بس صرف اور صرف اپنی
پڑھائی کی طرف توجہ دینی چاہیے لیکن وہ کیا کرے جب بوجھ خود بخود ہی اس کے ذہن پر آگرتا تھا۔ وہ
کٹاں کھول کر بیٹھ جاتی تھی۔ لفظ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ریل کے ڈبوں کی طرح بھاگتے رہتے۔

کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے۔ ایسے میں اسے عثمان احمد پر بھی غصہ آتا جو ماما سے بالکل بی بے نیاز ہو گئے تھے۔

لوگ تو اپنی ذرا ذرا سی چیز کی اتنی حفاظت کرتے ہیں اور پاپا نے اپنے قیمتی خزانے کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ کیا خبر کس کس کا دل بد نیت ہو جائے۔ کیا پتا.....
وہ کانپ جاتی۔

اور فلمی رسالوں اور میگزین کے صفحے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے۔
وہ کورس کی کتابیں سامنے رکھے بڑی بڑی باتیں سوچتی رہتی۔

وہ سوچتی کسی دن پاپا سے کہے گی کہ انھیں بتائے گی کہ جب چیزیں سامنے ہوں تو نیت خراب ہوتے ہیں نہیں لگتی اور انہیں چاہیے کہ وہ ماما کو کبھی اکیلا نہ چھوڑیں۔ ان کے ساتھ ساتھ رہا کریں۔ بے شک "میں" میں "بن کر ہی سہی" آخر ماما ایک کمزور عورت ہیں نا۔ اگر وہ پلٹ نہیں سکتیں تو پاپا کو چاہیے کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ ہی رہیں انہیں کبھی تنہا نہ چھوڑیں۔

اور یہی بات جب اس نے عینی کے بابا کے سامنے کہی تو وہ ہنس دیے۔

"کبھی کبھی چیزیں محفوظ پناہ گاہوں اور بند دروازوں سے بھی چوری ہو جاتی ہیں پتر۔"

"ہاں مگر یہ تو آپ مائیں کے ناکہ غیر محفوظ چیزوں کو زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔"

"ہوں۔" بابا نے محبت سے اس کا سر تھپتھپایا "ہم کسی دن تمہارے پاپا سے ملنے آئیں گے اور انہیں تمہارے خدشے اور خوف ضرور بتائیں گے۔"
اور وہ مسکرا دی تھی۔

عینی کے گھر آ کر اسے بہت سکون ملا تھا اور وہ اکثر جب دل گھبراتا تھا عینی کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ آج بھی وہ عینی کے گھر جانے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا ماما کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں اور عثمان احمد ان کے قریب کھڑے ہوئے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔

"اور درحقیقت ماما اور پاپا کا پھل بہت شاندار ہے۔" اس نے دل ہی دل میں انھیں بہت سراہا۔

زینب عثمان نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر عثمان احمد کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"کبھی کبھی تم بالکل احمقانہ باتیں کرتے ہو عثمان۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں نہ جاؤں جب کہ میں

اس اسٹوری کا مرکزی کردار ہوں۔"

"آخر اس کی شوٹنگ پاکستان میں بھی ہو سکتی ہے۔ تم جی سے کہو کہ اس کی شوٹنگ پاکستان میں ہی کر لیں اتنے اتنے خوبصورت مقام ہیں یہاں۔"

زینب عثمان نے اس طرح عثمان احمد کی طرف دیکھا جیسے انہوں نے بالکل بچوں جیسی بات کہہ دی ہو۔
"او کے عثمان! مجھے اس وقت جلدی ہے اور تمہاری طبیعت بھی شاید ٹھیک نہیں ہے جو سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جب فلم کی شوٹنگ انگلینڈ میں ہونا ہے تو میں یہاں کیسے رہ جاؤں۔ یہاں جتنی شوٹنگ ہوتی ہو چکی۔"

"ہاں! شاید میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔" عثمان احمد نے وہیں سنگ روم میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ جسے مریم نے نہیں سنا۔ وہ زینب عثمان کے جانے کے بعد ان کے قریب چلی آئی۔

"کیا بات ہے پاپا۔ کیا ماما باہر جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پاپا ایسا کریں آپ بھی ان کے ساتھ چلے جائیں۔" اس نے فوراً مشورہ دیا۔

"میں..... مگر کیوں؟"

"ماما کی حفاظت کے لیے۔" اس نے جھٹ سے کہا۔

"کیا اسے میری حفاظت کی ضرورت ہے؟" ان کا انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں....." اس نے پورے یقین سے کہا "بہر حال وہ ایک کمزور عورت ہیں۔ پھر آپ ساتھ ہوں گے تو کوئی صفائی ان کا اسکیئرڈ نہیں بنائے گا۔"

اب وہ بے تکلفی سے ان سے ہر بات ڈسکس کر لیتی تھی۔

"پاکل ہو تم۔ میرا جانا ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں بھلا۔"

"تم ہو یہاں! عاشری نینا اور تیمور ہیں۔"

"یہاں میرے پاس صفورا اور شریف ہوں گے اور عاشری وغیرہ ہاسٹل میں ہیں۔ جب چھٹیاں ہوں گی تو میں خود انہیں اسلم چاچا کے ساتھ جا کر لے آیا کروں گی۔ آپ ہماری فکر نہ کریں پلیز..... اگر کوئی پرابلم ہو گیا تو عینی ہے میری دوست اس کے بابا ہیں! ماں جی ہیں۔ وہ سب اچھے اور محبت کرنے والے ہیں..... ہمدرد اور مخلص۔"

"تم نے انہیں کبھی ملوایا ہی نہیں بیٹا! کسی دن بلاؤ انہیں گھر۔" انہوں نے بات پلٹی لیکن وہ انہیں قائل کرتی رہی کہ ان کا زینب عثمان کے ساتھ جانا بے حد ضروری ہے۔

"اسی بہانے آپ کی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔" آخر میں اس نے کہا "ہر وقت گھر میں رہتے ہیں۔"

"اچھا! سوچوں گا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

”ہاں، ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“
 ”تو پھر پلیز مجھے عینی کے گھر چھوڑ دیجیے گا اور اس طرح عینی کے بابا سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔“
 ”عینی کے بابا سے تو پھر کبھی مل لوں گا، کیونکہ میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔ جتنی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ البتہ تم آ جاؤ تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔“ انہوں نے شریف کو آواز دی۔
 ”اگر جتنی صاحب کا فون آئے تو اسے بتا دینا کہ میں اسی طرف جانے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔“
 ”جی بہتر سر۔“ شریف نے سر ہلایا اور وہ مریم کے ساتھ باہر نکل آئے۔



”بھابی، یہ نقشہ دیکھیں۔“ سکندر نے ایک نقشہ میز پر پھیلایا ”یہ ارسل نے اپنے دوست کے بھائی سے جو آرکیٹیکٹ ہے، بنوایا ہے۔“
 ”مگر سکندر، یہ ڈبل اسٹوری بلڈنگ ہے۔ اس پر تو بہت خرچ آئے گا۔“
 ”ہاں پیسے کی فکر آپ نہ کریں بھابی، بس یہ بتائیں نقشہ کیسا ہے؟“
 ”اچھا ہے لیکن سکندر.....“
 ”لیکن کیا؟“ سکندر نے سر اٹھا کر چوہدری ثار کی طرف دیکھا۔
 ”تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ تاہم ارسل لگ جائے گا، گاؤں میں۔“
 ”دل کا کیا ہے بھابی۔ جہاں لگائیں لگ جاتا ہے اور پھر وہ تو میرا اپنا گاؤں ہے۔ میں تو ان ہواؤں کی خوشبو کو ترس گیا تھا۔ میں نے بابا سے عہد کیا تھا کہ میں گاؤں میں ہی پریکٹس کروں گا۔ میں اس عہد کو نبھانا چاہتا ہوں۔“
 ”عہد تو تم نے اور بھی بہت سے کیے تھے سکندر۔“ بھابو نے اندر آتے ہوئے جانے کیوں شکوہ کیا تو چوہدری ثار نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”گزری باتوں کا اب کیا ذکر صالہ۔“

”ماضی بھی تو ہماری ذات کا ایک حصہ ہوتا ہے بھابی۔“ سکندر نے شرمندگی سے کہا ”بھابو کو کہنے دیں جو کہتا ہے۔ میں ہمہ وقت ان غدا متوں اور شرمندگیوں میں غرق رہتا ہوں بھابو کہ بہت سے عہد میں نہیں نبھاسکا بہت سے دل میں نے توڑے..... خاص کر.....“

اس کا لہجہ اتنا دھیمہ ہو گیا تھا کہ چوہدری ثار اور بھابو نہ سن سکیں کہ سکندر نے کیا کہا ہے۔
 ”سکندر میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔“ صالہ شرمندہ ہو گئیں ”میری زبان سے یوں ہی نکل گیا تھا۔“
 ”مگر بھابو آپ نے ٹھیک کہا تھا اور میں نے آپ کی بات کا بالکل برا نہیں منایا۔“ اس نے نقشہ لپیٹا اور کھڑا ہو گیا۔

”یہ شہر یا اسپتال چلا گیا؟“
 ”نہیں۔ آج تو اس کی نائٹ ہے۔ سو رہا ہے شاید۔“
 ”کیوں کوئی کام تھا اس سے؟“ بھابو نے پوچھا۔
 ”کوئی خاص نہیں ذرا ایک مریض کے متعلق بات کرنی تھی۔“
 ”بابا۔“ عینی نے اندر جھانکا ”دیکھیں تو کون آیا ہے۔“
 ”ارے ہماری بیٹی آئی ہے۔“ چوہدری ثار نے عینی کے پیچھے کھڑی مریم کو دیکھا ”آؤ آؤ بیٹا۔ میں تو تمہارے لیے بہت ادا اس ہو گیا تھا۔“
 وہ عینی کے ساتھ اندر آ گئی۔

”سکندر پتر یہ مریم ہے۔ میری دوسری بیٹی۔“
 مریم نے سر اٹھا کر سکندر ملک کی طرف دیکھا اور آہستگی سے اسے سلام کیا۔
 ”جیتتی رہو۔“ سکندر کے ہونٹوں پر شفیق سی مسکراہٹ تھی۔
 ”یہ میرے چاچو ہیں۔ وہی جن کے متعلق میں نے تمہیں بتایا تھا۔“ عینی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے ایک بار پھر سکندر ملک کی طرف دیکھا۔
 عینی نے صبح کہا تھا ”سکندر ملک کی شخصیت میں بڑا وقار تھا۔ کنپٹیوں سے کہیں کہیں سفید بال جھانک رہے تھے اور حقیقت میں وہ بہت شاندار لگ رہے تھے۔“
 ”اچھا بھابی میں ذرا شیر کی طرف جا رہا ہوں۔ دیکھوں جا گا ہے یا نہیں۔“
 ”آؤ بیٹی ادھر میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔“ صالہ نے اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنائی۔ مریم ان کے پاس آئی تو انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ عینی چوہدری ثار سے جز کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر مریم کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 ”بہت دنوں بعد آئی ہو۔ میں نے آج ہی عینی سے کہا تھا کہ واپسی پر تمہیں ساتھ لے کر آئے لیکن تم آج کالج نہیں گئی تھیں بیٹا۔“

”دراصل میں آج کل زیادہ تر گھر پر ہی پڑھتی ہوں۔ دو چار روز تک تو ہم فارغ ہو ہی جائیں گے۔“
 ”ہاں بابا اس نے پوزیشن لیٹی ہے بہت محنت کر رہی ہے۔“ عینی نے بتایا۔
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ چوہدری ثار بہت خوش ہوئے ”ہماری بیٹی انشاء اللہ پوزیشن لے گی لیکن تم بتاؤ تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ انہوں نے ہولے سے عینی کا کان کھینچا۔
 ”بابا۔“ وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئی ”کان تو نہ کھینچیں۔“
 ”کیوں کیا لہبا ہو گیا ہے۔“ وہ ہنسے۔

اپنی کمزوریاں اور الجھنیں۔

ماما کی بیماری۔

ان کے شوق اور ان کی دوستیاں۔

پاپا کارویہ۔

اور پایا نے بڑی محبت اور شفقت سے اسے سمجھایا تھا اور اس کے ذہن کے جالے صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

”لیکن بابا، میں چاہتی ہوں بابا بھی ان کے ساتھ جائیں۔“

”تو یا یا کیا کہتے ہیں؟“

”وہ جانا نہیں چاہتے۔“

”ظاہر ہے پھر تم یہاں اکیلی ہو جاؤ گی۔“

”لیکن میں نے انہیں کہا ہے کہ میں اکیلی رہ لوں گی۔ میں بچی تو نہیں ہوں۔ بابا، آپ ہمارے گھر

آئیں۔ پایا کو سمجھائیں وہ آپ کی بات مان جائیں گے۔“

”لیکن تم کیوں چاہتی ہو بٹیا کہ تمہارے پاپا ساتھ جائیں؟“

”بابا‘ میں۔“ اس کی آواز بھینگ گئی۔

اب وہ انہیں کیسے بتاتی کہ اسے کیا ڈر ہے، کیا خوف ہے۔ کون سے وہم اسے ستار ہے ہیں۔ اسے شرجیل مرزا سے خوف آتا ہے۔ جس کی آنکھوں کا کینہ اسے صاف نظر آتا تھا۔ کہیں وہ اس سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے ماما کو اس سے جدا نہ کر دے۔

یا پھر وہ غضنفر ملک جو ماما سے آدمی عمر کا ہے لیکن.....

آخر میڈم زنگس نے بھی لالہ کے ڈیڈی سے طلاق لے کر اپنے سے آدھی عمر کے امتیاز شاہ سے شادی کر لی تھی اور ماما کی جتنی بھی فریڈ زتھیں ان میں دو تین کو چھوڑ کر سب نے ہی دودو شادیاں کی تھیں۔

اور آنٹی نرگس کی تو یہ تیسری شادی تھی۔

اور مامانے ایسا کرنا چاہا تو کون روک سکے گا انہیں۔

اور پھر ہم.....

ہم سب کیا کریں گے۔

میں، عاشی، نینا، مور۔

اور.....اور

وہ تو مر ہی جائیں گے۔

”ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”تو چلو دوسرا بھی لمبا کر دیتا ہوں لیکن تم میرے سوال کا جواب کیوں گول کر گئی ہو۔ میں نے تمہارے ارادے پوچھے تھے۔“

”بابا! ارادے تو میرے اچھے ہیں اور میں محنت بھی کر رہی ہوں لیکن مومنو بہت لائق اور ذہین سپر میں اس جیسی ذہین نہیں ہوں۔“

”مگر اب کے میری پڑھائی تسلی بخش نہیں ہو رہی ہے۔“ مریم نے سنجیدگی سے کہا ”بس کامیاب ہو جاؤں گی، یہی غنیمت ہے۔“

”نہیں بھئی یہ غلط بات ہے۔ ہماری بیٹی نے ہر حالت میں پوزیشن لیتی ہے۔“

”مگر بابا، مجھ سے پڑھا نہیں جاتا اور اب.....“

”کیوں اب کیا ہوا ہے۔ تم سے کہا ہے میں نے کہ زیادہ نہ سوچا کرو۔ اپنے ماں باپ پر اعتماد کرو۔“
صالحہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم لوگ باتیں کرو میں چائے لے آؤں۔ شیریں سو کر اٹھا ہوگا تو اسے چائے... کی طلب ہو رہی ہوگی۔“

”سنو بھئی میری بیٹی کے لیے وہ شادی کا باب بھی گرم کر لیتا جو دن کو بتائے تھے۔“ انہوں نے صالحہ بیگم کو آواز دے کر کہا تو انہوں نے مڑ کر چوہدری نثار کو دیکھا۔

”ہاں“ آپ نہ کہتے تو مجھے بھلا کہاں یاد تھا کہ آج شامی کباب بھی بنے تھے۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”بھئی عینی تمہاری ماں کا بھی جواب نہیں۔“ مریم کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”تو مریم بیٹا تم کیا کہہ رہی تھیں۔ کیا ہوا ہے اب؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”بابا“ ماما جس فلم میں کام کر رہی ہیں۔ اس کی شوٹنگ ملک سے باہر ہونی ہے۔ سچا پورا انگلینڈ اور جانے کہاں کہاں اور ظاہر ہے ماما کو بھی جانا ہے۔“

”ہاں ظاہر ہے۔ جب وہ اس فلم میں کام کر رہی ہیں تو پھر جانا تو پڑے گا ہی۔“ انہوں نے پرسوج انداز میں سر ہلایا۔

بابا سے دل کی ہر بات کر کے اسے بڑا سکون ملا تھا۔ اگرچہ اس نے عینی کو منع کیا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو اس کے فضلی بیک گراؤنڈ کے متعلق نہ بتائے لیکن اس دن وہ اتنی ڈپر پریس تھی کہ اس نے خود ہی ان سے سب کچھ کہہ دیا۔

اپنے واسے۔

اپنے خوف اور ڈر۔

کنتا چاہتے ہیں وہ ماما کو۔

پچھلے چند ماہ سے وہ فارغ اوقات میں ٹی وی میگزین اور فلمی رسالے بڑی باقاعدگی سے پڑھنے لگی تھی حالانکہ یہ رسالے اور میگزین پہلے بھی اس کے گھر آتے تھے لیکن اسے ان سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اب یکا یک ہی اس کے دل میں شوبز سے تعلق رکھنے والے ہر آدمی کے بارے میں جان لینے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ سب کی نجی زندگیوں کے بارے میں جان لینا چاہتی تھی۔ شاید وہ اسٹوری طور پر اپنے گھر کا اور ان کے گھروں کا موازنہ کرنا چاہتی تھی۔

اور اس نے غور کیا تھا کہ چالیس فیصد شادیوں کا انجام علیحدگی تھا اور پتا نہیں کیوں اچانک ہی یہ خوف اس کے دل میں دھرتا دے کر بیٹھ گیا تھا کہ اگر ماما کیلے گئیں تو کچھ ہو جائے گا۔

کوئی بہت بڑا المیہ۔

شاید ان کا گھر بھی ٹوٹ جائے..... اور.....

نامعلوم سے آنسو اس کے اندر گرنے لگے چوہدری ثار جو بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھے اور اس کے سر کو ہولے سے تھپتھپایا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا“ بے وقوف لڑکی تم جو کچھ سوچ رہی ہونا ایسا کچھ بھی نہیں۔“ وہ اپنے مخصوص اثر انداز میں سمجھانے لگے تو اس نے پلکوں تک آجانے والے آنسوؤں کو اپنی انگلی کے پوروں سے پونچھا۔ تب ہی شہریار اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکا اور واپس مڑا ہی تھا کہ بابا نے اسے آواز دی۔

”شیری پتر کس لیے آئے تھے؟“

”بابا! وہ.....“ اس نے کن آنکھوں سے مریم کی طرف دیکھا۔ جس کی گلابی آنکھیں اس کے رونے کا پتہ دے رہی تھیں۔

”چاچو کہہ رہے تھے کہ آپ کو بتا دوں کہ وہ ارسل کے ساتھ کسی ٹھیکے دار سے بات کرنے جا رہے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے اور پتر تم مریم سے ملے ہو ہماری بیٹی سے۔“

”جی بابا! اسپتال میں ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ عینی کی دوست ہیں۔“

”اچھا ہاں! اس کے پاپا بیمار تھے نا یعنی نے بتایا تو تھا۔“ چوہدری ثار نے سر ہلایا۔

وہ ایک نظر اس پر ڈال کر باہر نکل گیا۔ بابا پھر اسے سمجھانے لگے۔ تب ہی صالو نے آواز دی۔

”عینی بیٹی! اپنی سسلی اور بابا سے کہو کہ باہر آ جائیں۔ باہر موسم اچھا ہو رہا ہے۔ میں نے سکندر کو بھی

روک لیا ہے۔ چائے پی کر جائے گا وہ۔“

اور بابا اسے ساتھ لے کر باہر آ گئے۔

چائے پر ارسلان اور ارمغان بھی تھے وہ دونوں عینی کو مسلسل چھیڑ رہے تھے۔

سکندر اور چوہدری ثار ان کی ٹوک جھونک پر مسکرا رہے تھے۔ چائے پی کر سکندر ارسلان اور ارمغان چلے گئے۔ شہریار اور بابا بھی اٹھ گئے تھے۔ وہ وہیں ہی عینی سے بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ عینی اسے چاچو کے متعلق بتاتی رہی۔

”اور پتا ہے چاچو کی کوئی اولاد نہیں۔ ان کی بیوی نے ان سے طلاق لے لی تھی۔“

”اور پھر تمہارے چاچو نے شادی نہیں کی؟“

”نہیں..... یہ بھی اچھا ہے کہ چاچو کے بچے نہیں تھے ورنہ ٹوٹے ہوئے گھروں کے بچے تو پرالہم

چالڈ بن جاتے ہیں.....“

”ہاں! لالہ ہے نا آنٹی نرمس کی بیٹی وہ بھی یوں ہی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی ہے حالانکہ بظاہر وہ بڑی خوش رہتی ہے لیکن کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اسے بھی اندر سے آنٹی کی اس کے ڈیڈی سے علیحدگی اور امتیاز شاہ سے شادی نے ڈسٹرب کیا ہوا ہے۔“ وہ عینی کو لالہ کے متعلق بتانے لگی۔

عینی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی کہ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”ارے! اتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب مجھے گھر چلنا چاہیے۔“

”کیا اسلم چاچا تمہیں لینے نہیں آئے گے؟“

”نہیں۔ وہ مئی کے ساتھ گئے ہیں۔ میں پاپا کے ساتھ آئی تھی اور ان سے مجھے یہ کہنا یاد ہی نہ رہا کہ وہ

واپس پر مجھے پک کر لیں۔“

”تو کیا اکیلی جاؤ گی؟“

”ہاں کیا حرج ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اور بابا تمہیں چھوڑ آتے ہیں۔“

”لیکن۔“

”لیکن کیا۔ میں بابا سے کہتی ہوں۔ بابا کبھی بھی تمہیں اس وقت اکیلے جانے نہ دیں گے۔“ وہ مڑی تو

اسے بابا کے کمرے سے شہریار باہر آتا دکھائی دیا۔

”شیری بھائی آپ کہیں جا رہے ہیں؟“

”ہاں اسپتال جانا۔ پتہ کیوں؟“

”مریم کو بھی چھوڑ دیجئے گا۔“

”ضرور۔ میں ذرا ماں جی کو خدا حافظ کہہ دوں۔“

”مگر.....“ مریم نے کچھ کہنا چاہا تو شہریار نے اسے ٹوک دیا۔

”کیوں! آپ کو خوف آتا ہے مجھ سے؟“

”نہیں تو۔“

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مریم نے نظریں جھکا لیں۔ یعنی اس کی جھجک محسوس کی۔

”جلسیں آپ رہنے دیں شیری بھائی بابا اور میں چھوڑ آئیں گے۔“

”کیوں کیا میں قابل اعتبار نہیں؟“ شہر یار نے قریب آتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

”نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ مریم نے شیشا کر اسے دیکھا اور پھر عینی کو آواز دی۔

”یعنی تم بابا سے مت کہو میں شہر یار صاحب کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

”تھینک یو۔ میں ماں جی کو بتا کر ابھی آیا۔“

شہر یار نے ذرا سا سر کو خم کیا اور کچن کی طرف چلا گیا۔

”مس مریم احمد۔“ گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے اس نے اگلی نشست پر بیٹھی مریم کی طرف

دیکھا ”ایک بات پوچھوں کہ جب آپ بابا کہ پاس بیٹھی تھیں تو روکیوں رہی تھیں؟“

”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ ممکن ہے کہ میں آپ کو کوئی بہتر مشورہ دے سکوں بابا سے بہتر۔“

”شکریہ ڈاکٹر شہر یار۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ بقول بابا میں کچھ بھی سی لڑکی ہوں۔ میرے وہم اور

میرے خوف مجھے ڈراتے رہتے ہیں اور وہی وہم مجھے رلاتے بھی ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے پر خیال نظروں سے اسے دیکھا ”میرا خیال ہے جس طبقے سے آپ تعلق رکھتی

ہیں آپ کو کوئی پریشانی یا وہم نہیں ستانا چاہیے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے طبقے میں کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔“

”ہوتی ہوگی مگر خود ساختہ..... آپ کی اس سبیلی لالہ کی طرح۔“ اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے شہر یار

نے اس کی طرف دیکھا.....

”شاید ہمارے طبقے کے مسائل آپ کے طبقے سے زیادہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف مسائل کی نوعیت کا

ہے۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”آپ برامان گئیں۔ سوری۔“ شہر یار نے فوراً سوری کر لیا تو وہ مسکرا دی۔

”نہیں میں نے برا نہیں منایا۔ آپ اپنی رائے کا اظہار آزادی سے کر سکتے ہیں۔“

”نہیں بھئی میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ آپ ناراض ہو گئیں تو وہ عینی کی بچی میری جان عذاب کر

دے گی اور بابا سے الگ ڈانٹ پڑ جائے گی۔ سنا ہے آپ نے ہمارے گھر کے ہر فرد پر قبضہ جمالیا ہے۔

خاص کر بابا اور ماں جی کے دل پر۔“

”ہاں مگر سوائے آپ کے۔“ بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

”ہمارے طرف سے بھی اجازت ہے اگر آپ چاہیں تو۔“ شہر یار اپنی منہر کے برعکس پتا نہیں کیوں

شوخ ہو رہا تھا۔

اپنی مسکراہٹ چھپا۔ نہ کے لیے مریم نے چہرہ جھکا لیا۔

”آپ کھل کر ہنس سکتی ہیں۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں کہ اگر آنسو آنکھوں کی صفائی کرتے

تو ہنسی دل کو صاف کرتی ہے۔“

”اچھا۔“ وہ سچ سچ ہنس دی۔

”بائے داوے یہ آپ کی اور عینی کی دوستی کیسے ہوئی۔ اس کی زبان تو مسلسل چلتی رہتی ہے۔ جب کہ

آپ خامی کم گوشتی ہیں۔“

”دوستی کے لیے ضروری نہیں کہ دو افراد بالکل ایک جیسے ہوں۔ ایک قدر مشترک بھی دوستی کا سبب بن

سکتی ہے۔“

”مثلاً۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ”آپ دونوں میں کیا قدر مشترک ہے؟“

”شاید خلوص اور محبت۔“ مریم نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”خلوص اور محبت۔“ اس نے سر ہلایا ”شاید خلوص و محبت اسی کا نام ہے کہ وہ جو میں گھنٹوں میں سے

میں گھنٹے آپ کی تعریف میں صرف کر دیتی ہے اور میں تو اس بات پر ایمان لے آیا تھا کہ ارسطو کے بعد

بس آپ ہی ایک ذہین خاتون پیدا ہوئی ہیں اور عزیزہ ایمن نثار آپ کی شاگرد خاص۔“

”پچھلے جناب اب غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔“

”نہیں خیر جو دھاک دل پر بیٹھ چکی ہے وہ اس طرح اتنی جلدی کیسے ختم ہو سکتی ہے۔“ شہر یار نے بے

پردائی سے ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے رکھے دوسرے ہاتھ سے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

مریم نے حیران ہو کر اسے دیکھا کہ شہر یار اسپتال کے شہر یار سے کتنا مختلف لگ رہا تھا۔ اسپتال میں تو

وہ انتہائی سنجیدہ لگتا تھا جب کہ.....

اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ ہولے سے کھنکھاتا تو مریم نے چونک کر نگاہیں اس کے چہرے سے

ہٹا لیں۔

”مس مریم۔“ شہر یار کا ایک سنجیدہ ہو گیا ”آپ کو کیا پریشانی ہے۔ میں جانتا ہوں بابا نے یقیناً آپ

کو اچھا مشورہ دیا ہو گا لیکن اگر آپ مناسب سمجھیں تو.....“

مریم نے پھر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے لہجے میں بابا کے لہجے کی خوشبو تھی اور اس کی باتوں میں

بابا کی باتوں کا رنگ تھا۔ مریم نے اس کے لیے بھی اپنے دل میں وہی اپنائیت محسوس کی جو عینی کے بابا

اور ماں جی کے لیے اس کے دل میں تھی۔

”کوئی خاص بات نہیں شہریار صاحب۔ میں نے کہا تا کہ میں ایک وہمی سی لڑکی ہوں اور بے شمار وہم مجھے ستاتے رہتے ہیں۔“

”مثلاً.....“ شہریار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مثلاً یہ کہ کہیں آسمان نہ گر پڑے، کہیں گاڑی کا حادثہ نہ ہو جائے اور کہیں چاند اور سورج ٹکرائیں۔“ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر مسکرائی۔

”ہاں یہ واقعی تشویش ناک بات ہے کہ آخر اتنے سالوں سے ایک ہی آسمان پر رہنے کے باوجود چاند اور سورج ایک دوسرے سے ٹکرا کیوں نہیں جاتے۔“ شہریار نے سر ہلایا۔

”ارے ارے ادھر..... ادھر لیفٹ سائڈ پر موڑ لیجیے۔“ اس نے شہریار کو بتایا ”یہ ادھر بس ادھر روک دیجیے۔“ تھینک یو۔“ اس نے نیچے اترتے ہوئے شکر یہ ادا کیا۔

”اور ہاں۔“ شہریار نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا ”ایک بات تو آپ کو بتانا ہی بھول گیا تھا۔ کچھ دن پہلے یعنی نے ایک بات کہی تھی مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔“

”کیا؟ کیا کہا تھا یعنی نے؟“ اس نے پوچھا لیکن وہ زن سے گاڑی نکال لے گیا۔

کچھ دیر تو وہ یونی کو خالی الذہن ہی کھڑی رہی پھر آگے بڑھ کر اس نے تیل پر ہاتھ رکھ دیا۔



تیرے چہرے کے سادہ سے اچھوتے نقوش

تیری زلفیں تیری آنکھیں تیرے عارض تیرے ہونٹ

کیسی انجانی سی مصوم خطا کرتے ہیں

خلوت بزم ہو یا جلوت تنہائی ہو

تیرا پیکر مری آنکھوں میں ابھر آتا ہے

کوئی ساعت ہو کوئی فکر ہو کوئی ماحول

مجھ کو ہر سمت ترا حسن نظر آتا ہے

پردیس عادل آنکھیں موندے گنگنا رہے تھے۔

آج کتنے دن ہو گئے تھے وہ چہرہ نگاہوں سے ہٹا ہی نہ تھا۔

بعض لمحے کیسے انوکھے کیسے قاتل ہوتے ہیں کہ قریب سے گزریں تو زندگی کا عنوان بن جاتے

ہیں اور وہ لمحہ جب ان کی نگاہوں نے اس کے مسجح چہرے کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ وہ ایک لمحہ اس روز سے

انہیں اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔

انہیں کسی کا انتظار تو تھا لیکن یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی ان کا انتظار ختم ہو جائے گا بلکہ اب تو انہیں یہی سی ہونے لگی تھی۔ کئی بار راتوں کی تنہائی میں وہ اپنے آپ سے الجھتے رہے تھے۔

اپنی حماقت پر انہوں نے خود کو برا بھلا کہا تھا۔

کہ ایک انجانی ہستی کے انتظار میں جیسے جاتے وجود کو نظر انداز کرتا۔

ہم کے آنسو کبھی کبھی راتوں کو انہیں بے چین سے کر دیتے لیکن دل میں کہیں گھنٹیاں نہیں جیتی تھیں۔

کہیں کوئی ارتعاش نہیں ہوتا تھا اور جتنی حیدر کہتا تھا کہ کبھی کوئی ایسی ہستی نگاہوں کے سامنے آتی ہے تو دل میں خود بخود گھنٹیاں ہی بج اٹھتی ہیں۔

اور وہ دلکش دل ربا لڑکی۔

انہیں لگا جیسے ان کا دل پہلو سے نکل کر بدن کے ہر حصے میں دھکڑ پکڑ کر رہا ہو۔ پاؤں کے تلووں میں

کلاہوں کے درمیان، آنکھوں کی پوروں میں، کنپٹیوں کے پاس ان کے دل کی دھک دھک جاگ رہی تھی۔

”یہ کیا حماقت ہے میں ابجڑ کی طرح۔“

وہ آنکھیں کھول کر سیدھے ہو بیٹھے۔

وہ لڑکی نہ جانے کون تھی کہاں ہوگی اور اس نے تو شاید ایک لمحہ بھی میرے متعلق نہ سوچا ہوگا اور مجھے

آج اتنے دن ہو گئے اسے سوچتے ہوئے۔ وہ چہرہ نگاہوں کے سامنے سے ہٹا ہی نہیں۔

اور جب میں جتنی حیدر کو بتاؤں گا تو وہ کس قدر حیران ہوں گے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

میرا خیال ہے مجھے شہریار سے اس کے متعلق ضرور پوچھنا چاہیے۔ ممکن ہے زیادہ دن گزر جانے پر

شہریار کو یاد ہی نہ رہے کہ وہ کون لڑکی تھی لیکن شہریار کیا سوچے گا بھلا وہ کیوں پوچھ رہے ہیں اس کے متعلق۔ کیا کہوں گا میں..... کہہ دوں گا شاید پہلے بھی کہیں ملا ہوں یا نہیں آ رہا۔

یا پھر..... نہیں کچھ اور..... کچھ اور کہوں گا۔

مگر مجھے شہریار سے پوچھنا چاہیے..... کہیں میں اسے کھونہ دوں۔

وہ بے حد مضطرب اور بے چین تھے۔

کئی بار انہوں نے شہریار کے اسپتال کا نمبر ملا یا اور پھر ریسورڈ رکھ دیا۔ کئی بار سرکریٹ چلایا اور پھر یونی

اٹلڑے میں ڈال دیا۔

شاید بقول اقبال یہ دیدار کے بعد کا اضطراب تھا۔

بے چینی بڑھ گئی تھی۔

انہوں نے مضطرب ہو کر پھر نمبر ملا یا۔ تب ہی سرور نے ہلکا سا دروازہ ٹاک کرتے ہوئے اندر جھانکا۔

”سر۔“

”اوہ آجاؤ مسرور“ انہوں نے ریسپور پھر کر بیل پر ڈال دیا۔

”سُروہ میں ذرا ارسل وغیرہ کی طرف جارہا تھا۔ آپ کو بتانے آیا تھا۔ شاید رات میں وہاں ہی ٹھہر جاؤں۔“

”اوہ یار۔ وہ لوگ اب گاؤں سے یہاں ہی منتقل ہو گئے ہیں۔ شاید شہر یار نے اس روز بتایا تو تھا۔“

پروفیسر عادل کو یاد آیا۔

”جی اور اب ماموں چاہ رہے تھے کہ میں ان ہی کے ساتھ رہوں..... لیکن.....“

”لیکن تم نے کیا سوچا ہے؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی ”یار میں تو تمہارا عادی ہو گیا ہوں۔“

تمہارے جانے سے بہت تنہائی ہو جائے گی اور پھر یہاں تم زیادہ بہتر طریقے سے کام نہیں کر رہے ہو کیا؟“

”جی سر۔ میرا ارادہ نہیں ہے جانے کا۔ حالانکہ ماموں بہت اصرار کر رہے ہیں۔“

”سنگے ماموں ہیں تمہارے۔“

”نہیں سر۔ ارسل کے والد میری والدہ کے فرسٹ کزن ہیں۔ میرے نانا نانی کی وفات کے بعد والدہ انہی کے ہاں رہیں تھیں بلکہ ارسل کے دادا جان نے ہی ان کی شادی کی۔ ارسل کے والد یعنی ماموں جان سگی بہنوں کی طرح ہی خیال رکھتے ہیں میری امی کا بلکہ وہ تو چاہتے تھے کہ ہم لوگ ان کے ساتھ ہی رہیں لیکن امی کو گوارا نہیں ہو رہا تھا۔“

”ٹھیک ہے تو پھر یہ طے ہے تاکہ تم مستقل میرے پاس ہی رہو گے؟“ وہ مسکرائے۔

”جی سر۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اجازت طلب کی۔

”تو اب جاؤں؟“

”ہاں..... لیکن نہیں ٹھہرو میں بھی چل رہا ہوں۔ ذرا جتنی کی طرف جاؤں گا۔ بہت دن ہو گئے طے ہوئے، تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی اور پھر یوں ہی سیلر پہنے مسرور کے ساتھ باہر آ گئے۔

مسرور کو شہر یار وغیرہ کے گیٹ کے قریب ڈراپ کر کے جوں ہی انہوں نے گاڑی رپورس کی اچانک ان کی نظر گیٹ کی طرف اٹھ گئی۔

وہ گیٹ سے باہر آ رہی تھی اور اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی بھی تھی۔ دونوں کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ پھر وہ مسرور کے پاس رک کر اس سے بات کرنے لگیں۔

”تو..... تو کیا وہ شہر یار اور ارسل وغیرہ کی کوئی عزیز ہے۔“ گویا انہوں نے اسے کھویا نہیں تھا۔

ان کا دل چاہا وہ اسے یونہی دیکھتے رہیں لیکن وہ دونوں مسرور کے ساتھ پھر واپس مڑ گئی تھیں۔

ایک ساتھ ان کے اندر بہت سے چراغ جل اٹھے۔

انہیں لگا جیسے اسے پانا آسان ہو گیا ہے۔

یہ دل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے، لمحوں میں امیدوں کے تانے بانے بننے لگتا ہے..... وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے لیکن پھر بھی انہیں یقین سا ہونے لگا۔ جیسے اس کی تخلیق انہی کے لیے ہوئی ہے۔ جیسے انہوں نے زندگی کا بائی ماندہ سفر اسی کی ہمراہی میں طے کرنا ہے اب۔

جیسے راستے بالکل صاف سیدھے اور سہل ہوں اور وہ ان پر چلتے ہوئے سیدھے اس تک پہنچ جائیں گے۔

”کیا وہ اتنے ہی امید پرست ہیں؟“ انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا اور مسکرا دیے۔

”شاید۔ جب اس کا وجود ہے اور اس اتنی بھری دنیا میں اچانک میرے سامنے آگئی ہے شاید اس لیے کہ اسے مجھ سے ملنا ہے اور مسرور سے اس کے متعلق پوچھ کر میں ماں جی کو ساتھ لے آؤں گا۔“

نہیں ماں جی کو نہیں پہلے بی آپا کو بتاؤں گا۔

کہ بالآخر میں نے اسے پالیا ہے۔

اور کیا خبر وہ ویسی نہ ہو جیسے ان کے تصور نے اسے تراشا ہوا تھا۔

شاید وہ اپنی گفتگو اپنے رویوں اور اپنے مزاج میں بالکل مختلف ہو۔

لوہ بھر کے لیے ان کے ذہن میں خیال آیا لیکن پھر خود ہی انہوں نے اس خیال کو رد کر دیا۔

نہیں اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو دل کے تاریوں نہ بجتے۔ وہ یوں یکا یک انسان سے لوہے کے ٹکڑے میں بدل جاتے۔ جب سے وہ ”رافع اسپتال“ میں اسے دیکھ کر آئے تھے، کالج بھی نہیں گئے تھے اور نہ ہی گھر سے باہر نکلے تھے۔ ذہن و دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی تو یوں لگتا جیسے ان کے اندر یہاں وہاں ہر جگہ چراغاں ہو گیا ہو اور کبھی ایک دم ساری روشنیاں مجھ جاتیں اور رگوں میں کوئی گہر اور دھلکورے لیے لگتا۔

پتا نہیں پتا نہیں وہ اسے دوبارہ دیکھ سکیں گے یا نہیں۔

اور کتنی حماقت ہوئی تھی ان سے۔

انہیں اسی وقت شہر یار سے اس کے متعلق پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کیا خبر شہر یار کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کون ہے کس کی بیٹی ہے..... وہ کسی عام سے پیسٹ کے ساتھ آئی ہو۔ یا یونہی کسی کی مزاج پر ہی کو چلی آئی ہو۔

کتنے سارے خدشات تھے جو انہیں مضطرب کئے ہوئے تھے۔

اور اب انہوں نے اسے دوبارہ دیکھ لیا تھا تو جیسے یقین سا ہو گیا تھا کہ قدرت خود انہیں اس کی طرف لے جا رہی ہے۔

عجیب بے خودی کے عالم میں وہ جتنی کے گھر پہنچے۔ وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ جتنی حیدر تھے، آمنہ صفی

میں حافظ احسان تھے اور قصہ قاصد احمد تھے..... سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا۔

”میں بہت دنوں سے آپ کے متعلق سوچ رہی تھی۔“ آمنہ صفی نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

”یقیناً کوئی اہم بات ہوگی۔“ انہوں نے آمنہ صفی کی طرف دیکھا۔ اس نے آج آنکھوں میں کاجل

اک رکھا تھا اور بونٹوں پر ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک تھی۔ جیسے اندر کے پھیکے پن اور بے رنگی کو باہر کے رنگوں سے چھپانے کی کوشش کی ہو لیکن باوجود کوشش کے اندر کی ویرانیاں آنکھوں سے جھانک رہی تھیں۔
”نہیں خیر کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔“ اس نے بے پروائی سے تصدق احمد کے ہاتھ سے ہٹا ہوا سرٹ لے لیا۔

”یہ تصدق تھیز کرنے جا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں ہمارے ہاں جو کچھ ڈرامے یا تھیٹر کے لیے اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے وہ محض ہل بازی، گھٹیا اور چپ مذاق ہے۔ صرف باہا ہوا اور المیہ یہ ہے کہ ایجوکیٹڈ لوگ بھی ان ڈراموں کو دیکھنے جاتے ہیں ہم اپنے سامعین کے ذوق کو خود برباد کر رہے ہیں۔“
”ہوں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ پروفیسر عادل نے بختی حیدر کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے گاؤنکے سے ٹیک لگائی۔
”تصدق نے تھیٹر کی بات کی تو مجھے آپ کی وہ ظہور الحسن صاحب کے ہاں والی گفتگو یاد آگئی تو میں سوچ رہی تھی کہ آپ سے اس سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا اگر ہم کوشش کریں تو کیا ہم عوام کو اچھے ڈرامے دکھا سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔ ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ پروفیسر عادل نے راکھ الیش ٹرے میں جھاڑی۔
”تصدق کا کیا خیال ہے؟“ انہوں نے تصدق کی طرف دیکھا۔

”میں واقعی کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ کچھ کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔“ اس کے لہجے میں مایوسی اور تھکن تھی۔ جیسے اس کی امیدوں کی ساری کشتیاں مایوسیوں کے ساحل پر آکر ٹھہر گئی ہوں۔
”ارے یار ٹیک آدی ہو اور لہجے میں اتنی مایوسی۔“ پروفیسر عادل نے اس کے کندھے پر ہتھکی دی۔
”عادل صاحب! کیا آپ نہیں جانتے کہ مراعات یافتہ طبقے اور خود کو فن کے اجارہ دار سمجھنے والوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔“

”جانتا ہوں دوست لیکن بی رپو۔ کسی بھی نئی شے کو قبول کرنے میں وقت لگتا ہے۔“
”ہاں لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرے عمر بھر کے اثاثے کو چوراہے پر رکھ کر آگ لگا دی ہو اور میں اس اثاثے کو بچا بھی نہ پایا ہوں۔“

پروفیسر عادل کو لگا جیسے اس کی آنکھوں میں اس کے اپنے خوابوں کے مدفن بن گئے ہوں۔
”تصدق صاحب! آپ کسی دن میرے پاس آئیں۔ ہم اس موضوع پر بات کریں گے۔ میں نے آپ کے کام پر نقادوں کی تنقید پڑھی ہے لیکن وہ اتنی مایوس کن بھی نہیں ہے۔ آپ کو اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ فی الحال تو تھیٹر کی بات کریں۔“

”ہاں! ہم تھیٹر کرنا چاہ رہے ہیں اور آمنہ کا خیال ہے کہانی بختی صاحب سے لکھوائی جائے جو بہت مختلف ہو۔“

”بختی صاحب! فی وی والوں کو چھوڑیں گے تو آپ کے لیے کچھ کریں گے۔ ہم کوشش کر دیکھتے ہیں۔“ حافظ احسان منمنائے۔

”ضرور۔ کیوں نہیں! حافظ صاحب۔ آپ کوشش کریں! بختی نے انہیں حوصلہ دیا اور مسکرا کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

”تو پھر یہ طے ہو گیا کہ یہ کہانی حافظ صاحب لکھیں گے۔“ پروفیسر عادل بھی مسکرائے۔
”کوشش کرتا ہوں۔“ حافظ احسان نے انکساری ظاہر کی۔

”آمنہ! آپ اسلام آباد کب جا رہی ہیں؟“ پروفیسر عادل نے اچانک پوچھ لیا تو آمنہ جو حافظ احسان کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک دم چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”نہیں! فی الحال میں نہیں جا رہی بلکہ شاید نہ ہی جاؤں اب۔“
”کیوں؟“ انہیں حیرت ہوئی۔

”دراصل میری اماں کا خیال ہے کہ اب جب میرے بھائی ٹھیک ٹھاک پیسہ گھر بھجوا رہے ہیں تو مجھے نوکری کی ضرورت نہیں۔“

”چلیں! اب تو آپ نہ کریں لیکن کیا آپ کالم وغیرہ بھی لکھنا چھوڑ دیں گی؟“
”شاید۔۔۔۔۔۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔ ”ساری زندگی اماں کی نافرمانی کی! ان کا دل دکھایا۔

اب سوچا ہے ان کو خوش کر دوں۔ ان کو میرا لکھنا لکھنا پسند نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میری بد نصیبی میں میرے لکھنے لکھانے کا بہت ہاتھ ہے۔ دراصل۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ”جب میرا پہلا مجموعہ کلام منظر عام پر آیا تھا تو میں نے بڑے شوق سے اسے اپنے معیتر کو گفٹ کیا تھا۔ جواب میں اس نے مگنی توڑ دی۔ کیونکہ

اس کا خیال تھا کہ محبتوں کے جذبات کا اظہار بغیر تجربے کے نہیں ہو سکتا اور میں نہ جانے۔۔۔۔۔۔ حالانکہ۔۔۔۔۔۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”حالاں کہ اس وقت تک میں نے اپنے اس خالہ زاد کے علاوہ

جو میرا معیتر تھی کسی دوسرے مرد کو دھیان سے دیکھا بھی نہیں تھا۔“

اور پروفیسر عادل کے دل میں کہیں چھین سی ہوئی جیسے کوئی ننھا سا کانٹا اندر کہیں دل میں پوسٹ ہو گیا ہو۔

”اور یہ کیا المیہ ہے۔“ انہوں نے سوچا۔
”بعض لوگ غلط جگہ اور غلط ماحول میں پیدا ہو جاتے ہیں اور وہاں ساری زندگی مس فٹ رہتے ہیں! آمنہ صنفی کی طرح۔“

”اور شاید آمنہ صنفی کبھی اپنے ماحول کے ساتھ کچھ و ماثر نہ کر سکے اور یہ اس کے ماحول اور شخصیت کا تقدار ساری زندگی اسے توڑتا پھوڑتا رہے۔ لیکن وہ بہت ساری دوسری لڑکیوں کی طرح بہت بولڈ

تقدار ساری زندگی اسے توڑتا پھوڑتا رہے۔ لیکن وہ بہت ساری دوسری لڑکیوں کی طرح بہت بولڈ

ہونے کے باوجود اپنے ماحول سے بغاوت نہ کر سکے۔“

”کاش وہ اس لڑکی کی کوئی مدد کر سکتے.....“ انہوں نے افسردگی سے سوچا۔

آمنہ صغی نے انہیں سوچوں میں گم دیکھا اور تصدق احمد کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”دی ان کمفرٹبل تھیئر“ کی اصطلاح میں نے کہیں پڑھی تھی۔ اس کا کیا مطلب ہے عادل خان کی طرح تھیئر؟“ تصدق احمد سے بات کرتے کرتے اچانک آمنہ صغی نے پوچھا تو وہ چونکے۔

”یہ امریکن اسٹیج پر ایک نیا ننھا منا تھیئر دی ان کمفرٹبل تھیئر کے نام سے سناے آیا تھا اور یہ لکڑی کے بنیوں پر گھٹے ہوئے ماحول میں کھیلا جاتا تھا۔ اور.....“

”عادل یار تمہاری کال ہے۔“ جتنی نے جو کسی کام سے باہر نکلے تھے اندر آتے ہوئے کہا تو پریشان ہو کر انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت ہی ہوگی خدا بخش ہے کہہ رہا تھا۔“ ٹھیک ہے۔ تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئے۔

”کیا بات ہے خدا بخش خیریت ہے نا سب حویلی میں تو سب ٹھیک ہیں نا؟“

”جی ہاں جی۔ وہ حویلی سے فون آیا تھا مگر نا لگن کا جی۔“

”کال تو ٹھیک ہے نا؟“ انہوں نے مضطرب ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔

”جی جی وہ کہہ رہی تھیں سب ٹھیک ہے پریشانی کی کوئی بات نہیں لیکن انہوں نے آپ کو فوراً حویلی میں بلا لیا ہے۔ میں نے بتایا تھا آپ جتنی صاحب کی طرف گئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ انہیں جا کر کہو کہ وہ ابھی حویلی کے لیے روانہ ہو جائیں۔“

”خدا بخش تم نے اچھی طرح تصدیق تو کر لی تھی نا۔ سب ٹھیک ہیں نا۔ کامل، ماں جی بی آپا سب۔“

”جی پوچھ لیا تھا لیکن انہوں نے بہت تاکید کی تھی کہ آپ فوراً آ جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔“ انہوں نے ریسور رکھ دیا لیکن وہ الجھ سے گئے تھے۔

”آخر ایسی کیا بات ہے۔ ماں جی نے تو یوں امیر جنسی میں انہیں کبھی نہیں بلایا تھا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہوگی۔ کہیں مانی نے کوئی کھیرا نہ کر دیا ہو۔ ایک تو برداشت نہیں ہے اس میں بالکل..... اور پھر وہ ننہ والی زمین کا بھی اسے دکھ ہے اور کئی دفعہ وہ اس کا اظہار بھی کر چکا ہے کہ خواجوا وہ زمین انہوں نے اللہ یار کو دے دی۔ یقیناً اسی نے کوئی جھگڑا کر لیا ہوگا۔“

جتنی کو بتا کر اور آمنہ صغی اور تصدق سے معذرت کر کے وہ باہر آئے تو جتنی بھی ان کے ساتھ تھے۔

”حویلی میں سب خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں لیکن چاہیں کیوں ناں جی نے حویلی بلوایا ہے۔“

”کہیں آپ کو زنجیر کرنے کا ارادہ تو نہیں عادل میاں۔ یہ ماں باپ جذباتی بلیک میلنگ کرتے ہیں“

اسی طرح امیر جنسی میں بڑ کر..... میری والدہ نے بھی ایک بار یونہی مجھے تار دے کر بلایا تھا۔ میں ان دنوں کراچی میں تھا۔ آیا تو پتا چلا کہ والدہ صاحبہ آخری خواہش کے طور پر اپنی جتنی کو میرے سر منڈھنا چاہتی

ہیں۔ مگر ہم بھی ایک کانیاں تھے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا اور پھر ان دنوں تو ہمیں سنبل کے سوا کہیں کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ سو ہم بلیک میل نہیں ہوئے.....“ جتنی نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“ انہوں نے کہا۔

”پھر کیا کرو گے میاں۔ تھیار ڈال دو گے اور بعد میں کہیں وہ مل گئی تو..... وہ تمہاری تصوراتی

شہزادی.....“

انہوں نے جتنی حیدر کی طرف دیکھا اور ان کا جی چاہا وہ انہیں بتا دیں کہ انہوں نے اسے دیکھا ہے اور

انہیں یقین ہے وہ وہی ہے جس کا انہیں انتظار تھا۔ جس سے وہ محبت کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے ان کے دل میں بے انتہا شدتیں تھیں..... لیکن نہیں..... پھر سہمی، پھر کبھی وہ جتنی کو اس کے متعلق بتائیں گے۔

”اب مجھے چلنا چاہیے۔ نکلے نکلے دیر ہو جائے گی۔“

”وش یو ٹو گڈ لک۔“ جتنی نے ان کا کندھا تھپکا۔

”تھینک یو۔“

”ارے ہاں ایک خاص بات تو رہ گئی۔ حالانکہ اس بات کے لیے دوبار میں نے تمہاری طرف فون کیا لیکن تم گھر پر نہیں ملے۔“

”کیا؟“ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رک گئے۔

”یار وہ تمہارے والد تم سے ملنا چاہ رہے ہیں۔“

”کیوں؟“ انہوں نے بھنویں اچکا کیں اور سوچا۔ ”یہ آخر اتنے سالوں بعد انہیں مجھ سے ملنے کا خیال کیسے آ گیا۔“

”شاید وہ کچھ بیمار ہیں اس لیے۔ وہ دو تین بار مجھ سے کہہ چکے ہیں۔ ملنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔

ایسا ہے کہ کسی دن میرے ساتھ چلے چلویا اگر کہو تو میں انہیں ادھر بلوا لوں۔“

”دیکھیں گے۔ حویلی سے واپس آ کر بتاؤں گا کہ.....“ انہوں نے بات نامکمل چھوڑ دی اور جتنی سے ہاتھ لاکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔



یعنی اور مریم آخری پیر دے کر ہال سے باہر آئیں تو یعنی نے اسے اپنا وعدہ یاد دلایا۔

”یاد ہے مریم، تم نے وعدہ کیا تھا کہ امتحان کے بعد ساتھ چلو گی۔“
”ہاں لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بابا اور اماں بھی تمہیں بہت یاد کر رہے تھے بلکہ اماں نے تو خاص طور پر مجھے کہا تھا کہ تمہیں ضرور لے کر آؤں۔“

”میں خود بھی بابا اور اماں کے لیے اداس ہو رہی ہوں۔ بابا کی باتوں سے مجھے بہت تقویت ملتی ہے۔“ وہ تمہارے چاچو اتنے اچھے اتنی محبت کرنے والے ہیں۔ میں تو خود جانا چاہتی تھی اور پیچر ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی لیکن آج عاشری وغیرہ آرہے ہیں۔ ماما بھی نہیں ہیں اور اگر میں بھی گھر پر نہ ہوں تو وہ اداس ہو جائیں گے۔ چاچا اسلم انہیں لینے گئے ہوئے ہیں..... اور پتا ہے میں خود ان تینوں کے لیے اداس ہو رہی ہوں۔ رات سے ہی ان کا انتظار کرنے لگی تھی۔ پڑھا بھی نہیں جا رہا تھا۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم ان سب کو ساتھ لے کر آنا۔“

”ہاں ایک دو روز تک آؤں گی۔“

”مومی! اب تو کالج بھی فی الحال نہیں آنا ہوگا۔ یہاں تو روز ملاقات ہو جاتی تھی۔ خیر..... تم کبھی بھی آیا کرتا اچھا۔“

”صرف میں، کیا تم نہیں آؤ گی؟“

”ہاں میں بھی آیا کروں گی۔“

”عاشری وغیرہ ایک ہفتے رہ کر واپس مری چلے جائیں گے تو میں بہت بور ہوں گی۔ یعنی ماما بھی تو نہیں ہیں حالانکہ ماما کی اپنی مصروفیات ہیں لیکن ان کے وجود سے کیسے گھر بھرا بھرا لگتا تھا۔ صرف ایک فرد کے جانے سے کتنی ویرانی ہو جاتی ہے یعنی شریف، صنوا اور جیناں بھی نہیں یاد کر رہے تھے..... اور پتا ہے پاپا تو بہت ہی اداس ہیں۔ بالکل چپ اور خاموش۔ جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔“

”تمہاری ماما یاد آتی ہوں گی۔“ یعنی ہنسی ”وہ ہیں بھی تو اتنی خوب صورت۔ کچی تم ان کی بیٹی نہیں چھوٹی بہن لگتی ہو۔ ارے ہاں چاچا اسلم تو مری گیا ہوا ہے پھر تمہیں کون لینے آئے گا؟“

”صبح پاپا ہی چھوڑ کر گئے تھے وہی لینے آئیں گے۔ تاہم میں نے انہیں بارہ بجے کا ٹائم دیا تھا لیکن پیچر مختصر تھا اس لیے جلدی ہو گیا۔“

”ابھی تو آدھا گھنٹا ہے۔ چلو چل کر کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے بہت بھوک بھی لگی ہے۔“

”کچی پیچر کی ٹینشن میں ڈھنگ سے ناشتا تو کیا ہی نہیں جاتا دو گھنٹہ چائے بھی حلق میں پھنس جاتی ہے۔“

”ہوں مجھ سے بھی کچھ کھا پیا نہیں جاتا حالانکہ آج کل بابا سر پر سوار ہو کر ناشتا کرواتے ہیں۔“

رات کو بھی زبردستی دودھ پینے کو کہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے خشکی ہو جاتی ہے دماغ میں پڑھ پڑھ کر منو کو کہہ

رکھا ہے انہوں نے کہ سونے سے پہلے ضرور دودھ کا گلاس میرے کمرے میں رکھ دیا کرے۔“ مریم نے عینی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتایا ”پتا ہے یعنی.....“ اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر رنگ سے کھل رہے تھے ”باشلور ہونے کے بعد مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ باپ کی محبت کیا ہوتی ہے۔ جب پہلی بار میں تمہارے بابا اور اماں سے ملتی تھی نا تو مجھے اپنی تہی دامنی کا احساس بڑی شدت سے ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا تم سب بھائی بہن کتنے کٹی ہو۔ کاش ہم سب بہن بھائی بھی تمہاری طرح ہوتے۔ شاید وہ لمحہ شدید تھا۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ پاپا ہمیں ہم سب کو اتنا چاہتے تھے پھر مجھے احساس کیوں نہیں ہوتا تھا۔“

”دراصل مومو۔“ عینی نے اس کے سامنے سموسوں کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا ”دراصل تم بہت حساس ہو اس لیے ذرا ذرا سی بات کو محسوس کرتی ہو۔ شاید تمہارے طبقے میں والدین محبتوں کا اظہار اس طرح نہیں کرتے جس طرح ہمارے طبقے کے والدین کرتے ہیں۔ اولاد تو سب کو ہی پیاری ہوتی ہے۔ تم لوگوں کا اپنا زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہے اس میں شاید اس طرح کی محبتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شاید بچوں کو والدین کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا۔ اپنی دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ اب تمہیں اپنے پاپا کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے تو تمہیں پتا چلا ہے کہ پاپا بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ جتنی میرے پاپا مجھ سے کرتے ہیں۔ تمہیں اپنی ماما کے ساتھ رہنے کا موقع ملے تو تمہیں پتا چلے گا کہ وہ بھی تمہیں اتنی شدت سے چاہتی ہیں۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو یعنی لیکن صرف یہ بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں الجھن سی ہوتی ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری ماما سگی ماما نہیں ہیں جس طرح دوسری شادی کے بعد مرد اپنی پہلی اولاد سے محبتوں کا اظہار بیوی کے سامنے کرتے ہوئے ڈرتا ہے پاپا بھی اس طرح ڈرتے تھے۔ ماما کی زیادتی کو وہ محسوس کرتے تھے لیکن زبان سے نہیں کہتے تھے۔ اب ماما نہیں ہیں تو وہ ایک ماں کی طرح ہی میری فکر کرتے ہیں۔“

”پاگل ہو تم۔“ لویہ سموسو لو۔“ عینی نے سموساں کی طرف بڑھایا ”یونی ایٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو۔“ ”نہیں عینی میری تو ذرا بھی ماما سے شکل نہیں ملتی حالانکہ عاشری اور نینا ان سے ملتی جلتی ہیں۔“ ”یہ تو کوئی بات نہیں۔ بعض بچے بالکل ایسے ہوتے ہیں جو نہ ماں پر جاتے ہیں نہ باپ پر..... میں کوئی اپنی اماں یا بابا سے ملتی ہوں ذرا بھی نہیں۔“

”ایک اور بات بھی مجھے پریشان کرتی تھی عینی۔“

”وہ کیا؟“ ”عینی مسکرائی ”اب کوئی نئی فلاسفی ظہور پذیر ہونے لگی ہے۔“

”اگر میں ماما کی سگی بیٹی ہوں تو مجھے بالکل اگلے نے یہ کیوں کہا تھا کہ ماما مجھ سے جلیس ہیں۔“

”یہ کون ذات شریف ہیں۔“ عینی نے پوچھا۔

”یہ ایک ادیب ہیں۔ پاپا کے دوست ہیں۔“
”تو تم نے ان سے نہیں پوچھا؟“

”پوچھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یاد بھی نہیں۔ ممکن ہے یونہی کبھی کہہ دیا ہو۔“
”یہ جو ادیب لوگ ہوتے ہیں، بعض اوقات یونہی الجھی ہوئی باتیں کر کے تجسس پھیلاتے ہیں۔ انہیں شوق ہوتا ہے ایسی باتیں کرنے کا۔ چلو اب اٹھو۔ باہر چل کر دیکھیں۔ شیری بھائی مجھے لیتے آئے ہوں گے۔ آج وہ اسپتال نہیں گئے تھے۔“

”مگر ابھی بارہ تو نہیں بجے۔“ مریم نے نشوونما نکال کر ہاتھ صاف کیے۔

”ارے اماں کا تمہیں نہیں پتا۔ انہوں نے تو دس بجے سے ہی شیری بھائی کو کہنا شروع کر دیا ہو گا کہ اٹھو جاؤ، یعنی کو لے آؤ اور بے چارے شیری بھائی گیارہ بجے سے کھڑے ہوں گے باہر دیکھ لیتا۔ اماں کی ایسی ہی بے چین روح ہے۔“

”ماں کو ایسا ہی ہونا چاہیے یعنی۔“ مریم نے زیر لب کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہر یار اپنی سوزوکی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

”آپ کب آئے شیری بھائی؟“ یعنی نے پوچھا۔

”بہت دیر ہو گئی۔“ اس نے یعنی کی بات کا جواب دیتے ہوئے پر شوق نظروں سے مریم کو دیکھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

مریم کے دل کی دھڑکنیں ذرا سی دیر کو بے ترتیب ہوئیں پھر نارمل ہو گئیں۔

”اچھی ہوں۔“

”وہ تو خیر آپ ہیں۔“ اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔

”آپ نے کچھ کہا شیری بھائی؟“ یعنی نے شہر یار کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے نگاہیں مریم کے چہرے سے ہٹالیں۔

”ایسا کیوں نہ کریں، ہم تمہیں ڈراپ کر دیں؟“ یعنی نے پوچھا۔

”نہیں پاپا آتے ہی ہوں گے۔“ تب ہی سانے سے شریف آتا دکھائی دیا۔

”صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی انہوں نے مجھے بھیجا ہے آپ کو لینے۔ میں ٹیکسی لے آؤں۔“

شریف نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔“ شہر یار فوراً بولا، ”ہم انہیں ڈراپ کر دیں گے۔ آئیے پلیز۔“

مریم نے لمحہ بھر اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے یعنی کے ساتھ کچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔

”تم بھی آ جاؤ میاں۔“ شہر یار نے بے تکلفی سے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

”نہیں صاحب جی، آپ مریم بی بی کو گھر چھوڑ دیں گے تو میں ذرا ادھر اپنے ایک دوست سے ملوں گا وہ یہاں قریب ہی رہتا ہے جی، جلدی آ جاؤں گا۔“

”جیسے تیری مرضی یار۔“ شہر یار نے مڑ کر مریم کی طرف دیکھا اور گاڑی ریورس کرنے لگا۔

سر جھکائے مریم کو یعنی سے ہولے ہولے باتیں کر رہی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ گاہے گاہے شہر یار اسے دیکھتا ہے اور جب وہ نگاہیں اٹھاتی، وہ سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

شہر یار کی اپنی ذات میں دلچسپی اس نے محسوس کر لی تھی۔ وہ جتنی بار بھی یعنی کے گھر گئی تھی۔ شہر یار کے متعلق اچھا تاثر لے کر آتی تھی۔ اسپتال میں بھی اس نے شہر یار کو مریضوں کے ساتھ بہت اخلاق اور ہمدردی سے پیش آتے دیکھا تھا اور لالہ تو اس کی بے حد تعریف کرتی تھی۔

”سچی بات تو یہ ہے مومنو کہ اگر میرا دل اعزاز میں نہ اٹکا ہوتا تو پھر یقیناً یہ ڈاکٹر شہر یار بے دریغ میرے دل میں گھس آتا، مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ اعزاز.....“

”یہ تمہیں اعزاز سے کیسے محبت ہو گئی تھی لالہ؟“

”محبت کیسے ہو جاتی ہے مومنو یہ کیسے بتایا جاسکتا ہے۔“ لالہ اس کی بے وقوفی پر ہنسی تھی ”محبت تو بس ہو جاتی ہے۔ دراصل.....“ کچھ دیر سوچنے کے بعد لالہ نے بتایا ”ان دنوں می لندن گئی ہوئی تھیں اور اعزاز

ہمارے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ امتیاز شاہ سے ملنے آیا تھا۔ تمہیں پتا ہے اعزاز کا تعلق گاؤں سے ہے اور میری

می امتیاز کے عزیزوں کو پسند نہیں کرتیں۔ وہ اچانک ہی بیمار ہو گیا تھا اور نہ وہ ٹھہرنا تھا نہ امتیاز شاہ سے مل کر

چلا جاتا تھا۔ مجبوراً اسے ٹھہرنا پڑا تھا اور میں ایک دن بور ہو کر اس کے کمرے میں چلی گئی اور بہت دیر تک

اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ بہت حیران ہوا۔ دراصل می نے کئی بار اس کی انسٹ کر دی تھی اور میں بھی

می کی بیٹی تھی تا لیکن یاز میں تھوڑا سا می سے مختلف ہوں۔ وہ جتنے دن ہمارے گھر رہا..... میں نے اس

سے بہت باتیں کیں۔ پھر وہ چلا گیا تو مجھے لگا جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے۔ خالی خالی ہو گیا ہے سارا وجود شاید

مجھے اس کی باتیں اچھی لگتی تھیں اس لیے محبت ہو گئی۔“ لالہ نے پوری تفصیل بتائی ”کیا تمہیں..... کبھی

ایسا لگا کسی کے جانے سے تمہارا کچھ کھو گیا ہے؟“

”ہاں۔“ مریم نے بتایا ”عاشی نینا اور مور کے جانے سے مجھے یوں ہی لگتا ہے جیسے کچھ کھو گیا ہو۔“

اور لالہ دیر تک ہنسی رہی تھی۔

”مومنو تم معصوم ہو۔ اس لیے مجھے اچھی لگتی ہو۔“

”کیا اعزاز بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“

”پتا نہیں میں نے کبھی پوچھا نہیں۔“ اس نے لا پرواہی سے کندھے اچکا۔

ہی ہوتے ہیں۔“
”یہ میڈم بھی بس۔“ مریم نے مڑ کر غصے سے انہیں دیکھا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

”مریم بہت خوبصورت ہے نا۔“
”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ عثمان احمد کو حیرت ہوئی۔
”کچھ نہیں، کچھ نہیں عثمان بھائی۔“ میڈم زمرگس نے ٹرائل میں سے کپڑوں کی پلیٹ اٹھائی ”یہ صفو کباب بہت مزے کے بناتی ہے۔“ انہوں نے پلیٹ میں سے کباب اٹھا کر چکھا۔

عثمان احمد الجھجھکے سے انہیں دیکھ رہے تھے۔
”دراصل عثمان بھائی زینی کچھ کچھ سائیکس ہے۔ آپ کو اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔“
”اور کیسے خیال رکھا جاتا ہے۔“ عثمان احمد نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا ”مجھے اس کا قلم میں کام کرنا پسند نہیں لیکن میں نے اسے منع نہیں کیا۔“

”ہاں ہاں، خیر وہ تو ہے۔ آپ عثمان بھائی واقعی ایک مثالی شوہر ہیں لیکن.....“ انہوں نے باقی ماندہ کباب ایک ہی بار منہ میں ٹھونس لیا۔

”لیکن کیا؟“ عثمان بہت الجھ گئے تھے ”پلیز کھل کر بات کریں۔“
”لجھ بھر چپ کر کے انہوں نے بات بڑھائی۔

”زینی سے جب میری شادی ہوئی وہ تب بھی اسی طرح ڈیپریس ہو جاتی تھی بلکہ شادی سے پہلے بھی کتنی ہی مرتبہ اسے یہ ڈیپریشن کے دورے پڑے اور وہاں بھی کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تھا، مگر نہ۔“
”اس روز۔“

ان کے ذہن میں وہ شام آگئی تھی جب محبتی حیدر کے فلیٹ کی سیزھیوں پر وہ انہیں ملی تھی اور انہوں نے بغیر سوچے سمجھے بغیر کسی بات پر غور کیے اسے شادی کے لیے پروپوز کر دیا تھا اور جب وہ اس کے ساتھ اس کے پارٹنر تک اسے چھوڑنے گئے تھے تو وہ شدید دردمر میں مبتلا تھیں اور پھر جس روز انہیں پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس روز دوسری بار انہوں نے اسے ڈیپریس دیکھا تھا۔ بے تحاشا روتے ہوئے اس نے اپنے بیڈروم کی ہر چیز اٹھا کر پھینک دی تھی۔ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔

”پلیز زینی ریلیکس..... بچے کی آمد تو خوشی کا باعث ہوتی ہے۔“

زیتون بانو سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہونے کے باوجود جب انہیں پتا چلا تھا کہ وہ باپ بننے والے ہیں تو رگ دپے میں عجیب سی ان دیکھی مسرت کی لہر اسے گھیر گئی تھیں۔ کتنے سارے دن ان کے اندر سنسنی کی ہوتی رہی تھی اور گھر میں بھی بابا جان اماں جی کتنی خوش تھیں اور بے دھیانی میں وہ زیتون بانو کا دھیان رکھنے لگے تھے۔ اسے خود ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ زینی کا ہاتھ تھامے اسے خاموش

اور وہ حیران سی لالہ کو دیکھتی رہ گئی۔ لالہ کی باتیں اسے ہمیشہ ہی حیران کرتی تھیں۔
”لیجیے جناب آپ کی منزل آگئی۔“ شہر یار نے گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے لے جا کر پارک کر دیا۔
”یعنی تم چلو نا اور آپ بھی۔“ اس نے شہر یار کی طرف دیکھا ”آپ لوگ کھانا کھا کر جائیے گا پلیز۔“
”نہیں مومو، پلیز اس وقت نہیں۔ سمو سے کھالیے تھے نا اور مجھے زور کی نیند آ رہی ہے۔ ہم اندر نہیں جائیں گے۔ میں تو گھر جا کر تین چار گھنٹے سوؤں گی اور دیکھو تم عاشر وغیرہ کو لے کر ضرور آنا۔“
”اچھا۔“ وہ ان کا شکریہ ادا کر کے اندر چلی آئی۔

عثمان احمد سینک روم میں تھے اور میڈم زمرگس اونچی آواز میں ان سے باتیں کر رہی تھی۔
”ارے میں دیکھ لوں گی اس سو مرو کو بڑا آیا لالہ کا باپ بن کر۔“
”السلام وعلیکم آئی۔“

انہوں نے سر کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر عثمان احمد کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
”خیر گولی مارو سو مرو کو۔ ہوگا تو وہ ہی جولاہ چاہے گی۔ تم بتاؤ زینی کا کوئی فون آیا؟“
اپنے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھے مریم نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

”ہاں۔“ زینی کے ذکر سے جیسے عثمان احمد کے چہرے پر رونق سی آگئی ”تقریباً روز ہی بات ہوئی ہے..... بہت انجوائے کر رہی ہے لیکن تھک گئی ہے کہہ رہی تھی یہ پہلی اور آخری فلم ہے۔ ٹی وی پر کام کرنے کے مقابلے میں فلم میں کام کرنا زیادہ تھکا دینے والا کام ہے۔“

مریم کو انجانی سی خوشی ہوئی ”اچھا ہے۔ ماما فلم میں کام کرنے سے بور ہو گئی ہیں۔“ اس نے سوچا ”مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا ان کا فلم میں کام کرنا۔ ماما آئیں گی تو میں ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں گی۔ یوں بھی رزلٹ تک فارغ ہوں۔ یعنی بھی کہتی ہے نا کہ جب میں ماما کے ساتھ وقت گزاروں گی تو مجھے پتا چلے گا وہ مجھے کتنی محبت کرتی ہیں۔“

”عثمان بھائی آپ بھی چلے جاتے زینی کے ساتھ آؤنگ ہو جاتی، میڈم زمرگس نے مریم والی بات کی۔“
”ایک تو ڈاکٹر نے مجھے فضائی سفر سے منع کر رکھا ہے۔ دوسرا یہاں بچوں کے ساتھ کسی بھی وقت مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا یہاں رہنا ضروری تھا۔“

”اوہ ہاں، مریم تو اب کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتی۔“ وہ زور سے نہیں جیسے ریل کا انجن پٹری پر چل رہا ہو۔ (ماضی کی ملکہ موسیقی کی ٹیسی کتنی خوف ناک ہوتی تھی) یا پھر جیسے سڑک پر بجری کوئی جاری ہو ”اس بچی نے بھی زینی کو بو اپریشان رکھا۔“

”نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں۔ مریم بہت سلجھی ہوئی طبیعت کی ہے۔“ عثمان احمد نے وضاحت کی
”دراصل زینی میں خود برداشت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے غصہ آ جاتا ہے۔ ورنہ بچے تو ایسے

ایک عہد میں بھانا چاہتا ہوں۔ ناکامی سے اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ میں وہاں خاطر خواہ پیسہ نہ کما سکوں گا تو مجھے اس کی خواہش نہیں ہے۔۔۔۔۔ زندہ رہنے کو روٹی ملتی رہے تو بہت ہے۔ میں نے بہت کمایا۔۔۔۔۔ اب اس کی ضرورت نہیں مجھے۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ وہاں مریض نہیں آئیں گے تو میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کیا یہاں تو دل میں لوگ پیار نہیں ہوتے۔ کیا انہیں ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی؟“

”ٹھیک ہے پتر۔“ چوہدری ثار کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی ”صبح چلتے ہیں گاؤں دیکھو ریز کیا کہتا ہے۔“

”تو کیا سکندر گاؤں جا رہا ہے اور آپ بھی؟“ صالو نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بھابھو میں اور بھابی جا رہے ہیں۔ بھابی تو یک دور روز میں آجائیں گے میں کچھ دن رکوں گا۔ تقریباً ایک ہفتہ۔ دراصل میں چاہتا ہوں اپنی نگرانی میں کام شروع کراؤں۔ یوں تو ٹھیکیدار ارسل کا جاننے والا اور قابل اعتبار آدمی ہے۔ اس نے بہت تسلی دی ہے کہ آپ مطمئن ہو جائیں۔ تاہم فی الحال نو ہفتہ بھر ہوں گا بعد میں کبھی کبھار چکر لگایا کروں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ بہت دل چاہ رہا ہے گاؤں جانے کو۔“ وہ ان کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔۔۔۔۔ وہاں انہیں کھانے پینے کی تکلیف ہوگی۔“

”میرے کھانے پینے کی فکر آپ نہ کریں بھابھو۔۔۔۔۔ اتنے سال اکیلا رہا ہوں۔ اپنا پیٹ بھرنے کی حد تک کوکنگ کر لیتا ہوں۔“

”سکندر ایک بات پوچھوں۔ تم نے ڈولی سے علیحدگی کے بعد پھر شادی کیوں نہیں کی؟“

”بس بھابھو جی ہی نہیں چاہا۔“

”تم کہو تو اب کسی خاتون کو دیکھوں۔۔۔۔۔ یہ ادھر پڑوس میں ایک لیکچرار رہتی ہے۔ شادی شدہ نہیں ہے۔“

”عمر زیادہ ہے مگر پھر بھی اس کی والدہ چاہتی ہیں کہ اپنی زندگی میں اس کی شادی کر دیں۔ چاہے۔۔۔۔۔“

”نہیں بھابھو نہیں۔۔۔۔۔“ سکندر نے ان کی بات کاٹ دی۔۔۔۔۔ ”اب تو عمر گزر گئی اب کیا گھر بنانا یا شادی کرنا۔“

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے یار۔“ چوہدری ثار اس کی طرف دیکھ کر ہنسے۔۔۔۔۔ ”ٹھیک ٹھاک اسارٹ لگ رہے ہو۔ تمہاری بھابھو صحیح کہتی ہیں۔ زندگی یوں کیسے گزرے گی تباہ تم اجازت دو تو تمہاری بھابھو کوشش کریں کچھ۔“

”تنہائی کا مشکل وقت تو گزر گیا بھابی۔“ سکندر کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ آگئی۔۔۔۔۔ ”بہت مشکل وقت گزرا ہے میں نے بھابی، کبھی کبھی تو گھنٹوں روتا رہتا تھا اکیلا۔۔۔۔۔ اب تو آپ سب ہیں۔ اب کہاں کہاں تمہا ہوں میں۔“

”بیٹھے عثمان بھائی آپ۔“ میڈم نرگس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ ان کے ساتھ باہر پورچ تک آئے۔

”میں تو کہتی ہوں عثمان بھائی آپ بھی انگلینڈ چلے جائیں بلکہ بچوں کو بھی واپس لے جائیں۔۔۔۔۔ ان کی بھی آؤ تنگ ہو جائے گی۔“ میڈم نرگس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے مشورہ دیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

”کمال کرتے ہیں۔ آپ بھی عثمان بھائی زینبی کو پتا نہ ہو۔۔۔۔۔“

”کیا۔ کیا مطلب تھا میڈم کا اس سے۔“ انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر ہولے سے سر جھٹکا۔۔۔۔۔ ”عجیب شے ہیں میڈم بھی اور ان کا ذہن جانے کہاں کہاں سے کیا کیا کرید کر لے آتا ہے۔“

وہ اپنی اسٹری میں جاتے جاتے وہیں ٹی وی لائونج میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی تھوڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”شریف۔“ انہوں نے آواز دی۔

”جی صاحب۔“

”پانی پلاؤ اور کچھا تیز کر دو۔“

پانی پینے کے بعد بھی گھبراہٹ اسی طرح تھی۔ پیشانی پر سے پینے کے تسفے تسفے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ انہیں لگا جیسے دل کی دھڑکنیں نارمل نہ ہوں۔ در دو نہیں تھا مگر کچھ گڑبڑ تھی۔

وہ اٹھے تاکہ بیڈروم میں آرام کر سکیں۔ مگر ٹائیس کا پریسی تھی وہ پھر بیٹھ گئے۔

”شریف۔“ انہوں نے بے بسی سے پاس کھڑے شریف کی طرف دیکھا ”مجھے سہارا دے کر کمرے میں لے چلو اور سریم بی بی سے کہو ڈاکٹر کو ہادی کوفون کر دیں۔“ انہوں نے صوفے کی پشت سے سر نکلتے ہوئے۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کر لیں اور شریف وہاں ہی کھڑا زور زور سے صفو اور جیناں کو آوازیں دینے لگا۔



”بھائی جی اگر آپ ملک مگریز سے بات کریں۔ زمین کے لیے تو کیا وہ زمین فروخت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟“ سکندر نے ٹیبل پر نقشہ پھیل کر اس پر کچھ نشان لگاتے ہوئے چوہدری ثار سے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مگریز کچھ ٹیڑھا آدمی ہے۔ یوں بھی ہم دیہاتی لوگ زمین بیچنا پسند نہیں کرتے پھر بھی میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔ بات کروں گا مگریز سے۔“

”یوں بھی وہ زمین بخرے قابل کاشت تو ہے نہیں۔ اگر مجھے مل جائے تو میں اسپتال اپنی مرضی کے مطابق بنوا سکوں گا۔ دراصل میری خواہش تھی کہ جگہ تھوڑی سی زیادہ ہو تو رہائشی کمرے زیادہ بن سکیں گے۔ ارد گرد کے دیہات سے آنے والوں کے لیے آسانی ہو جائے گی۔“

”کیا تمہیں یقین ہے سکندر کہ یہ اسپتال کامیاب رہے گا؟“ چوہدری ثار نے سکندر کی طرف دیکھا۔

”کامیابی یا ناکامی میرا مسئلہ نہیں ہے بھابی۔ مجھے تو ایک عہد پورا کرنا ہے۔۔۔۔۔ ایک عہد میں نہیں نباہ

لیکن پھر اس کی ہمت نہیں بڑی تھی۔ جانے بھائی کیا سوچیں گی کہ اب وہ کیوں اس کے متعلق اتنا متوجس ہے۔۔۔۔۔ اب کیا واسطہ ہے اس کا اس سے۔

”میں نے مسرور سے کہا بھی تھا کہ وہ رضی کو لیتا آئے۔ یہاں شیری ہے کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا۔ خواہ وہ اپنی بیماری کو طول دے رہی ہے۔ گاؤں سے آکر میں خود جاؤں گا اسے لینے۔“

چوہدری ثار نے صالحہ کی طرف دیکھا تو سکندر چونکا۔
”اے کیا ہوا ہے بھابھو؟“ اس کی نظر میں جھکی ہوئی تھیں۔
”معلوم نہیں۔“ صالحہ نے اس کی جھکی ہوئی نظروں کو تاسف سے دیکھا۔ ”بس بیمار رہتی ہے۔ کبھی بخار کبھی جسم میں درد اور کبھی سانس میں تکلیف ہو جاتی ہے اسے ماں جی کی طرح۔ ماں جی کی خدمت کی تو بہت کی اس نے آخری دنوں میں۔ ان کی پٹی سے ہی لگ کر بیٹھ گئی تھی۔“

”بعض نقصان ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔۔۔۔۔“ سکندر نے دل گرفتگی سے سوچا۔۔۔۔۔ ”کتنا بڑا نقصان کیا تھا اس نے اپنا۔۔۔۔۔ ناقابل تلافی نقصان۔۔۔۔۔ آج اگر رضوانہ۔۔۔۔۔“
”دراصل۔“ بھابھو نے ایک نظر اسے دیکھا۔ شاید انہوں نے اس کے دل میں اٹھنے والے سوال پوچھ لیے تھے۔

”بابا نے اس کا رشتہ اس کے ننھیالی رشتے داروں میں کیا تھا لیکن اس کا میاں اچھا آدمی نہیں لگا۔ اکھڑا بد مزاج تو ہمیشہ سے تھا۔ شروع ہی سے رضوانہ کے ساتھ اس کا رویہ صحیح نہیں تھا۔ پھر اس نے شادی کر لی اور رضوانہ کو چھوڑ دیا۔“ صالحہ کی آواز بھگ گئی۔۔۔۔۔ ”بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں سکندر۔ اپنی رضوانہ بھی شاید ایسے ہی لوگوں میں شامل ہے۔“
دکھ اس کے اندر اتر کر جیسے اس کے دل کو کاٹنے لگا۔

”غلطی تو میری تھی قصور وار تو میں تھا۔ رضوانہ کو کس جرم کی سزا ملی؟“ اس نے آنکھوں سے کہایوں جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو لیکن چوہدری ثار نے اس کی بات سن لی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے بولے۔

”کبھی کبھی سزائیں بے قصور لوگوں کا بھی مقدر بن جایا کرتی ہیں اور مقدر سے کسی کی جنگ نہیں ہے۔ قدرت نے اپنے عہد کو بہتر جانتی ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے مڑ کر صالحہ کی طرف دیکھا۔

”اور تم بھی بے وقت کیا ذکر لے بیٹھی ہو۔ اس وقت گاؤں جانے کی بات ہو رہی تھی۔ کیا واقعی تم ہمارے ساتھ گاؤں جانا چاہتی ہو۔۔۔۔۔“ انہوں نے بڑی خوب صورتی سے بات بدل دی۔

”ہاں تو آپ مذاق بکھر رہے تھے۔“ صالحہ نے بھویں اچکائیں۔

”تو کیا آپ سنجیدہ تھیں۔“ چوہدری ثار نے سکندر کے کندھے سے ہاتھ اٹھالیے۔

”جی میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ یعنی بھی فارغ ہے۔ ارسل اور منا بھی۔ یعنی کارلزٹ آگیا تو اس نے پنکوشی میں داخلہ لے لیتا ہے۔۔۔۔۔ پھر تو پھنس ہی جاؤں گی۔“

”تو کچھ بارادہ طویل قیام کا ہے؟“
”نہیں۔۔۔۔۔“ قطعاً انداز میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں ”میں ذرا یعنی کویتا دوں۔ وہ اپنی تیاری کر لے۔“

”اچھا تو پھر ٹھیک ہے بھابھو آپ لوگ تیاری کریں میں ذرا اسپتال جاؤں گا۔ ڈاکٹر رافع کو بھی بتانا ہے اور دیکھنا ہے کہ کوئی آپریشن وغیرہ تو نہیں ہے۔“

”یہ شیری بھی ابھی تک اسپتال سے نہیں آیا۔“ وہ جاتے جاتے پلٹیں۔

”اس کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا آج رات وہاں ہی رہوں گا۔“
”کیوں ابھی اسی ہفتے تو رات کی ڈیوٹی دی ہے اس نے۔۔۔۔۔ پھر آج۔“ وہ قدرے خشکی سے بولیں۔
”یہ ڈاکٹر رافع کو بھی بس شیری ہی ملا ہے رات کی ڈیوٹیاں بھگتانے کے لیے۔“ چوہدری ثار مسکرائے۔
”جی وہ کہہ رہا تھا کہ کسی دوست ڈاکٹر کی نائٹ تھی اسے ایمر جنسی میں چھٹی لینی پڑی ہے تو اس کی جگہ نائٹ دے گا۔۔۔۔۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئیں باہر گئیں تو انہوں نے سکندر کی طرف دیکھا۔

”یار نہ جی رہی بھابھو بس۔۔۔۔۔“

سکندر بھی مسکرا دیا۔

”اچھا بھابھو میں بھی چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

”اللہ حافظ۔“

”یاد تم شیری کو بتا دینا گاؤں جانے کا۔۔۔۔۔ کیا خبر وہ بھی پروگرام بنالے اور اگر اس کا ارادہ نہ بھی ہو تو اسے تا ضرور دینا۔ بعض اوقات وہ نائٹ دے کر تھکا ہوا ہو تو وہیں سو جاتا ہے اور تمہاری بھابھو کے قدم نہیں اٹھیں گے اس کے بغیر۔۔۔۔۔“ انہوں نے خدا حافظ کہنے کے بعد دوبارہ کہا۔
”جی ضرور۔“ سکندر نے مڑ کر انہیں دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔



سکندر ڈاکٹر رافع سے مل کر اور انہیں بتا کر کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں جا رہا ہے۔ باہر نکلا تو اسے کوریڈور میں ایک طرف شہر یا رکھ کر کسی سے باتیں کرتا نظر آیا۔

”شیری۔۔۔۔۔“ اس کے قریب جاتے ہوئے انہوں نے آواز دی۔

شہر یار نے مڑ کر انہیں دیکھا۔۔۔۔۔

”سکندر ماموں آپ اس وقت یہاں۔۔۔۔۔ غالباً آج اس وقت تو کوئی آپریشن نہیں ہے۔“

”ہاں میں ڈاکٹر رافع سے ملنے آیا تھا۔ دراصل ہم لوگوں نے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ بھابھو کہہ رہی تھیں کہ انہیں بھی چھٹی مل سکے تو تم بھی ساتھ چلو۔“

”میں..... لیکن میں.....“

اس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس سے لمحہ بھر پہلے باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی کی نگاہیں بھی اچانک اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

”میں ڈاکٹر رافع سے بات کروں تمہاری چھٹی کے لیے.....؟“ سکندر نے پوچھا۔

شہر یار کی نگاہیں اس لڑکی پر تھیں اور اس کی آنکھوں میں التجائی درخواست تھی کہ وہ نہ جائے۔

”نہیں۔ چھٹی کی بات نہیں ہے۔ میں دراصل خود بھی ابھی گاؤں نہیں جانا چاہتا۔ پھر کبھی سب لوگ کب تک واپس آجائیں گے.....؟“

”دو ہفتے تک اور بھابھو کہہ رہی تھیں کہ ساتھ نہ چلنا ہو تو ملنے ضرور آنا صبح..... دس گیارہ بجے تک ہم نکل جائیں گے۔ تم ڈیوٹی آف ہوتے ہی آ جانا۔“

”جی آ جاؤں گا.....“ وہ لڑکی کی طرف مڑا۔

”مریم میرے ماموں ہیں سکندر ملک۔ سرجن ہیں حال ہی میں باہر سے آئے ہیں اور ماموں جان یہ مریم ہے۔ عینی کی دوست ان کے پاپا یہاں ایڈمٹ ہیں۔ انہیں دل کی تکلیف ہے.....“

”اچھا تو یہ ہے مریم جس کا بھابھو ذکر کر رہی تھیں۔“ سکندر نے اب کی بار فوراً مریم کو دیکھا اور انہیں وہ اچھی لگی۔ پہلی نظر میں ہی انہیں اس سے اپنائیت محسوس ہوئی۔ شاید شہر یار کے تعلق سے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”پریشان نہ ہو بیٹی۔ انشاء اللہ تمہارے پاپا ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ اس نے زیر لب دہرایا اور شہر یار کی طرف دیکھا۔

”آپ پلیر ڈاکٹر رافع سے پوچھ کر صحیح حالت بتائیں۔ ماما بھی نہیں ہیں..... پتا نہیں کیسے اقدام کروں انہیں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں مریم، میں ہوں تاہم آپ کے پاس اور میں ابھی ڈاکٹر رافع سے بات کرنا ہوں۔ ڈاکٹر ہادی کے ساتھ ان کی تفصیلی بات ہوئی ہے۔ کوئی ایسی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ بس دو تین دن یہاں ریست کریں گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں نا.....؟“ مریم نے بے یقینی سے شہر یار کی طرف دیکھا۔ تو وہ مسکرا دیا اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

سکندر نے جاتے جاتے پھر تلقین کی اور ساتھ ساتھ کھڑے شہر یار اور مریم کو سراہا۔

دونوں ساتھ ساتھ کھڑے بہت اچھے لگ رہے تھے اور شہر یار کی آنکھوں میں اس نے مریم کے لیے پسندیدگی دیکھی اور دل ہی دل میں سوچا کہ وہ بھابھو سے کہے گا کہ مریم اسے بھی پسند آئی ہے اور یہ کہ بھابھو سے وہ کہیں کہ شہر یار کے رشتے کی بات وہ مریم کے والدین سے کریں۔

گھر میں رونق ہو جائے گی۔ کیسی بورے رونق اور بے رنگ زندگی ہے۔ شہر یار کی شادی ہوگی ہنگامہ ہوگا شور شرابا۔ کچھ تو جو دو ٹوٹے گا، اس نے سوچا، وہ بھابھو سے کہے گا کہ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ یوں بھی شہر یار اب برسرِ روزگار ہے۔ اس کی عمر ہے شادی کی۔

”ڈش یو لڈک۔“ وہ شہر یار کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اسپتال کے مین کی طرف بڑھ گئے۔

”مریم، تم نے دیکھا میرے ماموں جان کتنے اسارٹ ہیں اور کیسی زبردست پرسنٹی ہے۔“

”ہاں.....“

مریم پریشان تھی اس نے زیادہ دھیان سے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خیال پاپا کی طرف لگا ہوا تھا۔ ان کی طبیعت فوراً ہی خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ہادی فوراً ہی انہیں رافع اسپتال لے آئے تھے..... وہ ساتھ ہی آئی تھی۔ شریف بھی ساتھ تھا۔ اگرچہ پاپا کو آئی سی یو میں نہیں لے جایا گیا تھا۔ تاہم ان کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر رافع نے فوری ٹریینٹ کے بعد انہیں کمرے میں منتقل کر دیا تھا اور اب وہ ڈیوٹی ہو کر سو رہے تھے اور ان کے کمرے میں ڈسٹرنس سے منع کیا گیا تھا اور سختی سے کہا تھا کہ اندر لوگوں کا جھوم نہ ہو۔ اسی لیے تو اس نے آنٹی زمر کے کو بھی فون نہیں کیا تھا حالانکہ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی ہو اس لے پاس اس ہا۔ چاہے وہ آنٹی زمر کے اور بیگم آفندی ہی کیوں نہ ہوں..... ماما کی کمی اسے آج بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ بچھلی بار ماما کے آنے سے تھی تقویت ملی تھی اسے۔ انہوں نے اسے رونے پر ڈانٹا بھی تھا لیکن اسے لگا تھا جیسے ماما آگئی ہیں تو اب وہ ایسی نہیں ہے اور یہ کہ اب پاپا کو کچھ نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر ہادی اسے دوبارہ جلد آنے کا کہہ کر چلے گئے تھے وہ کچھ دیر پاپا کے سامنے صوفے پر بیٹھی خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ ان کی سانس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پاپا کا رنگ اتنا زرد ہو رہا تھا کہ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ جہاں شریف بیٹھ کر بیٹھا تھا۔ وہ بے مقصد ہی شریف سے باتیں کرنے لگی تھی اور گا ہے گا ہے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانک لیتی۔ بابا اسی طرح سوئے ہوئے تھے۔ سامنے والی بیٹھ پر بہت سی عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید وہ سب کسی مریض کی عیادت کو آئے تھے۔ ان میں سے ایک عورت اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”کون بیمار ہے تمہارا؟“

”میرے پاپا ہیں۔“

”کیا ہوا ہے انہیں؟“

”ہارٹ کی تکلیف ہے۔“ اس نے بتایا اور دروازہ کھول کر دیکھا اور پھر بند کر دیا۔

”تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہے؟“

”نہیں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ میری ماما انگلینڈ میں ہیں۔“

”اوہ۔“

عورت کو شاید اس کی تنہائی پر افسوس ہوا تھا یا ماما جو اتنی دور تھیں اور یہاں اس کا شوہر بیمار پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تو یونہی تاسف سے اسے دیکھتی رہی، پھر خود ہی بتانے لگی۔

”کمرے میں جانے نہیں دیتے سوا دھر بیٹھے ہیں۔ کیسے بچی کو چھوڑ کر چلے جائیں۔۔۔۔۔ میری بھانجی بیمار ہے۔ اسے بھی ہارٹ کی تکلیف ہے۔ وہ سامنے میری بہن ہے اس کے ساتھ جو دو خواتین بیٹھی ہیں وہ اس کی پھوپھیاں اور وہ دونوں لڑکے اس کی پھوپھوں کے بیٹے ہیں اور یہ ادھر اس کے ماموں ہیں۔۔۔۔۔“

مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور اسے خاموش پا کر وہ واپس بیٹھ چا کر بیٹھ گئی اور جیب سے تسبیح نکال کر پڑھنے لگی۔

”ایک یہ عورت ہے جس کے اتنے عزیز رشتے دار ہیں۔ دعا کرنے والے اور ایک پاپا ہیں اکیلے کوئی نہیں ان کا عزیز جو دعا کرے۔ صرف میں ہوں یہاں اور بس۔“

ایک دم اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا ”کتنے اکیلے ہیں ہم۔۔۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔۔۔“

نخیال میں صرف ایک نانا ہیں وہ بھی امریکا میں اور دھیال میں پتا نہیں کوئی ہے بھی یا نہیں پاپا نے کبھی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ماما نے نہ ہی کوئی وہاں سے آیا۔

”کوئی تو ہوگا پاپا کا۔ ماں بہن بھائی۔“

”کوئی رشتے دار۔“

”پاپا اچھے ہو جائیں تو میں ضرور پوچھوں گی پاپا سے۔۔۔۔۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے پاپا سے ناراض ہیں تو پاپا سے کہوں گی کہ انہیں منالیں۔ کتنی ضرورت ہوتی ہے ایسے لمحوں میں رشتے داروں کی۔“

”اس کی کوئی پھوپھو کوئی چچا ہوتے اس کے ساتھ یہاں تو کتنی ڈھارس رہتی کتنا آسرا ہوتا ہے۔ اگرچہ انکل ہادی ہیں پھر بھی۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔۔۔ تب ہی شہریار آ گیا۔

”مریم آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ انکل تو ٹھیک ہیں نا۔۔۔۔۔؟“

”جی پاپا تو سو رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں یونہی باہر آ گئی تھی۔۔۔۔۔“ وہ شہریار کے ساتھ چلتی ہوئی وہاں سے ایک

”بے۔۔۔۔۔“ پلیز آپ مجھے بتائیں پاپا ٹھیک ہو جائیں گے؟“

”مریم“ آپ اتنی کم حوصلہ کیوں ہیں۔ دعا کریں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ معمولی سی تکلیف ہے۔ ہارٹ بینک بالکل نارمل ہے۔ بس معمولی سابی پی ہائی ہو گیا تھا۔ جس سے گھبراہٹ ہو گئی تھی۔“

اس نے تسلی دی تو اس کا ڈوبا ڈوبا دل تیرنے لگا۔ شہریار کی موجودگی سے اسے بڑی تسلی ہوئی تھی۔

”مریم۔۔۔۔۔“ شہریار نے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ ”آپ پلیز بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں یہاں ہی ہوں رات کو بھی یہاں ہی رہوں گا۔ مجھے غیر مت سمجھیں اور دعا کریں بس۔“

”جی۔۔۔۔۔“

اس اپنائیت پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔۔۔ یہ سب لوگ کتنے اچھے، کتنے محبت کرنے والے تھے۔ عینی بابا اور شہریار۔۔۔۔۔ ان سب کے لیے اس کے دل میں خود بخود ہی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ بابا تو اسے بالکل اپنے دوست لگتے تھے اور شہریار۔۔۔۔۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ شہریار اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کی نگاہوں میں وارفتگی سی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ چونکی۔۔۔۔۔ ”انکل چلے گئے۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“

شہریار کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”چلو کمرے میں بیٹھو اور بالکل بھی پریشان نہ ہو۔ اگر زیادہ دل گھبراہا ہو تو عینی بابا کو بلا لوں۔“

”نہیں، نہیں پلیز انہیں تکلیف نہ دیں۔ یوں بھی انہیں گاؤں جانا ہے صبح۔۔۔۔۔“

”ہوں تو پھر۔“ وہ مسکرایا ”اپنی اس دھماکا دوست کو بلا لیں۔ کیا نام ہے اس کا وہ میڈم فرسز کی بیٹی۔۔۔۔۔“

”لالہ۔۔۔۔۔“ وہ بھی مسکرا دی ”آج نہیں صبح بلا لوں گی۔ اس وقت پاپا کو سکون کی ضرورت ہے اور آٹنی اگر بہت شور چائیں گی۔ پتا تو ہے نا آپ کو ان کا۔ خواہ مخواہ پاپا ڈسٹرب ہوں گے۔ ڈاکٹر رافع کہہ رہے تھے کہ ان کے کمرے میں بالکل شور نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ آپ کمرے میں جائیں میں ادھر ہی ہوں۔ کوئی بھی بات ہو شریف کو بھیج کر مجھے بلا لیں۔ میں خود بھی چکر لگا تا رہوں گا۔۔۔۔۔“

”شکریہ۔“ مریم کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور وہ ایک دم پلٹ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی شہریار وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

یہ لڑکی کیسے اس کے حواسوں پر چھاتی جاری تھی لگتا ہے۔ جیسے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔

اچھی تو وہ پہلے ہی لگی تھی اور اس نے اپنے دل میں اس کے لیے پہلے دن سے ہی ایک جذبہ سا ایک لگاؤ سا محسوس کیا تھا لیکن جب سے معنی نے کہا تھا کہ وہ مریم کو اس کے لیے پسند کر چکی ہے۔ تب سے وہ اسے اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی اور رات جب وہ بستر پر لیٹتا تو اس کا تصور اس کے ساتھ ہوتا۔

کبھی روتی آنکھوں کے ساتھ
کبھی مسکراتی ہوئی

گاڑی میں شوخی سے اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی۔

اس روز کے بعد پھر اس طرح اکیلے میں کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن جب کبھی وہ گھر آتی یعنی بابا سے ملنے تو وہ اگر گھر پر ہوتا تو اس کی نظریں اسے ضرور کھوجتی تھیں۔ وہ بہانے بہانے بابا کے کمرے میں جا تا جہاں وہ عین کے ساتھ بیٹھی مزے سے باتیں کر رہی ہوتی تھی۔ عینی سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑے دوران وہ ہر جگہ مسکراتی رہتی اور کبھی کبھار اٹھا کر اسے دیکھ بھی لیتی تھی اور اس کی کسی بات کا جواب بھی دے دیتی تھی۔

ارسلان اور ارمغان بھی اس سے کافی بے تکلف تھے اور ارسلان نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا..... ”شیری بھائی! مریم سے اچھی کوئی لڑکی آپ کو اس روئے زمین پر نہیں مل سکتی لہذا فوراً اس کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کروا لیجیے۔“

ارمغان نے بھی اس کا کیا تھا کہ وہ ڈائریکٹ بابا سے بات کرے۔ شاید بابا اور اماں نے عینی کی بات کو اہمیت نہ دی ہو لیکن وہ چاہتا تھا کہ بابا یا اماں سے بات کرنے سے پہلے وہ مریم سے بات کر لے۔ کیا خبر وہ کہیں انٹرسٹڈ ہو۔ کیا پتا اس کی سوچ کیا ہو۔

وہ اتنے امیر والدین کی بیٹی ہے۔ ان کے اسٹیشن میں فرق ہے۔ کیا خبر وہ اس جیسے ایک متوسط طبقے کے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا نہ سوچتی ہو..... کیا خبر اس کا اپنا کوئی آئیڈیل ہو..... جب سے اس نے مریم سے بات کرنے کا سوچا تھا تب سے کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا..... اور آج وہ اسپتال میں ملی تھی تو اس کے پاپا بیمار تھے۔

”ڈاکٹر شہریار! ڈاکٹر رافع کہہ رہے ہیں کہ آپ کمرہ نمبر ۹ کے مریض کو ذرا چیک کر لیں۔ اسے ڈی ہائیڈریشن کی شکایت ہے۔“ ایک نرس نے کہا تو وہ کمرہ نمبر ۹ کی طرف چل پڑا۔



پروفیسر عادل بڑی دیر سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر لکیریں تھیں اور ان کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ جلتے جلتے جب سگریٹ انگلیوں کو جلانے لگا تو وہ اسے ایش ٹرے میں پھینک کر نیا سگریٹ جلا لیتے..... جھلٹے جھلٹے وہ رکے۔ انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھا جو پوروں کو جلانے لگا تھا۔

اسے ایش ٹرے میں پھینکا نیا سلگایا اور جیسے بے حد تھک کر نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے اور آہستگی سے جیسے اپنے آپ کہہ۔

”کاش! میں اسے ایک بار پھر دیکھ سکتا بہت نزدیک سے نہ ۱۰۰۰۰ مارہ کہیں نظر نہیں آتی۔ جیسے کوئی میٹھا نرم جھونکا کر گزر جائے۔“

جیسے آنکھوں کا کوئی سندھ سپنا۔ جو نیند نوٹنے کے بعد لم ہو جائے۔

مگر وہ کوئی سپنا تو نہیں تھی اور نہ ہی ہوا کا کوئی جھونکا تھی بلکہ ایک جیتا جاگتا وجود رکھتی تھی اور یہیں کہیں اسی شہر میں تھی۔

پھر پتا نہیں کیوں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

کتنی ہی بار وہ رانچ اسپتال گئے تھے اور یونہی بے مقصد شہر یار سے گپ شپ لگا کر آ گئے تھے۔ کتنی ہی بار وہ ارسلان وغیرہ کے گھر کی طرف گاڑی لے کر گئے تھے کہ شاید وہ کہیں گھر سے باہر نکلتی یا اندر جاتی دکھائی دے جائے لیکن وہ پھر کہیں نظر ہی نہ آئی۔

کبھی کبھی تو انہیں اپنی اس ٹین ایجنر والی حرکتوں پر بڑی عداوت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اندر ہی اندر شرمندہ سے ہو جاتے تھے..... کوئی جان لے تو کیا سوچے..... سرور کو ہی پتا چل جائے تو کیا کہے گا کہ میں ایک لڑکی کی خاطر یوں خوار ہو رہا ہوں، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل جاتے اور دیر تک سڑکوں پر مارے مارے پھرتے۔ کئی بار ان کا جی چاہا وہ شہر یار سے اس کے متعلق پوچھیں..... ارسلان یا ارمغان سے پتا کریں کہ وہ ایک بے حد دلکش چہرے والی معصوم سی لڑکی جو ایک شام ان کے گھر کے گیٹ سے باہر آتی دکھائی دی تھی وہ کون ہے؟

لیکن پھر ہمت نہ ہوتی۔

کیا سوچیں گے وہ کہ میں بھلا کیوں پوچھ رہا ہوں اس کے متعلق.....

میرا بت ان کی نظروں میں چکنا چور ہو جائے گا۔

اف وہ کہاں ڈھونڈیں اسے۔

شہر یار اور ارمغان وغیرہ کے گھر سے آتے دیکھ کر انہیں بڑا اطمینان ہوا تھا جیسے وہ ان کی دسترس میں ہے اور جیسے وہ اب اسے کھو نہیں سکتے۔

لیکن جوں جوں وہ سوچے انہیں لگتا جیسے اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ اسے کھو چکے ہیں۔ وہ جب سے حویلی سے واپس آئے تھے کتنے ہی چکر ارسلان کے گھر والی سڑک اور رانچ اسپتال کے لگا چکے تھے.....

ایک بار

سرف ایک بار وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔

اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔

کہ کیا وہ زندگی کا سفر ان کی ہمراہی میں طے کرنا پسند کرے گی۔

وہ اسے بتانا چاہتے تھے۔

کہ انہوں نے برسوں اسے سوچا ہے، اس کا بیولا تراشا ہے۔ اسے نہ جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ

عہد و پیمان باندھے ہیں۔

بظاہر یہ ایک افسانوی سی بات لگتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ محض اس کی وجہ

سے اس کی خاطر وہ کتنے سارے لوگوں کا دل دکھا رہے تھے حالانکہ یہ ان کی سرشت میں نہیں تھا.....

انہوں نے بھی کسی کا برا نہیں سوچا تھا اور بھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا لیکن انجانے میں وہ سب کا دل

دکھا رہے تھے..... یہ کیسی خواہش، کیسی تمنا تھی..... کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کے لیے.....

جس کا خاکہ ان کے تصور نے تراشا تھا۔

اور جو ایک ہوا کے جھونکے کی طرح اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی تھی۔

صرف اس کی خاطر وہ سب کو خفا کر کے چلے آئے تھے۔

حتیٰ کے ابھیں سمجھنے والی..... ان کی دوست..... ان کی مخلص آپا بھی ان سے خفا ہو گئی تھیں۔

حویلی سے اچانک بلاوا انہیں پریشان کر گیا تھا، اگرچہ مسرور نے انہیں بے حد سلی دی تھی کہ وہاں سب

حیریت ہے۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں پھر بھی اماں جی نے انہیں بلایا ہے۔ فوراً..... تو وہ بے حد اچھے

ابھی سے اسی وقت حویلی روانہ ہو گئے تھے۔

حویلی پہنچتے ہی وہ سیدھے ماں جی کے کمرے میں گئے۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ جسکی دیر وہ نماز پڑھتی

رہیں۔ وہ مضطرب سے ادھر ادھر بہتے رہے۔

”ماں جی حیریت تو ہے نا۔“ وہ نماز پڑھ چکی تھیں تو انہوں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”ہاں بیٹا حیریت ہی ہے۔ کم آرام سے نہادھو کر پٹرے بدل لو سفر سے آئے ہو۔“

”کامل تو ٹھیک ہے نا.....؟“

”ہاں ٹھیک ہے وہ تو۔“

”پھر..... وہ بہت بے یقین ہو رہے تھے۔“

”ہمیں منے لودینھنے لوبی چاہ رہا تھا۔“

مراپ نے اس صحن کو جی میں بلایا ماں بی۔ وہ بیٹھ گئے۔ آپ پیر بھی بنا میں بی گئی

سُکراؤ نہیں ہوا..... ماما نے کوئی مسئلہ نہیں ہڑا کر دیا!

”کیا..... کیا بات کرو گے تم؟“ انہوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
 ”میں سمجھاؤں گا چچا کو کہ وہ حریم کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔“
 ”ہوں.....؟“ انہوں نے اس طرح ان کی طرف دیکھا جیسے انہوں نے کوئی انتہائی بے وقوفانہ بات کہہ دی ہو..... ”اگر تمہارے چچا نے کہہ دیا کہ پھر تم حریم سے شادی کر لو تو پھر کیا جواب دو گے؟“
 ”ماں جی۔“ انہوں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

شاید وہ انکار نہ کر سکیں۔ چچا کی بات رد کرنے کا شاید ان میں حوصلہ نہ ہو۔ ماں جی صحیح کہہ رہی تھیں۔
 ”تم اگر حریم سے شادی نہیں کر سکتے تو پھر چچا سے کچھ مت کہنا۔“ ماں جی جائے نماز سے اٹھیں..... ”عادل بیٹا حریم بہت اچھی ہے..... بیٹا اس کے لیے سوچو.....“
 ”جی ماں جی.....“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”ابھی آرام کرو۔ ٹھنڈے دل سے اچھی طرح سوچو۔ سید پور والوں کو تمہارے چاچا نے سوچنے کو کہا ہے لیکن وہ فیصلہ کر چکا ہے اور اس فیصلے کو صرف تمہاری رضامندی بدل سکتی ہے۔“
 ”میں ذرا کامل سے مل لوں پھر کچھ دیر آرام کروں گا اور یہ بی آپا کہاں ہیں؟“ انہوں نے ماں جی کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔
 ”وہ تو حریم کی طرف نکلیں ہے۔“

”اچھا.....“ وہ سر کو خفیف سا خم دے کر باہر نکل آئے۔
 کامل اپنے بستر پر گود میں ٹرانز سٹر رکھے بیٹھا تھا۔ کبھی لگا تا کبھی بند کر دیتا، کبھی سنتا اور کبھی خود ہی تالیاں بجانے لگتا۔ وہ کچھ دیر کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ کچھ کنزرو لگ رہا تھا لیکن مطمئن اور خوش تھا۔
 وہ کتنی ہی دیر تک چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ ایک درو سادل میں اٹھ رہا تھا.....
 اگر کامی نازل ہوتا۔

صحت مند ہوتا..... تو حریم اور کامی کی شادی ہو سکتی تھی۔ چچا حریم کا رشتہ باہر نہ دیتے، انسان بھی کتنا بے بس اور مجبور ہے۔

وہ کامل سے بے حد محبت کرتے تھے۔
 لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بچپن ہی سے وہ سوچتے تھے کہ کاش ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہوتی جسے گمانے سے کامی ایک دم صحت مند اور نازل ہو جاتا اور جب بھی انہیں یہ خیال آتا تھا وہ دادا کے کان..... کھانے لگتے تھے کہ جادو کیسے ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے اور کیا وہ جادو کیسے کر سکتے ہیں؟
 اور انہیں حریم سے ہمدردی تھی۔

اچھا نہیں ہے۔ بیٹا تمہیں کہیں نہ کہیں تو شادی کرنا ہی ہے پھر حریم ہے ہی کیوں نہیں کر لیتے؟“
 ”ماں جی.....“ انہوں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا..... ”مجھے ایسی بات پر مجبور نہ کریں جو میرے اختیار میں نہ ہو.....“ ایک دم ہی ان کے دل پر بہت بھاری بوجھ آگرا تھا۔

انہوں نے سرموٹے کی پشت پر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور..... وہ دلکش چہرے والی اجنبی لڑکی..... نے دیکھ کر بقل جیتی حیدر کے ان کے اندر ہنسیاں ہی بننے لگی تھیں۔
 اور کہیں اور اک ہوا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کا وہ اتنے سالوں سے انتظار کر رہے تھے اور ابھی تو انہوں نے اس لڑکی کو قریب سے دیکھا تک نہ تھا۔ باتیں تک نہ کی تھیں اور..... اور ماں جی نے انہیں کس مشکل میں ڈال دیا تھا..... ”کیا وہ حریم سے شادی کر لیں.....؟“ انہوں نے سوچا اور پھر خود ہی تردید کر دی۔

”نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔“
 اتنے طویل انتظار کے بعد تو دل کی کلی کھلی تھی۔
 اندر بالکل ہی مچی تھی ”کیا عمر بھر کا انتظار رائیگاں چلا جائے گا..... کیا وہ منزل پر پہنچ کر بھی پیاسے رہیں گے..... نہیں منزل تو اب ان کے سامنے ہے۔“
 جو پہلے دھند میں چھپی نظروں سے اب جھل تھی اب بالکل واضح تھی۔

بس ذرا سی ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔
 نہیں وہ اسے یوں نہیں گنوائیں گے۔

اور حریم.....
 دل نے سرگوشی کی۔

کیا وہ سولی چڑھ جائے گی۔
 وہ نازک سی بولتی آنکھوں والی حریم۔

جس کی خاموش التجاؤں سے وہ خوف زدہ سے رہتے تھے۔ کیا وہ تمام عمر کے لیے مصلوب ہو جائے گی..... نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ وہ خود چچا سے بات کریں گے، انہیں سمجھائیں گے کہ وہ ایسا نہ کریں۔ وہ خود حریم کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈیں گے۔

اس خیال نے جیسے ان کے کھولتے ہوئے دماغ میں ٹھنڈک سی بھردی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر ماں جی کی طرف دیکھا۔ جن کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں۔

”ماں جی آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خود چچا جان سے بات کروں گا.....“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

لیکن وہ اس کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھے۔

کیا خبر ماں جی کو کسی نے غلط اطلاع دی ہو۔

انہوں نے اپنے آپ کو بہلایا۔

سید پور والوں کا بیٹا جس کا رشتہ حرم کے لیے آیا ہے اچھا ہو..... تعلیم یافتہ نہ ہونے سے کوئی برا تو نہیں

ہو جاتا نا۔

”بھائی.....“ کامل کی نظر اچانک ہی ان پر پڑی تو وہ تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کرتا ہوا ایک دم ریڈیو

بستر پر پھینک کر بستر سے اتر آیا۔

وہ چونک کر مسکرائے اور آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹالیا۔ وہ بھی ان سے لپٹ گیا۔

”بھائی..... بھائی.....“ وہ بار بار دہراتے ہوئے ان کا ہاتھ چومنے لگا۔ تو وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے

لپٹائے آکر بستر پر بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ تھام کر ہولے ہولے اس سے باتیں کرنے لگے اور وہ سر ہلا ہلا کر

مسکراتا رہا۔

”اچھا کامی اب میں جاؤں گا؟“

”نہیں.....“ اس نے سختی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں تم کا ہوا ہوں نا..... ابھی میں نہاؤں گا“ پھر سوؤں گا۔“ انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا تو اس

نے ہاتھ چھوڑ دیا لیکن منہ بسورنے لگا جیسے روٹھا ہوا ہو۔

”ابھی تو میں یہاں ہوں نا پھر دونوں بھائی باہر گھومنے جائیں گے ہے نا۔“ انہوں نے اس کے

رخسار سہلائے۔

”ہوں.....“ وہ پھر خوش ہو گیا اور خوشی سے آوازیں نکالنے لگا تو وہ باہر چلے آئے۔ برآمدے میں کرم

داؤل گیا۔ وہ کامی کی طرف آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ اس کی بیوی تو سید پور کی ہے اسی سے

پوچھ لیا جائے۔

”یہ سید پور کے چوہدری کیسے ہیں؟“

”اچھے ہیں جی..... غریبوں کا خیال کرنے والے۔ بڑے چوہدری صاحب تو اللہ بخشے بہت ہی سخت

مزاج تھے لیکن ان کے بیٹے اچھے ہیں۔ تعلیم نے ان میں حلیمی پیدا کر دی ہے۔ بندے کی عزت کرتے ہیں۔“

”اچھا.....“ انہیں لگا جیسے ان کے دل پر اچانک جو بوجھ اڑا تھا وہ سرک رہا ہو۔

”لیکن.....“ کچھ دیر ٹھہر کر کرم داؤنے پھر بات شروع کی۔

”لیکن کیا.....؟“ ان کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

”ملک شیر سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا ہے چھوٹے چوہدری صاحب کا..... بے جالا ڈیپار اور پیسے کی

فراوانی نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ اس میں وہ ساری برائیاں ہیں جی۔ جو پیسے سے پیدا ہوتی ہیں۔ شراب

پیارے کھانا اور گانے سننے جانا وغیرہ وہاں سید پور میں ڈیرے پر بھی گانے والیاں آتی رہتی ہیں۔“

پروفیسر عادل کو یوں لگا جیسے کوئی بھاری سیل دل پر آگری ہو۔

”میں نے تو جی جیسے ہی پتا چلا کہ سید پور والے ملک شیر کے رشتے کے لیے آئے ہیں تو میں نے بیگم

عنبہ سے سب کہہ دیا۔ لفظ لفظ..... ابھی تو ملک شیر پورے بیس سال کا بھی نہیں ہے۔ شادی بھی تو اسی

لے کر رہے ہیں تاکہ میں ٹیکل ڈالنے کے لیے.....“

”تو وہ حرم سے عمر میں بھی چھوٹا ہے۔“ انہوں نے دل گرفتگی سے سوچا۔ ”پھر آخر چچا ایسا کیوں کر رہے

ہیں۔“ اپنے کمرے میں آکر بھی وہ بہت دیر تک سوچتے رہے کہ وہ حرم کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ کوئی

راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خود کو کسی صورت بھی اس کے لیے تیار نہیں کر پارہے تھے۔ شاید وہ اس

صورت حال میں ہار جاتے۔

اگر وہ انہیں دکھائی نہ دیتی۔

وہ جس کا انہیں برسوں سے انتظار تھا۔

ابھی تو انہوں نے اس سے بات تک نہیں کی تھی۔

قریب سے دیکھا تک نہ تھا۔

اور ماں جی چاہتی تھیں کہ وہ.....

نہیں..... ان کا برسوں کا انتظار رائیگاں نہیں جاسکتا.....

وہ ایسے کیسے حرم کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیں۔

وہ اپنے آپ سے لڑتے الجھتے ہوئے سو گئے۔

شام کو سو کر اٹھے تو وہ دل میں چچائے بات کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

”میں ذرا بی آپا کی طرف جا رہا ہوں انہیں لے آؤں۔“ ماں جی کو بتا کہ وہ چھوٹی حویلی آگئے۔

چچا حویلی میں نہ تھے۔ البتہ مہراں اور سلطان تھے۔ مہراں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔

”اے مہراں تم کب آئے ہو؟ ماں جی نے تو بتایا نہیں۔ تقریباً سات آٹھ ماہ بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”میں آج ہی آیا ہوں۔“ مہراں بھی ان سے مل کر خوش ہوا..... ”اتفاق ہے کہ جب میں آتا ہوں

آپ نہیں ہوتے اور آپ آتے ہیں تو میں نہیں ہوتا..... اب فارغ ہوں۔“

”اوہ ہاں تمہارے پیچہ زکیے ہوئے؟“ وہ بیٹھ گئے۔

”بہت اچھے۔“

مہراں شروع ہی سے ذہین تھا اور سلطان کے برعکس اس کا دھیان پڑھائی میں بہت لگتا تھا۔

”کل آخری پریکٹیکل تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اب آگے کیا سوچا ہے؟“

”میرا ارادہ فرکس میں ماسٹرز کرنے کا ہے۔“

”دش یونو ملڈ لک.....“ وہ مسکرائے ”میرے پاس ہی رہنا۔ یہ مانی تو بس آتا ہے اور چلا جاتا ہے کبھی کبھی تو مجھ سے ملتا ہی نہیں۔“ انہوں نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ خفا سا لگ رہا تھا۔ ”بہارہ“

ہے مانی طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....؟“

”ہاں.....“ اس نے مختصر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا ”اچھا عادل بھائی مجھے اجازت دیں۔ مجھے ڈیرے پر جانا ہے۔ کچھ دوست آئے ہوئے تھے۔“

”اوہ ہاں مانی..... مجھے تم سے بات کرنا تھی۔“

انہیں یاد آیا کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے تھے..... چچا گھر پر نہیں تھے اور مانی کو دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ چچا کی نسبت مانی سے وہ زیادہ بہتر طریقے سے بات کر سکتے ہیں اور چچا مانی کی بات ماننے بھی بہت ہیں۔

”جی.....“ سلطان کا انداز روکھا روکھا سا تھا۔

”مانی مجھے بتا چلا ہے کہ سید پور والوں نے حریم کے لیے رشتہ دیا ہے۔“

”آپ نے صحیح سنا ہے۔ عادل بھائی.....“ اس کا انداز بدستور روکھا روکھا تھا۔

”پھر کیا ارادہ ہے تم لوگوں کا.....“

”ظاہر ہے انکاری کوئی گنجائش ہی نہیں۔“

”مگر میں نے سنا ہے کہ لڑکا اچھا نہیں ہے.....“

”تو.....“ اس نے بھوئی اچکا میں۔

پروفیسر عادل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”ظاہر ہے پھر حریم کی زندگی تباہ نہیں کی جاسکتی..... چچا جان کو سمجھاؤ مانی کہ وہ انکار کر دیں۔“

”کیوں کیا کوئی متبادل رشتہ ہے آپ کے پاس.....؟“ اس کا لہجہ بہت چبھتا ہوا سا تھا۔

پروفیسر عادل نے نگاہیں جھکا لیں اور پھر سر اٹھا کر پاس کھڑے سلطان کی طرف دیکھا اور حتی انداز میں بولے۔

”نہیں..... لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حریم جیسی اچھی لڑکی کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جائے جو ڈرنک تک کرتا ہو۔ عورتوں کے پاس جانا ہوا اور.....“

”چھوڑیے عادل بھائی..... یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ محض جوانی کا شغل ہے.....“ سلطان کے تنے ہوئے نفوش میں ہلکی سی نرمی آگئی ”اب ہر کوئی آپ کی طرح عابد و زاہد نہیں ہو سکتا۔“

”پھر بھی تم چچا جان کو سمجھاؤ۔ حریم بہت مختلف لڑکی ہے۔“

”اچھا.....“ اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔

”ابا جان فیصلہ کر چکے ہیں غالباً.....“ وہ سیدھا ہو گیا..... ”میں چلتا ہوں اب۔“

پروفیسر عادل حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس کا آج کا رویہ اور انداز کچھ پسند نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی اس نے ان سے اس انداز میں باتیں نہیں کی تھیں..... اور پھر کیسا بھائی تھا وہ اسے اس بات کی پروا ہی نہیں تھی کہ جس شخص سے اس کی بہن کی شادی ہو رہی ہے وہ کس کردار کا ہے۔ انہیں بے حد دکھ ہوا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مانی ضرور چچا جان کو سمجھائے گا۔ انہوں نے پاس بیٹھے مہران کو دیکھا جو ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ وہ میرا مطلب ہے؟“ شبیر ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں میں نے یہی سنا ہے۔“

”میں ابا جان سے بات کروں گا کہ ان لوگوں کو جواب دینے سے پہلے تحقیق کر لیں اور اگر ایسی کوئی بات ہے تو حریم کوئی بوجھ نہیں ہے کہ اسے اتار کر پھینک دیا جائے۔“

”ٹھنک گاؤ۔“ انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ مانی نے نہیں تو کم از کم مہران نے ان کی بات سمجھ لی تھی۔

وہ کچھ دیر مہران کے پاس بیٹھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں ذرا بی آپا ت مل لوں پھر چلوں گا۔ چچا آجائیں تو میرا سلام کہنا۔“

”ہائیں میں بھی آپ کے ساتھ ہی اندر چلتا ہوں۔“

مہران بھی اٹھ کھڑا ہوا لیکن اسی وقت اس کا کوئی دوست آگیا تو وہ مہران کو وہیں چھوڑ کر اندر چلے آئے۔

سب سے مل کر جب وہ واپس آ رہے تھے تو ایک کونے سے حریم نے آواز دی۔

”عادل بھائی.....“

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

حریم ستون سے نیک لگائے کھڑکی تھی..... اس کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

”حریم کیسی ہو.....؟“

اس کی نظریں انہیں اور پھر جھک گئیں۔ ہونٹ کا نپ کر رہ گئے۔

”کچھ کہنا چاہتی ہو.....؟“ وہ اس کے قریب چلے آئے۔ وہ کچھ دیر ستون سے لپٹی تیل کے پتے توڑتی رہی۔

”ہاں نہیں بی آپا۔۔۔۔۔“ ان کی آنکھوں کی چمک بجھ سی گئی اور آواز میں پھر وہی درد گھل گیا۔
 ”ہاں نہیں بی آپا میں پھر کبھی اسے دیکھ پاؤں گا یا نہیں۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی میں کسی کے لیے۔۔۔۔۔ کسی بھی لڑکی کے لیے اپنا دل کشادہ نہیں پاتا۔“
 انہوں نے نیچے رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا اور بی آپا کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر واضح مایوسی تھی۔
 ”پھر بھی۔۔۔“

انہوں نے بریف کیس دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔
 ”میں سوچوں گا حریم کے تعلق اگر۔۔۔۔۔ اگر چچا جان نے مانی اور مہراں کی بات نہ سنی تو۔۔۔۔۔ آپ مجھے ان کے فیصلے سے ضرور مطلع کیجئے گا۔۔۔۔۔“ ان کا لہجہ شکستوں سے چور تھا۔ بی آپا تڑپ اٹھیں۔
 ”عادل۔۔۔۔۔“ انہوں نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے آنکھوں سے لگایا اور پھر چوم کر چھوڑ دیا۔

”اگر وہ لڑکی تمہیں ملے تو تم مجھے اس سے ضرور ملواتا۔ میں خود عبدالرحمن چچا سے بات کروں گی۔ شہیر ملک کے متعلق۔۔۔۔۔ کوئی یوں بھی اپنی اولاد کو کنوئیں میں پھینکتا ہے۔“
 انہوں نے ایک نظر بی آپا کو دیکھا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر بوٹھل دل لیے چلے آئے۔
 ماں جی نے کچھ کہا تو نہیں تھا لیکن وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ کچھ خفا تھا۔
 اور بی آپا بھی کتنی دل گرفتہ تھیں۔

شاید وہ بھی خفا ہوں۔۔۔۔۔ اتنے مجبور اتنے بے بس تو وہ کبھی بھی نہیں ہوئے تھے کتنے سارے دن انہیں لاہور واپس آئے ہو گئے تھے لیکن ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔
 نہ حریم کے حق میں اور نہ۔۔۔۔۔ وہ ہی پھر کہیں دکھائی دی تھی اور نہ حویلی سے کوئی فون آیا تھا۔۔۔۔۔ شاید سب بہت خفا ہو گئے تھے ”ہاں نہیں چچا جان نے سید پورو والوں کو کیا جواب دیا ہوگا۔۔۔۔۔ کسی نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا تو وہ خود ہی پتا کر لیتے۔۔۔۔۔“ انہیں پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ ہاتھ میں پکڑے ادھ جلتے سگریٹ کو انہوں نے ایش ٹرے میں پھینک کر فون اپنی طرف سرکایا۔ تب ہی بیل بج اٹھی۔ دوسری طرف بی آپا تھیں۔

”میں ابھی آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ چچا جان نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”مہراں نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ سید پورو والوں کو انکار کر دیں۔۔۔۔۔“
 ”تھیک گاڈ۔“ ان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور انہیں یوں لگا جیسے ان کے مضطرب دل کو قرار سا آ گیا ہو۔

”عادل۔۔۔۔۔“ بی آپا کے لہجے میں ہمیشہ والی نرمائیں تھیں ”سنو میرے بھائی اگر وہ لڑکی تمہیں نہ ملے

”کچھ کہنا ہے حریم۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے پھر پوچھا اور ادھر ادھر دیکھا۔ اس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ بی آپا اندر بڑے کمرے میں چچی سے باتوں میں محو تھیں۔ وہ انہیں ساتھ لانا چاہتے تھے لیکن چچی نے انہیں روک لیا تھا کہ وہ کل آ جائیں گی۔
 حریم نے پلکیں اٹھائیں۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے شادی کر لیں پلیز۔“
 ”حریم۔۔۔۔۔“ وہ ششدر سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ شاید وہ حریم سے اس بات کی توقع نہیں کر رہے تھے۔
 ”ہاں میں آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ آپ کی زندگی میں بالکل خل نہیں ہوں گی۔ آپ کو اپنے وجود کا احساس بھی نہیں ہونے دوں گی لیکن پلیز۔۔۔۔۔ مجھے اس شخص سے، اس شبیر ملک سے بچا لیں۔“
 آنسو روانی سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

وہ دکھا اور تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔ کاش! کاش! ان کا دل ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ۔۔۔۔۔ حریم کو۔
 ”روئیں نہیں حریم۔۔۔۔۔ میں نے بات کی ہے مانی سے مہراں سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔“
 انہوں نے اسے تسلی دی اور دل پر بہت بھاری بوجھ لیے وہاں سے چلے آئے۔ شاید حریم ان سے کچھ اور بھی چاہتی تھی۔ اس نے لب بھی کھولے تھے لیکن انہیں لگا تھا جیسے وہ کچھ دیر اور رکے تو ان کے حوصلے جواب دے جائیں گے۔۔۔۔۔ حریم کے آنسو انہیں بہا لے جائیں گے سو وہ چلے آئے تھے۔
 وہ چار دن حویلی میں رہے تھے۔ ماں جی نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی لیکن بی آپا نے گھنٹوں پاس بیٹھ کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خود کو اس کے لیے تیار نہیں کر سکے تھے۔
 ”نہیں یہ بہت مشکل ہے بی آپا۔ میں حریم کو خوش نہیں رکھ سکوں گا۔۔۔۔۔“ انہوں نے بے بسی محسوس کی۔
 جاتے سے پھر بی آپا نے تاکید کی۔

”پھر بھی سوچنا تو عادل۔۔۔۔۔ حریم سید پورو والوں کی حویلی میں گھٹ کر مر جائے گی۔ میرے بھائی تم تو بہت گداز دل رکھتے ہو۔۔۔۔۔ حریم کے لیے تمہارے دل میں کوئی نرمی کیوں پیدا نہیں ہوتی۔“
 انہوں نے گلہ کیا۔

”اور میرا دل۔۔۔۔۔ میرا اپنا دل بی آپا میں اس کا کیا کروں۔۔۔۔۔“ ان کے لہجے میں عجب سادہ رکھل گیا تھا۔

”مگر کوئی ہو تو عادل۔۔۔۔۔ کسی کا وجود تو ہو۔۔۔۔۔ تم تو ہواؤں کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔“
 ”نہیں بی آپا۔۔۔۔۔“ ان کی آنکھیں چمک اٹھیں ”وہ ہے۔۔۔۔۔ وہ ہے بی آپا۔“ ان کی آواز سرکش
 میں ڈھل گئی ”میں نے اسے دیکھا ہے۔“
 ”کیا بچ عادل؟“ بی آپا کے لہجے میں اشتیاق تھا ”کون ہے وہ کہاں رہتی ہے کس کی بیٹی ہے؟“



تو حرم کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے میں دیر نہ کرنا۔ ابھی تو مہراں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی دھمکی دے کر چچا جان کو مجبور کر دیا ہے لیکن پھر کبھی.....“

وہ لمحہ بھر کو چپ سے کر گئے اور پھر ماں جی اور کامل کا حال پوچھنے لگے۔

بی آپا سے بات کر کے انہوں نے فون رکھا تو انہیں یوں لگا جیسے اتنے دنوں سے ان کے دل پر جو بوجھ دھرا تھا وہ آپوں آپ سرک گیا ہو۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھ رہے تھے۔

”اور کتنی تکلیف دہ بات ہوئی تھی اپنے پیاروں کی امیدوں پر پورا نہ اترتا جب وہ آپ سے انی توقعات رکھتے ہوں اور آپ اپنی کسی مجبوری کے ہاتھوں ان کی توقعات کو مجروح کریں.....“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی اور میز پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھالیں۔

کتنے بہت سارے دن ہو گئے تھے وہ گھر سے باہر نہیں نکلے تھے۔ نہ جتنی صاحب کی طرف گئے تھے اور نہ ہی کوئی ادھر آیا تھا انہوں نے سرور سے کہہ دیا تھا کہ کوئی فون کرے تو کہہ دو کہ حویلی گیا ہوا ہوں۔ وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دن بھر اپنے آپ سے ہی الجھتے لڑتے اور جھگڑتے رہتے تھے پھر بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔

”تھیک گاڈ.....“ انہوں نے ایک بار پھر زیر لب کہا..... چچا جان نے سید پورو والوں کو انکار کر دیا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکتے۔

سرور اپنے کمرے میں ہی تھا اور اپنے کام میں مصروف۔ اسے باہر جانے کا ہتا کر وہ جتنی حیدر کی طرف چلے آئے وہ ابھی کہیں باہر سے آئے تھے۔

”آہا! آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئے عادل میاں۔“

”ہاں میں ذرا حویلی چلا گیا تھا۔“

”خیر یہ تھی سب۔“ وہ انہیں لیے ہوئے نشست گاہ میں آگئے۔

”جتنی.....“ گاڈ سیکے سے فیک لگاتے ہوئے جتنی کی نئی کتاب ”محبوتوں کے عذاب“ کی ورق گردانی کرتے انہوں نے جتنی حیدر کی طرف دیکھا..... ”میں نے..... بالآخر اسے پالیا۔“ ان کا لہجہ سرگوشی کا سا رنگ لیے ہوئے تھا۔

”کون کسے پالیا؟“ جتنی حیدر کا انداز سوالیہ تھا۔

وہ بدستور اسی لہجے میں بولتے گئے ”پتا نہیں وہ کوئی خیال تھا یا پستنا۔“

”لیکن جتنی حیدر میں نے اسے دیکھا اور پھر اسے یوں گنوا دیا جیسے کوئی تھکا ہارا پیاسا مسافر کنوئیں کے پاس جا کر پیاسا لوٹ جائے۔“

”احق.....“ ان کی بات سمجھتے ہوئے جتنی حیدر نے بے تکلفی سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ ”جب پالیا تھا تو



مہراں کی کیا ضرورت تھی اسیر کر لینا تھا اسے۔ حصار کھینچ دینا تھا اس کے ارد گرد کہ وہ تمہارے دائرے سے باہر نکل سکتی۔“

”جتنی.....“ انہوں نے کتاب بند کر کے نگاہیں جتنی حیدر کے چہرے پر جمادیں..... ”وہ سامنے تھی مگر مجھے اتنی دیر محسوس ہوئی جیسے کوئی ستارا۔ جسے ہم چھو نہ سکتے ہوں جو دور ہی دور سے ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ اور ہم صرف اسے دیکھ سکیں۔“

”عادل، تمہیں دیکھ کر بارہویں صدی کے کسی عاشق کا تصور آ رہا ہے۔ تم اس فاسٹ دور کی پیداوار ہو جہاں دیکھنے بعد میں ہیں اور چھو پہلے لیتے ہیں۔“

”اور یہ کتنی عجیب بات ہے جتنی کہ اس کا وجود ہے۔ ہے نا عجیب بات.....“ انہوں نے جتنی کو ساری تفصیل بتاتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ اتنی زیادہ عجیب بھی نہیں.....“ جتنی مسکرائے ”ہاں تمہارا رویہ عجیب سا ہے۔ میں ہوتا ہا تمہاری جگہ تو اب تک نہ صرف یہ کہ اس کا اتنا ہوتا معلوم کر چکا ہوتا بلکہ دو چار ملاقاتیں بھی ظہور پذیر ہو چکی ہوتیں۔ بہر حال گھبراؤ نہیں میرے دوست دنیا اتنی بڑی بھی نہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ دکھائی نہ دے سکے۔

دنیا امید پر قائم ہے..... اور ہاں.....“ جتنی حیدر کو یاد آیا..... ”عادل ملک وہ تمہارے والد پھر کچھ بیمار ہو کر اسپتال میں ایڈمٹ ہیں..... کل رات انہوں نے فون کیا تھا اسپتال سے ہی اور تمہارے متعلق بے چینی سے پوچھ رہے تھے بہت مضطرب ہیں وہ۔ انہوں نے مجھے کہا ہے کہ جیسے ہی تم حویلی سے آؤ تو میں انہیں بتاؤں۔ وہ خود تمہارے پاس ملنے آئیں گے۔“

پروفیسر عادل نے اضطرابی انداز میں انگلیاں مروڑ دیں۔

”عادل۔ کیا تم اپنے باپ کو معاف نہیں کر سکتے..... یہ دل کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں..... وہ بھی شاید کہیں ان خزاںوں میں الجھ گئے تھے ورنہ.....“ جتنی حیدر نے بات ادھوری چھوڑ دی اور لمحہ بھر انہیں دیکھتے رہے ”تم کہو تو میں انہیں اطلاع دے دوں کہ تم آگئے ہو۔ وہ اپنی زندگی کے متعلق کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں.....“ جتنی نے آہستگی سے کہا۔

پروفیسر عادل کچھ دیر تو یونہی بیٹھے رہے اور پھر جیسے ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آئیے.....“ انہوں نے جوتے پہنتے ہوئے ان کی طرف دیکھا ”اگر آپ زیادہ محسن محسوس نہ کر رہے ہوں تو اسپتال چلتے ہیں.....“

”اوہ نو..... نور۔“ جتنی حیدر خوش ہو گئے..... ”بہت..... بے حد خوش ہوں گے تمہارے والد تمہیں دیکھ کر۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں عادل میاں۔“ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”چلو میں ذرا اندر بتا دوں کہ ضروری کام سے جا رہا ہوں ورنہ مجھے غریب کی جان پر نزلہ گرے گا کہ

آتے ہی دوبارہ کہاں رفو چکر ہو گئے تھے.....“ مجتبیٰ حیدر مسکراتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے میں چلے گئے۔
پروفیسر عادل نے ذرا سی دیر کو سوچا..... پتا نہیں ماں جی اس ساری صورت حال کو کیسے قبول کر لیں گی۔ جو بلی میں وہ اتنے الجھے رہے تھے کہ ان سے بات کرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ حالانکہ وہ سوچ کر گئے تھے کہ وہ ماں جی سے اجازت مانگیں گے اور اگر انہوں نے اجازت نہ دی تو نہیں بلیں گے..... مگر اب.....

پتا نہیں کیوں انہیں یوں لگا تھا جیسے ان کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو.....“ وہ اپنی زندگی سے زیادہ پُر امید نہیں ہیں.....“
مجتبیٰ حیدر کے الفاظ ان کے کانوں میں گونجے تو وہ مرکوجھک کر نشست گاہ سے باہر نکل آئے۔



مریم بہت دیر سے ڈاکٹر شہریار کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ڈاکٹر زڈیوٹی روم میں صرف ڈاکٹر فاطمہ تھیں جو کسی سے فون پر مصروف تھیں۔ وہ چند لمحے وہاں رک کر باہر آگئی اور او۔ پی۔ ڈی میں دیکھا وہاں مریضوں کا رش تھا۔ ڈاکٹر فخرؔ وہاں بہت مصروف تھے لیکن شہریار وہاں بھی نہیں تھا۔
”پتا نہیں یہ ڈاکٹر شہریار اسے ڈیوٹی روم میں آنے کا کہہ کر خود کہاں چلے گئے۔“ اس نے کوریڈر میں کھڑے کھڑے سوچا۔

عثمان احمد سو رہے تھے ڈاکٹر شہریار نے اسے آفر کی تھی کہ اگر چائے پینے کا موڈ ہو تو ڈیوٹی روم میں آجائے لیکن خود نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے حالانکہ انہوں نے اس کا تھا کہ وہ راؤنڈ لے کر ڈیوٹی روم میں ہی آئیں گے۔ عثمان احمد کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اس دوران شہریار مسلسل ہاسپٹل میں ہی رہا تھا اور ہر طرح ان کا خیال رکھا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر ہادی بھی صبح وشام چکر لگاتے تھے لیکن شہریار کی موجودگی سے اسے بڑی تقویت ملتی تھی اور نہایت اطمینان رہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں شہریار ہاسپٹل میں نہ ہوتا تو اسے گھبراہٹ ہو نہ لگتی تھی۔ جیسے وہ نہ ہوتا یا کچھ ہو جائے گا اور وہ اکیلی کیا کرے گی۔ ماما کو ان کی بیماری کی اطلاع تو دے دی گئی تھی لیکن انہوں نے فی الحال آنے سے معذرت کر لی تھی۔

”شوٹنگ ختم ہوتے ہی آ جاؤں گی۔“ انہوں نے پاپا کو فون پر بتایا تھا اور پاپا نے بھی آنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ کیا تھا؟ اگر پاپا انہیں واپس بلا لیتے۔ مسز آفندی اور میڈم نرگس باقاعدگی سے ہاسپٹل انہیں دیکھنے آتی تھیں۔ صرف پاپا کے کمرے میں نہیں بلکہ راؤنڈ تو ضرور پورے ہاسپٹل کا لگاتار گھومیں اور بے لاگ تبصرہ بھی کرتی جاتی تھیں۔ شہریار سے اب ان کی خوب بختی تھی حالانکہ لالہ کی بیماری کے دوران تو ان کی اچھی خاصی تنہی ہو گئی تھی شہریار سے۔ لیکن اب وہ برعکس اس کی تعریف کرتیں۔

”شہریار اچھا لڑکا ہے۔“ کئی بار انہوں نے مریم کے سامنے بھی اس کی تعریف کی تھی اور مریم خود بھی اس کی محترف تھی۔ سبھی مریض شہریار کو پسند کرتے تھے۔ وہ بہت ہمدرد اور خوش اخلاق تھا اور مریم کا تو وہ بہت ہی خیال رکھتا تھا۔ عثمان احمد بھی اسے پسند کرنے لگے تھے۔ ایک بار مریم نے شکر یہ ادا کیا تو وہ مسکرایا۔
”اچھا۔“ اس نے بھی مسکرا کر شہریار کو دیکھا تھا اور اسے بابا اور یعنی سب کی محبتوں پر فخر سا محسوس ہوا تھا اور اگر بابا یہاں ہوتے۔ اس نے سوچا تو وہ بھی شہریار کی طرح پاپا کا خیال رکھتے اور خود اس کا بھی۔

یعنی کا گھر اسے اپنے لیے ایک پناہ گاہ لگتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پاپا کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ انہیں بلا لے گی لیکن وہ لوگ گاؤں جا چکے تھے مگر شہریار یہاں تھا جس سے اسے بڑی ڈھارس ملتی تھی اور بہت حد تک اس کی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی۔

”ارے مریم آپ یہاں کھڑی ہیں۔“ ڈاکٹر شہریار نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا تو وہ چونکی۔
”خیریت؟“ اس کی سوالیہ نظریں مریم کے چہرے کی طرف اٹھیں۔
”آپ نے ہی تو کہا تھا کہ.....“
”اوہ سوری!“ شہریار نے اس کی بات کاٹ کر خفت سے کہا۔

”دراصل ایک مریض کی BIOPSY کروانی تھی، ادھر چلا گیا تھا۔ آئی ایم رینلی ویری سوری مریم! آپ نے محسوس تو نہیں کیا؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“ وہ مسکرائی ”ظاہر ہے مریض زیادہ اہم ہوتے ہیں۔“
”بہر حال میرا جانا اتنا بھی ضروری نہیں تھا ہے بس مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ آئیے، انکل تو سو رہے ہوں گے۔“

”جی ہاں۔“
”تقریباً گھنٹا بھر سوئیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ریست چاہیے انہیں۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شہریار نے کہا۔

ڈاکٹر فاطمہ باہر جا رہی تھیں۔ دونوں کو ساتھ آتے دیکھ کر مسکرائیں اور شہریار کے پاس سے گزرتے ہوئے آہستگی سے کچھ کہا۔ شہریار کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔
”آئیے نا ڈاکٹر فاطمہ چائے میں ساتھ دیجئے۔“

”تھینک یو مجھے ذرا ایک کام ہے۔ گھر جا رہی ہوں پھر کسی دن تم دونوں کے ساتھ چائے پیوں گی۔“
”وش یو گڈ نائٹ۔“

ان کی آنکھوں میں شریر سی چمک تھی ”تھینک یو ڈاکٹر۔“
شہریار نے مریم کی طرف دیکھا جو کمرے کے وسط میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”بیٹھے نا، مریم۔“

”جی۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ شہریار نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے چائے کا کپنے کے لیے تیل بھائی۔

”کچھ نہیں۔“ مریم نے ایک نظر اسے دیکھا اور میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھالیا۔

”نہیں آپ یکا یک پریشان نظر آنے لگی ہیں۔“

”کچھ نہیں، بس یونہی پاپا کا خیال آ گیا تھا۔ پاپا کو کب تک گھر جانے کی اجازت مل جائے گی؟“

”کیا یہاں ان کی کیئر زیادہ اچھی نہیں ہو رہی؟“

”جی..... وہ تو ہے لیکن پھر بھی اسپتال تو اسپتال ہی ہوتا ہے۔“

”دراصل بات یہ ہے مریم کہ انکل کی طبیعت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ابھی کل بھی ڈاکٹر رافع ڈاکٹر ہادی

سے کہہ رہے تھے کہ شام تک وہ عثمان صاحب کو گھر لے جائیں لیکن پھر سہ پہر کو عثمان صاحب کی طبیعت

کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بی بی بہت ہائی تھا۔ پھر ڈاکٹر رافع نے تجویز کیا کہ ابھی دو تین روزہ ہسپتال میں ہی

رہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

”پاپا ٹھیک ہو جائیں گے؟“ وہ پہلے سے زیادہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔

”انشاء اللہ۔“ شہریار کی مسکراہٹ نے اسے حوصلہ دیا ”ایک تو آپ یک دم پریشان ہو جاتی ہیں۔

مریم یہ زندگی ہے۔ یہاں زندگی میں نہ جانے کتنے اپ اور کتنے ڈاؤن ہوتے ہیں۔ ایسے نہیں گزرا

ہوتا۔ مریم اپنا دل مضبوط کرو۔ آپ کی ماما بھی یہاں نہیں ہوتیں اسی لیے تو انکل ہادی اس حق میں نہیں ہیں

کہ عثمان صاحب کو گھر لے جایا جائے حالانکہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ معمولی سابی بی کا پراہلم ہے چونکہ ہارٹ

پمپشن ہیں تو ان کے لیے یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور گھر میں خدا نخواستہ ذرا سی ان کی طبیعت خراب

ہوئی تو آپ کو ہو جانا ہے پریشان۔ اسی لیے انکل ہادی چاہ رہے ہیں کہ بی بی کنٹرول ہو جائے ایک بار

تب ہی انہیں گھر بھیجا جائے۔“ شہریار نے پوری تفصیل بتائی ”لہذا آپ پریشان ہرگز نہ ہوں۔ انشاء اللہ

آپ کے پاپا بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ مریم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی ”یعنی اور بابا کب تک گاؤں سے آجائیں گے؟“

اس نے اخبار واپس میز پر رکھ دیا اور شہریار کی طرف دیکھا۔

”جلد ہی۔“ شہریار کی نظر اس کے چہرے پر تھیں ”دراصل سکندر ماموں گاؤں میں ایک چھوٹا سا

اسپتال بنوانا چاہ رہے ہیں۔ برسوں پرانی خواہش تھی ان کی یہ۔ اسی سلسلے میں وہ گاؤں گئے تو سب ہی تیار

ہو گئے۔ ارسل مٹے اور یعنی سمیت۔“

”سکندر ماموں کون؟“ مریم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ڈاکٹر سکندر میرے ماموں۔“ اس کے سوال پر شہریار کو حیرت ہوئی کیونکہ مریم سکندر سے مل چکی تھی۔

اور اس کو یاد آیا کہ اس روز بھی شہریار نے ماموں کہہ کر ان کا تعارف کروایا تھا لیکن اس نے دھیان

نہیں دیا تھا۔

”لیکن یعنی تو انہیں چاچو کہتی ہے۔“

”ہاں وہ یعنی کے چاچو ہی ہیں مگر میرے ماموں ہیں۔“

”کیا؟“ مریم کو حیرت ہوئی۔ اس نے تو آج تک شہریار کو یعنی کا سا بھائی ہی سمجھا تھا۔ ارسل اور

ارمغان کی طرح۔ پھر وہ تینوں کی طرح ہی بابا کو بابا اور صالح کو ماں جی کہہ کر بلاتا تھا۔

”مریم۔“ شہریار کی آنکھوں میں جیسے بادل چھا گئے ”میری والدہ میری پیدائش پر وفات پا گئی تھیں۔

موت نے انہیں اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ وہ ایک بار آنکھیں کھول کر مجھے دیکھ سکیں۔ بابا اور ماں جی

مجھے لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے ارسل، یعنی اور ارمغان کی طرح جانا۔ ماں جی تو مجھے اپنا بڑا بیٹا کہتی

ہیں۔ میری پیدائش کے دو ماہ بعد ماں جی کے ہاں مردہ بچی پیدا ہوئی تھی۔ یوں دو ماہ کی عمر میں انہوں نے

مجھے دودھ پلایا تھا۔ اس طرح یہ رشتہ اور بھی مستحکم ہو گیا۔“

”اور آپ کے والد؟“ مریم نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”میرے والد حیات ہیں۔“ شہریار کے چہرے پر ملال کے رنگ بکھر گئے اور لہجے میں ہلکی سی لرزش

آ گئی ”کبھی کبھار ملنے جاتا ہوں۔ ان کا جی چاہتا ہے تو وہ بھی آ جاتے ہیں لیکن بہت کم۔“

”اور آپ کے سوتیلے بہن بھائی تو ہوں گے؟“ مریم نے پوچھا۔

”یقیناً۔“ شہریار نے افسردگی سے کہا ”لیکن میں ان سے کبھی نہیں ملا حالانکہ کئی بار میرا جی چاہا کہ میں

انہیں دیکھوں۔ سوتیلے ہی سہی ہیں تو میرے بہن بھائی۔ دو بہنیں اور ایک بھائی ہے لیکن جب بھی میں ابا

سے ملنے گیا تو نہ میری سوتیلی والدہ میرے سامنے آئیں نہ انہیں آنے دیا۔“

”کمال ہے۔“ مریم کو حیرت ہوئی ”آپ نے اپنے والد سے کہا نہیں کہ آپ اپنے بہن بھائیوں کو

دیکھنا چاہتے ہیں ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”ایک بار ذکر کیا تھا مگر انہوں نے نال دیا۔“

”اچھا۔“ مریم اداس ہو گئی ”کبھی آپ سوچتے تو ہوں گے کہ اگر آپ کی ماں زندہ ہوتیں اور آپ.....“

”پلیز مریم!“ شہریار نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا ”کوئی اور بات کرو۔ یہاں اس دنیا میں بہت

سارے لوگ ایسے ہیں جو ہم سے زیادہ اکیلے اور تنہا ہیں۔ بابا اور ماں جی کی بے تحاشا محبتوں کے باوجود

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ بہت روؤں۔ کوئی انجانا سادھ دل کو بھیجتا ہے۔ شاید اپنی ان دیکھی ماں کا خیال

آتا ہے یا پھر اپنے ابا کا خیال آتا ہے جو مجھے ہمیشہ بابا کا بیٹا سمجھتے ہیں اور ایک اجنبی مہمان کی طرح باہر

مردانے میں ٹھہراتے ہیں۔ کبھی گھر کے اندر لے کر نہیں گئے اور جب رونہیں پاتا تو بہت گھٹن ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کہیں باہر نکل جاؤں، کھلی فضاؤں میں لیکن یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے مریم۔“

بات کرتے کرتے ناموش ہو کر وہ رحمت خان کو دیکھنے لگا جو چائے لایا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے چائے رکھنے کا اشارہ کیا اور اس کے جانے کے بعد پھر مریم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں بہت جلد خود کو سنبھال لیتا ہوں کہ شاید یہ ناشکری ہے۔ مجھے رضوانہ پھوپھو اور مسرور کا خیال آتا ہے۔ رضوانہ پھوپھو بہت اچھی اور خوب صورت تھیں پھر بھی نہ جانے کیوں ان کے شوہر نے انہیں غارت

دے دی اور دوسری شادی کر لی۔ مسرور میرا کزن بہت اکیلا ہے، بہت حساس ہے۔ بابا اور ماں جی اس سے بھی بہت پیار کرتے ہیں لیکن وہ..... رضوانہ پھوپھو کا کوئی سگا بہن بھائی نہیں۔ ان کے اور مسرور کے

دوھیال میں بھی کوئی نہیں۔ ایک پھوپھو ہیں شاید جو کہیں باہر ہوتی ہیں اور کبھی پاکستان آئیں بھی تو میرا خیال ہے مسرور وغیرہ کی طرف نہیں جاتیں مگر پیاری لڑکی تم اداس مت ہو۔ یہ سب تو چلتا ہے“ اس نے چائے

کا کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا ”اوہ سوری میں نے آپ کو ”تم“ کہہ دیا۔ آپ کو برا تو نہیں لگا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ مریم نے چائے کا کپ تھام لیا ”بلکہ اچھا لگا۔“

”تھینک یو مریم!“

”آپ کی باتوں سے مجھے وہی خوشبو آتی ہے جو بابا کی باتوں میں آتی ہے۔ وہی لہجہ وہی رنگ ہوتا ہے آپ کی باتوں میں۔“

”لہجہ اور رنگ کی حد تک تو خیر ٹھیک ہے۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی ”لیکن فارگاڈ

سیک کہیں تم مجھے بابا ہی نہ سمجھنے لگا۔ کسی دن خاتون ڈاکٹر شہریار کے بجائے بابا کہہ کر مجھے بلارہی ہوں۔“

”نہیں تو۔“ وہ جھینپ گئی ”میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ آپ بابا ہیں۔ آپ مجھ سے تھوڑے ہی بڑے ہوں گے۔“

”تو پھر آپ کا کیا مطلب تھا؟“ شہریار کی آنکھوں میں بدستور شرارت تھی۔

”کچھ نہیں..... بس یہی کہ آپ سے باتیں کر کے اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔ اسی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے جو یعنی بابا اور ماں جی سے بات کر کے ہوتا تھا۔“

”تھینک یو تھینک یو مریم۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا ”بہت دنوں سے میرا جی چاہ رہا تھا“ آپ سے ایک

بات کہنے کو مگر پھر ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ برا نہ مان جائیں۔“

”نہیں آپ کہیں۔ میں برا نہیں مانوں گی لیکن یہ آپ نے پھر آپ کہنا شروع کر دیا۔“

”مریم۔“ اس نے چائے کا خالی کپ نیل پر رکھا اور بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ مریم کی

نظریں جھک گئیں ”سمجھ میں نہیں آتا بات کس طرح شروع کروں۔ میں تو ایک سیدھا سادہ دیہاتی ہوں

اور میرے دل میں بہت سارے خوف ہیں کہ جانے میری بات کو پذیرائی ملے گی یا بے وقعت ہو جائے گی۔ مریم، پلیز پراس کریں کہ آپ میری بات سن کر خفا نہیں ہوں گی اور اگر میری بات آپ کو اچھی نہیں

لگی تو بھی آپ میرے متعلق اپنی رائے تبدیل نہیں کریں گی۔“

”یہ تو آپ کی بات پر منحصر ہے ڈاکٹر شہریار۔ کیا تجربائے تبدیل ہو جائے“ مریم نے قدرے شوخی سے کہا۔

”تو پھر میں بات ہی نہیں کرتا۔“ شہریار جو تھوڑا سا آگے کو جھکا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”نہیں..... نہیں“ آپ بتائیں..... پلیز۔“ مریم نے بے اختیار کہا تو شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مریم بہت دن قبل عینی نے مجھ سے ایک بات کہی تھی کہ شیری بھائی میں نے آپ کے لیے ایک

لڑکی پسند کر لی ہے اور جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو یہ وہی لڑکی تھی جو پہلی ہی نظر میں میرے دل میں

اتر چکی تھی اور میں اسے جھٹلا رہا تھا۔ پھر ہرگز رتے دن کے ساتھ وہ لڑکی میرے دل کی گہرائیوں میں اتر

گئی۔ میں نے کئی بار راتوں کی تجاہیوں میں اسے سوچا۔ کئی بار دن کی روشنی میں گھٹنوں اس کے متعلق سوچتا

رہا اور ہر بار مجھے لگا جیسے وہ میری اولین تمنا بن چکی ہے۔ وہ تو جیسے میرے اندر چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ شاید

ایک بار پہلے بھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے عینی کی بات سے اتفاق ہے۔“

”واقعی صورت حال بڑی تشویش ناک ہے۔“ مریم نے ذرا کی ذرا ناگہم لہجے میں دیکھا اور پھر

اس کی آنکھوں کی حد تک سے گھبرا کر لگا ہیں جھکائیں۔

”ہاں مریم صورت حال واقعی تشویش ناک ہے۔“ شہریار کی آواز بھاری سی ہو گئی ”تم نہیں پوچھو گی

مریم کہ وہ لڑکی کون ہے؟“

”آپ خود بتا دیں۔“ مریم نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ اس کی نظروں کی تپش سے اس کے رخسار

تپ اٹھے تھے۔

”وہ لڑکی۔“ شہریار نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

”ہاں وہ لڑکی۔“ مریم نے نظریں اٹھائیں تو شہریار گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مریم کی

نظریں جھک گئیں۔

”وہ لڑکی تم ہو مریم۔“ شہریار نے یوں گہری سانس لی جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو۔

اور مریم کا دل اس کے سینے کے اندر اتنی شدت سے دھڑکا جیسے ابھی باہر آ جائے گا۔

”خفا ہو گئی ہو مریم!“ شہریار نے بے چینی سے پوچھا لیکن مریم لگا ہیں جھکائے بیٹھی رہی۔ ”پلیز مریم۔

کچھ تو کہو۔ شاید تمہیں میری یہ جرات اچھی نہیں لگی۔ پتا نہیں کب کیسے تم میرے دل میں اتر آئیں

مریم۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ نادم سا ہوا تھا۔ ”تمہیں اگر برا لگا ہے تو سوری۔“

”نہیں۔“ مریم نے یہ مشکل کہا۔ دل کی دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب تھیں۔

”کیا..... کیا کہتا ہوں نے مریم، تمہیں میری بات بری نہیں لگی۔ تم خفا تو نہیں ہو مجھ سے؟“ شہر یار بے اختیار تھوڑا سا آگے جھک کر پوچھنے لگا۔

مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”حقینک یو مریم! حقینک مجھے یقین نہیں آ رہا۔ پلیز! ایک بار ذرا میری طرف دیکھو۔ میری طرف دیکھ کر مجھے بتاؤ کہ تمہیں میری جسارت بری نہیں لگی۔“

”جی۔“ مریم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی اس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

شہر یار کی نظریں دائرگی سے اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اس وقت وہ اسے دنیا کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی سرخ چہرے کے ساتھ پلکیں جھکا کر شرمائی شرمائی بیٹھی رہے اور وہ اسے تکتا رہے۔

”مریم!“ اس کی آواز بوجھل ہو کر سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ”تم اس وقت بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ مریم! بہت دلکش، تمہیں خود اپنی خوب صورتیوں کا اندازہ نہیں ہے۔ مریم تمہاری سادگی اور معصومیت۔“

”پلیز۔“ مریم نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ”کوئی اور بات کریں۔“

”کوئی! بات مریم۔“ شہر یار مسکرایا۔ ”اس وقت اس لمحے تو کوئی اور بات، کوئی اور تصور ذہن میں نہیں ہے۔ کاش میں شام ہوتا، اب ہوتا تو اس وقت..... مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا مریم۔“

بات کرتے کرتے اس نے اچانک کہا۔ ”مریم! کیا واقعہ تمہیں عینی کی تجویز پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

”آپ کے خیال میں مجھے اعتراض کرنا چاہیے ہاں؟“ مریم کے ذہن پر شہر یار کی مسکراہٹ اکھڑ گئی۔

”تو ٹھیک ہے میں۔“

”پلیز..... پلیز مریم! زندگی کی نوید دے کر موت کی خبر مت سنانا۔“

”اچھا۔“ مریم بدستور شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں اب معمول پر تھیں اور اس کی نگاہیں

شہر یار کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں جو بہت مضطرب ہو کر پہلو بدل رہا تھا۔

”یعنی کی تجویز کچھ ایسی بری بھی نہیں ہے۔ اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔“

”اوہ۔“ شہر یار نے گہری اطمینان بھری سانس لی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرایا دیا تھا۔“

”آپ اتنے ڈرنے والے لگتے تو نہیں ہیں۔“

”دل کے معاملات میں آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔ مریم ہزاروں وہم ہزاروں خوف اس کے دل سے

چھنے رہتے ہیں۔ پتا ہے جب سے میں نے تمہارے متعلق سوچنا شروع کیا ہے تب سے ہی بہت سے وہم

اور خوف دل سے چٹ گئے تھے۔ رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو مایوسی مجھے گھیر لیتی۔ میں سوچتا، بھلا میں کہاں اور تم کہاں۔ آسمان اور زمین کا کیا جوڑ۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا کہ مجھے تمہارے متعلق نہیں سوچنا چاہیے لیکن تم ایسے دل میں آ بیٹھی تھیں مریم کہ نکلتی ہی نہیں تھیں۔ مجھے خود پر اور یعنی پر غصہ آتا کہ اس نے کیوں تمہارا خیال میرے دل میں پیدا کیا بلکہ اس نے کیا خود تم نے ہی مجھے اسیر کر لیا تھا..... شاید پہلے ہی دن۔ تم میرے ساتھ خوش رہو گی نا مریم۔ بابا اور ماں جی گاؤں سے آجائیں تو انہیں تمہارے پاپا کی طرف بھیجوں گا لیکن تم پلیز! تم ایک بار پھر سوچ لینا۔ اچھی طرح سوچ لینا۔ کہیں بعد میں تمہیں کوئی بچھتاوانہ ہو۔ مریم میں جو کچھ ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ ہم سادے سے دیہاتی لوگ ہیں۔ وہ سب تمہیں بہت چاہیں گے۔ ماں جی کا خمیر تو محبتوں کی مٹی سے ہی اٹھایا گیا ہے۔“

ماں جی بابا اور یعنی یہ سب اسے بھی کتنے عزیز ہو گئے تھے۔ کسی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا اسے وہاں ان سب کے درمیان۔ جیسے وہ اپنے گھر میں ہو اور کتنی ہی بار اس نے دل ہی دل میں تمنا کی تھی۔ کاش! ماں جی کی طرح ہوتیں۔

اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے والی۔

اس کے لیے پریشان ہونے والی۔

ان کے پاس سے بھی ایسی ہی خوشبو آئے۔

ماتر کی شفقت کی محبت کی

بھلا اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر میں رہے۔

جہاں محبتیں تھیں۔

شفقتیں تھیں پیار تھا۔

مریم نے دل ہی دل میں سوچا اور رخساروں پر پھیلتی شفق اور گہری ہو گئی۔ شہر یار کی نگاہیں بدستور اس کے چہرے پر تھیں۔

”آئی لو یو مریم!“ اس نے سرگوشی کی ”آئی لو یو مریم!“

اس نے اپنی کہنیاں میز پر لگا دیں اور مریم کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا۔ ایک بار ایک بار پھر کہہ دو..... کہہ دو نا مریم کہ تمہیں عینی کی تجویز پر اتفاق ہے۔“

مریم کی نظریں اٹھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”حقینک یو مریم..... حقینک یو..... میں تمہیں بہت بہت چاہوں گا مریم..... ہمیشہ..... میں تمہیں اتنی

خوشیاں دوں گا کہ تمہارا دامن تنگ ہو جائے گا۔ تم مجھ سے کبھی بدگمان نہ ہونا، کبھی.....“

”ہیلو“ لالہ نے اندر جھانکا ”اوہ تو یہاں چائے پی جا رہی ہے۔“ اس نے اندر قدم رکھا۔ چائے کی پیالیوں کی طرف اشارہ کیا اور شرارت سے مریم کو دیکھا۔

مریم جھینپ سی گئی۔

”تم کب آئی ہو؟“

”بس ابھی۔“

”لیکن یہ ملاقات کا تاہم تو نہیں۔“

”نہ سہی۔“ مئی کی مرضی جب ان کا جی چاہا آگئیں۔ میں بھی ساتھ ہوں حالانکہ مئی کا موڈ بالکل نہیں تھا مجھے ساتھ لانے کا۔“

”کیوں؟“ مریم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آج کل مئی سے “کٹی“ ہے۔“

لالہ نے آنکھیں بھیچیں اور پھر شہریار کی طرف دیکھ کر ہنس دی۔

”اچھا ڈاکٹر شہریار، ہم آپ کی مریم صاحبہ کو لے جا رہے ہیں۔“

شہریار مسکرایا۔

”سوچ سمجھ کر بولا کرو لالہ۔“ مریم نے باہر آ کر کہا۔

”کیوں؟ کیا غلط کہہ دیا ہو۔“ مجھے تو کوئی مذاق میں کہہ دے کہ آپ کی لالہ تو میں تو ہواؤں میں اڑتی پھروں۔ ایسا ڈینٹ آدی ہے۔ یہ ڈاکٹر شہریار اور اگر درمیان میں اعزاز کا چکر نہ ہوتا تو میں ڈاکٹر

شہریار.....“

”لالہ کیسی باتیں کرتی ہو تم؟“ مریم نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر شہریار اچھا آدی ہے۔“ لالہ نے رک کر غور سے اسے دیکھا ”اور میرا خیال ہے وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔“

”کچھ نہیں لالہ کچھ بھی تو نہیں۔“ مریم نے گھبرا کر کہا۔

”مجھ سے کچھ مت چھپاؤ جانی۔“ لالہ نے اسے گدگدی کی ”تمہارا انتخاب برا تو نہیں ہے۔“

”لالہ۔“ مریم نے دیوار سے ٹیک لگائی ”تمہیں پتا ہے ناشہریار یعنی کے بھائی ہیں۔ یعنی یعنی کے بابا اور ماں جی اور ان کے گھر کا ہر فرد مجھے بہت عزیز ہے۔ مجھے اس گھر میں تحفظ ملا۔ میرے اندر اتنے جانے والے

تھے اتنا دھواں تھا لالہ کہ کبھی کبھی تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اپنے ارد گرد موجود سارے چہرے نقلی لگتے تھے۔ فریبی اور جھوٹے اور مجھے لگتا تھا جیسے ماما میری سگی ماں نہیں ہیں اور بابا کبھی کبھی مجھے اتنے شرمندہ لگتے

جیسے میں ان کے کسی گناہ کی یادگار ہوں۔ یہ بابا ماں جی اور یعنی ہی تھے جنہوں نے میرے اندر کے جانے

مانی کیے۔ میری آنکھوں کو سمجھا..... اور.....“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے مومو کہ ڈاکٹر شہریار کی فیملی بھی تمہیں چاہتی ہے۔“

”بہت بہت زیادہ۔“ بابا تو مجھے اپنی دوسری بیٹی کہتے ہیں۔“ مریم کے لہجے میں ایک عجیب سی خوشی تھی۔

”ہاں لیکن ایک بات ہے مومو۔ تم اتنی حساس، اتنی نازک سی ہو۔ اپنے گھر اپنی ماما اور اپنے ماحول

سے بہت مختلف سوچ رکھنے والی..... اور تمہاری ماما بے نیچر بالکل میری می جیسی ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ اگر

کبھی ڈاکٹر شہریار نے تمہارا ساتھ چاہا تو تمہاری می انکار کر دیں گی۔“

اب لالہ کو کیا خبر کہ ڈاکٹر شہریار اس کے ساتھ کی خواہش کر بھی چکے ہیں اور وہ زندگی میں اگر کبھی کسی کے ساتھ اور کسی کے گھر خوش رہ سکتی ہے تو وہ ڈاکٹر شہریار اور اس کا گھر ہے۔

”اب دیکھو ماما! میں نے خود تو امتیاز سے شادی کر لی اور مجھے اعزاز سے ملنے نہیں دیتیں۔“ وہ

وہیں کوریڈور میں کھڑی ہو کر باتیں کرنے لگیں ”کہتی ہیں گاؤں کا دیہاتی ہے۔ اپنی کیٹس نہیں آتے۔

ایٹش نہیں ہے۔ مجھ پر پابندیاں لگا دی ہیں۔

مائی فٹ! میں تو مئی سے نکلے سکتی ہوں لیکن تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ تم تو خود ٹوٹ جاؤ گی اور ڈاکٹر

شہریار..... وہ بھی تمہارے جیسا ہی لگتا ہے۔“ اس درگرفتہ است و خوب گرفتہ است والا۔“

”کیا مطلب.....؟“ مریم نے سوالیہ نظروں سے لالہ کو دیکھا۔

”ایک تو تم یہ سانس پڑھنے والے انتہائی بد ذوق ہوتے ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسٹر شہریار بھی

ایسے ہی لگتے ہیں کہ اگر تم سے محبت کرتے ہیں تو تمہارے علاوہ کہیں اور نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھیں گے..... تم

اسے نہیں تو وہ بھی تمہاری طرح ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔“

”خدا نہ کرے۔“ مریم کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

”یعنی دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔“ لالہ زور سے ہنسی۔

مریم سرخ پڑ گئی۔

”خیر اس موضوع پر پھر بات ہوگی۔ چلو می کو ہول پڑ رہے ہوں گے کہ کہیں میں انہیں جل دے کر

بھاگ تو نہیں گئی۔“

لالہ نے اس کا ہاتھ پکڑا ”تمہیں پتا ہے نا“ آج کل مئی نے میرا گھر سے لٹکانا بند کر رکھا ہے۔“ اس نے

عجب سامنے بتایا ”میں آؤں گی کسی دن تمہاری طرف یا پھر فون پر تفصیل سے بتاؤں گی۔“

”لالہ۔“ مریم نے سہم کر اسے دیکھا ”کہیں جذبات میں کچھ غلط نہ کر بیٹھنا۔“

”مثلاً کیا؟“ لالہ نے بھوین اچکا نہیں۔

”جیسے پہلے کر لیتی تھیں۔“

”مومنہ بہت پیاری اور اچھی بیٹی ہے اور جس طرح یہ میرا خیال رکھ رہی ہے۔ شاید کوئی بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔“
مریم کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اندر ہی اندر اس نے اپنے آپ کو بڑا معتبر محسوس کیا۔ پاپا کی اس بات نے ساری زندگی کے گلے دھو دیے تھے۔
”خیر۔“ میڈم نرس نے ایک اچھتی سی نظر مریم پر ڈالی۔
”کی مرضی ورنہ میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ عاشی کو بلوالیں۔“

”نہیں میڈم! اسے ڈسٹرب نہیں کرنا اور مومنو تو میری سب سے پیاری اور اچھی بیٹی ہے۔ ہمدرد اور
تھیں۔“ پاپا کی آنکھیں محبت سے چمک رہی تھیں۔
مریم نے بڑے فخر اور اطمینان سے ان کی طرف دیکھا اور ہولے ہولے سے کندھے اچکائے۔
میڈم کو عادت بنے ناما کی طرح سوئیاں چھوونے کی اور مجھے میڈم کی باتوں کی قطعی پروا نہیں کرنا چاہیے۔
اس نے ایک طرف منہ نہ بچائے بیٹی لالہ کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اسے
اپنی طرف دیکھتے پا کر لالہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا جسے وہ سمجھ نہ سکی۔ البتہ اس کے
ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
”یہ ہماری بیٹی آپ ہی آپ کیوں مسکرا رہی ہے۔“ عثمان احمد کے لہجے میں اس کے لیے بے پناہ
محبت تھی۔

”وہ پاپا لالہ کو دیکھیں تاکسی ناراض اور روٹھی روٹھی سی بیٹھی ہے۔“
”کیوں لالہ بیٹا، ہم سے خفا ہو کوئی خطا ہو گئی ہے ہم سے۔“ عثمان احمد اس کی طرف دیکھنے لگے۔
”نہیں انکل، آپ سے نہیں میں ممی سے خفا ہوں۔“ لالہ کو لگی لپٹی رکھنے کی عادت نہ تھی۔
”ہاں مجھ سے خفا ہے۔ غلطی ہو گئی ہے نا پال پوسل کر بڑا جو کیا ہے۔“ میڈم پھٹ پڑیں۔
”ارے ارے میڈم۔ لالہ بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ آپ یونہی اس سے خفا نہ ہوں۔“ عثمان احمد نے
لالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے عثمان بھائی، اس نے تو مجھے تنگ کر رکھا ہے۔ ماں ہوں اس کی۔ اس کے بھلے کی بات ہی
کر لیں گی۔“

”ممی پلیز! اس بات کو یہاں ڈسکس نہ کریں۔“ لالہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ ”میں جانتی ہوں کہ
بہرحال کس میں ہے اور کس میں نہیں اور مجھے وہی کرنا ہے جو میں خود اپنے لیے بہتر سمجھتی ہوں۔ آپ بس
صرف اپنی فکر کریں۔ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔“

”دیکھا..... دیکھا، عثمان بھائی، یہ میری بیٹی ہے اور مجھے کہہ رہی ہے کہ میں اس کی فکر کرنا چھوڑ دوں۔
اسے روکوں منع کروں اور یہ اس ”ٹنٹ پونچے“ سے شادی کر لے۔ ارے وہ اعزاز..... الو.....“ میڈم

”یعنی خود کشی۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”پہلے تو ڈراما ہی ہوتا تھا خود کشی کا۔ اب جو کچھ بھی کروں گی حقیقت ہوگی۔“
”لالہ پلیز، کچھ مت کرنا۔“ مریم نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
”یار زیہ می ہیں نا، ان کو کچھ نہ کچھ سبق دینا ہی ہے۔“ باتیں کرتے کرتے وہ کمرے کے پاس پہنچی
تھیں۔ ”آؤ۔“ مریم کا ہاتھ ابھی تک لالہ کے ہاتھ میں تھا۔
”السلام علیکم آئی!“

میڈم نرس جو پلیٹ گود میں رکھے بڑی نزاکت سے ایک ایک دانہ انکور کا اٹھا کر منہ میں ڈال رہی
تھیں۔ سر اٹھا کر یوں اسے دیکھا جیسے اچانک ان کے کمرے میں آنے کا پتا چلا ہو حالانکہ جب وہ کمرے
میں داخل ہوئی تھیں تو وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
”پاپا آپ جاگے۔“ مریم آئی نرس کو سلام کر کے ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
”میڈم نے آکر جگایا۔“ وہ مسکرائے۔

”ارے واہ عثمان بھائی! میں نے کہاں چکایا۔ آپ تو خود ہی آنکھیں کھولے دروازے کی طرف دیکھ
رہے تھے۔“ میڈم چمکیں۔
”آنکھیں آہٹ پر ہی کھلی تھیں۔“ عثمان احمد کے ہونٹوں پر ابھی تک بڑی شکستہ مسکراہٹ تھی اور وہ
بہت فریٹ لگ رہے تھے۔ مریم کو بڑا اطمینان ہوا۔

”پاپا! آج تو آپ بالکل صحیح لگ رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بات کروں گی کہ ہمیں اب گھر
جانے دیں۔“

”یہ میڈم کا کمال ہے بیٹا۔ سونے سے پہلے بہت سست ہو رہا تھا لیکن ان کی باتوں نے فریٹ کر دیا۔“
”عثمان بھائی، آپ بھی بتانے لگے۔“ میڈم نے ایک اداسے انہیں دیکھا۔ گود میں رکھی پلیٹ سامنے
پڑی چھوٹی سی ٹیبل پر رکھی اور تنکی نظروں سے مریم کی طرف دیکھا۔ ”اور مومنو تم کہاں تھیں۔ اچھی تیار دار
ہو۔ پاپا کو کیا چھوڑ کر خود گھومتی پھر رہی ہو۔“

”وہ آئی پاپا سوس رہے تھے۔ اس لیے۔“ وہ نام ہی ہو گئی۔

”مریٹس آدمی کا کیا پتا، کب کس وقت اس کی طبیعت خراب ہو جائے۔“ وہ بالکل زہنی کے اشارے
میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور مضطرب سی ہو کر انگلیاں مروڑنے لگی۔

”عاشی یا نیٹا ہوتیں تو وہ کبھی بھی اتنی غیر ذمے داری کا ثبوت نہ دیتیں عثمان بھائی!“ وہ مریم سے
نظریں ہٹا کر عثمان احمد کی طرف دیکھنے لگیں۔ ”میں تو کہتی ہوں عاشی کو بلوالیجیے۔ جب تک آپ کی طبیعت
ٹھیک نہیں ہے۔ زہنی کا تو کچھ پتا نہیں کب آئے۔ شو تنگ کے بعد بھی شاید وہ کچھ دن رہے۔“
”نہیں..... نہیں..... میڈم!“ عثمان احمد نے اپنا بازو مریم کے گرد رکھتے ہوئے اس کا دفاع کیا

نے روانی سے اسے گالیاں دیں۔ عثمان احمد نے گھبرا کر پہلے مریم اور پھر لالہ کی طرف دیکھا۔ لالہ ایک دم سرخ ہو رہی تھی۔

”میڈم..... میڈم پلیز۔“ عثمان احمد نے انہیں روکا۔ ”پلیز میڈم..... سکون سے بتائیں کیا بات ہے۔ لالہ بہت سمجھ دار بچی ہے۔“

انہوں نے غصے سے کہا ”اس کینے نے پھنسا لیا ہے اسے۔“

”مئی پلیز“ گالیاں مت دیں اسے..... اس نے نہیں پھنسا یا مجھے۔“

”سب جانتی ہوں..... سب جانتی ہوں عثمان بھائی۔ اس نے جان بوجھ کر میری بچی کو پھنسا یا ہے۔ ایک بار کہا تھا اس نے کہ میں نے اس کا بھائی جھین لیا ہے۔ وہ مجھ سے میری بچی کو جھین کر انتقام لے رہا ہے۔“

”وہ اتنا گھٹیا نہیں ہے مئی اور اگر گھٹیا ہے تو امتیاز شاہ سے زیادہ گھٹیا نہیں ہے آپ اس سے شادی کر سکتیں ہیں تو میں اس کے بھائی سے شادی کیوں نہیں کر سکتی۔“ لالہ نے اپنا رخ میڈم کی طرف کر لیا۔ مریم بھی سہمی سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”لالہ پلیز۔“ اس نے آہستگی سے کہا لیکن لالہ نے سنا نہیں۔ وہ میڈم کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

”اور آپ پلیز میرے معاملات میں دخل نہ دیں، نہیں تو میں ڈیڈی کے پاس چلی جاؤں گی۔“

”ڈیڈی..... کون ڈیڈی۔“ میڈم نرگس عجیب طرح سے ہنسی ”وہ جاگیر دار..... کیا سمجھتی ہو کہ وہ تمہاری شادی اعزاز سے کر دے گا..... زنداں میں ڈال دے گا تمہیں۔ تمہاری سوتیلی بہنیں اور ماں دس دس گز کی چادریں اوڑھتی ہیں اور اسپتال بھی جانا پڑے تو وہ دو دو کلاشکوف برداران کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ڈیڈی کے پاس چلی جاؤں گی..... یہ..... یہ ڈیڈی کے پاس چلی جائے گی عثمان بھائی۔“ میڈم نرگس نے عثمان احمد کی طرف دیکھا ”بغاوت کرے گی یہ مجھ سے۔ اس دو ٹکے کے چھو کرے کے لیے۔“

”وہ دو ٹکے کا چھو کر انہیں ہے میڈم۔ آپ کے شوہر کا بھائی ہے اور وہ اتنا ہی معتبر اور معزز ہے جتنا آپ کے شوہر ہیں۔“

لالہ ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

”لالہ پلیز۔“ مریم نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما ”یہ کیا جھگڑا شروع کر دیا ہے تم نے۔ پلیز دیکھو باپا تم لوگوں کے آنے سے کتنا ریٹکس ہو رہے تھے۔“

”سوری انکل!“ لالہ نے مڑ کر عثمان احمد کی طرف دیکھا اور پھر میڈم نرگس سے کہا ”میں گھر جا رہی ہوں۔“

”ہاں جاؤ۔ چلی جاؤ۔“ میڈم نرگس نے ہاتھ ہلایا ”بے شک باپ کے پاس چلی جاؤ۔ دیکھ لو وہاں با کر بھی..... یہ جو تم سمجھتی ہو نا کہ وہ تمہاری شادی اعزاز سے کر دے گا تو تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے

کی نہیں کرے گا۔ کبھی بھی نہیں کرے گا وہ تمہاری شادی اس سے۔“

”اچھا۔“ لالہ ان کی طرف دیکھ کر تسخّر سے ہنسی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ”لیکن یہ آپ کا سر درد نہیں ہے۔“

”دیکھا..... دیکھا آپ نے عثمان بھائی اسے۔“ میڈم نے اسے جاتے دیکھا اور پھر نہیں بھیں کر کے رونے لگیں۔

”آئی پلیز۔“ مریم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھی۔

”دیکھ لوں گی..... دیکھ لوں گی میں اسے بھی۔ اس نے ابھی میڈم نرگس کو نہیں دیکھا۔ جیل کوڑوں کے آگے ڈال دوں گی اس کی لاش۔ ایسا عاقب کر داؤں گی کہ پتا نشان تک نہیں ملے گا۔“ وہ روتی ہوئی لالہ کے پیچھے ہی نکل گئیں۔

مریم چند لمحے کمرے کے وسط میں حیران سی کھڑی رہی پھر مڑ کر عثمان کی طرف دیکھا۔

”کیا..... کیا آئی چیج اعزاز کو مرادیں گی؟“

”ارے نہیں۔“ عثمان احمد ہنستے ”یوں ہی غصے میں کہہ رہی ہیں۔ تم بیٹھو یہاں ادھر میرے پاس آکر“

”نچے سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“

”جی۔“ وہ ان کے بیڈ کے پاس اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی۔

مریم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہاتھ نہیں کیوں کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں رہا۔ دل جیسے کسی بھی لمبے ساتھ چھوڑ جائے گا۔“

”نہیں بابا! پلیز ایسی بات نہ کریں۔“ مریم کی آنکھوں میں آنسو آگئے ”آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر شہر پر کہہ رہے تھے معمولی سالی پی پرائلم ہے اور بس۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ہاں شاید۔“ عثمان احمد کے لہجے میں مایوسی تھی ”لیکن بیٹا آنے والے لحوں کی کس کو خبر ہے۔ کل کیا ہوا ہے کون جانتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت ضروری ہوتی ہیں۔“

”جی بابا۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے لیکن دل جیسے سینے کے اندر رتھ رہا تھا۔

یہاں اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہیں اور کس لیے۔

”نہیں..... نہیں بابا کو کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی اور سر اٹھا کر عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ ہولے سے مسکرائے۔

”ڈاکٹر ہادی کہہ رہے تھے کہ معید اور اس کے ڈیڈی کل شام کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔“

”اچھا۔“ اسے خوشی ہوئی۔ یوں جیسے کوئی اپنا بہت مدت بعد آ رہا ہو۔ اب وہ معید بھائی سے بہت

زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے۔“

”آرام ہی تو کر رہا ہوں بیٹا۔“ انہوں نے پیچھے رکھے ہوئے ٹکیے کو سیدھا کیا ”اگر کبھی میں نہ رہوں تو میرے بعد مریم بیٹا! اپنی بہنوں کا بہت خیال رکھنا۔ بہت محبت دینا انہیں۔ نینا اور مورابھی چھوٹے ہیں۔ بہت کم سن ہیں۔ عاشی کے مزاج میں تھوڑی سی خند ہے۔ تم پیار سے محبت سے سمجھایا کرنا۔“ تیمور بہت افسوس سے کہتا تھا۔

مریم سر جھکائے بیٹھی تھی اور آنسو خود بخود ہی اُس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں کو بھگور رہے تھے۔ اچانک ہی اسے کسی انہونی کا احساس ہوا تھا اور دل سینے کے اندر ہی کہیں ڈوب سا گیا تھا۔

”اور بیٹا!“ عثمان احمد نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی ”تم مجھ سے اور اپنی مئی سے اکثر بدگمان رہتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ ہم تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تمہاری مئی تمہیں بے حد چاہتی ہیں اور میں نے..... میں نے کبھی تمہیں عاشق اور نیتا سے کم نہیں چاہا بلکہ شاید ان دونوں سے زیادہ ہی پیاری ہو تم مجھے۔“ اور اس بات کا اور اک تو مریم کو بھی ہوا تھا کہ پاپا اسے کتنا اور کس قدر چاہتے ہیں۔ وہ یونہی ان سے بدگمان رہتی تھی۔

”خدا پاپا کو بہت..... بہت لمبی زندگی دے۔“ اس نے بے آواز دعا مانگی ”اور اب میں پاپا سے کبھی بد گمان نہیں ہوں گی اور می سے بھی نہیں لڑوں گی۔ مہی اور پاپا جو کچھ کہیں گے ان کی بات مانوں گی۔ چاہے وہ بات مجھے پسند ہو نہ ہو پھر بھی۔“ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا اور رخساروں پر ہستے ہوئے آنسوؤں کو پونجھا۔ عثمان احمد سر جھکائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر سر اٹھائے انہیں دیکھتی رہی اور پھر سر جھکا لیا اور دل ہی دل میں ان کی صحت و زندگی کی دعائیں کرنے لگی۔

عثمان احمد کی نگائیں گاہے گاہے مریم کی طرف اٹھتیں۔

سر جھکائے آنسو پوچھتی۔

زیر لب دعا مانگتی۔

یہ مریم کتنی پیاری تھی۔ یہ تو وہ خود ہی جانتے تھے اور اس روز زینب کے اپارٹمنٹ سے نیچے اترتے ہوئے وہ عہد کر چکے تھے کہ زینب کے بچے کو وہ اپنے بچے کی طرح ہی سمجھیں گے اور اسے کبھی احساس نہیں ہونے دیں گے کہ وہ اس کے باپ نہیں ہیں۔

نہیں ان کی بہت ممنون تھی۔

”یقین نہیں آتا کہ آپ جیسے لوگ بھی اس دنیا میں ہیں۔“

”یہ دنیا بڑی وسیع ہے زینی اور یہاں مجھ سے اچھے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ ہوں گے۔“

”سیکن لسی کی اولاد قبول کرنے کا ظرف تو ہر ایک میں نہیں ہوتا عثمان۔“

باتیں کرے گی۔

عاشی کے حوالے سے انہیں تنگ کرے گی۔ کتنے چھپے رستم نکلے یہ ڈاکٹر عبد المعید بھی۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔ اس نے پھر سر اٹھا کر عثمان احمد کی طرف دیکھ کر اپنی بات کر کے وہ جانے کیا سوچنے لگے تھے۔

”آپ کیا سوچ رہے ہیں پایا؟“

”ہاں۔“ وہ چونکے ”کچھ نہیں بس یوں ہی سوچ رہا تھا کہ یہ بہت اچھا ہوا کہ معید آرہے ہیں۔“

کیا انکل ہادی نے ڈاکٹر معید اور عاشی کی بات پایا سے کر دی ہے۔ مریم نے سوچا۔

”ڈاکٹر ہادی نے مجھ سے عاشی اور معید کے لیے بات کی تھی۔“ عثمان احمد نے جیسے اس کی سوچ بڑھ لی تھی ”لیکن میں نے تمہاری مہی سے بات نہیں کی تھی۔ معید بہت سمجھ دار اور محبت کرنے والا لڑکا ہے۔ ذمہ دار اور شفیق۔“ انہوں نے پر خیال نظروں سے مریم کی طرف دیکھا۔

”جی پاپا۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئی ”معیذ بھائی بہت اچھے ہیں..... اور وہ۔“

”میری اور ہادی کی خواہش تو تھی کہ.....“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سرکوشی کی اور بات ادھوری چھوڑ کر مریم کی طرف دیکھا۔ ”یہ..... یہ ڈاکٹر شہریار کے گھر والے کیسے لوگ ہیں۔“

”بہت..... بہت اچھے۔ بابا اور ماں جی تو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

ہیں مجھے۔“ اس نے خوش ہو کر بتایا۔

”کسی دن انہیں ملو اور نا مجھ سے۔“

”جی پاپا۔ وہ ابھی تو گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ یعنی کے چاچو وہاں گاؤں میں اسپتال بنوا رہے ہیں۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو ضرور آپ کی مزاج چرسی کے لیے آتے۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوتے پاپا۔“

”ہماری بیٹی ان سے مل کر خوش ہوتی ہے تو پھر ہم بھی یقیناً خوش ہوں گے۔ وہ جب بھی آئیں ان کے ساتھ مجھ سے ضرور ملوانا۔“

”جی پاپا۔“ مریم نے سائیڈ ٹیبل سے سیب اٹھایا ”آپ کے لیے سیب کاٹوں۔“

”نہیں، اس وقت تو کچھ جی نہیں چاہ رہا۔“

”تو پھر آپ لیٹ جائیں نا۔ اتنی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ تھک جائیں گے۔“ اس نے سب سے پہلے کہا۔

”نہیں میں باگ“

”باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں پایا۔ آج آپ نے بہت باتیں کی ہیں اور ڈاکٹر رافع کہتے ہیں کہ آپ کروں گا۔“

”جب آدمی کسی سے محبت کرتا ہے تا زنی تو اس سے وابستہ ہر شے ہی اسے پیاری ہوتی ہے۔ یہ آنے والا بچہ تو تمہارے ہی وجود کا حصہ ہوگا پھر مجھے کیوں نہ پیارا ہوگا۔“

لیکن ان یقین دہانیوں کے باوجود وہ کبھی کبھی بدگمان ہو جاتیں اور شدید ڈپریشن کا شکار ہو کر سر درو میں مبتلا ہو جاتیں۔ ایسے میں انہوں نے کتنا خیال رکھا تھا زینی کا۔

”میں پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ نہیں ضرورت ہے مجھے اس کی۔“ وہ غصے میں کہتی۔

چنانچہ کیوں ان کے ذہن میں یہ بات ہرگز رتے دن کے ساتھ پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ جب یہ بچہ دنیا میں آئے گا تو عثمان احمد جو انہیں پروپوز کر چکے ہیں اپنی بات سے منکر ہو جائیں گے۔

لیکن انہوں نے تو ہر طرح ان کا دھیان رکھا تھا۔ ان کے ساتھ اسپتال جاتے۔ ہر روز ان کے اپارٹمنٹ میں گھنٹوں بیٹھے انہیں تسلیاں اور دلا سے دیتے رہتے اور پھر جب وہ پیدا ہوئی تو ایک لمحے کے لیے بھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے۔

گلابی سی سلولائیڈ کی گڑیا جیسی۔

بے اختیار ہی انہوں نے اسے چوم لیا تھا۔

”ارے ہماری بیٹی کتنی پیاری ہے۔ دیکھتا تم نے زینی۔“

اور ننب چور نظروں سے انہیں پیار کرتا ہوا دیکھتی رہی تھیں۔

اور پھر اس کے بعد جب وہ نکاح کر کے ننب کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ مریم ان کی بیٹی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نینا اور عاشر کی پیدائش کے بعد بھی نہیں۔ انہوں نے کبھی تینوں میں فرق محسوس نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی کو معلوم تھا کہ مریم ان کی نہیں، سکندر ملک کی بیٹی ہے۔

”ہاں ایک بار جب عاشر پیدا ہوئی تھی تو نہ جانے کیوں ننب عثمان احمد نے میڈم زمرس کو اور جتنی حیدر کو بتا دیا تھا کہ مریم عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے اور کتنے ہی دن تک عثمان احمد اس بات پر ننب سے خفا رہے تھے۔“

”آخر یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی، جتنی اور میڈم سے۔ کیا تمہیں میری محبتوں پر شک ہے زینی!“

وہ بہت دل گرفتہ سے ہو رہے تھے ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا زینی۔“

کتنے ہی دن انہیں اس کا ملال رہا تھا لیکن نہ میڈم زمرس نے اور نہ ہی جتنی نے کبھی اس بات کو دہرایا تو وہ بھی اس بات کو ہولے ہولے بھول گئے تھے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی مریم جوں جوں..... بڑی ہو رہی تھی ننب عثمان ان کی شفقتوں اور محبتوں سے چڑنے لگی تھیں۔ مریم کی طرف ان کا ذرا سا التفات بھی ان

سے براہ راست نہ ہوتا تھا اور وہ بلاوجہ ہی مریم سے الجھ پڑتی تھیں نہ جانے کیا تھا ان کے ذہن میں۔ شاید وہ مریم پر عثمان احمد کا کوئی حق نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں افسردہ ہوتے رہتے تھے اور غیر ارادی طور پر ہی اس سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔ عجیب بات تھی اتنے سالوں میں رفاقت کے باوجود وہ زینی کو نہیں سمجھ سکے تھے اور اس کی بل بل بدل جانے والی کیفیت سے ہر سال رہتے تھے۔

”پاپا! مریم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر رکھا۔ ”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں، یونہی بس تمہاری ماما کے متعلق سوچ رہا تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”کیا آپ انہیں مس کر رہے ہیں پاپا؟“

”ہوں.....“

”تو پھر بلا لیں نا انہیں۔“

”آجائیں گی، بس کچھ دنوں کی تو بات ہے۔“

”پاپا! آپ کسی روز میری بات بھی ماما سے کروادیں نا۔ بہت اداس ہو رہی ہوں ایسا لگتا ہے..... جیسے ماما کو یہاں سے گئے صدیاں بیت گئی ہوں۔“ اس نے لاڈ سے کہا۔

”اچھا گھر جا کر بات کرادوں گا لیکن پہلے پراس کر دو کہ اتنی دور نہیں پریشان نہیں کرو گی۔ کوئی فضول بات نہیں ہوگی۔ تمہاری ماما نے تمہاری شکایت کی تھی مجھ سے کہ پچھلی بار تم نے انہیں بہت ڈسٹرب کیا تھا رو رو کر۔ بیٹا! پاپا کی صحت کی دعا مانگتے ہیں روتے تھوڑا سی ہیں۔“

”جی پراس پاپا! میں ماما سے آپ کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کروں گی کہ وہ پریشان ہو جائیں۔“

”اور دیکھو.....“ انہیں اپنی ادھوری بات پھر یاد آ گئی ”کبھی زندگی میں اچانک تم پر کوئی مشکل وقت آ گیا اور ماما تمہارے پاس نہ ہوئیں تو حوصلے سے کام لینا اور.....“

”پاپا پلیز!“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی ”بس اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ آپ لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔“ اس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

”مومو بیٹا!“ انہوں نے آہستگی سے اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹا دیے ”بیٹا کرنے دو مجھے باتیں۔ بہت کچھ کہنا ہے مجھے تم سے..... بہت کچھ سمجھانا ہے تمہیں۔ چنانچہ کیوں مجھے خوف آتا ہے..... جیسے میں نہ رہا تو تم سب اکیلے رہ جاؤ گے۔ جیسے زینی تم سب کی حفاظت نہ کر سکیں گی۔ اگر کبھی ایسا وقت آجائے تو مریم بیٹی! آپ نے خیال رکھنا ہے اپنے بہن بھائیوں کا۔ آپ نے.....“

عثمان احمد کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی تھی تو مریم کا جی چاہا وہ زور زور سے جھپٹیں مار مار کر رونا شروع کر دے اور پاپا کو منع کر دے کہ وہ ایسی باتیں نہ کریں نہیں تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ کیوں کر رہے ہیں وہ ایسی باتیں.....؟ لیکن اس نے اپنے آنسوؤں کو بہ مشکل روکا اور عثمان احمد کے ہاتھ مضبوطی

سے تھام لیے۔

”آپ کو کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ اور میں آج آپ کی اور کوئی بات نہیں سنوں گی۔ آپ اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آئیں گے تو پھر ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ میں بھی فارغ ہوں۔ عاشیٰ نینا اور مور کی بھی چھٹیاں ہو جائیں گی۔۔۔۔۔ پھر خوب سارا گھومیں گے اور بہت ساری باتیں کریں گے اور پھر پاپا میں آپ سے آپ کے والدین کے آپ کے بہن بھائیوں کے متعلق پوچھوں گی کہ وہ سب آپ سے کیوں شناختیں؟ کہاں ہیں وہ سب پاپا! آپ مجھے سب کے متعلق بتانا۔ اپنے بچپن کی اپنے لڑکپن کی باتیں۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت آپ بہت تھک گئے ہیں۔ آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے تھوڑا سا سوپ گرم کر کے لاتی ہوں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔!“ عثمان احمد کے اندر بھی جیسے ایک دم ٹھنک اتر آئی تھی۔ یہ میرے کیا کردار تھے۔

ہاں عبدالرحمن تھا، چھوٹا بھائی، اور اس نے ساتھ ہی جانے لیا اور لون یاد آ گیا تھا۔ باباجان جن کے جنازے میں بھی وہ شرکت نہ کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے چار دن بعد شئی انہیں بتا رہا تھا کہ وہ وفات پا گئے۔۔۔۔۔ اور وہ کتنے بے چین ہوئے تھے، کس قدر تڑپ تڑپ کر روئے تھے۔

کتنی بڑی سزا دی تھی باباجان نے انہیں اپنے آپ سے یوں الگ کر کے۔ اور جس کے لیے انہوں نے یہ سزا جھیلی تھی، اس نے کبھی مخلص دوست بن کر ان کے دخول پر مزم تک نہیں رکھا تھا۔

شاید وہ صرف لینا جاتی تھیں۔

اس روز وہ منشی سے ہی کتنا جھگڑے تھے ”بابا نے منع کر رکھا تھا تو تم ہی جتا جاتے“ آخری بار چہرہ ہی دیکھ لیتا۔“

کبھی وفاداریاں تھیں یہ کہ باباجان نہیں رہے تھے پھر بھی ان کے حکم کی تعمیل کی گئی تھی۔۔۔۔۔ اور ایک نرسب تھیں ان کا دل ابھلے ہوئے ہوا تھا اور میڈم نرس کے ساتھ جیم خانہ چلی گئی تھیں۔ کتنی ضرورت تھی اس وقت انہیں نرسب کی رفاقت اور تسلیوں کی۔

اور وہ کتنی ہی دیر تک بچوں کے کمرے میں بیٹھے خاموش آنسو پیتے رہے تھے۔ کتنی بار دل چاہا تھا کہ وہ انہیں گلے سے لگا کر روئیں اور انہیں بتائیں کہ بچو تمہارے دادا جان اس دنیا سے چلے گئے۔

ان کے اندر کا کرب ان کے چہرے پر اُٹھ آیا۔

”پاپا! مریم بہت غور سے ان کے چہرے کے بدلنے رنگوں کو دیکھ رہی تھی اس نے ان کے ہاتھوں کو چھوڑ دیا اور تکیہ درست کر کے رکھا ”بس اب آپ لیٹ جائیں میں ابھی آتی ہوں۔ سوپ گرم کر

لاؤں۔۔۔۔۔ پھر میں آپ کو اپنے کالج کی باتیں بتاؤں گی، بہت مزے کی۔ ہماری ایک میڈم تو پوپا ایک لطیفہ ہیں۔“ اس نے بچوں کی طرح انہیں بہلایا تو وہ مسکرا دیے۔

”کس قدر مختلف ہے یہ اپنی ماں سے۔“ انہوں نے سنا چا اور تکیے پر سر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”بہن! ایک بات یاد رکھنا میری۔ کبھی ’ایک بارہ باہر‘ نہ آئے۔“

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ بات ابھری۔ ”مریم! مریم! مریم!۔۔۔۔۔“

دیکھا۔ دستک دے کر مجتبیٰ حیدر اندر آ گئے تھے اور ان کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ شاید پاپا کا کوئی جاننے والا مریم، مجتبیٰ حیدر کو سلام کر کے بیڈ کے پاس سے ہٹ کر لحد بھر کور کی اور پھر باہر نکل آئی۔

”السلام وعلیک عثمان صاحب!“ مجتبیٰ حیدر ہاتھ بڑھائے اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں کہتے ہوئے ان کے بیڈ کی طرف بڑھے۔ عثمان تکیے سے سر اٹھائے، کہنیاں ٹیکے ان سے پیچھے دیکھ رہے تھے

دھڑ۔۔۔۔۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ انہوں نے مجتبیٰ حیدر کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایک ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے

دھک۔۔۔۔۔ دھک۔۔۔۔۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور نگاہیں مجتبیٰ حیدر کے ساتھ آنے والے کے چہرے پر دیوانہ وار ٹار ہو رہی تھیں اور دل کی ہر دھڑکن ایک ہی نام الاپ رہی تھی۔۔۔۔۔ عادل۔۔۔۔۔ عادل۔۔۔۔۔ عادل۔

انہیں مجتبیٰ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔

وہ بلاشبہ عادل ہی تھا۔

ان کا بیٹا۔

ان کا جگر گوشہ۔

جسے انہوں نے ہر لمحہ یاد کیا۔

بالکل وہی شریقی آنکھیں۔

باباجان کی طرح ان میں ذرا سے غصے پر سرخ سرخ سے ڈورے تیرنے لگتے تھے۔

اور باقی کے سارے نقوش بھی خود ان کی جھلک لیے۔ ان ہی کی طرف دیکھتا ہوا خاموش کھڑا وہ عادل ہی تو تھا۔ باباجان اکثر کہا کرتے تھے ”آنکھوں کے علاوہ یہ سارے کا سارا عثمان پر گیا ہے۔ دیکھ لینا۔“

بڑا ہو کر اس کی ہی کاپی ہو گا۔“

”عادل۔۔۔۔۔ عادل! میرے بیٹے!“ وہ بے آواز پکار رہے تھے۔ ان کے لب ہولے ہولے کان پر رہے تھے اور آنکھوں کے آگے دھند سی چھائی جا رہی تھی۔

”عثمان! رینکس۔“ مجتبیٰ حیدر نے ان کی کیفیت محسوس کر کے آگے بڑھ کر ان کے کندھے

ہاتھ رکھا۔

انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجتبیٰ حیدر کی طرف دیکھا اور پھر یکدم بیڈ سے اتر کر دونوں ہاتھ پھیلائے بے تابانہ کچھ فاصلے پر ساکت کھڑے پروفیسر عادل کی طرف بڑھے۔ ان کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پروفیسر عادل نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور ان کے اندر سے جیسے کوئی سیال مادہ پھیل پھیل کر باہر آنے لگا۔ لمحہ بھر وہ لب بھینچے یونہی کھڑے ان کے پھیلے بازوؤں کو دیکھتے رہے پھر یکدم خود بھی بازو پھیلائے اسی بے تابی سے ان کی طرف بڑھے۔ مجتبیٰ حیدر ایک طرف کھڑے باپ بیٹے کا ملاپ دیکھ رہے تھے۔

عثمان احمد کے آنسو عادل کے کندھوں کو بھگور رہے تھے اور پروفیسر عادل ان کے سینے سے لگے جیسے برسوں کی پیاس بجھا رہے تھے۔

”یہاں کا بیٹا تھا۔ اتنا توانا اتنا مضبوط اور پھر پور جوان۔“ عثمان احمد نے انہیں بازوؤں میں بھینچے بھینچے سوچا۔ اور انہیں ایک دم اپنے وجود میں توانائی سی محسوس ہوئی۔ جیسے اس کی موجودگی میں ان کا کمزور دل سنبھل جائے گا جیسے وہ ایک دم بہت توانا اور مضبوط ہو گئے تھے۔ انہوں نے اور زور سے اسے اپنے ساتھ بھینچا۔ پروفیسر عادل کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی عثمان احمد کے سینے سے لگے ان کے وجود کی خوشبو اپنے اندر اتارتے رہیں..... لیکن یکا یک انہیں محسوس ہوا جیسے عثمان احمد کے بازوؤں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہو گھر اگر دونوں بازوؤں سے انہیں تھامے ہوئے وہ پیچھے ہٹے تو عثمان احمد کا رنگ بے حد زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

بہت پریشان ہو کر انہوں نے مجتبیٰ حیدر کو آواز دی اور انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں لے کر بیڈ پر لٹا دیا اور مجتبیٰ حیدر کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکے تاکہ کسی ڈاکٹر کو بلا سکیں۔



بعض باتیں اتنی اچانک نہ ہوتی ہیں۔ وہی دن وہی صبح سوچا رہا تھا کہ یہ کیا ہو گا۔

نہ بولا کے ڈانٹنگ ہال میں ادھر ادھر بے چینی سے ٹپکتے ہوئے پروفیسر عادل یہی سوچ رہے تھے کہ یہ اچانک کیا ہو گیا اور کیسے؟ اس روز وہ مجتبیٰ حیدر کے ساتھ آنے کو تو آگئے تھے لیکن راستہ بھرا بجائی کیفیتوں میں گھرے رہے تھے۔ کبھی ان کا دل جی چاہتا وہ مجتبیٰ حیدر سے معذرت کر کے رستے سے ہی پلٹ جائیں۔ زندگی تو یوں ہی تشکر گر گئی اب دریا کنارے پہنچ بھی گئے تو کیا صدیوں کی پیاس بجھ پائے گی یا ٹھنکی اور بھی بڑھ جائے گی؟ کبھی انہیں مسرور کا خیال آتا۔

اس کی باتیں یاد آتیں۔

اس کے رویے اور اس کی سوچ۔

تو وہ سوچتے مسرور کے والد کی طرح قصور وار تو ان کے والد بھی ہیں پھر ان کے ذاتی رویے میں کیا تبدیلی ہوئی ہو گی؟

جیسا کہ اس کی زندگی میں موجود عثمان احمد کی وہ محبتیں تھیں جو انہوں نے اسے دی تھیں اور جنہوں نے ان کے اندر عثمان احمد کے لیے ایک نرم گوشہ ہمیشہ رکھا۔ کبھی کبھی بے حد شرب ہو جانے کے باوجود بھی وہ ان سے نفرت نہیں کر سکتے تھے۔ اور کبھی وہ سوچتے۔

بیٹے کی حیثیت سے نہ سہی ایک انسان کی حیثیت سے بھی ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کی خواہش کا احترام کریں جو اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔

مجتبیٰ حیدر کے الفاظ ان کے اندر گونجنے لگتے اور دل کو جیسے کوئی دکھ بھرا احساس اپنی گرفت میں لیتا اور ہولے ہولے بھینچتا۔

اور اندر ہی اندر کاٹا ہوا احساس۔

راستے بھر مجتبیٰ حیدر نہ جانے کون کون سی کہانیاں سناتے رہے تھے۔ ان کے پلے تو ایک لفظ بھی نہیں پڑا تھا۔

شاید وہ اپنے سری لنکا میں دوران قیام ملنے والی کسی دو شیزہ کا قصہ سن رہے تھے۔ مگر وہ تو مکمل طور پر ارد گرد سے بے گناہ اپنے اندر کھوئے ہوئے تھے۔

”کہاں ہو یا؟“ انہیں غلط جگہ گاڑی پارک کرتے دیکھتے ہی حیدر نے ٹوکا تو وہ چونکے۔

انہیں اس کیفیت میں گاڑی ڈرائیو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو غنیمت تھا کہ اس وقت ٹریفک کم تھا اور کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔

”کیا اس حسن دلاویز کے تصور میں تھے؟“ مجتبیٰ حیدر ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر رہے تو انہوں نے بے حد شرم کی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کیسے ادب ہیں مجتبیٰ حیدر جوان کی اس وقت کی کیفیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ادیب کا ہاتھ تو زندگی کی نبض پر ہوتا ہے اور وہ زندگی کی دھڑکنیں گنتا ہے اور مجتبیٰ حیدر ان کی کیفیت کا ادراک نہیں کر پا رہے ہیں اور اگر پاتے تو اس طرح راستے بھریو لے نہ آتے۔“

وہ بیان کی بات کا جواب دیے خاموشی کے ساتھ ان کے ساتھ چل پڑے دل کسی ضدی بچے کی طرح سینے کے اندر چل رہا تھا۔ یوں جیسے وہ اپنے والد سے ملنے نہیں جا رہے ہیں بلکہ پہلی بار درمجبوب پر حاضری دینے جا رہے ہوں۔ اپنے پچھلے دل کو سنبھالے وہ لمحہ بھر وہیں رک گئے تھے جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے



بجلی سی کوندی تھی۔ بیڈ کے ساتھ کھڑی لڑکی پر انہیں اس کا گمان ہوا تھا..... مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے سر جھٹک کر بیڈ پر موجود شخص کی طرف نگاہیں اٹھائی تھیں اور پھر ان کی نگاہیں وہیں ٹھہری گئی تھیں اور وہ جو کوئی بھی تھی ان کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئی تھی۔ شاید یہ ابھی کچھ دیر پہلے بجلی کی کبھی گئی بات کا اثر ہے کہ انہیں اس لڑکی پر اس کا گمان ہوا جو اسپتال روانہ ہونے سے کچھ دیر پہلے تک ان کے قصور کی دنیا..... آباد کیے ہوئے تھی۔

اندر ہی اندر انہیں خیال سا زرا تھا۔ وہ بیڈ سے کچھ فاصلے پر ساکت کھڑے عثمان احمد کو دیکھ رہے تھے جن کے لب کانپ رہے تھے اور سکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ خود ان کے اندر جیسے آنسوؤں کا ریلو سا اندر ہا تھا اور وہ بڑے ضبط سے اپنی جگہ مضبوطی سے قدم زمین پر جمائے کھڑے تھے۔

یہ وہ شخص تھا۔ جس نے انہیں اپنی شفقتوں سے محروم رکھا تھا۔ بابا جان اور ماں جی کی بے تحاشا محبتوں کے باوجود کبھی کبھی تشنگی وجود کو صحراب بنا دیتی تھی۔ جیسے وہ برسوں سے پیاسے لقمہ و دق صحرا میں سفر کر رہے ہوں اور دور و نزدیک کہیں کوئی چشمہ نہ ہو جو عمر بھر کی تشنگی ختم کر دے۔

کہیں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی جیسے زندگی میں بہت کچھ کمی تھی۔ صرف ایک اس شخص کے نہ ہونے سے۔ کتنے خلا تھے..... اور کتنی پیاس تھی ان کے اندر۔

شدید پیاس سے جیسے ان کا حلق خشک ہو گیا تھا اور ہونٹ ترخنے لگے تھے۔ اندر چشمے ابل رہے تھے اور حلق میں کانٹے پڑے تھے۔ انہوں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے عثمان احمد کی طرف دیکھا جو بازو پھیلائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پھر جیسے ضبط کی طنابیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھیں اور اندر ابلتے چشمے باہر آنے کو بے تاب ہو گئے تھے۔

وہ بھی بازو پھیلائے والہا نہ ان کی طرف بڑھے تھے۔ اس لمحے انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ کوئی ناراضی، کوئی گدہ، کوئی خشکی۔

بس وہ ان کے سینے سے لگے صدیوں کی پیاس بجھا رہے تھے۔ کیسی شفیق خوشبو تھی جو انہیں اندر باہر



سے ہر اب کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کیفیت میں مزید گزر جاتی کہ انہیں احساس ہوا کہ عثمان احمد ہوش کھوتے جا رہے ہیں۔ انہیں سینے پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ ڈیوٹی پر موجود کسی ڈاکٹر کی تلاش میں باہر بھاگے تھے۔

عثمان احمد کا کمزور دل اس خوشی کو جو بالکل اچانک ملی تھی، سہا نہیں پایا تھا۔ بہت دیر تک ان کی نبض نارمل نہیں ہوئی تھی اور دھڑکنیں معمول پر نہیں آئی تھیں اور وہ جوان کی پٹی سے بول لگے بیٹھے تھے جیسے وہ آج اتنے برسوں بعد ان سے نہیں ملے بلکہ ہمیشہ سے ان کے ساتھ تھے۔

اور درمیان میں کوئی دوریاں نہیں تھیں۔ کبھی وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اور کبھی پیشانی پر ہاتھ رکھتے۔

کبھی بے چین ہو کر پائنتی کی طرف جاتے اور ان کے ٹھنڈے پاؤں اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر گرم کرنے کی کوشش کرتے اور سر ہانے کھڑے شہر یار سے پوچھتے۔

”شہر یار! یہ..... یہ..... خطرے کی کوئی بات نہیں ہے نا؟ یہ پاؤں اتنے ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں؟“ شہر یار جو ان کے اس اضطراب پر اور بے چینی پر خود کچھ حیران سا تھا، انہیں تسلی دیتا۔ ”نوسر یہ اچانک بی پی لو ہو گیا تھا اس وجہ سے پاؤں ٹھنڈے ہو گئے ہیں لیکن اب بہتر ہو رہا ہے۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے..... حالانکہ کل تک ان کا بی پی اچانک ہائی ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ اس لیے انہیں گھر نہیں بھیج رہے تھے۔“

”یہ پروفیسر عادل ہیں۔“ شہر یار نے چپکے سے مریم کو بتایا ”اور یہ بہت شفیق اور ہمدرد دل رکھتے ہیں۔ تم نے دیکھا، انکل کے لیے کتنے پریشان ہو رہے تھے۔“

عثمان احمد زرد چہرے کے ساتھ آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ انہیں ٹریٹ منٹ دے دی گئی تھی۔ شہر یار ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے باوجود مریم کے خیال سے وہیں تھا۔

پروفیسر عادل جب ڈیوٹی روم سے ڈاکٹر رب نواز کو بلا کر لائے تھے تو وہ کوریڈور میں کھڑا مریم سے پوچھ رہا تھا کہ وہ باہر کیوں گھوم رہی ہے؟ اور مریم اسے جتنی حیدر اور ان کے ساتھ آنے والے انجینیئر شخص کے تعلق بتا رہی تھی۔

”بس مجھے جھگ سی ہو رہی تھی۔ شاید وہ انکل یا پاپا کے کوئی جاننے والے ہیں لیکن میں انہیں نہیں جانتی۔“

ڈاکٹر رب نواز نے پاس سے گزرتے ہوئے بتایا تھا ”عثمان صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔“ اور وہ دونوں ہی ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں آئے تھے۔

اور تب سے اب تک شہر یاد وہیں تھا۔ ڈاکٹر ب نواز کچھ دیر پہلے ہی مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔ مریم ایک طرف سبھی سی کھڑی تھی حالانکہ اس کا کتنا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پاپا کے پاس ان کے سامنے بیٹھ کر انہیں دیکھتی رہے لیکن وہاں تو پروفیسر عادل بیٹھے تھے۔ ان کی نبض پر ہاتھ رکھے جیسے وہ ڈاکٹر ہوں۔

”شہر یار تم بالکل مطمئن ہوتا؟“ انہوں نے نبض پر ہاتھ رکھے پھر پوچھا۔

”جی سر۔ کم از کم اس وقت کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ تمام سسٹم بالکل صحیح کام کر رہے ہیں۔ ابھی ڈاکٹر ب نواز نے بتایا تو ہے کہ ہارٹ بیٹنگ بالکل نارمل ہے۔“

انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر مجبئی کی طرف دیکھا جو قریب ہی بیٹھے تھے۔ دل بہت گداز ہو رہا تھا۔ ابھی تو انہوں نے جی بھر کر ان سے باتیں بھی نہیں کی تھیں۔

ابھی تو انہیں ان سے بہت سارے گلے کرنے تھے۔

گزرے ماہ و سال کا حساب لیتا تھا۔

اپنے متعلق بتاتا تھا۔

اپنے خسارے اور نقصان گنوا رہے تھے۔

کابل کا بتاتا تھا۔

اور یہ کیا ہو گیا کہ عثمان احمد ہمت ہار بیٹھے تھے۔

مجبئی حیدر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں آنکھوں میں انہیں تسلی دی جیسے وہ ان کی دلی کیفیت سمجھ رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی۔ مجبئی حیدر سے اپنی کیفیت چھپانے کے لیے انہوں نے رخ پھیرا تو نگاہ مریم پر پڑی۔

”یہ۔“ وہ چونکے۔

تو وہ جو آنے پر انہیں اس کی موجودگی کا گمان ہوا تھا تو وہ غلط نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ موجود تھی۔ یہاں۔۔۔۔۔ اس جگہ۔۔۔۔۔ کون ہے وہ؟ کیا رشتہ ہے اس کا عثمان احمد سے۔۔۔۔۔ کیا کوئی ڈاکٹر شہر یار کی کوئی عزیز۔۔۔۔۔!

لحمہ بھر کے لیے ان کی نظروں نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیا اور پھر فوراً ہی وہ عثمان احمد کی طرف متوجہ ہو گئے جنہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں پلیز آپ لیٹے رہیں۔“ شہر یار نے اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھا۔ ان کی نبض چیک کی۔ بلڈ پریشر دیکھا اور پروفیسر عادل کی طرف مڑے ”اپوری تھنک از اوکے۔“

پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی اطمینان بھری مسکراہٹ آگئی اور وہ ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھوڑا سا ان کی طرف جھکے۔

”اب اس وقت آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

عثمان احمد کی نظریں ان کے چہرے پر دیوانہ وار شمار ہو رہی تھیں اور آنکھوں کے کونوں میں آنسو اکٹھے ہو رہے تھے۔

انہوں نے انگلی کے پوروں سے آنسو پونچھے۔

مریم نے ایک قدم آگے بڑھایا تب ہی وارڈیو آئے نے اندر جھانکا۔

”آپ کا فون ہے لندن سے کال ہے۔“

”ماں کا فون۔“ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

فون کی اچانک تیل سے ڈسٹرکشن ہوتی تھی۔ کتنی دیر تک عثمان احمد کے دل کی دھڑکنیں نارمل نہیں ہوتی تھیں چنانچہ آج صبح ہی فون ان کے کمرے سے اٹھایا گیا تھا۔

”عادل۔۔۔۔۔ عادل! تم یہاں ہونا؟“ عثمان احمد نے ان کے ہاتھ تھام لیے ”تم یہیں رہنا میرے

پاس۔ اب مجھے اکیلا مت کرنا۔ چھوڑ کر مت جانا۔“

”میں۔۔۔۔۔ یہیں ہوں۔۔۔۔۔“ انہوں نے تسلی دی۔

ڈاکٹر شہر یار نے انہیں انجکشن لگایا۔

”ان کے لیے آرام اور سکون بے حد ضروری ہے۔ ابھی کچھ دیر تک یہ سوچائیں گے۔“

پروفیسر عادل نے سر ہلایا اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔ مریم جا چکی تھی۔ تو کیا یہ ان کا تصور ہے جو بار بار

انہیں اس کے سامنے لاکھڑا کر دیتا ہے اور یہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

وہ پھر عثمان احمد کی طرف متوجہ ہو گئے جن کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

عثمان احمد جلد ہی سو گئے تھے۔ وہ مجبئی حیدر کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا وہ آج

یہیں رک جائیں۔

عثمان احمد کے سامنے بیٹھے انہیں دیکھتے رہیں محسوس کرتے رہیں۔ وہ کھڑے کھڑے انہیں دیکھ

رہے تھے۔ مجبئی حیدر نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

”آئیے چلتے ہیں اب آپ کا تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہماری خبر گیری کے لیے بیگم تیار بیٹھی ہوں گی۔“

”اب یہ آرام سے سوتے رہیں گے۔“ شہر یار نے انہیں تسلی دی۔

”آر یو شیور؟“ پروفیسر عادل نے شہر یار کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ تب ہی

ایک نرس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”ملاقات کا نام ختم ہو گیا ہے۔ پلیز کمرہ خالی کر دیں۔ ڈاکٹر رافع راؤنڈ پر آرہے ہیں۔“ وہ تیز تیز

کتنی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

پروفیسر عادل نے پھر ایک نظر عثمان احمد کے چہرے پر ڈالی اور مجبئی حیدر کے ساتھ باہر نکل آئے۔

بی آپا کسی سے بات کریں۔

انہیں بتائیں کہ وہ عثمان احمد سے ملے ہیں۔

اور عثمان احمد.....!

کاش، کاش ہی کسی قابل ہوتا تو وہ اپنی کیفیات اس کے ساتھ شیئر کرتے۔

وہ اس وقت اپنے آپ کو ایک کم عمر لڑکے کی طرح محسوس کر رہے تھے۔

ساری رات وہ مضطرب رہے اور جاگتے رہے۔

کبھی لیٹ جاتے کبھی اٹھ جاتے اور کبھی سگریٹ سلگا کے کمرے میں ٹہلنے لگتے۔

رات بھر میں نہ جانے انہوں نے کتنے سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ صبح کی اذان ہوئی تو بے حد تھکے

تھے اور بڑھال سے وہ جائے نماز پر آکھڑے ہوئے۔

سجدے میں گر کر عثمان احمد کی زندگی کی دعا مانگتے ہوئے۔ کل کے رکے ہوئے آنسو بے اختیار پکڑوں

کا بند توڑ کر باہر آنکھوں سے جیسے دل پر دھرا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا

تو انہیں اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگا۔

ہاتھ لے کر وہ باہر نکلے تو طبیعت کا اضطراب بہت حد تک ختم ہو چکا تھا اور وہ خود کو خاصا پرسکون محسوس

کر رہے تھے۔ خدا بخش حسب معمول اٹھ چکا تھا۔

اس نے انہیں تیار ہو کر باہر آتے دیکھا تو ان کی طرف لپکا۔

”آپ آج اتنی جلدی اٹھ گئے؟“

”ہاں۔“ انہوں نے خدا بخش کی طرف دیکھا ”ایک کپ چائے بنا دو مجھے۔ کہیں جانا ہے۔“

”کہاں؟ حویلی میں تو سب خیریت ہے نا؟“

”سب خیریت ہے۔“

ان کا جی چاہا وہ خدا بخش کو عثمان احمد کا بتا دیں۔ وہ تو اکثر ان کا ذکر کرتا تھا اور انہیں یاد کرتا تھا لیکن پھر

نہ جانے کیا سوچ کر وہ خاموش ہو گئے۔

”ناشتا بھی بنالاولں؟ رات بھی آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔“

”نہیں بس چائے۔“

”اچھا جی!“ خدا بخش نے ایک نظر انہیں دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ”عجب آدمی ہیں اپنی صحت کی تو

پرہیزی نہیں ہے..... بس اب پتا نہیں صبح اٹھ کر بغیر ناشتے کے کہاں چلے ہیں.....؟“

اس کی بڑبڑاہٹ پر ہلکی سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا لیکن اس وقت ان کا ناشتہ کو بالکل جی

نہیں چاہ رہا تھا سو وہ چائے پی کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”عثمان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے جیسے عثمان صرف تمہارا زور

انتظار کر رہے تھے اور اب.....“ مجتبیٰ حیدر نے واپسی پر تڑپ کر کہا۔

انہوں نے لب کاٹتے، رے بڑی زخمی نظروں سے انہیں دیکھا اور سوچا۔

”مجتبیٰ حیدر کس قدر بے درو ہیں۔ ایک بیٹے سے اتنی مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔“

’او‘ بیٹا بھی وہ جو سالوں بعد باپ سے ملا ہو اور کیا ضروری ہے کہ مجتبیٰ حیدر اس وقت اپنی رائے دیں۔“

ان کے دل کے اندر طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ انہوں نے مجتبیٰ حیدر کے تیسرے کے جواب میں کچھ

نہیں کہا تھا۔

مجتبیٰ حیدر کو ان کے گھر ڈراپ کر کے وہ گھر لوٹے تو مسرور نے انہیں سلطان کی آمد کا بتایا۔

”اچھا..... کہاں ہے وہ؟“ انہوں نے سرسری پوچھا۔

”کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔“

مسرور نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”میں کھانا نہیں کھاؤں گا اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم کھا لیتا۔“

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ پریشان سا ہو گیا۔

”ہاں.....“ انہوں نے ذرا سی دیر رک کر اتنی سی دلی اور اپنے کمرے میں چلے آئے۔

اور ہر بات کنی بے چین تھی۔

کوئی ان سے دل سے پوچھتا۔

ہزار ہا وہم ان کے دل سے چھنے ہوئے تھے۔

مجتبیٰ حیدر کا تبصرہ لمحہ لمحہ جیسے ان کے وجود کو ہڈا کر رکھ دیتا تھا۔

”میں یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟“

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

عثمان احمد کو کچھ نہیں ہو گیا۔

وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔

وہ خود صبح کسی اور پارٹ اسپیشلسٹ سے بات کریں گے۔

کئی بار انہوں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ وہ اسپتال فون کر کے ان کی کیفیت پوچھیں لیکن

پھر پیچھے ہٹ گئے۔

”نہیں.....؟“

کئی بار ان کا جی چاہا کہ وہ حویلی فون کریں۔

”اچھا خدا بخش اگر دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا۔ مسرور کو بتا دینا وہ پریشان ہو جاتا ہے۔“

خدا بخش نے سر ہلا دیا۔ گویا زبان سے کچھ نہ کہہ کر اس نے ان کے ناشتا نہ کر کے جانے پر ناراض ہو کر اظہار کیا ہو لیکن اس وقت وہ خدا بخش کو منانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھے سو وہ کی رنگ انگلیوں میں گھسے خدا بخش کی طرف دیکھ بغیر باہر نکل آئے۔

اسپتال کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے وہ اترے تو ہر طرف خاموشی تھی۔ انہیں اپنی جلد بازی پر ندامت سی ہوئی اور وہ اندر اسپتال میں جانے کے بجائے لان میں آگئے۔ کچھ دیر تو وہ بیٹھنے لگے رہے تاکہ کچھ چہل پہل شروع ہو تو وہ اندر جائیں۔ اکا دکا لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پھر وہ ٹھک کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ ان کا سر بے حد بو جھل ہو رہا تھا۔ انہوں نے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وہ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ آنکھیں بند کیں تو جانے کب نیند بند آنکھوں میں چل آئی اور وہ یونہی گھٹنوں پر سر رکھے رکھے سو گئے اور پھر ان کی آنکھ بچوں کے شور سے کھلی۔ ایک دم ہڑاکر انہوں نے گھٹنوں سے سراٹھایا۔ دو پیارے پیارے بچے شور مچاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور لان میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے کلائی موڑ کر ٹائم دیکھا۔

اف..... وہ تو اچھی خاصی دیر سوتے رہے تھے۔

کپڑے جھاڑتے ہوئے وہ اٹھے اور تیز تیز قدموں سے اندر کی طرف بڑھے۔

کوریڈور میں ہی انہیں ڈاکٹر شہریار مل گئے۔

”شہریار!“ بے اختیار انہوں نے اسے آواز دی ”عثمان احمد کیسے ہیں؟“

”فائن!“ شہریار نے انہیں سلام کرتے ہوئے بتایا ”کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے ناشتا کیا ہے اور اب اخبار دیکھ رہے ہیں۔“

”تھینک گاڈ!“ ان کے رگ دپے میں سکون سا اتر گیا۔ وہ شہریار سے ان کی بیماری کی تفصیل پوچھتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عثمان احمد کے کمرے کے دروازے تک پہنچے تو شہریار نے معذرت کی۔

”سر! اب اجازت دیں میں اس وقت راؤنڈ پر ہوں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں عثمان صاحب سے مل کر ڈاکٹر رافع سے بھی ملنا چاہوں گا۔ عثمان صاحب کی صبح کنڈیشن جاننا چاہتا ہوں۔“

”جی سر! ڈاکٹر رافع آگئے تو میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔“

شہریار انہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تو لمحہ بھر کے لیے وہ جھج کر کھڑے ہو گئے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر چلے گئے۔ عثمان احمد نے انہیں دیکھا تو اخبار پھینک کر کل کی سی بے تاب سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ان کی طرف بڑھے اور بے اختیار عادل نے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا اور انہیں

اپنے توانا بازوؤں میں لیے ان کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتے ہوئے پروفیسر عادل نے انہیں آہستگی سے بڑبڑایا اور مسکرائے۔

”آپ..... آپ اس وقت کیسے ہیں؟“ یہ جملہ تھا جوان کے لبوں سے نکلا تھا۔

عثمان احمد نے کتنے سالوں بعد یہ آواز سنی تھی۔

”جی بھئی، گنیمت آواز۔“

”کتنی خوبصورت آواز ہے ان کے بیٹے کی۔“

”میں..... میں بہت اچھا ہوں۔ تم آگئے ہو تمہیں دیکھ لیا ہے تو ایک دم توانا اور مضبوط ہو گیا ہوں۔“

ان کی آواز میں بہت سارے آنسوؤں کی نمی تھی۔ ”میں تمہارا ممنون ہوں بیٹا تم آگئے۔ مجرم ہوں تمہارا“ تمہاری ماں کا بابا جان کا“ میں نے سب کا بہت دل دکھایا ہے..... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

بے اختیار پروفیسر عادل نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ذرا سا مسکرائے۔

”آپ کے لیے کوئی بھی، کسی بھی قسم کا جذباتی پیچان بہتر نہیں ہے..... پھر..... پھر کبھی بات کریں

میں۔ میں آتا رہوں گا۔ اور ہم آپ سے خفا نہیں ہیں۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ آدمی تو بے

برہم رہتا ہے۔“ اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں انہوں نے سمجھایا۔

”پھر کبھی.....“ عثمان احمد نے بڑی دل گرفتہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

جانے کیا تھا۔ ان کی نظروں اور اس ایک لفظ میں کہ پروفیسر عادل کا پورا وجود اندر تک کانپ گیا۔

غیر ارادی طور پر ان کے ہاتھوں پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی جیسے وہ اپنی گرم جوشی اور مضبوط گرفت سے انہیں تسلی دے رہے ہوں۔

”مجھے باتیں کرنے سے مت روکو عادل!“ انہوں نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا ”میرے

پاس وقت بہت کم ہے اور میں نے بہت باتیں کرنا ہی تم سے..... کچھ اپنی سنانی ہے۔ کچھ تمہاری سنانی

ہے۔ بہت حساب کتاب ہے تمہارے مجھ پر۔ بیٹا مجھے مت روکو..... میں سمجھتا ہوں تم نے مجھے معاف کر

لیا ہے تب ہی یہاں آئے ہو۔ تو میرے دل کی بھی سن لو..... اتنے سالوں میں بہت کچھ جمع ہو گیا ہے۔ بیٹا

بلبلز! میں نے تمہارا اپنی ذات پر بہت دکھ جھیلے ہیں۔ بہت کچھ پا کر بھی کچھ نہیں پایا۔ میرا دل بھرا ہوا

ہے..... تھکنے کو بے تاب.....“ ان کی ہمتی نظریں پروفیسر عادل کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے ٹھہری گئیں۔

اور پھر اس روز وہ بہت دیر تک عثمان احمد کے پاس بیٹھے رہے۔ خاموش سر جھکائے اور عثمان احمد نے

کلائی میں نینب سجاد سے ملنے سے لے کر اب تک کی ساری داستان لفظ بے لفظ سنا دی تھی..... اور اب سوالیہ

نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ جانتے تھے کہ ان کا بیٹا کشادہ دل اور سمندر ظرف ہے معاف کر دے گا

ان کی خطائیں۔

”میں تم سے اور تمہاری ماں سے بہت شرمندہ ہوں بیٹا! بہت نادم ہوں..... میں تمہارے حقوق ادا نہیں کر سکا ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا.....“ انہوں نے ایک دم اپنے ہاتھ جوڑ دیے تو بے اختیار پروفسر عادل ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے رو پڑے۔

”پلیز..... شرمندہ نہ کریں۔“

”اپنی ماں سے بھی میری سفارش کرنا بیٹا.....! میں اسے کوئی خوشی نہ دے سکا۔ اس کے حقوق ادا نہیں کر سکا..... بڑا جرم کیا میں نے بیٹا، تم سب کا مجرم ہوں بیٹا! میں نے.....“

”ابو!.....“ ان کے ہاتھ بدستوران کے ہاتھوں میں تھے۔

”ابو!“

یہ لفظ کتنا اجنبی لگا تھا خود انہیں۔

کتنے سالوں بعد اس لفظ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر تک گم صم سے بیٹھے اس لفظ کی حلاوت کو محسوس کرتے رہے۔

”عادل..... عادل بیٹا پھر کہو..... پھر کہو میری جان! ایک بار پھر.....“ عثمان احمد نے بے قراری سے ان کے ہاتھوں کو چوما۔

بہت پہلے جب عادل نے بولنا شروع کیا تھا تو جو پہلا لفظ ان کی زبان سے نکلا تھا وہ ”ابو“ تھا اور اس روز باہا جان کتنا خوش ہوئے تھے۔

اور وہ خود بھی۔

جتنی بار عادل ”ابو“ کہتا وہ اپنے اندر انجانی سی خوشی اور مسرت کی لہریں اٹھتی محسوس کرتے تھے۔

”اب باقی باتیں کل ہوں گی۔“ پروفسر عادل نے اپنی اندر کی کیفیتوں پر قابو پاتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔

مگر عثمان احمد ذرا بھی تھکے نہیں تھے۔ وہ ان کے منع کرنے کے باوجود انہیں بتاتے رہے۔ عاشقی کے متعلق، نینا اور مور کے متعلق اور مریم کے متعلق۔

”زینی آج کل لندن میں ہے۔“ انہوں نے پروفسر عادل کو بتایا۔

”عاشی نینا اور مور میری میں ہیں..... اور مریم ادھر ہی تھی۔ میرے پاس تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے میں نے اسے زبردستی گھر بھیجا ہے کہ تھوڑا آرام کر لے۔ کتنی راتوں سے جاگ رہی ہے..... اور پھر مجھے اپنے کچھ ضروری کاغذات بھی منگوانے تھے..... ابھی آتی ہوگی..... تو تم سے ملو اور گا۔ کتنی حیران ہوگی تمہیں دیکھ کر وہ..... جب اسے پتا چلے گا کہ تم.....“

اور پھر اچانک ہی کسی خیال سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پروفسر عادل

کی کینے لگے اور بہت دیر تک یونہی ان کے چہرے کو دیکھتے رہے۔

”آپ کیا پتہ رکھتے ہیں؟“ پروفسر عادل نے نرمی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں یونہی، ایک خیال آ گیا تھا۔“

”کیا.....؟“

عثمان احمد نے لمحو بھروسہ جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ وہ دل سے اپنا خیال بیان کریں یا نہیں؟ پھر کچھ سوچے ہوئے آہستگی سے بولے ”عادل مومو! بہت اچھی، بہت پیارا، بہت سنبھلی ہوئی لڑکی ہے۔ اپنی ماں سے بالکل مختلف، بہت کیسٹریک اور لوگ.....“

عادل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”ابھی ابھی تمہیں دیکھ کر خیال آیا تھا۔ بیٹا نہ ماننا، میرا خیال پُندہ نہ آئے تو کوئی بات نہیں۔ بس یونہی پتا نہیں کیوں..... میرے دل میں خیال آ گیا تھا کہ تم اور مومو..... مومو.....“

”نہیں..... نہیں..... بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔“ بے اختیار ان کے ہونٹوں سے نکلا تو ایک افسردہ سی مسکراہٹ عثمان احمد کے ہونٹوں پر آ گئی۔

”کچھ خیال نہیں کرنا بیٹا، یونہی ایک بات رباں پر آ گئی تھی۔“

”نہیں، کوئی بات نہیں۔“

انہوں نے نرمی سے کہا تھا لیکن ان کا ذہن الجھ سا گیا تھا..... پتا نہیں، کیوں لوگ ان سے امیدیں وابستہ کر لیتے تھے۔

ایک حیرت مئی، جس کی روتی آنکھیں انہیں ڈسٹرب کرتی رہتی تھیں۔

پھر آمنہ مئی تھی، جس نے انہیں امتحان میں ڈالا تھا اور پھر خود ہی فیصلہ بنا کر چلی گئی تھی اور اب یہ عثمان احمد جانے کیا کہہ رہے تھے؟

مریم..... مومو..... نہ ب عثمان احمد کے پہلے شوہر کی بیٹی جس کی عثمان احمد نے بے حد تعریف کی تھی اور جسے ابھی تک انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔

اور پھر اگلے روز بھی وہ اسے نہ دیکھ پائے تھے کہ جس وقت وہ اسپتال گئے وہ وہاں موجود نہ تھی۔

اور عثمان احمد نے انہیں بتایا تھا کہ عاشی نینا اور مور آج حرمی سے آئے والے ہیں۔ انہوں نے اسلم کو بھیج کر انہیں بلایا ہے تو وہ اس وقت گھر چلی گئی ہے۔

”نینا“ دل بہت چاہ رہا تھا انہیں دیکھنے کو۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں دیکھے بغیر ہی چلا جاؤں گا.....“ پروفسر عادل اس روز آئے تو انہوں نے بتایا۔

”آپ کو کہیں نہیں جانا اور ابھی تو آپ نے کامل سے بھی ملنا ہے..... اور ماں جی..... یہ بھی معافی مانگنی

ہے۔“ پروفیسر عادل نے خوش دلی سے کہا۔

”ہاں..... کامل.....“ ان کا دل اپنے اس ان دیکھنے بیٹے کے لیے چل اٹھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ انہوں نے کبھی ان سے کامل کا ذکر نہیں کیا تھا..... شاید بابا جان نے منع کر دیا ہو۔

”تم کب جاؤ گے عادل اسے لینے؟“ انہوں نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا۔

پروفیسر عادل نے انہیں کامل کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔

”آپ کہیں تو کل ہی چلا جاؤں؟“

”نہیں..... نہیں عادل“ تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جانا۔ ایسا کرو تم خدا بخش کو بھیج دو۔ تم نے بتایا تھا کہ خدا بخش تمہارے پاس ہے..... اور ہو سکے تو اپنی ماں کو بھی لے آنا۔ میں اس سے معافی مانگ لوں تو شاید دل کو سکون مل جائے۔ تمہاری ماں مجھے معاف تو کرے گی تا عادل! میں نے اسے بہت دکھ دیے ہیں۔“

اور اس رات انہوں نے بہت دیر تک حویلی میں بت کی۔ ماں جی خاموش! ایک لفظ کہے بغیر ان کی بات سنتی رہیں اور پھر بغیر کچھ کہے ریسورر دکھ دیا۔

”بی آپا!“ تب انہوں نے بی آپا کی مدد چاہی۔

ڈاکٹر رافع کی تسلی کے باوجود پتا نہیں کیوں ان کا دل جیسے ڈوبا جا رہا تھا۔

”بی آپا!“ ان سے بات کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی ”آپ ماں جی۔ اے ابو کی سفارش کر دیں۔“

اور پھر رات بارہ بجے کے بعد بی آپا۔ نے انہیں خوشخبری سنائی تھی کہ وہ ماں جی کامل اور چاچا عبدالرحمن کل صبح لاہور کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔

تب بے حد پرسکون ہو کر انہوں نے نیچے پر سر رکھا تھا جیسے عثمان احمد کے سامنے وہ سرخرو ہو گئے ہوں لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ فون کی بیل سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ بے اختیار ان کی نظریں وال کلاک کی طرف اٹھیں تین بج رہے تھے اور فون کی بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ سوئی سوئی کینیت میں انہوں نے ریسورر اٹھایا اور دوسری طرف سے شہریار کی آواز سن کر وہ یکدم الارٹ ہو گئے۔

”سرا“ شہریار کی آواز بھرائی ہوئی تھی ”عثمان صاحب کو اچانک ایک ہوا ہے۔“

آج صبح ہی تو انہوں نے شہریار کو یہ بتاتے ہوئے کہ عثمان احمد ان کے والد ہیں تاکید کی تھی کہ کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں انہیں فوراً مطلع کیا جائے۔ شہریار کی باقی بات سے بغیر انہوں نے ریسورر نیچے پھینکا اور بجلی کی سی تیزی سے گاؤں اتارا اور باہر کی طرف بھاگے۔

”مسرور خدا بخش.....!“ انہوں نے عجیب سی ٹوٹی ہوئی آواز میں انہیں پکارا ”میں اسپتال

جار ہا ہوں۔“

مسرور جوان کی آواز سن کر فوراً ہی کمرے سے باہر آیا تھا بغیر کوئی سوال و جواب کئے ان کے پیچھے لپکا۔ وہ اس کی طرف دیکھ بغیر تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے..... یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ مسرور ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ وہ تو آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی باہر نکال لے گئے تھے۔ چکیدار متجب سا گیت کھولے خدا بخش کی طرف دیکھ رہا تھا جو خود بھی حیران سا کھڑا تھا کہ اچانک کیا کیا؟ کون بیا رہے؟ شاید کامل۔ فون کی بیل تو اس نے بھی اسی تھی اور اتنی رات گئے فون کی بیل سن کر اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے چکیدار کو گیت بند کرنے کا اشارہ کیا اور وہیں پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سب کی خیریت کی دعائیں کرنے لگا۔

”یہ..... یہ کیا ہو گیا تھا؟“

”شہریار کی آواز میں اتنے آنسو کیوں تھے؟“

”ابھی تو انہوں نے عثمان احمد سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔“

کوئی گلے کوئی شکوے نہیں کیے تھے۔ صرف ان کی باتیں ہی تھیں ان کے زخم دیکھے تھے۔ اپنے سینے کے زخم تو انہیں دکھائے ہی نہیں تھے۔ ابھی تو انہیں بہت کچھ کہنا تھا بہت کچھ بتانا تھا۔ خدا نے اتنے برسوں بعد انہیں ملایا تھا تو اتنی مہلت کیوں نہیں دی تھی کہ وہ ساری باتیں جو وہ سوچتے تھے وہ عدم تحفظ جو! بابا جان کے ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی شدت سے انہیں محسوس ہوتا تھا وہ سب انہیں بتا سکیں۔

اسپتال میں سب ہی اکٹھے تھے۔ ڈاکٹر ہادی ڈاکٹر عبدالعزیز عاشرینا، مورا اور شہریار۔

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اندر آئے تھے شہریار انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف نہکا۔

”آئیے سر پلیز! وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی چند لمحوں پہلے ہم انہیں آئی سی یو سے لائے ہیں۔ ہارٹ ایک تھا۔ ایک دم ہی ہارٹ نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ دل کی ماش وغیرہ کی گئی۔ ابھی کچھ بہتر ہیں آکسیجن کچھ دیر پہلے ہی ہٹائی ہے۔ اب ہارٹ صحیح کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رافع بھی ابھی پہنچنے والے ہیں۔ انہیں کال کر دیا ہے۔ صحیح کیفیت تو وہی بتا سکتے ہیں۔“

وہ شہریار کی بات سنتے ہوئے بے تابی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ عثمان احمد کی نظریں دروازے کی طرف ہی لگی تھیں اور ان کے بیڈ کے بالکل پاس ان کے ہاتھ کو ہاتھ میں لیے مریم کھڑی تھی۔

اسے دیکھتے ہی عثمان احمد کے مضطرب چہرے پر سکون سا اثر آیا..... ان کے لب ہولے سے ہلے مگر آواز نہیں نکلی۔

مریم نے جھک کر پوچھا ”پاپا آپ نے کیا کہا؟“

انہوں نے مریم کے پیچھے دیکھا اور آہستہ سے کہا ”عادل!“

عادل تیزی سے ان کے سامنے جھکا۔

”ابو!“

”وہ..... وہ نہیں آئے“ کامل اور تمہاری ماں.....؟“ انہوں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”وہ صبح چلیں گے لیکن میں ابھی مسرور سے کہتا ہوں کہ فون کر کے انہیں کہے کہ وہ ابھی چل پڑیں۔“

پروفیسر عادل نے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر تسلی دی۔

”ہاں وقت بہت کم ہے۔ تمہاری ماں سے معافی مانگ لیتا..... کامل کو دیکھ لیتا..... اور عبدالرحمن سے مل لیتا۔“

بڑی حسرت تھی ان کے لہجے میں۔ پروفیسر عادل تڑپ اٹھے۔

”آپ ملیں گے سب سے انشاء اللہ۔“

”جہاں نہیں..... تم اپنی ماں سے مجھے معافی دلوا دینا“ میں اس کے حقوق ادا نہیں کر سکا۔“

”وہ کچھ دیر بعد آجائیں گی تو آپ خود ہی ان سے معافی مانگ لیتا..... یہ تو آپ دونوں کا معاملہ ہے۔“ انہوں نے لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی لیکن آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں اور لہجہ بھیگ گیا۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے عثمان احمد نے مریم کی طرف دیکھا۔

”یہ مومو ہے۔“

پروفیسر عادل نے جوان کے بیڈ کے پاس ہی دوڑا نو بیٹھے ہوئے تھے سر اٹھا کر ساتھ کھڑی مریم کی طرف دیکھا تو بے ساختہ ان کے لبوں سے نکلا۔

”یہ..... یہ مریم ہے؟“

یہ تو وہی تھی..... وہی۔ ان کے دل میں لمحہ بھر کے لیے گمنشیاں سی بچنے لگیں ایک آشنا مانوس سی خوشبو پورے وجود میں پھیل گئی..... ان کا دل چاہا وہ عثمان احمد کا ہاتھ پکڑ کر کہیں۔

”جو خیال اس روز آپ کے ذہن میں آیا تھا۔ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔“

لیکن انہوں نے سر نیچے کر لیا۔

”یہ عادل ہے مومو! جاؤ..... عاشریٰ نینا اور در کو بلا لو۔ یہ تینوں کہاں چلے گئے ہیں..... یہاں میرے

پاس رہیں۔ وہ سب.....“

مریم آنکھیں شدت گرہ سے سرخ ہو رہی تھیں لیکن عادل کے آنے سے اسے بڑی تعویبت سی محسوس ہوئی۔

”یہ عادل ہے ہمارا بھائی اتنا منبوط تو اتنا۔“

اسے لگے جیسے عادل اس کے بہت سارے بوجھ بانٹ لے گا اور جیسے وہ پاپا کو بھی بچالے گا۔

پاپا نے ان دونوں میں عادل کا اتنا ذکر کیا تھا کہ اسے وہ بالکل اجنبی نہیں لگا۔ پاپا سے بہت مل جلنا

بالکل پاپا کی طرح مہربان اور شفیق۔

وہ ایک نظر ان کے جھکے ہوئے سر پر ڈالتی عاشریٰ نینا اور مور کو بلانے باہر چلی گئی۔

عادل نے اٹھ کر ایک ساتھ تینوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ تینوں کس قدر سبے سبے لگ رہے تھے۔

عثمان احمد کی آنکھوں میں سکون سا اثر آیا۔

”ان کا دھیان رکھنا عادل! اور.....“ انہوں نے پاس کھڑی مریم کی طرف دیکھا ”اور مریم کا بھی.....“

انہوں نے مریم کا ہاتھ پکڑا اور عادل کی طرف دیکھا۔

عادل تیزی سے آگے بڑھا۔ مریم کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور پیشانی پر شدت کرب

سے ککیریں سی کھج گئی تھیں۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر آواز حلق میں ہی کہیں انک

گئی..... اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

”پاپا..... پاپا!“ مریم اور عاشریٰ کے لبوں سے ایک ساتھ چیخ نکلی تھی۔

لمحوں میں ہی انہیں پھر آئی سی یو میں پہنچا دیا گیا۔ اب کے بہت شدید انک ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی ہر

کوشش بیکار جا رہی تھی۔ تمام سسٹرنے یکدم کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف دل کی معمولی سی دھڑکن باقی

تھی۔ ڈاکٹر شہریار نے پروفیسر عادل سے مشورہ کر کے وینٹی لیٹر لگا دیا تھا۔ ایک مومو سی امید تھی کہ شاید

ماں جی اور کامل کے آنے تک..... مگر..... عثمان احمد نے پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ ماں جی، کامل بی، آپا اور

عبدالرحمن چاچا کے آنے کے بعد بھی نہیں۔ پروفیسر عادل نے تھی ہی دیر تک ان کے سر ہانے کھڑے

ہو کر ہوئے ہوئے انہیں آوازیں دی تھیں۔

بتایا تھا کہ ماں جی اور کامل آگئے ہیں مگر ان کی پلکوں میں تجش تک نہ ہوئی اور کوئی آواز ان کے

کانوں تک نہ پہنچی۔

مصنوعی ذریعوں سے چلنے والا سانس بھی شام تک دم توڑ گیا..... اور یوں زندگی کا ایک باب ختم

ہو گیا۔ ایک کہانی انجام کو پہنچ گئی۔

وہ جو کبھی کبھی سوچا کرتے تھے کہ اگر کبھی عثمان احمد ان سے ملے تو وہ ان سے ماں جی کی تنہائیوں، کامل

کی بے بسی اور اپنی ذات کی وہ کمی جو انہیں اپنے اندر محسوس ہوتی تھی اس کا حساب ضرور لیں گے۔ وہ عثمان

احمد کی موت پر ماں جی کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بلک بلک کر روئے۔ چاچا عبدالرحمن کے گلے لگ گئے اور

سب تماشا روتے ہوئے انہوں نے کتنے ہی شکوے کر ڈالے تھے۔

”بابا جان نے انہیں گھر آنے سے منع کر دیا تھا مگر آپ نے بھی تو یہ بند دروازے نہ کھولے۔ بابا جان

کے بعد بھی انہیں نہ بلایا؟ کیوں کیا چاچا آپ نے ایسا؟“

”بس پتر.....“ چاچا عبدالرحمن کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ کبھی خیال ہی نہ آیا کہ بابا جان

نہیں رہے تو پچھڑے بھائی کو جا کر گلے لگائیں اور حویلی کے دروازے ان کے لیے کھول دیں۔
آج حویلی کے دروازے ان کے لیے کھل گئے تھے۔

ماں جی نے اسپتال کے برآمدے میں کھڑے کھڑے چوڑیاں اتار کر بی آپا کو دے دی تھیں۔
عثمان احمد تو ان سے بہت پہلے پچھڑ گئے تھے لیکن بیوہ وہ آج ہوئی تھیں۔

عادل خالی خالی نظروں سے انہیں چوڑیاں اتارتے دیکھتے رہے تھے۔ یہ چوڑیاں بچپن سے ہی ان کے بازوؤں میں دیکھ رہے تھے۔

اور پھر بڑے گھیر لہجے میں انہوں نے کہا تھا۔

”اپنے باپ کی میت حویلی لے چلو اور مانی کو اطلاع کرو کہ اس کے تایا کی میت لے کر آرہے ہیں۔“

انہوں نے مریم اور پھر عاشری کی طرف دیکھا تھا کہ شاید وہ کچھ اعتراض کریں لیکن انہیں تو کچھ ہوش نہ تھا۔ ایک دوسرے کے گلے میں بائیں ڈالے وہ ارد گرد سے بے نیاز روئے چلی جا رہی تھیں اور جیسے اعتراض ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ اس وقت موجود نہ تھی۔ مریم نے دو دن قبل ہی تو انہیں عثمان احمد کے کہنے پر بتایا تھا کہ پاپا اب بہت بہتر ہیں۔۔۔۔۔۔ اور جواب میں انہوں نے بتایا تھا کہ شنگ ختم ہو چکی ہے اور پھر وہ ایک سیر تفریح نے بے حار سے ہنر بندہ سولہ دان تک دیکھی ہوئی۔

”پاپا ابھی اسپتال میں ہی ہیں۔“

”ذاکر ہیں نا وہاں؟“

انہوں نے اسے دلا سے دے کرفون بند کر دیا تھا اور اب وہ ٹریس نہیں ہو پارہی تھیں پتا نہیں کہاں تھیں وہ؟ شریف نے فون کر کے جیسے ہی میڈم زنگس کو عثمان احمد کی وفات کا بتایا تھا تب سے ہی وہ فون کے پاس بیٹھی تھیں لیکن نذیب احمد کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس کی فلم یونٹ کے لوگوں سے رابطہ تو ہو گیا تھا لیکن وہاں سے یہی بتایا گیا تھا کہ شونگ ختم ہونے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے طور پر تفریح کے لیے نکل گئے ہیں سو نذیب عثمان کو اطلاع نہ ہو سکی۔۔۔۔۔۔ اور عثمان کی ڈیڈ باڈی پروفیسر عادل حویلی لے آئے تھے۔

حویلی میں ایک کھرام مچا تھا۔ سارا نور پور جیسے حویلی میں اُٹا آیا تھا۔ اگرچہ عثمان احمد برسوں پہلے حویلی سے چلے گئے تھے لیکن لوگ یوں بلک بلک کر رو رہے تھے جیسے وہ کبھی یہاں سے گئے ہی نہیں تھے۔

تین چار دن تک تو عادل کو ابھر ابھر دیکھنے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ارد گرد کے علاقوں سے لوگ مسلسل تعزیت کے لیے آرہے تھے۔ خود ان کے دوست احباب، کولیگ، اسٹوڈنٹ بھی لاہور سے جوں جوں سننے ان کے پاس آرہے تھے۔ سرور سے معلوم ہونے کے بعد ان کے کئی کولیگ تو جنازے پر بھی پہنچ گئے تھے۔ اتنی شدید مصروفیت اور غم کا بوجھ! پھر بھی اندر باہر آتے جاتے وہ عاشری زینا کے پاس ضرور رکے ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں دلا سادیتے۔ تیمور کو ساتھ ساتھ لگائے پھرتے وہ انہیں اپنی ذمہ داری سمجھ

رہے تھے عثمان احمد نے کتنی بار انہیں سب کا دھیان رکھنے کو کہا تھا۔ کئی بار ان کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس آکر بیٹھیں ان سے عثمان احمد کی باتیں پوچھیں۔ انہیں حوصلہ دلائیں لیکن جب بھی وہ اس ارادے سے اٹھنے کوئی نہ کوئی آگیا۔

آج پانچویں دن بی آپا نے انہیں بلایا تھا۔

”عادل میاں جس طرح اچانک سب کو یہاں آنا پڑا تم جانتے ہو۔۔۔۔۔۔ بچوں کے پاس کپڑے وغیرہ نہیں ہیں۔ تم اگر عاشری اور مریم کے ساتھ آج لاہور جا کر ان کا ضروری سامان لے آؤ تو۔۔۔۔۔۔“

”ہاں واقعی!“ انہوں نے سوچا

”ان کی والدہ جب تک واپس نہیں آتیں ظاہر ہے وہ یہیں رہیں گے۔ کم از کم چالیسویں تک تو۔۔۔۔۔۔ اگر ان کی والدہ ابھی ٹیکس تب بھی۔۔۔۔۔۔“ بی آپا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔

”پتا نہیں۔“ انہوں نے تو ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں سوچا تھا اور معلوم نہیں وہ خاتون کس مزاج کی ہیں۔۔۔۔۔۔ عثمان احمد کی باتوں سے تو انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ صرف اپنی ذات سے محبت کرنے والی خود غرض عورت ہے۔

خیر یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ انہوں نے سوچا اور بی آپا سے عاشری اور مریم کو تیار ہونے کا کہہ کر وہ اپنے جانے کا ماں جی کو بتانے چلے گئے۔۔۔۔۔۔ اور اب اس وقت وہ ”نذیب ولا“ میں موجود تھے۔

عاشری اور مریم کو دیکھتے ہی سب ملازم اکٹھے ہو گئے تھے۔ مریم اور عاشری تو اس طرح چیخ چیخ کر روئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

جیناں، صفو، شریف، چوکیدار مالی سب ہی آنسو بہا رہے تھے۔

”پاپا۔۔۔۔۔۔ پاپا۔۔۔۔۔۔!“

مریم نے ان کی اسٹڈی کے دروازے پر سر ٹکراتے ہوئے اس طرح انہیں پکارا جیسے وہ اندر ہوں اور انہی اس کی آواز سن کر باہر آجائیں گے۔

”مریم! پلیز حوصلہ کریں۔“ عاشری کے گرد بازو لپیٹے اس کے سر کو چومتے ہوئے انہوں نے مریم کو دیکھا۔

”آپ بڑی ہیں آپ نے تو ان سب کو سنبھالنا ہے۔ آپ ہی حوصلہ ہار گئیں تو ان کا کیا بنے گا۔ انہیں کون دلا سادے گا؟“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”آپ کو کیا پتا۔۔۔۔۔۔؟“ مریم نے رو۔۔۔۔۔۔ تروتے سر اٹھایا ”پاپا نہیں رہے تو کیسا لگ رہا ہے ہمیں جیسے ہم بالکل اکیلے ہو گئے ہیں بالکل تنہا۔۔۔۔۔۔ یہ گھر پاپا کے بغیر۔۔۔۔۔۔ کیسے رہیں گے ہم یہاں۔۔۔۔۔۔ پاپا۔۔۔۔۔۔ پاپا۔۔۔۔۔۔ آپ کیوں چھوڑ گئے ہمیں۔“

”بصوک نہیں ہے ہمیں۔“

اتنے برسوں کی تشنگی کیا بجھتی اور بڑھ گئی تھی۔



دور ہو جانے کا، پھنسنے جانے کا دکھ اندر ہی اندر نہیں کھائے جا رہا تھا اور پاپا کو اتنا خوش دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ اب شاید پاپا کو کچھ نہ ہو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنے شوق اپنی دلچسپیاں، بچپن کی باتیں وہ سب بہت اشتیاق سے سنتی رہی تھی اور پھر صبح ہوتے ہی پاپا نے اسے گھر بھیج دیا تھا۔ رات بھر جاگی ہو، گھر جا کر ہاتھ لہو اور سو جاؤ اور جب واپس آؤ تو میری اسٹڈی سے براؤن کلر کی فائل لے آنا اور جب تم واپس آؤ گی تو میں تمہیں اپنی زندگی کی ایک بڑی خوشی میں شریک کروں گا۔ اور وہ راستے بھر پاپا کی اس خوشی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

”شاید ماما واپس آ رہی ہیں اور پاپا اسے سربراہ کر دیں گے۔“

اور گھر آ کر ہاتھ لینے کے بعد وہ سچ سچ سو گئی تھی حالانکہ اس کا خیال تھا کہ بس ذرا سی دیر لینے کی اور اٹھ جائے گی لیکن وہ رات بھر جاگتی رہی تھی حالانکہ پاپا سو گئے تھے پھر بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔ شہر یار نے وہ بار کمرے کا پکڑ لگایا تھا اور اسے سونے کی تاکید کی تھی اور پراس لیا تھا کہ وہ بھی سو جائے گی لیکن اسے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ خواہ وہ ہی انکل مجتبیٰ اور ان کے ساتھ آنے والے اجنبی پر اسے غصہ آتا رہا تھا۔ اتنی دیر پاپا سے باتیں کرتے رہے اور انہیں تھکا ڈالا اور ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ کم از کم مجتبیٰ انکل کو تو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ اتنے بیمار ہیں اور انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاپا صبح بالکل فریض تھے اور انہیں اخبار پڑھتا ہوا چھوڑ کر آئی تھی اور پھر بہت دیر تک سوئی رہی تھی۔ صفحہ جیٹا کسی نے اسے اٹھایا ہی نہیں تھا۔ وہ سب سے اٹھتی ہوئی اٹھتے ہی ہاسپٹل بھاگی تھی اور جب وہ پاپا کے پاس آئی تو ان کے چہرے پر اتنے رنگ تھے اور اتنی رونق تھی جیسے کوئی نرمانہ مل گیا ہو۔ فائل ان کے پاس رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”پاپا لگتا ہے آپ کو کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔“

”ہاں خزانہ ہی تو مل گیا ہے، مومو۔ میں بہت خوش ہوں۔ بہت بے حد۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ بہت برسوں سے جو بوجھ دل پر دھرا تھا وہ اتر گیا ہے۔“ عثمان احمد نے اپنے پاس ہی بیٹھ کر بٹھا لیا تھا ”مومو آج..... آج بہت برسوں بعد میں اپنے پچھڑے ہوئے بیٹے سے ملا ہوں۔“

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”مومو۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی پھر بہت دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ اسے بابا جان، چاچا عبدالرحمن اور عادل کے متعلق بتاتے رہے اور وہ خاموشی سے پوری توجہ اور دھیان سے ان کی ایک ایک بات سنتی رہی۔

”وہ..... میرا مطلب ہے عامل بھائی آپ سے تھا تو بہت ہوں گے۔“

”جہاں نہیں ہوگا تو ضرور مگر اس نے اظہار نہیں کیا۔ وہ بہت مدبر بہت سمجھ دار اور خلیق ہے۔ مجتبیٰ نے



بیشہ ہی اس کی بہت تعریف کی اور میرا کتنا جی چاہتا تھا اسے دیکھنے کو اس سے ملنے کو۔“

”تو وہ شخص جو مجتبیٰ انکل کے ساتھ تھا وہ عادل تھا۔ تب ہی تو وہ اسے کچھ شاسا لگا تھا۔ شاید پاپا کی شخصیت کی کوئی جھلک اس میں تھی۔ پتا نہیں بائے نیچر بھی وہ پاپا جیسا ہے یا۔“

”پاپا۔“ اس نے سر اٹھا کر عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ ان کی خوشی جیسے اس کے دل میں اتر آئی تھی۔

”آپ کو بہت مبارک ہو۔“

”تم..... تمہیں بھی خوشی ہوئی بیٹا۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی بہت لیکن پاپا..... وہ ہم سے نفرت تو نہیں کریں گے۔“

”نہیں۔“ انہوں نے بڑے یقین اور مان سے کہا۔ ”وہ بہت چاہنے والا اور بہت محبت کرنے والا ہے۔ پتا ہے اس نے مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا، کوئی گلہ نہیں کیا، کوئی حساب نہیں مانگا، کسی زیادتی کا۔“

”پاپا جب آپ ایسے ہو جائیں گے تو پھر ہم آپ کے گاؤں جائیں گے اور سب سے ملیں گے۔“

”ہاں ضرور عادل ہے تا تو اب مجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔ وہ میری شناخت کرے گا تو سب مان جائیں گے۔ میں نے سب کا بہت دل دکھایا ہے پھر تم سب سے ملنا اپنے بچاؤ اور اپنی مدد کی بات سے وہ..... وہ بہت اچھی ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔“

اور اس روز اس کے منع کرنے کے باوجود وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنے بچپن کی، چاچا عبدالرحمن کی اور اپنی ماں جی اور بابا جان کی۔ عبدالرحمن بچپن سے ہی سخت مزاح تھا۔ پڑھائی سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ بہت جلدی غصے میں آ جاتا تھا۔ بابا جان کو ہمیشہ عبدالرحمن سے خوف آتا تھا کہ کہیں وہ غصے میں کچھ کر نہ دے لیکن بابا مجھ پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ بہت محبت تھی انہیں مجھ سے۔ بہت ناراض اور خفا تھے وہ مجھ سے۔ کتنا چاہتا تھا میں نے کہ وہ میری اس غلطی کو معاف کر دیں لیکن وہ میری بات ہی نہیں سنتے تھے۔

اس نے انہیں زبردستی سونے کے لیے لٹایا تھا۔

”بس پاپا باقی باتیں کل کر لیں گے۔ اب میں آپ کی ایک بات بھی نہیں سنو گی۔“

اور اس رات وہ کتنی پرسکون ہو کر سوئی تھی۔ بہت پر امید کہ اب پاپا جلدی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن جب اس نے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تو پاپا کا چہرہ اسے بہت زرد لگا۔ یوں جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

”پاپا آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“ اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

”ہاں ٹھیک تو ہوں لیکن پتا نہیں کیوں دل کچھ بھجا بھسا ہے۔“

”دراصل جب کوئی بہت خوش ہوتا ہے تو کبھی کبھی دل ایسے ہی بھج جاتا ہے۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔

”آپ بھی تو بہت خوش تھے نارات۔“

”شاید“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”آپ بہت دیر سے جاگ رہے ہیں کیا۔ میں آپ کے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔“

”نہیں ابھی..... ابھی آنکھ کھلی ہے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی اور دودھ نہیں پیوں گا ابھی۔ مریم بیٹا مجھے تیمور نینا اور عاشری بہت یاد آ رہے ہیں۔ میں نے شاید خواب میں تیمور کو دیکھا ہے تم اسلم کو بھیج کر انہیں دیکھو۔“

”ٹھیک ہے پاپا“ میں ابھی اسلم چاچا کو کہہ دیتی ہوں۔ وہ لے آتے ہیں انہیں۔ آنٹی نرگس سے کہوں گی وہ ان کی پرسنل کو فون بھی کر دیتی ہیں۔“

”دیکھو اسلم کو سمجھا دینا، وہاں انہیں میری بیماری کا نہ بتائے۔ عاشری بہت نازک دل ہے۔ گھر آ جائیں کھانا دانا کھالیں تو محل سے بتانا۔“

اس روز اس کا گھر جانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا لیکن عاشری نینا اور تیمور کی وجہ سے اسے جانا پڑا۔ پاپا کی خواہش تھی کہ جب وہ آئیں تو وہ گھر پر ہو۔

”اور تم میری نگرہ نہ کرو۔“ پاپا نے اسے تسلی دی ”میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں اور ابھی عادل آ جائے گا۔“

اسے عادل کو دیکھنے کا بھی اشتیاق ہو رہا تھا۔ اس نے انکل مجتبیٰ کے ساتھ آنے والے اجنبی کو سرسری نظر سے دیکھا تھا اور اب..... وہ ایک رشتے کے حوالے سے اسے دیکھے گی۔ سو بیٹا ہی سہی تھا تو اس کا بھائی ہی نا۔ پاپا کا بیٹا اور پاپا کہتے خوش تھے۔ اس سے مل کر لیکن جب وہ نینا عاشری اور مور کے ساتھ اسپتال آئی تو عادل جا چکے تھے۔ عثمان احمد ان تینوں سے مل کر بہت مضطرب ہو گئے تھے۔ تیمور کو بہت دیر تک اپنے سینے سے لگائے وہ آنکھیں بند کیے رہے۔

”پاپا“ اس نے آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور تیمور کو اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

”رہنے دو مومو۔ باپ کے سینے کی گرمی شاید یہ پھر کبھی محسوس نہ کر سکے۔“

”پاپا“ وہ روہا سی ہوئی ”ایسی باتیں نہیں کریں پلیز اور ابھی تو آپ نے ہمارے ساتھ حویلی جانا ہے۔ ہم سب کو لے کر۔“

”مومو“ عثمان احمد نے نظریں اٹھائیں۔

”جی پاپا۔“ وہ ان کی طرف جھکی۔

”بیٹا“ تیمور ابھی بہت چھوٹا ہے۔“ ایک ہاتھ تیمور کے گرد حائل کئے کئے انہوں نے مریم سے کہا ”تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے۔ سب کا دھیان رکھنا ہے تمہیں۔ عادل کے آنے سے مجھے اطمینان تو ہو گیا ہے کہ اگر کبھی زندگی میں یہ تینوں اکیلے رہ گئے تو عادل انہیں سمیٹ لے گا۔ پھر بھی مجھ سے وعدہ کرو بیٹا کہ تم ان کا بہت دھیان رکھو گی۔ بہت محبت اور پیار سے رہنا۔ تمہاری ماما کی اپنی دلچسپی اور اپنے شوق ہیں۔“

انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پاپا“ مریم نے اپنے دونوں ہاتھ تیمور کے گرد رکھے ہوئے ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے ”آئی پر مومو میں ان کا دھیان رکھوں گی۔ اپنی زندگی سے بڑھ کر انہیں چاہوں گی بلکہ چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز سن کر ”آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں گے ہمیشہ۔ ہم سب کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔“ عثمان احمد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔

”مریم بیٹا“ مجھے تم سے ایک اور بات بھی کرنی ہے۔ پتا نہیں آج سے پہلے تم سے یہ بات نہ کر کے میں نے کوئی زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ یا..... لیکن ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور.....

جب ہی ڈاکٹر رافع آ گئے تھے اور وہ بات مکمل نہ کر سکے تھے اور چپکے چپکے جانے وہ ڈاکٹر رافع سے کیا کہتے رہے اور پھر چانک ہی ڈاکٹر رافع سے بات کرتے کرتے ہی ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور پتا نہیں وہ کیا بات تھی جو پاپا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ڈاکٹر سوچا کرتی تھی لیکن کوئی اندازہ نہ کر پاتی تھی۔

پاپا کو اسی وقت آنی سی یو میں لے جایا گیا تھا اور پھر تقریباً چار گھنٹے بعد انہیں اپنے کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ ہوش میں تھے اور انہوں نے عادل کو بلوانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ شہر یا فوراً ہی عادل کو فون کرنے چلے گئے تھے اور وہ ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر ان کے بیڈ کے پاس دوڑا نو بیٹھ گئی تھی۔ عاشری نینا اور تیمور تینوں ہی اس کے پاس کھڑے تھے اور عاشری بار بار گلہ کر رہی تھی کہ پاپا اتنے بیمار تھے اور اس نے انہیں پہلے کیوں نہیں بلوایا۔

اور پھر عادل آ گئے تھے۔ بہت پریشان سے اور عادل کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی پاپا کو پھر آئی سی۔ یو میں لے جانا پڑ گیا اور پھر وہ رات کتنی طویل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس رات کی سرکبھی نہیں ہوئی۔ دعا کیں مانگتے مانگتے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں دل کے اندر یہ خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اب اس لمحے کے بعد وہ پاپا کو زندہ نہیں دیکھ پائے گی اور پھر جب وہ سب آئے جن کا پاپا کو انتظار تھا اور جن سے ملنے کا اسے اشتیاق تھا تو ان سے اپنے رشتے کا علم نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بی آپا اور بڑی اسی کے گلے لگ کر بہت روئی تھی۔ بی آپا نے اسے تسلی دی تھی۔

”دعا کرو۔“

اور وہ شہر یار کی منت کر کے دوبارہ پاپا کے پاس گئی تھی اور ان کے سر ہانے کھڑے ہو کر انہیں روتی آواز میں بتاتا تھا ”پاپا“ وہ سب آ گئے ہیں۔ ایک بار صرف ایک بار آنکھیں کھول کر انہیں دیکھ لیجیے۔ بڑی اسی سے چاچا جی سے معافی مانگ لیجیے۔“

لیکن اس کی آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی اور شہر یار سے باہر لے آئے تھے۔ باہر سب ہی تھے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز انکل ہادی۔ شہر یار وقفہ وقفہ سے ان کے پاس آتے انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتے

لیکن اندر ہی اندر کسی انہونی کا یقین اس کا دل کاٹ رہا تھا۔

”پاپا ٹھیک ہو جائیں گے نا“ وہ پرامید نظروں سے شہر یار کی طرف دیکھتی تھی شاید شہر یار کو اس کے اندر کے اس یقین کو فنی کر دے لیکن شہر یار نظر میں چرچا جاتا۔

کبھی کرب ناک رات تھی۔ وہ ساری رات نینا کا سر گود میں رکھے عاشری کے گرد بازو دھرائی کرتی اور دعائیں مانگتی رہی اور پھر صبح ہو گئی۔ شہر یار تھکا تھکا سا سر جھکائے آئی۔ سی۔ یو سے باہر آیا۔ عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”وینٹی لیٹر ہٹا دیا گیا ہے۔“ پھر اس نے سر اٹھا کر وضاحت کی ”سارے فنکشنز نے ایک دوسرا کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

عادل لمحہ بھر ہونٹ بھیجنے شہر یار کو دیکھتے رہے اور پھر ایک دم عاشری نینا اور تیمور کو اپنے بازوؤں میں کر رہے اور اسے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

گھر سے سب ہی آگئے تھے۔ شریف، اسلم، چاچا، صفو، جینا سب ملازم ان کے آس پاس کھڑے تھے جب عادل نے سر جھکائے اس سے اجازت چاہی کہ وہ پاپا کو حویلی لے جانا چاہتے ہیں۔

وہ کیا کہتی اسے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑے تھے اور پاپا نے ان کو ہی سب کی ذمہ داری سونپی تھی جو بہتر سمجھتے کرتے اور تب ہی میڈم نرگس آگئی تھیں۔ سیاہ ساڑی میں مکمل میک اپ کے ساتھ وہ سرخ لپ اسٹک میں تھڑے ہوئے ہونٹ۔ اس نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

وہ مزاح سے ٹٹو سے آنکھیں پونچھتی اسے اور عاشری کو بتا رہی تھیں کہ زینبی سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ تو کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کے سامنے تو بس پاپا تھے۔ ان کی بند آنکھیں اور خاموش لب تھے۔ وہ ان کے ہاتھ چومتی، کبھی ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتی۔

میڈم نرگس اس کے کانوں کے پاس منہ رکھے خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ پاپا کو حویلی لے جانے سے منع کر رہی تھیں یا بتا نہیں کیا۔

اس نے ایک بازو رخ پھیر کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اگر ماما یہاں ہوتیں تو شاید وہ بھی یوں آئی نرگس کی طرح سیاہ ساڑی باندھ کر تک سب سے درست ہو کر دکھا کر اظہار کرتیں۔ جانے کیسے پیٹا لمحہ بھر کے لیے اس کے ذہن میں آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ بیڈ کے کنارے پر سر رکھ کر گئی تھی۔

اور پھر شہر یار نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا ”مریم۔“ اس نے سر اٹھا کر شہر یار کو دیکھا۔ کے پیچھے عادل تھے ڈاکٹر عبدالعید تھے وہ سب عثمان احمد کو لینے آئے تھے۔ وہ اٹھ کر ایک طرف ہو گئی۔ سب ہی حویلی آئے تھے۔ میڈم نرگس، انکل ہادی، معید، بیگم آفندی اور جانے کون کون۔



پاپا کا گھر تھا اتنا بڑا محل نما۔ جب ایبوی لنس حویلی کے گیٹ میں داخل ہوئی تو اس نے حیرت سے دیکھا۔ یہاں سے وہاں تک لوگ ہی لوگ تھے۔ جانے کہاں کہاں سے اٹھ پڑے تھے اور یوں رو رہے تھے۔ پاپا یہاں سے جانے کے بعد بھی ان کے دلوں میں رہے تھے۔ یہاں کتنی شان تھی پاپا کی اور وہاں گھر کے سامنے بھیگی مٹی بنے رجتے تھے اور وہ ہمیشہ شک کا شکار رہتی تھی کہ وہ جو ماما اکثر بتایا کرتی تھیں کہ عثمان احمد ایک بڑے جاگیردار ہیں۔ وہ سب جھوٹ ہے اور پاپا کا تعلق کسی نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ جب ہی وہ اتنے دے دے رہتے ہیں اور شاید میڈم نرگس کو بھی ماما کی باتوں کا یقین نہیں تھا۔ یہی تو وہ بالکل اس کے پیچھے بیٹھی بیگم آفندی سے تمبرہ کر رہی تھیں۔

”یہ عثمان بھائی تو جی جی بڑے جاگیردار نکلتے۔ میں تو حیران ہو رہی ہوں اتنا بڑا گھر دیکھ کر۔“

”نہ بولا دے دس گنا بڑا ہوگا۔“ مسز آفندی چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

”یہ عثمان احمد کا بیٹا اور پہلی بیوی بھی تو ہے لیکن زینبی نے کبھی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ بڑی گھٹی ہے۔ اب تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اسے علم نہ ہو۔“

”زینبی کے بچے بھی تو عثمان احمد کی جائیداد میں حصے دار ہوں گے۔“

”ہاں لیکن۔“ میڈم نرگس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”پھوڑ لیکن ویکن زینبی بڑی چیز ہے۔“ بیگم آفندی ہولے سے ہنسیں ”اکیلے ہضم نہیں کرنے دے گی عثمان احمد کے بیٹے اور بیوی کو سب کچھ اور اس وقت یہاں زینبی کی موجودگی کتنی ضروری تھی۔“

”ہاں لیکن وہ۔“ میڈم کی دبی دبی ہنسی ”دیکھنا آفندی بیگم اب وہ شرجیل مرزا سے شادی کر لے گی۔“

”اف! مریم کا جی چاہا کہ وہ انہیں وہاں سے اٹھا دے۔ اس کے بالکل پاس سفید دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ سویر اور مدہ بری۔ آنسو بڑی روانی اور آہستگی سے ان کے رخساروں پر پھسل رہے تھے اور

رہانے کی طرف لی آپا تھیں اور جو روتے روتے کبھی شکوہ کرتیں۔

”عثمان بچا کیوں کیا آپ نے ایسا۔ بابا جان نے اپنے دروازے بند کر لیے تھے تو آپ ہی آجاتے ان کے بعد۔ سب آپ کو کھلے بازوؤں سے ملے اور اب آئے ہیں تو آنکھیں ہی نہیں کھولتے۔“

اور خدا بخش تھا جوان کی پانچویں بیٹھا تھا اور بار بار ان کے پاؤں چومتا اور خدا جانے کیا کیا کہتا تھا۔

یہ سب محبت کرنے والے چاہنے والے لوگ تھے پھر کیوں چلے گئے تھے پاپا ان سب کو چھوڑ کر۔

وہ آنکھیں کھولتے تو ضرور ان سے پوچھتی لیکن انہوں نے تو آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ماما کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ جن کی مرضی کے بغیر وہ بچوں سے بھی بات نہیں کرتے تھے۔ اب اتنے لیے سفر پر ان سے

پوچھنا انہیں بتائے بغیر چلے گئے تھے اور اس وقت ماما کی یہاں موجودگی کتنی ضروری تھی۔ شاید میڈم

نرگس ہی کہتی تھیں۔

اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا تھا اور پھر مڑ کر پیچھے کھڑی عاشری کو گلے لگایا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد عاشری یا نینا کو گلے لگا کر رونے لگی تھی۔
وقت کیسے گزرا اسے خبر ہی نہیں تھی۔

عثمان احمد کی تدفین کے بعد جب لوگ آئے تو وہ بیگم آفندی سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر روئی۔
نے بڑھ کر آتے علیحدہ کیا۔

”حوصلہ کرو بے بی صبر کرو۔“ انگل ہادی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی ”ہم پھر آئیں گے۔
تمہاری خبر لیتے رہیں گے۔“

پتا نہیں۔ وہ کیا کیا کہتے رہے تھے۔ اس کا ذہن کچھ بھی قبول نہیں کر رہا تھا۔
”عاشری۔“ اس نے قریب کھڑی عاشری کی طرف دیکھا ”پاپا ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“
پاس کھڑے عادل نے عاشری کے گرد اپنے بازو لپیٹ لیے ”میں ہوں تمہارا بڑا بھائی۔“ اور انگلی سے
پوروں سے اس کے آنسو پونچھے تھے اور ڈاکٹر ہادی کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں ڈاکٹر ہادی۔ ہم سب یہاں ان کا خیال رکھیں گے۔ ہمارا اپنا خون ہیں یہ۔ آپ
ان کے لیے پریشان نہ ہوں۔“

”ہاں میری بھی خواہش تھی کہ یہ زینی کے آنے تک یہاں ہی رہیں آپ کے پاس۔“
اور پھر وہاں کامل آگیا تھا اور عادل کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگا تھا۔

”بھائی سب روتے کیوں ہیں؟“
اور تب عادل نے عاشری کو اپنے ساتھ بٹھائے بٹھائے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”عاشری۔ یہ بھی تمہارا بھائی ہے۔ دیکھو اسے۔ جسے خبر تک نہیں کہ کون دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ کیا
تا تھا اس کا اس کے ساتھ اور پھر اسے خبر بھی کیا ہو۔ اس نے تو کبھی اپنے باپ کو دیکھا ہی نہیں۔“

اور اس نے پہلی بار سراٹھا کر عادل کو غور سے دیکھا تھا اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ بھی عادل سے لپٹ
کر خوب روئے۔ اتنا کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے لیکن دل کا بوجھ تو جیسے گزرے دنوں کے ساتھ بڑھتا ہی جا
رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ آسنا نہ رہی کہیں ٹھہر گئے ہوں اور ان آنسوؤں کا بوجھ دل پر دھرا ہوا اور جب
عاشری عادل کے ساتھ نہ بولے آئیں تو گیت میں قدم رکھتے ہی اسے لگا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے
گا۔ پاپا جیسے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ماما کے پیچھے ہولے ہولے
چلتے دھیمے دھیمے انہیں سمجھاتے ہوئے۔

وہ بیمار ہو جاتیں تو کتنے پریشان ہو جاتے۔ ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ بار بار ڈاکٹر
ہادی کو فون کرتے اور اس آخری روز وہ لاؤنچ میں میڈم نرگس سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھاگ کر لاؤنچ

میں آتی تھی اور پھر صوفے کے کنارے پر سر رکھ کر رونے لگی تھی اور جب ماما باہر گئی تھیں وہ کتنی باتیں کرتے
تھے اس سے آنے والے لمحوں کے لیے جیسے لاشعوری طور پر اسے تیار کر رہے تھے۔

اپنے کمرے میں اسٹڈی کرتے ہوئے اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے کوئی بات کرتے ہوئے۔
ان سب مناظر کے حیرے لکھنا کتنا مشکل تھا ان کے لیے وہ ایک ایک چیز سے لپٹ کر روئی،
جیسے ہر چیز سے ان کی مہک ان کی خوشبو آ رہی تھی۔

”مریم، پلیز حوصلہ کریں۔“ عادل نے دھیمے لہجے میں کہا تھا اور روتی ہوئی عاشری کو اپنے ساتھ لپٹا کر
اس کے بالوں کو چوما تھا۔

”بس اب رونا نہیں ہے۔“
اور مریم نے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا تھا کہ عادل کے دل میں شاید اس کے لیے کوئی بغض ہے کہ وہ

عاشری اور نینا کی طرح اس سے بات نہیں کرتے۔ ہمیشہ ایک فاصلے پر رہ کر بات کرتے ہیں۔ آتے ہوئے
اس نے بار بار سب کو تاکید کی تھی کہ جیسے ہی ماما کا فون آئے، انہیں حویلی کا نمبر دے دیں لیکن ماما نے
پورے بیس دن بعد فون کیا تھا۔ ان کی آواز سنتے ہی ضبط کی لگائیں اس کے ہاتھ سے جھوٹ گئی تھیں اور کتنی
ہی دیر تک وہ بات ہی نہیں کر سکی تھی۔

ماما کو وقت پر اطلاع نہ ملنے کا افسوس تھا لیکن مریم کو ان کا لہجہ بالکل ساٹ لگا۔ اگرچہ انہیں میڈم نرگس
سے پوری تفصیل معلوم ہو چکی تھی پھر بھی انہوں نے مریم سے دو چار باتوں کی تصدیق کی تھی اور یہ جان کر
انہیں اطمینان ہوا تھا کہ عاشری نینا اور تیرہ مری جا چکے ہیں۔

”ہر ویک اینڈ پر عادل بھائی ان سے ملنے جاتے ہیں۔ کچھ دنوں تک موسم سرما کی چھٹیاں ہو جائیں
گی تو پھر وہ انہیں لے آئیں گے۔“

”یہاں حویلی میں تم لوگوں کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔“
”کیسا خطرہ؟“ مریم کو حیرت ہوئی تھی۔

”بھئی یہی جاگیر دار وغیرہ اکثر جائداد زمین کی لالچ میں گئے بہن بھائیوں کو بھی مار دیتے ہیں پھر تم
لوگ تو سوتیلے ہو۔“

”مگر ماما پاپا کا تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ تو عادل بھائی اور کامل کا ہے۔ دادا جان نے اپنی
زندگی میں ہی سب کچھ ان کے نام کر دیا تھا اور پاپا کے نام تو بس وہی سرگودھا والی زمین ہے جس کی آمدنی

پاپا کی زندگی میں ان کو ملتی تھی اور ان کے بعد بچوں کو ملے گی۔“ بی بی آپا سے حاصل کردہ معلومات اس نے
انہیں منتقل کر دی تھیں۔

”خیر۔“ انہوں نے بیزار سے کہا ”عاشری اور نینا کی چھٹیاں ہو جائیں گی تو تم لوگ لاہور چلے جانا

میں نرگس کو کہہ دوں گی وہ تمہاری خبر خیر لیتی رہے گی اور ڈاکٹر ہادی بھی دھیان رکھیں گے تمہارا۔“

”اور آپ..... آپ کب آئیں گی؟“

”میں اب عدت گزار کر ہی آؤں گی۔ تمہارے پاپا کی اچانک ڈھچک خبر نے میرے اعصاب کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ آج کتنے دن بعد طبیعت سنبھلی ہے تو تمہیں فون کیا ہے۔“

”مگر ماما..... ہم..... ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔ ہم آپ کے لیے اداس ہو رہے ہیں۔ تیمور آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ بہت مس کر رہا ہے وہ..... عاشی اور نینا بھی۔“

مگر ماما نہیں آئیں تھیں۔

”کیسی ماں ہیں وہ!“ بی آپا کو حیرت ہوئی تھی ”اطلاع ملنے کے باوجود نہیں آئیں۔ تمہارے دکھ کا احساس ہی نہیں ہوا انہیں اور اپنے نقصان کا۔“

”نہیں، دراصل۔“ وہ نگاہیں جھکائے وضاحت کرنے لگی تھی ”وہ ذرا سی بات پر ڈپریشن ہو جاتی ہیں پھر ہفتوں مہینوں بستر سے اٹھ ہی نہیں پاتیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے اور یہ..... یہ تو اتنا بڑا حادثہ ہے کہ ان کے اعصاب بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔ بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے ان کے اندر۔“

”اور تمہارے نصیال سے بھی تو کوئی نہیں آیا۔“

بی آپا کی فطرت میں تجسس نہیں تھا لیکن انہیں زہنی کے رویوں پر حیرت تھی۔

”وہ دراصل صرف نانا ہیں۔ نانا کا تو انتقال ہو چکا ہے۔“

بی آپا سمجھ رہی تھیں کہ زہنی اپنے والدین کے پاس گئی ہوئی ہے۔ مریم نے وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ ماما کا فلموں میں کام کرنا پسند نہیں کریں اور وہ ان کی محبتوں سے محروم ہو جائیں۔

اس نے عاشی اور نینا کو بھی منع کر دیا تھا۔

”مگر کیوں؟“ عاشی نے بحث کی تھی ”اس میں کیا برائی ہے؟“

”چنانچہ کوئی برائی ہے یا نہیں لیکن دیہات میں لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے نا اس لیے میں نہیں چاہتی کہ یہ لوگ ماما کو غلط سمجھیں۔“

عاشی نے پھر بحث نہیں کی تھی لیکن وہ کچھ ابھی ابھی ہی لگنے لگی تھی۔

”بھو، بعض اوقات آپ کی باتیں مجھے سمجھ نہیں آتیں۔“

ماما تو نہیں آئی تھیں البتہ میڈم نرگس، بیگم آفندی دو بار آئی تھیں۔ انکل ہادی اور ڈاکٹر عبدالعزیز بھی آئے تھے۔ انکل ہادی تو اکثر فون کر کے خیریت پوچھتے تھے۔ یعنی بابا جان اور صالحہ بھی آئی تھیں۔

وہ یعنی اور صالحہ سے لپٹ کر بہت روئی تھی۔ بابا جان کتنی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے دلاسا دیتے رہے تھے۔

”ارے میں تو پروگرام ہی بنا تا رہ گیا تمہارے پاپا سے ملنے کا۔“

”ہاں پاپا نے کہا تھا کہ جب وہ اچھے ہو جائیں گے تو آپ سے ملیں گے۔“

”تم لاہور کب آؤ گی مومو؟“ یعنی نے جاتے جاتے پوچھا تھا۔

”چنانچہ ماما آجائیں تو پھر ابھی بڑی امی اور بی آپا جانے نہیں دیتے۔“

”یہ بھی تو اس کا اپنا ہی گھر ہے۔“ بڑی امی نے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

”یہ سب لوگ بہت چاہنے والے ہیں۔“ اس نے یعنی کو بتایا تھا۔

”وہ تو خیر اندازہ ہو رہا ہے۔“ کس طرح سب نے ان کی تواضع کی تھی۔ رکنے پر اصرار کیا تھا۔

”تم اپنوں میں ہو۔ مطمئن ہو تو دل کو سکون ملا ہے ورنہ میں نے سوچا تھا تمہیں کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے جاؤں گا۔“ چوہدری ثار نے رخصت ہوتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ”لیکن جب دل گھبرائے فون کر دینا۔ میں خود آ کر اپنی بیٹی کو لے جاؤں گا۔“

سب لوگ کتنا خیال رکھنے والے تھے لیکن ایک ماما کے نہ ہونے سے یوں لگتا جیسے پاپا کے بعد وہ بالکل اکیلی ہو گئی ہے۔ تنہا اور ایک وہ تھی لالہ کی بچی جس نے مڑ کر اس کی خبر بھی نہ لی تھی۔ فون پر بھی افسوس نہیں کیا تھا۔

ایک روز اچانک ہی اسے لالہ کا خیال آ گیا اور اس روز بڑی امی سے اجازت لے کر اس نے لاہور فون کیا تھا۔

”چل گئی ہے وہ اپنے باپ کے پاس۔“ میڈم نرگس نے بتایا۔

”کیا کب..... کب گئی وہ؟“ وہ حیران رہ گئی تھی۔

”تمہارے پاپا کی ڈھچک سے ایک روز پہلے آجائے گی، نہیں ٹکے گی وہاں۔ حویلیوں میں قید رہ کر نہیں رہ سکتی وہ اور سنو مومو۔“ ان کی آواز میں سرگوشی ڈھل گئی ”ادھر تو سب ٹھیک ہے نا۔“

”جی۔“ ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی اس نے جی کر دیا۔

”ادھر ادھر کی ٹوہ رکھنا اور ہوشیار رہنا۔“

”کیا مطلب؟“

”ان جاگیرداروں کا کیا بھروسہ۔ بڑے عیاش ہوتے ہیں۔“

اسے ان کی ذہنیت پر افسوس ہوا تھا۔ جانے کیا خناس بھرا تھا ان کے ذہن میں جانے کہاں کی کہاں ملائی رہتی تھیں۔ لالہ کے اس طرح چلے جانے پر اسے دکھ ہوا تھا۔

کم از کم بتا کر تو جاسکتی تھی۔

فون تو کر سکتی تھی۔

کتنی اچھی لگتی تھی وہ اسے سچی اور کھری اور اب پتا نہیں زندگی میں اس سے کبھی مل سکی پائے گی یا نہیں۔ پتا نہیں وہ اپنے باپ کے پاس جا کر خوش ہے یا نہیں اور یہ میڈم نرگس اسے یاد دلاتی ہوئی گی۔ اور وہ میڈم نرگس سے محبت بھی تو بہت کرتی تھی۔ ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کسی کسی اور پٹانگ حرکتیں کیا کرتی تھی اور جب میڈم نرگس اس کے لیے پریشان ہوتی تو جی جی میں خوش ہوتی کہ میڈم اس سے محبت کرتی ہیں۔ بس ان کی سوشل ایکٹیوٹیٹیز ہی کچھ ایسی ہیں کہ توجہ نہیں دے پاتیں اور وہ تو اسے بھی بڑے بوڑھوں کی طرح سمجھاتی تھی۔

”یاریہ ہمارے طبقے کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ محبت کرتی ہیں اپنی اولاد سے لیکن ان کی محبت کے انداز مختلف ہوتے ہیں“ اور پھر اب کیسے اس نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔

میڈم کے بغیر کیسے رہ رہی ہوگی وہ۔

کیا صرف اعزاز کے لیے۔

اس کی محبت کا خاطر اس نے میڈم کا گھر چھوڑا اور کبھی اسے ایسا کوئی فیصلہ کرنا پڑتا تو وہ می کے بغیر رہ سکتی تھی..... نہیں کبھی نہیں۔

اور لالہ بھی نہیں رہ سکے گی۔

اس نے خود ہی خود سوچ لیا تھا۔

میڈم صحیح کہتی ہیں۔

وہ واپس آ جائے گی۔

اور پتا نہیں ماما کب آئیں گی۔

اس کا ذہن پھر زینہ کی طرف چلا گیا۔

ابھی کچھ دنوں میں عاشری زینا اور تیمور آ جائیں گے پھر وہ تیمور سے کیا کہے گی۔ ایک تو وہ اتنے سوال کرتا تھا کہ اسے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ وہ اسے کس طرح مطمئن کرے اور پھر وہ کتنا اداں ہوگا یہ جان کر کہ ماما بھی بھی نہیں آئی تھیں۔

اور پتا نہیں وہاں ماما کی کیا مصروفیات ہیں اور کیا واقعی وہ بیمار ہیں؟

اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

اور میڈم نرگس نے بتایا تھا کہ وہ امریکا چلی گئی ہیں اپنے ڈیڈی کے پاس اور وہاں سے سیدی پاکستان آئیں گی لیکن کب..... اتنے سارے دن ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد اس کا رزلٹ آنے والا تھا پھر اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی لینا تھا کیونکہ وہ یہاں تو نہیں رہ سکتی تھی۔ بڑی امی اور بی آبا بھی ان کو جانے ہی نہیں دے رہے تھے۔ پچھلے ویک اینڈ پر عاشری نے کتنی ضد کی کہ اب وہ لاہور ہی جائیں گے۔

”یہاں دل نہیں لگتا بھو۔ چینیوں میں اپنے گھر میں رہیں گے۔“

”اسکیلے۔“ بی آبا کو حیرت ہوئی۔

”اسکیلے کہاں اتنے سارے لوگ تو ہیں وہاں۔ صفو شریف چاچا اور اسلم مالی۔“

”لیکن اپنا تو کوئی نہیں ہے۔“

”زینہ کے آنے تک تم لوگ یہاں ہی رہو گے۔“ بڑی امی نے فیصلہ نہادیا تھا۔

”چاہے ماما ایک سال نہ آئیں۔“ عاشری بڑبڑاتی تھی لیکن مریم ان کی اس اپنائیت کے سامنے ہار ہی گئی تھی حالانکہ اسے اپنا گھر اپنا کمرہ سب ایک دم شدت سے یاد آ گئے تھے۔

”مومو! میں ہوں نا! آپ کا بھائی پھر کیا ڈرتا۔“ تیمور نے سمجھایا وہ اکیلے رہنے سے ڈر رہی ہے۔

”نہیں میری جان ڈر کیسا تم ہوتا۔ ماما نے کہا تھا کہ ان کے آنے تک ہم یہاں ہی رہیں۔“ اس نے بے اختیار تیمور کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”ماما نے کہا تھا؟“ عاشری نے حیرت سے پوچھا ”ان لوگوں کے پاس رہنے کو جن لوگوں کا ذکر بھی انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا اور شاید جن کے متعلق وہ جانتی بھی نہ ہوں۔ یقیناً پاپا نے انہیں بتایا تک نہ ہوگا کہ ان کی ایک بیوی اور دو بیٹے بھی ہیں۔“

اس نے سر اٹھا کر عاشری کو دیکھا۔ اس ایک سال میں عاشری میں کتنی تیزی سے تبدیلی آئی تھی۔ خاموش طبع اور بات بات پر منہ بسورنے والی عاشری اب غور کرنے اور بولنے لگی تھی۔

”نہیں عاشری۔“ اس نے تھل سے اسے سمجھایا ”پاپا نے ماما سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ ماما کو بڑی امی اور عادل بھائی کے متعلق علم تھا اور یہ سب کتنا چاہتے ہیں ہمیں اور کتنا خیال رکھتے ہیں ہمارا۔“

”ہاں یہ تو ہے بھو۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں لگتا یہاں۔ خدا کرے ماما جلدی آ جائیں۔“

اور ماما تھیں کہ ابھی نہیں رہی تھیں۔ وہ جب بھی فون کرتی چند دنوں بعد آنے کا کہہ دیتی تھیں۔

بے حد تھک کر اس نے نیچے پر سر رکھا تھا کہ بی آبا نے اندر جھانکا۔

”تم تیار نہیں ہوئیں مریم؟“

”اوہ ہاں۔ بی آبا آ جائے نا۔“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”حرم کی طرف نہیں چلو گی۔“

”جاؤں گی کیوں نہیں اور مجھے کیا تیاری کرنی ہے۔ چلیں۔“ اس نے چادر اٹھالی۔

”کپڑے تو تبدیل کر لو مریم کل سے یہی پہنے ہوئے ہو۔“

”ٹھیک تو ہیں بی آبا۔“

”کوئی ٹھیک نہیں ہے گریا۔“ انہوں نے مسکرا کر اس کے رخسار پر چھکی دی ”تم پانچ منٹ میں چنچ

کر کے آجاؤ میں اتنے میں ماں جی کو بتاتی ہوں۔“
 ”جی اچھا۔“ مریم سر ہلا کر کپڑے نکالنے لگی۔



پروفیسر عادل کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے دائیں ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ لیے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کو ہولے ہولے دبا رہے تھے کہ سرور نے قریب آ کر آہستگی سے انہیں آواز دی۔
 ”سر۔“ مگر وہ یہ نہیں بے دھیانی سے ہولے ہولے سر کو دبا رہے۔
 ”سر پلیز۔“ سرور نے انہیں دوبارہ پکارا تو وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔ سگریٹ کی راکھ دائیں ہاتھ میں رکھی ہوئی چھوٹی ٹیبل پر پڑی ایش ٹرے میں ڈالی اور سرور کی طرف دیکھا۔
 ”تم کب آئے؟“

”بہت دیر سے آپ کو نوٹ کر رہا تھا لیکن آپ گرد و پیش سے بالکل بے خبر تھے۔“
 ”ہوں۔“ وہ مسکرائے ”خود سے بے خبری اور خود فراموشی میں بڑی عافیت ہوتی ہے سرور۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ زندگی بے خبری اور خود فراموشی میں گزر جائے۔“
 ”مگر یہ تو ایک طرح کا فرار ہے سر۔“ سرور ان کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔
 ”شاید لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے تاکہ آدمی دنیا کے سارے تھمیلوں کو بھول کر بس اپنے اندر کی دنیا میں قیام کر لے۔ وہیں جیسے وہیں مرے۔“
 ”سزا یک بات پوچھوں۔“ سرور نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”ہوں۔“ پروفیسر عادل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

”سر میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے اندر بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ بہت خوش ہوں۔ کبھی لگتا ہے بہت اداس ہوں اور کوئی گہرا درد آپ کے دل کو چھیل رہا ہو اور کبھی لگتا ہے جیسے کوئی بڑی گتھی ہے جسے سلجھانے میں آپ کے ذہن و دل کی ساری صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں اور کبھی سلجھ نہ پاری ہو۔“

”بہت غصہ کا مشاہدہ ہے تمہارا سرور۔“ وہ کھل کر مسکرائے اور ہاتھ میں پکڑا ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک کر نیا سگریٹ سلگا یا۔

”سر۔“ سرور سنجیدہ ہو گیا ”آپ مجھے اپنا چھوٹا بھائی اور دوست کہتے ہیں۔ کیا آپ اپنی الجھن میرے ساتھ شیئر کریں گے۔ کیا خبر اس الجھی گتھی کا کوئی سرا میرے ہاتھ آ جائے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے چھوٹے بھائی بھی ہو اور دوست بھی لیکن فی الحال تو کوئی ایسی بات نہیں۔ ہاں اگر کبھی کوئی بات ہوئی، کوئی گتھی سلجھ نہ سکی تو تم سے ضرور شیئر کروں گا۔“ پروس اور

ہاں تمہارا کام تو تقریباً مکمل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے فائل کے بعد فوراً ہی تمہارا کام سامنے آجائے۔ تمہاری ایگزیکشن کے سلسلے میں میں نے تجویزی اور تصدیق سے بات کی تھی لیکن پھر والد صاحب کی اچانک ڈیجھ..... بہت سے کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ بہر حال اب تم امتحان سے فارغ ہو جاؤ تو پھر اطمینان سے کام کریں گے۔ میں نے تصدیق احمد سے بھی کہا ہے کسی دن وہ تمہارا کام دیکھ لیں گے۔ انہوں نے ایک دم ہی بات پلٹ دی۔ سرور انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر پھر سر جھکا لیا۔
 ”کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ پروفیسر عادل کی نگاہیں اس کی طرف ہی تھیں۔

”نہیں سر۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”کیا خیال ہے ایک کپ چائے نہ ہو جائے۔“
 ”جی میں کہتا ہوں خدا بخش سے۔“ سرور اٹھ کھڑا ہوا تب ہی فون لی بیس بیج آئی۔ سرور نے ریسیور اٹھا کر انہیں دیا اور خود چائے کا کہنے چلا گیا۔

دوسری طرف مریم تھی۔
 لمحہ بھر کے لیے وہ اس کی آواز کی نفی میں کھو سے گئے۔
 ”ہیلو۔“ مریم نے پھر کہا تو وہ چوہے کے۔
 ”آپ مریم۔ خیریت؟“

”جی وہ میں نے آپ کو یاد دلانا تھا کہ کل سے عاشری وغیرہ کی چٹھیاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ انہیں لینے جائیں گے لیکن اگر آپ مصروف ہوں تو میں اسلم چا چا سے کہہ دوں۔“
 ”نہیں۔ مجھے یاد ہے اور میں خود لے آؤں گا۔ میں نے مور سے وعدہ کیا تھا کہ خود لینے آؤں گا۔“
 ”مور آپ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔“
 انہیں لگا جیسے مریم کی آواز بھیگ رہی ہو۔

”وہ بہت پیارا بچہ ہے۔ خود بخود دل میں جگہ بنا لینے والا۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔
 ”اچھا تھینک یو۔“ ماما بھی شاید چند روز میں آجائیں ان کا فون آیا تھا کہ وہ پہلے سے بہت بہتر Feel کر رہی ہیں اور جلد ہی آجائیں گی۔“

پروفیسر عادل خاموش رہے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ نذیب عثمان احمد کے آنے کی خبر سن کر جیسے ان کے اندر کچھ سمجھ سا گیا تھا اور عجیب سی اداسی نے یک دم ہی ان کا گھبراؤ کر لیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ریسیور تھا یہ بیٹھے رہے اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کب مریم نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔
 مریم نے ان چند ماہ میں پہلی بار اس طرح انہیں فون کیا تھا۔ خود سے دو چار بار انہوں نے حویلی فون کر کے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

”مریم“ انہوں نے زیر لب دہرایا ”کس قدر خوب صورتی اور پاکیزگی ہے اس نام میں اور خود وہ کتنی پاکیزہ اور معصوم لگتی ہے بالکل ایسی جیسی ان کے تصور نے تراشا تھا۔ وہی لہجہ وہی انداز گفتگو ویسی ہی نرم و نازک احساسات رکھنے والی۔ وہ جب جب حویلی گئے اس کا نقش جو پہلے مدھم مدھم تھا مگر اب ہوتا جا رہا تھا۔

کامل کے ساتھ بیٹھ کر ہولے ہولے باتیں کرتی ہوئی۔ ماں جی اور بی آپا کے پاس بیٹھی احترام سے ان کی باتیں سنتی ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں سب اس سے کتنا پیار کرنے لگے تھے اور کامل تو جیسے اس کا دیوانہ ہو گیا تھا اور اسے کامل کا اتنا خیال رکھتے دیکھ کر انہیں عجیب سی خوشی ہوتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلاتی، اس سے کھیلتی، اسے کہانیاں سناتی ہوئی وہ انہیں بہت اپنی اپنی بہت اچھی لگتی تھی اور ان کا جی چاہتا کہ کاش وہ ہمیشہ یونہی اس طرح اسی گھر میں رہے۔ حویلی میں ادھر ادھر گھومتی کامل سے کھیلتی۔

وہ آنکھیں موندے سوچے چلے جاتے۔ وہ جتنی بار بھی حویلی گئے تھے۔ مریم سے بہت کم بات ہو پاتی تھی۔ پہلے دن سے ہی ان کے درمیان جھجک سی در آئی تھی۔ انہیں سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ مریم سے کیا بات کریں۔ عاشی نینا اور مورتیوں ہی اس سے بے تکلف ہو گئے تھے لیکن مریم سے بات کرتے ہوئے وہ جھجک جاتے تھے۔

وہ روتی تو اس کے آنسو ان کے دل پر گر جاتے۔ وہ مضطرب سے ہو جاتے، ان کا جی چاہتا کہ وہ اس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے چن لیں، اسے تسلی دیں لیکن وہ کچھ کہہ نہ پاتے۔ کئی دفعہ انہیں محسوس ہوا جیسے وہ انہیں شا کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ شاید وہ ابھی تک بے خبر ہے کہ عثمان احمد اس کے والد نہیں تھے۔ شاید اب اسے بتائیں سکے اور اب میں..... میں اسے کس طرح بتاؤں کہ.....

مسرور چائے کا کھہہ کر واپس آیا تو انہوں نے چونک کر ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور مسرور کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی کرسی کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

ابھی تک انہوں نے ماں جی اور بی آپا کو بھی نہیں بتایا تھا کہ مریم عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے۔ کون سا اس نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ چلی جائے گی اور پھر کیا خبر یہ جان کر کہ وہ عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے سب لوگ اس سے اس طرح پیش نہ آئیں جس طرح اب آ رہے ہیں۔

کئی دفعہ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ بی آپا کو ہی اس راز میں شریک کر لیں اور انہیں عثمان احمد کی خواہش بتا کر چپکے سے کہہ دیں کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کا انہیں برسوں سے انتظار تھا لیکن پھر انہوں نے خود کو روک لیا۔ نہیں ابھی نہیں۔ پہلے وہ مریم سے بات کر لیں لیکن مریم سے کیا بات کریں گے اور کس طرح۔

یہی وہ تھی تھی جسے وہ سلکھا نہیں پارہے تھے۔ بے شمار طلباء کے مسائل جنکیوں میں حل کرنے والے۔

فلسفہ و ادب پر گھنٹوں بولنے والے۔

اور ہر شعبہ زندگی کے متعلق بے تحاشا معلومات رکھنے والے پروفیسر عادل سے یہ جھوٹی سی گتھی نہیں سلجھ رہی تھی۔ کیا یہی اچھا ہوتا کہ عثمان احمد خود ہی اسے بتا دیتے کہ وہ..... بلکہ انہیں بہت پہلے اسے بتا دیا ہے تھا۔ اب پتا نہیں وہ کیسے اسے فیس کرے گی اور اگر اسے نہ بتایا جائے تو..... تو..... انہوں نے

بے اختیار بائیں ہاتھ سے اپنے سر کو دبایا۔

یہ کس الجھن میں آکر پھنس گئے تھے وہ۔

اسے طویل انتظار کے بعد وہ ملی بھی تو کہاں اور کس روپ میں۔ ان کے متعلق اس کی سوچ، اس کے خیالات کتنے مختلف ہوں گے۔ کتنے احترام سے بات کرتی ہے۔ کیا وہ کبھی اس سے وہ سب کچھ کہہ پائیں گے یا زندگی یونہی تشنہ کام رہے گی۔

”سر“ مسرور نے انہیں مسلسل سر دباتے دیکھ کر آہستگی سے کہا۔

”ہوں“ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

”سر آپ کے سر میں شاید رو رہے کوئی پین کھلے آؤں۔“

”ہاں یا آگر کوئی ٹیبلٹ ہے تمہارے پاس تو دے دو۔ نہیں تو خدا بخش سے پتا کر لیجیے اس کے پاس شاید ڈسپینر ہوتی ہے۔“

”جی سر“ مسرور اٹھ کھڑا ہوا ”میرے پاس ہیں میں ابھی لاتا ہوں لیکن سر پلیز آئی ریکوسٹ یو کہ آپ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ بہت سارے مسائل کا وقتی طور پر ہمیں کوئی حل دکھائی نہیں دیتا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود بہت سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔“ اس نے ان کی ہی ایک باریکی کوئی بات دہرائی تو وہ بے اختیار مسکرا دیے۔

”بہتر سر۔ فی الحال تو ایک ٹیبلٹ مل جائے تو غنیمت ہے۔“ مسرور بھی مسکراتا ہوا چلا گیا۔



چائے پینے کے بعد وہ بہت دیر تک مسرور سے اس کی تصاویر وغیرہ پر باتیں کرتے رہے لیکن اندر ہی اندر ان کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہلے ہی قدم پر وہ ہار گئے ہوں۔ تب وہ مسرور کو گھر چھوڑ کر جتنی حیدر کی طرف چلے آئے لیکن وہاں بھی اندر ہی اندر وہ الجھتے رہے۔

”کیا بات ہے عادل، خاناں؟“ جتنی حیدر نے اپنے مخصوص انداز میں ان کے کندھے پر ہاتھ مارا ”کچھ پریشان لگتے ہو۔ یا راز یہ زندگی ہے اور موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ عثمان اتنی زندگی لے کر آئے تھے۔ بہت نفس انسان تھے۔ کاش کچھ پہلے میں نے تم سے ان کا ذکر کر دیا ہوتا تو بہت پہلے تمہاری ان سے ملاقات ہو چکی ہوتی۔ کچھ کوتاہی میری بھی ہے۔ میرا ذہن اصل میں اپنی کہانیوں کی ہیروینوں میں الجھا

رہتا ہے اور جن میں سے نوے فیصد حقیقی ہوتی ہیں۔“

پروفیسر عادل بے اختیار مسکرا دیے۔

”مجھے آپ کا بھی جواب نہیں۔“

”چلو تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آئی۔ وہ تمہاری خوابوں کی ملکہ..... اس سے پھر ملاقات ہوئی یا نہیں۔“

”آج کل نیندیں ہی روٹھ گئی ہیں سو خوابوں کی ملکہ سے ملاقات بھی ممکن نہیں رہی۔“ پروفیسر عادل نے کہا۔

”ہماری ہی بلی اور ہم سے ہی میاؤں!“ مجتبیٰ حیدر نے قہقہہ لگایا ”ادھر ذرا ہماری آنکھوں میں دیکھ کر بات کرو میاں۔“

تب ہی حافظ احسان اللہ کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں لیے کھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور پروفیسر عادل کو دیکھتے ہوئے بڑی گرجبوشی سے ان کی طرف بڑھے ”آہا پروفیسر عادل آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئے۔“

پروفیسر عادل نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ہی ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”بس ان دنوں کچھ مصروف رہا۔ حویلی میں زیادہ رہا۔ آپ بھی نہیں آئے۔“

”نہیں خیر۔ ہم تو باقاعدہ حاضری دیتے رہے ہیں پوچھ لیجیے گا، مسرور ماں سے اور ہاں عادل صاحب! ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا آپ کے والد کا اس روز مجتبیٰ صاحب نے بنایا۔ بہت افسوس ہوا وقت پر پتا چلتا تو جنازے میں شامل ہوتے۔ آپ نے بھی کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ کیا نام ہے نذیب عثمان احمد یعنی وہ آپ کی والدہ ہیں کمال ہے۔“

پروفیسر عادل کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں لیکن وہ اپنی ناگواری کو چھپاتے ہوئے جملے بولے ”وہ میرے والد کی دوسری بیوی ہیں میری والدہ نہیں ہیں۔“ اور پھر نگاہیں اٹھا کر کسی قدر شاکی نظروں سے مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ انہیں قطعی گمان نہیں تھا کہ حافظ احسان اللہ اس قدر بے تکی بات کریں گے۔ انہوں نے تو یونہی پتا نہیں کس موڈ میں آکر حافظ احسان اللہ سے ذکر کر دیا تھا اور.....

”اچھا مجتبیٰ میں چلتا ہوں۔“ پروفیسر عادل کھڑے ہو گئے۔

مجتبیٰ حیدر نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی کہ ابھی تصدق احمد بھی آنے والے ہیں۔ صبح ان کا فون آیا تھا اور آمنہ صبیح بھی ساتھ ہوں گی وہی لباس تھیٹر کے سلسلے میں حافظ صاحب کے موڈ کے کوڈیکنا اور ڈسکس کرتا ہے لیکن ان کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی سو وہ رکے نہیں اور مجتبیٰ حیدر سے معذرت کر کے چلے آئے۔



”ہاں جی آپ نے بلوایا تھا؟“ پروفیسر عادل نے کھلے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر پوچھا اور کمرے میں چاروں طرف ایک اچھتی سی نظر ڈالی۔ تیموران کی گود میں سر رکھے لیٹا شاید ان سے کوئی کہانی سن رہا تھا اور سریم قریب بیٹھی تھی۔

”ہاں میں نے بلوایا تھا اور رک کیوں گئے آجاؤ۔“ ماں جی نے تیمور کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تیموراٹھ کران کی طرف دیکھا تو وہ دو قدم آگے بڑھ کر دروازے کے قریب ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”عادل بھائی۔“ تیموراٹھ کران کے پاس چلا گیا ”بڑی امی کو بہت اچھی کہانیاں آتی ہیں آپ کو پتا ہے۔“

”نہیں مجھے نہیں معلوم۔“ عادل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کیا بڑی امی نے آپ کو کبھی کوئی کہانی نہیں سنا؟“ تیمور کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے حد جرت تھی۔

”اوں..... ہوں کبھی نہیں۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کرایا۔

”بڑی امی آپ عادل بھائی کو کہانی کیوں نہیں سناتیں؟“

زیتون بانو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”میری ماما کو بالکل کوئی کہانی نہیں آتی۔ ایک بھی نہیں آتی مومو کو آتی ہیں لیکن ان کا موڈ خراب ہو تو یہ بھی کہانی نہیں سناتی ہیں۔“

”بڑی بات مور بیٹا۔“ زیتون بانو نے تنبیہ کی ”باجی کہا کرو۔ نام لے کر بڑی بہنوں کو نہیں بلاتے۔“

”نہیں بڑی امی مجھے ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ جب یہ مومو کہہ کر بلاتا ہے تو مجھے لگتا ہے جیسے میرا ہی چھوٹا سا بھائی میرا بہت اچھا دوست بھی ہو اور جیسے اگر کبھی میں تنہا ہو گئی تو یہ میرے ساتھ ہوگا۔“ مریم نے بے اختیار کہا تو زیتون بانو نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

”پانچس ہوتم بھی بیٹا۔ الٹی سیدھی باتیں نہ سوچا کرو اور خدا نہ کرے تم کیوں تنہا ہو گئی۔ تمہاری ماما کو خدا سلامت رکھے اور تمہارے بہن بھائیوں کو۔“

”اور آپ کو بھی۔“ مریم نے لاڈ سے کہا اور ان کے قریب ہو گئی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

غفوران جو نیچے کار پیٹ پر بیٹھی کسی دوپٹے کو لیس لگا رہی تھی اس نے ان کی طرف دیکھا۔

”انشاء اللہ بچوں کے آنے سے کتنی رونق ہو گئی ہے گھر میں۔ حویلی بھری بھری لگنے لگی ہے۔“

”ہاں لیکن یہ رونق بھی کب تک رہے گی۔ چند دن تک یہ لوگ اپنے گھر چلی جائیں گی اور پھر۔“

زیتون بانو نے اداسی سے عادل کی طرف دیکھا۔ عادل نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ ان نظروں کا مفہوم سمجھتے تھے لیکن وہ ان کی اداسی ختم کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے۔ فی الحال تو کچھ بھی ان کے سامنے واضح

نہیں تھا۔ سب کچھ دھند میں چھپا تھا۔ دور تک گہری دھند تھی اور بس۔

”بڑی امی ہم آتے رہیں گے آپ سے ملنے اور میں تو پوری چھٹیاں آپ کے پاس گزارا کروں گی۔ آپ اتنی اچھی ہیں، اتنی شفیق۔ آپ مجھے بہت یاد آیا کریں گی۔ آپ نے ہم سب سے اتنی محبت کی تھی حالانکہ آپ کو تو ہم سے نفرت ہونی چاہیے تھی۔۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔۔“

”پھر وہی پاگلوں جیسی باتیں۔“ زیتون بانو نے اسے ٹوک دیا ”بیٹیاں تو بہت پیاری ہوتی ہیں اور تیرے ہی بہت پیاری اور وہ دونوں عاشی اور نینا۔ نینا تو چمکتی مینا ہے چلی جائے گی تو ویرانی ہو جائے گی ایک دم۔“

”یہ نینا اور عاشی کہاں ہیں بھلا اس وقت؟“ عادل نے تیسور سے پوچھا۔

”وہ دونوں بی آپا سے لڈو کھیل رہی ہیں اور نینا تو بہت چیونٹک کرتی ہے، بی آپا کو تو پتا ہی نہیں چلتا۔“

تیسور نے بتایا۔

”آپ نینا سے کبھی نہیں کھیلا۔ مومو سے کھیل لیتا۔ یہ بالکل چیونٹک نہیں کرتی۔“

”اچھا۔“ انہوں نے سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا جو ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن جونہی نظریں ملیں اس نے فوراً ہی سر جھکا لیا اور اس کی دلکش پیشانی پر کندر سا پھیل گیا۔ یکا یک ایک نادیدہ سا بوجھ جیسے ان کے دل پر آگرا۔ یہ بیگانگی اور بیزاری کا برملا اظہار اپنے اعصاب پر حملہ آور ہونے والی ہر پریشانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے زیتون بانو کی طرف دیکھا۔

”جی ماں جی، آپ نے کیوں بلوایا تھا؟“

”امام بخش کہہ رہا تھا کہ تم صبح واپس لا ہو رہا ہے۔“

”جی ماں جی، بہت دن ہو گئے ہیں۔ تیسور نے ضد کی تھی ورنہ بہت کام تھا۔ مسرور کا فائل ہونے والا ہے اور یوں بھی کالج میں بھی بہت مصروفیت ہے۔“ انہوں نے تفصیلاً بتایا۔

وہ عاشی نینا اور تیسور کو لے کر آئے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ انہیں حویلی چھوڑ کر فوراً واپس لا ہو چلے جائیں گے لیکن تیسور ضد کرنے لگا کہ وہ کچھ دن ان کے ساتھ رہیں اور حقیقت تو یہ تھی کہ خود ان کا دل بھل اٹھا تھا کہ وہ کچھ دن رک جائیں کہ وہ ان کے سامنے ہوگی۔

نگاہیں اسے دیکھیں گی، چھوئیں گی، محسوس کریں گی اور وہ رک گئے تھے۔

”تمہاری چاچی بیمار تھیں۔ تم ادھر گئے تھے۔“

”نہیں ماں جی۔“ وہ نادم سے ہو گئے۔

”بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں عادل لیکن ان کے نتائج بہت گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔“

اب تم ان کی مزاج پر ہی کیے بغیر ہی چلے جاتے تو وہ کتنا برا محسوس کرتیں۔ یوں ہی تو فاصلے پیدا ہوتے اور بڑھتے ہیں اور محبتیں کم ہوتی ہیں۔“

”جی ماں جی۔ میں چلا جاؤں گا۔“

”چلے نہیں جاؤ گے بلکہ ابھی ہواؤ۔“ انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔

”جی بہتر۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

چاچی کی مزاج پر ہی کرنے یا چاچا عبدالرحمن سے ملنے میں انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا بس وہ حریم سے نمبر تے تھے۔

اس کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی۔ اس کی بھیگی بھیگی سی نظریں ان کے دل میں گڑی جاتیں۔

کاش۔۔۔۔۔ کاش وہ حریم کے لیے اپنے دل کے دروازے کھول سکتے اور مریم بھی حریم کی وجہ سے ہی شاید ان سے متفر ہو گئی تھی۔

اس روز حریم! ادھر بی آپا کی طرف ہی آئی ہوئی تھی۔ وہ اور مریم خدا جانے ہولے ہولے سر جوڑے کیا باتیں کر رہی تھیں کہ وہ تیسور کو گاؤں کی سیر کروا کر لائے تو سیدھے بی آپا کی طرف ہی آگئے تھے اور وہاں حریم کو بیٹھے دیکھ کر کچھ بھر کو جھجک سے گئے۔

”السلام وعلیکم۔“

حریم نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”اچھی ہوں۔“ حریم نے نگاہیں جھکا لیں۔

”چاچا جی اور چاچا جی کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“

حریم نے یونی نگاہیں جھکائے جھکائے جواب دیا تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔

”یہ بی آپا کدھر ہیں؟“

”کچن میں ہیں۔“

مریم ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دلکش آنکھوں سے شوخی جھلک رہی تھی۔

”وہ ہمارے لیے کچھ بنانے گئی ہیں آپ بیٹھے نا۔“

وہ کھڑی ہو گئی۔

”میں انہیں بلاتی ہوں۔“

اور پھر ایک دم شرارت سے انہیں اور حریم کو دیکھتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ تیسور بھی ان کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا تھا نا کہ نینا اور عاشی کو اپنی سیر کا احوال بتا سکے اور وہ کمرے میں حریم کے ساتھ اکیلے رہ گئے تھے۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ مریم کیا سمجھ رہی ہے؟“ انہوں نے بوکھلا کر حریم کی طرف دیکھا۔



آپ..... آپ نے حریم! مریم سے کچھ کہا اپنے یا میرے متعلق۔“

”کیا.....؟“ حریم نے حیرت سے پوچھا ”میرے اور آپ کے درمیان کیا ہے جو میں مریم سے کہتی۔“
”اوہ۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”سوری حریم..... سوری خدا جانے میں کیا کیا کہہ گیا۔“ وہ یک دم باہر نکل گئے اور کوریڈور میں انہیں مریم مل گئی جو بی آپا کے طوطے کے پتھرے کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔
”مریم۔“ اس کے بالکل قریب جا کر انہوں نے آہستگی سے اسے آواز دی۔
”ہی۔“ مریم نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

”آپ تو بی آپا کو بلانے گئی تھیں۔“

”دراصل۔“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر شرارت سے انہیں دیکھا اور اپنی مسکراہٹ ہانے کو سر نیچے کر لیا اور اس لمحے وہ انہیں اتنی پیاری اور اتنی خوبصورت لگی کہ ان کا جی چاہا وہ یونہی چرے وڑی تھوڑی شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی رہے اور وہ اسے دیکھتے رہیں اور یونہی اس بیت جائیں۔

”منٹو نے مجھے بلالیا تھا۔“ اس نے انگلی پتھرے کے اندر ڈال کر طوطے کو چھیڑا اور جب طوطے اس کی نگاہ پر کنا چاہا تو اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر کے عادل کی طرف دیکھا۔

”آپ بیٹھے نا بیٹے، اندر جا کر میں بی آپا کو سمجھتی ہوں۔“

”آپ کیوں اٹھ کر آگئی ہیں مریم؟“

”میں..... یونہی آپا کو بلانے جا رہی ہوں۔“

”مریم! آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں..... میں اور حریم۔“

مریم یکدم سنجیدہ ہو گئی ”حریم بہت پیاری ہے۔ آپ کے ساتھ بہت بچے گی۔ آپ کیوں انکار کر رہے ہیں بھائی۔ کیا حریم سے اچھی بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے۔ مجھے بی آپا نے بتایا ہے آپ ان سے شادی پر رضا مند ہو جائیں نا پھر کتنا مزہ آئے گا۔“

”حریم ہماری بھابی بنیں گی اور.....“

لیکن عادل اس کی بات سن نہیں رہے تھے وہ کھوئے کھوئے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”حریم سے اچھی بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے۔“ انہوں نے سرگوشی کی اور پتھرے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا مریم کی طرف جھکے۔ ان کی آنکھوں میں سرخی سی چھا گئی تھی اور یک دم وہ بے حد جذباتی ہو گئے تھے ”ہاں! حریم سے اچھی بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے۔ مریم جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے دور دیے میں بسنے والی کوئی شہزادی.....“



مریم ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی حیرت اور اتنی سراسیمگی تھی کہ وہ ایک دم سیدھے ہو گئے اور ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ یہ..... یہ کیا ہو گیا تھا انہیں..... کیا کہنے والے تھے وہ بغیر سوچے سمجھے..... بغیر.....

”سوری.....“ وہ یک دم مڑ گئے تھے اور مریم حیران سی طوطے کے پتھرے کے پاس کھڑی رہ گئی تھی اور اس کی وہ حیرت زدہ سراسیمہ نظریں جیسے ان کے دل میں کھب گئی تھیں۔ کئی راتوں تک وہ سو نہیں سکے تھے۔ کیسے..... کیسے وہ اس کی نظروں میں سرخ رہوں، کیسے اسے بتائیں کہ وہ غلط نہیں ہیں۔ کئی بار انہوں نے اس ارادے سے مریم سے بات کرنا چاہی۔ وہ چاہتے تھے کہ عثمان احمد سے ہونے والی ساری گفتگو اس کو بتادیں لیکن اس کی نظروں میں اتنی سرد مہری ہوتی کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پاتے تھے۔

پہلے قدم پر ہی شوکر لگی تھی۔ صفائی میں کہنے کے لئے سارے لفظ بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔
”کیا سوچتی ہو گی وہ کہ میں.....“

”میں عادل عثمان خان! اس کا سوتیل بھائی.....“

”اوہ..... وہ کیا کریں۔ کیسے اپنے اور اس کے رشتے کو واضح کریں۔“

وہ اپنے بالوں کو ٹھپوں میں بھینچنے اور دیوار پر کے مارتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ تب بہت اپ سیٹ ہو کر انہوں نے آج رات بی آپا سے سب کچھ کہہ دیا تھا اور بی آپا حیران سی سن رہی تھیں۔
”تو مریم! عثمان چچا کی بیٹی نہیں ہے؟“

”جی بی آپا اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مریم کو اس حقیقت سے باخبر کر دیں۔ میں نے کچھ اور بھی سوچ رکھا تھا بی آپا..... ابھی میں مریم سے یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا۔ وہ بہت حساس ہے۔ ابا جان نے بتایا تھا مجھے اس کے متعلق کہ وہ ان سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس لئے یہ دھچکا اسے بہت اذیت دے گا۔ بہت..... پتا نہیں وہ کیسے اور کس طرح ری ایکٹ کرے لیکن بی آپا یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اسے کیسے اس حقیقت سے باخبر کریں گی۔ میں..... میں..... اس کی نظروں میں ملامت اور سرد مہری برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔“

”عادل کیا مریم ہی وہ لڑکی ہے جس کا ذکر تم نے مجھ سے کیا تھا۔“

”جی بی آپا لیکن تب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔“

اور بی آپا سے دل کی بات کہہ کر بہت حد تک ان کی بے چینی اور اضطراب کم ہو گیا تھا لیکن پھر بھی دل کچھ بوجھ سا دھرا تھا حالانکہ انہوں نے تیمور سے دو دن مزید رہنے کا وعدہ کر رکھا تھا مگر اپنی دلی کیفیات سے گھبرا کر انہوں نے صبح واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جب تک سب کچھ مریم کے سامنے ظہور نہیں ہو جاتا، وہ اس کا سامنا نہیں کریں گے۔

”سنو عادل بیٹا! اپنے چچا سے کہنا کہ وہ وقت نکال کر ایک بار فیملی آباد۔۔۔ بھی ہوا آئیں تو اچھا ہے۔ اس دفعہ وہاں سے فصل بہت کم آئی ہے۔“

”جی ماں جی۔“ انہوں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ابھی وہ حویلی کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھے تھے کہ سامنے سے امام بخش آتا دکھائی دیا ”وہ جی لاہور سے مہمان آئے ہیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔“

”کون ہیں؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”وہ جی ایک تو وہی میڈم۔۔۔۔۔۔ میڈم نرگس جو پہلے بھی آئی ہیں دو بار اور ایک کوئی اور ہیں جی۔ وہ جی وہ جن کاٹی وی پر ڈراما بھی آیا تھا۔“

”اچھا! انہیں ڈرائنگ روم میں کیوں بٹھایا۔ ادھر اندر ہی لے آؤ۔“

ڈرائنگ روم حویلی کے رہائشی حصوں سے کافی فاصلے پر تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ ظاہر ہے میڈم نرگس اور ان کے ساتھ جو کوئی بھی تھا وہ مریم اور بچوں سے ملنے آیا ہوگا۔ لہذا انہوں نے انہیں اندر بلا لیا تھا۔ وہ ٹی وی نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ٹی وی دیکھ سکیں لہذا وہ میڈم نرگس کے ساتھ آنے والی خاتون کو پہچان نہیں سکے۔

”خوش آمدید میڈم۔“ انہوں نے مسکرا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ میڈم نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور پھر ساتھ آنے والی خاتون کے کان میں سرگوشی کی جو سرگوشی ہرگز نہ تھی۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہی عادل ہے عثمان احمد کا بیٹا۔“

خاتون نے جو سیاہ سوٹ پر سیاہ شال اوڑھے ہوئے تھیں۔ گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہ مسز عثمان احمد ہیں۔“ میڈم نے تعارف کرایا ”اور یہ عادل ہے عثمان کی فرسٹ وائف سے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ وہ ایک دم مودب ہو گئے۔

”آئیے پلیز بچے اندر ہیں۔“ اور پھر مڑ کر ماں جی کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

”ماما۔“ مریم انہیں دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئی اور آنسو روانی سے اس کی آنکھوں میں اند پڑے۔

آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہونے لگی تو زینب عثمان احمد نے اسے آہستگی سے الگ کیا اور ہلکے سے سرزنش کی۔

”تم ابھی بھی ایسی ہوا حق اور بے وقوف۔ میں سمجھ رہی تھی ان چند ماہ میں تمہیں عقل آگئی ہوگی۔“

”ماما۔“ آنسو اب بھی روانی سے اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے ”پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پاپا۔۔۔۔۔۔“

”زیلیکس مومو۔“ زینب عثمان احمد نے کسی قدر ناگواری سے اسے دیکھا ”تم اب ایک مچور ڈلڑی کی ہو“

غم کو برداشت کرنے کا سلیقہ سیکھو۔ تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس طرح واویلا نہیں کرتے ہیں۔“

”یہ چھوٹی سی بات ہے۔“ مریم نے ایک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھا ”پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ہم کبھی انہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔ کبھی ان سے باتیں نہیں کر سکیں گے۔ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ یہ چھوٹی بات ہے۔“

سوچتے ہوئے اس نے آنسو پینے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ بے اختیار آئے چلے جا رہے تھے۔ وہ غیر ارادی طور پر زیتون بانو کے پیچھے ہو گئی تاکہ زینب عثمان احمد کی نظر اس پر نہ پڑے۔ پروفیسر عادل دیوار سے ٹیک لگائے انہیں دیکھ رہے تھے۔ زینب عثمان احمد نے مریم سے نگاہ ہٹا کر زیتون بانو کی طرف دیکھا جو انہیں اپنی طرف پا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور ان سے گلے ملنے کے لیے ان کی طرف بڑھیں لیکن انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے انہوں نے بغیر کسی ناگواری کا اظہار کیے تمام لیا اور سامنے پڑے ہوئے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تشریف رکھیے اور آپ بھی میڈم پلیز۔“ وہ ایک دم میڈم نرگس کی طرف مڑ گئیں۔

”شکریہ۔“ میڈم نرگس زینب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئیں۔

”باقی بچے کدھر ہیں؟“ زینب نے مریم کو مخاطب کیا۔

”تیور تو ابھی ایک منٹ پہلے ادھر ہی تھا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا۔“ مریم نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا ”غفور! جاؤ بی آپا کی طرف ہوں گے بچے انہیں بلا لاؤ اور انہیں مہمانوں کی آمد کی اطلاع بھی کر دو۔“

”جی۔“ غفور نے دوپٹہ ایک طرف رکھا۔

”یہ بڑی امی ہیں ماما۔ عادل بھائی کی امی۔“ مریم نے تعارف کروایا ”اور بڑی امی یہ ماما ہیں۔“

اس نے ذرا سارخ موڑ کر بڑی امی کی طرف دیکھا۔ دونوں عثمان احمد کی بیوہ تھیں۔

بڑی امی کے چہرے کے طلال سے جلال سا نکلتا تھا۔

جب کہ ماما کے چہرے میں ایک مایوسی ایک دکھ سا تھا۔ جیسے بڑی امی کو دیکھ کر انہیں شک سا لگا ہو۔

شاید وہ توقع کر رہی ہوں گی کہ بڑی امی کوئی بد صورت سی خاتون ہوں گی تب ہی تو پاپا نے ان سے شادی کی ہوگی۔

”افوہ۔۔۔۔۔“ اس نے خود کو سرزنش کی ”یہ میں کیا فضول باتیں سوچنے لگتی ہوں۔ بابا نے کتنا سمجھایا تھا کہ خود ہی خود اندازے لگا کر کہانیاں نہ بنایا کرو اور اپنے آپ کو پریشان نہ کیا کرو۔ ضروری نہیں ہے کہ تمہارا ہر اندازہ صحیح ہو۔“

لیکن اسے ماما کی خاموشی کھل رہی تھی۔ آخر وہ بڑی امی سے بات کیوں نہیں کرتیں اور پھر اس نے دیکھا تھا، ان کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آئے تھے حالانکہ بڑی امی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ جب بھی پاپا کو یاد کر کے روتی تھی، بڑی امی کی پلکیں بھی بھیک جاتی تھیں حالانکہ پاپا کے حوالے سے یاد کرنے کے لیے تمنا ہی کیا ان کے پاس۔

چند روکھے پھیکے سال جن میں عثمان احمد کی رفاقت تو تھی، لیکن اس رفاقت میں گرم جوشی اور مثبت سے رنگ نہیں تھے۔

”ماما۔“ اس نے اچھی طرح اپنا چہرہ صاف کر کے پکارا ”یہاں بڑی امی بی بی آپا عادل بھائی سب نے ہی ہمارا بہت خیال رکھا۔ سب بہت پیار کرتے ہیں ہم سے۔“

”اچھا۔“ ان کے لہجے میں طنز تھا ”یہ تم پہلے فون پر بھی بتا چکی ہو۔ بہر حال آپ کا بہت شکریہ۔“ وہ بڑی امی کی طرف متوجہ ہو گئیں ”حالانکہ بچوں کو یہاں لانے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ وہاں ہمارے برائے ملازم تھے گھر میں۔ کوئی ڈروالی بات نہ تھی بلکہ میرے خیال میں بچے وہاں زیادہ ایزی فیل کرتے۔“ ”یہ پاپا کی خواہش تھی کہ جب تک آپ نہ آئیں، ہم لوگ حویلی میں رہیں۔ انہوں نے عادل بھائی سے یہی کہا تھا۔“ مریم نے فوراً وضاحت کی اسے ان کا انداز گفتگو پسند نہ آ رہا تھا۔

”تمہارے پاپا ہمیشہ سے ہی احقنا اور فضول باتیں کرتے رہے ہیں۔“ پروفیسر عادل کی پیشانی پر ناگوار لکیریں سی پڑ گئیں اور وہ ایک دم ہی باہر نکل گئے۔ انہیں نذیب عثمان بالکل بھی پسند نہیں آتی تھیں اور عثمان احمد نے بالکل صحیح کہا تھا کہ مریم اپنی ماں سے بالکل مختلف ہے۔ ”مریم۔“ اپنے کمرے میں آ کر ادھر ادھر بے چینی سے ٹپکتے ہوئے انہوں نے زیر لب دہرایا ”مریم۔۔۔۔۔“ اور پتا نہیں آج کے بعد وہ اسے دوبارہ دیکھ سکیں گے بھی یا نہیں۔ نذیب عثمان احمد کے روئے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ اب ان سے رابطہ رکھنا پسند نہ کریں۔ تو کیا یوں منزل ان کے قریب آ کر دور ہو جائے گی۔

اور وہ کس قدر بدگمان نظر آتی ہے ان سے اور وہ وضاحت بھی نہیں کر پائے۔ ”بی بی آپا سے بھی تو رات ہی انہوں نے بات کی تھی اور ابھی تک وہ ادھر آئی نہیں تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے پرندوں کو خوراک دیتیں اور بہت دیر تک ان کے ساتھ مصروف رہتیں اور پھر ان سے فارغ ہو کر قرآن پڑھتی تھیں اور ابھی تو وہ اپنے پورشن میں ہی تھیں کہ نذیب عثمان آ گئی تھیں۔

”اور کیا یہ ضروری تھا؟“ ٹپکتے ٹپکتے رک کر انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا کہ وہ تصور جسے برسوں ان کے تجھلنے نے تراشل تھا۔ وہ ان کی سوتیلی ماں کی بیٹی ہوتی اور ایسا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ کہیں اور ملی ہوتی

کسی اور جگہ کسی اور گھر میں، کسی اور روپ میں تو کتنی آسانی ہوتی تو وہ سب کچھ اس سے کہہ ڈالتے یا پھر وہ اپنی حقیقت سے باخبر ہوتی۔

کیسے جل اور خوب صورت لفظ ان کے اندر بنتے اور سنوڑتے تھے کہ جب وہ ملی تو وہ یوں کہیں گے اس طرح اپنے جذبے اس کے نام کریں گے مگر ان کے اندر بننے والے لفظ تو اندر ہی مر جھا کر رہ گئے تھے۔ شاید وہ ہمیشہ نامراد ہی رہیں گے۔

دل نے جیسے فیصلہ سنا دیا تو بے چین ہو کر وہ کھڑکی پر جھک گئے۔ وہ جاری تھی تو وہاں رکے بھی نہیں تھے۔ اسے جی بھر کر دیکھ ہی لیتے۔

اس کی شبیہ کو اپنی آنکھوں میں چھپا لیتے۔

اور وہ اس قابل تھی کہ اسے چاہا جاتا۔

پوچھا جاتا۔

گنتی ہمدرد گنتی مہربان اور گنتی شائستہ تھی۔ ماں جی اور بی بی آپا کتنی تعریفیں کرتی تھیں اس کی اور ماں جی نے کتنی بار حسرت سے کہا تھا کہ کاش مریم کو انہوں نے جنم دیا ہوتا۔ وہ سچ مچ ان کی بیٹی ہوتی۔ ان کی اپنی۔

وہ ایک بار پھر اسے دیکھ لیں۔

دل بری طرح پھل رہا تھا اور اس میں حرج ہی کیا ہے۔

انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ایک بار پھر ماں جی کے کمرے میں جانے کے خیال سے مڑے ہی تھے کہ تیور نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھر انہیں کھڑے دیکھ کر دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ ”بھائی۔“

”ہوں جان برادر۔“ انہوں نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹ لیے۔

”ہم جارہے ہیں ماما کے ساتھ۔“

”اتنی جلدی۔ آپ لوگ کچھ دیر کیوں گے نہیں؟“ انہوں نے حسرت سے کہا۔

”نہیں، ماما کو جلدی جانا ہے اور بڑی امی آپ کو بلارہی ہیں۔“

وہ تیور کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔ مریم انہیں کامل کے کمرے کی طرف جاتی دکھائی دی تو انہوں نے تیور کی طرف دیکھا۔

”مور آپ چلیں میں آتا ہوں۔“

وہ کامل کے بیڈ کے پاس پہنچے تو مریم کا رپیٹ پر بیٹھی تھی اور کامل ریڈیو کو دیکھ رہے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کامی“ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا ”کامی میرے بھائی، ہم جا رہے ہیں۔“

”کہاں؟“

”لاہور۔“

”بھائی کی طرح؟“ اس نے پوچھا۔

مریم نے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

”نہلو۔“ (رو)

کامل نے ریڈیو ایک طرف پھینک دیا اور ہونٹ لٹکا لیے پروفیسر عادل بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک دم آگے بڑھے ”کیا ہی اچھا ہوتا“ آپ کامی کو اپنا عادی نہ بناتیں۔ آپ نے تو چلے ہی جانا تھا اور یہ معصوم بہت دن روئے گا۔ بہت اذیت اٹھائے گا۔“

اسے تو جانا ہی تھا وہ جانتے تھے لیکن پتا نہیں کیوں شکوہ کر بیٹھے تھے۔

مریم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر ریڈیو کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”بہن! منہ پٹ۔“ کامل نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا ”نہلو“ (رو) اور پھر شاکی نظروں سے

عادل کی طرف دیکھا۔ عادل نے نگاہیں جھکا لیں۔

”مریم! اس گھر سے اپنے دل میں کوئی شک یا کدورت لے کر مت جائیے گا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر وہ نہیں ہوتیں جو نظر آتی ہیں۔“ وہ کہنا چاہتے تھے اس بتانا چاہتے تھے کہ اس روز جو کچھ وہ اس سے ایک بے انتہا جذباتی کیفیت میں کہہ بیٹھے تھے۔ وہ اس کی وجہ سے ان سے متفر اور بدگمان نہ ہو لیکن لفظ اندر ہی اندر کہیں چکر اگر مہم ہو گئے۔ انہوں نے ہونٹ کھولے اور پھر کچھ کہہ بیٹھیں۔



عاشی، مریم، نینا اور تیمور زینب عثمان کے ساتھ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ مریم کے دل کو جیسے کوئی مٹھی میں ہولے ہولے بھیج رہا تھا۔ کتنا جی چاہ رہا تھا اس کا کہ وہ جانے سے پہلے ایک بار پاپا کی قبر پر جائے۔ انہیں خدا حافظ کہہ لیکن ماما کے خیال سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا اور خود ماما نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی کہ وہ قبرستان جانا چاہتی ہیں حالانکہ انہیں جانا تو چاہیے تھا۔ انکل ہادی اور ڈاکٹر عبدالعزیز جب بھی آئے قبرستان گئے بلکہ وہ تو ہمیشہ پھول لے کر آتے تھے اور ماما.....

وہ ایک ایک دن ماما کے انتظار میں گمن گمن کر گزرتی رہی تھی اور ماما آتی تھیں تو پہلے ہی دن اسے ان سے شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اسے ان کا رویہ اور ان کا انداز گفتگو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ کتنی نخوت اور غرور سے بات کر رہی تھیں۔ جب کہ بڑی امی کے لب و لہجے میں حلیمہ تھی، شفقت تھی حالانکہ قصور وار تو ماما تھیں۔

بڑی امی کی مجرم تو وہ تھیں لیکن ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بڑی مجرم ہوں، عادل قصور وار ہو۔ جب کہ یہ سب لوگ کتنے اچھے اور محبت کرنے والے ہیں اور وہ ضرور بڑی امی سے ملنے آیا کرے گی چھٹیوں میں اور بی آپا سے اور پھر حریم سے۔ حریم سے باتیں کر کے کتنا مزہ آتا تھا۔ کتنی دوستی ہو گئی تھی اس کی حریم سے۔

مانی سے تو وہ بہت کم ملی تھی البتہ مہران اسے اچھا لگا تھا بالکل ارسلان اور ارمغان کی طرح شوخ اور

کھنڈر اس اور عادل..... کیا وہ بھی کوئی عیاش قسم کے جاگیر دار ہیں جیسا کہ میڈم نرگس نے اسے ڈر لایا تھا۔

وہ ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ عجیب سی الجھن میں گھر کر رہی تھی۔ اس روز کی گفتگو..... ادھوری

اور نامکمل سی اس گفتگو نے اسے بری طری الجھا دیا تھا اور وہ کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ عادل نے عاشی اور نینا کے سر کو چومتے ہوئے انہیں اپنے قریب کر لیا ”اپنی

دعاؤں میں اپنے بھائی کو یاد رکھنا اور کبھی ضرورت پڑے تو بلا جھجک بتانا۔ فون کر لیتا۔“

”جی۔“ عاشی کی آنکھیں بھی نم تھیں اور پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

”بھائی! آپ لاہور آیا کریں گے ہمارے گھر۔“ نینا نے پوچھا۔

”جی..... شاید۔“ انہوں نے مڑ کر پیچھے آتی زینب عثمان کو دیکھا۔ بڑی امی، بی آپا اور عاں انہیں

گیت تک رخصت کرنے آئے تھے۔

”یہ ہماری ریت نہیں ہے کہ مہمان یوں بغیر کھانا کھائے چلے جائیں لیکن آپ نے زیادتی کی ہے۔“

انہوں نے زینب عثمان کے قریب آنے پر شکوہ کیا تو پہلی بار زینب عثمان کے چہرے پر ہلکا سا نرم تاثر ابھرا۔

”بہت لمبا سفر ہے عادل خان۔ اگر ہم کھانے کے لیے رک جاتے تو بہت دیر ہو جاتی۔ چائے کے

ساتھ اتنے لوازمات تھے کہ مزید کچھ کھانے کی حاجت نہیں رہی۔“

”چائے پھر کبھی ہم آپ کو اپنی میزبانی کا شرف بخشیں گے۔“ میڈم نرگس نے قہقہہ لگایا۔

”ضرور کیوں نہیں۔“ پروفیسر عادل نے مودب لہجے میں کہا ”ابنی ٹائم..... ہر وقت ہمارے گھر کے

دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں میڈم۔ جب چاہیں تشریف لائیں۔ جتنے دن جی چاہیں رہیں۔“

”اپنی بات یاد رکھیے گا۔“ اب کہ وہ ہنسی تھیں۔ وہی ریل کی پٹریوں پر ریل کے انجن کی آواز والی ہنسی۔

اور یہ آئی نرگس بھی کتنے مختلف انداز میں ہنستی ہیں۔ کبھی سڑک پر روڑی کوٹنے کی آواز۔

کبھی سیٹیاں بجاتی ہنسی۔

اور کبھی ان کی ہنسی پر سسکیوں کا گمان ہوتا ہے۔

مریم نے سوچا۔

”ہم اپنی بات سے کمر انہیں کرتے میڈم۔“ پروفیسر عادل بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔

اور کتنا غرور کتنا مان ہوا تھا اسے یہ جان کر کہ یہ انتہائی سوبر اور خلیق سا شخص اس کا بھائی ہے۔ اس کا

بڑا بھائی اور پاپا نے بھی کتنی تعریف کی تھی لیکن..... ”بظاہر اتنا سو بر نظر آنے والا مودب شخص اندر سے کتنا بد تہذیب ہے۔ پاپا بڑی امی اور بی آبا سے بالکل مختلف۔ رشتوں کے احترام اور تقدس سے بے خبر اور خدا جانے اس روز وہ کیا کہنے والے تھے۔“

اخبار میں پڑھی کئی خبریں اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئیں اور اس کی پیشانی خشک آلود ہو گئی اور اس کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔ وہ بی آبا اور بڑی امی سے مل کر عادل کی طرف دیکھے بھیر کا رہیں بیٹھ گئی اور اگر اس روز وہ اپنی بات ادھوری نہ چھوڑتے تو کم از کم ان کے متعلق جاننے میں اسے آسانی ہوتی اور پروفیسر عادل کے چہرے پر اس وقت جو کرب جھلک آیا تھا وہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو خود بہت دکھی ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ یعنی سے جا کر عادل بھائی کی باتیں کرے گی۔

اپنے بڑے بھائی کی۔

کتنا معتبر لگنے لگا تھا اسے اپنا آپ۔

جیسے ایک بڑے بھائی کے ہونے سے وہ بہت معزز اور معتبر ہو گئی ہو۔

”اور سب لوگ کتنی تعریف کرتے ہیں عادل کی حریم اور بی آبا۔“

اور وہ خود بھی کتنے سو بر لگے تھے اسے مگر.....

”کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔“ یکا یک اسے ادراک ہوا۔

”شاید وہ پاپا اور ماما کی سگی بیٹی نہیں۔“ مدتوں پرانا ایک شک اس کے اندر کھلایا۔ شاید پاپا اور ماما کی

اولاد نہ ہو اور انہوں نے اسے گود لیا ہو اور عادل اس حقیقت سے باخبر ہوں اور پاپا بھی تو اسے کوئی بات بتانا چاہتے تھے اور انہوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ محل سے سنے گی اور اس حقیقت کو برداشت کرے گی۔

شاید وہ اسے یہی حقیقت بتانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے اور پھر ان کی کبھی ہوئی باتیں اس کے ذہن کے پردے پر جاگ اٹھیں۔ کیوں کہا تھا انہوں نے کہ وہ ہمیشہ یہ یقین رکھے کہ وہ اسے عاشری اور نینا کی طرح چاہتے رہے ہیں۔

”اف..... او۔“ اس نے سر کو نشست کی پشت سے ٹیک لیا ”اس کی شکل بھی تو ماما اور پاپا سے نہیں ملتی

اور پھر عاشری بھی تو اس سے بہت چھوٹی ہے۔ ماما نے یقیناً اسے گود لیا ہوگا۔“

گرم گرم آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

”کیا حماقت ہے مومو۔ اب یہ رونا دھونا بند بھی کرو۔“ ننب نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے اسے سرزنش کی تو آنسو پونچھتے ہوئے وہ یکدم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ میڈم نرس بیٹھی تھی۔

”عاشری نینا اور مومو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے ننب کی طرف دیکھا۔

”دوسری گاڑی میں ہیں۔“ ننب بتا کر میڈم نرس کی طرف متوجہ ہو گئیں اور پھر سارا ناٹم میڈم نرس

منہ پیچھے کیے اونچی آواز میں ننب عثمان احمد سے باتیں کرتی رہیں اور قہقہے لگاتی رہیں۔

اور ننب عثمان احمد کے چہرے پر شگفتگی تھی چمک تھی اور ذرا بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ چند ماہ پہلے بیوہ ہو چکی ہیں۔

مریم چپکے چپکے ان کا جائزہ لیتی رہی۔

”یار زنی تمہارا رویہ ان لوگوں کے ساتھ کچھ صحیح نہیں تھا۔“ میڈم نرس نے تبصرہ کیا ”بنا کر رکھو بھئی“

اتنی بڑی جائداد کے مالک ہیں۔ میں تو جب جب حویلی گئی تھی کہ وہ سی ہو گئی۔ سجاوٹ دیکھی تھی۔ فرنچیز

دیکھا تھا۔ ویسے تمہارے بچوں کا بھی حصہ تو ہوگا اس اتنی وسیع جائداد میں۔ یار میں نے تو تو کروں سے ٹوہ

لی تھی۔ یہ سارا علاقہ انہی کا ہے۔ سندھ، فیصل آباد اور سرگودھا کی طرف بھی زمینیں ہیں۔“

”وہ بی آبا کہہ رہی تھیں کہ دادا جان نے اپنی زندگی میں ہی پاپا کے حصے کی زمین ان کے نام کر دی تھی

اور پاپا کو پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ وہ اب نہیں بچیں گے۔ اس لیے تو انہوں نے وکیل کو بلوایا تھا اور وہ فائل

میرے پاس ہے۔ عادل بھائی نے ان کی ڈیجھ کے بعد مجھے دی تھی۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے زنی کہ تمہارے بچوں کا اس باقی جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم مقدمہ تو

کر سکتی ہو۔“

”فضول میں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“ ننب عثمان احمد نے برا سامنہ بنایا ”اور جتنی عثمان

کے نام زمین ہے وہ بھی بہت ہے۔“

”ویسے میرے دل میں ایک اور خیال آیا ہے کہ یہ عادل۔“ میڈم نرس کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ معنی

خیز نظروں سے مریم کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیں۔ ننب عثمان احمد نے بھی مریم کی طرف دیکھا۔ وہ

کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

اسے خواہ مخواہ میڈم نرس کی باتوں سے چڑھ رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا جہاں کہیں بھی وہ لوگ رکے

وہ اتر کر دوسری گاڑی میں چلی جائے گی۔



اور پھر جب وہ ریفریجنٹ کے لیے رے کے تودہ سچ اتر کر دوسری گاڑی میں چلی گئی۔ تیور بہت خوش ہوا۔

”مومو آپ ادھر کیوں بیٹھ گئی تھیں؟“

”مجھے کیا خبر تھی کہ تم لوگ ادھر نہیں بیٹھو گے۔“

”ماما نے کہا تھا۔“ تیور نے منہ بنایا۔

”چلو اب تو آ گئی ہوں نا۔“

عاشری اور نینا خاموش سی تھیں۔ تیور مسلسل بول رہا تھا۔

”عاشی کیا سوچ رہی ہو؟“ اس نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کچھ نہیں، عادل بھائی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کتنے اچھے ہیں وہ اور کتنے شفیق۔ بالکل پاپا کی طرح۔ کاش وہ سچ سچ ہمارے اپنے سگے بھائی ہوتے بجو تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”ہاں، کاش ہمارا کوئی بڑا بھائی ہوتا۔“ مریم نے بھی سوچا اور ایک دم عاشی سے پوچھا ”سب کہتے ہیں کہ تم ماما سے بہت ملتی ہو اور نینا کی آنکھیں اور ہونٹ بھی بالکل ماما جیسے ہیں۔ کیا میں بھی!!“

عاشی نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا ”کیوں نہیں، بہت ملتی ہیں آپ ماما سے۔ آپ کا فکر تو بالکل ماما جیسا ہے اور یہ جو آپ کے رخساروں میں ڈھپل پڑتے ہیں یہ تو آپ نے ماما سے ہی چرائے ہیں۔ یاد ہے، ایک دن پاپا نے ماما سے کہا تھا کہ مومو نے آپ کی سب سے بڑی خوبصورتی لے لی ہے۔“

ہاں..... ہاں۔“ اسے یاد آگیا۔ وہ سب فی وی لاؤنچ میں بیٹھے تھے اور اس روز ماما بہت خوش اور لائٹ موڈ میں تھیں اور عاشی کو ساتھ لے کر وہ شاہجگ کے لیے گئی تھیں اور اسی وقت واپس آئی تھیں اور انہوں نے آتے ہی بتایا تھا۔

”عثمان مجھے ایک پرانی کلاس فیول گئی۔ کہہ رہی تھی کہ تمہاری بیٹی نے ساری تمہاری خوب صورتیاں چالی ہیں۔ وہ دیکھ لیتا بڑی ہو کر یہ بالکل تمہارے جیسی لگے گی۔ عاشی ساری کی ساری مجھ پر گئی ہے اور مومو.....“

”مومو نے تمہاری سب سے بڑی خوبصورتی لے لی ہے زینبی۔ یہ تمہارے رخساروں پر پڑنے والے ڈھپل۔“

اسے ایک دم اطمینان سا ہوا۔ اندر ہی اندر وہ بہت پرسکون سی ہو گئی۔

”اور پاپا ج کہتے تھے کہ میں بہت بے وقوف ہوں۔“

”اور میرا ذہن اندازے لگانے میں بہت زرخیز ہے۔“

وہ بہت مطمئن ہو کر تیسرے باتیں کرنے لگی۔



”مریم..... مریم فارغا ذمیک مجھے وقت دو ملو مجھ سے۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شہر یار نے کہا۔

”ترس گیا ہوں تمہیں دیکھنے، تم سے ملنے کو۔“

”مگر شہر یار میں اس طرح کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر آپ سے ملاقات نہیں کر سکتی۔“

”اور تم گھر بھی تو نہیں آتی ہو۔ سب تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔“

”اچھا آؤں گی کسی دن۔“

”بہت مصروف ہو گئی ہو؟“ شہر یار نے گلہ کیا۔

”یونیورسٹی سے واپس جاتے جاتے اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ.....“

”مجھے کچھ نہیں پتا۔“ شہر یار بدستور روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا ”مجھے تم وقت دو۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں ڈسکس کرنا ہیں۔ کتنے ہی دن ہو گئے ہیں مومو، تم سے ڈھیر ساری باتیں کیے۔ پتا ہے آج ڈاکٹر فتح بھی چھٹی پر تھے پھر بھی میں ڈاکٹر فاطمہ سے کہہ کر بھاگ آیا ہوں کہ وہ میری جگہ وارڈ میں رہیں حالانکہ وہ بے چاری گھر جا رہی تھیں۔“

”تو یہاں ہی باتیں کر لیتے ہیں۔“ مریم نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اس وقت یونیورسٹی میں تھے اور مریم ابھی ڈاکٹر جلیس حیدر کی کلاس اینڈ کر کے باہر نکلی تھی کہ اسے دور سے شہر یار آتا دکھائی دیا۔

”یہاں سے اتنے سارے اسٹوڈنٹ آ جا رہے ہیں، اچھا نہیں لگتا۔“

”تو ادھر کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”مومو کی بچی، تم مجھے بہت تنگ کر رہی ہو۔ پتا ہے رات کو مجھے نیند نہیں آئی۔“

”مگر یہ تو بڑی تشویش ناک صورت حال ہے ڈاکٹر صاحب۔ کسی اچھے اور بہتر ڈاکٹر سے رجوع کریں۔“ مریم نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”دیکھو تم مجھ سے پتو کی آج۔ میں بہت ناراض ہوں۔ اتنے دن ہو گئے محترمہ نے مڑ کر خبر تک نہ لی۔ ایک تمہا کو نے میں بیٹھتے ہوئے شہر یار نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا ”کہ کوئی ان کے بغیر اس بھی ہو سکتا ہے۔“

”تو کیا آپ اداس ہو گئے تھے؟“ مریم بہت لائٹ موڈ میں تھی۔ اس نے اپنا شولڈر بیک نیچے زمین پر رکھ کر اسے دیکھا۔

”ہاں اداس تھا، بہت زیادہ۔ یوں لگتا تھا جیسے تمہیں دیکھے، تم سے بات کیے، تمہیں ملے صدیاں بیت گئی ہوں۔ پتا نہیں، تمہاری محبت نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔“

”کیا؟“ مریم نے سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جائزہ لیا ”مجھے تو کسی تبدیلی کے کوئی آثار بظاہر نظر نہیں آ رہے۔ چہرے سے مونچھیں غائب ہوئی ہیں نہ آنکھوں میں کا جل ہے نہ ہاتھوں میں چوڑیاں۔“

”مومو..... میں سنجیدہ ہوں۔“ شہر یار نے اس کی بات سمجھتے ہوئے بے اختیار مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی۔

”ہنس لیں۔ پابندی تو نہیں۔“

”میں سچ سچ سنجیدہ ہوں مریم۔ کبھی کبھی مجھے بہت خوف محسوس ہوتا ہے کہ اگر کبھی تم مجھے نہ مل سکیں تو کیا ہوگا۔ کیسے..... کیسے جی پاؤں کا تمہارے بغیر۔“

”مجھے بہت سارے لوگ، بہت سارے لوگوں کے بغیر جی لینے ہیں۔“

”مریم پلیز، سنجیدہ ہو جاؤ۔“

”اچھا چلیے سنجیدہ ہو گئی۔“ اتنے بہت سارے دنوں بعد شہر یار کو دیکھ کر وہ بے اختیار ہی شوخ ہو گئی تھی حالانکہ شوخی اس کے مزاج کا حصہ نہ تھی۔ یوں بھی یعنی بہت دنوں سے گاؤں گئی ہوئی تھی اور وہ اچھا خاصا اداس ہو رہی تھی۔ سو شہر یار کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

”مریم! انکل کی ڈیڑھ کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم غم کے اس حصار سے نکل آؤ تو تم سے بات کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ بابا اور ماں جی کو تمہاری ماما کے پاس بھیجوں۔“

”پلیز شہر یار ابھی نہیں۔ ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے ایم ایس سی کرنا ہے اور.....“

”تم ایم ایس سی مکمل کرتی رہنا سکون سے۔ میں صرف تسلی چاہتا ہوں۔ مجھے وہم آتے ہیں جیسے تمہاری ماما کے معیار پر میں پورا نہ آسکوں گا۔ میرا جی اپنے کام میں نہیں لگتا۔ ایک بار یقین ہو جائے مریم کہ تم میری ہو تو میں سکون سے پارٹ ون کا امتحان دے سکوں گا۔“

مریم کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں اور رخسار تہمتا اٹھے۔

”پلیز کچھ کہو نا مریم۔ اجازت دو کہ میں بابا کو بھیجوں۔“

”نہیں پلیز، ابھی نہیں۔“ اس نے پلکیں اٹھائیں ”مجھے پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرنے دو پھر۔“

”اور تب تک یہ وہم یہ خوف۔ یہ تو مجھے مار ڈالیں گے۔“

”آپ یقین رکھیں۔ آپ کے وہم یوں ہی ہیں۔ ماما بہت برا ڈانٹ ڈھکیں۔“

”تمہیں یقین ہے وہ مجھے رو نہیں کریں گی؟“

”ہاں پورا یقین ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ڈاکٹر ہادی نے ماما سے عاشری کے سلسلے میں بات کی تھی۔ آپ کو میں نے بتایا تھا نا کہ معید بھائی عاشری کو پسند کرتے ہیں۔“

”نہی آزاویری ٹائسن میں۔“

”تو پتا ہے شہر یار ماما نے انہیں ٹال دیا کہ ایک تو عاشری ابھی پڑھ رہی ہے۔ دوسرے وہ اس سلسلے میں بچوں کی پسند کو اہمیت دیں گی کہ بہر حال زندگی انہوں نے گزارنی ہے۔ اس لیے وہ عاشری کی پسند اور مرضی کے بغیر ایسا کوئی وعدہ ان سے نہیں کر سکتیں۔“

”مگر پتا نہیں کیوں مجھے خوف آتا ہے۔“

”فضول خوف ہیں آپ کے۔“

”جانی! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہو تو پتا ہو کہ جب آدمی کسی سے محبت کرتا ہے تو یہ خوف اور یہ وہم کیسے آکنو پس کی طرح دل کو بکڑ لیتے ہیں۔“

”اب زیادہ رومینک نہ ہوں۔“ مریم کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

رومینک۔ کیا بھی؟ میں زیادہ تو کیا معمولی سا رومینک بھی نہیں ہوتا۔“

”اور یہ ابھی کیا کہہ رہے تھے۔“

”کیا؟“ شہر یار کے ہونٹوں پر بھی شوخی مسکراہٹ آ گئی۔

”یہی جواب بھی کہا تھا۔“

”کیا کہا تھا مجھے تو کچھ یاد نہیں۔“

”بہن مت۔“ اس نے بیک اٹھالیا۔

”ہیں..... ہیں..... یہ کہاں چلی ہو تم..... ابھی تو ہم نے کوئی بات بھی نہیں کی۔“ اس نے ایک دم مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مریم ایک بار بھر بلش ہو گئی اور اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”اور یہ جوتاتی دیر سے باتیں ہو رہی تھیں۔“

”یہ باتیں کہاں تھیں۔ ابھی تو میں نے تمہیں اپنا فسانہ دل سنا ہے۔ اپنی بے چینیوں اور بے قرار یوں کا احوال تمہیں گوش گزار کرنا ہے۔“

”یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے شہر یار۔“ مریم کوچ کوچ حیرت ہوئی۔ وہ تو اچھا خاصا سنجیدہ بندہ تھا ”ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ خلل ہے دماغ کا۔“

”اس کا کوئی علاج تو ہو گا نا۔“

”ہاں ہے لیکن فی الحال ممکن نہیں۔“

”پتا ہے مریم۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا ”اتنے سارے دن ہو گئے تھے، تم سے ملے، تم سے باتیں کیں۔ آج صبح سے ہی طبیعت بہت اداس تھی۔ اب تم سے ملا ہوں، تمہیں دیکھا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اوٹ پانگہ باتیں کروں۔ یونہی فضول اور بے معنی اور پھر ان بے معنی اور فضول باتوں پر ہم دونوں مل کر خوب نہیں اور یہ جو اندر ہی اندر اداسی کا غبار سا چھایا ہوا ہے نا، یہ چھٹ جائے۔ پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی یوں ہی اداسی کے بادل سارے وجود کو گھیر لیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی کبھی ایسا ہوا ہے مریم؟“

”بہت..... بہت بار شہر یار! اداسی خود بخود دیوں ہی بلا وجہ گھیراؤ کر لیتی ہے اور بظاہر اس کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی۔ پتا ہے شہر یار جب میں چھوٹی سی تھی نا تب سے ہی کبھی کبھی میں سوچتی تھی کہ شاید میں ماما کی سگی بیٹی نہیں ہوں۔ پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا تھا جیسے ماما مجھ سے اس طرح اور اتنی محبت نہیں کرتیں جیسے سگی ماں اپنی اولاد سے کرتی ہے اور جب میں بڑی ہو گئی، تب بھی کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا تو میں یونہی اداس ہو جاتی تھی بلا وجہ اور اب جب کہ مجھے یقین ہے کہ میں ماما کی سگی بیٹی ہوں۔ تب بھی میں کبھی کبھی بلا وجہ اداس ہو جاتی ہوں۔“ وہ ہولے ہولے دھیمے دھیمے لہجے میں بولتی گئی اور شہر یار بہت دھیان سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ جب کبھی ملتے تھے۔ وہ یونہی اپنے بچپن کی کوئی بات کرتی۔

عاشی اور تیور کی باتیں۔

نینا اور ماما کی باتیں کرتی رہتی اور وہ نہایت انہماک سے اس کی باتیں سنتا اور اس کی آواز کی خوب صورتی اس کے لہجے کے حسن کو اپنے اندر تار تار ہوتا۔

”آپ بورتون نہیں ہوتے شہر یار؟“ کئی بار اس نے پوچھا تھا۔

”نہیں ذرا بھی تو نہیں۔ تمہاری آواز اتنی خوب صورت ہے اور تمہارے لہجے میں اتنا حسن ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تم بولتی رہو اور میں سنتا رہوں۔“

اور وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

شہر یار بھی اپنے بچپن کی بابا کی، یعنی ارسل اور منے کی باتیں اسے سنا تا اور وہ بھی اتنی ہی توجہ سے سنتی۔ حویلی سے واپس آتے ہی اس نے منی سے رابطہ کیا تھا۔ یعنی بابا، ماں جی سب ہی اس سے ملے اور افسوس کرنے آئے تھے اور حیرت کی بات تھی ماما سب سے بڑی اچھی طرح ملتی تھیں۔ شہر یار کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے اسپتال میں مریم کا خیال رکھا۔

”تمہاری ماما تو اتنی اچھی ہیں۔ اتنی خوب صورت اور اتنی پولائٹ اور خوش اخلاق۔“ منی نے جانے جاتے سرگوشی کی تھی ”اور تم خوا خواہ ماما سے خفا رہتی تھیں۔“

”ہاں۔“ اس نے قافز سے زبانی کی طرف دیکھا۔

وہ جب سے آئی تھیں سب کا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ دن میں دو تین بار وہ یہ ضرور کہتی تھیں کہ

سب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ شاید وہاں کسی نے تم لوگوں کا زیادہ خیال نہیں رکھا۔

”نہیں ماما ایسی بات نہیں ہے۔ وہ سب بہت چاہنے والے اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔“ وہ فوراً دفاع کرتی لیکن اسے ماما کی تشویش اچھی لگتی تھی۔ ان دنوں وہ زیادہ گھر پر ہی رہتی تھیں۔ بہت کم باہر جاتی تھیں۔ میڈم نرس، ٹیکم آفندی اور شرجیل مرزا کبھی کبھار آ جاتے۔ اس نے شرجیل مرزا سے جڑنا چھوڑ دیا تھا۔ اگر سامنا ہو جاتا تو خوش اخلاقی سے سلام کرتی۔ عموماً وہ ماما کی موجودگی میں ہی آتا تھا اور کوئی غیر اخلاقی بات نہ کرتا تھا۔ بابا کی موت سے زندگی میں کتنے چیز آ گئے تھے اور سب سے بڑا چیلنج تو ماما میں آیا تھا۔

ایسے اس طرح تو وہ کبھی گھر میں نہیں رہتی تھیں۔ نہ یوں مجبوتوں کا اظہار کرتی تھیں۔ اب تو وہ کھانے کی میز پر سب کو اصرار کر کے کھلاتیں۔

”مورینا، یہ لو۔“

”نینا جانو تم تو کچھ بھی نہیں لے رہی ہو۔“

”عاشی جان، اتنی تھوڑی خوراک ہو گئی ہے تمہاری۔ بیٹا کھایا کیا کرو۔“

”اور مومو تم بالکل بھی اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں۔ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ تمہارے

بابا کی اتنی ہی زندگی تھی۔ تم سب خوش رہا کرو۔“

اور ماما کی اس توجہ اور اس التفات پر وہ اندر ہی اندر خوش ہوتی رہتی۔ خود بخود اس کے اندر بردباری سی آ گئی تھی۔ ذات کی ساری تلخی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ شہر یار کی محبت کو بھی اس نے قبول کر لیا تھا۔

اس سے باتیں کرنا اسے سوچنا۔

اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اب کبھی کبھی اسے لگتا جیسے اس کی محبت اس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں شامل ہو گئی ہو۔ چند دن اس سے بات نہ ہو پاتی تو زندگی ایک دم پھکی پھکی لگنے لگتی تھی۔

اور اس سب کے باوجود کبھی کبھی بابا بہت شدت سے یاد آتے تو وہ اپنے کمرے میں چھپ کر چپکے چپکے روتی۔ تیور نینا اور عاشی مری چلے گئے تو اب وہ زیادہ بور نہیں ہوتی تھی ہاں انہیں یاد بہت کرتی تھی۔ انہیں فون کرتی خط لکھتی اور ان کے لیے شاپنگ کرتی۔

بابا کو کتنا خوف تھا کہ ماما کی اپنی مصروفیات ہیں۔

لیکن ماما نے اپنی ساری مصروفیات چھوڑ دی تھیں۔ خود انہیں لینے اور چھوڑنے جاتی تھیں اور سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ کتنا اچھا ہو گیا تھا۔ کاش بابا بھی ہوتے۔

”مومی کیا سوچ رہی ہو؟“ شہر یار بہت دیر سے اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ چوکی۔

”میں تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ ابھی مجھے دیکھو۔ جب میں نہیں ہوتا تب مجھے سوچا کرو۔“

”بڑی خوش فہمی ہے۔“ وہ سر نیچے کر کے مسکرائی۔

”ہاں ہے تو کوئی اعتراض؟“

”نہیں۔“ وہ ایک دم ہنس پڑی اور اس نے زمین پر پڑا اپنا شولڈر بیگ اٹھایا۔

”اب چلیں۔“

”کچھ دیر اور نہیں ٹھہر سکتیں مریم؟“

”میں سر نیاز کی کاپیر میس نہیں کر سکتی شہر یار بہت اہم موضوع پر لکچر دے رہے ہیں وہ آج کل۔“

”کسی سے لے لیتا۔“

”مجھے کسی کے لیے ہوئے ٹولس پسند نہیں آتے۔ میں اپنی مرضی کے پوائنٹ نوٹ کرتی ہوں نا پلیز۔“

”اچھا بابا۔“ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا ”ویسے کیا کرنا ہے تمہیں ایم ایس سی کر کے یار گھر داری

ماما کے تسلط سے نکل گئی تھی حالانکہ وہ اب بھی ماما کی پسند کے ڈریسز پہنتی تھی، جب کہ اس کی پسند ماما کی پسند سے خاصی مختلف تھی۔

اور اس رات عاشری نے اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا تھا ”مجھے عادل بھائی کے ساتھ ماما کا رویہ پسند نہیں ہے۔“

”عاشری! ان کا رویہ بالکل نیچرل ہے۔“

”حالانکہ اب تک ان کا کوئی بھی رویہ کبھی نیچرل نہیں رہا۔“ عاشری نے کندھے اچکائے ”خیر عادل بھائی کے ساتھ ان کا رویہ نیچرل ہی سہی لیکن ہمارا تو ان کے ساتھ رشتہ ہے نا، بجو اور پتا ہے مجھے ان کی موجودگی سے تحفظ کا احساس ہوتا ہے اور جب وہ وہاں آتے ہیں مری تو بہت فخر محسوس ہوتا ہے مجھے کہ یہ میرے بھائی ہیں اتنی زبردست پرسنلٹی کے مالک۔ کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا؟“

وہ خاموش رہی۔ یہ احساس نہ جانے کس الجھن سے دب گیا تھا، ایک سر اس کی اور گھبراہٹ کا۔ اس ہوتا تھا اب تو پتا نہیں کیا۔ شاید وہ شرد سے ہی بتول ماما سے آئی تھی یا اس رشتہ سے۔ چاہے وہ ماما اور پاپا کے متعلق الجھن کا شکار رہتی تھی اور اب یہ عادل بھائی۔

بہر حال میں ماما کے کہنے پر اور صرف ان کی وجہ سے عادل بھائی سے نفرت نہیں کر سکتی اور نہ ان سے تعلق توڑ سکتی ہوں۔“

کتنا کا نفیڈ تھا عاشری میں کتنی بدل گئی تھی وہ۔ شاید ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے۔

شہر یار بھی جانے کس سوچ میں تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے لڑکوں کا ایک گروپ قہقہہ لگا کر ہنسا تو وہ دونوں چونکے۔

”اچھا اب اجازت۔“ شہر یار نے ہلکا سا سر خم کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

”اللہ حافظ!“ وہ مسکرائی ”یعنی آجائے تو اس کے ساتھ آنا۔“

اس نے سر ہلا دیا۔

”بہت یاد آتی ہو۔ بہت مس کرتا ہوں تمہیں۔“ جاتے جاتے اس نے سر گوشی کی۔

”پتا نہیں یہ محبت کی کیا چیز ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر نیازی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا۔

وہ بھی تو شہر یار کو یاد کرتی تھی اور اسے مس کرتی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس وہ دونوں یونی باتیں کرتے رہیں اور کبھی نہ جھکیں اور اگر لالہ ہوتی یہاں تو وہ اس سے ضرور پوچھتی اور لالہ اس کی کیفیات جان کر کتنی محظوظ ہوتی، کتنا تنگ کرتی اسے۔

اور لالہ تو ایسی گئی تھی کہ پھر مرکز آئی ہی نہیں تھی۔ پتا نہیں وہاں اپنے والد کے گھر میں وہ اعزاز سے مل بھی پاتی ہوگی یا نہیں..... اور اعزاز..... اعزاز کے بغیر وہ کیسے رہتی ہوگی وہاں۔ اب جب کہ وہ خود محبت

سے آشنا ہو رہی تھی تو لالہ کے لئے اکثر اس کا دل گداز ہوتا رہتا تھا۔ کاش کہیں سے اسے لالہ کا فون نمبر مل جاتا تو وہ ایک بار اسے فون تو کرتی اور وہ کتنی بے وفائی تھی کہ اس نے مرکز فون ہی نہیں کیا تھا۔

”خیر آج آئی مگر اس سے پوچھوں گی۔ کیا خبر انہیں نمبر معلوم ہو۔“ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اس سے گزرتی ہوئی اپنی ایک کلاس فیلو کی طرف متوجہ ہو گئی۔



مریم جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی ڈرائنگ روم سے قہقہوں کا اک شور سا اٹھا۔ اس نے پاس سے گزرتے شریف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ جی سب آئے ہوئے ہیں۔ اپنے شی صاحب اور وہ جی سارے فلم والے۔“

”اچھا۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

”سینے جی۔“

اس نے مڑ کر دیکھا۔

”آپ ذرا ٹیکم صاحبہ سے کہہ دیں نا۔ میری سفارش کر دیں جی، فلم والوں سے مجھے بھی کوئی چانس وائس مل جائے فلم میں جی۔“

”اچھا، میں کہہ دوں گی۔“ وہ مسکرائی۔

اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ وہ جب بھی شہر یار سے مل کر آتی تھی اس کا موڈ بہت اچھا ہوتا تھا۔ اپنے ارد گرد کی ہر شے اسے خوب صورت اور دلکش لگتی جیسے تمام کائنات خوش ہو۔ کسی کو کوئی دکھ نہ ہو۔ شاید یہ شہر یار سے ملنے کی خوشی ہوتی تھی۔ آج بھی شہر یار سے مل کر جیسے اس کی ساری جھکن اور ساری دہائی دور ہو گئی تھی حالانکہ پچھلے کئی دنوں سے وہ بے حد تھکن محسوس کر رہی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اگر آج بھی مینی نہ آئی تو وہ بھی دو تین روز یونیورسٹی سے چھٹی کر لے گی اور اگر مینی آئی ہوگی تو پھر وہ اس کے ساتھ گھر جائے گی۔

ماں جی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پیئے گی، ارسل اور سننے سے کپ شپ لگائے گی اور شہر یار کو دیکھے گی اور اگر بابا ہوئے تو ان سے اچھی اچھی باتیں کرے گی لیکن عینی نہیں آئی تھی البتہ شہر یار آ گیا تھا اور شہر یار سے مل کر اس سے باتیں کر کے وہ کس قدر فریض ہو گئی تھی۔ مینی بھر کی تھکن دور ہو گئی تھی۔

بیک ایک طرف اچھالتے ہوئے وہ بیڈ پر گر گئی اور ریلیکس ہونے کے لئے ذرا سی دیر کو اس نے آنکھیں موند لیں اور بند آنکھوں میں شہر یار کا سراپا اتر آیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ اسے ہی سوچتی رہی تھی۔ سنجیدہ سا شہر یار آج کتنا شوخ ہو رہا تھا اور کس قدر مختلف اور بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ سر نیازی کے لپچر کے دوران بھی اس کی باتیں اس کی دانتی اسی گدگداتی رہی تھی اور سر نیازی کے اتنے اہم لپچر کا

ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا اور نہ ہی وہ کوئی پوائنٹ لکھ سکتی تھی اور شہر یار کی محبت میں کیسی بے خودی تھی کہ وہ ارد گرد سے بھی بعض اوقات غافل ہو جاتی تھی اور اگر لالہ یہاں ہوتی تو وہ ضرور اسے اپنے راز میں شریک کرتی اور اسے بتاتی کہ اسے بھی محبت ہے۔

محبت۔ پتا نہیں کیسا جذبہ ہوتا ہے اور کیوں ہو جاتی ہے یہ محبت اور جب لالہ کو پتا چلتا تو وہ کیسے آنکھیں منکائی اور کیسے اسے چھیڑتی اور اسے مشورے دیتی۔ حالانکہ لالہ عمر میں اس سے چھوٹی تھی مگر وہ اس کے مقابلے میں بہت زیادہ جانتی تھی اور اس کی باتیں اسے حیران کر دیا کرتی تھیں۔ آج کل لالہ اسے اکثر یاد آتی تھی حالانکہ وہ اس سے بہت زیادہ قریب کبھی بھی نہیں رہی تھی اور نہ ہی وہ اس کی اس طرح دوست تھی جس طرح عینی تھی پھر بھی وہ اسے سوچتی تھی اور اسے یاد کرتی تھی اور پتا نہیں لالہ بھی اسے یاد کرتی ہوگی کبھی یا نہیں؟

اور ضرور آئی نرگس بھی اسی ہوں گی۔ بھلا ماما کے سب دوست اکٹھے ہوں اور آئی نرگس نہ ہوں۔ پاپا ہمیشہ آئی نرگس کو ماما کی بیسہ فریادیں کرتے تھے اور خود ماما بھی لیکن پتا نہیں کیوں اسے ہمیشہ آئی نرگس فراڈ لگی تھیں جیسے ماما کے لئے میں بہت زیادہ ان کا ہاتھ ہوا اور وہ ماما سے جلیس ہوں۔ ان کی خوب صورتی اور اسٹارٹس سے اور پاپا سے کہ پاپا جیسے پینڈم بندے کی وائف ہیں۔ وہ ہمیشہ پاپا اور ماما کے درمیان ہونے والے معمولی جھگڑے کو ہوا دیتی تھیں اور جب پاپا آخری بار ہاسپٹل گئے تھے جب بھی وہ انہیں ماما کے خلاف بھڑکا رہی تھیں سوائے آئی نرگس کبھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ دوغلی اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور۔ ماما اس بات سے بے خبر تھیں جب کہ لالہ آئی نرگس سے بالکل مختلف تھی اور اگر آئی نرگس آئی ہوں تو وہ ان سے جا کر لالہ کا پتا کر لے۔ کئی دنوں سے اس کا بہت جی چاہ رہا تھا لالہ سے باتیں کرنے کا اسے اپنی کیفیات بتانے کا۔

وہ اٹھ بیٹھی تب ہی صفو نے اندر جھانکا۔

”کھانا لگاؤں؟“

”نہیں، بھوک نہیں ہے، بس ایک کپ چائے بنا دو اور ہاں سنو۔ آئی نرگس بھی ہیں؟“

”جی کچھ دیر پہلے تو تھیں لیکن جب میں چائے لے کر گئی تھی تو وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں کہیں جانا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم چائے لے آؤ۔“

اس نے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں برش کیا اور چائے پی کر اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ ڈرائنگ روم سے اب بھی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

اور بڑے دنوں، ریوں ماما کے سب دوست اکٹھے ہوئے تھے۔ وقتاً فوقتاً تو کوئی نہ کوئی آ جاتا تھا۔ کبھی شرجیل مرزا، کبھی نرگس، کبھی کوئی اور اور ماما انہیں انٹرٹین کرتیں لیکن سارا وقت اداس اداس سی

رہیں۔ اکثر سیاہ کپڑے پہنتیں۔ چلو اچھا ہے، آج سب لوگ آئے ہیں تو ماما بھی خوش ہو جائیں گی۔ ورنہ پاپا کے بعد وہ کتنی اداس رہنے لگی تھیں۔ شاید انہیں ان کے بعد ان کی اچھائیوں کا احساس ہوا تھا۔

اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ بالکل سانسے شرجیل مرزا بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ماما بیٹھی تھیں۔ آج بھی انہوں نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور کالا رنگ ان پر کتنا جتنا تھا اور اس رنگ میں وہ کس قدر حسین لگتی تھیں۔ آئی نرگس شاید جا چکی تھیں۔ ادھر بہت سے لوگ تھے جن میں سے کئی ایک کو وہ جانتی کئی نہیں تھی۔ شاید ان کی فلم سے متعلق لوگ تھے اور ان کے ساتھ فلم میں آنے والا وہ کم عمر بیرو بھی تھا اور آئی نرگس۔ انہیں دیکھنے کے لیے اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور اس کی نظریں پھر ماما پر ٹپک گئیں۔ اور ماما شرجیل مرزا کے کس قدر قریب بیٹھی نہ جانے کس بات پر سن رہی تھیں۔

”بھئی، یہ سیاہ لباس اب اتنا روتیجے میڈم بہت سوگ منالیا آپ نے۔“ نہ جانے کس نے کہا تھا۔

”سوگواری نے حسن دو آتھہ کر دیا ہے۔“ شرجیل مرزا کی آواز آہستہ تھی لیکن مریم کے کانوں تک بخوبی آرہی تھی۔ وہ یونہی ذرا سا پردہ ہٹائے دم بخود سی کھڑی تھی۔

”بجائے ماما۔“ کسی نے تائید کی۔ موضوع گفتگو ماما تھیں، سوان کی کھنی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔

”کیوں ہمیں قتل کرنے کا ارادہ ہے مرز عثمان؟“ شرجیل مرزا تھوڑا سا ان کی طرف جھکا۔

”بھئی، تم بہت فضول بولتے ہو۔“ مرز عثمان نے اسے ٹوکا۔

”ہاں جی، آپ کہہ سکتی ہیں جو بھی چاہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں جو مزاج یار میں آئے۔ بھئی، ایک تو میرا شعری ذوق بہت خراب ہے۔ تجبی ہوتا تو درستی کر دیتا۔“ کہتے ہوئے شرجیل مرزا سیدھا ہوا اور اس کی نظریں یکدم پردہ اٹھائے اندر جھانکتی ہوئی مریم پر پڑیں تو وہ بے اختیار اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پردہ مریم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ وہاں سے ہٹ کر لاؤنج میں آ بیٹھی اور ٹی وی آن کر دیا۔ ذہن ایک دم پراگندہ سا ہو گیا تھا۔

”کیا تھا یہ سب۔“

”کیا ماما پھر پہلے جیسی ہو جائیں گی۔“

”سب کچھ کتنا اچھا اور خوش کن ہو گیا تھا۔“

”نہیں۔“ اس نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی ”بھلا اب پھر سب کچھ کیسے بدل سکتا ہے پھر بھلا اس میں ماما کیا قصور۔ وہ سب لوگ ماما سے ملنے آئے ہیں تو ظاہر ہے، ماما کو ان سے ملنا اور بات تو کرنا ہی سہا۔ پھر وہ لوگ، وہ تو اسی طرح باتیں کرنے کے عادی ہوں گے۔ ایسی ہی فضول باتیں۔“

اس نے ریوٹ اٹھا کر جینیل بدلا۔

ایس ٹی این سے ”مسٹرین“ دکھائی جا رہی تھی۔ ذرا سی دیر کو وہ اسے دیکھنے میں محو ہو گئی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”کیا کوئی بہت دلچسپ چیز دیکھی جا رہی ہے؟“ شرجیل مرزا جانے کب لاؤنچ میں آ گیا تھا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا ”بس یہ مسٹرین دیکھ رہی تھی۔“

حالانکہ اسے نینا، عاشی اور مور کے ساتھ وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی لیکن اب یونی مصروفیت ڈھونڈ رہی تھی اس نے۔

”بہت دلچسپ ہے کیا؟“ شرجیل مرزا اسانے ہی بیٹھ گیا۔

”بس سوسو۔“ وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی اور آواز قدرے اونچی کر دی۔

”کمال ہے ابھی تو ہمیں چسپ چسپ کر دیکھا جا رہا تھا اور اب ہم سامنے آ کر بیٹھ گئے ہیں کہ لو جی بھر کر دیکھ لو تو نظریں ہی نہیں ملائی جا رہیں۔“

”کیا!“ اسے کرنٹ سا لگا ”میں آپ کو دیکھ رہی تھی۔ جی نہیں، غلط فہمی ہے آپ کی۔“

”تو پھر کیا اپنی ماما کی جاسوسی ہو رہی تھی؟“

”مجھے ماما کی جاسوسی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ تپ گئی لیکن حتی الامکان اس نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔ ”میں تو اتنی دودھ پیتے تھی۔ آج بڑھ گئی۔“

”اچھا۔“ شرجیل مرزا نے اچھا بول دیا۔

”ہم سمجھے۔۔۔۔۔ خیر۔“ اس نے تھنڈی سانس لی ”اگر ہم پر بھی نظر عنایت ہو جائے تو کیا حرج ہے۔“

”پلیز۔“ اس نے درخواست کی ”میں آپ سے کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتی۔ بہتر ہے آپ ماما کے پاس ہی جا کر بیٹھیں۔“

”ابھی انہی کے پاس سے ہی تو اٹھ کر آ رہا ہوں جانم۔۔۔۔۔!“

اس کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا جیسے کسی نے رخساروں پر انگارے دھریے ہوں۔ اس نے یہ مشکل اپنے آپ کو کچھ کہنے سے روکا۔ وہ سچ سچ اس سے کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی ماما کو ناراض کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے ارے کہاں چلیں آپ۔“ شرجیل مرزا نے بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر اسے روکا ”آپ شوق سے اپنا پروگرام دیکھیں اور ہم۔۔۔۔۔ ہم آپ کو دیکھیں گے۔“

اس نے پاؤں پھیلانے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر مڑی۔

”مس عثمان۔“ اس نے آہستگی سے آواز دی ”پلیز ایک منٹ رکیں۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”آخر

آپ مجھ سے اتنا بھاگتی کیوں ہیں۔ میں اتنا برا نہیں ہوں، جتنا آپ سمجھتی ہیں۔ یقین کیجئے میں آپ کی بہت قدر کروں گا، بہت محبت دوں گا۔“

”آپ یہ خیال اپنے دل سے نکال دیں شرجیل مرزا! میں آپ سے نفرت کرتی ہوں اور یہ بات غالباً پہلے سے آپ کے علم میں ہے۔“

”نفرت محبت میں بھی تو بدل سکتی ہے۔“ وہ بھی انتہائی ڈھیٹ تھا۔

مریم نے بے بسی سے ہونٹ کانٹے ”آخر آج آپ پھرتے عرصے بعد کیوں میرے پیچھے بڑگئے ہیں۔“

”اتنے عرصے بعد نہیں جانم۔ ہم تو شروع سے ہی آپ کے پیچھے ہیں۔ یہ اتنے عرصے کی خاموشی محض اس لئے تھی کہ آپ سچو سچو اور سچا جانیں۔ پھر یوں بھی پیپ پڑھنا، مصروفیات میں بھرا آپ کے

باباوات پائے۔ سچا، دراصل ہم سے نہیں جانیں۔ ورنہ آپ کو بھولتا تو بھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔“ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غار ہوتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”آپ۔“ اس نے ہونٹ چبائے اور ٹھہر ٹھہر کر بولی ”آپ کے لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ کسی اپنی

ہم عمر خاتون سے شادی کر کے اب شریفیوں والی زندگی بسر کریں۔“

”آہ۔“ وہ زور سے ہنسا ”آپ کے خیال میں کیا اب میں بد معاشوں والی زندگی بسر کر رہا ہوں۔“

اسے بی بی، بہت شریف آدمی ہوں۔ اس معاشرے کا ایک معزز فرد جسے لوگ بہت عزت دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ہم عمر خاتون۔۔۔۔۔ ہا۔“ وہ پھر ہنسا ”سولہ سولہ سترہ سال کی لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کے

لیے مری جا رہی ہیں لیکن کیا کریں یہ دل آپ پر مرمٹا ہے۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت الجھ کر اور بیزار سی ہو کر اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑی۔ تب ہی نذیب عثمان

ڈرائنگ روم سے ہنستی ہوئی باہر نکلیں۔

”افوہی، تم یہاں آ کر بیٹھ گئے ہو اور اندر روزی علی وہ قصہ سننے کو بیتاب ہو رہے ہیں جسے تم ادھر اچھوڑ آئے تھے۔“

نذیب عثمان مریم کی طرف دیکھے بغیر اس کی طرف بڑھیں۔

”کیا کریں بھئی۔ آپ کی بیٹی نے روک لیا۔ اندر آپ باندھے بیٹھی تھیں باہر آیا تو انہوں نے قید کر لیا۔“

”نہیں ماما! میں نے تو۔۔۔۔۔ میں نے تو بالکل بھی نہیں روکا۔“ وہ جاتے جاتے پلٹ پڑی ”یہ خود ہی آ کر بیٹھ گئے۔“

”ضروری تو نہیں کہ کسی کو زبان سے ہی روکا جائے اور بھی طریقے ہوتے ہیں روکنے کے۔“ وہ بائیں آنکھ کا کوننا با کر خباثت سے ہنسا اور وہ اندر ہی اندر چوری بن گئی۔ نذیب عثمان نے دونوں کو عجیب نظروں



دو دنوں 'تمہاری فلم میں ہیرو و کن تھے اور ان دنوں اکٹھے رہنے کے مواقع بہت ملے اور صحافیوں سے تو خدا بچائے اور تم خود بھی تو وہاں تھے۔“

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور کمرے میں جاتے جاتے اس نے سنا کہ سب عورتیں کہہ رہی تھیں ”وہ سچی نہیں تو پتا ہے کہ اسے تمہاری اس طرح کی باتیں پسند نہیں ہیں۔ چلتی ہے وہ ان باتوں سے پھر یوں تنگ کرتے ہو؟“

”میں تنگ کرتا ہوں، بھلا کہاں۔ تنگ تو وہ مجھے کرتی ہے۔“
 ”حجی۔“ نذب کی آواز میں جانے کیسی لگاؤ تھی کہ مریم اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے کرتے
 رک گئی، ”تمہیں تو پتا ہے، وہ تمہیں پسند نہیں کرتی پھر.....“
 وہ ذرا سی رکیں۔ مریم نے جھانک کر دیکھا۔

وہ بڑے قائل انداز میں شرجیل مرزا کی طرف بھگی ہوئی تھیں۔ اس کے کان کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں۔ اس نے نیک دم زور سے دروازہ بند کر دیا اور بند دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہارے لیے کیا کمی ہے۔ جس طرف انگلی اٹھاؤ۔“

”انگلی تو اس طرف اٹھی ہے سر عثمان۔“

بند دروازے سے مدھم سی آواز مریم کے کانوں میں پڑی۔ غیر ارادی طور پر اس نے کان دروازے سے لگا دیے۔

”آپ کو یاد ہوگا مسز عثمان ایک بار بہت پہلے آپ نے کہا تھا کہ مومو کی تعلیم ہو جائے تو پھر..... ہم تو اسی دن کی اس لگائے بیٹھے ہیں۔“

”لیکن اس کے پاپا کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ یاد ہے نا ہمیں۔“

”ہاں یمن اب تو اس کے پاپائیں رہے اور ویسے بھی بے چارے عثمان صاحب تمہارے فیصلوں میں کہاں دخل دیتے تھے۔“

”لیکن مومو کے معاملے میں انہوں نے دخل دیا تھا۔“ وہ کچھ ہچکچائیں ”دراصل تمہاری اور اس کی عمر میں فرق بھی تو بہت ہے۔“

”خیر اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میڈم نرگس اور امتیاز ملک کی عمر میں دیکھ لیں، کتنا فرق ہے اور اب اگر آپ اور آپ کا ہیرو شادی کر لیتے ہیں تو آپ کی عمر میں بھی.....“

”تم جی صحافیوں کی بات پر یقین کئے بیٹھے ہو گئی۔“ انہوں نے شکوہ کیا ”بات صرف اتنی ہے کہ ہم

فیروزی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت فریش لگ رہی تھیں۔
 ”کیا کرنے لگی ہو؟“
 ”کچھ نہیں، ذرا باتھ لینے لگی تھی۔“

”تو چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں ذرا ڈاکٹر ہادی کی طرف جا رہی تھی۔ ڈاکٹر معید کے والد کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، ذرا مزاج پر سی کر آئیں۔ تمہاری بھی آؤنگ ہو جائے گی۔ واپسی پر شاپنگ بھی کر لیں گے۔“

”مگر ماما میری نہیں چاہ رہا۔ آپ ہو آئیں۔“

”تم روکی ہو مومو۔“ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں ”اب تم یونیورسٹی میں ہو۔ مریم چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے لیے مسئلہ بنا لیا کرو۔ اگر شچی نے تم سے کہہ دیا ہے تو لاسٹلی لو اسے۔ تم اگر نہیں چاہتی تو نہیں ہوگا۔ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں۔ اپنی ماما پر اعتبار کرو۔“

”ماما، اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور پلکیں ایک دم جھپک گئی تھیں۔

انہوں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے سانسے بٹھالیا ”میں تمہاری ماما ہوں۔ مجھے شچی تمہارے لیے پسند تھا کہ وہ ایک سمجھدار اور دولت مند آدمی ہے۔ میرے اپنے خیال کے مطابق تم اس کے ساتھ خوش رہیں لیکن جب تم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو بات ختم ہو گئی۔ میرا اعتبار کرو۔ کبھی بھی تمہاری خواہش یا مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا لیکن جانو تم شرجیل کی کسی بات کا برا نہ مانا کرو۔ اگر کبھی اتفاق سے تمہارا سامنا ہو جاتا ہے اس سے تو اس کی باتوں کو نظر انداز کیا کرو۔ جانتی ہو مومو میں اس کی کمپنی میں کام کرتی تھی اور بہت پرکشش تنخواہ دیتا تھا وہ مجھے پھر میں نے فلم کے لیے کنٹریکٹ کر لیا اور فلم ختم ہوئی تو تمہارے پاپا کی ڈیجھ نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا۔ میں اپنے آپ کو کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں سمجھتی تھی لیکن کب فارغ بیٹھا جاسکتا ہے۔ میں نے پھر سے اس کی کمپنی جوائن کر لی ہے حالانکہ ایک دو فلموں کی بھی آفر ہوئی ہے لیکن کردار جاننا نہیں ہیں۔ یوں بھی میرا ارادہ فلم میں کام کرنے کا نہیں ہے۔“

”مگر ماما،“ مریم نے ان کی طرف دیکھا ”آپ کو فلم یا شرجیل مرزا کی کمپنی میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ گھر پر ہی رہا کریں۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔“

”ضرورت ہے نا، میری جان! تم ہونیٹا اور عاشی ہیں، مور ہے۔ آخر تم سب کے لیے.....“

”مگر ماما،“ اس نے بات کاٹی ”زمین کی آمدنی جو آتی ہے وہ کیا کافی نہیں ہے۔“

”کیا خاک آمدنی ہوتی ہے۔“ ان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی ”اس سے تو صرف نینا عاشی اور مور کی سال کی فیس بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ مور کے دادا نے بڑی زیادتی کی ہے عثمان کے ساتھ۔ دراصل تمہارے پاپا نے اپنی پسند سے مجھ سے شادی کی تھی۔ والدین رضامند نہ تھے۔ ترس کھا کر تھوڑی سی زمین ان کے

نام کر دی اور رہنے کو یہ ایک گھر عنایت کر دیا اور باقی سب کچھ تو عادل اور کامل کے نام کر دیا انہوں نے۔ تمہارے پاپا کا حق مارا ہے انہوں نے۔ خیر روز مجھ پر جواب دہ ہوں گے۔“

”تو ماما،“ مریم پریشان سی ہو گئی ”میں جاب کر لیتی ہوں۔“

”وہ تمہیں بھلا کیا جاب ملے گی؟“ وہ ہنس پڑیں ”اور تم اس کی فکر نہ کرو۔ اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ تعلیم سے شخصیت میں نکھار آتا ہے۔“

”تو پھر آپ کہیں اور جاب کر لیں نا۔ ضروری ہے شرجیل مرزا کی ہی جاب کریں۔ وہ ہرگز اچھا آدمی نہیں ہے۔“

”کہیں اور اتنی پرکشش جاب نہیں مل سکتی۔“ وہ اپنی جھنجھلاہٹ کو چھپا کر کھڑی ہو گئیں ”اور اب فضول میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیار ہو جاؤ۔“

”جی۔“ وہ کپڑے اٹھائے کچھ سوچتی ہوئی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔



پروفیسر عادل بہت دیر سے لان میں رکھی بید کی کرسی پر بیٹھے زرد اور سوکھے چوں کو تیزی سے مگرتے اڑتے اور ایک اخبار کی صورت میں جمع ہوتے دیکھ رہے تھے۔

بالکل ایسا ہی زرد ملال کا موسم ان کے دل میں اتر ا ہوا تھا اور آنکھوں میں شگفتگی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اتنے برسوں کے انتظار کا حاصل

مریم عثمان احمد

لیکن ان کی رسائی سے بہت دور

حالانکہ وہ جانتے تھے وہ کہاں ہے کس جگہ ہے..... بہ ظاہر ان کی رسائی میں۔ لیکن حقیقتا بہت دور..... بہت فاصلے پر کھڑی تھی وہ.....

اس کا خوب صورت اور دلکش سراپا ان کے تصور میں آیا تو وہ دم بخود سے ہو گئے۔

کس قدر خوب صورت، کس قدر دلکش ہوتی..... بالکل ایسا ہی سوچتا تھا میں تمہیں۔

لیکن سب رائیگاں اور لا حاصل تھا۔

وہ آرزوئیں جو دل کو گدگداتی تھیں۔

اور وہ ایک انجانی سی ہستی کا انتظار۔

سب لا حاصل۔

وہ کیا کریں۔

سب بچینی سے انہوں نے ہاتھوں کو مسلا۔ پہلے ہی قدم پر ٹھوکر لگی تھی۔ صفائی میں کہنے کے لیے سارے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ جب بھی تیمور عاشی اور نینا سے ملنے گئے تو انہیں اس کے رویے میں

دل چپے پانی ہونے لگا۔ درو کی ایک لہری اٹھی جو یہاں سے وہاں تک پورے وجود میں پھیل گئی۔ بے چینی سوا ہوئی۔

”نہیں..... عادل خان نہیں۔“

”اتنی آسانی سے ہمت ہارو گے تو کیا برسوں اسی لیے انتظار کیا تھا۔“

”راتوں کی تنہائی میں سوچا تھا۔“

”دل ہی دل میں میں شین ابجز کی طرح اس کی شبیہ تراشی تھی اور جب اسے دیکھ کر دل میں کھٹی بجی تو.....“

”نہ اس سے درو دل کہا۔“

”نہ اپنی بے چینیاں اور بے تائیاں اس سے بیان کیں اور..... اتنے مشکل لمحے اس سے پہلے ان پر کبھی نہ آئے تھے۔“

”اتنی تیز ہوا میں آپ باہر بیٹھے ہیں۔“ خدا بخش نے ان کے قریب آ کر کہا تو وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

”آدمی آئے گی اور شاید بارش بھی ہو۔“ خدا بخش نے آنکھوں پر ہاتھ کا کچھجا سا بنا کر آسمان کی

طرف دیکھا۔

”شاید۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”خدا بخش اگر ایک کپ چائے مل جائے اس وقت تو.....“

”کیوں نہیں جی۔ آپ چائیں اپنے کمرے میں۔ ابھی لایا۔“ پھر جاتے جاتے مڑا ”آپ کمرے ہی

میں جائیں گے نا جی۔“

”ہاں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور خدا بخش کی طرف دیکھا ”یہ سرور نے بہت دن

لگا دیے گاؤں میں۔“

”ہاں دن تو بہت لگا دیے ہیں جی پر کون سا ب کالج جانا ہوتا ہے انہیں..... فارغ ہی ہیں۔“

”پھر بھی کام تھا..... خیر۔“ انہوں نے زیر لب کہا اور سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ تب

ہی کہ وہ در میں پڑے فون کی کھٹی بجی۔ انہوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تا کہ خدا بخش سے کہیں کہ وہ فون اٹینڈ

کر لے ان کا قطع کسی سے بات کرنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

اس وقت وہ صرف اپنے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

خود کو کھوجنا چاہتے تھے۔

خود سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔

کوئی تو سراہا تھا آئے۔

وہ کچھ تو فیصلہ کریں۔ ادھر یا ادھر۔ ماں جی بھی کتنی اہل رہتی ہیں اور کتنی خواہش تھی ان کی کہ وہ

واضح بے زاری محسوس ہوئی۔ وہ اگر کوئی بات بھی کرتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی بے زاری کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ ان کی طرف دیکھتی تو نگاہوں میں واضح الجھن ہوتی اور وہ اپنی صفائی میں کیونکہ بھی نہ سکے تھے اور وہ حویلی سے آگئی تھی..... اور پھر کبھی حویلی گئی نہیں۔ وہ کتنی ہی بار نینب ولا گئے تھے صرف اس کی خاطر حالانکہ پہلی بار ہی انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نینب عثمان کو ان کی آمد پر نہ نہیں آئی..... عاشقی نینا اور تیرور ان سے خاصے مانوس ہو گئے تھے اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود بھی ان کے لیے اپنے دل میں اچھے جذبے محسوس کرتے تھے۔ نینا تو انہیں بہت پیاری لگتی تھی بولتی بیٹھا جیسی۔ شاید ان کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی اس لیے۔

یا پھر عثمان احمد سے دم مرگ انہوں نے جو وعدے کیے تھے اس لیے وہ ان سے ملنے اور ان کی خیریت معلوم کرنے چلے جاتے تھے لیکن اگر صرف ان سے ملنا مقصود ہوتا تو وہ مری بھی جاسکتے تھے۔ خاص طور پر نینب عثمان احمد کی ناگواری محسوس کر کے۔ ان کا دل تو کسی ضدی بچے کی طرح اسے دیکھنے کو چلتا رہتا تھا۔ کتنا ضبط کرتے تھے وہ۔

اپنے آپ کو روکتے اور سمجھاتے رہتے تھے۔

لیکن جب کبھی ویک اینڈ پر عاشقی اور نینا وغیرہ آئے ہوتے تو پھر ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے اور وہ اسے دیکھنے کو اس سے ملنے کو بے تاب ہو جاتے۔

کئی بار وہ گھر سے سوچ کر گئے تھے کہ وہ آج ضرور اس پر واضح کر دیں گے۔

خدا جانے وہ کیا سمجھ رہی تھی اور کیوں ابھی، وہی تھی۔

شاید کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی اسے۔

وہ جو پہلے اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی ایک دم بے تاثر لگتیں اور کبھی ابھی ابھی سی لیکن شدید چاہت کے باوجود وہ اس سے بات نہیں کر پائے تھے۔

وہ بہت کم ان کے پاس رکتی تھی۔ بس بی آ یا اور ماں بی کی خیریت پوچھتی۔ حریم اور کامل کا حال پتا آتی اور پھر ادھر ادھر ہو جاتی اور ان کی نگاہیں اسے کوئی ہی رد جاتیں۔

اور کتنی بد نصیبی تھی کہ وہ مل کر بھی نہیں مل رہی تھی..... تو کیا خیال چھوڑ دیں۔

کبھی الجھن تھی اور کبھی گرہ تھی جو کھل نہیں پاری تھی اور یہاں وہ بھی نہ جان پائے گی کہ اس کے اور

نہ درمیان وہ رشتہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہی ہے۔

اور کیا میں پیچھے ہٹ جاؤں اور ماں جی کو اپنی رشتہ منی۔ یہ دونوں حریم کے لیے۔

انہوں نے ذہنی خلفشار سے تھک کر آنگن میں موڑ دی۔

ماں جی اور آغا خوش ہو جائیں گی اور شاید حریم بھی.....

شادی کر لیں..... حرم سے نہ سہی۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ۔

اور ماں جی نے کیا خوش دیکھی..... ساری زندگی یوں ہی بے رنگ گزر گئی تھی اور اب ان کی شادی کی صورت میں وہ ایک خوشی چاہ رہی تھیں تو وہ انہیں دینے سے قاصر تھے۔

نیل مسلسل ہورہی تھی خدا بخش کچن میں جا چکا تھا۔ انہوں نے لمحہ بھر کچھ سوچا اور پھر آگے بڑھ کر ریسورٹ اٹھالیا۔ دوسری طرف سے تیمور کی چپکتی ہوئی آواز آئی۔

”کہاں تھے آپ اتنی دیر سے فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟“

”اوہ۔“ انہوں نے ایک طویل سانس لی ”آپ ہیں مور۔ کہاں سے بول رہے ہیں؟“

”یہاں سے ہی..... ہماری ایک ہفتے کی چشیاں ہیں۔“

”کس سلسلے میں؟“

”بس وہ فنکشنز وغیرہ ہورہے تھے نا۔ ہم نے چھٹی لے لی۔“

”اچھا کیسے ہیں آپ..... اور عاشی نینا کیسی ہیں۔“

”ہم سب اچھے ہیں اور آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ آپ کب ہم سے ملنے آئیں گے؟“

”دیکھیں کب آنا ہو۔ ابھی تو آپ ہیں نا کچھ دن۔“

”عادل بھائی۔“ وہ اداس ہو گیا ”آپ آج ہم سے ملنے نہیں آئیں گے؟“

”آج.....“ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ اسے دیکھنے کو دل چل اٹھا۔

”ہاں آج ہی۔ اتنے اداس ہورہے ہیں ہم سب آپ کے لیے اور آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ آپ

اداس نہیں ہوتے ہمارے لیے۔“

”ہوتا ہوں۔“

”تو پھر آتے کیوں نہیں ہیں۔ ابھی میں چھوٹا ہوں نا نہیں تو میں خود ہی آ جاتا۔“

”اچھا.....“ وہ ہنس دینے ”جب بڑے ہو جائیں گے تو پھر خود آ جایا کریں گے۔“

”ہاں..... اور پھر میں حویلی بھی جایا کروں گا بڑی امی سے ملنے اور پتا ہے ہم نے آپ کے لیے گفٹ

بھی لیے ہیں مری سے۔ نینا اور عاشی نے بھی۔“

”میری جان۔“ انہیں ایک دم ہی اس پر پیارا گیا ”بھلا گفٹ کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہم نے مضموم کے لیے اور ماما کے لیے بھی گفٹ لیے تو آپ کے لیے بھی لے لیا..... آپ ہمارے

بھائی نہیں ہیں کیا۔“

”ہاں ہیں تو۔“

مومو کے نام پر ان کا دل زور سے دھڑکا۔

پھر وہی خواہش۔

اسے دیکھنے کی۔ اس سے ملنے کی خواہش خون میں گردش کرنے لگی اور پھر وہ اس خواہش سے مغلوب

ہو کر بولے۔

”اوکے میں ابھی آتا ہوں۔“

ریسورٹ کرڈیل پر ڈال کر انہوں نے خدا بخش کو آواز دی۔

”خدا بخش چائے مت بنانا میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔“

”لو چائے میں کتنی دیر لگنا تھی۔ میں نے دم بھی کر دی۔“ خدا بخش نے کچن سے باہر آ کر کہا ”آپ دو

منٹ رک جائیں میں ابھی بنا کر لاتا ہوں۔“

”نہیں یا۔ اب میرے حصے کی تم ہی پی لینا۔“

اب جانے کا ارادہ ہو گیا تھا تو کچھ دیر بھی رکنا محال ہو رہا تھا۔ کہاں تو ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہ سوچ رہے

تھے کہ اب کبھی ادھر نہیں جائیں گے تاکہ اس پر نظر نہ پڑے۔ اس کا اس قدر روکھا اور بے زاری کا اظہار کرنا

روپہ انہیں بہت تکلیف دیتا تھا۔ پتا نہیں وہ انہیں کیا سمجھ رہی تھی اور ان کے متعلق شدید غلط فہمی کا شکار تھی

اور کہاں اب ایک منٹ رکنے کو تیار نہ تھے۔

”اب ایسی بھی کیا آفت ہے۔“ خدا بخش آپ ہی آپ بڑبڑایا ”ضرور مجھتی صاحب کا فون ہوگا۔

انہیں ہی وقت بے وقت کام پڑتے ہیں۔ کہیں کوئی شام منانی جا رہی ہوگئی۔ انہوں نے افسانہ پڑھنا ہو گیا

حافظ صاحب کو کسی نے افسانہ اور کہانی لکھنے کا مشورہ دیا ہوگا۔“

وہ ایک دم مسکرا دیے اور ٹیلی وژن کے قریب پڑی ہوئی گاڑی کی چابی اٹھالی ”اوکے خدا بخش اللہ حافظ!“

جب کبھی وہ یوں اس کی بنائی ہوئی چائے یا کھانا چھوڑ کر چلے جاتے تھے تو خدا بخش کا موڈ سخت خراب

ہو جاتا تھا.....

تمام راستہ وہ اسے ہی سوچتے رہے۔

اور کتنا مشکل ہے اسے چھوڑ دینا۔

بھلا دینا۔

اور شاید میں کبھی فیصلہ نہ کر سکوں۔

اور کبھی کسی کو نہ پتا سکوں۔

تقدیر کے اس مذاق پر انہیں ہنسی آگئی۔

اور تمہیں کہاں ملنا تھا مریم۔

کس جگہ پر۔

گیٹ کے سامنے انہوں نے ہارن بجاتے ہوئے سوچا۔

”کاش! تم مجھے کہیں اور ملی ہوتیں۔ کسی اور جگہ تو تمہیں بتاتا کہ میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا ہے۔ اور کتنا تلاش کیا ہے۔“

تم تو میری صدیوں کی تلاش کا حاصل تھیں مریم اور میں سوچتا تھا کہ جب تم مجھے ملو گی تو میں ہر نہیں کیسے اور کس طرح سے اپنے جذبوں کا اظہار کر پاؤں گا۔ شاید تم میری باتیں سن کر ہنسو گی۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ یوں اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کوئی کسی ان دیکھی ہستی کے انتظار میں عمر بتا دے۔ اور پتا نہیں کیا کیا سوچا تھا میں نے۔

تم ملو گی تو تم سے یوں کہوں گا۔ اس طرح بات کروں گا۔

بہت دنوں سے یہ سوچتے تھے کہ۔

تم سے گریہ کلام کرتے

تو لفظ کیا انتخاب کرتے کہ دل کی حالت بیان کر دے

تمہیں کوئی ہم کتاب بھیجیں

کہ دل کی ہنسی پہ کھلنے والے گلاب بھیجیں

وہ کیا روش اختیار کرتے کہ دل کی حالت بیان کر دے

اسی شش و پنج

ادھیڑ بن میں

چوکیدار گیٹ کھولے کھڑا تھا۔ وہ چونکے اور انہوں نے گاڑی اندر بڑھا دی۔

اور وہ..... جسے وہ سارا راستہ سوچتے آئے تھے۔ وہ ٹی وی لائن میں کھڑی شریف سے کچھ کہہ رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“

”السلام علیکم۔“ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا

”کیسے ہیں آپ؟“

”فائن۔“

انہوں نے بس ذرا کی ذرا اسے دیکھا تھا اور پھر نگاہیں جھکا لی تھیں۔

کتنا جی چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھیں۔ جی بھر کے دیکھیں..... اور اس کی تصویر آنکھوں میں بسالیں..... دل میں اتار لیں لیکن وہ شعوری کوشش سے نگاہیں جھکائے کھڑے تھے۔

”آپ بیٹھیں ناپلیز..... عاشی اور نینا تو سوری تھیں اور مورغا لبا تھ لے رہا تھا۔ میں ابھی بلواتی ہوں۔“

”صفو۔“ اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آواز دی۔

”جی۔“ صفو نے کچن کے دروازے سے جھانکا۔

”چاؤ۔ عاشی اور نینا کو بتاؤ عادل بھائی آئے ہیں۔“

”خوبی میں سب ٹھیک ہیں نا۔ ماں جی اور بی آپا۔“

وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی اور اس نے ان کے ہنکے ہوئے سر کو دیکھا۔

اور شہر یار کہتا ہے ”مجھے اپنے بھائی پر فخر کرنا چاہیے۔ کیا ہوا سو تیلے ہیں مگر میں تو بھائی نا اور شہر یار

کس قدر تعریف کرتے ہیں ان کی۔ پتا نہیں کیوں وہ ان سے اتنی بدگمان ہو گئی ہے کہ اس نے لاہور آنے

کے بعد کبھی ان سے ڈھنگ سے بات ہی نہیں کی۔“

”ماں جی اور بی آپا ٹھیک ہیں۔“ ان کی نگاہیں بدستور زمین پر تھیں۔ ضبط کی انتہا تھی۔ دل کسی ضدی

بچے کی طرح چلے جا رہا تھا لیکن وہ جیسے اس کا امتحان لینے پر تلے تھے۔

”بلکہ ماں جی اور بی آپا نے اس بار اصرار کیا تھا کہ سب کو ایک دوروز کے لیے حویلی لے آؤں۔ مور

بہت یاد آتا ہے انہیں.....“

”اور میں..... مجھے یاد نہیں کرتیں ماں جی اور بی آپا؟“ مریم کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”آپ کو۔“ بے اختیار ان کی نگاہیں اٹھ گئیں۔

وہ بات کر کے کچھ محجوب سی ہو گئی تھی اور رخساروں پر گلہابی رنگ دوڑ گیا تھا۔ لمحہ بھران کی نظروں نے

اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیا اور پھر انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔ ان کا جی چاہا وہ اس سے

کہیں۔ آپ کو بھولا ہی کون ہے۔ حویلی کی ایک ایک اینٹ آپ کو یاد کرتی ہے..... لیکن انہوں نے بہت

آہستگی سے بہت احتیاط سے ایک ایک لفظ چن کر کہا۔

”آپ سب کو بی بی آپا اور ماں جی یاد کرتی ہیں بلکہ کامی بھی۔ اگر آپ کی ماما اجازت دیں تو پیر کو چلے

چلے ہیں ایک روزہ کرواہیں آجائیں گے۔“

”ماما تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“

”اچھا کب آئیں گی؟“

نفس بہان احمد کے گھر پر نہ ہونے کا سن کر وہ ریلیکس سے ہو گئے۔ ان کی موجودگی انہیں اچھا خاصا

نفس کر دیتی تھی۔ عجیب کھر داسا لہجہ تھا ان کا۔ طرز سے بھیکے لفظ ان کے ہونٹوں سے نکلتے تھے اور وہ ایسی

نظروں سے دیکھتیں جیسے تسخراڑ رہی ہوں جسے وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھتی ہوں۔ بلاشبہ وہ حسین تھیں۔

حسن ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا اور ابو نے پتا نہیں کیوں ان سے شادی کی تھی۔ کس بات نے سیر کیا تھا انہیں۔

وہ دل ہی دل میں حیران ہوتے تھے اور سمجھ نہ پاتے تھے۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے وہ

بہال آنے سے کتراتے تھے لیکن پھر تیور کی بات وہ ٹال نہ سکتے تھے اور کچھ اسے دیکھنے کا شوق نہ چاہتے

”بھی انہیں کشاں کشاں لے آتا۔“

”پتا نہیں..... دراصل ماما نے جب کر لی ہے۔ عام طور پر تو وہ پانچ بجے تک آ جاتی ہیں لیکن کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی ہے۔“

”جواب..... مگر کیوں؟“ انہیں حیرت ہوئی۔

”ظاہر ہے‘ جواب ماما کی ضرورت ہے اب۔“ اس نے کسی قدر استعجاب سے انہیں دیکھا..... ”ماشا“
نیتا اور مور کے ہاسٹل کے اتنے اخراجات۔ یہاں گھر کے اخراجات ہیں۔ کہاں سے پڑے ہوں۔۔۔۔۔
پاپا کی کمپنی جب فیل ہو گئی تھی تو ماما نے تب ہی جواب کر لی تھی..... یہ تو جب انہوں نے فلم..... اس نے
بات ایک دم ادھوری چھوڑ دی۔

”مگر.....“ انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”زمینوں سے جو پیسہ آتا ہے کیا وہ گھر کے اخراجات کے لیے پورا نہیں ہوتا؟“

”زمینوں سے اتنی آمدنی کہاں ہوتی ہے عادل بھائی۔ ماما کہتی ہیں کہ اس سے تو بہ مشکل دو وقت کا
کھانا پورا ہو سکتا ہے اور یہاں اتنے ملازم ہیں۔ اتنا بڑا گھر ہے۔ سب کچھ مین مین کرنے کے لیے جواب
کرنا ضروری ہے۔“

”نہیں۔“ انہوں نے بڑے یقین سے کہا ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مریم۔ محض اتفاق کی بات ہے کہ
چند دن پہلے منشی چاچا نے مجھے بتایا کہ اس بار بہت فصل ہوئی ہے اور بہت اچھی قیمت بھی ملی۔ میں نے
دانتہ نہیں پوچھا تھا۔ دراصل سرگودھا کی طرف کچھ بی آپا کی زمین بھی ہے۔ اسی سلسلے میں بات ہو رہی تھی
تو منشی چاچا نے بتایا کہ چند دن پہلے ہی وہ تقریباً ایک لاکھ روپے لاہور آپ کی ماما کو دے کر آیا ہے اور کچھ
پچھلا حساب بھی تھا..... شاید انہیں مصروفیت چاہیے ہوگی۔ ورنہ پیسے کا تو بالکل مسئلہ نہیں ہے۔ میں ایک
بار پھر منشی چاچا سے تصدیق کر لوں گا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو.....“

”نہیں، نہیں۔“ مریم نے دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کی ”میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ شاید
مجھے ہی کوئی غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔“

تب ہی مور بھاگتا ہوا آیا اور عادل سے لپٹ گیا..... ”بھائی بھائی میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں۔“
پروفیسر عادل نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ بہت پیارا لگتا تھا وہ انہیں۔ چھوٹی چھوٹی
آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی اور وہ بہت پیاری باتیں کرتا تھا تب ہی تو ماں جی بھی اسے اتنا یاد کرتی تھیں۔
”دراصل اس عمر میں جی چاہتا ہے عادل کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔ اپنے گھر میں۔ اپنے
پوتے پوتیاں اور تم ہو کہ شادی کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔“ بی آپا نے کہا تھا ”کب تک ترساؤ گے ماں جی کو۔
کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔“

اور فیصلہ ہی تو نہیں ہو پا رہا تھا ان سے۔

انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر تیور کی طرف متوجہ ہو گئے۔



تیور کو گیسٹ پر اتار کر انہوں نے بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ گیسٹ کھلا اور بختی حیدر باہر نکلے۔

”آہا آپ۔“ بے ساختہ انہوں نے ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔

”تیور کو چھوڑنے آیا تھا۔“ پروفیسر عادل نے ان سے ہاتھ ملایا۔

”بھائی سے خوب دوستی ہو گئی ہے، نانی بوائے۔“ بختی حیدر نے پیار سے تیور کے گال تھپتھپائے۔

”جی اٹکل..... آپ کی بھی تو دوستی ہے بھائی سے۔“

”ہماری تو بہت پہلے سے ہے۔“ وہ ہنسے اور پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

”بہت تیز ہے یا عادل تمہارا یہ بھائی۔“

”ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دس کیا۔

”پھر کب آئیں گے؟“ تیور نے جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

”جلد ہی۔“ انہوں نے تیور کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بختی حیدر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اور کیسے ہیں آپ؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس اور اس وقت تم بڑے موقع پر آئے ہو۔ یہاں سے اس وقت ٹیکسی کا ملنا بہت
مشکل ہے مجھے ذرا نقد کی طرف ڈراپ کر سکو گے۔“

”اوکے آجائیے۔“ انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”عادل بھائی۔“ تیور گیسٹ سے جھانک رہا تھا۔ کل ضرور آتا۔ میں ماما سے اجازت لے لوں گا۔ پھر
ہم جو ملی جلیں گے بڑی امی سے ملنے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ وہ تیور کی کسی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ پتا نہیں یہ خون کی محبت تھی یا وہ

تھا یا اتنا پیارا کہ خود بخود متوجہ کرتا تھا۔ حالانکہ ان کا موڈ نہیں ہو رہا تھا جانے کو لیکن اس کے اصرار پر وہ

اسے ڈرائیو پر لے گئے تھے۔ سارا راستہ وہ مسلسل باتیں کرتا رہا تھا ”آپ کو اپنے گھر میں سب سے اچھا
کون لگتا ہے؟“

”سب ہی اچھے ہیں۔“ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”نہیں کوئی ایک بتائیں نا۔ بڑی امی..... میں نا.....“

”ہوں۔“

”مجھے مومو اچھی لگتی ہیں اور پاپا بھی اچھے لگتے تھے۔ سب اچھے ہیں لیکن سب سے اچھی مومو ہیں۔ پتا

کردار کو سنبھال لیتی ہے۔“
 مجتبیٰ حیدر نے تفصیل بتائی۔ پروفیسر عادل خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے اور پتا نہیں کیوں انہیں
 مجتبیٰ حیدر کا زنب عثمان کے متعلق بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی ناگواری کا احساس ہو رہا تھا
 لیکن وہ مجتبیٰ کو ٹوک نہیں سکتے تھے۔ سو خاموشی سے ڈرائیو کر رہے تھے حالانکہ زنب عثمان سے ان کا کیا رشتہ
 تھا..... محض ان کے والد کی دوسری بیوی۔

وہ عورت

جس کی وجہ سے وہ اپنے باپ کی شفقتوں سے محروم ہو گئے تھے۔

جس نے ان کی ماں کی جگہ لے کر ان کا حق مارا تھا۔

اور جو شاید انہیں سخت ناپسند کرتی تھی۔

لیکن پھر بھی ان کے دل میں شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ مجتبیٰ حیدر زنب عثمان کا ذکر نہ کریں۔ اس
 طرح اتنی بے تکلفی سے شاید اندر سے وہ کچھ دقتا نوسی تھے اور وہ بہر حال ان کے والد کی بیوہ تھی۔

”دو چکر لگا چکا ہوں لیکن زنبی مل ہی نہیں رہی۔ یہ کم بخت شرجیل مرزا اسے لے اڑا۔ بہت تیز ہے
 اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہے۔ تم بھی ملے ہو اس سے؟“

”نہیں۔ یہ تصدیق آج کل کیا کر رہا ہے؟“ انہوں نے انتہائی ناگواری محسوس کرتے ہوئے موضوع
 بدلنے کی کوشش کی۔

”وہی تھیر کا جنون سوار ہے۔ آمنہ معنی بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ مصوری وغیرہ تو خیر باد کہہ رکھا
 ہے ان دنوں اس نے۔“

”کیا حافظ صاحب کا اسکرپٹ ہے؟“ وہ موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

”ارے نہیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے بتایا ”وہ تو تصدیق کو پسند نہیں آیا تھا۔ وہی گھسے بٹے مکالے اور پرانا
 پلاٹ۔ آمنہ نے خود لکھا ہے۔ بڑا مختلف خیال ہے۔ مکالے غالباً ابھی لکھے نہیں گئے لیکن یہ ذمے داری
 بھی آمنہ ہی لے لی ہے۔“

”بہت ٹیلنٹڈ ہے۔“ پروفیسر عادل نے تعریف کی ”مجھے ان کے کالم بہت پسند تھے۔“

”ہاں بہت زبردست کالم لکھتی تھی لیکن موڈی اور لا پرواہی ہے۔ اخبار کی جاب چھوڑ دی بلا وجہ۔“

”کچھ بھی بلا وجہ نہیں ہوتا مجتبیٰ۔ ہر عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“

”ہاں ممکن ہے کوئی ریزن ہو۔ تم بتاؤ یا کوئی پیش قدمی ہوئی؟“

”کیسی پیش قدمی؟“ انہوں نے کسی قدر استعجاب سے پوچھا۔

”بھئی ان ہی کی طرف جن کامرسوں سے انتظار تھا۔“

ہے آپ کو؟ میں مومو کا دوست ہوں۔“ اس نے فخر سے کہا جیسے مومو کا دوست ہونا بڑے اعزاز کی بات
 ہو یا۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور مسکرا کر اسے دیکھا ”اچھا تو آپ مومو کے دوست ہیں؟“
 ”ہاں۔ جب مومو کی لڑائی ہو جاتی تھی ناما مائے تو میں بہت خیال رکھتا تھا ان کا۔ وہ روٹی تھیں تاؤ
 میں ہی انہیں چپ کروا تا تھا۔“ اس نے اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔
 ”بھلا ماما اور مومو میں کیوں لڑائی ہوتی تھی؟“ پروفیسر عادل نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے بظاہر
 بے پروائی سے پوچھا۔

”پتا نہیں، لیکن ماما پہلے تو مومو سے خفا رہتی تھیں اور مومو بھی ان سے ناراض رہتی تھی اور پاپا بھی ماما کو
 کچھ نہیں کہتے تھے۔ بس ماما سے میں کہتا تھا کہ وہ مومو سے خفا نہ ہوا کریں۔ اتنی اچھی تو ہیں وہ۔“ اس نے
 ان کی معلومات میں اضافہ کیا ”لیکن اب ماما خفا نہیں ہوتیں مومو سے۔“

اور پھر جب اسے آکس کریم دلو کر سب کے لیے انہوں نے آکس کریم پیک کروائی تو اس نے بتایا۔
 ”مومو کو یہ والا فلپور پسند نہیں ہے۔“

”لگتا ہے آپ کو مومو کی ہر بات کا پتا ہے۔“

”جی۔“ اس نے فخر سے کہا ”میں دوست جو ہوں ان کا۔ آپ بھی ان کے دوست بنیں گے؟“

”میں۔“

”ہاں۔“

”وہ شاید مجھے دوست نہ بنائیں۔“

”میں کہوں گا تو وہ پھر آپ کو دوست بنالیں گی۔“

”کیا سوچنے لگے ہو۔“

”ہاں کچھ نہیں۔“ وہ چونکے اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مجتبیٰ حیدر سے بیٹھنے کو کہا۔

”اور سنا نہیں عادل صاحب، کیا حال ہے۔ اب تو کم ہی نظر آتے ہیں آپ۔ دو تین بار درود ملت پہ
 حاضری دی لیکن جناب غائب تھے۔“

”بس کچھ مصروف رہا۔ آپ کہیں کیسے آتا ہوا اور؟“

”دراصل ایک اسکرپٹ لکھا ہے میں نے۔ بہت جان ہے اس میں۔ افضل صاحب کو بہت پسند
 ہے۔ تمہیں پتا ہے افضل کے دو تین پلے پرائیویٹ پروڈکشن سے بڑے اچھے آئے ہیں۔ میں چاہ رہا تھا
 کہ زنبی سے بات کر لوں۔ وہ اگر اس پلے میں کام کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو..... دراصل اس میں
 ایک کردار ہے ماہرہ آپا کا..... جب میں وہ لکھ رہا تھا تو میرے ذہن میں زنبی تھی..... زنبی بہت زبردست
 اداکارہ ہے یا۔ جان ڈال دیتی ہے کردار میں..... مکالمہ کہیں کمزور بھی ہو جائے تو وہ اپنی ایکٹنگ سے

”اوہ“ انہوں نے زیر لب کہا اور بھتی کی طرف دیکھا۔
”نہیں۔“

”کمال ہے یا، ایک سال ہونے کو ہے اور ابھی تک کوئی پیش قدمی نہیں کی..... بھی کسی مدد دینے کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں دل و جان سے۔“
”یہ تصدق کا گھر کس طرف ہے۔ پلیز، بھتی ذرا گائیڈ کیجیے گا۔ میں آج تک تصدق کے گھر نہیں گیا۔“
انہوں نے پھر خوبصورتی سے موضوع بدلا۔

جانے کون سے کمزور لمحے تھے جب وہ بھتی سے ذکر کر بیٹھے تھے اور بھتی جب بھی ملتے ضرور پوچھتے تھے اور ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کا راستہ تھا اور نہ پیچھے پلٹنے کا حوصلہ.....
کاش زندگیوں ہی انتظار میں گزر جاتی۔
کتنی لذت تھی اس انتظار میں۔
ایک موہوم سا انتظار۔ ان دیکھی ہستی کا۔
کتنے رنگ تھے اس انتظار کے۔ کتنا حسن تھا اس انتظار میں
اور اب.....

”ہاں بس ادھر..... ادھر موڑ لیجیے۔ اگلی گلی میں پہلا گھر تصدق کا ہے۔“ بھتی حیدر نے اشارے سے بتایا تو چونک کر انہوں نے ٹرن لیا۔

”تصدق ادھر رہتے ہیں کیا؟“

”ہاں۔ تصدق کا تعلق پوشو ہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ یہ ایک کمرے کا گھر یہاں کرائے پر لے رکھا ہے اس نے۔ فیملی تو گاؤں میں ہے۔ تین بچے ہیں اس کے، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا..... والدین ہیں، بہن بھائی ہیں، کافی ذمے داریاں ہیں اس پر لیکن کوئی مستقل جاب نہیں ہے اس کے پاس۔“

”بچے۔“ پروفیسر عادل کو حیرت ہوئی۔

”بہت کم عمری میں شادی ہو گئی تھی جیسا کہ گاؤں میں اکثر ہوتا ہے۔ بیٹا میٹرک میں ہے اس کا۔“
”تو کوئی مستقل جاب ڈھونڈنی چاہیے اسے۔“

”تم اس سلسلے میں اگر اس کی ہیلپ کر سکو تو ضرور کوشش کرنا۔“

”ہاں کیوں نہیں۔ دیکھوں گا میں۔“ انہوں نے بریک لگائی۔ تصدق احمد گلی کے موڑ پر ہی نظر آگئے تھے۔
”میں ذرا سگریٹ لینے باہر نکلا تھا۔“ انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔
”سر آپ بھی آئیے نا پلیز۔“

”تصدق اس وقت تو میں بھتی کو ذرا پ کرنے آیا تھا۔ پھر کبھی سہی۔ خدا بخش انتظار کر رہا ہو گا۔“
”تھوڑی دیر کے لیے سر آمنہ صفی بھی ہیں۔ ذرا آپ سے بھی ڈسکشن ہو جائے گی۔“ اس نے اصرار کیا تو وہ گاڑی لاک کر کے اتر آئے۔

چھوٹا سا صحن عبور کر کے سامنے کمرہ تھا۔ وہ خاصا بڑا تھا۔ وہلیز پر کھڑے کھڑے انہوں نے جائزہ لیا..... ادھر ادھر ایل پڑے تھے۔ زمین پر ایک دری بچھی تھی۔ زمین پر ہی میٹر لیس ڈال کر بیڈ کا کام لیا گیا تھا۔ ایک طرف کتابوں کا ڈھیر تھا۔ غالباً یہی کمرہ تصدق کا اسٹوڈیو، بیڈ روم اور اسٹوڈی روم تھا..... ایک طرف آمنہ صفی زمین پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ ارد گرد کا غنہ بکھرے ہوئے تھے۔ پاس ایش ٹرے تھی۔
”السلام علیکم۔“

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”وعلیکم السلام۔“ سرسری انداز میں جواب دے کر وہ پھر کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

پروفیسر عادل نے اس کی طرف دیکھا۔

وہی لا پرواہ سا انداز۔

گرے فکڑ کا سادا کھدر کا سوٹ، جس کی قمیص کا کالر مراد نہ تھا اور استیوں میں کف لگے ہوئے تھے جسے اس نے موڈ لیا تھا..... ہمیشہ کی طرح میک اپ سے بے نیاز چہرہ، بظاہر وہ عام سے نقوش کی عام سی لڑکی لگتی تھی لیکن پھر بھی کوئی بات تھی اس میں جو اٹریکٹ کرتی تھی۔

پتا نہیں اس کا یہ بے نیازانہ انداز یا پھر اس کے چہرے کا کوئی ناٹرا یا تھا جو نامعلوم سی کشش رکھتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ پروفیسر عادل اس کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کرتے تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے وہ سب سے خفا ہو۔

’وٹھی ہوئی ناراضی اپنے آپ سے بھی خفا۔‘

جیسے اسے زمانے سے بہت شکوے ہوں۔ بہت گلے ہوں جنہیں وہ اپنے اندر چھپائے بیٹھی ہو۔ پہلی بار جب وہ اس سے ملے تھے تب بھی وہ انہیں ایسی ہی لگتی تھی..... لیکن تب میں اور اب میں کچھ نہ کچھ فرق تھا ضرور۔

پہلے اس کی بے پروائی کا رنگ اور تھا۔ جیسے سارا زمانہ اس سے خفا ہو اور اسے زمانے کی پروا نہ ہو۔ بس وہ اپنی ترنگ میں چلی جا رہی ہو۔ ارد گرد سے بے خبر اور لا پرواہ لیکن اب فرق یہ پڑا تھا کہ اسے زمانے سے شکوے ہو گئے تھے۔ جیسے پہلے زمانہ اس سے خفا تھا اور اب وہ زمانے سے ناراض تھی لیکن ظاہر کرتی تھی جیسے اس کی پروا نہیں ہے۔ اب اپنی ترنگ میں بڑھنے کی بجائے رک سی گئی تھی۔

”آمنہ آپ کیسی ہیں؟“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

”کیسے آپ کا کام کہاں تک پہنچا؟“ وہ چونکہ شلوار قمیص میں تھے اس لیے زمین پر ہی بیٹھ گئے۔
 ”بس تقریباً مکمل ہی ہے۔“
 ”بے چارے حافظ صاحب گلہ کر رہے تھے کہ ان کے اتنے اچھے لکھے گئے ڈرائے کو آپ نے مسترد کر دیا۔“
 ”اگر کبھی ملیں تو میری طرف سے معذرت کر دیجیے گا۔ مجبوری تھی۔ تصدیق جس طرح کا پلے کرنا چاہ رہے تھے اس پر وہ پورا نہیں اترتا تھا۔“
 ”نی الحال تو وہ بہت مصروف ہیں اپنی شادی کے سلسلے میں۔“ مجتبیٰ حیدر مسکرائے۔
 ”شادی..... کیا ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔“ آمنہ مضمیٰ کو حیرت ہوئی۔
 ”ایک شادی تو ان کی کم عمری میں ہوئی تھی۔ بیوی ان پڑھ تھی بقول ان کے بھہ نہیں سکی۔ دوسری شادی پڑھی لکھی لڑکی سے کی جو بھر رہی تھی اور اب یہ تیسری شادی ازراہ ہمدردی کر رہے ہیں۔ بیوہ سے نکاح کر کے نیکی کا کام ہو رہا ہے۔“
 ”واقعی حافظ صاحب تو چھپے رستم نکلے۔“
 تصدیق چائے کا کپ اٹھائے اور پروفیسر عادل کو پکارتے ہوئے بولے۔
 ”یہ آپ کس تردید میں پڑ گئے۔ آئیے بات ہو جائے کچھ۔“
 پروفیسر عادل نے کپ لے لیا۔
 ”بات بھی ہو جاتی ہے پہلے چائے ہو جائے۔“ اس نے دوسرا کپ مجتبیٰ کے سامنے رکھا اور دوبارہ چائے لینے باہر نکلا۔
 ”ایسا کرو تصدیق ایک ٹرے لے لو۔“ آمنہ مضمیٰ نے مشورہ دیا۔
 ”لے لوں گا۔“ اس نے جاتے جاتے کہا۔
 ”تصدیق چائے مزے کی بتاتا ہے۔“ آمنہ نے تبصرہ کیا ”اور کھانا پکانے میں ماہر ہے۔“
 ”بیوی فائدے میں رہتی ہوگی۔ پکا پکا کر کھلاتا ہوگا۔“ مجتبیٰ نے چائے کا گھونٹ لیا۔
 ”ارے کہاں اس کے نصیب میں خوشی نہیں۔ چھ چھ مہینے تو گھر نہیں جاتا۔ اس کی شادی اگر تصدیق احمد جیسے اونچے آرٹسٹ کی بجائے کسی سیدھے سادے دکاندار یا زمیندار سے ہو جاتی تو زیادہ خوش رہتی۔“
 ”آمنہ مضمیٰ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ ہے کہ ہم غلط جگہوں پر فٹ ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہمیں ہونا ہوتا ہے۔ ہم وہاں نہیں ہوتے اور جہاں نہیں ہونا ہوتا وہاں ہو جاتے ہیں۔“
 تصدیق احمد کپ اٹھائے اندر آئے اور آمنہ کے پاس کپ رکھتے ہوئے ذہاں ہی بیٹھ گئے۔
 ”تم نے یہ مسودہ دکھایا ہے پروفیسر صاحب کو؟“

”فائن۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔
 ”بہت مصروف لگ رہی ہیں۔“
 ”بس یہ اسکرپٹ دیکھ رہی تھی۔ تصدیق کی خواہش ہے کہ اسے آج ہی مکمل کر دوں۔“
 ”گھر میں سب خیریت ہے؟“ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کریں۔ مجتبیٰ اور تصدیق باہر ہی رہ گئے تھے۔ تصدیق تو غالباً سگریٹ لینے چلا گیا تھا اور مجتبیٰ پتا نہیں کیوں رک گئے تھے باہر۔
 ”ہوں..... گھر میں ہے ہی کون سوائے اماں کے۔“
 آمنہ مضمیٰ نے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
 ”اور اماں۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔
 ”وہ کبھی خیریت سے نہیں رہتیں۔ بقول ان کے کہ جب سے میں باشعور ہوئی ہوں۔ ان کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں اور میں نے ہمیشہ انہیں پریشان ہی کیا ہے حالانکہ اپنی طرف سے میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ انہیں دکھ نہ دوں..... لیکن وہ خود بخود ہی دکھی ہوتی رہتی ہیں۔ خیر.....“ اس نے کندھے اچکائے
 ”ان کا نصیب۔ میں نے تو جاب بھی چھوڑ دی ہے تاکہ وہ خوش رہیں..... کالم لکھنا چھوڑ دیا بلکہ ایک دن اپنی ساری کتابیں جو گھر پر تھیں انہیں آگ لگا دی تاکہ اماں خوش ہو جائیں۔ کیا کیا جتن نہیں کیے مگر وہ خوش ہی نہیں ہوتیں۔“
 بظاہر وہ نارمل لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن پروفیسر عادل کو اس قلمی کی کڑواہٹ اپنے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ جوان الفاظ کے پس پردہ موجود تھی۔
 ”ساری مائیں ایسی ہوتی ہیں آمنہ۔“ انہوں نے نرمی سے کہا ”اولاد کے لیے ذرا سی بات پر پریشان ہونے والی۔“
 ”نہیں عادل صاحب، میری اماں ساری ماؤں سے مختلف ہیں۔ مائیں تو اولاد کا فحور کرتی ہیں لیکن میری اماں نے ساری زندگی میرا فحور نہیں کیا۔ ہر معاملے میں مجھے ہی قصور وار ٹھہرایا۔ میرے کزن نے منگنی توڑ دی تو قصور وار میں۔ کہ میں نے شعر و شاعری کر کے ناس مارا ہے اپنا..... اس کا کوئی قصور نہیں جو جتنی چہڑی پر مر مٹا تھا..... دن رات اٹھتے بیٹھتے اتنی باتیں مجھے غیروں نے نہیں سنائیں جتنے کو سننے میری اماں نے مجھے دیے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ میں اپنا سر بھی کاٹ کر اماں کے قدموں میں رکھ دوں پھر بھی وہ خوش نہیں ہوں گی۔ ساری خرابیاں انہیں مجھ میں نظر آتی ہیں اور وہ اس کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ میرے منگیتر کے لیے..... بے چارا.....“
 ”آہا آمنہ صاحبہ کیسے مزاج شریف کیسے ہیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے قدم رکھتے ہی کہا۔
 ”بہت بہتر۔“

”میں صرف ماما کی وجہ سے آپ کا احترام کرتی ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں سچے کتاب کھاتے ہوئے

بیٹھ گئی۔

”احرام۔“ شرجیل مرزا نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے غنڈی سانس بھری۔۔۔۔۔ ”احرام صرف احترام
میں مریم۔“ تھوڑی سی دل میں بھی جگہ دیجیے۔ باقی جگہ ہم خود بنالیں گے۔ بس قدم دھرنے کی اجازت
دے دیں۔“

مریم برا سامنے بنا کر خاموش ہو گئی۔

”یعنی کچھ گنجائش ہے۔“ اسے خاموش دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”آپ کس خیال میں ہیں مسٹر شرجیل۔“ اس کا ضبط جواب دینے لگا۔

”آپ کی خاموشی سے تو یہی پتا چل رہا تھا۔“ اس نے بڑی مصومیت سے کہا۔

”میری خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ میں فضول باتوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتی ہوں۔“

”فیضول باتیں نہیں ہیں۔ ہا۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا ”یہی تو زندگی کی حقیقت

ہے مس مریم لیکن افسوس ابھی آپ زندگی کی خوبصورتیوں۔۔۔ سے نا آشنا ہیں۔“

”آپ غنڈی لیں گے یا چائے؟“ مریم نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”جو بھی آپ پلا دیں۔۔۔۔۔ آپ کے ہاتھوں سے تو زہر بھی امرت بن جائے گا۔“ وہ بدستور روٹینک

ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کاش میں آپ کو زہر پلا سکتی۔“ اس نے دانت پیسے اور شریف کو آواز دی ”شریف شرجیل صاحب

کے لیے چائے لاؤ۔“

”بائے داوے یہ زہنی کدھر گئی ہیں؟“

”وہ آنٹی زمر کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔“ اس نے طنزیہ نظروں سے شرجیل مرزا کو دیکھا۔

اس کا اتنی بے تکلفی سے ماما کا نام لینا اسے زہر لگتا تھا اور وہ جان بوجھ کر اسے چڑانے کے لیے اس کے

سامنے ان کا نام لیتا تھا۔

”سنا ہے ڈاکٹر عبدالعزیز اور ڈاکٹر ہادی تمہاری کوشی کی اوپر والی منزل میں آ رہے ہیں۔“ اب کے وہ

منجیدہ ہو گیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“

”کیوں؟“

”دراصل اکل ہادی نے اپنی کوشی اسپتال کو ڈویٹ کر دی ہے۔ وہ لوگ اپنے لیے گھر تلاش کر رہے

تھے۔ ماما نے انہیں آفر کی کہ وہ ادھر شفٹ ہو جائیں۔ ان کا خیال ہے اس طرح انہیں بھی اطمینان

کا مل سکتے خوش ہوئے تھے انہیں دیکھ کر۔

”میں تم سب کے لیے بہت اداس ہو گئی تھی۔“ بڑی امی نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

ماما نے نہ جانے کس موڈ میں انہیں حویلی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ شاید میڈم زمر نے سمجھایا

تھا ”الٹا کچھ حاصل ہی کریں گی۔ نقصان نہیں ہوگا۔“

اور واقعی بڑی امی نے اتنا کچھ دیا تھا۔ سب کو جوڑے دیے تھے۔ ایک ایک ہزار روپیہ دیا تھا اور ماما

کے لیے بھی کپڑے بھیجے تھے اور یہ دودن حویلی میں کتنے اچھے گزرے تھے۔۔۔۔۔ عاشی نینا اور تینو رستے خوش

تھے۔۔۔۔۔ عادل انہیں اپنے باغات دکھانے لے گیا تھا لیکن مریم نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں گھر پر ہی رہوں گی بڑی امی کے ساتھ۔“

پتا نہیں کیوں وہ عادل کی نظروں سے الجھتی تھی۔ اندر ہی اندر عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے وہ

کوئی نام بھی دینے سے قاصر تھی اور پھر وہ بڑی امی کے ساتھ حریم کی طرف گئی تھی۔

کتنا خوش ہوئی تھی حریم اسے دیکھ کر۔ چاچا عبدالرحمن اور عمران بھی اچھی طرح محبت سے ملے تھے۔

”بیٹا آتی رہا کرو۔ عثمان کا خون ہو۔ تمہیں دیکھ کر دل میں غنڈک بڑتی ہے۔“

چچی نے بھی بہت پیار کیا تھا۔ ڈھیروں اشیاء ساتھ کر دی تھیں اور ماما یوں ہی ان سے بدگمان تھیں لیکن

وہ ماما کی بدگمانی دور نہیں کر سکتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ ماما خواہ اس سے بھی بدگمان ہو جائیں گی۔

”مریم بی بی۔“ صفو نے اندر جھانکا۔

”کیا ہے؟“ وہ چونک پڑی۔

”وہ جی شرجیل مرزا صاحب آئے ہیں جی۔“

”تو بتا دیتا تھا کہ ماما گھر پر نہیں ہیں۔“

”بتایا تھا لیکن جی وہ کہہ رہے تھے کہ انہیں آپ سے کام ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے بدولی سے کہا ”تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آتی ہوں۔“

وہ جانتی تھی کہ شرجیل مرزا کو اس سے کوئی کام نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ نہ جاتی تو ماما یقیناً ناراض ہوتیں

اس سے اور خواہ مخواہ ڈھیر لیٹن ہوتا انہیں۔ اس نے بیڈ سے دوپٹہ اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ شرجیل مرزا اسے

دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آہا۔ یہ چاند بڑے دنوں بعد بدلیوں سے نکلا ہے۔“

”فارگا ڈیسک شرجیل صاحب اس طرح کی بازاری زبان استعمال نہ کیا کریں۔“ اس نے برا سامنے بتایا۔

”آپ کو جو زبان پسند ہے مس مریم۔ ہم تو وہی زبان استعمال کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ نظر

الطاف ادھر بھی ہو۔“

ہو جائے گا۔ اگر کبھی انہیں باہر جانا پڑا تو وہ آرام سے جاسکتی ہیں۔“
 ”خیر آرام سے تو وہ اب بھی جاسکتی ہیں۔“ شرجیل مرزا نے کندھے اچکائے۔
 ”السلام علیکم جی۔“ شریف ٹرائی دھکیلے ہوا اندر داخل ہوا۔
 ”کیا حال ہے مسٹر شریف؟“

”ٹھیک ہوں صاحب جی۔ پر آپ بھی سب کی طرح جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔“
 ”کیسے وعدے بھی ہمیں تو یاد نہیں رہا کہ ہم نے آپ سے کوئی بیان کیے تھے۔“
 ”آپ تو شرمندہ کرتے ہیں جی۔“ وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ”یہ سمسو سے ہیں جی بہت مزے دار ہیں۔“ اس نے پلیٹ آگے بڑھائی۔
 ”حالانکہ یہ کام آپ کا تھا۔“ شرجیل مرزا نے مریم کی طرف دیکھا۔ ”خیر۔۔۔۔۔“ وہ پھر شریف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیا وعدہ کیا تھا ہم نے بھی؟“
 ”صاحب جی۔“ وہ لالچ سے بولا۔ ”آپ سے کہا تھا کہ ہمیں بھی قلم وغیرہ میں کوئی چانس ملو اور جی۔ خواہ نوکر کا ہی سہی۔۔۔۔۔“
 ”اچھا اچھا۔ ضرور بھی، تمہیں چانس نہیں دیں گے تو کسے چانس دیں گے۔ اگلی قلم میں تمہارا چانس پکا۔“
 ”سچ صاحب جی۔“ وہ ایک دم خوش ہو گیا۔ ”اللہ آپ کو بھلا لگائے جی۔“
 تب ہی باہر سے باتوں کی آواز آئی۔

”اوہ ماما آگئیں شاید۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔
 شرجیل مرزا نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹرائی میں رکھی۔
 ”تمہارا چانس تو بن گیا یا رنگین باتوں میں لگ کر اپنا چانس مس کر دیا۔ ہائے۔“ اس نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے بانیں آنکھ کا کونا دبایا۔ وہ ایک دم ہلش ہو گئی۔
 ”بے ہودہ۔“ اس نے زیر لب کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

زینب عثمان اور میڈم نرگس ٹی وی لاؤنج میں کھڑی اپنی شاہک پر تبصرہ کر رہی تھیں۔
 ”صنف۔“ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر انہوں نے آواز دی ”پانی لاؤ نہ بہت ٹھکن ہو گئی ہے بھی۔“
 ”ماما۔“ مریم ان کے سامنے آگئی۔ ”وہ شرجیل مرزا صاحب آئے ہیں۔“

”اوہ گاڈ۔“ وہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”مجھے تو آج شچی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ اس کا تو موڈ بہت خراب ہوگا۔“ مریم کا بچی چاہا کہہ دے کہ ان کا موڈ تو ضرورت سے زیادہ اچھا تھا لیکن وہ خاموش رہی۔
 ”جاؤ بھی اپنے شچی صاحب کا موڈ ٹھیک کرو میں تو بہت تھک گئی ہوں۔“ میڈم نرگس وہیں ٹی ڈو

لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔

”آؤ نا جانی ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ میڈم نرگس نے بہت پیار سے مریم کو دیکھا۔ ”کیسی ہو ذیہ۔ اب تو بہت فریش لگتی ہو۔“

”اچھی ہوں آئی۔“ مریم ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
 ”ایسے ہی خوش خوش رہا کرو۔ بہت پیاری لگنے لگی ہو۔“
 ”آئی۔۔۔۔۔“ مریم کو اچانک یاد آیا۔ ”آپ نے لالہ کا نمبر ڈھونڈا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ نمبر تو مل گیا تھا لیکن وہ کم بخت۔۔۔۔۔“ گالیوں کا ایک طوفان سا ان کے لبوں سے پھوٹ پڑا۔
 ”وہ بات ہی نہیں کراتے اس سے۔ جب بھی فون کرو کہتے ہیں۔ نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور اسے دیکھو۔۔۔۔۔ اس لالہ کتنی کو۔۔۔۔۔ اس نے وہاں جا کر ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ ایک بار بھی نہیں۔۔۔۔۔ اسے پیدا کیا۔ بڑا کیا۔۔۔۔۔ خیر بے درداشت کیسے اس کے اور ذرا سی بات پر روٹھ کر بیٹھ گئی۔“ وہ رو ہانسی ہو گئیں۔
 ”آئی پلیز آپ مجھے اس کا نمبر دیجیے گا۔ میں ٹرائی کروں گی۔ کیا خبر وہ لوگ آپ کے فون کے متعلق بتاتے ہی نہ ہوں۔“

”ہاں ممکن ہے۔ بڑے خواخوڑ لوگ ہیں وہ۔ سب کچھ ممکن ہے ان سے اور کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ اسے قید کر دیں گے۔ بند کر دیں گے۔۔۔۔۔ پروہ ایک بار بتائے تو مجھے۔ ذرا سا ہنٹ تو دے۔ پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔ ارے میں میڈم نرگس ہوں۔ اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گی۔ یہ سہرا دکھتا کیا ہے خود کو۔۔۔۔۔ پروہ۔۔۔۔۔ ارے وہ خود ہی مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ ایک بار اس نے اینٹ ڈال دیا تھا تو۔۔۔۔۔ تو خود ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھ سے اپنی ماں سے۔۔۔۔۔ جس نے اس کے لاڈ اٹھائے۔ کیسی بے وفائی۔۔۔۔۔ بات کرتے کرتے وہ ایک دم دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

”آئی پلیز ریلیکس۔“ مریم نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پلیز آئی۔ روئیں نہیں پلیز۔“
 ”تم اسے فون کرو گی نا۔۔۔۔۔ تو اگر اس نے تم سے بات کر لی تو اس سے کہنا۔۔۔۔۔ کر دوں گی۔ کر دوں گی اس کی شادی اعزاز کے ساتھ۔ ایک بار گھر آ جائے وہ۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ کہہ دوں گی نا۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔“ مریم نے تاسف سے انہیں دیکھا۔
 اور اگر لالہ کو پتا چل جائے کہ آئی اس کے لیے اتنی پریشان ہیں تو وہ کتنی خوش ہوگی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید میڈم نرگس کو لالہ کا خیال ہی نہیں۔

”دیکھو۔“ میڈم نرگس نے سرگوشی کی ”تم اس سے کہہ دینا۔ اگر اس کے ڈیڈی اسے آنے نہ دیں تو بس مجھے ایک فون کر دے۔ میں خود پہنچ جاؤں گی اسے لینے۔ ساری صحابی برادری کو میں اکٹھا کر لوں گی۔ سارے میں رو لاؤ ال دوں گی۔ دیکھ لیتا تم۔ بس ایک دفعہ وہ آنے کو کہہ دے۔۔۔۔۔ اور دیکھو تم اپنی ماما کو نہ

بتانا کہ میں نے تم سے کہا ہے کہ میں اعزاز سے اس کی شادی کر دوں گی۔“
”جی۔“ مریم کو حیرت ہوئی۔

”ارے کیا دے گا وہ اعزاز اسے۔ ڈھنگ کا گھر تک تو اس کے پاس ہے نہیں۔ جو کا نام اسے۔ کہتی ہے آپ نے بھی تو اس کے بھائی سے شادی کی ہے تو میرے پاس تھا سب کچھ۔ سات پشتوں کو کھلا سکتی تھی۔ اس کے پاس کیا تھا اپنا۔ کچھ بھی نہیں خالی ہاتھ تھا وہ۔ دھکے کھا جو اسٹوڈیوز کے۔ مومو سے کہہ دینا اس سے کر دوں گی اس کی شادی اعزاز کے ساتھ۔ بس ایک بار جا وہ۔۔۔۔۔ وہ پھر رونے لگیں۔

”اچھا پلیر آپ روئیں نہیں۔۔۔۔۔ میں چائے منگواتی ہوں آپ کے لیے۔“ مریم اٹھ کھڑی ہوئی تب ہی فون کی بیل بج اٹھی۔
مریم نے آگے بڑھ کر ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف شہر یار تھا۔ مریم نے ریسور ہاتھ میں تھامے مڑ کر میڈم زمر کی طرف دیکھا۔ وہ واش روم کی طرف جا رہی تھیں۔
”آپ!“

”کیسی ہوزنگی؟“ شہر یار کے لہجے میں بے چینی تھی۔

اس کے رخسار تپ اٹھے ”اچھی ہوں۔“

”یعنی کہہ رہی تھی کہ تم یونیورسٹی نہیں آ رہی ہو۔ دو تین دن سے۔ پریشان ہو گیا تھا میں۔ تم ٹھیک تو ہوا ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس یوں ہی جی نہیں چاہ رہا تھا۔“
”تھینک گاڈ۔“ اس نے ایک لمبا سانس لیا ”جان نکال لیتی ہو تم میری مریم۔ آج شاید یعنی تمہارے طرف آئے گی۔“

”مریم۔“ اس نے آہستگی سے کہا ”میں تمہارے بنا بہت ادھورا ہوں مریم بہت اکیلا۔ دیکھو راستے میں ہی نہ چھوڑ دیتا۔“

”نہیں۔“ مریم نے لحد بھر سوچا اور پھر بات مکمل کی ”آپ بابا جان اور امی جان کو بھیج دیں۔“
”کیا۔۔۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”جو کچھ آپ نے سنا۔“ وہ شوخ ہو گئی۔

”لیکن ابھی اس دن چند دن پہلے تو تم۔۔۔۔۔“

”میں نے سوچا آپ کو اطمینان ہو جائے گا نیند ٹھیک سے آئے گی۔“
”کون جانے نیند آئے گی یا اڑ جائے گی۔ وہ کیا کہا ہے کسی نے کہ پا کر بھی نیند آگئی تھی۔ کھو کر بھی رت جگے ملے۔۔۔۔۔“

شہر یار کے لہجے میں شوخی تھی ”بائے داوے یہ مہربانی اچانک کس لیے۔“
”مہربانی تو کسی بھی وجہ سے ہو سکتی ہے بتانا قطعی ضروری نہیں۔“ کم از کم شرجیل مرزا کو سکون مل جائے گا اور وہ میرا چچا چھوڑ دے گا۔ اس نے دل میں سوچا۔
”تو کب بھیجوں بابا کو؟“

”جب۔۔۔۔۔ جب آپ کا جی چاہے۔“

”میرے جی کی بات نہ کرو مریم۔ وہ تو بہت بے ایمان ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے ابھی اسی وقت بابا جان کو بھیج کر تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے نام کر لوں لیکن بابا جان اور ماں جی گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ دراصل پچھلے دنوں سکندر ماموں کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ انہیں پتا چلا تو وہ چلے گئے۔ ایک دو روز تک آجائیں گے پھر۔ تھینک پو مریم۔۔۔۔۔ تھینک یو سوچ۔۔۔۔۔ تم بہت اچھی ہو۔۔۔۔۔ اور سنو۔۔۔۔۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”اس وقت کون سے رنگ کے کپڑے پہننے ہوئے ہو؟“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”بس تصور کی آنکھ سے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کسی لگ رہی ہو۔ ویسے تو ہر رنگ ہی تم پر سوٹ کرتا ہے۔“

”براؤن۔۔۔۔۔“

”بڑی رو میٹک گفتگو ہو رہی ہے۔“ شرجیل مرزا نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”آپ کو الہام ہوتا ہے۔“ اس نے ریسور رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”آنکھوں کی چمک اور چہرے کے رنگ بتا رہے ہیں۔“ اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ مریم اس کی بات کا جواب دیے بغیر لاؤنج سے جانے لگی تو تھنک نے آواز دی۔ وہ بھی شاید شرجیل مرزا کے پیچھے ہی ڈرائنگ روم سے باہر آئی تھیں۔
”مومو۔۔۔۔۔“

”جی ماما۔“ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

”زمر گس چلی گئی ہے کیا۔“

”نہیں ماما۔ وہ ذرا منہ ہاتھ دھونے گئی ہیں۔“

”اودہ اچھا۔“

”مجھے اجازت ہے اب؟“ شرجیل مرزا نے پوچھا۔

”تو تم میڈم سے نہیں ملو گے۔“

”نہیں ڈیر۔۔۔۔۔“ اس نے سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا۔ جو تھنک کے بلانے پر کچھ فاصلے پر رک گئی تھی۔
”اب میں چلوں گا۔ باہر جانے کا پروگرام تو رہ گیا۔ اب کل میں آؤں گا۔ بلکہ صبح تم آؤ گی تو پروگرام

سیٹ کر لیں گے۔ اوکے۔“

نہیں عثمان اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اسے خدا حافظ کہنے باہر تک گئیں۔ مریم کچھ دیر وہاں کھڑی رہی اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔



اماں

میری آنکھیں ترسیں

سانوں آس نہ پاس

اماں فی میری نیندیں بھاگیں

مجھ سے کوسوں دور

اماں فی میرے سینے ٹوٹے

چھ گئی سینے پھانس

اماں فی میں پیاس سے تڑپی

دل دریا کے بچ

اماں فی میری کشتی ڈوبی

عین کنارے بچ

پروفیسر عادل نے بی آپا کے حصے میں قدم رکھا تو ٹھنک کر رک گئے۔ بی آپا اپنے مخصوص جھولے پر بیٹھی گارہی تھیں۔ اور یہ بی آپا کی آواز اتنی خوب صورت ہے اور کتنا سوز ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی بی آپا کو گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے جھولے کے پیچھے آگئے۔

”بی آپا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں۔“

حریم نے یک دم پیچھے مڑ کر دیکھا اور جھولے سے اتر آئی۔

”آپ؟“

وہ حیران رہ گئے ”میں سمجھا بی آپا ہیں۔“ حریم کا سامنا کرتے ہوئے انہیں ہمیشہ ہی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ”وہ بی آپا ذرا کچن کی طرف گئی ہیں پکڑوے بخوانے۔ آپ بیٹھیں نا۔“ اس نے برآمدے میں پڑی کین کی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ تو وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ حریم ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔

”آپ کیسی ہیں؟“ انہوں نے نگاہیں جھکائے جھکائے پوچھا۔

”اچھی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ اس بار بہت دنوں بعد آئے.....“

”ہاں کچھ مصروفیت تھی آتا نہ ہو سکا۔ یوں بھی بی آپا یہاں ہوں تو میں ماں جی کی طرف سے مطمئن

رہا ہوں۔“

”اور مریم، تیمور نیا وغیرہ سے ملاقات ہوتی ہے کبھی، کیسی ہیں وہ؟“

”مریم۔“

ان کے دل میں ہلچل سی ہوئی۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا اسے دیکھے۔ شاید تین ماہ حالانکہ ان تین ماہ میں وہ دربار نہیب ولا گئے تھے لیکن مریم سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ تیمور اور عاشی وغیرہ سے بھی ذرا سی دیر کو ملاقات ہوئی تھی۔ نہیب عثمان کا رویہ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تینوں بار کسی بہانے سے وہ انہیں معذرت کر کے لے گئی تھیں حالانکہ تیمور نے ضد بھی کی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ڈرائیو پر جائے گا۔ نہیب عثمان انہیں ذرا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

لیکن تیمور کا فون آتا تو وہ بے اختیار چل پڑتے، نہیب عثمان کی واضح ناپسندیدگی کے باوجود پتا نہیں یہ فون کی محبت تھی یا پھر دم آخر عثمان احمد سے کیا وعدہ تھا کہ نہیب عثمان کے اس ناپسندیدہ رویے کے باوجود بھی وہ نہیب ولا چلے جاتے۔ بچوں کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر۔ اصولاً تو انہیں نہیب عثمان سے نفرت ہونی چاہیے تھی کہ... یہ وہ عورت تھی جس کی وجہ سے ساری زندگی ان کی ماں دکھی رہی اور وہ باپ کی محبت و شفقت سے بھی محروم رہے لیکن انہوں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اپنے دل میں نہیب عثمان سے نفرت محسوس نہیں کی بلکہ جب بھی جاتے عزت و احترام سے بات کرتے۔ وہ کمرے میں آتیں تو کھڑے ہو جاتے لیکن اس کے باوجود نہیب عثمان کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا تھا۔ انہوں نے کیا لیا تھا ان کا اٹاواہ ان کی مجرم تھیں۔

اور وہ مریم کی رفاقت کے خواب دیکھ رہے تھے جو اسی عورت کی بیٹی تھی اور یہ زندگی نے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا انہیں۔ پیچھے مڑ سکتے تھے اور نہ آگے بڑھنے کو کوئی راستہ دکھائی دے رہا تھا۔

”کیسے ہیں وہ سب؟“ حریم ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

”اچھے ہیں۔“ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اب اگر ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دیجئے گا مریم سے میں اسے بہت یاد کرتی ہوں۔“

”ہاں اگر ملاقات ہوئی تو۔“ انہوں نے ذرا کی ڈانٹا ہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیوں؟ کیا وہ لوگ کہیں اور چلے گئے ہیں؟“

”نہیں لیکن ان کی والدہ پسند نہیں کرتیں۔“

”سو تیار رہتے جو ہوا۔“ حریم نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”لیکن مریم اور بچے تو سب محبت کرنے والے ہیں۔ ان کے دل میں سوتیلہ پن نہیں ہے۔“

پروفیسر عادل کچھ نہ بولے۔ کئی لمحے ایسے ہی خاموش گزر گئے تو انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

”حرم آپ بیٹھے نا کھڑی کیوں ہیں۔“
 ”اوہ ہاں۔“ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ بی آپا ادھر ہی آرہی تھیں۔
 ”ارے عادل آیا ہے۔“ بی آپا انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں ”کیسے ہو؟“
 ”ٹھیک ہوں بی آپا۔“

”تم کہیں باہر گئے تھے۔ ایک دو بار گئی تو تم ملے نہیں اور یہ جو ساون کی جھڑی ایسی لگی کہ بستر سے اٹنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ ابھی حرم آئی ہے تو اٹھی ہوں..... چائے پی کر ہم ادھر ہی آرہے تھے۔“ تفصیل بتاتے ہوئے وہ حرم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئیں۔

”میں دراصل صبح ہی ڈیرے پر چلا گیا تھا مانی کی طرف۔“
 ”مانی تو اب مستقل وہیں رہنے لگا ہے۔ ہفتوں بعد کہیں گھر آتا ہے اور مجھے تو مانی سے ملے مینے ہو گئے ہیں۔“

”وہاں اتنی رونق جو لگا رکھی ہے۔ کیسے جی چاہے گا آنے کو۔“ ان کے لہجے میں شکوہ سا تھا۔
 ”کیا؟“ بی آپا نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”دوست یا رتھے اور کوئی گانے والی خاتون آئی ہوئی تھیں۔ مجھے تو یہ سب اچھا نہیں لگا بی آپا..... آپ پلیز..... کسی دن اسے سمجھائیں۔ عجیب عجیب لوگ تھے وہاں اور چچا جان بھی نہیں روکتے انہیں کسی بات سے۔“ انہوں نے حرم کی طرف دیکھا۔

”وہ ابا کی نہیں سنتے۔ اپنی مرضی کرتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں انہوں نے..... بلکہ ان کے دوستوں نے ایک مزارے کو اچھا خاصا مارا۔ بے چارہ ابا جان کے پاس فریاد لے کر آیا تو ابا جان کا کافی دیر سمجھاتے رہے انہیں لیکن ان پر تو اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے سمجھایا ہوتا۔“

”میں۔“ پروفیسر عادل نے اپنی طرف اشارہ کیا ”اس وقت تو کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ دوست یا رتھے اس کے وہاں پھر کبھی موقع دیکھ کر بات کروں گا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ”اچھا بی آپا۔“
 ”ارے عادل بھیا۔ بیٹھو نا کہاں چل دیے۔“

”بس بی آپا اب چلوں گا۔“

اچانک ہی ان کے دل میں کوئی بوجھ سا آگرا تھا۔ پتا نہیں کیوں ہوتا ہے ایسا۔ حالانکہ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ بی آپا کے پاس زیادہ دیر بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے ان سے مریم کے متعلق مشورہ کریں گے۔ اکیلے یہ بوجھ سنبھالتے سنبھالتے تھک گئے تھے۔

”چائے بن رہی ہے پکڑے بھی ہیں ساتھ۔“ بی آپا نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ کہ ابھی آئے اور ابھی چل دیے۔

”بس بی آپا کسی چیز کو جی نہیں چاہ رہا۔“
 ”خیر تو ہے نا عادل میاں۔ طبیعت تو اچھی ہے نا۔“
 ”جی اچھا ہوں بس ایسے ہی کامل سے کہہ کر آیا تھا کہ ابھی دو منٹ میں آرہا ہوں۔“
 ”اچھا تم نے کہیں جانا تو نہیں ہے نا۔“
 ”نہیں۔“

”تو پھر میں ابھی آؤں گی۔ تین دن ہو گئے ہیں تمہیں حویلی آئے ہوئے۔ جی بھر کر باتیں بھی نہیں ہو سکتی تم سے۔“

”آپ بیٹھیں پلیز۔ میں جا رہی ہوں تاکی اماں کی طرف۔“ حرم ایک دم کھڑی ہو گئی۔
 حرم کی یہ بالکل سادہ سی بات انہیں اندر تک کاٹ گئی گویا حرم نے انہیں اپنی سادہ سی بات میں یہ جتا دیا تھا کہ وہ سمجھتی ہے کہ وہ اس کی وجہ سے جارہے ہیں۔

”نہیں..... نہیں آپ غلط سمجھ رہی ہیں حرم۔“ وہ شرم سارے ہو گئے۔
 لیکن حرم ان کی بات کا جواب دیے بغیر چلی گئی اور وہ وہاں ہی کھڑے رہ گئے۔ بی آپا ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔
 ”بیٹھ جاؤ عادل۔“

”بی آپا حرم نے غلط سمجھا ہے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔“
 ”بیٹھ جاؤ عادل وہ ہرٹ ہو گئی ہے۔ لڑکیوں کے دل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نازک سے چھوٹی موٹی کے پھولوں کی طرح جو چھوٹنے سے مرجھا جاتے ہیں اور پھر حرم تو تمہارے اجتناب اور بے اعتنائی سے خراب ہے۔ بیٹھو۔“

”جی بی آپا۔“ وہ نادم سے بیٹھ گئے۔
 ”کہو مریم سے کوئی بات ہوئی۔“ ایک دم بی آپا نے پوچھ لیا تو وہ ہٹا گئے۔
 ”جی نہیں تو، کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”پھر ایسا کب تک چلے گا عادل۔ ماں جی بہت اداس رہتی ہیں۔ وہ جلد از جلد تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ حرم نہ سہی جو بھی ہو۔ وہ کل شام کو بھی کہہ رہی تھیں۔“
 ”آپ نے مریم کے متعلق ماں جی سے بات کی۔“

”نہیں۔ ابھی نہیں۔ پہلے تم تو کسی فیصلے پر پہنچو۔“
 ”میں۔“ انہوں نے بی آپا کی طرف دیکھا ”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ بہت الجھ گیا ہوں مریم سے میری بات نہیں ہو پاتی اور نہ ب عثمان مجھے پسند نہیں کرتیں۔“

”مریم کی والدہ تمہیں پسند نہیں کرتیں تو پھر بات کیسے بنے گی۔“ بی آپا نے پریشانی سے پوچھا۔
 ”تو آپ کچھ کریں نا..... بی آپا میرے ساتھ لاہور چلیں۔ مریم کو سب کچھ بتا کر اور اس کا عندیہ معلوم کر کے اس کی ماما سے بات کر لیں۔“

”عادل! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیسے مریم سے بات کروں گی۔ کتنا چاہتی ہے وہ عثمان چچا کو۔ ہر وقت ان کی باتیں ان کا ذکر۔ یہ جان کر کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے، کیا بیٹے گی اس پر..... کیسے سامنا کرے گی وہ اس حقیقت کا..... نہیں عادل! مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔“

”پلیز بی آپا! میری خاطر..... مجھے لگتا ہے میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔“ پروفیسر عادل نے التجا کی۔

”عادل تم نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ مریم کی والدہ مجھے کچھ پسند نہیں آئیں۔ جب وہ یہاں آئی تھیں تو تب بھی بہت مغرور لگ رہی تھیں۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ ماں جی کتنے کھلے دل سے آگے بڑھی تھیں لیکن انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم مریم کا خیال دل سے نکال دو۔ نہ تو تم سے ڈسٹرب کرو اور نہ خود پریشان ہو۔ میرا خیال نہیں ہے کہ نہ تمہارا لیے مان جائے۔“

”نہیں بی آپا۔“ پروفیسر عادل کھڑے ہو گئے۔
 اس کا خیال اب دل سے نکالنا اتنا آسان نہیں رہا۔ پہلے جب وہ ایک خیال تھی تب بھی وہ اس کے سوا کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور اب جب کہ وہ خیال سے حقیقت کے روپ میں ڈھل گئی تھی تو اب یہ کیسے ممکن تھا۔

”کیا سوچنے لگے ہو عادل؟“ بی آپا نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔
 ”جو قدم جس سمت اٹھ چکے ہیں۔ وہ اسی سمت جانا چاہتے ہیں ان کا کسی اور طرف پلٹ جانا بہت مشکل ہے۔“ وہ ایک دم پلٹ پڑے۔

”عادل سنو تو۔“ بی آپا نے انہیں پکارا لیکن وہ رکے نہیں اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بی آپا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔



اور اب بی آپا کو کیا پتا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اتنا آگے جا کر پیچھے پلٹ آنا۔ اپنے کمرے میں بیٹلتے ہوئے پروفیسر عادل نے سوچا۔

مریم جو محض ایک خیال اور ایک تصویر تھی ان کے لیے کتنی اہم ہو چکی ہے اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہے..... جس کو وہ دن رات سوچتے ہیں اور پتا نہیں یہ کیا جذبہ ہے۔

محبت یا..... یا اس سے بھی کوئی اعلیٰ و ارفع جذبہ۔
 پتا نہیں وہ مجتبیٰ حیدر سے پوچھتے تو وہ اس سلسلے میں کیا کہتے۔ لیکن بہت دنوں سے وہ مجتبیٰ سے نہیں ملے تھے۔ پتا نہیں کیوں کہیں بھی آنے جانے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ وایک بار حافظ احسان اور کچھ دوسرے لوگ آئے تھے لیکن انہوں نے معذرت کر لی تھی۔ کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ تصدق احمد اور آمنہ صفی بھی ایک دن اپنے تھیز کے سلسلے میں بات کرنے آئے انہوں نے سرسری سا اسکرپٹ دیکھا تھا..... اور اچھا لگا تھا۔

”بہتر ہے۔ بلکہ بہت مختلف لگ رہا ہے۔“

”ایک تجربہ ہی ہے سر۔“

”کر کے دیکھو شاید کامیاب ہو جائے۔“

”ہمارے دوام کی پسندیں بدل سکتی۔ تصدق کا تجربہ تا کام رہے گا۔“

آمنہ صفی از حد مایوس تھی پھر بھی تصدق کا ساتھ دے رہی تھی۔

”آمنہ آپ اتنی مایوس کیوں ہیں ابتداء ہی میں اتنی مایوسی ہو تو کام میں اسپرٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔ بددی آجاتی ہے۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا تھا لیکن آمنہ خاموش رہی تھی اور اس واضح مایوسی کے باوجود تصدق کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی بلکہ اب انہوں نے ریہرسل بھی شروع کر دی تھی۔ تصدق نے انہیں فون بھی کیا تھا کہ وہ..... آ کر دیکھیں کہ ادا کاروں کا انتخاب کیسا ہے لیکن وہ نہ جاسکے اور اب تو مسرور بھی گاؤں چلا گیا تھا اور وہاں انہیں تنہائی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لیے تو ایک ہفتے کی چھٹی لے کر وہ حویلی آگئے تھے اور انہوں نے سوچا تھا کہ وہ بی آپا کے ساتھ اپنے اس مسئلے پر تبادلہ خیال کریں گے اور کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی لیکن بی آپا تو آمنہ صفی کی طرح پہلے ہی مایوس تھیں اور کیا کوئی راستہ نہیں اس تک پہنچنے کا۔ ٹپٹے ٹپٹے وہ رک گئے۔

آخر اس میں حرج ہی کیا ہے اور کیا کبھی اس طرح کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ خود ان کے اپنے گاؤں میں ایسی مثال موجود تھی پھر کون سی وجہ مانے تھی کہ بی آپا..... نہیں بی آپا کو میرے ساتھ چلنا ہوگا اور نہ نب عثمان سے بات کرنی ہوگئی۔ میں بی آپا سے کہوں گا۔

لیکن اگر..... اگر مریم کو یہ ساتھ پسند نہ ہو تو..... پھر..... اور انہیں لگا جیسے ان کا دل کسی انجانے درد کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ وہ یک دم بیٹھ گئے تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون ہے آ جاؤ۔“ بے حد تھکا تھا کالہجہ تھا۔

زنتون بانو اندر آئیں تو وہ یک دم حیران ہو کر کھڑے ہو گئے۔

”آپ ماں جی۔ مجھے بلوالیا ہوتا۔ خیریت ہے نا۔“

”ہاں خیریت ہی ہے۔“ وہ بیٹھ گئیں ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا عادل صبح سے تم کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے۔ ناشتا بھی کمرے میں کیا۔“

”جی ماں جی بالکل ٹھیک ہوں۔ بس یوں ہی سستی سی تھی۔“ وہ بھی بیٹھ گئے۔

”حویلی آئے ہو عادل تو باہر نکلتے۔ چچا کی طرف جاتے۔“

”گیا تو تھا ماں جی۔ مانی کی طرف بھی گیا تھا۔“

”تو چچا نے کوئی بات کی تم سے؟“

”کبھی بات ماں جی؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”عادل مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تمہارے چچا کی بات۔ دو تین بار وہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں مگر اب تو وہ

کانی سنجیدہ تھے۔ بلکہ مصرعے اس بات پر۔“

”مگر ماں جی بات لیا ہے۔ مجھے بتا تو چلا۔“

”تمہیں بتا تو تھا کہ تمہارے دادا اے ماں سے نام نہان جا مدد دردن تھی۔ تاہم کبھی وہ اکیلا رہ

جائے تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنے۔ کم از کم جائداد کی لالچ میں ہی کبھی کوئی اس کی دیکھ بھال کرتا رہے

..... اور اگر خدا خواستہ کامل کو کچھ ہو جائے تو جائداد ساری کی ساری اس شخص کو ملے گی جس نے کامل کی

دیکھ بھال کی ہوگی۔ خدا جانے تمہارے دادا نے ایسا کیوں کیا۔ حالانکہ اصولاً کامل کے بعد تم اور تمہاری

اولاد ہی اس کی جائداد کے وارث ہوتے ہیں۔“

”دادا نے اگر ایسا کیا ہے تو یقیناً ان کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔“ عادل نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تم چونکہ ان دنوں باہر تھے۔ اس لیے تمہارے دادا نے کامل کی جائداد کا سرپرست تمہارے چچا کو

بنایا تھا لیکن ان کا خیال ہے کہ مانی کو وہ کامل کی جائداد کا سرپرست بنا دیں کیونکہ تم تو لاہور میں ہو۔

تمہارے اپنے مسائل ہیں۔“

”میرے خیال میں چچا ٹھیک کہتے ہیں۔ میں تو گاؤں کم ہی آتا ہوں اور مجھے ان معاملات کا پتا بھی

نہیں ہے۔“

”وہ تو صحیح ہے بیٹا لیکن مانی کے متعلق مجھے کچھ اچھی خبریں نہیں مل رہی ہیں۔ بھائی صاحب نے تو اس

کی طرف سے کان بند کر رکھے ہیں۔ وہ تو ساری جائداد..... اڑا دے گا۔ حاجی صاحب بھی پچھلے دنوں

آئے تھے۔ وہ ہی پرانی شکایت لے کر کہ ان کی فلو رٹز کو جتنی گندم ہم پہلے دیتے تھے اب نہیں دے رہے

ہیں۔ مجھے شک ہے عادل کہ مانی.....“

”پلیز ماں جی۔“ پروفیسر عادل نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا ”مانی بے شک کچھ بگڑ گیا ہے اور اس

کی سرگرمیاں ایسی ہیں کہ اسے پیسے کی ضرورت رہتی ہوگی لیکن میرے خیال سے اس کے پاس کمی

نہیں ہے..... سارا حساب کتاب تو اسی کے پاس ہے۔ چچا جی دخل نہیں دیتے اس کے معاملات میں وہ

چاہے سیاہ کرے یا سفید..... اسے ہماری گندم میں ہیر پھیر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا لیکن اس بار تم وکیل سے تو ملو۔ دیکھو تو کامی کے نام کیا کچھ ہے اور کیا واقعی کامی کے

بعد جائداد تمہیں یا تمہارے بچوں کو منتقل نہ ہوگی..... مجھے عجیب طرح کی الجھن ہے۔ تم یہاں تھے نہیں مجھے

کچھ خبر نہیں ہے سوائے اس کے جو تمہارے دادا نے وقفہ وقفہ مجھ سے کہا۔ تمہارے چچا نے کبھی کچھ بتانے

کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دو ایک بار میں نے ذکر بھی کیا تو کہنے لگے۔

”آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے ماں جی اس دفعہ لاہور جاتے ہی وکیل صاحب سے ملوں گا اور ساری صورت حال کا پتا

کروں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ انہوں نے ہولے سے ان کے ہاتھ تھپتھپائے۔

”میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پتا ہے تم خود بھی پریشان رہتے ہو۔ خدا جانے کیا کیا

بو جھلا دور کھے ہیں تم نے اپنے اوپر..... آ جاؤ عادل حویلی میں۔ اپنی زمین جائداد دیکھو۔“

”ماں جی کوئی بوجھ نہیں ہے اور حویلی آنا فی الحال میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ

مہینے میں ایک آدھ بار آ کر فٹنی چاچا سے سب کچھ کہنے کی کوشش کروں۔“

”عادل۔“ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے عادل کی طرف دیکھا جو کمرے میں کھو گئے تھے۔

”جی۔“ انہوں نے چونک کر ماں جی کی طرف دیکھا۔

”بیٹا زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میری اور تمہارے دادا کی بہت خواہش تھی کہ حریم بیوہ بن کر اس

گھر میں آئے لیکن تمہاری خواہش کے بغیر نہیں۔ تمہیں حریم پسند نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔“

”تمہیں ماں جی۔“ انہوں نے تڑپ کر نظریں اٹھائیں ”میں نے حریم کو ناپسند کبھی نہیں کیا۔ ہاں میں

اپنے آپ کو حریم کی رفاقت کی قابل نہیں سمجھتا۔ میں اسے شاید وہ خوشیاں نہیں دے سکتا جو کسی اور سے اسے

مل سکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن عادل بیٹا تم اپنی پسند بھی تو بتاؤ۔ تم آخر کیا چاہتے ہو۔ تم جہاں چاہو گے میں جھولی

پھیلانے کے لیے تیار ہوں۔ میں تمہارے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے اب انتظار نہیں ہوتا۔ کوئی

خوشی مجھے بھی تو ملے..... یا میں یوں ہی دنیا سے چلی جاؤں گی۔ کیا میرے حصے میں کوئی مسرت نہیں؟“

”ماں جی۔“ وہ ایک دم اٹھ کر ان کے قدموں میں آ بیٹھے اور ان کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے

”ماں جی میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی رفاقت میں زندگی کا سفر طے کرنا میری اولین

خواہش ہے..... آپ اس لڑکی سے ملی ہیں۔ اسے دیکھا ہے.....“ ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے ماں جی کو ساری

حقیقت بتادی..... عثمان احمد کی خواہش اور اپنی آرزو۔

”مریم زنب کی بیٹی ہے۔“ بڑی دیر بعد ماں جی نے کہا۔ جیسے اس انکشاف نے انہیں بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”جی ماں جی۔“ انہوں نے پر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔ عجیب یاس و آس کے عالم میں دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کہیں ماں جی انکار نہ کر دیں..... بہر حال زنب وہ عورت تھی جس نے ان کے سہاگ پر ڈاکڑا لگایا تھا۔ جنہوں نے عثمان احمد کو ان سے چھین لیا تھا۔

”مریم اچھی لڑکی ہے۔ بہت محبت کرنے والی۔“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا تو پروفیسر عادل نے بڑی دیر سے رکے ہوئے سانس کو آزاد کیا۔

”اور اب میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی۔“ وہ گھڑی ہو گئیں ”میں تمہارے ساتھ ہی لاہور چلوں گی اور مریم کا رشتہ تمہارے لیے مانگوں گی۔“

”ماں جی۔“ پروفیسر عادل نے بے اختیار ان کے ہاتھ چوم لیے۔

”تمہاری خوشی اور تمہاری مسرتیں مجھے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہیں عادل۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

”اور مریم اس گھر کی بہو اور تمہاری بیوی بننے کے قابل ہے۔“

وہ عجیب سرشاری کے عالم میں کھڑے تھے اور ماں جی انہیں کامیابی کی طرف آنے کا کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئیں اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

یہ کیسی خوشی تھی، کیسی سرشاری تھی ماں جی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کچھ نہیں کہا تھا بلکہ وہ ان کی خوشی میں خوش تھیں۔

”لیکن مریم۔“

پتا نہیں مریم.....

ان کے اندر راجا پاک چھا جانے والے مسرت کے رنگ بچھ سے گئے۔

انہوں نے ابھی تک مریم سے کوئی بات نہ کی تھی۔ نہ اسے بتایا تھا کہ وہ عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے۔ انہیں پہلے مریم سے بات کر لینی چاہیے تھی۔ پھر..... پھر ماں جی سے بات کرنی تھی لیکن اس جذباتی کیفیت میں اب جبکہ وہ ماں جی سے سب کچھ کہہ بیٹھے تھے اور ماں جی بھی زنب ولا جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں تو..... بے چین ہو کر انہوں نے سگریٹ جلایا اور سوچا کہ ماں جی کے زنب ولا جانے سے پہلے

انہیں مریم سے بات کر لینی چاہیے مگر کیسے.....

ان کی نگاہ کارز میں رکھے ٹیلی فون اسٹینڈ پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے وہ زنب ولا کا نمبر ملا رہے تھے۔



”آخر تمہیں پریشانی کیا ہے مریم۔ تم بتاتی کیوں نہیں ہو۔“ شہر یار نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھا۔ ”جب سے تم آئی ہو اب سیٹ لگ رہی ہو۔“

”پتا نہیں۔“ مریم کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی ”مجھے خود بھی نہیں معلوم کے میں کیوں پریشان ہوں۔ کوئی ایسی واضح پریشانی بھی نہیں ہے لیکن ذہن الجھا ہوا سا ہے۔“

”اس الجھن کی کوئی وجہ تو ہوگی نا۔“ شہر یار بھی پریشان ہو گیا ”مجھ سے تو خفا نہیں ہونا۔“

”نہیں۔“ مریم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اب دیکھو نا پہلے تم ضد کر رہی تھیں کہ جب تک تمہاری تعلیم مکمل نہ ہو جائے اماں جان اور بابا جان کو نہ بھیجوں اور اب تم نے انہیں بھیجے کو کہا تو..... سکندر ماموں اتنے زیادہ بیمار تھے کہ وہ گاؤں سے آئی نہیں سکے۔ پہلے انہیں ٹائیفائیڈ ہوا اور پھر مونہیہ ہو گیا۔ اماں جان کا تو ابھی بھی آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر

یعنی کے خیال سے آگئیں کہ وہ یہاں اکیلی ہے اور اب تمہاری ماما نہیں ہیں۔ ماما کب تک آجائیں گی مومو۔“

”معلوم نہیں۔“ وہ از حد افسردہ ہو رہی تھی ”ابھی تو ماما کل ہی کراچی گئی ہیں اور ان کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہے۔“

وہ کراچی سے ہونے والے ڈراما سیریل میں ایک اہم کردار ادا کر رہی تھیں اور اسی سلسلے میں کراچی گئی تھیں۔ میڈم نرگس بھی ان کے ساتھ تھیں۔ کراچی میں ان کے بڑے بیٹے مقیم تھے اور ان کا قیام انہی کے ہاں تھا۔ میڈم کا کراچی جانے کا ایک مقصد لالہ سے ملنا بھی تھا مریم نے سنا تھا وہ ماما سے کہہ رہی تھیں کہ وہ

حیدر آباد بھی جائیں گی لالہ سے ملنے اور خود میڈم نرگس کے دیے ہوئے فون نمبر پر اس نے کئی بار ٹرائی کیا تھا لیکن اس کی لالہ سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ ہر بار ہی ٹال دیا جاتا تھا۔ کبھی کہہ دیا جاتا گھر پر نہیں ہیں کبھی

کہہ دیا جاتا بڑی ہے کچھ دیر بعد بات کریں۔ میڈم نرگس اس کے لیے پریشان تھیں اور روتی تھیں۔

”ضرور انہوں نے بچی کو قید کر رکھا ہے۔ تم سے بھی بات نہیں کروائی۔ میری بچی کو کچھ ہوا تو میں تہلکہ

چاؤں گی! اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ وہ تو نا سمجھ ہے بالکل بچی ہے۔“

شاید اسی لیے انہوں نے ماما کے ساتھ جانے کا پروگرام بنایا تھا اور ماما بہت خوش تھیں کہ کمپنی رہے گی۔ اور ماما کتابت بدل گئیں تھیں۔ ایک بار پھر وہی پہلے جیسی ماما ہو گئی تھیں۔ وہ یونورسٹی سے گھر آتی تو ماما گھر

پر نہ ہوتیں اور چھٹی والے دن ماما کے دوست احباب اکٹھے ہو جاتے۔

”کیا سوچنے لگی ہو مریم۔“ شہر یار غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ چونکی۔

”اپنی ساری پریشانیاں مجھے دے دو مریم۔“

”شہر یار.....“

”ہاں ہاں کہو نا خاموش کیوں ہو گئی ہو۔“

”شہر یار مجھے شرنیل مرزا سے ڈر لگنے لگا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے شہر یار کہیں ماما کا ارادہ بدل نہ جائے۔“

”پاگل ہو تم مومو۔ ایک بار جب تم سے ماما نے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گی پھر ڈرتی کیوں ہو تم۔“

اور اب وہ شہر یار کو کیا بتاتی کہ وہ کیوں ڈرتی ہے۔ ماما ان دنوں شرنیل مرزا پر کس قدر مہربان ہو رہا تھا کہ اسے خوف آنے لگا تھا شرنیل مرزا سے اور ابھی پرسوں رات ماما نے اپنی فلم کی کامیابی کی خوشی میں جو زبردیا تھا تو وہ کس قدر گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا اور پھر آتے جاتے اس کے ذہنی جملے تیز نظر میں۔ بہت جلد وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ جبکہ ماما کی خواہش تھی کہ وہ وہاں رہے اور سب کو انٹرٹین کرے اور اس کے اپنے کمرے میں آجائے پر ماما نے کس قدر ڈانٹا تھا اسے..... اور اس لمحے ماما بالکل پہلی والی ماما لگنے لگی تھیں اور اسے ڈانٹ کر حسب معمول خود ہی رونے لگی تھیں اور انہیں میگزین کا ہلکا سا ٹک ہونیا تھا اور ڈاکٹر ہادی نے انہیں سکون آور گولیاں دے دی تھیں۔ جس سے وہ جلد ہی سو گئی تھیں اور اسے تب پایا کہتے بے تحاشا یاد آئے تھے۔ جب ماما کو سر درد یا ٹینشن کا یہ ایک ہوتا تھا تو وہ کس قدر پریشان ہوتے تھے۔ کیسے دھیمے دھیمے باتیں کرتے ہوئے ہولے چلتے کہ کہیں ان کی آہٹ سے بھی ماما کی تکلیف بڑھ نہ جائے اور پھر ان کی بیسٹ فرینڈ زمیڈمز گرس اور بیگم آفتدی کو فون کرتے تھے۔ بار بار بے چین ہو کر اپنی اسٹڈی سے ماما کے بیڈ روم تک جاتے تھے..... اور اس روز پایا اسے بہت یاد آئے بے تحاشا اور وہ چپکے چپکے روتی رہی۔ ماما پر سکون ہو کر سو گئی تھیں لیکن وہ انہی کے کمرے میں بیٹھی رہی..... پایا انہیں تھے تو اسے ہی ان کی دیکھ بھال کرنی تھی۔

ڈاکٹر عبد المعید نے دو تین بار آکر ماما کو دیکھا تھا۔

”یہ بالکل ٹھیک ہیں مریم۔ آپ جا کر سو جائیں اور پھر اگر طبیعت خراب ہوئی تو میں ہوں نا اوپر فوراً

آجاؤں گا۔“

اور انکل ہادی اور ڈاکٹر عبد المعید کے آجانے سے کسی قدر تحفظ کا احساس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر عبد المعید تو اسے عاشی کے حوالے سے بالکل بھائیوں کی طرح عزیز ہو گئے تھے اور وہ بھی کس قدر خیال کرتے تھے۔ شکر ہے ماما صبح تک ٹھیک ہو گئی تھیں۔ کیوں کہ انہیں کراچی بھی جانا تھا اور وہ پریشان ہو رہی تھی کہ ان کی طبیعت خراب ہے..... ”ماما آپ نہ جائیں کراچی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ صبح انہیں جانے کے لیے تیار ہوتے دیکھ کر اس نے انہیں منع کیا تھا۔

”نہیں میرا جانا ضروری ہے اور پھر نرس ہے نا میرے ساتھ۔ دیکھو مومو تم مجھے پریشان مت کہو

”کرو۔ ہمیشہ تم مجھے تکلیف دیتی ہو۔“

”ماما۔“ وہ شرمندہ ہو گئی ”آئی ایم سوری ماما۔“

”اوکے۔ آئندہ دھیان رکھنا۔“

وہ ماما کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ماما سے بے حد بے حساب محبت کرتی تھی۔ وہ کبھی انہیں دکھ نہیں دے پائے گی اور کبھی بھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر پائے گی اور اگر ماما نے شرنیل مرزا کے حق میں فیصلہ دے دیا تو شاید وہ کچھ بھی نہ کر سکے..... اس لیے وہ پریشان تھی..... ابھی ہوئی تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے بابا جان اور اماں جان ماما سے بات کر لیں۔ ماما کے موڈ کا تو کچھ تباہی نہیں چٹا تھا، گھڑی میں تو لگھڑی میں ماشہ۔

”بیجے جناب چائے حاضر ہے۔“ یعنی نے ٹرے لاکر ٹیبل پر رکھی تو وہ چوکی ”آپ کی پسند کے اماں کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب بھی۔“

اس نے مریم کی طرف دیکھا اور پھر شہر یار کو دیکھ کر چوکنے کی ایکٹنگ کی۔

”ارے شیری بھائی آپ ابھی تک یہاں ہیں۔ ڈیوٹی پر نہیں گئے۔“

”نہیں میں اس وقت.... فارغ ہوں۔ میری آج نائٹ ہے۔“

”اچھا اچھا۔ تو یہاں کیا کر رہے ہیں میرے کمرے میں۔“ یعنی شوخ ہو رہی تھی۔

”مریم سے ملنے آیا تھا۔“ شہر یار نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے ارے بیٹے شیری بھائی۔ چائے نہیں پیتیں گے۔“ یعنی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔ میں ذرا بابا کے پاس جا رہا ہوں۔ تم میری چائے ادھر ہی لے آنا بلکہ نہیں۔ تم چائے رہنے

ہی دو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو پی ہے۔“ اس نے مریم کی طرف دیکھا۔

”مریم جب جانا ہو تو مجھے بلوالینا میں ڈراپ کر دوں گا۔“

”نہیں گاڑی ہے میرے پاس۔“

”احتیاط سے ڈرائیو کرنا۔“

”اوکے سر۔“ وہ مسکرا دی۔

”بڑا خیال ہے۔“ یعنی نے چھیڑا۔

”ہونا بھی چاہیے۔“ شہر یار نے کہا اور مریم پر ایک نظر ڈالتا ہوا بابا ہر نگل گیا۔

”تو جناب اب شروع ہو جائیے کیا بات ہے۔“ یعنی نے کہا بوی کی پلیٹ مریم کی طرف بڑھائی۔

”اسنے دنوں سے اپ سیٹ، دیکھ رہی ہوں تمہیں۔ موقع ہی نہیں مل رہا تھا بات کرنے کا۔ ایک تو

ہر وقت کوئی نہ کوئی ہوتا ہے تمہارے ساتھ.....“

”تم ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو مومو۔“ یعنی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا ”کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔“

”کچھ بھی تو نہیں چھپا رہی ہوں۔“ اس نے اپنے خیالوں کو جھٹک کر عینی کی طرف دیکھا ”بس وہ ماما کراچی چلی گئی ہیں نا تو ان کے بغیر دل بہت اداس ہے۔ پتا نہیں ماما کے بغیر مجھے گھر نہیں لگتا ہے ویرانہ لگتا ہے۔“

”تو ایسا کرو نا۔ تم ادھر ہی آ جاؤ۔ جب تک ماما نہیں آ جاتیں۔“ عینی نے اس کے لیے چائے بنا کر کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”نہیں شاید ماما اسے پسند نہ کریں اور پھر میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ معید بھائی ہیں ان کے ڈیڈی ہیں۔ انکل ہادی۔۔۔۔۔ اور یوں بھی مجھے اپنے گھر کے سوا کہیں نیند نہیں آتی۔“

”اور جب ہمیشہ کے لیے کسی اور کے گھر میں جانا پڑ گیا تو۔“ عینی کے لہجے میں شوخی تھی اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

”پتا ہے مومو ہم سب بہت خوش ہیں۔ بے حد شیریں بھائی کی پسند ہم سب کو پسند ہے۔ بلکہ شیریں بھائی سے پہلے میں نے آپ کو پسند کیا تھا۔ ماما، ارسل ابا جان، اماں جان سب ہی تم سے پیار کرتے ہیں مومو۔ ہمارے گھر میں تمہیں بہت محبتیں ملیں گی۔ سکندر چچا کو بھی تم اچھی لگی ہو اور ان کا بھی خیال ہے کہ تم اور شہر یا ایک دوسرے کے لیے بہت مناسب ہو۔“

مریم کے رخساروں پر لالی ڈورنے لگی اور چمکیں جھک گئیں۔

”مریم تمہاری ماما انکار تو نہیں کریں گی نا۔ کبھی کبھی مجھے خوف سا آتا ہے کہ ہم اور تم۔۔۔۔۔ ہم تمہارے مقابلے کے تو نہیں ہیں نا۔۔۔۔۔“

”نہیں مجھے یقین ہے کہ ماما انکار نہیں کریں گی۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ میری پسند کو ترجیح دیں گی۔“ مریم نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

”اچھا تو شیریں بھائی آپ کو پسند ہیں؟“ وہ پھر شوخ ہونے لگی۔

”پتا ہے ہم تو بہت دھوم دھام سے منگنی کریں گے۔ ارسل اور منے نے تو پروگرام بھی سیٹ کر لیا ہے۔ خوب ہنگامہ کریں گے۔ سب دوستوں کو بلائیں گے۔ ہمارے گھر کی پہلی خوشی ہے۔ بس اب تمہاری ماما جلدی سے آ جائیں۔“

اور مریم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی اور وہ وقتی طور پر اپنی الجھن فراموش کر بیٹھی۔

اور یہ سب کچھ کتنا خوش کن ہو گا۔ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔

اس شخص سے منسوب ہو جانا جس کی رفاقت کی خواہش دل نے کی ہے۔

”کوئی بات نہیں ہے۔ وہم ہے تمہارا۔“ اس کے ہونٹوں پر پچھکی سی مسکراہٹ آ گئی ”اب میں حیرت بٹاؤں جو کچھ میں محسوس کرتی ہوں اور جو کچھ میں سوچ رہی ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے۔ جیسے پہلے جیسی ہو رہی ہیں جیسے وہ ایک بار پھر ہم سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور اس روز وہ ڈنر میں سارا وقت ملک کے ساتھ ہی نظر آتی رہی تھیں اور شرجیل مرزا اپنی پلیٹ اٹھائے اسی کی طرف آ گیا تھا۔ جب وہ کونے میں تنہا کھڑی پاپا کو سوچ رہی تھی۔ پاپا کی ڈیجھ کے بعد پہلی بار کوئی بڑا فنکشن ان کے گھر ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور اسے پاپا بہت یاد آرہے تھے۔ ماما کے ساتھ ڈنر سوٹ میں وہ کتنے شاندار لگتے تھے اور نرس نے بھی کتنی ہی بار ان کی تعریف کی تھی۔“

”ہیلو مریم یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو۔“ شرجیل مرزا کی آواز پر وہ چونک پڑی تھی۔

اب وہ کتنی بے تکلفی سے اس کا نام لے کر بلائے لگا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ اسے اکثر مس عثمان باکر مریم کہہ کر بلاتا تھا۔ آپ کی جگہ خود بخود ہی تم کہنے لگا تھا اور مریم اس کے اس انداز مخاطب سے چڑنے کے باوجود اسے منع نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اس طرح سے مخاطب نہ کیا کرے۔

”مریم ذرا اپنی می می کی طرف تو دیکھو۔“ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی ”کس قدر زندہ دل ہیں۔ ایک تم ہو اس عمر میں بڑھا پاپا اڑھ لیا ہے۔“

اس نے نظریں اٹھائی تھیں۔ ماما غضنفر ملک کے ساتھ کھڑی ہنس رہی تھیں۔ موف رنگ کے ڈریس میں ان کی سفید رنگت دکھ رہی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح بے تحاشا خوب صورت اور فریش لگ رہی تھیں اور غضنفر ملک ذرا سا ان کی طرف جھکا جانے کیا کہہ رہا تھا۔

”لوگوں کا خیال ہے کہ مسز زینب عثمان غضنفر سے شادی کر لیں گی۔“

اس نے تیز نظروں سے شرجیل مرزا کو دیکھا۔

”یہ میرا نہیں، لوگوں کا خیال ہے۔“ اس نے گھبرانے کی ایکٹنگ کی ”تم مجھے اس طرح غصیل نظروں سے مت دیکھو۔ ہم تو پہلے ہی شکار ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ اور تمہاری ماما نے غضنفر کو شکار کر لیا ہے۔ وہ زور سے ہنسا۔

تو اس کا جی چاہا کہ اس طرح ہنسنے سے اس شخص کا گلا گھونٹ دے۔ کس قدر فضول باتیں کر رہا تھا وہ اور اگر شرجیل مرزا کی بات سچ ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے اسے خیال آیا تھا اور اس کا دل جیسے کسی نے منہ میں لے لیا تھا۔ پھر بھلا وہ کسی سے کیسے نظر ملائے گی۔ شہر یا کر کیا سوچے گا، بابا اور ماں جی کیا خیال کریں گے۔

”نہیں۔“ اس نے خود کو یقین دلایا۔

می ایسا نہیں کر سکتیں۔ ان کی تو عادت ہے ہر ایک سے خوش دلی سے ملتی ہیں۔ فریک ہو کر اور شرجیل مرزا فضول باتیں کرتا ہے۔ خواہ مخواہ اسے تنگ کرنے کے لیے۔

اور شہر یار کس قدر مختلف ہے اپنے ہم عمر لڑکوں سے۔

اور پھر اس کی محبت

کس قدر دلکش اور دلنشین ہے۔

اس کے لبوں سے نکلنے والا ایک ایک لفظ اس کی روح میں اتر جاتا تھا۔ گھنٹوں وہ اس کے کہے لفظوں کو دل ہی دل میں دہرائی اور سوچتی رہتی تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی اسے بھی محبت مل جائے گی اور وہ اس طرح کسی اجنبی کو سوچے گی۔ جب لالہ اعزاز کے متعلق بات کرتی تھی تو وہ کس قدر حیران ہو کر اس کی باتیں سنتی تھی اور اب خود.....

”ہاں وہ عاشری اور معید بھائی کا کیا بتا؟“ یعنی کو یاد آیا۔

”مئی نے عاشری سے پوچھا تھا۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے مئی سے کہہ دیا تھا کہ جو ان کی مرضی ہو اور پھر مئی نے انکل ہادی سے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک ہے انہیں معید کا رشتہ عاشری کے لیے قبول ہے لیکن باقاعدہ منگنی عاشری کے سینئر کیمبرج کے بعد ہوگی۔“

”چلو اچھا ہوا تم اتنی تعریف کرتی تھیں ڈاکٹر عبدالمعید صاحب کی۔“ یعنی نے خوشی سے کہا۔

”ہاں وہ واقعی بہت اچھے ہیں یعنی اور عاشری لگی ہے بہت بہت مخلص اور محبت کرنے والے ہیں۔“

”اور کیا تم لگی نہیں ہو۔ ہمارے شیریں بھائی بھی تو بہت اچھے ہیں.....“

”ارے ہاں.....“ اسے اچانک خیال آیا ”یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ شیریں بھائی بھی ڈاکٹر ہیں۔“

معید بھائی بھی ہیں نا.....“

”ہاں۔“ مریم خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔

یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ ماما نے اس روز ڈاکٹر پر عاشری اور ڈاکٹر عبدالمعید کی منگنی کا غیر رسمی اعلان کر دیا تھا ورنہ..... اور لوگوں کے ذہن کتنے چھوٹے اور تنگ ہوتے ہیں۔

وہ اپنے لیے کوئلڈ ڈرنک لینے گئی تو میڈم نرگس کے پیچھے سے گزرتے ہوئے سنا وہ بیگم آفندی سے کہہ رہی تھیں۔

”کمال ہے..... ہم تو سمجھ رہے تھے کہ ڈاکٹر عبدالمعید زینی کی زلفوں میں الجھ گئے ہیں اور.....“

”ہاں یہ بات تو ہم نے بھی محسوس کی تھی۔“ بیگم آفندی ان کی تائید کر رہی تھیں۔

”زینی کی طبیعت خراب ہوتی تو ڈاکٹر عبدالمعید صبح و شام پکڑ لگا رہے ہیں پٹی سے لگے بیٹھے ہیں۔“

”یعنی معاملہ الٹ تھا۔“ میڈم نرگس نے ہتھ پر لگایا۔

”ہونے والی ساس کی خوشامد ہو رہی تھی۔“

”لیکن حیرت ہے مریم تو عاشری سے بڑی ہے۔ زینی کو پہلے مریم کا سوچنا چاہیے تھا۔“

”مریم پر تو شریل مرزا آنکھ لگائے بیٹھا ہے۔“ میڈم نرگس کی سرگوشی بھی اتنی بلند تھی کہ مریم کے علاوہ ایک دو مہمانوں نے جو قریب بیٹھے تھے سنی۔

”لیکن ہم تو سمجھے تھے شریل مرزا زینی کا پرستار ہے۔“ بیگم آفندی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”شریل زینی کا پرستار نہیں۔ زینی شریل کی پرستار تھی۔ لیکن شریل کی شروع ہی سے مریم پر نظر ہے

اور وہ زینی کے خمرے بھی غالباً اسی لیے برداشت کرتا ہے۔“

میڈم نرگس کو اندازے لگانے میں کمال حاصل تھا۔

”اور یوں بھی زینی نے اب شریل مرزا کا فہم البدل ڈھونڈ لیا تھا۔ اس سے زیادہ بیک اور اسارٹ

لیکن سنا ہے اس کا بیک گراؤ بڑا دیک ہے۔ بہت غریب ہے۔ تب ہی تو زینی کے گرد چکرار ہا ہے۔ ورنہ

ایڈسری میں کوئی اس کی ہم عمر ہیر دکن نہیں ہے کیا کوئی۔“

اور وہ ہونٹ بھیچنے وہاں سے ہٹ آئی تھی۔

پتا نہیں لوگوں کی ذہنیت ایسی کیوں ہوتی ہے اور ماما کی فریڈنز تو سب ایک جیسی ہیں۔ دوغلی ماما کے

سامنے کچھ پیٹھ پیچھے کچھ۔

اور لالہ کے ہاں ڈنر میں شریل مرزا نے بھی تو ماما اور ڈاکٹر عبدالمعید کے متعلق ایسی ہی فضول باتیں کی

تھیں..... دراصل یہ ان کے اپنے ذہن کا گندہ ہے۔

اس نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے سوچا تھا اور وہاں سے کوئلڈ ڈرنک لے کر نسبتاً ایک تاریک اور

اکیلے کونے میں چلی گئی تھی۔ حالانکہ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ڈاکٹر عبدالمعید کے پاس جائے اور انہیں

مبارک باد دے کس قدر خوش لگ رہے تھے وہ لیکن لوگوں کو کہانیاں بنانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

اور خاص طور پر میڈم..... خوا خواہ ہی ماما سے کوئی بات کہہ دیں۔ اسے اور ڈاکٹر عبدالمعید کو اکٹھے دیکھ کر

تو ماما بیگانہ ہو جائیں۔

اور اپنی اس احتیاط پر وہ خود ہی خوش ہو گئی تھی۔ یعنی اب وہ اتنی سمجھ دار ہو گئی ہے کہ بہت سی باتوں کو صحیح

طرح سے سمجھ سکتی ہے۔

”مومو یہ کباب اور لو۔ تم نے ذرا سا کچھ لیا ہے بس۔“ یعنی نے کباب کی پلیٹ اس کی طرف

بڑھائی۔

”تھینک یو یعنی۔ میں نے لے لیا تھا۔ اب میں چلوں گی۔“

”اتنی جلدی..... پتا ہے کتنے دنوں بعد تو یوں اس طرح بیٹھنے کا موقع ملا ہے اور.....“

”نہیں یعنی۔ پتا نہیں کب ماما کا فون آجائے اور میں گھر پر نہ لی تو وہ پریشان ہو جائیں گی۔“

”مجا بونو شری تو آؤ گی نا۔“ یعنی نے اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“

”چلو تھوڑی دیر بابا کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔“ یعنی بھی کھڑی ہو گئی ”آج تو بابا کے پاس تم بیٹھی ہی نہیں ہو۔“

”چلو کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر پھر چلتی ہوں۔“

چوہدری ثار اور شہر یار نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔

”ارے ہماری بیٹی آج کہاں غائب ہو گئی تھی سلام کر کے۔“ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

”بس بابا میں یعنی کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ آپ آرام کر رہے تھے نا۔“

”یوں ہی لیٹا ہوا تھا اور تم چلی بھی گئیں۔ سچی بات تو یہ ہے بہت اداس ہو رہا تھا تمہارے لیے۔ وہاں گاؤں میں بھی تم ایک دن بہت یاد آئیں تو میں نے سکندر سے کہا یا سکندر پتا نہیں کیا ہے اس بچی میں یعنی سے بڑھ کر عزیز ہو گئی ہے مجھے۔“

”آپ کی شفقت اور محبت میرے لیے بڑا سرمایہ ہے بابا۔“ مریم کے چہرے پر خوشی کے پھول سے کھل اٹھے وہ ان کی محبت پر سرشار ہو گئی تھی اور کتنی خوش قسمتی تھی اس کی کہ اسے بابا کی شفقت و محبت مل گئی تھی اور وہ بھی اس وقت جب وہ بکھر رہی تھی اور اس کی شخصیت ٹوٹ چھوٹ کا شکار ہو رہی تھی اور اگر اس وقت بابا نہ ملتے اسے نہ سمجھاتے تو شاید اس کی شخصیت بالکل مسخ ہو جاتی اور پھر کچھ دیر وہ بابا اور ماں جی کے پاس بیٹھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پھر کب آئے گا ہمارا بیٹا۔“ چوہدری ثار نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”بس بابا جلدی آؤں گی۔ میں خود آپ سب کے لیے اداس ہو جاتی ہوں۔“

”اب تو ہمیشہ کے لیے ادھر ہی آنے کا بندوبست کر لیں بابا۔“ شہر یار نے بہت آہستگی سے کہا جسے صرف مریم نے سنا اور اس کے ہونٹوں پر مدھمی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اپنے قریب کھڑے شہر یار کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ یعنی ہولے سے کھکاری۔ گویا ظاہر کر رہی ہو کہ نظروں کا یہ تبادلوہ دیکھ رہی ہے۔

”تمہاری ماما آجائیں کراچی سے تو یعنی کو بتانا ہم آئیں گے تمہارے گھر۔“ صالحہ بیگم نے اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے کہا تو وہ شرمگاہی اور جلدی سے سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔



جب وہ گاؤں لاک کر کے مڑی تو اپنے پیچھے ڈاکٹر عبدالمعید کو دیکھ کر مسکرائی۔

”کیسے ہیں معید بھائی آپ۔ کیا کہیں جارہے تھے؟“

”ہاں آپ کو دیکھنے جارہا تھا۔“

”مجھے۔“ اسے حیرانی ہوئی۔

”ہاں ابھی کچھ دیر پہلے ہی کلینک سے آیا تھا۔ صغیر سے آپ کا پوچھا تو پتا چلا کہ آپ ابھی تک یونیورسٹی سے نہیں آئیں تو پریشان ہو گیا۔ اگلے ہوتے تو وہ بھی پریشان ہو جاتے۔ مریم آپ کہاں چلی گئی تھیں؟“

”میں تو یعنی کی طرف چلی گئی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے ماں جی اور بابا سے ملے۔“

”نیکم از کم فون کر دیا ہوتا۔“

”مگر میں تو پہلے بھی اکثر یونیورسٹی سے یعنی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔“

”لیکن جب سے ہم اوپر شفٹ ہوئے ہیں میرے آنے سے پہلے آپ یونیورسٹی سے آچکی ہوتی ہیں اور آج تو آپ کی ماما بھی نہیں تھیں۔ سچ بہت پریشان کیا آپ نے۔ اتنی سی دیر میں میں نے پتا نہیں کیا کیا سوچ ڈالا تھا کہ کہیں کوئی حادثہ ہی نہ کر بیٹھی ہوں۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمعید نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”سوری معید بھائی۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ آپ پریشان ہو جائیں گے۔“

اور یہ اتنے سارے اچھے اچھے چھ لگ اس کے ارد گرد تھے۔ اسے ایک دم ڈاکٹر عبدالمعید پر فخر محسوس ہوا اور اس کے اندر ایک سرشاری سی در آئی۔ بابا کے بعد بھی وہ تنہا نہیں ہے۔ بہت سارے ہیں اس کے اپنے۔ اس کے لیے پریشان ہونے اور اس کے لیے سوچنے والے۔

”انگل ہاشم تو ٹھیک ہیں نا۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ ٹی وی لائونج تک آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔

”آپ کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“ عبدالمعید نے پوچھا۔

”بہت اچھی۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

”معید بھائی آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھیں نا چائے پیئیں گے۔“

”لیس پلیز۔“

ڈاکٹر عبدالمعید بیٹھ گئے تو اس نے صغیر کو بلا کر چائے لانے کے لیے کہا۔

”مریم بھی کوئی مسئلہ کوئی بات ہو تو پلیز بغیر کسی جھجک کے مجھ سے کہیے گا۔ ماما نہیں ہیں تو آپ ہماری

نہ داری ہیں۔۔۔۔۔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھیں۔۔۔۔۔“

”سمجھیں کیا۔“ مریم مسکرائی ”آپ ہیں ہی میرے بڑے بھائی۔“

”تھینک یو۔“ عبدالمعید کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی ”میں ان محبتوں سے ہمیشہ محروم رہا ہوں۔“

”یقیناً آپ کے روپ میں مجھے ایک بہت اچھی اور پیاری بہن مل گئی ہے۔“

”تھینک یو۔“ اس نے بالکل عبدالمعید کے انداز میں کہا تو وہ ہنس دیا۔

”یہ مور اور نینا کب آئیں گے۔“

”یعنی آپ کا مطلب ہے عاشقی کب آئے گی۔“ اس نے شرارت سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا دیے۔

”ایک ہی بات ہے۔“

”عائشہ اگلے ویک اینڈ پر۔“

”دراصل میں نے ایک گھر دیکھا ہے بہت خوب صورت۔ مالک نے اپنے رہنے کے لیے بنوایا تھا لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے اسے فروخت کرنا پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا اگر عاشقی کو وہ گھر پسند آجائے تو میں اسے خرید لوں۔ پلاٹ لو پھر گھر بنواؤ..... بہت جھنجٹ ہے..... اور یہ گھر بہت آرتھک بنا ہوا ہے بہت زبردست بالکل خوابوں کا گھر لگتا ہے۔“

”تو پھر آپ خرید لیں۔“

”لیکن اگر عاشقی کو پسند نہیں آیا تو.....“

”آپ کو عاشقی کی پسند کا بہت خیال ہے۔“

”ہوں۔“ ان کے چہرے پر رنگ کھڑ گئے ”ظاہر ہے اس گھر میں اسے رہنا ہے۔ میں اس گھر کو عاشقی کی پسند سے خریدنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر ماما آجائیں گی تو ان سے بات کر کے اسی ویک اینڈ پر انہیں لے آئیے گے۔ یوں بھی مور بہت اداس ہو رہا تھا..... رات میری بات ہوئی تھی۔“

”میرا جی چاہتا ہے مریم کو وہ گھر خریدنے کے بعد میں اس کا ایک ایک کمر ایک ایک کمر عاشقی کی پسند سے ڈیکوریٹ کروں۔“

”لیکن ابھی اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں ہے۔“ مریم نے منہ کی طرف دیکھا جو چائے لائی تھی اور پھر ٹرائی اپنی طرف مھینٹ لی۔

”بچے معید بھائی کچھ اسٹیکس لے لیں۔“ اس نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

”نہیں مریم صرف چائے بنا دیں۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کھانا کھایا ہے۔ یہاں آکر میری خوراک بڑھ گئی ہے۔ اب ڈائنٹ کا خیال رکھنا پڑے گا۔“ وہ ہنسا۔

”کیوں خوراک کیوں بڑھ گئی ہے۔“

”بھئی منواتے مزے کے کھانے بنائی ہیں اور شریف کے پھلکے تو مجھے بہت ہی پسند ہیں اور ہمارے پہلے میں غلے طرح پے انک گیسٹ بننے کی مخالفت کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کھانا حسب معمول ہمارا لگ

بنائے گا لیکن پھر یہ محض اتفاق ہے کہ وہ چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ انکل ہادی بھی کہہ رہے تھے کہ اب فضل خان کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں آئے گا۔“

”یعنی کی ماں جی منو سے بھی اچھا کھانا بناتی ہیں۔ بہت ذائقہ ہے ان کے ہاتھ میں۔“ مریم نے بتایا۔

”آپ کو بھی کچھ دلچسپی ہے کوئی گھر وغیرہ سے۔“

”کوئی خاص نہیں اب پڑھائی سے فارغ ہو کر عینی کی ماں جی سے کھانا بنانا سیکھوں گی۔“

”اور عاشقی کو۔“

”اسے تو بالکل بھی نہیں۔ شاید چائے بنانی بھی نہیں آتی اسے۔“ مریم ہنسی۔

”اچھا خیر مجبوری ہے۔“ عبدالمعید بھی مسکرایا ”ویسے مجھے تھوڑی بہت کوئی گھر آتی ہے۔“

”رہتی۔“

”ہوں کسی دن آپ کو پلاؤ بنا کر کھلاؤں گا۔ منو سے اچھا بناتا ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی۔ تب ہی فون کی بیل ہوئی۔ اس نے اٹھ کر اٹینڈ کیا لیکن آواز بہت مدھم تھی۔

”ہیلو ہیلو۔“ اس نے کریڈل پر ہاتھ مارا لیکن ڈس کنکٹ ہو گیا۔

”کٹ گیا ہے شاید ماما کا تھا۔“ واپس آتے ہوئے اس نے عبدالمعید کو بتایا۔

”وہ عادل میاں کا بھی فون آیا تھا حویلی سے۔“ منو نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔

”اچھا کیا کہہ رہے تھے۔ عاشقی اور مور وغیرہ کے متعلق پوچھا ہوگا۔“

”نہیں جی آپ کا پوچھا تھا۔ دوبار فون آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ شاید آپ یونیورسٹی سے ہی کسی سہیلی کی طرف چلی گئی ہوں گئی۔“

”اچھا۔“ اسے ذرا سی حیرت ہوئی۔

عادل سے تو اس کی بہت کم بات ہوتی ہے۔ خود بخود ہی ان کے درمیان ایک جھجک ایک فاصلہ سایہ یا ہو گیا تھا اور اب تو کافی عرصے سے اس کی عادل سے بات نہیں ہوئی تھی۔ دو تین بار عادل آئے بھی تو وہ یا تو یونیورسٹی گئی ہوئی تھی یا آرام کر رہی تھی اور عادل عاشقی وغیرہ سے مل کر چلے گئے تھے۔ عاشقی نینا اور مور

عادل کا اتنا ذکر کرتے تھے کہ وہ ایک ہلکا غبار سا جو تھا جو عادل کے متعلق اس کے دل میں وہ ختم ہو گیا تھا اور پھر شہر یا ریکی انہیں بہت ایڈماز کرتا تھا تو شاید اسے ہی کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

”دراصل اس میں قصور بھی میڈم نرس کا ہے۔“ اس نے سوچا خواجہ خواجہ ہی ان کی کبھی ہوئی فضول باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی ذہن کے اندر ہی کہیں بیٹھ جاتی تھیں۔

اور اب کے عادل بھائی آئے تو وہ ان سے اچھی طرح ملے گی۔ اس نے سوچ کر کھاتھا۔

عاشقی نے بھی تو کہا تھا۔

”بھو آپ بھی ماما کی طرح عادل بھائی کو پسند کرتی ہیں۔“

”نہیں..... نہیں تو عاشقی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ یوں ہی جھجک ہوتی ہے۔“ اس نے وضاحت کی تھی۔

”وہ ہمارے بھائی ہیں۔ بڑے چاہے سوتیلے ہی سہی مگر انہیں ہمارا خیال ہے..... اور ہمارے ساتھ

مخلص ہیں بلکہ محبت کرتے ہیں ہم سے۔“

عاشی کا مشاہدہ شاید اس سے بہتر ہو گیا تھا حالانکہ وہ اس سے بہت چھوٹی تھی۔

”میرا خیال ہے اب میں چلوں۔ کچھ دیر ڈیڈی سے کپ لگاؤں گا پھر آرام کروں گا۔“ ڈاکٹر عبدالمعید اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوکے۔“ اس نے بھی پاس پڑی کالج فائل اٹھائی اور صوفو کو آواز دی۔

”صوفو اگر میں سوئی تو مجھے رات کے کھانے کے لیے مت جگانا۔“

”اور اگر کوئی فون آجائے تو.....“ صوفو ہاتھ پونچھتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔

”تب بھی نہیں۔ بہت نیند آرہی ہے مجھے۔ ہاں کوئی خاص بات ہو تب ہی مجھے جگانا۔“

”ٹھیک ہے جی۔“

اور وہ معید کو خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی آئی جبکہ عبدالمعید اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ جولاؤنج سے ہی اوپر کی طرف جاتی تھیں۔



”اور خدا جانے کب ماما جاگئیں گی۔“ مریم نے ٹی وی آن کرتے ہوئے سوچا۔

رات ہی وہ آئیں تھیں اور ابھی تک آرام کر رہی تھی کتنا جی چاہ رہا تھا اس کا ان سے باتیں کرنے کو۔

تقریباً پچیس دن بعد آئی تھیں اور وہ ان کے لیے بے حد اداس ہو رہی تھی اس لیے وہ یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی

کہ ماما سے بہت ساری باتیں کرے گی۔ تیورنیزنا اور عاشی بھی کتنے دنوں سے نہیں آئے تھے۔ وہ ماما کے

ساتھ ان سے ملنے جائے گی۔ کل ہی تو اس نے تیور سے بات کی تھی۔ وہ بے حد اداس ہو رہا تھا اور خفا بھی۔

”آپ سے اچھے تو عادل بھائی ہیں جو ملنے آجاتے ہیں۔ میں ماما سے اور آپ سے بہت ناراض

ہوں؟“

اور اس نے تیور سے وعدہ کیا تھا کہ ماما آجائیں تو وہ اس سے ملنے آئے گی لیکن اب ماما آئی تھیں تو

جانے کتنے دنوں کے لیے۔ رات وہ بغیر اطلاع کے اچانک ہی آگئی تھیں..... غضنفر ان کے ساتھ تھے اور

ماما کس قدر خوش اور فریض لگ رہی تھیں اور اصرار کر کے انہوں نے اسے کھانے پر روک لیا تھا اور جتنی دیر

وہ وہاں رہا تھا انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بس سرسری سا ہیلو ہائے ہوا تھا۔ اسی لیے تو وہ

آج یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔

اور شہریار بھی کس قدر بے چین ہو رہا تھا۔ صبح شام فون کر کے ماما کے متعلق پوچھتا۔

”اف او..... موموک آپ انہیں کی تمہاری ماما۔“

”آجائیں گی اتنی جلدی کیا ہے۔“ وہ شوخ ہو جاتی۔ پتا نہیں کیوں شہریار سے بات کرتے ہوئے

اسے لگتا تھا جیسے دنیا میں کوئی غم کوئی دکھ نہیں۔ صرف خوشیاں ہیں سر میں ہیں اور بس۔ ایک دم ہلکی پھلکی

ہو جاتی تھی وہ۔

”ہے نا جلدی۔“ شہریار کو بھی اس سے ہلکی پھلکی باتیں کر کے مزہ آتا تھا۔

”ایک پیاری سی خوب صورت سی لڑکی کو اپنے نام کرنے کی جلدی۔“

”کیوں؟ کیا لڑکی پر اعتبار نہیں ہے۔“

”اعتبار اس سے بڑھ کر ہے لیکن ملکیت کا نشہ ہی اور ہوتا ہے..... اب دیکھو نا۔ ہم ترستے رہتے ہیں

ہفتوں مہینوں کہ کب محترمہ..... گھر آئیں اور ان کو ایک نظر دیکھ سکیں..... اور پھر.....“

”پھر کیا میں روز چکر لگایا کروں گی۔ منہ دھو رکھیے۔ مجھے اپنی اسٹڈی بھی کرنا ہے۔ بہت

پڑھنا ہے مجھے۔“

”تو جناب پھر ہم آیا کریں گے۔ جب جس وقت جی چاہے گا دھڑلے سے۔ ایک استحقاق کے

ساتھ ایک مان کے ساتھ۔“

اور شہریار کے خیال سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

اور شہریار کس قدر اور کتنی شدت سے محبت کرنے لگا تھا اور وہ خود..... اسے لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے

شہریار کو جانتی ہو..... اگر اسے شہریار کے بجائے کسی اور کی رفاقت میں زندگی کا سفر کرنا پڑا تو اس خیال

سے ہی اس کا دل بند ہونے لگتا تھا۔

”یہ آپ ہی آپ کیوں مسکرایا جا رہا ہے مریم۔“ عبدالمعید کلینک جانے کے لیے نیچے اترے تو وہ مریم

کو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”کبھی کبھی یوں ہی۔“ اس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے عبدالمعید نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ لگتا ہے

مریم جیسے آپ نے اپنے اندر کوئی بہت خوب صورت دنیا بار کھی ہے اور کبھی لگتا ہے جیسے اندر گھمسان

کارن پڑا ہوا ہے۔“

”اوہ۔“ وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہو گئی۔

”اور یہ بات صحیح نہیں ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

میرے چہرے سے میرے اندر کی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس دن شہریار بھی تو کہہ رہا تھا کہ تمہارا

چہرہ تمہارے دل کا آئینہ ہے۔

”خاموش کیوں ہو گئیں مریم۔“ عبدالمعید مسکرائے ”میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی ہے۔“

”میں دراصل آپ کی بات پر غور کر رہی تھی کہ کیا واقعی ایسا ہے۔“

”ایک بات کہوں مریم جو لوگ اپنے اندر ایک دنیا بسا لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس دنیا میں کسی کو شریک نہیں کرتے وہ زندگی میں کبھی کسی نہ کسی مقام پر تنہا رہ جاتے ہیں۔ میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ مجھے اپنا بھائی سمجھیں..... اور زندگی میں کوئی بھی مسئلہ ہو۔ کوئی بات ہو بلا تکلف مجھ سے کہیں۔ جس طرح کوئی بہن اپنے بھائی سے کہہ سکتی ہے۔“

”جھینک یو معید بھائی۔“ مریم نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔

عاشی کے حوالے سے ڈاکٹر عبد المعید اسے بہت عزیز ہو گئے تھے اور خاص طور سے جب اسے والدین والے پورشن میں آئے تھے اس پر ان کی ذات کی بہت سی خوبیوں کا انکشاف ہوا تھا۔ کس قدر بردبار، سنجیدہ، مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ پھر انکل ہاشم، انکل ہادی سب ہی کتنے شفیق تھے اور ماما کی عدم موجودگی میں کس قدر خیال رکھا تھا ان سب نے..... چھوٹی چھوٹی باتوں کا۔

یونیورسٹی سے دیر ہو جاتی تو انکل ہاشم اور معید کس قدر پریشان ہو جاتے تھے۔

”ہمارا گھر مدتوں سے عورت کے وجود سے محروم ہے۔ معید چھوٹا سا تھا تب سے۔ میری کتنی شدید خواہش تھی کہ میں عبد المعید کی جلد شادی کر دوں گا۔ گھر میں اس کی بیوی آئے گی..... اس کے بچے ہوں گے رونق ہوگی۔ گھر گھر لگنے لگے گا۔ عورت کے بغیر گھر گھر نہیں مکان ہوتا ہے۔“ انکل ہاشم نے ایک روز کہا تھا۔ اس روز ان کی طبیعت خراب تھی اور وہ بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھی رہی تھی۔

”پہلے تو معید مانا ہی نہیں تھا اور اب مانا ہے تو تمہاری ماما کہتی ہیں کہ شادی کم از کم تین چار سال سے پہلے نہیں ہو سکتی..... کہتی تو وہ بھی ٹھیک ہیں، عاشی ابھی..... چھوٹی ہے لیکن پتا نہیں میں تب تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔“

”نہیں انکل آپ بہت سارے سال زندہ رہیں گے۔“ اس نے انہیں حوصلہ دیا۔

”ہارٹ پیسٹ کا کیا پتا کب.....“

”پھر وہی تکلف۔“ ڈاکٹر عبد المعید اسے دیکھ رہے تھے ”خیر اب تو معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ یہ تکلفانہ گفتگو ہوئی نا مجھ سے تو پھر لڑائی ہو جائے گی۔“

”اوکے۔“ وہ دلکشی سے مسکرائی ”رات ماما آگئی ہیں۔“

”جی خبر ہے ہمیں۔ شریف نے بتایا تھا۔ اس وقت تو آرام کر رہی ہوں گی۔“

”جی۔“

”اوکے۔ پھر انشاء اللہ واپسی پر ملاقات ہوگی۔“

”انکل ہادی کیا آج اسپتال نہیں جائیں گے۔“

”وہ تو رات کو آئے ہی نہیں تھے۔ اسپتال ہی میں رہے تھے۔“

”خیریت، کوئی ایرضی تھی۔“

”نہیں۔ وہ تو اکثر وہاں ہی رہ جاتے ہیں۔ انہوں نے تو خود کو بھی ڈونیٹ کر دیا ہے اپنے مریضوں کو۔“

”ایسے ہی چند لوگ ہیں دنیا میں جن سے انسانیت موجود ہے۔“ مریم نے عقیدت سے کہا اور ڈاکٹر عبد المعید خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

”صفو! ٹی وی آف کرتے ہوئے اس نے صفو کو آواز دی ”میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو“

”پلیز۔“ اور خود اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ تب ہی مین گیٹ پر تیل ہوئی۔

”اس وقت کون ہوگا بھلا۔“ اس نے اخبار سامنے رکھے رکھے سوچا۔ شاید مالی ہوگا یا پھر کپڑے

دھونے والی یا شریف اور صفو کا کوئی رشتہ دار۔ وہ اخبار دیکھنے لگی۔ صفو نے اندرونی گیٹ کھولا۔

”آئیے جی..... جی۔“

اسے صفو کی آواز سنائی دی لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

”آئیے جی! ادھر ڈرائنگ روم میں۔“

”نہیں ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ تم اندر اطلاع کر دو ہمارے آنے کی۔“

یہ..... یہ عادل کی آواز تھی۔ مریم نے چونک کر اخبار رکھ دیا۔

”عادل بھائی اس وقت..... وہ تو عاشی وغیرہ کے آنے پر ہی آتے تھے اور آج..... کیا ماما سے ملنے

آئے ہیں..... جبکہ ماما کا رو بہ تو کبھی بھی ان کے ساتھ مناسب نہیں رہا اور نہ ہی وہ ان کی آمد پسند کرتی ہیں۔

صرف عاشی اور تیمور کی ناراضی کے خیال سے وہ انہیں منع نہیں کرتیں ورنہ کب کا یہاں آنے سے منع کر چکی

ہوتیں۔

”مریم بی بی وہ آئے ہیں۔“ صفو نے آکر بتایا ”اور ان کے ساتھ دو عورتیں بھی ہیں۔“

”عورتیں۔“ وہ کمڑی ہو گئی ”کون ہو سکتا ہے بھلا۔“

وہ صفو کے ساتھ سنگ روم میں آئی اور ماں جی اور بی بی آپا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”آپ بڑی امی یہاں؟“ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ..... آپ

یہاں آئیں گی۔“ ان سے الگ ہو کر بی آپا سے گلے ملتے ہوئے اس نے کہا تو بی آپا مسکرا دیں۔

”کیوں کیا ہم یہاں نہیں آ سکتے تھے۔“

”کیوں نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن آپ کیسے اچانک۔“

”بس جی چاہا۔“ ماں جی نے محبت سے اسے دیکھا۔

”ہم لوگ کل..... لاہور آئے تھے اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ تم سے ملے بغیر چلے جاتے۔“ بی آپا نے

وضاحت کی۔

”اوکے۔“

”سوری ماما۔ میں آپ کو بتانے آئی تھی کہ مہمان آئے ہیں۔ وہ..... عادل بھائی اور ان کی امی..... اور بی بی آپا.....“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں ماما کو ان کی آمد ناگوار نہ گزری ہو لیکن ان کے چہرے پر کوئی ناگوار تاثر نہ تھا۔ ساٹ ساچرہ تھا۔

”ہاں عادل نے فون کیا تھا کراچی جانے سے پہلے کہ اس کی والدہ آنا چاہتی ہیں اور میں نے کہا تھا کہ میں کراچی سے آجاؤں تو آجائے گا۔“

”اوہ.....“ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

گویا بڑی امی ماما کی اجازت سے آئی ہیں۔ عادل بھائی واقعی سمجھ دار ہیں۔ اگر بڑی امی یوں ہی آجائیں بغیر اجازت کے تو شاید ماما ان کے ساتھ صحیح طرح بی بیوند کرتیں۔ گویا پاپائیں رہے تھے پھر بھی ایک عورت کے لیے یہ کس قدر مشکل کام ہے اپنے شوہر کی دوسری بیوی کو خوش آمدید کہنا اور ماما ہرگز بڑی امی جیسی فراخ دل نہیں تھیں اور بڑی امی۔ بڑی امی کتنی اچھی ہیں..... کتنی شفیق اور مہربان..... اور انہوں نے کبھی انھیں یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ان کے اپنے سگے بچے نہیں ہیں۔

”مومو! انہیں انٹرٹین کرو۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

ماما پھر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں..... خود کو دیکھنے لگیں تو وہ باہر آگئی اور مضمون کو بہت اچھی سی چائے لانے کا کہہ کر وہ بڑی امی کے پاس آکر بیٹھ گئی اور ہولے ہولے باتیں کرنے لگی۔ پروفیسر عادل اخبار دیکھ رہے تھے لیکن ان کا پورا دھیان مریم کی طرف تھا۔

اور نذیب عثمان احمد کے تیار ہو کر آنے سے پہلے ہی میڈم زگس آگئیں۔ ہمیشہ کی طرح باہر ہی سے شور کرتی ہوئی آئیں۔ رائل بلو تینتی ساڑھی کے ساتھ حسب معمول تیز سرخ لپ اسٹک میں اتھڑے ہونٹ، نیلم کا خوب صورت سیٹ وہ بہت چمک رہی تھیں۔

”آپا! آج تو بڑے لوگ آئے ہیں۔“ وہ بڑے تپاک سے بڑی امی اور بی بی آپا سے ملیں اور عادل کو ہراہا۔

”بڑے بچے رہے ہو عادل خان۔“

”میڈم آپ کے سامنے کون بیچ سکتا ہے۔“ پروفیسر عادل نے اخبار ساؤنڈ ٹیبل پر رکھا۔

”یعنی آپ بھی بناتے ہیں۔“ انہوں نے شربانے کی ایکٹنگ کی اور بیٹھتے ہوئے بولیں ”اب تو بس کھنڈر ہی ہے۔ کبھی واقعی ہمارے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا..... اور اب تو یہ آج کل کی چھو کر یاں انگلی انگلی جتنی بے سری میرے مقابل آ رہی ہیں۔“ میڈم زگس کو تو موقع چاہیے ہوتا تھا اپنی تعریف کرنے کا۔ مریم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں دیکھوں یہ مضمون بھی تک چائے نہیں لائی۔“

”تھینک یو بی بی آپا، تھینک یو۔ بہت خوشی ہو رہی ہے آپ کو یہاں دیکھ کر..... بچی میں بھی آپ سب کو بہت یاد کرتی ہوں۔ کامی کیا ہے اور حرم تو تھینک ہیں نا۔“

”سب اچھے ہیں۔“

”اچھا آپ لوگ بیٹھیں۔ میں ماما کو اطلاع کرتی ہوں۔ دراصل مامرات ہی کراچی سے آئی ہیں تو..... کچھ تھکی ہوئی تھیں اس لیے ابھی تک سو رہی تھیں۔“

کھڑے ہوتے ہوئے اس کی نظر عادل پر پڑی۔ بی بی آپا اور بڑی امی کو دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ عادل کو سلام تک نہ کیا تھا۔

”السلام علیکم عادل بھائی۔ کیسے ہیں آپ؟“

”اچھا ہوں۔“ عادل نے نگاہیں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں اپنے آپ سے اپنے جذبوں کی شدت سے خوف آتا تھا۔ نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں تو پھر ہٹا بھول جاتی تھیں اور وہ بدگمان ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کی نگاہوں میں واضح بدگمانی دیکھی تھی۔

”آپ کیسی ہیں؟“

”فائن۔“

”میں مری گیا تھا۔ لاسٹ ویک اینڈ پر۔ مور آپ کو بہت مس کر رہا تھا اور بہت خفا تھا آپ سے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کو تیاروں کہہ کر وہ آپ سے بہت ناراض ہے۔“ نگاہیں بدستور جھکی تھیں۔

”اور آپ نے بتایا تو نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”ہاں بس فون نہیں کر سکا۔“

پروفیسر عادل کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی کوئی بات کرے گی۔ سو وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔

”کوئی بات نہیں۔ ویسے میری مور سے بات ہوئی تھی اور اب ماما آگئی ہیں تو ہم جائیں گے اس سے ملنے۔“ بات مکمل کر کے وہ ماما کو چگانے چلی گئی۔

ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر گئی۔ ماما ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھیں۔

”ماما..... وہ۔“

”تم مومو! تم آج یونیورسٹی نہیں گئیں۔“ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”وہ دراصل میں آپ کے لیے بہت اداس ہو رہی تھی اور میں آج کا دن آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔“

”بالکل بچی ہو تم مومو۔“ ان کے چہرے پر نرم سا تاثر پھیل گیا ”کب بڑی ہوگی تم؟“

”ماما۔“ اس نے ایک دم آگے بڑھ کر ان کے رخسار چوم لیے ”آئی لوو ماما۔“

سوپ وغیرہ بنا لے۔

”بیٹا زبردست کرنا۔“ بڑی امی نے اسے منع کیا۔

”آپ کون سا روز روز آتی ہیں۔ پہلی بار آئی ہیں اور پھر.....“

ماما کا انداز گفتگو مختلف تھا..... مریم نے جاتے جاتے سوچا۔

یہ ماما..... اور واقعی ماما کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ پاپا سمجھ کہا کرتے تھے کہ زینی کے موڈ کا کچھ پتا نہیں ہوتا..... ماما کس قدر حلیمی سے بات کر رہی تھیں بڑی امی اور بی آپا سے اور وہ خواہ مخواہ ہی ذرا سی محک جاتے ماما بڑی امی وغیرہ سے کس طرح پیش آئیں گی۔

”اب تو انشاء اللہ آتے رہیں گے بشرطیکہ.....“

بی آپا کی آواز بچن میں جاتے ہوئے اس کے کانوں میں بڑی اور وہ سر جھٹک کر بچن میں چلی گئی اور شریف کو ایک بار پھر سے بتانے لگی کہ پلاؤ بنا لو۔ سوپ بھی بنالینا اور کباب اگر تیار ہیں فریزر میں پڑے ہوئے تو قتل لینا..... کچھ باہر سے لے آنا۔ ان لوگوں نے جلدی واپس جانا ہے۔ کھانا بہت اچھا ہونا چاہیے ماما نے کہا ہے۔ بہترین.....

”یہ صاحب کی بڑی بیگم ہے ناجی.....“ شریف کو باتیں کرنے کی بہت عادت تھی۔

”ہوں۔“ مریم اس کی باتوں کا جواب بھی دے رہی تھی اور فرخ میں دیکھ رہی تھی کہ کیا کیا ہے۔

”بیٹھے میں کیا بناؤں گے شریف۔“

”کچھ بھی بنا لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں جی۔ جائیں مہمانوں کے پاس بیٹھیں۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔“

”اچھا۔“

وہ بچن سے باہر آ کر لاؤنج میں بیٹھی رہی۔ میڈم زمر کے قبیلوں کی آوازیں وہاں تک آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی ماما کی آواز بھی آتی یعنی سب بہت خوشگوار ماحول میں بات کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی میگزین دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر ان کی طرف آگئی۔



اور آج کا دن کس قدر خوش گوار اور خوش کن تھا۔ مریم نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے سوچا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے اور وہ بے حد تھکن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ کچھ دیر آرام کر لے اور پھر فریش ہو کر اسٹڈی کر لے گی۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے میڈم زمر اور ماما کہیں گئی تھیں۔ آج کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ پروفیسر عادل بھی کھانے تک آگئے تھے اور ماما کا اتنا اچھا رویہ اسے بے حد حیران کر رہا تھا لیکن وہ خوش تھی اور میڈم زمر.....

”یہ زینی کیا ابھی تک بستر میں ہے۔“ بات کرتے کرتے میڈم زمر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ”اسے ذرا جگا دینا جانو۔“

”میں حاضر ہو گئی ہوں۔“ زینب عثمان ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

”آج تو تمہارے زینب ولا کی قسمت جاگ گئی ہے بھئی۔ دیکھو کون کون یہاں موجود ہے۔“

”میڈم کا اشارہ غالباً اپنی طرف ہے۔“

عادل نے آہستگی سے کہا لیکن مریم نے سن لیا اور جاتے جاتے مسکرا کر عادل کی طرف دیکھا اور عین اسی وقت عادل کی نظریں اس کی طرف انھیں اور اس کی مسکراہٹ نے جیسے ان کے آس پاس اندر باہر پھول ہی پھول کھلا دیے اور وہ جوتی دیر سے بہت بے چین اور مضطرب ہو رہے تھے مطمئن سے ہو کر بیٹھ گئے۔

صفو کے ہاتھ چائے بھجوا کر وہ شریف کو دن کے کھانے کی ہدایت دے کر آئی تو پروفیسر عادل جاچکے تھے..... البتہ بڑی امی اور بی آپا تھیں اور ماما ان سے بہت شائستگی سے مسکرا کر بات کر رہی تھیں۔

اور یہ کس قدر حیران کن تھا اس کے لیے۔

یقیناً پاپا کے بعد ماما میں کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں کہی تبدیلی ضرور آئی ہے۔ ورنہ ماما سے اسے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ وہ بڑی امی سے اس طرح پیش آئیں گی۔

”عادل بھائی چلے گئے کیا؟“ بی آپا کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں اسے جانا تھا کچھ دیر بعد ہمیں لینے آئے گا۔“

”کچھ دیر بعد کیا مطلب؟ آپ آج ادھر ہی رہیں گی شام تک۔“

”نہیں بیٹا۔“ بڑی امی کا لہجہ اسے ہمیشہ کی طرح بہت شفیق اور مہربان لگا ”وہاں کامی اکیلا ہے۔ کل سے ہم لوگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ کچھ دیر مجھے نہ دیکھے تو تنگ کرتا ہے۔ بے چارہ..... وہ بھی کیا کرے۔

پریشان کر کے رکھ دیتا ہے..... چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا ہے۔“

”تو آپ آج ہی حویلی چلی جائیں گی۔“ مریم نے اداسی سے پوچھا۔ ابھی تو میں نے بی آپا سے جی بھر کے باتیں بھی نہیں کی۔ بس آپ لوگ کھانا کھا کر جانا۔“

”کیوں نہیں کھانا کھائے بغیر ان کو کون جانے دے گا؟“ میڈم زمر نے جواب دیا۔

”ہاں مومنم جاؤ۔ زمر شریف کو سمجھا دو سب کچھ کھانے کے متعلق اسے کہنا کھانا ذرا جلدی تیار کرے۔“

”جی اچھا۔“ مریم اٹھ کھڑی ہوئی۔

پتا نہیں کیوں ماما چاہتی ہیں وہ یہاں نہ بیٹھے۔ ورنہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ شریف کو بس بتا دیا جاتا تھا کہ اتنے مہمان ہیں۔ یہ یہ بنا لو..... وہ اور مفرد دونوں ایک پیرٹ تھے۔ تا کبھی ماما بچن میں گئی تھیں اور نہ ہی وہ۔ ہاں جب پاپا بیمار تھے تو کبھی کبھار بچن میں چلی جاتی تھی تاکہ ان کے لیے اپنے ہاتھ سے

وہ کتنی خوش تھیں۔ جب سب چلے گئے تھے تو انہوں نے کس طرح مردوں کے انداز میں لالہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”زنی! کچھ مت سوچو یا۔۔۔ اتنی دولت، اتنی جائیداد اور پھر لڑکا بھی۔۔۔ کچی زنی! لڑکیوں کے معاملے میں تم کی ہو۔ مجھے دیکھو۔ لالہ کم بخت کو پسند بھی آیا تو ٹٹ پونجیا اعزاز۔“

”ہاں کبھی تو تم ٹھیک ہو لیکن۔۔۔ بہر حال دیکھا جائے گا۔“

اور خدا جانے آئی نرس کس کی بات کر رہی تھیں۔ شاید معید بھائی کے متعلق بات ہو رہی تھی۔

”کیا آپ کراچی میں لالہ سے ملی تھیں آئی؟“ اسے اچانک خیال آ گیا تھا اور وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی تھی۔

”لالہ۔۔۔“ ان کے چہرے کا رنگ لمحہ بھر کو بدل گیا تھا اور ہنسنے ہوئے ہونٹ بھیجنے لگے تھے۔ ”ہاں ملی تھی۔ ملی تھی اس بے وقاف سے۔ خون میں بے وقافی ہے اس کے۔ پہلے تین دن جاتی رہی تو دروازے سے ہی لوٹا دیا۔ جو تھے دن جب میں نے سنائیں تو پھر انہوں نے اس سے ملوایا۔ بس کھڑی کھڑی آئی۔“

”بیٹو کیسی ہیں می۔۔۔ رسی سا پوچھ کر بیٹھ گئی۔۔۔ گلے بھی نہیں ملی۔۔۔“ ان کی آواز رعد لگی۔

”وہ۔۔۔ وہ خوش تھی وہاں کیا۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

”خوش۔۔۔ نہیں بالکل بھی نہیں آنکھیں بھیجی ہوئی، چہرہ پیکا تھا۔ مگر پھر بھی کہہ رہی تھی میں خوش ہوں۔۔۔ میں نے منت کی، چلو میرے ساتھ۔۔۔ میں تمہاری شادی کروں گی اعزاز سے لیکن انکار کر دیا اس نے میرے ساتھ آنے سے۔“

ان کی پلکیں نم ہو گئیں ”بے وقاف ہے اپنے باپ کی طرح۔ کہہ دیا ہے میں نے اعزاز سے۔“

”اعزاز۔۔۔ اعزاز ملتا ہے آپ سے۔۔۔؟“ مریم کو از حد حیرت ہوئی۔ وہ تو اعزاز کا اپنے گھر آنا بھی پسند نہ کرتی تھیں۔

”ہاں آتا ہے کبھی کبھی بھائی سے ملنے تو ہم دونوں لالہ کی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ اچھا لڑکا ہے۔ اتنا برا نہیں ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے زہب عثمان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اور وہ حیران کی اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے لالہ کے متعلق سوچنے لگی۔

”وہ آخر ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ آئی نرس کے ساتھ واپس کیوں نہیں آئی۔۔۔ اور اعزاز۔۔۔ اعزاز سے بھی نہیں ملتی۔۔۔ اب تو آئی مان بھی گئی ہیں اعزاز سے اس کی شادی کے لیے پھر بھی۔۔۔ ضرور وہ آئی کو ستا رہی ہے اور ایک دن ہنستی ہوئی آجائے گی لیکن آئی نرس سے اس نے کیسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے لیے قطعاً پریشان نہ ہوں۔ وہ اپنے باپ کے گھر ہے اور آئی نرس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ کیسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہی ہے، بچپن سے لے کر اب تک۔ یقیناً اب بھی اس نے

ایسا ہی لیے کیا ہے۔۔۔ اور آئی کہہ رہی تھیں۔۔۔ ایک بار۔۔۔ ایک بار بھی اس نے ٹکاہ اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا اس لڑکے ہیں جھکاٹے قالین کو دیکھتی رہی۔

فون کی بتل ہو رہی تھی مسلسل۔ منو اور شریف جانے کہاں تھے لیکن وہ لیٹی رہی۔ اٹھنے کا قطعی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ جب شاید منو نے کہیں سے براہ ہو کر فون ریسو کیا اور کارڈ لیس لے لے اس کے کمرے میں آ گئی۔

”آپ کا فون ہے جی۔۔۔ یعنی بی بی کا۔۔۔“

”اچھا۔۔۔“ اس نے لیٹے لیٹے کارڈ لیس لے لیا۔

”پہلو۔“

”کہاں تھیں۔۔۔ خیریت تھی یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟“

”خیریت تھی۔ رات می آگئی ہیں تاکہ می سے اس وجہ سے۔“

”می آگئی ہیں۔“ یعنی نے بے حد خوشی کا اظہار کیا ”تھیک گاڑ۔ بے چارے شیری بھائی صبح شام تھیں ہزار ہے تھے کہ وہ جلد از جلد آجائیں تاکہ۔۔۔“

اس کے رخسار تھماٹھے۔

”چلو اچھا ہوا می آگئیں باا اور اماں کل ہی آئیں گے اور فوراً اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”اور کچھ نہیں۔“ وہ خواہواؤں دی۔

”مریم تمہیں یقین ہے کہ تمہاری می شیری بھائی کا ہر پوزل منظور کر لیں گی۔“ یعنی سنجیدہ ہو گئی۔

”ہاں یقین تو ہے۔“ اس نے اعتماد سے کہا ”می کوئی دقیقہ عورت نہیں ہیں۔ بہت براڈ اسٹنڈ ہیں اور وہ میری مرضی کے بغیر میری زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں کریں گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو مومنو۔ ورنہ میرا بھائی تو بے موت مر جائے گا۔۔۔ ان دنوں اس کی جو بے چہنگامی میں نے دیکھی اور محسوس کی ہیں ان سے میرا دل ڈر گیا ہے گنا گر خدا نہ کرے۔۔۔“

”نہیں۔۔۔“ مریم کا دل لمحہ بھر کو کانپ سا گیا۔ شہریار کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی رفاقت کا خیال ہی مارڈالنے کو کافی تھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے دوبارہ بہت یقین سے کہا۔

”اوکے۔ پھر کل ملاقات ہوگی۔ ویسے یونیورسٹی آ رہی ہو کل یا۔۔۔؟“

”ہاں کل آؤں گی۔۔۔ بائے۔“ اس نے آف کر کے کارڈ لیس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

”اور لالہ اگر یہاں ہوتی تو شیری اور میرے متعلق جان کر کس قدر خوش اور حیران ہوتی۔“

”اور تم کس قدر کھنی ہو جرتک نہیں ہونے دی اپنے دل کی۔“ وہ ضرور کہتی۔

”اوکے..... لیکن زینبی تمہارے جیسی بیکریڑی کہاں ملے گی۔“

”دھوہنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“ وہ ہنسیں۔

”سنو زینبی، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کرم داد لان کے ایڈ کے لیے تم مریم کو رضامند کر لو۔“

”اوہ نو..... ایک تو اسے یہ سب پسند نہیں ہے۔ دوسرے ابھی اس کے ایگزام ہونے والے

ہیں اس کے پاس کہاں وقت ہوگا۔“

”تم کہو تو اسے زینبی۔“

”نہیں شچی پلیز..... اس کار جان نہیں ہے اس کی طرف۔ تم کسی اور کو دیکھو نو..... تمہارے پاس تو اتنی

اچھی اچھی ماڈلز آرہی ہیں کیا نام ہے وہ فنی لڑکی زارا۔“

”زینبی.....“ شرجیل مرزا کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ مریم چونک گئی۔

”زینبی میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مریم کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ کیا کوئی اور دیکھ لیا ہے؟“

”فضول باتیں مت کرو شچی۔ وہ خود تم سے دور رہتی ہے۔ پسند نہیں کرتی تمہیں۔“

”مگر زینبی تمہیں یاد ہوگا۔ تم نے خود مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے خیال میں مریم اور میں ایک دوسرے

لے بے مناسب رہیں گے۔“

”ہاں میرا خیال تھا کہ وہ ڈرپوک اور بزدل لڑکی ہے۔ اس کے لیے تمہاری عمر کا مرد مناسب رہے

گا لیکن عثمان نے اسی وقت مخالفت کی تھی اس شادی کی اور پھر..... اگر مریم تمہیں پسند کرتی تو مجھے بھلا کیا

اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر وہ.....“

”اور اگر وہ مجھے پسند کرنے لگے تو.....؟“

”تو تم سے زیادہ مجھے بھلا کون عزیز ہو سکتا ہے۔“

”اوکے..... تو پھر میں اس دن کا انتظار کروں گا جب وہ مجھے پسند کرنے لگے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ

وہ مجھے پسند کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔“ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”ارے۔ ارے بیٹھو نا شچی..... کھانا کھا کر جانا.....“

”نہیں..... کھانا پھر کبھی سہی۔ جانے سے پہلے لوگی تو سہی نا۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ بلکہ میں صبح آفس آؤں گی۔“

نائب بھی کھڑی ہو گئیں اور اسے سی آف کرنے کے لیے اس کے ساتھ ٹی وی لائونج سے باہر نکل

گئیں۔ مریم نے اٹھ کر لائٹ جلائی اس کے ذہن میں شرجیل مرزا کی بات نے الجھاؤ پیدا کر دیا تھا۔

”کیا کرے گا شرجیل مرزا۔“

”آخر اس نے کیا سوچا ہوا ہے۔“

لیکن خود اسے کب خبر تھی اپنے دل کی۔ یہ انکشاف تو اچانک ہی ہوا تھا کہ وہ شہریار کو پسند کرنے لگی ہے اور پھر اس انکشاف سے وہ کتنے ہی دن بولا بولا کی پھرتی رہی تھی اور اگر لالہ یہاں ہوتی تو سر سے پہلے لالہ ہی کو بتاتی۔

اور وہ لالہ کے متعلق سوچتے سوچتے سو گئی اور جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر روشنیاں جل رہی تھیں اور ٹی وی لائونج سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔

تو ماما واپس آ گئی ہیں وہ اٹھ بیٹھی..... لیکن ماما کے ساتھ کون ہے۔ اس نے ذرا سادہ رازہ بھولا۔

”زینبی میں اتنے دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا اور اب تم آئی ہو تو اتنی جلدی وائپس جاری ہو۔“

”اوہ تو یہ صاحب ہیں۔“ شرجیل مرزا کی آواز سن کر وہ پیچھے ہٹ آئی۔ اوہ کھلے دروازے سے

آوازیں صاف آرہی تھیں۔

”مجبوری ہے شچی، تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میری سیریل ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ مجھے ابھی نہیں آتا تھا

لیکن میں مور کے لیے اداس ہو گئی تھی اور پھر مومنو بھی اتنے دنوں سے اکیلے تھی۔ تمہیں تو ہوتا ہے نا چڑیا جیسا

اس کا دل ہے۔ میں نے سوچا گھبرا رہی ہوگی۔ ہفتہ بھر کے لیے ہو آؤں۔ حالانکہ یہاں ڈاکٹر ہادی

اور معید ہیں۔ مجھے اس کی اتنی فکر نہیں ہے۔“

”ہاں یہ معید کے متعلق میرا اندازہ بالکل غلط نکلا ہے زینبی۔“ شرجیل مرزا ہنسا۔

”تمہارے اندازے ہمیشہ غلط ہی ہوتے ہیں۔“ نئیب عثمان کا لہجہ خوش گوار تھا۔

”خیر اس پر تو بعد میں بھی بحث کر لیں گے کہ کس کے اندازے صحیح ہیں اور کس کے غلط۔ پہلے تم یہ

بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ہمیں کرم داد والوں نے اپنی لان کے لیے ایڈ تیار کرنے کو کہا ہے۔ میرا خیال

ہے کہ تم.....“

”پلیز شچی کسی اور کو لے لو..... میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“

”کیا کریں۔“ شرجیل مرزا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”نگاہ کسی اور طرف اٹھتی ہی نہیں۔“

”اچھا اب بتاؤ نہیں مجھے۔“ نئیب عثمان کے لہجے کے لگاؤ نے مریم نے محسوس کی تو اس کی پیشانی پر

ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں۔

”ویسے تمہاری سیریل کب تک مکمل ہو جائے گی؟“

”کم از کم ایک ماہ اور لگ جائے گا۔“

”اور تمہاری جاب۔“

”یہ جاب تو کبھی بھی میرا مسئلہ نہیں رہی..... تم میرا استعفیٰ لے کر کسی اور کو پائینٹ کر لو۔“

اور ماما نے اس سے کہا تھا جاب ان کی مجبوری ہے..... مریم نے سوچا۔

”نہیں..... وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔ بلکہ اس سے پہلے ہی بابا اور ماں جی ماما سے شہر یار کے لیے ہاتھ کر لیں گے۔“

”اور پتا نہیں..... پتا نہیں یعنی نے شہر یار کومی کے آنے کے متعلق بتایا ہے یا نہیں..... کہیں وہ بھول ہی نہ جائے..... کہیں وہ لیٹ ہی نہ ہو جائیں اور ماما پھر کراچی نہ چلی جائیں..... اس نے یعنی کو بتایا ہی نہیں تھا کہ ماما صرف ایک ہفتے کے لیے کراچی آئی ہیں۔ بلکہ اسے خود بھی کب پتا تھا۔ یہ تو ابھی ابھی اسے پتا چلا تھا اور شہر یار اس وقت ہسپتال میں ہوگا۔ اس نے لمحہ بھر سوچا اور پھر رافع اسپتال کے نمبر ملانے لگا۔



”ہائے کیا زمانہ تھا تھیر کا.....“ جتنی حیدر نے چائے کا کپ اپنی طرف کھسکایا۔

”ہاں جی..... آپ تو تب بہت چھوٹے ہوں گے۔“ خدا بخش نے چائے بناتے ہوئے جتنی حیدر کی طرف دیکھا۔

”میں تو تھا تب پندرہ سولہ سال کا۔ ہاں کیا زمانہ تھا..... ماسٹر غلام قادر کیا پاٹ دارا وادھی ان کی۔ اور وہ غلام قادر کلکتہ تھیر ٹیکل کپنی میں ملازم تھے۔ ان کی آواز آسمان کے تارے توڑتی تھی۔“

”ارے خدا بخش! تم تو چھپرے ستم لکھے۔“

”وہ جی جتنی میاں تھیر سے بہت دلچسپی تھی۔ آغا صاحب کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ ان کا جھوٹا پانی پی لیا کرتا تھا کہ شاید اس طرح کچھ صحت ہو جائے ہمیں بھی۔“

”بھئی خدا بخش! میرے بڑے بھائی بہت عاشق تھے تھیر کے۔ ان سے ہی سنا ہے بہت کچھ میں نے بھی۔ وہ کیا نام ہے بھئی ماسٹر غلام..... اور سلطان.....“

”سلطان محمود کا رقص..... کیا رقص کرتا تھا جی وہ اور جمنابائی اور بسنت کماری تھیں کلکتہ اور بنارس کی۔ کیا غضب کا گاتی تھیں۔“

خدا بخش نے کپ اٹھا کر آمنہ صفی کو دیا جو بہت دھیان سے جتنی حیدر اور خدا بخش کی گفتگوں رہی تھی۔

”یار خدا بخش!“ جتنی حیدر نے خالی کپ میر پر رکھا۔

ان کی عادت تھی کہ جب کبھی بھی ان کی دلچسپی کی بات ہوتی تو وہ ارد گرد سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔

”وہ کیا گانا تھا ان کا جمنابائی اور بسنت کمار کی کا۔ اکثر بھائی صاحب گاتے تھے۔“

”وہ جی.....“ خدا بخش نے یاد کیا۔

ہائے کرو لے والی ندی اٹھرائی لیے چائے

جب ندی کا پانی میرے پاؤں تلے آئے

مجھے گودوں لے لو سا نور یا میری پائل بھیگی جائے“

”خدا بخش کسی دن فرصت میں تمہارے پاس آ کر تم سے تھیر کے متعلق پوچھوں گی اور سنوں گی۔“

آمنہ صفی کو تھیر سے بہت دلچسپی تھی۔ ایک زمانے میں اس نے قدیم اور جدید تھیر کے حوالے سے لکھنا شروع کیا تھا لیکن پھر کافی معلومات کی وجہ سے اس کا وہ آرٹیکل نامکمل ہی رہ گیا تھا اور اب اتنے عرصے بعد وہ تصدق احمد کی وجہ سے تھیر کی طرف متوجہ ہوئی تھی تو ایک بار پھر اسے تھیر سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ تصدق احمد راستے سے جتنی حیدر کو لیتے ہوئے پروفیسر عادل کی طرف آئے تھے۔

نہیں۔ صرف یہ کہ ڈائلاگ وغیرہ لکھے جا چکے تھے بلکہ اداکاروں کا انتخاب بھی ہو چکا تھا اور آج ان کی ریہرسل کا پہلا دن تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ عادل اور جتنی حیدر بھی ہوں اور کہیں کوئی کمی یا خامی محسوس ہو یا اداکاروں کے انتخاب کے سلسلے میں کوئی رائے دینا چاہیں اور ان کی رہنمائی کر سکیں۔ تصدق احمد کی شدید خواہش تھی کہ اس کا یہ ڈرامہ تھلکہ مچا دے۔ وہ عزت اور شہرت جو اسے اپنی تصویروں کی نمائش پر نہ مل سکی تھی اس ڈرامے سے مل جائے۔ اس کے بہت سے خواب تھے وہ بیک وقت بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور نہیں کر پاتا تھا اور آمنہ صفی تو یوں ہی اپنے آپ کو بھلانے کے لیے اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ اماں کے کہنے پر اس نے اخبار کی جاب تو چھوڑ دی تھی لیکن وہ مضطرب اور بے چین رہتی تھی جیسے کسی نے ہاتھ پاؤں باندھ کر بھینک دیا ہو۔ دم کھٹتا تھا گھر میں اس کا۔ جیسے گھر کے بے جان درود یواری بھی شک کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے ہوں۔

اس کا نسخہ اڑا رہے ہوں۔

فلس رہے ہوں اس پر

اس کے اندر سے الفاظ باہر نکلنے کو بے تاب ہو جاتے تھے۔

گرم دہکتے ہوئے الفاظ جو صفیر قرطاس پر بکھر جاتے تو پتا نہیں کیا قیامت آجاتی..... مگر یہ الفاظ اندر ہی اندر ٹھٹھنے بن کر اسے جلاتے رہتے تھے۔ وہ قلم اٹھاتی اور پھر رکھ دیتی تھی۔ اس نے اماں سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ کبھی کوئی شعر نہیں لکھے گی اماں کے علاوہ اسے دنیا میں شاید کوئی بھی عزیز نہیں تھا اور ماں کی بات اسے ماننی ہی پڑتی تھی۔

بے چاری سیدمی سادی اماں بھی سمجھتی تھیں کہ اس کی شاعری نے ہی اسے گمراہ کیا ہے۔

شاعری کی وجہ سے ہی اس کی منگنی ٹوٹی ہے۔

اور اب شاعری کی وجہ سے ہی اسے اغوا کیا گیا ہے۔

پتا نہیں اماں نے یہ سب کیسے سوچ لیا تھا۔

اور وہ اماں کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔

ایک وہی تو تھیں جو اس کے لیے دعا کرتی تھیں اور جن کے لیے وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ سو وہ اپنے

”آمنہ آج دیر نہ کرنا جلدی آ جانا“ شام کو کچھ لوگ آرہے ہیں۔“
 ”جی ہاں۔“ وہ سعادت مندی سے اماں کی بات مان لیتی تھی۔ وہ اگر اس طرح خوش ہوتی ہیں تو اس کا کیا گڑبڑ تھا اور آج بھی اماں نے تاکید کی تھی۔
 ”بھو! آج کچھ مہمانوں کو لارہی ہیں۔ شام کو پانچ بجے آئیں گے، تم چار بجے تک گھر آ جانا بہت اچھے لوگ ہیں۔ بوانے بتایا ہے..... شریف اور معزز.....“
 ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ کہہ دے کہ اسے بار بار ترازو کے پلڑے میں کھڑا ہونا پسند نہیں اور آپ بوا کو منع کر دیں گے۔“ اسے کسی مہمان کو لیکن اماں کی تنکھوں میں جو ایسا بھی چہرے پر جوئے لگتی تھی اس نے اسے ہرا دیا۔

”ضروری جانا ہے اماں۔“ اس نے رساں سے سمجھایا ”آپ کو بتایا تھا نا کہ ایک دوست کے لیے کام کر رہی ہوں اب اسے ادھر راتو نہیں چھوڑا جا سکتا۔“

ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا لیکن ان کے چہرے پر اب اطمینان تھا اور بے بسی میں امید اور آرزو کے
 ایک ٹیگ گھل مل رہے تھے اور اگر تصدق احمد اماں کے چہرے کو پینٹ کرے تو کیا زبردست شاہکار بنے۔ امید
 ناامیدی، آرزو، بے بسی اور خواہشوں کے رنگوں میں ڈھلا اماں کا چہرہ۔

اور وہ اماں سے جلد آنے کا وعدہ کر کے آئی تھی اور اس نے تھدق احمد کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ پوری رہبر سل دیکھنے تک نہیں رک سکے گی لیکن دو تو یہاں ہی بیچ گئے تھے۔ تھدق نے سب ادا کاروں وغیرہ کو تین بجے تک پہنچنے کو کہا تھا..... جتنی کے گھر ہی کافی دیر ہو گئی تھی اور پھر اب یہاں پروفیسر عادل کے ہاں آئے بھی ایک گھنٹا تو ہونے والا تھا۔ انہوں نے چائے کے لیے روک لیا تھا اور پھر تھیرٹر پر گفتگو چمڑ گئی تھی اور پروفیسر عادل کا رکارڈ بشپ راجہ اور مرزا گفتگو وقت گزر جانے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔ وہاں تک پہنچنے میں بھی تو وقت لگے گا۔“ اس نے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا تو وہ چونکے۔
”اوکے۔“ وہ مجبور ہو گئے حالانکہ ان سب کے آنے سے کچھ دیر پہلے وہ حویلی فون کرنے کا سوچ رہے تھے۔



کتنے دن ہو گئے تھے۔

اندر جلتے الاؤ کو اپنے اندر ہی دبانے کی کوشش کرتی تھی مگر سارا دن گھر بیٹھے خالی دیناروں کو نکتے نکتے ہاں کو ادھر سے ادھر چیزیں سیٹنے کام کرتے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھکنے لگی تھیں۔ اس نے گھر کے کاموں میں جی رنگانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن رنگا نہیں سکی تھی۔ کوکنگ سے اسے اتنی ہی دلچسپی تھی کہ آلیٹ بنا لیتی تھی اور چائے۔ سوجلد ہی گھر کے کاموں سے بھی ادب گئی۔ ایسے میں بختی حیدر کے ہاں تصدق احمد کے تھیز کی تجویز اسے اچھی لگی تھی..... اور پھر تصدق احمد کے کہنے پر اس نے اس کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا تھا۔ اماں اس کے دیر تک باہر رہنے پر پریشان رہنے لگی تھیں۔

”کہاں رہ جاتی ہو آمنہ۔“ وہ گلہ کرتی۔

”دوستوں کی طرف چلی جاتی ہوں۔“

”میرا دل ہوتا رہتا ہے بیٹی۔ گھر پر رہا کرو۔“

”گھر پر رہ کر بھی کیا کروں اماں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتی تو وہ نظریں چرا لیتیں۔

جانتی تھی کہ اماں نے کتنے ہی ملے ملائے والوں سے اس کے رشتے کے متعلق کہہ رکھا۔
رشتے دار عزیز برادری والے تو پہلے ہی اس کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔

”اخبار میں لکھتی ہے..... تو بہ بڑی تیز طرار ہوگی۔“

”اور کیا شعروں کی کتاب بھی چھپی ہے۔“

زیادہ عزیز رشتے داران پڑھتے تھے سو اس کی ذات و شخصیت پر بے لاگ تبصرہ کرتے اور پھر اسے بڑی طرح رد کر دیتے تھے۔

اور اب تو..... اب تو وہ اغوا کے بعد قابلِ نفیرین ہو چکی تھی۔

پھر بھی اماں بے چاری اپنی کوشش میں لگی ہوئی تھیں اور اس سلسلے میں ایک دو مائیں کی مدد بھی حاصل کر لی تھی انہوں نے..... اے اماں پر ترس آتا تھا وہ جانتی تھی کہ یہ سب لا حاصل ہے لیکن وہ انہیں منع نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ڈرتا کہ کہیں امید کا وہ نمٹا سا دایا جو اماں کی زندگی کے چراغ میں تیل کا کام دے رہا تھا بجھ گیا تو۔ تو شاید اماں بھی نہ سمجھیں۔

سو وہ اماں سے کچھ نہ کہتی۔

اور تہنقد احمد کے ساتھ کام کر کے خود کو بظاہر اس نے تھوڑا مصروف کر لیا تھا۔ اس طرح اس نے قسم جو ایک دن اماں کے سامنے کھائی تھی وہ بے اثر رہی۔

نہ دوبارہ جاب کر رہی تھی۔ نہ شعر لکھ رہی تھی۔

اماں بھی روک ٹوک کر، تھک کر، چپ ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہاں جب مائی کوئی رشتہ لے کر آتی تو دوا ضرور کہتی تھیں۔

آس و نراس، یقین و بے یقینی کے درمیان پنڈولم کی طرح لٹکتے ہوئے۔
اور یہ درمیانی کیفیت انہیں مضطرب کیے ہوئے تھی۔

ہر لمحہ بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔

معلوم نہیں، زینب عثمان کیا کہیں گی۔ انہوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا۔

ان کا رویہ تو بہت اچھا تھا۔ لہجے میں وہ غرور اور بے نیازی نہیں تھی بلکہ بہت خلوص سا تھا۔ لہجہ بھر کو انہیں یقین سا ہونے لگتا۔ ”ضرور زینب عثمان اس پر پوزل کو قبول کر لیں گی۔“ دوسرے ہی لمحے وہ مضطرب سے ہو جاتے۔

”شاید نہیں۔“

”انہوں نے تو کبھی انہیں پسند نہیں کیا۔“

وہ عاشق، نینا اور تیور سے ملنے جاتے تو صاف بے زاری کا اظہار کرتی تھیں۔ لیکن اس روز..... ہاں اس روز حیرت انگیز ریڈ طور پر ان کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ شاید ماں جی کی وجہ سے اور ماں جی نے خون پر اپنے آنے کا مقصد پہلے ہی مبہم لفظوں میں ان پر ظاہر کر دیا تھا۔ شاید انہیں بھی خوف تھا کہ کہیں وہ ان کی آمد کو پسند نہ کریں۔

اور اس معاملے میں وہ کتنے خود غرض ہو گئے تھے۔ اس روز جب ماں جی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی تھیں۔ ایک دم انداموں نے انہیں گھیر لیا تھا۔

”یہ میں نے ماں جی کو کس امتحان میں ڈال دیا ہے اور کیا ماں جی کے لیے یہ آسان ہوگا۔ اس عورت کے پاس جانا جس نے.....“

اور بہت سے درد اور بہت سی محرومیاں جاگ اٹھیں۔

مسرور جیسے کانوں میں ان سے سرگوشی کرنے لگا۔

”اور اس عورت کو دیکھ کر خون میری رگوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا سر۔ میرے اندر میری ماں کے خاموش آنسو اور اس کی لا حاصل فریادیں زندہ ہو گئی تھیں..... میں اس عورت کو اور اس کو جو میرے ہونے کا سبب ہے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“

”اور ماں جی.....“

انہوں نے ماں جی کی سوتلی کلائیوں کو دیکھا..... ان کے شفیق چہرے پر پھیلی لیے دنوں اور طویل راتوں کی محرومیوں کو دیکھا..... اور ان کی سیاہ آنکھوں میں چھائے گہرے دکھ کے سایوں کو..... اور ان کا دل جیسے کٹ کٹ کر گرنے لگا اور..... یہ کلائیوں کو اب سوتی ہوئی تھی۔

لیکن چہرے پر پھیلی محرومیاں اور آنکھوں میں چھائے دکھ کے بادل تو وہ ہمیشہ سے دیکھ رہے تھے۔

جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے۔

اور وہ کتنے خود غرض ہو گئے تھے۔ انہوں نے صرف اپنی آرزو یاد رکھی تھی اور باقی سب کچھ بھلا دیا تھا..... تنہائی کے سارے دکھ، محرومیوں کے سارے غم جو ماں جی نے سہے تھے اور خود انہوں نے بھی..... اور وہ ایک لڑکی جو انجانے میں ان کی تمنائیں چکی ہے..... وہ اگر زندگی کے سفر میں ہم سفر نہ بھی ہوتی تو بھی زندگی گزر رہی جائے گی۔ فس کر نہ سکی رو کر ہی سکی۔

انہوں نے دل گرہ لگی سے سوچا تھا اور پھر بے اختیار ماں جی کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

”سوری ماں جی۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے..... آپ کو میری اس خواہش سے اگر تکلیف پہنچی ہو تو پلیز.....“ انہوں نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا جو کسی قدر حیران ہو کر انہیں دیکھ رہی ہیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ان کی بات سمجھتے ہوئے بھی جیسے پوری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”ماں جی..... آپ..... آپ..... آپ مت جائیے زینب ولا میں اور مجھے معاف کر دیجئے گا کہ میں.....“
”پگل ہو گئے ہو عادل۔“ انہوں نے پاس کھڑی بی آپا کے ہاتھ سے چادر لی اور گاڑی کی طرف بڑھیں لیکن عادل اپنی بات مکمل کر کے ان کی بات سے بغیر ہی تیز قدموں سے انہیں یوں ہی پورج میں کھڑا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔

اور وہ ایک خیال، ایک تصور جسے مدتوں سوچا تھا پھر اسے ایک پیکر میں تراشا تھا اور اس پیکر کو دل ہی دل میں سجایا تھا اور پھر یہ تصور یہ پیکر ایک حقیقی روپ میں سامنے تھا..... تو اس ایک خیال کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دینے کا خیال روح و دل کو کلڑے کلڑے کر رہا تھا۔

”تو مریم عثمان احمد، تم میرا تقدیر نہیں تھیں.....“ انہوں نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔

”لیکن پھر تمہیں کیوں میری زندگی میں چلی آئی تھیں۔“

کتنی طویل راتیں انہوں نے اسے سوچا تھا اور اسے دیکھنے کے بعد کتنے بے چین دن گزارے تھے۔ دل کے اندر کسی گھنٹیاں سی جیتی رہتی تھیں..... اور یہ کس قدر افسانوی سی بات ہوئی تھی کہ وہ ایک خیال، ایک دھند میں چھپی شبیہ جس کی کوئی واضح شکل نہ تھی۔ بس ایک تصور تھا، ایک خیال تھا کہ ہاں کوئی بچہ اس بھری وسیع دنیا میں جسے دیکھ کر دل بے اختیار پانے کی تمنا کرے۔ بس اسی کے ساتھ زندگی کا سفر طے کریں گے لیکن دل نے جس کی تمنا کی تھی، اس کی مہرائی میں زندگی کا سفر طے کرنا شاید ان کا نصیب نہ تھا۔ رگوں کو کاشقی اذیت کم کرنے کے لیے انہوں نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ ماں جی آ گئیں۔

”ہمیں پورج میں چھوڑ کر تم ادھر آ گئے ہو۔“ ان کا لہجہ گھٹیا تھا۔

”ماں جی۔“ انہوں نے سگریٹ یوں ہی ایش ٹرے میں پھینک دیا کہ ماں کے سامنے سگریٹ پیتا ان

کے نزدیک خلاف ادب تھا۔ ”میں نے آپ سے معذرت کر لی تھی کہ ماں جی نہ میں آپ کے دل کو دکھ پہنچایا۔ میں جانتا ہوں ماں جی کہ آپ کے لیے اس عورت کی بیٹی کو بھونٹنا آسان نہیں ہے۔ میں اپنی خواہش سے دستبردار ہو گیا ہوں۔“ ان کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی جھنک تھی۔ زیتون بانو نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”ہاں آسان نہیں تھا اگر میں مریم سے نہ ملی ہوتی لیکن مریم بہت پیاری ہے۔۔۔۔۔ اور پھر تمہاری خوشی مجھے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہے۔“

”لیکن ماں جی، میں اپنی ہر خوشی آپ کے معمولی سے سکھ کے لیے بھی قربان کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ ماں جی اگر آپ حکم دیں گی تو میں حرم سے۔۔۔۔۔“ آواز ان کے گلے میں پھنس گئی اور آنکھوں کے آگے آنسوؤں کا پردہ اٹھ گیا۔

”اور یہ سب کچھ میری ماں نے تھا۔“

وہ جانتے تھے لیکن یکایک ہی۔۔۔۔۔ جی کہ عمو ملی تھا ہاں انہیں بہادر بنانا تھا۔

”تو میری خوشی اس میں ہے عادل کہ میں نرنب ولا جاؤں۔“ انہوں نے ہشامش لٹاش سچے میں کہا اور ان کی آنکھوں میں عادل کی زندگی میں آنے والی خوشی کے رنگ بھر گئے۔

”مگر۔۔۔۔۔“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن ماں جی نے انہیں ٹوک دیا۔

”اگر مگر کچھ نہیں پہلے ہی ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ میں نے رات نرنب سے بات کر لی تھی اور ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی آمد کا مقصد بھی واضح کر دیا تھا۔ وہ اگر اسی وقت کراچی سے نہ آئی ہوتیں تو میں اسی وقت چلی جاتی۔“

”میری وجہ سے حرم۔۔۔۔۔ حرم کو کیا ہوا۔“ انہوں نے نظریں اٹھائیں۔

”اس کی شادی میں بھی تاخیر ہو رہی ہے۔ تمہاری شادی ہو جائے گی تو۔۔۔۔۔“

وہ اندر ہی اندر تادم ہو گئے۔۔۔۔۔ ہاں شاید ان کی وجہ سے ہی۔

ماں جی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

”چلاؤ اب مزید دیر نہ کرو۔۔۔۔۔ ہمیں آج ہی حوٹلی بھی واپس جانا ہے۔“

”ماں جی۔۔۔۔۔“ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے

لگائے اور پھر انہیں نہایت عقیدت سے چوم لیا۔۔۔۔۔

”میں شاید آپ کو کوئی خوشی نہ دے سکا ماں جی۔“

”میری خوشی اب صرف اس میں ہے عادل کہ اپنی زندگی میں تمہیں آباد دیکھ لوں۔۔۔۔۔ تمہاری بیوی ہو تمہارے بچے ہوں۔۔۔۔۔ اور یقیناً کرو مریم بہت اچھی بچی ہے اور میں مطمئن ہوں۔ میں سوچتی تھی کہ حرم

کے علاوہ کوئی باہر کی لڑکی اس گھر میں آئے تو جانے کا دل کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ جانے اسے برداشت بھی کرے یا نہیں۔۔۔۔۔ لیکن مریم۔۔۔۔۔ وہ تو کامل سے بہت پیار کرتی ہے۔۔۔۔۔ میں خوش ہوں عادل۔“ ان کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ ”تم اپنے دل میں اندیشے مت پالو بیٹا۔“

”مگر اس کی کمی۔۔۔۔۔“

ماں جی کے ہاتھ ابھی تک ان کے ہاتھوں میں تھے۔

”اس کی کمی کی ذات اگر کبھی میرے لیے کچھ باعث تکلیف بھی تھی تو اس میں مریم کا کیا قصور۔ وہ بچی مجھے بہت عزیز ہے۔ یقیناً رکھو۔“

”ماں جی۔۔۔۔۔“ شدت جذبات سے ان کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ بہت عظیم ہیں۔“ انہوں نے ان کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

زیتون بانو ان کی طرف دیکھ کر مسکرائیں اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر چلی گئیں اور وہ کمرے کے وسط میں بہت دیر تک یوں ہی کھڑے رہے۔

”مریم۔۔۔۔۔ چنانچہ مریم کا رد عمل کیا ہوگا۔ شاید وہ حیران ہو بہت زیادہ۔“

”اور شاید کے یہ جان کر کہ وہ پاپا کی بیٹی نہیں ہے اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو۔۔۔۔۔ اور شاید کچھ بھی نہ ہو۔“ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ ماں جی کے نرنب ولا جانے سے پہلے مریم سے بات کر لیں اور حوٹلی سے انہوں نے دو تین بار فون بھی کیا۔۔۔۔۔ پہلے تو مریم ملی ہی نہیں اور جب ملی تو انہیں سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا بات کریں گے سو انہوں نے بات کیے بغیر فون رکھ دیا۔

نہیں ان کا بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ بات نرنب عثمان ہی بہتر طریقے سے کر سکتی ہیں۔ وہی اسے بتا سکتی ہیں کہ۔۔۔۔۔

اور اس عجیب و غریب صورت حال نے کئی دنوں سے انہیں پوری نیند سونے نہیں دیا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک کر جاگ اٹھتے تھے۔

”عادل۔۔۔۔۔“ بی آپا نے آواز دی تو وہ باہر آ گئے۔

”میں نے سمجھا تیار ہو رہے ہو۔۔۔۔۔ مرد کھاوے کے لیے تو جا نہیں رہے ہو۔ نہ صرف نرنب آنٹی بلکہ مریم بھی تمہیں دیکھ چکی ہے۔“ بی آپا کے چہرے پر بھی سرسبزی کھل رہی تھیں۔

”مراد بھائی نے تو خود ہی شادی کر لی تھی۔ کتنا شوق تھا کہ ان کی مہندی کے گیت گاؤں گی۔ ان کے سہرا باندھوں گی لیکن۔۔۔۔۔ اور تم ہو کہ شادی کا نام ہی نہ لینے تھے۔ میں نے تو مراد بھائی کی شادی پر بھی نہ پورے ہونے والے سارے شوق تمہاری شادی پر پورے کرنے ہیں۔“ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔ سو آج وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

”میں آپ کو نذیب ولا میں ڈراپ کر کے واپس آ جاؤں گا اور کچھ دیر بعد پھر آ کر پک کر لوں گا۔“ گاڑی گیٹ سے نکالتے ہوئے انہوں نے بی آپا کو بتایا۔

”کیوں کیا نہیں کسی کام سے جاتا ہے؟“ ماں جی نے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئے۔

”نہیں۔ ہاں۔۔۔۔۔ جی۔“

دراصل انہیں گھبراہٹ ہو رہی تھی نذیب عثمان کا گزشتہ رویہ۔ مریم کا گریز۔ وہ عاشی اور دنیا کی طرح سے ان سے بے تکلفی سے بات نہیں کرتی تھی اور نہ ہی وہاں زیادہ دیر آ کر بیٹھتی تھی جہاں بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوتے اور اس کے اس گریز کو عاشی نے بھی محسوس کیا تھا اور اس نے ایک بار وضاحت بھی کی تھی۔

”بجو کچھ کم کو ہیں لیکن وہ ایسی ہرگز نہیں ہیں کہ سگے اور سوتیلے رشتوں میں فرق کریں لیکن ہاں نہیں کیوں آپ کو۔۔۔۔۔ شاید وہ آپ سے جھجکتی ہیں۔“

پھر اس نے خود ہی وضاحت کر دی تھی۔

”جب باپا زندہ تھے تو ماں اکثر کہا کرتی تھیں کہ مومن کے اندر کوئی دقیقہ نوسوی روح ہے۔۔۔۔۔ وہ لوگوں سے ملنے سے کترائی ہے شروع سے ہی۔“

وہ کم گوئی اور وہ اس سے ڈیروں باتیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ جانے کب سے سجت سجت کر انہوں نے اپنے اندر لفظوں کا ڈھیر جمع کر رکھا تھا۔

خوبصورت ڈر بال لفظ۔

مجھتی حیدر کے نادلوں میں موجود لفظوں سے بھی زیادہ خوب صورت اور دلربا لفظ۔

لیکن وہ اس سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔

ایک بار اس کے اور ان کے درمیان موجود رشتہ واضح ہو جائے پھر وہ اس کے قدموں میں لفظوں کے ڈھیر کر دیں گے۔

چاہے انہیں پذیرائی ملے یا نہ ملے مگر ایک بار تو وہ اپنے جذباتوں کو لفظوں کا پیرا بن ضرور دیں گے۔ اور خدا جانے نذیب عثمان کا رویہ کیا ہوگا۔

وہ راستے میں بیٹھ کر سوچتے رہے تھے۔۔۔۔۔ کہیں وہ ماں جی کی توہین نہ کر دیں۔

انہیں خود سے زیادہ ماں جی کا خیال تھا اور ماں جی کی توہین انہیں گورا نہیں تھی۔۔۔۔۔ بہت قندذب حالت میں وہ ڈرائیو کرتے رہے۔ حالانکہ بی آپا نے ایک دو بار ان سے کوئی لطیف سا مذاق بھی کیا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہے۔۔۔۔۔ وہ بہت ڈپر تھے۔ بات اگر ان کے سچے جذباتوں کے متعلق کے انتہار اور اصول چاہتوں کی نہ ہوتی تو وہ ماں جی کو بھی اس امتحان میں نہ ڈالتے۔

لیکن نذیب عثمان کا رویہ حیرت انگیز حد تک بہت اچھا تھا۔ ان کی توقع کے بالکل برعکس وہ بہت محبت اور خلوص سے ملتی تھیں۔۔۔۔۔ اور پھر میڈم نرگس کی آمد۔۔۔۔۔ انہوں نے تو اتنی پذیرائی کی تھی کہ وہ شرمندہ ہو گئے تھے اور کتنے خلوص سے انہیں انوائسٹ کیا تھا اور نذیب عثمان کی طرف سے انہوں نے یقین دلادیا تھا کہ یہ مریم کی خوش نصیبی ہے۔۔۔۔۔ اور انہیں یقین ہے کہ مریم عادل کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔

”پھر بھی۔“ نذیب عثمان نے کہا ”یہ بالکل اچانک اور غیر متوقع بات ہے میں سوچوں گی۔۔۔۔۔ اور مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ مریم۔۔۔۔۔ مریم کو کیسے۔۔۔۔۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ مریم اس بات سے بے خبر ہے کہ عثمان احمد اس کے والد نہیں ہیں۔۔۔۔۔ وہ عثمان احمد کو بہت چاہتی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بات میرے بھتیجی حیدر اور میڈم نرگس کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے۔“

”مگر۔۔۔۔۔“ میڈم نرگس نے نذیب عثمان کو سمجھایا۔۔۔۔۔ ”زہنی ڈارنگ مریم کو بہر حال اپنے باپ کا نام معلوم ہونا چاہیے۔ ہمارے تو مذہب میں بھی ہے۔ اسلام بھی ہمیں علم دیتا ہے کہ بچوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے محروم نہ کرو۔“

اور پروفیسر عادل نے بے حد حیران ہو کر میڈم نرگس کو دیکھا تھا۔

یہ خاتون جو اس وقت سیلو لیس بلاؤز پہنے بہت ڈارک میک اپ کیے۔ فچی ہوئی ہمنوں اور مصنوعی پلکوں کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھی تھی اور جس کے متعلق لوگوں کی رائے کوئی بہت اچھی بھی نہیں تھی اسلام اور مذہب کی بات کر رہی تھی۔ لہذا مذہب اور اسلام کے بارے میں کچھ علم ہوگا ہی تب ہی تو۔ اور پھر وہ غلط بات تو نہیں کر رہی تھیں۔ قرآن شریف میں موجود ہے کہ لے پاک بچوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے پکارو۔

ان کی نگاہوں میں میڈم نرگس کے لیے احترام جھلکنے لگا اور شوہر سے متعلق۔ لوگوں کے بارے میں کہانیاں تو بنتی رہتی ہیں اور ان میں کتنی حقیقت ہوتی ہے یہ کون جانتا ہے۔

”انشاء اللہ فیصلہ آپ کے حق میں ہی ہوگا۔“ جاتے جاتے انہوں نے امید دلائی تھی۔

اور ان کی نگاہیں بے اختیار نذیب عثمان کی طرف اٹھ گئی تھیں جنہوں نے مسکرا کر میڈم نرگس کی بات کی تائید کر دی تھی۔

”یقین رکھیں انکار کی گنجائش کم ہی ہے۔“

میڈم نرگس نے جو نذیب عثمان کے ساتھ ہی انہیں خدا حافظ کہنے باہر تک آئی تھیں نذیب عثمان کے ہلٹ جانے کے بعد اچانک ہی مڑی تھیں اور وہ کار کا دروازہ کھولتے کھولتے مڑ کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ تب بہت بے تکلفی سے انہوں نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

”بھئی ایک تو آپ عثمان احمد کے بیٹے ہیں اور دوسرے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بائیں آنکھ کا کونا

”پتا نہیں ماں جی نے نسب سے بات کی یا نہیں۔ پتا نہیں کیا جواب ملا۔ مثبت یا منفی اور اگر..... اگر“

اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ پاتے تھے۔ ان کا دل ڈوبنے سا لگتا۔

مجبئی حیدر نے کیا کہا۔ تصدق احمد نے کیا بات کی۔

کون کون سا اداکار وہاں تھا اور کس کس سے تصدق احمد نے انہیں متعارف کروایا تھا۔ انہیں کچھ نہیں تھا..... وہ تو اپنے آپ میں گم بس اداکاروں کو مکالمے بولتے اور تصدق احمد کو ہدایات دیتے رہے تھے..... اور پھر آمنہ صفی کے ساتھ ہی تصدق احمد سے معذرت کر کے کھڑے ہوئے تھے۔

”تمہارا انتخاب بہت اچھا ہے۔“ انہوں نے اسے سراہا تھا ”انشاء اللہ میں پھر آؤں گا۔“

بے چینی سی تھی..... کل ہی تو آپا نے بتایا تھا کہ ماں جی کے ”نسب ولا“ میں فون کریں گی۔ پندرہویں دن تو ہو گئے تھے اور اگر کوئی امید افزا بات ہوئی تو پھر آئیں گے لاہور اور پندرہویں دن سے بے چینی تھی وہ سوا ہو گئی تھی..... شاید کوئی امید افزا بات نہیں ہوگی۔“ تب ہی تو بی آپا نے فون نہیں کیا تھا۔ ان کا دل جیسے کٹنے لگتا۔

”نہیں۔“ وہ دل کو تسلی دیتے..... ممکن ہے ماں جی نے ابھی بات نہ کی ہو۔ نسب ولا میں۔ دیر سو رہا ہو ہی جاتی ہے نا۔

سو وہ صبح سے دل پر جبر کیسے بیٹھے بی آپا کے فون کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بے چینیوں بی آپا پر ظاہر ہوں۔ سو کئی بار حویلی کا نمبر ملا کر انہوں نے ریسپونڈر رکھ دیا لیکن اب ان سے حریہ انتظار نہیں ہو پا رہا تھا۔

اور کبھی کبھی آدی کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔

اس وقت اگر تصدق احمد ”مجبئی حیدر“ منہ منی نہ آ جاتے تو اب تک.....

انہوں نے آمنہ صفی کو اس کے اسٹاپ پر ڈراپ کیا اور پوری اسپید کے ساتھ گھر کی طرف آئے۔

”آپ جلدی آگئے۔“ خدا بخش انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔

”ہاں بس موڈ نہیں تھا۔“ خدا بخش کی بات کا جواب دے کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئے اور بیڈ پر بیٹھے ہی ریسپونڈر اٹھا کر حویلی کا نمبر ملایا۔ دل یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آئے ہوں۔ دوسری طرف بی آپا ہی تھیں۔

”ارے عادل تم..... بس میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔“

”عادل وہ ماں جی نے نسب ولا فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ مریم کے امتحان ہونے والے ہیں اور فی الحال وہ اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتیں۔ وہ امتحان سے فارغ ہو لے تو پھر آرام سے“ سہولت سے

اس سے بات کریں گی۔“

”اس کا مطلب.....“ وائیں ہاتھ سے ریسپونڈر تھامے تھامے پایاں ہاتھ انہوں نے دل پر رکھا۔

”مرتب.....“ ظاہر سے عادل۔“ بی آپا نے خوش گوار لہجے میں کہا ”نسب آئی کو اعتراض نہیں ہے۔ بس وہ مریم کی وجہ سے.....“

انہوں نے بہت دیر کے رکے ہوئے سانس کو خارج کیا۔

”بہر حال وہ صحیح کہتی ہیں..... اس انکشاف سے ڈسٹربنس تو بہت ہوگی..... لیکن حقائق کبھی نہ کبھی تو اسپوز ہونے ہی ہوتے ہیں۔“

”ہاں۔“ ان کی نگاہوں کے سانسے..... مریم کا چہرہ آگیا۔

ہراساں اور پریشان..... آنکھوں میں آنسو بھرے عثمان احمد کا ہاتھ تھامے ان کے پاس ٹنٹھی اور ان کی ڈیڑھ پر بلک بلک کر روتی ہوئی۔

اور یہ انکشاف.....

ایک لمحے کو ان کا جی چاہا وہ اس بے حد عزیز ہستی کو کسی دکھ سے آشنا نہ ہونے دیں اور چپ چاپ اپنی اس خواہش سے دستبردار ہو جائیں۔ صرف اس دہرے کے دل کو اس دکھ سے بچانے کے لیے لیکن حقائق کبھی نہ کبھی تو اسپوز ہونے ہی ہوتے ہیں۔ کل جب تیمور بڑا ہوگا..... نینا اور عائشہ بڑی ہوں گی اور جاناں ادا ان کے نام منتقل ہوگی تو.....

”اوکے“ وائیں یونٹوں کو عادل۔“ بی آپا نے انہیں وائیں کیا تو وہ مسکرا دیے۔

”اوکے..... بی آپا انشاء اللہ ویک اینڈ پر حویلی آؤں گا.....“

ریسپونڈر کیڈل پر ڈال کر وہ کچھ دیر یوں ہی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھے رہے۔ بہت مطمئن اور پرسکون۔

یوں جیسے غلامیں لٹکنے کی اذیت سے نجات پالی ہو۔

جیسے مدتوں معلق رہنے کے بعد ان کے پاؤں نے زمین کو چھوا ہو۔

ہولے ہولے ان کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ ٹھہری ہوتی گئی اور امید کا وہ دیا جو میڈم نرگس نے آتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں تھمایا تھا، یکا یک تیرے کرمل اٹھا اور اس کی روشنی سے ان کے آس پاس..... ادھر ادھر ہر طرف چراغاں ہونے لگا۔



”مومن۔“ تیمور نے جو بڑی دیر سے مریم کو پڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا، آہستگی سے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ہوں۔“ مریم نے کتاب بند کرتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”مومو کیا اب ہم کراچی جا کر رہیں گے؟“

”کیوں..... ہم کیوں کراچی جائیں گے؟“

”ماما جو وہاں چل گئی ہیں۔“

”مگر وہ تو کام سے گئی ہیں، آجائیں گی۔“

”مگر آئی تو آئی، روزگنی انکل سے کہہ رہی تھیں کہ کراچی سٹل ہونے کا سوچ رہی ہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے از حد حیران ہو کر اسے دیکھا ”مجھے تو نہیں معلوم۔“

”آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔“ وہ روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔

”ارے میری جان۔“ مریم نے اسے ایک دم اپنے ساتھ لگا لیا ”ناراض ہو مجھ سے۔“

”اتنی دیر سے آکر بیٹھا ہوا ہوں اور آپ پڑھ رہی ہیں۔“ اس نے بدستور روٹھے روٹھے انداز میں کہا

تو مریم نے اس کے خساروں پر بوسہ دیا۔

”آپ کو پتا ہے تا میرا امتحان ہونے والا ہے اس لیے۔“

”اچھا۔“ وہ از حد سنجیدہ لگ رہا تھا ”آپ پڑھیں میں جا رہا ہوں عاشی بچو کے پاس۔“

”میں نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب میں اپنے پیارے پیارے کپلو کپلو بھائی سے باتیں کروں گی۔“

..... مریم نے اسے گدگدایا تو وہ ہنس پڑا۔

”مومو..... مت کریں تا ایسا مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔“ اس نے مریم کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ہنسنے ہنسنے

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”نہیں، پہلے پرامس کرو اس طرح روٹھو گے نہیں۔“

”نہیں..... پرامس۔“ اس نے جھٹ اپنا ہاتھ آگے کر دیا ”ویسے میں آپ سے روٹھا نہیں تھا مومو۔“

وہ تو یوں ہی۔

وہ مسکرایا ”ماما بھی نہیں ہیں..... پاپا بھی نہیں ہیں اور آپ دن رات پڑھتی رہتی ہیں..... تو پھر گھر آنے کا

فائدہ۔“

اور تیسور نے پاپا کا نام کیا لیا، مریم کے اندر ایک ہوک سی اٹھی۔ اسے ایک دم پاپا یاد آگئے اور کبھی کبھی

پاپا کی کتنی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ گھر پر ہوتے تھے تو کتنا تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ اگرچہ ماما کے کسی

معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے پھر بھی ماما جب بھی کوئی زیادتی کرتی تھیں یا اسے محسوس ہوتا تھا کہ ماما

بلاوجہ اس کے ساتھ ضد کر رہی ہیں تو اس کی پرامید نظریں بار بار پاپا کی طرف اٹھتی تھیں۔

دل میں ایک آس سی ہوتی تھی۔

شاید پاپا ماما کو روکیں۔

انہیں سمجھا سکیں۔

اور پھر کبھی کبھی پاپا دے لفظوں میں اس کی سائڈ بھی لے لیا کرتے تھے۔ اگرچہ ماما اس پر بہت جڑ

بوتی تھیں..... اور شرجیل مرزا کے معاملے میں تو پاپا نے اچھا خاصا اسٹینڈ لیا تھا..... اسے اچانک وہ دن

یاد آگیا۔

اور پھر مئی کا ڈپریشن

ڈاکٹر عبدالعزیز کی آمد

میڈم نرگس کے تبصرے

پیٹم آفندی کی مسکراہٹیں

ایک ریل سی اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔

اور اب اگر زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ آگیا تو.....

تو کون اسٹینڈ لے گا اس کے لیے

ماما تو اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوں گی۔

کون ہے اس کا ہمدرد اور بڑا۔

لحہ بھر کے لیے تصور میں ڈاکٹر عبدالعزیز اور پروفیسر عادل کے چہرے آئے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عاشی کے منگیتر ہونے کے ناطے اس کے لیے بھائیوں جیسے تھے اور پروفیسر عادل پاپا

کے بیٹے تھے شفیق اور مہربان۔

لیکن شاید دونوں ہی ماما کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے اور ماما کا پتا نہیں کیا فیصلہ تھا..... وہ

ایک دم بے چین سی ہو گئی۔



چوہدری ثناء اور ماں جی کو ماما نے کوئی ٹھوس جواب نہیں دیا تھا۔

”ایک اور رشتہ بھی مریم کے لیے اچکا تھا لیکن فی الحال میں نے انہیں بھی کوئی جواب نہیں دیا

ہے..... میں سوچوں گی۔ فی الحال مریم پڑھائی کر رہی ہے۔ فارغ ہو جائے تو..... میں اسے ڈسٹرب نہیں

کرنا چاہتی۔“

”شہریار آپ کے سامنے ہے دیکھا بھالا ہے۔ ڈاکٹر رافع اور ڈاکٹر ہادی سے اس کے متعلق پوچھ

لیں۔ یقیناً سب تعریف ہی کریں گے۔“ چوہدری ثناء نے بڑے رسان سے کہا تھا ”ہمیں آپ کی بیٹی اپنی

بیٹیوں جیسی پیاری ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اسے ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”بھانجرا مہر ہے ہیں چوہدری صاحب لیکن میں نے کہا نا کہ دوران تعلیم میں اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی۔“

”لیکن شیری۔“
”میں ہوں ناموسی تمہاری فکر کرنے کے لیے..... اور میں اتنی آسانی سے تمہیں نہیں کھونے دوں
تم ہوگی تو زندگی ہوگی..... نہیں ہوگی تو زندگی بھی نہیں ہوگی۔ زندگی سے لے کر موت تک میں
تمہارے ساتھ ہوں۔ میرا یقین رکھو اور بس پڑھائی کرو..... تمہیں اپنا ریکارڈ برقرار رکھنا ہے اور اپنی ماما کو
بھول نہیں کرنا۔“

..... ہر بات وقتی طور پر ذہن سے نکال کر اسٹڈی کر رہی تھی لیکن کبھی کبھی دل ایک دم پڑھائی سے
اچاٹ ہو جاتا تھا اور اناجانے وسوسے ذہن کو جکڑ لیتے تھے۔
”مومو۔“ تیمور نے پھر اسے اپنی طرف متوجہ کیا ”آپ کیا سوچنے لگی ہیں؟“
”ہاں۔“ اس نے چونک کر تیمور کی طرف دیکھا ”کچھ بھی تو نہیں۔“
”تو پھر چلیں تاکہیں باہر لے چلیں۔“

”اچھا چلتے ہیں۔“ اس نے اس کے گال تھپتھپائے ”تم جا کر عاشی اور نینا کو کہو تیار ہونے کے لیے۔
میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

”تھینک یو مومو۔“ وہ ایک دم خوش ہو گیا ”بچی بہت بوریٹ ہو رہی تھی..... ماما بھی تو روز فون پر کہہ
دیتی ہیں کہ کل آؤں گی اور پھر آتی ہی نہیں۔“

”آجائیں گی۔ بڑی ہیں نا۔“ مریم نے نرمی سے کہا ”چلو تم لوگ فناف تیار ہو جاؤ۔“
”اوکے۔“ وہ تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ مسکرا کر وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگی۔
مریم جب تیار ہو کر باہر آئی تو نینا اور تیمور لاؤنج میں اس کے منتظر تھے۔

”اور عاشی کہاں ہے؟“

”بچی نہیں آئیں گی۔“ نینا نے بتایا۔

”کیوں؟“ مریم نے پوچھا اور جواب نے بغیر عاشی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ عاشی آنکھیں بند
کیے میوزک سن رہی تھی۔

”عاشی۔“ مریم نے آہستہ سے آواز دی تو اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”آپ لوگ ابھی گئے نہیں؟“

”تم کیوں نہیں چل رہی ہو؟“

”موڈ نہیں ہے۔“

”ذرا سی آؤ تنگ ہو جاتی۔ مور بور ہو رہا تھا۔“ مریم نے وضاحت کی ”بس ذرا می پارک جاؤں گے۔“
”اوکے..... مگر میرا موڈ نہیں ہے۔“ اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔

”آپ کی بات بھی صحیح ہے لیکن ہمیں کچھ تسلی ہو جاتی تو..... بچی سے بے شک آپ ابھی ذکر نہ کرتیں۔“
لیکن ماما نے انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تھا اور نہ ہی انہیں مایوس کیا تھا۔

”تمہاری ماما زبردست ڈپلومیٹ ہیں۔“ شہریار نے فون پر اسے ساری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
”اس دلائی نے نہ ہی مایوس کیا ہے۔ ویسے.....“ بات کرتے کرتے اچانک اسے یاد آیا ”یہ ہمارے قریب
روسیاہ کون ہیں۔ تم نے تو کبھی ذکر نہیں کیا کسی اور پو پوزل کا۔“

”مجھے تو خود نہیں معلوم۔ پتا نہیں شاید شرنیل مرزا ہوں۔“

”لیکن تم تو کہہ رہی تھیں تمہاری ماما نے اسے منع کر دیا تھا۔“

”ہاں منع کر دیا تھا۔ پھر پتا نہیں۔“ وہ خود الجھی ہوئی تھی اور شہریار اس سے کہیں زیادہ الجھ رہا تھا۔

”مجھے لگ رہا ہے مریم تمہاری ماما ہری جھنڈی نہ دکھادیں۔“

”نہیں۔“ وہ اسے یقین دلا رہی تھی لیکن خود بے یقین ہو رہی تھی۔

”خیر کر لیں گے انتظار تمہاری پڑھائی مکمل ہونے کا بھی۔“ شہریار شگفتہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔
اس کے لہجے میں چھپی اداسی نے مریم کو بھی اداس کر دیا تھا۔

اور ماما کے متعلق کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی۔ نہ جانے کب کس وقت وہ کیا فیصلہ
کر دیں۔ کب کس پر مہربان ہو جائیں۔

مریم کو ہر وقت دھڑکا کا ہوا رہتا تھا۔

اور چند ماہ کتنے خوش کن گزرے تھے۔

پاپا کی جدائی کا دکھ بھی کم ہو گیا تھا۔

لیکن اب ایک بار پھر ماما بے حد مصروف ہو گئی تھیں۔ زیادہ تر کراچی رہتی تھیں۔

ایک سیریل ختم ہوئی تو انہوں نے ایک اور سیریل کا انگریمنٹ کر لیا تھا اور شاید بہت جلد وہ ایک نئی
فلم بھی سائن کرنے والی تھیں۔ ان کی اور میڈم ٹرگس کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا۔

اور اگر ماما نے اپنے آپ کو اتنا مصروف کر لیا تو پھر وہ ہمیں صرف اسکرین پر ہی دکھائی دیں گی اور یہ
جو کبھی کبھی وہ دکھائی دے جاتی ہیں ہم اس سے بھی محروم ہو جائیں گے..... اس نے دل گرفتگی سے سوچا
تھا۔ ان دنوں وہ ماما کے لیے بہت حساس ہو رہی تھیں اور اپنے لیے بھی پریشان ہو رہی تھی۔

پتا نہیں ماما نے اس کے لیے کیا سوچ رکھا تھا اور اس کی زندگی کے متعلق کیا فیصلہ کر رکھا تھا۔

کاش وہ جان سکتی۔

”دیکھو تم! اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔“ شہریار نے اسے سمجھایا تھا ”اپنی ساری سوچیں اور ساری
پریشانیاں مجھ سے دو اور تم صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ مریم نے پریشان ہو کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”اے ون۔“ اس نے پھر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرائی..... ”ڈونٹ وری۔“

”تو پھر ٹھیک ہے کل چلے جائیں گے۔“

”نہیں، جو آپ جائیں پلےز مور کا موڈ خراب ہو جائے گا۔“

”ہاں..... اتنی جلدی ناراض ہو جاتا ہے۔“ مریم کے لہجے میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

”اوکے۔ پھر ہم جلدی آجائیں گے۔“

”کمال کرتی ہیں، جو آپ۔“

عاشی ہنس دی۔

”میں کوئی پتی ہوں۔ آپ جائیں انجوائے کریں۔ کبھی کبھار تو نکلے ہیں اور نینا، مور بہت اکتا رہے ہیں۔“

”اچھا..... خدا حافظ۔“ مریم.... جانے کے لیے مڑی۔

”ارے ہاں..... سنیں۔“ عاشی کو اچانک یاد آیا ”نوں آیا تھا۔ ڈاکٹر شہر یار کا۔“

”اچھا کب؟“ مریم کا دل زور سے دھڑکا اور آنکھوں میں جھنوسے چمکے۔

”آپ سو رہی تھیں میں نے جگا نہیں اور پھر انہوں نے منع کر دیا تھا جگانے سے۔“ عاشی کی نظریں

اس کے چہرے پر تھیں ”یہ ڈاکٹر شہر یار وہی ہیں ناراض ہسپتال والے؟“

”ہوں۔“ مریم نے سر ہلایا۔

”غالباً یعنی آپ کی بھائی۔“ عاشی کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر تھیں۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ مریم اس کے مسلسل اس طرح دیکھنے سے گھبرا گئی۔

”کچھ نہیں، بس ماما کا پوچھا تھا اور آپ کی خیریت معلوم کی تھی۔“ عاشی نے نگاہیں اس کے چہرے

سے ہٹائیں اور مریم اسے خدا حافظ کہتے ہوئے باہر چلی آئی۔

عاشی کے بغیر مریم کا جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن نینا اور مور کے خیال سے وہ چلی آئی تھی۔

عاشی کے موڈ کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ پریشان سی ہو جاتی تھی۔ ان دو سالوں میں عاشی

کے اندر بے حد چیخ آئے تھے۔ بہت..... وہ بے تماشاً خوبصورت ہو گئی تھی۔ بالکل ماما کی طرح گلنے لگی تھی۔

وہ اس کے ساتھ کھڑی ہوتی تو اس سے لمبی لگتی تھی۔ کتنی خوبصورت ہامیت تھی۔

کتنی دلکش آنکھیں تھیں۔

وہ ساری کی ساری خوبصورت تھی اور کچھ کچھ مغرور بھی۔ اپنی ذات سے آگہی نے اس کے اندر ایک

عیب سی بے نیازی پیدا کر دی تھی۔

کبھی کبھی تو وہ ڈاکٹر عبدالمعید سے گھنٹوں باتیں کرتی۔ ان کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلتی..... ڈاکٹر ہادی

کے ساتھ گھیں لگتی اور کبھی انہیں بالکل نظر انداز کر دیتی تھی۔ جیسے اپنے اور ان کے درمیان موجود رشتے

کے قطعی انجناں ہو..... ابھی کل رات ہی ڈاکٹر عبدالمعید نے کتنے مان سے اسے اپنے ساتھ لے چلنے کی

درخواست کی تھی تا کہ اسے وہ گھر دکھائیں جو انہوں نے خریدا تھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔“

”عاشی، وہ گھر تمہارا ہے..... میں اسے تمہاری مرضی سے ڈیکوریٹ کرنا چاہتا ہوں..... پلےز ایک بار

چلو تو دیکھ لو۔“

”جو کو لے جائیں۔“ وہ ان کی بات کا جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور ڈاکٹر عبدالمعید

اداس سے ٹی وی لاؤنچ میں ہی بیٹھ گئے تھے۔

”سوری معید بھائی۔“ مریم کو افسوس ہوا تھا ”وہ بہت موڈی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔“

”اوکے۔ کوئی بات نہیں۔“

ڈاکٹر عبدالمعید مسکرانے لگے تھے لیکن مریم کا دل ان کے لیے کڑھتا رہا تھا۔ کیا تھا اگر عاشی ان کی اس

چھوٹی سی خوشی کا احساس کر لیتی۔

ایمی پارلر سے انہیں آنسکریم کھلا کر غیر ارادی طور پر اس نے گاڑی یعنی کے گھر کی طرف موڈ دی تھی

..... اتنے سارے دن ہو گئے تھے شہر یار سے بات کیے اور اس سے ملے۔ وہ تقریباً ایک ہفتے سے گاؤں گیا

ہوا تھا..... اور شاید گاؤں سے آتے ہی اس نے نون کیا تھا۔ یقیناً وہ بھی اداس ہو رہا تھا۔ وہاں سب ہی

انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”بچی مومو میں بہت اداس ہو رہی تھی تمہارے لیے۔ پوچھ لو ارسل سے۔ کل بھی میں نے اس سے کہا تھا

کہ مجھے تمہاری طرف لے جائے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ مہر وف ہے۔“ اس کے رخساروں

کو چوستے ہوئے یعنی نے کہا۔

”توبہ توبہ۔“ ارسل نے عینی کو چھیڑا ”اسے کہتے ہیں منہ دیکھ کی محبت۔ ایک بار بھی اس نے آپ

کے گھر چلنے کے لیے نہیں کہا۔ یہ کہتی اور میں نہ لے کر آتا ہے۔ یہ تاب یہ جمال یہ طاقت نہیں ہمیں۔“

”ارسل۔“ عینی حیرت کی زیادتی سے چیچی ”اتنا بڑا جھوٹ۔ مومو مجھی پوچھ لینا پچھو سے۔ پچھو بھی

تھیں اس وقت جب میں نے اس سے تمہاری طرف چلنے کے لیے کہا تھا۔“

ارسل ہنستا رہا۔

”مریم! اس کی بات پر بالکل یقین نہ کیجیے گا۔“

مریم ہولے ہولے مسکراتی رہی۔

یہ محبت بھری چھیڑ چھاڑ اسے ہمیشہ ہی اچھی لگتی تھی اور وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھی۔

نینا اور تیمور بھی بہت خوش تھے بلکہ تیمور نے تو تھوڑی سی دیر میں ارسل سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی اور اب مزے سے اس کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

عینی نے مریم کو اپنی پھپھو سے بھی ملوایا۔

”یہ رضوانہ پھوپھو ہیں مومی۔ کچھ دن ہوئے پایا انہیں گاؤں سے لائے ہیں۔“

بہت دلکش اور سوہری خاتون بہت محبت سے مریم سے ملیں۔

”اچھا تو میریم ہے۔“ انہوں نے اسے ساتھ لپٹا کر ہوئے پیار کیا ”ماشاء اللہ عینی تم نے اپنے لیے بہت پیاری بھائی ڈھونڈی ہے۔“

مریم کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”جی۔“ یعنی نے اپنے کالروں کو جھاڑنے کی ایکٹنگ کی۔

”یہ خدمت ہمارے لیے کب انجام دوگی۔ ہم تمہاری نظر کے قائل ہو گئے ہیں۔“

ارسل تیمور کے گرد بازو حائل کیے بیٹھا شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”منہ دھور کھو۔“

”وہ تو پہلے ہی دھلا دھلایا۔ کیوں پھپھو۔“

”ہمارا بیٹا تو سچ مچ کا شہزادہ ہے۔“ رضوانہ پھپھو نے اسے پیار سے دیکھا۔

”اچھا ابھی تم لوگ باتیں کرو۔ میں ذرا ابھابو کے پاس جا رہی ہوں کچن میں اور ارسل، تم ذرا آنا کچن

ارسل اٹھ کھڑا ہوا ”کیوں؟ اماں مجھ سے چائے بنوائیں گی؟“

”تم چلو تو۔“ رضوانہ پھوپھو، میس ”کیا خبر کھانا بھی تم ہی سے پکوانا ہو۔“

”او کے۔ آؤ یار تم بھی ذرا میری مدد کرنا۔“ وہ تیور کو بھی ساتھ لیتا گیا۔

”بتا ہے مومو۔ یہ ہماری رضوانہ پھپھو ہیں نا پہلے ان کا نکاح سکندر چاچو سے ہوا تھا۔ پھر سکندر چاچو

ہر چلے گئے اور پھر انہوں نے وہاں ہی شادی کر لی اور پھوپھو کو طلاق دے دی۔“

”مگر کیوں؟“ مریم کو حیرت ہوئی ”تمہاری پھوپھا بھی اتنی خوبصورت ہیں۔ ایک اتج میں تو وہ اور

”ہاں اماں بتاتی ہیں کہ رضی پھوپھو بہت خوبصورت اور دلکش تھی اور حاجو انہیں پسند بھی کرتے تھے لیکن

ہر وہاں جا کر وہ کسی دوسری عورت کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اماں کہتی ہیں وہ بھی بہت خوبصورت

”اور اب.....“ مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ”اب وہ کہاں ہیں؟“

”چاہیں انہوں نے کچھ ہی عرصے بعد چاچو سے ملید گی۔ لے لی تھی لیکن چاچو میرواپس نہیں آئے اور

فرمانہ چھوٹی بابائے ستادی سردی کی۔ ان کے ایسے بیٹے ہیں جو کہ ان کے پاس ہر شے ہے۔ اور عینی کے چاچا اس قدر بے وفا شخص ہیں

اور مریم کو اسوں ہوا کی خوب بھروسہ ملا یہیں

کچھ ہوا دے ماما کتنے نرم خوش تھے لیکن انہوں نے بڑی امی کو دکھ دیا اور سکندر چاچو

میں نے کہا: "میں نے سب سے پہلے آپ کی بات سنی۔" وہ نے کہا: "میں نے سب سے پہلے آپ کی بات سنی۔" وہ نے کہا: "میں نے سب سے پہلے آپ کی بات سنی۔"

لیکن وہ اس کے لیے بابا کی طرح ہی لگے تھے..... لیکن انہوں نے رضوانہ پھوپھو کو دکھ

سر سرنی کی ٹانگیں اس صدمے کو کس طرح برداشت کیا ہوگا۔ اس کا جی چاہا وہ رضوانہ پھینکو

دیا۔ اور راز کو کھلے پائے۔ پھر وہ اپنی سوچ پر خود ہی خاموش ہو گئی۔ کیسی الٹی سیدھی باتیں اس کے دماغ میں آتی رہتی تھیں۔

تھیں اب جب سے مکنی نے اسے رضوانہ بھوپ کے متعلق بتایا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے

لو جیسے کہ جب سکندر راجا چو نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ کس طرح زندہ رہیں۔ لیسے اپنے آپ کو سنبھالا.....

خبر سہمی..... کبھی اسے بھی اس طرح کی مصورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا تو..... شہر یار کے بغیر رہنا پڑا تو.....

اف او کس قدر۔ بری سوچ تھی اس کی..... اس نے خود کو سرزنش کی۔

”شیری بھائی تو اسپتال میں ہیں۔“ عینی نے شرارت سے اس کی اٹھولیں بھاری۔

”مجھے معلوم ہے۔“ مریم چوٹی۔

”آج دیر سے آئیں گے شاید۔“

”میں تم سے ملنے آئی ہوں۔“

”جی آئی تو مجھ سے ہی ملنے ہو مانا عین اکر سیر کی بجائی سے کی ملاقات ہو جیسا کہ یہاں

”ہاں حرج تو کوئی نہیں تھا مگر تیرے مریم سے ایسا بے میں ہوا اور اللہ سب سے اعلیٰ ہے۔“

”ارے اسی جلدی..... ابھی تو چائے ہی نہیں پی اور اماں کو سسے مارے | اسی لیے

لہاڑ جانا نیتا اور موز سی ہیں۔

”ہاں، ہاں کہہ کر جانا۔“ حیدری ٹار بھی اسنے کمرے سے باہر

پھر سب نے ہی اسے روک دیا۔

”اتنے دنوں بعد آئی، ہو اور پھر یہ ہمارے ننھے منے بچے بھی آئے ہیں۔“

”نہیں بابا۔ وہ عاشق سے میں نے جلد آنے کو کہا تھا۔“

”تو عاشقی کو خون کر دو۔ ارسل اسے بھی جا کر لے آتا ہے۔“

”ہوں۔“

وہ نینا کے ساتھ اندر آئی۔ تیمور ٹی وی لاؤنچ میں کھڑا عاشری کو آواز میں دے رہا تھا۔

”عاشری آپنی عاشری آپنی کدھر ہیں آپ؟ آجائے ہم آگئے ہیں۔“

”وہ جی ڈرائنگ روم میں ہیں۔“ صفونے پگن سے نکل کر بتایا تو مریم ٹی وی لاؤنچ کی طرف جاتے جاتے ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئی۔

شرجیل مرزا کے بالکل سامنے عاشری بیٹھی اس کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔

”آہا..... مس مریم آئیے۔“ شرجیل مرزا اٹھ کھڑا ہوا ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔“

”خیریت..... کیسے آنا ہوا..... ماما تو ابھی تک کراچی میں ہیں۔ شاید اس ماہ کے اینڈ میں آئیں گی..... آپ کو تو معلوم ہی ہوگا۔“

اس کے برتاک خیر مقدم کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے مریم نے خشک لہجے میں پوچھا۔

”مگر میں تو آپ سے ملنے آیا تھا مس مریم.....“ شرجیل مرزا کالہجہ معنی خیز تھا۔

”جی فرمائیے۔“ مریم ابھی تک کھڑی تھی۔

”آپ بیٹھیے نا اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“

مریم نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی اور عاشری کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”دراصل۔“ شرجیل مرزا ابھی بیٹھ گیا ”میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ اس روز جب آپ کی ماما جا رہی تھیں تو آپ نے بیٹی صاحب کو بتایا تھا کہ آپ اپنی ایجوکیشن مکمل کرنے کے بعد جاب کرنا چاہتی ہیں تو.....“ اس نے کن انکھیوں سے مریم کی طرف دیکھا جو ساٹ چہرے کے ساتھ اس کی بات سن رہی تھی۔

”تو دراصل بات یہ تھی کہ میری پرسنل سیکریٹری جاب چھوڑ کر باہر چلی گئی ہے تو یہ سیٹ خالی ہے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دو ماہ کی تو بات ہے آپ پڑھائی سے فارغ ہو جائیں تو یہ سیٹ آپ کے لیے رکھی جاسکتی ہے اگر آپ انٹرنسٹڈ ہوں۔“

”سوری میں بالکل انٹرنسٹڈ نہیں ہوں۔“

”مگر آپ تو خود کہہ رہی تھیں اس روز جاب کرنے کا۔ مسز عثمان کی وجہ سے میں نے سوچا کہ گھر کی بات ہے ایک دو ماہ تک یونہی کام چلاؤں گا۔ جاب ملنا کوئی آسان تو نہیں ہے۔“

”جی بجا فرمایا آپ نے لیکن میں کوئی معزز جاب کرنے کو کہہ رہی تھی۔“

”ارے یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ پرسنل سیکریٹری کی جاب معزز نہیں ہے۔“

”عاشری آپنی۔ عاشری آپنی۔ ٹی وی لاؤنچ سے پھر تیمور کی آواز آئی ”جلدی آئیے آپ کا پسندیدہ پروگرام آرہا ہے۔“

”نہیں..... آج اس کا موڈ نہیں تھا کہیں جانے آنے کا۔ وہ نہیں آئے گی۔“

اور پھر وہ سب کے اصرار کے باوجود کھانے تک نہ رکی۔

”عاشری گھر میں اکیلے تھی اور پاپا نے اسے کہا تھا زینہ کی اپنی مصروفیات ہیں۔ تم خیال رکھنا سب کا۔ زیادہ دیر تک باہر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اگرچہ معید بھائی بھی آگئے ہوں گے اور انکل ہادی بھی لیکن امید نہیں عاشری کمرے سے باہر نکلی ہو۔ جب سے چھٹیاں ہوئی تھیں اور وہ لوگ گھر آئے تھے تو وہ خاصی چڑچڑ سی ہو رہی تھی شاید ماما کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے لاشعوری طور پر اس طرح بی بیہوش رہا تھا۔ ابھی ان سب کو ماما کی کتنی ضرورت تھی۔ ان کی موجودگی کی۔ گھر میں اتنے سارے لوگ تھے پھر بھی ماما کے بغیر گھر کیسا خالی خالی لگتا تھا۔ ماما ہوتی تھیں تو رونق لگی رہتی تھی اب وہ دو تین دن کے لیے آتی بھی میں تو خوب رونق ہو جاتی۔“

تیمور اور نینا سارا راستہ چبکتے رہے۔

”ارسل بھائی کے ساتھ بہت مزہ آیا بھو۔ ہم نے کرکٹ بھی کھیلی اور میں نے دوسری ہی بال پر انہیں آؤٹ کر دیا۔“

وہ بے دھیانی سے ہوں ہاں کرتی رہی۔

تیمور مسلسل بولتا رہا۔ وہ بے حد خوش تھا جب سے وہ مری سے آیا تھا پہلی بار مریم نے اسے اتنا خوش دیکھا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ اتنے دنوں سے وہ پڑھائی میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ انہیں آؤٹنگ کے لیے کہیں لے جایا جائے۔

”مومو۔“ تیمور نے اس کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا ”آپ کل بھی ہمیں لے جائیں گی آؤٹنگ کے لیے؟“

”ہاں کل بھی۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور گیٹ کے سامنے ہارن بجایا چونکہ کیر نے گیٹ کھول دیا تو پورچ میں ڈاکٹر عبدالعزیز کی گاڑی کے ساتھ ایک اور گاڑی دیکھ وہ چونکی۔

”یہ گاڑی تو.....“

”انکل شچی کی ہے۔“ تیمور نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کی بات مکمل کی اور اندر کی طرف بھاگ گیا۔

”شرجیل مرزا کب آئے ہیں؟“ گاڑی لاک کر کے اس نے چونک کر اسے پوچھا۔

”کافی دیر ہو گئی ہے۔“

”تو تم نے بتایا نہیں تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔“

”بتایا تو تھا۔ کہنے لگے انتظار کر لوں گا۔ آپ سے کوئی کام تھا جی۔“

عاشی اٹھ کھڑی ہوئی ”اچھا انکل میں جا رہی ہوں۔ سو بار بار ہے۔“

”اوکے گڑیا..... پھر سوچنا میری بات کو۔“

عاشی سر ہلا کر چلی گئی تو مریم نے سوالیہ نظروں سے شرجیل کو دیکھا۔

”کیا بات؟“

”بھئی یہ ہماری آپس کی بات ہے۔“ وہ بائیں آنکھ کا کوننا دبا کر ہنسا۔

”کیا پٹی پڑھا رہے تھے آپ عاشی کو۔“

”یہ تو تم اسی سے پوچھنا۔“ عاشی کے جانتے ہی وہ بے تکلفی پر اتر آیا ”اس وقت تو ادھر دیکھو ہماری

طرف..... سچ ترس جاتے ہیں تمہاری صورت دیکھنے کو۔“

”میرے خیال میں آپ، بات ختم ہو چکی۔ اب آپ جائیں۔“ مریم نے بڑی مشکل سے اپنے

آپ کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا ”اور جیسے آپ کی جاب سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی

”ارے ارے۔“ شرجیل نے یوں ہاتھ آگے بڑھایا جیسے اسے جانے سے روک رہا ہو۔ باب

تو ایک بہانہ تھی۔ ہم تو تمہاری خاطر آئے تھے اور اب جی بھر کے شربت دیدار تو پینے دو۔ پیاسے ہیں۔“

ضبط کی کوشش میں اس کے رخسار تھما اٹھے اور ہونٹ لرزنے لگے۔

”پلیز آپ ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ.....“

”کیوں خفا ہوتے ہو پیارے مرے نظارے سے۔“ شرجیل مرزا آنکھیں میچ میچ کر گنگنایا۔

”شریف۔“ مریم نے آواز دی۔

”شریف کو کیوں آواز دیتی ہو؟ حکم کرو تو کنوئیں میں چھلانگ لگا دیں گے۔“

”تو جناب۔“ مریم نے دانت پیستے ہوئے کہا ”میرا حکم ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے

جائیں اور آئندہ ماما کی عدم موجودگی میں یہاں آنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“

”ضرورت..... ہماری ضرورت کیا ہے۔“ شرجیل مرزا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری ”وہ کیا کہتے

ہیں کہ..... اس قدر معصوم ہے وہ.....“

مریم پوری بات سننے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی اور ٹی وی لاؤنج میں کھڑے ہو کر شریف کو

آواز دی ”شریف شرجیل صاحب کو گیٹ تک چھوڑ آؤ۔“

”کہاں ہیں جی وہ؟“ جھاڑن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے شریف نے ادھر ادھر دیکھا جب ہی شرجیل

مرزا ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔

عاشی نینا اور مور بہت دھیان سے ٹی وی پر ”بلیک بیوٹی“ دیکھ رہے تھے۔

”ہیلو نینا اور مور۔“ مریم کو نظر انداز کر کے شرجیل مرزا نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔

”ہیلو انکل۔“ دونوں نے بہ یک وقت کہا۔

”ہاؤ آر یو۔“

”فائن۔“ وہ ٹی وی کی طرف متوجہ تھے۔

”اور عاشی گڑیا..... خدا حافظ۔“ اس نے مریم کو دیکھتے ہوئے آنکھ کا کوننا دبا یا۔

”بلیک بیوٹی“ عاشی کا بھی پسندیدہ پروگرام تھا۔

”شریف۔“ اندرونی گیٹ بند کر کے وہ ٹی وی لاؤنج سے گزرا تو مریم نے اسے آواز دی۔ وہ ابھی

ٹک ٹی وی لاؤنج کے وسط میں کھڑی تھی۔

”جی۔“

”سنو بیٹر دل سے کہہ دو کہ جب تک ماما نہیں آئیں اس شخص کو گیٹ پر سے ہی واپس کر دے۔“

”کیوں جی؟“ شریف نے آنکھیں پھیلا لیں ”کیا ہوا جی۔“

”میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔ یہ شخص آئندہ ماما کی عدم موجودگی میں نہیں آئے گا۔“ مریم کا خون کھول

رہا تھا ورنہ اس نے اونچی آواز میں کبھی بات نہیں کی تھی۔

”کیا ہوا بجو؟“ عاشی چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ پیشانی سے پینے کے قطرے پونچھتے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔

”آپ نے یہ شریف سے کیا کہا ہے؟“ عاشی اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”کچھ نہیں۔ ماما نہیں ہیں نا۔ اس لیے میں نے منع کیا ہے۔“ حتی الامکان اپنے لہجے پر قابو پاتے

ہوئے اس نے نرمی سے کہا۔

”مگر انکل جی تو ابھی آدمی ہیں۔“

”ہاں..... تم..... تم سے کیا بات کی تھی انہوں نے۔“

”کچھ نہیں..... کوئی خاص نہیں۔ بس ایسے ہی گپ لگاتے رہے۔“

”لیکن وہ کیا بات سوچنے کو کہہ رہے تھے؟“ مریم کی پرسوج نظریں عاشی کے چہرے پر تھیں۔

سادہ سے بلیو سوٹ میں اس کی گلابی رنگت بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

”اوہ ہاں.....“ عاشی کی آنکھیں چمکنے لگیں ”وہ کہہ رہے تھے کہ انہیں اپنے ایک ایڈ کے لیے ماڈل کی

ضرورت ہے اور میں بالکل ویسی ہی ہوں جیسی ماڈل کی انہیں ضرورت ہے۔ کم سن، خوب صورت

اور معصوم۔“

مریم نے اندر ہی اندر دانت پیستے ”فضول..... تم نے منع کر دیا نا کہ.....“

”نہیں..... میں نے کہا تھا ماما سے پوچھوں گی۔ کچی بجو کتنا اچھا لگے گا اپنے آپ کو اسکرین پر



دیکھنا..... وہ کہہ رہے تھے کہ میری اسکرین بیوی بہت اچھی ہے۔
”تم..... عاشری تم آئندہ کبھی اس شخص سے بات نہیں کرو گی اور نہ ہی تمہیں ماڈلنگ وغیرہ کرنا ہے
اور پھر معید بھائی بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔“

عاشری نے قدرے حیرت سے مریم کو دیکھا۔

”کیوں ماما بھی تو ماڈلنگ کرتی رہی ہیں بھلا اس میں کیا برائی ہے..... اور پھر معید تو بہت اچھے ہیں
وہ بھلا کیوں منع کریں گے۔“

”عاشری..... میں کہہ رہی ہوں نا تم سے..... نہیں کرو گی تم آئندہ اس شخص سے بات۔“

عاشری نے ایک نظر مریم کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر دو بار اقلور کشن پر جا کر بیٹھ گئی۔

”اور کس قدر کمینہ ہے یہ شخص.....“ مریم نے سوچا..... ”اب عاشری کو درغلز رہا ہے..... اور عاشری اتنی
معصوم ہے کہ.....“

”خیر ماما عاشری کو اس وقت تک ماڈلنگ کی اجازت نہیں دیں گی جب تک وہ پڑھ رہی ہے..... اس
نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔“

ایک بار جب پہلے بھی شرجیل مرزا نے ماما سے خود مریم کے لیے بات کی تھی کہ وہ اسے بطور ماڈل
متعارف کرانا چاہتا ہے تو ماما نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”اور پتا نہیں یہ شخص کیا چاہتا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔

ایک دم ہی درد سا اٹھا تھا۔ ماما کی طرح اسے بھی اکثر پریشانی میں در و شروع ہو جاتا تھا۔

”ہیلو! پوری بوڑی۔“ ڈاکٹر عبدالمعید نے میز ہیوں سے اترتے اترتے سب کو مخاطب کیا۔

”ہیلو معید بھائی۔“ تیمور دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔

ڈاکٹر عبدالمعید کی عادت تھی کہ اگر وہ وقت پر کلینک سے آجاتے تو آرام کے بعد اس وقت کچھ دیر ان
کے پاس آکر بیٹھتے تھے..... اس وقت بھی وہ گھریلو لباس میں تھے۔ پاؤں میں چپل تھے اور شلوار کرتا پہنے
ہوئے تھے۔ ان کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہی ہو گئی تھی۔

”آئیے معید بھائی بہت اچھی موڈ ہے۔“ نینا نے بھی مرکز انھیں دیکھا۔

”اچھا۔“ وہ تیمور کا ہاتھ تھامے تھا۔ آکر بیٹھ گئے۔ عاشری اور مریم نے انہیں سلام کیا۔ لمحہ بھر کے لیے
ان کی نظروں نے عاشری کے چہرے کا اف کیا پھر وہ مریم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”پڑھائی کیسی جاری ہے؟“

”اچھی ہو رہی ہے۔“ مریم ہنسی کی لالچائی تھی۔

”خیریت مریم! آپ کی طبیعت تو تھک ہے نا۔“



”جی۔“ مریم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”لیکن مجھے آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ ماما تو ٹھیک ہیں نا۔ کوئی فون آیا تھا کیا؟“

”نہیں تو..... ماما کا بھی فون نہیں آیا دو تین دن سے۔“

”مگر آپ کچھ الجھی الجھی لگ رہی ہیں۔ کیا آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتیں..... مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھیں۔“

مریم نے تشکر سے انہیں دیکھا۔ ڈاکٹر عبدالمعید کی اس اپنائیت نے اندر ہی اندر اسے بہت مطمئن کر دیا تھا۔

”جی وہ شچی صاحب آئے تھے۔ انہوں نے کچھ بولا ہے بی بی کو۔“ شریف جو ابھی ابھی بی بی کی لاؤنج

میں آیا تھا اس نے ڈاکٹر عبدالمعید کو بتایا تو مریم نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”شریف، تمہیں فضول بولنے کی عادت ہے۔“

”مریم۔“ ڈاکٹر عبدالمعید پریشان ہو گئے۔ ”کیا کہا ہے اس ربش آدمی نے؟ مجھے کیوں نہیں

بولوایا..... جب اس نے کچھ کہا تھا۔ میں تھا نا اوپر آپ کو پتا نہیں..... اور میں کس لیے شفت نہیں کر رہا

یہاں سے گھر لینے کے باوجود..... صرف اس لیے کہ آپ کی ماما نہیں ہیں اور انکل نے وعدہ کیا تھا ان سے

کہ ہم لوگ آپ کا خیال رکھیں گے۔ پھر.....“ وہ ایک دم تیز بولتے گئے..... ”اور اس کی جرات کیسے

ہوئی کچھ کہنے کی۔“

مریم کو ڈاکٹر عبدالمعید پر فخر محسوس ہوا۔

”عاشری! کیا بات ہوئی ہے؟“ مریم کو خاموش دیکھ کر وہ عاشری کی طرف مڑے۔

”مجھے تو معلوم نہیں۔“ عاشری نے نظریں اٹھائیں ”شاید بچو کوان کا ماما کی عدم موجودگی

میں آنا اچھا نہیں لگا۔“

”مریم فارگاڈ سیک چپ کیوں ہو۔ اس نے اگر کوئی فضول حرکت کی ہے تو میں اس شخص کو قتل بھی

کر سکتا ہوں۔“

”تھیک یو معید بھائی! مجھے آج صبح اس بات پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ آپ میرے بھائی ہیں..... بس

مجھے مناسب نہیں لگا کہ وہ ماما کی عدم موجودگی میں یہاں آئیں۔ سو میں نے منع کر دیا آنے کو اور شریف

سے بھی یہی کہا تھا کہ شیر دل کو سمجھا دے کہ جب تک ماما نہیں ہیں وہ یہاں نہ آئیں۔“

”بہت اچھا کیا تم نے مریم۔ یہ شخص شرجیل مرزا انتہائی خبیث آدمی ہے اگر کبھی بھی کوئی مسئلہ ہو تو پلیز

مریم! مجھے سے انکل سے یا ڈیڈی سے کسی سے بھی کہتے ہوئے مت جھجکنا..... ہم سب آپ کے ہیں.....“

”مومنو! دیکھو بلیک ہارس زخمی ہو گیا۔“ تیمور نے بتایا تو مریم بی بی کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن مووی ختم

ہوئی تھی۔

”مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔“ تیمور نے معید سے پوچھا۔ ”آپ کو رائیڈنگ پسند ہے؟“

ارسلان اور ارمغان کھڑے ہو گئے۔

”کیسے ہو بھی تم لوگ؟“ انہوں نے بیٹھے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس صوفے کی طرف بڑھ گئے۔
جدھر سرور اور تصدق احمد بیٹھے تھے۔ دونوں سے مصافحہ کر کے وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”ہاں تو ارسلان صاحبان کیا ہو رہا ہے آج کل؟“

”کچھ نہیں سر۔ بالکل فارغ ہیں۔“ ارسلان نے بتایا۔

”کوئی جاب وغیرہ نہیں کی؟“

”سر جاب ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔“

”خیر تم تو یہ نہ کہو ارسلان تمہیں تو بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔“

سرور نے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن میں ایسی جاب نہیں کر سکتا مائی ڈیر کزن جس میں دل ذہن اور ضمیر کو فروخت کرنا پڑے۔“

”پرائیویٹ جاب تھی کیا.....؟“ پروفیسر عادل نے پوچھا۔

”جی سر لیکن سارا کا سارا عملہ ہی کرپٹ تھا اور سب چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے رنگ میں رنگ

جاؤں لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ دو ماہ میں ہی انہوں نے مجھے بھگا دیا وہاں سے۔“ وہ ہنسا۔

”خیر دیکھیں گے انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور ارمغان میاں تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟“ وہ

ارمغان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں تو آپ کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔ شروع ہی سے میرا ارادہ ایجوکیشن میں آنے کا ہے۔

پبلک سروس کمیشن کا ٹیسٹ اور انٹرویو تو دے دیا ہے۔ دیکھیں کیا رزلٹ آتا ہے۔“

”انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔“ پروفیسر عادل نے اسے حوصلہ دیا اور پھر تصدق احمد کی طرف متوجہ ہو گئے

”جی تصدق میاں اب آپ کے کیا ارادے ہیں۔ ڈراما تو ہو گیا اور پذیرائی بھی مل گئی۔“

”ہاں کچھ کچھ۔“ تصدق احمد افسردہ سے تھے۔

”آپ کی توقع سے کم لیکن تصدق احمد میرے خیال سے اتنی پذیرائی کا ملنا بھی بہت ہے۔ ان

حالات میں جب دیکھنے والے ایک مخصوص انداز کا تھیٹر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اتنی پذیرائی کا ملنا بھی

غیرت ہے۔“

”میرے خیال میں۔“ سرور نے تبصرہ کیا ”ہمارا ایجوکیٹڈ طبقہ تھیٹر بہت کم دیکھتا ہے۔ تھیٹر دیکھنے

والے زیادہ لوگ ایسے طبقے سے ہیں جو اس طرح کی ہلکے بازی پسند کرتے ہیں اور مذاق..... بعض

اوقات تو بہت چپ ہو جاتا ہے۔“

”ہاں۔“ ارسلان نے بھی حصہ لیا ”جو لوگ..... اسٹیج ڈراما کر رہے ہیں وہ مجبور ہیں۔ مانگ ہی اس

”بہت۔“

”اچھا۔“

عاشی بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”میں ماما سے کہوں گا مجھے ایک گھوڑا لے دیں۔ بلیک بیوٹی۔“

”ماما کبھی تمہیں گھوڑا لے کر نہیں دیں گی۔“ زینا ہنسنے لگی ”انہیں گھوڑے پسند نہیں ہیں۔“

”تو کیا ہوا؟ میں عادل بھائی سے کہوں گا..... ان کے پاس تو گھوڑے ہیں۔ وہاں گاؤں میں ایک روز

انہوں نے مجھے دکھائے تھے۔“

”اچھا۔“ ڈاکٹر عبدالعزیز اس سے باتیں کرنے لگے۔ وہ اپنے بچپن کی کوئی بات بتانے لگے۔ جب

وہ پہلی بار گھوڑے پر بیٹھے تھے تو عاشی اور مریم بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔



ہائے کرو لے والی ندی زناتے لیے آئے

جب ندی کا پانی میرے پاؤں تلے آئے

مجھے گودوں لے لو سا نور یا میری پائل بھیگی جائے

ہائے کرو لے والی ندی زناتے لیے آئے

جب ندی کا پانی میرے گھٹنے تلے آئے

مجھے گودوں لے لو سا نور یا میری گھکری بھیگی جائے

ہائے کرو لے والی ندی زناتے لیے آئے

جب ندی کا پانی میری کمر تلے آئے

مجھے گودوں لے لو سا نور یا میری چولی بھیگی جائے

ہائے کرو لے والی ندی زناتے لیے آئے

جب ندی کا پانی سر سے گزر جائے

مجھے دھکا دے دو سا نور یا

میرا ابا پیچھے آئے

خدا بخش اونچی آواز میں گارہا تھا اور ارسلان اور ارمغان تالی بجاتے ہوئے اس کا ساتھ دے رہے

تھے۔ سرور اور تصدق ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے تھے کہ پروفیسر عادل کمرے

میں داخل ہوئے۔

”یہاں تو بڑی رونق لگا رکھی ہے آپ نے۔“

طرح کی ہے۔“

”نہیں، ارسلان میاں میں اس جواز کو نہیں مانتا۔ ہم انہیں ایجوکیٹ کر سکتے ہیں، اچھے پلے دے کر مکر وقت لگے گا۔“

”لیکن جب مسلسل وہ بہتر سے بہتر کی طرف آئیں گے تو خود ان کا رجحان بدلتا جائے گا۔“ تصدق احمد نے بھی بحث میں حصہ لیا۔

”تو پھر کیا ارادہ ہے کیا کوئی مزید.....؟“

”نہیں، فی الحال تو نہیں۔“ تصدق احمد نے ان کی بات کاٹی ”ایک مخصوص گروپ کی پذیرائی کے باوجود ادا کاروں وغیرہ کے معاوضے ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچا۔“

”خدا بخش یا رُچائے وغیرہ پلانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“

خدا بخش جو دھیان سے ان کی باتیں سن رہا تھا فوراً کھڑا ہو گیا۔

”جی نہیں۔ کیوں نہیں۔“

”تصدق بھائی اب کے کوئی پلے کیا تو اپنے خدا بخش کو کوئی رول دینا۔“ سرور نے مسکرا کر اسے دیکھا ”اسے تھیر کا بہت شوق ہے۔“

”ضرور۔“ تصدق احمد نے بھی مسکرا کر خدا بخش کی طرف دیکھا۔

”آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا دن کو۔ کھانا بھی لاؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں چائے پیوں گا۔“

”سر ہمیں تو اجازت دیں۔“ ارسلان اور ارمغان کھڑے ہو گئے۔

”چائے پی کر جانا۔“

”نہیں سر۔ چائے پھر کبھی سہی۔ بہت دیر سے ہم آئے بیٹھے تھے۔“

”سوری بوائز۔ میں دراصل صبح فیصل آباد چلا گیا تھا۔ وہ ماں جی پتا نہیں کیوں ان دنوں واہموں میں پڑی ہوئی ہیں، بس وہاں سے آتے آتے دیر ہو گئی۔“

”سرور تم تو روکو گے نا..... یا تم بھی؟“ انہوں نے سرور کی طرف دیکھا۔

”سر، میں ابھی تو ہوں البتہ رات کو مجھے جانا ہو گا۔ دراصل امی آج کل آئی ہوئی ہیں۔“

”کہاں یا رُچائے تم نے بتایا بھی نہیں۔ چیک اپ وغیرہ کروایا۔“

”جی، ماں جان خود جا کر لے کر آئے ہیں۔ وہ تو آئی نہیں رہی تھیں اور شیریں لے گیا تھا، چیک اپ

کے لیے۔“

”کیا پتا چلا۔“

”دے کی تکلیف ہے اور کمزوری ہے۔“

”اچھا خیال رکھا کرو ان کا..... اور ارسل میاں تم لوگ بھی رک جاتے۔ سرور کے ساتھ ہی چلے جاتے۔“

”پھر حاضر ہوں گے سر۔ آج شیریں کے کسی دوست کے ویسے کانفرنس ہے، ادھر جانا تھا۔“

”اوکے پھر۔“ انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی انہیں خدا حافظ کہا۔

”آپ کب ایسا کوئی فنکشن کر رہے ہیں سر؟“ تصدق احمد اگرچہ بہت سنجیدہ مزاج کا تھا اور پروفیسر

بادل کے ساتھ بے تکلف بھی نہیں تھا۔ لیکن بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

”میں۔“ پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی اور تصور میں مریم کا چہرہ آ گیا۔

”مریم.....“ دل ہی دل میں انہوں نے اس کا نام دہرایا۔

اس نام میں کتنی حلاوت تھی۔

کتنی مٹھاس تھی۔

دن میں نہ جانے کتنی بار وہ دل ہی دل میں اس نام کو دہراتے تھے اور پھر اس کی حلاوت دیر تک محسوس کرتے رہتے تھے۔ کتنا ہی چاہتا تھا ان کا کہ دیر تک وہ اسے سامنے بٹھائے اس سے باتیں کریں۔

اسے اپنی راتوں کی بے چینوں اور دنوں کی بے کفنی کا حال بتائیں۔

اسے بتائیں کہ کیسے وہ صرف ایک تصویر تھی اور پھر یہ تصور اسے دیکھ کر ایک شبیہ میں ڈھل گیا تھا۔ کتنی انسانی سی بات ہوئی تھی ان کے ساتھ کہ انہوں نے بس اسے ایک نظر دیکھا تھا اور دل نے گواہی دی تھی کہ سن ہے وہ جس کا مدتوں انہوں نے انتظار کیا تھا اور جس کے انتظار میں وہ کہیں رکے نہیں تھے۔ کہیں قیام نہ کیا تھا اور اب وہ ملی تھی تو یہ کیسی مصلحتیں تھیں جو انہیں کچھ کہنے سے روک رہی تھیں اور جانے کب وہ اس سے کچھ کہہ پائیں گے۔

جب اسے بندھی تھی انصہراب میں اسٹاف ہو گیا تھا۔ کئی بار بے اختیار اسے دیکھنے اس سے باتیں کرنے کو بھی چاہا تو وہ نہ بولا جانے کے ارادے سے گھر سے نکلے لیکن پھر کبھی دیر نہ آتے اور کبھی گھر کے پاس سے پلٹ آتے۔

”بچے بھی تو نہیں ہیں، کیا کہوں گا کیوں آیا ہوں، کس لیے آیا ہوں۔“

اس روز بھی وہ یوں ہی گھر کے پاس سے پلٹ رہے تھے کہ میڈم نرگس نے انہیں دیکھ لیا۔ ان کی گاڑی نہ بولا سے باہر آ رہی تھی۔

”عادل میاں۔“ انہوں نے سر باہر نکال کر اتنے زور سے آواز دی کہ پروفیسر عادل نے جو گاڑی ریورس کرنے لگے تھے چونک کر ادھر دیکھا تو میڈم نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا اور پھر اتر کر ان کے پاس آئیں۔

”ارے آپ چپکے چپکے کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔“
 ”کہیں نہیں۔“ وہ دل ہی دل میں نادم سے ہو گئے تھے۔ جانے میڈم کیا سمجھیں گے۔
 ”دراصل ادھر ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ بے دھیانی میں کچھ آگے نکل آیا۔ اب کہ ان کا گھر پکھلے
 بلاک میں ہے۔ اب ریورس کرنے لگا تھا۔“
 ”چلیے صاحب، بے دھیانی میں ہی سہی اب آئی گئے ہیں تو کچھ دیر غریب نے کو بھی رونق بخینے۔
 بھئی اب تو آپ اس گھر کے ہونے والے داماد ہیں۔ کیوں زبانی؟“ انہوں نے پیچھے مڑ کر نہنہ ہوا۔
 سے کہا تھا جو خود بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔
 شن شن۔ ان کے اندر جلت رنگ سے نچ اٹھے تھے۔
 اور ان کو ادھر ادھر یہاں وہاں ہر جگہ چراغاں ہو گیا تھا۔ اگر وہ کسی مملکت کے بادشاہ ہوتے تو میڈم کو
 اس اتنی خوبصورت بات پر جانے کیا عنایت کر دیتے۔
 ”ہاں ضرور۔ آئیے نا عادل۔“ نزنہ عثمان نے بھی مسکرا کر انہیں دعوت دی۔
 ”کیسی ہیں آپ؟“ دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئے۔
 ”فائن۔“ نزنہ عثمان نے ان کا سر تاپا جائزہ لیا ”ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے کبھی کبھی چکر لگایا
 کریں۔ کوئی حرج تو نہیں ہے۔“
 ”وہ دراصل۔“ اس غیر متوقع آفر پر وہ کچھ شپٹا سے گئے تھے ”بچے نہیں تھے نا تو..... ورنہ ان سے
 ملنے تو آتا ہی ہوں۔“
 ”بچے بھی ایک دور واز میں آجائیں مگر کیا ہمارا کوئی حق نہیں۔“
 ”جی کیوں نہیں ضرور حاضر ہوں گا کسی وقت۔“
 ”مگر ابھی کیا حرج ہے۔“ میڈم نرس کی آنکھوں میں ہلا کی چمک تھی۔
 ”نہیں حرج تو کوئی نہیں لیکن شاید آپ لوگ کہیں جا رہے تھے۔“
 ”کہیں کسی خاص جگہ نہیں۔“ میڈم نرس نے ہی جواب دیا ”یوں ہی بس آؤنگ کے لیے نکلے
 تھے۔ آپ آئیں کچھ دیر بیٹھیں آؤنگ تو روز ہی ہوتی ہے اور آپ سے ملاقات روز نہیں ہو سکتی۔“
 ”ہاں ہاں آئیے۔“ نزنہ عثمان غالباً میڈم نرس کی بات روز نہیں کر سکتی تھیں شاید بہت ہی گہری دوستی تھی۔
 ”کبھی کبھی آرزو میں اس طرح اچانک بھی پوری ہوتی ہیں.....“ نزنہ ولا کے ڈرائنگ روم میں
 بیٹھے ہوئے پروفیسر عادل نے سوچا تھا۔
 کتنا جی چاہ رہا تھا ان کا مریم کو دیکھنے کو۔
 چاہے ایک نظر ہی سہی۔

اب وہ ان کے سامنے کھڑی ان سے بی آپاں جی اور کامل کی خیریت پوچھ رہی تھی۔
 دلکش آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ شاید سوتے سے اٹھ کر آئی تھی۔ چہرے پر وہی حسن اور مصومیت
 کا دلکش استخراج جس نے پہلے روز ہی انہیں اسیر کر لیا تھا۔
 ”سر آپ کیا سوچنے لگے؟“ تصدق احمد نے پوچھا تو وہ چونک پڑے۔
 ”کچھ بھی نہیں۔ بس یوں ہی ایک خیال آ گیا تھا۔“
 ”وہ خیال کسی حسن دلبر کا تو نہیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے ان کی پشت پر سے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔
 ”ارے مجتبیٰ آپ کب آئے؟“ پروفیسر عادل نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔
 ”جب آپ خیالوں ہی خیالوں میں کسی حسین صورت کے ساتھ محو خرام تھے۔“ مجتبیٰ مسکراتے ہوئے
 سامنے آ گئے۔
 ”دراصل آپ اتنے دے پاؤں آئے کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔“
 ”ہوتا ہے ہوتا ہے عادل میاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔“ مجتبیٰ حیدر ہنستے ہوئے ان کے سامنے
 والے اصول پر بیٹھ گئے اور سرور اور تصدق احمد کی طرف دیکھا۔
 ”ہیلو صاحبان آپ کیسے ہیں؟“
 ”اللہ کا شکر ہے جی۔“
 ”سرور میاں آپ کیا کر رہے ہیں آج کل؟“
 ”انتظار ایک اچھی جاب کا۔ ویسے عارضی طور پر میں نے ایک پبلک اسکول میں آرٹ ٹیچر کی جاب
 کر لی ہے۔“
 ”ڈرائنگ ماسٹر۔“ تصدق احمد ہنسا۔ عجیب سی ہنسی جس میں ٹوٹے کانچ کی چھین تھی۔
 ”میں بھی سوچ رہا ہوں کہ ایسی ہی کوئی جاب کر لوں یا پھر دا تا در بار کے سامنے رنگ اور برش لے کر
 بیٹھ جاؤں۔ بانی داوے سیلری کیا ہے تمہاری؟“
 ”تقریباً تین ہزار۔“ سرور سنجیدہ تھا۔
 ”سم تھنک از بیئر دین تھنک۔“ مجتبیٰ حیدر نے قہقہہ لگایا۔
 ”تم نے اچھا کیا سرور۔“ پروفیسر عادل نے اسے سراہا اور پھر مجتبیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 ”آپ کیسے ہیں بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی۔“
 ”ہم تو ہمیشہ ہی اچھے ہوتے ہیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے بے تکلفی سے ان کے ہاتھ سے ادھ جلا سگریٹ
 لے کر کش لگایا۔
 ”آج بھی ملاقات نہ ہوتی اگر آمنہ صبی تصدق احمد کی تلاش میں ادھر آنے کا پروگرام نہ بنالیتیں۔“

”کیسے ہو مانی، وہاں حویلی میں تو سب ٹھیک تھے؟“

”پھر کام ہوا؟“

”کھانا کھاؤ گے؟“

”ارے یہاں تو میرا زبھی جج ہے..... بہت بے وفا ہو یا ر۔“ وہ بڑی گرم جوشی سے اس سے ملا۔

”بس صرف پوچھتے ہی رہتے ہو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ ملنے آ جاؤ۔ چلو تمہارے کمرے میں چل کر

پروفیسر عادل سے "جا" سے اکر دونوں باہر چلے گئے تو پروفیسر عادل آمدنی کی طرف متوجہ ہوئے جو

ابھی تک کھڑی تھیں ”ارے مس آمنہ! آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔“

”اس لیے کہ مجھے ابھی جانا ہے۔ میں نے ایک جانے والے سے تصدیق کی جاب کے لیے بات کی

تمہی اور انہوں نے اس وقت ملنے کو کہا تھا اور میں تصدق احمد کو لینے آئی تھی۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

وہ ہمیشہ کی طرح سادہ اور انٹریکٹو رہی تھی۔ اس کے بال اب کچھ لمبے ہو گئے تھے اور اس نے ان

کیا پونی بنائی ہوئی تھی۔ سیاہ دو ٹیٹے گلے میں جھول رہا تھا اور سرخ پھول دار شرٹ میں وہ اچھی خاصی دلکش

لگ رہی تھی۔

”او کے۔ تصدق احمد، وثر، بوگڈ لک۔“

”مکر میں۔“

”پلیز“ آرمی صفی زمینی کی ”تمہیں انہیں تو ان کا تذاویب سے جتنا کہہ سکتے ہو“

”آمنہ صبح کہتے ہیں، یہ تو صبح ہے۔“ وہ فلفلے باز، زہرے کے پاس کے ”ترانہ“ میں اٹھ کر اٹکا حلا

ہیں، یہی اہل تصوف۔ پرویسر مادلے کی اس کتاب "میں نے تم کو تہذیب اور ملت سے جدا کیا ہے۔"

”معاشرہ اس آفت زدہ گھر کا حقیقی نمونہ ہے۔“ کہیں سے ”کہیں سے“ لے کر ”کہیں سے“

میں سناں تو زندگی بھر مل نہیں ہوں گے۔ وہ لڑا ہوا کیا دیکھ بیچے گا بن صاحب نے آمنہ کو

معدلت کرتا ہے۔ یہ سب باتیں ہوں گے کہ ہم دے لیا پھر حوس اخلاقی کے لباوے میں لپیٹ کر امید کی افیون

کو بڑا لالچا رہا۔“

”افوہ بھی مجتبیٰ! آپ بات کو کس قدر پھیلا کر کرتے ہیں۔“ تصدق احمد کے لہجے میں بے زاری تھی۔

”اور آئینہ صفیٰ کیا.....“

"اغوا نہیں ہوئے۔"، مجھے زیر و فتنہ والا کام کمال کا تصور ہے۔ اے : ہا کہ ان

اور کھانے کی چیزیں بھی کھانے کے لئے تیار کر دیتے۔

کہہ افغان کہہ کر کہ لاش ڈال رہے ہیں۔

”نکاح میں ساطاتہ احسنہ نہ نہیں کے اہل بیت میں سے ہیں۔“

بلکہ باہر ہیں۔ سلطان صاحب نے انہیں روک لیا اور اب وہ دونوں باہر لان میں کھڑے ہو گئے۔

ان مائی؟ پرویسر عادلے سوالیہ نظروں سے جی جیدری طرف دیکھا ”مگر مائی کب آیا خدا

”لوٹے کو بھی بتایا میں۔“ اہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”اس لی پجارو اور میری چسپی آ کے پیچھے ہی ہیں۔“

”ویسے یہ مالی اور آمنہ بھی پہلے ہی ملتے رہے ہیں کیا؟“ جنجلی حیدر نے سرگوشی کی جو سرگوشی ہرگز نہ تھی۔

”جہاں نہیں۔ میرے خیال میں ایک آدھ بار یہاں ہی ملاقات ہوئی تھی۔“ پروفیسر عادل نے کسی قدر

ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

’دراصل۔“ انہوں نے پھر عادل کا جلایا ہوا سگریٹ ان کے ہاتھ سے لے لیا ”دونوں ساتھ ساتھ

بے اتھے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا، شاید دونوں میں کچھ انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

”نہیں میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ مانی بالکل اور مزاج کا بندہ ہے اور آمنہ بالکل مختلف

”کی ہے۔“

”اور اگر“ تصدق احمد نے جونہ جانے کس خیال میں گم تھا، سر اٹھا کر کہا ”اور اگر میرے پاؤں میں

بے سارہ ہوئیں تو میں آمنہ صفی کی رفاقت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا مگر.....“ اس نے پھر سر جھکا لیا۔

السلام علیکم۔“ آمنہ صفی اور سلطان آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ روفیسر عادل نے آمنہ کے سلام

بہارِ کرسنت الہیہ کی گنجائش۔

[illegible]

”نہیں جن صاحب کے پاس ہم جا رہے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔ کسی بھروسے پر ہی لے کر جا رہی ہوں۔“
 ”آمنہ صفی حیرت ہے تم پر کہ تمہیں اب بھی لوگوں پر بھروسہ اور اعتبار ہوتا ہے جب کہ تمہارے
 بھروسے اور اعتبار کو سب نے ہی کرچی کرچی کیا ہے۔“
 ”ہوں۔“ آمنہ صفی مسکرائی لیکن اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو گئی تھیں۔

واقعی اس کے بھروسے اور اعتبار پر تو کوئی بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ سب ہی نے اس کے یقین کی
 وجہیں نکھیر دی تھیں پھر بھی وہ یقین کر لیتی تھی۔ اعتبار کر لیتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ جہاں حیر
 سے چند قدم پیچھے رہ گئی تھی وہ تو سلطان نے ایک دم اسے آواز دے لی تھی ”پلیز میری بات سن۔“
 وہ بھڑکی تھی۔ پتا نہیں کس بھروسے پر حالانکہ یہ وہ شخص تھا جس نے اسے ایک دم سب کی نظروں میں گرا
 دیا تھا۔ حتیٰ کہ اماں کی نظریں بھی اسے کھوجتی تھیں۔
 کبھی کبھی وہ سر سے پاؤں تک اسے دیکھتیں۔

”کیا کمی ہے تم میں منوں پھر بھی لوگ۔“
 اور پھر کسی نہ کسی حوالے سے وہ اس انگو کا ذکر ضرور کرتیں اور پھر ان کی نظریں اسے اپنے وجود
 میں کھیتی ہوئی لگتیں اور اسے ایسا لگتا جیسے وہ اماں کی نظروں میں بھی معتبر نہیں رہی۔
 اس کی سرگرمیاں۔

اس کا اٹھنا بیٹھنا۔
 لکھنا پڑھنا تو ویسے ہی اماں کو کھٹکتا تھا لیکن اب تو اسے لگتا تھا اس کا وجود بھی اماں کی نظروں اُڑو
 پڑوس والوں کی طرح بہت زیادہ ہی کھٹکنے لگا ہوا اور جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔
 اس کے روکنے پر وہ رک گئی حالانکہ وہ بھروسے کے قابل کہاں تھا۔
 اس سے بات کرنا یا اس کی بات سننا کہاں گوارا تھا اسے۔

وہ اسے کہہ رہا تھا۔
 ”آمنہ صفی آپ مجھے بہت یاد آتی ہیں کبھی کبھی راتوں کو وجود میں آپ کا تصور آگ لگا دیتا ہے۔ تو
 چاہتا ہے۔ شاید یہ اس لیے ہے کہ سلطان خاں کے ہاتھوں سے شکار کر نکل جائے۔ ایسا اس سے پہلے
 کبھی نہیں ہوا تھا۔“

”شکار ہاتھ سے نکل جانے کا پچھتاوا ہے۔“ اس نے نظریں اٹھائیں۔
 ”ہاں۔“ سلطان کی پرشوق نظریں پورے وجود میں کبھی کبھی جا رہی تھیں۔
 ”کیا پھر گھبرنے کا ارادہ ہے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے بے بسی سے کہا ”یہی تو نہیں کر سکتا۔ آپ کی مرضی سے آپ کو حاصل کرنا۔“

”یعنی باہمی سمجھوتے سے۔“
 ”آمنہ کا رنگ یک دم سرخ ہوا اور کنپٹیاں دھکنے لگیں۔ اس نے ہونٹ جھینچے اور اسے وہاں ہی کھڑا چھوڑ
 کر چلی آئی تھی لیکن وہ اس کے پیچھے پیچھے ہی آیا تھا۔
 ”سوچو گا مس آمنہ۔“ لہجہ میں شوخی اور غرور تھا۔

”کیوں بھروسے کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی ہے کیا؟“ تصدق احمد کا لہجہ طنزیہ تھا۔
 ”نہیں۔ میں کچھ سوچنے لگی تھی۔“ اس نے تصدق احمد کی طرف دیکھا۔
 ”آئیے۔“
 ”کیا ہوا ان لوگوں کا؟“ تصدق احمد نے اس کے قریب آتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔
 ”وہ ہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔“
 ”یعنی۔“

”یعنی اماں انتظار کی شمعیں جلائے بیٹھی ہیں اور وہ لوگ پلٹ کر نہیں آئے۔ دراصل ہمارے اہل
 محلہ بہت ہمدرد ہیں۔ وہ ہر آنے والے کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ لہذا آنے۔۔۔۔۔ والوں کو میری
 خامیوں اور خوبیوں سے آگاہ کرنا وہ اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ سو اتنا دل گردہ کس کا ہے بھائی جو ایک
 انوشاہ۔۔۔۔۔“

”فضول باتیں مت کرو آمنہ۔۔۔۔۔“ تصدق احمد نے اسے ڈپٹ دیا۔ اس کی پیشانی پر بے شمار
 لکیروں کا جال سا بن گیا۔
 ”اچھی امید لے کر جاؤ اینگری بیگ مین۔“ پروفیسر عادل نے اس کا کندھا تھپکا ”ایڈاگین ویو گڈ
 لک۔“ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر تک آگئے۔
 مسرور اور سلطان باہر ہی لان میں کچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

”آہ۔“ سلطان نے ایک آہ بھری ”کیا چیز ہے یہ آمنہ صفی بھی۔ میں اسے دیکھتا ہوں تو میری رگوں
 میں گردش کرتا ہوا چائیک گرم ہو جاتا ہے۔ آگ سی لگ جاتی ہے۔ کیا تمہیں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے؟“
 ”نہیں۔“ مسرور نے ایک نظر آمنہ صفی کی طرف دیکھا۔
 ”تم نے شاید کبھی غور سے اسے نہیں دیکھا مسرور غضب کی انریکشن ہے اس میں۔“
 ”ہاں شاید۔“

”یارتہ اتنے کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔ ایک بار چلو میرے ساتھ ڈیرے پر ساری اداسیاں ختم ہو
 جائیں گی۔ تمہارے اس ٹھنڈے لبو میں بھی آگ نہ لگ گئی تو نام بدل دیتا میرا۔“
 ”اچھا کبھی آؤں گا۔۔۔۔۔ اماں کی طبیعت ٹھیک ہو اور چٹھیاں ہوں تو۔۔۔۔۔“

”ایک بات ہے یار۔“ انہوں نے حسب معمول سگریٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پروفیسر عادل نے ہاتھ پیچھے کر کے دوسرے ہاتھ سے ٹیبل پر پڑی روتھ مین ڈبیا ان کی طرف بڑھادی جسے انہوں نے جھپک پوکھ کر لے لیا۔

”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں میں نے شادی کرنے میں جلد بازی کی..... یار بعد میں اس سے بھی خوب صورت لڑکیاں نکرائی تھیں زندگی میں..... ویسے تم نے سوچنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا دیا۔ یار عادل خان اب فیصلہ کر لیو۔“

”کیسا فیصلہ؟“ وہ انجان بن گئے۔

”اے اپنانے کا۔“

”فیصلہ تو ہو چکا تجبی۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا ”بلکہ اسی وقت ہو گیا تھا جب اسے پہلی بار دیکھا تھا۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے..... کوئی رکاوٹ؟“ تجبی حیدر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ دراصل انہیں بہت تجسس تھا لیکن پروفیسر عادل نے اس موضوع پر کبھی مکمل کلمات ہی نہیں کی تھی۔

”رکاوٹ۔“ انہوں نے پر خیال نظروں سے تجبی حیدر کو دیکھا۔

رکاوٹیں تو بہت تھیں لیکن کبھی کبھی تو لگتا تھا جیسے رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے ہوں ان کے راستے میں اور شاید وہ کبھی بھی انہیں نہ پاٹ سکیں گے اور شاید کبھی بھی مریم تک نہ پہنچ سکیں گے۔

مارسائی کا زہرا آہستہ آہستہ ان کی رگوں کو کاٹ رہا تھا۔ مگر پھر اچانک خدا ان پر مہربان ہو گیا تھا۔ جب وہ ماں بی کے ساتھ نوبت والا جا رہے تھے تب بھی بے یقین سے تھے۔ امید کا کوئی ٹھکانہ سادیا بھی ان کے ہاتھ میں نہ تھا لیکن پھر نوبت عثمان کے مثبت رویے نے انہیں حیران کر دیا تھا۔

”اور میڈم نرگس..... اور یہ میڈم نرگس بھی کیا چیز ہیں۔“

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

اس روز وہ انہیں اصرار کر کے ”نوبت ولا“ لے گئی تھیں اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ وہاں نوبت عثمان اور میڈم نرگس کے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔ نوبت عثمان ان سے ان کی تعلیم ان کی مصروفیات ان کے شوق اور دلچسپیاں پوچھتی رہی تھیں اور میڈم نرگس وقفے وقفے سے بہت دلچسپ گفتگو کرتی رہی تھیں۔

”خیر ہے آپ جاگیر داروں والا کوئی شوق نہیں رکھتے۔“ انہوں نے بڑی بڑی آنکھیں جو کاجل سے اور بھی بڑی لگ رہی تھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔

”بس میڈم میں تو ایسا ہی ہوں..... میرے شوق اور میری دلچسپیاں بہت مختلف ہیں۔“

”عثمان بھائی کو بھی ایسا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ میں تو.....“ انہوں نے تہتہ لگایا ”جی بات ہے زینی ان کے جاگیر دار ہونے کے متعلق کچھ مشکوک ہی تھی۔“

”تیری پڑھائی ابھی ختم نہیں ہوئی؟“

”ہوگئی ہے لیکن نوکری شروع ہوگئی ہے۔“

پروفیسر عادل آمنہ صافی اور تصدق احمد کو خدا حافظ کہہ کر پلٹے تو انہیں لان میں بیٹھے دیکھ کر مسکرائے۔

”تم تو آرام کرنے گئے تھے مانی۔“

”مسرور کو دیکھ کر ساری تھکن دور ہوگئی ہے۔ حالانکہ خود ڈرائیو کیا ہے۔“

”تمہاری اور مسرور کی دوستی کبھی کبھی مجھے حیران کرتی ہے۔“

”کبھی کبھی عادل بھائی دنیا میں حیران کن باتیں بھی وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں اور میری اور مسرور کی دوستی بھی ان ہی حیران کن واقعات میں سے ایک سمجھ لیں۔“

”صحیح۔“ پروفیسر عادل نے تہتہ لگایا۔ ”چلو تم دونوں دوست باتیں کرو میں ذرا تجبی کو کہنی دے لوں۔“

”ضرور۔“ سلطان نے انہیں مسکرا کر دیکھا۔ ”آپ جائیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”خدا بخش۔“ پروفیسر عادل نے وہیں کھڑے کھڑے خدا بخش کو آواز دی ”یار تجبی آئے ہیں چائے لے آؤ..... میں بھی بلکہ مسرور اور مانی بھی پیئیں گے۔“ اور ایک بار پھر دونوں کو مسکرا کر دیکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

تجبی آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے سر نکالے پاؤں پیارے بہت ایزی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔

”کیا خواب دیکھے جا رہے ہیں؟“

”خواب دیکھنے کی عمر ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ خواب ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے.....“

”ابھی چند دن پہلے ہی ایک دلربا چاک ہی ”شام غزل“ میں ٹکرائی۔ ہائے عادل خان! کیا بتاؤں۔ کیا چیز تھی..... میں اگر اس ”شام غزل“ کا منتظم ہوتا تو شام غزل اسی کے نام کر دیتا..... غزل کے تمام لوازمات موجود تھے اس میں سرائے غزل تھی وہ اور نام بھی غزل ہی تھا۔ بس موقع ملے ہی اس کے خواب آنکھوں میں اتر آتے ہیں..... گھریں تو ڈراما ان خوابوں کو دور ہی رکھتا ہوں۔ سوچا یہاں ڈرامی پہلا لوں..... تمہیں تو پتا ہے ہماری بیگم کا رویہ نامہ جارحانہ ہے ایسے معاملات ہیں..... اور جب شادی محبت کی ہو تو یہ جارحانہ رویہ برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”یہ تو مجبوری ہے آپ کی۔“ پروفیسر عادل نے سگریٹ سلگایا ”یار تاک جھانک کی اجازت تو ہونی ہی چاہیے..... آخر کائنات کی خوبصورتیاں ہمارے لیے ہی تو تخلیق کی گئی ہیں اور ان خوب صورتیوں کو نہ سراہنا سراسر ناشکری ہے۔“

”بالکل بجا فرمایا آپ نے۔“

اور پروفیسر عادل کے تصور میں عثمان احمد کا سراپا آگیا اور اسی نے انہیں گھیر لیا۔ وہ نرم نرم لہجے میں ہوئے ہوئے ان کا ہاتھ تمام کمران سے باتیں کرتے ہوئے عثمان احمد اور وہ کتے نرم مزاج تھے جبکہ زنب عثمان..... اور خدا جانے ان کا میل کیسے ہوا ہوگا۔

”اور تم تو ہمیشہ ہی ہر بات اور ہر شخص کے متعلق مشکوک رہتی ہو۔“ زنب عثمان نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔

”خیر کبھی کبھی میرے شک صحیح بھی ہوتے ہیں۔“

”ہاں کبھی کبھی نہیں اکثر غلط ہی ہوتے ہیں۔“

اور جب وہ وہاں سے اٹھے تو میڈم نرگس بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”عادل! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو پلیز مجھے ڈراپ کر دیجئے گا۔ دراصل میں نے اپنی گاڑی واپس بھجوا دی تھی۔“

”شیور۔“ انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میڈم نرگس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”زینی تو تم سے بہت چلتی تھی۔ جب سے اس نے مجھے بتایا کہ تمہاری والدہ اس مقصد سے آنا چاہتی ہیں تو میں نے اسے احساس دلایا کہ تم جیسا داماد چراغ لے کر دھونڈنے سے بھی نہیں لے گا اور یہ کہ تمہیں اس کی والدہ وغیرہ سے خوش دلی سے ملنا چاہیے۔“

”تھینک یو میڈم۔“ وہ اپنی تعریف پر مجبوب ہو گئے۔

”رشتہ اور وہ بھی سوتلا۔ زینی کا آپ کو ناپسند کرنا فطری سی بات ہے اور جبکہ زینی عثمان کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ یوں سمجھ لیں زینی نے بے حد مجبور ہو کر عثمان سے شادی کی تھی۔ اس کے سپینڈ نے اسے چھوڑ دیا تھا اور عثمان بھائی کے علاوہ سامنے کوئی تھا نہیں جبکہ زینی فوراً شادی کرنا چاہتی تھی اور.....“ انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

عادل نے ڈرائیو کرتے ہوئے کسی قدر استعجاب سے انہیں دیکھا۔

عثمان احمد نے زنب عثمان سے شادی کے متعلق ساری تفصیل انہیں بتائی تھی لیکن ان کی کسی بات سے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ زنب نے ان سے مجبوراً شادی کی ہوگی۔ ان جیسی دکھ عورت کے لیے کیا کی تھی۔ وہ چاہتیں تو کسی کنوارے مرد سے بھی شادی کر سکتی تھیں..... ایک شادی شدہ مرد کو انہوں نے منتخب کیا تھا تو یقیناً اندر کوئی جذبہ رہا ہوگا۔ مجبوری کی بات تو ہرگز نہ ہوگی۔

”خیر پرانی باتوں کا کیا ذکر۔“ میڈم نرگس نے ایک ادا سے کندھے اچکائے ”میں نے یہ مشکل قابل کیا تھا زینی کو کہ مریم جس مزاج کی ہے اس کے لیے تم ہی مناسب ہو۔ عجیب ڈرپوک سی سہمی ہوئی سی لڑکی ہے۔ بولڈ نہیں تو بالکل نہیں ہے اور نہ ہی اعتماد ہے۔ اس کے برعکس عاشی میں بہت بولڈ نہیں ہے۔“

حالانکہ انہیں تو ایسا محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں تو وہ ہمیشہ ہی بولڈ لگتی تھی۔

”اسی لیے تو ڈاکٹر عبدالمعید نے عاشی کو پسند کیا۔“

انہوں نے اپنی دانست میں انکشاف کیا لیکن عادل اس بات سے باخبر تھے جب تیور نے انہیں بتایا تھا کہ مامانے عاشی بھوکی مٹکی ڈاکٹر عبدالمعید سے کر دی ہے تو انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔

”جی ڈاکٹر عبدالمعید بہت نفیس آدمی ہیں اور یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے انہوں نے۔“

”بہر حال اب تو زینی بہت مطمئن ہے آپ سے۔ بس ذرا مریم کی اسٹڈی کی وجہ سے اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہ رہی۔ یوں بھی مریم عثمان صاحب سے بہت اٹیچڈ تھی اور وہ بھی مریم کا خیال زینی سے زیادہ کرتے تھے بلکہ اکثر مریم کی وجہ سے دونوں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔“

”جی۔“ پروفیسر عادل نے سادگی سے کہا ”انہوں نے بتایا تھا مجھے اور اگر ان کی خواہش نہ ہوتی تو میں انہیں ڈسٹرب نہ کرتا۔“

”ان کی..... آپ کا مطلب ہے کہ عثمان بھائی کی خواہش تھی کہ آپ مریم سے شادی کریں۔“

”ہاں جی انہوں نے آخری وقت یہ خواہش کی تھی۔“

”تو پھر.....“ میڈم نرگس نے قہقہہ لگایا۔ ”زینی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔ وہ کسی صورت نہیں مانے گی پھر۔“

”کیوں.....؟“ انہوں نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا۔

”وہ بس ایسی ہی ہے۔“ میڈم کے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی ”ویسے آپ کیا صرف اپنے والد کی خواہش پوری کر رہے ہیں یا.....“ انہوں نے بہت دھیان سے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔ ”میرے خیال میں مرنے والے کی خواہشات اتنی اہم نہیں ہوتیں جتنی اس کی اپنی زندگی اہم ہوتی ہے۔ کیا آپ کی کوئی کنٹ منٹ تو نہیں تھی کہیں اور.....“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں میڈم۔“ انہوں نے احتیاط سے لفظوں کا استعمال کیا ”مریم یقیناً ایک بہت اچھی شریک حیات ثابت ہوں گی اور میں ان کا ساتھ پا کر بہت فخر محسوس کروں گا۔“

”پھر تو.....“ وہ ہنس رہیں تھیں پروفیسر عادل خان میں آپ کی پزور کو نیونگ کروں گی۔“

”میں آپ کا ممنوم ہوں میڈم۔“

”اس میں ممنونیت کی کیا بات ہے بھئی۔ مریم مجھے بہت پیاری لگتی ہے اور تم بھی مجھے بہت پیارے لگے ہو۔“ وہ یک دم آپ سے ”تم“ پر آئیں۔

اور جب انہوں نے انہیں گیٹ پر ڈراپ کیا تو انہوں نے اصرار کیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے ان کے غریب خانے کو بھی رونق بخش لیں لیکن وہ ان سے معذرت کر کے اور پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے چلے آئے تھے۔

خوب صورت لڑکی سے انہیں عشق ہو جاتا ہے اور وہ اسے مذاق سمجھتے تھے مگر وہ مذاق نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ جو محبت کے متعلق کوئی واضح نظریہ نہیں رکھتے وہ ہر دوسرے شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت۔ وہ مجتبیٰ حیدر کی بہت عزت کرتے تھے اور شاید کسی حد تک ان سے متاثر بھی تھے اور ان کی گفتگو سے متاثر ہوتے تھے اس وقت اس تاثر کو اچھا خاصا جھکا لگا تھا لیکن پھر فوراً ہی وہ اس جھکے سے سنبھل گئے اور انہوں نے مسکرا کر مجتبیٰ حیدر کی طرف دیکھا۔

”مجتبیٰ، کبھی کبھی آپ کی باتیں مجھے بہت حیران کرتی ہیں۔“

”کبھی کبھی میں خود بھی اپنے آپ پر بہت حیران ہوتا ہوں عادل خان۔“

”آپ۔“ پروفیسر عادل کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر قریب پڑے ٹیلی فون اسٹینڈ سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف میڈم نرگس تھیں۔

”آپ میڈم۔“

”کیا بہت حیرت ہوئی؟“

”ہاں..... نہیں تو۔ دراصل میں اس وقت بالکل ایکس پکٹ نہیں کر رہا تھا آپ کا فون۔“

”میں نے تمہارا وعدہ یاد دلانے کے لیے فون کیا ہے۔“

”جی میڈم۔“ وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ ”بس وقت ہی نہیں مل سکا۔“

”وقت ملنا نہیں خود کا لٹا پڑتا ہے عادل خان۔ بائے داوے اس وقت آپ کیا کر رہے تھے؟“

”جی بس ایک دوست آئے ہوئے تھے ان سے مصروف گفتگو تھا۔“ انہوں نے مجتبیٰ حیدر کی طرف دیکھا۔

”تو پھر کب آرہے ہیں ہماری طرف۔ اس وقت ممکن ہے کیا ہے؟“

”اس وقت۔“ انہوں نے پھر مجتبیٰ حیدر کی طرف دیکھا۔

”ہاں اگر ممکن ہو تو۔ دراصل امتیاز اس وقت گھر پر ہے اور میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی ہیں کہ وہ تم سے ملنے کا مشتاق ہو رہا تھا۔“

”میں کوشش کروں گا آنے کی۔“

مجتبیٰ حیدر نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ بھی جانے والا ہے۔

”کون تھا عادل خان؟“ مجتبیٰ حیدر کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں تھیں ”وہی تو نہیں تھی۔“

”ارے نہیں۔“ پروفیسر عادل کے لبوں سے بے ساختہ نکلا ”میڈم نرگس تھیں۔“

”یو مین میڈم نرگس..... ملکہ موسیقی۔ آف کورس۔ تم سے کہاں ملاقات ہوئی؟“

”نہ بولا میں۔“ انہوں نے مختصر اُکھا۔

”تو اب تمہیں گھر ملتا رہی ہیں۔“

زندگی کے سارے رنگ یک دم کتنے دلکش ہو گئے تھے۔

نیلا آسمان، چمکتے بادل، ٹھنڈی چاندنی اور نیلے آسمان پر اڑتے پرندے۔

کائنات کی ہر شے تپتی خوب صورت ہو گئی تھی صرف اس احساس کے ہونے سے کہ بہت جلد وہ اسے پالیں گے جسے انہوں نے مدتوں سوچا تھا۔

”ارے میاں کن بھول بھلیوں میں کھو گئے ہو۔“ مجتبیٰ حیدر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

لیے ہیں۔ ہم سے کچھ کہو۔ حال دل سناؤ۔ کوئی پرابلم ہے تو شیر کر۔ اپنے دوست کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔“

”کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔“ وہ مجتبیٰ حیدر کی طرف دیکھ کر دل کشی سے مسکرائے۔

”پھر دیر کس لیے ہے؟“

”یوں ہی بس۔“

”یعنی ابھی صرف محبت کر رہے ہو شادی کی نوبت نہیں آئی۔“ مجتبیٰ حیدر نے قہقہہ لگایا۔

”مجتبیٰ، کبھی کبھی میں سوچتا ہوں آپ کا نظریہ محبت خدا جانے کیا ہے..... کبھی آپ کی باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے اس کائنات کی سب سے بڑی خوب صورتی محبت ہے اور محبت کے بغیر اس کائنات کے

سب رنگ پھیکے ہیں اور محبت ہی کائنات کا سب سے خوب صورت اور پادارِ فل جذبہ ہے۔ کھرا سچا اور مضبوط جذبہ..... لیکن کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ محبت کو محض مذاق سمجھتے ہوں..... جسٹ

فارا انجوائے منٹ..... ایک وقتی جذبہ..... ایک عارضی خوشی۔“

”دراصل۔“ مجتبیٰ حیدر نے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی ”مجھ پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیات حملہ آور ہوتی ہیں۔ جب میں کوئی ایسی کہانی تخلیق کر رہا ہوتا ہوں جس میں محبت محض دھوکا فربہ

اور ریا کاری ہوتی ہے تو میں اس طرح کے ڈائلاگز بولتا ہوں اور جب میں محبت کی سچائیوں پر کوئی کہانی لکھ رہا ہوتا ہوں تو اس وقت میری زبان سے محبت کی عالگیر سچائیوں کے ڈائلاگز ادا ہوتے ہیں۔

”یعنی.....“ پروفیسر عادل نے بے حد تعجب سے انہیں دیکھا ”آپ کی ذاتی رائے کوئی نہیں۔“

”بھئی ہم تو خلیل جبران کی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب محبت بلائے تو ضرور اس کی طرف جاؤ اب محبت کیا ہے اور کیا نہیں ہے ہم اس پر زیادہ غور نہیں کرتے۔“

اور پروفیسر عادل یوں ہی یقین سے بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتے رہے۔

یہ مجتبیٰ حیدر تھے جو عمر میں کہیں ان سے بڑے تھے۔ جو محبت کے موضوع پر کہانیاں لکھتے تھے اور جن کے بارے میں عام رائے یہ تھی کہ وہ محبت کے داعی ہیں اور محبت کا پرچار کرتے ہیں لیکن خود محبت کے متعلق ان کا کوئی نظریہ نہیں تھا..... اور یہ کس قدر اچھے کی بات تھی اور وہ جو مجتبیٰ حیدر کہا کرتے تھے کہ ہر

”ہی جوج تھ باہر جائیں گے کسی اچھی جگہ کھانا کھائیں گے اور اس طرح آپ کی برتھ ڈے سلیمینٹ کریں گے۔“
 لہجہ بھر کے لیے اسے ماما کا خیال آ گیا۔
 ”ماما کا فون تو نہیں آیا تھا؟“
 ”نہیں۔“

اور آج ماما کو اس کا برتھ ڈے بھی یاد نہیں رہا حالانکہ پہلے اپنی تمام خفگیوں اور ناراضگیوں کے باوجود وہ کبھی بھی اس کی برتھ ڈے نہیں بھولتی تھیں۔ پاپا انہیں ہمیشہ باہر لے کر جایا کرتے تھے۔ عمو ماہ ”وہ“ میں ڈنر کرتے تھے اور پھر پاپا اور ماما اسے گفت دیتے تھے اور کتنا خوش کن دن ہوتا تھا۔۔۔۔۔ اور آج ماما نے فون تک نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کتنی مصروف ہو گئی تھیں وہ۔

”مور کا فون آیا تھا آپ کو دوش کر رہا تھا۔“
 ”مور کا فون۔“ اس کا دل یک دم خوشی سے بھر گیا ”اتنا چھوٹا سا تو ہے وہ پھر اسے کیسے خیال آ گیا۔“
 ”مور بہت سینس ایبل ہے۔“ عاشری نے تبصرہ کیا۔

”تو ابھی تم مور سے بات کر رہی تھیں۔“

”نہیں وہ تو شچی انکل کا فون تھا۔“

”شرجیل مرزا کا۔“ مریم یک دم چونکا ہو کر بیٹھ گئی ”کیا کہہ رہے تھے وہ۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا اور تمہیں کیا ضرورت تھی بات کرنے کی۔“

”بجو۔“ عاشری کی آنکھوں میں لہجہ بھر کے لیے حیرت سی ابھری ”وہ فون میرے لیے تھا۔ شچی انکل کو مجھ سے ہی بات کرنا تھی آپ سے نہیں۔“

”تم سے۔“ مریم کی نظریں عاشری کے چہرے پر تھیں اور ان میں سوال تھا۔

”ہاں مجھ سے۔ وہ مجھے اپنے ایک ایڈ میں بطور ماڈل لینا چاہتے ہیں۔“

”اور تم نے بتا دیا انہیں کہ تم ماڈلنگ نہیں کرو گی۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں ماڈلنگ کروں گی۔“

”مگر عاشری تمہیں ابھی ایڈیشن لینا ہے۔ بی اے میں۔“

”مگر میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ مجھے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور ماڈلنگ کرنا مجھے پسند ہے کس قدر گیمر ہوتا ہے۔ اسکرین پر خود کو دیکھنا کس قدر خوش کن ہوگا۔ مجھے تو ابھی سے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ کسے سا لگے گا۔“
 ”مگر عاشری مجھے تو پسند نہیں ہے۔ آئی مین تمہارا ماڈلنگ کرنا۔ تم ابھی اتنی چھوٹی ہو اور شو بزنس کی دنیا میں اتنا گندہ دھوکا ہے۔“

”ہاں بہت اصرار کیا تھا لیکن ان دنوں بہت مصروفیت رہی۔ سو جانہ سکا حالانکہ وعدہ کیا تھا۔“
 ”سنجھل کے جانا میاں۔ سنا ہے امتیاز شاہ سے آج کل ان کے اختلافات ہو گئے ہیں۔“ بھتیجی نے
 کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی۔ پروفیسر عادل کے چہرے پر سرخ سی دوڑ گئی۔
 ”آپ بھی کمال کرتے ہیں بھتیجی۔“
 ”دوستوں کو سمجھانا ہمارا فرض ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ امتیاز شاہ کے ساتھ ان کے کوئی اختلافات وغیرہ نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ
 کہہ رہی تھیں کہ امتیاز شاہ اس وقت گھر پر ہیں۔۔۔۔۔ اور ان کی خواہش تھی کہ میں ابھی ان کی طرف جاتا۔“
 ”تو پھر چلتے ہیں۔ مجھے راستے میں ڈراپ کر دینا۔“ بھتیجی حیدر کھڑے ہو گئے۔

”ارے بیٹھے بھتیجی۔ خدا بخش چائے لا رہا ہے۔ چائے پی کر چلتے ہیں۔“ اور بھتیجی حیدر انہیں مریم
 نرگس اور امتیاز شاہ کی شادی کا قصہ سنانے لگے جو ان دنوں جب شادی ہوئی تھی، کئی فلمی میگزین میں چھپا
 تھا۔۔۔۔۔ اور صوفی کی پشت سے ٹیک لگائے پروفیسر عادل بہت دھیان سے بھتیجی حیدر کی باتیں سننے لگے۔



”عاشری۔“ مریم اسے پکارتی ہوئی لیونگ روم میں آئی۔ فلور کشن پر بیٹھی فون گود میں دھرے عاشری کی
 سے بات کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر گلاب کھل رہے تھے۔ ریسپور کریدل پڑا لٹے ہوئے اس نے
 سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا جو صوفی پر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ جاگ گئیں؟“

”ہاں پتا نہیں کیوں اتنی نیند آ رہی تھی۔“

”استخوانوں کی تھکن ابھی تک اتر رہی ہے۔“ عاشری مسکرائی۔

”نہیں اب تو رزلٹ بھی آنے والا ہے۔ ابھی تک کیا تھکن باقی ہے۔“

”بجو۔“ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔ ”اب آپ کیا کریں گی۔ بی ایچ ڈی۔“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔ لیکن تم نے کیا سوچا ہے۔ سینئر کیمرن تو تمہارا ہو گیا۔“

”کچھ بھی نہیں۔ مجھے مزید نہیں پڑھنا۔“

”کیوں؟“ مریم کو حیرت ہوئی۔

”بس مجھے دلچسپی نہیں ہے۔“

”لیکن ماما۔“

”ماما کچھ نہیں کہیں گی اور اس وقت بورنہ کریں بتائیں کیا پروگرام ہے۔“

”تم بتاؤ نا۔“

”مگر مجھے پسند ہے بجو اور پھر کہیں کسی غیر جگہ پر تو کام نہیں کرنا چھی انکل کے ادارے میں کام کرنا ہے۔ وہ تو ہمارے اپنے ہیں اور وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھیں گے۔“

مریم نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے۔

”لیکن ماما شاید تمہیں اجازت نہ دیں۔“

”وہ کیوں اجازت نہیں دیں گی بھلا۔ کیا وہ خود شادی سے پہلے ماڈلنگ نہیں کرتی تھیں اور شادی کے بعد بھی ماڈلنگ کرتی رہیں۔ ابھی بھی شو بزم کے معروف ناموں میں ان کا نام ہے، کتنی شہرت ہے ان کے پاس۔“

”پھر بھی تم ماما سے پوچھ تولو۔“ مریم نے کمزور آواز میں کہا ”اور معید بھائی سے بھی۔ شاید وہ بھی تمہاری ماڈلنگ کو پسند نہ کریں۔“

”معید سے کس لیے پوچھوں اور کیوں روکیں گے مجھے۔ ہو ازی ہی؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”عاشی معید بھائی کو رائٹ ہے کہ وہ تمہیں۔۔۔۔۔“

”ابھی ایسا کوئی رائٹ نہیں ہے ان کے پاس۔“ عاشی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”صرف ماما کے یہ کہہ دینے سے کہ میری منگنی ڈاکٹر معید سے کر رہی ہیں، انہیں کیسے رائٹ حاصل ہو گیا۔“ وہ جاتے جاتے پلٹی ”میں تیار ہونے جا رہی ہوں کب تک باہر جانا ہے؟“

”میں تیار ہوتی ہوں پھر چلتے ہیں۔“ مریم نے آہستگی سے کہا اور ہاتھ گود میں دھرے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھتی رہی۔

”اور یہ ساری کیننگی شرنیل مرزا کی ہے۔“ اس نے سوچا ”یقیناً اس نے ہی عاشی کے دل میں یہ شوق پیدا کیا ہوگا اور عاشی وہ اس قدر ضدی ہے کہ اگر اس نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا ہے کہ وہ ماڈلنگ کرے گی تو پھر بھلا اسے کون روک سکے گا۔۔۔۔۔ شاید ماما بھی نہیں اور معید بھائی کو جب پتا چلے گا تو انہیں دکھ ہوگا یقیناً وہ کتنے مختلف ہیں۔ انگلینڈ میں اتنا عرصہ رہنے کے باوجود اس قدر مشرقی سوچ رکھنے والے ہیں اور کیسے خواب دیکھتے ہیں وہ۔۔۔۔۔ ایک گھر پیارے بچے اور عاشی۔“

”اور اگر عاشی نے ماڈلنگ شروع کر دی تو کیا ان کا یہ خواب پورا ہو سکے گا پھر عاشی بھی ماما کی طرح مصروف ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اور پتا نہیں وہ معید بھائی سے شادی بھی کرے گی یا نہیں۔ ابھی کتنی تلخی سے اس نے کہا تھا ہوازی اور معید بھائی کتنے خوش ہیں ماما کی یقین دہانی پر اور کتنا خیال رکھتے ہیں وہ سب کا اور خاص کر عاشی کا جیسے وہ صرف اور صرف ان کی ذمہ داری ہو۔۔۔۔۔ حالانکہ عاشی اور ماما۔۔۔۔۔ ماما بھی ان چند ماہ میں ہم سے کتنی دور ہو گئی ہیں۔ ایک ساتھ ہی دو تین فلمیں سائن کرنے کے بعد وہ کتنی مصروف ہو گئی تھیں چند دن لاہور ہوئیں اور چند دن کراچی۔۔۔۔۔ کراچی میں شاید ان کی کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور اب بھلا کیا ضرورت تھی اس عمر میں انہیں فلم میں آنے کی۔ اپنے سے آدھی عمر کے ہیرو کے ساتھ ہیروئن

آ کر وہ کتنی خوش اور مسرور تھیں اور اگر وہ یہاں ہوتیں تو شاید۔۔۔۔۔ شاید شرنیل مرزا عاشی کے دل میں یہ خواہش نہ پیدا کر سکتا۔ ایک بار جب اس نے اس کے متعلق ماما سے بات کی تھی تو ماما نے فوراً ہی اس کی پڑھائی کا کہہ کر منع کر دیا تھا لیکن اب ماما یہاں نہیں تھیں اور عاشی فارغ تھی۔

”اور اب اس نے لاہور میں بی اے میں داخلہ لینا تھا۔ نینا اور مور مری ہی میں تھے ماشی سینئر کیمرج کر کے آچکی تھی۔۔۔۔۔ اور یقیناً شرنیل مرزا پہلے بھی اسے فون کرتا رہا ہوگا۔ ورنہ ایک دم سے تو یہ فیصلہ نہیں ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور عاشی اپنے فیصلوں میں بہت سخت ہو گئی ہے۔ پاپا کی ڈیڑھ کے بعد سے ہی اس کے لہجے میں سختی آئی تھی اپنی بات منوانے والی تھی۔۔۔۔۔ اور اگر اس نے ارادہ کر لیا ہے تو پھر بھلا کون اسے روک سکے گا۔“

اس نے مایوسی سے سوچا۔

”شاید۔۔۔۔۔ شاید عادل بھائی۔ عاشی ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ یقیناً وہ ان کی بات مان لے لی لیکن عادل بھائی پتا نہیں کب آئیں گے اور میرے پاس ان کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔ جو بی فون کر کے بی آپا سے پوچھ لوں۔۔۔۔۔ لیکن بھلا وہ کیا سوچیں گی کہ میں عادل بھائی کا فون نمبر کیوں مانگ رہی ہوں۔“

”شہر یار۔۔۔۔۔“ دفعتاً اس کے ذہن میں روشنی آئی۔

نمبر۔۔۔۔۔ مگر شہر یار پتا نہیں کہاں ہوگا۔۔۔۔۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے اس نے رابطہ نہیں کیا۔

بارش کی کوئی کرچی تھی لیکن وہاں سے کوئی کوئی ریسیو بھی نہیں کر رہا تھا۔ غالباً وہ سب لوگ گاؤں چلے گئے ہوں گے۔

اور عینی کتنی فضول ہے جانے سے پہلے اس نے بتایا بھی نہیں کہ وہ لوگ گاؤں جا رہے ہیں شاید اچانک جانا پڑا ہو لیکن اس نے نہیں بتایا تھا تو شہر یار ہی بتا دیتا۔۔۔۔۔ لیکن شہر یار وہ بھی خدا جانے کہاں تھا اور اس نے رافع اسپتال فون بھی کیا لیکن پتا چلا کہ وہ آج کل چھٹی پر ہے۔ خدا جانے اچانک کیا افتاد پڑ گئی تھی کہ سب بغیر بتائے گاؤں چلے گئے تھے۔

”اور وہ بالکل بات نہیں کرے گی شہر یار۔۔۔۔۔ اور اس عینی کی بچی سے۔“

کس قدر پریشان ہوئی تھی وہ اور بے اختیار ڈاکٹر رافع سے پوچھ بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ ”خیریت تو ہے شہر یار کیوں چھٹی پر ہیں؟“

اور ڈاکٹر رافع نے اسے تسلی دی تھی۔۔۔۔۔ ”بالکل خیریت سے ہیں بیٹا۔ شہر یار یونہی ویکس کرنا چاہ رہے تھے اور چھٹیاں بھی کافی ڈیوٹیں ان کی سوا اپنی فیملی کے ساتھ چلے گئے۔“

اسے کس قدر غصہ آیا تھا۔۔۔۔۔ کم از کم بتا کر تو جاتے۔۔۔۔۔ لیکن اور اب پتا نہیں شہر یار واپس بھی آئے ہیں یا نہیں لیکن میں بھی فون نہیں کروں گی اب خود ہی بات کریں گے اور شاید وہ ناراض ہیں مجھ سے۔

”لیکن میرا بھلا اس میں کیا قصور۔“

کیا تھا بلکہ۔

اس نے سوچا تھا وہ ماما کی واپسی پر انہیں یعنی کے بابا اور ماں جی کے آنے کے متعلق بتا دے گی لیکن بہت دیر سے واپس آئی تھیں اور وہ سو گئی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر بھی وہ ماما سے بات نہ کر سکی تھی۔ ابھی بلکہ میز پر بیٹھی ہی تھی کہ آنٹی آفندی کا فون آگیا تھا اور پھر میڈم نرگس سے مختصر سی بات کرنے کے بعد واپس کھڑی ہوئی تھیں۔

”شریف ناشتا لے جاؤ۔ میں نرگس کی طرف جا رہی ہوں۔ وہاں ہی ناشتا کروں گی۔“

اور وہ جوان کے فارغ ہونے کے انتظار میں یوں ہی اخبار لیے بیٹھی تھی اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن نذیب عثمان نے مسکرا کر اس کے گالوں کو چھوا۔

”کیا بات ہے ڈیر؟“

”وہ آپ سے کچھ کہنا تھا۔ آج شام یعنی کی ماں جی اور بابا نے آنا تھا۔“

”کوئی بات نہیں آج آئیں وہ لوگ۔ شریف سے کہہ دینا وہ انٹرین کر دے گا۔“

”مگر ماما وہ آپ سے ملنے.....“

”تم ہونا تمہاری فرینڈ ہے مومو۔ تم ان سے ملنا گپ لگانا..... اچھی طرح خاطر تواضع کرو۔“ انہوں نے اس کی بات پر غور ہی نہیں کیا۔

”یوں بھی تو مجھے تین بجے کی فلاٹ سے واپس جانا ہے۔ بڑی مشکل سے بٹ صاحب سے اجازت لے کر آئی ہوں۔ بیگم آفندی میری پسند سے جیولری لینا چاہتی تھیں۔“ وہ جلدی جلدی تفصیل بتا کر چلی گئیں۔ اور وہ چاہنے کے باوجود شہر یا رکو نہ بتا سکی کہ ماما نے تین بجے چلے جانا ہے۔ جانتی تھی کہ وہ نہیں ہو جائے گا۔

بابا اور ماں جی آئیں گی تو وہ انہیں بتا دے گی کہ بس اچانک ہی ماما چلی گئیں۔ اسے ان کے پروگرام کا پتا ہی نہیں تھا۔

اور پھر اس نے بابا سے یوں ہی کہا۔

”آئے تو ہم آپ کی ماما سے ملنے تھے لیکن چلیں اپنی بیٹی سے باتیں کریں گے..... کیوں صالحہ۔“

”ہاں بہت دن ہو گئے تھے اس سے ملے۔ یعنی بھی ماموں کے پاس جا کر بھول گئی اور اس نے بھی خبر نہیں لی۔“

”بس ماں جی یوں ہی امتحان کی تھکن اتار رہی تھی.....“ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”یعنی کب آئے گی اسلام آباد سے؟“

”چہا نہیں۔“ چوہدری ثناء نے ”شاید اسے اسلام آباد ہی پسند آگیا ہے۔ کل فون پر کہہ رہی تھی ابھی

آنے کا موڈ نہیں ہے۔“

”نہ بھی میرا تو دل اداس ہو گیا ہے۔ سکندر جا کر تم کل اسے لے آنا۔“ صالحہ نے سکندر کو مخاطب کیا۔ جو جب سے آئے تھے خاموش بیٹھے تھے۔

”جی بھائیو۔“ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ”آپ جب کہیں گی لے آؤں گا۔“

”یار سکندر پہلی بار تو گھر سے نکلی ہے انجوائے کرنے دو اسے۔ اپنے ماموں کے گھر ہے کسی غیر جگہ

پر تو نہیں۔“

”نہیں بھی میں اداس ہو گئی ہوں اس کے لیے ایسے لگتا ہے جیسے گھر خالی ہو گیا ہے اس کے بغیر۔ بس تم کل لے آؤ۔“

”جی بہتر لے آؤں گا۔“

”اور ایک ماما ہیں۔“ مریم نے دل گرفتگی سے سوچا ”جنہیں کسی کی پروا نہیں..... حتیٰ کہ مور کی بھی نہیں۔ شاید وہ کسی کے لیے بھی اداس نہیں ہوتیں۔ تب ہی تو سب سے دور ہیں۔ شاید وہ ہم سب سے اس طرح محبت نہیں کرتیں۔ جیسے مائیں اپنی اولاد سے کرتی ہیں۔ کاش ماما بھی یعنی کی ماں کی طرح ہوتیں۔ محبت کرنے والی شفیق۔“

وہی پرانی سوچ اس پر حملہ آور ہوئی تو اس نے ہولے سے سر جھٹک کر سکندر کی طرف دیکھا جو بہت گہری نظروں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہے تھے۔

اور پتا نہیں یعنی کے چاچا اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ شاید وہ ڈرائنگ روم کے فرنیچر اور سجاوٹ سے ہماری حیثیت کا انداز لگا رہے ہیں۔

اس نے سوچا اور پھر خود ہی رد کر دیا۔

”نہیں بھلا انہیں کیا ضرورت ہے اس طرح کا انداز لگانے کی۔“

پھر اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اور یعنی کے چاچو..... کس قدر باوقار اور سنجیدہ لگتے ہیں۔“

”اور یعنی کہتی ہے۔“

”میں جب بھی چاچو کو دیکھتی ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی گہرا دریاں کے دل کو ہولے ہولے پھیل رہا ہو۔“

”شاید رضوانہ پیچو کو دکھ دینے کا بچھتاوا..... ان سے بچھڑ جانے کا درد۔“

”اور کیا آدمی اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھول سکتا..... اور کیا پہلی محبت ہمیشہ دل میں زندہ رہتی ہے۔

کچھ کے دیتی رہتی ہے۔“

”اور اگر ماما نے اور بابا ماں جی کو منع کر دیا تو.....“

”کیا وہ شہر یار کو کبھی نہیں بھول پائے گی۔“

”اور کیا اس طرح ایک گہرا درد ہمیشہ اس کے دل کو چھیلتا رہے گا۔“

تب ہی شریف سب کے لیے پانی لے آیا تو اس نے چونک کر شریف کو دیکھا۔

”صاحب جی۔“ اس نے گلاس سکندر کی طرف بڑھایا ”آپ بھی جی فلموں اور ڈراموں میں کام کرتے ہیں جی؟“

”الحق۔“ مریم نے دل ہی دل میں کہا۔

اب کیا یہاں آنے والا ہر فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے والا تو نہیں ہو سکتا..... اور یہ شریف تو نرا الحق ہے۔ خدا جانے کیا دماغ خراب ہو گیا تھا اس کا جو ہر آنے والے شخص سے فلم میں چانس دلوانے کی بات ضرور کرتا اور ہر دلکش نظر آنے والا شخص اس کے نزدیک ہیرو تھا۔ لہذا وہ اسے فلموں میں کام کرنے کا مشورہ بھی ضرور دیتا تھا اور عینی کے چاچو کی شخصیت تو بڑی پرکشش تھی اور وہ سچ کچ کوئی ہیرو ہی لگتے تھے۔

”نہیں۔“ سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مریم بھی مسکرا دی۔

”آپ تو جی بالکل ہیرو لگتے ہیں۔“ شریف سب کو پانی سرور کر کے پھر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا ”اور جی“ مجھے تو بڑا ہی شوق ہے جی فلموں میں کام کرنے کا لیکن کوئی بھی بات نہیں سنتا۔ وہ اپنے چچی صاحب ہیں وہ بھی وعدہ کر کے بھول جاتے ہیں۔ بس ایک بار چانس مل جائے تو پھر دیکھنا شریف کیسے انڈسٹری کے بڑے بڑے ہیروز کو پیچھے چھوڑ دے گا۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔“ مریم نے چوہدری ثار کی طرف دیکھا۔

”بابا! آپ انکل ہاشم سے ملیں گے بلواؤں انہیں۔ آپ کو ان سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“

”ہماری بڑی بیٹی کے حوالے سے جو بندہ بھی ہمیں ملے گا، ہم اس سے مل کر خوش ہی ہوں گے۔“ چوہدری ثار نے محبت سے اسے دیکھا اور وہ ان کی محبت پر سرشار سی ہو گئی۔

”جاؤ شریف! انکل کو بلا لاؤ۔ بتانا مہمان آئے ہیں۔“

”اچھا جی لیکن آپ بھی تو سفارش نہیں کرتیں نا۔ بیگم صاحبہ سے ایک دفعہ کہہ کر شریف کو چانس دلوادیں۔“

”شریف۔“ مریم نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے جی نہ کریں سفارش۔ شریف کا کیا ہے جی لے گا۔ پر سکندر صاحب کی سفارش تو ضرور کریں۔ بالکل سنشوش کی طرح لگ رہے ہیں جی۔ آپ نے جی کبھی سنشوش کی فلم دیکھی ہے؟“

”نہیں یا مجھے کبھی فلموں سے دلچسپی نہیں رہی۔“ سکندر نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”وہ تو میں نے بھی نہیں دیکھی جی۔ پر وہ اپنے بھتیجی صاحب تھے نا، وہ بڑا ذکر کرتے تھے جی سنشوش

نا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ میں تو بالکل سنشوش لگتا ہوں..... اور آپ بھی جی..... ویسے آپ فکر نہ کریں جی۔ میں آپ کی سفارش کروں گا۔ یہاں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں جی فلم انڈسٹری کے۔ اپنی بیگم صاحبہ بھی تو اب فلم میں کام کرتی ہیں۔ ان سے کہہ کر آپ کو ضرور چانس دلوادیں گا جی۔ شریف کا کیا ہے اسے چانس ملے نہ ملے۔“

”شریف۔“ مریم نے اب کے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے کیا کہا ہے کہ انکل کو بلا لاؤ۔“

”جی بس جی جا ہی رہا ہوں۔ ایک منٹ۔“ اس نے لپک کر سائنڈ ٹیبل سے اخبار کا سنڈے ایڈیشن اٹھایا۔ ”دیکھیں جی ہمارا بیگم صاحبہ کی تصویر۔“ اس نے میگزین کا رنگین صفحہ کھول کر سکندر کے سامنے رکھا۔

”تصویر.....“ سکندر نے بے حد حیرت سے تصویر کو پھر اسے اور پھر مریم کو دیکھا۔

”ہاں جی تصویر..... اپنی بیگم صاحبہ کی جی۔“ اس نے دانت نکالے ”اخباروں میں اور رسالوں میں چھپی رہتی ہے۔“

”شریف۔“ مریم نے بے حد غصے سے اسے دیکھا۔

”جی..... جی بس جا رہا ہوں۔“

مریم نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ میگزین ہاتھ میں لیے ارگرد سے بے نیاز ساکت سے بیٹھے تھے۔

”یہ آپ کی مٹی ہیں؟“ کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا۔

”جی۔“ مریم نے آہستگی سے کہا۔

”میرا مطلب ہے، نرنب عثمان آپ کی ماما ہیں۔“ انہوں نے پھر پوچھا جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

”جی..... یہ ماما ہی کی تصویر ہے۔ یہ دراصل ماما کا شوق ہے۔“ لمحہ بھر ٹھہر کر اس نے وضاحت کی ”ایکٹنگ کرنا۔“

مریم کی نظریں سکندر کی چہرے پر تھیں جب دل میں اچانک ہی خوف سا پیدا ہوا۔

”اور عینی کے چاچو پتا نہیں کس حراج کے ہیں۔ کیا خبر انہیں ماما کا فلم میں کام کرنا پسند نہ آئے اور وہ.....

لیکن نہیں بابا اور شہر یار کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پھر اگر عینی کے چاچو کو ماما کا فلم میں کام کرنا

پسند نہ آئے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے پھر بھی.....“

اس نے غور سے انہیں دیکھا لیکن ان کے چہرے سے کسی قسم کا کوئی تاثر نہ ملا۔

”کیوں کیا تم مریم کی ماما کو جانتے ہو سکندر؟“

”اوہ..... ہاں نہیں تو۔“ وہ چونکے۔ ”یوں ہی نام سنا ہے..... شوہر سے متعلق لوگوں کے نام تو جانے

پہچانے ہی ہوتے ہیں۔“

”ہاں۔“ چوہدری ٹار کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ہاشم اندر داخل ہوئے۔

”آئیے انکل۔“ مریم کھڑی ہو گئی ”میری ایک دوست ہے یعنی یہ اس کے بابا ہیں۔“ اس نے تعارف کر دیا۔

”اور کیا تمہارا بابا انہیں؟“ انہوں نے ڈاکٹر ہاشم سے ہاتھ ملاتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا۔

”ہاں میرے بھی بابا ہیں۔“ وہ ہنسی ”اور یہ عینی کی اور میری ماں جی اور یہ عینی کے چاچو اور.....“ اس نے بے حد سنجیدہ سے کھوئے کھوئے بیٹھے سکندر کی طرف دیکھا۔

”اور تمہارے بھی چاچو۔“ چوہدری ٹار بیٹے اور انکل ہاشم کی طرف دیکھا۔

”یہ بچی ہم سب کو بہت پیاری ہے۔“

”یہ ہے ہی بہت پیاری۔“

ڈاکٹر ہاشم سکندر سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے اور انہوں نے مسکرا کر مریم کو دیکھا۔

”اسی لیے تو ہم حاضر ہوئے تھے کہ اس پیاری سی بچی کو کچھ اپنا بنالیں۔“ بے اختیار چوہدری ٹار کے لبوں سے نکلا اور مریم کے رخساروں پر گلاب کھل اٹھے۔

”انکل آپ بابا سے باتیں کریں میں ذرا صفو کو دیکھوں کیا کر رہی ہے وہ۔“ حیا سے اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور رخسار گلابی ہو رہے تھے۔

”ہاں ہاں تم جاؤ میں تمہارے بابا کو بالکل بور نہیں ہونے دوں گا۔“ اسے جانے کا کہہ کر وہ چوہدری ٹار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”افو..... اب معلوم نہیں بابا، انکل ہاشم سے کیا بات کرنے والے تھے۔“ وہ کچن میں چلی آئی اور کچھ دیر یوں ہی صفو کو چائے کے لوازمات ٹرالی میں رکھتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”آپ جاؤ تا موصوبی بی مہمانوں کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی چائے لاتی ہوں۔“ صفو نے اسے دیکھا۔

”وہ انکل ہاشم ہیں ان کے پاس۔ میں یوں ہی دیکھنے آئی تھی کہ چائے تیار ہوئی ہے یا نہیں۔“

”چائے تو تیار ہے جی بس ذرا یہ کباب تلنے تھے۔“ صفو فریزر سے کباب نکالتے ہوئے بولی۔

”اور شریف کہاں چلا گیا؟“

”سمو سے لینے گیا ہے۔ آبی رہا ہو گا۔“

”اچھا۔“ وہ کچن سے نکل آئی۔

اور پتا نہیں بابا نے انکل ہاشم سے پھر کوئی بات کی یا نہیں لیکن انکل ہاشم ان کے جانے کے بعد ان کے متعلق پوچھتے رہے تھے اور انہوں نے عینی کے چاچو کی بہت تعریف کی تھی۔

”سکندر بہت کو ایلفاؤنڈ ڈاکٹر ہیں۔“

شاید اس کی عدم موجودگی میں انہوں نے انکل ہاشم سے کوئی بات کی ہوگی۔ ورنہ اس کے سامنے تو وہ زیادہ تر خاموش ہی رہے تھے۔ بس انکل ہاشم اور چوہدری ٹار باتیں کرتے رہے تھے اور ماں جی اسے ارسلان ارمغان کے متعلق بتاتی رہی تھیں۔

اور پھر جب شریف چائے سرو کر رہا تھا تو اچانک ہی انکل ہاشم نے پوچھا تھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ڈاکٹر سکندر؟“

”ہاں شاید نہیں۔“ انہوں نے پیشانی سے پسینا صاف کیا۔ ”کچھ طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔“

”کیا ہوا سکندر؟“ چوہدری ٹار پریشان ہو گئے۔

”شاید تھکن ہے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ گھر جا کر آرام کروں گا تو بہتر ہو جاؤں گا۔“

اور پھر اس کے اصرار کے باوجود وہ کھانے کے لیے نہیں رکے تھے اور پھر اس نے سوچا تھا کہ جب شہر یار کو ہٹا چلے گا کہ ماما نہیں تھیں تو وہ ضرور خفا ہو گا لیکن خیر محذرت کر لوں گی لیکن شہر یار نے تو فون ہی نہیں کیا۔

اور تب پریشان ہو کر اس نے سوچا تھا شاید وہ بہت زیادہ خفا ہو گیا ہے کہ فون ہی نہیں کر رہا..... تب خود اس نے کتنی بار فون کیا۔ گھر بھی اور اسپتال بھی لیکن وہ تو کہیں بھی نہیں مل رہا تھا کتنے دن ہو گئے تھے اس سے بات کیے ہوئے۔ پھر وہ اسے بتائے بنا ہی گاؤں چلا گیا۔

اب اگر ماما کراچی گئی تھیں تو بھلا اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

”ٹھیک ہے اب میں بھی اس سے بات نہیں کروں گی۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”کتنی پریشانی ہوئی ہے مجھے اور اگر عاشری نہ جاتی تو.....“ وہ کتنی اداس ہو رہی تھی..... ”اور شکر ہے کہ عاشری آگئی ہے۔ عاشری کے آنے سے کتنی رونق ہو گئی ہے۔“

”اور اگر ماما بھی یہاں ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”اور عاشری بھی مس کرتی ہے ماما کو.....“

اس نے کئی بار محسوس کیا تھا۔

”اور یہ شرجیل مرزا جانے کیسے عاشری کو کنکٹ کیا ہے۔ جب سے عاشری آئی تھی وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ یقیناً فون پر ہی بات ہوئی ہوگی..... پتا نہیں آج سے پہلے بھی وہ کتنی بار بات کر چکا ہو گا اور عاشری اتنی معصوم ہے اور وہ انتہائی مکار۔ میں عاشری کو آرام سے سمجھاؤں گی۔“

تب ہی عاشری تیار ہو کر آگئی۔

”ارنے بجو آپ ابھی تک ادھر ہی بیٹھی ہیں تیار نہیں ہوئیں۔“

وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ شرٹ کی آستیں پر شیشوں کا کام تھا۔ مریم نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”عاشی بہت پیاری لگ رہی ہو۔“

”تھیک یو..... اب آپ انھیں فوراً اور پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آ جائیں۔“

”مگر میں ٹھیک تو ہوں۔“ اس نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔

سادہ سے کٹن کے سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح ہی لگ رہی تھی معصوم اور سادہ سی۔

”بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ اتنی ٹکٹیں پڑی ہیں کپڑوں میں۔ پلیز بجو کوئی اچھا سا ڈریس پہن کر

آئیں وہ والا مونگیا کلر کا کڑھائی والا جو ماما اس دفعہ آپ کے لیے لائی ہیں۔“

”مگر وہ تو..... اس پر اتنا کام کیا ہوا ہے۔“

”تو جناب آپ کی برتھ ڈے ہے نا۔“

عاشی بہت خوش لگ رہی تھی..... کچھ دیر پہلے والی بیزاری اب اس کے لہجے میں نہیں تھی..... پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اسے۔ باتیں کرتے کرتے بہت تلخ ہو جاتی تھی۔ کبھی ایسا لگتا جیسے اس سے زیادہ خوش مزاج کوئی ہے ہی نہیں۔ پتا نہیں کیا الجھن تھی اسے یا پھر یوں ہی ہاشل میں رہنے کی وجہ سے اس کے مزاج کا رنگ ہی ایسا ہو گیا تھا۔

”اچھا۔“ اس کا موڈ بالکل ہی نہیں ہو رہا تھا لیکن عاشی کے اصرار پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اچھا ٹھیک ہے تم ذرا معید بھائی کو بلاؤ۔ اسپتال سے تو آ چکے ہوں گے۔“

”ہاں کچھ دیر پہلے ہی آئے تھے لیکن کیا ان کا جانا ضروری ہے۔ ہم دونوں کافی نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ مریم نے ہولے سے اس کا رخسار چھوا ”وہ اب اس گھر کے فرد ہیں..... اور یوں بھی وہ ساتھ ہوں گے تو تحفظ کا احساس ہوگا۔“

”اوکے مادام.....“ عاشی نے ہکا ساس خرم کیا ”آپ کہتی ہیں تو بلا لیتے ہیں ان کو بھی کیا یاد کریں گے۔“

وہ سیرھیوں کی طرف مڑی تو مریم لمحہ بھر یوں ہی کھڑی اسے اوپر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”اور اب عاشی اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اپنا دکھ سکھ کہہ سکیں۔ کتنی پیاری اور کتنی بڑی بڑی لگنے لگی ہے..... میری بہن میری دوست۔“

اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ عاشی نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”آپ ابھی تک کھڑی ہیں بجو.....؟“

”جاری ہوں.....“ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر چہنچ کرنے چلی گئی۔



”اور ماما کو گئے کتنے بہت سے دن ہو گئے ہیں اور اتنے بہت سے دنوں میں ماما نے صرف ایک

فون کیا ہے۔“

مریم نے یونہی ”عذاب دید“ کی ورق گردانی کرتے ہوئے سوچا۔ وہ کتنی دیر سے کتاب کھولے بیٹھی تھی لیکن ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ چند دن پہلے وہ ڈاکٹر عبدالمعید کی شیف سے اٹھا کر لائی تھی..... ڈاکٹر عبدالمعید نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔

”بہت خوبصورت شاعری ہے۔“

”آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟“ مریم کو حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں بہت زیادہ..... فارغ ہوتا ہوں تو کتا میں ہی پڑھتا ہوں۔ بہت دوستی ہے میری کتابوں

سے۔ میرے پاس بہت اچھا انتخاب ہے۔ آپ کو ضرورت ہو تو لے لیا کریں بلکہ پڑھا کریں۔ یوں بھی

آج کل فارغ ہیں۔“

اور وہ محسن نقوی کی ”عذاب دید“ ان سے لے آئی تھی۔ مگر ابھی تک پڑھنے کی تھی۔ جب بھی کتاب کھلتی ذہن ادھر ادھر بھٹکنے لگتا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایک نامعلوم سی اداسی تھی۔ جس نے اسے لیٹ میں لے کھا تھا۔ شاید ماما کی وجہ سے..... اور کتنے بہت سارے دن ہو گئے تھے انہیں کراچی گئے..... اور اتنے ہی دن ہو گئے تھے شہر یار سے بات کیے اس سے ملے۔ عینی ابھی تک غائب تھی۔ بابا اور ماں جی گاؤں سے آ گئے تھے اس کی بات ایک دو بار ہوئی تھی ان سے اور انہوں نے بتایا تھا کہ عینی نے اسلام آباد میں اسپون انگلش کاکورس کرنے کے لئے ایڈمیشن لے لیا ہے، تین ماہ کے لئے اور اب مکمل کر کے ہی آئے گی۔

اور اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ شہر یار کے متعلق بھی پوچھ لے کہ وہ گاؤں سے آ گیا ہے یا ابھی تک وہیں ہے لیکن نہ پوچھ سکی..... ”بھلا بابا کیا سوچیں گے۔“

”اور اگر وہ گاؤں سے آ گیا ہوتا تو یقیناً اسے فون کرتا۔“

”ضرور سکندر چاچو نے اسے روک لیا ہوگا۔ ویسے بھی تو وہ اس سے کہتے رہتے تھے کہ کبھی چھٹی لے کر

یہاں بھی رہو..... گاؤں والوں کا بھی تم پر حق ہے۔“

”وہ زیادہ دیر اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ اسے یقین تھا..... اور عینی.....“

”کیا تھا اگر وہ اسے ایک خط ہی لکھ دیتی۔“

”کس قدر اداس ہو رہی تھی وہ اس کے لئے پتا نہیں وہ مجھے یاد بھی نہ کرتی ہوگی۔“

”اور یہ میں ہی ہوں بے وقوف اور احمق۔“

”پتا نہیں میری منٹ اتنی شدید کیوں ہو جاتی ہے۔ جو بھی میری محبت کی دائرے میں داخل ہوتا ہے اس کے لئے اتنی شدت کیوں ہو جاتی ہے میرے جذباتوں میں اور پھر ان کی طرف سے اتنی شدت نہ پا کر میں کس قدر ہرٹ ہوتی ہوں اور جانے اور لوگوں کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوتا..... شاید میری توقعات کچھ زیادہ ہوتی ہیں..... اور شہر یار بھی اگر چاہتا تو کیا گاؤں سے فون کر کے پتا نہیں سکتا تھا کہ وہ

کچھ دن گاؤں رہے گا اور شاید ساری محبتیں منہ دیکھے کی ہوتی ہیں..... وہاں جا کر اس نے مجھے سچا بھی نہیں ہوگا۔ حالانکہ وہ کہا کرتا تھا۔

”مومیٰ میں جس روز تم سے بات نہیں کرتا۔ بے کل سار جہتا ہوں..... مضطرب سا جیسے کچھ کہو سا گیا ہو کوئی کی رہ گئی ہوزنگی میں۔ دو منٹ کے لئے ہی سہی مجھ سے بات کر لیا کرو..... پتا ہے اس تصور سے ہی میرا دل ڈوبنے لگتا ہے کہ اگر تمہارا ساتھ تمہاری رفاقت نہ ملی تو..... سوچتا ہوں تصور سے دل کا یہ حال ہوتا ہے تو اگر سچ سچ ہم زندگی کے سفر میں چھڑ گئے تو اس دل کا کیا حال ہوگا۔ لگتا ہے اس لئے بند ہو جائے گا۔“

”اور وہی شہر یا راستے دنوں سے غائب تھا۔“

”اگر میں اسے یاد ہوتی اسے میرا خیال ہوتا تو وہ مجھے ضرور فون کرتا۔ مگر شاید اس کے سارے جذبے وقتی تھے..... عارضی..... اور اب شاید کوئی اور..... کوئی اور اس کی زندگی میں آ گیا ہوگا..... جب ہی.....“

چوہدری ثار کے گاؤں سے آنے کے بعد کتنی بار اس نے رافعہ اسپتال کا نمبر لایا پھر رکھ دیا۔

”اگر وہ گاؤں سے آ گیا ہے تو وہ خود ہی کیوں نہیں فون کر لیتا۔“

اس نے پھر کتاب کھول لی لیکن الفاظ آنکھوں کے سامنے سے بغیر اپنا مفہوم اس پر واضح کیے گزر رہے تھے، کھلے ہوئے صفحے پر موجود غزل کو اس نے کوئی دو بار پڑھا لیکن ایک لفظ بھی ذہن میں نہیں اترا تو اس نے کتاب بند کر دی۔

”کیوں نہ آج بابا اور ماں جی سے مل آؤں..... کتنا بلا رہے تھے..... اور کس قدر محبت کرتے ہیں۔ کتنی شفقت سے بات کرتے ہیں اور شاید بابا سے مل کر ان سے باتیں کر کے یہ نامعلوم سی اداسی جو اندر ہی دل کو چھینتی ہے ختم ہو جائے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹی وی لاؤنج میں آ کر صفو کو آواز دی۔

”صفو پلیز۔ ایک کپ چائے تو بنا دو۔“

”ناشتا تو ابھی تک آپ نے کیا نہیں، مومو بی بی اور چائے پہ چائے پیے جا رہی ہیں..... پتا ہے نا؟“

آپ کو بیگم صاحبہ زیادہ چائے پینے سے منع کرتی ہیں۔

”ناشتا تو عاشی کے ساتھ کروں گی لیکن پلیز سر میں دروہے۔ اس وقت ایک کپ چائے بنا دو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کپٹیوں کو دبایا۔

”اور کیا یہ عاشی ابھی تک سو رہی ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور وال کھا ک کی طرف دیکھا۔

گیارہ بجنے والے تھے اور عاشی ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ تو اتنی دیر تک نہیں سوتی تھی۔ ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے اسے جلدی اٹھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

”خدا نخواستہ کہیں بیمار نہ ہو۔“ وہ یک دم پریشان ہو کر عاشی کے کمرے کی طرف بڑھی اور آہستہ سے

ایک دے کر اس نے دروازہ کھولا۔ عاشی سامنے ہی ڈریسنگ کے پاس کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی۔

”عاشی.....“

”السلام علیکم بجو۔“ عاشی نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”آج بہت دیر کر دی تم نے۔ تم تو بہت جلد اٹھ جاتی ہو۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ہاتھاری؟“

”اے ون۔“ وہ مسکرائی ”جاگی تو حسب عادت سو رہے ہی تھی لیکن بیڈ سے اٹھنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ سو لیتے لیتے موسیقی سے لطف اندوز ہوتی رہی۔“

”ٹھیک گاڈ۔“ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”لیکن آپ مجھے کچھ تھکی تھکی اور بیماری لگ رہی ہیں۔“

”نہیں میں تو بالکل اچھی ہوں۔ یوں ہی رات کو نیند نہیں آتی تھی۔“

”بجو۔“ وہ بالوں کو ہیزر بینڈ میں کتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی ”اب تو آپ کو عادی ہو جانا چاہیے۔“

”کس بات کا؟“ مریم نے نظریں اٹھائیں۔

”ماما کے گھر سے باہر رہنے کا۔“ عاشی کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”ہاں۔“ مریم نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ماما کو مس نہیں کر رہی۔“

”ایسی ہی بات ہے بجو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ ”میں جانتی ہوں آپ ماما کی وجہ سے اب سیٹ رہتی ہیں۔ آپ چاہتی ہیں وہ ہمیشہ گھر پر رہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارے درمیان ہمارے دکھ سکھ شیر کر رہی ہوئی۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے..... اور اب تو بالکل ہی ممکن نہیں ہے۔“

نہیں صرف یہ بات ہی نہیں کچھ اور بھی تو ہے..... کوئی اور خیال بھی تو اسے اب سیٹ کر رہا ہے۔

اس نے سوچا لیکن وہ عاشی سے نہیں کہہ سکتی باوجود اس کے کہ عاشی بہت سمجھ دار اور بڑی ہو گئی ہے اور اس کا دل چاہتا تھا کہ کبھی کبھی وہ اور عاشی بیٹھ کر دوستوں کی طرح باتیں کریں..... وہ عاشی کو اپنے من میں ہونے والی کیفیات اپنے دکھ اپنے سکھ اور اپنے احساسات بتائے۔ پاپا کی باتیں کریں..... ماما سے متعلق اپنے خدشے اور خوف اس سے کہہ لیکن کیا ہوا جو عاشی کا قد اتنا بڑا ہو گیا ہے اور وہ اپنی باتوں سے کچھ دار لگنے لگی ہے۔

پھر بھی وہ ہے تو ابھی بچی ہی نا۔ اس پر اپنے خدشے اور خوف کیوں لاوے اور اسے تو اس کا خیال رکھنا ہے بڑا بن کر۔ اس نے پاپا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سب کا بہت خیال رکھے گی اور کبھی کسی مشکل میں تھانیں چھوڑے گی۔



”پتا ہے بجو۔“ اس نے جبکہ کہہ رہے تھے اس کے ہاتھ تھپتھپائے ”جب میں ہاسٹل سے آئی تو شروع شروع میں میں نے بھی ماما کو بہت مس کیا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں ابھی تک ہاسٹل میں ہی ہوں۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ لاہور منتقل ہو گئی ہوں اور یہ کہ وہاں مری کے ہوسٹل میں ڈھیر سارے بچے تھے لیکن یہاں ہم صرف دو ہیں۔۔۔۔۔ لیکن پھر ہولے ہولے میں نے جان لیا کہ ہماری زندگی کا سیٹ اپ اسی طرح ہے اور ہمیں اسی سیٹ اپ کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ اینڈ ناؤ اس اوکے اور میں خوش ہوں۔۔۔۔۔ بجو پتا ہے ہماری ماما ایک قابل رشک زندگی گزار رہی ہیں اور میں۔۔۔۔۔ مجھے زندگی میں کبھی موقع ملا تو میں بھی ایسی ہی زندگی گزارنے کی کوشش کروں گی لیکن شاید ہر شخص ماما کی طرح نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ میں بھی اتنی کچی نہ ہوں لیکن میں کوشش ضرور کروں گی۔۔۔۔۔“

”عاشی۔“ مریم نے دل ہی دل میں دکھ اور خوف کی جھپٹاں محسوس کی۔۔۔۔۔ ”نہیں عاشی۔۔۔۔۔ ماما ایک قابل رشک زندگی نہیں گزار رہی ہیں۔ گھر سے بچوں سے دور ہوتے اسکینڈلز کی زد میں۔ عورت کے لیے قابل رشک زندگی تو وہ ہے جو عینی کی ماں گزار رہی ہیں۔“ اس نے افسردگی سے سوچا۔

”لیکن شاید عاشی ابھی اس کو نہیں سمجھ سکتی اور وہ ماما کو آئیڈیل لائز کرتی ہے۔ اس کی طرح اور بیٹے بیٹیاں اس عمر میں ماں باپ کو ہی آئیڈیل لائز کرتے ہیں۔ وہ خود بھی تو بچپن میں ماما کے جیسے بننے کا سوچا کرتی تھی۔“

”آپ نے ناشتا کر لیا؟“ اسے خاموش دیکھ کر عاشی نے پوچھا۔

”نہیں۔ بس تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہاں چائے دو بار پی چکی ہوں۔“

”اوکے۔“ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور آواز دی۔

”صفوف ہمارے لیے ناشتا بناؤ۔ آج ہم پرائیوٹ کھائیں گے۔ آلیٹ اور اچار کے ساتھ۔“ وہ واپس آ کر اس کے پاس ہی بیٹھ بیٹھ گئی۔

”بجو اتنی اداس نہ رہا کریں۔ پتا ہے وہ ہاسٹل میں لڑکیاں مجھ پر رشک کرتی تھیں کہ میری ماما اتنی معروف و مشہور ہیں اور میرے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔“

اس کی خوبصورت آنکھیں چمک رہی تھیں اور رخساروں پر شفق اتری ہوئی تھی۔

”پتا ہے میرا بہت دل چاہتا ہے بجو کہ میں ایک دن ماما کی طرح مشہور ہو جاؤں۔ ٹی وی پر فلم میں ہر جگہ میرا نام ہو اور انکل شچی نے مجھ سے پراس کیا ہے۔ بلکہ یقین دلایا ہے کہ ایک بار میں اسکرین پر آئی تو پھر ہر طرف میرا نام ہوگا۔“

”عاشی۔“ مریم کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ”کیا تم نے پکا ارادہ کر لیا ہے ماڈلنگ کرنے کا؟“

”ہاں۔ ارادہ تو ہے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

مریم نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”اور بلیر آپ اس وقت مجھے کوئی لیکچر مت دیجیے گا۔ میرا موڈ صبح صبح موسیقی سن کر بہت اچھا ہو گیا ہے۔“

مریم نے آہستگی سے سر ہلا دیا لیکن اسے لگا جیسے کسی انجانے خوف کے بچے اس کے دل میں گڑ گئے ہوں۔ پھر کبھی رساں سے عاشی کو سمجھاؤں گی اور وہ یقیناً سمجھ جائے گی۔ وہ ایسی نادان نہیں ہے بلکہ وہ تو۔۔۔۔۔ بھی زیادہ سمجھ دار اور بولڈ ہے۔ عاشی اٹھ کر اخبار لینے چلی گئی تو اس نے پوچھا۔

”آپ بہت دنوں سے عینی کی طرف نہیں گئیں؟“ عاشی اخبار لے کر پلٹی تو اس نے پوچھا۔

”ہاں وہ عینی یہاں نہیں ہے نا اس لیے۔۔۔۔۔ البتہ اس کے بابا اور ماں جی ادھر ہی ہیں۔ کل بھی میں نے فون کیا تھا بہت بلار ہے تھے مجھے۔“

”تو پھر چلی جائیں۔۔۔۔۔ آپ کا موڈ اچھا ہو جائے گا۔“ اس نے اخبار کھولا اور اس کا خود کتنا جی چاہ رہا تھا جانے کو شاید وہاں سے شہر یار سے متعلق کچھ پتا چلے۔۔۔۔۔ لیکن وہ اپنے آپ کو زبردستی روکے ہوئے تھی۔

”تم ہی چلو نا عاشی“ آؤ تنگ ہو جائے گی اور تم آج تک ادھر نہیں گئی ہو۔ ماں جی اور بابا سے مل کر تم یقیناً خوش ہو جاؤ گی۔“

”مے پی۔“ لیکن میرا موڈ نہیں ہے کہیں بھی جانے کا۔ انکل ہاشم سے کپ لگاؤں گی اور معید سے بلاؤں گا نا کیکھوں گی۔“

”معید بھائی سے۔“ مریم کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

”ہاں۔ ہاں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ معقوبی بی سے زیادہ اچھا پلاؤ پکاتے ہیں۔ سو آج وہ پلاؤ پکائیں گے اور میں دیکھوں گی۔“

”پھر تو صحیح ہے۔“ مریم کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

”اور آپ کھانا دانا کھا کر مت آئیے گا وہاں سے۔ آج معید کے ہاتھ کا پکا ہوا پلاؤ کھانا ہے آپ کو۔“

”کیا معید بھائی اسپتال نہیں جائیں گے؟“

”آج چھٹی ہے بجو۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ میں بس ماں جی اور بابا سے مل کر جلدی آ جاؤں گی۔“

اور پھر وہ ناشتا کر کے خود ہی گاڑی لے کر نکل گئی۔

عاشی سے باتیں کر کے اس کی اداسی کسی حد تک کم ہو گئی تھی لیکن پھر بھی وہ راستے بھر شہر یار کے متعلق ہی سوچتی رہی۔

”اور اگر شہر یار یہاں ہی ہوا تو۔۔۔۔۔ اگر وہ بدل گیا تو۔۔۔۔۔ اور مرد کو بدلنے کوئی کون سی دیر لگتی ہے انکل مجھتی

نے کتنی بار کہا تھا۔

”مرد تو ہندل بس تھیلی پر رکھ کر پھرتے ہیں۔ جہاں کوئی اچھی صورت نظر آئی وہاں ہی پیش کر دیا۔ اور کیا خبر شہر یار کے اسپتال میں کوئی بہت پیاری بہت ہی دلربا لڑکی آگئی ہو اور شہر یار سے محبت گیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن نہیں لالہ کہتی تھی۔ شہر یار ایسا مرد نہیں ہے۔ وہ تو چاہت میں مرٹنے والا مرد ہے۔ ایک درکو پکڑنا اور اسے مضبوطی سے پکڑے رکھنے والا مرد۔۔۔۔۔“

یعنی کے گھر میں کوئی نہیں تھا سوائے ماسی زرینہ کے جو ان کے گھر کے برتن دھوتی اور صفائی کرتی تھی۔ ”وہ جی آپاجی اور چوہدری صاحب کہیں پر سے لیے گئے ہیں۔ ارسل میاں کے کسی دوست کے والد کا انتقال ہو گیا ہے ادھر۔ آپ بیٹھیں نا جی۔ ابھی آ جائیں گے۔“

”نہیں، بس تم انہیں بتا دینا میرا۔“

وہ لمحہ بھر بھڑکی۔۔۔۔۔ ”شہر یار کے متعلق پوچھوں۔۔۔۔۔“ اس نے سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔۔۔۔۔ اور واپسی کے لیے مڑی وہ سر جھکائے اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی کہ گیٹ سے شہر یار داخل ہوا۔ وہ بھی سر جھکائے اپنے دھیان میں تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

مریم نے سر اٹھایا۔ وہ شہر یار ہی تھا کہ دم اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ سوری کہتی ہوئی ایک طرف ہو کر باہر جانے لگی تو شہر یار نے بے چینی سے اسے آواز دی۔

”مریم۔۔۔۔۔ لیکن اس نے مرکز نہیں دیکھا۔“

”ناراض ہو مجھ سے خفا ہو؟“ وہ اس کی طرف لپکا۔

”نہیں مجھے آپ سے خفا ہونے کا کیا باعث ہے۔“

”سارے رات تو تمہارے پاس ہی ہیں مریم۔“ اس نے دل شکستگی سے کہا ”خدا کے لیے اس طرح روٹھ کر خفا ہو کر مت جاؤ۔ میں نہیں برداشت کر پاؤں گا۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی بہت اذیت میں ہوں۔“ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ مریم نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”میں جانتا ہوں مریم تم کیوں خفا ہو۔ مجھے ڈانڈو پڑا تو مجھ سے لیکن خدا سے لیے اس طرح مت کرو۔ مجھ سے پوچھو میں تمہیں بتاؤں گا کہ اتنے دنوں سے کیوں رابطہ نہیں کر رہا تھا، کس لیے۔۔۔۔۔“

”اور میں۔“ مریم کی آواز بھر آگئی۔ ”آپ کو پتا ہے میں کتنی پریشان ہوئی۔ کیسے کیسے وہم میرے دل میں آئے تھے اور۔۔۔۔۔ آنسوؤں کی پلکوں کا بند تو زکر خساروں پر ڈھلک آئے۔“

”مت روؤ مریم۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ چلو آؤ میں تمہیں سب بتاتا ہوں۔ مجھے پتا تھا تم پریشان ہوگی۔ بدگمان ہو جاؤ گی مجھ سے، لیکن میں کیا کر رہا ہوں مجھے لگتا تھا جیسے میں میں نے تم سے بات کی تو ضبط کھو بیٹھوں گا۔۔۔۔۔ اور اپنے ساتھ تمہیں بھی پریشان کروں گا۔ صرف تمہاری پریشانی کے خیال سے میں تم سے بات

نہیں کر رہا تھا۔“

”کیا ہوا تھا آپ ٹھیک تو تھے نا؟“ سارے گلے شکوے بھول کر مریم نے بے حد بے چین ہو کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد جلتے پڑے تھے اور وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور لگ رہا تھا۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ بیمار تھے کیا؟“ وہ مضطرب ہوئی۔

”آؤ اندر چلو آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ شہر یار نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا ”آؤ نا۔“ مریم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے بے چینی سے بولی۔

”آپ بتاتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔ کیا ہوا تھا آپ کو۔۔۔۔۔؟ بیمار تھے آپ۔ لگ رہا ہے آپ بیمار تھے لیکن آپ نے مجھے خبر کیوں نہیں دی۔ بتایا کیوں نہیں۔“

”کہانا بتاتا ہوں۔“ شہر یار نے محبت سے اسے دیکھا۔

”چلیں یہاں ہی بیٹھ جاتے ہیں۔“ مریم نے برآمدے میں ہی رک کر کرسیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”کیوں کیا مجھ پر اعتبار نہیں رہا؟“ شہر یار نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ مریم اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”خیر اگر تم بے اعتبار بھی ہو جاؤ مریم تو کوئی گلہ نہیں کہ ایک ماہ سے میں نے تمہاری خبر نہیں لی لیکن تمہیں کیا پتا کہ کتنا تڑپا ہوں میں تم سے بات کرنے کو۔ کیسے کیسے ضبط کیا ہے۔۔۔۔۔ کیسے کیسے روکا ہے خود کو۔“

”مگر کیوں کس لیے؟“

”کیا بتاؤں مریم۔“ اس نے ایک گہری سانس لی ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا بتاؤں تم کو کس کرب سے گزر رہا ہوں میں کس اذیت میں مبتلا ہوں۔“

”مجھے بتائیں پلیز۔۔۔۔۔ شہر یار کون سی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ آئی دل ٹرائی تو ہو چلیپ یو۔“

”تم۔“ شہر یار نے جھکا ہوا سر اٹھایا ”مریم جب پہلے پہل میرے دل میں تمہارے نام کی کوئٹل پھوٹی تو اس کے ساتھ ایک نامعلوم سا خوف بھی آگیا۔۔۔۔۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں تمہاری ماما مجھے رو نہ کر دیں۔ میرے اور تمہارے اسٹیشن میں بہت فرق تھا اس لیے ہفتوں مہینوں میں اس جذبے کو اپنے آپ سے بھی چھپاتا رہا۔ نفی کرتا رہا۔۔۔۔۔ میں اس کوئٹل کے تادور درخت بننے سے خوف کھاتا تھا مومی لیکن کچھ پودے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں جتنا بھی اکھاڑاؤں کی جڑیں اندر زمین میں ہی رہ جاتی ہیں اور پھر ذرا سی نمی پا کر پھوٹ پڑتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مومی۔۔۔۔۔ میں جتنا بھی اس کو مسلتا ہوں پھر پھوٹ پڑتی اور بالآخر یہ ایک تادور درخت بن گئی لیکن خوف کا پودا ابھی اس کے ساتھ ساتھ ہی بڑھتا گیا۔“

مریم ساکت بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔ ایک بار اس نے مرکز پیچھے دیکھا زریں بچن میں برتن دھو

”اور ہوا، یا مریم..... میرے خوف، میرے ڈر اور میری سوچوں کے بالکل برعکس..... بعض اوقات جو ہم سوچتے ہیں اس کے برعکس..... کوئی بات ہو جاتی ہے۔“

”پلیئر شہریار.....“ مریم نے التجا کی۔ ”مجھے ٹینس نہیں کرو، پلیئر بناؤ کیا ہوا۔ کیا مانے کچھ کہا ہے۔ کیا انہوں نے فون پر منع کر دیا ہے آپ کو۔ اگر ایسا ہے تو میں خود بات کروں گی ماما سے۔“ محبت نے یک دم اسے بولڈ بنا دیا تھا۔

”نہیں مومنو ماما سے تو بات ہی نہیں ہوئی ابھی۔ تمہیں پتا تو ہے۔ رکاوٹیں تو یہاں کھڑی ہو گئی ہیں میرے گھر میں۔“

”کیا!.....“ مریم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا بابا اور ماں جی۔“ اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔ جیسے اسے یقین نہ ہو جو کچھ اس نے سنا ہے۔

”نہیں..... نہیں مریم نہیں۔ بابا اور ماں جی تو خود پریشان ہیں لیکن وہ بھی کیا کریں۔ سکندر ماموں اتنے سالوں بعد گھر آئے ہیں وہ ان کی بات ٹال بھی نہیں سکتے اور تم..... تم بھی انہیں بہت پیاری ہو۔“

”سکندر ماموں..... کیا انہوں نے مجھے رد کر دیا ہے۔“ مریم کی آواز نکھر رہی تھی۔

”نہیں مریم، مت کہو ایسا۔“ شہریار نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”تم رد کرنے والی نہیں ہو مومنو تم تو دل کی ملکہ بننے کے قابل ہو، مت کہو ایسا میرا دل پھٹ جائے گا۔“

”پھر۔“

”پتا نہیں کیوں۔ پتا نہیں کس لیے سکندر ماموں نے ایسا کیا۔ انہیں تم اچھی لگی تھیں، پسند تھیں۔ خود انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ تمہاری پسند بہت اچھی ہے اور مریم بہت پیاری بچی ہے لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا اس روز وہ تمہارے گھر سے واپس آئے تو بہت اپ سیٹ تھے اور انہوں نے بابا سے کہا کہ وہ میرا شہ

کہیں اور کر دیں لیکن یہاں نہیں کسی صورت میں بھی نہیں۔ بابا نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طرح قائل نہیں ہوئے۔“

”مگر کیوں شہریار۔“ مریم نے آنسو پینے کی کوشش کی۔ ”کوئی وجہ تو بتائی ہوگی انہوں نے۔“

”نہیں لیکن ماں جی کا خیال ہے کہ شاید تمہاری ماما کے شو بزم میں ہونے کی وجہ سے۔“

”لیکن میرا تو شو بزم سے کوئی تعلق نہیں ہے شہریار میں تو.....“

”ہاں بابا نے تمہاری بہت دکالت کی۔ ماں جی نے بھی لیکن پتا ہے سکندر ماموں نے کیا کہا۔“

”تو پھر وہ نہ تو اس شادی میں شریک ہوں گے اور نہ آئندہ ہم سے کوئی رابطہ رکھیں گے۔“ بلکہ ممکن ہے وہ واپس چلے جائیں اور یہ سب بہت مشکل ہے بابا کے لیے۔ بابا، سکندر ماموں سے بہت پیار کرتے

ہیں کتنے سارے سالوں بعد تو وہ واپس آئے ہیں۔“

”نہ؟“ مریم کو لگا جیسے اس کا دل یک دم خالی خالی ہو گیا ہو۔ جیسے منزل آنکھوں کے سامنے آ کر کھو گئی ہو۔ جیسے کوئی بہت انہونی ہو گئی ہو۔

”تو۔“ شہریار نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ ”کچھ بھی نہیں، بس تمہیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے اسی لیے اتنے دن تمہیں فون نہیں کیا اور بغیر تمہیں بتائے گاؤں سکندر ماموں کے ساتھ

ہی چلا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے تو تم سے بات کروں۔ مجھے پتا تھا کہ تم سے بات کرتے ہی میں اختیار کھو بیٹھوں گا۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا مومنو۔ لیکن ابھی تک بابا سکندر ماموں کو قائل

نہیں کر سکے اور نہ ہی سکندر ماموں نے کوئی وجہ بتائی ہے۔ آج اگر تم نہ بھی آتیں تب بھی میں نے سوچ لیا تھا کہ آج تمہیں ضرور فون کروں گا۔ پتا ہے مومنو..... میں ہر روز تمہیں فون کرتا تھا اور تمہاری ہیلوسن

کرفون رکھ دیتا تھا..... یہ طے ہے کہ میں تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن میں سکندر ماموں اور بابا کو ناخوش بھی نہیں کرنا چاہتا..... میری دلی آرزو ہے کہ سب کچھ ان کی مرضی اور خوشی

سے ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر میں خود ہی..... اور یہ ناگزیر ہوگا۔“

”لیکن میں نا امید نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے بابا، سکندر ماموں کو قائل کر لیں گے ایک دن..... مگر مجھ سے وعدہ کرو مریم، مایوس نہیں ہوگی۔ میرا انتظار کرو گی۔ اپنی انتہاؤں تک.....“

”لیکن شہریار۔“ مریم نے دل گرفتگی سے کہا۔

”لیکن وہ کچھ نہیں مریم..... تمہاری رفاقت اور تمہارا ساتھ ہی میرے دل کو روشن رکھ سکتے ہیں.....“

”مگر وہ روشنی جو دوسروں کو دکھ دے کر حاصل کی گئی ہو اس سے اندھیرے ہی بھلے ہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ سب کچھ بھول جاؤں..... آپ بھی مجھے بھلانے کی کوشش کیجیے گا۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”نہیں..... میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا اگر تم انتظار نہیں کر سکتیں تو میں ابھی اسی وقت سب کو چھوڑ دیتا ہوں مگر تمہاری ماما.....“

”نہیں۔“ مریم نے بے اختیار اٹھ آنے والے آنسوؤں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا..... ”میں خود غرض نہیں ہوں۔ میں اپنی خوشی کے لیے آپ کو سب سے جدا نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر وعدہ کرو میرا انتظار کرو گی..... خواہ کچھ بھی ہو جائے۔“

مریم خاموش سر جھکائے کھڑی تھی۔

”مریم! دھر دیکھو..... میری آنکھوں میں.....“ وہ جذباتی ہو گیا..... ”کیا نظر آ رہا ہے ان میں..... غور سے دیکھو مریم۔ یہ آنکھیں تمہاری محبت سے سرشار ہیں تم ہی تم ہو ان میں۔ تمہیں میرا انتظار کرنا ہے۔“

پورے یقین کے ساتھ۔ ممکن ہے کچھ دیر ہو جائے۔ لیکن بہت دیر نہیں ہوگی۔ میرا یقین رکھنا۔ مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہے اور یہ تھوڑا سا وقت بہت مشکل ہو جائے گا۔ مریم اگر یہ یقین کے ساتھ نہ ہوا کہ تم میری منتظر ہو۔ پلیز مریم۔“

”پراس۔“ مریم کی نظریں جھک گئیں۔ ”میں آپ کا انتظار کروں گی اپنی انتہاؤں تک۔“
”تھینک یو۔۔۔۔۔ تھینک یو مریم۔“ شہریار کی آنکھوں میں آنسو گھلنے لگے۔ ”جب دیکھو کہ تم تھک رہی ہو اور تمہارے لیے انتظار ممکن نہیں رہا تو مجھے ضرور بتانا مریم۔ میں ساری مصلحتیں بالائے نام رکھ کر تم تک پہنچوں گا۔۔۔۔۔ ساری زنجیریں کاٹ دوں گا۔ انتظار نہیں کروں گا ان کے خود بخود کٹنے کا۔“
”میں نے کام ختم کر لیا ہے اب جاری ہوں۔“

ماسی زرینہ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے آگئی تو شہریار نے اس سے درخواست کی۔
”ماسی! میں نے مریم کو روک لیا تھا کہ ماں جی اور بابا آتے ہی ہوں گے اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو چائے بنا دیں۔ شاید تب تک ماں جی آئی جائیں گی۔“
”تکلیف کیسی پتر۔۔۔۔۔ چائے بنانے میں کون سے مل جوتے پڑتے ہیں۔“
”نہیں پلیز! میں نے صبح سے اب تک کافی چائے پی ہے اب نہیں پیوں گی۔ آپ پلیز تکلیف نہ کریں۔“ مریم نے ماسی زرینہ کو منع کیا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے کچن کی طرف چلی گئی۔
”مریم۔۔۔۔۔ کیا تم اب بھی مجھ سے خفا ہو۔ سوری میری وجہ سے تم پریشان رہیں۔“
”کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ آپ بھی تو پریشان ہی تھے۔“
”بس تم مجھ پر اپنا یقین پختہ رکھنا مریم۔“

مریم نے سر ہلادیا لیکن اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ ایک دم بے تحاشا محسن سارے وجود میں اتر آئی تھی۔ جیسے کوئی منزل پر پہنچنے سے پہلے تھک کر بے دم ہو کر گر جائے۔
زرینہ چائے بنا کر لائی تو چوہدری ثار اور صالحہ بھی آگے ان کے ساتھ سکندر بھی تھے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ارے میری بیٹی آئی ہے۔“ چوہدری ثار نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔
”جی بابا کیسے ہیں آپ۔“

”ایک دم اچھا۔۔۔۔۔ اور تم کیسی ہو؟“
”میں بھی ایک دم اچھی ہوں۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور صالحہ کی طرف مڑ گئی اور ان سے مل کر اس کی نظریں سکندر کی طرف اٹھ گئیں جو بہت گہری نظروں سے اے دیکھ رہے تھے۔
اس نے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا اور پھر بابا کی طرف متوجہ ہو گئی۔
”اور یہ لڑکی۔“ سکندر کی نظریں ابھی تک اس پر تھیں۔

”ڈولی کی بیٹی ہے اور ڈولی کی بیٹی سے شہریار کی شادی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ شہریار کی زندگی تباہ ہوتے میں نہیں دیکھ سکتا۔ کیا پایا ہے شہریار نے نہ ماں کی محبت نہ باپ کی شفقت اور اب ڈولی جیسی خود پسند اور سیشن عورت کی بیٹی سے شادی کر کے کیا پائے گا وہ۔ زندگی بھر کا عذاب۔“

”ارے بیٹی، بیٹھو۔“ چوہدری ثار نے کہا تو انہوں نے چونک کر نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔
”بس بابا! اب چلوں گی۔ کافی دیر سے آئی ہوئی ہوں۔“
”نہیں بیٹا! کچھ دیر تو اپنے بابا کے پاس بیٹھو۔“
چوہدری ثار نے اصرار کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ سکندر۔“ انہوں نے پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے سکندر کی طرف دیکھا اور صالحہ سے کہا۔
”بھئی ہماری بیٹی اتنے دنوں بعد آئی ہے کچھ کھلانے پلانے کا ارادہ نہیں۔“
”نہیں بابا! ابھی چائے پی ہے۔“
”خیر ہے بھئی۔۔۔۔۔ چائے نہ سہی کچھ اور ہی سہی۔“ وہ ہنسے اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی ”کیا بات ہے ہمارے بیٹی آج کچھ اداس لگ رہی ہے۔ مانا، نینا، مور سب اچھے تو ہیں نا؟“
”جی بابا۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”پھر؟“ ان کی سوالیہ نظر اس کے چہرے پر تھیں۔
”پھر کچھ نہیں۔“ وہ ہنس پڑی ”یوں ہی کچھ تھکن سی ہے۔“
”اور تمہارا رزلٹ کب آ رہا ہے؟“
”شاید آج کل میں۔“

”مریم بیٹی بہت لائق ہے۔ بہت ذہین۔“ انہوں نے خاموش بیٹھے سکندر کو مخاطب کیا۔ جو بے دھیانی میں بیٹھے جانے کیا سوچ رہے تھے کبھی کسی ان کی نظریں مریم کے چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔
”کس قدر معصوم لگتی ہے دیکھنے میں۔ بظاہر ڈولی سے کتنی مختلف ہے لیکن ہے تو اسی کی بیٹی۔۔۔۔۔ یقیناً اسی کی طرح ہوگی۔۔۔۔۔“

”خود غرض اور غلام۔“
”اپنی انا کا شکار۔“
”خود پرست اور خود پسند۔“

”یقیناً اس نے بھی شہریار کو خیر کرنے کے لیے جھوٹی محبت اور الفت کا ڈھونگ رچایا ہوگا۔“
”محض اپنے جذبہ برتری کی تسکین کے لیے۔“
اور سکندر کو خاموش دیکھ کر وہ پھر مریم کی طرف متوجہ ہو گئے جو گاہے گاہے سکندر کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

”اور پتا نہیں یہ شخص کیا سوچ رہا ہے۔“

”شاید اسے بابا کا مجھ سے اس طرح باتیں کرنا پسند نہیں آ رہا اور کیا وہ ان سے..... ان سب شفقتوں اور محبتوں سے محروم ہو جائے گی..... محض اس شخص کی وجہ سے۔“

ایک دم ہی دل پر بہت سارا بوجھ آ کر اتو وہ کھڑی ہو گئی۔

”ارے ارے تمہاری ماں جی تمہارے لیے کچھ لینے گئی ہیں۔“

”نہیں بابا پھر سہی..... یعنی کون آئے تو اسے میرا سلام کہیے گا۔“

اور پھر وہ ان کے اصرار کے باوجود وہاں نہیں رکی اور کچن میں اس کے لیے کباب تلتی صالہ بیگم کو دروازے کے اندر جھانک کر خدا حافظ کہہ کر حیران چھوڑ کر چلی گئی۔

”ارے کیا ہوا مریم چلی بھی گئی۔“ وہ ہاتھ پونچھتی برآمدے میں آ گئیں۔

”ہاں کچھ اپ سیٹ لگتی ہے۔ شاید شہر یار نے کچھ بتایا ہو۔“ انہوں نے سکندر کی طرف دیکھ کر گویا انہیں بتایا لیکن سکندر سر جھکائے بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

”سکندر۔“ انہوں نے آہستگی سے اسے بلایا۔

”جی بھاجی۔“ سکندر نے جھکا ہوا سراٹھایا۔

”کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ محض اس لیے کہ مریم کی والدہ کا تعلق شوہر سے ہے ہم اسے بھی رد کر دیں۔ میں مریم کو تقریباً دو سال سے جانتا ہوں اور یعنی تو چھ سال سے اس کے ساتھ پڑھ رہی ہے“

دونوں میں بے حدودتی ہے۔ یعنی نے ہمیشہ اس کی تعریف کی ہے۔ وہ بہت حساس ہے اور اپنے گھر ماحول اور والدہ کے مزاج سے بالکل مختلف۔“

اور ڈولی بھی کتنی مختلف لگتی تھی۔ پر خلوص اور جان قربان کرنے والی، بظاہر بے غرض اور بے طلب محبتیں لٹاتی ہوئی، ”بلکہ مریم کو تو ہمیشہ اپنی والدہ سے اس بات پر اختلاف رہا۔ اسے کبھی بھی ان کا شوہر میں جانا پسند نہیں رہا۔“

”بھاجی۔“ سکندر نے گہیر آواز میں کہا ”میں نے محض ایک رائے دی تھی میرا تجربہ ہے کہ ایسی لڑکیاں گھر نہیں بتائیں جلد یا بدیر یہ گھر بن کر ٹوٹ جاتے ہیں میری خواہش ہے کہ شہر یار کو زندگی میں بہت محبتیں ملیں، مکمل آسودگی اور خوشی ملے میں نے محسوس کیا تھا کہ باوجود اس کے کہ آپ نے اور بھالو نے بہت شفقتیں اور محبتیں دی ہیں۔“

ارسل نے اور یعنی کی طرح ہی چاہا ہے اسے لیکن پھر بھی اس کے اندر ایک تشنگی سی ہے۔ جو کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگتی ہے، مجھ سے غبر آ پ کے متعلق پوچھتے ہوئے ان کی باتیں سننے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو درد کو ٹپس لیتا ہے وہ مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ بھاجی، یہ ان اتنے پیارے اور شفقت

رشتوں سے محرومی کا کرب ہمیشہ آدمی کے اندر رہتا ہے۔“ انہوں نے ایک نظر چوہدری ثار پر ڈالی ”میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ شیر کی بیوی اتنی اچھی اور محبت کرنے والی ہو کہ اس کی زندگی کی یہ تشنگی اور اس کا کرب کم ہو جائے لیکن بھاجی اگر آپ اور شہر یار نہیں چاہتے ہیں تو.....“ وہ کھڑے ہو گئے۔

”میں کچھ دنوں تک امریکا واپس جا رہا ہوں۔ شہر یار کبھی کبھی گاؤں جا کے اسپتال دیکھ لے گا اور میں ایک دو ڈاکٹروں یا اپائنٹ کر دوں گا۔“

”سکندر پتر۔“ چوہدری ثار نے تڑپ کر انہیں دیکھا اور کھڑے ہو کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”نہیں سکندر میں تمہیں اب واپس نہیں جانے دوں گا۔ میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی اور نہ ہی شیر ی ایسا ہے اور سنو وہی کچھ ہوگا جو تم چاہو گے۔ میں شیر ی کو سمجھا دوں گا۔ بس یوں ہی اس بچی کے لیے خود بخود ہی دل میں ایک جگہ بن گئی تھی اور پھر شیر ی نے تو ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا یہ تو ہم سب کی تمہاری بھابھ کی، یعنی کی اور میری خواہش تھی اور شیر ی نے تو ہم سب کی خواہش کا احترام کیا تھا۔“

”تو پھر آپ۔“ سکندر کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں۔

”پھر کچھ نہیں۔“ وہ افسردگی سے بھرے ”مریم پتا نہیں کیوں ہم سب کو بے حد عزیز ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ ارسل اور منا بھی جب بھی فون کرتے ہیں پوچھتے ہیں لیکن ہم تمہیں کسی صورت بھی نہیں کھونا چاہتے۔ مریم نہ سہی کوئی اور سہی..... پتا نہیں کیوں“ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ محض اس وجہ سے کہ مریم کی والدہ شوہر سے متعلق ہیں تم اسے رد نہیں کر رہے ہو۔ تم اتنے تنگ نظر نہیں ہو۔ تمہارا دل تو بہت کشادہ تھا سکندر پتر۔“

”ہاں شاید محض اس وجہ سے نہیں۔“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

ان کی آنکھیں خوں رنگ ہو رہی تھیں۔

انہوں نے آہستگی سے چوہدری ثار کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔

”بھاجی..... مریم کی والدہ وہ عورت ہے جس نے مجھے آپ سے دور کیا تھا..... اور پھر خود ہی ایک دن واپس جھٹک کر چلی گئی اور میں آج تک حیران ہوں کہ.....“ ان کی آواز میں ٹوٹے کاچ کی جھن تھی جیسے ایک دم بہت سارے درد ان کے اندر جاگ گئے ہوں۔

”تم..... تمہارا مطلب ہے ڈولی؟“ چوہدری ثار نے از حد حیرت سے پوچھا۔

سکندر نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور چوہدری ثار برآمدے کے پتھوں بیچ ساکت اور حیران کھڑے رہ گئے۔



”بی آپا یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“ ان کے ہاتھ ہولے سے کاٹنے اور غیر ارادی طور پر ریسپر پران کی

گرفت مضبوط ہوگئی۔

”عادل۔“ دوسری طرف بی آپا کی آواز بھرا گئی ”خدا جانے کہاں چلا گیا ہے وہ۔“

”مگر بی آپا۔“ انہوں نے اپنے ایک دم سے ڈوب جانے والے دل کو سنبھالا ”وہ بھلا کیسا کہاں جاسکتا ہے وہ تو کبھی حویلی سے باہر نہیں گیا۔ ہر وقت تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔“

”وہ اکیلا نہیں تھا کرم داد تھا اس کے ساتھ۔“ بی آپا کی آواز مدھم تھی ”کبھی کبھی جب وہ خند کرتا ہے تو کوئی نہ کوئی اسے باہر لے جاتا ہے تمہیں نہیں پتا نا عادل، تم کون سا حویلی میں زیادہ رہتے ہو۔ وہ کبھی کبھار چلا جاتا ہے۔“

”تو۔“ انہوں نے الجھ کر کہا ”آپ نے پوچھا نہیں کرم داد سے کہ کیوں نہیں دھیان رکھا اس نے اور کہاں چلا گیا تھا وہ اسے چھوڑ کر۔“

”وہ بہت ذمے دار ہے عادل، تمہیں پتا تو ہے۔ برسوں سے وہ کامل کے ساتھ ہے۔ وہ تو خود گل سے رو رو کر پاگل ہو رہا ہے۔ کہتا تھا صرف دس منٹ کے لیے گل باز سے باتیں کرنے لگا تھا کامی اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ وہ گل باز سے باتیں کرتا ہوا چند قدم آگے نکل آیا تھا لیکن اس نے مڑ کر دیکھا تھا، کامی وہاں ہی بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ صرف چند منٹ کے لیے وہ اس سے غافل ہوا تھا اور جوں ہی گل باز سے بات کر کے وہ مڑا کامی وہاں نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ حویلی واپس چلا گیا ہوگا کیونکہ وہ حویلی سے زیادہ دور بھی نہیں تھے لیکن.....“ بی آپا کی آواز رندھ گئی لگتا تھا وہ کل شام سے اب تک مسلسل روتی رہی ہیں۔

”لیکن وہ اتنی دیر میں کہاں جاسکتا ہے کہیں سڑک کی طرف نہ نکل گیا ہو۔“ وہ بے حد الجھ رہے تھے۔

”سب کا یہی خیال ہے۔“ بی آپا نے تائید کی ”اور کل شام سے ہی چاچا عبدالرحمن، مانی اور مہران پاگلوں کی طرح اسے ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن خدا جانے وہ کہاں چلا گیا ہے۔ زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ ماں جی کا بہت برا حال ہے عادل۔“ آنسوؤں پر سے جیسے ان کا اختیار اٹھ گیا۔

”اوکے۔“ ریلیکس بی آپا۔“ انہوں نے انتہائی ضبط سے کہا ”میں آرہا ہوں۔ آپ کو کل ہی مجھے بتانا چاہیے تھا۔“

”ماں جی کا خیال تھا کہ صبح تک ضرور مل جائے گا۔ تمہیں خوا خواہ پریشانی ہوگی۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو گئے ہو تم حویلی سے۔“

”اللہ حافظ۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور کرڈال پر ڈال دیا۔

یہ کسی خبر سنائی تھی بی آپا نے۔ آخر کہاں جاسکتا ہے وہ۔ ارد گرد کا علاقہ تو اپنا ہی تھا..... شاید اس سے آگے ان سے کچھ نہ سوچا جاسکا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور خدا بخش کو آواز دی۔

”خدا بخش۔“

”جی میاں۔“ وہ صانی سے ہاتھ پونچھتا ہوا آگیا۔

”میں حویلی جا رہا ہوں۔ تم میرے کچھ کپڑے بیگ میں رکھ دو۔ ہو سکتا ہے مجھے کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔ صبح کالج فون کر کے اکبر صاحب کو بتا دینا کہ میں کم از کم ہفتہ بھر کالج نہ آسکوں گا، سرور بھی آئے گا۔ اسے بھی بتا دینا۔“

”حویلی میں تو سب خیریت ہے نا عادل میاں۔“ خدا بخش نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ کامی کہیں چلا گیا ہے۔“ انہوں نے مختصر آیتا یا اور پورچ میں آگئے۔

اور جب خدا بخش بیگ لے کر آیا تو وہ پورچ میں ہی ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے کسی پل چین نہیں آرہا تھا، کیسے کیسے خیال دل میں آرہے تھے۔

”کہیں کسی نے اغوا نہ کر لیا ہو۔ آج کل اغوا برائے تادان کے بھی کافی کیسز ہو رہے ہیں۔“

”کہیں راہ بھٹک کر سڑک کی طرف جا نکلا ہو اور وہاں سے کسی بس وغیرہ میں بیٹھ گیا ہو اور کوئی بھکاری ساتھ لے گیا ہو۔ اور اب۔ یا پھر کہیں کوئی حادثہ اور ماں جی.....“

”دھیان سے ڈرائیو کیجیے گا عادل میاں۔“ بیگ ڈگنی میں رکھ کر خدا بخش نے آہستگی سے کہا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے انہوں نے خدا بخش کی طرف دیکھا ”دعا کرنا خدا بخش۔“

”اللہ کرم کرے گا عادل میاں۔ انشاء اللہ کامی میاں مل جائیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔“

لیکن وہ کیسے پریشان نہ ہوتے۔ لاہور سے حویلی تک کے طویل سفر میں ایک لمحے کے لیے بھی ان کا ذہن کامل کی طرف سے نہیں ہٹا تھا۔

”خدا جانے کہاں ہوگا۔“

”کس حال میں ہوگا۔ پتا نہیں زعہ بھی ہوگا یا نہیں.....“

بزار طرح کے دوسرے تھے جو ان کے ذہن و دل سے چٹے ہوئے تھے وہ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی ان کے جواب رد کرتے جھکولے پر جھکولے لکھاتے رہے۔ بار بار اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔

ان کی آمد پر وہ کس قدر خوشی کا اظہار کرتا تھا۔ بھائی، بھائی کہہ کر ان سے چٹ جاتا۔ جڑ کر بیٹھ جاتا تھا اور بھرا ہئی چیزیں انہیں دکھاتا رہتا تھا۔ ان کے ہاتھوں کو چومتا اور ان کے چہرے کو ہاتھوں میں لیتا۔ وہ بھرپور جوان لڑکا جب معصوم بچوں جیسی حرکتیں کرتا تو ان کے دل میں ہوک سی اٹھتی تھی۔ وہ زیادہ دیر اس کے پاس بیٹھ نہ پاتے تھے۔

وہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کرتے حویلی پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے لیکن سب حویلی میں اکٹھے تھے چاچا عبدالرحمن، عمران، مہران سب ہی۔

گیٹ پر ہی انہیں بٹا چل گیا کہ وہ نہیں ملا۔ ایک موبہومی امید جو راستے بھر انہیں دلا سادیتی آئی تھی کہ کیا خبر وہ گھر پہنچیں تو کال آچکا ہو دم توڑ گئی۔ وہ سر جھکائے ماں جی کے کمرے میں داخل ہوئے تو ماں جی آنکھیں موندے لیے تھیں اور بی آپا ہولے ہوئے ان کا سر دبا رہی تھیں۔ پاس ہی کرسی پر چاچا عبدالرحمن اور بانی بیٹھے تھے۔

”ماں جی۔“ ان کے بیڈ کے پاس دوزانو بیٹھے ہوئے انہوں نے آہستہ سے آواز دی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

”عادل میرا کامی۔“ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”ماں جی۔“ عادل نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”میرا کامی عادل۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ”پتا نہیں کہاں ہو گا وہ..... پتا نہیں اس نے کچھ کھایا بھی ہو گا یا نہیں..... وہ تو میرے یا کرم داد کے ہاتھ کے علاوہ کسی سے نہیں کھاتا تھا۔ پتا نہیں اسے نیند بھی آئی ہو گئی یا نہیں..... وہ تو داد کی چھڑی سینے سے لگا کر سوتا تھا۔ جس دن کہیں ادھر ادھر ہو جاتی تھی کتنا چیختا چلاتا تھا واویلا کرتا تھا۔ وہ روتا ہو گا تو کون اسے بہلاتا ہو گا..... وہ تو بڑا نازک مزاج تھا عادل میرا بچہ..... خدا کے لیے میرے بچے کو ڈھونڈ کر لے آؤ۔“

پروفیسر عادل نے بڑی شکل سے اپنے آنسوؤں کو روکا۔

ماں جی نے ایک دم اپنے ہاتھ پروفیسر عادل کے آگے جوڑ دیے۔

”ماں جی۔“ عادل نے ان کے ہاتھ ایک دم دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا لیے ”میں آگیا ہوں نا انشاء اللہ کامی مل جائے گا۔“

”نہ جانے کن ظالموں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ میرا بچہ کل سے بھوکا پیاسا ہو گا۔“

”ماں جی پلیز حوصلہ کریں۔“ اٹھ کر ان کے پاس ان کے بیڈ پر بیٹھے ہوئے عادل نے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔

”عادل میرا کامی تو معصوم ہے بالکل۔“ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بلکنے لگیں ”عادل ہولے ہولے انہیں تھکنے لگے لیکن خود ان کے آنسوؤں کی آنکھوں سے باہر آنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔

بہت دیر تک وہ ماں جی کے پاس بیٹھے انہیں بہلاتے اور تسلیاں دیتے رہے یہاں تک کہ وہ سو گئیں۔ بی آپا نے بتایا کہ وہ ٹرانکولائزر کے زیر اثر ہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر انجکشن لگا کر گیا ہے۔ کل سے لے کر اب تک پلک نہیں جھپکی اور نہ ہی کچھ کھایا پیا ہے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر ان کے پاس سے اٹھ آئے۔ بی آپا بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں تمہارے کھانے کے لیے کہوں۔“

”نہیں پلیز بی آپا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ بس آپ چائے بھجوا دیں۔“

وہ چاچا عبدالرحمن اور سلطان کے ساتھ لیونگ روم میں آگئے اور بہت دیر تک ڈسکس کرتے رہے۔ ایک ایک بات تفصیل سے سنی، کرم داد کو بلایا۔

”عادل میاں۔“ کرم داد کے تو آنسو ہی نہیں رک رہے تھے ”میں کیا جواب دوں گا بڑے مالک صاحب کو۔ مرنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ کامی کی حفاظت جان سے بڑھ کر کروں گا لیکن مجھے تو پتا ہی نہیں چلا جی کہ کون نے کیا کامی میاں کو۔ ہم دونوں ہی کھیت کی منڈیر پر بیٹھے تھے جی کہ گل باز خان آگیا۔ اس نے کہا ذرا میری بات سنو۔ اس کی گھر والی روٹھ کر میکے بیٹھی ہے۔ میں چند قدم ہی آگے گیا تھا۔ مڑ کر دیکھا بھی تھا اسے۔ پھر گل باز نے مجھے یوں باتوں میں لگا لیا جی۔ ٹھیک سے یاد نہیں کتنی دیر بات ہوئی۔ پر زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ بات ختم کر کے جب گل باز چلا گیا تو میں نے مڑ کر دیکھا تو کامی میاں نہیں تھے وہاں۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

”اچھا اچھا حوصلہ کرو۔“

”میں کیسے جیوں گا جی۔ کیسے خود کو معاف کروں گا میں..... سب سے زیادہ تو وہ میرے ہی تھے صبح سے شام تک میں ہی ہوتا تھا ان کے ساتھ۔“

بی آپا چائے لے آئیں تو وہ آنسو پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

چائے پیتے ہوئے بھی چاچا عبدالرحمن مسلسل اس کا ہی ذکر کرتے رہے۔

”زیادہ امکان ہے کہ کسی ایسے گروہ کے ہاتھ لگ گیا ہے جو پیشہ ور بھکاری ہیں۔“

”آس پاس ارد گرد تو کہیں بھی نہیں..... ہر جگہ گیا ہوں۔ ہر جگہ پوچھا ہے۔“ عمران نے بتایا۔

”پھر..... کہاں ڈھونڈیں گے اسے۔ ماں جی کو کیسے تسلی دیں گے۔“ انہوں نے بے بسی سے عمران کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے صبح اشتہار دیں اخبار میں شاید۔“ چاچا عبدالرحمن نے اٹھتے ہوئے کہا ”اور اب تم آرام کرنا دوبارہ بج گئے ہیں۔ صبح ایک بار پھر تلاش کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔“

”جی بہتر۔“

وہ تینوں کو رخصت کر کے آئے تو بے حد بے حال تھے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ماں جی کو ایک غور دیکھ کر اور بی آپا سے کہہ کر کہ اگر ماں جی جاگ جائیں یا رات کو ان کی طبیعت خراب ہو جائے تو وہ انہیں بگا لیں۔

”عادل تم سو جانا بہت تھکے ہوئے ہو سفر کر کے آئے ہو۔ میں ہوں نا ماں جی کے پاس۔ کل سے تم نے ایک لمحے کے لیے بھی ماں جی کو اکیلا نہیں چھوڑا۔“ بی آپا نے انہیں تسلی دی۔

انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آگئے اور بیڈ پر لیٹتے ہوئے عینے پر سر رکھا ہی تھا کہ

ایک دم اٹھ بیٹھے۔

اور پتا نہیں کامی کو بستر بھی نصیب ہوا ہوگا۔ تکیہ بھی ہوگا یا نہیں۔ شاید کہیں فٹ پاتھ پر کہیں زمین پر بیٹھ ہو اور..... اسے صاف نرم بستر ہی پسند تھا۔ بستر پر معمولی سی ٹمکن بھی ہوتی تو الٹ دیتا۔ چیخ چیخ کر چادر اتار کر پھینک دیتا۔ تکیہ گداجو بھی ہاتھ میں آتا، پھینکتا جاتا..... اور اپنے تکیے کے بغیر اسے نیند کہاں آتی تھی..... ایک بار اس نے تکیے پر پانی گرا دیا تھا تو کرم داد نے دوسرا تکیہ رکھ دیا تو کتنا ہنگامہ کیا تھا..... رو کر برا حال کر لیا تھا اور جب تک کرم داد نے دوسرا تکیہ لا کر نہیں دیا تھا سو یا نہیں تھا۔ مسلسل روتا رہا تھا..... اور اب پتا نہیں کہاں کس پتھر ملی زمین پر..... وہ بے چین اور مضطرب سے ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ پوری رات یوں ہی اسی بے چینی اور اضطراب میں گزری۔ کبھی بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیتے اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ صبح ناشتا کیے بغیر وہ گاڑی لے کر نکل گئے تھے۔

اور پھر کہاں کہاں انہوں نے اسے تلاش نہیں کیا۔

ارد گرد کے تمام گاؤں چھان مارے

قریبی قصبے کے بس اسٹاپ پر۔ دیکھوں کے اڈے پر فقہروں کے ٹھکانے پر ہر جگہ وہ اس کا پتا پوچھتے پھرے..... اخباروں میں اشتہار دیے۔ ریڈیو اور ٹیلیوژن پر بھی اعلان کروایا لیکن کہیں سے کچھ پتا نہ چلا۔ مہران اور سلطان کو ساتھ لیے وہ رات گئے تک اسے ڈھونڈتے پھرے اور پھر تھک ہار کر ماں جی کے پاس آ بیٹھے۔ ماں جی خاموش نظروں سے انہیں دیکھتیں۔ وہ بنا کچھ کہے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں تسلی دیتے..... پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اب تو کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

نہ کوئی ایک لفظ تسلی کا

نہ امید کی کوئی کرن

قصبے کا اسپتال

گاؤں کے کونٹیں

کہاں کہاں تلاش نہیں کیا تھا انہوں نے اسے

کہیں سے کوئی نشان نہیں ملا تھا۔

حویلی میں صبح شام دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

بی آپا نے ختم کروا کے نیاز تقسیم کروائی تھی۔

لیکن دعائیں بھی جیسے راستوں سے ہی پلٹ رہی تھیں۔ کہیں کوئی درجیو لیت نہیں کھل رہا تھا۔ اس روز مغرب سے ذرا پہلے وہ شاہ مراد شاہ کی درگاہ پر منت مان کر واپس آئے تو بہت دل گرفتہ اور مایوس سے

تھے۔ شاہ مراد کی درگاہ گاؤں سے زیادہ دور نہ تھی۔ مہران کا خیال تھا کہ وہاں بھی دیکھ لیا جائے ممکن ہے کسی نے جھٹکتے دیکھ کر وہاں درگاہ پر چھوڑ دیا ہو.....

”ہاں ممکن تو ہے۔“ ان کے اندر ایک دم امید کا دیا جگمگا اٹھا تھا..... وہ ہر جگہ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے لیکن حیرت ہے انہیں درگاہ کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

”یقیناً وہ وہیں ہوگا۔“ ان کے دل کو جیسے یقین سا ہو گیا۔

وہ ماں جی کو درگاہ پر جانے کا بتانے لگے تو ان کی ہچکھی ہوئی آنکھوں میں بھی روشنی سی اتر آئی۔

”وہاں منت مان آنا عادل میرا کامی مل جائے تو چادر پڑھاؤں گی مزار پر اور لنگر میں پورے ایک ہفتے تک کھانا بھجواؤں گی۔“

اور وہ ان باتوں پر یقین نہ رکھتے ہوئے منت مانتے ہوئے رو سے پڑے تھے۔

ایک ایک مجاور سے انہوں نے کامی کا پوچھا تھا لیکن سب نے ہی لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور وہ بے حد دل گرفتہ اور مایوس سے درگاہ سے باہر آئے تھے۔

”عادل بھائی۔“ مہران نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا ”آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں۔ اللہ کی رحمت سے ناامیدی کفر ہے۔“

”ہاں جانتا ہوں۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی ”لیکن پتا نہیں کیوں دل کو ایک آس سی باندھ گئی تھی کہ کامی ضرور یہاں سے مل جائے گا۔“

”خدا کبھی کبھی اسی طرح اپنے بندوں کو آزماتا ہے عادل بھائی۔“

”اس کا وجود تو خود ایک بہت بڑی آزمائش تھا مہران..... پھر یہ ایک اور آزمائش..... اور پتا نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں..... اگر زندہ ہے تو نہ جانے کن لوگوں کے پاس اور کس حال میں ہے۔“

”پلیز عادل بھائی..... آپ کا یہ حال ہے تو ماں جی کو کون دلا سادے گا۔ اپنے آپ کو سنبھالیں۔“

”کوشش تو کر رہا ہوں مہران۔“ وہ افسردگی سے مسکرائے ”اور ہاں تم اتنے دنوں سے یہاں ہو تمہاری بڑھائی کا حرج نہیں ہو رہا ہے کیا۔“ انہوں نے موضوع بدلا۔

”کوئی خاص نہیں۔ چلا جاؤں گا ایک دو روز میں۔“

”میری تو خواہش تھی کہ تم پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کرتے۔“

”ہاں ارادہ تو میرا بھی تھا لیکن جب تک ہمارے کالج میں ایم اے کی کلاسز شروع ہوتیں تو میں نے سوچا یہاں سے ہی ایم اے کر لوں۔ شروع سے ہی میرا ارادہ انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کا تھا۔“

وہ راستے بھر مہران سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تاکہ ذہن سے کامی کا خیال کچھ دیر کے لیے نکل جائے۔ اتنے دنوں میں پہلی بار مایوسی نے اس طرح ان کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ لحوہ

بعد انہیں یوں لگتا جیسے دل ایک دم خالی خالی ہو گیا ہو۔

مہران کو چھوٹی حویلی کے گیٹ پر ڈراپ کر کے وہ سیدھے بڑی حویلی آئے تھے۔

”کامی کے متعلق کوئی خبر؟“ انہوں نے چوکیدار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر جواب نفی میں پاکر وہ سر جھکائے اندر کی طرف چل پڑے اور پھر ماں جی کے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ایک دم ہلٹ آئے انہیں لگا جیسے آج اس وقت ماں جی کا مایوس چہرہ دیکھنے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔

ٹی وی لاؤنچ میں بی آپا کیلی بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ وہ انہیں سلام کر کے وہاں ہی بیٹھ گئے۔

بی آپا نے ایک نظر ان کے جھکے ماندے متضلل چہرے کی طرف دیکھا اور بتا پوچھے جان گئیں کہ وہ ناکام ہی لوٹے ہیں۔ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے صاحبان کو آواز دے کر چائے کا کہا اور پھر عادل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”عادل تم نے کتنی جھٹی لے رکھی ہے؟“

”ایک ہفتے کا کہا تھا خدا بخش سے اور اب تو گیارہ دن ہو گئے۔ سوچ رہا ہوں صبح چلا جاؤں چند روز تک مزید جھٹی لے کر آ جاؤں گا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا نہ کسی نے اسے کہیں جاتے دیکھا نہ ادھر ادھر وہ کسی کو نظر آیا۔۔۔۔۔ آخر کسی کو تو کسی طرف جاتے نظر آتا۔ میرا دل کہتا ہے وہ زندہ نہیں ہے۔“

پروفیسر عادل لب بچنے خاموش بیٹھے رہے۔

”کامی کی پریشانی میں خیال ہی نہیں رہا۔ لاہور میں تو سب لوگ ٹھیک ہیں نا۔۔۔۔۔ عاشی نینا مور اور مریم۔“

”ہاں سب اچھے ہیں۔“ انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

”میں اور ماں جی تو لاہور آنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ زینی آئی سے بات کر سکیں۔ اب تو مریم پڑھائی سے بھی فارغ ہو چکی ہے پھر پتا نہیں کیوں وہ تاخیر کر رہی ہیں۔“

”دراصل وہ خود گھر نہیں تھیں۔۔۔۔۔ کراچی میں تھیں۔“ انہوں نے مختصر جواب دیا ”اب آئی تھیں تو اس روز میڈم کو فون کر کے بتایا تھا کہ ان کا پروگرام تقریباً مہینہ بھر لاہور رہنے کا ہے اور میں سوچ ہی رہا۔“

کہ آپ کو فون کر کے بتاؤں کہ آپ کا فون آ گیا تھا۔“ انہوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹک لیا۔

کیسے ایک ایک لمحہ گن گن کر گزرا رہے تھے وہ۔

عاشی جواب لاہور ہی آگئی تھی اکثر فون کرتی تھی اور ہر بار یہی وہ اس سے زینی عثمان کا ضرور پوچھتے تھے۔

”ماما تو کراچی میں ہیں۔“ ہر بار عاشی کا یہی جواب ہوتا تھا۔

وقت جیسے گزرنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ کبھی تو انہیں لگتا جیسے خوشیاں اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے

سمجھے لیے ان کی منتظر کھڑی ہوں اور کبھی یوں لگتا جیسے ان کے ارد گرد سارے رنگ مر گئے ہوں اور زندگی میں کوئی حسن باقی نہ رہا ہو۔ امید اور ناامیدی کے اس کھیل میں لذت بھی تھی اور اذیت بھی۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو وہ اس کھیل سے اکتا جاتے۔۔۔۔۔ کوئی فیصلہ ہو۔۔۔۔۔ چاہے کیسا بھی۔

اور کبھی ان کا جی چاہتا۔۔۔۔۔

زندگی یوں ہی گزر جائے

امید و ناامیدی کی آنکھ مچولی میں۔

کسی فیصلے کی اذیت سے یہ امید و ناامیدی کا کھیل ہی اچھا ہے۔

پاک ایک ہی زندگی کی ساری دلچسپیاں ختم ہو گئی تھیں۔

نہ پڑھنے میں جی لگتا تھا نہ ادبی محفلوں میں۔

نہ رنگ اور برش ہی دل بہلاتے تھے۔

کتنے ہی انویشین کارڈ ٹیبل پر یوں ہی پڑے رہتے تھے۔ خدا بخش یاد دلاتا۔

بجلی حیدر فون کرتے ”یار آج فلاں کتاب کی رونمائی ہے ضرور آتا۔“

وہ وعدہ بھی کر لیتے مگر پھر بھی نہ جاتا۔

کبھی بہت گھبراتے تو عاشی سے ملنے یا نینا اور تیور کی خیریت معلوم کرنے کے بہانے ”نہنہ ولا“ چلے جاتے اور یوں اسے دیکھ لیتے جسے ہر آن ہر لمحہ سوچتے تھے۔

”وہ ہر رنگ ہر لباس اور ہر انداز میں دل میں اترتی جاتی تھی ان کا جی چاہتا وہ اسے بتائیں کہ وہ کیسے اسے سوچتے ہیں اسے محسوس کرتے ہیں اور کیسے وہ ان کے دل پر حکمرانی کر رہی ہے لیکن پھر وہ ہونٹ سی لپٹے لگا ہوں جھکا لیتے لیکن خود پر ضبط کے پھرے بٹھائے بٹھائے وہ جھک سے گئے تھے اور ایسے میں میڈم

زنگ کے فون نے جیسے ان کی رگوں میں زندگی سی دوڑا دی تھی۔

”کہاں گم ہو گئے ہو خان صاحب؟“

”تو یہاں ہی ہوں میڈم۔“ وہ شرمندہ سے ہو گئے تھے۔

اس روز کے بعد وہ میڈم کے ہاں جا ہی نہیں سکے تھے۔ میڈم نے اس روز ان کی بے حد تواضع کی تھی۔ امتیاز شاہ بھی بہت اخلاق سے پیش آئے تھے لیکن چون کہ وہ اپنی نئی کیسٹ کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں مشغول تھے۔ اس لیے وہ کچھ دیر بیٹھ کر معذرت کر کے چلے گئے تھے لیکن میڈم نے بعد اصرار انہیں

کھانے تک روک لیا تھا اور اس دوران انہوں نے زینی شرجیل مرزا ڈاکٹر عبدالمعید، بجنی حیدر سب کے متعلق ہی بے شمار باتیں کی تھیں۔

”اور کتنی بھی مریم کے خواستگاریوں میں سے ہے۔“

انہوں نے چونک کر میڈم کی طرف دیکھا تھا۔

”لیکن“ انہوں نے تہقہہ لگایا ”تم بے فکر رہو زینی شرجیل مرزا کا پروپوزل کسی صورت میں بھی مریم کے لیے قبول نہیں کرے گی۔ دراصل زینی خود کسی زمانے میں شیجی کے پرستاروں میں سے تھی اور شیجی ظاہر ایسا ہی کرتا تھا جیسے زینی کو دل و جان سے چاہتا ہے اور اگر زینی عثمان احمد کی بیوی نہ ہوتی تو..... لیکن اس کی نظر دراصل مریم پر تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو عمر کے حساب سے مریم اس کی بیٹی جیسی ہی ہے اور اندر ہی اندر زینی نے دلا سا بھی دے رکھا تھا شیجی کو لیکن عثمان بھائی شیجی کو پسند نہیں کرتے تھے۔“

میڈم کی باتوں سے ان کے دل پر بخند سا چھا گیا تھا۔

”اور یہاں تو بونے کس قسم کی عورت سے شادی کی تھی۔“

”لیکن تمہارا پلڑا اس وقت بھاری ہے میاں ہر لحاظ سے۔“

وہ بہت حیرانی سے میڈم کی باتیں سنتے رہے تھے اور کئی بار انہیں میڈم کی دماغی صحت پر شبہ سا ہوا تھا..... شاید ان کی سوچ اتنی محدود تھی۔ اس سے آگے ان کی اپرویج نہیں تھی۔ نذیب عثمان سے ملنے والے ہر شخص کو ان کے پرستاروں میں شمار کر رہی تھیں وہ۔

ڈاکٹر عبدالمعید کی قدر تھیں اور سادہ دل انسان تھے اب وہ جب بھی نذیب دلا جاتے ڈاکٹر عبدالمعید اور سرجن ہاشم سے ضرور ملتے۔ ان سے بات کر کے انہیں مزہ آتا تھا اور عاشی کی نسبت سے تو وہ بہت عزیز ہو گئے تھے۔ چنانچہ میڈم کی باتوں پر ان کی پیشانی پر ابھرنے والی لکیریں واضح ناگواری کا اظہار کر رہی تھیں اور انہوں نے دو تین بار موضوع بدلنے کی کوشش کی تو میڈم نے ان کی ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے لالہ کا قصہ چھیڑ دیا۔

”تم نے عادل خان لالہ کو نہیں دیکھا..... پھولوں سے گندمی اور کلیوں سے بنی میری بیٹی جانے کس حال میں ہوگی اور یہ سارا کیا دھرا عزت کا ہے۔“

اور موضوع کی تبدیلی سے انہوں نے بے حد سکون محسوس کیا تھا لیکن غالباً اسی وجہ سے میڈم کے بے حد اصرار کے باوجود وہ دوبارہ میڈم کی طرف نہ جاسکے تھے اور نہ ہی انہوں نے فون کیا تھا اور اس روز.....

اچانک ہی میڈم کا فون آ گیا تھا..... بہت سارے گلے شکوے کرتے ہوئے انہوں نے زینی کی آمد اور اس کے ایک ماہ تک قیام کی خبر بھی دی تھی اور انہوں نے عاشی کو فون کر کے اس کی تصدیق بھی کر لی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو عادل؟“ بی بی آپا نے انہیں گم مدم دیکھ کر پوچھا تو وہ چوہے۔

”کچھ نہیں۔“

”عادل! ماں جی ذرا سنبھل جائیں تو ہم لاہور آئیں گے اور پھر.....“

”لیکن اب اس طرح کیسے ممکن ہے بی بی آپا جبکہ ابھی گامی کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔“ انہوں نے کسی قدر

حیرت سے بی بی آپا کی طرف دیکھا۔

”خدا نے چاہا تو کچھ نہ کچھ تو پتا چلے گا ہی کامی کے متعلق بھی۔ آخر ہر روز اخبار میں اشتہار آرہا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اعلان ہو رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تو خبر دے گا ہی نا اس کے متعلق اور پھر زندگی تو رواں دواں رہتی ہے۔ حادثات بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور زندگی کے کام رکستے نہیں۔ جو کام انجام دینا ہے وہ تو دینا ہی ہے۔ لوگ ہمارے انتظار میں نہیں بیٹھے رہیں گے عادل..... بس ماں جی کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو میں ان سے بات کروں گی اور خود ان کی بھی خواہش تھی کہ جلد از جلد.....“

”نہیں پلیز بی بی آپا! ابھی نہیں۔ ابھی کچھ مت کہیے گا ماں جی سے۔ ابھی آپ دیکھ نہیں رہیں کہ کیا حالت ہو رہی ہے ان کی.....“

بی بی آپا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ صاحبان کے پیچھے پیچھے ماں جی بھی آگئیں۔

”ماں جی آپ۔“ عادل نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔

”تم آگئے۔“

”جی ماں جی۔“ انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔

”بیٹھو بیٹا۔“ وہ بی بی آپا کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”اور تم جاؤ صاحبان۔ تمہاری بی بی چائے خود بنا رہی گی۔“

پروفیسر عادل نے بہت غور سے انہیں دیکھا اس وقت وہ پہلے کی نسبت بہت ترنگ رہی تھیں۔

”عادل! میں نے تم سے کہا تھا کہ وکیل سے مل کر پتا کرنا۔ تم نے پھر بتایا نہیں کہ تم وکیل سے ملے تھے یا نہیں؟“

”وکیل سے ملا تھا ماں جی اور فیصل آباد بھی گیا تھا لیکن بھولی بار آیا تو آپ کو بتانا بھول گیا۔ وہاں فیصل

آباد میں تو اللہ یاری کہہ رہا تھا کہ فیصل ہی صحیح نہیں ہو رہی تھی اس لیے آمدنی کم ہو گئی ہے اور وکیل.....“

انہوں نے بی بی آپا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے ماں جی کی طرف دیکھا ”وہ کہہ رہا تھا کہ دادا نے

اپنی زمین و جائداد کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس زمین و جائداد میں چاچا عبدالرحمن کا حصہ شامل نہیں

ہے۔ ایک حصہ انہوں نے ابو کی زندگی ہی میں ان کے نام کر دیا تھا اور کاغذات انہیں بھجوا دیے تھے اور باقی

کے دو حصوں میں ایک حصہ میرے نام اور دوسرا حصہ کامل کے نام ہے۔ کامل کے حصے کے گارڈین چاچا

ہیں۔ ہاں ان کے بعد میں کامل کا گارڈین ہوں لیکن کامل کے بعد اس کے حصے کا میں مالک ہوں۔

بشرطیکہ میں حرم سے شادی کروں۔ دوسری صورت میں کامل کا حصہ سلطان مہراں اور مجھ میں برابر تقسیم

ہوگا۔“ انہوں نے ماں جی کو تفصیل بتاتے ہوئے سوچا۔

”اور پتا نہیں دادا نے یہ اس طرح کی شرط کیوں رکھی ہے۔ جبکہ زندگی میں کبھی انہوں نے مجھے حرم

کے ساتھ شادی کرنے پر اصرار نہیں کیا لیکن اگر وہ اصرار کرتے تو میں انکار بھی نہ کرتا اور پھر بھی تو جانتے تھے کہ مجھے زمین دولت چاند اکیسے ہے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”خدا جانے تمہارے دادا کے دل میں کیا تھا۔“ ماں جی نے جیسے ان کی سوچ پڑھ لی تھی۔

”مختلف بینکوں میں کامل کے نام پر اکاؤنٹ ہے جہاں چاند اکیسے آمدنی جمع ہوتی ہے۔“

”اگر تم نے حرم سے شادی نہیں کی۔“ ماں جی نے آہستگی سے کہا ”اور کامل کی موت کے بعد سر سے زیادہ فائدہ تو.....“

”ماں جی.....“ عادل نے چونک کر ماں جی کی طرف دیکھا ”یہ آپ کیا سوچ رہی ہیں..... پلیز ماں جی کوئی غلط بات ہرگز نہ سوچیے گا۔ ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ بہت سیدھی سادی سی بات ہے کہ کامی شکر کی طرف نکل گیا ہوگا اور پھر وہاں کسی بس میں بیٹھ گیا ہوگا۔ سائیکس جان کر بس والے ایسے لوگوں سے نکت طلب نہیں کرتے یوں وہ یہاں سے دور نکل گیا ہوگا۔ ممکن ہے ایک بس سے اتر کر دوسری پر تیسری پر سوار ہو گیا ہو اور یوں یہاں سے دور نکل گیا ہوگا۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کے متعلق پتا چلے گا..... وہ مل جائے گا اور یہی بات زیادہ قرین قیاس بھی ہے چاچا اور مہراں خود بہت پریشان ہیں اور مانی بھی کس طرح حیرے ساتھ خوار ہوتا رہا ہے۔“ وہ ایک دم جذباتی ہو گئے تھے۔

”ماں جی پلیز اس متنی سوچ کو ذہن سے نکال دیں۔ یہ اذیت ناک خیال دل میں لائیں بھی نہیں۔“ وہ خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک دم ہی ذہن پر آگندہ ہو گیا تھا۔

”ماں جی میں صبح واپس لاہور جا رہا ہوں۔ اب وہاں دیکھوں گا..... مختلف اداروں میں پتا کروں گا..... انشاء اللہ کہیں نہ کہیں سے کوئی خبر ضرور ملے گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔“ وہ ماں کو تسلی دے کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ دیر آرام کر کے قصبے میں جائیں گے اور اخبار کے دفتر سے پتا کریں گے شاید کسی نے کوئی اطلاع دی ہو۔ اگرچہ وہ اپنا نو نمبر وہاں چھوڑ تو آئے تھے لیکن پھر بھی وہ دوسرے تیسرے روز خود ہی اخبار کے دفتر جا کر پتا کر لیتے تھے۔ چونکہ وہ صبح واپس جا رہے تھے اور یہ فیصلہ انہوں نے کچھ دیر پہلے ہی کیا تھا کہ انہیں لاہور جا کر پتا کرنا چاہیے۔ اس لیے انہوں نے سوچا تھا جانے سے پہلے پتا کر لیں لیکن وہ آرام کرنے کے لیے لیٹے تو ماں جی کی باتوں پر غور کرتے کرتے سو گئے اور جب آنکھ کھلی تو باہر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

”افوہ..... اتنی دیر ہوگئی۔“ انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ بیٹھے مغرب کی نماز بھی چلی گئی تھی۔ اس طرح وقت نکل جانے اور نماز قضا ہو جانے کا ہمیشہ ہی انہیں بے حد دکھ ہوتا تھا۔

بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلے تو حرم بی آپا سے کوریڈور میں کھڑی ہو لے ہو لے کچھ کہہ رہی تھی۔

”اسلام علیکم۔“ آہٹ پر مڑ کر اس نے دیکھا تو سلام کیا۔

”حرم کیسی ہیں آپ اور کب آئیں؟“

ذرا کی ذرا ان کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہریں اور پھر وہ بی آپا کی طرف دیکھنے لگے۔

”اچھی ہوں۔“ حرم نے آہستگی سے کہا ”اور مانی بھائی کے ساتھ آئی تھی کافی دیر ہوگئی ہے۔“

”مانی کہاں ہے۔ چلا گیا کیا۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے بی آپا کو دیکھا۔

”ہاں چلا گیا ہے لیکن حرم کو میں نے اصرار کر کے روک لیا ہے۔ ایک کامی چلا گیا ہے لیکن گھریک دم خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ دل گھبراتا ہے تم تو صبح سے نکتے ہو تو شام کو ہی پلٹتے ہو۔“

پروفیسر عادل لمحہ بھریوں ہی خاموش کھڑے رہے۔

”آپ نے مجھے جگایا ہوتا۔ مانی ملے بغیر چلا گیا۔“

”مانی نے منع کر دیا تھا جگانے کو۔“ بی آپا نے بتایا ”کھانا ابھی لگواؤں یا کچھ دیر تک؟“

”لگوا ہی دیں نو تو بجنے والے ہیں۔ میں ماں جی سے مل کر ابھی آتا ہوں۔“ انہوں نے ماں جی کے

کمرے کی طرف جاتے جاتے حرم پر ایک نظر پھر ڈالی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ نہ تو اس کے چہرے پر

ملال کم ہوا تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں لاعاصلی کا کرب مدھم ہوا تھا۔ اداسی اس کے پورے وجود سے

لپٹی ہوئی تھی جیسے اداسی کا ایک ہالہ سا اسے حصار میں لیے ہوئے ہو۔ ہمیشہ کی طرح ان کے دل پر ایک

بوجھ سا آگرا تھا۔ حرم کو دیکھ کر اس نے مل کر ہمیشہ ہی ان کا دل بوجھل ہو جاتا تھا اور اب تو جب سے حرم

انہیں ملتی تھی تو وہ حرم کو سوچنے لگے تھے۔ انہیں حرم کا خیال زیادہ ہی آتا تھا۔

وہ اس کے دکھ کو محسوس کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نارسانی کے زخم اور لاعاصلی کے دکھ کیا ہوتے

ہیں۔ کئی بار وہ تصور ہی تصور میں اس کرب کو چھو کر آئے تھے۔ سو حرم کے لیے ان کا دل دکھتا تھا اور وہ دل

کی گہرائیوں سے اس کے لیے کسی اچھے ہم سفر کی دعا کرتے تھے اس وقت بھی ماں جی کے کمرے کی طرف

جاتے ہوئے بے اختیار لیوں سے اس کے لیے دعا نکلتی تھی۔

”خدا یا اس بہت اچھی لڑکی کو بہت ہی اچھا رفیق زندگی عطا کر۔ اتنا اچھا کہ اداسی کا ہالا اس کے وجود

سے مٹ جائے اور اس کی آنکھوں میں لاعاصلی اور نارسانی کے دکھ نہ ہوں۔ پالینے کے رنگ دکھیں۔“

ماں جی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ بی آپا جا چکی تھیں

لیکن حرم ابھی تک وہی کھڑی ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی نظریں ملیں تو حرم نے فوراً چہرہ موڑ

لیا۔ لیکن وہ ایک نظر..... اس ایک نظر میں جانے کیا تھا..... وہ اندر تک بیگ گئے۔

لیکن.....

انہوں نے بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور تیزی سے ماں جی کے کمرے کا دروازہ دھکیلتے

اندھ چلے گئے۔



اگر ہو سکے تو

ادھر کو بھی دیکھو

تمہارے یہ آنسو میں پلکوں سے جن لوں گا

اگر ہو سکے تو

”افوہ۔“

پروفیسر عادل نے اخبار رول کر کے سامنے صوفے پر پھینک دیا اور خود آنکھیں موند کر بیڈ کی پٹی پر سر رکھ دیا۔ کتنی دیر سے وہ اخبار سامنے پھیلائے پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ایک لفظ بھی ان کی نظروں کی گرفت میں نہیں آیا تھا۔ الفاظ ریل کے ڈبوں کی طرح بھاگتے جا رہے تھے کوئی مفہوم ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ اتنی دیر سے وہ کیا پڑھ رہے تھے انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ نگاہوں کے سامنے تو بار بار بس وہ ایک صورت آرہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے انہیں نہ ب ولا سے آئے لیکن وہ ایک چہرہ نگاہ سے ہٹا ہی نہیں تھا۔

وہ روٹی روٹی آنکھیں

وہ زرد چہرہ

شام کی ملجی سی روشنی میں لان میں اکیلی بیٹھی کچھ سوچتی ہوئی وہ کس قدر اداس اور دل گرفتہ لگ رہی تھی۔ اس شام وہ تیمور کے بار بار فون کرنے پر نہ ب ولا گئے تھے حالانکہ اس شام انہیں مسرور کے سلسلے میں کسی صاحب سے ضروری ملنا تھا۔ یہ کراچی میں ایک آرٹ گیلری کے کرتا دھرتا تھے اور وہ مسرور کی تصاویر کی نمائش کے سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ بختی حیدر سے ان کی ریکی سی جان پہچان تھی اور بختی نے ہی ان سے ذکر کیا تھا اور ان کا پروگرام بختی کے ساتھ ادھر جانے کا تھا لیکن تیمور نے انہیں کوئی تین بار فون کیا۔

”پلیز عادل بھائی آجائیے نا میں آپ کے لیے بہت اداس ہو رہا ہوں۔“

”ارے تم کب آئے؟“

”چار دن ہو گئے ہیں لیکن فون خراب تھا اور آپ سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔“

”اب تو آپ کی موسم سرما کی چھٹیاں ہو گئی ہوں گی تو ایسا ہے کہ میں کل کسی ٹائم آ جاؤں گا۔“

”لیکن عادل بھائی میں تو آپ کو بہت یاد کر رہا ہوں۔ بہت زیادہ..... عاشی بھوکا موڈ عجیب سا ہے یا تو کمرے میں کھسی گانے سنتی رہتی ہیں یا پھر فرینڈز کی طرف چلی جاتی ہیں۔ بات ہی نہیں کرتیں اور موموتا

ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”موموتا بیمار ہو گئی تھیں، ماما کی طرح اور وہ اداس بھی ہیں، چپکے چپکے روتی ہیں۔ شاید انہیں پاپا بہت یاد آتے ہیں..... آپ آجائیں نا، عادل بھائی۔ آپ کو دیکھ کر موموتا خوش ہو جائیں گی۔ آپ کی شکل پاپا سے اتنی زیادہ ملتی جو ہے۔“

وہ بتا رہے۔

وہ اداس ہے۔

ایک دم ان کا دل اسے دیکھنے کو مچلنے لگا۔

”پتا نہیں وہ کیوں اتنی اداس رہتی ہے۔“

”اتنی چپ اور خاموش۔“

”اور جب وہ خوش ہوتی ہے ذرا سی تو کتنی دلکش لگتی ہے۔“

”ایک بار..... ایک بار وہ ان کی زندگی میں شامل ہو جائے تو وہ اسے کبھی اداس نہیں ہونے دیں گے..... کبھی نہیں.....“ میڈم نرگس نے انہیں بتایا تھا۔ زینی، مریم کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی۔ شاید لاشعوری طور وہ اس کے باپ کی زیادتی کا بدلہ اس سے لیتی ہے۔

”اور اس کے والد کون ہیں انہوں نے اپنی بیٹی کی خبر کیوں نہیں لی۔“

”معلوم نہیں زینی نے کبھی اس سلسلے میں بات نہیں کی لیکن میرا خیال ہے موموتا بعد میں پیدا ہوئی ہے میرا مطلب ہے علیحدگی کے بعد اور اس کے والد کو غالباً اس کے متعلق علم نہیں۔“

”اوکے۔“

انہوں نے تیمور سے کہا کہ وہ آرہے ہیں اور پھر بختی سے معذرت کر کے کہ وہ آج نہ جاسکیں گے وہ نہ ب ولا چلے آئے۔

وہ لان میں اکیلی بیٹھی تھی اور بے حد اداس۔ سارے گھر سے بے خبر جانے کیا سوچ رہی تھی..... فضا میں اچھی خاصی خنکی تھی اور بغیر کسی گرم کپڑے کے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے گھاس پر بیٹھی تھی۔

”مریم۔“ انہوں نے ہولے سے اسے پکارا اور آہستگی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آگئے ”مریم آپ یہاں ٹھنڈ میں کیوں بیٹھی ہیں اور آپ نے نہ شمال لی ہوئی ہے نہ سونہ پہنا ہوا ہے اور یہ کوئی باہر بیٹھنے کا موسم تو نہیں ہے۔“

”آپ!“ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی ”آپ کیسے ہیں اور حویلی میں سب اچھے ہیں نا۔“

”ہاں سب اچھے ہیں لیکن آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہیں۔“ وہ بے اختیار کہہ بیٹھے۔

”میں۔“ مریم نے کسی قدر گھبرا کر اپنی طرف اشارہ کیا ”میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“

”نہیں۔“

ان کا جی چاہا وہ اس سے کہیں ”تم ٹھیک نہیں ہو مریم۔ کوئی بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ جس نے تمہارے چہرے کی گلابیوں کو ماند کر دیا ہے اور تمہاری آنکھوں کی چمک کو مدھم کر دیا ہے۔ مریم اپنے سارے دکھ ساری پریشانیاں..... میری جھولی میں ڈال دو اگر ہو سکے تو۔“

ادھر کو بھی دیکھو

تمہارا یہ غم اپنی آنکھوں میں بھر لوں

یہ درد و الم اپنی جان میں سمیٹوں

تمہاری یہ وحشت میں اپنے نام کر لوں

وہ آزرده سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لیونگ روم میں آگئے۔ تیور کچن کے دروازے کے پاس کھڑا شریف سے مذاکرات میں مصروف تھا۔ انہیں دیکھ کر بھاگتا ہوا آکر ان سے لپٹ گیا اور بلند آواز میں نینا کو پکارا۔

”نینا بھو! عادل بھائی آگئے ہیں۔“

تیور کو پیار کرتے ہوئے اور اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے عادل بیٹھ گئے۔

”میں بہت بور ہو گیا ہوں عادل بھائی۔ مجھے تو آپ اپنے ساتھ لے جائیں حویلی میں۔“

”مگر میری جان میں تو یہاں ہوں لاہور میں جب گاؤں جاؤں گا حویلی لے جاؤں گا آپ کو بھی۔“

”جب نہیں، مجھے ابھی لے جائیں، میں ساری پھشیاں وہاں گزاروں گا حویلی میں اور ماما آئیں گی تاکہ راجی سے تو تب بھی نہیں آؤں گا۔“

”آپ ماما سے ناراض ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے فوراً سر ہلایا ”بھلا کوئی ماما سے ناراض ہوتا ہے۔ میں تو بس بور ہو رہا ہوں نا۔“

”ادھر وہاں کیا آپ بور نہیں ہوں گے۔“ عادل مسکرائے۔

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔ وہاں ماں جی سے کہانیاں سنوں گا۔ بی آپا کے طوطے سے باتیں کروں گا۔ اور..... چاہے کامل بھائی میرے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتے تھے۔“

”لیکن کامل۔“ ان کے مسکراتے لب بھینچ گئے اور دل میں جیسے کسی نے سوئی چبھو دی۔

”کیا ہوا کامل بھائی کو؟“ مریم شاید ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اس لیے بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

”کیا بتاؤں مریم۔“ ان کی آواز بھگ گئی..... ”کامی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ خدا جانے کہاں کھو گیا ہے۔۔۔۔۔ دو ماہ ہو گئے ہیں میں نے کہاں کہاں نہیں تلا شہا سے۔ کراچی تک دیکھ آیا ہوں۔“

”مگر کیسے..... کیسے کھو گیا وہ۔“

مریم نے بے چینی سے پوچھا تو وہ تفصیل بتانے لگے..... کئی بار ان کی آواز بھگ گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ مریم گود میں ہاتھ دھرے ساکت بیٹھی سن رہی تھی۔

”اور ماں جی۔“ انہوں نے بات ختم کی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”وہ تو پریشان ہوں گی بہت روتی ہوں گی۔“

”ہاں، بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ بہت روتی ہیں۔ زیادہ وقت کامل کے کمرے میں ہی بیٹھی رہتی ہیں۔ اس کی ایک ایک چیز کو سنہال کر رکھا ہوا ہے کہ شاید ایک دن وہ واپس آجائے۔ ایسے ہی جیسے ایک دن کم ہوا تھا لیکن میں تو مایوس ہو گیا ہوں مریم۔“

”نہیں عادل بھائی مایوس نہیں ہوتے۔ کیا خبر..... کیا خبر خدا کب مہربان ہو جائے۔“

عادل نے سراٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں کے کناروں پر آنسو اٹکے ہوئے تھے۔

”اور کس قدر مہربان ہے یہ..... کتنی نرم دل اور محبت کرنے والی۔ اور کیا رشتہ ہے اس کا کامل کے ساتھ اور پھر یہ حویلی میں رہی کتنے دن ہے لیکن کامل کے لیے رو رہی ہے۔ جو اس کی نظر میں اینارل سوئٹا بھائی ہے..... اور پتا نہیں، نرنب عثمان کب..... کب اسے حقیقت سے آگاہ کریں گی۔ بی آپا نے انہیں کہا بھی تھا کہ وہ نرنب ولا ضرور جائیں اور نرنب عثمان کو کامل کے متعلق بتا کر معذرت سے آگاہ کریں کہ

ماں جی نہیں آسکیں۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایک بار بات کر کے ہم بھول ہی گئے ہیں..... لیکن ان کا دل نہ چاہا۔ ماں جی پریشان تھیں..... کامل کھو گیا تھا اور جانے کس حال میں تھا اور وہ اپنی ذات کے لیے پریشان ہوتے رہیں۔ وہ اس طرح کامی اور ماں جی کو فراموش کر کے اپنی ذات کے لیے خوشیاں ڈھونڈنے نہیں آسکتے تھے سو وہ نرنب ولا نہ آسکتے تھے اور نرنب عثمان واپس کراچی..... چلی گئی تھیں۔“

”ماما آجائیں تو میں ان سے اجازت لے کر حویلی آؤں گی ماں جی کے پاس۔“ مریم نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”ہاں ضرور۔“

ان کی نظروں نے لمحہ بھر کے لیے اسے اپنے حصار میں لے لیا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ مبادا وہ پھر ان سے بدگمان ہی ہو جائے۔ جب تک اس کے اور ان کے درمیان رشتہ واضح نہیں ہو جاتا انہیں محتاط رہنا تھا۔

اس کی وہ بدگمان نظریں وہ کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔

اس کا گریز۔

اس کی بے اعتنائی اور اجنبیت۔

کس قدر اذیت ناک تھا ان کے لیے اور اب جب سے وہ ماں جی کے ساتھ آئے تھے وہ ان سے بات کر لیتی تھی۔ اگرچہ عاشی کی طرح بے تکلف نہیں تھی۔ پھر بھی غیبت تھا کہ اس کی نظروں میں

بات کر لیتی تھی۔ اگرچہ عاشی کی طرح بے تکلف نہیں تھی۔ پھر بھی غیبت تھا کہ اس کی نظروں میں

بات کر لیتی تھی۔ اگرچہ عاشی کی طرح بے تکلف نہیں تھی۔ پھر بھی غیبت تھا کہ اس کی نظروں میں

ناگوار اور اجنبیت نہیں رہی تھی۔ سو وہ اس کے سامنے بے حد محتاط رہتے تھے۔ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پاتے تھے۔

”مور بتا رہا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب تھی۔“

”ہاں..... نہیں تو بس ذرا یوں ہی معمولی سا ملو تھا۔“ وہ کھڑی ہوئی ”آپ مور سے باتیں کریں عادل بھائی میں صوفو کو چائے کے لیے کہوں۔“

”نہیں مریم! رہنے دیں پلیز.....“ انہوں نے منع کرنا چاہا لیکن مریم چلی گئی تو وہ تیسرے باتیں کرنے لگے۔

”عادل میاں طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟“ خدا بخش نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”ہاں۔“ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں ”ٹھیک ہوں خدا بخش۔“

”ہاں لگا دو۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی والے دن عموماً اخبار وغیرہ پڑھ کے ناشتا کرتے تھے۔

”بلکہ ادھر ہی لے آئیں اور وہ اخبار مجھے دے دیں۔“

”حویلی سے کوئی فون آیا تھا؟“ اخبار پریسر عادل کو تھمتے ہوئے خدا بخش نے پوچھا۔

”ہاں بی آپا کا فون آیا تھا۔“

”چنانچہ کہاں کہاں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے کامل میاں۔“ خدا بخش نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

تب ہی فون کی بیل بجی۔ خدا بخش نے کارڈ لیس اٹھا کر انہیں دیا۔ دوسری طرف آمنہ صغی تھیں۔

”ارے آپ آمنہ خیریت؟ صبح کیسے یاد کیا۔“

”بس کر لیا یا عادل خان۔ آپ تو یاد بھی نہیں کرتے۔“

”تھینک یو آمنہ۔ کیسی ہیں آپ؟“

”اچھی ہوں۔ دراصل ابھی میں نے کچھ دیر پہلے ایک شخص کو دیکھا ہے..... ہماری گلی کے ککڑ پے بیٹھا ہے..... اپنے آپ میں گن اور ارد گرد سے بے خبر مجھے ٹک ہے کہ وہ کامل ہے۔ میں نے کامل کو دیکھا تو نہیں ہے مگر جو حلیہ آپ نے بتایا تھا وہ اس سے بہت مطابقت رکھتا ہے اور پتا ہے جب میں اس کے پاس سے گزری تو اس نے سراٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا..... ”بھائی۔ بھائی پاس جانا۔“

پریسر عادل کے ہونٹ لرزنے لگے۔

”پلیز..... پلیز آمنہ..... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ کامی ہی ہوگا..... میں نے بتایا تھا نا آپ کو وہ اکثر میری عدم موجودگی میں کہتا رہتا ہے بھائی پاس جانا ہے۔“ یہ وہ واحد جملہ تھا جو وہ پورا بولتا ہے۔ میں چند

منٹ میں آ رہا ہوں۔ پلیز آپ اس کا دھیان رکھنا۔ کہیں جانے مت دیتا۔“ انہوں نے خدا حافظ کہے بغیر فون بند کیا اور بجلت میں کھڑے ہو گئے۔

”دعا کرنا خدا بخش کہ وہ کامی ہی ہو..... ہمارا کامی.....“

اور خدا بخش کی بات کا جواب دیے بغیر انہوں نے سائنڈ بیل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اسے جبران چھوڑ کر باہر نکل گئے۔



”عاشی کیا تم کہیں جا رہی ہو۔“ مریم نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ نیل پر رکھا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ بہت اچھی طرح سے تیار ہوئی تھی اور ہلکے ہلکے میک اپ میں بے حد دلکش لگ رہی تھی۔

”ہوں۔“ وہ اس کے قریب آگئی اور ڈانٹنگ ٹیبل کے قریب کھڑے کھڑے صوفو کو ناشتا لانے کے لیے کہا۔

”ایک املا ہوا انڈا اور ایک کپ نیم گرم دودھ..... فوراً۔“

”کہاں جا رہی ہو اتنی صبح؟“ مریم نے پھر پوچھا۔

”پہلے یہ بتائیں کیسی لگ رہی ہوں۔“

”بہت دلکش! بے انتہا خوب صورت۔“ مریم مسکرائی اور اس کے لہجے میں محبتوں کے رنگ کھل گئے۔

یہ سب عاشی موزینا سے کتنے پیارے عزیز تھے اس کے دل میں ان سب کے لیے ڈھیروں محبت تھی۔

”بیٹھ جاؤ نا کھڑے کھڑے ناشتا کرو گی۔“

”ہاں بس انکل شچی آنے ہی والے ہوں گے۔“ اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور پھر صغیہ کو آواز دی۔

”صغیہ! صغیہ! جلدی کرو۔“

”انکل شچی.....؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں آج میری شوٹنگ ہے ”رائل حسین“ کے لیے ایڈ تیار کر رہے ہیں نا انکل۔“

”شوٹنگ۔“ مریم کے دل کو دھچکا سا لگا۔

”میں نے تم سے کہا تھا عاشی کہ.....“

”اوہ بھو۔“ عاشی نے اس کی بات کاٹ دی ”آخر آپ کو اعتراض کیوں ہے جب ماما کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”مگر شاید ماما کو تو پتا بھی نہ ہو کہ تم.....“

”آپ نے بتانے کی کوشش تو کی تھی۔ اگر ماما کو کوئی اعتراض ہوتا تو وہ کم از کم ایک بار تو مجھ سے اس کے متعلق کچھ پوچھتیں کچھ کہتیں اور پھر وہ بھلا اعتراض کر بھی کیسے سکتی ہیں جبکہ وہ خود بھی سب کچھ کرتی رہی ہیں۔“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔



”ہاں اس نے بتانے کی کوشش تو کی تھی لیکن ماما نے کب اس کی پوری بات سنی تھی۔ وہ پورے ایک ماہ کے لیے آئی ہوئی تھیں اور کتنی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ آرام سے ماما کے پاس بیٹھ کر عاشری کے متعلق ان سے بات کرے گی کہ وہ عاشری کو سمجھائیں لیکن ماما گھر میں کبھی ہی کب تھیں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں کوئی پارٹی، کوئی فنکشن اور جس دن گھر ہوتیں سارا دن کوئی نہ کوئی ان سے ملنے آتا رہتا تھا اور اس شام بھی غالباً وہ کسی پارٹی یا فنکشن میں جانے کے لیے اپنے کمرے سے تیار ہو کر آئی تھیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ اس کا دھیان ذرا بھی ٹی وی کی طرف نہیں تھا۔ دل و ذہن استیاء ہی میں کب تھے۔ کتنا اپنے آپ کو بہلانے اور مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن دل و ذہن سے وہ ایک خیال جاتا ہی نہیں تھا۔

شہریار کے ماموں نے اسے رد کر دیا تھا۔ محض ماما کی وجہ سے ان کے شو بزم میں ہونے کی وجہ سے اور اب عاشری بھی ماما کے نقش قدم پر چلنا چاہ رہی تھی اور وہ عاشری کے لیے پریشان تھی۔

ماما زادیرا اس کے پاس آکر کہیں اور غور سے اسے دیکھا۔

”کیسی ہوم مومو اور یہ تم اتنی زرد کیوں ہو رہی ہو؟“

”ماما۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”اچھی ہوں بالکل۔“

”اپنا خیال رکھا کرو۔ بہت ویک ہو رہی ہو۔“ انہوں نے ہولے سے اس کے رخسار کو چھوا اور ماما کا یہ ذرا سا التفات اسے اندر تک بھگو گیا۔

”ماما آپ تو اچھی ہیں نا؟“

”ہوں۔“ وہ مسکرائیں ”بالکل فائن۔۔۔۔۔ اور مومو تم فارغ ہو گئی ہو۔ سارا دن گھر میں کیا کرتی ہو کوئی کوکنگ، بیکنگ یا کوئی لیکچرنگ کا کورس کرلو۔ اس طرح گھر بیٹھے بیٹھے تو بور ہوتی ہوگی۔۔۔۔۔ ہاں تمہارا رزلٹ بھی آ گیا تھا۔ اچھے نمبر لیے تھے گزدرل۔ تمہارا گفٹ ادھار ہے۔ کل چلنا میرے ساتھ اپنی پسند کا گفٹ لے لینا بلکہ تم اور عاشری چلی جانا کل صبح کیش لے لینا مجھ سے۔“

”اتنے دن ہو گئے تھے زلزلہ آؤٹ ہوئے اور انہیں آج یاد آیا تھا۔“ وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

”تھینک یو ماما، کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ کسی کورس میں ایڈمیشن لے لو۔“

”کیا کروں گی کورس کر کے۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

کرنے کو تو بہت کچھ تھا اس کے پاس۔ پاپا کی اسٹڈی میں اتنی کتابیں تھیں ڈاکٹر عبدالعید کے پاس اتنا بڑا ذخیرہ تھا۔ عمدہ اور اچھی کتابوں کا لیکن دل کہیں ٹھہرنا ہی نہ تھا۔ وہ اسٹڈی میں جاتی تو پاپا اسے یاد آ جاتے۔ ان کا وہ لیس مین والا انداز۔۔۔۔۔ ماما کے خوف سے ڈرتے ڈرتے اس کی حمایت کرنا اور پھر وہ



آخری دنوں میں ان کی اس کے لیے بے تحاشا شفقت و محبت۔ کتنا مان بڑھا دیا تھا پاپا نے اس کا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔ ان کی محبتیں، شفقتیں، عداوتیں۔ ایک ایک بات یاد آتی اور وہ بھول جاتی کہ ان کی اسٹڈی میں وہ کوئی اچھی بک لینے آئی تھی۔

ان کی بیماری
رائف اسپتال
اور پھر رائف اسپتال میں شہریار
ڈاکٹر شہریار
یعنی کے بھائی
ان کی محبت

اور پھر جیسے سب کچھ ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آنے لگتا۔

”ایمی پراہلم؟“ انہوں نے کلائی موز کر وقت دیکھا۔

”ماما دراصل وہ۔۔۔۔۔ عاشری کے متعلق بات کرنا تھی آپ سے۔“

”ہاں کیا ہوا عاشری کو؟“

”میں نے بتایا تھا نا آپ کو کہ اس نے بی اے میں ایڈمیشن نہیں لیا۔“

”کوئی بات نہیں ایک آدھ سال ریٹ کر لے۔ نہیں موڈ ہو گا اس کا۔“

”مگر وہ ماما۔۔۔۔۔ اکل شچی نے اسے ورغلا یا ہے اور وہ ماڈلنگ۔۔۔۔۔“ آنسو ایک دم ہی اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

”اسٹوڈنٹ۔“ ان کا انداز اسرا سرتا گواہی لیے ہوئے تھا ”کیا حماقت ہے مومو ذرا ذرا سی بات پر روتے بیٹھ جاتی ہو اور عاشری کو شوق ہے تو کر لے ماڈلنگ۔ ایک آدھ بار اسکرین پر آ جائے گی تو خوش ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اور یہ شچی۔۔۔۔۔“

”اے بھئی کیا ہوا شچی کو؟“ میڈم نرگس نے ایک دم ٹی وی لاؤنج میں آتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں ڈیر۔ میں ہاتھ سے نکل گئی ہوں تو میری بیٹیوں کو تاک لیا ہے۔ عاشری کے پیچھے پڑا ہے“

”اٹلنگ کے لیے۔“ وہ میڈم نرگس کے ہاتھ پر ہاتھ مار بنیں۔

”وہ ہاتھ میں آئی ہوئی کوئی چیز چھوڑنے والا تو ہرگز نہیں۔“ میڈم نرگس کا تہمتہ ان سے زیادہ بلند تھا۔

”اور میں کوئی عام سی چیز نہیں ہوں۔ نرسب عثمان ہوں۔“ ان کے لہجے میں ایک دم ہی تقفیر چاہا گیا تھا۔

”نرسب عثمان یا۔۔۔۔۔“ میڈم نرگس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”زنبد عثمان“ انہوں نے زنبد عثمان پر زور دیا۔
”لیکن۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔“
مریم ساکت کھڑی تھی اور آنسو خساروں پر ہی انک گئے تھے۔

”ارے یہ مومو کیا ہوا.....؟ یا تم تو اپنی اس دلکش بیٹی کے ساتھ بہت زیادتی کر جاتی ہو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر مریم کو ساتھ لگا لیا اور مریم کا جی چاہا وہ میڈم نرگس کے کندھے پر سر رکھ کر ان کے بازوؤں میں منہ چھپا کر بہت سارے لے۔

”ارے یہ خود ہی بہت بیوقوف ہے۔ احمق ماسٹر کی ڈگری لے کر بھی اس کی سوچ وہی متوسط طبقہ کی میٹرک پاس لڑکی والی ہے۔“

”پھر بھی کیا کہہ دیتا تم نے اسے۔“ میڈم نرگس نے اسے الگ کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔
”کچھ نہیں یار۔ عاشری کو ماڈلنگ کا شوق چرایا ہے اور یہ اس پر زور رہی ہے۔ پسند نہیں ہے اس کو ماڈلنگ کرنا.....“ ان کے لہجے میں بے زاری اور جھنجھلاہٹ تھی۔

”پڑھا تو ہو چکی ہے اب اس کی شادی کی کر دو۔ خوش رہے گی۔“ میڈم نرگس نے مشورہ دیا۔
”آئی ہو تو یہ قصہ بھی منسا جاؤ ان لوگوں کو تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟“

”کہاں ڈیز میری تو بات ہی نہیں ہوئی پھر ان لوگوں سے۔ یہاں رہتا ہی کم کم ہوا ہے۔ اب رہوں گی کچھ دن تو.....“

”اور ماما کو کیا پتا وہ لوگ اب کبھی نہیں آئیں گے اس لیے کہ شہر یار کے ماموں کو پسند نہیں ہے ان کا شوبز میں کام کرنا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ شوبز سے متعلق لوگ اچھے نہیں ہوتے۔“ مریم نے افسردگی سے سوچا تھا..... ”لیکن عاشری عاشری کو کیسے پتا چلا کہ میں نے ماما سے اس کے متعلق بات کی تھی۔“

اس نے سر اٹھا کر عاشری کی طرف دیکھا۔

”میں سن رہی تھی اس روز آپ کے مکالمات۔“ عاشری نے جیسے اس کے دل کی بات جان لی۔

”عاشری تم ابھی بہت چھوٹی ہو بہت معصوم اور یہ شوبز کی دنیا.....“

”پلیز بجو۔“ عاشری نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”آپ مجھے روکیں، خواہ مخواہ بد مزگی ہوگی۔ اس لیے کہ میں رکوں گی نہیں..... اور پریشان مت ہوں..... مت ڈالیں اپنے اوپر اتنا بوجھ..... میں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوں۔“ اس نے صوفیہ کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی اور انڈا اچھیل کر کھانے لگی۔ تب ہی باہر گیٹ پر تیل ہوئی۔

”انگل شی ہوں گے۔“ اس کی آنکھیں دک اٹھیں ”او کے بجو۔“ اس نے مریم کے رخساروں کو.....

ہونٹوں سے چھوا اور دودھ کا گلاس یوں ہی چھوڑ کر ہاتھ ہلاتی چلی گئی۔
مریم یوں ہی ہاتھ گود میں دھرے نم آنکھوں کے ساتھ ساکت بیٹھی رہی۔
تو بالآخر شریل مرزا نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔

اور وہ عاشری کو اس کی کمینگی کے متعلق بتا بھی نہیں سکتی۔ وہ کب اس کی بات پر دھیان دیتی ہے۔
ماما کی ناراضی کے خیال سے سہم جانے والی عاشری کتنی بدل چکی تھی..... اور شاید اس میں شریل مرزا کا ہاتھ تھا اور نہ شریل مرزا کو منع کر سکتی ہے اور نہ وہ عاشری کو روک سکتی ہے۔ ہاں ماما..... ماما اگر چاہتیں تو عاشری کو روک سکتی تھیں لیکن ماما کو شاید کسی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ مور سے بھی نہیں اور پتا نہیں اب وہ وہاں کراچی میں کیوں رہ رہی ہیں جبکہ ان کی شوٹنگ بھی ختم ہو چکی ہے شاید..... اور اخبارات اور شو بزنس متعلق میگزین ان کے بارے میں کیسی کیسی باتیں لکھ رہے ہیں۔

اور ماما کو رتی بھر پروا نہیں ہے کہ وہ کس طرح اسکینڈلز کی زد میں آ چکی ہیں اپنی سے آدھی عمر کے غضنفر ملک کے ساتھ ہیروئن آکر بلکہ شاید وہ انجوائے کرتی ہیں ان اسکینڈلز کو اور بعض نے تو صاف صاف لکھا تھا کہ زنبد عثمان اور غضنفر ملک نے شادی کر لی ہے لیکن انہوں نے کوئی تردید نہیں کی تھی بلکہ اس روز میڈم نرگس کے پوچھنے پر بے پروائی سے کہا تھا۔
”جکتے ہیں سب۔“

”تو پھر تردید کیوں نہیں کرتے ہو تم لوگ۔“

”مجھے پروا نہیں ہے، خود ہی تھک جائیں گے لکھ لکھ کر اور پھر اگر میں شادی کر بھی لوں تو ان صحافیوں کو کیا تکلیف ہے۔“ ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

”اور یہ سب کچھ چھپ رہا تھا..... اور وہ سب باتیں جو ایک عام متوسط طبقہ کے گھر میں شوبز سے متعلق لوگوں کے بارے میں ہوتی تھیں..... ایسے میں اگر عینی کے چاچو نے اسے رد کر دیا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا اور کیا خبر کل کو ماما چچ غضنفر ملک سے شادی کر لیں، جیسا کہ میڈم نرگس اور بیگم آفندی کا خیال تھا تو..... اچھا ہی ہونا کہ انہوں نے خود ہی..... اور پھر تب اسے کتنی شرمندگی ہوتی۔“

لیکن شہر یار.....

شہر یار اپنے ماموں کے اس فیصلے کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ ان کے گھر میں مس فٹ ہے۔ وہ اس سے بھاگنا چاہ رہی تھی۔ اس کے فون انینڈ نہیں کرتی تھی لیکن شہر یار بار بار اسے فون کرتا۔

”پلیز مومو اس طرح مجھ سے دامن مت چھڑاؤ۔ تم میرے ساتھ ہوگی تو مجھے حوصلہ رہے گا۔ میں یہ جگہ لڑکوں کا۔ تم نے اس طرح مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے نا مجھے لگتا ہے جیسے میری جدوجہد اور ساری جگہ بے فائدہ ہے۔“



”پلیز شہریار مجھے تنگ نہ کرو بار بار۔ مجھے پکارو گے تو میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔ مجھے خود کو یہ یقین دلانے دو کہ ہمارا سفر بس یہیں تک تھا۔“

لیکن شہریار اسے پھر بھی بار بار فون کرتا اور وہ اس کی آواز سن کر فون رکھ دیتی تھی۔ کیا فائدہ تھا اس راستے پر جانے کا جو منزل تک نہیں لے جاتا تھا اور یہ سب کچھ اس صورت حال میں برداشت کرنا کتنا قدر مشکل تھا۔ خود کو یہ یقین دلانا کہ بس اب راستے بدل گئے ہیں اور شہریار کی رفاقت اس کا نصیب نہیں تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر کٹ کر گرتا رہتا۔ ایسے میں عاشی کا ہر دوسرے تیسرے روز شرجیل مرزا کے دفتر چلے جاتا اور ڈانگ میں اس قدر روچھپی لینا مزید اذیت ناک تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے اور وہ اتنی کمزور ہے کہ دونوں محاذوں پر ہی ہار جائے گی اور اب عاشی چلی گئی تھی اور وہ اسے روک نہیں سکی تھی، سمجھا نہیں سکی تھی اور شرجیل مرزا کی کینکوں سے آگاہ نہیں کر سکتی تھی۔

”چائے بنا دوں مریم بی بی؟“ صفوان شستے کے برتن اٹھانے آئی تو اس نے چائے سے بھرے کپ کو دیکھا ”یہ تو بالکل ٹھنڈی ٹھار ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے چونک کر صفوان کو دیکھا ”پلیز۔“

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا جی۔“ صفوان نے قبوہ کپ میں ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیوں؟“

”آپ ٹھیک نہیں لگتی ہو جی۔ ابھی ڈاکٹر صاحب نیچے آئیں گے تو ان کو بتا کر دو الے لینا جی۔ روز بہ روز چلی ہوئی جا رہی ہیں..... کہیں اللہ نہ کرے.....“

”اوہ کچھ نہیں صفو۔“ مریم نے اس کی بات کاٹ دی ”ایسے ہی وہ ہم نہ کیا کرو۔“

”پھر بھی جی ڈاکٹر صاحب سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے جی۔“

”اچھا۔“

”ناشتا تو آپ مور بابا اور نینا بی بی کے ساتھ کریں گی نا۔“

”ہاں۔“

اس نے چائے کی پیالی اٹھائی تو صفوان برتن سمیٹ کر چلی گئی۔ نینا اور مور اکثر دیر سے اٹھتے تھے چنانچہ وہ اور عاشی چونکہ جلد اٹھ جاتی تھیں اس لیے چائے کا ایک ایک کپ پی لیتی تھیں۔ عاشی ویسے چائے کم ہی پیتی تھی۔ پھر ناشتا وہ سب مل کر ہی کرتے تھے۔ مور بہت خوش ہوتا تھا جب سب ٹیبل پر اکٹھے بیٹھتے تھے اور ایسے میں وہ ایک بار تو ضرور بابا اور ماما کو یاد کرتا تھا۔

وہ چائے کی پیالی لیے ٹی وی لاونچ میں آگئی اور ٹی وی آن کر دیا۔ وہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

نہ عاشی کے متعلق۔



نہ ماما اور شہریار کے متعلق۔

یعنی کے بابا نے ایک بار اسے سمجھایا تھا کہ جب تم لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل نہیں کر سکتی ہو تو پر نہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگ بھی اسی طرح سوچیں جیسے تم سوچتی ہو۔ لوگ نہاری مرضی کے پابند نہیں ہو سکتے..... اور اس وقت اس لمحے اسے بابا کی کتنی ضرورت تھی..... لیکن اس گھر کے دروازے اس نے اپنے اوپر بند کر دیے تھے۔ یعنی کتنی بار آئی تھی۔ سوری کیا تھا اس سے کہ وہ اپنے پہلے اس سے مل نہیں سکی تھی لیکن وہ یعنی سے اس بات پر تو خفا نہیں تھی کہ وہ اس سے ملے بغیر اسلام آباد اور پھر گاؤں چلی گئی تھی بلکہ یہ تو اور ہی مسئلہ تھا اور وہ یعنی سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے یعنی کے چاچو کے فیصلے سے رنج پہنچا ہے اور خود یعنی نے تو ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے چاچو کے فیصلے سے بے خبر ہو۔ بس اس نے خود ہی اپنے اوپر اس گھر کے دروازے بند کر لیے تھے۔

وہ اس گھر کے کسی فرد سے خفا نہ تھی۔

نہ شیری سے نہ یعنی اور بابا سے۔

حتیٰ کہ چاچو سے بھی نہیں۔

جنہوں نے چند لمحوں میں خوابوں کے جزیرے میں آگ لگا دی تھی۔

لیکن اس وقت..... اس نے پوری لاشعوری کوشش سے ٹی وی پر کارٹون دیکھ کر ہنسنے کی کوشش کی لیکن ہنسنے ڈارے واہو کر رہ گئے۔

اسے لگ رہا تھا جیسے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

اور یہ سب کچھ کتنا مشکل اور اذیت ناک ہے شہریار تمہیں بھلانا..... اور

چاہتوں کے موسم میں

رزم جو بھی مل جائے

پھر بھی نہیں سلتا

پھر بھی نہیں سلتا

اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا اور چائے کی خالی پیالی سائید ٹیبل پر رکھتے ہوئے سر صوفے کی ہٹ سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ اور درد..... بے انتہا درد۔ دل کی دیواروں سے ٹھوکریں مارنے لگا۔

”کیا ہوا ہے مریم آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں۔“ ڈاکٹر عبدالعزیز نے اس کے قریب آ کر کہا تو اس نے ایک دم چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس طرح اپنی ذات کے اندر گم تھی کہ اسے ان کے

پڑھنے سے اترنے کا پتا ہی نہ چلا۔

”خیریت ہے نا؟“

”ہوں۔“ اس نے آہستگی سے سر ہلادیا۔

”اور عاشی کہاں ہے؟“ انہوں نے اُدھر اُدھر دیکھا۔

عومًا جب وہ کلینک جانے کے لیے نیچے اترتے تھے وہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے کارٹون دیکھ رہی ہوتی تھی یا اخبار پڑھ رہی ہوتی تھی۔ وہ اس کے اس طرح بیٹھنے کے انداز پر اکثر مسکرا اٹھتے تھے۔ بڑی بے نیازی اور بے پروائی تھی اس کی ذات میں اور یہ بے نیازی اور بے پروائی انہیں اچھی لگتی تھی۔ بیٹے نے ان کے دل نے اسے پسند کیا تھا لیکن اب تو یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ اس سے محبت کرنے لگے ہیں۔ بڑی شدید قسم کی افسانوی سی محبت ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے صبح و شام و دوپہر دن میں کئی بار سامنا ہوتا تھا۔ اکثر گفتگو بھی رہتی تھی۔ اب تو وہ جیسے اس گھر کے ایک فرد بن گئے تھے۔ قریبوں کے دھاکوں نے محبت کے جال مضبوط کر دیے تھے۔ کبھی کبھی تو عاشی بے حد بولتی اور کبھی خاموش رہتی۔ وہ انتہا سے زیادہ موڈی تھی لیکن وہ انہیں ہر رنگ میں اچھی لگتی تھی۔

”کیا سوری ہے اب تک؟“

”نہیں۔“ مریم نے سر اٹھا کر ڈاکٹر عبدالعزیز کو دیکھا۔

”وہ تو چل گئی ہے تیار ہو کر۔“

”کہاں؟“ بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا۔

”انگلش کی کے ساتھ شوٹنگ کے لیے۔“

”اوہ۔“ انہوں نے لب بھینچ لیے۔

”آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں سمجھایا کیوں نہیں مریم۔“

”میں..... میں بھلا کیسے روکتی اسے معید بھائی آپ..... آپ اسے روک لیں معید بھائی آپ اسے سمجھائیں آپ کا حق ہے اس پر۔“ مریم کی پلکیں جھجک گئیں۔

”حق صرف اسی پر ہوتا ہے جو آپ کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔“ ان کے لہجے میں اضطلال اتر آیا۔ اور شاید عاشی نے ان کا یہ حق تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے ابھی وہ کم عمر ہے، چھوٹی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاید وہ اس تعلق اس رشتے کو پچھاننے لگے لیکن وہ تو اسی طرح لا پرواہ اور بے نیازی تھی۔ وہ مریم کے سامنے بیٹھ گئے۔

”مریم! آپ نے اسے سمجھایا نہیں تھا؟“

”اس کے سامنے ماما کی مثال ہے اور وہ کوئی بات سنتی ہی نہیں۔“ مریم کے اندر ایک دم ڈھیر سادی تھکن اتر آئی تھی۔

جیسے وہ ہمت ہار کر تھک کر بیٹھی ہو۔

”ہاں اس کے سامنے مسز عثمان کی مثال ہے..... اور اگر اس نے ارادہ کر لیا ہے تو پھر بھلا میں یا تم کیا کر سکتے ہیں۔“ انہوں نے پر خیال انداز میں کہا۔

”لیکن پھر بھی معید بھائی آپ کو شش تو کر سکتے ہیں۔ آپ بات تو کیجیے نا اس سے۔“ مریم نے پر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اجا۔“ انہوں نے اضطرابی انداز میں اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں ”میں بات کروں گا..... لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ رے کی نہیں..... جس سفر پر وہ نکل پڑی ہے مریم! اس سفر کی کوئی حد نہیں ہے..... اور میں.....“ ان کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا..... ”اور میں مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں ہے مریم..... میں نے تو ایک پرسکون گھر کے خواب دیکھے تھے۔“

عاشی

میں

اور نیچے

اس میں کسی اور بات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میرے خواب تو بہت مختلف تھے مریم۔ میں نے تو ایک عمر پایادہ سفر کیا ہے..... میرا گھر برسوں عورت کے وجود کو ترسا ہے۔ اس گھر کو عورت کے وجود کی گرمی اور حرارت کی ضرورت تھی اور میں نے عاشی کے حوالے سے کتنے خواب دیکھ ڈالے ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب عاشی میرے سنگ ہوگی تو ہم دونوں مل کر اپنے گھر کو ایک جنت نظیر جگہ بنائیں گے۔ اس نے گھر کی ایک ایک اینٹ کے ساتھ میرے خواب بندھے ہیں۔ مریم اگر عاشی اس سفر پر چل پڑی تو میرے سارے خواب بکھر جائیں گے..... سب.....“

ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی تو وہ یکا یک چپ ہو گئے۔ مریم نے تڑپ کر انہیں دیکھا اور احمقوں کی طرح پوچھا۔

”تو پھر کیا آپ اپنا پروپوزل واپس لے لیں گے۔ منگنی تو ڈو دیں گے؟“

”پاگل۔“ ڈاکٹر معید کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی ”یہ سب کچھ اس قدر آسان تو نہیں ہوتا مریم۔ شاید یہ آپ نہ جان سکیں کہ جن سے محبت کی جاتی ہے انہیں ان کے ہر رنگ میں چاہا جاتا ہے اور طویل سفر میں انہیں تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ وہ گھر جو عاشی کے لیے بنا ہے اس گھر میں عاشی کے سوا اور کوئی نہیں آسکتا چاہے وہ گھر ساری زندگی عورت کے وجود کو ترستار ہے۔“ وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوکے۔“ انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی ”اور آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔“ ریلیکس ہو جائیں۔ بہت سی باتیں جو ہونی ہوتی ہیں وہ ہو کر رہتی ہیں اور ہم انہیں ہونے سے نہیں روک سکتے۔ شام کو انشاء اللہ

”اور جب وہ واپس آئیں گی تو پتا چل جائے گا پھر تو ناراض ہوں گی ناکہ ہم ان سے پوچھے بغیر
 کیوں گئے تھے۔“

”ہوتی رہیں۔“ اس نے منہ پھلایا۔

”ہم بھی تو ان سے ناراض ہیں۔“

”اچھا آپ کیوں ناراض ہیں جی ماما سے۔“

وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”بس ناراض ہوں میں ان سے۔“ اس نے دونوں پاؤں صوفے پر رکھتے ہوئے گھٹنوں پر

ٹھوڑی ٹیک لی۔

”اور مور کس قدر مس کرتا ہے ماما کو..... اور ماما کو شاید کسی کی پروا نہیں رہی..... لیکن

میں..... میں ہوں نا ان سب کا خیال رکھنے کے لیے عاشقی، نینا اور مور کا.....“

”کیا مجھ سے بھی ناراضگی ہو گئی ہے۔“ تیمور نے جواب نہیں دیا تو مریم نے اسے گدگدایا۔

”نہیں کریں نا۔“ وہ پیچھے ہٹ گیا

”تو پھر بتاؤ‘ مومو سے بھی ناراض ہو گئے ہو۔“

”ہوں، آپ حویلی جو نہیں چلتیں۔“

”اچھا چلوں گی۔ اب جب ماما کا فون آیا تو ان سے پوچھ لیں گے۔“

”پر اس؟“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ہوں پر اس۔“ مریم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہتا ہے۔“ تیمور نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے سرگوشی کی ”ہتا ہے میں حویلی جا کر کیا کروں گا؟“

”کیا؟“ مریم نے متحس نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے پاپا سے ایک بات کرنی ہے۔ میں پاپا سے ماما کی شکایت کروں گا۔ وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ..... وہ.....“ وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مریم لمحہ بھر یونہی بھونچکا سی اسے دیکھتی رہی تھی۔

اور پھر بے اختیار اسے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”مور میری جان، میری زندگی۔“

”ہاں میں شکایت کروں گا“ میں ضرور شکایت کروں گا۔“ وہ اس کے بازوؤں میں لپٹا روتے ہوئے بولے ہوئے کمر ہاتھ اور مریم اس کے خوب صورت گھنے بالوں والے سر کو بے تحاشا چومتے ہوئے خود بھی روئے چلی جا رہی تھی۔

بات ہوگی عاشی سے۔“

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”جنہیں چاہا جاتا ہے، جن سے محبت کی جاتی ہے، انہیں مشکل اور طویل سفر میں تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

معید بھائی نے کہا تھا میں وہ اس طویل اور مشکل سفر میں آئی ہے..... بھیا اور وہ دونوں

محبت..... نا نہیں، نا نہیں، محبت کسے کس طرح اس کے دل میں جگہ بنا پا رہی تھی.....

خفا اور ناراض رہتی تھی۔

ایک ماما کی وجہ سے۔

ان کے رویے اور ان کے دوستوں نے اسے کمپلیکس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ ہر دم سہمی اور خوف زدہ

رہنے والی لڑکی جانے کیسے محبت کرتی تھی۔

اور اب یہ محبت س طرح امتحان لینے پر مبنی اور پائیں وہ یہی زندگی جیسے اب۔ سہریار کے بچے

”مہمہ کیا ہے؟“

”تیوہر!“ اس نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں۔

”ماں نہیں تو تم جاگ گئے ہو۔“

”ہوں۔“ وہ آنکھیں ملتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا ”کیوں رو رہی ہیں آپ۔ پایا یاد آ رہے ہیں؟“

اس نے سر ہلا دیا۔

”تو چلیں نا“ پاپا سے مل آتے ہیں، عادل بھائی کے ساتھ جا کر۔“

”پاپا سے۔“ اس نے خالی الذہنی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیا ہوا جو وہ ہم سے بات نہیں کریں گے۔ ہماری بات کا جواب نہیں دے سکیں گے“

ہماری بات سیں گے تو سہی نا.....“

”ہاں شاید۔“

”تو پھر آپ ہمیں نا عادل بھائی سے، میں وہاں حویلی میں پھوڑا آئیں۔ پھر آپ وہاں پاپے“

ساری با میں کرنا۔
”میں نے“

میری جان۔ مریم نے اسے اپنے ساتھ لایا۔
”سبحانک۔ اے خدا“

”اے کبوتر! کس قسم حل ہو گا کہ ہمچہ“

ان کو بھائی پہنچا دے گا نہ ام کو یہاں سے۔



”مومو“ تیمور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تو مریم نے بیگ میں اس کے کپڑے رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

”ہوں۔“

”مومو آپ نے ماما کو بتایا تھا کہ ہماری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں؟“

”جی۔“

”پھر ماما نے کیا کہا تھا؟“ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”ماما نے کہا تھا کہ وہ کوشش کریں گی کہ تمہاری چھٹیاں ختم ہونے سے ایک ہفتہ پہلے آجائیں۔“ مریم نے اس کی شرٹ تہ کر کے بیگ میں رکھی۔

”مگر تم تو کل واپس چلے جائیں گے اور ماما نہیں آئیں۔“ وہ بہت دل گرفتہ لگ رہا تھا۔

”کوئی مجبوری ہوگی ورنہ ماما ضرور آئیں۔“ مریم نے اسے بہلایا۔

”ایک بات بتائیں گی آپ؟“ وہ اس کے پاس ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ مریم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”یہ ماما اب کراچی میں کیوں رہتی ہیں؟ کیا انہوں نے وہاں جا ب کر لی ہے۔“

”شاید میں نے بھی ماما سے پوچھا نہیں۔“

”ماما تو فلم ایکٹریس ہیں نا۔“ اس نے سر اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا ”کیا آپ کو اچھا لگتا ہے ان کا فلم میں ایکٹریس ہونا۔“

”پتا نہیں لیکن میری جان یہ ماما کا شوق ہے نا۔“ اس نے بالکل عثمان احمد کے انداز میں کہا۔

”مگر مجھے ماما کا فلم ایکٹریس بننا بالکل پسند نہیں ہے۔“ اس کا انداز جتنی تھا۔

”اچھا.....“ مریم نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ”تو پھر آپ ماما سے کہنا کہ

آپ کو پسند نہیں ہے۔ ماما آپ کی بات ضرور مان لیں گی۔“

”شاید۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”ماما تو اب ماما لگتی ہی نہیں۔ فلم ایکٹریس لگتی ہیں پوری۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری پینٹنگ مکمل ہو گئی ہے مور۔ چلو کچھ دیر ”مار پو“ لگائیں۔“

”نہیں میرا موڈ نہیں ہے۔ میں ذرا انکل ہاشم کی طرف جا رہا ہوں۔“ مریم افسردگی سے اسے جاتے

ہوئے دیکھتی رہی۔

اور کیا تھا اگر ماما آجائیں۔ کتنی منت کی تھی اس نے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آجائیں۔ مور انہیں بہت

س کر رہا ہے۔

”مومو میری جان میں نہیں آسکتی۔“ انہوں نے اسے بہلایا ”مجبوریات ہیں کچھ۔“

”کیا مجبوریات ہیں ماما پلیز چند دنوں کے لیے آجائیں۔“

اس نے پھر التجائی کی تو انہوں نے وعدہ کر لیا۔

”اچھا کوشش کروں گی۔“

لیکن پھر وہ نہیں آئی تھیں اور اب ان کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ کتنا انتظار کیا تھا مور نے ماما کا

ادراکچی کون سا سمندر پار تھا۔

”ایسا کریں ماما ہمیں وہاں بلوائیں کراچی۔“ جچی مجھے سمندر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ تیمور نے کتنے

شوق سے کہا تھا۔

”نہیں بیٹا میں خود ہوٹل میں رہ رہی ہوں تمہیں کیسے بلواؤں۔“

تیمور اداس ہو گیا تھا ”اوکے ماما۔“

”لیکن بہت جلد ہم سب یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے کراچی۔ پھر ہم اکٹھے رہیں گے بس گھر

میں دیکھ رہی ہوں۔“

انہوں نے تیمور کو بہلایا تھا اور اس روز تیمور بہت اداس رہا تھا حالانکہ عادل اسے اپنے ساتھ لے گئے

تھے خوبی اور وہ ایک ہفتے بعد ہی واپس آ گیا تھا۔

”وہاں آپ سب کے بغیر میرا جی نہیں لگا۔ آپ سب چلتے تو مزہ آتا۔“

لیکن ماما نے منع کر دیا تھا۔ سو وہ نہ جاسکے حالاں کہ اس کا خود کتنا جی چاہ رہا تھا ماں جی اور بی آپا سے ملنے

اور پاپا کی قبر پر جانے کا لیکن ماما نے کہا تھا ”صرف مور کو بھیج دو۔ تم سب کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے کلاک پر نظر ڈالی رات کے آٹھ بج رہے تھے اور عاشی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ بے چین سی

ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ نینا کچن میں صفو کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

”نینا تمہاری پینٹنگ مکمل ہو گئی۔“

”جی جی۔“

”اور صفو عاشی کا کوئی فون تو نہیں آیا تھا کہ وہ دیر سے آئے گی۔“

”نہیں جی۔“ صفو پھر نینا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ہاں تو نینا بی بی وہ بادشاہ بڑا نیک تھا۔“

شاید نینا صفو سے کہانی سن رہی تھی۔ صفو بیاباز بھی کاٹتی جا رہی تھی اور نینا کو کہانی بھی سنار ہی تھی۔ وہ

چند لمبے کچن کے دروازے پر کھڑی رہی۔

عاشی نے پہلے تو کبھی اتنی دیر نہیں کی اور آج صبح ناشتے کے بعد ہی وہ تیار ہو کر چلی گئی تھی۔
”کہاں جا رہی ہو عاشی؟“

”یونہی گھومنے۔“

”اچھا جلدی آنا آج شام ہم سب مل کر باہر جائیں گے۔ صبح نینا اور مورو اپس چلے جائیں گے۔“
”اوکے۔“

اور اب رات کے آٹھ بج رہے تھے اور پتا نہیں وہ کہاں تھی۔ اس نے جس ایڈ میں کام کیا تھا وہ کب کا مکمل ہو چکا تھا اور چند دن میں ان ایئر بھی آنے والا تھا اور پچھلے ایک ہفتے سے تو وہ گھر پر ہی تھی۔ دو دن قبل اس نے ڈاکٹر عبدالعید کے ساتھ مل کر ان کے نئے گھر کے لیے شاپنگ کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالعید نے اس کی پسند سے پردے وغیرہ خریدے تھے۔

”کہاں پتا کروں؟“ اس نے بے چینی سے سوچا۔

اس کی کوئی ایسی خاص دوست بھی نہیں تھی یہاں اور شرجیل مرزا کہیں وہ اس کے ساتھ نہ ہو۔

اس کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ اس نے ٹیلی فون اسٹینڈ سے ڈائری اٹھا کر شرجیل مرزا کا نمبر دیکھا اور پھر نمبر ملائے لیکن دوسری طرف سے کسی نے اسٹینڈ نہیں کیا۔

”معید بھائی سے کہوں؟“ اس نے مضطرب ہو کر سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا۔ تب ہی مین گیٹ پر بیل ہوئی تو بے اختیار اندرونی گیٹ کھول کر وہ باہر نکلی۔ عاشی شرجیل مرزا کی گاڑی سے اتر رہی تھی۔

”عاشی۔“ وہ ایک دم آگے بڑھی ”اتنی دیر کر دی۔“

”نہیں کوئی خاص دیر تو نہیں ہوئی۔ دراصل میں انکل شچی کے ساتھ ٹی وی اسٹیشن چلی گئی تھی۔ وہاں ایک ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی وہ دیکھتے رہے پھر وہ پروڈیوسر ہیں نارب نواز ملک انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان کی نئی سیریل میں کام کروں گی اور پھر انہوں نے میرا ڈیشن بھی لے لیا اسی وقت۔“
اس نے وہیں کھڑے کھڑے تفصیل بتائی۔ اس کا گلہابی رنگ دک رہا تھا آنکھوں میں جیسے خوشیوں کے بے شمار رنگ اترے ہوئے تھے۔

”ہیلو س مریم عثمان۔ بڑے عرصے بعد دیکھا ہے، کیسے مزاج ہیں؟“ شرجیل مرزا گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھے بہت دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مریم نے سر اٹھا کر غصے سے اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شریر سی چمک لہرائی اور وہ عاشی کی طرف مڑا ”اوکے عاشی، کل تیار رہنا۔ تمہارے ڈیشن کا رزلٹ پتا کرنے چلیں گے اور یہ جو تمہاری سسٹر ہیں انہیں بھی کچھ اخلاق وادب سکھا دو۔“

”بجو تو ایسی ہی ہیں۔“ عاشی ہنسی ”آپ بیٹھیں گے نہیں؟“

”آپ کی سسٹر نے داخلہ بند کر رکھا ہے۔“

”لیکن یہ صرف بجو کا گھر تو نہیں ہے۔“ عاشی نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔
”ہاں۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”اس وقت مطلع ایر آلود ہے اس لیے پھر سہی۔“ وہ ہاتھ ہلاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔
مریم چوکیدار کو گیٹ بند کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے عاشی کے ساتھ چلتی ہوئی اندر آگئی۔ نینا ابھی تک صفو کے ساتھ کچن میں تھی۔

”عاشی، بجی آپ آئیں۔“ نینا اسے دیکھ کر باہر آگئی ”آپ کو یاد نہیں تھا۔ ہم نے آؤٹنگ کے لیے جانا تھا؟“

”تو پھر آپ لوگ چلے جاتے نا۔“

”ہم تو آپ کا انتظار کرتے رہے۔“

”SORRY نینا۔ ابھی چلتے ہیں کھانا کھانے۔ کیوں بجو آج باہر ہی کھانا کھائیں گے؟“

”ٹھیک ہے۔“ مریم جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے چونک کر عاشی کو دیکھا۔

”نینا، معید بھائی سے جا کر کہہ دو۔ ہم باہر جائیں گے۔ کہیں وہ کھانا نہ کھالیں۔“

”کیا معید بھائی کا ساتھ جانا ضروری ہوتا ہے بجو۔“ عاشی نے مصنوعی سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہوں۔“ مریم اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”عاشی۔“

”جی۔“

عاشی جو جھک کر اپنے جوتوں کے اسٹریپ کھول رہی تھی۔ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور ریپلیکس ہونے کے لیے جوتے اتار کر ٹانگیں پھیلا کر سر صوفے کی پشت سے ٹکالیا۔

”عاشی، یہ تمہیں اتنی دیر تک انکل شچی کے ساتھ باہر نہیں رہنا چاہئے اور تم صبح سے اب تک ان کے ساتھ کیا کرتی پھر رہی تھیں۔“

”بجو۔“ عاشی یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا تھا۔

”میں نے یہ آپ سے کبھی نہیں پوچھا کہ آپ اس شام ڈاکٹر شہریار کے ساتھ کیفے زوف میں کیا کر رہی تھیں لہذا آپ کو بھی یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ میں کہاں جاتی ہوں کس کے ساتھ جاتی ہوں اور کیوں جاتی ہوں۔“

”عاشی۔“ مریم کے ہونٹ ذرا سے کھل کر بند ہو گئے۔ جیسے وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے منجمد ہو گئی ہو۔

عاشی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھک کر اپنے جوتے اٹھائے اور یونہی ننگے پاؤں اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

مریم نے جاپا کہ وہ عاشی کو آواز دے اسے روکے اور بتائے کہ وہ اس روز کیفے زوف میں ڈاکٹر شہریار کے ساتھ نہیں گئی تھی بلکہ ڈاکٹر شہریار اچانک مل گئے تھے۔ اسے نینا اور مور کے لیے شاپنگ کرنا تھی۔ ماما نے کراچی سے فون کیا تھا کہ اسکول سے جوسٹ ملتی ہے اس کے مطابق وہ خود جا کر شاپنگ کرے کیونکہ شاید وہ نہ آسکیں۔ ہمیشہ ماما ہی شاپنگ کیا کرتی تھیں اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اور کس طرح شاپنگ کرے گی۔ اتنی لمبی چوڑی لسٹ تھی۔ یونیفارم کے ہی چار چار جوڑے تھے۔

”ماما پلیز آپ آجائیں نا، خود مور بہت اداس ہے یہ چھٹیوں کا یہ آخری دیک آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔“

”کوشش کروں گی جان لیکن بہت مصروف ہوں۔ شاید نہ آسکوں تم شاپنگ کر لینا۔ زمرگ کو ساتھ لے لینا یا بیگم آفندی کو۔“

لیکن میڈم زمرگ گھر پر نہ تھیں۔ بیگم آفندی کو اس نے فون ہی نہیں کیا۔ عاشی کو اس روز جانا تھا کسی نئے ایڈ کے سلسلے میں۔ شرجیل مرزا نے اسے بلا رکھا تھا۔ نینا اور مور صبح ہی ڈاکٹر عبدالعید کے ساتھ ان کے کلینک چلے گئے تھے۔ ماما کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے سوچا تھا کہ وہ ہر صورت آج کچھ نہ کچھ شاپنگ کر ہی لے۔ چھٹیاں ختم ہونے میں اتنے تھوڑے سے دن ہی تو رہ گئے تھے۔ وہ اسی وقت تیار ہو کر شاپنگ کے لیے نکل گئی تھی اور حاد شاپنگ پلازا میں جب وہ تیسورے کے لیے شرٹس دیکھ رہی تھی تو اچانک شہریار مل گیا تھا۔

”مریم۔“ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا تھا ”کیسی ہو۔“

لحہ بھر کے لیے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کتنے بہت سارے دنوں کے بعد اس نے آج شہریار کو دیکھا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو نادل کر لیا۔

”اچھی ہوں۔“

اس نے کاؤنٹر پر مل پے کیا۔

شہریار نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے لیے۔

”گھر میں سب ٹھیک ہیں ناعاشی، نینا، مور۔“

”ہاں اور آپ کے گھر میں سب کیسے ہیں بابا، ماں جی اور عینی سب۔“

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مریم نے پوچھا۔

”سب اچھے ہیں مریم۔ مطمئن اور پرسکون مجھے بے اطمینان کر کے۔ مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر سب پرسکون ہیں۔“ مریم خاموش رہی۔

”مریم، آؤ تھوڑی دیر وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ بات کرتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے صدیاں گزر گئی ہیں جہیں دیکھے اور تم سے بات کیے۔“

”شہریار پلیز میرے راستے میں مت آؤ۔ مت الجھاؤ مجھے۔“

”پلیز مریم۔ ایک بار صرف ایک بار میری بات سن لو پھر نہیں آؤں گا تمہارے راستے میں۔“

اور وہ اس کی التجا کے سامنے مجبور ہو گئی تھی۔ اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر خود اس کا کتنا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر اس سے بات کر لے۔

”جو راستے منزلوں کی طرف نہیں جاتے شہریار ان پر چلنے سے فائدہ۔“ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے اس نے انتہائی دل گرگشتی سے کہا۔

”راستے منزلوں کی طرف لے کر جائیں یا بھٹکا دیں۔ منزل تو وہی ہے جس کا تعین ہو چکا۔“

شہریار کے لہجے میں یقین تھا۔

”میں جانتا ہوں موی۔“

لحہ بھر بعد شہریار نے اس کی طرف دیکھا۔

”راستے بہت ٹھن ہیں لیکن انسان ہمیشہ سیدھے اور صاف راستے پر تو نہیں چل سکتا نا، کبھی کبھی راستے میں مشکلات بھی تو آ جاتی ہیں بلکہ مشکلات کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اگر آدمی کا یقین پختہ ہو اور حوصلہ بلند ہو تو کبھی نہ کبھی مشکلات کے باوجود بھی راستے طے ہو جاتے ہیں اور منزل مل جاتی ہیں۔“

”ہاں شاید لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو چاہیں مل جائے۔“

مریم نے لمحہ کے لمحہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر مینو دیکھنے لگی جو ابھی ابھی بیرارکھ کر گیا تھا۔

”تمہارا دل بہت فضول باتیں کرتا ہے۔“ شہریار نے مینو کا رڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا ”کیا

ٹھکواؤں۔“

”جو جی چاہے۔“

”موی۔“

آرڈر دے کر وہ میز پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

”دیکھو ان مشکل لمحوں میں مجھے جہامت کرو۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، تم ساتھ ہوگی تو میں یہ سارے مشکل مرحلے طے کر لوں گا لیکن تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اپنے آپ کو مجھ سے اس طرح الگ مت کرو موی پلیز۔ تمہیں کیا خبر کہ میں کن کن اذیتوں سے گزر رہا ہوں اور زندگی مجھے کتنے مشکل موڑ پر لے آئی ہے۔ جہاں اگر تم نے مجھے اکیلا کر دیا تو میں بھی ہمت ہار جاؤں گا۔ جانتی ہو مومواب ماں جی اور بابا بھی ماموں کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔“

”بابا بھی۔“ مریم کو از حد حیرت ہوئی۔

”ہاں بابا بھی۔“ شہریار کا لہجہ گر سا گیا۔

پہلے یہ یقین تھا کہ بابا اور ماں جی کبھی نہ کبھی سکندر ماموں کو منالیں گے لیکن اب یہ یقین بھی بچھڑ گیا ہے۔
”شاید بابا بھی کسی ایسی لڑکی کو بہو بنانا پسند نہیں کرتے ہوں گے جو ایک غلم ایکٹریس کی بیٹی ہے“
اس نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے مریم۔ جب بابا نے مجھ سے تمہارے متعلق پوچھا تھا تو تب بھی وہ اس حقیقت سے باخبر تھے۔“

”پتا نہیں جو بھی ہو مریم۔ میں تمہارے سوا کسی دوسری لڑکی کو شریک زندگی بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں بابا اور ماں جی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا“ میں نہیں چاہتا کہ کل کو وہ کہیں کہ میں احسان فراموش ہوں۔ میں اپنی آخری حدوں تک ان کو قائل کرنے کی کوشش کروں گا اور پھر۔“

اس نے اپنے ہاتھ میز پر سے اٹھا لیے۔

”اور پھر میں سب کو چھوڑ کر تمہاری طرف آ جاؤں گا۔“

”نہیں شہر یار ماں جی اور بابا کے بغیر نہیں۔“

اس نے تو پہلے ماں جی اور بابا کو ہی پسند کیا تھا۔ اس گھر اور اس گھر کے ماحول کے حوالے سے ہی اس نے شہر یار کی چاہ کی تھی پھر۔

”مریم۔“ شہر یار نے بے چینی سے کہا ”میں نے تم سے پہلے بھی وعدہ لیا تھا کہ تم میرا انتظار کرو گی۔ تمہیں میرا انتظار کرنا ہے۔ ایک بار پھر وعدہ کرو مریم۔“

مریم سر جھکائے میز پر رکھے گلاسوں اور ان میں بے نشو زکود کھیتی رہی۔

”دیکھو اگر تم نے میرا انتظار نہ کیا تو میں اپنی زندگی ختم کر لوں گا۔“

اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ مریم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں شہر یار۔“

”ہاں مریم میں صحیح کہہ رہا ہوں۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔

”میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی میرے لیے قطعی بے معنی ہے۔ دیکھو تم اس وقت تک میرا انتظار کرنا جب تک کہ سکواور جب نہت ہارنے لگو تو مجھے بلا لینا“ آواز دے لینا۔ ایک منٹ تو کیا میں ایک لمحہ بھی نہیں رکوں گا۔ میں سب زنجیریں توڑ کر آ جاؤں گا لیکن پلیز مریم تم کچھ دیر تو میرا انتظار کرو۔ اس وقت تک جب تک.....“

”اچھا“ مریم نے آہستہ سے کہا ”میں انتظار کر لوں گی..... لیکن شہر یار ماں جی اور بابا کو کوئی دکھ نہ دینا۔“

”اوکے۔ اوکے مریم۔“

شہر یار کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”میں نے اسکا لرشپ کے لیے درخواست دے دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے اسکا لرشپ مل جائے گا پھر شاید میں دو تین سال کے لیے باہر چلا جاؤں ہائر ایجوکیشن کے لیے۔ فی الحال میرے پاس یہی راستہ ہے اور بابا نے بھی منع نہیں کیا۔ شاید وہ میرے چہرے سے میرے اندر کی کیفیات کو پڑھ رہے ہیں۔ شاید ان دو تین سالوں میں ان کے خیالات بدل جائیں شاید وہ بخوشی.....“

”پتا نہیں۔“ مریم نے اس کی بات کاٹ دی ”لیکن میں آخری حدوں تک آپ کا انتظار کر سکتی ہوں۔“
”کھانا کب لگاتا ہے۔“

منو نے آکر پوچھا تو مریم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا!“

”وہ جی کھانے کا پوچھا تھا جی۔“

”کھانا تو شاید باہر کھانے کا پروگرام تھا۔ تم عاشری سے پوچھ لو۔“

کیا تھا اگر وہ اس روز شہر یار کے ساتھ کیفے زوف تک نہ جاتی۔ منو چلی گئی تو اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔

اور پتا نہیں عاشری نے کیا سوچا ہوگا۔ کس قدر غلط اور اب پتا نہیں وہ اس کی بات کا یقین بھی کرے گی یا نہیں اور پھر بھلا شہر یار کا شریل مرزا سے کیا مقابلہ۔ شریل مرزا تو ایک فضول اور غلط آدمی ہے اور عاشری بہت انوسینٹ بہت معصوم۔

پتا نہیں کیوں اسے یقین سا تھا کہ شریل مرزا جان بوجھ کر عاشری کو اپنے ساتھ انوالو کر رہا ہے محض اسے تنگ کرنے اور نیچا دکھانے کے لیے اور ماما..... ماما پتا نہیں کیوں منع نہیں کرتیں نہ اسے اور نہ عاشری کو۔ اب وہ اسے اداکاری کی طرف لے جا رہا ہے اور عاشری کو کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ کسی کی بات نہیں سنے گی۔ کسی کی بھی۔ معید بھائی کی بھی نہیں اور میں۔ مجھے میرے متعلق خدا جانے وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔

شاید اس روز کیفے سے باہر آتے ہوئے اس نے انہیں دیکھا ہو یا شاید اندر جاتے ہوئے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے۔ وہ تو اپنے ارد گرد سے قطعی بے خبر بیٹھی تھی۔

اس نے چاہا کہ وہ عاشری کے پاس جائے اور وضاحت کرے کہ وہ..... لیکن اسے لگا جیسے اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا کہے گی بھلا وہ اسے۔

”وہ یونہی ایک تنگ ٹی وی کی خالی اسکرین کو دیکھ رہی تھی“ تب ہی سیڑھیوں سے ڈاکٹر عبدالعزیز‘
نیا اور تیور کے ساتھ اترتے ہوئے نظر آئے۔ تیور ان کے بازو سے چپکا ہوا تھا۔

”بیچے خاتون ہم حاضر ہو گئے۔“

”نہیں تو میری جان۔“

ڈاکٹر عبدالمعید نے مریم کے سامنے سر جھکاتے ہوئے شریر سے لہجے میں کہا تو مریم نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے انہیں دیکھا تو ڈاکٹر عبدالمعید ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

مریم نے ایک دم بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔
”یہ تو بس یونہی ہو گیا ہے۔ دن کو میں سوئی نہیں تھی نا بالکل اور بک پڑھتی رہی تھی شاید اس لیے۔
معمولی سادہ ہے۔“

”خیریت، مریم آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔“
”ہاں۔“

”اچھا۔“
اس نے سر اٹھا کر اسے بے یقینی سے دیکھا ”تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں گی۔“
”کیوں نہیں۔“

مریم نے مسکرانے کی کوشش کی۔
”نہیں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ ڈاکٹر عبدالمعید نے تشویش سے اسے دیکھا۔

”میں تو اچھی ہوں۔“ وہ پوری شعوری کوشش سے ان کی طرف متوجہ ہو گئی ”بس ہلکا سا سر میں درد ہو رہا ہے۔“

تب ہی عاشی نینا کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ مریم نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے لباس چنچ نہیں کیا تھا لیکن منہ ہاتھ دھو کر اور برش کر کے فریش ہو گئی تھی اور بے حد دلکش لگ رہی تھی۔
ڈاکٹر عبدالمعید کی نظریں لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔
”کیسی ہو عاشی۔“
”فائن۔“

”میں تو پھر۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
”میں دیکھوں بھی تیار ہے کہ نہیں۔“

نینا ان کا ہاتھ چھڑا کر عاشی کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔
”کچھ نہیں ابھی کوئی ٹیبلٹ لیتی ہوں ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اگر زیادہ طبیعت خراب ہو تو۔۔۔۔۔“
”نہیں بالکل نہیں۔“

اس نے خوش دلی سے کہا اور اس کی آنکھوں میں شریری چمک ابھری۔ نچلے ہونٹ کے دائیں کونے کو داٹوں تلے دبا کر اس نے ڈاکٹر عبدالمعید کی طرف دیکھا۔

اس نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔
”صبح سویرا در نینا چلے جائیں گے اور میں نے ان سے پراس کیا تھا کہ آج باہر ہی کھانا کھائیں گے۔“

ڈاکٹر عبدالمعید تیور کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اس نے نظریں جھکا لیں۔ تیور کی نظریں بھی اس کے چہرے پر تھیں۔
”مومو۔“

وہ ڈاکٹر عبدالمعید کا ہاتھ چھوڑ کر بالکل اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
”یہ درد کیوں ہو گیا ہے آپ کو۔“

”درد تو خود ہی ہو جاتا ہے نکلے۔ کیوں اور کیسے کا بھلا کیا جواز۔“
اس نے پیار سے تیور کی طرف دیکھا۔

”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو یہ درد نہیں تھا آپ کو۔“
”ہاں بس اچانک ہی ہو گیا۔“

”یہ درد۔“ وہ ذرا سا جھکا ”یہ وہ والا درد تو نہیں ہے نا ماما والا۔“
اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور چہرے پر پریشانی سی۔

”یہ کیا ہمارے ہر پروگرام میں آپ کا ہونا ضروری ہوتا ہے کیا۔“
”یقیناً۔“ ڈاکٹر عبدالمعید مسکرائے۔

”کیوں بھلا۔“
وہ بدستور شرارت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”شاید یہ کہیں بہت پہلے ہی کس لوح مقدس میں رقم ہو چکا تھا۔“
”یقین ہے آپ کو!“

”ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد سے مسکرائے۔
”اتنا یقین بھی اچھا نہیں ہوتا ڈاکٹر عبدالمعید۔“

وہ اپنی بات کر کے ایک دم مریم کی طرف مڑ گئی۔
”یہ۔ یہ اس طرح عاشی نے کیوں کہا۔ کیا ہے اس کے دل میں۔“

ڈاکٹر عبدالمعید کے مسکراتے لب یک دم سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے چہرے سے اس کے اندر کی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن وہ اس طرح فریش چہرے کے ساتھ اپنی بات کے تاثر سے قلعے بے نیاز بنی مریم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بجواپ تیار نہیں ہوں۔“

”ہاں نہیں تو۔ ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

مریم کھڑی ہو گئی لیکن اسے لگا جیسے اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا یو جھ سہار نہ رہی ہوں۔ وہ پھر بیٹھ گئی شاید بہت دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس کے پاؤں سن ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا مریم؟“

ڈاکٹر عبد المعید نے بے اختیار پوچھا۔

”کچھ نہیں شاید پاؤں سن ہو گئے ہیں۔“

”آپ کی طبیعت اگر اچھی نہیں ہے تو پھر ہم گھر پر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔“ تیمور نے افسردگی سے کہا۔

”ہاں پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔“

”نہیں پلیز پروگرام مت کینسل کریں۔“

”کیا ہوا ہے آپ کو۔“

عاشی نے پوچھا۔ مریم نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

کس قدر انجان بن رہی تھی وہ۔ کیا اسے ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے کس لیے میں اور کیا بات کی تھی اس نے لیکن اس کے چہرے سے ذرا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ یوں جیسے اسے یاد ہی نہ رہا ہو کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے کیا کہا تھا۔ مریم کی آنکھیں جلنے لگیں اور کپکپی میں درود کی ٹیسیں سی اٹھیں۔ اس نے بے اختیار دو انگلیوں سے کپکپی کو دبایا۔

”مومو کے سر میں درد ہے۔“ تیمور نے عاشی کو انفارم کیا۔

”کوئی ٹیبلٹ لے لیتیں آپ۔“ عاشی نے نرمی سے کہا۔

”ہاں لے لیتی ہوں۔ تم ایسا کرو عاشی۔ تم اور معید بھائی چلے جاؤ مور اور نینا کے ساتھ۔ میں ٹیبلٹ لے کر کچھ دیر سو جاؤں گی تو سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ عاشی نے سر ہلایا۔

”میرے کمرے میں پرس ہو گا وہاں سے پیسے لے لینا۔“

”میرے پاس ہیں۔“

عاشی نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ افسوس کی بات ہے مریم۔ آپ ابھی تک مجھے غیر سمجھتی ہیں۔“ ڈاکٹر عبد المعید نے ناراضگی کا

اظہار کیا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“

مریم کے بجائے عاشی نے شوخی سے جواب دیا۔

”اگر اپنائیت کا مطلب یہ ہے کہ آج کے کھانے کا ٹیل آپ پے کریں جبکہ یہ دعوت سراسر ہماری طرف سے تھی تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”جھینک یو۔“

ڈاکٹر عبد المعید کے چہرے پر چند لمحے پہلے جو بادل چھا گئے تھے وہ ایک دم چھٹ گئے اور انہوں نے مریم کی طرف دیکھا۔

”مریم اگر نیند نہ آئے تو دو دو ٹیبلٹیں لے لینا۔ سونے سے فریش ہو جائیں گی اور پھر ڈیڈی ہیں نا اوپر اگر طبیعت کچھ خراب محسوس کریں تو.....“

”ذرا ساسر درد ہی تو ہے نا۔ آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے خدا نخواستہ مجھے.....“

”اب کوئی فضول بات مت کہنا بجو۔“

عاشی نے اسے ٹوک دیا اور پھر ڈاکٹر عبد المعید کی طرف دیکھا ”تو پھر چلیں۔“

”لیکن جائیں گے کہاں؟“

”کننگلی فرائیڈ چکن K.F.C.“ تیمور نے جواب دیا۔

”جی نہیں، ہم تو سوپ پیئیں گے اور چکن شاشنک کھائیں گے ایک فرائیڈ رائس کے ساتھ دیکھی میں۔“ نینا اور مور دونوں بحث کرنے لگے۔

”دیر ہو رہی ہے پلیز آپ لوگ جائیں اب میں بھی سو جاؤں گی میرے لیے پریشان نہ ہونا۔“

”اوکے پھر چلتے ہیں۔“

”اپنا خیال رکھیے گا مومو۔“

جاتے جاتے تیمور نے مدبر بن کر کہا۔ تو سب مسکرا دیئے۔

اور تیمور بھی کبھی کیسے بڑوں کے سے انداز میں بات کرتا ہے حالانکہ ابھی وہ پورے دس سال کا بھی نہیں ہوا۔

اس کے ہونٹوں پر بھی مدہم سی مسکراہٹ آگئی۔

”آپ کیوں نہیں ساتھ گئیں جی۔“

مفوکٹ بند کر کے آئی تو اس نے پوچھا۔

”یونہی ہلکا ساسر میں درد تھا۔“

”چائے بنا دوں۔“

”نہیں موز نہیں ہے۔ تم سب کو کھانا دے دو اور خود بھی کھا لو۔“

”آپ نہیں کھائیں گی۔“
”نہیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی بہت سارا لیکن آنسو جیسے خشک چکے تھے اور پتا نہیں عاشری نے اس کے متعلق کیا سوچا ہوگا۔ جب۔ جب اس نے مجھے اور شہر یار کو سر میں درد کی شدید لہر اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک بار پھر عاشری اپنے شہر یار اور شرجیل مرزا کے متعلق سوچنے لگی۔



پروفیسر عادل نے ہال میں قدم رکھا تو تقریباً پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کوئی نشست خالی تھی۔ انہوں نے وہیں رک کر ایک طائرانہ نظر پورے ہال پر ڈالی۔ بختی حیدر اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے بالکل ساتھ والی نشست پر تصدق احمد اور پھر ان کے ساتھ آمنہ صفی تھیں۔ تب ہی بختی حیدر نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور ان کی نظر پروفیسر عادل پر پڑی اور انہوں نے وہاں سے ہی ہاتھ ہلایا اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

”بڑی دیر کردی آپ نے۔“ قریب پہنچنے پر بختی حیدر نے کہا۔
”ہاں کچھ دیر ہی ہوگئی۔“

”خیر ہم نے آپ کے لیے نشست رکھی ہے۔“

انہوں نے آمنہ صفی کے ساتھ والی سیٹ کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک دس بارہ سالہ لڑکا بیٹھا تھا۔
”چلیے میاں صاحب زادے آپ کا شکریہ ہمارے عادل صاحب آگئے۔“

لڑکے نے پروفیسر عادل کے لیے سیٹ خالی کر دی تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے بختی حیدر کی طرف دیکھا۔
”اپنے حافظ صاحب کے برخوردار ہیں۔“

”اور حافظ صاحب نظر نہیں آ رہے۔“

پروفیسر عادل نے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔
”وہ منتظمین میں سے ہیں۔“

”اچھا۔“ پروفیسر عادل سر ہلا کر آمنہ صفی کی طرف متوجہ ہو گئے ”کیسی ہیں آپ؟“

”اچھی ہوں۔“ آمنہ صفی نے سراٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اور اماں۔“

”اماں بھی اچھی ہیں۔ کامل کا کچھ پتا چلا۔“

”نہیں۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”I AM SORRY“ اس روز مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ بعد میں پھر میں آپ سے معذرت ہی نہ کر سکی۔“

”کوئی بات نہیں وہ بہت حد تک کامی سے ملتا تھا۔“ ان کا لہجہ بدستور دھیمہ اور دکھ لیے ہوئے تھا۔

اور اس روز آمنہ صفی کی اطلاع پر بھاگے بھاگے گئے تھے تو پتا نہیں کیوں ان کے دل کو یقین ماہو گیا تھا کہ وہ ضرور کامی ہوگا مگر وہ کامی نہیں تھا۔

ہاں کامی کی طرح وہ انہیں دیکھ کر ”بھائی پاس جانا ہے۔“ کرنے لگا تھا۔ وہ کتنی دیر تک مایوس اور دل ریز سے اس کے پاس کھڑے رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے کیا کیا سوچ ڈالا تھا کہ ابھی وہ کامی

کے آ کر آئیں گے اور پھر ماں جی کو فون کریں گے۔ مریم اور عاشری کو بتائیں گے اور اب آ زردہ سے وہ اسے دیکھ رہے تھے جو آمنہ صفی کے گھر کے کڑوا لی گلی میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ذرا دیر بعد

مراٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا اور بھائی پاس جانا ہے کا نعرہ لگا کر پھر سر جھکا لیتا تھا۔ پتا نہیں کون تھا وہ۔ انہوں نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تب ہی آمنہ صفی انہیں اپنی طرف آتی دکھائی دی

تھی۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ تھا۔ جس میں غالباً پھل تھے۔
”ابھی چند لمحے پہلے ہی گھر گئی تھی اس کے لیے کچھ لینے۔ کچھ کھانے کے لیے۔“

لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
”یہ کامی ہی ہے نا۔“

”نہیں۔“

”اوہ۔“

اسے بے حد دکھ ہوا ”SORRY“

وہ چپ کھڑے رہے۔ آج پہلی بار انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کامی سے کتنی زیادہ اور بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک دم ہی بے تحاشا تھکن ان کے وجود

مٹاڑ آئی۔ یوں جیسے منزل پر آ کر کوئی پیاسا رہ جائے۔
”آئیے نا۔ کچھ دیر بیٹھئے۔“

آمنہ صفی نے آفر کی تو وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیے۔ مایوسی نے اس وقت اس طرح ان پر ظہور کیا تھا چاہے وہ تھے کہ کچھ دیر کو وہ کہیں بیٹھ جائیں سستا لیں تاکہ ان کے ڈوبتے دل میں ٹھہراؤ

آجائے لیکن آمنہ صفی کے گھر جا کر انہیں احساس ہوا کہ انہیں وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔
ایک متوسط محلے کے متوسط گھرانے کے اپنے آداب اور اپنی ریسٹیں ہوتی ہیں۔ آمنہ صفی کو اپنی

رہائیت سے بغاوت کی مجرم ٹھہرائی گئی تھی پھر بھی۔
”اماں یہ پروفیسر عادل ہیں۔“ اس نے تعارف کروایا تھا ”ان کے بھائی کم ہو گئے تھے۔“

”کوشش کروں گا۔“

”کوشش نہیں عادل خان! تمہیں آنا ہے ہر صورت اور صرف آنا ہی نہیں، کتاب کے متعلق کچھ کہنا بھی ہے۔“

”ہائش۔ میرا مطلب ہے صاحب کتاب میرے ایک بہت اچھے دوست کا عزیز ہے اور۔“

انہوں نے کتاب بھی بھجوا دی۔
سو وہ چلے آئے تھے لیکن اپنی مصروفیات میں اتنا وقت نہیں نکال سکے تھے کہ وہ کتاب پڑھ کر اس پر کوئی تبصرہ لکھیں۔

”اور تصدق احمد۔“ انہوں نے مسکرا کر انہیں دیکھا ”کیا مصروفیات ہیں آج کل۔“

”جواب مل گئی ہے۔“

”اوہ گلد۔“

”لیکن ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

آمنہ صفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ کر ٹھہر گئی اور اس نے تصدق احمد کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔
”کیا؟“

”یہ جاب تصدق احمد کے قابل نہیں یا تصدق احمد اس جاب کے قابل نہیں، دونوں میں کوئی ایک بات ضرور ہے جو ابھی تک تصدق کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”تو کیا ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ کو کس کے قابل نہیں۔“

پروفیسر عادل نے بھی لائٹ موڈ میں پوچھا۔

”دونوں صورتوں میں تصدق احمد کی ہی بے روزگاری کے چانسز ہیں۔ جاب کا تو کچھ نہیں بگڑے گا کوئی اور ضرورت مند آ جائے گا۔“

آمنہ صفی سنجیدہ ہو گئی۔

”عادل آپ اسے سمجھائیں۔ اسے ان کے متعلق سوچنا چاہیے اپنے بچوں اور بیوی کے متعلق جن کے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔“

”سر۔“

تصدق احمد خان نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔

”کیا ہمارے اس ملک میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمیں بھی یعنی ہم فنکاروں کو بھی کوئی ایسا تحفظ مل جائے

کہ ہم غم دور اس سے بے نیاز ہو کر اپنی تخلیقات کرتے رہیں اور..... آخر کھلاڑیوں کو بھی تو جب ملتی ہے۔

کی ٹینک میں بی آئی اے میں۔ ہمیں ایسی کوئی جاب نہیں مل سکتی جس میں گھر بیٹھے تنخواہ ملتی رہے

اور ہمارے بچوں کے حصد کا سارا.....“

111

وہ تفصیل بتا رہی تھی اور وہ اس کی ماں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے رویے میں واضح سردمہری تھی۔ شاید انہیں ان کا اپنے گھر آنا پسند نہیں آیا لیکن آمنہ صفی تو آمنہ صفی تھی۔ وہ انہیں وہاں بٹھا کر ان کے لیے چائے لینے چلی گئی تو وہ سوچنے لگے۔

ساری دنیا کی مائیں شاید اپنے رویوں اور محبتوں میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چاہے وہ اس چھوٹے سے گھر میں رہنے والی آمنہ صفی کی ماں ہو چاہے بڑی حویلی میں رہنے والی عادل خان کی ماں۔

پھر وہ چائے پی کر فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”ماں جی۔“

انہوں نے اپنا سر جھکا کر بڑے ادب سے التجا کی تھی۔

”دعا کیجیے گا کہ کامی مل جائے۔“

”خدا تمہاری ماں کی مانتا ٹھنڈی کرے۔“

بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا اور جھریوں کی سخت سردمہری میں کہیں کہیں شفقت و محبت کے جھنوکے چمک اٹھے تھے اور ہمیں بتانے اور ہمیں بگاڑنے میں لوگوں کے رویے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ آمنہ صفی کو خدا حافظ کہتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔

اور اگر لوگوں کے رویے اتنے منفی نہ ہوتے تو آج آمنہ کی اماں کے رویے میں اتنی سردمہری نہ ہوتی۔

اندھے سے تو آدمی کا دل بہت گداز ہوتا ہے۔ محبتوں اور چاہتوں سے بھر اور پھر واپس آتے ہوئے وہ اس

اجنبی کے پاس ڈرا دیر کے لیے رکے تھے۔ جو نہ جانے کس ماں سے چمچ کر یہاں آ بیٹھا تھا۔ شاید اس کا

کوئی بھائی بھی ان کی طرح اسے تلاش کر رہا ہو۔ وہ کامی نہیں تھا لیکن کامی کی طرح لگتا تھا۔

وہ اسے ساتھ ہی لے آئے تھے اور اخبار میں اشتہار دے دیا تھا اور اس کی تصویر سمیت چند دن بعد ہی

اس کے عزیز آ کر اسے لے گئے تھے اور کیا خبر کسی دن یوں ہی کامی کے متعلق کوئی نیک دل

اشتہار چھپو ادے اس توقع میں وہ ہر چھوٹا بڑا اخبار خریدتے اور دھیان سے دیکھتے تھے۔ کہیں کسی نے کامی

کے متعلق کوئی اطلاع نہ دی ہو۔

”آپ نے“ منظر منظر دھوپ“ کا مطالعہ کیا۔“

تصدق احمد ان کی طرف جھکے تو وہ چونکے۔

”نہیں۔“ وہ شرمندہ سے ہو گئے ”مجھے وقت ہی نہیں ملا۔“

دراصل یہ ایک نوجوان شاعر کی کتاب ”منظر منظر دھوپ“ کی تقریب رونمائی تھی۔ وہ ذاتی طور پر

تو اسے نہ جانتے تھے لیکن بھتیجی نے اصرار کیا تھا بے حد۔

”یار ضرور آنا۔ ہمیں اپنی نمائندہ نسل کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔“

”آخاہ۔“

”جتنی حیدر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔“

”تھدق احمد خوابوں کی دنیا سے باہر آجاؤ۔ میری جان تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ تم مصوری کرو۔“

”اور اپنا خون پیو۔ میرے بھائی یہ امیر لوگوں کا فن ہے۔“

”اچھا پرتاج سیکرٹری نے تقریب شروع ہونے کا اعلان کیا تو جتنی حیدر نے آمنہ صفی سے سیٹ تبدیل کر لی۔“

”عادل خانان کچھ لکھا تھا۔“ انہوں نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جتنی۔“ وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

”کوئی بات نہیں۔ کافی لوگ ہیں۔ حافظ صاحب نے تو زبردست مضمون لکھا ہے۔ مجھے پڑھایا تھا۔“

”سامعین بھی کافی ہیں۔“

”ہاں یار یہ نوجوان نسل ہم سے بہت آگے ہے۔ مجھے یاد ہے جب میری پہلی کتاب ”شب جہراں“

”کی تقریب رونمائی ہوئی تھی تو صرف چند لوگ آئے تھے۔“

”وقت کی بات ہے۔“

”پروفیسر عادل اسٹیج کی طرف متوجہ ہو گئے جہاں حافظ صاحب کتاب کا تعارف کروا رہے تھے۔“

”مسعود عادل میں نے تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔ یار بہت دنوں سے میرے دل میں کھد کھد ہو رہی تھی۔“

”کیا؟“

”پروفیسر عادل ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔“

”یار اس روز اپنے نئے ناول کا پہلا جملہ لکھتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ تمہارے خوابوں کی

”شہزادی تمہاری وہ تصوراتی ہستی کہیں میڈم زگس کی بیٹی تو نہیں۔“

”ارے نہیں۔“ بے ساختہ ان کے لبوں سے نکلا ”میں تو اس بات سے بھی لاعلم ہوں کہ میڈم کی کوئی

”بیٹی ہیں۔“

”ان کی ایک بیٹی ہے جس کے متعلق آج کل وہ بے تحاشا بیان دے رہی ہیں کہ ان کے سابقہ خاوند

”نے جس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ ایک بیٹی غالباً امتیاز شاہ سے بھی ہے وہ چھوٹی ہے۔“

”ہوں گی لیکن آج تک کسی سے بھی نہیں ملا اور آپ بھی کمال کرتے ہیں جتنی۔۔۔ آپ کا ذہن بھی

”کہاں پہنچا۔“

”یادِ رحمہ سے کچھ بھونٹے نہیں ہوتے میں نے سوچا میڈم تم پر بہت مہربان ہیں کہیں ان کی وہ بیٹی۔۔۔“

”اوہ نہیں جتنی میں اگر چپ ہوں تو میری کچھ مجبوریاں ہیں۔“

”مجبوریاں ہیں تو چھوڑ دو اس کا خیال۔ ایک سے ایک حسین موجود ہے تم نگاہ تو کرو۔ دیکھو تو اپنے

”آس پاس کیسی کیسی زہرہ جیں ایک نظر۔“

”پلیز جتنی آپ کے اور میرے فلسفہ محبت میں بہت فرق ہے۔ آپ جس طرح سوچتے ہیں میں اس

”طرح نہیں سوچتا۔“

”جتنی کی بات کا مختصر جواب دے کر وہ مقرر کی طرف متوجہ ہو گئے۔“

”بیسویں صدی کا یہ آخری سیاسی اور سماجی لحاظ سے تیزی سے بدلتے رجحانات اور اہم مثبت و منفی

”جدیلوں کا زمانہ ہے۔ ادبی تحریک میں یہ اقبال کی جدید تحریک میں استحکام اور اس کے تھیس اور اینٹی

”تھیس کے طور پر ابھرنے والی مختلف تحریکوں کا دور ہے۔“

”کبھی ہمیں بھی ان کا کچھ اتنا ہوتا ہی نشان بتاؤ۔ شاید کسی کام آسکیں۔“

”پلیز جتنی۔“ پروفیسر عادل نے درخواست کی ”سننے دیں“ مقرر کیا کہہ رہا ہے۔“

”انہیں جتنی کا یہ انداز از حد ناگوار کرتا تھا اور اس لمحے پر وہ بچھٹاتے جب وہ بے اختیاری میں جتنی سے

”مریم کا ذکر کر بیٹھے تھے۔ جتنی کبھی کبھی تو بالکل ہی بے لحاظ ہو جاتے تھے اور دوسروں کی موجودگی میں بھی

”ذہنی باتیں کر جاتے تھے جس سے انہیں انتہائی کوفت ہوتی ہے۔“

”جتنی مسکرا کر تھدق احمد کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے ایک بار پھر مقرر کی بات سننے کی کوشش کی۔“

”شاعر کے خواب اور تمنائیں تو ہمیشہ اس زہر کو سستی اور شہد کی طرح اپنے اندر سمو کر امرت بناتے

”رہتے ہیں۔ زہر کو امرت بنانے کا عمل ہی وہ مقام ہے جہاں بڑا فن وجود میں آتا ہے۔ ایسا فن جو کائنات

”اور انسان کے نئے رشتوں کو وجود میں لاتا اور معاشرے کو نئے خوابوں اور تمنائوں سے آشنا کرتا ہے۔ یہی

”خواب تمنائیں اور حوصلے ”منظر منظر دھوب“ کے شاعر کا بنیادی آدرش ہیں۔“

”وہ مقرر کو نہیں جانتے تھے لیکن وہ جو کوئی بھی تھا بہت اچھا بول رہا تھا۔ انہوں نے پوری شعوری کوشش

”سے اپنی توجہ اس کی طرف مبذول کرنی چاہی لیکن ذہن منتشر ہو چکا تھا۔ بار بار تصور میں مریم کا سراپا آ رہا

”تھا۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے۔ وہ مریم سے نہیں ملے تھے۔ نہ اسے دیکھا تھا۔ تیمور کو جویلی سے واپس

”لانے کے بعد وہ نوبت ولا نہیں گئے تھے۔ حالانکہ کئی بار اسے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کو جی چاہا تھا

”لیکن انہوں نے خود کو روک رکھا تھا۔ چنانچہ کیوں؟ کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

”انہیں لگتا تھا جیسے مریم کو دیکھتے ہی وہ ضبط کھو بیٹھیں گے اور وہ سب کچھ جواہر ہونے لگے اپنے اندر چھپا رکھا تھا

”اس کے سامنے کہہ بیٹھیں گے۔“

”سارے جذبے عیاں کر دیں گے۔“

”اور پھر۔۔۔ تب ہی تو وہ اتنے دنوں سے تیمور کے فون کرنے کے باوجود نوبت ولا نہیں گئے تھے۔ وہ

”اتنی اداس اتنی دل گرفتہ اور شکست خوردہ سی نظر آتی تھی کہ بے اختیار ان کا جی چاہنے لگتا تھا کہ وہ اس کے نہ

کہ انہوں نے تیسور سے بھی بار بار کہا ”بیٹا ماما آجائیں تو مجھے فون ضرور کرنا۔“
ایک دم ہی اضطراب نے انہیں آگھیرا تو بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے اسٹیج کی طرف دیکھا۔
جب جی حیدر جانے کب اسٹیج پر چلے گئے تھے اور اب مائیک کے سامنے کھڑے اپنے دلچسپ اور
دلکش انداز میں بول رہے تھے۔
ورڈ زور تھہ نے ککو کے متعلق لکھا تھا۔

THRICE WELCOME DARLING OF THE SPRING EVEN YET
THOU ART TO ME

میرے لیے ”منظر منظر دھوپ“ کا شاعر بھی ورڈ زور تھہ کے ککو کی طرح ہے پراسرار اور انجانا!
اور یہ جتنی کے پاس بھی انظوں کا ایک خزانہ ہے خوب صورت اور دل کو ٹھٹھی میں لینے والے لفظ۔
پروفیسر عادل نے پاکٹ سے روتھ مین کی ڈیپا نکال کر سگریٹ سلگایا اور جتنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔
وہ دوسری زبان سے نہیں اپنی زبان سے کچھ کہنا چاہتا ہے اس لیے اس کے اسلوب میں تاثر، گرمی،
گداز، جمالیات اور گمبھرتا ہے۔

اور تیسور کی چھٹیاں تو ختم ہونے والی ہوں گی۔
اف او انہیں دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے نینا، رتیسور کے لیے کچھ گفت خریدنے تھے۔
اور پتا نہیں وہ چلے ہی گئے ہوں۔ چند دن پہلے ہی تو تیسور نے انہیں فون پر بتایا تھا کہ دو تین روز تک
وہ مری واپس چلے جائیں گے۔

انہوں نے سگریٹ پھینک کر اور جوتے تلے مسل دیا۔
وہ جن کی خاطر
دعا میں کرتے ہوئے ہماری
نجیف پلکیں بھی جھک گئی تھیں
وہ چاند راتیں بہار لمحے
جو ہم نے باہم گزارے تھے
وہ کتنی صدیوں سے
چاندنی کی روائیں اوڑھے
گلاب و زمکس کے ہار لے کر
تمہارے آنے کے منتظر ہیں

دھوپ، بارش اور سانے
نظر آنے والے آنسو اپنی انگلی کی پوروں سے چن لیں۔ اس کے سارے درو چرا کر اپنے دل کے اندر بند
کر لیں اور اس کی خاموشی اور اداس آنکھوں میں ہنسی اور مسرت کے جگنو بھر دیں۔ وہ ہر بار انہیں پہلے سے
زیادہ اور کمزور اور تھکی ہوئی لگتی تھی۔ وہ بمشکل خود کو کچھ پوچھنے سے روکتے تھے۔ وہ سر جھکائے ماں بی، آپا
اور کامل کے متعلق پوچھتی رہتی تھی۔ جانے کیا چیز اسے اس قدر پریشان کر رہی تھی کہ اس کی گلابی رنگت
میں زردیاں سی گھل گئی تھیں۔

شاید وہ زینب عثمان کی وجہ سے پریشان تھی۔
ان دنوں زینب عثمان اور غضنفر ملک کے متعلق جو کچھ چھپ رہا تھا، وہ یقیناً اس جیسی حساس لڑکی کے
لیے تکلیف دہ ہوگا۔ انہوں نے خود ہی انداز لگایا تھا۔ وہ خود یہ سب پڑھ کر ڈسٹرب ہو جاتے تھے حالانکہ
ان کا کیا رشتہ تھا زینب عثمان سے۔ وہ مریم کی ماں تھیں اور عثمان احمد کی بیوی۔ بس اتنا سہاوی تو تعلق تھا لیکن
غضنفر ملک اور زینب عثمان کی شادی کی خبریں انہیں بھی بے حد ڈسٹرب کر دیتی تھیں اور وہ۔ وہ تو ایک
حساس لڑکی تھی اور زینب عثمان اس کی ماں تھیں۔
اور عثمان احمد نے بھی بتایا تھا کہ وہ اپنی ماما کی وجہ سے ڈسٹرب رہتی ہے۔
کاش! اے کاش ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس کی آنکھ کا ایک ایک آنسو پی لیتے لیکن..... یہ کیسی
مجبوریاں تھیں۔

وہ شدید چاہت کے باوجود کسی بھی جذبے کا اظہار نہیں کر سکتے۔
اب کے زینب عثمان آئیں تو وہ خود ان سے بات کریں گے۔ ان سے کہیں گے کہ کسی مناسب لمحے
میں مریم کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دیں اور پھر انہیں بھی اس اذیت سے نجات دلائیں۔
وہ انتظار کرتے کرتے تھکنے سے لگے تھے۔ میڈم زمرس نے امید کے جو دیے ان کے ہاتھ میں تھمائے
تھے، وہ کبھی بجھنے لگتے اور کبھی ایک دم لووے اٹھتے۔ پتا نہیں کیوں انہیں لگتا تھا جیسے زینب عثمان انہیں منزل
کی جھلک دکھا کر منزل سے محروم کر دیں گی۔ اتنی ہی سفاک لگتی تھیں وہ انہیں پھر بھی ایک ننھا سا دیا ان کے
اندراج رہا تھا جو انہیں مایوس نہیں ہونے دیتا تھا۔
• ماں جی اگرچہ کامل کی وجہ سے بہت بے چین رہتی تھیں۔ کسی پل چین نہیں آتا تھا انہیں۔ راتوں کو
کامل کو پکارتی اپنے کمرے سے باہر آ جاتی تھیں۔
جانے اسے نیند بھی آئی ہوگئی یا نہیں۔
جانے کسی نے اسے کھانا بھی دیا ہوگا۔

وہ یہ خیال کر کے رو پڑتیں اور روتے روتے صبح کر دیتیں پھر بھی انہوں نے اس بار بھی تاکید کی تھی۔
”مریم کی ماما آجائیں کراچی سے تو انہیں فوراً خبر کریں۔“ اور پھر شاید انہیں عادل پر یقین نہیں آیا تھا

تجسسی حیدر ”منظر منظر دھوپ“ میں سے شاید کوئی نظم پڑھ رہے تھے۔

اور جانے وہ چندراتیں کب آئیں گی اور یہ انتظار کب ختم ہوگا..... ہوگا بھی یا نہیں؟
ایک ایک دل پر چھا جانے والا اضطراب اور بے چینی اتنی بڑی کہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔

”خیریت عادل خان! آپ جا رہے ہیں؟“

”ہاں مجھے کچھ کام تھا۔“

انہوں نے پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

”کچھ دیر رک جاتے تو..... میں سوچ رہی تھی فنکشن سے فارغ ہو کر آپ سے بات ہوگی۔“

”پھر کبھی سہی۔“ انہوں نے معذرت کی۔

”کسی دن گھر آجائیے نا آپ دونوں۔“

”میں سوچ رہی تھی لیکن بس وہ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیا ہوا تھا؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ آمنہ مافی نے بے پروائی سے کندھے اچکائے ”ان کی سب سے بڑی بیماری تو

میں ہوں اور میرے پاس اس بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

”دراصل اماں کو میرے خیال میں ہارٹ کی تکلیف ہے۔“

تصدق احمد نے خیال ظاہر کیا اور پھر آمنہ کی طرف مڑا۔

”تم نے کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھایا؟“

”نہیں بس اپنے محلے میں حکیم احمد خان ہیں ان سے دوائی لے لی تھی۔“

”آمنہ! آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے تھا۔“

پروفیسر عادل نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

”مسرور تو آتے ہوں گے؟“

”ہاں میرے پاس ہی ہے۔ میں سوچ رہی تھی مسرور کے اسکول میں شاید میرے لیے کوئی جاب ہو؟“

وقت بھی کتنا بڑا جادو گر ہے۔

پروفیسر عادل نے تاسف سے اسے دیکھا۔

کل کی مشہور کالم نگار اب اسکول میں جاب کرنا چاہتی تھی۔

”آپ دوبارہ اخبار جوائن کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”اماں کو پسند نہیں ہے..... اور میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں اماں کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتی۔“

اس نے سر جھکا لیا۔

”اوکے اس پر پھر بات کریں گے۔“

پروفیسر عادل نے محسوس کیا تھا کہ پچھلی نشستوں والے ڈسٹرب ہو رہے تھے اور پھر خود ان کے دل نے سینے کے اندر اودھم مچایا ہوا تھا..... وہ اتنے سارے دن زنب و لائیں گئے تھے تو خود کو سنبھالنے ہوئے تھے اور جو یکدم مریم کا خیال آیا تھا تو جی چاہ رہا تھا کہ لمحوں میں اڑ کر زنب و لائیں جائیں اور پھر واقعی بے فوری کی سی کیفیت میں انہوں نے اتنی فاسٹ ڈرائیونگ کی تھی کہ انہیں لگا تھا جیسے زنب و لائیں آنے میں نہیں لمبے ہی لگے ہوں۔

لیونگ روم میں وہ کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ اس طرح کہ اس نے اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے کارپٹ کو دیکھ رہی تھی اتنے دھیان سے کہ اسے عادل کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی مگر وہ اندرونی گیٹ کھولا تھا اور اندر داخل ہوتے ہی ان کی نظر اس پر پڑی تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے قریب آ کھڑے ہوئے اور بہت آہستگی سے اسے پکارا۔

”مریم!“

”آپ..... عادل بھائی.....؟“

مریم نے چونک کر سر اٹھایا تو پروفیسر عادل نے محسوس کیا کہ اس کی ہلکی سی ہنسی ہوئی تھیں اور پوٹے سوجے ہوئے تھے جیسے روٹی رہی ہو۔ ان کا دل ان کے سینے کے اندر تڑپ کر رہ گیا۔

”مریم! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

وہ بولے تو ان کے لہجے سے ان کی بے چینی عیاں ہو رہی تھی۔

”ہاں۔ آپ بیٹھے نا پلیز!“

وہ کھڑی ہوئی تو اس کی گود سے ایک ہفت روزہ میگزین نیچے گر پڑا جسے اس نے اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا مریم!“

بیٹھے ہوئے اسی اضطراب سے انہوں نے پھر پوچھا۔

”جی بالکل اچھی ہوں۔ کامی کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں..... مگر آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“

”آپ کا وہم ہے۔“

وہ مسکرائی اور اس نے ہلکی سی جھپک کر آنکھوں میں آئے آنسو پینے کی کوشش کی۔

”مریم! آپ کو کوئی نڈ کوئی پریشانی ہے تو..... کیا آپ اسے میرے ساتھ شہر نہیں کر سکتیں..... میں.....“

”کچھ بھی تو نہیں ہے عادل بھائی!“

اب اس کے لہجے میں اعتقاد تھا۔

”وہ مانہیں ہیں تاہیں اس لیے کبھی کبھی دل اداس ہو جاتا ہے۔“

وہ شاید تانا نہیں جانتی اپنے مسائل اس سے شیئر نہیں کرنا چاہتی اور اسے کیا پتا کہ وہ بل بل میرے ساتھ ہوتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاتے۔

خیال میں خواب، خلوت میں جلوت میں، شب و روز۔

میرا لہوا ہنی گردشوں میں اسی کی تسبیح پڑھ رہا ہے۔

جو میری چاہت سے بے خبر ہے۔

ان کے چہرے پر غبار سا چھا گیا لیکن انہوں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ٹیبل پر پڑے میگزین پر جمادیں اور یونی میگزین کی طرف دیکھتے دیکھتے پوچھا۔

”اور باقی سب کہاں ہیں؟ عاشری، نینا اور مور۔“

”نینا اور مور تو واپس ہاسٹل چلے گئے اور عاشری ٹی وی اسٹیشن گئی ہے۔“

”ٹی وی اسٹیشن!“ انہوں نے دہرایا۔

”جی!“

”کیوں؟“

”وہ..... اس نے آڈیشن دیا تھا نا۔ وہ کام کرنا چاہتی ہے ڈراموں میں اور.....“

اس کے حلق میں پھندا سا لگ گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

وہ بے چین ہو کر یکدم اٹھے اور اس کے قریب چلے آئے۔

”مریم!“

انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”مریم! فارغا ڈسک! اس طرح مت روئیں۔“

لیکن وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی رہی۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اسے خاموش کرائیں۔ اس کے آنسو ان کے دل پر گر رہے تھے اور وہ اندر سے تمام بھگتے جا رہے تھے۔

”مریم..... مریم پلیز!“

بے اختیار انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے ہاتھوں نے اس کے ہاتھ کو چھوا اور پھر یکدم انہوں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ کہیں وہ بدگمان نہ ہو جائے..... کہیں!

”مریم خدا کے لیے..... خدا کے لیے حوصلہ کریں۔ میں ہوں نا..... مجھ سے کہیں مجھے بتائیں..... میں عاشری سے بات کروں گا، سمجھاؤں گا اسے..... لیکن پلیز! اس طرح اپنے ساتھ قلم مت کریں۔“

مریم نے آہستگی سے ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے۔

اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے اور آنسو کا ایک منسا قطرہ اوپر والے ہونٹ کے پاس اٹکا ہوا تھا اور کچھ آنسو پلوں کے کنارے پراگھے ہوئے تھے۔ بے اختیار ان کا جی چاہا کہ وہ ان موتیوں کو اپنے ہونٹوں سے چن لیں لیکن وہ ضبط کیے کھڑے رہے۔ مریم نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”SORRY عادل بھائی!“

”ہاں اب بتائیے ساری بات۔ کیا مسئلہ ہے؟“

اور اس نے ہولے ہولے ساری بات بتادی۔ شرجیل مرزا کی کمینگی اور عاشری کی ضد۔

”عاشری کو بالکل شوق نہیں تھا ٹی وی پر جانے اور ماڈلنگ کرنے کا۔ یہ سب شرجیل مرزا کی شرارت ہے۔ اسی نے اکسا یا ہے عاشری کو..... وہ اچھا آدمی نہیں ہے عادل بھائی۔ آپ..... آپ سمجھائیں عاشری کو..... مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ وہ بھی ماما کی طرح شو بیز میں جائے..... اور معید بھائی کو بھی پسند نہیں ہے لیکن وہ کہتے نہیں ہیں۔ انہیں عاشری کے احساسات کا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ عاشری کی خوشی کی خاطر اسے کبھی منع نہیں کریں گے لیکن مجھے پتا ہے ان کے خواب بالکل مختلف ہیں عاشری کے خوابوں سے بالکل مختلف..... اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ بھی پاپا کی طرح عاشری کے خوابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک دن تھک نہ جائیں۔“

وہ بہت دھیان سے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ بولتے ہوئے بات کرتے ہوئے کتنی دلکش لگ رہی تھی۔ اس کا لہجہ ان کی سماعتوں میں رس مگول رہا تھا اور لفظ دل میں اترے جا رہے تھے۔ اس طرح اتنی دیر تک تو اس نے ان سے کبھی بات نہیں کی تھی۔

”مریم.....!“

اس نے بات ختم کی انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ان کے لہجے میں از حد نرمی اور گداز تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں بالکل بھی..... میں عاشری کو سمجھاؤں گا اور آپ آئندہ بالکل نہیں روئیں گی، ٹھیک ہے نا؟ اور آپ کو بہت پہلے مجھے بتانا چاہیے تھا جب عاشری نے ماڈلنگ کے لیے خدا کی قسم تب ہی..... پاپا نہیں ہیں لیکن میں تو ہوں نا..... پاپا کی جگہ سب کا خیال رکھنے کے لیے..... اور سب کی حفاظت کے لیے۔“

مریم کے چہرے پر ایک دم سکون اتر آیا اور اس نے مسکرا کر عادل کی طرف دیکھا۔

”تھیک یو عادل بھائی! آپ کے لیے جانے منگواؤں یا ٹھنڈا؟“

”چائے۔“

انہوں نے بے تکلفی سے کہا۔

”آج کا دن کتنا اچھا ہے۔“

انہوں نے بے حد طمانیت محسوس کرتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا۔

”آپ کی ماما کب تک آئیں گی؟“

”فی الحال تو کچھ پتا نہیں، انہوں نے بتایا ہی نہیں۔“

تب ہی بیل ہوئی اور بیرونی گیٹ کی آواز آئی۔ صفو نے آکر اندرونی گیٹ کھولا۔ عاشی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”ارے عادل بھائی، آپ.....؟“

پروفیسر عادل کو دیکھ کر وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔

”ہاں، کیسی ہو عاشی؟“

انہوں نے کھڑے ہو کر حسب معمول اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مریم کو کتنا اچھا لگتا تھا، کتنی اپنائیت اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا جب وہ عاشی اور نینا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے سر پر پیار کرتے تھے اور اس کا جی چاہتا تھا وہ اس کے ساتھ بھی اتنے ہی شفیق اور اتنے ہی مہربان ہوں لیکن شاید عاشی اور نینا چھوٹی ہیں اور وہ بڑی۔

”کہاں تھیں آپ؟“

”عادل بھائی، میں انکل جی کے ساتھ ٹی وی اسٹیشن گئی تھی..... اور پتا ہے عادل بھائی، انہوں نے مجھے سلیکٹ کر لیا۔“

وہ بے حد ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔

”پتا ہے بھو.....“ وہ مریم کی طرف مڑی۔

”بہت زبردست سیریل ہے اور وہ جو انکل ملک تھے انہوں نے مجھے ممبر رول دیا ہے..... اور یہ سب انکل جی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ اتنی سینئر لڑکیاں تھیں لیکن انہوں نے انکل جی کے کہنے پر رسک لے لیا۔“

بات کرتے کرتے اس کی نظر مریم کے چہرے پر پڑی۔

”آپ رور ہی تھیں بھو..... خیریت.....؟“

پھر اس نے مڑ کر بیل پر رکھے میگزین کو دیکھا۔

”اوہ..... تو آپ نے یہ میگزین پڑھا ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ جو کچھ ان فلمی پرچوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے سب سچ ہوتا ہے۔ انکل جی کہہ رہے تھے سب جھوٹ ہوتا ہے سسپنس پیدا کرنے کے لیے..... اور اپنی سبیل بڑھانے کے لیے۔ اب جو یہ انہوں نے ماما اور غنفر ملک کی شادی کی خبر چھاپی ہے تو کیا سچ ہے یا خیر..... بالکل نہیں، کیوں عادل بھائی؟“

وہ عادل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا ماما غنفر ملک سے شادی کر سکتی ہیں، نہیں کبھی نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... ماما کبھی بھی غنفر ملک سے شادی نہیں کر سکتیں۔ بس وہ ان کے ساتھ کام کر رہی ہیں تو ان صحافیوں کو کہانیاں بنانے کا موقع مل گیا ہے۔“

اس کے لہجے میں اتنا یقین، اتنا اعتماد تھا کہ مریم کو یقین ہو گیا کہ یہ خبر کسی صورت سچ نہیں ہو سکتی۔

”ہم کوئی خفیہ سچے تو نہیں ہیں نا، جو کہ ماما اتنا بڑا فیصلہ کر لیں اور ہم سے ذکر تک نہ کریں۔ ناممکن ہے کہ ماما غنفر ملک کی عمر کے کسی شخص سے شادی کریں۔“

اس نے مریم کو سمجھایا۔

عاشی کی باتوں نے مریم کے لرزتے دل کو سہارا سا دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ عادل کے آنے سے پہلے ماما اور غنفر ملک کی شادی کا ہی پڑھ کر روئی تھی۔

”ماما نے شادی کر لی ہے۔“

اس کا دل ڈوب سا گیا تھا اور اس نے بے وقوفوں کی طرح سوچا تھا کہ پھر ان سب کا کیا ہوگا..... اس کا عاشی نینا اور مور کا.....؟ ماما تو پہلے ہی فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے ان سے دور ہو گئی تھیں اور اب تو اور بھی دور چلی جائیں گی..... اور ماما سچ کہتی تھیں کہ میں فضول میں جھوٹی چھوٹی باتوں کو خود پر مسلط کر کے اپنے لیے PROBLEMS CREAT کرتی ہوں..... عاشی نے اس خبر کی پروا ہی نہیں کی تھی..... اسے ماما پر پورا یقین تھا جبکہ اس کا یقین پختہ نہیں تھا..... کسی پر بھی اس کا یقین پختہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ ہر ایک کے لیے خوف زدہ رہتی تھی جبکہ شہر یار نے کتنی بار اس سے کہا تھا۔

”محبت یقین کا دوسرا نام ہے مومو..... مجھ پر اپنا یقین پختہ رکھنا..... اگر تم بے یقین ہوئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو.....“ اور وہ بار بار بے یقین ہو جاتی تھی حالانکہ وہ سب سے بے حد اور شدید محبت کرتی تھی..... لیکن بچپن سے ہی وہ سب کی محبتوں پر بے یقین ہوتی آئی تھی۔“

ماما کی محبتوں پر..... پاپا کی شفقتوں پر..... کہیں بھی اس کا یقین ٹھہرنا نہیں تھا۔

”مریم، عاشی سچ کہہ رہی ہے۔ یہ اس طرح کے پرچوں میں محض ان کا پیٹ بھرنے کے لیے ایسی خبریں چھاپ دی جاتی ہیں۔ سو آپ اب جائیں منہ ہاتھ دھوئیں اور ہمیں اچھی سی چائے پلوائیں۔“

وہ ایک دم ریلیکس ہو گئے تھے۔

”اور عاشی! آپ ادھر آئیں یہاں بیٹھیں۔ مجھے آپ سے بہت باتیں کرنا ہیں۔“

مریم اٹھ کر چلی گئی تو وہ عاشی کی طرف متوجہ ہو گئے اور بڑے رساں سے انہوں نے اسے سمجھایا کہ انہیں اس کا شو بزم میں جانا قطعی پسند نہیں ہے۔

”دیکھو عاشی!“

ان کے لہجے میں خود بخود جتنی آگئی تھی۔

”آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ آپ عثمان احمد کی بیٹی ہیں اور ہمارے خاندان کی لڑکیاں شوہر میں نہیں جاتیں۔ نہ ہی ہماری غیرت یہ گوارا کرتی ہے۔ پاپائیں رہے آپ کے تو میں تو ہوں۔ اس خاندان کی عزت و آبرو کا رکھوالا۔ چچا عبدالرحمن اور مانی اور امیران کو پتا چلا تو کیا سوچیں گے وہ۔“

”لیکن عادل بھائی وہ ماما بھی تو.....“

”وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں لیکن تم یہ مت بھولو عاشی کہ میں ہوں تمہارا بھائی، جو تمہیں غلط راستوں پر چلنے سے روکے کا حق رکھتا ہوں۔“

”عادل بھائی.....“

عاشی کی ساری شوخی و شرارت ختم ہو گئی۔

”لیکن عادل بھائی، میں نے پراس کر لیا ہے اور پھر مجھے بہت شوق ہے ایکٹنگ کرنے کا اور پھر کسی کو کیا پتا کہ میں کون ہوں؟ کس کی بیٹی ہوں؟ بس ایک سیریل کرنے دیں عادل بھائی! پھر نہیں کروں گی کسی بھی ڈرامے میں۔“

عادل سوچ میں پڑ گئے تھے۔ ان کی اپنی کوئی سگی بہن نہ تھی اور وہ عاشی اور نینا کے لاڈ اس طرح اٹھاتے تھے جسے وہ ان کی سگی بہنیں ہوں۔ انہوں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ان کی اپنی سگی بہنیں نہیں ہیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ عاشی اور نینا کی کسی خواہش کو رد نہ کریں۔

”آپ کیا سوچنے لگے عادل بھائی مجھے ہر صورت اس سیریل میں کام کرنا ہے۔“

اس کے لہجے میں ضد تھی اور آنکھوں میں اپنی بات پر قائم رہنے کا اٹل ارادہ۔ یعنی عادل نے اگر اجازت نہ دی تب بھی وہ نہیں رکے گی اور اس مقام پر جبر بے معنی ہو جائے گا بلکہ زیادہ الجھاوے پیدا کرتا۔ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ایک سیریل میں کام کرنے کے بعد دوسری سیریل میں کام کرنے کی ضد نہیں کروں گی۔“

”بالکل بھی ضد نہیں کروں گی! پکارا مس!“

اس کی آنکھوں میں پھر وہی معصوم سی چمک لوٹ آئی تھی اور چہرے پر مان رہ جانے سے رنگ دڑنے لگے تھے۔

”اوکے! پھر اپنا پراس یاد رکھنا اور ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تم کس کی بیٹی اور کس کی پوتی ہو۔“

انہوں نے پہلی بار بے تکلفی سے اسے تم کہہ کر بلایا۔

”اور دیکھو..... ٹی وی اسٹیشن پر اکیلی مت جانا کسی کو ساتھ لے کر جایا کرو۔“

”جی!“

اس کی آنکھیں یوں دکنے لگی تھیں جیسے کسی نے ان میں ستارے کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہوں۔

”ایک بات اور..... یہ سیریل ختم ہوتے ہی تم اپنی پڑھائی شروع کرو گی..... اور تمہیں کالج میں داخلہ لینا ہے۔“

”لیکن ابھی تو داغے نہیں ہو رہے ہیں۔“

”اس بات کی تم فکر مت کرو۔ تمہارے فارغ ہونے تک بی اے کے داغے شروع ہو جائیں گے۔“

”رائے!“

اس نے سر ہلا دیا۔

دراصل غلطی نذیب عثمان کی ہے جنہوں نے ان لمحوں میں انہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ اس عمر میں بچوں کو ماں کی اتنی شدید ضرورت ہوتی ہے ان کی رہنمائی اور محبت و شفقت کی لیکن نذیب عثمان کی اپنی ایکٹی ویٹر ہیں اور بچے نظر انداز ہو رہے ہیں اس کا کوئی بہت اچھاری ایکشن نہیں ہو رہا بچوں پر..... نینا چپ رہتی ہے لیکن تیمور..... کس قدر ری ایکٹ کرتا ہے اور کتنا مختار ہوتا ہے نذیب عثمان سے۔

چائے آگئی تھی..... عاشی پیچھے کرنے چلی گئی تو وہ مریم کو عاشی سے ہونے والی گفتگو بتا کر کھر چلے آئے۔ مریم کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے بعد پہلی بار آج ان کا دل قدرے پرسکون تھا۔ مریم کو دیکھنے کے بعد سے لے کر اب تک واقعات اتنی تیزی سے رونما ہوئے تھے کہ ان کے دل کو کہیں چین نہیں ملا تھا۔

عثمان احمد سے اچانک ملاقات ان کی وفات مریم کے متعلق انکشاف ماں جی کا مریم کے لیے اس کا پروزل دینا نذیب عثمان کا بدلتا رویہ کامی کی گمشدگی آمنہ صفی کی پیشکش..... ان سب واقعات نے ان کے دل کو عجیب طرح سے اپنی گرفت میں لیا تھا کہ وہ مسلسل مضطرب رہنے لگے تھے۔

کبھی اس کے جتنو چمکتے تو پھر مریم کا رویہ لمحوں میں ان جتنوں کو مار دیتا اور وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں بانسنے لگتے تھے لیکن آج مریم نے ان پر اعتبار کر کے اپنی پریشانی ان کے ساتھ شیئر کر کے انہیں یکدم معتبر کر دیا تھا۔ وہ خود اپنی نظروں میں بلند ہو گئے تھے۔ وہ اس انجانی بدگمانی کے سائے جو کبھی کبھی مریم کی آنکھوں میں ڈولنے لگتے تھے انہیں اب دور ہے تھے اور کتنی ہی بار ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر مریم سے سب کچھ کہیں۔

”نذیب ولا“ سے نکل کر انہوں نے غیر ارادی طور پر گاڑی کا رخ میڈم زگس کے گھر کی طرف موڑ دیا۔



”تو ساری بات یہ ہے کہ عادل بھائی کے خیال میں پھرے ہوئے طوفانوں کے آگے بند باندھنا

محض حماقت ہے۔“

مریم نے ریموٹ سے ٹی وی آف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمعید کی طرف دیکھا۔
”اور یہ کہ انہوں نے اس کی آنکھوں میں بغاوت کو ابھرتے دیکھا تھا۔ وہ ان کے کہنے پر نہ رکتی
اور اس طرح وہ اکیلی ہو جاتی اور ہم نقصان میں رہتے۔“

”ہوں۔“

ڈاکٹر عبدالمعید ٹی وی کی خالی اسکرین پر نظر جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے؟

”اب تو اس نے وعدہ کیا ہے کہ یہ اس کی پہلی اور آخری سیریل ہوگی۔“

مریم نے عبدالمعید سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

”ہاں خدا کرے ایسا ہی ہو مریم! مگر پتا نہیں کیوں مجھے خوف آتا ہے۔ جیسے شو بیز کا یہ طوفان اسے بھی
اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا اور میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔۔۔۔۔“

”نہیں! ایسا نہیں ہوگا معید بھائی!“

مریم نے ان کی بات کاٹ دی۔

”عادل بھائی کہتے ہیں کہ جو لکڑی جھک نہیں سکتی وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اسے اگر وہ مجبور کرتے تو زیادہ
نقصان کا اندیشہ تھا۔ وہ بہت ضدی ہو چکی ہے۔ آپ نہیں جانتے اسے۔ وہ ایسی نہیں تھی لیکن بابا کی موت
اور ماما کی دوری نے اسے ایسا کر دیا ہے۔ اس پر شرجیل مرزا نے اکسایا ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر عبدالمعید ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں مریم!۔۔۔۔۔ عادل صاحب کا خیال صحیح ہے کہ اسے محبت اور پیار سے ہی
کیا جاسکتا ہے۔“

”اگر اس نے عادل بھائی سے وعدہ کر لیا ہے تو یقین رکھیے معید بھائی وہ اپنے وعدے سے
پھرے گی۔“

”مجھے یقین ہے۔“

انہوں نے ریموٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”آپ نے بند کیوں کر دیا تھا؟“

”یوں ہی۔ مجھے عاشری کو اسکرین پر دیکھنے کا قطعی شوق نہیں ہے۔ میں تو اس لیے دیکھ رہی تھی
کیا اخبار والے سچ کہتے ہیں۔“

”ہاں! اخبار والے سچ کہتے ہیں۔“

انہوں نے ٹی وی آن کر دیا۔ مریم نے وی سی آر پر اس کے ڈرامے کی قسط لگا رکھی تھی جسے عاشری نے
ریکارڈ کر لیا تھا۔

”اسے اداکاری نہیں آتی۔ وہ اداکاری کر ہی نہیں سکتی۔ مجھے یقین ہے۔“

اسکرین پر عاشری نظر آرہی تھی۔ گلاب کی کیار یوں کے پاس کھڑی ہوئی جھک کر پھول توڑتی ہوئی وہ
کوئی شہزادی لگ رہی تھی۔ بے انتہا خوب صورت اور حسین۔ عام دنوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ خوب
صورت۔ بلاشبہ اس کی اسکرین بیوٹی غضب کی تھی لیکن جیسا کہ اخبار میں تبصرہ کیا گیا تھا اس کی اداکاری
میں بالکل جان نہ تھی۔۔۔۔۔ اور یہ کہ اس کے بے تحاشا حسن کی وجہ سے سیریل چل جائے تو پھل جائے ورنہ
اس کی اداکاری میں کچھ نہ تھا۔ ممکن ہے آگے چل کر اس کی اداکاری بہتر ہو جائے لیکن پہلی دو تین اقساط
میں تو اس کی اداکاری نے کوئی تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ ہاں اس کے حسن کے چرچے تھے۔

مریم نے عبدالمعید کی طرف دیکھا۔

”آپ آج اسپتال نہیں جائیں گے کیا؟“

”نہیں رات ڈیڈی کی طبیعت خراب تھی جاگتا رہا۔ اس وقت سر بھاری ہو رہا ہے کچھ دیر سے
جاؤں گا۔ انکل تو سویرے چلے گئے تھے۔“

”آپ نے رات کو بتایا ہی نہیں۔ اکیلے پریشان ہوتے رہے۔“

”آپ کی نیند کیا خراب کرنا تھی۔ انکل گھر پر ہی تھے۔“

”اب کسی طبیعت ہے؟“

”اب تو کافی بہتر چل کر رہے ہیں۔ میں کچھ دیر کے لیے ہی اسپتال جاؤں گا آپ ذرا دیکھ لیجیے گا انہیں۔“

”ضرور۔۔۔۔۔ آپ ناشتا کریں گے؟“

”نہیں چائے پی لی تھی صبح۔“

”تو پھر میں ناشتا بخواتی ہوں۔ عاشری تو سو رہی ہے ابھی۔۔۔۔۔ رات کو کچھ دیر سے آئی تھی تھکی ہوئی ہے۔“

”میں ناشتا اور پر ہی کروں گا ڈیڈی کے ساتھ اور یوں بھی ابھی میرا موڈ نہیں ہو رہا۔“

”پھر چائے خواؤں؟“

”نہیں مریم! پلینز کچھ نہیں۔ بیٹھیں۔ میں یونی چلا آیا انکل اسپتال چلے گئے تو میرا دل گھبرانے لگا۔
کنک میں نے آپ کو آکر ڈسٹرب تو نہیں کیا مریم!“

”کمال کرتے ہیں معید بھائی! اب آپ غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں بھلا کیوں ڈسٹرب
ہوں گی۔۔۔۔۔ اور مجھے کیا کرنا ہوتا ہے اتنی سویرے اٹھ جاتی ہوں اور پھر پور ہوتی رہتی ہوں۔“

اسانے ناراض نظروں سے ڈاکٹر عبدالمعید کو دیکھا۔

”بابا اور ماں جی کیسے ہیں عینی۔“

”اچھے ہیں اور تمہیں یاد کر رہے تھے کسی دن آؤ نا۔ تم نے تو بالکل آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”مجھے یاد کر رہے تھے۔“ اس نے دل گرفتگی سے سوچا ”اور کس قدر تضاد ہے کہ وہ مجھے یاد کرتے ہیں

مجھے محبت کرتے ہیں اور مجھے اپنے خاندان میں شامل نہیں کر سکتے۔“

”کیا سوچنے لگی ہو مومو، کب آؤ گی؟“

”دیکھو گی کسی دن آؤ گی تو۔“

”سنو موشیری بھائی انگلینڈ جا رہے ہیں۔ مزید تعلیم کے لیے۔ پرسوں صبح چار بجے کی فلائٹ ہے ان کی۔“

اس کا دل سینے کے اندر تپتی زور سے دھڑکا جیسے ابھی سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ

ریسور ہاتھوں میں تھامے خاموش کھڑی تھی۔

”لوشیری بھائی سے بات کرو۔“ ایریس میں عینی کی آواز گونجی تو وہ چوگی۔

”مریم..... مریم کیسی ہو؟“ شہر یار کی آواز ایریس میں ابھری اور اس کی آواز سنتے ہی جیسے اندر کہیں

برف پگھلنے لگی۔

”اچھی ہوں۔“ اس نے یہ مشکل تمام کہا۔

”وہ تو ہو ہی۔“ شہر یار نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

”مریم۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا ”میں جا رہا ہوں لیکن تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا۔ میرا انتظار

کرنا..... اور اگر انتظار کرتے کرتے تھک جاؤ تو مجھے آواز دینے میں بہت دیر مت لگانا۔ میں جہاں کہیں

جی ہوا ساری زنجیریں توڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

وہ خاموش رہی اندر بہتے دریا آنکھوں کے کنارے تک آ گئے تھے۔

”جانے سے پہلے ایک نظر تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مل سکتی ہو صرف چند لمحوں کے لیے

کہیں بھی۔ جہاں تم کہو آ جاؤں۔“

”نہیں۔“ اس نے بے اختیار کہا۔

”اچھا۔“ وہ از حد آرزو ہو گیا ”گھر بھی نہیں آؤ گی؟“

”نہیں۔“

”خفا ہو سب سے؟“

”نہیں۔“

”اپنا خیال رکھنا ہمیشہ بہت زیادہ۔“

”اور آپ بھی اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔“ اس کی آواز بھر گئی۔

”سوری مریم! پتا نہیں کیوں میں آج بہت ڈسٹرب ہو رہا ہوں..... ڈیڈی نے اپنی ساری زندگی

میرے لیے وقف کر دی اور میں انہیں ذرا سی خوشی بھی نہیں دے سکا۔ بعض اوقات ہم انسان قدرت کے

ہاتھوں ہونے والے فیصلوں کے سامنے کتنے بے بس ہوتے ہیں کہ کچھ بھی ہمارے اختیار میں نہیں رہتا۔

میں ڈیڈی کو خوشی دینا چاہتا ہوں لیکن میرے اختیار میں نہیں رات وہ بہت افسردہ ہو رہے تھے۔“

”معید بھائی جب ماما آئیں گی تو آپ انگل ہادی سے کہیں کہ وہ ان سے بات کریں عاشری کے لیے۔“

”کیا مسز عثمان آنے والی ہیں۔ ان کا فون آیا تھا؟“

”ہاں! ماما کا فون آیا تھا اس روز جب عاشری کے ڈرامے کی قسط آئی تھی۔“

”کیا کہہ رہی تھیں..... ناراض ہوئی تھیں؟“

”نہیں! بس پوچھا تھا کہ اسے کیسے اس سیریل میں کام ملا اور یہ کہ وہ پیاری لگ رہی تھی اور اداکاری

کے لیے اسے مزید محنت کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔“

”اور آنے کے متعلق کچھ کہا تھا؟“

”ہاں کہہ رہی تھیں کہ چند روز میں آئیں گی اور اب اس بات کو بھی دو ہفتوں سے زیادہ ہو گئے ہیں۔“

”ان کا فون نمبر تو ہو گا آپ کے پاس؟“

”نہیں! انہوں نے کہا تھا کہ کبھی ایمر جنسی ہو جائے تو آنٹی زمرس کو بتائیں وہ ان سے رابطہ کر لیں

ورنہ وہ خود ہی کر لیتی ہیں فون۔“

”اب جب ان کا فون آئے گا پلیز ان سے کوئی کنٹیکٹ نمبر لے لیتا کہ انگل ہادی بات کریں گے

”جی ضرور۔“

”میں تو مریم! ایک عرصہ انتظار کر سکتا ہوں لیکن ڈیڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آپ جانتی تو ہونا۔“

”جی معید بھائی مجھے یقین ہے انگل ہادی ماما کو منالیں گے۔“

جب ہی فون کی بیل بج اٹھی۔ مریم نے ٹی آف کرتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عینی تھی۔

”ارے عینی تم۔“

”ہاں میں۔“ عینی نے خشکی سے کہا ”کہاں کم ہو تم فون کرو تو پتا چلتا ہے محترمہ آرام کرنا۔“

”سورہی ہیں یا گھر نہیں ہیں۔“

”اتفاق ہے عینی ورنہ میں تو گھر ہی ہوں۔“

”اچھا مریم۔“ ڈاکٹر عبد المعید کھڑے ہو گئے۔

”آپ بیٹھے نا، پلیز معید بھائی۔ میری دوست کا فون ہے۔“

”آپ بیٹھے نا، پلیز معید بھائی۔ میری دوست کا فون ہے۔“

وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس سے خفا یا ناراض نہیں ہے اور اگر راستے الگ بھی ہو گئے تو یہ مقدر کے کھیل ہیں..... اور قسمت کی بات ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور ان کے درمیان ایک طویل خاموشی کا وقفہ حائل ہو گیا۔

”یعنی کہاں ہے؟“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔
 ”وہ تو اسی وقت باہر چلی گئی تھی۔ میرا انتظار ضرور کرنا مریم..... اپنی آخری حدوں تک اور اس بات کا یقین رکھنا کہ میری زندگی میں تمہارے علاوہ کسی اور کی گنجائش نہیں ہے..... تم ہو تو میں ہوں، تم نہیں ہوگی تو میں بھی نہیں ہوں گا بس۔“

اس نے یک دم ریسیور رکھ دیا اور وہ کتنی دیر تک ریسیور ہاتھوں میں تھامے کھڑی رہی۔
 ”اور کیا ہے اگر جانے سے پہلے ایک نظر اسے دیکھ لے کیا خبر پھر کبھی وہ اسے نہ دیکھ سکے۔“
 وہ ریسیور کرڈیل پر ڈال کر وہیں قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی اور شہریار سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی ایک ایک بات اس کے قصور میں آنے لگی۔
 اور لالہ کہتی تھی۔

ڈاکٹر شہریار اپنی محبتوں میں سچا ہوگا۔
 اور وہ اپنی محبتوں میں بہت سچا ہونے کے باوجود بہت ساری محبتوں کے سامنے ہار رہا تھا۔
 اور ممکن ہے کسی دن وہ مکمل طور پر ہار جائے۔
 اور ڈاکٹر شہریار.....

اس نے لب بچنے ہوئے آنکھوں کو بند کر لیا۔
 ”میں بھی اپنی محبتوں میں اتنی سچی ہوں جتنا کہ وہ اور یہ کہ میری زندگی میں کبھی کسی دوسرے کی کوئی گنجائش نہیں ہے..... ڈاکٹر شہریار نہیں تو کوئی بھی نہیں۔“
 ”موسموٹی بی۔“

اس نے آنکھیں کھولی تو اس کی آنکھوں میں سکون تھا اور مضطرب دل بھی جیسے تھوڑی دیر کو ٹھہر سا گیا تھا۔
 ”جی کیا بات ہے؟“

”وہ جی کل مجھے چھٹی چاہیے تھی۔“

”کیوں؟“

”شادی ہے جی، میری خالہ کی بیٹی کی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

تب.... ہی گیٹ پر بیل ہوئی، پھر گیٹ کھلنے اور گاڑی پورچ میں آنے کی آواز۔

”کون ہے بھلا اتنے سویرے۔“ اس نے صفوی کی طرف دیکھا۔

”انگل ہادی واپس آ گئے ہیں یا پھر..... یا پھر شریل مرزا ہوگا۔“ اس نے ناگواری سے سوچا۔

لیکن عاشی تو کہہ رہی تھی کہ آج اسے کہیں نہیں جانا اور وہ مکمل ریست کرے گی۔ بہت سارا سوئے گی اور شام کو اس کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر جائے گی۔ ایک روز تو وہ عادل کی ہدایت کے مطابق شریف کے یا سلم چاچا کے ساتھ ٹی وی اسٹیشن گئی لیکن پھر وہی شریل مرزا اسے پک اور ڈراپ کرنے لگا تھا اور اس کی خفگی کے خیال سے اس نے عاشی کو کچھ نہیں کہا تھا کیوں کہ وہ اس سے چڑتی تھی۔
 ”میں کوئی بچی نہیں ہوں، بجو اور جانی ہوں، کیا اچھا ہے اور کیا برا..... آپ کو یوں ہی انگل فچی سے چڑ ہوئی ہے۔“

اندر دنی گیٹ کی بیل ہوئی۔

”سنو سفو انگل فچی ہوئے تو انہیں کہہ دینا کہ عاشی سو رہی ہے اور اس نے اٹھانے سے منع کیا ہے۔“
 اس نے ریک سے آج کا اخبار اٹھایا اور پھر ایک دم کھڑی ہو گئی..... آنے والی نینب عثمان تھیں۔
 ”ماما آپ۔“ وہ دوڑ کر کسی چھوٹی بچی کی طرح ان سے لپٹ گئی ”کتنے دنوں بعد آئی ہیں آپ۔ ہم سب آپ کو کتنا مس کر رہے تھے۔“

”اوکے..... اوکے مائی گرل۔“ انہوں نے آہستگی سے اسے الگ کرتے ہوئے اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔

”آپ نے فون بھی نہیں کیا۔ سلم چاچا کو ایئر پورٹ بھیج دیتی۔“
 ”میں نے زمر سے کہہ دیا تھا۔ اس کا ڈرائیور آ گیا تھا ایئر پورٹ پر۔“
 چوکیدار نے اٹھتی کیس اندر رکھا۔

”صفوی سامان کمرے میں رکھو۔“ وہ وہاں ہی لیوٹنگ روم میں بیٹھ گئیں۔
 ”اور موسموٹیہ تم بیمار رہی ہو کیا۔ بہت کمزور لگ رہی ہو اور تھکی تھکی سی۔“
 ”نہیں تو ماما بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔
 ”بہت خوش اور یک لگ رہی تھیں۔“

اس کی ماما ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور باوقار تھیں۔ اس نے اپنے اندر ایک غرور اور فخر سا محسوس کیا۔
 ”نہیں موسموٹیہ تم اپنا خیال نہیں کرتی ہو۔ کس قدر زرد ہو رہی ہو..... اس بار میں ڈاکٹر ہادی سے کہہ کر تمہارا مکمل چیک اپ کرائی ہوں۔“

اور نینب عثمان کی اس توجہ پر اس کا دل پھول کی طرح کھل گیا۔

”اور ماما اپنی مصروفیات کی بنا پر اگر ان کے ساتھ نہیں رہ پارہی ہیں تو یہ ان کی مجبوری ہے ورنہ انہیں

”نہیں نہیں۔“ انہوں نے جیسے اسے تسلی دی ”ابھی تو میں یہاں ہی ہوں کافی دن۔ کم از کم دو ماہ۔“
مریم کو عاشی کے انداز گفتگو پر حیرت ہو رہی تھی۔ شاید وہ بھی ماما کو اس کی طرح بے حد مس کرتی تھی۔
شریف نے خالی گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”ہاشا بناؤں؟“

”ہاں ہاں یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جاؤ ثقافت اچھا سناشتا بنا کر لاؤ پرائٹوں کے ساتھ۔“ عاشی نے
خوشی سے کہا۔

”جار ہا ہوں جی..... عاشی بی بی بھی بن گئیں ہیر و دن۔ ایک بے چارہ شریف رہ گیا ہے۔ اس کو کوئی
نہیں پوچھتا۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

”ماما اسے کوئی چائس دلوا ہی دیں کسی فلم وغیرہ میں۔“ عاشی ہنسی اور اس نے اپنے
دلوں پاؤں اٹھا کر صوفے پر رکھ لیے اور مخصوص انداز میں گھٹنوں کے گرد حائل کرتے ہوئے ان پر ٹھوڑی
رکھے ہوئے نینب عثمان کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں شرارت کے خیال سے کوندا سا لپکا۔
”ماما آپ روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی ہیں۔“ وہ اب بالکل نارمل لگ رہی تھی جیسے ایک دو تلخ
نظارے بول کر اس نے سارے گلے شکوے کو دھو دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ لمحوں میں نارمل ہو جاتی تھی۔ مریم
مکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ماما تو ہیں ہی ہمیشہ سے خوب صورت اور دلکش اور تم بھی ماما کی طرح ہو..... اتنی ہی
خوبصورت اور دلکش۔“

”تھینکس فار دی کممنٹس۔“

عاشی کے ہونٹوں پر ابھی تک شریسی مسکراہٹ تھی۔

”یہ تم دونوں کچھ شر نہیں ہو گئی ہو۔“ نینب عثمان نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”بھئی ہم دونوں بڑی ہو گئی ہیں۔“ عاشی نے نظروں ہی نظروں میں نینب عثمان کا جائزہ
لیا۔ مذاق سے قطع نظر انداز آپ واقعی زیادہ مسلم اور زیادہ خوب صورت ہو گئی ہیں..... تب ہی تو..... اس
سناٹا مکمل چھوڑ دی۔

”تب ہی تو کیا.....“ نینب عثمان کا موڈ اچھا تھا اور مسکراہٹ تھیں۔

”تب ہی تو اخبارات آپ کے اور غنفر ملک کے متعلق ایسی سیدھی باتیں چھاپ دیتے ہیں۔ یہ سوچے
نہیں کہ آپ چار بچوں کی ماں بھی ہیں۔“

نینب عثمان کی رنگت میں لمحہ بھر کے لیے تغیر سا پیدا ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے خود کو نارمل

خیال ہے سب کا۔“
”نہیں تو ماما مجھے کچھ بھی نہیں ہے، بس ایسے ہی آپ نہیں ہوتیں نا تو میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔“
”ماسٹر زکی ڈگری لے کر بھی تم بالکل بچی ہو ابھی تک مومو۔“ انہوں نے شریف کے ہاتھ سے پانی کا
گلاس لیتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا۔ ”مائیں ہمیشہ ساتھ تو نہیں ہوتیں نا اور پھر لڑکیوں کو دوسرے گھر جانا
ہوتا ہے ایک دن۔ اس بار ڈھونڈتے ہیں کسی کو جو تمہارا خیال رکھے۔“ انہوں نے ہلکا مزاح کیا لیکن مریم
کا زرد رنگ یک دم سپید پڑ گیا۔
”نہیں ماما۔“ اس نے بے اختیار کہا ”مجھے شادی نہیں کرنا..... آپ عاشی کی شادی کر دیں! انکل ہاشم
بہت بیمار رہتے ہیں۔“

”کیوں تمہیں شادی کیوں نہیں کرنا؟“ انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تب ہی آنکھیں ملتی ہوئی عاشی اپنے کمرے سے باہر نکلی۔“

”عاشی دیکھو ماما آئیں ہیں۔“ مریم کی آواز میں خوشی کی چمکا تھی۔

عاشی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ اس نے مریم کی طرح بے تابی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا
ان کے قریب آ کر جھکتے ہوئے ان کے رخساروں کو چوما۔
”اوہ کیسی ہو ڈار لنگ؟“ نینب عثمان نے اسے پیار کیا۔ ”اور ناٹی گرل! یہ کیا شوق چرایا ہے تمہ

ایکٹنگ کا۔“

”آپ کی بیٹی ہوں نا۔ کچھ تو درٹے میں ملنا تھا مجھے۔“ وہ ان کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”آپ کی بیٹی ہوں نا۔ کچھ تو درٹے میں ملنا تھا مجھے۔“ وہ ان کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”مگر جانو تمہاری ایکٹنگ بالکل بے جان ہے۔“

”ہوتی رہے۔“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے ”مجھے کون سا ہمیشہ ایکٹنگ کرنا ہے۔“

اور مریم کو اس پر بے حد خوشی ہوئی ”تو اس نے عادل بھائی کی بات مان لی ہے۔“

”آپ سنا کہ آج اچانک کیسے خیال آ گیا یہاں آنے کا۔“

مریم نے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس کیا لیکن ماما خوش دلی سے بولیں۔

”بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ اب کچھ دن اپنے گھر جا کر رہوں۔ بہت باہر رہ لی۔ مور
کیا تھا لیکن پھر بس نہ آسکی۔“

”کیا آپ کی فلمی مصروفیات ختم ہو گئی ہیں؟“ عاشی نے سادگی سے پوچھا۔

”ہاں ہاں..... فلمیں تو میں نے ایک دو سائن کی ہیں لیکن ابھی کسی کی شوٹنگ شروع نہیں
ہو۔ اصل راجہ صاحب طے نہیں کر پائے ہیں کہ وہ کس ملک میں شوٹنگ کریں گے۔“

کر لیا۔

”مثلاً کس طرح کی خبریں۔“

”یہی کہ آپ نے مخمفر ملک سے شادی کر لی ہے۔“

عاشی بڑے آرام سے ہر بات جو اس کے دل میں ہوتی کہہ دیتی تھی جبکہ مریم کے لیے کوئی بھی بات کہنا ہمیشہ بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

”ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا ڈارلنگ۔“ نذیب عثمان سنجیدہ تھیں۔

”کیا؟“ عاشی نے پورا منہ کھول دیا۔ ”کیا مطلب ہے اس بات کا کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ تو ماما میں اس

بات کا ہرگز یقین نہیں کر سکتی، اخبار دالے بھی بے پرکی اڑاتے ہیں۔“

”ہاں لیکن یہ سچ ہے عاشی کہ میں نے مخمفر ملک سے شادی کر لی ہے۔“ نذیب عثمان نے اتنی بڑی

بات بڑی آسانی سے کہہ دی۔

”نہیں۔“ عاشی کی آواز جیسے پھٹ سی گئی تھی ”نہیں۔“ اس نے دوبارہ آہستگی سے کہا ”آپ مذاق

کر رہی ہیں۔“

”یہ مذاق نہیں ہے جانو۔“

”نہیں یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے بے یقینی سے نذیب عثمان کو دیکھا۔ وہ اضطرابی انداز میں

کھڑی ہو گئی اور پھر بیٹھ گئی۔

مریم ساکت بیٹھی تھی۔ یوں جیسے اس کے ارد گرد ساری آوازیں مر گئی ہوں۔ پتا نہیں کتنی دیر اسی

کیفیت میں گزر گئی تھی۔ پھر شاید وہ فون کی بیل تھی جو اسے باہر کی دنیا سے واپس لائی۔ نذیب عثمان اٹھ کر

فون اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھیں اور عاشی یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے پتھر کی ہو گئی ہو۔ وہ ایک ٹک سانے

خالی دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ مریم آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں دھواں بھر رہا تھا لیکن

اسے لگ رہا تھا جیسے عاشی..... عاشی کے ساتھ کچھ انہونی ہو گئی ہے۔ ایک دم کسی انجانے خوف سے اس

کے اندر کچھ بگڑ چکی ہو گئی۔

”عاشی۔“ قریب جا کر اس نے ہولے سے عاشی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

عاشی نے دیوار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

”نہیں..... بچو نہیں ماما یقیناً مذاق کر رہی تھیں۔“

”ماما مذاق ہرگز نہیں کر رہی تھیں۔“ مریم کو اس بات کا اچھی طرح ادراک ہو گیا تھا لیکن پھر بھی

غیر ارادی طور پر اس نے سر ہلا دیا اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”عاشی۔“ اس نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”ماما ایسا نہیں کر سکتیں بچو..... نہیں کر سکتیں تاہم سب کے ہوتے ہوئے۔“ اس کی آنکھوں کی سطح

ایک دم گیلی ہوئی اور پھر مریم کے کندھے پر سر رکھے رونے لگی۔

نذیب عثمان فون اسٹینڈ کر کے ہولے ہولے چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

”یہ کوئی انہونی اور غیر معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی گناہ ہے کوئی اور عاشی مجھے تم سے اس حماقت کی

زنج نہیں تھی.....“

عاشی نے مریم کے کندھے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر میں اتنے شکوے تھے اتنے

گلے تھے اور اتنی شکایتیں تھیں کہ لہجہ بھر کو نذیب عثمان کی نظریں بھی جھک گئیں۔

”تم شاید ہرٹ ہوئی ہو عاشی لیکن.....“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ ہاتھ چھڑا کر تقریباً

بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نذیب عثمان نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر مریم کے قریب بیٹھتے

ہوئے بولیں۔

”میں نے زندگی میں کبھی خوشی نہیں پائی۔ ہمیشہ اکیلی اور تنہا رہی ہوں..... اور اب پہلی بار مجھے مخمفر

ملک نے خوشی کا احساس دلایا تو.....“

وہ خدا جانے کیا کیا وضاحتیں کر رہی تھیں لیکن مریم کچھ نہیں سن رہی تھی۔ کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔ نہ ان

کے لہجے کا درد نہ ان کے پراثر الفاظ کچھ بھی اسے متاثر نہیں کر رہے تھے۔

”مور کیا سوچے گا۔“

”عادل بھائی، ماں جی بی آپا۔“

”ڈاکٹر عبدالعزیز اور انکل ہاشم۔“

”یہ سب لوگ..... کتنے ہلکے اور نامعتبر ہو جائیں گے۔ سب کی نظروں میں۔“

”لوگ نہیں گے ان پر۔ مذاق اڑائیں گے..... کہہ دیکھو نذیب عثمان نے اس عمر میں اپنے سے آدمی

مر کے مرد سے شادی کر لی۔“

”اور الو پٹانے کا لُج میں ایک بار کتنا مذاق اڑایا تھا۔“

”یہ شونہ متعلق لوگ اکثر دو یا تین شادیاں کرتے ہیں۔ دیکھ لیتا مریم کی ماما بھی..... اور ان کے

یہ شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بازار سے کوئی من پسند شے خرید لیتا۔“

اور اس کی بات سچ ہو گئی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ریل سی چل رہی تھی۔

یگم آفندی اور میڈم زگس کی مسکراہٹیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کی آمد پر ان کی دبی دبی سرگوشیاں۔

شرجیل مرزا کے ریمارکس۔

”اور..... اور جب بابا، ماں جی اور عینی کو پتا چلے گا اور شہریار کو تو.....“
 ”اور کیا وہ کل شہریار کے گھر جا سکے گی۔“ اس نے سوچا تھا، ذرا کی ذرا وہ چلی جائے گی..... ایک بار اسے دیکھ لے گی..... اور کتنی التجا تھی اس کے لہجے میں۔
 ”مومو“ زینب عثمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 مریم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
 ”تم میرے اس کرب کو محسوس کر سکتی ہو جان۔“
 ”میں؟“

اور پتا نہیں یہ کس فلہ کا ڈائلاگ ہے۔

مریم کا دل کٹ کٹ کر جیسے پانی ہوا جا رہا تھا۔

”اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ایک بہترین اداکارہ ہیں..... بیسٹ اداکارہ کا ایوارڈ آپ کو یوں ہی نہیں مل گیا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”شٹ اپ۔“ انہیں ایک دم غصہ آ گیا ”تم اپنی ماں سے مخاطب ہو۔ اور یہ عاشی کو لگاڑنے میں مگر تمہارا ہاتھ ہے۔ وہ ایسی ہرگز نہ تھی اور تم تو ہمیشہ سے میری دشمن ہو۔ بھلا.....“ وہ غصے سے کشن اٹھا کر پیچھے لگیں۔

وہی پرانی کیفیت۔

وہ مسلسل بول رہی تھیں، زور ہی تھیں اور چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھیں۔ مریم کو یوں لگا جیسے اسے اپنی اسٹڈی کے دروازے پر کھڑے ہوں اور تاسف سے زینب عثمان کو دیکھ رہے ہوں اور ابھی آئیں گے اور ماما کا ہاتھ پکڑ کر ان کے بیڈروم میں لے جاتے ہوئے شاکی نظروں سے اسے دیکھیں گے اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں بتانے کی کوشش کرے گی کہ نہیں پاپا، میں نے تو کچھ نہیں کہا اور پاپا کی بات سمجھ بغیر ماما کو ان کے بیڈروم میں چھوڑ آئیں گے اور ان کی مضطرب انگلیاں ٹیلی فون پر تھم رہی تھیں۔

”ڈاکٹر ہادی۔ ڈاکٹر ہادی پلیز، زینب کی طبیعت خراب ہے۔“

اس نے دوبارہ سراٹھا کر اسٹڈی کی طرف دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسٹڈی کا دروازہ بدستور بند تھا۔ اس نے ایک نظر زینب عثمان پر ڈالی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔
 ایک خواب کے سے عالم میں وہ چلتی ہوئی فون تک آئی اور اوپر کے نمبر ڈائل کیے۔
 ”ہیلو ڈاکٹر عبدالعزیز، ماما کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ پلیز جلدی نیچے آئیں۔“

اور پھر ریسپورڈ کر ٹیل پر ڈال کر یوں ہی خواب کی سی کیفیت میں ہو لے ہو لے چلتی ہوئی زینب عثمان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔



”عادل، تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“ بی بی آپا نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا تو ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار ایک طرف رکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔
 ”آئیے بی بی آپا بیٹھے۔“

”میں پوچھ رہی تھی عادل کہ اب تم نے کیا سوچا ہے؟“ انہوں نے بیٹھے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔
 ”میں نے کیا سوچنا ہے بی بی آپا۔ انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ بھی بیٹھ گئے۔

”لیکن کب تک عادل..... ماں جی کی طبیعت تمہارے سامنے ہے۔ کامل کی گمشدگی اندر ہی اندر انہیں کھائے جا رہی ہے۔ آنکھوں کے سامنے کوئی مرجائے تو بالآخر ممبر آ جاتا ہے..... مراد بھائی کے کتے ہی خطا آچکے ہیں۔ بلارہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا دل بھی بچوں کے لیے بہت ادا اس مورہا ہے لیکن ماں جی کو اس حال میں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔“

”جی بی بی آپا، میں ماں جی کے لیے بہت پریشان ہوں۔ رات بھی ڈاکٹر پر اچے سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ خدا ان کی سمجھ میں ماں جی کی کمزوری نہیں آ رہی ہے۔ تمام ٹیسٹ نگیئر ہیں۔“

”میں نے کہا نا عادل، انہیں کامل کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ ایسے میں تمہاری شادی ہو جائے۔ گھر میں بچے ہوں تو ان کا دل بھل جائے۔ یہ مریم کی والدہ اگر مستقل ہی کراچی رہنے لگی ہیں تو ایسا ہے کہ ہم کراچی چلے جاتے ہیں۔ کچھ تو پتا چلے کہ..... اس طرح عمر تو نہیں گزاری جاسکتی نا عادل..... ہاں یا نہ جو بھی ہو۔ تم ریم سے ان کا کراچی کا پتا لے آنا۔ اسی بہانے میں بھی مراد بھائی سے مل لوں گی..... خود تو وہ کبھی نہ آئیں گے۔ اگر مریم بھی جاؤں تو شاید پھر جتاڑے کو کندھا دینے بھی نہ آئیں گے۔ یہ میں جانتی ہوں۔“
 انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”کتنی بار کہا بھائی ایک بار گاؤں آؤ۔ حویلی خالی پڑی ہے۔ رہو وہاں آ کر چٹائوں میں بیٹھی لیکن ان کی وہی بس ایک بات کہ بابا کی زندگی میں نہیں آ سکا تھا..... انہوں نے منع کر دیا تھا تو اب کیوں آؤں۔“

”ماں! لالہ مراد بھی تو اپنی بات کے کپے ہیں۔“

”خیر میں بھی کیا ذکر لے بیٹھی۔“ بی بی آپا مسکرائیں ”میں تم سے کراچی جانے کی بات کر رہی تھی۔“

”جی آپا میں لاہور جا کر پتا کروں گا مریم کی والدہ کے متعلق اور پھر آپ کو مطلع کر دوں گا۔“

”خود بھی تو اس انتظار سے تھکنے سے لگے تھے۔ اب وہ مریم کے سنگ سنگ زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اس کی رفاقت میں اس کی مہر اہی میں۔“

آج کل کچھ سوچتا ہی نہیں ہے۔ سوائے اس ٹٹ پونچھے ہیرو کے۔ دراصل زینی بہت جذباتی اور جلد باز ہے۔ ساری زندگی میں اس نے جو فیصلے بھی کیے ہیں، انتہائی جلد بازی اور جذباتی پن میں..... اور پھر خوب صورت مرد، ہمیشہ اس کی کمزوری رہے ہیں۔“

”مسلل پویتی رہی تھیں اور وہ اپنی بے زاری چھپائے ان کی باتوں سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے اور ساری گفتگو نے ایک ہی بات اخذ کی تھی کہ زینب عثمان کچھ دنوں تک لاہور آنے والی ہیں اور انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے لاہور آتے ہی وہ ماں جی اور بی آپا کو ان کی طرف بھیجیں گے۔“

”زینی انتہائی بے وقوف عورت ہے۔“ انہوں نے عادل کو کوئلہ ڈرنگ لینے کے لیے کہتے ہوئے وضاحت کی۔

”اب تمہارے والد سے اس کی شادی سراسر اس کا بے وقوفانہ فیصلہ تھا اور اب جو.....“ ان کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھ گئی تھی اور حلق سے میٹھیں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی لمبی برقا بواہر پر مزید انکشاف کرتیں کہ ان کے سابقہ شوہر دعتا نے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہونٹ پھڑکنے لگے اور چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

”تم..... تم یہاں کیسے آئے اور لالہ کہاں ہے؟“

”یہی بات تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں میڈم نرگس کہ لالہ کہاں ہے؟“

”کیا؟“ میڈم نرگس غصے سے کانپ رہی تھیں۔

”ہاں ڈراما مت کرو۔ لالہ تمہارے پاس ہے اور تم اخبارات میں میرے متعلق جس بے جا کہ بات چھوڑا ہی ہو وہ تین ماہ قبل وہاں سے چلی آئی تھی۔“

”تم..... تم نے اسے مروادیا ہے، قتل کر دیا ہے اور..... اور بکواس کر رہے ہو کہ وہ تمہارے قید خانے سے بھاگ آئی ہے۔“ ان کے منہ سے مغفقات کا طوفان ابل پڑا تھا اور وہ اپنے لیے ناخنوں سے سمرور پر فخر آور ہو گئی تھیں ”مجید حامد ملاں۔“ وہ ساتھ ساتھ آوازیں بھی دے رہی تھیں اور پوچھ بھی رہی تھیں

”ہاں ہے میری لالہ؟“

”مجید کا آرام سے بات کرو میڈم۔“ سوزو نے مونچھوں کو بل دیا۔

”بہ یہ صورت حال دیکھ کر عادل خان ان سے معذرت کر کے چلے آئے تھے۔ گیٹ کے باہر کھڑی

ہوئے کے ساتھ دو گلا شوف بردار کھڑے تھے۔

”اور خدا جانے یہ لالہ کا کیا واقعہ تھا..... مجبئی نے ذکر کیا تھا کچھ لیکن انہوں نے دھیان نہیں دیا تھا

انہوں نے سوچا تھا کہ وہ ایک دور دراز فون کر کے میڈم کی خیریت دریافت کریں گے لیکن پھر حویلی

سے نکالتے ہی آپا کا فون آ گیا تھا کہ ماں جی کی طبیعت خراب ہے اور وہ اسی وقت حویلی روانہ ہو گئے تھے

دھوپ، بارش اور سانسے

ہر بل جو گزر رہا تھا، انہیں لگتا تھا، رائیگاں جا رہا ہے۔ وہ اس کے آنسو اپنی انگلیوں سے پھٹا چاہتے تھے۔ یوں کہ پھر ان دلکش، ان قاتل آنکھوں میں کبھی کوئی آنسو نہ آئے۔ وہ اس کے سارے دکھ اپنی جہول میں بھر لیتا چاہتے تھے۔ وہ جوان دنوں بے حد تکی ہوئی، اداس اور دل گرفتہ لگتی تھی۔

اکیلی اور تنہا

وہ اس کی تھکانیں اس کی تنہائیاں باٹنا چاہتے تھے۔

وہ اس روز غیر ارادی طور پر زینب ولا سے نکل کر میڈم نرگس کی ہاں جا پہنچے تھے۔ میڈم نرگس انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

”اٹھا عادل خان زہ ہے نصیب آج ہمارا مقدر کیسے جا گا۔“

وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

باوجود ان کے اصرار کے وہ دوبارہ میڈم نرگس کے ہاں نہ جا سکے تھے۔ پتا نہیں کیوں عجیب سا لگتا تھا۔ حالانکہ وہ زمانے یا معاشرے سے خوف کھانے والے ہرگز نہ تھے پھر بھی اس دن بچتی حیدر کی بار

جیسے ان کے دل کو لگ گئی تھی۔ انہیں ڈانپ کرتے ہوئے جب وہ انہیں خدا حافظ کہہ رہے تھے تو انہوں نے مسکرا کر ان کے ہاتھ کو دبایا تھا۔

”عادل خان! میڈم کے ہاں جا تو رہے ہو لیکن محتاط رہنا۔ کہیں کل تمہارا اسکینڈل ہی بن جائے۔“

انہوں نے ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

”میرے یار۔“ مجبئی نے معنی خیز انداز میں انہیں تنبیہ کی ”اس میڈم میں عمر و مر کچھ نہیں ہے۔“

”میرے یار۔“ مجبئی نے معنی خیز انداز میں انہیں تنبیہ کی ”اس میڈم میں عمر و مر کچھ نہیں ہے۔“

”میرے یار۔“ مجبئی نے معنی خیز انداز میں انہیں تنبیہ کی ”اس میڈم میں عمر و مر کچھ نہیں ہے۔“

اور اب انہیں یہاں آئے بھی ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور پتا نہیں نہ تب عثمان لاہور آئی تھیں کہ نہیں۔“
 ”عادل اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔“ بی آ پانے کہا تو وہ چونکے۔ ”ماں جی کی خواہش ہے کہ اگر
 مریم نہیں تو حرم ہی کیوں نہ ہو..... ابھی تک اس کا کوئی قابل ذکر شہ نہیں آیا۔ ایک دو آئے بھی تو وہ بہر
 پلہ نہ تھے اور جو ہم پلہ آیا تھا وہ مہران نے رو کر دیا تھا اور خود حرم کی بھی مرضی نہ تھی۔ کچھ ایسی ہی باتیں
 جارہی تھیں اس کے متعلق..... جنہیں پتا ہے نا وہ لوگ تو اب بھی خواہش مند ہیں۔ ایسا نہ ہو بہت دیر
 ہو جائے اور حرم بھی..... پتا نہیں کیوں میں مریم کی والدہ سے زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ ممکن ہے وہ انکار کر
 دیں تو اس صورت میں حرم سے بہتر اور کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں پلیز ایسا مت کہیں۔“ انہوں نے لہجی نظروں سے بی آ پانے کی طرف دیکھا۔

”میری تو شدید خواہش ہے عادل کہ تم اور مریم..... لیکن میرے بھائی اپنے آپ کو ہر دو صورتوں کے

لیے تیار رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ بہت تکلیف ہو۔“

اور بی آ پانے سادہ اور معصوم ہیں۔ تکلیف تو بہت معمولی سا لفظ ہے۔ مزہ کی ہم راہی کے بغیر زندہ
 ان کے لیے بے معنی ہو جائے گی اور وہ تو یہ سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے جبکہ بی آ پانہیں ذہنی طور پر تیار نہ
 کے لیے کہہ رہی تھیں..... شاید اسی لمحے نبض رک جائے اور زندگی ختم جائے۔

پتا نہیں کیا ہوگا.....

اس کے متعلق وہ ابھی سے کیا کہہ سکتے تھے۔ ہاں وہ اتنا جانتے تھے کہ مریم کا خیال ان کے رگ و
 میں خون بن کر سرایت کر گیا ہے اور اگر وہ شامل حیات نہ ہوئی تو زندہ رہنے کا کیا جواز رہ جائے ان
 پاس..... شاید زندگی ان کے اندر اسی وقت اسی لمحے مر جائے۔

”میں ذرا ماں جی کو دیکھ آؤں۔ کیا خبر جاگ گئی ہوں۔ کچھ دیر پہلے تو سو رہی تھیں۔“ بی آ پانے کھڑی ہو کر

”اگر جاگ رہی ہوں تو مجھے بھی خبر کر دیجیے گا۔“

پروفیسر عادل نے اخبار اٹھا لیا اور انہوں نے اس کا اندرونی صفحہ کھولا ہی تھا کہ سامنے سے سلاٹ

دکھائی دیا تو وہ اخبار رکھ کر ایک دم اس کے لیے کھڑے ہو گئے اور دو قدم آگے بڑھ کر اسے گلے لگا دیا۔

”ارے مانی، کہاں تھے اتنے دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے تم دکھائی نہیں دیے۔“

”بس وہ میں ایک کام میں پھنسا ہوا تھا عادل بھائی۔“ وہ بی آ پانے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے

ماں جی کہتی ہیں۔“

”اب تو پہلے سے بہت بہتر ہیں بس ویک نہیں ہے۔“ پروفیسر عادل بھی بیٹھ گئے۔

”آپ کچھ دن اور غم نہیں گے یا چلے جائیں گے؟“

”ایک دو روز تک جا رہا ہوں۔“

”مسرور کیسا تھا عادل بھائی؟“

”پتا نہیں بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دراصل جس اسکول میں جاب کر رہا ہے وہ جس
 گاؤں میں ہے وہ کچھ فاصلے پر ہے۔ پہلے تو روز ہی آتا تھا۔ صبح کا گیارہ پلٹا تھا لیکن اب اس نے وہاں
 ہی ٹھکانہ کر لیا ہے۔ کبھی کبھار ہی آتا ہے۔“

”مگر وہ تو لاہور میں ہی کپرائیوٹ اسکول میں جاب کر رہا تھا۔“

”ہاں لیکن وہ جاب اس نے فوراً ہی چھوڑ دی تھی۔ یہ گورنمنٹ کا اسکول ہے مڈل اسکول
 ہے۔ پرائیوٹ اسکول کے مقابلے میں یہاں تنخواہ کافی بہتر ہے۔“

”اور اس کی تصویروں کی نمائش ہو گئی کیا؟“

”نہیں مانی ابھی کہاں..... کراچی میں ایک دو آرٹ گیلریز سے بات چیت چل رہی تھی۔ کوئی حوصلہ
 انرا جواب نہیں مل رہا تھا۔ خیال تھا خود جاؤں کراچی لیکن بس پہلے کچھ مصروفیات رہی..... کامی کی گمشدگی
 ماں جی کی بیماری۔ پھنس ہی گیا ہوں۔“ ان کے لہجے میں افسردگی تھی جیسے مسرور کی تصاویر کی نمائش اب
 تک نہ کروا سکے گا انہیں خود بہت ملال ہو۔

”یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے عادل بھائی۔ میں نے کہا بھی تھا مسرور سے مجھے بتا دو سب کیا
 کرنا ہے کس طرح اور کہاں۔ بس نشان دی کر دو پھر دیکھو سلطان کیا کرتا ہے۔ جس گیلری کی طرف
 اشارہ کیا اسی میں نمائش ہوگی اپنے یار کی تصاویر کی۔“ اس کے چہرے پر آنکھوں میں یقین تھا اعتماد تھا اور
 اس کی پوری شخصیت ایک فخر اور غرور کے سنہرے سے غبار میں لپٹی ہوئی تھی۔

اور اگر اس کی تربیت کچھ مختلف انداز سے ہوئی ہوئی تو یہ یقین اور یہ فخر اس کے اندر یہ کھردری سی خود
 پسندی پیدا کرنے کی بجائے اسے کسی مقام تک لے جاتی۔ اس کی شخصیت میں ایک جاذبیت بہر حال اب
 بھی تھی۔ جسے اسے بے جا فخر و مان نے دھند میں چھپا رکھا تھا اور کبھی کبھی دھند چھٹ جاتی تو شخصیت کی یہ
 جاذبیت ایک دم مخاطب کو اسیر کرنے لگتی تھی۔ مسرور کے متعلق بولتے ہوئے وہ یکسر بدل جاتا تھا۔

پروفیسر عادل نے بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں عادل بھائی؟“

”کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ تم اور مسرور کس قدر متضاد فکر اور سوچ رکھتے ہو اور تمہارے طبقوں میں بھی
 اتنا فرق ہے پھر تمہاری مسرور کے ساتھ یہ دوستی کبھی کبھی مجھے بہت حیران کرتی ہے۔“

”عادل بھائی۔“ وہ مسکرایا۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ کبھی کبھی دنیا میں حیران کن باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور ان ہی
 حیران کن باتوں میں ایک یہ بھی ہے..... مسرور کے لیے میرا خلوص اور میری محبت۔ کبھی کبھی میں سوچتا

ہوں عادل بھائی میں مسرور کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں شاید۔ وہ کہے تو اپنا سر بھی اسے کاٹ کر پیش کر سکتا ہوں جبکہ مجھے پتا ہے کہ مسرور میرے لیے ایسے کوئی جذبہ نہیں رکھتا بلکہ وہ ممکنہ حد تک مجھ سے کتراتا ہے۔“

اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس کی جاذبیت پوری طرح نمایاں تھی۔ پروفیسر عادل کو ایک دم ہی اس پر فخر محسوس ہوا۔

”اور انسانی ذہن کو سمجھنا کس قدر مشکل ہے۔“ ان کے پروفیسر کہا کرتے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اس قدر رکھداری شخصیت اور تکبر والا سلطان ایک متوسط طبقے کے کم گو سے لڑکے کے لیے اپنے دل میں اتنا گداز رکھتا ہے۔

”خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ میں اس وقت ایک تو ماں جی کا پتا کرنے آیا تھا۔ ابا جان دو تین بار کہہ چکے تھے کہ ان کی مزاج پر سی کو جاؤں۔ دوسرے مجھے آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنا تھی۔“

”ہاں ہاں کہو۔“ پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر ایک شفیق سی مسکراہٹ ابھری ”بھلا تمہیں مجھ سے کیا کام پڑا۔“

”عادل بھائی۔“ اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا ”مجھے کامی کے متعلق بات کرنا ہے۔ اتنا عرصہ ہو گیا۔ ابھی تک کامی کے متعلق کسی نے کوئی خبر نہیں دی۔ اخبارات میں اتنے اشتہار چھپے۔ جبکہ اعلانات کیے گئے۔ کسی نے دیکھا ہوتا تو ضرور اطلاع دیتا۔ کچھ تو بتانا کہ ہم نے اسے وہاں دیکھا تھا یا کوئی بھی بات۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ کامی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ شاید کسی نے لاوارث جان کر اسے دفن کر دیا ہو۔“

”نہیں۔“ عادل کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اگرچہ اس کا وجود اور اس کی زندگی کوئی خوشی کا باعث نہیں تھی پھر بھی وہ ان کا بھائی تھا ان کا خون تھا۔ اس کا لاوارثوں کی طرح دفن ہو جانا۔

”کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی مانی۔“ وہ از حد آزدہ لگ رہے تھے ”کیا خبر وہ زندہ ہو اور کہیں ایسی دور دراز جگہوں میں سے کسی جگہ پہنچ گیا ہو کہ وہاں اخبارات وغیرہ نہ جاتے ہوں۔“

”آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں عادل بھائی۔ میرے خیال میں تو ایسا ہرگز نہیں۔ بہر حال دل کے بہلاوے ہیں یہ سب۔ وہ زندہ ہوتا تو اب تک مل چکا ہوتا۔“

”شاید۔“ اندر ہی اندر ان کا من بیگ گیا ”ڈاکٹر تو یوں بھی کہتے تھے کہ اس طرح کے بچے اٹھ انیس سال سے زیادہ نہیں جیتے اور وہ اب تقریباً بیس سال کا تھا۔ اسے مرنا ہی تھا تو یہاں اس جگہ اس کو میں سب کے سامنے کیوں نہ مر گیا۔ سب کو صبر آ جاتا۔“

”عادل بھائی۔“ سلطان نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا ”میں چاہ رہا تھا کہ کامی کے نام جو رقم اور ز

وغیرہ ہے وہ بابا جان کی وصیت کے مطابق میرے نام منتقل ہو جائے۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک سے اس کی بات سمجھ نہیں سکے تھے۔

”میرا مطلب ہے عادل بھائی یہ تو طے ہے کہ آپ کی حریم سے شادی نہیں ہو سکتی تو اس صورت میں بابا جان کی وصیت کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔“

”ہاں۔“ انہیں اب سلطان کا مطلب اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی ”لیکن اس کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔ ابھی تو کامل کے متعلق کچھ یقینی طور پر پتا بھی نہیں ہے کہ وہ۔۔۔۔۔“

اپنے دل میں بے حد تکلیف محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ انہیں نہ صرف سلطان کی بات پر حیرت ہوئی تھی بلکہ بے حد رنج بھی ہوا تھا۔

”جو بات کل ہونی ہے وہ اگر آج ہی ہو جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔“

”یوں بھی۔“ پروفیسر عادل غیر ارادی طور پر سانسے پڑے اخبار کو ہاتھ میں رول کرنے لگے ”کامی کے گارڈین تو چچا جان ہی ہیں اور اس کے اکاؤنٹس کے تمام حساب کتاب ان ہی کے پاس ہیں اور چیک پروسی سائن کرنے کے مجاز ہیں۔ تمہیں اگر کچھ رقم درکار ہے تو چا چا جی سے کہو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے لہجے میں ہلکی سی تنگی درآئی۔

”مسئلہ یہ نہیں ہے عادل بھائی۔ میں چاہتا ہوں کہ باضابطہ طور پر سب کچھ میرے نام منتقل ہو جائے۔ دراصل میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔“ اس نے مسکرا کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا لیکن پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں ابھری وہ بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے۔ دکھ قطرہ قطرہ کر کے ان کے دل پر گر رہا تھا۔

یہ مانی نے ایسی بات کیوں کی۔ کتنا پیارا تھا وہ انہیں۔۔۔۔۔ کتنا چاہتے تھے وہ اسے۔۔۔۔۔ اور جب کبھی انہیں کامی کی بے بسی اور اپنے اکیلے پن کا خیال آتا تھا تو مانی اور مہراں کا خیال انہیں بڑی تقویت دیتا تھا۔ جیسے وہ اکیلے نہ ہوں۔ ان کی وجہ سے بہت مضبوط ہوں، جیسے وہ ان کے بازو ہوں۔ ان کا سہارا ہوں اور مانی نے کیسی بات کی تھی۔

یہ ایک ماں جی کا شک

ان کی بہیم ہی باتیں ان کے کانوں میں گونجیں تو جیسے ان کے دل میں کسی نے تیز دھار والا خنجر چھو دیا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ کامی کی گم شدگی میں مانی کا ہاتھ ہو۔“

”نہیں۔“

ان کا دل جیسے اس مفرد ضئے کو ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی انہیں لگا جیسے وہ زندگی کے لقمہ صحرائیں بالکل اکیلے ہوں بالکل تنہا۔

اور کوئی بھی ان کا ہاتھ نہ مارا۔

اور خدا جانے بابا جان کے ذہن میں کیا تھا اور کیا وہ سمجھے تھے کہ اس طرح میں حریم سے شادی کرلوں گا..... حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں دولت جاگداز زمین کی بھی شے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو زندگی گزارنے کے لیے اتنی دولت کافی سمجھتے تھے کہ زندگی سہولت سے گزر جائے اور بس پھر..... پھر بابا جان نے ایسا سوچا تو کیوں۔ حالانکہ انہیں یاد آیا ایک بار جب وہ غالباً نوے میں پڑھتے تھے تو بابا جان نے ان سے پوچھا تھا کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں تو انہوں نے انکار کر دیا تھا تو وہ بہت دیر تک انہیں اپنے سامنے بیٹھائے عثمان احمد کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے۔

”تمہارا باپ بھی تمہاری ہی طرح تھا۔ درویش صفت، کبھی زندگی بھر اس نے مجھ سے کسی بات کا مطالبہ نہیں کیا۔ عجیب غریب مزاج کا تھا.....“ وہ عثمان احمد کے بچپن کی تصاویر دکھاتے رہے ”پھر پتا نہیں کیوں اس نے ایسا کیا..... مجھ سے کہتا تو کیا میں اس کی خواہش پوری نہ کرتا..... میں نے تمہاری ماں سے اس کی شادی کرنے سے پہلے اس سے پوچھا بھی تھا کہ اگر وہ کہیں اور چاہتا ہے تو..... لیکن اس نے کچھ بھی نہ کہا..... اور پھر ایک دم یہ سیم توڑ دیا۔“

پہلی بار انہوں نے عثمان احمد کے متعلق اس سے اس طرح کھل کر بات کی تھی..... اور وہ اس رات بہت دیر تک عثمان احمد کو سوچتے رہے تھے کہ پتا نہیں اب عثمان احمد کیسے ہوں گے۔ ایسے ہی درویش صفت اور اپنے آپ سے بے گناہ اور لا پرواہ۔

بابا جان نے انہیں بتایا تھا وہ تمہارے چاچا عبدالرحمن سے بالکل مختلف مزاج کا تھا۔ نہ مزاج میں تند خوئی نہ کوئی تکبر.....

اور جب وہ عثمان احمد سے ملے تو وہ انہیں بالکل ویسے ہی لگے تھے۔ نرم خور اور نرم مزاج۔ دھیمے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہوئے..... لیکن کتنا مختصر سا ساتھ تھا۔ کتنی معمولی سی رفاقت تھی۔

برسوں جن سے ملے جنہیں دیکھنے کو وہ ترپے تھے وہ ملے بھی تو یوں کہ پھر پھڑکنے کے لیے ہی ملے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دھواں سا پھیل گیا..... تصور جانے کہاں سے کہاں جا نکلا تھا۔ وہ تو اس بات پر حیران ہو رہے تھے کہ آخر بابا جان نے کیا سوچا تھا..... دل اگر ٹھہر جاتا تو حریم بغیر کسی لالچ کے بھی انہیں عزیز ہوتی لیکن دل ہی تو نہیں ٹھہرا تھا۔ اس کی منزل تو مریم تھی۔

مریم جسے اپنانے کی خواہش یوں تو ان کے لبوں میں گردش کر رہی تھی کہ اس کے لیے وہ تخت و تاج چھوڑنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

”عادل بھائی آپ کہاں کھو گئے؟“ سلطان نے پھر ان کے ہاتھ کو چھوا تو وہ چونکے۔

مریم نے اتنی جلدی کیوں کی۔ کچھ تو انتظار کر لیتے۔ ان کے لہجے میں شکوہ بھی تھا اور دکھ بھی اور انہیں اندرونی کرب سے یک دم لال ہو گئی تھیں۔

”عادل بھائی..... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ آپ نے میری پوری بات سنی ہی نہیں۔ میں..... دراصل ایک ادارہ بنانا چاہتا ہوں، کامی جیسے بچوں کے لئے۔ کامی کی کم شادی کے بعد اچانک ہی مجھے یہ خیال آیا تھا۔ جب کئی اداروں میں کامی کی تلاش میں ہم گئے تو وہاں بچوں کی جو حالت تھی وہ دیکھی ہوگی آپ نے۔ تب میں نے ابا جان سے بات کی۔ کہ ہم ایک ایسا ادارہ بنائیں جہاں ایسے بچوں کی رہائش اور دیکھ بھال کا انتظام ہو۔ کامی کو تو سب سہولتیں حاصل تھیں جبکہ ہزاروں بچے ایسے ہوں گے جن کا وجود ان کے والدین کے لیے بوجھ بن جاتا ہے لیکن ابا جان اس کے لیے تیار نہیں۔ ان کے خیال میں ایسے بے شمار ادارے کام کر رہے ہیں اور فضول روپیہ ضائع کرنے کے وہ قائل نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں ادارہ قائم کرنے کے بعد کامی کے حصے کی باقی جائداد کا ایک ٹرسٹ بنادیا جائے اور ساری آمدنی ان بچوں کی دیکھ بھال پر صرف کی جائے۔ یہ ادارے جو موجود ہیں ان کے مالکان زیادہ تر لالچی ہیں اور تمام فنڈز خود خرچ کرتے ہیں اپنی ذات پر اور سچے اس طرح بری حالت میں رہتے ہیں۔“

اس نے تفصیل سے بات کی تو پروفیسر عادل نے پرسوج نظروں سے سچ اور جھوٹ کو جاننا چاہا..... اس کی سوچ تو بہت مثبت تھی لیکن پتا نہیں سچ کیا تھا..... ”کیا واقعی وہ ایسا ادارہ بنانا چاہتا تھا۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو بالکل ساٹ تھیں۔ ایک لمحے کو تو انہیں لگا جیسے وہ سچ کہہ رہا ہے۔ کسی ایسے ہی جذبے کی لہر تھی اس کی آنکھوں میں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بے یقین سے ہو گئے۔ پتا نہیں کیوں یہ بے یقینی ان کے اندر آئی تھی یا ایک ہی اور اب وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے۔

”کیا آپ بھی ابا کے ہم خیال ہیں؟“ سلطان نے پوچھا۔

”ہاں نہیں تو..... وہ چونکے“ تم وکیل سے مل کر ہو کر بنا چاہتے ہو کہ لو میرے خیال میں میری تو اس میں کوئی ضرورت نہیں ہے اگر ضرورت ہو تو کہہ دینا مجھ سے میرا آجاول گا۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”بات صرف وکیل کی تو نہیں ہے عادل بھائی ابا جان کو بھی تو قائل کرنا ہے وہ کسی صورت نہیں مانگے۔ اب اس سے بات کریں نا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے کامی کے نام پر یہ ادارہ بنوادوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں شام میں چاچا کی طرف چکر لگاؤں گا۔“ انہوں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ وہ سلطان کی گرم جوشی کا ساتھ نہیں دے پارہے تھے۔ یکا یک دل پر آگرنے والے دکھ کی چیمیں کو سلطان کی جوشی بھی کم نہیں کر پارہی تھی۔ نہ ہی اس کے جے کا خلوص شک کے اس کا نئے کو ان کے دل سے نکال سکتا تھا۔ ابا کی ہی سلطان کی بات سن کر وجود میں گڑا تھا۔

وہ بے حد خوشی سے کامی کے نام پر بننے والے اس ادارے کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں

”بچہ ہے نا عادل۔ اتنی چھوٹی عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا اور پھر ماں بھی تو گھر پر نہیں رہتی۔ ان کی کمی محسوس کرتا ہوگا۔ اس عمر میں بچے سمجھتے ہیں کہ مرنے والا ان کی ہر بات سن رہا ہے۔“

اور پھر وہ اسے حویلی چھوڑ کر لاہور آگئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ دس پندرہ دن رہے گا وہاں لیکن چار پانچ دنوں بعد ہی اس کا فون آگیا کہ وہ لاہور آنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ وہاں ایک اینڈر پرنسور حویلی آکر اسے لے جائیں۔

”ارے کیوں مور؟ کیا وہاں خوش نہیں ہو؟“

”نہیں خوش تو بہت ہوں۔ بی آپا کے طوطوں اور چڑیوں سے میری دوستی ہوگئی ہے۔ خاص

طور پر مٹھو سے۔“

”پھر۔“

”پھر میں نے سوچا کہ مجھے گھر پر ہی رہنا چاہیے۔ وہاں سب اکیلے ہیں نا اور مومو تو بہت اداس ہو جاتی ہے۔“

”لیکن جب تم ہاسٹل ہوتے ہو تو مومو تو تب بھی اکیلی ہوتی ہے۔“

”ہاں تب تو مجبوری ہے لیکن اب تو مجھے ان کے پاس رہنا چاہیے۔ بھائی ہوں نا اور بھائی ہی بہنوں کا خیال رکھتے ہیں اور میرے تو پاپا بھی چلے گئے ہیں اور اما بھی مصروف رہتی ہیں اور پھر مجھے ہی خیال رکھنا ہے ان کا۔“

اور وہ بے حد حیران ہوئے تھے۔

”کس قدر پیارا اور سمجھ دار بچہ ہے۔“ ان کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ آگئی۔

”اچھا عادل بھائی، اب میں چلوں گا۔“ سلطان کھڑا ہو گیا۔

”کھانے تک نہیں روکو گے۔“

”نہیں! کچھ دوست آئے ہوئے ہیں ڈیرے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔ ماں جی سے مل کر جاؤں گا اب۔“

”ماں جی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کرنا مانی، ان کی طبیعت خراب ہے۔“

وہ تو پہلے ہی شک کی دیوار سے ٹک لگائے کھڑی تھیں اور اس نے اگر ایسی کوئی بات کی تو..... ان کا جی چاہا کہ وہ اس سے کہیں۔

”مانی پیسہ دولت، جائیداد جو لیتا ہے لے لو لیکن میرے بھائی کامی کے متعلق بتا دو کہ کہاں ہے کس جگہ ہے زندہ بھی ہے یا نہیں..... ماں جی کو چین آجائے گا۔ ایک ایسی امید کی ڈوری پکڑ کر زندگی کا سفر طے کرنا جو یقین دے یعنی کے پتھر سے بندھی ہو کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔“

لیکن لفظ ان کے ہونٹوں تک آکر ٹھہر گئے اور جتنی نظریں اس کے چہرے کو چھو کر جھک گئیں۔

چمک تھی اور چہرے پر سرنخی۔ وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہے۔ اس کے ساتھ جائے بھی لپا اور اسے کھانے تک رکنے کے لیے پر خلوص اصرار بھی کیا۔ پوری توجہ سے اس کی ہر بات سنی لیکن پھر بھی ان کے چہرے کی اداسی کم نہ ہوئی تھی۔ دکھ کی اداس اندر ہی اندر مسلسل ان کے وجود کو بھگور رہی تھی۔ ایک دم پھر ہجوم میں اکیلے اور تنہا رہ جانے کا احساس لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر کو تیور کے تصور سے اندر تک جگمگ ہوئی تھی..... لیکن یوں جیسے کوئی ستار اٹھنا کر بجھ گیا ہو۔

”وہ بھی تو ہے نا میرا بھائی۔“ انہوں نے سوچا ”سو تیرا سہمی ہم دونوں کی رگوں میں خون تو ایک ہے نا..... لیکن اتنا چھوٹا سا تو ہے وہ..... ابھی تو اسے خود سہارے کی ضرورت ہے۔“ عثمان احمد کے ہاں

اس چھوٹی سی عمر میں وہ کتنا تنہا اور اکیلا ہو گیا ہے۔ بے سائبان اور غیر محفوظ کچھلے دنوں جب وہ ان کے ساتھ حویلی آیا تھا تو کتنی دیر تک عثمان احمد کی قبر پر رخسار نکائے جانے ہوئے ہونے ان سے کیا کہتا جا رہا اور وہ کچھ فاصلے پر کھڑے اسے عثمان احمد سے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنی کئی بات انہیں حیران کر دیتا تھا اور اس روز بھی جب وہ اس کے اصرار پر اسے عثمان احمد کی قبر پر لائے تھے تو اس اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بے حد تنگید کی بھر کر کہا تھا۔

”عادل بھائی، مجھے پاپا سے اپنی باتیں کرنا ہیں..... ہیں نا کچھ باتیں..... اور وہ میں صرف پاپا کروں گا..... آپ پلیز یہاں ہی رکھیں۔“

اور وہ حیران سے اسے عثمان احمد کی قبر پر چہرہ رکھے ہوئے ہونے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے اور کافی دیر بعد اس نے سراٹھایا تھا تو اس کے رخسار بھیٹکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

”اب تو آسکتا ہوں نامور۔“ وہ اس کے قریب چلے آئے اور پھر ایک دم سے اسے اپنے لپٹا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بے اختیار پوچھ بیٹھے تھے۔

”کیا بات ہے مور؟ کیا چاہیے۔ مجھ سے کہو۔“

”کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔ بس مجھے پاپا سے کچھ اور ہی باتیں کرنا تھیں۔“

بردار اور اپنی عمر سے بہت بڑا لگ رہا تھا۔

”اے بھائی کو بھی نہیں بتاؤ گے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا تھا ”کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بھائی سے بھی نہیں کہ

صرف پاپا سے ہی کی جاسکتی ہیں۔“

”اوکے یار۔“

اور فاتحہ پڑھ کر وہ گھر آگئے تھے لیکن بہت دیر تک اس کے متعلق سوچتے رہے تھے اور بپا

اس کا ذکر کیا تھا۔

”جانتا ہوں عادل بھائی، کامی کا ذکر ان کو کتنی اذیت دیتا ہے۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ”پھر شام میں ملاقات ہوگی۔“

”انشاء اللہ۔“ انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ آگے بڑھادیا۔ انہیں لگا تھا جیسے وہ اٹھ نہ سکیں گے۔ جیسے وجود سے کسی نے ساری ہمت نچوڑ لی ہو۔۔۔۔۔ ”کیا کامی کو مانی نے مراد دیا ہے۔“

”کیا کامی کو مانی نے۔۔۔۔۔“ یہ سوال ان کے دماغ میں سویاں چھوڑ رہا تھا اور اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔

مانی کی دلچسپیاں

اس کے شوق

اس کی شاہ خرچیاں

مزارعوں کے ساتھ اس کا رویہ

لاہور میں کئی دن تک اس کا قیام اور پھر۔۔۔۔۔

دکھ صرف یہ ہی تو نہیں تھا کہ مانی نے کامی کو۔۔۔۔۔ دکھ یہ بھی تھا کہ اس بھری دنیا میں وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ جوان کے چاچا کا بیٹا تھا اور اپنے مزاج کی تمام تر خامیوں کے باوجود انہیں بہت عزیز تھا۔ مانی چلا گیا لیکن وہ یوں ہی بیٹھے رہے ہاتھ گود میں دھرے خاموش اور اداس جیسے ساری کشتیاں جلا کر سرساحل خالی ہاتھ تہی دامال کھڑے ہوں۔

جانے کتنی ہی دیر گزر گئی وہ یوں ہی سامنے اخبار پھیلانے خالی الذہن سے بیٹھے رہے جیسے سوچنے کے

بی آپا نے انہیں آکر کھانا لئے اور ماں جی کے اٹھ جانے کی اطلاع تو تب وہ اپنی جگہ سے اٹھے۔

”بی آپا، کھانا ادھر ماں جی کے کمرے میں لگوا دیجیے۔ آج وہاں ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔“

اور پھر کھانے کے دوران ماں جی سے باتیں کرتے ہوئے ان کے ذہن پر چھایا اضمحلال کا کافی کم ہو گیا تھا۔ ماں جی کی طبیعت کافی بہتر تھی اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ مراد اور بی آپا کے بچپن کی باتیں۔۔۔۔۔ ان کے بچپن کی باتیں۔ بابا جان اور کامی کی باتیں اور وہ بہت دلچسپی سے سنتے رہے۔

کھانے کے بعد بھی وہ عصر کی نماز تک وہاں ماں جی کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ شاید ان کے لاشعور میں خوف سا بیٹھا تھا کہ تنہا ہوں گے تو نہ جانے۔۔۔ کون کون سے شکوک اور واہموں کے ناگ ان کے ذہن و دل سے چٹ جائیں گے۔ ماں جی عصر کی نماز سے فارغ ہوئیں تو وہ انہیں چاچا عبدالرحمن کی طرف جانے کا تیکہ حویلی سے نکل آئے۔

چاچا گھر پر نہیں تھے۔ انہیں باہر ہی سے پتا چل گیا کہ وہ قریبی گاؤں کے دو فریقوں میں کافی عرصے

نے لڑائی جلی آ رہی تھی، صلح صفائی کی غرض سے گئے ہیں۔ انہوں نے ادھر سے غیر ارادی طور پر گاڑی کا رخ ڈیرے کی طرف موڑ لیا۔ یہ ایک خوبصورت سا چھوٹا سا جنگلا تھا جو گاؤں کی حدود سے باہر تھا اور یہاں لوہا بابا جان اپنے شہری دوستوں کو جو شکار کی غرض سے آتے تھے ٹھہرایا کرتے تھے۔ یا پھر جب یہاں ہمارا نہ ہوتے تو فصل کے دنوں میں بھی شیر خان اور اللہ داد وغیرہ رہتے تھے۔ جو فصلوں کی نگرانی کرتے تھے۔ چچا ڈلوانا پانی لگوانا، کٹائی، بوائی، سب ان کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

یہ چھوٹا سا جنگلا جدید سہولتوں سے آراستہ تھا اور اب بابا جان کے بعد مانی کے دوست یا رعمو آیا یہاں ہی اکر ٹھہر کر رہتے تھے۔ وہ خود بہت کم اس طرف آتے تھے۔ کبھی سالوں بعد۔ وہ یوں ہی اس طرف آ نکلتے تھے لیکن آج ان کے ذہن میں کیا تھا، وہ خود کچھ نہیں پارہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ انہوں نے سوچا ”وہ ہمارے کی طرف کیوں جا رہے ہیں۔ مانی سے تو صبح ہی ملاقات ہو چکی ہے، پھر۔“ اور واپس پلٹتے پلٹتے ہمارے گاڑی کا رخ ڈیرے کی طرف کر لیا۔

شیر خان باہر ہی بیٹھا تھا۔ بی رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر قدرے حیران ہوا۔

”آپ خان صاحب اس وقت!“

”ہاں، بی مانی سے ملنے چلا آیا تھا۔“

”وہی ایسی بات ابھی ابھی لکھ ہیں ان کے کوئی نئے دوست آئے ہیں شہر سے انہیں باغات دکھانے۔“

”اور ادھر کون ہے؟“ انہوں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”یہاں سب ہی ہیں ان کے باقی دوست یا راور۔“ وہ کچھ جھجک گیا۔

”اور کون۔۔۔۔۔؟“

”جدا وہ ہیں آخر بیگم اور ان کے بندے۔“

”آخر بیگم کون ہیں؟“ انہوں نے شیر خان کی طرف دیکھا اور مزید سوال کیے بغیر اندر کی طرف بڑھ گئے۔

ڈرائنگ روم میں فرش نشست تھی۔ گاؤں کے لگے تھے اور دو تین سلطان کی عمر کے لڑکے یہاں ٹیک لگے بیٹھے تھے اور وہ عین وسط میں قدرے جھکی اپنے ہتھکڑے کھول رہی تھی۔ ان کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھ کر ہنسنے لگے۔

”ابھی انہیں حسین تھی۔“

”ابھی انہوں میں کا جمل تھا۔“

”ابھی انہیں لگے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔“

”ابھی انہوں نے مسکراہٹ۔“

”ابھی انہوں نے نظریں جھکائیں۔“

مانی کے دوست کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک شاید انہیں پہچانتا تھا۔

”عادل بھائی آپ۔ خیریت ہے نا؟ سلطان تو ابھی نکلا ہے۔ حفیظ پراچہ کو باغات دکھانے لے گیا ہے۔“

”ہاں خیریت ہی ہے۔ یوں ہی مانی کو دیکھنے چلا آیا تھا۔“

”بٹھے نا۔ گانا سنیں گے۔ بڑا رس ہے، بڑی کولمٹا ہے، اختر بیگم کی آواز میں۔“

وہ یقیناً آخر بیگم تھی جو بڑی بے باکی سے انہیں دیکھ رہی تھی اور بھرمانی کے دوست کی تعریف پر ہنر
 طرح سر جھٹک کر اس نے ان کی طرف مسکراہٹ بھیجی تھی اس سے ان کی پیشانی پر ناگوار سی شکنیں پڑ گئیں۔
 ”نہیں، مجھے گانا نا سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ ان سے معذرت کر کے باہر نکل آئے۔

”اور پتا نہیں..... یہ طبقہ جو اپنے آپ کو مظلوم کہتا ہے اور اسے مظلوم سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت مظلوم ہوتا ہے یا عالم.....“ سارے کمرؤں میں بے مقصد چکر لگاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

اور پتا نہیں کون سی بات انہیں اس منزل پر لے آئی ہے اور یہی اٹھریلک جو اپنے پاؤں سے کھول رہی تھی انہیں تو خالم ہی لگی تھی اور اس کے چہرے سے کہیں بھی مظلومیت نہیں چمک رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے یہ ظلم کرنے کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو اور ہر سمت سے وار کرنا چاہتی ہو۔

انہوں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہ دنیا کاسب سے پرانا پیشہ ہے لیکن آج تک وہ اس طبقے کے درجہ تک نہیں سمجھ سکے تھے۔ حالانکہ اس طبقے پرادیبوں نے بڑی معرکہ الآرا کہانیاں لکھ کر ابی شہرت حاصل کر لی تھی۔

”خان جی آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں، دیکھ رہا تھا کہ کہیں مرمت وغیرہ کی یا کسی اور شے کی ضرورت تو نہیں ہے۔“ انہوں نے

اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں جی! اپنے سلطان جی ہر سال سفیدی وغیرہ کراتے ہیں۔“

”خیر.....“ شیرخان سے باتیں کرتے ہوئے وہ باہر نکلے اور اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا: ”شیرخان، یہاں لوگ آتے رہتے ہیں، اپنے کامی کے متعلق ضرور ہر ایک سے پوچھتے رہا کرتا“

کوئی اتا پتا بتا دے۔“

”جی میں تو جو بندہ بھی ملتا ہے اس سے ضرور ذکر کرتا ہوں۔“ اس کی آنکھیں جچی سا رہ گئیں۔

”آپ کا دکھ ہمارا دکھ ہے خان جی۔ بڑے چوہدری صاحب زندہ تھے تو ہمیں بھی کاش لاتے تھے۔ اس کی انگلی پکڑ کر گھومتے رہتے تھے۔“

وہ آب دیدہ ہو گیا تو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے اسے تسلی دی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

”تو بانی کی دلچسپیوں میں یہ سب بھی شامل ہے۔“ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے زیر لب اشارتاً تو کہا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں سکے تھے۔

ایک بار سروسز کے ہوں تو قارون کا خزانہ بھی تمھوڑا ہے اور پھر ایک طرف یہ شوق اور دوسری اور جب شوق اس قسم کے ہوں تو قارون کا خزانہ بھی تمھوڑا ہے اور پھر ایک طرف یہ شوق اور دوسری خدمت خلق کا جذبہ ڈس ایبل بچوں کے لیے ادارے کا قیام۔ انہیں یاد نہیں کہ مافی کبھی کامی کے

کوئی چیز جو خلق میں پہننے لگی تھی اور اندر کندلی مار کر بیٹھا تنگ پہن اٹھا کر ڈنک مارنے لگا تو ایسی زبان کا داؤد بڑھ گیا اور حویلی واپس جاتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ ماں جی کی طبیعت تو اب بہتر ہے۔ کئی باتیں ان کے ذہن کو الجھا رہی تھیں اور وہ مسرور سے ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ وہ حویلی پہنچے پہنچے صبح واپس کا فیصلہ کر چکے تھے۔



”مریم!“ ڈاکٹر عبدالعزیز المعید نے مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تو اس نے سر ہلکا کر ڈاکٹر عبدالعزیز المعید کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سوجی ہوئی تھیں اور رنگت زرد ہو چکی تھی۔ ”کیا حالت بیانی ہے آپ نے۔“ انہوں نے بے حد تاسف سے اسے دیکھا۔ ”مسز عثمان اب معمولی سا ڈیپریشن تھا۔ آپ کو پتا ہے وہ پہلے بھی ڈیپریشن میں ہو جاتی تھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر آپ؟“ ڈاکٹر عبدالعزیز المعید نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

دو ٹی ڈی لاؤنج کے بچوں سچ کارپٹ پر بیٹھی تھی اور اس کی جھکی پلکیں تیار ہی تھیں کہ وہ ان کے آنے سے پہلے دور ہی تھی۔

”میں انہیں منہ ہاتھ دھوئیں اور فریش ہو جائیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور رات کافی دیر تک مجھ سے بات کرتی رہی ہیں۔ ناؤ ہری اپ گڈ گرل اور فریش ہو کر آؤ اور مجھے فناف اچھی سی چائے پلاؤ۔“

بلکہ ہر گھنٹہ کے لیے میں کہتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ تو مریم کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں ذرا دیر کو

”کیا منظرِ عثمان سورہی ہیں ابھی تک؟“

۱۱۔ مسافر مریم کے لبوں سے نکلا۔

”کیا سوچ رہی ہیں مریم آپ؟“ ڈاکٹر عبدالعید مسکرائے ”میں نے کہا نا کہ مرز عثمان اب بالکل

”مذہب“ نے زیر لب کہا اور سوچا..... ”وہ اب مرزا عثمان کہاں ہیں۔ مرزا غنیمت ملک ہیں.....“

”فی الحال موڈ نہیں ڈیڑی اور چائے آج نیچے پیئیں گے سب کے ساتھ۔“

آج ان کا موڈ بہت اچھا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ اگر مسز عثمان کی طبیعت اچھی ہوئی تو کہیں آؤنگ کا پروگرام بناتے ہیں۔ کچھ موسم بھی بہت اچھا ہو رہا تھا اور دل کا موسم بھی بے حد خوشگوار تھا۔ سرجن ہاشم نے ڈاکٹر ہادی سے کہا تھا کہ وہ آج شام مسز عثمان سے عاشی اور معید کی شادی کی بات کریں اور ڈاکٹر ہادی نے وعدہ کیا تھا کہ آج وہ ضرور گھر آکر مسز عثمان سے بات کریں گے۔ سو ان کے اندر چاروں طرف پھول سے کھل رہے تھے اور وہ اسی بے اختیار یں میں نیچے چلے آئے تھے اور اب مریم کو اپنی اس خوشی میں شریک کرنا چاہ رہے تھے۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے انہوں نے بچن کی طرف دیکھا۔ مریم کچن میں تھی۔

”اور مریم بے حد خوش ہوگی۔“

اور خدا جانے صبح کیا بات ہوگئی تھی کہ وہ اتنی ڈیپر لیں اور تھکی تھکی لگ رہی تھی اور تھکی تھکی اور ڈیپر لیں تو عاشی بھی لگ رہی تھی اور ان تین چاروں میں انہوں نے دو تین بار ہی اسے دیکھا تھا۔ شاید نہ بنب عثمان کی وجہ سے ہی دونوں ڈیپر لیں تھیں۔ یکا یک ہی ان کا دل عاشی کو دیکھنے اور اس سے بات کرنے کو بے چین ہونے لگا تو وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور ایک قدم آگے بڑھایا لیکن پھر رک گئے۔

”اور عاشی کے موڈ کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا اور کیا پتا؟ وہ بھی ابھی تک سو رہی ہو۔“

”معدی بھائی آپ جا رہے ہیں کیا؟“ مریم نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ وہ واپس پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”منفوجائے لاری ہے۔ آپ ناشتا کر چکے ہیں کیا؟“

”نہیں ناشتا تو نہیں کیا لیکن موڈ نہیں ہے اس لیے صرف چائے کا کہا ہے۔“ انہوں نے بغور مریم کی طرف دیکھا۔ وہ منہ دھو آئی تھی لیکن اس کی آنکھیں اسی طرح سو جی ہوئی تھیں اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔

”جی مریم بی بی اب بتائیے کیا بات ہے۔ اتنی اپ سیٹ کیوں ہیں؟“

”نہیں تو اپ سیٹ تو نہیں ہوں۔ بس یوں ہی سر میں درد تھا۔“

”اور سردی کی وجہ سے آپ روتی رہی ہیں۔ اتنے چھوٹے دل کی تو نہیں ہیں آپ۔“

”اور آپ کو کیا پتا معید بھائی کہ میں کتنے چھوٹے دل کی ہوں اور میرا دل کیسے طوفانوں کی زد میں آیا ہے۔“ اس نے نظریں اٹھائیں۔

”فلو بھی تھا اس لیے۔“

”جھوٹ کیوں بول رہی ہیں بھو۔“

عاشی اتنی آہستگی سے ٹی وی لاؤنج میں آئی تھی کہ مریم کو اس کے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک دم پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔ بلو جینز اور ریڈی ٹی شرٹ کے ساتھ گلے میں ریڈی ہی اسکارف ڈالے اور

اور یہ کس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ انکشاف تھا۔ نہ بنب عثمان کی ابھرتے ہوئے ہیر و خنجر لک سے شادی..... بہت جلد سب جان جائیں گے۔

اور پھر ان پر نہیں گے۔

اور مذاق اڑائیں گے۔

بیگم زکس اور بیگم آفندی جیسی مخلص دوست بھی پس پشت ماما پر نہیں گی۔

کس قدر اذیت ہو رہی تھی۔

جیسے کوئی جسم میں سونیاں چھو چھو کر نکال رہا ہو۔

اور مانے کچھ بھی نہ سوچا۔

نہ میرا نہ عاشی نہ انا اور مورکا۔

اور نہ لوگوں کا۔

جب سے یہ انکشاف ہوا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے پوری کائنات لوٹ لی ہو۔

جیسے وہ بھری دنیا میں تنہا اور اکیلی ہوگئی ہو۔

”اور جب کسی سے اس کی پوری کائنات چھن جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔“ اس نے ہنسی کے ساتھ

”کیوں کیا چائے پلانے کا ارادہ نہیں؟“ ڈاکٹر عبدالعزیز ابھی تک مسکرا رہے تھے اور ان کی ٹانگ

اس کے چہرے پر تھیں۔ مریم نے شعوری طور پر مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ صرف ہلکے

گئے اور ایک دم بچن کی طرف جانے لگی۔

”نہیں۔ اگر مسز عثمان جاگ رہی ہوں تو میں ذرا ان کی خیریت معلوم کر لوں۔“

”نہیں۔ اگر مسز عثمان جاگ رہی ہوں تو میں ذرا ان کی خیریت معلوم کر لوں۔“

”ماما تو گھر پر نہیں ہیں۔“ مریم نے گردن موڑ کر ڈاکٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اب وہ نابل ہیں لیکن ڈیڑ سٹر مریم پھر آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟“

”نہیں۔ میں تو پریشان نہیں ہوں۔“ اس نے جلدی سے چہرہ موڑ لیا اور بچن کی طرف چلی گئی۔

”اور اس لڑکی کو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔“ ڈاکٹر عبدالعزیز کے چہرے پر ایک مہربان سی مس

آکر ٹھہر گئی اور انہوں نے ریسیوٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ یہنا اس کی مسز عثمان سے تھپڑ

یا پھر وہ اس بات پر رو رہی ہوگی کہ وہ صبح صبح کہاں چلی گئی ہیں۔

”خیر اتنی صبح بھی نہیں۔“ انہوں نے سامنے کھڑک پر نظر ڈالی ساڑھے دس بج رہے تھے۔

انہوں نے اسپتال نہیں جانا تھا۔ ڈاکٹر سعدی نے ان سے ریکویسٹ کی تھی کہ وہ آج ان کی جگہ

لیں۔ سہ چار بجے تک فرصت ہی فرصت تھی اس لیے وہ دیر سے اٹھے تھے اور پھر تیار ہو کر نیچے آئے

”ناشتا نہیں کرتا کیا؟“ انہیں جاتا دیکھ کر سرجن ہاشم نے زنجیر جھانک

کندھوں پر شولڈر بیگ لٹکائے وہ شاید کہیں جانے کے لیے تیار نظر آ رہی تھی۔
”اٹھ نکس عاشی؟“

لیکن عاشی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور ڈاکٹر عبدالعید کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب انداز سے مسکرائی۔
”بجو جھوٹ بول رہی ہیں..... حالانکہ اس جھوٹ کا کوئی فائدہ نہیں ہے..... ایک دور و زمیں اخباروں

میں سرخیاں لگ جائیں گی کہ مسز عثمان نے غضنفر ملک سے شادی کر لی ہے۔“

”کیا.....!“ بے اختیار ڈاکٹر معید کے لبوں سے نکلا۔
”اوہ! اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے ڈاکٹر عبدالعید۔ کیا ماما نے کوئی نئی بات کی ہے۔ ہوتی رہتی ہیں ایسی شادیاں۔“ وہ ہنسی۔

اور ڈاکٹر عبدالعید کو اس ہنسی میں ٹوٹے کانچ کی جھپن محسوس ہوئی۔
”بیٹہ جاؤ عاشی۔“ ڈاکٹر عبدالعید نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ اگرچہ اس نے بے حد ڈاکٹر میک اپ کر رکھا تھا پھر بھی اس کے چہرے کا حزن چھپ نہیں پایا تھا۔ اس کی بے انتہا خوبصورت اور دلکش آنکھوں میں عجیب سا درد و کوشش لیتا محسوس ہو رہا تھا۔

”بیٹہ جاؤ عاشی۔“ انہوں نے دوبارہ کہا۔ ان کے لہجے میں بے حد زماہٹ تھی۔
”سوری ڈاکٹر معید مجھے کہیں جانا ہے۔“ اس نے ایک نظر مریم کو دیکھا جو دونوں ہاتھ گود میں دھرے

سات بیٹھی تھی اور اس کی رنگت بے حد پسید ہو رہی تھی۔
”کم آن بجو..... اب واپس آ جائیں۔ ماما نے کوئی سناہ تو نہیں کیا شادی کی ہے اور اسلام کہتا ہے کہ بیوہ کی شادی کرنا ثواب ہے۔“ اس نے نسیب عثمان کے کہے لفظوں کو دہرایا تو مریم نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

”خیر.....“ اس نے کندھے اچکائے ”ہر نئی بات کو قبول کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔ ایک دور“
”بجو بھی سنبھل جائیں گی۔“ وہ ڈاکٹر عبدالعید سے مخاطب تھی۔
”اور یہ مسز عثمان نے کیا کیا۔“ ڈاکٹر عبدالعید نے دل گرتی سے سوچا ”اب بھلا پار بجوں کے ہونے ہوئے کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی اور وہ بھی اپنے سے آدمی عمر کے لڑکے سے۔“

”اوکے ڈاکٹر عبدالعید۔“ اس نے کندھے پر لٹکے بیگ کو دائیں کندھے سے بائیں پر منتقل کیا۔
”اور بجو آپ بھی کہیں گھوم پھر آئیں۔ یعنی کی طرف چلی جائیں۔“
”عاشی۔“ ڈاکٹر عبدالعید کھڑے ہو گئے اور ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے قریب آئے ”عاشی! آج کہیں مت جاؤ۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا آج مجھے فرصت ہے اور ہم سب آؤنگ کے لیے جائیں گے۔“

بے حد مہربان لہجے میں بولتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعید کو عاشی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔
”سوری ڈاکٹر عبدالعید میں پہلے پروگرام بنا چکی تھی۔“

”تم نے ناشتا بھی نہیں کیا۔“ مریم نے اپنا بوجھل سراو پر اٹھایا۔
”موڈ نہیں ہے۔“

”عاشی مت جاؤ کہیں۔“ مریم نے ملتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرے گھر پر رہنے سے کیا حقیقت بدل جائے گی۔“ عاشی کے لہجے میں تلخی تھی ”حقیقتوں کو فیس کرنا سیکھائی ڈیر سسٹر۔“ وہ بات کر کے ایک دم ایڑیوں پر گھومی اور کارز نیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی ”میں گاڑی لے کر جا رہی ہوں۔“

”نہیں عاشی۔“ مریم کھڑی ہو گئی۔ عاشی کو ابھی ڈرائیونگ کرتے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے ”تم ڈرائیونگ کرنا چاہا تو ساتھ لے جاؤ۔“

”میں ڈراپ کر دیتا ہوں عاشی۔“ ڈاکٹر عبدالعید نے بھی کہا۔

”نہیں! مجھے اکیلے ہی جانا ہے بجو اور پھر زندگی ہمیشہ دوسروں کے سہارے نہیں گزر سکتی۔“ وہ مزے لہریوں اور تیز چلتی ہوئی سی لاولیج سے نکل گئی۔

”وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔“ مریم نے بے بسی سے ڈاکٹر عبدالعید کی طرف دیکھا۔

”اور میری بات بھی نہیں مانے گی۔“ ڈاکٹر عبدالعید اس کے پیچھے باہر نکل آئے۔

اور مریم وہیں کھڑی رہی جیسے اس کے پاؤں زمین نے جکڑ رکھے ہوں۔ کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر عبدالعید واپس آ گئے۔

”اور مجھے پتا تھا وہ کسی کی بات نہیں مانے گی۔“ مریم نے ڈاکٹر عبدالعید کی طرف دیکھا اور تھکی تھکی لڑھکی پر بیٹھ گئی ”وہ اپنے آپ کو جتنا بہادر ظاہر کر رہی ہے اتنی بہادر ہرگز نہیں ہے معید بھائی۔“

”ہاں! وہ اتنی بہادر ہرگز نہیں ہے۔“ ڈاکٹر معید نے زیر لب دہرایا۔

”وہ بہت ڈسٹرب تھی بہت زیادہ۔“ مریم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”لیکن مریم۔“ ڈاکٹر عبدالعید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”ممکن ہے کہ یہ بات صحیح نہ ہو۔ یہ کس نے ہے آپ کو کہ مسز عثمان.....“ وہ کچھ جھجک کر خاموش ہو گئے۔

”ماما نے خود۔“ مریم نے آہستگی سے کہا ”اور جب ماما نے بتایا تھا تو یوں لگا تھا جیسے کوئی بہت انہونی بات کہہ رہی ہو۔ بہت ناقابل بیان۔ اور عاشی! اسے تو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار تھی کہ ماما.....“ وہ سر جھکا کر جیسے ہولے ہولے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔
”نہو چائے لائی تو وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گئی۔“

کئی رہی۔
”پاپائے بھی کہا تھا کہ اسے سب کا خیال رکھنا ہے شاید انہیں پہلے سے پتا تھا کہ ماما ہمیں چھوڑ جائیں گی۔“ اور کل رات جب وہ ماما کے بیڈ روم میں بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی اور ماما نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

”جاؤ مومو اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔“

تو اس نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا تھا۔

”ماما کیا اب آپ ہمیں چھوڑ جائیں گی؟“

”پاگل ہو گئی ہو۔“ ماما نے اس جھڑک دیا تھا ”تم سب میری زندگی ہو۔ یہ شادی..... میری اور غنیمت کی شادی ہے۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری جان کہ یہ ناگزیر تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی خوشی نہیں دیکھی حقیقی خوشی۔ مجھے کبھی میرا مقام نہیں ملا۔“ ان کی آواز بھرا گئی تھی اور انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ حیران سوچتی رہ گئی تھی کہ وہ حقیقی خوشی کیا تھی جو ماما کو کبھی نہیں ملی اور وہ مقام کیا تھا جس کی ماما خواہاں تھیں۔

جب ہی تیل ہوئی تو اس نے مڑ کر ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھا اور کتنی ہی دیر تک تیل مسلسل ہوتی رہی۔ جب جیسے کسی خواب سے جوشکتے ہوئے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ریسیور اٹھا لیا۔

”بے وقافتہ کی کہانیں تھی تم؟“ دوسری طرف عینی تھی ”میں فون کر کر کے تھک گئی ہوں کوئی انڈینڈی نہیں کرتا اور اب بھی اتنی دیر سے تیل ہو رہی تھی۔“

”کیسی ہو عینی؟“ جوابا اس نے کہا۔

”میں پوچھ رہی ہوں مومو کہاں تھیں تم؟ فون انڈینڈی کیوں نہیں کر رہی تھیں؟“

”شاید خراب ہو گا۔“ اس نے آہستگی سے کہا حالانکہ عاشری نے خود ہی آف کیا ہوا تھا۔

”اور بابا اور ماں جی کیسے ہیں؟“

”سب اچھے ہیں مریم لیکن تم مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟“

”ہاں اچھی تو ہوں۔ تم بتاؤ کیا کر رہی تھیں۔ کیسے فون کیا؟“

”یوں کیا میں فون نہیں کر سکتی۔“ عینی کے لہجے میں خفگی درآئی۔

”اور تم..... تم بہت بے وقافتہ بہت سنگدل۔ آنکھیں کیوں نہیں۔ شیری بھائی نے کتنا انتظار کیا۔ وہ کس قدر افسردہ لگ رہے تھے اور تم..... تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ آج تامل کچھ دیر کو۔“

”میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔“

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ بتاتی بھی تو کچھ نہیں ہو۔ دوست ہوں میں تمہاری۔“

”آپ کے لیے بھی چائے بناؤں مریم بی بی؟“

”نہیں۔“ اس نے ہاتھوں کے پشت سے پیشانی پلکوں کو صاف کیا۔

”کیا ماما کو ایسا کرنا چاہیے تمہارے بھائی۔ مومو کیا سوچے گا۔ لوگ کیا کہیں گے؟“

”مریم۔“ صفو کے ہاتھ سے چائی کی پیالی لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعید نے مریم کی طرف دیکھا اور پھر

صفو کو جانے کا اشارہ کیا۔

”تم نے سنا نہیں کہ عاشری کیا کہہ رہی تھی کہ حقائق کو قبول کر لینا چاہیے۔ جو ہر چکا وہ تو ہو چکا پھر.....

مور تو بچہ ہے۔ شاید اتنا محسوس نہ کرے اور لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے حقائق

سوچتے اور باتیں کرتے رہیں۔ چند روزہ حرمت کا اظہار کریں گے اور پھر بھول جائیں گے۔ انہیں یاد

بھی نہیں رہے گا کہ.....“

”نہیں معید بھائی۔“ مریم نے ان کی بات کافی ”لوگ کبھی نہیں بھولیں گے۔ کبھی نہیں۔ وہ تو صدیوں

پرانی باتیں یاد رکھتے ہیں۔ انکل بختی حیدر کو میڈم نرس کی ہر شادی کی تفصیل ابھی تک یاد ہے اور وہ

اکثر.....“

”اسپتال سے آپ کا فون ہے جی۔“ میز جیوں سے جھانکتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعید کے ملازم نے بتایا

تو چائے کا کپڑا لپیٹ کر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعید کھڑے ہو گئے۔

”میں ابھی آ رہا ہوں اور پلیز آپ ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالیں۔“

اس نے سر ہلا دیا اور یوں ہی خالی الذہن سی بیٹھی سامنے دیوار کو کھتی رہی۔ ڈاکٹر عبدالعید اسپتال

جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے اترے اور اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

”سوری مریم مجھے اسپتال جانا پڑ گیا ہے۔ ایک ایمر جنسی آگئی ہے۔ حادثہ ہوا ہے۔ زخمی کافی سیر

ہیں۔ میں فارغ ہوتے ہی رنگ کروں گا لیکن پلیز مریم ناؤ ٹیک اٹ ایڑی۔ آپ تو بڑی ہیں۔ آپ

سب کا خیال رکھنا ہے۔ عاشری کو سمجھانا ہے۔ وہ بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی لیکن آپ خود اس طرح

رہیں تو اسے کیسے سمجھا پائیں گی۔ میں ہوں نا آپ کا بھائی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ سب مجھے

عزیز ہیں۔ آپ کبھی بھی تنہا نہیں ہوں گے اور پھر مسر عثمان پہلے بھی تو اتنے مہینوں سے یہاں نہیں تھیں۔

انہوں نے اپنا بھاری ہاتھ مریم کے سر پر رکھا۔ بالکل یوں ہی جیسے عادل بھائی جب سی بیٹا آ

تھے عاشری اور نینا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے سر پر پیار کرتے تھے۔ اس کا دل اندر رہی اند

ہونے لگا لیکن وہ ہونٹ بھیٹنے کھڑی رہی۔

”او کے گڈ گرل۔“ وہ مسکرائے ”میں فارغ ہوتے ہی گھر آؤں گا۔ جب تک عاشری بھی آچکی ہو

پھر ہم لمبی ڈرائیو کریں گے۔“ وہ تیز قدم اٹھاتے چلے گئے لیکن وہ یوں ہی کھڑی کارپٹ کے

”بس یوں ہی معمولی سا پھر چڑھا۔“

”آج اگر اسل آگیا تو شام کو آؤں گی۔“

”شام کو تو شاید میں گھر نہ ہوں، وہ آئی نہ گس کی طرف جانا ہے۔“

”اچھا پھر کل آ جاؤں گی۔“

یعنی کو خدا حافظ کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یعنی آئے۔ وہ یعنی سے بھی کچھ بچا نہ پاتی اور فی الحال وہ کسی سے کچھ نہ کہنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک طوفان سا بٹا تھا۔ اور وہ ماما سے بھی کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ ایک لفظ بھی تو نہ کہا تھا اس نے ان کی طبیعت بھی اتنی خراب ہوئی تھی اور عاشری ٹوٹی ٹوٹی اور بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ عاشری کو اس کی ضرورت تھی اس کی رفاقت کی لیکن وہ تو بس ماما کے پاس بیٹھی رہی تھی پاپائیں تھے اور ماما ڈیپر لیس تھیں۔

اور شہریار.....

وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

شہریار کے متعلق تو ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نہیں سوچا تھا اور اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ شہریار رہا ہے اور اس نے جانے سے پہلے ملنے کی درخواست کی تھی۔

”اور شہریار چلا گیا۔“

”یوں زندگی کا ایک باب شاید تمام ہو گیا۔“

”اور اب تو یوں بھی..... شاید راستے بدل گئے ہیں۔“

”ماما شاید پھر ایک دور دراز میں چلی جائیں۔“

”صبح وہ کس قدر خوش، مطمئن اور پرسکون لگ رہی تھیں۔ جب وہ تیار ہو کر اپنے بیڈروم سے نکلیں

ہمیشہ سے کہیں زیادہ دلکش اور خوب صورت لگ رہی تھیں۔“

”مومنوں ذرا نرس کی طرف جارہی ہوں۔“

لیکن اس نے گلاس ڈور سے دیکھا، باہر لان میں گلاب کی کیاریوں کے پاس خشنفر ملک کھڑا تھا۔

وہ کب آیا تھا..... اسے خبر نہ تھی وہ چند لمحے پہلے ہی اپنے کمرے سے باہر آئی تھی اور صفو کو جانے کے

کہہ رہی تھی۔ خشنفر ملک نے نرس عثمان کو باہر آتے دیکھا اور وہاں ہاندا انداز میں آگے بڑھا۔

کیا۔ وہ پیچھے ہٹ آئی تھی اور ماما اس کے ساتھ چلی گئی تھیں۔

”مریم بی بی، بیگم صاحبہ تو چلی گئی ہیں۔ ان کے لیے سوپ بنانا ہے۔ کیا کھانے تک آ جائیں گی؟“

نے قریب آ کر پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ مریم نے مرکزہ سے دیکھا

”پھر کیا کروں جی؟“

”ماما آئیں گی تو بتالینا نہیں تو رہنے دو۔“

”اور عاشری بی بی بھی چلی گئی ہیں۔“

”ہاں۔“

”آپ بھی چلی جایا کریں کہیں اتنی اداس رہتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کی طرف۔“

مریم نے جواب نہ دیا اور صفو کچھ دیر کھڑی رہنے کے بعد چلی گئی۔

اور جیسے کرنے کو کچھ نہ رہ گیا ہوا اور زندگی ایک جگہ ٹھہری گئی ہو۔ ان چھ سات دنوں میں جیسے وقت ختم

سا گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ کس قدر گراں ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ چھ سات دن نہیں گزرے تھے کچھ

سات صدیاں گزر گئی تھیں۔

”اور عاشری کتنی ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آکے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ایسا ہوتا رہتا ہے۔ آخر میڈم نرس نے تو تین شادیاں کی ہیں اور اگر ماما نے دوسری شادی کر لی

تو کون سی قیامت آگئی ہے۔“

”حالانکہ خود عاشری نے کس طرح ری ایکٹ کیا تھا لیکن پھر اس نے حقائق کو تسلیم کر لیا لیکن میں کیوں

فتیوں کو قبول نہیں کر پاتی اور خود ماما کتنی مطمئن اور پرسکون ہیں، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔“

”اور ابھی تک میڈم نرس اور آفندی کو نہیں معلوم ورنہ وہ تو بھاگی آتیں۔“

”اور شریل مرزا کس قدر تسخراڑاتا۔“

”آج شاید سب کو پتا چل جائے۔ ماما یقیناً صبح صبح میڈم کی طرف ہی گئی ہوں گی اپنے نئے شوہر کو

میڈم سے تعارف کروانے.....“ وہ ایک دم تلخ سی ہونے لگی تو اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ ٹی

وی پر عاشری والا ڈراما آرہا تھا۔ رات کو دکھائی جانے والی قسط دوبارہ دکھائی جا رہی تھی۔ ماما کے آنے کے

پندرہ سالوں میں عاشری اس کی ریکاڈنگ کے لیے گئی تھی۔ غالباً آخری قسط تھی۔

اور وہ سب کتنا خوش تھے۔

”نکاح کیا ہے.....“ نے کہا تھا کہ آخری قسط کے بعد وہ سب ”سن کا گم“ میں ڈنر کریں گے اور یہ ڈنر ان

مطرح سے ہوگا۔

اور پھر..... انہوں نے معنی خیز نظروں سے عاشری کی طرف دیکھا تھا ”اگلا ڈنر انشاء اللہ اپنے گھر میں

ہوگا۔“ نے گھر میں شفٹ ہونے کی خوشی میں۔“ اس نے آہستگی سے کہا تھا اور عاشری مسکراتی رہی تھی۔

لیکن سب کچھ گڑبڑ ہو گیا تھا۔ اسے تو پتا بھی نہیں چلا کہ رات عاشری کے ڈرامہ سیریل کی آخری قسط

رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر اپنی توجہ ٹی وی پر لگانے کی کوشش کی۔ اس نے ڈرامے کی سب اقساط تو نہیں

اور ایسا ہو گیا تھا خود بخود ہی۔

بتا کسی منصوبے اور پلان کے
لیکن بعض محبتیں کتنی بد نصیب ہوتی ہیں۔

اس کی اور شہر یار کی محبت کی طرح۔

بل کر بھی نہ ملنے کی اذیت۔

”اور شہر یار کہتا ہے کہ مجھے اس کا انتظار کرنا ہوگا اور کون جانے یہ سفر کتنا طویل اور مسافت کتنی کٹھن
ہو..... اور میں راستے ہی میں تھک جاؤں۔“

”ممکن ہے شہر یار ہی اس طویل مسافت سے تھک کر کسی شجر سایہ دار تلے بیٹھ جائے پھر.....“

”آنے والا ہر لمحہ کتنا بے اعتبار ہے۔“

”اور اب ہمیں کیا خبر تھی کہ ماما غنفر ملک سے شادی کر لیں گی.....“ اس کا ذہن پھر ماما کی طرف چلا گیا۔

اور ماما نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ غنفر ملک سے ان کی شادی ناگزیر تھی۔

”اور کیا واقعی ایسا تھا۔“

”ماما نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ نہ عاشری کا نہ عینا کا، مور کا اور نہ میرا۔“

”ہم سب ہم چاروں کس قدر تنہا ہو گئے ہیں اور کتنے اکیلے۔ ماما کے ہوتے ہوئے بھی۔“

”اب بتائیں ماما غنفر ملک کے ساتھ چلی جائیں گی یا غنفر ملک کو یہاں لے آئیں گی اور اگر غنفر
ملک آکر رہے گا تو سیتھ مکیش، دگلا، پاپا، بابا، عینا،

دل لے اندر جیسے کسی نے سوئی چھو دی ہو۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریموٹ اٹھا کر بی بی بند کیا۔ دل تھا کہ ٹھہرنا ہی نہ تھا۔ اس نے سوچا کچھ دیر
انگل ہاشم کے ساتھ کپ لگائے گی تاکہ کچھ دیر کو خیال بٹ جائے۔

”صفو۔“ اس نے بیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے آواز دی ”میں ذرا اوپر جا رہی ہوں، انگل ہاشم
کے پاس۔“ اور پھر صفو کا جواب سننے بغیر بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تب ہی مین گیٹ پر تیل ہوئی۔

”شاید عاشری واپس آگئی ہے لیکن اتنی جلدی..... پتا نہیں اسے کہاں جانا تھا۔“

وہ دروازے کی تھی اور ایک ہاتھ رینگ پر دھرے پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ شریف بچن سے ہاتھ
پٹختا ہوا نکلا۔ وہ وہیں کھڑی اسے باہر جاتے دیکھتی رہی۔

”گور میں بڑی ہوں۔ مجھے عاشری کو سنبھالنے میں مدد دینی چاہیے لیکن میں اپنے آپ کو ہی سنبھال نہیں پا
رہی ہوں اور ہم دونوں کو بیٹھ کر ایک دوسرے کے دکھ کو شہر کرنا چاہیے اور.....“ اس نے رینگ سے ہاتھ

ہٹایا اور اچھی کے لیے میزمری نیچے اتاری اور پھر وہیں رک گئی۔

دیکھی تھیں۔ پتا نہیں کیوں عاشری کو اسکرین پر دیکھنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ اقساط اس نے عاشری کے
ساتھ بیٹھ کر دیکھی تھیں اور اسے لگا تھا جیسے اخبارات سچ لکھ رہے ہوں کہ عاشری کو ایکٹنگ نہیں آتی۔

اسکرین پر عاشری اکیلی تھی۔ سیاہ لباس میں گھٹنوں پر چہرہ دھرے وہ بے اتہادل گرفتہ ٹوٹی ٹوٹی

اور شکستہ لگ رہی تھی اور جب اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا اور پکلوں کے کنارے

پر موتی اگلے ہوئے تھے۔

مریم کا دل کٹنے لگا۔

یہ ایکٹنگ نہیں تھی..... ہرگز ایکٹنگ نہیں تھی۔

عاشری ایکٹنگ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ سچ سچ رو رہی تھی وہ سچ سچ ٹوٹی ہوئی تھی۔ جب وہ ریکا ڈنگ کے لیے جا رہی تھی تب بھی مریم نے

دیکھا تھا کہ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں لیکن..... کون جانے گا۔ کس کو پتا ہوگا کہ وہ..... اس کے اندر کیا

گزر رہی تھی۔

اس کی نظریں ٹی وی پر جمی تھیں اور ذہن ایک بار پھر زنب عثمان۔ عثمان احمد۔ زنب عثمان کی پیارا

ان کا رویہ اور پھر اب ان کی غنفر ملک سے شادی کی طرف چلا گیا تھا۔

”شیری..... شہر یار پلیز۔“

غیر ارادی طور پر ہاتھ ریموٹ پر لگا تھا اور آواز اونچی ہو گئی تھی..... عاشری کی آنسو بھری آواز سے

نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا۔

عاشری بے اختیار جھوم میں سے راستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف جہاز کی میزجدا

تھکے تھکے انداز میں قدم رکھتا ہوا اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوا ہیرو۔

لمحہ بھر کو اسے لگا جیسے وہ شہر یار ہو۔

ڈاکٹر شہر یار۔

”اور میرے نہ جانے پر شہر یار کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا۔ اور کتنی مایوسی شاید اس نے بھی یوں ہی

لمحوں تک مڑ مڑ کر مجھے دیکھا ہوگا۔“

”اور پتا نہیں۔ میں اب بھی شہر یار کو اتنا کیوں سوچتی ہوں جبکہ..... اور کس قدر مشکل ہوتا ہے

بھول جانا اور بھلا دینا۔“

”اور بعض باتیں کیسے خود بخود ہو جاتی ہیں۔“

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی کسی کی محبت میں مبتلا ہو جائے گی..... اور کوئی اس

سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہو جائے گا۔

رخسار پر بوسہ لیتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

”نہیں تو۔“ مریم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”اور ہاں۔“ میڈم نرگس کی آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں ”غصنفز یہ مریم ہے۔ تم غالباً پہلے بھی مل چکے ہو گے اس سے۔“

”ہاں ایک دو قاریب میں دیکھا تو تھا لیکن باقاعدہ تعارف نہیں ہے۔ بس زینی نے بتایا تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔“ غصنفز ملک ایک قدم آگے بڑھ کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”اور اب تمہاری بیٹی بھی۔“ ایک آنکھ پینچتے ہوئے میڈم نرگس نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ریل کی سیٹیاں جکتی رہیں۔

مریم کے حلق میں جیسے کچھ چھننے لگا۔۔۔۔۔ یہ عمر میں تقریباً اس کے برابر یا اس سے ایک آدھ سال بڑا غصنفز ملک۔۔۔۔۔ اندر در در تک نمک ہی نمک گھلتا گیا۔ وہ نچلا ہونٹ نیچی سے دانتوں تلے دبائے پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور نگاہیں اٹھا کر لمحہ بھر کے لیے نینب کی طرف دیکھا جو بڑی پرسکون سی ہو کر بڑے نفرت سے غصنفز ملک کو دیکھ رہی تھیں جو ابھی تک مریم کی طرف متوجہ تھا۔

”کیا کرتی ہیں آپ؟“

”ہاسٹرز کر چکی ہوں۔“ مریم کا لہجہ دھیمّا تھا اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

”اوہ۔“ اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکڑے ”میرا خیال تھا ابھی آپ اسکول کی طالبہ ہوں گی۔“ مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”غصنفز بیٹھ جاؤ نا۔“ نینب نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

میڈم نرگس بلاوجہ نہیں اور ان کے ہنسنے پر چونک کر مریم نے ان کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہ شریف پر پڑی جو بڑا سا اچھی اٹھائے اندر آ رہا تھا۔

”یہ سامان گیسٹ روم میں رکھنا ہے جی۔“ اس نے نینب کی طرف دیکھا۔

”نہیں، نہیں گیسٹ روم میں نہیں میرے بیڈ روم میں لے جاؤ۔“

”تو نا غصنفز ملک کو ساتھ لے آئیں۔“ مریم نے سوچا۔

”ہاں بے چارہ اتنے دنوں سے ہوٹل میں اکیلا بوریور ہوتا تھا بلکہ انتہائی اداس ہو رہا تھا۔“ میڈم نرگس نے اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر تبصرہ کیا۔

نینب نے دلکشی سے مسکرا کر غصنفز کو دیکھا اور پھر مریم کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”عاشی اپنے کمرے میں ہے کیا؟“

”نہیں باہر گئی ہے۔“

مسز عثمان، غصنفز ملک اور میڈم نرگس کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھیں۔

لمحہ بھر کے لیے اس نے سوچا کہ وہ نیچے جائے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے رخ موڑ لیا اور اوپر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

”مومو۔“ مسز نینب عثمان نے پکارا۔

”جی۔“ اس نے وہیں سے رخ موڑ کر پیچھے دیکھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”اوپر انکل ہاشم کے پاس۔“

”ادھر آؤ نیچے، تمہیں غصنفز سے ملو اؤں۔“

”کیا یہ ضروری ہے۔ آئی مین۔ میرا غصنفز ملک سے ملنا۔“

”مومو۔“

نینب کے لہجے کی تنگی مریم نے محسوس کی اور ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری اور معدوم ہو گئی وہ وہیں کھڑے کھڑے نینب کو دیکھ رہی تھی جب کے چہرے کا رنگ یک دم بدل گیا تھا۔

”تمہیں آخر کب تمیز آئے گی؟“

انہوں نے مرکز غصنفز ملک سے کہا جو فی دی لاؤنچ کے بچوں کی طرف اشارہ اٹھائے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”غالباً میرے متعلق بتا رہی ہوں گی کہ میں ہمیشہ سے ایسی ہی بدتمیز ہوں۔“ مریم نے دل گرتی سے

سوچا اور اوپر جانے کے لیے رخ موڑ لیا۔

”دیکھا۔۔۔۔۔ دیکھا تم نے نرگس۔“ ان کا انداز اسرار سے مظلومیت کا تاثر لیے ہوئے تھا کہ۔۔۔۔۔

”ریلیکس ڈارلنگ۔“ میڈم نرگس نے نینب کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور سراپا اٹھا کر اسے آواز دی۔

”مومو جانو اپنی آنٹی سے نہیں ملو گی کیا؟“

مریم کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ”اوہ گاؤ مجھے معلوم نہیں تھا کہ۔۔۔۔۔“

مسز نینب منہ ہی منہ میں کچھ بددا کر گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”اور ماما کی طبیعت آج ہی ٹھیک ہوئی ہے۔۔۔۔۔ مومو مینا اپنی ماما کا ہمیشہ خیال رکھنا۔“ انہیں پوٹا

مت کرنا۔“

عثمان احمد جیسے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

”تم جانتی ہو نا مومو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈیپر پریس ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔“ اور وہ مرکز آہستہ آہستہ

اترنے لگی۔

”ارے تم تو ہمیشہ سے کہیں زیادہ کمزور لگ رہی ہو۔ ڈیپر کیا کچھ بیمار تھیں؟ میڈم نرگس نے اسے

”کہاں.....؟“

”معلوم نہیں۔“

”جی آیتھا اسے لینے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں اسکی گئی ہے۔“

”یاز جی عااشی کو اسپاگل کر رہا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ انہوں نے میڈم کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا وہم ہے۔ بلکہ وہ تو تمہاری بیٹی کو بلند یوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ رات

آخری قط میں عااشی نے غضب کی ایکٹنگ کی۔ کمال کر دیا اس نے۔“

”واقعی عااشی نے اتنی اچھی ایکٹنگ کی۔“ مسز زنب نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں ہاں میں خود حیران رہ گئی۔ جبکہ پورے سیریل میں اس کی ایکٹنگ میں کوئی جان نہ تھی بالکل

سپاٹ..... لیکن.....“

”آخر میری بیٹی ہے نا۔“ ان کے لہجے میں تفرق تھا۔

”غزنی، تم نے دیکھی آخری قط۔“

”نہیں نہیں دیکھ سکا۔“

مریم نے انتہائی بوریٹ محسوس کی۔ اس کا جی چاہا۔ ہاتھ کاٹھ کر چلی جائے بار بار اس کی نظریں مٹان

احمد کی اسٹڈی کی طرف اٹھ جاتیں اور اسے گلتا جیسے ابھی عثمان احمد اپنی اسٹڈی سے باہر آئے ہوں گے

اور شاید پاپا نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ماما ان کے بعد ہم سب کے ہوتے ہوئے غضنفر ملک سے شادی کر لیں

گی اور اگر ماما کو شادی کرنا بھی تھی تو وہ کسی سویر سے اپنے ہم عمر سے شادی کر لیتیں۔ نہیں تو شریں

مرزا سے ہی سہی، کم از کم اس کا ماما کا ساتھ اس طرح مٹھکے خیز نہ لگتا۔ اب غضنفر ملک کسی بھی طرح ان کے

ساتھ بیٹھا ہوا ان کا شوہر نہیں لگ رہا تھا..... اور میڈم زمرس نے بھی تو سید امتیاز علی شاہ سے شادی کی تھی۔

مریم کے خیالات ادھر ادھر بھٹک رہے تھے اور وہ اپنے ارد گرد سے بالکل لاپرواہی ہو گئی تھی اور میڈم

زمرس، مسز زنب اور غضنفر ملک نہ جانے کس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ عااشی کی آواز پردہ چوکی۔ وہ کوئے

میں رکھے بڑے سے گملے کے پاس کھڑی بظاہر مسکراتی نظروں سے مسز زنب اور غضنفر ملک کو دیکھ رہی

تھی..... کمال ہے وہ ارد گرد سے اتنی بے خبر ہو گئی تھی کہ اسے عااشی کے آنے کا پتا بھی نہ چلا۔

”عااشی تم آگئی ہو۔“ مریم کا لہجہ از حد شفیق تھا ”ادھر آ جاؤ۔“

لیکن عااشی اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔

”غضنفر، یہ عااشی ہے مریم سے چھوٹی۔“ اس بار بھی میڈم زمرس نے تعارف کا مسئلہ اپنے سر لیا۔

غضنفر نے سناٹھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

”عااشی واقعی تمہاری بیٹی لگتی ہے زبنی..... بہت زیادہ تم سے ملتی ہے۔“

”ہاں سب یہی کہتے ہیں۔“ وہ مسکرائیں۔

”نواب غضنفر ملک صاحب ادھر ہی قیام فرمائیں گے۔“ عااشی پھول کی پتیاں توڑ رہی تھی۔

”ظاہر ہے۔“ میڈم زمرس ہنسیں ”اور کہاں جانا تھا انہیں۔ بہت دن رہ لیے ہوئے میں۔“

”حالانکہ اصولاً۔“ عااشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ”ماما کو ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔“ اس نے

پورے سے پھول کو توڑ لیا۔

”عااشی۔“ انہوں نے غصے سے اسے دیکھا۔

”کیوں آئی۔“ عااشی نے پھول کی آخری پتی توڑ کر پھول کو ہاتھوں میں مسلا اور نیچے پھینکتے ہوئے

میڈم زمرس کی طرف دیکھا ”کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟“ لہجے میں ملا کی معصومیت تھی۔

”نہیں جانی بالکل بھی نہیں۔“ میڈم نے ذرا سارخ، ڈرگ زنب اور غضنفر ملک کی طرف دیکھا ”بین

مجبوری یہ ہے کہ غضنفر ملک کا گھر یہاں نہیں ہے۔ اور.....“

”تو جہاں ان کا گھر ہے ماما کو تو وہیں ہونا چاہیے نا۔“ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی میڈم زمرس کے

ماننے آکھڑی ہوئی۔

”ہاں لیکن تم بھی تو ہونا تم، مومن، نینا اور مور۔ تم سب کے لیے.....“ میڈم زمرس نے زنب کا دفاع

کرنے کی کوشش کی لیکن عااشی نے ان کی بات کاٹ دی۔

”میرے خیال میں ہم اتنے بچے بھی نہیں ہیں کہ ماما کے بغیر رہ نہ سکیں۔ پہلے بھی تو تقریباً ایک سال

سے وہ زیادہ تر کرچی ہی رہی ہیں۔ کیوں ماما غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں میں۔“ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”عااشی۔“ زنب کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا اور پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں ”یہ کیا بکواس ہے۔“

”نہیں تو ماما میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں آپ خواہ مخواہ ہمارے لیے پریشان نہ ہوں اور سیکرٹیفائر نہ

کریں۔ ہم بہت مزے میں تھے۔“

”تم بہت تمیز ہو گئی ہو اور یہ سارا قصور مریم کا ہے۔ ہمیشہ سے میری دشمن ہے۔ اسی نے تمہیں.....“

”کمال کرتی ہیں آپ ماما۔“ عااشی نے انہیں ٹوک دیا ”بجوبے چاری کا کیا قصور انہوں نے تو مجھ سے

بات تک نہیں کی۔ یہ سراسر میرا ذاتی خیال ہے کہ اصولاً آپ کو غضنفر ملک کے ساتھ جانا چاہیے تھا نہ کہ غضنفر

ملک کو آپ کے ساتھ رخصت ہو کر آنا چاہیے تھا۔“

”زبنی۔“ غضنفر ملک ایک دم کھڑا ہو گیا ”مجھے اجازت دو۔“

”غزنی پلیز کو تو کیا ہو گیا ہے۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ عااشی اور مومن نے تمہاری شادی کو اور مجھے قبول کر لیا ہے مگر..... پلیز میرا

”خیر“ انہوں نے ہولے سے سر جھٹک کر ٹیبل پر سے روتھ مین کی ڈبیا اٹھائی ”یوں ہی ایک خیال آیا تھا۔ دراصل کامی کی کم شدگی نے ذہن کو عجیب طرح سے الجھا رکھا ہے۔ تم سناؤ تمہاری والدہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہت بہتر ہے سر۔“

”کہاں ہیں آج کل؟“

”گاؤں میں ہیں سر۔ پچھلے دنوں شیریں سے ملنے آئی تھیں۔ پھر واپس چلی گئیں۔ میں سوچ رہا ہوں اگر اپنے ہی گاؤں میں ٹرانسفر ہو جائے تو میں امی کے پاس رہ سکوں گا۔“

”ہاں میرے ذہن میں ہے۔ میں کافی کی وجہ سے کسی بات نہیں کر سکا۔ انشاء اللہ کل ہی بات کروں گا۔ رضا صاحب سے کہہ کر تمہارے ٹرانسفر کے سلسلے میں ایگزیشن کا کام بھی درمیان میں رہ گیا۔“

”کوئی بات نہیں سر۔ مصیبتیں کوئی بتا کر تو نہیں آتیں۔“

”بہر حال میری ذمہ داری ہے۔ میں فارغ ہوتے ہی پہلی فرصت میں کراچی جاؤں گا۔ میری بات ایک آرٹ گیلری سے چل رہی تھی۔“

”سر آپ ایگزیشن کے لیے پریشان نہ ہوں۔ ایک بار کامی کے متعلق کچھ بتا چل جائے۔“

”میں تو اس کی طرف سے واپس ہو گیا ہوں۔“ ان کے لہجے میں بے حد مایوسی تھی ”شاید اب وہ کبھی نہ ملے اور نہ ہی ہمیں کبھی بتا چل سکے کہ اس کے ساتھ کیا بنتی۔“

”ماپوی تو کفر ہے سر۔۔۔۔۔“

”ہاں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن بالآخر ایک سٹیج آتی ہے جہاں ہر امید ختم ہو جاتی ہے۔ خیر اب تم آرام کرو۔“

”نہیں سر اب میں جاؤں گا۔“

”کیوں کل تو چھٹی ہے تم زکوہ نہیں کیا۔ گاؤں جانے کا ارادہ ہے اس وقت؟“

”نہیں سر میں اب ماموں کی طرف جاؤں گا۔ شیریں کا پتا کرنا ہے کہ اس کے پہنچنے کی خبر آئی ہے یا نہیں۔“

”ہاں“ شیریں آیا تو تھا ملنے۔ ہائر اسٹڈی کے لیے باہر جا رہا تھا لیکن کچھ اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ کالج اٹھاؤ میں پوچھ نہ سکا۔ اس کے گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟“

”نہیں سر شاید سب سے جدا ہونے کے خیال سے اپ سیٹ ہو۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ اپنا وطن اور اپنی زمین چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں جب گیا تھا تو مجھے بھی اسی بہت مشکل پیش آئی تھی۔ بہت دل گھبراتا تھا۔ اسے خط لکھو تو لکھنا کہ وہاں اگر اسے کوئی مسئلہ ہو تو

لکھے۔ بہت دوست اور مہربان ہیں میرے وہاں۔“

”جی سر۔“ سرور اٹھ کھڑا ہوا ”لکھ دوں گا۔“

سامان منگوا دو اور تم بھی میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔“ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دی لاؤنچ سے نکل گیا۔

”غزنی پلیرز۔“ زنب اس طرح گھبرا کر انھیں جیسے غضنفر ملک چلا گیا تو ایک قیامت آجائے گی۔ انہوں نے مڑ کر ایک تہر آلود نظر عاشری اور مریم پر ڈالی اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں ”غزنی۔۔۔۔۔ غزنی پلیرز کو۔“

عاشری کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی جبکہ مریم آنے والے لمحوں میں ہونے والے ہنگامے کے خوف سے سہمی ہوئی سی عاشری کو دیکھ رہی تھی۔

میڈم زنگس نے باری باری دونوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

”تمہاری ماما کو اس عمر میں غضنفر ملک سے عشق ہو گیا ہے۔“ انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اٹھ کر زنب اور غضنفر ملک کے پیچھے باہر نکل گئیں۔



”تو تمہارا کیا خیال ہے سرور؟“ پوری تفصیل بتاتے ہوئے پروفیسر عادل نے سرور کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ ”کیا مانی ایسی حرکت کر سکتا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ سرور نے کچھ سوچنے کے بعد رائے دی۔۔۔۔۔ ”کسی کے متعلق کوئی بھی بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔۔۔۔۔ میں مانی کو بہت زیادہ نہیں جانتا۔ اگرچہ وہ مجھ سے دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن پھر بھی میں انہیں اس طرح نہیں جانتا جس طرح ایک دوست کسی دوسرے دوست کے متعلق جان سکتا ہے۔ ہم

بہت کم ملے ہیں اور میں اتنا ہی جان پایا ہوں کہ وہ دوستوں کے معاملے میں بہر حال بہت مخلص ہیں۔“

”ہوں۔“ پروفیسر عادل نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

”ممکن ہے مانی واقعی کامی کے نام سے ڈس ایبل بچوں کے لیے کوئی ادارہ بنانا چاہتا ہو۔ بعض اوقات بعض لوگ اچانک ہی کوئی حیرت انگیز کام کر جاتے ہیں۔“

”شاید۔“ پروفیسر عادل بے حد الجھے ہوئے تھے ”آمنہ صفی کا اغوا میرے گھر کے سامنے ہوا تھا۔ کیا اس میں مانی کا ہاتھ تھا؟“

سرور نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا ”نہیں۔۔۔۔۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟“

”پتا نہیں۔“

وہ خود بھی اپنی بات پر حیران رہ گئے تھے شاید بہت دنوں سے جب آمنہ صفی نے ان سے اس روز الجھی الجھی باتیں کی تھیں۔ یہ خیال کہیں لا شعور میں چھپا ہوا اب خود بخود وہی لیوں پر آ گیا تھا۔

”نہیں قطعی نہیں۔ آمنہ کے اغوا میں مانی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔“ سرور نے بے حد یقین سے کہا۔

”ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ان کے سامنے ڈیرے کا منظر آ گیا۔ مانی کو بھلا کیا ضرورت پڑی تھی آمنہ ایسی عام سی شکل و صورت کی خشک مزاج لڑکی کو اغوا کرنے کی۔

”اوکے۔ پھر کب ملاقات ہوگی؟“

”اگلے ایک پرتو میں گاؤں جاؤں گا اور اس کے بعد کا ویک اینڈ آپ کے ساتھ..... کچھ ورک بھی کروں گا..... بہت دنوں سے برش اور رنگوں سے نانا ٹوٹا ہوا ہے۔“

”برش اور رنگ تو تمہاری شناخت ہیں تمہاری پہچان ہیں۔ غم روزگار میں الجھ کر انہیں نہ بھلا دیتا۔“

”نہیں! ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ برش ہو یا رنگ۔ قلم ہو یا کاغذ جس سے ایک بار نانا بڑ گیا اس سے پھر ٹوٹنا مشکل ہوتا ہے۔“

”ہاں جس سے ایک بار نانا بڑ گیا اس سے پھر ٹوٹنا مشکل ہی ہوتا ہے..... جیسے ان کے دل نے نرم سے نانا جوڑ لیا تھا اور اب.....“

”اچھا سرب اجازت ہے۔“

”ہاں۔“ انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھایا۔

تب ہی سائنڈ ٹیبل پر پڑے فون کی بیل بج اٹھی۔

انہوں نے سر دوڑ کو خدا حافظ کہتے ہوئے ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو۔“ بے حد تھکے تھکے انداز میں ریسیور کان سے لگاتے ہوئے انہوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔

”ارے عادل خان کہاں گم تھے آپ۔“ دوسری طرف میڈم تھیں۔

”کچھ دنوں کے لیے حویلی چلا گیا تھا۔ کیوں خیریت تھی؟“

”ہاں خیریت ہی تھی۔“ میڈم نرگس کی آواز میں چپکا تھی..... ”وہ تمہاری مسز زینب.....“ انہوں نے

جملہ ادھر اچھوڑ کر پھر سے بات مکمل کی..... ”زینی آئی ہوئی ہے۔ سو تمہیں اطلاع کرنا تھی۔“

”تھیک یو میڈم۔“ انہوں نے بے حد شائستہ انداز میں ان کا شکریہ ادا کیا۔

”بی آپا کی تاکید۔“

”ماں جی کی پریشانی۔“

”اور مریم کا خیال۔“

ذرا سی دیر کو ریسیور ہاتھ میں تھا وہ دھوکے سے گئے۔

”کہاں چلے گئے عادل خان؟“

”کہیں نہیں! یہیں تو ہوں میڈم۔“ وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

”یہاں تو خیر نہیں ہیں اس وقت آپ۔“ وہ ہولے سے ہنسیں ”ویسے ایک زبردست خبر

”کیا آپ کو علم ہے کہ زینی نے.....“

”کیا؟“ ان کا دل زور سے دھڑکا.....

”کہیں مریم کی والدہ نے انکار تو نہیں کر دیا.....“ انہیں لگا جیسے ان کا دل ڈوب رہا ہو۔

”کیا واقعی آپ کو علم نہیں؟“ وہ ان کا صبر آزمانے پر تکی تھیں۔

”نہیں۔“ انہوں نے ضبط کا مظاہرہ کیا ”میں نے آپ کو بتایا ہے تاکہ میں تقریباً ہفتہ بھر حویلی رہا اور

پھر یہاں آکر بھی بہت مصروف رہا۔ زینب ولا نہیں جاسکا۔“

”در اصل زینی نے شادی کر لی ہے۔“

”اوہ.....“ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور ان کا ڈوبتا ہوا دل جیسے ٹھہر سا گیا لیکن پھر بھی ایک

چپکا سا لگا تھا انہیں اور وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

”غصہ فرمک..... جانتے ہو غصہ فرمک کو؟“

”نہیں..... دراصل مجھے شوہر سے متعلق لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔“ ان کا لہجہ

دبیاتھا۔

”ہاں آپ ٹھہرے علمی دنیا کے آدمی۔“ میڈم نرگس انہیں غصہ فرمک کے متعلق بتانے لگیں..... ”زینی

کو چاہیے تھا پہلے وہ عاشقی اور مومو کی شادی کرتی اور پھر..... دونوں بچیاں بہت ڈسٹرب ہیں۔“

میڈم نرگس بغیر رکے بولے چلی جا رہی تھیں اور وہ کچھ عجیب سی کیفیت میں گھرے ان کی باتیں سن

رہے تھے۔ پتا نہیں ذہن ان کی باتوں کو کنج کر رہا تھا یا نہیں لیکن وہ ایر پیس کانوں سے لگائے ہوئے

ہوں ہاں کر رہے تھے۔

”تو اب کیا سوچا ہے آپ نے عادل خان؟“ میڈم نرگس نے پوچھا تو وہ چونکے۔

”میں نے۔“

”ہاں ہاں! اب ان حالات میں آپ کیا کریں گے؟“

”حالات کس طرح کے حالات؟“

انہوں نے بوکھلا کر سوچا۔ میڈم نے کن حالات کا ذکر کیا تھا۔ وہ تو شاید سن ہی نہیں رہے تھے یا اگر سن

رہے تھے تو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

”تو کیا کریں گے اب؟“ میڈم نے اپنا سوال دہرایا تو انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

”بی آپا کو ان کی آمد کے متعلق مطلع کر دوں گا۔ وہ..... آئی مین مریم کی والدہ یہاں ہی ہیں۔ زینب

ہائیں؟“ وہ کچھ جھجکا۔

”ہاں..... ہاں فی الحال تو ادھر ہی ہیں لیکن بہت جلد ہی مومن کے لیے دونوں فرانس جانے کا پروگرام

بنارہے ہیں۔“

میڈم نے انہیں مطلع کیا۔

ان کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں اور انہوں نے بے حد ناگواری سے سوچا۔

”یہ بھلا انہیں کیا سوچھی اس عمر میں شادی کی۔“

”میرے خیال میں آپ کچھ مصروف تھے۔“ میڈم نے شاید ان کی بے زاری محسوس کر لی تھی۔

”نہیں، خیر ایسا کچھ مصروف بھی نہیں تھا۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ ان کا میڈم کی لائسنسی اور فضول باتیں سننے کا قطعی موڈ نہ تھا اور پھر اس پر نرنب عثمان اور غضنفر ملک سے شادی کے انکشاف نے انہیں ایک دم بے زار کر دیا تھا اور وہ خود اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کا بھلا نرنب سے کیا رشتہ اور تعلق تھا..... وہ صرف ان کی والدہ کی بیوہ ہی تو تھیں پھر بھی انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے نرنب عثمان کا اپنی سے آدمی عمر کے لڑکے سے شادی کرنا خود ان کے لیے باعث شرم ہو۔

”کبھی آئیے نا عادل خان۔ اس روز سومر کی وجہ سے بد مرگی ہوگئی تھی اور آپ چلے گئے تھے۔“ ایک زیر دست قسم کی گالی ان کے طلق سے برآمد ہوئی ”جھوٹ بکنا ہے لالہ کو اپنی حویلی میں بند کر رکھا ہے اور الزام مجھ پر لگا رہا ہے۔ میں بہت جلد اس پر پتہ لگے گا کہ مقدمہ دائر کرنے والی ہوں۔“ انہوں نے پھر اسے گالیوں سے نوازا۔ پروفیسر عادل بدحوہ سے ہو کر بے اختیار بولے۔

”مجھے اجازت ہے میڈم ایک ضروری کام سے جانا تھا۔“

”ہاں آنا مت مجھو لے گا۔ اس روز آپ بغیر کچھ کھائے پیے ہی چلے گئے۔ کئی روز تک مجھے افسوس

رہا۔“

”جی، ضرور حاضر ہوں گا کسی روز۔“ ریسور کرڈیل پڑا لٹے ہوئے انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اپنی گائیکی کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں کے دلوں پر حکومت کرنے والی میڈم نرگس کے ساتھ گفتگو کرنا خاصا ٹکھن مرحلہ تھا۔ خاص طور پر وہ اپنی گفتگو میں جس روانی سے گالیوں کا استعمال کرتی تھیں پروفیسر عادل جیسے شخص کے لیے انہیں برداشت کرنا بے حد مشکل ہوتا تھا۔

”تو نرنب عثمان نے غضنفر ملک سے شادی کر لی بقول میڈم نرگس کے ٹٹ پونجیا ہیرو.....“ انہوں نے

از حد دکھ محسوس کیا۔

”مریم یقیناً بہت ڈسٹرب ہوگئی۔“

”اور عاشری بھی۔“

”کیا مجھے ان کے پاس جانا چاہیے۔“

انہوں نے سگریٹ سلگایا اور اضطراب سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑیں۔

”یقیناً اس وقت انہیں میری دل جوئی اور سہارے کی ضرورت ہوگی اور میڈم نرگس نے بھی تو

بتایا تھا کہ دونوں بچیاں ڈسٹرب ہیں بہت۔“

”اور اگر نرنب عثمان نے شادی کرنا ہی تھی تو انہیں چاہیے تھا کہ پہلے جتنی طور پر انہیں تیار کرئیں..... پھر لیکن پتا نہیں کیا ہوگا اور دونوں نے کیاری ایکٹ کیا ہوگا۔ شاید عاشری نے زیادہ محسوس نہ کیا ہو لیکن مریم..... وہ کم گو کم سخن لڑکی۔ جو نہ جانے کیوں ہر دم کھوئی کھوئی اور اداس رہتی ہے اور جو ابھی تک عثمان احمد کی جدائی کو ایکسپٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ کیا اس نے آسانی سے نرنب عثمان کی غضنفر ملک سے شادی کو قبول کر لیا ہوگا..... شاید نہیں..... شاید وہ بہت ڈسٹرب ہو۔ بہت اپ سیٹ اس سے بھی کہیں زیادہ جتنا میڈم نرگس نے بتایا تھا۔

وہ ایک دم بے چین ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ میں پکڑا ادھ جلا سگریٹ نیچے پھینک کر جوتے کی اڑی سے سلتے ہوئے نیا سگریٹ جلایا۔

”اور عاشری نے بھی فون نہیں کیا اتنے دنوں سے یا شاید میری عدم موجودگی میں کیا ہو۔“

”خدا بخش۔“ ایک گہرا کش لیتے ہوئے انہوں نے آواز دی ”میرے بعد کسی کا فون تو نہیں آیا تھا؟“

”نہیں جی۔“ خدا بخش جانے کہاں سے بھاگتا ہوا ”ان چندہ سولہ دنوں میں تو جی کسی کا فون نہیں آیا۔ جتنی کہ بھتیجی صاحب اور حافظ صاحب کا بھی نہیں۔ بس ایک روز تصدق اور آمنہ آئے تھے۔ آپ کا پتہ پھر چلے گئے۔“

”عاشری کا بھی نہیں۔“

”نہیں جی۔“

”اچھا۔“ انہوں نے آخری کش لے کر پھر سگریٹ نیچے پھینکا اور ریسور اٹھا کر نرنب ولا کے کمرے میں لے گئے لیکن پھر کچھ سوچ کر ریسور نیچے رکھ دیا۔

”خدا بخش میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔“

”ہاں جائیں گے؟“ خدا بخش ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

انہوں نے نگاہیں اٹھا کر خدا بخش کی طرف دیکھا..... ”عاشری کی طرف جاؤں گا۔“

”مور صاحب کو لے آئیے گا۔ ان کی باتیں بہت یاد آتی ہیں۔ ان کا کوئی کوئی انداز تو بالکل عثمان جیسا ہے۔“

”وہ تو مری میں ہے۔“ انہوں نے ٹیبل سے روٹھ مین کی ڈبیا اور گاڑی کی چابی اٹھائی اور خدا بخش کو

خدا حافظ کہہ کر پورچ کی طرف بڑھ گئے۔



مریم ارد گرد سے بالکل بے خبر لیونگ روم میں قالین پر اپنے سامنے کارڈ پھیلائے بیٹھی اکیلا "میویری" کھیل رہی تھی۔ وہ ایک کارڈ اٹھا کر دیکھتی پھر دوسرا اٹھاتی پھر رکھ دیتی۔ پروفیسر عادل بے بھریوں ہی اس کے پیچھے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ نوبت والا پہنچے تو شریف پورچ دھور ہاتھ..... اور اندرونی گیٹ بھی لاک نہیں تھا۔ وہ شریف سے خیر خیریت پوچھ کر اندر آ گئے اور مریم کو ان کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

"مریم۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گئے "یہ اکیلے اکیلے کارڈ کھیلے جا رہے ہیں اور باقی لوگ کہاں ہیں؟..... عاشی اور ماما..... شریف نے بتایا ہے کہ وہ گھر پر ہی ہیں۔" انہوں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

"آپ عادل بھائی۔" مریم چونک کر کھڑی ہو گئی "بیٹھیے نا۔"

"شکریہ۔" وہ قدرے پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے "عاشی کیسی ہے اس کی سیریل ختم ہو چکی ہے یا نہیں؟"

"سیریل تو ختم ہو گئی ہے۔" وہ کوئی کوئی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے تھے اور چہرے کی گلابیوں میں زردیاں مل گئی تھیں۔

"مریم" آپ اتنی پریشان کیوں رہتی ہیں۔ زندگی کے حقائق کو ایسی لیا کریں۔" وہ بے اختیار کہہ بیٹھے "زندگی میں نشیب و فراز تو آتے رہتے ہیں۔ لگتا ہے آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر حوصلہ کھودیتی ہیں۔"

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر مریم نے اپنی لائی پلکیں اوپر اٹھائیں اس کی بے حد دلکش آنکھوں میں طال کے رنگ گہرے ہو گئے "یہ بھلا چھوٹی سی بات ہے کیا۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور پروفیسر عادل کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کون سی بات؟"

پروفیسر عادل گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور اس کا کرب اس کا دکھ جیسے ان کی روح میں اتر رہا تھا۔

"ہاں نہیں میں کیا کہہ گئی ہوں۔ میرے سر میں بہت درد ہے نا۔" اس نے مسکراتے کی کوشش کی "ماں جی اور بی آپا کیسی ہیں۔ کامی کا کچھ ہوا چلا؟"

"کامی کا کچھ ہوا نہیں چلا۔ ماں جی اور بی آپا خیریت سے ہیں لیکن آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہی ہے۔"

"نہیں تو میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ دراصل آج رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی ہوں نا اس لیے حداثہ ہے۔" مریم کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

"مریم۔" پروفیسر عادل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں "آپ کو یاد ہے نا میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اپنی ہر بات ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ بخدا مریم....."

"السلام علیکم عادل بھائی۔" عاشی نے قریب آتے ہوئے سلام کیا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حسب معمول اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر اپنے ہونٹ رکھے۔

"کیسی ہو گڑیا؟"

"فائن۔"

عاشی مسکراتی لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں جیسے کچھ دیر پہلے روتی رہی ہو "لگتا ہے جیسے میڈم نے جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہے اور یہ کہ مریم اور عاشی دونوں ہی ڈسٹر ب لگ رہی ہیں۔" عاشی کو پاس بٹھاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

"ہاں عاشی گڑیا میں آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے آیا ہوں..... آپ کی سیریل ختم ہو گئی ہے یا نہیں؟" انہوں نے خوشگوار لہجے میں ماحول کی اداسی کم کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں سیریل ختم ہو گئی ہے لیکن بعض اوقات زندگی میں کچھ ایسے حادثات ہو جاتے ہیں کہ بہت یقین اور اعتماد سے کیے ہوئے وعدے بھی نبھائے نہیں جاسکتے۔"

"کیوں بھئی" کیا ہو گیا سسر۔" وہ بدستور اسی لہجے میں بات کر رہے تھے "وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے۔ اسے ہر حال میں نبھانا چاہیے۔ کہیں آپ وعدہ توڑنے کا ارادہ تو نہیں رکھتیں گڑیا؟"

"نہیں۔" وہ مسکراتی۔

لیکن عادل نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ پھکی پھکی تھی۔

"میں نے یوں ہی ایک بات کی تھی۔"

"جھٹکس۔" میں تو ذرا ہی گیا تھا۔ تو اب کیا ارادہ ہے۔ ایک دو ماہ تک بی اے کے ایڈمیشن شروع ہو جائیں گے۔ آپ کا ارادہ کیا ہے کس کالج میں ایڈمیشن لینا چاہیں گی؟"

"ہائیں میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔ دو ماہ تو بہت ہوتے ہیں۔ جانے کیا ہو جائے۔"

"کیا ہونا ہے بھئی؟"

"ہوئے کو تو لٹھوں میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"آج بڑا افسوس بولا جا رہا ہے۔"

پروفیسر عادل نے مسکرا کر اسے دیکھا وہ سامنے دیکھ رہی تھی..... غضنفر ملک شریف کے ساتھ

باتیں کرتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا اور بلیو کمر کے تھری پیس سوٹ میں بے حد شاعرانہ لگ رہا تھا۔ پروفیسر عادل کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں۔

”غضنفر ملک۔“

عاشی نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر پروفیسر عادل کو دیکھا۔

”ماما کے شوہر۔“

پروفیسر عادل بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیا آپ کو حیرت ہوئی، بچو نے آپ کو نہیں بتایا کہ ماما نے غضنفر ملک سے شادی کر لی ہے۔“

عاشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں جانے کیسی کیفیت تھی کہ پروفیسر عادل نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپایا۔

”جیک اسٹ ایزی گریڈ۔“ وہ ہولے سے بولے۔

”اپنے عادل میاں ہیں جی۔۔۔۔۔ اپنی مومو بی بی اور عاشی بی بی کے بھائی۔“ شریف مسکرا کر غضنفر ملک

سے ان کا تعارف کروانے لگا۔ غضنفر ملک نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔

”آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ زینبی آپ کی تعریف کرتی ہیں۔“

پروفیسر عادل کو عجیب سا لگا جب اس نے مسز نوب کو زینبی کہہ کر بلایا۔

”شکریہ۔“

انہوں نے باری باری مریم اور عاشی کی طرف دیکھا۔ جو نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔

”آپ غالباً کہیں جا رہے ہیں؟“

”ہمیں ایک ٹی پارٹی میں جانا تھا۔ ورنہ آپ کے پاس بیٹھتے۔“ انہوں نے مڑ کر شریف کی طرف

دیکھا جو ابھی تک وہاں ہی کھڑا تھا۔

”دیکھو جا کر کہ زینبی تیار ہوئی ہے کہ نہیں۔ ہم پہلے ہی لیٹ ہو رہے ہیں۔“

پھر وہ عادل کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ عورتوں کی تیاری۔۔۔۔۔ اتنی دیر میں تو امریکا والے چاند پر پہنچ جائیں۔ جتنی دیر میں ان کا میک اپ

مکمل ہوتا ہے حالانکہ زینبی کو کسی میک اپ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اتنی مکمل ہے کہ۔۔۔۔۔“

اس کا انداز بہت عامیانہ سا تھا۔ پروفیسر عادل نے بہت ناگواری محسوس کی۔

اس نے کلائی موڑ کر ناٹم دیکھا اور پھر آوازیں دینے لگا۔

”زینبی ڈیڑ بج رہی ہے کروادیاں تمہارے مہمان بھی ہیں۔۔۔۔۔ اب آ بھی جاؤ۔“

”کون؟“ زینب خوشبوؤں میں بس اپنے بیڈروم سے برآمد ہوئیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ بہت دلکش اور

فریش لگ رہی تھیں۔

”اور اگر غضنفر ملک نے ان سے عمروں کے اتنے زیادہ فرق کے باوجود شادی کر لی تھی تو اتنی اچنبھے کی

بات بھی نہ تھی۔“ پروفیسر عادل نے سوچا اور احتراماً کھڑے ہو گئے۔

”میرے عادل! کیسے ہیں آپ؟ بہت عرصے بعد آپ کو دیکھا۔“ وہ قریب آتے ہوئے خوش دلی سے بولیں۔

”بس وہ کچھ مصروفیات رہیں۔ میں زیادہ تر حویلی میں رہا اور جب کسی آیا تو آپ نہیں تھیں۔“ ان کی

چاہیں جھکی ہوئی تھیں اور لہجے میں احترام تھا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ بلواؤں آپ کو کسی دن۔۔۔۔۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔“

ان کی نگاہیں بے اختیار مریم کی طرف اٹھ گئیں جو بدستور ہاتھ کود میں دھرے نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

”لیکن اس وقت تو ہم انوائیٹڈ ہیں۔ پھر کبھی آپ سے بات ہوگی اور ہاں۔۔۔۔۔“ انہوں نے مسکرا کر

غضنفر ملک کی طرف دیکھا۔ ”آپ؟ غزنی سے لے؟“

”جی ہاں میں نے تمام سیاق و سباق کے ساتھ ان کا تعارف کروا دیا ہے۔“ عاشی نے جھکا ہوا سر

اٹھایا۔ مسز نوب نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”بائی داوے عادل بھائی! آپ کو حیرت نہیں ہوئی کہ ماما غضنفر ملک کے ساتھ رخصت ہونے کے

بجائے انہیں اپنے ساتھ رخصت کروا کے لے آئی ہیں۔“ اس کا لہجہ سراسر تمسخر لیے ہوئے تھا۔

مسز نوب کا چہرہ تپ گیا۔

”عاشی تم حد سے بڑھ رہی ہو، بہت دنوں سے میں تمہیں برداشت کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ آخر

چاہتی کیا ہو تم۔۔۔۔۔؟“

انہوں نے حتی الامکان اپنا لہجہ دھیمار کھینے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ عادل کے سامنے بے قابو نہیں ہونا

چاہتی تھیں۔

”سادہ سی بات ہے ماما! میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے شوہر نامہ دار کے ساتھ اپنے گھر چلی جائیں اور

میں اکیلا چھوڑ دوں۔ ہم آپ کے بغیر بھی زندگی گزار سکتے ہیں۔“

”ذات!“ مسز نوب عثمان کا ضبط جواب دے گیا۔ ”یہ میرا گھر ہے۔۔۔۔۔ میرے نام ہے یہ گھر۔“

”اوہ۔“ عاشی نے ہونٹ سیکڑے ”تو پھر ٹھیک ہے“ آپ رہیں اس گھر میں ہم چلے جاتے ہیں۔“

”کہاں جاؤ گی تم؟“ وہ استہزائیہ انداز میں نہیں۔

”اپنے باپ کے گھر اپنے بھائی کے ساتھ۔“

اس نے مڑ کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا جنہوں نے بے اختیار ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

غضنفر ملک بہت پرسکون سادہ یوار کی پیٹنگ کو دیکھ رہا تھا اور زینب عثمان اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش

کرتے ہوئے اسے گھور رہی تھیں۔

”چلیں بجو اٹھیں۔۔۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ مور اور نینا کو بھی بھول جائیے گا آپ۔۔۔ میرے بھائی کے گھر میں ہم سب کے لیے بہت جگہ ہے۔“ اس نے مریم سے نظریں ہٹا کر مسز زنب کی طرف دیکھا جو ابھی تک خاموش کھڑی تھیں۔

مریم جیسے خواب کی سی کیفیت میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ ماما کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور عاشری کو بھی اکیلا نہیں کر سکتی تھی۔

”چلیں بجو۔“ پروفیسر عادل کے بازو سے نکل کر اس نے آگے بڑھ کر مریم کا ہاتھ تھاما۔ مریم نے نتنی نظروں سے زنب عثمان کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ اسے اور عاشری کو روک لیں گی لیکن اس کی آنکھوں سے تو جیسے شعلے نکل رہے تھے اور چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس نے بے حد مایوسی سے ان پر نظریں ہٹالیں۔ اپنے خشک ہوتے لیوں پر زبان پھیری اور پھر عاشری کی طرف دیکھا۔

”او کے عاشری۔۔۔ یہی بہتر ہے۔“

”ہمیں اس گھر سے کچھ نہیں لینا۔“ عاشری کے لہجے میں بغاوت تھی۔

”تمہارے بھائی کے پاس تمہارے لیے بہت کچھ ہے گڑیا۔“ پروفیسر عادل جو اس صورت حال۔

کچھ گھبرائے رہے تھے۔ ایک دم پر اعتماد سے ہو کر بولے۔

”مریم نہیں جائے گی تمہارے ساتھ۔“ مسز زنب کا لہجہ پتھر کی طرح تھا۔

”کیوں؟“ عاشری نے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیوں نہیں جائیں گی وہ؟“

”تم تو اپنے بھائی کے گھر جاؤ گی۔ اس کا کیا ناتا ہے عادل خان یا بیوی حویلی والوں کے ساتھ۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ عاشری کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”مریم کا باپ عثمان احمد نہیں تھا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔

”نہیں۔“ مریم کو لگا جیسے اس کے کانوں نے غلط سنا ہو۔ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”آپ جھوٹ بول کر بچو کو نہیں روک سکتیں ماما۔“ عاشری کی آواز تیز تھی۔

”اپنے بھائی سے پوچھ لو۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔ عاشری نے مڑ کر عادل کی طرف دیکھا تو وہ

نے نگاہیں جھکا لیں۔

”مریم میری بیٹی ہے۔۔۔ میری بیٹی عثمان احمد کی نہیں۔“ مسز زنب کی آواز بلند اور لہجے میں دھنڈانہ

رنگ تھا۔

مریم کو لگا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہو اور آسمان اس پر گر پڑا ہو۔

”او کے ماما۔“ عاشری دوسرے ہی لمحے نارمل ہو گئی تھی۔

”عثمان احمد میرے پاپا نہیں ہیں۔۔۔ میرے۔۔۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“ مریم نے ڈوبتے ذہن

کے ساتھ سوچا اور اس کی کیفیت سے بے خبر عاشری ہنس رہی تھی۔

”یعنی اس کا مطلب ہے۔۔۔“

اس نے غضبناک کی طرف اشارہ کیا جو اب بھی اس ساری صورت حال سے خود کو بے گانہ ظاہر

کر رہا تھا۔

”یہ آپ کے تیسرے شوہر ہیں یا پھر ممکن ہے چوتھے ہوں باقی انکشاف بھی آج ہی ہو جائیں تو بہتر

نہیں ہے کیا۔ پھر شاید ملاقات نہ ہو۔“

”نٹ اپ عاشری۔“ زنب عثمان کا ہاتھ بے اختیار اس پر اٹھ گیا۔

”مریم۔“ پروفیسر عادل کی نظریں یک دم مریم کی طرف اٹھیں اور پھر دوڑ کر انہوں نے اسے گرتے

مڑے سنبھال لیا۔۔۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ ہولے ہولے مل رہے تھے۔

”نہیں وہ میرے پاپا تھے میرے اپنے پاپا۔“

”مریم۔۔۔ مریم آنکھیں کھولیں، ہوش میں آئیں۔“ اسے صوفے پر لٹاتے ہوئے وہ دیوانہ وار اسے

پارنے لگے۔ لیکن وہ آنکھیں بند کیے ان کی آواز سے بے نیاز اور بے پروا بالکل ساکت پڑی تھی

اور ہونٹ اب بھی مل رہے تھے لیکن آواز نہیں آرہی تھی۔

”مریم۔“ انہوں نے اضطراب سے اس کے ہاتھوں کو رگڑا۔ ان کا دل جیسے ڈوب جانے

لگتا۔ انہوں نے سر اٹھا کر پاس کھڑی عاشری کو دیکھا۔

”عاشری۔۔۔ ڈاکٹر عبدالعزیز ہوں گے گھر پر؟“

”نہیں، لیکن انگل ہاشم ہوں گے۔“

عاشری۔۔۔ چونک کر اوپر کی طرف بھاگی اور پھر وہ اسے اسی بے چینی سے پکارنے لگے۔



”پاپا۔۔۔ پاپا کہہ دیں یہ جھوٹ ہے غلط ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، صرف آپ کی۔۔۔“

عثمان احمد کی اٹھنڈی میں ان کی تصویر کے سامنے کہنی چبکتے ہوئے مریم نے بغور تصویر کو دیکھا۔

اور یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ عثمان احمد کے علاوہ کوئی اور شخص اس کا باپ ہو۔۔۔ اور پاپا نے تو اسے ماما

سے بھی زیادہ چاہا تھا۔ وہ تو ہمیشہ ماما کے متعلق شکوک میں مبتلا رہتی تھی کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں ہیں۔ پاپا

نہیں تو ایک بار بھی اس نے ایسا نہیں سوچا تھا کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے۔ اور۔۔۔ نہیں پاپا، نہیں۔

”کہہ دیں ایک بار کہہ دیں۔۔۔ صرف ایک بار کہہ دیں آپ کی بی بی بیٹی ہوں۔ صرف آپ کی۔“

”جس مرثا کرو نے لگی۔“

اس کا ذہن ابھی تک خالی تھا۔

”آپ کو.....؟“

اس کی نظریں عادل کی طرف اٹھیں، جس نے نظروں ہی نظروں میں اسے کچھ کہنے سے منع کر دیا۔

”خدا جانے لیکن آپ نے ہمیں پریشان کر دیا۔“ وہ مسکرائی۔

”پتا ہے آپ کو؟ آپ آج صبح پورے چوبیس گھنٹوں بعد ہوش میں آئی تھیں۔ پھر ڈاکٹر نے خود ہی آپ

کو زکوالا زردے دیا سکون کے لیے..... اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“

اس نے محبت سے مریم کے ہاتھ تھپتھپائے۔

”مگر عاشی! میں اچانک بے ہوش کیسے ہو گئی تھی؟“

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

”مریم پلیز! آپ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں۔“

عادل..... نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ہاں! عادل بھائی صحیح کہتے ہیں۔“

عاشی نے اس کی تائید کی۔

”ابھی آپ ذہن کو مت تھکا لیں اور پتا ہے عادل بھائی مسلسل ہمارے ساتھ رہے ہیں ادھر اسپتال

میں..... اور.....“

اس نے چپل اتار کر دونوں پاؤں سمیٹ کر اوپر بیڈ پر رکھ لیے اور اپنے مخصوص انداز میں گھٹنوں کے

گرد بازو پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”اور ہم کتنے خوش قسمت ہیں جبکہ ہمارے ایک بڑے بھائی بھی ہیں جو کسی بھی مشکل میں ہمیں اکیلا

نہیں چھوڑیں گے۔ ہیں نا؟“

”ہوں۔“

اس نے سر ہلایا۔

اسے تو پہلے روز ہی عادل پاپا کی طرح لگے تھے۔ ان ہی کی طرح نرم اور شفیق۔

”لیکن ماما..... ماما کہاں ہیں؟“

”کمرہ لیکن آتی رہی ہیں وہ اسپتال میں۔ اور وہ خود بھی تمہارے لیے پریشان تھیں۔“

”وہ ٹھیک تو ہیں نا عاشی..... انہیں ڈیپریشن تو نہیں ہوا؟“

اسے یکدم ان کی فکر پڑ گئی کہ وہ تو ذرا سی پریشانی پڑ پیر لیں ہو جاتی تھیں۔ ان کے اعصاب اس قدر

کمزور تھے کہ کچھ بھی تو برداشت نہ کر پاتی تھیں اور اس کی طویل بے ہوشی۔ ضرور وہ ڈیپر لیں ہوں گی تب

کتنے سارے دن ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلا دلا کر تھک گئی تھی کہ ماما نے جو کچھ کہا تھا وہی

تھا اور یہ کہ وہ عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا یا وہ یقین کرنا نہیں چاہتی تھی..... اور

کتنے دن ہو گئے تھے پورا ایک مہینہ مگر وہ اس دکھ سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے ابھی ابھی

نے کہا ہو کہ تم عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہو..... اور جیسے ابھی ابھی اس کی ساعتوں پر دھماکے ہو رہے ہوں اور وہ

گول گول دائروں میں گھوم رہی ہو۔

اور یوں ہی تو لگتا تھا اسے۔

جیسے آسمان اس پر آگرا ہوا اور زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں

سے ماما کو دیکھ رہی تھی اور..... اور پھر جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی..... دوبارہ جب

ہوش کی دنیا میں آئی تو اسپتال میں تھی..... اور اس کے بالکل سامنے عادل خان بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ میں کہاں ہوں؟“

اس کا ذہن خالی خالی سا ہو رہا تھا۔

”مریم..... مریم پلیز! لیٹی رہیں۔“

پروفیسر عادل نے جو اسے ہی دیکھ رہے تھے بے اختیار کہا۔

”لیکن میں یہاں.....“

”آپ اسپتال میں ہیں مریم۔“

”مگر مجھے کیا ہوا تھا؟“

وہ بدستور ابھی ہوئی تھی۔

”یونہی! آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“

ان کا لہجہ از حد نرم اور اپنائیت لیے ہوئے تھا پھر بھی ان کے وہاں ہونے سے وہ الجھ رہی تھی۔

”مگر ماما اور عاشی.....؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ تب ہی عاشی وادش روم سے باہر نکلے۔

”بجو! آپ کیسی ہیں؟“

اس نے خوش دلی سے پوچھا اور اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہوں بالکل۔“

عاشی کو دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔

”لیکن عاشی! مجھے کیا ہوا تھا؟“

ہی تو یہاں اسپتال کے کمرے میں عادل اور عاشری ہیں صرف۔

”عاشری، ہم گھر کب چلیں گے؟ میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اچھا محسوس کر رہی ہوں۔“

”ہاں، عادل بھائی ڈاکٹر سے پوچھ لیتے ہیں۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ابھی چل جائیں گے۔“

عاشری نرمی اور آہستگی سے سمجھانے والے انداز میں بات کرتی اسے اپنے سے بڑی لگ رہی تھی۔

”عاشری، تم ایک دم کتنی بڑی اور سمجھ دار لگنے لگی ہو۔“ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”انسان کے حالات اسے بعض اوقات بہت چھوٹی عمر میں ہی سمجھ دار بنادیتے ہیں اور میں تو اتنی

چھوٹی بھی نہیں ہوں۔“

”لیکن اتنی بڑی بھی تو نہیں ہو۔“ اس نے بے حد محبت سے کہا۔ تب ہی پروفیسر عادل کھڑے ہو گئے۔

”میں ڈاکٹر سے پتا کر لوں شاید وہ ابھی گھر جانے کی اجازت دے دیں۔“

”ہاں ضرور۔“

اس نے تشکر نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”اوئے!“

پروفیسر عادل باہر چلے گئے۔

تو اس نے پھر عاشری سے پوچھا۔

”عاشری سچ بتاؤ، ماما ٹھیک ہیں نا؟“

پتا نہیں کیوں اسے وہم سا ہو رہا تھا جیسے ماما ٹھیک نہ ہوں۔ ورنہ..... انہیں تو اسپتال میں ہی ہونا چاہیے تھا اپنی سہیلیوں کے ساتھ۔ بھلا عاشری اتنی بڑی بھی کب ہوئی ہے کہ..... اور پھر ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ساہو پورا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے واضح ہو گیا۔

ماما کی شادی۔

عاشری کا رومل۔

اور..... اور پھر۔

”نہیں۔“

اس کے لبوں سے سسکی سی نکلی۔

”نہیں عاشری، نہیں ماما جھوٹ کہہ رہی تھیں نا مجھے روکنے کے لیے تاکہ میں..... میں عادل بھائی کے ساتھ حویلی نہ جاؤں۔ تم جو جا رہی تھیں..... اور پھر ماما اکیلی ہو جاتیں نا..... پھر مور کا اور نینا کا خیال کوں

رکنا۔ ماما نے اسی لیے جھوٹ بولا تھا۔ میں..... میں پاپا کی بی بیٹی ہوں نا۔“

اظہار کی کیفیت میں اس نے عاشری کے ہاتھ تھام لیے۔

”بولو نا عاشری۔“

”بجوا۔“

عاشری نے نظریں جھکا لیں۔

”کہہ دو..... کہہ دو نا عاشری۔“

اس نے ہلکی نظروں سے اسے دیکھا۔

عاشری نے اس کے ہاتھ تھپتھپائے۔

”شاید وہ جھوٹ نہیں تھا۔“

اس نے عاشری کی جھکی ہوئی نظروں کو دیکھا اور اسے لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ جیسے زندگی میں کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔ پاپا اس کے پاپا نہیں تھے اور وہ ان کی بیٹی نہیں تھی۔ کس قدر اذیت ناک خیال تھا اور کتنا تکلیف دہ۔

آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے۔ عاشری نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”مریم!“

عادل جانے کب اندر آئے تھے۔

اس نے عاشری کے کندھے سے۔ انڈا کر عاشری کی طرف دیکھا۔

”ہوئے پختے ہوئے اس نے بند رقعہ۔“

مریم زندگی لے حقائق کو ACCEPT تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ جلد یا بدیر۔ جانتا ہوں کہ آپ کو شدید درد پہنچا ہے، شک لگا ہے لیکن ایک بات کا یقین رکھیں آپ۔ اب آپ کو اذیت چاہئے تھی اور اسی طرح بہت کرتے تھے جس طرح کوئی باپ اپنی بیٹی سے کرتا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گی کہ دو دلوں میں میرے ماما سب سے زیادہ انہوں نے آپ کی باتیں کیں۔“

وہ جانتی تھی اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی لیکن پھر بھی یہ دکھ یہ اذیت کہ وہ ان کا خون نہیں تھی وہ ان کی بیٹی نہیں تھی اس کی رگوں کو کاٹ رہا تھا۔ خون کے اندر اذیت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھوں مابہشت سے آنسو پونچھے اور یہ شخص عادل احمد خان۔

جیسے پہلی بار دیکھ کر اسے بڑی تقویت اور مسرت کا احساس ہوا تھا..... پاپا سے ملتا جلتا یہ شخص۔

انہی کی طرح مہربان اور شفیق۔

پاپا کی ڈیڑھ کے بعد جب وہ ماں جی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا، اسے حوصلہ اور تسلی دے رہا تھا تو

اسے کتنے تحفظ اور اپنائیت کا احساس ہوا تھا کہ اس کا کوئی بڑا بھائی ہے۔

سو تیار ہی تھی لیکن ہے تو۔

اور وہ شخص اس کا کچھ نہیں لگتا تھا۔

کوئی رشتہ نہیں تھا اس کا ان سے۔

دکھ، گہرا دکھ۔ چہرہ کھڑے کھڑے کر دینے والا دکھ اس کے اندر اس کے وجود میں اپنے نوکیلے پن

کاڑے سے از حد اذیت پہنچا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

”پلیز مریم، حوصلہ کریں۔ بہادری سے حقیقت کو فیس کریں۔“

عادل نے اسی نرم لہجہ میں سمجھایا۔

لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا۔ اس نے کتنی کوشش کی تھی کہ خود کو یہ باور کرائے اور پھر زندگی کی اس انتہائی تلخ حقیقت کو قبول کر لے لیکن دل کسی طور سے اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا، حتیٰ کہ ماننے بھی تصدیق کر دی تھی۔

”یہ FACT ہے جانو!“

لیکن وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی تھی جیسے اسے ماما پر اعتبار نہ ہو۔ جیسے ماما ابھی کہہ دیں گی ”میں نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا۔ جھوٹ بولا تھا۔“ لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے خود ہی

لگا ہوں جھکا لی تھیں۔

”مجھے تم سے اتنی کم ہمتی کی توقع نہیں تھی مومو۔ اب بھلا اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات

ہے۔ تمہارے ڈیڈی ایک انتہائی CONSERVATIVE آدمی تھے اور جب تم پیدا ہوئیں تو

ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی..... اور تمہاری پیدائش کے دو تین ماہ بعد میری اور عثمان کی شادی ہو گئی

تھی اور عثمان نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھا لیکن یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ ہے کہ تم اس کی بیٹی نہیں ہو۔

نائب کا لہجہ اتنا اجنبی اور بے نیاز سا تھا کہ اس کے اندر جیسے برف اترنے لگی۔

”غصہ بھی تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا اور تمہاری وجہ سے ہمیں اپنا اسلام آباد کا ٹور کینسل کرنا پڑا

”آپ چلی جاتیں ماما عاشر تو تھی نا اور پھر عادل بھائی بھی تھے۔“ اس کے لہجہ میں کوئی تاثر نہ

سپاٹ اور بالکل بے جان لیکن نائب عثمان نے اس کے لہجہ پر غور نہ کیا۔

”دراصل غصہ چاہتا تھا کہ یورپ جانے سے پہلے میں اس کے والدین سے مل لوں۔ وہ اسلام

کے قریب کسی گاؤں میں رہتے ہیں لیکن خیر اب واپسی پر مل لیں گے۔“

”آپ کہیں باہر جا رہی ہیں؟“

اس نے اسی لہجہ میں پوچھا۔

”ہاں، ہم لوگوں کا پروگرام تھا اور لڈنور پر جانے کا۔ غصہ کی خواہش ہے ورنہ میں نہ جاتی لیکن وہ سمجھے گا

کہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے یا میں اس کو اہمیت نہیں دیتی۔“

انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

اور اس طرح پاپا کی پروا تو انہوں نے کبھی نہیں کی تھی۔

اس نے سوچا۔

اور پھر ماما غصہ ملک کے بلانے پر اٹھ گئی تھیں اور وہ یونہی ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہی

تھی..... اور اس کے اندر جیسے برف سی گرتی رہی..... ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اس شخص کے متعلق

نہیں سوچا تھا جو اس کا باپ تھا۔ وہ کون تھا۔ کہاں تھا؟ کیسا تھا..... نہ ہی اس نے ماما سے کچھ پوچھنے کی

کوشش کی تھی۔ بس اس کے ذہن میں یہی ایک دکھ نجد ہو گیا تھا کہ وہ عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے۔

عثمان احمد اس کے پاپا نہیں ہیں۔

بڑی دیر بعد عاشر اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔

”بجوا!“

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

”کیا سوچ رہی ہیں..... زیادہ مت سوچا کریں۔“

اس نے تھکی تھکی بوجھل ہلکیں اٹھائیں۔

”عاشر..... تم تو اس روز عادل بھائی کے ساتھ جا رہی تھیں..... پھر کیا مانا جانے نہیں دیا عادل

بھائی ساتھ لے کر نہیں گئے؟“

”بس یونہی جذباتی ہو گئی تھی بجو ورنہ.....“

اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔

”سب سے قریبی رشتہ تو ہمارا ماما کے ساتھ ہی ہے نا..... انہیں چھوڑ کر کہاں جانا ہے ہم

نے..... اور.....“

اس نے موضوع بدلا۔

”ہائے داؤسے! ماما اور غصہ ملک گھر پر ہی ہیں کیا؟“

”ہاں۔“

مریم نے سر جھکا لیا۔

”اوکے! میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“

باخبر بھی ہو گیا نہیں۔

اور اگر وہ میرے وجود سے باخبر ہوتا تو کبھی تو..... کبھی تو رابطہ کرتا۔

اور پھر وہ خود ہی اس خیال کو جھٹک دیتی۔

”جہیں وہ صرف اور صرف اپنے پاپا کی بیٹی ہے اور باقی سب جھوٹ ہے..... اسے کسی کے متعلق کچھ

نہیں جانتا۔“

اما نہیں ہوتی تو شاید وہ کسی لمحے ان سے پوچھ ہی لیتی۔

لیکن اب اما نہیں تھیں..... وہ غنفر ملک کے ساتھ ورلڈ ٹور پر نکل گئی تھیں۔ بقول میڈم نے بنی

مون ٹرپ پر۔“

اور یہ خیال ذہن میں آ کر نکل جاتا اور پھر وہی احساس۔

وہی بچہ کے دینے والا احساس کہ وہ پاپا کی بیٹی نہیں ہے۔ اس کے دل پر ضربیں لگانے لگتا۔

اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر عثمان احمد کی تصویر کو دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ اسے دیکھ کر مسکرائے ہوں۔

”تم صرف اور صرف میری بیٹی ہو اور دیکھو میرے بعد سب کا خیال رکھنا..... عاشری نا سمجھ ہے اور مور

بہت حساس اور لاڈلا۔“

کہیں قریب ہی سرگوشی گوئی تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن آس پاس کوئی بھی نہیں تھا.....

پاپا کی تصویر اسی طرح حلیف پر پڑی تھی۔

”ہاں پاپا! مجھے سب کا خیال رکھنا ہے..... اور میں.....“

اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”میں اپنے ہی دکھ میں الجھی ہوئی ہوں..... میں بس اتنا جانتی ہوں پاپا کہ آپ میرے پاپا ہیں۔“

اس نے جھکتے ہوئے تصویر کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے ”اور مجھے آپ کے بعد سب کا خیال رکھنا ہے۔“

”میں نے آپ سے Promise کیا تھا نا پاپا..... اور آپ جانتے تھے کہ ماں بہت بے پروا ہیں اور

اب بھی وہ ورلڈ ٹور پر چلی گئی ہیں اور آج ان کو گئے تین ماہ ہو گئے ہیں اور ان تین ماہ میں صرف انہوں نے

دو بار بات کی اور آج مور اور نیتانے آنا ہے..... اور مور کس قدر اداس ہو گا ماں کو یہاں نہ پا کر۔“

ورنہ یہ تو فتح رکھتا ہے کہ اما اس کی منتظر ہوں۔

اور وہ..... اسے خیال رکھنا ہے مور کا نینا کا ہاں۔

اس نے مسکرا کر پاپا کی تصویر کی طرف دیکھا۔

اور دونوں ہاتھوں سے بال سنواری باہر نکل آئی۔

فی دی لاؤنچ میں آ کر اس نے صفیہ کو آواز دی۔

بے اختیار مریم نے پوچھا۔

”یونہی ذرا انکل شی کی طرف جاؤں گی۔“

”لیکن کیوں؟“

مریم مضطرب ہوئی۔

”وہ اپنے ڈرائے کی وڈیو کیسٹ لینا تھی ان سے۔“

”تمہارا جانا ضروری ہے کیا۔ ڈرائیو کو بھیج دو۔ لے آئے گا۔“

عاشری نے نیچلے ہونٹ کو دانتوں میں دب کر بغور اسے دیکھا۔

”اور گھر میں بیٹھ کر کیا کروں۔ اما اور غنفر ملک کو دیکھوں..... کم از کم ابھی میں اما کے ساتھ غنفر ملک

کا وجود برداشت نہیں کر پاتی ہوں۔ شاید کچھ عرصے تک عادی ہو جاؤں لیکن ابھی نہیں۔“

وہ بات مکمل کر کے تیزی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔

اور پتا نہیں اما اور اس کے درمیان کیا بات ہوئی تھی اور اما نے کیسے اسے روکا تھا لیکن بظاہر وہ بہت

مطمئن لگتی تھی ہاں کبھی کبھی کوئی تلخ بات کہہ جاتی تھی جیسے ابھی اس نے کہا تھا لیکن یہ کتنا بڑا جج تھا اور واقعی

یہ کتنا مشکل تھا۔ اما اور غنفر ملک کو ایک ساتھ دیکھنا..... اور ایسے میں جانے کہاں سے پاپا اس کے سامنے

آ کر کھڑے ہوتے تھے ہو لے ان کے ساتھ چلتے۔

نرم نرم لہجے میں ان سے بات کرتے۔

اس نے سرگھٹنوں پر رکھ لیا اور عثمان احمد کے متعلق سوچنے لگی۔ اما تیار ہو کر غنفر ملک کے ساتھ با

چلی گئیں لیکن وہ وہاں ہی بیٹھی خود کو یہ یاد کرانے کی کوشش کرتی رہی کہ جو کچھ اما نے بتایا ہے وہ سچ ہے۔

درد میں ذرا بھی تو کمی نہیں آئی تھی۔ وہی روز ازل کی طرح دل کو کچل رہا تھا اور کھرج رہا تھا۔ یقین آ جاتا تو

شاید تکلیف کم ہو جاتی لیکن یقین ہی تو نہیں آ رہا تھا۔ اس نے میڈم نرس سے بھی پوچھا تھا اور انہوں نے

بھی تائید کر دی تھی۔

”ہاں زینبی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ تم عثمان کی بیٹی نہیں ہو۔ تمہارے والد کو میں نے تو دیکھا نہیں تھا

لیکن زینبی نے بتایا تھا کہ بہت تنگ نظر تھا اور بیک گراؤڈ بھی بہت پور تھا اس لیے طبعی ہو گیا۔“

مگر اسے اس بات سے تو فی الحال کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ ورنہ وہ پوچھتی

اما سے کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے..... اور اب اسے کئی دن سے خیال آ رہا تھا کہ نہ جانے اس کا پاپا

باپ کیسا ہو گا۔ کہاں ہو گا..... شاید اس نے بھی اما کی طرح شادی کر لی ہوگی اور اس کے اور بھی بچے

ہوں گے اور شاید اس نے بھی سوچا بھی نہ ہو گا میرے متعلق۔

اور پتا نہیں اما نے اسے میری پیدائش کی اطلاع بھی دی تھی یا نہیں اور پتا نہیں وہ میرے وجود

”صفو..... دیکھو آج مور اور نینا کو آتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا مور کھانے میں کیا پسند کرتا ہے۔“
 ”جی وہ تو پتا ہے جی آج سب کچھ مور کی پسند کا ہی بنے گا۔ شریف نے پڈنگ تو صبح بنا کر رکھ دی تھی۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے سنو..... دیکھو عاشی بی بی کیا کر رہی ہیں؟“
 ”جی وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ تو چلی گئی تھیں صبح ہی۔“
 ”کہاں؟“

”پتا نہیں جی اپنے مٹی صاحب کے ساتھ گئی ہیں۔“
 ”انکل مٹی کے ساتھ؟“

مریم نے آہستگی سے کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔
 ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“
 ”ہاں ہاں ٹھیک ہوں۔“

اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر صفو کی طرف دیکھا۔
 ”تم جاؤ کام کرو۔“

”اور یہ شرجیل مرزا کس قدر ذلیل ہو گیا ہے ان کے گھر میں۔ جب جس وقت جی چاہتا ہے چلا آتا ہے..... اور عاشی..... عاشی پتا نہیں کیوں اسے اتنی اہمیت دیتی ہے۔ حالانکہ نہ تو وہ کسی ڈرامے میں کام کر رہی تھی اور نہ ہی کسی پروڈیکٹ کے لیے ماڈلنگ کر رہی تھی۔ پھر خدا جانے کیوں اکثر وہ شرجیل مرزا کی طرف چلی جاتی تھی۔“

”اور شرجیل مرزا خدا جانے اس کے ذہن میں کیا تھا اور مانا کے سامنے بھی کتنی بار آیا تھا اور مانا نے ایک بار بھی تو عاشی کو اس سے باتیں کرنے سے منع نہیں کیا تھا اور عاشی کتنے مزے سے ڈرانگ روم میں بیٹھی اس کے ساتھ گپ لگاتی اور وہ مانا سے اس کی تعریف کرتا۔“

”زینبی تمہاری یہ بیٹی تو بالکل تم پر مبنی ہے اور مریم..... وہ خدا جانے کس پر چلی گئی ہے۔“
 اور مانا ہنستی رہتیں فخر سے گردن بلند کیے۔

اور اب تو مانا بھی جا چکی تھیں اور مانا کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی ہی بار آتا تھا اور وہ اسے منع نہیں کر سکتی تھی۔ روک نہیں سکتی تھی۔ ایک خوف سا اس کے دل سے چمٹ گیا تھا۔

”اگر عاشی نے روک دیا منع کر دیا کہہ دیا کہ تم کون ہوتی ہو شرجیل مرزا کو اس گھر میں آنے سے منع کرنے والی..... یہ میرا گھر ہے میرے پاپا کا۔ تمہارا کیا حق ہے اس گھر پر؟“

اور اس کا سارا غصہ جھگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

”کیا بات ہے بھئی آج کل تمہاری بھونڈی خاموش ہیں؟“

وہ جان بوجھ کر اسے سنانے کے لیے اونچی آواز میں بات کرتا۔
 اور اس روز عاشی ہاتھ لے رہی تھی اور وہ لوگ روم میں اکیلی بیٹھی تھی کہ وہ سیدھا اس کے پاس چلا آیا تھا۔
 ”خدا نخواستہ طبیعت کچھ نہ ساز گیتی ہے ان دنوں۔“

”کیا مانا سے لڑائی ہو گئی ہے یا پھر ان کی دوسری شادی کا غصہ ہے..... ویسے زینبی نے بھی کمال کیا۔“
 بجائے اس کے کہ وہ تمہاری شادی کرتیں خود شادی رچا کے بیٹھ گئیں۔“

اور وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ لیکن اب وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اسے بہادر بننا ہے اور مضبوط اور اسے ہی سب خیال رکھنا ہے۔

”عاشی نینا اور مور کا۔“

اس نے پاپا سے وعدہ کیا تھا..... اور پھر وہ تینوں اسے کتنے پیارے ہیں اور کتنے عزیز ہیں۔ مانا کو پتا نہیں ہے کہ عاشی کیا کرتی پھر رہی ہے لیکن وہ تو ہے نا اس کی پروا کرنے والی اور اسے خود کو مضبوط بنانا ہے..... اور بابا بھی تو اسے سمجھایا کرتے تھے کہ زندگی بسر کرنے کے لیے آدمی کو خود مضبوط بنانا پڑتا ہے..... کزور لوگوں کو تو دنیا کچل کر رکھ دیتی ہے..... اور بابا کے ساتھ ہی اسے شہر یا کرا خیال آ گیا اور دل میں ایک ٹیس ہی اٹھی۔ ان دنوں اسے شہر یا رکتنا یاد آتا تھا۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ شہر یا رہتا تو وہ اس سے اپنا دکھ share کرتی جس طرح شہر یا اسے اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی ایسے تو وہ کسی سے کوئی بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ نہ عاشی سے نہ معید بھائی سے اور نہ عادل سے۔

عادل جس نے ان دنوں اس کا بے حد خیال رکھا تھا اور اسے اس کے وجود سے پاپا کی خوشبو آتی تھی..... اور کئی بار اس کا جی چاہا تھا وہ اس کے ہاتھوں میں منہ چھپا کر بہت سارو لے۔

وہ اسے اپنے اس دکھ میں شریک کر لے جس سے وہ گزر رہی تھی۔

لیکن بھلا کیا رشتہ تھا اس کا اس سے۔

اور شہر یا..... وہ صرف اس سے ہی اپنا دکھ شیئر کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بہت دور تھا مگر اتنا دور ہونے کے باوجود بھی جیسے دل کے تار کہیں ملے ہوئے تھے۔ جیسے رابطہ اسی طرح تھے کہ اس کا خط آ گیا تھا..... جس نے اس کا دل اتنا ہلکا کر دیا تھا۔

بارش اور خفا خفا سی۔

”تم نے بالکل ہی آ جا چھوڑ دیا ہے مریم۔ کیا بہت خفا ہو ہم سے؟ بابا اور اماں بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔“
 ”نہیں تو میں کسی سے خفا نہیں ہوں اور پھر بھلا کیوں خفا ہوں گی؟ یوں ہی طبیعت اچھی نہ تھی۔“

”ہاں تم بہت weak لگ رہی ہو۔ کیا ہوا تھا تمہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

وہ افسردگی سے مسکرا دی تھی۔

اور اس روز پہلی بار یعنی سے کھل کر بات کی۔

”پتا ہے مریم، میری شدید خواہش تھی کہ تم اور شیری بھائی بابا اور اماں بھی تم سے بہت محبت کرتے تھے اب بھی کرتے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں.....“

”پلیز یعنی!“

اس نے ٹوک دیا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میری طبیعت خراب تھی، میرے نہ آنے کی یہ وجہ تو نہ تھی۔“

لیکن پھر بھی وہ اپنے دکھ کا اظہار کرتی رہی۔

”مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اچانک بابا اور اماں کو کیا ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سکندر چاچو کی وائف

ایک ماڈل گرل تھیں۔“

”پلیز یعنی، لیوڈی ٹاپک۔“

وہ یعنی سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وجہ جو بھی رہی ہو، ایک خواب آنکھوں میں ہی

مر گیا تھا۔

”پتا ہے مریم، مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شیری بھائی اتنا آگے نکل چکے ہوں گے۔ وہ جب بھی فون

کرتے ہیں، تمہارا ضرور پوچھتے ہیں۔ وہ بہت بے چین اور مضطرب رہتے ہیں مریم اور انہوں نے میرے

نام خط بھیجا تھا جس میں تمہارے لیے ایک خط تھا۔ تم شیری بھائی سے بدگمان مت ہونا، وہ انتہائی مجبور

ہو گئے ہیں۔ وہ بابا اور اماں کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے لیکن میں نے سوچا ہے، میں سکندر چاچو سے خود

بات کروں گی پھر اگر سکندر چاچو مان گئے تو بابا اور اماں تو سکندر چاچو کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔“

اور یعنی کے جانے کے بعد بھی کتنی ہی دیر تک اس نے خط نہیں کھولا تھا۔ خدا جانے شہر یار نے

کیا لکھا تھا۔ شاید اس نے لکھا ہو کہ وہ اسے اس کے عہد سے آزاد کر رہا ہے..... شاید اس نے لکھا ہو کہ

ہار گیا ہے..... لیکن ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا، خط میں۔

”مومی، میری زندگی..... تم ٹھیک تو ہونا۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ چند دن سے.....“

ہوں۔ عجیب سی بے چینی ہے۔ دن میں کئی بار جی چاہتا ہے اڑ کر تم تک پہنچوں۔ جیسے تم اداس ہو، پتا

ہو اور تمہیں میری ضرورت ہے۔ مریم، مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ ایک بار آواز دو گی تو ساری زنجیریں توڑ

آ جاؤں گا۔ اپنی خیریت کی خبر دو اور میرا انتظار ضرور کرنا اور یہ یاد رکھنا کہ تم ہو تو میں ہوں۔ تم نہیں ہوگی

میں بھی نہیں ہوں گا.....“ اور اس نے کتنی ہی بار اس کا خط پڑھا اور اسے بڑی تقویت محسوس ہوئی تھی۔

اس نے سوچا تھا، جب تھک جائے گی ہارنے لگے گی تو اسے آواز دے گی۔

”مریم بی بی، مور بابا اور نینا گڑیا کب تک آجائیں گے؟“

منو نے قریب آ کر پوچھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”یہی کوئی تین چار بجے تک۔“

”تو پھر آپ کے لیے کھانا لگا دوں؟“

”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔ عاشی آجائے تو.....“

”پتا نہیں جی وہ کب آئیں، کل بھی دیر سے آئی تھیں۔“

منو نے مڑتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ کھانا کھا لو..... اور سب کو دے دو۔“

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے ابھی، تب ہی سیڑھیوں سے ڈاکٹر عبدالعید اترتے دکھائی دیے تو وہ ہیں رک کر ان کا انتظار کرنے لگی۔

”کیسی ہیں مریم!“

”فائن!“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”لیکن مجھے تو آپ بہت دنوں سے فائن نہیں لگ رہی ہیں۔“

”نہیں تو، اچھی ہوں۔“

اس نے سراٹھا کر انہیں دیکھا۔

”آپ اسپتال جا رہے ہیں؟“

”نہیں، ذرا گھر جا رہا ہوں کچھ کام کروانا ہے وہاں۔ آپ چلیں گی ساتھ۔ کچھ مشورہ دیجیے گا سیٹ

وغیرہ کرنے میں۔“

”آج تو نہیں وہ مور اور نینا نے آنا ہے پھر کسی دن چلی جاؤں گی۔ کیا ماما سے بات ہوئی تھی انکل کی؟“

”ہاں ہوئی تو تھی لیکن انہوں نے کوئی ٹھوس بات نہیں کی تھی، یہی کہا تھا کہ واپس آ کر بات کریں گی

..... بات ان کا خون آیا تھا۔“

”اچھا، کیا کہہ رہی تھیں؟ آنے کا بتایا تھا کچھ؟“

میش کی طرح وہ ماما کے فون کا سن کر خوش ہو گئی تھی۔

”نہیں، آنے کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا البتہ یہی کہا تھا کہ ان کے آنے سے پہلے ہم اوپر والا حصہ خالی

کر دیں..... اور یہ کہ وہ آنے سے دس پندرہ دن پہلے پھر فون کریں گی۔“

”لیکن کیوں؟“

اس نے ہونٹوں کی طرح پوچھا۔
”بھئی ان کا گھر ہے جب چاہیں خالی کروالیں اور یوں بھی ہمیں ایک دن تو اپنے گھر جانا ہی تھا۔ وہ تو آپ لوگوں کی تنہائی کے خیال سے رک گئے تھے۔“ وہ مسکرائے۔

”مگر معید بھائی آپ کے اور انکل کے یہاں ہونے سے کتنا اطمینان تھا؟ کتنے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔“

اندرا ہی اندر اس نے بے حد بے چینی محسوس کی۔

”شاید مسزن زنب کا اب مستقل یہاں رہنے کا خیال ہو؟“

”ہاں، ممکن ہے۔“

اس نے اپنے دل میں ایک خوش گواری لہرائتے محسوس کی۔
”اوکے پھر میں چلتا ہوں۔ آج اسی لیے چھٹی کی ہے کہ دیکھ لوں کہ کیا کیا کی ہے گھر میں۔“

”اور.....“

وہ جاتے جاتے رکے۔

”یہ عاشی کدھر ہیں، اپنے کمرے میں؟“

”نہیں، وہ گھر پر نہیں ہے۔“

”کیا پھر کوئی ڈراما وغیرہ.....“

”نہیں، نہیں۔“

اس نے فوراً کہا۔

”اس نے عادل بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ مزید کسی ایڈیڈارے میں کام نہیں کرے گی۔“

”رائٹ!“

پتا نہیں کیوں وہ بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے۔ مریم نے بے حد غور سے انہیں دیکھا۔ اپنے ہی دکھ میں ڈوب کر وہ اپنے ارد گرد سے بے خبر ہو گئی تھی۔

”انکل کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”کچھ زیادہ ٹھیک نہیں.....“

ان کی آواز اسے ہلکی ہلکی لگی۔

”اور آپ نے بتایا ہی نہیں۔“

”آپ خود اتنی پریشان اور الجھی الجھی رہتی تھیں کہ کیا کہتا۔ اور مجھے عاشی بھی بہت ڈسٹرب لگتی تھی۔ خدا جانے کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔ اب تک آپ کو حقائق کو ACCEPT کر لینا چاہیے۔ بہر حال۔“

مسزن زنب کا رائٹ تھا۔ اگرچہ مناسب نہیں تھا لیکن.....“

اور ڈاکٹر عبدالمعید کو کیا پتا کہ صرف یہ بات ہی نہیں ہے اس پر تو دہرا غم ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ تو جس عذاب میں ہے ڈاکٹر عبدالمعید تصور بھی نہیں کر سکتے۔

”اپنا خیال رکھا کریں مریم! زندگی اس طرح بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس طرح حوصلے ہار دیتا تو صحیح نہیں ہے نا مریم!“

”اور یہ چھوٹی سی بات تو نہیں ہے نا ڈاکٹر عبدالمعید!“ اس نے دل گرفتگی سے سوچا اور اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

”بی بریو (BE BRAVE)۔“

وہ اس کا سر تھپتا کر چلے گئے تو وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے سوچا، وہ شہریار کے خط کا جواب دے دے۔ اس نے اپنا پتا لکھا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ اس کے خط کا جواب ضرور دے لیکن ان تین ماہ میں کتنی بار اس نے قلم اٹھایا تھا اور پھر رکھ دیا تھا۔ کیا کہے، کیا لکھے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جیسے اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہو ہی نہیں۔

جیسے سارے لفظ اس کے اندر مر گئے ہوں حالانکہ وہ شہریار سے کتنی باتیں کیا کرتی تھی۔

اور وہ کس قدر بے چین اور مضطرب تھا۔ اگرچہ یعنی نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ ٹھیک ہے اور یہ کہ وہ بہت جلد اسے خط لکھے گی پھر جب بھی اس کا فون آتا، یعنی اسے بتاتی کہ وہ بہت اب سیٹ ہے۔

”مومن، ایک بار تم اپنے ہاتھ سے اسے چند جملے لکھ دو۔ نہیں تو مجھے ڈر ہے کہ کسی دن وہ اپنی تعلیم بھل چھوڑ کر آجائے گا۔“

لیکن وہ کیا کرتی، اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ نہ تو لفظ اس کی گرفت میں آتے نہ خیالات۔

اس نے سائیز ٹیبل پر پڑا ہوا لیٹر پیڈ اٹھایا اور دراز سے قلم نکالا اور پھر یونہی قلم ہاتھ میں لیے لیٹر پیڈ کو دھس رکھے بیٹھی رہی۔

”کیا لکھوں؟“

”کیا لکھوں شہریار مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

تھک کر اس نے لیٹر پیڈ اور قلم سائیز ٹیبل پر رکھ کر آنکھیں موند لیں اور سر تکیے پر رکھ دیا۔ تب ہی تیل ہوئی۔ شاید عاشی آئی تھی۔

اس نے آنکھیں موندے موندے سوچا لیکن ابھی نہیں یونہی لیٹی رہی۔

”بجوسوری ہیں؟“

کچھ دیر بعد عاشی نے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تو وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی اور شو لڈریک ایک طرف بیڈ پر اچھالتے ہوئے وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”تم بغیر بتائے چلی گئی تھیں بتا کر تو جایا کرو گھر رہتی ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گلہ کر بیٹھی۔

”صفو کو بتایا تو تھا؟“

جوتوں کے اسٹریپ کھولتے ہوئے حسب معمول اس نے دونوں پاؤں کرسی پر رکھتے ہوئے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اپنی ٹھوڑی ان پر ٹکاتے ہوئے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ بہت خوش اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ کاجل اور مسکارے سے کچی آنکھیں قیامت ڈھا رہی تھیں۔

”پتا ہے بچو! آج..... آج ایک بہت حیران کن بات ہوئی میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انکل جی! کیا!“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”کیا کہا ہے انکل جی نے؟“

”کچھ نہیں بچو!“

وہ ہنس پڑی۔

”آپ تو یونہی گھبرا جاتی ہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بس مجھے پروپوز کیا ہے۔ ہے تاجرت کی بات؟“

”کیا!“ وہ چیخی۔

”وہ..... وہ..... انہوں نے جرات کیسے کی تم سے یہ کہنے کی شرم آئی چاہیے تھی انہیں تم سے یہ کہتے ہوئے کیوں؟“

اب کے عاشی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”اس میں بھلا شرم کی کیا بات ہے کسی کو پروپوز کرنا باعث شرم بات تو نہیں ہوتی۔“

”لیکن عاشی۔“ اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”وہ پاپا کے ہم عمر ہوں گے۔“

”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ اگر ماما اپنے سے بیس سال چھوٹے غنفر ملک سے شادی کر سکتی ہیں تو میں اپنے سے پچیس سال بڑے انکل جی سے شادی کیوں نہیں کرنا۔ جبکہ میرا ان سے شادی کرنا اتنا مشکل نہیں ہوگا جتنا ماما کا غنفر ملک سے شادی کرنا۔“

”عاشی.....“ مریم کی آواز ٹوٹ رہی تھی ”کیا تم محض ماما کی ضد میں انکل جی سے شادی کر لو گی؟“

”میں بھی تو انہوں نے مجھے پروپوز کیا ہے۔ میں کیا کروں گی یہ تو میں نے ابھی سوچا ہی نہیں۔“

”عاشی۔“ مریم اٹھ کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”عاشی یہ انکل جی کوئی بہت اچھے آدمی نہیں ہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ انہوں نے تمہیں کیوں پروپوز کیا ہے۔“

”آپ جانتی ہیں؟“ اس نے پلکیں اٹھائیں۔

مریم نے پٹٹا کر اسے دیکھا۔

”عاشی..... عاشی پلیز! تم کہہ دو انکل جی سے کہ انہیں تم سے ایسی فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم..... تم تو جانتی ہو عاشی کہ..... ماما نے معید بھائی کے ساتھ تمہاری مگنی.....“

”افوہ بچو.....“ عاشی کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ اس نے پاؤں نیچے رکھے اور کھڑی ہو گئی۔

”میں ماما کے کیسے گئے کسی فیصلے کی پابند نہیں ہوں۔ بوجوب انہوں نے ہماری پروا نہیں کی تو میں ان کی پروا کیوں کروں میں اپنے متعلق ہر فیصلہ خود کروں گی۔“

اس نے جھک کر جوتے پہنے بیڈ سے اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ مریم یوں ہی کرسی کی بٹ پر ہاتھ رکھے اسے جاتے دیکھتی رہی اور آنسو اس کی آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے۔



”ناول خان! آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ کہاں رہتے ہیں کہیں نظری نہیں آتے۔“ مجتبیٰ حیدر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے مزکر پیچھے دیکھا۔

”ارے مجتبیٰ آپ آئیے۔“

”آپ شاید کہیں جا رہے تھے۔“

”کوئی اتنا ضروری بھی نہیں تھا جانا۔ آئیے۔“ انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر خدا بخش کی طرف دیکھا جس سے وہ بات کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے خدا بخش! آپ جاییے اور چائے بھجوا دیجیے گا۔“

”نن کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ مسکرائے۔“

”مجتبیٰ صاحب! کیسے کیسے ہیں آپ؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ ہم تو اچھے ہی رہتے ہیں۔ وہ بڑا مہربان ہے ہم پر۔ آپ سنائیے کیسی گزر رہی ہے بہت ذول سے نہ آپ کبھی آئے نہ ملاقات ہوئی۔ سنہ فون پر ہی بات ہو سکی۔“

”بس یوں ہی مصروفیت رہی۔“

کر لیا کیا؟“ تصدق احمد کے برابر صوفی پر بیٹھتے ہوئے پروفیسر عادل نے پوچھا۔
 ”جواب نے تو خدا جانے مجھے قبول کیا ہے یا نہیں لیکن میں نے جاب کو قبول کر لیا ہے۔“
 ”اوکے۔ اوکے۔“ پروفیسر عادل نے شفقت سے ان کے کندھے تھپتھپائے۔ ”زندگی میں بہت سے مقامات پر انسان کو سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ آمنہ سے سبق سیکھیں۔“
 ”ان سے ہی تو سیکھا ہے سمجھوتا کرنا۔ ورنہ زندگی نے تو بہت مایوس کر دیا تھا مجھے۔“
 ”اس عمر میں ہی اگر مایوس ہو گئے تو باقی عمر کیسے گزارو گے میاں۔“ مجتبیٰ حیدر نے پلیٹ سے کباب اٹھایا۔
 ”خدا بخش سب کے لیے چائے بناؤ۔“ پروفیسر عادل نے خدا بخش جو قریب ہی کھڑا تھا کہا اور پھر آمنہ صفی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ کی کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“

”فارغ ہوں۔ دن بھر گھر میں رہتی ہوں اماں کے ساتھ کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیا اور بس دو بندوں کا کام ہی کیا ہوتا ہے اور کبھی کبھار یوں ہی شام کو تصدق کی طرف چلا آتی ہوں جب کبھی یہ بہت ڈسٹررب ہوتا ہے تو اور اماں کو تو یہ بھی اچھا نہیں لگتا لیکن ہفتے بعد ذرا سی دیر کو باہر نہ نکلوں تو میرا دم گھٹ جائے تصدق سے بات کر کے ذرا دل کی کھٹن کم ہو جاتی ہے۔“
 ”مس آمنہ صوفی، ایک بات تو بتائیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے خالی پلیٹ ٹرالی میں رکھ کر چائے کا کپ اٹھایا۔
 ”پوچھیے۔“ آمنہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ایک تخلیق کار کو چاہے وہ لفظ تخلیق کرتا ہو مجھے تراشتا ہو یا رنگوں سے کھیلتا ہو اگر لفظ تخلیق کرنے سے نئے ترانے سے یا رنگوں کے کھیلنے سے روک دیا جائے تو کیا وہ رک سکتا ہے اور کیا اس کے اندر تخلیق کے سوتے مرجاتے ہیں۔ آپ دونوں نے جو خود کو تخلیق کے عمل سے دور کر دیا ہے تو آپ کے اندر موجود تخلیق کے سوتے دھارے باہر نکلنے کو بے چین نہیں ہوتے؟“

”تخلیق کا عمل روکا تو جاسکتا ہے۔“ آمنہ صوفی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”لیکن تخلیق کار کے اندر موجود تخلیق کے سوتے مرجاتے نہیں سکتے۔ یہ دھارے اندر ہی اندر بہتے رہتے ہیں اور باہر نکلنے کو بے چین رہتے رہتے ہیں۔“ صاحب آپ اس کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس سے اس تخلیق کار کو گزرنا پڑتا ہے۔ جسے جبراً لپٹا آپ کو تخلیق کے عمل سے روکنا پڑتا ہے یہ بہت نازک صورت حال ہوتی ہے۔ میں نے اماں سے سنا کہ کیا تھا کہ لظہم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی سو نہیں لگاتی۔ لفظوں سے نانا تو ڈلیا ہے لیکن لفظ میرے اندر بننے کے سوتے بہتے ہیں۔ بلکہ آج کل تو زیادہ ہی لفظوں کی آنکھ چولی ہوتی رہتی ہے۔ ابھی جب میں گھر سے نکلنے لگی تھی میرے اندر لفظوں کا ایک جھوم تھا۔ جو ایک ہائیکو کی صورت میں ڈھل رہا تھا۔
 بندہ گھر سے میں جس کتنا ہے۔

”ہمیں تو ہو جاتی ہے میاں کیا کریں۔ جمال جہاں بھی جس رنگ میں بھی ہو ہمیں جکڑ لیتا ہے۔ طاری ہو جاتا ہے پھر اس حر سے نکل نہیں پاتے ہم۔ کیا بتائیں۔ ایک وقت میں ہم نے نب عثمان کے اسیر رہے۔ یہ امریکا کے قیام کی بات ہے۔“
 پروفیسر عادل نے از حد ناگواری محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی لیکن پھر نے حسب معمول ان کے ہاتھ سے ادھ جلا سگریٹ لے کر کش لگایا اور اپنی بات جاری رکھی۔
 ”ان دنوں زینبی اور اس کے سپنڈ ڈاکٹر سکندر کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے تھے اور زینبی خاصی ڈسٹررب رہتی تھی جب میری اس سے دوستی ہوئی۔“
 ”یہ آمنہ صوفی نے کب تک آنے کو کہا تھا؟“

”ناگ تو نہیں بتایا تھا، بس یہی کہا تھا کہ شام کو جائیں گے۔“

پروفیسر عادل کی بات کا جواب دے کر وہ خدا بخش کی طرف متوجہ ہو گئے جو ٹرالی کھینچتے ہوئے آرہے تھے۔
 ”لیانا خدا بخش صاحب، کیا چائے لینے سیلون چلے گئے تھے؟“
 ”نہیں۔ صاحب۔“ خدا بخش بھی ادھار رکھنے کے قائل نہیں تھے ”چائے تو ہمیں سے مل گئی تھی بلکہ میں نے سوچا خدا جانے سب سے کچھ آپ نہیں کھایا ہو گا تو میں کباب اور سو سے تلنے لگ گیا تھا۔“
 ”مجتبیٰ حیدر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ پروفیسر عادل نے اس پر مسکایا۔
 ”آپ کی عقل مندی کے قائل ہو گئے ہم۔ بس اب جلدی سے چائے بنا دیجیے بہت صوب سورہ ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا عادل میاں۔“

”آپ غالباً آمنہ اور تصدق احمد کی بات کر رہے تھے۔“ انہوں نے دانستہ کہا۔

”ہاں بھئی وہ آمنہ۔۔۔۔۔“

”جیسے ہم حاضر ہو گئے۔“ آمنہ نے اندر آتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔

پروفیسر عادل احترازا ہاتھڑے ہو گئے تھے ”آئیے آمنہ۔“

ان کے پیچھے تصدق احمد بھی تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔“ مجتبیٰ حیدر چپکے۔

”ہاں کچھ دیر ہی ہو گئی۔“ آمنہ صوفی نے بیٹھتے ہوئے بتایا ”عین وقت پر کچھ مہمان آگئے اور اماں نے روک لیا۔“

”کوئی خاص مہمان تھے کیا؟“ مجتبیٰ کے لہجے میں شرارت تھی۔

”خاص ہی سمجھ لیں۔“ آمنہ صوفی سنجیدہ تھی۔

”جی تصدق احمد آپ سنائیں کیسے ہیں جاب نے آپ کو اور آپ نے جاب کو قبول

میں لگا، پیسے آمنہ نے یہ بات ان کے لیے کہی ہو..... لیکن انہوں نے آمنہ سے کہا تو تھا کہ اگر وہ اس دن میں نہیں بھی ذرا سے بھی ملوث ہوتے ہیں یا ان کی ذات زد میں آتی ہے وہ ہر طرح کی کٹ منٹ کر کے اس سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔

اور اگر ایسا ہوا ہے..... اور کسی دن آمنہ صغی ثبوت لے کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تو..... ان کا دل دے گا اور جیسے روح جسم سے نکلنے لگی۔ کیا وہ مریم کو چھوڑ سکتے ہیں۔

مریم کے بغیر اب زندگی کرنے کا تصور ہی ان کے لیے بے معنی سا ہو کر رہ گیا تھا۔

”نہیں..... ان کی ذات کسی ایسے حادثے کی زد میں نہیں آتی۔“ انہوں نے خود کو تسلی دی۔ بہت دیر پہلو سے پھر بھی کبھی کبھی جب آمنہ ان کی طرف دیکھتی..... کوئی بات کرتی تھی تو وہ بہت بے چینی میں کرتے تھے۔

”اور کبھی اگر وقت نے انہیں آمنہ کے سامنے کٹھرے میں لا کھڑا کیا تو.....“ انہوں نے کن اکھیوں سے اندر کی طرف دیکھا۔ وہ بختی حیدر کی طرف متوجہ تھیں..... ”شاید وہ اس آزمائش پر پورا اندازہ رکھیں۔“ انہوں نے اپنے اندر انتہائی شگفتگی محسوس کی۔

مریم تو جیسے ان کے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ وہ مریم سے کیسے کنارہ کش ہو سکتے تھے۔ وہ بہار تھی زمین کی جان پر بن آتی تھی۔ جب تک وہ بے ہوش رہی انہیں لگتا رہا جیسے ان سے کوئی ساری کائنات پیٹنے لگا رہا ہو۔ ”اور اگر خدا خواستہ مریم کو کچھ ہو گیا تو.....“ اس تصور سے ہی ان کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ اس روز زینب عثمان کے اچانک انکشاف سے مریم لمحہ بھر کو تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر وہ خود انہیں اپنی کائنات لٹی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور زینب عثمان کی پردا کیے بغیر انہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا تھا اور عاشر اور زینب کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے تیزی سے گاڑی ڈرائی کی تھی جتنی کبھی نہیں کی تھی۔

عاشر رو رہی تھی اور دو عاشریں مانگ رہی تھی۔

اور خود ان کے جسم کا رواں رواں دعا گوا تھا لیکن زینب عثمان پر انہیں حیرت تھی جو انتہائی پرسکون تھی ”یہ نورانے ہی ایسا ہے۔“ انتہائی بزدل اور ڈر پوک مجھے پہلے ہی خوف تھا کہ یہ اس انکشاف کو برداشت نہ کر پائے گی۔ اس لیے تمہارے پردہ پوزل کا میں..... ابھی تک کوئی جواب نہیں دے پائی تھی کہ میں اس بات کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ یہی خوف تھا مجھے۔“ اسپتال کے کوریڈر میں کھڑے کھڑے انہوں نے سانس لیا تھا۔

زینب عثمان نے پھر ان کے ہاتھوں میں امید کا دیا تھا دیا اور ان کے اندر بھتے چڑاؤں کی لو جیسے پھر نہ ہوئی۔ اگرچہ مریم کی وجہ سے پریشان تھے۔ پھر بھی ان کے اندر ایک مسرت کی لہری اٹھی تھی اور

کھول دیں میں نے کھڑکیاں ساری۔

پھر بھی دل کی گھٹن نہیں جاتی۔

”لیکن میں ان لفظوں کو کاغذ پر نہیں اتاروں گی کہ میں نے اماں سے وعدہ کیا ہے۔“

”آمنہ صبح کہتی ہیں تخلیق کا عمل کبھی رک نہیں سکتا۔ وہ جاری رہتا ہے چاہے ہم اسے لفظ در لفظ دیں یا نہ دیں۔“ تصدق احمد نے آمنہ کی تائید کی۔

”میں نے رنگ اور برش ایک طرف رکھ دیے ہیں لیکن میرے اندر تخلیق کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور شاید کسی دن میں پھر رنگ اور برش اٹھالوں۔ اسی طرح آمنہ نے بے شک اماں سے وعدہ کیا ہے لیکن کوئی لمحہ ایسا اس کی زندگی میں بھی آ سکتا ہے جب تخلیق کے دھارے اتنے پرجوش ہوتے ہیں کہ سارے بند توڑتے چلے جاتے ہیں۔“

”اور کیا یہ زیاتی نہیں ہے اپنے ساتھ؟“ پروفیسر عادل نے آمنہ اور تصدق احمد دونوں کی طرف دیکھا۔ ”شاید۔“ آمنہ نے آہستگی سے کہا ”جب ساری دنیا ہمارے ساتھ زیادتی کر رہی ہے تو اگر ہم ان میں شامل ہو جائیں تو کیا حرج ہے..... وہ لطیفہ سنا ہے آپ نے۔“ وہ ہنسی۔

”جب ایک ٹھیلے والے کا ٹھیلہ کالج کے لڑکے لوٹنے لگے تو پہلے تو وہ دیکھتا رہا اور پھر خود دو دنوں ہاتھوں سے کھانے لگا کہ سب کچھ لوٹ جانا ہی ہے کیوں نہ خود بھی کھالیا جائے۔“ پروفیسر عادل نے اسے تاسف سے دیکھا۔

”آمنہ صغی آپ نے کالم نویسی چھوڑ دی بلکہ لکھنا سرے سے ہی چھوڑ دیا تو پھر اب گھر بسائیں..... زندگی میں کچھ تو ہونا چاہیے۔ وہ کیا نام ہے سید عتیق الرحمن شاہ جن دنوں آپ نے کالم نویسی چھوڑی ان دنوں آپ کی اور ان کی شادی کی خبریں سنی جا رہی تھیں کہ عتق رب..... لیکن پھر وہ شادی کیا ہوئی؟“

بختی حیدر کو تنکے چھونے کی عادت تھی اور کچھ ان کی جنرل مانج بھی غضب کی تھی۔ لوگوں کی زندگیوں تک کا جغرافیہ انہیں معلوم ہوتا تھا۔

”وہ شادی اغوا کی نذر ہو گئی۔“ آمنہ صغی نے آہستگی سے کہا۔

اور پروفیسر عادل نے بے حد ناگواری سے بختی حیدر کی طرف دیکھا..... ان کا از حد..... باوجود انہیں بختی کی یہ کرید کرید کر پوچھنے پانچھنے والی عادت قطعی پسند نہ تھی۔

”عتیق اچھا آدمی تھا۔“

”ہاں لیکن اس شادی کے لیے جس حوصلے اور ظرف کی ضرورت تھی وہ اس میں نہ تھا۔“ آمنہ نے بختی کی بات کا جواب دے کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔ عین اسی وقت پروفیسر عادل کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں اور انہوں نے ایک دم نظریں جھکا لیں اور اپنے اندر پانی پانی ہوئے

میں کھڑے کھڑے اس شام کہہ دی تھی جب مریم ہوش میں آگئی تھی اور اس وقت ٹرانگولائزر کے زیر اثر پرسکون بند سو رہی تھی۔ انہیں لگا تھا جیسے پوری کائنات وجد میں آکر رقص کرنے لگی ہو۔ ان کے اندر پھول چٹکنے دھڑکنے لگے تھے اور اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے مسز نینب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ماں جی اور بی آ پاتا تو بے چین تھیں آپ کے پاس آنے کے لیے۔“

”ہاں مجھے نرس نے بتایا تھا۔“

”تو میں ماں جی کو کب بھیجوں آپ کے پاس؟“

”فی الحال تو ہم جا رہے ہیں واپسی پر تب تک مریم بھی اس حادثے سے سنبھل جائے گی۔۔۔۔۔ وہ ابھی بہت ڈسٹرب رہے گی۔ دراصل عثمان احمد نے اسے بہت چاہا اور وہ بھی انہیں بہت چاہتی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی کبھار اسے مجھ پر بھی ترجیح دینے لگتے تھے اور میں جیلس ہو جاتی تھی اور وہ کہا کرتے تھے کہ بیٹیاں ہمیشہ باپ کو پیاری ہوتی ہیں۔ انہوں نے کبھی اسے سوتیلی بیٹی نہیں جانا۔۔۔۔۔ میں اسی لیے سکون و آرام سے بات کرنا چاہتی تھی اس سے تاکہ وہ زیادہ شاک نہ ہو۔ لیکن اچانک جذباتی ہو گئی۔۔۔۔۔ عادل میرے اعصاب بہت کمزور ہیں۔ کوئی بھی بات جو میری مرضی کے خلاف ہو مجھ سے راشت نہیں ہوتی۔“

اس روز مسز نینب عثمان دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے انہیں بہت ریزن لگیں اور ہوں نے سوچا کہ کوئی آدمی بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا اور ہر آدمی کی نشوونما اس کے حالات کے پس منظر میں دلتی ہے۔ سو اپنے حساب سے وہ ٹھیک ہی ہوں گی۔

ان کے رویے۔

اور ان کا اسٹائل آف لوگ۔

سب ان کے ماحول کا خاصہ ہے۔

اور پتا نہیں وہ شخص جو مریم کا باپ تھا ان سے ان کی کیوں نہ بن سکی۔ غالباً یہی رویوں اور زندگی گزارنے کے اسٹائل کا ڈفرنس ہی ہو گا جو دونوں میں علیحدگی ہو گئی ہوگی۔

ان کے اندر رنگ ہی رنگ اتر آئے تھے۔

انہیں لگتا تھا جیسے وہ ایک دم کالا مال ہو گئے ہوں۔

سید احمد امیر اور خوش قسمت

مگر ابھی تک حویلی میں انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

نیا پکارا چچی میں تھیں۔

ماں جی کی طبیعت تاسا ز تھی۔

انہوں نے متشکر نظروں سے نینب عثمان کو دیکھا۔

”اور یہ عاشری انتہائی بے وقوف ہے۔“ انہوں نے اپنی پوزیشن اس پر کلیئر کی۔

”شادی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ نکاح سنت ہے۔ باہر کی دنیا میں اسکی عورت غیر محفوظ ہوتی ہے۔ اسے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں غنفتر نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے اس کا پروپوزل قبول کر لیا۔ عاشری کا غصہ اور ناراضی قطعی بے جا ہے۔“

”آپ کو چاہیے تھا پہلے آپ عاشری اور مریم کو اعتماد میں لے لیتیں۔ ان سے بات کر لیتیں۔ یقیناً وہ سمجھ دار ہیں۔“

”ہاں یہ غلطی ضرور ہوئی مجھ سے مگر عاشری کا رد عمل انتہائی احمقانہ ہے جبکہ مومو نے کوئی ری ایکشن نہیں دیا تھا۔۔۔۔۔ حالانکہ میں اس کی توقع کر رہی تھی۔“

اور انہیں مریم کے آنسو یاد آ گئے جو محض ایک فلمی میگزین میں ان کی شادی کی خبر پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔

”اب تمہارے ساتھ رہنے کی یا جانے کی کیا تک ہے جبکہ میں اس کی ماں ہوں اور میرے ہونے ہوئے وہ کہیں اور کیسے جاسکتی ہے۔“ اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے انہوں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ عاشری کو اپنے ساتھ حویلی لے جانے کا نہ سوچے وہ اس کی سوتیلی بہن ہے جبکہ وہ اس کی ماں ہیں اور عدالت ان کا حق تسلیم کرے گی نہ کہ ان کا۔

”سمجھا دوں گا عاشری کو۔ بچی ہے جذباتی ہو گئی تھی۔“ انہوں نے گیمیر لہجے میں کہا۔ مسز نینب مل بولتی رہیں۔ ان کا سارا دھیان مریم کی طرف تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اچانک شاک پہنچا ہے جس کوے میں چلی گئی ہیں۔

انہوں نے کتنی بے آواز دعائیں کی تھیں۔

اور مسلسل اسپتال میں ہی رہے تھے۔ نینب اور غنفتر ملک ملاقات کے ٹائم آتے۔ عاشری بھی! میں رہی تھی۔ ان دنوں انہیں عاشری پر بہت پیارا آتا تھا۔ کتنی معصوم تھی وہ۔

اور کس قدر کھری لگ رہی تھی وہ۔

مسز نینب نے یہ اچھا نہیں کیا تھا اس عمر میں غنفتر ملک سے شادی کرنے کا فیصلہ کرے۔

”میں یورپ سے واپس آ کر عاشری اور مومو دونوں کی شادی کر دوں گی۔“ انہوں نے پروپیہ کو بتایا تھا۔

”تم اپنی والدہ سے کہہ دینا کہ وہ شادی کی تیاری رکھیں۔“ وہ بات جسے وہ بانیے کے لیے بے حد بے چین اور مضطرب تھے اور جس کے لیے وہ کراہتے، اب اس نے انتہائی بے چینی سے منظر تھے۔ وہ بات مسز نینب نے اس وقت

اور مریم خود بہت ڈسٹرب تھی۔

وہ جانتے تھے لی آپا اور ماں جی سے یہ خوشی برداشت نہیں ہوگی۔ وہ ضرور مریم کو دیکھنے آئیں گی۔ اسے پیار کریں گی۔

اپنی خوشی کا اظہار کریں گی۔

لی آپا تو جانتے کب سے کیا کیا پروگرام بنائے بیٹی تھیں اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت جب مریم اس قدر ڈسٹرب ہے اس کو مزید ڈسٹرب کیا جائے۔ تین ماہ ہو گئے تھے اور وہ انہیں ابھی تک مضحل اور تنگی تھی۔ اس کی آنکھیں سو جی رہتی تھیں اور پلکیں بھیگی لگتی تھیں۔ وہ جب بھی جاتے وہ انہیں اداس اور دل گرفتہ لگتی تھی۔

ان تین ماہ میں انہوں نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا جب بھی جاتے اسے سمجھاتے۔ دیر تک باتیں کرتے۔

عاشی کو اور اسے زبردستی گھمانے لے جاتے۔

اگرچہ وہ بہت کم بولتی تھی۔ زیادہ تر سوچ میں گم رہتی کھوئی کھوئی سی۔

لیکن اس کی موجودگی کا احساس۔

اور یہ احساس کہ مریم ان کی ہے۔

ان کے اندر پھول کھلائے رکھتا تھا۔

وہ لی آپا اور ماں جی کو ذہن کی رائے بتانے سے پہلے مریم سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اتنی اداس اور دل گرفتہ نظر آتی تھی کہ جب اسے دیکھتے، کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیتے تھے۔

”نہیں ابھی نہیں۔ ابھی وہ سنسبل جائے۔“

وہ اپنے آپ کو روک لیتے تھے۔

تقریباً دو ہفتے سے وہ ذہن بدلانہیں گئے تھے تو دل بہت مضطرب اور بے چین تھا۔ ان کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ اس کے سارے دکھ اپنی پلکوں سے جن لیں۔ اپنے سینے میں چھپالیں اور اس کے سامنے خوشیوں کے ڈھیر لگا دیں۔ اس کی آنکھوں کا ایک ایک آنسو چالیں۔ وہ تقریباً ہر دوسرے دن چکر لگاتے تھے لیکن اس روز اس نے کہا۔

”عادل بھائی! اب تو میں بالکل اچھی ہوں۔ آپ کو زحمت ہوتی ہے۔ پتا نہیں کتنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر آنا پڑتا ہے آپ کو۔“

تو انہوں نے سوچا تھا کہ شاید اس طرح روز روز ان کا آنا مناسب نہ ہو۔ اس لیے اب وہ ہفتے دو ہفتے بعد چکر لگانے لگے تھے لیکن عاشی سے فون پر خیریت پوچھ لیتے تھے۔ آج اگر مجتبیٰ حیدر نہ آ جاتے تو وہ اس وقت

بلا جانے کے ارادے سے ہی نکلے تھے۔ یوں بھی عاشی نے بتایا تھا کہ تیمور اور نینا بھی آرہے ہیں۔

”آپ کہاں کھو گئے عادل صاحب۔“ آمنہ صفی نے اچانک انہیں مخاطب کیا تو وہ چونکے۔

”پرانی عادت ہے خواب دیکھنے کی۔“ مجتبیٰ حیدر نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں اس دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے کبھی خواب نہ دیکھا ہو۔“ تصدق نے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

”کیوں سر؟“

”ہاں خواب نہ ہوں تو زندگی مشکل ہو جائے۔ بالکل بخر اور ویران۔“

”بجائے آپ نے۔“ تصدق احمد نے تائید کی۔

”تصدق احمد۔ ایک مشورہ دوں۔“ پروفیسر عادل اب پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے۔

”ضرور سر۔“

”دیکھو رنگوں اور برش سے اپنا نانا قائم رکھنا تھوڑا بہت۔ بالکل چھوڑ مت دینا۔ زندگی کے

لے EARN کرنا ایک الگ مسئلہ ہے جبکہ اپنے ذوق کی تسکین ایک الگ۔“

”جی سر اس موضوع پر پھر بات کریں گے کبھی۔ آج تو ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر آمنہ صفی کی طرف دیکھا۔

”ہاں عادل صاحب۔ وہ آپ کے ایک کولیگ ہیں۔ آغا عبدالکریم۔“

”ہاں خیریت۔“

”خیریت ہی ہے سر۔ ان کا ایک مکان ہے کشمی چوک کی طرف وہ اسے کرائے پر دینا چاہتے ہیں۔

مناسب کرایہ ہے لیکن ان کی شرائط ہے کچھ کڑی سی ہیں اگر آپ سفارش کر دیتے تو..... وہ یقیناً آپ کی

بات رد نہیں کریں گے۔“

”کیوں نہیں۔ میں آج ہی بات کر لیتا ہوں آغا صاحب سے۔“

”دراصل۔“ آمنہ نے وضاحت کی ”تصدق احمد اپنی فیملی کو لانا چاہتے ہیں۔ وہاں

کڑوں میں بچوں کی ایجوکیشن کا مسئلہ ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے فیملی ساتھ ہی ہونا چاہیے۔“

پروفیسر عادل نے تصدق احمد کی طرف دیکھا۔

”اور میں تو حیران ہوں کہ یہ اتنے عرصے فیملی کے بغیر کیسے رہ لیے ہیں۔“ مجتبیٰ حیدر نے تبصرہ

”میں نہیں رہ سکتا ایک دن بھی بیوی بچوں کے بغیر حالانکہ.....“

”حالانکہ دل کے بہلانے کے بہت سامان مہیا ہو سکتے ہیں۔“ آمنہ نے آہستگی سے کہا۔

”بالکل۔“ جتنی حیدر نے قہقہہ لگایا..... ”دریں چہ شک۔“

پروفیسر عادل نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور وہ فون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دوسری طرف تیار تھا۔

”ارے بیٹا! آپ کیسے ہیں؟“

”میں تو اچھا ہوں لیکن موموا اچھی نہیں ہیں۔“

”کیا ہوا موموکو؟“ انہوں نے تڑپ کر پوچھا۔

”اتنی کمزور ہو گئی ہیں! آپ نے خیال نہیں رکھا ناں کا۔ ناراض ہوں آپ سے۔“

”اوہ۔“ انہوں نے قدرے پرسکون ہو کر کہا ”میں نے تو خیال رکھنے کی کوشش کی تھی میری جان لیجئے وہ خود ہی دھیان نہیں رکھتیں اپنا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ تیمور نے پرسوج انداز میں کہا ”چنانچہ کیا بات ہے۔ مومو بہت اداس لگ رہی ہیں۔“

”ماما بھی تو گھر پر نہیں ہیں نا۔“ اس کے لہجے میں اداسی تھی ”حالانکہ میں نے مومو سے کہا بھی تھا کہ

ماما کو فون کر کے بتادیں کہ ہماری چٹھیاں آنے والی ہیں۔ مگر پھر بھی ماما چلی گئیں۔“

”آجائیں گی میری جان یہ بتاؤ دنیا کیسی ہے۔“

”موٹی ہو گئی ہے۔“ وہ ہنسا ”ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی ہے..... ڈرائی فروٹ زیادہ کھاتی ہے

... اور آپ بتائیں! آپ مجھ سے ملنے کب آئیں گے؟“

”شاید آج ہی آجاؤں یا پھر ممکن ہے کل صبح آؤں۔ کچھ گیٹ آئے ہوئے ہیں۔“

”میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”اوکے۔“ ریسپورڈ کر ڈیل پر رکھ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔



”عاشی۔“ مریم نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے پکارا۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹی گائے

رہی تھی۔ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”ارے بھو! آپ گئیں نہیں ڈاکٹر عبد المعید کے ساتھ شاپنگ کرنے؟“

”نہیں۔ آج پروگرام رہ گیا ہے۔“ وہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”عاشی اب تم کالج جاکر کرلو۔ ایڈمیشن تو غالباً ہو رہے ہیں۔ ایف اے کے نتائج آئے ہونے

دن ہو گئے تم عادل بھائی کے ساتھ کون سا کورس کرو گے؟“

”مجھے تو دل پڑھائی میں نہیں لگتا۔“

”پھر کس میں دل لگتا ہے جاہارا؟“ مریم مسکرائی۔

”کسی میں بھی نہیں۔“ اس نے انتہائی بے زاری سے کہتے ہوئے ڈیک کا بٹن آف کیا۔

”چاہے یہ معید بھائی کس سلسلے میں شاپنگ کرنا چاہ رہے ہیں؟“

مریم کا چہرہ ایک دم کھلا کھلا گئے گا۔

”نہیں بہت دنوں سے میری ان سے بات نہیں ہوئی۔“

”اپنی شادی کے سلسلے میں۔ ماما سے فون پر انکل کی بات ہوئی تھی۔ وہ واپس آ کر تمہاری شادی

کر دیں گی۔“

”واٹ۔“ اس نے پورا منہ کھول کر کہا ”یہ ماما سے کس نے کہہ دیا کہ میں ڈاکٹر عبد المعید سے شادی

کر لوں گی۔“

”عاشی.....“ مریم نے بے حد افسردگی سے اسے دیکھا ”یہ تو ڈاکٹر عبد المعید اور ماما کی خواہش

ہے۔ بلکہ تم جانتی ہو سب۔“

”لیکن میں کسی کی خواہشات کی پابند نہیں ہوں صرف اپنی خواہش کی پابند ہوں..... اہمیت تو میری

اپنی خواہش کی ہے جو کہ وہ کیا ہے نہ کہ ماما اور معید کی خواہش کی۔“

”تمہاری خواہش۔“ مریم نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا ”کیا تم کہیں اور.....؟“

”ہاں۔“

”کون ہے وہ؟“

”انکل شچی۔“

”انکل شچی۔“ مریم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا تم نے ان کا پروپوزل ایکسیپٹ کر لیا ہے لیکن کیوں..... کیوں عاشی؟“ اس نے بے حد

مضطرب ہو کر پوچھا۔

”محبت ہوئی ہے مجھے ان سے۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

”لیکن عاشی وہ..... شرجیل مرزا..... وہ اس قابل نہیں ہے تمہاری محبت کے۔“

”اوہ۔“ اس نے مٹی خیر انداز میں اسے دیکھا ”میں نے تو آپ سے یہ نہیں کہا کہ ڈاکٹر شہریار سے

آپ کیوں ملتی ہیں اور یہ کہ وہ آپ کی محبت کے قابل نہیں ہے۔“

”عاشی۔ تم جانتی ہو کہ وہ یعنی کا بھائی.....“

”میں آپ سے صفائی تو نہیں مانگ رہی محبت کا کوئی جواز نہیں ہوتا اور یہ بات جب میں نے جانی

بے حد مجھے چاہا تھا کہ میں انکل شچی سے محبت کرنے لگی ہوں۔“

”میں صفائی پیش نہیں کر رہی ہوں اور مجھے تمہارے سامنے کسی بھی قسم کی صفائی پیش کرنے کی

ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں تو صرف تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں کہ شہر یار یعنی کامبھائی ہے شریف اور معزز ہیں۔“

”جہاں تک میرے علم میں ہے، انکل شچی بھی ماما، پاپا کے دوست ہیں اور وہ بھی شریف اور معزز ہیں۔“

”عاشی۔ عاشی تم نا سمجھ ہو۔“ وہ ہولے ہولے کانپنے لگی۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے بچو۔“ وہ بڑے تحمل اور سکون سے مسکرائی۔

”میں شاید تم سے زیادہ سمجھ دار ہوں..... لیکن محبت میں تو سمجھ اور نا سمجھ کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم جانتی ہوگی۔“

”یقیناً..... محبت تو.....“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”انکل شچی مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں۔ جیسی محبت ڈاکٹر شہر یار آپ سے کرتے ہیں۔“

وہ گیلی مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھتی چلی گئی۔ عاشی کیسے سمجھنے لگی کہ ماما نے مار رہی تھی۔ بڑی دیر بعد اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”عاشی اگر میں نے غلطی کی ہے تو ضروری ہے کہ تم بھی وہی غلطی دہراؤ۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ آپ نے غلطی کی ہے بچو۔ محبت تو ایک بہت خوب صورت جذبہ ہے۔ م دوئوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”عاشی.....“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”محبت تو معیہ بھائی بھی تم سے کرنے ہیں..... شاید اس سے زیادہ.....“

”ڈاکٹر عبد المعید.....“ وہ طنز سے ہنسی..... ”جو کبھی ماما کے پرستاروں میں شامل تھے اور اگر وہ مال میں یہ غنفر ملک نہ آجاتا تو آج غنفر ملک کی جگہ یہ ڈاکٹر عبد المعید صاحب ہوتے۔“

”نہیں نہیں عاشی۔“ مریم نے تڑپ کر کہا ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے شاید ایسی کوئی بات کبھی نہیں تھی۔ سب انکل شچی کے اپنے مفروضے ہیں۔ جان بوجھ کر انہوں نے ورغلا یا ہے تمہیں۔“ اس نے بے بسی سے

ہاتھ ملے ”تم..... تم انکل شچی کے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتی ہو۔ کیا کہوں میں کس طرح سمجھاؤں کہ.....“

”میں ان کے متعلق کچھ بھی جانتا نہیں چاہتی۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے۔ میرے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ہے۔“

”تم ابھی کم عمر ہو نا سمجھ ہو۔ دیکھ لینا ماما کبھی بھی نہیں مانیں گی۔ وہ انکل شچی کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”ماما نہیں مانیں گی تو کیا ہوا۔ میں اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔“ وہ باغی ہو رہی تھی۔ وہ انتہائی دل گرفتہ سی اس کے کمرے سے اٹھ آئی۔

”اور یہ سب آپ کا تصور ہے ماما۔“ بے اختیار اٹھ آنے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس نے دل کی دلی میں مزینب سے گلہ کیا۔

”اور یہ سب جو عاشی کر رہی ہے یا کرنے جا رہی ہے..... آپ کا غنفر ملک سے شادی کرنے کا رد عمل ہے اور اسے..... اس شریل مرزا کو موقع مل گیا ہے مجھے شکست دینے کا ہر آنے کا ماما شریل مرزا کا خیال

رکھتی تھیں..... اور ماما سے اس کے اختلافات بڑھنے کی وجہ بھی شریل مرزا ہی تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ ان سے اچھی طرح پیش آیا کرے اور اس کی چھوٹی موٹی گستاخیوں کا برا نہ مانا کرے کہ وہ ان کا پاس ہے۔ ان کا اپنا دے آف تھکنگ تھا۔ اس کے باوجود انہیں یقین تھا کہ وہ کبھی بھی عاشی کی شادی اس سے کرنے پر

راہی نہ ہوگی۔ عاشی ان کی ہم شکل تھی بلکہ ان سے زیادہ خوب صورت تھی اور عاشی کو چاہتی بھی نہیں..... پھر وہ عاشی کے لیے انکل ہادی کو ہاں کر چکی تھیں۔ بلکہ اب تو شادی بھی طے کر دی تھی۔

”اور عاشی..... شاید وہ بھی نہ جھکے پھر..... پھر کیا ہوگا۔“

”عاشی..... عاشی کو کیسے سمجھاؤں۔“

”وہ فیصلہ کر چکی ہے۔“

”اور ضد میں ہے۔“

”کیوں نہ انکل شچی سے بات کروں۔“

ایک دم اس کے ذہن میں روشنی سی کونڈی۔

”کیا خبر وہ میری بات مان لے اور..... عاشی کا چچھا چھوڑ دے۔“

وہ دونوں تک سوچتی رہی اور بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شریل مرزا سے مل کر خود بات کرے گی اس سے اور فیصلہ کرنے کے بعد اس نے اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

گاڑی درک شاپ میں تھی اس لیے وہ ٹیکسی پر ہی چلی آئی..... پہلی بار وہ شریل مرزا کے دفتر آئی تھی۔ شریل مرزا ہی تھی اس لیے اس نے اسلم چاچا کے گاڑی واپس لانے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

شریل مرزا اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔

”اب.....“ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا ”آج یہ ہمارے نصیب کیسے جاگ گئے۔“

وہ لمبے ٹھٹھکی ہوئے کائٹی رہی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ.....“

”کوہ کس سرخ جو کچھ کہنا ہے اطمینان سے کہیے گا۔ پہلے تشریف تو رکھیں..... چائے ٹھنڈا۔“

”کوہ نہیں۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری ”میں صرف آپ سے یہ درخواست کرنے آئی تھی کہ بھائی کا چچھا چھوڑ دیں۔“

وہ زرد ہوتی رنگت کے ساتھ وہاں کھڑی تھی۔

”جہیں اگر عاشی سے محبت ہے اور تم اسے مجھ سے بچانا چاہتی ہو تو.....“

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے بائیں آنکھ کا کوتا دبایا اور انتہائی کمینگی سے اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

”بھئی، منزل مقصود تو تم ہی ہو جان شرجیل۔“

اس کی زرد رنگت یک دم تپ کر سرخ ہو گئی اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے دفتر سے باہر نکلی اس نے اپنے چچے اس کا بلند قہقہہ اسے دیر تک سنائی دیتا رہا۔

سڑک پر آ کر کچھ دیر رک کر اپنا سانس درست کیا۔ دو روز دیک کوئی سواری نہیں تھی۔ پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے اس نے قدم اٹھایا تو اسے لگا جیسے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے گی۔ اس کا سر چکر رہا تھا اور وہ راتوں پر دانت سختی سے جمائے ایک ایک قدم بہت سنبھل کر اٹھا رہی تھی کہ اچانک پروفیسر عادل نے اس کے پاس آ کر گاڑی روک دی۔

”مریم!“

”جی۔“ اس نے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں۔

”یہ آپ ادھر کہاں سے آرہی ہیں اور پیدل کیوں ہیں آپ اور گاڑی کہاں ہے آپ کی۔ آئیے۔“ انہوں نے دروازہ کھولا۔ وہ کچھ کہے بغیر دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور پھر بیٹھتی ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ضبط کی طنائیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اگر وہ نہ روئی تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔

پروفیسر عادل نے بے حد گہرا کر گاڑی ایک طرف کرنے کے روک دی۔

”مریم..... مریم پلیز کیا ہوا ہے آپ کو؟“

لیکن وہ یوں ہی ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی رہی۔

انہیں لگ رہا تھا جیسے اس کے آنسوؤں کے دل پر گر رہے ہوں اور وہ اندر سے تمام بھیگتے جا رہے ہوں۔

”مریم۔ مریم۔ پلیز۔“ انہوں نے پھر درخواست کی ”حوصلہ کریں۔ کیا ہوا ہے کچھ تو کہیں۔“ لیکن وہ نہ بولنے لگی نہ چلنے جا رہی تھی۔ ان کا جی چاہ رہا تھا اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ کر اسے تسلی دیں۔

کہ وہ ہیں اس کے ساتھ۔

بڑھاپے اور ہر دکھ میں۔

اور اس کے سارے غم خود لے لیں گے۔

”آہ۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”اتنی سی بات کہنے کے لیے آپ نے اتنی زحمت کی یہ بات تو آپ

عاشی سے بھی کہہ سکتی تھیں کہ وہ میرا چچا چھوڑ دے۔“

”وہ معصوم ہے۔ نا سمجھ ہے۔ آپ نے اسے درغلا یا ہے۔“

”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کے میں نے اسے درغلا یا ہے۔ کسی کو شادی کے لیے پروپوز کرنا عاقل کسی جرم کے زمرے میں نہیں آتا۔“

”لیکن آپ کو شرم آتی چاہیے تھی۔ اپنے سے آدمی سے بھی کم عمر کی لڑکی کو پروپوز کرتے ہوئے بھی۔“

”یہ بھی کوئی باعث شرم بات ہرگز نہیں ہے آپ کے سامنے تو مثال موجود ہے۔“

اس نے غصے سے اسے دیکھا۔

”آپ..... آپ۔“

”نہ۔ نہ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا ”کچھ مت کہیے گا..... ویسے غصے میں بھی آپ

پیارا آتا ہے۔“

”پلیز آپ کچھ تو سوچیں عاشی اور آپ۔“ وہ روہاںسی ہو گئی ”بھلا کیا جو ہے آپ کا اس کا۔“

”چلیں اس سے نہ سنی آپ سے تو جوڑ بن سکتا ہے۔“

”کیا.....“ وہ تیز لہجے میں بولی ”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“

”بھئی جو کہنا چاہیے۔“ وہ انتہائی پرسکون تھا ”عاشی کا چچا چھوڑ دیتا ہوں آپ شادی کر لیں مجھ سے۔“

یوں بھی زبانی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مومن جانے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”شٹ اپ“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”غور کرنا اس بات پر مس مریم۔“ وہ انتہائی خباثت سے مسکرایا ”ہم تو روز اول سے آپ کے دیوانے

ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کم

ہم نے جس جس کو بھی چاہا ترے ہجر میں فراز

آتے جاتے ہوئے موسم تھے فسانہ تو تھا

وہ بن ہی کھڑی تھی وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”مریم میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایک دن آپ خود چل کر میرے پاس آئیں گی۔“

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ ایک دم تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

”مت چھوئیں مجھے۔“ اس کی آنکھیں شدید غصے سے سرخ ہو گئیں۔

”تم میری ضد بن چکی ہو مریم عثمان احمد۔ یاد رکھنا میں وہ لمحہ کبھی نہیں بھولا۔ جب اس نے تم نے میرا ہاتھ جھٹکا تھا اور میں نے تم تک پہنچنے کے لیے عاشی کو بطور سیڑھی استعمال کیا ہے۔“

لیکن وہ ضبط کیے بیٹھے تھے اور وہ یوں ہی بے دردی سے روئے چلی جا رہی تھی۔

”مجھے..... مجھے..... یوں اس طرح تو مت آزمائیں مریم۔“ انہوں نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا۔
”آپ کا یوں اس طرح رونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا اور پھر یہ کوئی مناسب جگہ نہیں ہے رونے کے لیے۔“ ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لیے انہوں نے لطیف سا مذاق کیا ”گھر چلتے ہیں وہاں بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔ مجھ پر یقین کریں۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔ جو بھی مسئلہ آپ کو ہے وہ آپ کا تھا نہیں۔ بے مجھے بھی اس میں اپنا شریک سمجھیں میں..... میں.....“

”کاجی چاہا کہ وہ آج دل کھول کر رکھ دیں۔ آج اسے بتا دیں کہ وہ اپنے دل میں اس کے لیے کیے بندھے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے اسے انہوں نے سوچا ہے اور کس طرح وہ اپنے ہر بندے کو اب تک سب سے کمزور کر رکھ رہے ہیں اور وہ اس کے لیے جان تک سے گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“

”مریم۔“ انہوں نے بے اختیار اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ان کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔

مریم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

آنسوؤں سے بھیسے گلابی رخسار

لرزتی پلکوں پر موتی اٹکے ہوئے

اور دھڑکنے والی لب ہولے لہرتے ہوئے۔

ان کا ضبط جواب دینے لگا تو بے اختیار انہوں نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔

مریم نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

”ریلیکس مریم۔“ ان کا لہجہ بے حد نرم اور شفیق تھا بالکل پاپا کی طرح ”آپ مجھ سے اپنا پرالیم ڈسک کریں اور یقین کریں وہ سب کچھ جو آپ کو پریشان کر رہا ہے وہ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ اپنی سارا پریشانیوں مجھے دے دیں اور خود بالکل ریلیکس ہو جائیں۔“

مریم کو بے حد حوصلہ محسوس ہوا۔ جیسے وہ واقعی سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔

”آخر پہلے بھی تو انہوں نے عاشی کو روک لیا تھا۔ سمجھالیا تھا یقیناً اب بھی وہ اسے سمجھا لیں گے۔“

اس کے اندر جیسے سکون سا اثر آیا۔

”آپ بہت کم حوصلہ ہیں مریم۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اگر اجازت ہو چلیں۔ گھر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا۔

اور وہ واقعی وہ بہت کم حوصلہ ہے، پتا نہیں کیوں وہ ایسی ہے۔ اتنی کم ہمت اور تھوڑی..... حالانکہ نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اب بہادر بنے گی اور یہ کہ اسے سب کا خیال رکھنا ہے اور سب کی حفاظت

ہے اور اس نے کوشش بھی تو کی تھی۔

ان دنوں اپنا غم بھول کر اپنا دکھ فراموش کر کے وہ نینا اور تیمور کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن تیمور از حد شرب ہوا تھا اس کے خدشے سے کہیں زیادہ۔

جلد یاد پر تیمور اور نینا کو بھی حقیقت تو پتا چلنا تھی لیکن وہ اسے ابھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کی تیمور اور نینا کیا رد عمل ظاہر کریں گے اور وہ کس طرح انہیں ہینڈل کرے گی۔ عاشی تو جیسے بالکل بے نیاز ہو کر خود میں مگن رہنے لگی تھی، مور نے محسوس بھی کیا تھا۔

”کاجی بہت بدل گئی ہیں مومو۔“

”نہیں تو یوں ہی تمہارا وہم ہے۔“ اس نے اسے بہلایا۔

”وہم تو نہیں ہے مومو۔ وہ اب پہلے کی طرح ہم سے بات نہیں کرتیں۔“ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔

اور ایسے میں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیسے اسے ماما کے متعلق بتائے گی۔ وہ کتنی بار پوچھ چکا تھا ”آخر ماما یورپ کی سیر کے لیے کیوں گئی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم سب کو ساتھ لے کر جائیں گی۔ مومو کیا وہ کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے گئی ہیں؟“

”نہیں تو۔“ اس روز بھی اس نے پوچھا تو وہ الجھنے لگی تھی کہ وہ اسے کیا بتائے۔ وہ کم عمر تھا لیکن بہت باشعور تھا۔

”وہ تو جی آپ کے نئے ڈیڑی کے ساتھ گئی ہیں گھونسنے پھرنے۔ آپ کو کیسے ساتھ لے جاتیں.....“

شریف نہ جانے کب سے وہاں آکھڑا ہوا تھا۔

”نئے ڈیڑی۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔

اور پھر اسے کتنی مشکل پیش آئی تھی اسے سمجھانے اور بہلانے میں۔

”ماما نے ایسا کیوں کیا مومو؟“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

اور پھر وہ ایک دم ہی چپ ہو گیا تھا..... خاموش اور بنجیدہ۔

اس نے کتنی کوشش کی تھی کہ وہ پہلے کی طرح بنے بولے..... حتیٰ کہ وہ عادل سے بھی کم ہی بات کرتا تھا۔

نینا بھی چپ تھی اور پھر وہ دونوں ہی چھٹیاں گزار کر چلے گئے تھے اور تیمور کے خیال سے وہ کتنی افسردہ رہی تھی اور ہر دوسرے دن اسے فون کرتی تھی۔

پروفیسر عادل نے اس کی طرف دیکھا۔

خاموش اور اس سی وہ ان کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔

”عاشی کیسی ہے؟“

ایک بڑے سے سیاہ گیٹ کے سامنے ہارن دیتے ہوئے انہوں نے بتایا لیکن وہ سن سی بیٹھی تھی اور اس کی حالت سے بے خبر وہ اسے بتا رہے تھے ”یہ میرا گھر ہے مریم۔“
 ”یہاں بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں پھر میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔ آپ بہت اعتماد کے ساتھ ہر بات بتا سکتی ہیں یقین کریں مریم مجھ پر میرے خلوص پر۔“
 لیکن مریم کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی اور پھر پروفیسر عادل نے اتر کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔
 ”آئیے مریم۔“

خواب کے سے عالم میں وہ نیچے اتری اور پھر گاڑی سے اترتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں زمین سے الچھ رہے ہوں اور چیزیں اس کے چاروں طرف گول گول دائروں میں چکر لگا رہی ہوں۔ وہ لڑکھائی تو بے اختیار پروفیسر عادل نے اسے تمام لیا لیکن پھر جیسے سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے سے نچو گیا۔



”عاشی۔“

مریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”خفا ہو مجھ سے؟“

عاشی نے جو بہت دیر سے لان میں اکیلی بیٹھی شریف کو دیکھ رہی تھی جو پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ مڑ کر مریم کی طرف دیکھا جو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی بہت محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”ہاں۔“

اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور کھڑی ہو گئی اور مریم کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ..... آپ انکل شی کی طرف گئی تھیں؟“

”ہاں۔“

”نرگس کی خبریں جھک گئیں۔“

”کیوں! کیوں گئی تھیں آپ وہاں۔“

اس کا لہجہ سخت لیکن آہستہ تھا۔

”کیا سمجھتی تھیں آپ کے اس طرح میں رک جاؤں گی۔ نہیں بھو۔ اب کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ بتا بیٹے گا ماما کو جب ان کا فون آئے کہ میں انکل شی سے ہی شادی کروں گی۔“

”اچھی ہے۔“ اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر اس کی نظر باہر پڑی۔ راستے انجانے تھے۔ یہ سڑک ان کے گھر کی طرف تو نہیں جاتی۔

”یہ..... یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ بوکھلا کر اس نے پوچھا۔

”آپ بے فکر رہے آپ کو کہیں کسی غلط جگہ لے کر نہیں جاؤں گا۔“

اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ مسکرائے۔

لیکن ان کے لبوں پر پھیلی جیسی جیسی مسکراہٹ نے اسے حوصلہ دینے کی بجائے مزید خوف زدہ کر دیا۔ غیر ارادی طور پر وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔
 ”اور یہ شخص عادل احمد خان۔“ اس نے سوچا۔

”عاشی نینا اور مور کا بھائی ہے۔“

”اس کے ساتھ اس کا تو کوئی رشتہ نہیں ہے اور وہ اس کے ساتھ چلی آئی ہے بغیر سوچے سمجھے۔“
 ”لیکن یہ شخص کس قدر مہربان، ہمدرد اور شفیق ہے اور ان بیٹے دنوں میں اس نے ان سب کا کتنا ذرا رکھا ہے جب وہ بیمار تھی۔“

”تب۔“

”اور جب وہ اتنی زیادہ آپ سیٹ تھی تو وہ کس طرح مہربان لفظوں سے اسے تسلی دیتا تھا۔“
 اس سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے کن آنکھوں سے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

وہ اپنے دھیان میں ڈرائیو کر رہے تھے اور کسی خیال سے ان کے ہونٹوں پر اب بھی جیسی ہی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں کسی اندرونی احساس سے دمک رہی تھیں۔

ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا۔

بی آپا کے گھر طوطے کے بنجرے کے پاس کھڑے پروفیسر عادل کی آنکھوں کی دمک اور..... اور.....

نرگس کی باتیں۔

”یہ جاگیر دار بہت عیاش ہوتے ہیں۔“

ان کی تنبیہ۔

”موموان سے بچ کر رہنا۔“

ایک دم خوف شدید خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے اپنے اعصاب ٹوٹنے محسوس ہوئے۔

”لیجیے منزل آگئی۔“

”نہیں۔ نہیں میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“
وہ جلدی سے بولی تو انہوں نے سر ہلادیا۔
”اوکے۔“

اور پھر اس نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔ عاشی کی خواہش، اس کی ضد، شرجیل مرزا کی کمینگی اور اس کی دیکھیاں وہ سنجیدگی سے سنتے رہے۔

”آپ کو اس چپ انسان کے پاس جانے کی ضرورت کیا تھی۔ میں تھا نا، مجھ سے کہا ہوتا۔“
ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا اور پیشانی کی رگیں پھول ہی گئیں۔

”بہر حال اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لوں گا سب۔“

اور اس کے دل میں اطمینان سا اتر آیا تھا جیسے اب کچھ نہیں ہوگا اور عادل سب کچھ ٹھیک کر لے گا لیکن عادل نے ابھی تک عاشی سے بات نہیں کی تھی۔ اس روز وہ اسے زنب ولا کے گیٹ پر اتار کر چلے گئے تھے اور آج تین دن ہو گئے تھے وہ پھر نہیں آئے تھے اور عاشی کے ارادے خطرناک تھے اور کیا خبر وہ ماما کے آنے کا انتظار ہی نہ کرے اور خود ہی.....

”پھر پھر کیا ہوگا؟“

وہ پریشان ہی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”عادل بھائی کو فون کروں۔“ اس نے سوچا۔

”انہیں بتاؤں کہ عاشی اس سے خفا اور ناراض ہے اور یہ کہ اس نے انکل شچی سے شادی کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔“

فون کرنے کے ارادے سے وہ اندر چلی آئی اور پروفیسر عادل کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف خدا بخش فون اس نے بتایا کہ پروفیسر عادل حویلی گئے ہیں۔ ماں جی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ ان رات حویلی چلے گئے تھے۔

لیکن وہ کہہ گئے تھے کہ آپ کا فون آئے تو آپ کو کہہ دوں کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوں اور ان پر یقین رکھیں۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

خدا بخش کے دل کو ذرا سی تسلی ہوئی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال کر عاشی کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ بند تھا لیکن اندر سے بہت تیز موسیقی کی آواز آرہی تھی ”شاید وہ بھی ڈسٹرٹ ہے۔“
انہوں نے افسردگی سے سوچا اور میں جانتی ہوں وہ یہ سب کچھ ماما کی ضد میں کر رہی ہے۔ ورنہ ڈاکٹر المعید کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور یقیناً انکل شچی اسے ڈاکٹر عبدالعزیز کے خلاف کر رہا ہے۔

”اور..... اور پتا نہیں شہریار کا کیا حال ہے۔ کتنے بہت سے دن ہو گئے ہیں یعنی نے بھی فون نہیں کیا

”لیکن عاشی۔“

مریم کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا۔

”عاشی معید بھائی.....“

”ہاں معید بھائی۔ ماما کو یہ بھی بتا دیجیے گا کہ اس میں کو وہ اپنے لیے بچا کر رکھ لیں۔ کیا خبر آج کل میں غنفر ملک سے ان کے اختلافات ہو جائیں تو پھر۔ یوں بھی مجھے ان کے کسی پرستار سے شادی نہیں کرنا ہے اور آپ براہ مہربانی اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ بھی ڈاکٹر شہریار سے شادی کر لیں۔ ماما کو شاید کبھی فرصت نہ ملے آپ کی شادی کرنے کی۔“
وہ کھٹ کھٹ کرتی اندر چلی گئی اور مریم وہیں ساکت کھڑی رہ گئی۔

”یہ عاشی کس قدر باغی ہو رہی ہے۔“

”اور ماما، یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ کم از کم عاشی کو تو آپ نے پہلے بتا دیا ہوتا کہ آپ غنفر ملک سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو شاید وہ اتنی دل شکستہ نہ ہوتی۔“

مریم نے انتہائی دل گرگشتی سے سوچا اور عاشی کے پیچھے اندر جانے کی بجائے وہیں لان میں گھاس پر بیٹھ گئی۔

اور عادل بھائی نے کتنا اطمینان دلایا تھا اسے کہ وہ ایسا کچھ کبھی نہیں ہونے دیں گے اور یہ کہ عاشی کی شادی ڈاکٹر عبدالعزیز سے ہی ہوگی شرجیل مرزا سے نہیں لیکن عاشی.....

شاید ابھی عادل بھائی نے عاشی سے بات نہیں کی اور اس روز جب ہوش آیا تھا تو وہ پروفیسر عادل کے گھر میں تھی۔ خدا بخش اس کے سر ہانے کھڑا تھا اور پروفیسر عادل ڈاکٹر کو فون کر رہے تھے۔ اسے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر اس کی طرف پلٹ آئے۔

”ارے مریم کیا ہو گیا تھا آپ کو ایک دم سے۔“ پریشانی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ شرمندہ ہی ہو گئی۔

انہیں کیا بتانی کہ اس کے ذہن میں کیا کیا خیال آئے تھے اور اس کے تھکے ہوئے اعصاب چند لمحوں کے لیے جواب دے گئے تھے۔

”خدا بخش، مریم بی بی کے لیے گرم دودھ لائیں۔“

انہوں نے خدا بخش سے کہا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا مریم۔ یہاں تک بمشکل سہارا دے کر آپ کو لایا۔ خیر۔“

وہ ذرا مسکرائے۔

”اب دودھ پی لیں اور پھر اندر چل کر آرام سے بیٹھ کر مجھے سب کچھ بتائیں۔“

اور وہ خود اس نے بھی تو شہر یار کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ کیا لکھے وہ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا۔ شاید اس کے پاس کچھ لکھنے کے لیے تھا ہی نہیں نہ کوئی امید نہ کوئی خواب۔ جیسے سارے خواب آنکھوں میں ہی مر گئے تھے اور ساری امیدیں دم توڑ گئی تھیں اور عاشی کہتی ہے کہ میں ڈاکٹر شہر یار سے شادی کر لوں۔ وہ وہیں ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ پڑے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

”اور پتا نہیں عاشی نے یہ کیسے جان لیا کہ میں اور ڈاکٹر شہر یار..... کیا اس روز صرف ایک بار مجھے اور ڈاکٹر شہر یار کو دیکھ کر اس نے سوچ لیا تھا۔“

”کہ میں..... اور شاید یہ دوسری یا تیسری بار تھی کہ اس نے ڈاکٹر شہر یار کا نام لے کر اس سے کچھ کہا تھا اور وہ پتا نہیں کیا سوچتی ہوگی اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس روز وہ ڈاکٹر شہر یار کے ساتھ نہ جاتی لیکن اب تو ایسا ہو چکا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے عاشی اسے ڈاکٹر شہر یار سے شادی کا مشورہ دے چکی تھی۔“

”اور اسے کیا پتا۔“

مریم نے بے حد دل گرفتگی سے سوچا۔

”کہ یہ ممکن نہیں ہے کسی طرح بھی نہیں۔ وہ ایک ماڈل گرل ایک اداکارہ کی بیٹی ہے اور پھر اب وہ اور بھی بے مایہ ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ عثمان احمد کے نام کا حوالہ بھی نہیں رہا۔“

”اور پتا نہیں میرا باپ کون ہوگا۔ کوئی خاندانی آدمی یا.....“ دکھ گہرا دکھ ہو لے ہو لے اس کے دل کو چیرنے لگا۔

دونوں ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی کہ یک دم فون کی بیل بج اٹھی۔ یک دم چونک کر اس نے ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف زنب عثمان تھیں۔

”ماما آپ!“

اس کی آواز لرز گئی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی ماما کی آواز سن کر اس کے اندر زندگی پیدا ہو گئی تھی۔

”ہاں جالو کیسی ہو۔“

”ٹھیک ہوں۔“

”عاشی، مونڈینا۔“

”سب۔ سب اچھے ہیں، مور نے آپ کو بہت مس کیا ہے۔“

”میں بھی سب کو بہت مس کرتی ہوں جان۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ بہت جلد زیادہ سے زیادہ نیک ہفتے تک میں آ رہی ہوں۔ تم ڈاکٹر ہادی کو بتا دینا، وہ اوپر والا پورشن خالی کر دیں، میرے آنے سے پہلے میں نے انہیں کہا ہوا تھا۔“

”یس ماما آئی نو۔“

”سب کو مونڈینا اور عاشی کو میرا پیار کہنا۔“

”ماما، کب؟ کس دن ہے آپ کی فلائٹ؟“

”ابھی کسفر نہیں ہے۔ پھر بتا دوں گی۔“

اور ماما کو خدا حافظ کہہ کر وہ یک دم عاشی کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”عاشی۔ عاشی سنو ماما آ رہی ہیں۔“

اس نے دروازے کو دھکیلتے ہوئے خوشی سے بتایا۔

”اچھا۔“

عاشی نے جو ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی، سر موڑ کر اسے دیکھا۔

”عاشی، تمہیں خوشی نہیں ہوئی ماما کے آنے کی؟“

”پتا نہیں۔“

عاشی دوبارہ منہ موڑ کر آئینے میں دیکھنے لگی۔

”میں..... میں بہت مس کر رہی تھی ماما کو۔“

مریم ہولے ہولے چلتی ہوئی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ جب سے ماما کی تھیں اسے لگتا تھا جیسے زندگی ایک نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہو۔ ٹھہر کر منجمد ہو گئی ہو۔

”ماما کے ساتھ وہ بھی ہوگا۔ غنفر ملک۔“

عاشی برش ڈیرنگ ٹیبل پر رکھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔“

مریم کی رنگت پھیکی پڑ گئی پھر بھی وہ مسکرائی۔

”ماما بھی تو ہوں گی ماما ساتھ۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“

”اب نے کندھے اچکائے اور اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔“

”عاشی۔“

مریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

”تم اتنی ناراض کیوں ہو ماما سے؟“

”کیا آپ نہیں ہیں؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

کہ باقی ماندہ زندگی ہمیشہ ساتھ رہیں۔ اس بار تو انہوں نے بہت ضد کی تھی کہ تمہیں اور ماں جی کو بھی ساتھ لاؤں۔ عادل تم چلو تاکہ بھی کراچی۔“

”ہاں، کوشش کروں گا۔“

انہوں نے کسی خیال سے چوہکتے ہوئے کہا۔

”وہاں ہوتی ہوں تو یہاں کے لیے دل بے چین رہتا ہے اور یہاں ہوتی ہوں تو مراد بھائی اور بچوں کے لیے دل تڑپا ہے۔ عادل اب شادی میں دیر مت کرنا۔ جیسے ہی زینب آئی واپس آتی ہیں مجھے فون کر دینا۔ ہم آکر تاریخ لے لیں گے۔ کب تک آجائیں گی وہ؟“

”معلوم نہیں۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ واپس آ کر وہ مریم اور عاشری کی شادی کریں گی۔“

”میں نے دعا تو بہت کی تھی عادل کہ مریم تمہاری دلہن بن کر حویلی میں آجائے لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے مریم کی والدہ پر یقین نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ڈر تھا کہ وہ انکار کر دیں گی اور یقین کرو۔“

وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

”جب تم نے فون پر بتایا کہ مریم کی والدہ نے تم سے یہ بات کہی ہے تو کتنی ہے دیر تک یقین ہی نہ آیا اور جب یقین آیا تو بے اندازہ خوشی ہوئی اور ماں جی تو خوشی سے رو پڑیں۔“

”ماں جی نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ انہوں نے سارے خواب تمہارے حوالے سے دیکھے ہیں۔ اب دیر نہیں کرنا۔ ماں جی کوئی خوشی اپنی زندگی میں ہی دیکھ لیں تو اچھا ہے۔“

وہ کب دیر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی روز مریم کو رخصت کروا کے لے آتے جس روز زینبی نے انہیں ہمیشہ کے لیے مریم کو ان کا بنادینے کی نوید دی تھی۔ لیکن وہ مریم پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ کس قدر بکھری ہوئی تھی۔ کتنی اپ سیٹ اور سر اسیمہ۔ ابھی وہ اتنے بڑے دکھ کو برداشت نہیں کر رہی تھی۔ ایک ساتھ اس پر دو الم ٹوٹے تھے۔

ایک زینبی کی غنیمت ملک سے شادی کا۔

اور دوسرا یہ انکشاف کہ وہ عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے۔

ابھی تو جیسے وہ یقین و بے یقینی کے درمیان کی اذیت میں تھی۔ انہوں نے خود اس کی آنکھوں میں اس اذیت کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ تو اسے پھولوں کی طرح رکھنا چاہتے تھے۔ یوں سنبھال کر جیسے وہ کسی نازک کانچ سے بنی ہو جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جائے گی۔ کتنی شدید اذیت جمیل کر وہ اب کچھ بہتر ہونے لگی تھی۔ وہ لمحے جب وہ ہاسپٹل میں تھی۔ جب ڈاکٹر انہیں ہوش میں لانے کے لیے کوشش کر رہے تھے تو انہیں لگتا تھا جیسے ان کے ارد گرد زندگی ہولے ہولے مر رہی ہو اور جیسے اگر اس نے آنکھیں نہ کھولیں تو کائنات ان کے لیے ہمیشہ کے لیے مرجائے گی اور اب جب خدا نے اسے ان کے لیے بچا لیا تھا تو وہ کیسے

وہ..... وہ تو ہمیشہ ناراض رہتی تھی، خفا رہتی تھی، ماما سے کتنے شکوے کتنے گلے تھے اسے ماما سے لیکن وہ خود ہی خفا ہوتی تھی اور خود ہی مان بھی جاتی تھی اور وہ ہمیشہ ماما سے کبھی بھی خفا نہیں رہ سکتی تھی۔

”کیا آپ کو دکھ نہیں ہوا تھا ماما کی شادی کا۔ کیا آپ اس بات پر خوش ہوئی تھیں کہ۔“

اسے خاموش دیکھ کر عاشری نے پھر کہا۔

”نہیں عاشری۔ لیکن پلیز، تم اب ماما کو معاف کر دو۔ ناراضی ختم کر دو پلیز۔ عاشری اتنی خفا مت رہو ان سے۔ ہمارا کون ہے ان کے سوا۔“

مریم کی آواز بھر اگئی۔

عاشری نگاہیں جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی۔

”عاشری۔“

مریم نے ایک دم سے اپنے ساتھ لگا لیا اور وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بے اختیار رو پڑی۔ مریم اسے ساتھ لگائے ہوئے ہوئے اٹھنے لگی۔



”بی آئی یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ آپ ابھی کراچی سے آئی ہیں اور ابھی واپس جانے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔“

پروفیسر عادل نے بی آئی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”عادل تم آؤ بیٹھو۔“

بی آئی نے جو اخبار دیکھ رہی تھیں اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”ماں جی بتا رہی تھیں کہ آپ کچھ دنوں تک واپس جا رہی ہیں۔“

پروفیسر عادل نے بیٹھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں مجبوری ہے عادل۔ ورنہ ماں جی جس طرح اچانک بیمار ہوتی ہیں میرا یوں انہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر مراد بھائی اور بھابی نے حج کے لیے جانا ہے اور بچے اکیلے ہوں گے۔ مراد بھائی تو ابھی بھی نہیں آنے دے رہے تھے لیکن میں ماں جی کی بیماری کا سن کر رہ نہیں سکی۔ ان سے کہا بھی کہ ابھی تو ایک ماہ ہے۔ چند دن پہلے آ جاؤں گی۔ چا چا نے جب بتایا کہ ماں جی کی طبیعت اچھی نہیں ہے تو میں نہیں رہ سکی۔“

”ہاں ماں جی کا بی بی اچانک ہی بہت ہائی ہو جاتا ہے اور پھر۔“

پروفیسر عادل نے آہستگی سے کہا۔

”مریم آ جاتی تو مجھے بھی اطمینان ہو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب بھی جاتی ہوں۔ مراد بھائی آنے نہ نہیں دیتے۔ کہتے ہیں اتنا عرصہ ایک دوسرے سے چھڑے رہے ہیں ہم بہن بھائی کہ اب جی چاہتا

ابھی کوئی ایسی بات کر سکتے تھے جو اس کے لیے مزید اذیت کا باعث بنے۔ وہ تو ذرا ذرا سی باتوں پر پریشان ہو جاتی تھی۔ حواس کھونٹے لگتی تھی۔ اس روز وہ کس قدر پریشان ہو رہی تھی عاشری کی وجہ سے اور یہ عاشری خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ جاتے ہی اس سے بات کریں گے۔ انہوں نے مریم سے وعدہ کیا تھا، اسے یقین دلایا تھا کہ اسے عاشری کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اسے کوئی غلط قدم اٹھانے نہیں دیں گے۔ وہ اسے روک سکتے ہیں اور وہ کتنی مطمئن ہو گئی تھی۔ یوں جیسے اسے یقین ہو کہ اب کچھ نہیں ہوگا اور وہ ماں جی کی اچانک بیماری کی وجہ سے حویلی آگئے تھے اور عاشری سے بات ہی نہیں کر کے تھے۔ وہ ضرور پریشان ہوگی۔ اتنی ہی کم حوصلہ ہے وہ۔

ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

اس روز اچانک سڑک پر اس کا ملنا اور پھر وہ ان کا اسے گھر لے جانا۔ بس اچانک ہی دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ آج مریم کو گھر لے جائیں لیکن خود وہ اس خواہش سے بے خبر تھے۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور وہ بے خودی کی سی کیفیت میں گاڑی گھر والی سڑک پر موڑ چکے تھے اور اس کا احساس انہیں تب ہوا تھا جب مریم نے انہیں ٹوکا تھا۔

”یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اور تب خیالوں کی دنیا سے باہر آتے ہوئے انہوں نے اسے بتایا تھا کہ گھر اور پھر وضاحت بھی کی تھی کہ وہاں ہم آرام سے جو مسئلہ بھی ہے اسے ڈسکس کر سکیں گے حالانکہ ان کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ اسے تا دیں کہ وہ خیال میں بہت دور آگئے نکل گئے تھے۔ یوں جیسے وہ اور مریم اکٹھے ایک گھر میں رہتے ہوں اور اب لمبی ڈرائیو کے بعد گھر واپس جا رہے ہوں۔ کیسا خوش کن خیال تھا اور کتنا دل نشین لیکن وہ یہ سب کچھ اس سے نہیں کہہ سکتے تھے اس کے اعصاب کس قدر کمزور تھے۔ ذرا سی بات بھی اس کے اعصاب کو توڑنے لگتی تھی اور ڈاکٹر نے کتنی تاکید کی تھی کہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کسی بات سے اسے شاک نہ پہنچے۔ پہلے ہی اس کا اعصابی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔

اور کوئی بھی پریشان کن بات اسے حواس سے بے گانہ کر سکتی تھی۔

اور اس روز وہ گاڑی سے اترتے ہی وہ کیسے اپنا آپ کھوٹ بیٹھی تھی اور اس کے بے ہوش ہونے سے وہ کوئی انہوں نے ہانپوں میں لیا تھا تو انہیں یوں لگا جیسے پوری کائنات اپنی تمام تر خوب صورتیوں اور حسن سمیت ہانپ کی ہانپوں میں سمٹ آئی ہو۔ ایک لمحہ کو ان کا جی چاہا تھا کہ کائنات کی گردش میں کبیں خنجر جائے اور وہ اسے ہانپوں میں لیے کھڑے رہیں اور..... مگر دوسرے ہی لمحے وہ چونک کر بہت احتیاط سے اسے ہانپ ہوئے اندر آئے اور باہر پڑے صوفے پر لٹا دیا۔ اسے کتنی آوازیں دیں بے چینی سے اسے پکارا لیکن وہ سدھ پڑی تھی۔ خدا بخش کو آوازیں دیتے ہوئے فون کی طرف لپکے تھے تاکہ ڈاکٹر کو فون کر سکیں۔

اور ابھی وہ نمبر ڈائل کر رہی رہے تھے کہ وہ اٹھ بیٹھی اور ریسور کرڈیل پر ڈال کر وہ بے اختیار اس کی لپکے تھے۔

”تم..... تم ٹھیک ہوتا۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“

بے اختیاری میں وہ اسے تم کہہ کر بلا گئے تھے لیکن وہ ہراساں سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

”مریم۔“

وہ ایک دم ایک قدم آگے بڑھے تھے بے اختیار جھک کر انہوں نے اس کے شانے کو تھپکا۔

مریم نے ایک دم ہی ان کا ہاتھ کندھے سے ہٹا دیا۔ اس کا انداز قطعی غیر متوقع اور ناگوار لیے ہوئے تھا۔ انگلیاں اضطرابی انداز میں ملتی ہوئی وہ بہت بے چین بہت مضطرب اور خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

لمحہ بھر کو وہ یونہی ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔

”کیا بات ہے مریم پلیز ریلیکس..... آپ اتنی خوف زدہ کیوں ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ۔ پلیز مجھ پر اعتبار کریں۔“

اور پھر کتنی دیر بعد اس کے اعصاب پر سکون ہوئے تھے اور وہ جلدی نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں انتظار کرنا تھا۔ اس وقت تک جب وہ اس کیفیت سے باہر نہ نکل آئے اور اب تو آگے راتے صاف اور روشن تھے۔

زینبی نے انہیں یقین دلادیا تھا کہ وہ ہی مریم کی رفاقت کے اہل ہیں۔

اب کوئی خوف یا شک نہیں تھا۔ نہ ہی وہ یقین و بے یقینی کے درمیان والی کیفیت تھی۔

انہیں ہولے ہولے مریم کو یقین دلانا تھا۔

پہلے اپنا اعتبار بحال کرنا تھا اور پھر.....

”کیا سوچنے لگے ہو عادل؟“

بی آپا نے جو بہت غور نے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں پوچھا۔

”کچھ نہیں بی آپا۔“

انہوں نے چونک کر کہا۔

”ابھی کم از کم ہفتہ بھر تو میں یہاں رہوں گی ہی۔ اگر مریم کی والدہ واپس آگئی ہوں تو فون کر دیتا۔“

”نہیں بی آپا۔“

وہ دل ہی دل میں ایک حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔

”ابھی نہیں۔ کم از کم چھ ماہ بعد۔ میں بی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”لیکن عادل! ماں جی کی طبیعت کا تمہیں پتا ہے۔“

بی آپا کو از حد حیرت ہوئی۔ کہاں تو وہ اتنے بے چین دیکھتے تھے اور کبھی کبھی بے اعتباری میں بی آپا کے

جائے آنکھیں موندے جانے کیا سوچ رہے تھے۔

”کبھی کبھی حرم کا خیال آتا ہے تو دل کو دکھ سا ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں، جانے اس کا نصیب کیا ہوگا۔“

”چاچا جانے بھی تمہاری آس میں کئی اچھے رشتے ٹھکرا دیے تھے اور جب تمہاری طرف سے ناامید ہو گئے ہیں۔ تو اب کوئی برابر کا اچھا رشتہ ہی نہیں آ رہا۔“ ان کے ہونٹ ہنسنے لگے اور اندر ہی اندر نام ہوتے ہوئے وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ کبھی کبھی مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی آدمی خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہے اور حرم کے معاملے میں وہ خود کو ایسا ہی سمجھتے تھے لیکن بعض معاملوں میں آدمی بے اختیار ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی خود کو اس رفاقت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں کر سکے تھے۔ جب مریم نہیں ملی تھی تب بھی نہیں اور اب تو۔

”تم چاچا کی طرف گئے تھے عادل؟“

بی آپا نے چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھائی۔

”نہیں۔ ماں جی کی طرف سے اتنی پریشانی رہی کہ جا ہی نہ سکا۔ چاچا جی سے تو اس روز حویلی میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ چچی جان کی طبیعت بھی کچھ نرم گرم رہتی ہے۔ ابھی جاؤں گا یہی سوچ کر آیا تھا کہ ادھر سے ہو کر ادھر جاؤں گا۔“

”ہاں ضرور جانا عادل۔ رشتے دور یوں سے کمزور پڑ جاتے ہیں اور پھر اب ہمارا اور بڑا ہے ہی کون ایک چاچا عبدالرحمن ہی تو رہ گئے ہیں۔“

”جی بی آپا۔“

انہوں نے آہستگی سے کہتے ہوئے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی۔ وہ غیر ارادی طور پر حرم کے متعلق سوچے چلے جا رہے تھے اور اگر وہ محبتی سے ذکر کریں حرم کا۔ کوئی خاندانی لڑکا، ان کا ہم پلہ.....

”ان کی ذات برادری سے تعلق رکھنے والا۔“

”محبتی کے تو اتنے تعلقات ہیں۔ اتنے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔“

”اور حرم ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔“

ایک بار پہلے بھی انہیں محبتی کا خیال آیا تھا کہ وہ محبتی سے حرم کا ذکر کریں لیکن پھر ایک عجیب سی جھجک مانع آگئی تھی اور آج ایک بار پھر انہیں محبتی حیدر کا خیال آیا تھا لیکن پھر انہوں نے خود ہی اسے رد کر دیا تھا۔

”نہیں یہ بھلا مناسب ہوگا۔“

”کیا سوچیں گے محبتی کہ ہم.....“

”نہیں سرور۔ سرور تو بہت اچھا لڑکا ہے لیکن چتا نہیں..... اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے اور پھر اگر اس کا فیملی بیک گراؤنڈ اچھا ہو بھی تو بھلا چاچا مانیں گے۔ ایک سرکاری اسکول میں معمولی ملازمت کرنے والا لڑکا۔“

سامنے اپنے جذباتوں کا اظہار کر بیٹھتے تھے اور کہاں اب اتنے سکون سے کہہ رہے تھے کہ فی الحال نہیں مرے کی والدہ نے انکار تو نہیں کر دیا۔ انہیں غم نہ ہوا تو انہوں نے عادل کی طرف دیکھا۔

تو انہیں ان کا چہرہ بہت پر سکون لگا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”دراصل بی آپا۔ مریم ابھی اس شاکڈ سے پورے طور پر سنبھلی نہیں ہیں جو یہ جان کر کہ اب اس کے پاس نہیں تھے اسے لگا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا اسے کئی دن ہاسپٹل میں رہنا پڑا۔ یوں کچھ لیس کر موت کو چھو کر بٹٹی ہے وہ۔“

”اچھا۔“

بی آپا پریشان سی ہو گئیں۔

”اب کیسی ہے وہ۔ جب وہاں جاؤ تو میرا پیارا کہنا اسے۔“

”جی ضرور۔“

وہ مسکرائے اور انہوں نے پاؤں پھیلاتے ہوئے بی آپا کی طرف دیکھا۔

”اور اب مجھے اچھی سی چائے پلو دیجیے۔“

”ہاں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ عفتاں۔“

انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔

”خیر تب تو..... میں ناشتا کر کے ہی نکلا تھا مگر اب طلب ہو رہی ہے۔“

انہوں نے بی آپا کے پاس پڑا اخبار اٹھا لیا۔

عفتاں کو چائے بنانے کا کہہ کر بی آپا پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”عادل تمہارا کیا خیال ہے۔ مریم کی والدہ اپنی بات سے پٹیں گی تو نہیں۔“

ایک لمحہ کے لیے جیسے کسی نے ان کے دل کو ٹٹٹی میں لے لیا اور پھر بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا۔

”نہیں میرے خیال میں تو نہیں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اب تو تمہارے ساتھ میری اور ماں جی کی بھی یہی خواہش ہے کہ مر

تمہاری دلہن بن کر اس حویلی میں اترے۔ ماں جی تو صبح شام اسی کا ذکر کرتی ہیں۔ عادل تمہاری ہنس

بہت اعلیٰ ہے۔“

اور مریم جیسے تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ان کے ہونٹوں پر آ

طمہانیت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

عفتاں کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے لے کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بی آپا نے پروفیسر عادل کی طرا

دیکھا۔ ان کے بھرے بھرے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی اور وہ کرسی کی پشت سے ت

اور یہ کتاب بڑا المیہ ہے کہ انسان کی ساری خوبیاں اور ساری اچھائیاں غربت اپنے اندر چھپا لیتی ہے اور آدمی کی اہمیت صرف اس کی دولت سے مشروط ہے۔

انہوں نے خالی کپ میز پر رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے ”اتنی اچھی چائے پلانے کا شکریہ۔“

”بیٹھو عادل۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی اکٹھے چلے ہیں۔ میں بھی ماں جی کی طرف جاؤں گی۔“

”نہیں بی آپ! میں اب چلوں گا بلکہ میں چھوٹی حویلی جاؤں گا۔ چا چا جی سے ملنے شاید مہران یا مانی سے ملاقات ہو جائے دیر ہوگئی تو وہ گھر سے نکل جائیں گے۔ خاص طور پر مانی تو ملتا ہی نہیں ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”میرے آنے تک آپ میاں جی کی طرف ہی رہیں گی نا؟“

جاتے جاتے وہ پلٹے۔

”ہاں بس میں ذرا اعتناں کو کچھ کپڑے اور برتن وغیرہ نکال دوں۔ دراصل اس کی بھانجی کی شادی ہے نا۔ تو میں نے کہا تھا اس سے یوں بھی میں دن بھر تو ادھر ہی ہوتی ہوں ماں جی کی طرف میرا کہاں دل لگتا ہے ادھر۔“

”اوکے بی آپ پھر دن میں ملاقات ہوگی۔“

انہیں سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی اس لیے وہ بی آپ کا خدا حافظ کہہ کر اپنے حصے میں آگئے۔ ان کا خیال تھا سگریٹ پی کر اور ذرا..... ریلیکس ہو کر وہ چھوٹی حویلی جاتے ہیں لیکن چا چا عبدالرحمن کو ماں جی کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھے۔

”میں تو آپ ہی طرف جا رہا تھا چا چا جی! اچھا ہوا نکل نہیں گیا ورنہ ملاقات نہ ہوتی۔“

”میری اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی اس لیے وہ دوبارہ تمہاری والدہ کی خیریت پوچھنے نہ آسکا۔ البتہ مہران سے پتا چلا تھا کہ اب پہلے سے بہتر ہیں تو اطمینان ہو گیا تھا۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے عادل پتر ایک بار بھر جانی کولا ہو رے کر کسی اسپشلسٹ کو دیکھا دو۔“

”کنی بار کہا ہے چا چا جی لیکن ماں جی مانتی ہی نہیں ہیں۔“

انہوں نے شکوہ بھری نظروں سے ماں جی کی طرف دیکھا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”یہ بلڈ پریشر بھی کوئی بیماری ہے جس کے لیے اسپشلسٹوں کی طرف جایا جائے۔“

بانو مسکرائیں۔

”اور سچ تو یہ ہے کہ بھائی عبدالرحمن کے میں حویلی سے باہر کہیں رہ ہی نہیں سکتی۔ عادل نے تو سکی بار کہا کہ اس کے ساتھ چل کر لا ہو رہی ہوں پہلے تو کامی کا مسئلہ تھا اور اب.....“

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کامل کے خیال سے ان کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

”جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا۔“

انہوں نے زیر لب کہا تھا لیکن عادل نے سن لیا اور ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور ان کی طرف کچھ کرزی سے مسکرائے۔

”ماں جی کچھ باتیں تقدیر میں لکھی ہوتی ہیں اور جلد یادیر ہمیں انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ کامی کی تقدیر بھی یوں ہی لکھی ہوئی تھی۔ اسے ہم سے یوں ہی بچھڑ جانا تھا اسی طرح۔“ انہوں نے ان کے ہاتھ چھپتے۔

”ہاں بھر جائی! اب تو میں بھی مایوس ہو گیا ہوں۔ اسے ملنا ہوتا تو اب تک مل چکا ہوتا۔“

عبدالرحمن خان نے کہا اور پھر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

”اور یہ مانی کیا کرتا پھر رہا ہے اور تم نے بھی اسے کھلی اجازت دے دی۔ بھی میں اس کے حق میں ہرگز نہیں تھا۔“

”کیا کرتا پھر رہا ہے؟“

زیتون بانو نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

”زیتون لے رہا ہے اور اس پر ڈس ایبل بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ خواہ وہ پیسہ ہی ضائع کرے گا۔ پہلے ہی ایسے بہت ادارے ہیں ملک میں۔ مزید کی کوئی ضرورت تو نہیں۔ ابھی کل ہی واپس آیا ہے فیصل آباد سے۔ کسی دوست کے ساتھ گیا تھا میں کا سودا کرنے۔ کہہ رہا تھا بات طے ہوگئی ہے۔ بس پے منٹ کرنی ہے۔ بھی میری بات تو وہ سنائیں تم ہی سمجھاتے اسے۔“

انہوں نے بات مکمل کر کے عادل کی طرف دیکھا۔

”تو وہ صحیح ہی کہہ رہا تھا اور میں خواہ وہ اس کی طرف سے بدگمان ہو رہا تھا۔“

”اگر وہ بنییدہ ہے چا چا جی تو اسے کرنے دیں جو کچھ وہ کر رہا ہے۔ ادارے تو یقیناً بہت ہیں ایسے لیکن جس طرح ان میں کام ہو رہا ہے آپ نہیں جانتے مانی نے میرے ساتھ جا کر وہاں رہنے والے بچوں کا حال دیکھا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا ہے۔“

انہوں نے عبدالرحمن خان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ خود ان کا ذہن ایک دم بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ کچھ لگتی دنوں سے جو ایک انجمن ہی ان کے ذہن کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ ایک موہوم سا وہم تھا۔ کبھی دل سے اٹھتا اور ان کے دماغ پر حاوی ہونے لگتا تھا۔ ایک دھندلی تھی جس میں سے صحیح سمت نہیں آتی تھی جیسے ایک دم صاف ہوگئی تھی۔

”مانی سے کہیے گا وہ میرے پاس لا ہو آئے پھر مل کر کچھ طے کر لیں گے۔“

”مجھے بھی تو کچھ پتا چلے کہ مانی کیا کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آسکی بات کی۔“

مان جی نے پوچھا تو وہ بہت خوشگوار موڈ کے ساتھ انہیں مانی کا منصوبہ بتاتے لگے۔ تب ہی باہر سے کسی ملازم نے آکر مسرور کے آنے کی اطلاع دی۔

”مسرور اور یہاں گاؤں میں خیریت؟“ وہ چاچا عبدالرحمن سے معذرت کر کے مردانے میں آگئے۔
”مسرور خیریت تو ہے نا۔ سب ٹھیک ہیں نا تمہاری امی اور..... تم یہاں..... تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں حویلی میں ہوں۔ تم گھر گئے تھے کیا؟“ اسے گلے سے لگاتے ہوئے ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی سوال کر ڈالے۔

”جی سر! بالکل خیریت ہے آپ تو یوں ہی پریشان ہو گئے۔“ مسرور نے الگ ہوتے ہوئے جواب دیا۔
”بات صرف اتنی سی ہے کہ میرا یہاں آپ کے گاؤں میں تبادلہ ہو گیا ہے حالانکہ درخواست تو میں نے اپنے گاؤں میں تبادلے کے لیے دی تھی۔“

”اوہ تھینک گاڈ! میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔“

خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”اور رہی یہ بات کہ مجھے آپ کا کیسے پتا چلا تو وہ سلطان صاحب نے بتایا ابھی کچھ دیر پہلے کہ آپ یہاں آئے ہوئے ہیں سوچا آیا۔“

”مان جی کیسی ہیں اب؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ بہتر ہیں۔ دراصل ان کا بلڈ پریشر اچانک اتنا بڑھ جاتا ہے کہ برین ہیمیرج کا خطرہ ہوتا ہے۔ دوا لیتی رہیں تو ٹھیک رہتی ہیں۔ چھوڑ دیں تو ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ ویسے تم کب آئے یہاں؟“
”تقریباً پانچ چھ دن ہو گئے۔“

”رہائش کی فکر نہ کرنا۔ میں ابھی انتظام کر دیتا ہوں۔“

”نہیں! وہ تو مسئلہ حل ہو گیا۔ مانی میرا مطلب ہے سلطان صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی آتے ہی انہوں نے کوئی بات بھی سننے سے انکار کر دیا۔ آپ جانتے تو ہیں نا انہیں.....“

”ہاں۔ ہاں۔“

وہ ہنس دیے۔

”ایک ہی بات ہے مانی کی طرف رہو یا ادھر۔ اس وقت کہاں تھا وہ ساتھ ہی آ جاتا۔“

”ادھر ڈیرے پر ہی تھے وہ کہہ رہے تھے دوست آنے والے ہیں۔“

”تمہاری رہائش ڈیرے پر ہی ہے۔“ وہ چونکے۔

اس روز کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

”نہیں! قریب ہی ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ سلطان صاحب نے بتایا تھا ان کی اپنی رہائش گاہ ہے۔“

کھانا ناشتا وغیرہ سب ڈیرے سے آ جاتا ہے حالانکہ میں نے بہت منع کیا لیکن.....“
”اوہ اچھا! ممکن ہے چاچا نے کہیں قریب ہی کوئی اور رہائش گاہ بتائی ہو۔“ انہیں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔
انہیں اطمینان سا: داؤر نہ وہ سوچ رہے تھے کہ ڈیرے پر مانی کے جس طرح کے دوست آتے ہیں اور جیسی محفلیں جتنی ہیں۔ مسرور شاید وہاں سیٹ نہ ہو پاتا۔

”آپ کب تک ہیں ادھر؟“

”میں شاید صبح چلا جاؤں۔ بشرطیکہ مان جی کی بیعت ٹھیک رہی۔ تم سناؤ! کیسا لگا ہمارا گاؤں اسکول پسند آیا اور کتنے لوگ ہیں یہاں؟“

”ہمارے زیادہ تر دیہاتوں میں اسکول ایک جیسے ہی ہیں سر! کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔“
وہ انہیں تفصیل بتانے لگا اور وہ بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سننے لگے۔



”جو! آپ نے ماما سے بات کی تھی۔“

عاشی نے مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مریم نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت لان میں اوائل دہر کی ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھی تھی اور اسے یوں لان میں اکیلا خاموش بیٹھ کر دھوپ سینکنا اچھا لگ رہا تھا۔
”تم بیٹھو نا۔“

مریم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا ”دھوپ اچھی لگ رہی ہے۔“

”نہیں! مجھے ابھی کہیں جانا ہے آپ بتائیں! ماما نے کیا کہا! انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟“
”عاشی۔“

مریم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ماما بہت ناراض ہوئی تھیں۔ وہ ہرگز اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ انکل ہادی کو زبان دے گئیں اور انہوں نے کہا تھا کہ تمہاری شادی صرف معید سے ہوگی اور اگر تمہیں مزید پڑھنا نہیں ہے تو وہ بلا درغیر خیرہ لا کر دیں گی۔“

عاشی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ ماما ہرگز اس بات کے لیے رضامند نہیں ہوں گی۔ انکل شچی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہاری ماما اس شادی پر رضامند نہیں ہوں گی اور وہ رضامند بھی کیسے ہو سکتی ہیں۔“ وہ عجیب طرح سے ہنسی۔
”کی زمانے میں وہ خود انکل شچی میں انٹرنسڈ تھیں یہ تو انکل شچی.....“

”عاشی۔“ مریم نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کیا آپ نے ان سے نہیں کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہ کریں۔“
”ہاں کہا تھا۔“

مریم نے کمزور آواز میں اعتراف کیا ”لیکن تمہاری بہتری کے لیے تمہارے بھلے کے لیے گڑیا۔“
”میری بہتری کے لیے یا.....“ عاشری نے بات ادھوری چھوڑ دی اور تیزی سے مر گئی۔
مریم بے بسی سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

”اور پتا نہیں عاشری کیا کرنے جا رہی ہے۔“

اس نے وہیں گھاس پر بیٹھتے ہوئے اپنا سر گھنٹوں پر رکھ لیا۔

کاش وہ اسے روک سکتی، اسے سمجھا سکتی۔ کس قدر بدگمان اور ضدی ہو رہی ہے وہ اور شرنیل مرزا اس کی دیت سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور اسے ماما کے اور میرے خلاف جانے کیا کیا پٹیاں پڑھا تا رہتا ہے۔

اور پتا نہیں عادل بھائی کیا کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے روک لیں، سمجھائیں گے اور پتا نہیں ان کی عاشری سے بات ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ حالانکہ ماما کے آنے کے
”دو تین بار آچکے تھے اور عاشری سے بھی دیر تلک باتیں کرتے رہے تھے۔

اور عاشری نے ان کی بات بھی ماننے سے انکار کر دیا ہے، تب ہی تو انہوں نے اسے کچھ نہیں بتایا حالانکہ
ان نے کتنا یقین دلایا تھا کہ وہ بے فکر ہو جائے۔ مگر وہ کیا کرے۔

کس طرح عاشری کو شرنیل مرزا سے بچائے۔

اس نے تو عاشری کو اس سے بھی بدگمان کر دیا تھا اور ماما سے تو وہ بدگمان تھی ہی۔ اس پر جانے شرنیل
کیا الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا کہ وہ اور بھی بدگمان ہو گئی تھی۔ اتنی کہ اس نے ڈاکٹر عبد المعید کے
نے شرنیل مرزا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ماما کو اس کی پڑا ہی نہیں تھی کہ وہ کیا کرتی پھر رہی
مریم نے جب انہیں اس کی خواہش کے متعلق بتایا تھا تو انہوں نے بے حد ناراضی سے مریم کی طرف
دیکھا تھا جیسے یہ اس کی غلطی ہو۔

”جس ہے وہ۔“ اسے کہہ دو کہ اس کی شادی ڈاکٹر عبد المعید سے ہوگی۔ میں ڈاکٹر ہادی کو زبان دے
دیں اور یہی اسے میں خود دیکھ لوں گی۔“

”وہ مومن ہو گئی تھی جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ یوں جیسے کسی بچے کو اس کی کسی ہند پر معمولی سا
بھڑکائی یا ملے ہوئے ہو جائے، گویا فرض ادا ہو گیا ہے اور عاشری خطرناک حد تک سیریس ہو رہی تھی اپنے
نہایت پرستار اور پر یقین۔

”بے حد بے بسی سے اس نے سوچا۔

اور عاشری کس قدر محروم تھی اور کتنی محبت کرتی تھی ماما سے کتنی زیادہ اور وہ اس سے کہا کرتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ

”تم ہر اس فضول بات پر یقین کر لیا کرو جو انکل شچی تمہیں بتاتے ہیں۔ وہ بدبان بوجھ کر
تمہیں SPOIL کر رہے ہیں۔“

”وہ مجھے SPOIL نہیں کر رہے ہیں اور انہیں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں مجھ سے
اور میں خود جانتی ہوں سب۔“

”عاشری۔ عاشری پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں الٹی سیدھی باتیں بتا کر خواہ ماما سے متفر کرنے کی
کوشش کر رہا ہے۔ عاشری اگر ماما نے شادی کر لی ہے تو یہ اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ تم.....“

”ماما کی شادی فی الحال زیر بحث نہیں ہے بھو۔“ عاشری نے اس کی بات کاٹ دی۔
”آپ ماما کو بتا دیجیے گا کہ اگر وہ اس شادی پر راضی نہیں ہیں تو ہم عدالت سے اجازت لے کر خود
شادی کر لیں گے۔“

وہ اس کے سامنے کھڑی بہت با اعتماد لگ رہی تھی۔

مریم نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے۔

”مت کرو ایسا عاشری۔ کیوں کر رہی ہو تم ایسا۔ انکل شچی ہرگز تمہارے قابل نہیں ہیں گڑیا۔ تم معید بھائی
کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔ میرا یقین کرو عاشری معید بھائی بہت اچھے ہیں۔“

مریم نے کھڑے ہوتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں کس کے ساتھ خوش رہوں گی؟ یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔“

عاشری نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”انکل شچی کیسے انسان ہیں؟ تو آپ کو بھی اچھی طرح پتا ہوگا کہ کسی وقت آپ بھی ان میں انٹرنل
تھیں۔“

”نہیں عاشری یہ جھوٹ ہے۔“ مریم نے تڑپ کر اسے دیکھا ”جھوٹ بولتا ہے وہ شخص۔ میں نے کبھی
اسے پسند نہیں کیا۔ I HATE HIM۔“ اس کی آواز لرزنے لگی۔

”I HATE HIM ASHI BELIVE ME“ (عاشری میرا یقین کرو میں اس سے نفرت
کرتی ہوں)

”تو کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ ان کے دفتر گئی تھیں۔ کہہ دیں کہ آپ ان کے دفتر میں کبھی
نہیں گئیں۔“

”ہاں میں گئی تھی عاشری لیکن۔“

مریم کی نظریں جھک گئیں۔

”لیکن جو تم سمجھ رہی ہو وہ غلط ہے۔“

ماما سے خفا نہ ہوا کرے اور اب خود ان سے خفا تھی اور مریم جانتی تھی کہ وہ یہ سب ماما کو تنگ کرنے کے لیے کر رہی ہے۔

یہ محض اس کی خفگی اور ناراضی کا اظہار ہے۔
لیکن یہ صحیح نہیں تھا۔

اور وہ ماما کو اپنا موقف سمجھا نہیں سکی تھی۔ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ بے حد مصروف تھیں۔ جبر سے واپس آئی تھیں، مریم کو ان کے پاس سکون سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کتنی ہی بار اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ماما سے عاشری کے متعلق بات کرے لیکن ماما کو ہمیشہ کہیں جانے کی جلدی ہوتی تھی۔

”او کے جانو پھر بات کریں گے۔“

”DONT WORRY“ تم یونی فضول باتیں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوا کرو۔“

لیکن یہ فضول بات ہرگز نہ تھی اور ماما سے بالکل اہمیت نہیں دے رہی تھیں۔

اور اگر ماما کی مرضی کے خلاف عاشری نے خود ہی شریل مرزا سے شادی کر لی تو سب لوگ کچھ نہیں گئے۔ وہ آئی نرس اور بیگم آفندی کس قدر مذاق اڑائیں گی اور وہ تو اب بھی مذاق اڑاتی ہیں ماما کی عدم موجودگی میں۔ ان کا اور غضنفر ملک کا ماما اپنے ارد گرد ہونے والی سرگوشیوں سے بے نیاز کتنی خوش اور مطمئن تھیں۔ اتنا خوش تو اس نے ماما کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور اپنی خوشیوں میں انہوں نے سب کو بھلا رکھا تھا۔ عاشری کو اسے ”میرا اور مورسب کو۔ مورسب قدر ان کو مس کرتا تھا اور کتنی ضد کر رہا تھا کہ وہ اسے کی دیکھ کر ہنسنے پر مجبور ہو جائے۔ آئیں یا انہیں گھر بلائیں لیکن ایک ماہ ہو گیا تھا انہیں واپس آئے مگر وہ ابھی تک مریم نہیں جاسکتی تھیں۔ بس فون پر ہی اسے بہلا دیتیں اور اب تو اس نے ضد کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن انہوں نے پروگرام بنایا بھی تھا جانے کا لیکن اسی روز غضنفر ملک اپنی والدہ والدہ اور بہنوں کو ساتھ لے کر آگئے۔ انکل ہادی۔ ز۔ اور پورا پورشن خالی کر دیا تھا اور وہ لوگ اپنے گھر میں منتقل ہو گئے تھے اور اب اوپر والے پورشن میں غضنفر ملک کے والدین آگئے تھے اور ماما نے غالباً اسی لیے وہ پورشن خالی کر دیا تھا۔ اسے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی تھی کہ اوپر والے پورشن میں اب غضنفر ملک کے والدین رہیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ماما اور غضنفر ملک خود اوپر والے حصے میں منتقل ہوتا جا رہے ہیں۔ ماما بھی یہی خیال تھا اور غضنفر ملک کے والدین کو دیکھ کر اس نے بے حد ناگواری کا اظہار کیا تھا اور انہیں بہنوں سے تو دو تین بار جھڑپ بھی ہو چکی تھی۔ وہ انہیں بھی تو ایسی ہی بالکل جاہل، شوخ، زور والی، کپڑے پہن کر گہرا گہرا میک اپ کیے صبح ہوتے ہی نیچے لان میں آئی تھیں اور اپنی آواز میں ہنسنے لگتی تھیں۔

”لو اپنے ملک صاحب کی بہنیں بھی کیا چیز ہیں۔“

دونوں غیر شادی شدہ تھیں اور غضنفر ملک سے بڑی تھیں سو غضنفر ملک سے تو تزاؤ کر کے بات کرتی تھیں۔ انہیں ماما کیسے انہیں برداشت کرتی تھیں اسے ماما پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ تو ذرا سی بات پر ڈپریشن ہو جاتی تھیں اور عثمان احمد خان بھی ان کے بیڈروم میں اس طرح بے دھڑک نہیں جاتے تھے جس طرح غضنفر ملک کی بہنیں اور والدہ وقت بے وقت ان کے بیڈروم میں چلی جاتی تھیں۔

”در اصل زینی کو غضنفر ملک سے عشق ہو گیا ہے۔“ یہ میڈم نرگس کا خیال تھا۔

جس کا اظہار انہوں نے مریم کی موجودگی میں بیگم آفندی سے کیا تھا۔

”اور زینی اس لیے اس کے خاندان والوں کو برداشت کر رہی ہے ورنہ ان جیسے بڑا جڈلوگوں کو زینی کبھی بھی برداشت نہ کرتی۔“

یہ کتنی عجیب بات تھی کہ غضنفر ملک خود کس قدر ویل ڈریسڈ اور میزڈ آدمی تھا لیکن وہ اپنے خاندان والوں کو بدل سکا تھا۔

نانا کا لب و لہجہ نہ ان کا طرز زندگی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ بالکل میچ نہیں کرتا تھا۔

عاشری کو تو ان سے انتہائی چڑ ہو گئی تھی اور اس نے ڈاکٹر معید سے خوب لڑائی کی تھی۔

”کیا ضرورت تھی مگر خالی کرنے کی۔“

”مزمنان نے کہا تھا تو ظاہر ہے خالی کرنا ہی تھا۔“ (وہ ابھی تک انہیں مسز عثمان ہی کہتے تھے۔)

”تو کیا وہ زبردستی کر سکتی تھیں اگر آپ خالی نہ کرتے تو؟“

”ایک دن تو اپنے گھر جانا ہی تھا گریزا۔“

”اور یہ جو رنگ برنگے لوگ آئے ہیں یہاں۔“ وہ رونے والی ہو رہی تھی ”مجھے ان کا یہاں رہنا قطعی پسند نہیں ہے۔“

وہ بے حد ناراض اور خفا تھی اور ڈاکٹر عبد المعید اسے بہلاتے رہے تھے۔

”کوشش کریں گے گریزا کہ آپ کو جلد ان رنگ برنگے لوگوں سے نجات مل جائے۔“

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی اور آنکھیں اودھنے لگی تھیں۔ ”PROMISE“ عاشری نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”PROMISE“ انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اور ان کی بات کا مفہوم جان کر مریم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی لیکن عاشری۔

عاشری نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا اور ڈاکٹر عبد المعید۔ کس قدر دکھ ہو گا انہیں یہ جان کر کہ عاشری اور کاشمیر وہ عاشری کو روک سکتی۔ اسے بچا سکتی لیکن وہ تو کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھی اور عادل بھائی۔

انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ عاشی کو سمجھالیں گے لیکن شاید وہ بھی ناکام ہو گئے تھے۔ شاید عاشی ان کی بات بھی نہیں سنی تھی ورنہ ماما کے آنے کے بعد وہ دوبارہ آئے تھے اور دونوں بار بھی ماما گھر نہیں آئے اور وہ دیر تک عاشی سے باتیں کرتے رہے اور پتا نہیں انہوں نے عاشی سے کیا کہا تھا اور عاشی نے کیا کیا جواب دیا تھا لیکن انہوں نے جاتے جاتے اسے تسلی ضرور دی تھی۔

”آپ بے فکر ہو جائیں مریم سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

لیکن سب ٹھیک نہیں ہوا تھا اور عاشی شعی انکل سے شادی کرنے جا رہی تھی اور وہ بھی ماما کی مرضی بغیر اور ماما تو یقیناً ہنگامہ کریں گی اور۔۔۔ پھر بیمار پڑ جائیں گی۔

مریم کو اس تصور سے ہی خوف آنے لگا۔

ماما کی بیماری اسے ہمیشہ ہی ڈر پھیل کر دیا کرتی تھی۔

اف وہ وہ کیا کرے کیسے عاشی کو روکے۔

پروفیسر عادل کی طرف سے وہ مایوس ہو گئی تھی۔

یقیناً وہ عاشی کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

”بابا۔ شاید بابا۔“

اسے ایک دم چوہدری عمار کا خیال آ گیا۔

”کیا خبر کوئی ایسا راستہ بتا دیں کہ وہ عاشی کو اس راہ پر چلنے سے روک سکے۔ بہر حال ان کا تجربہ بھائی سے کہیں زیادہ ہے اور شاید انہیں کوئی بہتر راہ بھائی دے سکے اور کتنے بہت زیادہ دن ہو گئے

اسے بابا اور ماں جی سے ملے۔“

”یعنی نے کتنی ہی بار لکھا تھا۔ اصرار کر کے اسے بلایا تھا لیکن وہ نہیں جاسکتی تھی۔ حالانکہ کئی بار اس کا جی چاہا تھا وہ یعنی کے گھر جانے اور بابا کو اپنے دکھ میں شریک کرے۔“

”انہیں بتائے کہ وہ کتنی نامعتبر ہو گئی ہے۔ عثمان احمد اس کے پاپائیں ہیں۔“

اور وہ شخص جو اس کا باپ ہے وہ اس کے متعلق نہیں جانتی اور ان کے متعلق اسے کچھ جا خواہش بھی نہیں ہے۔ ماما کی واپسی پر ایک بار اس نے پوچھا تھا کہ اس کا باپ کون ہے اور کہاں رہتا ماما نے اسے جھڑک دیا تھا۔ وہ اس وقت غضبناک کے ساتھ میڈم نرس کے ہاں ایک پارٹی میں تھیں۔

”مومنتم فضول سوال مت کیا کرو۔ وہ جو کوئی۔۔۔ بھی تھا مجھے اس کے متعلق معلوم نہیں کہ

کہاں ہے زندہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ کون تھا اور اس کا کیا نام تھا میں بائیس سال پہلے وہ تھے اور تمہاری زندگی سے نکل گیا تھا۔ اسے ایک خواب سمجھو۔“

یوں خود اس کے دل میں اس کے متعلق جاننے کی کوئی ایسی شدید خواہش نہ تھی اور اس نے دوبارہ ماما سے سوال نہیں کیا تھا۔

وہ بابا کو عاشی کے متعلق بتائے۔

اس کی ضد۔

اور اس کی ناراضی۔

”بابا یقیناً کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔ وہ کتنے نرم لفظوں میں بات کرتے ہیں اور کتنی محبت اور شفقت ہے۔ بابا سے بات کر کے یقیناً اس کا دکھ کم ہو جائے گا۔“

اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ سامنے مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

بابا کے ساتھ ہی اسے شہر یار کا خیال آ گیا۔ اس نے شہر یار کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً اب تک وہ یوں ہو چکا ہوگا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ میں اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکی اور شاید اس نے خود ہی راہ بدل لینے کا سوچ لیا ہو۔ وہ اس مایوس کن صورت حال سے تھک گیا ہو۔ تب ہی تو اس نے پھر خط نہیں لکھا تھا۔

”اور کاش وہ کبھی جان سکتا کہ مریم نے بھی اس سے کتنی شدید محبت کی ہے اور یہ کہ اگر شہر یار کے ہاتھ زندگی کا سفر طے نہیں ہو سکا تو پھر وہ تنہا ہی یہ سفر طے کر لے گی۔ یعنی نے بھی تو شہر یار کے متعلق اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی۔“

وہ کسی کو خط نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے لگتا تھا جیسے سب اس سے خفا ہیں۔ شاید یعنی بھی اس سے خفا تھی۔

”چلو آج یعنی کو ممالوٹ لے گی۔“

وہ دل ہی دل میں اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

”وہ آج سارا دن بابا سے باتیں کرے گی اور بابا یقیناً اپنی نرم اور مہربان باتوں سے اس کے دل ہاں میں چھپے سارے کانٹے چن لیں گے۔ یہ صحیح کہ یعنی کے چاچو کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے تھے لیکن یعنی نے مجھے بتایا تھا کہ بابا اب بھی مجھے یاد کرتے ہیں اور یعنی سے میرے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں اور یہ سننے کے بعد کہ میں عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہوں وہ کیا سوچیں گے میرے متعلق۔“

”کیا کہیں گے کہ ماما ساری زندگی شادیاں ہی کرتی رہی ہیں پہلے میرے باپ سے“

”پھر عثمان احمد سے۔“

”اور اب پھر غضنفر ملک سے۔“

”کیا مجھے ان کے ساتھ اپنا دکھ شیئر کرنا چاہیے۔“

”اور چاہیں کیا صحیح ہے کیا غلط۔“

اس نے بے بسی سے سوچا۔

بڑوں کا اور جا کر قلم دیکھ آتا اور کبھی نہیں لوٹا۔ رات کیسے اماں کے گھٹنے پکڑے کہہ رہا تھا کہ صبح اسلم باپ کو لے جائے گا۔ جھوٹا کہیں کا۔“

اس نے بات مکمل کر کے سرائٹھا کر اوپر بیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

”اے عارفہ تو بھی نیچے ہی آجا۔ کوئی قلم لگا کر دیکھتے ہیں ایسا بھڑکی۔“

لیکن عارفہ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور مریم پر ایک غصیلی نظر ڈالتی ہوئی اوپر چلی گئی۔
”خیر نہ دیکھو مجھے کیا۔“

اس نے کندھے اچکائے اور مریم کی طرف دیکھا۔

”تم مجھے کوئی اچھی سی قلم لگا دو ایسا بھڑکی۔“

مریم نے منو کو آواز دی۔

”منو اھر آؤ شریف سے کہو عاصمہ بی بی کو ان کی پسند کی قلم لگا دے وی سی آر پر۔“

بہرہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ عاصمہ نے اسے آواز دی۔

”اے مریم سنو تو۔ یہ مومن اور بھائی مری گئے ہیں کیا؟ رات مومن کہہ تو رہا تھا کہ اسے مری جاتا ہے۔“

”میں نے بتایا نہ کہ ماما نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔“

مریم نے بدستور نرمی سے جواب دیا۔

ٹوٹا شروع میں تو جب غضنفر ملک کو مومن کہہ کر بلاتی تھیں تو مریم ذرا سی دیر کو پزل ہو جاتی تھی کہ نکان ہے لیکن اب اسے پتا چل گیا تھا کہ مومن غضنفر ملک کا اصل نام ہے۔ غضنفر اس کا قلمی نام ہے۔

”ویسے یہ مومن بھی پکا جھوٹا ہے۔“ وہ زور سے ہنسی۔

”بی بی قریب کتا تھا اپنی بیوی کی لیکن ہوا تک لگے نہیں دی کہ بیوی جہیز میں اتنے بڑے بڑے لٹریچر لائی ہے۔“ وہ ایک بار پھر مریم کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

”خیر اماں کہہ رہی تھیں خود ہی دل بھر جائے گا ایک دن تو پھر مومن کی دوسری شادی کریں گی۔ دھوم مسموم سے کہہ رہی ہوں کہ اماں کو ایک دن چڑیا گھر دکھا لاؤ۔ کہہ دیتا ہے اسلم لے جائے گا کی

”اور اب۔“

”اماں۔ اماں۔“

وہ نیچے سے ہی آوازیں دینے لگی۔
”اب تیار نہ ہوتا۔ ذرا نیور نہیں ہے۔ وہ بھائی کی چیتا کاڑی لے گئی ہے۔“
”لو یہ مومن تو ہمیشہ ہے۔“
”بچپن میں بھی اسی طرح دھڑلے سے جھوٹ بولتا تھا۔ مجھ سے پیسے ادھا مانگ کر لے جاتا تھا۔“

”پھر بھی آج عینی کی طرف ضرور جاؤں گی۔ شاید یہ گھٹن جو میرا گلا بھیجنے رہی ہے کم ہو جائے۔“
عثمان احمد کے متعلق بابا کو نہ بھی بتاؤں تب بھی عاشری کے متعلق تو ان سے مشورہ لیا جاسکتا ہے نا اور وہ ان مہربان اور شفیق ہیں اور میں یونہی اتنے سارے دن ان سے دور رہی ہوں۔“

وہ دل ہی دل میں ان کی طرف جانے کا حتی فیصلہ کر کے اندر کی طرف بڑھی۔

ٹی وی لاؤنج میں رک کر اس نے بیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ غضنفر ملک کی دونوں بینیں بھڑکیے ہوئے کے پکڑے پہنے اور گہرا میک اپ کیے گولڈن پرس گلے میں ڈالے بیڑھیوں پر کھڑی تھیں۔

”اب آ بھی چکو اماں۔“

ان میں سے ایک جس کا نام عاصمہ تھا نے مڑ کر غالباً اپنی والدہ کو پکارا تھا اور پھر جواب کا انتظار کے بغیر دھپ چھپ کرتی نیچے اتر آئی اور ٹی وی لاؤنج کے عین وسط میں کھڑی مریم کے کندھے پر زور دے ہاتھ مارا۔

”اے مریم بھائی کدھر ہے۔ اندر ہے کمرے میں؟“

”نہیں۔“

مریم نے آہستگی سے اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹایا اور نرمی سے بولی۔

”وہ لوگ صبح جلدی ہی کہیں چلے گئے تھے۔“

”کہاں؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”خیر گاڑی تو ہے نا گھر پر؟“

”نہیں اسلم چاچا ماما کے ساتھ گئے ہیں اور سوزو کی ناشی کے پاس ہے۔“

”لو ہمارے بھائی کا گھر ہے اور ہم ہی غیروں کی طرح رہ رہے ہیں یہاں۔“

وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”اماں کتنے دنوں سے کہہ رہی تھیں چڑیا گھر جانے کو۔ کتنا شوق تھا انہیں چڑیا گھر دیکھنے کا۔ اب مومن سے کہہ رہی ہوں کہ اماں کو ایک دن چڑیا گھر دکھا لاؤ۔ کہہ دیتا ہے اسلم لے جائے گا کی اور اب۔“

”اماں۔ اماں۔“

وہ نیچے سے ہی آوازیں دینے لگی۔

”اب تیار نہ ہوتا۔ ذرا نیور نہیں ہے۔ وہ بھائی کی چیتا کاڑی لے گئی ہے۔“
”لو یہ مومن تو ہمیشہ ہے۔“
”بچپن میں بھی اسی طرح دھڑلے سے جھوٹ بولتا تھا۔ مجھ سے پیسے ادھا مانگ کر لے جاتا تھا۔“

لیکن تمہاری اماں نے پھنسا لیا اسے ورنہ آج مادھوری ہماری بھابی ہوتی۔ ارے اتنی ادا کارا نہیں کرتی ہیں اور یہ مومن یہ تو بچپن سے ہی نظر باز ہے۔“
 ”شکل اچھی تھی نا۔ لڑکیوں کو پھنسا لیتا تھا۔ ابا نے تو پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ یہ بڑا ہو کر فرس نہ کچھ کرے گا۔“
 وہ مسلسل بول رہی تھی، مریم اسے نظر انداز کر کے تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی اور جی کھر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔



”سن رہی ہونا عاشی۔ میں آئندہ تمہیں اس ریش شخص کے ساتھ نہ دیکھوں۔“ پروفیسر عادل کی بلند تھی اور لہجہ مضبوط تھا۔

”یہ عادل بھائی تو کبھی اس طرح اونچی آواز میں نہیں بولتے۔“ مریم اندرونی گیٹ کو دھکیلتی، ٹھٹھکی سی گئی۔ سامنے ہی لوگ روم میں پروفیسر عادل کھڑے تھے۔ عاشی کا بازو ان کے ہاتھ میں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور رنگ زرد ہو رہا تھا پھر وہ ایک دم عاشی کا بازو پکڑے پکڑے شرجیل کی طرف مڑے جس کے ہونٹوں پر بڑی تمسخرانہ سی مسکراہٹ تھی اور وہ ایک ہاتھ صوفے کی بیک پر قدرے جھک کر کھڑا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 مریم اک دم سہم کر وہیں کھڑی ہو گئی۔

”آئیے آئیے مس احمد اس سین میں صرف آپ کی کمی تھی۔“ اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔
 ”شٹ اپ۔“

پروفیسر عادل کا چہرہ دمک اٹھا۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے شرجیل آنکھوں میں جھانکا اور پھر آہستہ لیکن سرد اور سخت لہجے میں بولے۔
 ”مسٹر شرجیل مرزا آئندہ میں آپ کو یہاں آتے ہوئے اور عاشی سے ملتے نہ دیکھوں۔“

”BUT WHO ARE YOU MR. ?“

شرجیل مرزا سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ صوفے کی بیک سے اٹھا لیا۔ مریم کو اس کی آنکھیں کسی لومڑی سے مشابہ لگ رہی تھیں۔
 ”مجھے اپنا تعارف کروانے کی ضرورت نہیں مسٹر شرجیل، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کون ہوں۔“

”لیکن شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔“
 شرجیل مرزا نے اب ہونٹ بھیج لیے تھے اور وہ بہت خوں خوار نظروں سے پروفیسر عادل

رہا تھا۔
 ”میں اور عاشی بہت جلد شادی کر رہے ہیں۔“ اس نے گویا دھا کا کیا۔
 پروفیسر عادل کی آنکھیں خون رنگ ہو گئیں۔

وہ عاشی کا بازو چھوڑ کر یک دم ایک قدم آگے بڑھے۔

مریم نے بے آواز دعا کی خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔

”شرجیل مرزا عزت و غیرت کی خاطر قتل کرنا ہمارے لیے معمولی بات ہے۔ آئندہ آپ ”زنوب ولا“ دے دس میل دور بھی مجھے دکھائی دے گئے تو.....“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھا۔

ان کا لہجہ بدستور سرد اور سخت تھا۔

مریم نے اپنے وجود کے اندر قہری قہری سی محسوس کی۔

”ہاؤ گٹ لاسٹ۔“ وہ دھاڑے۔

”میں زینی سے تمہاری شکایت کروں گا اور میں تو کیا۔ تم زنوب ولا میں دکھائی نہیں دو گے آج کے بعد اور.....“

”شٹ اپ۔“

پروفیسر عادل نے اس کی بات کاٹی لیکن شرجیل مرزا نے اپنی بات جاری رکھی۔

”پوچھ لو اس سے جس کے بھائی بنے پھرتے ہو۔ یہ خود مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے عاشی بتاؤ اس اپنے بڑے بھائی اور محترم کو کہ تم.....“

”شرجیل مرزا!!“

اب کے پروفیسر عادل کی آواز اس قدر بلند تھی کہ مغل اور شریف بچن سے دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔

”مزید ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہاری زبان کاٹ لوں گا۔ ہم اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔“ احمد خان اور عادل احمد خان کی عزت الگ نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنا۔“

”تم۔“ شرجیل مرزا نے کچھ کہنا چاہا تو وہ پھر دھاڑے۔

”آئیے گٹ لاسٹ۔“

”i will see you“ (میں تمہیں دیکھ لوں گا۔)

شرجیل مرزا نے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور جاتے جاتے مریم پر ایک قہر آلود نظر ڈالا۔ ہوا بھی تک وہیں گیٹ کے پاس سہی کھڑی تھی۔

”کیا کیا ہوا تھا جی، اپنے شی صاحب نے کیا کیا تھا۔“ شریف نے آگے بڑھ کر پوچھا تو مریم نے جو کچھ کر

پہلے پروفیسر عادل اور پھر عاشی کی طرف دیکھا اور وہیں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں تم جاؤ اپنا کام کرو۔“

پروفیسر عادل کے لہجے میں ابھی تک غصے کی جھلک تھی اور پھر وہ عاشی کی طرف مڑے۔

”تم آؤ میرے ساتھ۔“

”عادل بھائی۔“

وہ ایک دم دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

”عادل بھائی میں۔“ وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

”اوکے اوکے ریلیکس گڑیا۔“

ان کے لہجے میں یک دم نرمی آ گئی اور اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے اسے

الگ کیا اور کسی قدر ناراضی سے بولے۔

”اس روز بھی میں نے تمہیں سمجھایا تھا گڑیا لیکن۔۔۔۔۔۔“

عاشی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

”کم ان گڑیا۔“

اس کے گرد بازو جمائل کیے وہ اسے لے کر اس کے کمرے کی طرف بڑھے اور جاتے جاتے مڑ کر انہوں نے ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی مریم کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ ان کے ہونٹوں پر ایک مہربان سی مسکراہٹ آ کر محدود ہو گئی اور ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی مریم کے وجود میں جنبش ہی ہوئی اور اس کا خوف سے کانپنا دل چیسے ٹھہر سا گیا اور اس نے یک دم اپنے وجود میں ایک گہری طمانیت سی اترتے محسوس کی اور ایک یقین سا خود بخود اس کے دل میں کہیں ہو گیا جیسے عادل بھائی اب سب کچھ سنبھال لیں گے۔

اور جیسے وہ عاشی کو روک لیں گے۔

اور وہ شرجیل مرزا۔ کس قدر کیڑہ تھا اس کی آنکھوں میں۔

اس نے خوف سے جھرجھری سی لی۔

اور پروفیسر عادل جو انتہائی مہربان اور شفقت سے تھے اور جو ہمیشہ نرم اور دھمے لہجے میں بات کرتے تھے آج کس قدر غصے میں لگ رہے تھے۔

اور عاشی۔

کتنی ڈری ہوئی اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔

وہ یقیناً عادل بھائی کی بات مان کر شرجیل مرزا سے شادی کرنے کا خیال چھوڑ دے گی۔

اس نے خود کو یقین دلایا اور اس کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے تک اس قدر مایوس اور دل گرفتہ تھی حالانکہ بابا اسے کتنی تسلی دے رہے تھے سمجھا رہے تھے کہ وہ خود عاشی سے بات کریں گے۔ وہ یقیناً اسے سمجھالیں گے لیکن اس وقت اس کا دل یقین نہیں کر رہا تھا۔

”نہیں بابا وہ بہت ضدی ہے۔ مجھے پتا ہے وہ آپ کی بات ہرگز نہیں مانے گی اور شرجیل مرزا انتہائی فضول آدمی ہے اور عمر میں ڈیڑی کے تقریباً برابر۔“

وہ ایک دم رو پڑی تھی اور بابا اسے بہلاتے رہے تھے۔

اور وہ لوگ اسے دیکھ کر کس قدر خوش ہوئے تھے۔

یعنی تو اس سے لپٹ پڑی تھی۔

”یہ تم ہونا مومنو مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم ہم سب سے خفا ہو گئی ہو۔ بہت ناراض ہو۔۔۔۔۔۔“

”نہیں تو بھلا ناراضی کی کوئی وجہ بھی ہو یعنی میں تو بس یونہی اپنے ہی حالات میں الجھی ہوئی تھی۔ تمہیں کیا تاؤں ڈیڑی کے بعد زندگی کس قدر مشکل لگنے لگی ہے۔“

اور بابا نے بھی گلہ کیا تھا۔

”ابھی بیٹی ہو کہ اتنے دنوں بعد اپنے بابا سے ملنے آ رہی ہو۔“

”اور آپ کون سا اپنی بیٹی سے ملنے آتے ہیں۔“ اس نے بھی شکوہ کیا تو وہ ہنس دیے۔

”ہاں یہ تو ہے۔ ہمارا بیٹا نہیں آیا تھا، ہمیں جانا چاہیے تھا لیکن ہم نے جانا شاید وہ ہم سے خفا ہے۔“

”کیوں بھلا میں آپ سے کیوں خفا ہوتی۔“

”ہاں بھلا تم نے کیوں خفا ہونا تھا۔“

انہوں نے نگاہیں چرائیں اور پھر وہ صاف کو آوازیں دینے لگے۔

”صاف صاف بیگم کہاں ہو بھی دیکھو تو کون آیا ہے۔“

اور صاف بیگم نے تو اسے لپٹا کر بہت پیار کیا تھا۔

”سے میری مریم آئی ہے۔ ماما کسی ہیں تمہاری عاشی مورا اور غینا سب ٹھیک ہیں نا؟“

”کون کونہ شکوہ وہی محبت بھرا لہجہ۔ وہی محبت و شفقت لٹائی نظریں۔“

”جہاں کی خوشبو میں بس ان کی باتیں۔“

اب اس گھر میں اس نے اس قدر طمانیت محسوس کی تھی اور پھر بابا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے

بابا مجھے آپ کی بے حد ضرورت تھی۔“

”ارے ارے کیا ہوا ہماری بیٹی کو۔ کیا پھر ماما سے ناراضگی ہو گئی۔“
”نہیں۔“ اس نے ہنسی آواز میں کہا۔

”وہ..... وہ عاشی جو ہے نا وہ ناراض ہے ماما سے۔ اسے غصہ ہے ماما پر اور وہ اس کا بدلہ خود سے لے رہی ہے۔ مجھے پتا ہے وہ جان بوجھ کر ماما کو تنگ کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔“
”کیا کر رہی ہے وہ؟ کچھ پتا تو چلے۔“

اور تب اس نے عاشی کے متعلق ان کو ایک ایک بات بتادی۔

”اور معید بھائی اتنے اچھے ہیں پھر بھلا عاشی شرجیل مرزا کو کیسے پسند کر سکتی ہے بابا۔ مجھے پتا ہے ایسا نہیں ہے۔ وہ صرف ضد میں ایسا کر رہی ہے۔“ اور تب بابا نے اسے بہت تسلی دی تھی۔
”تم پریشان نہ ہو۔ میں اپنی عاشی بیٹی سے خود بات کروں گا وہ تو اتنی سمجھ دار اور پیاری بچی ہے۔ بغیر سمجھ جائے گی۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے بابا۔ ماما کی اور عاشی کی لڑائی ہو گئی تو..... ماما ڈپریشن ہو جاتی ہیں۔ بہت زیادہ۔ آپ کو تو پتا ہے نا دورہ پڑتا ہے انہیں۔ کوئی بھی خلاف مرضی بات وہ برداشت نہیں کر سکتیں وہ کبھی بھی عاشی کی شادی انکل شچی سے نہیں کریں گی۔ کیوں کہ بہت پہلے انہوں نے انکل ہادی کے ساتھ عاشی اور معید بھائی کے رشتے کی بات کچی کر دی تھی۔“
”ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ میں عاشی سے بات کروں گا۔ کل ہم انشاء اللہ تمہارے گھر آئیں گے۔ عاشی بیٹی سے کہنا وہ گھر پر ہی رہے۔“
لیکن بابا کی اتنی تسلیوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھی۔ اسے عاشی کی ضد سے خوف آ رہا تھا اور وہ بے اداس اور دل گرفتہ تھی۔

”مومنم بہت کمزور ہو گئی ہونا پنا خیال رکھا کرو نا۔“

یعنی کے ساتھ جب وہ اس کے کمرے میں آئی تو یعنی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔
”پتا نہیں کیا سوچتی رہتی ہو۔“

”میں عاشی کے لیے بہت پریشان ہوں۔“

”یعنی اور پھر مور ہے بہت ہی حساس۔ اتنا سامنہ نکل آیا تھا اس کا۔ بہت مس کیا اس نے ماما کو اور..... کی شادی کا سن کر اسے شاک لگا تھا۔ ایک دم چپ سا ہو گیا تھا۔ باقی ساری چشموں میں بہت خاموش اور چپ رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان سب کے لیے کیا کروں۔ کیسے ان کے سامنے ٹھنڈے کے ڈھیر لگا دوں۔“

”آئی کو شادی نہیں کرنا چاہیے تھی؟“ یعنی نے آہستگی سے کہا۔

”بہت؟ حیرت ہوئی تھی مجھے یہ سن کر کہ آئی نے شادی کر لی ہے۔“ مریم نے سر جھکا لیا۔ جیسے یہ اس ازم ہونا کا نہیں۔
”خیر۔“ یعنی مسکرائی۔

”اب جو ہونا تھا ہو چکا تم خوا خواہ ڈپریشن نہ ہو اور عاشی اتنی بے وقوف ہرگز نہیں ہے کہ شچی انکل بے بوڑھے سے شادی کر لے وہ جان بوجھ کر تنگ کر رہی ہے۔ اپنے غصے کا اظہار کر رہی ہے۔“
”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

مریم نے افسردگی سے کہا۔

”جہیں پتا ہے مریم شیری بھائی کا..... ایک سیٹنٹ ہو گیا تھا۔“

”سب، کیسے؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔ دل جیسے ڈوبنے سا لگا تھا۔

”اب کیسے ہیں وہ؟“

”بہت بہتر ہیں۔ اللہ کا شکر ہے لیکن بہت شدید زخمی ہوئے تھے۔ بازو اور کندھے کا فریکچر ٹوٹا تھا۔ تقریباً ایک ماہ اسپتال میں رہے۔ ہمیں تو انہوں نے اب خبر کی ہے۔ اسپتال سے آ کر۔“
”اور حادثہ کیسے ہوا تھا؟“

”پتا نہیں انہوں نے تفصیل نہیں بتائی۔ کل ہی تو اسل سے ان کی بات ہوئی ہے۔ بابا اور ماں جی اتنی پریشان تھیں کہ خدا جانے کیا بات ہے ایک ماہ سے کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ مومنو۔“
اس نے خاموش بیٹھی مریم کی طرف دیکھا۔

”مومنو میرے بھائی کو معاف کر دو۔ اس کا قصور نہیں ہے کوئی بھی۔ وہ مجبور کر دیا گیا ہے لیکن تم انتظار کر سکتی ہو میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں جا چوکو منانے کی پوری کوشش کروں گی مگر جب شیری بھائی آ گئے تو تب۔“
”پاگل ہو تم۔“ مریم نے آہستگی سے کہا۔

”میں شہر یار سے خفا نہیں ہوں اور شہر یار یہ بات جانتے ہیں۔“

”لیکن تم نے ان کے خط کا جواب بھی تو نہیں دیا تھا۔“

”سنا جواب لکھتی تھی۔“ میرے پاس ہے ہی کیا لکھنے کے لیے۔ کوئی امید، کوئی امکان کچھ بھی نہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی یعنی کہ اگر تمہارے چاچو مان بھی جاتے تو ماما پتا نہیں راضی بھی ہوتی ہیں یا نہیں اور میں عاشی جیسی بہادر نہیں ہوں یعنی۔ تم تو جانتی ہو۔ میں ماما کی کسی بھی بات کو DENY نہیں کر سکتی۔ میں بھی کوشش کروں۔ میں پتا نہیں ایسی کیوں ہوں۔ میرے اندر اعتماد کی اتنی کمی کیوں ہے۔ میں تو شاید کبھی اپنا موقف نہیں سمجھا سکتی۔ اس کی غلط فہمی دوزخ میں کر سکتی۔“

”شیری بھائی تم سے محبت کرتے ہیں مومنو۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں اور تمہارے بغیر زندگی گزارنا

ان کے لیے بہت مشکل ہوگا۔

”وقت ہر ذمہ کو مندرل کر دیتا ہے۔ بہت بڑا مسیحا ہوتا ہے وقت اور شہر یار بھی بھول جائیں گے۔ ہمارے درمیان کون سی اتنی بہت سی ملاقاتیں اور یادیں تھیں کہ بھلائی نہ جاسکیں۔“ وہ نظریں جھکائے ہوئے سب کہہ رہی تھی لیکن خود اس کا دل ان ساری باتوں کی نفی کر رہا تھا۔ ”نہیں یہ سب آسان نہیں ہے بہت مشکل ہے۔ کیا وہ بھول سکتی ہے۔ بھول جائے گی شہر یار کو۔“ جب پہلی بار اس کا دل شہر یار کے نام پر دھڑکا تھا۔ ”کیا وہ باتیں جو اس کے اور شہر یار کے درمیان ہوئیں۔ کو مختصر ہی سہی اس کے ذہن سے نکل جائیں۔ وہ مہربان لہجہ تو اس کی سماعتوں میں ہر وقت گونجتا تھا۔“

وہ شوخ جملے

جو کبھی بکھار شہر یار بے اختیار کہہ جاتا تھا۔

وہ پر شوق نظریں جو اس کی طرف اٹھتیں تو پھر جھکنا بھول جاتی تھیں۔

وہ..... وہ کیسے بھول سکتی تھی۔

”مجھے تو تم دونوں ہی بہت عزیز ہو اور شہر یار میرا بھائی ہے۔ میں تو تم دونوں کے لیے ہی دعا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ تم کہہ رہی ہو۔“

”مریم“ آپ ابھی تک یہاں بیٹھی ہیں؟

پروفیسر عادل نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا تو مریم نے چونک کر سر اٹھایا وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”ٹیک اسٹ ایزی مریم۔“

وہی مہربان نظریں اور وہی نرم لہجہ۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔“

”کیا۔ کیا عاشری اب انکل شچی سے شادی نہیں کرے گی۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کیا عاشری نے آپ کی بات مان لی ہے؟“

”مریم“ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں ہوں نا۔ سب کچھ دیکھ لوں گا۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔

ایسا کچھ بھی نہ ہوگا جو آپ کے لیے تکلیف دہ ہو اور عاشری کے لیے بھی۔ وہ نادان ہے، معصوم ہے اور اس وقت ضد میں ہے لیکن آپ کو قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا آپ سب کا خیال رکھنے والا اور پلیز۔“

وہ ذرا سا مسکرائے۔

”اپنا خیال رکھا کریں۔ کیا حالت بنائی ہے آپ نے اپنی۔“

”تھینک یو عادل بھائی۔“

اس نے نظریں جھکا لیں۔

”آپ اتنا خیال رکھتے ہیں ہم سب کا۔“

”فرض ہے میرا۔ میں نے وعدہ نہ بھی کیا ہوتا تو بھی میرا فرض تھا کہ میں ہر مشکل میں آپ لوگوں کے ساتھ رہوں۔“

”اور..... اور اگر شرجیل مرزا۔ میرا مطلب ہے انکل شچی نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا تو۔ وہ بہت غصے میں تھے۔“

”بچانے والا اور حفاظت کرنے والا تو اللہ ہے۔ انسان کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ اپنے لیے مریم کی یہ تشویش انہیں اچھی لگی تھی۔

”اور یہ شرجیل مرزا جیسے لوگ بزدل ہوتے ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔“

”مگر انکل شچی بہت کینہ پرور ہیں آپ کو نہیں پتا انہوں نے جان بوجھ کر عاشری کو درغلا یا ہے اور اب انہوں نے ایشی سیدھی باتیں کر کے عاشری کو ماما سے اور مجھ سے اور ڈاکٹر عبدالعزیز سے متفر کر دیا ہے۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی سازش کر کے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ آپ پلیز اپنا خیال رکھیے گا۔“

ماں جی کے لیے۔“

”اوکے۔“ وہ مسکرائے۔ ایک بھر پور مسکراہٹ جس نے ان کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔

”مریم“ کبھی یہ زندگی بہت بے معنی لگتی تھی زندگی سے کوئی خاص محبت بھی نہ تھی لیکن اب محبت ہو گئی ہے

زندگی سے، جینے کو جی چاہتا ہے۔ بہت پیاری ہو گئی ہے یہ زندگی آپ فکر نہ کریں بہت خیال رکھوں گا اپنا۔“

ان کی نظریں وارفتگی سے مریم کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

مریم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو وہ فوراً سنبھل گئے اور نگاہیں جھکاتے ہوئے پوچھا۔

”اگر آپ کچھ خوف محسوس کر رہی ہوں تو میں حویلی سے دو بندوں کو حفاظت کے لیے بلا لیتا ہوں وہ“

چپیں گئے گیت پر ہیں گے۔“

”نہیں اس کی ضرورت تو نہیں ہے وہ خان ہوتا ہے گیٹ پر۔“ مریم نے جلدی سے کہا۔

”بچر بھی میں احتیاطاً حویلی سے قاور کو بلا لیتا ہوں البتہ آج رات کے لیے ادھر کٹھی سے چوکی دار کو بھیج

”الگا۔ اپنا آدمی ہے وہ۔ ویسے ماما کہاں گئی ہیں۔ کب تک واپسی ہوگی ان کی۔“

”معلوم نہیں“ عاصمہ کہہ رہی تھی کہ انہوں نے مریم جانا تھا۔ شریف نے بھی بتایا ہے کہ اٹیچی بکس رکھا تھا انہوں نے ڈیگٹی میں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی گئے ہیں۔ ایک دو روز کے لیے گئے ہیں۔“

”تو کیا وہ آپ کو بتا کر نہیں گئیں؟“

پروفیسر عادل کو از حد حیرت ہوئی۔

”در اصل میں تو سوری تھی۔ صوفو کو بتایا ہوگا انہوں نے۔ میں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں۔“

”خیر میں فون کر کے گھر سے ابھی عزیز کو بلا لیتا ہوں۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں! ہا دھڑ آنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ بہت ہر اتو وہ عا ش ا کو فون کرنے کی کوشش کرے گا اور امید ہے کہ اب عا ش ا بات نہیں کرے گی اس سے وعدہ کیا ہے مجھ سے۔“

”تھینک یو۔ تھینک یو عادل بھائی۔“

”میں نے آپ سے ابھی کیا کہا ہے مریم کہ کوئی تھینک یو نہیں۔“

”اور میں۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں کتنی اکیلی تھی اور کس قدر تنہا۔ عا ش ا مجھ سے بدگمان تھی وہ میری بات نہیں سمجھتی تھی اور پایا سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ میں سب کا خیال رکھوں گی لیکن

میں کسی کا خیال بھی نہیں رکھ پارہی تھی۔“

اس کی آواز بھینگ مئی اور پلکیں نم ہو گئیں۔

”آپ اکیلی نہیں ہیں مریم۔“

انہوں نے نگہ میر آواز میں کہا۔

”اور یاد رکھیے گا ایسا ہی ایک وعدہ میں نے بھی کیا ہے۔ ایک ہی شخص سے کیا جانے والا یہ وعدہ ہم دونوں نے مل کر نبھانا ہے اور ہم اپنا وعدہ نبھائیں گے۔ آپ ہر بات ہر فکر چھوڑ کر ریلیکس ہو جائیں۔“

اس نے سر ہلا دیا۔

”اور عا ش ا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ رورہی تھی کیا؟“

اسے اچانک عا ش ا کا خیال آ گیا۔

”نہیں! میں نے اسے سونے کے لیے کہا ہے۔ سو کر اٹھے گی تو فریش ہو جائے گی اس وقت تھوڑی

ڈسٹرب ہے۔ گھبرا گئی ہے۔ مجھے بہت کم غصہ آتا ہے لیکن اس وقت غصہ برداشت نہیں ہوا مجھ سے جب

میں نے دونوں کو سنا تھا آتے دیکھا۔ خیر۔“ انہوں نے سر کو ہولے سے جھٹکا اور مسکرائے۔

”اس وقت تو چائے پلوادیں۔“

”اوہ ہاں۔“

وہ شرمندہ ہو گئی۔

اسے خود تو خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ اتنی الجھی الجھی ہی تھی وہ۔

وہ کچن میں چائے کا کپہن گئی تو پروفیسر عادل ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے تاکہ خدا بخش کو فون

کرے عزیز کو بلا سکیں۔



”فرائیسی مصوری کی تحریک تاثریت پسندی IMPRESSIONISM کو ماڈرن آرٹ کا۔۔۔

مرکز و محور تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک سرکش نوعیت کی تحریک تھی جس نے آرٹ میں بغاوت پیدا کر دی۔

فرانس میں SALON (آرٹ کی نمائش گاہ) کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے من پسند مصوروں کی

نمائش کرتے تھے۔ 1863ء میں نیپولین نے ایک نئے سیلون کی بنیاد رکھی جس کا نام SALON

DEREFUSES تھا اور اسی میں دسلو مانے پزارو PISSARO کے فن کاروں کی نمائش ہوئی اور

مانے کی تصویر ”دی لنچن آن دی گراس“ نے تہلکہ برپا کر دیا۔“

”سر! یہ تصویر کس موضوع پر تھی؟“

مسرور نے جو بہت دھیان سے پروفیسر عادل کا لیکچر سن رہا تھا پوچھا۔

”یہ تصویر۔۔۔۔۔؟“

پروفیسر عادل نے سگریٹ نکال کر جلائی۔

”اس تصویر کا موضوع دو مرد اور ایک بے لباس عورت تھی۔ اس سے پہلے عورت کو یونانی کلاسیکل

انسانک میں دکھایا جاتا تھا۔ جبکہ مانے نے اس عورت کو یونانی مثالیہ بنانے کے بجائے مانوس فرنج ماحول

میں بے باکی کے ساتھ بیٹھا ہوا دکھایا تھا۔۔۔۔۔ مانے کی دوسری شاہکار تصویر ”اولیپیا“ تھی۔ جس نے

قیامت برپا کر دی اور اسے اسپانیہ میں پناہ دینی پڑی۔“

پروفیسر عادل نے ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی اور مسرور کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”کہو! اور کیا پوچھتا ہے؟ کوئی خاص بات جاننا چاہتے ہو تو کہو۔ ورنہ اگر اس طرح بات جاری رکھی تو

بہت لمبی ہو جائے گی اور مجھے ذرا چاچا کی طرف بھی جانا ہے کچھ دیر تک۔“

”نہیں سر! کوئی خاص بات تو نہیں پوچھنی بس یونہی مجھے لگتا تھا جیسے میں مصوری سے برش

اور رنگوں سے ہر شے سے بہت دور ہو گیا ہوں۔ دل چاہا! آپ کی باتیں سنوں! آپ کے لیکچر بہت پر مغز

ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بہت کمی اور بہت نقصان کا احساس ہوتا ہے کہ آپ سے دور ہو کر میں آپ کی ان

باتوں کو سننے سے محروم رہ گیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے ابھی کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اس علم سے

ایک ذرہ بھی نہیں جو آپ کے پاس ہے۔“

”تم یہاں رہ کر اپنی اسٹڈی جاری رکھ سکتے ہو۔ میری لائبریری میں بہت کتابیں ہیں۔۔۔۔۔ ہر موضوع

پرمصوری پر بھی تمہیں یہاں بہت کتابیں مل جائیں گی۔ جب میں یورپ سے آیا تھا تو میرے سامان

میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ جنہیں میں نے بذریعہ بحری جہاز بھجوا دیا تھا۔ تمہارا جب دل چاہے حویلی آ

جایا کرو۔ میں ماں جی سے کہہ دوں گا۔ تم لاہریری سے جو کتاب لینا چاہو لے جایا کرو۔“
”شکریہ سر!“

”اور تم یہاں کیا کرتے رہتے ہو فارغ اوقات میں یہاں تو لکھ تم نیچر کے زیادہ قریب ہو تم نے رنگ اور برش سنبھال کر کیوں رکھ دیے ہیں۔ میں نے کراچی کی ایک آرٹ گیلری سے بات تقریباً قائل کر لی ہے۔ بس ذرا کچھ الجھا ہوا تھا ایک مسئلے میں اس لیے ابھی تک کراچی جانا نہیں ہو سکا۔“

”کیا بات تھی سر کوئی پریشانی؟“

”ہاں..... نہیں تو کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔“

انہوں نے اسے اطمینان دلایا اور سوچا۔

”شکر ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا ورنہ وہ خود بھی عاشی کی ضدی طبیعت سے اندر سے کچھ خوف زدہ تھے اور چاہتے تھے کہ عاشی کو پیار اور نرمی سے سمجھائیں اور انہوں نے بہت شفقت اور محبت سے اسے سمجھایا تھا کہ اسے شریل مرزا جیسے شخص کے ساتھ گھومنا زیب نہیں دیتا۔“

”کیا بچو نے آپ سے میری شکایت کی ہے؟“

اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

”نہیں تو میں نے خود دیکھا ہے تمہیں عاشی۔ تم اور شریل مرزا دونوں کو جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میری غیرت نے اسے گوارا نہیں کیا۔“

اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ حویلی سے واپس آتے ہوئے ہی اپنے ایک کولیگ کے ساتھ ”رنگ کا رنگ“ چلے گئے تو انہوں نے عاشی کو وہاں سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔

”اچھا“ میں سمجھی شاید بچو نے آپ سے شکایت لگائی ہے۔ وہ خواخواہ ہی انکل فچی کے خلاف ہو گئی ہیں۔ ورنہ انکل فچی تو بہت اچھے انسان ہیں۔ آپ ان سے ملیں نا کبھی تو۔“

”اچھے انسان ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے عاشی۔ مجھے پسند نہیں ہے کہ تم..... عثمان احمد خان کی بیٹی ہو کر یوں غیر مردوں کے ساتھ ہولٹوں اور کیفیوں میں گھومو۔“

اور عاشی نے اس طرح انہیں دیکھا تھا جیسے اسے ان کی بات پر از حد حیرت ہوئی ہو اور انہیں ہنسنے لگا تھا کہ عاشی ان کی بات کا مان رکھے گی۔

لیکن اس روز جب وہ نہ بولا گئے تو شریل مرزا لوگ روم میں دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا اور عاشی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ غالباً دونوں ابھی ابھی کہیں باہر سے آئے تھے اور وہ اسے خدا حافظ

کہہ رہا تھا۔

”عاشی!“

وہ اتنے زور سے بولے تھے کہ عاشی نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تھا اور ایک دم زرد پڑ گئی تھی۔ شریل مرزا نے غالباً اسے تسلی دینے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا تو انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے کھینچ لیا اور شریل مرزا سے درخواست کی تھی کہ وہ چلا جائے لیکن وہ بڑے اعتماد کے ساتھ جین کڑا سنسر سے انہیں دیکھتا رہا تھا اور غصے کی شدت سے ان کا پورا وجود چپ اٹھا تھا اور خون جیسے دماغ کی دیواروں سے ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ بمشکل تمام انہوں نے خود کو روکا تھا ورنہ وہ شریل مرزا کو دھکے لے کر باہر نکال دیتے۔ عاشی بہت سہم گئی تھی اور کتنی ہی دیر تک کمرے میں آکر بھی سسکیاں لیتی رہی تھی اور وہ اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہونے کے لیے نرم لہجے میں سمجھاتے رہے تھے کہ یہ شخص اچھا آدمی نہیں ہے۔
”لیکن عادل بھائی انکل فچی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

اس نے روتے روتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

اور لہجہ بھر کو وہ شہسدر سے رہ گئے تھے اگرچہ مریم نے انہیں بتایا ہوا تھا کہ عاشی انکل فچی سے شادی کرنا چاہتی ہے پھر بھی عاشی کے منہ سے سن کر انہیں بے حد عجیب سا لگا تھا لیکن جلد ہی سنبھل کر انہوں نے نور سے دیکھا تھا۔

”اور تم.....؟“

”میں..... مجھے بھی انکل فچی اچھے لگتے ہیں۔“

اس نے سر جھکا لیا۔

”اور وہ جوڈاکٹر عبدالعزیز ہیں وہ.....“

”میں ان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”اس کی کوئی وجہ تو ہوگی گڑیا۔ ورنہ وہ تو بے حد نفیس انسان ہیں اور میں تو بہت خوش تھا کہ میری بہن جیسا شخص کے ساتھ خوش رہے گی مگر تم شریل مرزا کوڈاکٹر عبدالعزیز پر کیوں ترجیح دے رہی ہو؟“

وہ خاموش ہی رہی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”اوکے اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تم اپ سیٹ لگ رہی ہو سو جاؤ..... اور ایک بات رونا کھانا میں تمہارا بھائی ہوں اور تم مجھ سے ہر بات بلا جھجک کر سکتی ہو..... میرے لیے تمہاری خوشی ہر لمحہ سہم ہے۔“

اور اسے کوئی بھی بات نہ سوچنے کی تلقین کرتے ہوئے وہ باہر آئے تو مریم یونہی ہاتھ گود میں دھرے لگے بیٹھی تھی اور اس کا رخ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا..... کس قدر کم حوصلہ اور نازک تھی وہ..... ان

کا چاہا اسے دل میں چھپا لیں۔ لہجہ بھر تو وہ اب یونہی دیکھتے رہے تھے اور پھر جیسے ہی نگاہیں اٹھا کر اس

انکل دیکھا تھا انہوں نے نظریں جھکا لی تھیں۔

اور یہ صرف مریم کی ناپسندیدگی ہی کی بات نہ تھی کہ وہ کئی دن تک زینب ولا جا کر عاشری کو سمجھا رہے تھے بلکہ خود بھی شریل مرزا انہیں قطعی پسند نہیں آیا تھا اور پھر اس کی شہرت بھی کوئی بہت زیادہ اچھی نہ تھی۔ جب وہ اسے اور ڈاکٹر عبدالعزیز کو COMPARE کرتے تو اس کا پلا آسمان سے جا لگتا تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر یونیورسٹی میں ترقی سے شریل مرزا کا ذکر کیا تھا تو اس کے متعلق جو کچھ جتنی حیرانہ بتایا تھا وہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ عاشری کی ضد مان لیتے پھر زینب نے بھی ان سے درخواست کی تھی کہ وہ عاشری کو سمجھائیں۔ وہ خود پریشان تھیں۔ ”میں ڈاکٹر ہادی کو زبان دے چکی ہوں عادل کیا سوچیں گے وہ اور پھر دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ ایک بارش نے مریم کے لیے خواہش کی تھی تو عثمان نے از حد مخالفت کی تھی اس کی۔“

بات صرف عمروں کی تو تھی، جتنی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ تو اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں سے شادیاں کر کے انہیں چھوڑ چکا ہے۔ جہاں اس کی دال نہیں نکلتی وہاں شادی کر لیتا ہے لیکن مشہور یہی کر رکھا ہے کہ کنوارا ہے۔ اور عاشری ان کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

”میں جانتی ہوں بجواد ماما نے آپ کو درغلا یا ہے۔“

”نہیں عاشری، ایسا نہیں ہے۔ ایک بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے میں خود سمجھ سکتا ہوں کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے۔“

”نہیں، آپ نہیں سمجھ سکتے عادل بھائی اس لیے کہ آپ میرے سکے بھائی نہیں ہیں۔ سکے بھائی ہوتے تو جیسا آپ نے کہا تھا، میری خوشی آپ کو ہر بات سے زیادہ مقدم ہوتی اور میری خوشی یہ ہے کہ مجھے ڈاکٹر عبدالعزیز سے شادی نہیں کرنا، مجھے انکل شی سے شادی کرنا ہے۔“

وہ اٹھ کر چلی گئی تھی اور وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھ رہے تھے ایک دم جیسے سے ڈھسے سے گئے تھے۔ یہ عاشری نے کیا کہہ دیا تھا۔ وہ عاشری کو کتنا عزیز رکھنے لگے تھے اور انہوں نے کبھی عاشری کا نیا نامور کے لیے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ان کے سکے بہن بھائی نہیں ہیں۔

”عاشری یونیورسٹی بول دیتی ہے بلا سوچے سمجھے۔“ مریم نے ان سے معذرت کی۔

”اور یوں بھی وہ اس وقت ضد میں ہے ورنہ میں جانتی ہوں وہ اگر کسی کا احترام کرتی ہے۔“

”نہایت خجست کرتی ہے تو وہ آپ ہیں۔“

”شاید!“

وہ بے حد افسردہ اور دل گرفتہ ہو رہے تھے۔

”اسے تو میرے خلوص پر بھی شک ہے اور وہ مجھے بھی تنگی اور سوتیلی کے حساب سے دیکھنے لگی ہے۔“

اس کی آواز بھگ گئی تھی اور آنکھوں میں جھنجھوٹے چمکنے لگے تھے۔ اور وہ اپنا دکھ بھول کر اسے دلا سادے لگے۔

”آپ کا کیا خیال ہے مریم اب کیا کوئی راستہ رہ گیا ہے؟“

”شاید نہیں۔“

وہ بے حد افسردہ تھی اور اس کے چہرے پر مال کے رنگ لہجہ بہ لہجہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

”اور کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ مسز زینب اپنے ہاتھوں سے عاشری اور شریل کی شادی کر دیں بجائے اس کے کہ وہ خود کر لیں۔“

مریم خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی اور اس کی آنکھوں میں چمکنے جھنجھوٹ کر خساروں پر تک گئے۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے آنسو بہاتی رہی اور وہ انتہائی دکھ مایوسی اور دل گرفتگی سے اسے روتے دیکھتے رہے کہ وہ اب اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

”آپ ماما سے بات کریں گے عادل بھائی یا میں خود کروں؟“ تھوڑی دیر بعد عاشری پھر ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”میں کوشش کروں گا عاشری کہ انہیں قائل کر سکوں لیکن اگر وہ نہ مانیں تو.....؟“

”وہ مان جائیں گی۔ میں انہیں جانتی ہوں لیکن اگر وہ نہیں مانیں تو شریل خود انہیں منالیں گے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ماما کو دو منٹ میں قائل کر سکتے ہیں۔“

انہوں نے ایک خاموش نظر عاشری پر ڈالی۔

گہرے میک اپ میں اس نے اپنے چہرے کی زردی کو چھپانے کی کوشش کی تھی اور بہت فریش دکھائی دے رہی تھی حالانکہ کچھ دیر پہلے اس کا چہرہ بے حد زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے گرد مسلسل رونے سے حلقے سے دکھائی دے رہے تھے۔

”اوکے!“

اس نے ان کی طرف باری باری دیکھا۔

”میں ذرا باہر جا رہی ہوں..... ماما آجائیں تو پلیز، ان سے بات کر لیجئے گا، فحش کو بہت جلدی ہے۔“

وہ ہاتھ ہلاتی چلی گئی اور وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

مسز زینب جو پارک گئی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد واپس آئیں تو انہوں نے بے حد مایوسی سے انہیں بتایا کہ عاشری کسی بھی صورت اپنی خواہش سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔

اور جیسا کہ مریم کو تو قہر بھی پہلے تو وہ بہت دیر تک تیز تیز بولتی رہیں پھر انہیں ڈپریشن ہونے لگا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کی آواز سن کر اوپر سے عاصمہ آگئی تھی اور آخری سیڑھی پر پورا منہ کھول کر

جائیاں لیتی ہوئی وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر زنب کے بیڈروم میں جانے کے بعد نیچے اتر کر مریم کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

”اے مریم! یہ بھائی اتنا اونچا اونچا کیوں بول رہی تھی؟“

”یونی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”ہمارے خلاف تو نہیں چلا رہی تھی۔ ہم اپنے بھائی کے گھر رہتے ہیں۔ اس کا کھاتے ہیں۔ بتا دیا اپنی اماں کو۔ زیادہ بولیں تو طلاق دلوادیں گے ہاں۔“

اور عادل کی طبیعت سکدر ہوئی۔ انہوں نے بڑی ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

”اچھا مریم! میں چلتا ہوں۔ آپ اپنی اماں کے پاس جا کر بیٹھیں اور پریشان نہ ہوں۔ ریلیکس ہو جائیں گی ابھی اور اگر طبیعت کچھ دیر تک بحال نہ ہو تو ڈاکٹر ہادی یا عبدالعزیز کو کال کر لیجیے گا۔“

”نوٹیری وجہ سے جا رہے ہو تو میں چلی جاتی ہوں اوپر۔۔۔۔۔ ویسے میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ تو ہماری بھابی ہے بھائی کی ساری کمائی سنبھال کر بیٹھی ہے۔ ہمارا دل گروہ ہے کہ اسے اس کی اولادوں سمیت برداشت کر رہے ہیں پھر بھی ہم پر چلاتی ہے اور مومن کو کسائی رہتی ہے کہ ہمیں چلتا کرے۔“

پروفیسر عادل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور مریم کی طرف دیکھا۔

”اوکے مریم!“

”اوکے اللہ حافظ۔“

مریم نے آہستگی سے کہا۔

”بعض حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں لیکن انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات انسان بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ جب دونوں طرف کھائی ہو تو نسبتاً کم تکلیف دہ موت کا انتخاب کرنا چاہیے۔“

انہوں نے اسے حوصلہ دیا اور تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھے اور جاتے جاتے انہوں نے سنا۔

عاصمہ پوچھ رہی تھی۔

”اے! کون ہے تیرا؟“

مریم کوئی جواب دیے بغیر زنب کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا اور عاصمہ نے بھی انہیں مڑ کر دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور شاید اسی لیے انہیں سانے کی خاطر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”اللہ جانے کون ہے ہر دوسرے تیرے دن چلا آتا ہے۔“

وہ زور سے دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے باہر نکل آئے تھے اور پورچ میں گاڑی سے ٹپک لگائے عاشی کھڑی تھی۔

”عاشی! تم گئی نہیں؟“

بے حد حیران ہو کر انہوں نے پوچھا اور اس کے قریب چلے آئے۔

”تم ٹھیک تو ہونا گڑیا۔ میں ہوں نا تمہارا بھائی! میں نے زنب آنٹی سے بات کی ہے۔ ہم تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ بے شک اس میں ہماری مرضی شامل نہیں ہے لیکن ہم نے ہماری خوشی اور صرف تمہاری خوشی کی خاطر۔۔۔۔۔“

انہوں نے بات اور مری چھوڑ دی اور غور سے اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی اور اس کی پلکیں پت پت لگ رہی تھیں۔ جیسے کچھ دیر پہلے روٹی ہو۔

”تمہاری اماں! انکل ہادی سے معذرت کر لیں گی۔ تم شرجیل مرزا سے کہہ دینا کہ وہ اپنا باقاعدہ رپوٹل بھجوادیں۔“ از حد دکھ محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔“

عاشی نے یکدم دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

”مجھے شرجیل مرزا سے شادی نہیں کرنی۔۔۔۔۔ عادل بھائی!“

اور وہ بے حد حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کس قدر مختلف بات کہہ رہی تھی اور کس زبانش دکھائی دیتی تھی لیکن اب۔۔۔۔۔

ایک دم ان کا ذہن ہلکا ہلکا ہو گیا جیسے کوئی بہت بھاری بوجھ ان کے دل سے اتر گیا ہو۔ ان کا منی چاہا۔

”اگلی بیچے پلٹ جائیں اور مریم کو جا کر یہ خوش خبری دے دیں جو اس قدر آرزو ہو رہی تھی۔ انہوں نے اُن کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے وہ مسلسل رورہی تھی۔“

”رلیکس گڑیا!“

انہوں نے بہت شفقت سے اس کے آنسو پونچھے۔

”پلو میرے ساتھ تمہیں آج اپنے خدا بخش صاحب کے ہاتھ کی چائے پلاتے ہیں اور پھر لمبی بات کرتے ہوئے دونوں بہن بھائی بہت ساری باتیں کریں گے اور میں تم سے تمہاری ہی لڑائی بھی کروں۔“

”نہیں ہاں ہے نا میں تم سے ناراض ہوں۔ پتا ہے کیوں۔۔۔۔۔ تم نے مجھے یہ کیوں کہا تھا کہ میں تمہارا سا گناہ سونپتا بھائی ہوں۔“

”نات موڈ میں اس سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔“

”sory عادل بھائی!“

انہوں نے بیٹھتے ہوئے عذارت سے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

”عاشی! ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ تمہاری رگوں میں بھی وہی لہو دوڑ رہا ہے جو میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ تمہیں جنم دینے والی میری ماں نہیں ہے۔“

”بالوں۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے سرور بلکہ تم پروگرام بنائی لو..... راستے میں باتیں کرتے ہوئے سفر اچھا سٹ جائے گا اور میں تمہیں فراہمی مصوری کی تحریک impressionism کے متعلق مزید کچھ بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے سر، کل پھر فائل کر لیں گے۔“

سرور خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا تو وہ اندر ماں جی کی طرف چلے گئے تاکہ انہیں بتا کر..... وہ چاچا عبدالرحمن سے مل آئیں۔

مگر ماں جی نے کامل کی باتیں شروع کر دیں تو انہوں نے چاچا عبدالرحمن کی طرف جانے کا ارادہ لٹوی کر دیا اور ماں جی کی باتیں سننے لگے اور باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی ناچلا۔ مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی جب وہ ماں جی کے پاس سے اٹھے۔ ماں جی بھی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھے تو ماں جی نے آہستگی سے کہا۔

”عادل بیٹا نماز پڑھ لیا کرو۔“

”جی ماں جی کو شش تو کرتا ہوں۔“

وہ نام سے ہو گئے۔ کتنی بار وہ سوچتے تھے کہ نماز باقاعدگی سے پڑھا کریں۔ دو چار روز تو باقاعدگی رہی اور پھر گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں آئندہ باقاعدگی سے پڑھنے کا عہد کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ سرور آیا ہے۔

”سرور!“

انہیں از حد حیرت ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ یہاں سے ہو کر گیا تھا۔

زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے ہوئے تھے اسے گئے ہوئے اور ”خدا خیر کرے“ سب خیریت ہو۔ سرور کی انا کو اللہ زندگی دے.....“ انہوں نے بے آواز دعا کی اور تیز تیز چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سرور کی آنکھیں کی اندرونی جوش سے چمک رہی تھیں اور چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔

”خیریت..... خیریت ہے نا سرور؟“

”جی..... جی سر۔“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ”سر..... سر وہ کامل مل گیا ہے۔“

”کیا کامی!“ انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی..... جی سر۔ وہ کامی ہی ہے سر میں اسے پہچانتا ہوں۔“

”کیا!۔ کہاں ہے وہ؟“ ”پروفیسر عادل کی آواز کانپ گئی اور آنسو باہر آنے کو جیسے بے تاب ہونے لگے۔“

”سرور ادھر ہے۔ ادھر میرے کمرے میں۔ آپ پلیز چلیں نا۔“

وہ نہیں جانتے تھے کہ عاشری نے ایک دم یہ فیصلہ کیوں کر لیا تھا۔ آدھا گھنٹا پہلے تک تو وہ اپنے فیصلے میں بہت سخت تھی پھر..... انہوں نے اس سے یہ فیصلہ بدلنے کی وجہ نہیں پوچھی تھی لیکن وہ بہت مطمئن اور بہت خوش تھے..... نہ سب بھی مطمئن ہو گئی تھی اور مریم تو اتنی خوش تھی کہ اس نے بے اختیار دعا کی تھی کہ خدا کرے وہ ہمیشہ یونہی خوش رہے اور اس کی آنکھوں میں غم کے تارے نہیں خوشی کے جگنوؤں یونہی جگمگاتے رہیں۔ عاشری نے کانچ میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اگرچہ وہ کافی لیٹ تھی پھر بھی انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے اسے داخلہ دلا دیا تھا..... اور اب بے حد مطمئن ہو کر ماں جی کو ملنے حویلی آئے تھے۔ بی آبا پیال ہوتی تھیں تو انہیں ماں جی کی اتنی فکر نہیں ہوتی تھی مگر اب بی آبا کراچی میں تھیں اس لیے وہ دس پندرہ دن بعد حویلی کا چکر ضرور لگاتے تھے۔

”سر آپ کیا سوچتے گئے؟“

سرور نے انہیں مسلسل خاموشی سے سگریٹ پھونکتے دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

انہوں نے آخری کش لگا کر سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

”یونہی تمہیں بتایا ہے نا کہ ایک مسئلے میں الجھ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بخوبی وہ مسئلہ حل ہو گیا۔“

”ناؤ دل لگ گیا ہے نا بلکہ میرا خیال ہے نا مانی تمہیں بور نہیں ہونے دیتا ہوگا۔“

”جی سر!“

”مگر کب گئے تھے امی کیسی ہیں تمہاری؟“

”کافی دن ہو گئے ہیں۔ ایک دو روز تک جاؤں گا۔ ویسے خط آیا تھا امی کا“ پہلے سے بہت

ہیں۔ شیریں کی تجویز کی ہوئی دوا انہیں سوٹ کر گئی ہے۔“

”ہاں شہر یار کیسا ہے؟“

”امی نے لکھا تھا کہ پچھلے دنوں اس کا..... ایک میڈنٹ ہو گیا تھا لیکن تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔“

کوئی خطرے والی بات نہیں تھی۔“

”بھئی، کبھی خط لکھو اسے تو میری دعا بھی لکھ دیتا۔“

”جی سر سوچ تو رہا ہوں خط لکھنے کا۔“

سرور کھڑا ہو گیا۔

”اب میں چلوں گا۔ آپ ابھی کچھ دن رہیں گے نا یہاں؟“

”نہیں بس کل کا دن ہے۔ پرسوں صبح انشاء اللہ واپسی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے سر، پھر کل شام ملاقات ہوگی اور ہو سکتا ہے میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

”تم..... تم اسے ساتھ کیوں نہیں لے آئے سرور؟“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”وہ ضد کر رہا تھا، نہیں آ رہا تھا، میرے ساتھ۔ میں اسے گھر ہی میں وہاں اپنے کمرے میں چھوڑ آیا ہوں۔“
”اور اگر وہ وہاں سے چلا گیا تو سرور تم..... تم کیوں چھوڑ آئے ہو اسے اکیلا۔“ وہ بے حد مضطرب سے ہو گئے تھے۔

”نہیں سر۔“ اب کے سرور نے اپنے اوپر قابو پالیا تھا ”وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے پاس آمنہ مٹی اور تصدق احمد بھی ہیں۔ میں یہاں سے گیا تو وہ میرے منتظر تھے۔“

”لیکن وہ تمہیں ملا کہاں سے سرور اور کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ کامیابی ہے نا؟“ انہوں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پھر پوچھا۔

”جی سر وہ کامی ہے۔ آپ چلیں ناسروہاں چل کر ساری بات ہوتی ہے۔“ سرور کے چہرے پر اب بھی نیک سرتی تھی۔

پروفیسر عادل نے ایک لمحہ کے لیے سوچا کہ وہ ماں جی کو کامل کے ملنے کا بتائیں لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ سرور کے ساتھ چل دیے۔



”بجو۔“ عاشری نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور مریم کی طرف دیکھا۔ جو بہت دیر سے اس کے بالکل سامنے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی ”یہ جو محبت ہوتی ہے، کیا واقعی بہت تکلیف دہ اور ظالم ہوتی ہے اور کیا اس کے پھڑ جانے سے آدمی کو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی مجھے ہو رہی ہے۔“

”عاشری۔“ مریم نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھوں کے پونے سو بے ہوئے تھے اور رخسار دک رہے تھے ”کیا تم انکل فچی سے سچ محبت کرنے لگی تھیں۔“

”ہاں نہیں۔“ اس نے بے بسی سے مریم کی طرف دیکھا ”لیکن مجھے ایسا ہی لگتا تھا، جیسے دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی بھی میرا اپنا نہیں ہے۔“

”کیا تم ان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم ان کے ساتھ زیادہ خوش رہو گی؟“ مریم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ عاشری ہچکچاہٹ کئی دنوں سے کتنی ڈسٹرب تھی۔ اس قدر مضطرب اور بے چین کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے اور کس طرح..... تیار.....

وہ تو خود نہیں چاہتی تھی کہ عاشری، شریل مرزا جیسے شخص سے شادی کرے اور ڈاکٹر عبد المعید کتنے اچھے سنے ناکس تھے لیکن اس سے عاشری کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس روز سے وہ کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ نہ کپڑے تبدیل کئے تھے نہ بال بنائے تھے۔ وہ عادل سے کہے گی کہ ٹھیک ہے عاشری کی شادی انکل فچی سے ہی ہو جائے۔ وہ اتنی کم سن ہے اور اتنی نازک دل کہ وہ برداشت نہ کر پائے شاید وہ سچ سچ انکل فچی سے

بٹ کرنے لگی ہے۔

”عاشری میں ماما کو راضی کرنے کی کوشش کروں گی اور میں عادل بھائی سے بھی کہوں گی کہ وہ ماما سے کہیں کہ تم صرف انکل فچی کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہو۔ ماما مان جائیں گی۔ مجھے یقین ہے عاشری۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ ماما مان گئیں نہ تو پھر عادل بھائی کا کیا ہے۔ وہ بھلا کس کی پروا کرتی ہیں! چلو اٹھو کپڑے تبدیل کرو۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ ہم آج لمبی ڈرائیو پر جاتے ہیں۔“

”نہیں بجو۔“ عاشری نے مریم کی طرف دیکھا ”مجھے انکل فچی سے شادی نہیں کرنا۔“

”تمہیں عادل بھائی سے ڈر لگتا ہے نا میں انہیں منالوں گی۔ آئی پراس عاشری۔ میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ وہ تمہیں سمجھائیں لیکن سوری عاشری مجھے بتائیں تھا کہ تم..... تم انکل فچی سے اتنی شدید محبت کرنے لگی ہو۔“

”نہیں بجو۔“ مجھے اب انکل فچی سے شادی نہیں کرنی۔ کبھی نہیں۔“ عاشری نے چونک کر کہا ”انکل فچی بہت گھٹیا آدمی ہیں..... بہت فضول۔ پتا ہے اس روز جب میں گھر سے نکلی تھی نا تو ان کے دفتر میں گئی تھی اور وہاں دفتر میں ان کے ساتھ کوئی اور لڑکی تھی اور وہ دونوں.....“ اس کی آواز بھرا گئی ”پتا ہے بجو لیکن

وہ..... جو کچھ مجھے کہتے تھے وہ سب کچھ جھوٹ تھا..... وہ صرف آپ کو اور ماما کو پریشان کرنے کے لیے بری طرف بڑھے تھے۔ آپ صحیح کہتی تھیں بجو لیکن میں..... میں.....“ ایک دم اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور زور سے رونے لگی مریم نے بے اختیار اسے گلے سے لگایا۔

”میں نے خود اپنے کانوں سے سنا بجو وہ کہہ رہے تھے کہ عاشری..... وہ ذرا سی ہاتھ بھری لڑکی وہ بھلا گئے.....“ اس کی آواز اندر کہیں پہنچ گئی ”بجو..... مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ لو..... نہیں تو میرا دل پھٹ.....“

”میرا جان۔“ مریم نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ خود اس کا دل جیسے سینے کی چار دیواری سے باہر آنے کو بے چین ہو رہا تھا۔

”اور خدا کرے یہ شخص کبھی خوش نہ رہے۔“ اس نے دل ہی دل میں اسے بد دعا دی۔

بڑی دیر بعد عاشری سنبھلی تو اس کے آنسو پونچھے ہوئے مریم نے اس کے رخساروں پر پیار کیا۔

”مجھے یقین ہے عاشری کے ہولے ہولے تمہارا دل سنبھل جائے گا اور پتا ہے۔ یہ محبت ہر گز نہیں کی..... مگر رانی۔“

”یہ محبت تمہاری ضد تھی۔ ورنہ معید بھائی تو اتنے اچھے ہیں۔ وہ سچ سچ تم سے محبت کرتے ہیں اور تم کس کی نظر میں بہت اچھی لگی تھیں اور تم ان کے ساتھ بہت خوش رہو گی..... انکل ہاشم، انکل ہادی بے شک اتنے ہیں عاشری۔ محبت کرنے والے چاہنے والے۔“

عاشری جھکائے سنتی رہی اور مریم نرم آواز میں ہولے ہولے اسے بہلاتی رہی۔

”بجو کیا آپ کو ڈاکٹر شہر یا یاد آتے ہیں؟“ ایک دم ہی عاشی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولنے لگے چپ کر گئی۔ دل کے اندر جیسے کسی نے سوئی چھو دی تھی۔

”بجو کیا آپ ان سے محبت کرتی تھیں؟“ عاشی نے پھر پوچھا۔
مریم نگاہیں جھکائے ساکت بیٹھی تھی۔

”مجھے پتا ہے آپ ان سے محبت کرتی ہیں۔ وہ بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ اس روز جب آپ دونوں وہاں ریٹورنٹ میں بیٹھے تھے تو وہ جس طرح آپ کو دیکھ رہے تھے وہ محبت ہی تھی اور مجھے یہ بھی پتا ہے بجو کہ ماما کبھی بھی آپ کی شادی ان سے نہیں کریں گی۔ جب ان کے بابا اور ماں جی آئے تھے تا تو میں نے خود سنا تھا کہ ماما آئنی زمر سے کہہ رہی تھیں کہ وہ کبھی بھی کسی مڈل کلاس میں اپنی بیٹی کی شادی نہیں کریں گی۔ بلاشبہ شہر یا خوبصورت اور اچھا ہے لیکن یہ جو مڈل کلاس کے لوگ ہوتے ہیں نایہ تمام عمر اپنے ہی کپلیکس میں جتلا رہے ہیں اور کپلیکس انہیں ڈھنگ سے محبت بھی نہیں کرنے دیتے اور پتا ہے بجو آئی زمر اس اور ماما یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ اور ڈاکٹر شہر یا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ مریم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بجو میں نے خود سنا تھا۔ آئی زمر سے کہہ رہی تھیں۔۔۔ کہ مومو شاید شہر یا کو پسند کرتی ہے تو ماما نے کہا تھا مومو بیوقوف ہے۔“

مریم نے ایک گہری سانس لے کر نگاہیں جھکا لیں۔

”بجو کیا آپ کو یہ سوچ کر ڈاکٹر شہر یا اور آپ ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ دکھ ہوتا ہے۔“
”دکھ۔“ مریم نے سوچا۔

شاید اس احساس کے لیے نفرت میں اس سے بڑا لفظ ہوتا۔ ڈاکٹر شہر یا اور وہ۔۔۔ وہ اور شہر یا کچھ خواب بے تعبیر رہتے ہیں اور خوابوں کے بے تعبیر رہنے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے کے اندر موجود دل پانی پانی ہونے لگا ہو۔

”یہ دکھ کیا ہوتا ہے بجو بچھڑ۔۔۔ جانے کا نہ پانے کا دکھ۔۔۔ اس شخص کو نہ پانے کا دکھ جسے پانے کا خواب آپ نے دیکھا ہو۔“

پوچھنے والے تمہیں کیسے بتائیں آخر

دکھ عبارت تو نہیں ہیں کہ جو لکھ بھیجیں

یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو

آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو

”بجو۔“ عاشی کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں جس پر کئی رنگ آکر جا رہے تھے ”بجو اگر ڈاکٹر شہر یا

آپ سے بے وفائی کرتے۔ اگر وہ آپ کی محبت کی توہین کر دیتے تو کیا وہ اس دکھ سے بڑا ہوتا جس دکھ ہے آپ آج کل گزر رہی ہیں۔“

”محبت کی توہین کا دکھ، دھوکا کھا جانے کا دکھ، کھلونا بن جانے کا دکھ، بچھڑ۔۔۔ جانے کے دکھ سے کہیں بڑا ہوتا ہے بجو۔۔۔ بہت بڑا۔ میرا دکھ آپ سے بڑا ہے۔ مجھے انکل شچی نے بے وقوف بنایا ہے۔ مجھے۔۔۔“ اس کی آواز بھرا گئی اور آنسو ایک بار پھر اس کے رخساروں پر بہہ آئے۔ مریم نے اسے پھر بازوؤں میں لے لیا۔

”عاشی! پلیز اب اس شخص کا ذکر نہ کرنا۔ وہ شخص تمہارے قابل تھا ہی نہیں۔۔۔ خدا کا شکر کہ اس نے نہیں اس سے بچالیا۔“ مریم نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا ”اور اب ریلیکس ہو جاؤ۔ ماما تمہارے لیے پریشان نہیں۔“

”ماما میرے لیے۔۔۔“ عاشی نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پوچھتے ہوئے حیرت سے پوچھا اور پھر بولے مسکرا دی۔

”ماما ہم میں سے کسی کے لیے پریشان نہیں ہو سکتیں وہ صرف اپنے لیے پریشان ہو سکتی ہیں اور۔۔۔ اور غضنفر ملک کے لیے۔۔۔“

”تم ناحق ماما سے خفا ہو گئی ہو۔ وہ ہم سب سے بہت پیار کرتی ہیں۔“

”تم بھی تو ماما سے خفا رہتی تھیں نا۔“

”ہاں اور تمہیں پتا ہے۔ عاشی۔ ماما سے میرا پہلا جھگڑا بھی اسی شخص کی وجہ سے ہوا تھا۔ شرنیل مرزا کی جے۔ یہ ماما کو میرے خلاف درغلزاتے تھے۔“

”اور انکل شچی مجھ سے کہتے تھے تم اور ماما دونوں۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

صفونے اندر جھانکا۔ ”فون ہے جی۔ بڑی دیر سے نیل ہو رہی ہے۔“

”کس کا؟“ مریم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”نیو ببا کا مری سے۔“

”اوہ! چھا۔ ان کی تو چھٹیاں ہونے والی تھیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی پریشانی میں اسے تو خیال نہ تھا کہ ہاتھ اور ماما از حد مصروف تھیں۔

”وہ جی پانچ منٹ بعد کریں گے۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں آرہی ہوں۔“ اس نے مڑ کر عاشی کی طرف دیکھا۔

”عاشی تمہیں یاد ہے جو مورارینا کے اسکول سے خط آیا تھا۔ اس میں چھٹیوں کی کون سی تاریخ لکھی تھی؟“
”ہاں نہیں۔“

کے چہرے پر ڈالی اور پھر اسے عثمان احمد یاد آگئے۔ ماما کے آگے پیچھے پھرتے ان کی ہر بات کو ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے۔

ان کی زیادتیاں برداشت کرتے ہوئے

ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوشاں۔

اور ان کے لیے پریشان ہوتے ہوئے عثمان احمد۔

کاش۔ کاش وہ ہی میرے پاپا ہوتے، میرے اپنے پاپا۔

دل میں ایک درد کی لہری اٹھی جس نے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ خاموشی سے ان کے بیڈروم سے باہر نکل آئی۔ کچھ دیر ٹی وی لاؤنج میں کھڑی وہ کچھ سوچتی رہی۔

یوں ہی بے معنی اور فضول باتیں۔

کیا خبر وہ عثمان احمد کی ہی بیٹی ہو۔

اور کیا خبر ماما نے جھوٹ بولا ہو۔

اور نرگس آئی نے ان کا ساتھ دیا ہو۔

اور نرگس آئی تو یوں بھی ماما کا ساتھ دیتی ہیں۔ بیگم آفندی کے ساتھ مل کر ان کا مذاق اڑانے کے باوجود وہ ان کی گہری دوست تھیں..... ہر معاملے میں ان کی رازدار۔

اور اگر یہ سچ ہے تو وہ ضرور کسی دن آئی نرگس سے اپنے باپ کے متعلق پوچھے گی۔ یقیناً انہیں پتا ہوگا اور ایک بار..... ہاں! ایک بار وہ اس شخص کو دیکھے گی اور اس سے ملے گی جس نے مڑ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی اور عثمان احمد کس قدر عظیم شخص تھے جنہوں نے اس کو کبھی سوچا نہیں جانا تھا..... ہمیشہ اپنی سگی بیٹی جانا تھا اور کبھی کبھی تو وہ اس کے لیے ماما سے بھی الجھ پڑتے تھے۔

اور کون یقین کرے گا کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے۔

اور جب وہ اسپتال میں تھے تو بھی آخری دنوں میں کتنی بار انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اسے اٹائی اور نینا سے بڑھ کر چاہتے ہیں ”اور کیا یہ ممکن ہے کہ انہیں مجھ سے عاشر اور نینا سے زیادہ پیار ہو۔“

انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور پھر کوئی جواب نہ پا کر وہیں ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔

”اور یہ سچ ہے۔“ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا ”پاپا نے مجھے بے حد اور بے تحاشا چاہا ہے۔“ اس نے ہنس بھینس کر کہیں۔

”اور میں نے بھی پاپا کو..... آئی لو پو پاپا آئی لو پو۔“

اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کیں اور سر صوفے کی پشت سے ٹکائے ہوئے

”اور ماما تو بالکل بے نیاز ہو گئی ہیں یا تو گھر سے باہر رہتی ہیں اور گھر پر ہوں تو اپنے سرال والوں کو بھٹکتی رہتی ہیں اور پتا نہیں وہ کیسے برداشت کرتی ہیں انہیں۔ حالانکہ ماما کی طبیعت اور مزاج ایسا نہیں تھا کہ وہ ان جیسے لوگوں کو برداشت کرتیں لیکن شاید غصہ نرگس کی وجہ سے وہ مجبور تھیں اور عاشر ٹھیک کہتی ہے کہ ماما کو صرف اپنے آپ کا خیال ہے اور اپنے آپ سے محبت ہے۔ مورکس قدر ناراض ہو گا۔“

باہر گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔

”بجوا سلم چا چا کیوں نہیں آئے؟“ تیمور نے اس کی آواز سننے ہی کہا ”ہم صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔“

”میری جان۔ وہ سلم چا گھر پر نہیں تھے نا اس لیے لیٹ ہو گئے ہیں۔ ابھی جھپٹتی ہوں انہیں۔“

”ابھی بجو..... اب تو دیر ہو گئی ہے۔ اب تو وہ آدمی رات کو کہیں پہنچیں گے اور رات کو سر پیڑ جانے

نہیں دیں گے۔“

”رات کو سفر کریں گے نا تو صبح آپ کی طرف آ جائیں گے۔ رات کو راولپنڈی ٹھہر جائیں گے اور

انشاء اللہ صبح آٹھ نو بجے تمہارے پاس ہوں گے۔“

”بجوا کیا آپ کو اسکول سے چھٹیوں کا لیٹر نہیں ملا تھا؟“ وہ بے انتہا ذہین تھا۔

”نہیں لیٹر تو مل گیا تھا۔ کیوں؟“

”اچھا میں سمجھا تھا شاید آپ کو پتا ہی نہیں کہ چھٹیاں ہو رہی ہیں۔“

”کیا سب لوگ چلے گئے ہیں؟“

”نہیں تو ابھی تقریباً آدھے بچے گئے ہیں۔ کل تک سب چلے جائیں گے اور پتا ہے آج رات مدر جو اس کرکس ٹری سجاائیں گی۔ میرا ایک دوست کہہ رہا تھا۔ بہت مزہ آئے گا۔“ وہ بتانے لگا۔

تیمور سے بات کر کے وہ نینب کے بیڈروم کی طرف آئی اور ہولے سے دستک دی۔

”کم آن۔“ ماما ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تیار ہو رہی تھیں انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا ”کیا بات ہے مومو؟“

”ماما وہ آج مور اور نینا کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ کیا آپ نے چاچا سلم کو بھیجا نہیں۔ تیمور کا فون آیا

تھا۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“

”غزنی، میں نے تم سے کہا تھا کہ سلم کو مری بھیجتا ہے.....“ برش رکھ کر انہوں نے غزنی کو دیکھا۔

”مجھے خیال نہیں رہا۔“

”تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا غزنی۔ مورکس قدر SENSITIVE ہے، میں نے تمہیں بتایا تھا۔“

ذرا اسی بات کو محسوس کرتا ہے۔“

”بچے تمہاری ذمہ داری ہیں ڈیر، تمہیں خود خیال ہونا چاہیے۔“ از حد بے نیاز انا انداز تھا۔

”اوکے مومو، تم جاؤ۔ میں ابھی سلم سے کہہ دیتی ہوں۔ وہ چلا جائے گا۔“ مریم نے ایک نظر نینب

آنکھیں موند لیں اور شہریار کا تصور بند آنکھوں میں جھلملانے لگا۔

”پتا نہیں کیسی طبیعت ہوگی اب اس کی۔ اس نے تو دوبارہ یعنی سے پوچھا بھی نہیں تھا کہ وہ کیا ہے اب اسپتال سے اپنے پارٹمنٹ میں آنے کے متعلق تو یعنی نے اسے بتایا تھا لیکن اس کی طبیعت کسی تھی یہ اس نے نہیں پوچھا تھا۔ حالانکہ کئی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ عینی کو فون کر کے پتا کرے لیکن زندگی میں جیسے ایک دم بہت سے الجھاؤ پیدا ہو گئے تھے۔ گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھی ایک ہی بات سوچتی رہتی تھی حالانکہ اب اسے یونیورسٹی بھی نہیں جانا ہوتا تھا لیکن پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے دن ایک دم بہت جلدی گزر گیا اور وہ بہت سارے ضروری کام جو اس دن کرنے تھے سب رہ گئے۔ مثلاً میڈم نرس کو فون کرنا، ماما سے اپنے باپ کے متعلق پوچھنا، ڈاکٹر عبدالمعید کے گھر جانا، شہریار کا پتا کرنا۔

لیکن زندگی ایسا ریٹم کا ڈھیر بن گئی تھی جس کے اندر ہر گزرتے دن کے ساتھ الجھاؤ بڑھتے جا رہے تھے۔ بظاہر تو اک ذرا سا بھی الجھاؤ نہ تھا لیکن اندر الجھاؤ ہی الجھاؤ تھے اور وہ جتنا اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتی تھی اتنا ہی زیادہ وہ الجھتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ سب الجھاؤ خود ساختہ تھے یا سچ ہی اس کی زندگی الجھ گئی تھی۔

اور اگر زندگی کے سفر میں شہریار اس کے ساتھ ہوتا تو شاید وہ اپنی مشاق اگلیوں سے یہ سارے الجھاؤ ختم کر دیتا۔ دل کی گہرائیوں میں یہ خواہش ابھر کر ڈوب گئی۔

کچھ لوگ زندگی کے سفر میں بہت مختصر عرصے کے لیے ملتے ہیں۔ شاید لیکن ہمیشہ کے لیے ان کی یادوں میں ایک کسک بن کر انکی رہتی ہے۔ اور عاشی کہتی ہے کہ بے وفائی کا دکھ پچھڑ جانے کے دکھ سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ۔

لیکن پچھڑنے کا دکھ بھی کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا جس میں رہ رہ کر درد اٹھتا اور پورے وجود پر چھا جاتا۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ شہریار کے ماموں نے خود ہی منع کر دیا ورنہ اگر ماما انکار کر دیتیں تو کتنی شرمندگی ہوتی مجھے شہریار سے۔ عاشی شاید ٹھیک کہہ رہی ہے کہ ماما بھی بھی شہریار کا پرو پوزل قبول نہ کرتیں۔

”مور کیا کہہ رہا تھا؟“ عاشی نے اس کے قریب آ کر پوچھا تو اس نے چپکے سے کہا۔

”ان کی چھٹیاں ہو گئی ہیں اور وہ اسلم چاچا کا انتظار کر رہا تھا۔“

”تو کیا چاچا اسے لینے نہیں گئے؟“ عاشی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور کارنر میبل سے ریموٹ اٹھایا۔

”نہیں ماما کو یاد نہیں رہا۔“

”ماما کو اب کچھ یاد نہیں رہتا سوائے غفنفر ملک کے۔“ عاشی کے لہجے میں تلخی تھی۔

”اسلم چاچا کو ماما بھی بھیج رہی ہیں۔ کل وہ لے کر آ جائے گا۔“ مریم نے نرمی سے کہا۔ اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اچھی لگ رہی ہو۔“

بیک بائیں پر میروں لانگ شرٹ پہنے ہوئے اور گلے میں میروں اسکارف لٹکائے وہ کچھ فریش تو لگ رہی تھی لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک ملال تھا جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے احاطے میں لے رکھا تھا۔ اس نے تیار ہو کر آنکھوں میں کا جل بھی لگایا تھا لیکن پھر بھی آنکھیں سو جی سو جی اور سرخ لگ رہی تھیں۔ بہر حال اتنے دنوں بعد اس نے کپڑے چھینج کیے تھے اور اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی اور یہ ایک ثبت رد عمل تھا۔ یقیناً وقت کے ساتھ ساتھ وہ سنبھل جائے گی وقت سب سے بڑا سیما ہے۔ اور شاید وہ خود بھی وقت کے ساتھ شہریار کو بھلا سکے۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور عاشی کی طرف دیکھا۔

”کیا پروگرام ہے کہیں باہر چلیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کوئی خاص موڈ نہیں ہے۔ ماما کہاں ہیں گھر پر یا۔۔۔۔۔؟“

”فی الحال تو گھر پر ہیں لیکن شاید کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔“

”اور وہ غفنفر ملک صاحب۔“

”وہ بھی گھر پر ہی ہیں۔“ مریم نے بغور اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے کیا ماما سے کچھ کہنا ہے؟“

”ہاں ایک کام تھا ماما سے۔“

”تو ماما اپنے بیڈروم میں ہی ہیں۔ چلی جاؤ۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی نہیں پھر سہی۔“

”کیا کام تھا؟“ مریم نے پوچھا۔

”یوں ہی کوئی خاص نہیں۔“ عاشی کے انداز میں بے پروائی تھی اور وہ مریم کی بات کا جواب دے کر لڑائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

زلی ڈی پر بہت اچھا اسٹیج شو چل رہا تھا۔ مریم کی توجہ بھی ادھر ہی ہو گئی تھی اور وہ اتنے دھیان سے ٹی نہ کر رہی تھی کہ انہیں ڈاکٹر عبدالمعید کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔

”نیلو ایوری باڈی۔“ عاشی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے محبت سے کہا۔

”ارے آپ معید بھائی۔“ مریم کو انہیں یوں اچانک دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔

”جی ہم۔“ وہ بیٹھے ہوئے بولے ”آپ لوگوں نے مرکز خبر ہی نہیں لی۔ ڈیڈی آپ دونوں کو بہت یاد کر رہے تھے۔“

”انگل کیسے ہیں اب؟“

”بہت بہتر۔“

”گھر وغیرہ سیٹ ہو گیا؟“ مریم نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ حالانکہ گھر کی سیٹنگ میں کسی نہ کسی خاتون کے مشورے کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم کچھ نہ کچھ کام چل ہی گیا ہے۔“ انہوں نے ہلکا سا گلہ کیا۔

”سوری معید بھائی۔“ مریم شرمندہ ہو گئی ”میں ہر روز پروگرام بناتی تھی کہ آج ضرور چلوں گی آپ کی طرف۔“

”اوکے“ کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر عبد المعید مسکرائے ”میں نے سوچا یوں تو شاید آپ کو فرصت نہ ملے۔ کیوں نہ باقاعدہ انوائٹ کر لیا جائے کل رات نئے گھر میں منتقل ہونے کی خوشی میں ایک چھوٹا سا زور آپ لوگ ہمارے ساتھ کریں۔“

”ارے ڈاکٹر معید“ کیسے ہیں آپ اور کب آئے؟“ نرنب نے اپنے بیڈروم سے باہر کاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر عبد المعید احترازا کھڑے ہو گئے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ مسز عثمان۔“ کہتے کہتے وہ ایک لخت خاموش ہو گئے اور محض طلب نظروں سے پہلے انہوں نے انہیں پھر ان کے پیچھے کھڑے غفنفر ملک کو دیکھا ”دراصل ڈیڈی نے نئے گھر کی خوشی میں کچھ گید رنگ کا پروگرام بنایا ہے اس لیے آیا تھا۔“ انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے انہیں کل آنے پر اصرار کیا۔

”جھینکس مسز۔۔۔۔۔ ملک۔“ انہوں نے بات مکمل کرنے میں ذرا سا وقفہ لیا۔

”اوکے۔ ڈاکٹر۔ تم گپ لگاؤ عاشری اور مومو کے ساتھ اور ہمیں اجازت دو کہ آج ہمیں ایک پارٹی میں جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں آپ جائیں میں بھی اب چلوں گا۔ مجھے ایک دو جگہ ضروری کام سے جانا تھا۔“ انہوں نے باری باری غفنفر ملک اور نرنب کی طرف دیکھا۔ غفنفر ملک نخوت سے سر اٹھائے بے نیاز سا کھڑا تھا اور اس دوران نہ تو اس نے ڈاکٹر عبد المعید کی طرف دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے کوئی بات کی تھی۔ تھری پیس سوٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی اور رے ٹین کے سن گلاسز کے ساتھ وہ بہت فحش رہا تھا اور کمر اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کا بچپن اور لڑکپن کیسا گزرا ہوگا۔۔۔۔۔ مریم نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

”اوکے۔“ اس نے گلاسز اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے پہلی بار ڈاکٹر عبد المعید کی طرف دیکھا اور انتہائی بے دلی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر عبد المعید نے مسکرا کر ہاتھ ملایا۔

”اللہ حافظ۔“ اور پھر مریم اور عاشری کی طرف متوجہ ہو گئے ”کل آپ لوگ کس وقت آئیں گے۔ اگر جلدی آجائیں تو مجھے ذرا تسلی رہے گی۔“

”ضرور معید بھائی“ آپ بیٹھیں نا۔“ مریم نے ان کی طرف دیکھا ”ہم انشاء اللہ صبح ہی آجائیں گے۔ نہیں بلکہ تیرا اور نینا کے آنے کے بعد آئیں گے۔“

”اوہ تو کیا وہ کل آرہے ہیں؟“ ڈاکٹر عبد المعید نے پوچھا۔

”جی ان کی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔“ مریم نے بتایا۔

”عاشری“ کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟“ ڈاکٹر عبد المعید نے خاموش بیٹھی عاشری کی طرف دیکھا۔ جو اس دوران سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس نے کسی طرف نہیں دیکھا تھا۔ نہ ماما کی طرف اور نہ ڈاکٹر عبد المعید کی طرف۔

”نہیں تو۔“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”پھر اس قدر چپ چپ سی کیوں ہیں؟“ ان کی پرشوق نظریں اس کے چہرے پر لگی تھیں۔

”یوں ہی۔“ ان کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔۔۔۔۔ حسن و مصویت اور طلال نے مل کر اس کے چہرے کو عجیب سی دلکشی بخش دی تھی۔ ڈاکٹر عبد المعید کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری گئی تھیں اور وہ بے اختیار اسے دیکھنے جا رہے تھے۔

”دراصل عاشری کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کئی دنوں سے۔“ مریم نے وضاحت کی تو انہوں نے ہنک کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور بے چینی سے پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا انہیں؟“

”یوں ہی۔ معمولی سا ٹھہر چکا تھا“ غلو وغیرہ۔“ مریم نے بات بنائی۔

”مجھے بلوایا ہوتا۔“

”اتنی سی بات کے لیے۔“ مریم مسکرائی۔

”ہاں ڈاکٹر اپنا ہوتا تو اتنی سی بات کے لیے بھی بلوایا جاسکتا ہے۔ کیوں عاشری؟“ ان کے لہجے میں ہلکا سا ٹی کارنگ تھا۔

”جی۔“

”جب آپ ایگزی کرتی ہیں اس سے تو پھر بلوایا کیوں نہیں۔ لائیے نبض دیکھیں آپ۔“ انہوں نے خود ہی اس کی کلائی تھام لی ”نمبر پچر تو اب بھی ہے۔ ہنڈرڈ ہوگا۔“ انہوں نے کلائی سے تھامے مریم کی طرف دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی۔

”تو پھر؟“

”میں میڈیسن دیے دیتا ہوں۔ میری گاڑی میں میڈیسن باکس ہے۔ ذرا شریف کو لے آئے۔“

”شریف۔“ مریم نے شریف کو بلا کر میڈیسن باکس لانے کے لیے کہا اور پھر ڈاکٹر عبدالمعید سے پوچھا ”یہ بخاریوں ہو گیا ہے؟“

”موسم کی تبدیلی کا اثر ہے اور پھر دیکھیں اتنی خشکی میں خاتون بغیر کسی گرم کپڑے کے ہیں۔ نہ کوئی سویٹر نہ کوٹ۔ ٹھنڈ لگ گئی ہوگی۔“

”یہ شرٹ اوئی ہے۔“ عاشری کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی ”کوئی ٹھنڈ نہیں لگی ہے صرف محکم سے معمولی حرارت ہو گئی ہے۔“

”کیوں کیا آپ مل جوتی رہی ہیں۔“ ڈاکٹر عبدالمعید مسکرا رہے تھے۔

”اور یہ دکھ جو اس نے سہا تھا کیا کم کڑی مشقت تھی۔ اتنا بڑا بوجھ آپڑا تھا اس کے دل پر۔ انگلی ایک دھوکے باز اور فریبی شخص تھے اور اس کے علاوہ نہ جانے وہ کتنی لڑکیوں کے ساتھ محبت کا مکمل کمال رہے تھے اور کس قدر سچا جانا تھا انہیں..... اور کتنا مہربان اور شفیق سمجھتی تھی وہ انہیں اور کتنا بدظن کر دیتا تھا انہوں نے اسے ماما اور مریم دونوں سے اور پھر ڈاکٹر عبدالمعید سے بھی۔ حالانکہ یہ شخص کتنا سادہ سچا اور بے ریا ہے۔ بھلا ماما اور ڈاکٹر عبدالمعید.....“

”ریش گھٹیا..... غریبی۔“ اس نے دل ہی دل میں شرجیل مرزا کو مخاطب کیا۔

”لیجئے محترمہ یہ میڈیسن۔“ شریف سے میڈیسن لے کر اسے دیتے ہوئے انہوں نے اسے حبیہ کی ”اور صبح تک یہ ٹیبلٹ چرانا چاہیے۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ورنہ۔“ انہوں نے سر کھایا ”ورنہ ڈزینٹریل کرنا پڑے گا۔“

”بے فکر رہیں ڈزینٹریل نہیں کرنا پڑے گا۔“

”گڈ۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائے اور جانے کی اجازت طلب کی۔

مریم انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

”کیا عاشری کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟“

”نہیں۔“ وہ مسکرائے ”مریم آپ یوں ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ بہت معمولی ٹیبلٹ ہو گا۔ آپ چیک کر لیتا۔ ایک ڈوز سے ہی انشاء اللہ اتر جائے گا۔ ویسے عاشری کچھ اپ سیٹ لگ رہی تھی۔“

”اما سے کوئی بات ہوئی ہے؟“

”ہاں..... نہیں تو وہ دراصل غنغفر ملک..... آئی مین وہ ان کی فیملی کی وجہ سے اپ سیٹ رہتی ہے۔“

”جوان کی بہنیں ہیں نا ان سے نہیں بنتی اس کی۔“

”صحیح۔ وہ کچھ عجیب و غریب سی ہیں۔ خیر کچھ کرتے ہیں بندوبست اس کا بھی۔“ کسی خیال سے ان

کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

مریم انہیں خدا حافظ کہہ کر آئی تو عاشری ابھی تک لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔

”عاشری تم جا کر لیٹ جاؤ۔ معید بھائی کہہ رہے تھے کہ آرام کرنے سے ٹیبلٹ اتر جائے گا اور میڈیسن لے لیں تم نے۔“

”جی لیکن میرا جی نہیں چاہ رہا۔ آپ نے کہا تھا کہ باہر چلتے ہیں۔ تو چلیں..... یعنی کے گھر چلتے ہیں۔“

یعنی کے بابا اور ماں جی بہت اچھے لگتے ہیں۔ کتنے شفیق اور مہربان سے ہیں۔ ہیں نا۔“

”ہاں بہت مہربان اور شفیق۔“ مریم نے سوچا اس روز مریم کے کہنے پر وہ آئے تھے۔

”بھئی کہاں ہے ہماری بیٹی؟“ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا تھا۔

تب مریم نے انہیں بتایا تھا کہ ”ابھی وہ اس سے کوئی بات نہ کریں کیوں کہ وہ بہت اپ سیٹ ہے اور“

یہ کہ عادل بھائی نے اسے سمجھایا ہے اور شرجیل مرزا کو منع کر دیا ہے۔“

”پھر بھی ہماری بیٹی کو بلاؤ تو سہی ہم یوں ہی باتیں کریں گے۔“

اور پھر وہ یوں ہی بہت دیر تک وہ عاشری سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے اور عاشری جو بڑی بے

دلی سے اپنے کمرے سے نکلتی دیکھتی تھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”نہیں گڑیا..... اس وقت تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر یوں بھی بہت دیر ہو گئی ہے پھر

چلیں گے کسی دن سب..... مورینا اور تم۔ کل تو انکل ہادی کی طرف جائیں گے نا؟“ مریم نے بہت پیار

سے اس سے کہا۔

”اچھا۔“ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور مریم نے ٹی وی آن کر لیا۔



”مریم بی بی کوئی امان صاحب آئے ہیں۔“ چوکیدار نے آکر بتایا تو مریم نے اخبار سے

نظر رکھنا کراس کی طرف دیکھا۔ وہ لان میں دھوپ میں کرسی بچھائے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ جنوری کی

اس خشک صبح میں اسے دھوپ سینکنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”کوئی خاتون بھی ہیں ساتھ برقع اوڑھا ہوا ہے اور بچے بھی ہیں۔“

”تم نے پوچھا نہیں کون ہیں کس سے ملتا ہے؟“

”کہہ رہے تھے اپنے بھائی کا گھر ہے اس سے ملے آیا ہوں۔“

”بھائی کا گھر۔“ مریم نے الجھ کر اسے دیکھا۔ تب ہی گیٹ میں سے ٹین کا صندوق دھکیلتے ہوئے کوئی

فٹس اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے کالا ریشمی برقع پہنے ایک عورت اور تین بچے بھی اندر چلے آئے۔

”ارے ارے کدھر آتا ہے۔“ چوکیدار پلٹ کر اسے روکنے لگا۔

ہوئی تھی۔ عاشی بھی بہت حد تک سنبھل گئی تھی اور نینا اور تینو کے ساتھ مصروف رہتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالعزیز نے ہاں ڈنر میں بھی وہ بہت خوش دلی سے شریک ہوئی تھی اور بہت دیر تک انکل ہاشم کے پاس بیٹھ کر اس نے کپ لگائی تھی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتے پھرتے سارا انتظام دیکھتی رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر عبدالعزیز کو سراہا بھی تھا کہ انہوں نے بہت خوب صورتی سے گھر ڈیکوریٹ کیا ہے لیکن مریم کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کی بے ساختہ ہنسی، آنکھوں کی وہ قدرتی چمک کہیں کھو گئی ہے۔ کاش شرنیل مرزا اس کی زندگی میں نہ آتا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کے ساتھ کھڑی ان سے ڈرائنگ روم کی ڈیکوریشن پر ڈسکس کرتی وہ اسے بہت خوب صورت لگی۔ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے بہت اچھے لگ رہے تھے اور عین اسی وقت ڈاکٹر عبدالعزیز نے اس کی طرف دیکھا اور پھر عاشی کی طرف اور ہولے سے مسکرا دیے اور ایک قدم آگے بڑھ کر مریم سے پوچھا۔

”مریم کیا سوچ رہی تھیں؟“

”میں۔۔۔ مریم کے ہونٹ کھل اٹھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“

”خدا کرے ہم ہمیشہ یوں ہی ساتھ ساتھ کھڑے رہیں۔“ ڈاکٹر عبدالعزیز نے زیر لب کہا۔

”کیا ماما سے انکل کی فائنل بات ہو گئی ہے؟“

”ہاں لیکن ابھی مسز نینب نے حسی جواب نہیں دیا۔ کہہ رہی تھیں کہ عاشی کچھ ڈسٹرب ہے۔ کیا عاشی نے ابھی تک مسز نینب کی شادی کو ایکسپٹ نہیں کیا؟“

”ہاں نہیں تو ایسے ہی وہ کچھ ڈسٹرب تھی۔“ مریم نے عاشی کی طرف دیکھا جو ایک پینٹنگ کو بڑی تنیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں وہ اب بھی اندر سے ڈسٹرب ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے۔“

”کسی بھی واقعے کا اثر زائل ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ مریم کوئی اور بات بھی ہے کیا؟“ ڈاکٹر عبدالعزیز نے بغور اسے دیکھا۔

”نہیں تو اور کیا بات ہوتی ہے۔ آپ کو بتایا تھا وہ غضنفر ملک کے عزیزوں کے آجانے سے ہی ڈسٹرب ہے۔“

”آپ اسے سمجھائیں تاکہ زندگی میں بہت سے مقامات پر آدمی کو کھپڑا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے تو وہی سن چاہیے اگلا اور شوخی عاشی۔ سنجیدگی اس کی ذات پر کبھی سوٹ نہیں کرتی۔“

”ہر بات میں وقت لگتا ہے معید بھائی۔“

عاشی ہولے ہولے جلتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ ”یہ پینٹنگ کس کی ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔“

”چل چل پیچھے ہٹ۔“ اس نے چونک کر ارکو ہلکا سا دھکا دیا۔ ”مجھے روکتا ہے۔ مجھے فضا ہی کا بھائی ہوں میں بھائی بڑا ہیرو بننا چھوڑتا ہے۔“

”اوہ۔“ مریم نے ایک طویل سانس لی ”خان بابا، مت روکو انہیں۔ اوپر جانے دو۔“

”بھائی۔ ارے میرا بیٹا۔“ اوپر سے جیج سنائی دی۔

مریم نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

ماں بیٹیاں تینوں نیچے جھانک رہی تھیں۔ ہر وقت جیسے نیچے گیلری میں دھری رہتی تھیں۔

”اماں۔“ صندوق نیچے رکھ کر ان صاحب نے یوں ہاتھ پھیلائے جیسے کوئی فلم سین ہو رہا ہو۔ مریم نے ناگواری سے رخ موڑ کر اخبار اٹھا لیا۔

تھوڑی دیر میں ہی تینوں لان میں پہنچ گئی تھیں اور پھر سب گلے ملنے لگے تھے جیسے برسوں سے پھٹے ہوئے ہوں۔

کافی دیر تک ہنگامہ رہا۔ پھر غضنفر ملک کی والدہ نے حکم دیا۔ ”ارے خان یہ سامان اٹھا کر اوپر لے چل۔“

”ارے اماں، تجھے کیسے خیال آگیا ماں بہنوں کا۔ اس کم بخت نے کیسے آنے کی اجازت دے دی۔“ انہوں نے بظاہر سرگوشی کی تھی لیکن ان کی آواز مریم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ ”چھوٹی منمنائی تمہاری محبت میں نہیں آئے ہیں۔ کیوں بھائی۔“

”چل چپ۔“ بھائی نے اسے ڈانٹ دیا۔

”یہ کون ہے؟“ ان کی نظریں مریم کی پشت پر تھیں۔ ”یہ بڑی کچی کچی کر کے ہنسنے لگی۔“

”یہ بھائی کی بڑی بیٹی ہے مریم۔۔۔۔۔“

”چل بک بک نہ کر۔“

”قسم سے اماں سے پوچھ لو۔ کیوں اماں۔“

”چل چل اوپر چل کر ساری ایشوری سناتی ہوں۔“ وہ کیے بعد دیگرے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

”جھینک گاؤ۔“ مریم نے سکون کا سانس لیا۔ یہ کس طرح کے لوگ ہیں اور ماما خوش ہیں محض غضنفر ملک کی رفاقت سے۔ اسے کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی تھی کہ ماما کیسے ان سب کو برداشت کر رہی ہیں۔

کا حراج اس طرح کا نہیں تھا کہ وہ یہ سب برداشت کر تیں لیکن شاید غضنفر ملک کی خاطر۔

اس نے پھر سے اخبار پر نظریں جمائیں مگر دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ یوں بھی تقریباً وہ سارا اخبار اشتہارات کے پڑھ چکی تھی۔ اندر خاموشی تھی اگرچہ گیارہ بجنے والے تھے لیکن سب سو رہے تھے۔ اماں نے نیوایرنٹ پارٹی اٹینڈ کر کے بہت دیر سے آئی تھیں۔ نینا مور اور عاشی تینوں دیر تک ڈش پر غواہی پر دو گرام دیکھتے رہے تھے۔ سب ہی سو رہے تھے۔ نینا اور مور کی چھٹیوں پر گھر میں آنے سے عادی روٹا

”معلوم نہیں میں نے لندن سے خریدی تھی۔ کسی غیر معروف مصور کی ہے۔“ ڈاکٹر عبدالرحمن مرکز اسے دیکھنے لگے۔

”مجھے مصوری سے بہت دلچسپی ہے۔“

”رنگیں۔“ ڈاکٹر عبدالحمید کو اذ حد خوشی ہوئی ”میرے پاس بہت اچھی پینٹنگز ہیں۔ میں ہمیشہ تصاویر خریدتا رہتا ہوں۔ جب بھی کوئی ایگزیشن ہوتی ہے ایک دو پینٹنگز میں ضرور خرید لیتا ہوں۔ تم دیکھو عاشی؟“

”ضرور۔“

”ابھی یا پھر کبھی؟“

”ابھی دکھا دیں پھر کا کیا بھروسہ۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اوکے۔ آؤ۔“ انہوں نے کلائی الٹ کر ٹائم دیکھا۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں بہت دیر تھا اور سب انتظام مکمل ہو چکے تھا۔

نینا اور مصور لاؤنج میں بیٹھے کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔ مریم ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”تم جاؤ عاشی، تصاویر دیکھ آؤ۔“ مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔“

”مومنو کیا ماما بھی ادھر آئیں گی۔“ تیمور نے وی دیکھتے دیکھتے پوچھا۔

”ہاں انہوں نے کہا تو تھا کہ وہ بھی آئیں گی۔“

”اور ان کے ساتھ وہ بھی آئیں گی نیلی بیلی۔“ نینا کا اشارہ غضنفر ملک کی بہنوں کی طرف تھا۔

”اور ڈیو بنو بھی۔“ تیمور مسکرایا۔

”یہ ڈیو بنو کون ہیں نمی؟“

”کیوٹر اور کیوٹری۔“ وہ پھر ہنسا۔

”اوہ صحیح طرح سے بتاؤ زندگی۔“

”ان کے اماں ابا اور کون۔“ نینا نے وضاحت کی اور کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

”یہ نام تم نے رکھے ہیں شریر۔“ مریم نے ہولے سے ان کے کان کیے۔

”نہیں تو۔“ اس کی چھوٹی چھوٹی بے تحاشا چٹکی آنکھوں سے ہنسی پھوٹ رہی تھی۔

”وہ..... وہ جوان کے ابا ہیں نا، اپنی بیگم کو میری کیوٹری کہتے ہیں تو پھر وہ خود کیوٹر ہوئے نا۔“

”چلو ٹھیک لیکن یہ ڈیو بنو.....“

”یہ نام تو نینا نے رکھے تھے کیونکہ ابا ہر وقت ایک ڈبا کھولے بیٹھے رہتے ہیں اور اماں ہر وقت اپنا ہاتھ دھو بیٹھتی رہتی ہیں۔“

”اچھا بہت شریر ہو گئے ہوتم دونوں۔“

”مومنو کیا یہ لوگ ہمیشہ ادھر ہی رہیں گے ہمارے گھر میں۔“ تیمور ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں نہیں۔“

”آخر ماما نے شادی کیوں کی ہے بچو۔“ نینا نے پہلی بار بے زاری کا اظہار کیا۔

اور اس سوال کا جواب تو خود مریم کے پاس نہیں تھا سوان کا دھیان بنانے کے لیے اس نے ان کی توجہ

اپنی طرف کر دوائی۔

”ادھر دیکھوٹی۔ وی پر کتنا اچھا لگا نا آ رہا ہے۔“

نینا اور مورٹی وی دیکھنے لگے تو وہ اٹھ کر انکل ہاشم کے کمرے میں چلی گئی۔

رات ڈنر میں کافی لوگ آئے تھے۔ زیادہ تر کاتعلق میڈیکل ہی سے تھا۔ انکل ہادی کے کو لیگ

بہت احباب وغیرہ۔ پروفیسر عادل بھی تھے اور ڈاکٹر رافع بھی..... اور رافع اسپتال کی وہ ڈاکٹر بھی

نہیں نے شہر یار کو اور اسے ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر شہر یار کو اس کی چوٹس پر ہنسا ہوا تھا۔ وہ مریم کو دیکھ کر اس

کے پاس چلی آئی تھیں۔

”تم مریم ہونا مجھے پہچانتا؟“

”جی۔“

”تمہاری منگنی وغیرہ ہوئی۔“ انہوں نے تجسس لگا ہوں سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

”نہیں تو۔“ مریم کو ان کے سوال پر حیرت ہوئی۔

”کس قدر راجح ہے یہ شہر یار بھی یوں ہی چلا گیا کوئی مضبوط بندھن باندھے بغیر۔ اتنی بیماری سی تو

..... بھلا اتنی بیماری چیز کو بھی کوئی یوں ہی چھوڑ کر جاتا ہے۔“ انہوں نے بے لاگ تبصرہ کیا تو وہ ریڈ

”تم بہت بیماری ہو مریم اور دیکھو شادی وغیرہ کرنے میں جلدی مت کرنا..... وہ بے وقوف لڑکا تمہیں

بھانپتا ہے لیکن مجھے پتا ہے اس نے تمہیں یہ بات نہیں بتائی ہوگی۔ اس سے مجھے یہی توقع ہے۔“

مریم کو وہ پر غلوس سی ڈاکٹر جو بے حد ہلوتی تھیں بہت اچھی لگیں۔

مرکز صحت بہت لیت آئی تھیں ان کے ساتھ میڈم زمرس بھی تھیں اور کمال یہ تھا کہ غضنفر ملک ان کے

ساتھ تھا۔

”وراصل غزنی کی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی اس لیے انہوں نے معذرت کی ہے۔“ انہوں نے ڈاکٹر

الحمید اور انکل ہادی کو بتایا اور پھر خود میڈم زمرس کے ساتھ ایک طرف بڑھ گئیں جہاں ان کے کچھ فین

تھیں انہیں گھیر لیا۔ اسے ماما کا کیلا آنا بہت اچھا لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں غضنفر ملک کے ساتھ انہیں

انکل یو بوجھ سا بڑھ جاتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ عاشی بھی ریڈیکس لگ رہی تھی۔ ماما ہمیشہ کی طرح

”آئی تو ہے“ نہیں کہیں ہوگی..... اور ٹھیک ہے۔“

”وہ شریل مرزا پھر تو نہیں آیا۔“

”نہیں۔“

”اس کا کوئی فون۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں..... میری موجودگی میں تو نہیں لیکن عاشی نے بتایا ہے کہ دو تین بار آیا مگر عاشی نے بات

”کی۔“

”کڑ۔“ وہ اطمینان سے مسکرائے۔

”اور عاشی تو ضرور خفا ہوگی مجھ سے۔“

”نہیں، میرے خیال میں نہیں۔“

”کیا اب آپ مطمئن ہیں؟“ ان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”میں اوکے۔“ مریم نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

باؤڈر سٹ میں ملبوس وہ اس کی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھے بہت دھیان سے اسے دیکھ رہے تھے

ان کی آنکھوں میں ہزاروں رنگ تھے۔

”یرنگ.....“ لمحہ بھر کے لیے شہر یار کا تصور اس کی آنکھوں میں جھلک لایا۔ کبھی کبھی وہ بھی یونہی دیکھتا

تھا۔

”آنکھوں میں ہزاروں رنگ لیے۔“

اور وہ پیش ہو جاتی تھی۔

لیکن آج پروفیسر عادل کی نظروں کی تپش سے وہ پرل سی ہو گئی۔ گھبرا کر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”ماہیانا اور مورسب کیسے ہیں؟“

”اب اچھے ہیں ادھر ہی ہیں۔ آپ ملے نہیں ان سے؟“ اس نے پھر نظریں اٹھائیں..... پروفیسر

کی نظریں اب بھی اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہی شوق و وارفتگی لیے..... اس کی

لہجہ جگمگ گئی وہ آواز گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔

”مریم۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ ”مریم آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں بہت دلکش یہ رنگ

بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ انہوں نے ایک دم کرسی کے ہتھے سے ہاتھ ہٹایا اور مڑ گئے..... مریم

نے ہنسی منہ کی انہیں سامنے والی نشستوں کی طرف دیکھتی رہی۔

یہ عادل بھائی نے اس طرح کیوں کہا بھلا۔“ ان کی گھمبیر آواز دیر تک اس کے

سامنے گونجتی رہی ”مریم آج آپ اچھی لگ رہی ہیں۔“ وہ کچھ پریشان اور حیران سی وہیں بیٹھی سوچتی

بہت خوب صورت اور گرئس فل لگ رہی تھیں۔ انہوں نے کافی کلر کا سادہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی

لپ اسٹک اور میچنگ میک اپ نفیس کڑھائی والی گرم شال کندھوں پر ڈالے وہ کوئی ملکہ لگ رہی تھیں۔

میڈم ٹرگس حسب معمول گہرے میک اپ میں تھیں اور ہونٹوں پر ان کی وہی مخصوص لپ اسٹک

تھی، تیز سرخ رنگ کی۔ حالانکہ وہ میک اپ نہ کریں تو اس سے کہیں زیادہ حسین لگیں جتنی اب لگتی ہیں۔

بار کی طرح اس نے آج بھی سوچا۔ لائٹ بیلوکلر کی ستاروں والی ساڑی میں وہ دک رہی تھیں۔

”آئی لالہ کا کوئی فون وغیرہ آیا ہے؟“ وہ بہت دنوں سے پوچھتا چاہ رہی تھی آج اچانک اسے خبر

آ گیا۔

”نہیں۔ بے وفا خون ہے اس کا اور اس کا باپ کہتا ہے کہ وہ میرے پاس ہے۔ اس کے پاس

چلی آئی ہے.....“ (انہوں نے گالی دی.....) جھوٹ بولتا ہے۔ ایک بار وہ ذرا سا اشارہ کر دے کہ

میرے پاس آنا چاہتی ہے تو میں اس کی حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں لیکن وہ خود ہی آنا نہیں چاہ

پھر میں کس لیے لڑوں۔ کس لیے کیس کروں جاؤ۔“ وہ اداس ہو گئیں ”میں اس سے بہت یاد رکھا

ہوں لیکن اسے پتا نہیں ہے..... اور وہ اعزاز وہ بے چارہ تو پاگل ہو رہا ہے اس کے لیے..... دن میں

چکر لگاتا ہے۔ دس بار فون کرتا ہے کہ لالہ آئی یا نہیں؟ بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔ میرا ہی دماغ بگاڑ

تھا۔“ وہ اسے تفصیل بتاتی رہیں۔ کئی بار ان کی آواز بھرائی اور کئی بار انہوں نے ہاتھ میں پکڑے

رومال سے آنکھیں صاف کیں۔

اور مریم بہت دیر تک سوچتی رہی کہ کیا لالہ واقعی اپنی مٹی سے اتنی ہی ناراض ہو گئی ہے کہ اتنا

گزرنے کے بعد بھی اسے ان کی یاد نہیں آئی اور اس نے ایک بار بھی مڑ کر فون نہیں کیا۔

اور لالہ واقعی عجیب لڑکی تھی۔ جودل میں آتا نتائج کی پروا کیے بغیر گزرتی تھی۔ وہ کچھ اسی تھی

بہت ضدی لڑکی تھی..... اور اگر عینی کے چاچے کو کوئی اعتراض نہ ہوتا اور ماما انکار کر دیتیں تو کیا وہ لالہ

کر سکتی تھی..... شاید نہیں۔ وہ تو ماما کو یہ بھی نہ بتا پاتی کہ یہ اس کی اپنی خواہش بھی ہے۔

”یار زبئی یہ تمہارے سرسرا لیے کیا ہمیشہ یہاں ہی قیام کریں گے؟“ میڈم ٹرگس نے بک کی طرف

ہو گئیں تو وہ اٹھ کر پچھلی نشستوں پر آ بیٹھی۔ تب ہی پروفیسر عادل اس کی طرف چلے آئے۔

”کیسی ہیں مریم آپ؟“

”فائن۔“ وہ مسکرائی ”آپ کیسے ہیں؟“

”آپ کو کیا لگ رہا ہوں۔“

”اچھے ہی لگ رہے ہیں۔“

”تو پھر اچھا ہی ہوں۔ عاشی کیسی ہے اور کیا آئی نہیں؟“

رہی..... یہ بھلا عادل بھائی۔

”شاید آج وہ واقعی اچھی لگ رہی ہے۔ ماما نے بھی اور میڈم زمرس نے بھی تو اس کی تعریف کی اور پھر عاشری اور نینا نے بھی تو اسے سراہا تھا پھر..... پھر آخر عادل بھائی نے بھی.....“



”اے مریم۔“ بڑی نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ مریم نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اپنا ناکواری کو سکرا ہٹ میں چھپانے کی کوشش کی۔

”جی فرمائیے۔“

”ذرا اپنی ماں کو تو جگنا جا کر۔“

”کیوں؟“

”لو بھائی اتنی دور سے اسے دیکھنے آیا ہے اور وہ بڑی سوری ہی ہیں..... بہت شوق ہو رہا ہے اسے دیکھنے کا اپنی بھال کو۔“

”ماما رات بہت دیر سے آئی تھیں پارٹی اٹینڈ کر کے سو دیر سے انھیں گی۔“

”تو کیا ہوا جگنا دو کیا سارا دن سوئی رہیں گی۔“

”آپ خود کیوں نہیں جگا لیتیں۔“

”وہ بڑ بڑ کرتا ہے ضامن کا بچہ..... جا اچھی بہن جا کر جگا دے۔“

”وہ اس وقت نہیں جاگیں گی۔“ صبح کے قریب ہی تو وہ آئی تھیں۔ اس نے جھک کر اخبار اٹھانے

ہوئے سوچا جو نیچے گر گیا تھا۔

”کوئی خاص خبر ہے کیا۔“ بڑی کے پیچھے پیچھے اماں جان بھی آگئی تھیں اور ان کے عقب میں اماں صاحب تھے۔ بالوں کو نیل میں ڈبو کر وہ سنگھمی کر چکے تھے۔ چہرہ بھی چمک رہا تھا اور آنکھوں میں سرے کی سلاخیاں بھی لگائی گئی تھیں۔

”نہیں۔“ اس نے مختصر کہا ”اماں کے لیے تو خاص خبر بس ایک ہی ہوتی ہے کہ ہندوستان

اور پاکستان میں جنگ ہوگئی۔“

اماں صاحب نے دادوں کی نمائش کی۔ ان کی پر شوق نظریں مریم کے چہرے پر تھیں۔

”چل ہٹ خدا نہ کرے پاکستان اور ہندوستان میں جنگ ہوا بھی..... ہم تو بارڈر پر بیٹھے ہیں۔“

انہوں نے اسے ہلکا سا پھڑکارا۔

”یہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔“ بڑی نے قدرے سلیتے سے تعارف کروانے کی کوشش کی ”ہماری

دادی انہیں پیار سے اماں کہا کرتی تھیں۔“

”آداب۔“ اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آداب کیا۔

”اور یہ..... یہ بھابی کی بیٹی ہے۔ بتایا تو تھا تمہیں۔“ وہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

”اتنی بڑی۔“ اماں کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی جا رہی تھیں۔

”جل ہٹ نظریں نیچے کر لیجی ہے تمہاری۔“

”قسم سے اماں یہ پہلے مل جاتی نا..... پر اب تو تیری بہو سے ڈر لگتا ہے۔“

”کم بخت۔“ اماں نے اسے موکا مارا۔

مریم نے از حد ناگواری محسوس کرتے ہوئے انہیں دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔

”جا اپنے ابا اور بہن کو بھی بلالو..... کتنی اچھی دھوپ ہے۔ جب سے آئے ہیں دھوپ سینکے کو ترس

لئے ہیں۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

اور انہیں وہیں چھوڑ کر مریم اندر چلی آئی۔



”مریم تم میرا خواب ہو۔“

”میری آرزو ہو۔“

”بہت ساری راتیں میں نے تمہارے تصور میں جاگ کر گزاری ہیں۔“

”اور بہت سارے دن تمہاری یادوں میں بیٹے ہیں۔“

”تمہیں ملنے سے پہلے ہی میں نے تمہارا ایک خیالی پیکر تراش رکھا تھا مریم۔“

”مذقوں میں نے تمہارا انتظار کیا ہے۔“

”اور اب تم ملی ہو اتنی دور ہو اتنے فاصلے پر کھڑی ہو..... کہ ابھی تک تمہیں اپنا کہنے کا حق نہیں ہے۔“

لالہ ملک مزین بے حق مجھے دے چکی ہیں۔“ براؤن کبل سینے تک تانے آنکھیں موندے پروفیسر عادل

مریم کے تصور سے باتیں کر رہے تھے۔ رات وہ ڈاکٹر عبدالعید کے گھر سے لوٹے تو وہ بہت بے چین تھے

”مضطرب تھے سو دیر تک جاگتے رہے تھے۔“

مریم کا سراپا باران کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔

وہ کس قدر دلکش لگ رہی تھی نا۔

سفید لباس میں۔

کوئی اپرا اپا پری۔

کتنی ہی دیر تک وہ دور سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ وہ محفل میں موجود ساری خواتین سے کہیں زیادہ

نہن لگ رہی تھی اور پھر وہ اس کے پاس چلے آئے تھے اور ان کی نظریں اس کے چہرے پر پھیر گئی تھیں

اور پھر وہ اپنا ضبط کھو بیٹھے اور بے اختیار کہہ اٹھے۔

”مریم! آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ اور وہ کس قدر گھبراہٹ مٹی۔

اور وہ کس قدر پریشان سی ہو گئی تھی۔ تب وہ اس کے پاس رکے نہ تھے۔

”ہاں نہیں وہ خفا نہ ہو گئی ہو۔“

پھر وہ سارا ناٹم اس کے سامنے نہ آئے تھے۔ اور دل ہی دل میں تادم سے ہوتے رہے تھے۔ آج پہلی بار تو وہ انہیں کچھ مطمئن اور پرسکون لگی تھی۔

ملاں کے وہ بادل جو ہمیشہ اس کے چہرے کو اپنے ہالے میں لیے رکھتے تھے اس وقت نہیں نے اور انہوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ کیا تھا اگر وہ اپنے آپ کو روک لیتے۔

کتنی اچھی لگتی تھی وہ۔

عاشی نینا اور مور سے باتیں کرتے ہوئے دور سے انہوں نے کئی بار اسے دیکھا تھا۔

وہ وہیں الجھی الجھی بیٹھی تھی اور وہ تادم سے ہورہے تھے۔

مزنزنب نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ جلد اپنی والدہ کو بھیج دیں کیونکہ ڈاکٹر ہادی جلدی کر رہے ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ مریم اور عاشی کی شادی اکٹھی کر دیں۔

”لیکن عاشی ابھی کم عمر ہے۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

”ہاں لیکن ڈاکٹر ہاشم کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔“

اور بے حد خوشگوار موڈ میں بے اندازہ خوشیوں کو سنبھالے وہ گھر کی طرف آئے تھے لیکن پھر رات بھر مضطرب رہے تھے۔

اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سلجھانے کی خواہش۔ اس کے لبوں کو چھونے کی خواہش۔ رات بھر انہیں بیتاب کیے رہی تھی۔

سوا بھی تک وہ بستر میں تھے۔ خدا بخش دودھ انہیں آکر دیکھ چکا تھا۔

”مریم یہ کمرہ تمہارے وجود سے سج جائے گا۔ تمہیں کیا خبر کہ ایک تمہارے آنے سے اس گھر میں تے رنگ اتر آئیں گے۔ کتنی باتیں ان کے اندر باہر آنے کو بے تاب تھیں۔ بعض اوقات یہ

بہت ساری خوشیاں مل جاتی ہیں۔ ابھی تو کامل کے ملنے کی خوشی دل میں سنبھالے وہ حویلی سے آئے تھے اور آتے ہی مزنزنب نے انہیں یہ خوش خبری سنا دی تھی۔ حالانکہ وہ بے حد تھکے ہوئے تھے اور اپنے

انہوں نے ڈاکٹر عبدالعزیز سے معذرت کر لی تھی۔

”میں کچھ دیر پہلے ہی حویلی سے آیا ہوں اور بے تحاشا تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“

”لیکن میری شدید خواہش تھی کہ آپ آتے۔ میں نے کل بھی فون کیا تھا لیکن آپ نہیں تھے۔“

اور انہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ۔ یوں بھی عاشی کے حوالے سے وہ ڈاکٹر عبدالعزیز کو بہت پسند کرنے لگے تھے اور پھر اتنے دن ہو گئے تھے سب کو دیکھے اور وہ بھی تو وہاں ہو گئی۔

”مریم۔۔۔۔۔“

”اور کس قدر خوش ہو گئی جب وہ اسے کامی کے ملنے کا بتائیں گے۔۔۔۔۔ وہ تو بالکل مایوس ہو چکے تھے۔“ انہوں نے اپنے دل کو یقین دلادیا تھا کہ کامی اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن پھر وہ مریم کو کامی کے

معلق بتائیں پائے تھے۔ خود ہی انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ کامی مل چکا ہے۔ اس طرح اچانک خود ہی۔

جب وہ اس کی کھوج کرتے کرتے تھک گئے تھے تو وہ خود ہی مل گیا تھا۔

اس روز سرور کے ساتھ جب وہ اس کے گھر پہنچے تو انہیں یقین تھا کہ وہ کامی ہوگا۔

ایک بار پہلے بھی تو انہیں مایوسی ہوئی تھی لیکن سرور تو کامی سے مل چکا تھا۔ دیکھا ہوا تھا اس نے اسے وہ دل ہی دل میں امیدوں کے جال بنتے اور ادھیڑتے جب سرور کے گھر پہنچے تو لمحہ بھر دروازے پر ہی

کڑے رہے۔۔۔۔۔ کمرے کے وسط میں کامی کھڑا تھا۔

”میں باہر جاؤں گا۔“

وہ ضد کر رہا تھا اور آمنہ صغی اسے بہلا رہی تھیں۔ وہ بلاشبہ کامی تھا لیکن کس قدر کمزور ہو رہا تھا۔ الجھے ہوئے بال، میلے کپڑے۔

ان کے اندر جیسے جیسے ابل پڑے۔

”کامی۔“

وہ بے اختیار آگے بڑھے اور اسے گلے سے لگا لیا۔

”کامی۔“

اسے دونوں بازوؤں میں جھینچے کتنی ہی دیر وہ کھڑے رہے اور ان کی آنکھیں برستی رہیں۔

”سر پلیز۔“ سرور نے انہیں آہستہ سے الگ کیا۔

”کامی۔“

اس سے الگ ہوتے ہوئے انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”کہاں چلے گئے تھے تم۔ کہاں گم ہو گئے تھے؟“

کامی کچھ دیر یوں ہی اجنبی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا تھا پھر اس نے انگلی سے ان کی طرف اشارہ کیا۔

”بھائی۔“

”اپنے کمرے میں ہیں کیا؟“

”نہیں! باہر دھوپ میں بیٹھے ہیں۔“

”اوکے۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔ آپ چائے ادھر ہی لے آنا۔“

وہ برش کر کے گاؤں کی ڈوریاں باندھتے ہوئے باہر آئے تو خدا بخش ٹیبل پر چائے رکھ رہا تھا۔

”لگتا ہے چائے پہلے سے تیار تھی۔“ وہ مسرور کے سامنے کرسی ٹھیکٹ کر بیٹھ گئے۔

”اب پانچویں بار دم کی ہے۔“ وہ کچھ ناراض لگ رہے تھے۔

”سوری رات دیر سے سویا تھا اس لیے اٹھ نہیں سکا۔“ انہوں نے خدا بخش سے معذرت کی وہ جانتے

تھے کہ خدا بخش دیر سے اٹھنے پر چڑتا ہے۔

”اتنی دیر تک جاگنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے کہ صبح اٹھایا نہ جاسکے۔ رات خدا نے آرام کے لیے

بنا ہی ہے۔“

خدا بخش جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا چلا گیا تو وہ مسرور کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”سوری مسرور آج اٹھنے کا موڈ ہی نہیں ہو رہا تھا۔“

”آپ آرام کر لیتے سزا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“ اس نے ان کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے

ہوئے کہا۔

”نہیں! طبیعت تو اچھی ہے بھائی۔ دراصل رات صبح سے نیند نہیں آئی۔ میں ابھی تک حیران ہوں کہ

کامل اچانک وہاں کیسے پہنچ گیا اور کدھر سے آ گیا تم گاؤں سے بالکل باہر رہتے ہو۔ وہ گاؤں سے گزرا تو

کسی نے دیکھا نہیں۔“

”کیا یہ جاننا بہت ضروری ہے سر کہ وہ کیسے آیا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ وہ مل گیا۔ آپ خواہنا وہ اپنے

ذہن کو مت تھکا میں۔“

”ہاں۔“ اہم بات تو یہ ہے کہ وہ مل گیا۔ ورنہ ماں جی نے تو روگ لگایا تھا خود کو۔“ انہوں نے چائے

کی پیالی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے میز پر سے اخبار بھی اٹھالیا۔

مسرور کے پاس ان کے سوال کا جواب موجود تھا لیکن ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کو

اصل بات بتاتے یا نہیں۔ ان سے بات کرنے سے پہلے وہ ایک بار سلطان سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے

بات کر کے اپنے شبیہ کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

اس شام وہ پروفیسر عادل سے مل کر گھر آیا تو تھوڑا اندھیرا ہو چکا تھا۔ بے خیالی میں وہ اپنے گھر

بانے کے بجائے ساتھ والے گھر میں چلا گیا۔ یہ دونوں گھر ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ بالکل ایک جیسے

تھے۔ سلطان نے اسے بتایا تھا کہ یہ گھر شہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے بنوائے گئے ہیں۔ بعض

”ہوں بھائی۔“ آنسو پونچھتے ہوئے وہ مسکرائے۔

”بھائی۔“ اس نے خوش ہو کر دہرایا۔

”بھائی۔“

اور پہلے کی طرح ان کا ہاتھ تمام کمراس پر پیار کیا۔

”گھر..... بھائی گھر۔ اماں پاس۔ بابا پاس۔“

”ہاں ہاں! لے جاؤں گا گھر اماں کے پاس۔“ وہ اسے لیے ہوئے چار پائی پر بیٹھ گئے۔

”یہ..... یہ کہاں سے ملا تمہیں؟“

”میں آپ کے گھر سے آ رہا تھا تو مجھے یہاں اپنے گھر کے پاس ہی کھڑا مل گیا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ

کامل ہے اور جب قریب آ کر دیکھا تو یقین آ گیا۔ اسے لے کر گھر آیا تو آمنہ معنی اور تصدق احمد کو اپنا منتظر

پایا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اسے ساتھ جوہلی لے چلوں لیکن یہ ضد کرنے لگا۔“

”مگر یہ یہاں اچانک کیسے آ گیا اور پھر گاؤں میں کسی شخص نے نہیں دیکھا۔“

وہ بے حد الجھ گئے تھے اور مسرور بھی انہیں خاصا الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ کیا خبر کوئی شخص اسے یہاں چھوڑ

گیا ہو یا پھر خود ہی کہیں سے گھومتا پھرتا آ گیا ہو۔ جو بھی تھا وہ مل گیا تھا۔ اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی تھی۔ پھر

وہ آمنہ معنی اور تصدق احمد کے کہنے کے باوجود وہاں نہیں رکے تھے اور انہیں جوہلی آنے کی دعوت دیتے ہوئے

وہ فوراً ہی کامل کو جوہلی لے کر چلے آئے تھے۔ زیتون بانو کتنی ہی دیر حیران سی اسے دیکھتی رہی تھیں اور پھر جو اس

کے گلے لگ کر روئیں تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا اور ابھی تک ان کی طبیعت نہیں سنبھلی تھی۔

لیکن انہیں لاہور آنا پڑ گیا تھا اگرچہ کالج ابھی بند تھا۔ یکم جنوری تک چھٹیاں تھیں لیکن کراچی سے ایک

صاحب آ رہے تھے جن سے مسرور کی ایگزیکٹیشن کے سلسلے میں ان کی بات ہو رہی تھی اور ان صاحب نے

صرف دو دن لاہور کرنا تھا۔ اور ان سے مل کر سامنے بات کرنا ضروری تھا۔ مسرور کو بھی وہ ساتھ ہی لائے

تھے۔ یوں بھی اسے گھر جانا تھا۔ ایک دن کے لیے انہوں نے اسے اپنے پاس روک لیا تھا۔ وہ چاہتے تھے

کہ مدنی صاحب سے مسرور کی بات کروادیں۔

خدا بخش نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو انہوں نے آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔

”آپ جاگ گئے ہیں تو چائے لے آؤں؟“

”ہاں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھے۔ ”لے آؤ اور مسرور اٹھ گئے کیا؟“

”جی وہ تو کب کے اٹھ گئے بلکہ اب تک دونوں اخبار تین بار پڑھ چکے ہوں گے۔“

خدا بخش نے تفصیل بتائی۔ گویا انہیں جتنا رہے ہوں کہ وہ لیٹ ہو گئے ہیں۔

پروفیسر عادل مسکرا دیے۔

اوقات کچھ ایسے مہمان بھی آجاتے ہیں جنہیں وہاں ڈیرے پر نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ایک گھر میں اس نے سرور کو ٹھہرایا تھا اور کام کاج کے لیے ایک لڑکا بھی بھیج دیا تھا۔ جس سے سرور کو خامی سہولت ہوگئی تھی۔ اب وہ لڑکا چائے اور ناشتا خود ہی بنالیتا تھا۔ ہاں کھانا بدستور ڈیرے سے آتا تھا..... اگرچہ اس کی خوددار طبیعت کو یہ گوارا نہ تھا لیکن سلطان نے اس سلسلے میں اس کی کوئی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم میرے گاؤں میں میرے مہمان ہو بس۔“

”مہمان تو تین چار دنوں کا ہوتا ہے سلطان صاحب۔ مجھے نہ جانے کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے۔“

”بھلے صدیوں تک رہو لیکن کھانا تمہارا دھر سے ہی آئے گا۔“

ساتھ والا گھر اکثر بند رہتا تھا۔ کبھی کبھار ہی کھلا ہوتا تھا لڑکا بہت باتونی تھا اور اکثر خود ہی کچھ نہ کچھ

بولتا رہتا تھا۔

”یہ جو گھر ہے نا یہاں اکثر وہ ٹھہرتی ہیں گانے والیاں کئی کئی مہینے رہتی ہیں جی۔ اپنے سلطان صاحب

بہت شوقین ہیں جی۔“

لیکن وہ جب سے آیا تھا اس طرح کی کسی عورت کو اس نے ساتھ والے گھر میں آتے جاتے نہیں دیکھا

تھا۔ ہاں تین چار بار بڑی بڑی مونچھوں والے ایک مرد کو اس نے گھر سے باہر نکلنے اور تالا لگاتے

دیکھا تھا۔

”اپنے سلطان صاحب کا خاص بندہ ہے جی فتح علی۔ بڑا جی دار ہے جی۔“ لڑکے نے اسے بتایا۔

دونوں دروازے ساتھ ساتھ تھے اور وہ نہ جانے کس دھیان میں تھا کہ اپنے دروازے کی بجائے اس

نے ساتھ والے دروازے کو دھکیلا اور اندر چلا گیا۔ سامنے کوئی نہیں تھا حالانکہ اکثر وہ لڑکا اس کی عدم

موجودگی میں باہر محن میں ہی بیٹھا ہوتا تھا۔ شاید کمرے میں ہوگا۔ اس نے سوچا اور دائیں طرف والے

کمرے کی طرف بڑھا جو اس کے استعمال میں تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کمرے تھے جو بند رہتے تھے۔

دروازے کو ہلکا سا دھکیل کر اس سے اندر قدم رکھا اور ٹھنگ گیا۔

یہ اس کا کمرہ تو نہیں تھا۔ دونوں گھر بھی ایک جیسے تھے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر کونے میں

زمین پر بیٹھے ہوئے کال کو دیکھ کر وہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔

”کامی..... کامی.....“ اسے پہچاننے میں اسے ایک لمحہ بھی نہ لگا۔

”کامی.....“

اس نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے بلایا تو اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا اور

پکایک اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

”نہ..... نہ مجھے مت مارنا۔“

”نہیں..... نہیں میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ تم آؤ چلو میرے ساتھ۔“

”کہاں۔ اماں پاس؟“

اس کی آنکھیں ایک دم چمکنے لگی تھیں اور وہ کھڑا گیا۔ جب دل میں ایک ہیجان چھپائے اس کا ہاتھ

تھاے وہ باہر نکلا تو اسے لگا جیسے سامنے والے کمرے کے دروازے سے کوئی اندر گیا ہو۔ کامی کا ہاتھ

تھاے وہ کمرے میں گیا۔ اندر کوئی نہ تھا البتہ کھڑکی کھلی تھی۔ غالباً جو کوئی تھا یہاں سے کوڈ گیا تھا۔

کیا سلطان نے اسے قید کر رکھا تھا۔

یا اس شخص فتح علی نے اپنے طور پر اسے بند کر رکھا تھا۔

لیکن اس کا فائدہ؟

کامی کو اغوا کرنے کا سلطان یا فتح علی کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اگر فتح علی نے اسے پیسے کے لیے اغوا

کیا تھا تو ابھی کسی قسم کا مطالبہ کیوں نہیں کیا تھا..... اور پھر اس وقت دروازہ کیوں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ نہ

صرف باہر کا دروازہ کھلا تھا بلکہ کمرے کا دروازہ بھی لاک نہ تھا اور اگر سلطان نے تو..... آخر سلطان کو کیا

فائدہ تھا اگر اسے کوئی دشمنی تھی تو پروفیسر عادل سے ہونی چاہیے تھی نہ کہ بے ضرر کامل سے۔

وہ فتح علی کے متعلق اس لڑکے سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ حویلی جانے کے بجائے گھر چلا آیا

تھا جہاں آمنہ مافی اور تصدق احمد اس کے منتظر تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ بے حد حیران ہوا تھا۔

”ارے آپ کیسے اچانک!“

”دراصل ہم یہاں ایک قریبی گاؤں میں آئے تھے۔ میری ایک عزیزہ کا انتقال ہو گیا تھا جو میری

بہت اچھی دوست بھی تھیں۔ میں تصدق احمد کو ساتھ لائی تھی۔ ہم نے سوچا تھا رات تمہارے پاس

گزاریں گے۔“

”تھینک یو۔“ اسے خوشی ہوئی تھی۔

”اب آپ آئے ہیں تو کچھ دن ہیں اور گاؤں کی زندگی کا لطف اٹھائیں۔“

”نہیں رہتا تو مشکل ہے۔ اماں پریشان ہوں گی۔“ آمنہ مافی نے معذرت کی ”ہمیں صبح واپس

جانا ہے۔“

”پھر کبھی میں آؤں گا جتنی کے ساتھ۔ کئی دنوں سے تمہارے پاس آنے کا پروگرام بن رہا تھا لیکن جتنی

حیرت فارع نہیں ہو پارہے تھے حالانکہ جب تمہارا خط ملا تھا اسی دن میں نے ارادہ کر لیا تھا یہاں آنے

کا۔“ تصدق احمد نے اپنے اپنا پروگرام بتایا۔

اور پھر لڑکے کو چائے وغیرہ پلانے کا کہہ کر اور کامل کو ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر وہ حویلی چلا

آیا تھا اور راستے میں ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ابھی پروفیسر عادل کو یہ نہیں بتائے گا کہ کامل اسے

کہاں ملا تھا۔ جب تک سلطان سے بات نہیں ہو جاتی۔ سلطان دونوں سے لاہور آیا ہوا تھا۔ ڈنرے پر ہوتا تھا تو ہر شام اس کے پاس ضرور آتا تھا پھر اکثر گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا، گپ لگاتا۔ کبھی وہ دونوں باہر بھی نکل جاتے تھے۔

کیا سوچنے لگے تم؟“ انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں سر۔“ سرور ان کی طرف متوجہ ہو گیا ”کامل کا ملنا ایک معجزہ ہی لگتا ہے جبکہ دل کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ شاید.....“

”ہاں یار۔“ پروفیسر عادل نے ایک گہری سانس لی ”سب ہی کہہ رہے تھے..... چاچا اور مہراں بھی۔“ یہ حقیقت تھی کہ سب کو بے حد حیرت ہوئی تھی اور خوشی بھی۔ کامل کے ملنے کا سبب ہی بڑی جلدی آگئے تھے۔ چاچی چاچا عبدالرحمن، مریم اور مہراں۔ حالانکہ چاچی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ چاچا عبدالرحمن نے فوراً دیکھیں پکڑا کر غریبوں میں تقسیم کروانے کے لیے کہا تھا اور ڈاکٹر کو بلا کر کامل کا معائنہ کروانے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ وہ بے حد کمزور ہو رہا تھا۔

”شکر ہے ماں جی، کامل مل گیا۔ ورنہ زندگی بھر یہی خلش رہتی آپ کو۔“

ماں جی کا ہاتھ تھامے انہیں مبارکباد دیتی ہوئی حریم کو دیکھتے ہوئے ان کا دل اس کے لیے اداس ہو گیا۔ وہ ابھی تک سرور یا بچپنی سے اس کے متعلق بات نہ کر سکے تھے۔ انہیں وہ بہت اداس اور دل گرفتہ لگ رہی تھی۔

”سرور۔“ انہوں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا ”شادی وغیرہ کا کب تک ارادہ ہے؟“

”شادی۔“ اسے پروفیسر عادل کے اس اچانک سوال پر حیرت ہوئی ”یہ اچانک آپ کو شادی کا خیال کیسے آگیا؟“

”یوں ہی..... بھئی ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ جب بیٹا پڑھ لکھ کر کہیں نوکری کر لے تو اس کی شادی ہو جائے کیا تمہاری امی.....؟“

”ہاں امی تو کہتی رہتی ہیں اور وہ میری خوشی دیکھنا چاہتی ہیں لیکن میں فی الحال خود کو اس پوزیشن میں نہیں پاتا۔ آپ تو جانتے ہیں سر میں نہیں چاہتا کہ عینی کو میرے گھر آکر کسی تکلیف کا سامنا ہو۔ وہ بہت لاڈلہ دیکار سے پلی ہے۔“

”یعنی کون؟“ پروفیسر عادل چونکے۔

”یعنی میرے ماموں کی بیٹی ہے سزا رسل کی بہن۔“

”کیا تمہیں پسند ہے؟ اچھی ہے وہ۔“

”نہیں سر۔ میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا نہیں۔ امی کی خواہش ہے اور یقیناً وہ بہت اچھی ہوگی

اور اگر وہ اچھی نہ بھی ہوتی تو امی کی خواہش کو پورا کرنا میرے لیے اہم ہے۔ آپ جانتے ہیں سزا میری امی نے بہت دکھ سہے ہیں اور میں اپنی ذات سے انہیں کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتا۔“

”بہت اچھی بات ہے سرور۔“ انہیں سرور کی سوچ پر خوشی ہوئی تھی۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے۔ آج ہی گاؤں جانا ہے؟“

”مدنی صاحب سے ملنے کے بعد ایک دو کام ہیں میرے۔ اگر وہ ہو گئے تو آج ہی چلا جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے ناشتا کر کے مدنی صاحب کی طرف چلتے ہیں۔ جب تک ناشتا بننا ہے میں تیار ہو جاتا ہوں۔ تم تو غالباً تیار ہی ہو۔“

”جی سر۔“

اسے سلطان اور تصدق احمد سے ملنا تھا۔ سلطان یقیناً اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوشی میں ہوگا۔ اس نے سوچا اور اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔

یہ ماڈل ٹاؤن کا وہی گھر تھا جہاں ایک بار پہلے بھی سرور آیا تھا اور آج پھر وہ اسی گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ بھر گیٹ کے باہر اس نے کچھ سوچا اور پھر آہستگی سے گیٹ کو اندر دھکیلا۔ گیٹ کے اندرونی طرف ہکا بھکا طے پر کرسی بچھائے اسلحہ بردار چوکیدار بیٹھا تھا۔ وہ یک دم الارٹ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ سرور نے اس کی طرف دیکھا۔

”سلطان صاحب ہیں؟“

”جی لیکن آپ کون ہو جی۔ اس سے پہلے ادھر نہیں دیکھا۔“ چوکیدار ایک قدم آگے بڑھا آیا تھا اور اب سر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں سرور ہوں۔ سلطان صاحب کا دوست۔“

”سرور.....“ اس نے حافظہ پر زور دیا اور پھر جیسے کوئی ہدایت یاد آتے ہی اس کے لہجہ میں فرق آگیا۔

”جی صاحب۔ سلطان صاحب نے آپ کے متعلق بتایا تھا جی۔ بہت پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ جب کبھی آپ آؤ تو آپ کا خاص خیال رکھا جائے۔ آپ جاؤ جی اندر چلے جاؤ۔ صاحب اندر ہی ہیں۔“ اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

”تھوڑے لمحوں میں۔“

”کوئی نہیں جی۔ صبح سب ہی چلے گئے تھے۔ بس سلطان صاحب ہیں۔ وہ بھی جا رہے تھے لیکن

گال سے بندھ آگیا تو رک گئے۔ وہ عزیز ہے نا جی۔ آپ تو جانتے ہوں گے اے۔“

سرور نے سر ہلایا اور ایک قدم آگے بڑھا دیا۔

”اوہ جی یاد آگیا۔ آپ ایک بار پہلے بھی آئے تھے ادھر بڑے عرصے بعد آئے ہیں۔ کیا کسی اور

”کیا؟“ سلطان نے اس کی طرف دیکھا۔

”کامل مل گیا ہے۔“

”وہ ہاں پتا ہے مجھے۔“ بے اختیار سلطان کے لبوں سے نکلا۔

”کیسے پتا چلا؟“

”وہ۔“ سلطان ذرا شپٹایا ”بابا جانی سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے ہی بتایا۔“

”جانتے ہو وہ کیسے۔۔۔ اور کہاں سے ملا؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں تو۔“ سلطان نے نظریں چرائیں۔

”وہ ایک گھر جو تم نے مجھے رہنے کے لیے دیا ہے سلطان۔ اس گھر سے ملحق ایک اور گھر بھی ہے۔

بالکل دیباغی کامل اس گھر میں قید تھا۔“

مسرور کی نگاہیں سلطان کے چہرے پر تھیں۔ بہت گہری نظریں اندر کو اترتی ہوئی سلطان نے اذہد

بے چینی محسوس کی۔

”اور ابھی یہ شخص جو ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے سامنے کھڑا تھا، میں نے اکثر اس کو تمہارے گھر آتے

جاتے دیکھا ہے۔“ ذرا سے توقف کے بعد مسرور نے بات مکمل کی اور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اوکے سلطان میں چلتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ مسرور روکو۔“ غیر ارادی طور پر سلطان کے لبوں سے نکلا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

مسرور کی اس مختصر بات کا کیا جواب دے اور مصفا فی میں کچھ کہے ”لیکن کیا مصفا فی میں کہنے کے لیے اس

کے پاس کچھ ہے۔ شاید کچھ بھی نہیں۔“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

مسرور کا انداز اتنا حساس اور یقینی تھا کہ کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ مسرور کی سوالیہ نظریں اس کے

چہرے پر جمی تھیں اور پسینا ہولے ہولے اس کے مساموں سے پھوٹ رہا تھا۔ وہ خود کو سلطان کہلواتا

قادر و قاسمی غلطی پر اپنے ملازمین کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اس میں ڈیڑھ لے سارے انداز

موجود تھے۔

وہی مزاج کی تیزی

وہی انا

وہی غرور و تکبر

وہی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر شے کو روندتے چلے جاتا۔

سب کچھ تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ مسرور کے سامنے وہ پانی ہو جاتا۔ لہجے میں خود بخود حلیمی

لڑائی آ جاتی۔

شہر میں رہتے ہیں۔ یار لوگ تو روز ہی محفلیں جماتے ہیں۔ سلطان صاحب کے سارے دوست یار بڑے

جی دار ہیں جی۔ بڑے دل والے۔“

چوکیدار بہت باتونی معلوم ہو رہا تھا۔ مسرور اثبات میں سر ہلاتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔۔۔۔۔ ادھر ادھر

دیکھتا ہوا وہ اندرونی گیٹ کے پاس آ کر کچھ بھرکھڑ گیا۔

”بھلا کیوں آیا ہے وہ یہاں۔۔۔۔۔ وہ کیا جانتا چاہتا ہے اور کس لیے سلطان کے پاس آیا ہے۔“ اس

کے ذہن میں کوئی واضح بات نہ تھی۔ بس مبہم مبہم سا کوئی شک تھا وہم سا تھا جو ذہن و دل کو جکڑے ہوئے

تھے ”کیا کہوں گا سلطان سے وہ مجھے یوں اچانک دیکھ کر حیران نہیں ہوگا؟ ابھی تین دن پہلے تو وہ مجھے

گاوڑں چھوڑ کر آیا تھا۔۔۔۔۔ کیا یہاں سے ہی واپس چلا جاؤں۔۔۔۔۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن

میں خیال آیا لیکن دوسرے لمحے غیر ارادی طور پر دروازے پر رکھے ہوئے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا اور دروازہ

کھلتا چلا گیا اندر لاؤنج میں سلطان صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے اپنے سامنے کھڑے عزیز خاں کو غصے

سے دیکھ رہا تھا۔

”میں پوچھتا ہوں کہ تم سے یہ بے پروائی ہوئی کیوں اور تم۔۔۔۔۔“ اس نے جملہ مکمل چھوڑ کر مسرور کی

طرف دیکھا۔

”ارے تم مسرور یہاں؟“ وہ خوش ہونے کی بجائے کچھ حیران اور پریشان لگ رہا تھا۔ مسرور نے

ایک اپٹتی ہوئی نظر سلطان کے سامنے کھڑے عزیز خاں پر ڈالی اور پھر فوراً ہی سلطان کی طرف متوجہ

ہو گیا۔

”کیوں مجھے دیکھ کر تمہیں بہت حیرت ہوئی ہے کیا؟“

”ہاں نہیں تو بیٹھو۔“ سلطان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عزیز کی طرف دیکھا ”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“

”یہ شخص میرا بڑا دوست ہے غالباً اور اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور۔۔۔۔۔ ضرور پوچھو یار۔ یہ شخص کہیں بھاگ نہیں جا رہا۔ یہیں ہے جب کہو حاضر کروں گا۔ جلد

چاہے پوچھتے رہنا۔“ سلطان نے ہلکا سا ہتھکڑ لگاتے ہوئے مسرور کے کندھے پر ہاتھ مارا اور اس کے

قرب ہی بیٹھ گیا۔

”جاؤ بھی عزیز خاں۔ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کچھ بھجواؤ کھانے پینے کو میرا یا آ۔۔۔۔۔“

”نہیں میں ابھی ناشتا کر کے نکلا ہوں۔ سر عادل کے ساتھ ناشتا کیا تھا اور ناشتے سے پہلے نہ پانی

کتنے کپ چائے انڈیل چکا ہوں۔ سو کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے۔“

”کب آئے؟“

”رات ہی سر کے ساتھ آیا ہوں اور ایک خوش خبری بھی ہے۔“

یہ حقیقت تھی کہ سرور سے ملنے سے پہلے اس کا ذہن بہت منفی انداز میں سوچنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے جی جان اور عادل بھائی کو ختم کرنے کے لیے منصوبے بنائے تھے اور کئی بار اس نے پلان بنائے تھے کہ کسی طرح وہ چچا جان کی جائداد پر قابض ہو جائے اور پھر دوستوں کے ساتھ مل کر خوب داد عیش دے۔ جب سے زیتون بانو نے گوجر والہ کے حاجی صاحب سے گندم کی فروخت کے سلسلے میں خود بات کی تھی اور بابا جان نے اس کو بے تحاشا رقم دینے سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ پھر چوہدری اللہ یار نے جاس کا گہرا دوست تھا، اسے کامی کے اغوا کی راہ سمجھائی تھی۔

”ختم کر کے کھیتوں میں پھینک دو۔“

لیکن اس کے خون میں وہ جو شاید دادا جان کا خون بھی شامل تھا وہ اسے ہر بار ایسا کرنے سے روکتا۔ پھر ان اور بابا جان کی مشکوک نظریں۔ بابا جان کے عجیب و غریب سوالات۔

اسے ان سوالات سے بچنے کے لیے خوا خواہ معذور بچوں کے لیے ادارہ قائم کرنے کا بہانہ بنانا پڑا اور میں بھی خریدنی پڑی۔ تب کہیں جا کر عبدالرحمن خاں مطمئن ہوئے تھے۔ زمین کی خریداری سے وہ جلد لاکھ روپے ہی بچا سکا تھا اور وہ چند دنوں میں اڑ گئے۔ صرف دو لاکھ روپیہ تو اس نے ماہ بانو کو تارارانی کی فائردانی کا دے دیا تھا۔

سرور نے لگائیں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔

”سوری سلطان! میں نہیں رک سکتا۔ مجھے گاؤں بھی جانا ہے۔“

”پلیز۔“

سلطان نے چونک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے لہجے میں خود بخود نرمی آ گئی تھی۔

”کچھ کہتے تو دو۔“

”کیا کیا کہو گے۔ سلطان۔ سب کچھ تو واضح اور صاف ہے۔ ایک بار پہلے بھی میں تمہارے پاس آیا تھا۔ تب میں متذبذب تھا اور آج تک میں متذبذب ہی تھا لیکن آج..... آج مجھے یقین ہے کہ میں اپنی غلطی نہیں تھا۔“

”آہ۔“ سلطان نے سر جھکا دیا۔ ”مجھے اعتراف ہے یار لیکن غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔ میرے اعتراف میں ہمیشہ ایسے لوگ رہے جنہوں نے کبھی مجھے میری غلطیوں سے آشنا نہیں کروایا۔ تم بھلے ہو گوریا۔ نہ کرو لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب سے تم گاؤں آئے ہو میرے اندر زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میری کاپاپلٹ گئی ہے۔“

سرور نے تاسف سے اسے دیکھا۔

چہرے کی کڑھکی میں محبت کے رنگ گھل جاتے کیا تھا، سرور ایک عام سا لڑکا تھا لیکن اس میں تھی کوئی بات کوئی انداز تھا اس میں جس نے پہلے ہی روز اسے اسیر کر لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بے تحاشا اور بے خوف چمک۔ اس کے چہرے کے ناراض نقوش۔ اور اس کی بے نیازی۔

اس نے ذرا سی بھی تو اہمیت نہیں دی سلطان کو اور نہ ہی اس کی دوستی کی آفر کو ایک دم قبول کر لیا تھا۔ جتنا اس سے دور بھاگتا تھا سلطان کا دل اتنا ہی اس کی طرف کھینچتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ سرور اسے اپنا دوست سمجھے دل و جان سے حالانکہ اس کے دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ ہر طرح کے دوست اس کے طے احباب میں تھے۔

ایسے بھی تھے جو وقت پڑنے پر سرور کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرتے۔ ایسے بھی تھے جو اس کی خاطر جیل تک جانے کے لیے تیار ہو جاتے لیکن پتا نہیں کیوں سلطان کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ یہ سب عارضی ہے۔ جب تک پیسہ ہے یہ دوستیاں بھی ہیں۔

اگر وہ فلاح ہو جائے اور بابا جان کسی بات پر ناراض ہو کر اسے چھوٹی حویلی سے نکال دیا تو یہ دوستیاں بھی ختم ہو جائیں۔ یہ سب لوگ اس لیے اس کے گرد جمع ہیں کہ وہ چھوٹی حویلی کا وارث ہے۔ بے تحاشا پیسہ لٹاتا ہے۔

اور ان کے لیے عیش و عشرت کے سامان مہیا کرتا ہے۔

لیکن سرور کی بات اور تھی اس کے متعلق جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی حالت میں اس کا ساتھ چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے اس کی عیش و عشرت کی محفلوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی بلکہ جب سے وہ گاؤں میں آیا تھا اور سلطان کو اس کے قریب رہنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملے تھے تو اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ غیر محسوس طریقے پر اسے ان محفلوں سے دور لے جانا چاہ رہا تھا۔ کتنے دنوں سے اس نے ڈیرے پر کئی کوئیں بلایا تھا۔

نہ رنگ دور کی کوئی محفل جمائی تھی۔

بلکہ اندر ہی اندر وہ کامی کو قید کرنے پر چکھتا تھا سا لگا تھا..... اپنے ایک دوست کے..... پتہ پہنچا تھا۔ اغوا تو کر چکا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ آسانی سے اس تمام جائداد کا مالک بن کر اپنی مرضی سے اسے خرچ کر سکے گا جو کامی کے بعد اسے ملنا تھی لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہ تھا۔ بابا جان بھی تھے جو جانے کیوں کامی کے گم ہو جانے کے بعد سے اس کی ہر بات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور سوال و جواب کرنے لگے تھے کہ کتنا پیسہ کہاں سے ملا اور کہاں اس خرچ کیا گیا۔ پتا نہیں انہیں کیا وہم ہو گیا تھا۔

”میں تم سے یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کامی کو کیوں اغوا کیا۔ پیسے کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ ماں جی کو جو اذیت ہوئی اور عادل بھائی نے جو دکھ اٹھایا اس کا از الہ نہیں ہو سکتا اور مجھ کو معصوم جو اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ خود سے اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا۔“

”ہاں عزیز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کھانا پیتا نہیں تھا۔ ضد کرتا تھا۔ یقین کرو دوست، میں اس غلطی پر بعد میں بہت پچھتاؤں..... کئی دفعہ سوچا کہ تم سے ذکر کروں۔ شاید تم کوئی بہتر راستہ بتا دو لیکن پھر سوچا شاید اس طرح میں تمہاری نظروں میں گر جاؤں گا۔“

”پھر عادل بھائی اور سب سے بڑھ کر بابا جان۔ وہ تو مجھے کبھی معاف نہ کرتے۔ وہ عثمان بچاؤ عادل بھائی سے بالکل مختلف ہیں۔ غصیلے اور اپنے فیصلوں میں اٹل۔ سو میں نے جو کچھ کیا ہے اسے مجھ سے کی کوشش کرتا رہا لیکن شاید خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ تم عادل بھائی سے معافی مانگ لینا۔ میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا اور بابا جان وہ شاید اس حرکت پر مجھے زندہ بھی نہ چھوڑیں۔ وہ مجھے دیکھنا بھی گوارا نہ کریں۔“

سلطان کے لہجے میں تاسف، دکھ، افسوس سبھی کچھ تھا۔

مسرور لمحہ بھرا سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اور انسانی ذہن کو سمجھنا نہایت مشکل ہے اور اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب کس وقت انسان کیا کر بیٹھے اور سلطان..... سلطان نے ہمیشہ ہی اسے حیران کیا تھا۔

پہلے دوستی کا ہاتھ بڑھا کر۔

پھر آمنہ صغی کو واپس کر کے۔

اور اب..... اب کامی کے اغوا پر شرمندگی کا اظہار کر کے۔ آج وہ سب دنوں سے بہت مختلف لگ رہا تھا..... اداس اور طول سا۔

سر جھکائے نام اور شرمندہ۔

یہ اس سلطان سے کتنا مختلف تھا جسے پہلی بار اس نے سر عادل کے ساتھ دیکھا تھا۔

مغرور اور خود سر وڈیرا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس کے لیوں پر بکھری مدہم مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”لیکن عادل صاحب سے کس بات کی معافی مانگوں؟“

سلطان نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں از حد حیرت تھی اور وہ مسرور کے سوال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسرور اس کی مشکل جان چکا تھا۔

”میں نے سر سے اس بات کا تو کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ کامی مجھے کہاں سے ملا تھا۔ کامی مل گیا۔ یہ بڑی

”یعنی اس بات پر زیادہ غور نہیں کیا گیا کہ وہ اچانک وہاں کیسے آگیا۔“ مسرور نے اسے وضاحت سے بتایا کہ اس نے سر عادل سے کیا کہا تھا۔

”مسرور میرے یار۔“ سلطان کی آواز بھرا گئی۔

”مائی دوست، ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ہی کہا تھا نا کہ غلطیاں انسانوں سے ہی سرزد ہوتی ہیں۔“

مسرور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو سلطان ایک دم اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔ آج پہلی بار مسرور نے نی کہہ کر اسے بلایا تھا اور آج پہلی بار اس نے اس کے چہرے پر اپنے لیے محبت کے رنگ دیکھے تھے۔

”تم جی مجھ میرے دوست ہو۔ سچے اور حقیقی دوست۔“

مسرور مسکرایا ”یقیناً۔“ اس سے الگ ہوتے ہوئے مسرور نے اس کا ہاتھ دبایا ”اور اب اجازت دو مجھے۔“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ سلطان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کے کونے

نم ہونے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”تم بہت عظیم ہو میرے دوست۔ ورنہ اگر تم عادل بھائی کو بتا دیتے تو میں زندگی بھر حویلی جانے اور

اس سے آنکھ ملانے کے قابل نہ رہتا۔“

”دوست کہا تھا تم نے مجھے۔“ مسرور نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں کہا تھا۔ سمجھا تو کبھی نہیں تھا۔“ سلطان نے ہولے سے کہا تو مسرور بے اختیار ہنس دیا۔

”غلط نہیں کہہ رہا ہوں مسرور۔“ سلطان بے حد سنجیدہ تھا ”آج پہلی بار میں نے تمہارے چہرے اور

ہاری آنکھوں میں اپنے دوستی کے جذبے دیکھے ہیں، مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔“

”اور مجھے بھی..... او کے سلطان اب اجازت دو۔ مجھے گاؤں جانا ہے ماں جی منتظر ہوں گی۔“ اس

ناہی بات پھر دہرائی۔

”ہاں ہاں چلے جانا۔ اکٹھے چلتے ہیں۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گا اور وہیں سے حویلی چلا جاؤں گا۔“

”عزیز بالم خیر دین۔“ مسرور کا ہاتھ چھوڑ کر وہ آوازیں دینے لگا ”کہاں مر گئے ہو سب۔ ادھر آؤ۔

دیکھنا بیٹے کو لاؤ۔ میرا دوست آیا ہے اور خیر دین تم.....“ لاؤنچ میں آتے خیر دین کو دیکھ کر اس نے کہا۔

دراپور سے کبوجا کر گاڑی تیار کر لے۔ ابھی ہمیں جانا ہے۔“

اور پھر مسرور کا ہاتھ تھا سے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

تیر اور اماسن کے بیٹے میں لڑائی ہو رہی تھی۔

میرم شوری کی آوازیں کر باہر نکلی ”کیا ہے مور کیوں شور کر رہے ہو۔“

”مومنو یہ حبیب کا بچہ خوا خواہ میری چیزوں پر اپنا حق جتنا تا ہے۔ ابھی میری کوئٹر اٹھا کر اوپر لے جا رہا تھا۔ پرانی والی ٹی وی گیم تو ساری توڑ چھوڑ کر رکھ دی ہے۔“

”بہت بری بات ہے حبیب۔ دوسروں کی چیزیں نہیں اٹھاتے۔“ مریم نے آگے بڑھ کر کوئٹر کا ڈبا حبیب کے ہاتھ سے لے لیا۔

”مومنو یہ کب تک ہمارے گھر میں رہیں گے۔ آخر اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔“

”واہ کیوں جائیں۔“ حبیب نے منہ چڑایا ”ہمارے چاچا کا گھر ہے، نہیں جاتے۔“

”نہیں یہ ہمارا گھر ہے، ہمارے پاپا کا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔“ تیمور کے لہجے میں تنجید کی تھی اور وہ بہن غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں جاتے۔ ہمارے چاچا کا گھر ہے، ہم یہیں رہیں گے۔“ حبیب زور زور سے کہتا ہوا میز میاں پھلانگتا چلا گیا۔

”مومنو یہ ہمارے پاپا کا گھر ہے نا۔“ تیمور کی آواز میں آنسو تھے اور وہ تصدیق طلب نظروں سے مریم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مریم نے بے اختیار اسے ساتھ لگا لیا ”ہاں میری جان یہ تمہارا گھر ہے۔“ اس نے تیمور کو تسلی دی۔

”یہ گھر پاپا کا ہے۔ آپ ماما سے کہیں وہ ان سب کو نکال دیں۔ یہ لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے اور یہ حبیب تو مجھ سے روز لڑائی کرتا ہے۔ یہ دیکھیں۔“ اس نے کلائی موڑتے ہوئے آستین پیچھے کی ”کل می اس نے مجھے کاٹ لیا تھا۔“

کلائی پر دانتوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔ مریم نے ایک دم اس کی کلائی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے ”میری جان، تم اس کے منہ کیوں لگتے ہو۔ وہ تو بہت بدتمیز اور فضول ہے۔“

”میں تو اس سے بات ہی نہیں کرتا وہ خود ہی جان بوجھ کر مجھے روزانہ ہی تنگ کرتا ہے اور۔۔۔۔۔۔“

”یہ صحیح ہے۔“ عاشری بچن سے چائے کا کپ لیے باہر نکلے۔

”بجود دونوں لڑکے انتہائی بدتمیز ہیں اور خوا خواہ ہی منہ لگتے ہیں۔ کتنی بار میں نے انہیں منع کیا ہے کہ نیچے نہ آیا کریں لیکن۔۔۔۔۔۔“ اس نے چائے کا کپ سینئر ٹیبل پر رکھا اور تیمور کی طرف دیکھا ”اب کیا ہوا ہے؟“

”یہ۔۔۔۔۔۔ یہ۔“ مریم نے تیمور کی کلائی آگے کر دی ”یہ حبیب نے کاٹا ہے اس کی کلائی پر۔“

عاشری کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا۔

”آپ ماما سے بات کیوں نہیں کرتی ہیں بچو۔ نکال باہر کریں انہیں، بہت ہو گیا ہے۔“ پیل والدین آئے۔ پھر بھائی مع فیملی کے آگیا اور ابھی نہ جانے کس کس نے یہاں آنا ہے۔ نہیں برداشت ہوتے۔

لوگ مجھ سے۔ ابھی ماما سے جا کر بات کرتی ہوں۔“

”ماما گھر پر نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ غضنفر ملک کے ساتھ کچھ دیر پہلے ہی کہیں گئی ہیں۔“ مریم نے بتایا اور تیمور کا ہاتھ تھامے تھامے صوفے پر بیٹھ گئی۔ عاشری بھی کپ اٹھا کر سامنے بیٹھ گئی۔

”اور یہ جو عاصمہ بی بی ہیں۔۔۔۔۔۔ وقت بے وقت میرے کمرے میں چلی آتی ہیں اور جو مرضی ہوا اٹھا کر لے جاتی ہیں تبھی لپ اسٹک، کبھی نیل پالش۔ نہیں برداشت ہوتا مجھ سے یہ سب۔ میں ماما سے آج ضرور بات کروں گی۔“

”اوکے، لیکن عاشری ماما۔۔۔۔۔۔ ماما شاید۔۔۔۔۔۔“ مریم نے بات اسوری چھوڑ دی۔

”ماما کو ہماری بات ماننا ہوگی۔“ عاشری کا انداز حتمی تھا ”مور اور نینا چند دن کے لیے چھٹیاں گزارنے آئے ہیں اور ایک دن بھی سکون نہیں ملا۔“ اس نے چائے کی چسکی لی اور مسکرا کر تیمور کی طرف دیکھا ”تم لگنڈہ کرو موزو دودن میں یہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے یہاں سے۔“

”چمچ عاشری بچی۔“ تیمور خوش ہو گیا۔

”جی اور ہاں معید کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے سب لوگ تیار رہنا، شام کو لمبی ڈرائیو پر جائیں گے اور ڈرنج بھی باہر ہی کریں گے۔“

”رنجلی بچی۔“

”ہوں۔“

عاشری کے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔

”چند دن تو رہ گئے ہیں تمہارے واپس ہاسٹل جانے میں اس لیے ڈاکٹر معید کہہ رہے تھے کہ بھی تیمور میاں کو جاتے جاتے ایک اچھا سا ڈرودے دیا جائے ان کی پسندیدہ جگہ پر۔“

”معید بھائی بہت اچھے ہیں۔“ تیمور نے آنکھیں منکائیں اور نینا کو بتانے کے لیے اندر کی طرف بھاگا۔

”ماما کو اب شاید مور سے بھی محبت نہیں رہی۔ ہیں نا۔“

تیمور کے جانے کے بعد عاشری نے مریم کی طرف دیکھا تو مریم چونک گئی۔ وہ تو عاشری کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر ڈاکٹر معید کا نام لیتے ہوئے رنگ سا اتر آیا تھا ”تھینک گاڈ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی ”عاشری پلٹ آئی ہے ورنہ اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہتی اور شریل مرزا سے۔۔۔۔۔۔“

”بھئی، میں صحیح کہہ رہی ہوں ماما کو اب تیمور سے بھی محبت نہیں رہی۔“ عاشری نے اپنی بات دہرائی۔

مریم نے محبت سے اسے دیکھا ”ایسا بھلا کئے ہو سکتا ہے۔ ماما کو تو تیمور سے بہت زیادہ محبت تھی۔“

”تھی نا۔ ہے تو نہیں۔“ عاشری کے لہجے میں تلخی تھی۔

”نہیں عاشی ماما کو ہم سب سے زیادہ محبت ہے لیکن وہ اتنی معصوم رہتی ہیں کہ ان کے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے کہ ہمارے کیا مسائل ہیں۔ تم ان سے بدگمان نہ رہا کرو۔ مجھے یقین ہے جب تم آرام سے انہیں اپنا نقطہ نظر سمجھاؤ گی اپنے مسائل تو سمجھ جائیں گی اور ضرور مغنفر ملک سے بات کریں گی کہ وہ اپنے عزیزوں کو سمجھائے۔“

”بجو آپ ماما کو کچھ زیادہ ہی ڈیفنڈ نہیں کرنے لگی ہیں۔“ عاشی نے خالی کپ اٹھا کر ٹیبل پر رکھا۔ ”اما کے سوا ہمارا اور ہے کبھی اور ماما کا بھی تو کوئی نہیں ہے ہمارے سوا۔“

”یہ غلط فہمی ہے آپ کی بجو۔ ماما کے تو سب ہیں مغنفر ملک اور ان کے عزیز واقارب سب اور ماما تو کبھی بھی اکیلے نہیں رہیں۔۔۔۔۔ ہاں ہم اکیلے ہیں اور اگر عادل بھائی بھی نہ ہوتے تو ہم بالکل اکیلے تھے اور انکل جی جیسے لوگ ہمیں جیسے چاہتے استعمال کرتے۔“ وہ کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑی۔

”اور ان چند ہفتوں میں یہ عاشی کتنی عقل مند ہو گئی ہے۔“ مریم نے سوچا۔

”ارے ہاں آپ کو ایک خوش خبری سنانا تو بھول ہی گئی۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے ملی

”عادل بھائی نے بتایا تھا کہ کامل مل گیا ہے۔“

”ارے کہاں سے؟ کیسے؟“ مریم کو جچ بہت خوشی ہوئی۔

”ہاں نہیں لیکن مل گیا ہے۔“

”تب ہی شاید عادل بھائی اتنے دنوں سے نہیں آئے۔“ مریم نے سوچا ”ضرور جو ملی گئے ہوں گے۔ میں آج ہی ماما ہی فون کر کے مبارک دوں گی۔ ڈاکٹر عبدالمعید کے ہاں پارٹی ہی میں پروفیسر عادل سے بات ہوئی تھی اور وہ الجھ بھی گئی تھی۔ ان کا یہ کہنا کہ وہ اچھی لگ رہی ہے اور ان کے انداز نے کئی دن تک اسے ڈسٹرب کیے رکھا۔ مگر اس دن کے بعد وہ آئے ہی نہیں۔ حالانکہ ماما نے بھی ایک دو بار پوچھا تھا۔“

”اور ہاں نہیں ماما کیوں پوچھ رہی تھیں۔“

اس نے یوں ہی سوچا۔

ماما کا پروفیسر عادل کے ساتھ رویہ کبھی کبھی اسے برا حیران کرتا تھا۔ جس طرح کا ان کا مزاج تھا۔ اس سے یہ ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ پروفیسر عادل کے ساتھ ان کا رویہ اچھا ہو گا لیکن مریم کے لیے یہ از حد حیرت کی بات تھی کہ نہ صرف پروفیسر عادل کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا بلکہ وہ ان کی بات و اہمیت بھی دیتی تھیں حالانکہ وہ پاپا کے بیٹے تھے۔ اور پاپا کی بات کو ماما نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی ہمیشہ اپنی ہی بات منوائی تھی۔ شاید اس میں خود عادل خان کی شخصیت کا دخل ہے۔

اس نے سوچا۔

عاشی بھی تو ان کا احترام کرتی ہے۔ نینا اور مور بھی کتنا چاہتے ہیں انہیں اور خود اس کے دل میں بھی ان

کے لیے بے حد احترام تھا اور پھر پاپا کی نسبت وہ اسے عزیز بھی ہو گئے تھے اور اتنے دنوں سے وہ نہیں آئے تھے تو وہ ان کی کمی محسوس کر رہی تھی۔

عاشی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ وہ وہیں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ اگرچہ ٹی وی لاؤنج میں خنکی تھی پھر بھی کمرے میں جانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہاں نہیں کیا بے چینی تھی اور کیسا اضطراب تھا جو اسے بے چین کیے رکھتا۔ حالانکہ عاشی کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

عاشی نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر عبدالمعید کے ہاں پارٹی اینڈ کر کے آنے کے بعد سے وہ بہت مطمئن لگتی تھی اور جب کبھی ڈاکٹر عبدالمعید کا فون آتا تو نہایت خوش دلی سے باتیں کرتے ہوئے وہ ہولے ہولے مسکراتی رہتی اور کبھی کبھی اس کا چہرہ یک دم لودے اٹھتا تھا۔ ماما نے ڈاکٹر ہادی سے کہا تھا کہ وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ جا رہی ہیں۔ واپسی دو تین ماہ میں ہو جائے گی اور اگر عاشی کو رخصت کر دیں گی لیکن عاشی نے ڈاکٹر عبدالمعید سے کہا۔

”میں مگر رجبویشن کرنا چاہتی ہوں۔“

”بعد میں بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”نہیں بعد میں نہیں۔ ابھی۔۔۔۔۔ پہلے۔۔۔۔۔“

”اوکے۔“ ڈاکٹر عبدالمعید اس کی بات ٹال نہیں سکتے تھے۔ ”جہاں اتنا انتظار کیا وہاں کچھ اور بھی لیکن مگر رجبویشن کے بعد ماسٹرز کا پروگرام نہ بننا بیٹھنا۔“ ڈاکٹر عبدالمعید کے انداز میں شوخی تھی لیکن عاشی سنجیدہ تھی۔

”نہیں پراس۔“

اسے سنبھلنے کے لیے ناٹم چاہیے تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ سنبھل گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے ملال کے رنگ جھانکنے لگتے تھے اور اس کے دکھ کو محسوس کر کے مریم خود بھی اداس ہو جاتی لیکن اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر عبدالمعید کی رفاقت اور محبت پا کر بہت جلد عاشی کی آنکھوں میں بے ملال کے رنگوں کی جگہ خوشی کے جگنو اتر آئیں گے۔

”اور وہ۔۔۔۔۔ وہ خود کیا اسے بھی کوئی خوشی ملے گی۔“

”شاید نہیں۔۔۔۔۔ اور ماما کہہ رہی تھیں اسکاٹ لینڈ سے واپس آ کر وہ مریم اور عاشی دونوں کو رخصت کر دیں گی۔“

اور آئی نرگس نے کہا تھا ”ہاں یہ کام اب کر ہی لو۔“

”اور ہاں نہیں وہ شخص کون ہے جس کے ساتھ ماما نے میری شادی کا سوچ رکھا ہے۔ نہ کبھی کسی شخص کو لے لے ادھر آتے دیکھا ہے اور نہ ہی ماما نے کبھی ذکر کیا ہے۔“

”کہیں مٹی اٹک تو نہیں۔“

”اچانک اس کے دل میں خیال آیا مگر پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔

”نہیں بھلا وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ بہر حال جو بھی ہو مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ میں ماما سے کہہ دوں گی کہ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ ماما تو اتنی مصروف رہتی ہیں تیمور اور نینا کا کون خیال رکھے گا..... ماما کو تو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ تیمور کی چھٹیاں ہو رہی ہیں اور انہیں لینے بھی جانا ہے اور مجھ کو خیال رکھنا ہے ان سب کا اور اب اور بھی زیادہ جب کہ غضنفر ملک کے عزیزوں نے یہاں ڈیرا جمالیا تھا اور عاشی کی طرح تیمور بھی انہیں سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔“ اور وہ جانتی تھی کہ ماما کبھی بھی غضنفر ملک سے یہ نہیں کہہ سکتیں کہ انہیں جانے کے لیے کہے۔ وہ کسی طرح غضنفر ملک کی کسی بات کو ٹال نہیں سکتی تھیں۔ انہیں شاید اتنی ہی محبت ہوئی تھی غضنفر ملک سے اور ایک پاپا تھے جن کی ہر بات کو وہ بڑے آرام سے رد کر دیا کرتی تھیں۔

”ہے مریم۔“ عاصمہ نے اوپر بیڑھیوں سے آواز دی تو اس نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ تیمر گلابی رنگ کا ٹشو کا دو پٹہ اوڑھے اور گلابی رنگ کی ہی لپ اسٹک لگائے اور ہم رنگ سوٹ پہنے اور کانوں میں بڑے بڑے جھکے ڈالے شاید وہ کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”کیا ہے؟“ مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مومن ہے نیچے۔“

”نہیں۔“ مریم کا جواب مختصر تھا۔

”امامن۔ امامن۔“ اس نے منہ اوپر اٹھا کر آواز دی۔

”چلا گیا ہے کہیں سیر پائے کو۔“

”بھابھو بھی گئی ہے یا اکیلا ہی گیا ہے؟“ اوپر شاید امامن نے پوچھا ”ارے بھائی اکیلا کہیں جاتا ہے وہ ساتھ ہی گئی ہوں گی۔ کیوں مریم بڑی اماں بھی ساتھ ہی گئی ہوگی نا۔“ امامن کی بات کا جواب دے کر عاصمہ نے نیچے جھانک کر مریم سے پوچھا تو مریم نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”نہیں ہے بھابی نیچے وہ بھی گئی ہے۔“ اس نے اونچی آواز میں اوپر والوں کو بتایا اور خود کھٹ کھٹ کرتی ہوئی نیچے آگئی۔

”کیا کر رہی تھیں مریم؟“ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں۔ یوں ہی فارغ بیٹھی تھی۔“

”وہ..... وہ کیا نام ہے تمہارا سوتلا بھائی۔ وہ نہیں آیا بڑے دنوں سے۔“ عاصمہ نے عادل سے متعلق پوچھا۔ ”غالبا ان کے متعلق وہ معلومات حاصل کر چکی تھی۔

”کیوں کوئی کام تھا آپ کو ان سے؟“

”نہیں۔ ہاں نہیں تو کوئی کام تو نہیں۔“ وہ نگاہیں جھکا کر انگلی پر دوپٹہ لپٹنے لگی ”یوں ہی بہت دنوں سے دیکھا نہیں تو دل اداس ہو رہا تھا۔“ اس نے شرمانے کی ایکٹنگ کی اور بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے مریم پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی اور دلچسپی سے پوچھا۔

”ان کے نہ آنے سے آپ کیوں اداس ہو رہی ہیں؟“

”وہ دراصل یوں ہی۔“ وہ مزید شرمانے لگی ”ویسے مریم بھائی کے لیے کوئی لڑکی وڈی دیکھی۔“ شرمانے کی ایکٹنگ بدستور جاری تھی۔

”لوہ بھر کے لیے حرم کا چہرہ مریم کے سامنے آگیا۔

”ہاں۔“

”جی۔“ عاصمہ بی بی نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”لیکن وہ شریف تو کہہ رہا تھا۔ ابھی شادی وادی نہیں ہوئی لیکن لڑکی تو گھر ہی میں ہے۔ میرا مطلب ہے چچا کی بیٹی ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ اماں کہتی ہیں میرے جیسی سیدی سادی لڑکیاں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گی۔“

”بالکل۔“ مریم بے اختیار ہنس دی۔ ایسی بے اختیار ہنسی تو مدت سے نہیں آئی تھی۔

وہ خود ہی اپنی ہنسی پر چونک گئی۔

جب شہر بار تھا تو کبھی کبھار جب وہ یونیورسٹی آتا تھا یا وہ اس کے ہاسٹل جاتی تھی تو اس کے کسی لطیفے یا کسی بات پر وہ کبھی کبھی یوں ہی بے اختیار ہو کر ہنس پڑتی تھی۔ تو شہر یا بے اختیار اسے دیکھے چلا جاتا۔

”مومی تم ہنستے ہوئے کتنی خوب صورت لگتی ہو۔ خدا کرے تم ہمیشہ یوں ہی ہنسی رہو۔“ اور وہ محض اسے ہنسانے کے لیے ڈانچوں سے لطیفے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسے سناتا تھا۔

”اور تمہاری دعا شاید قبول نہیں ہوئی شہر یار۔“ وہ تو ہنسانے بھول گئی تھی۔

”لے ہنس کیوں رہی ہے تو۔“ میں نے کوئی غلط بات کہی ہے۔ پوچھ لے اماں سے ہزار بار اماں نے کہا ہے کہ میری جیسی لڑکیاں آج کل کہاں۔“

”صحیح، لیکن تیمور ہی ہے عادل بھائی کی بات تو بچپن سے ہی طے ہے۔“

”تو بچپن کی بات کو کون اہمیت دیتا ہے۔ امامن کی بات بھی بچپن سے نوری خالد کی بیٹی سے طے تھی لیکن وہ اپنی مرضی سے بھابی کو لے آیا اور یہ مومن اس نے تو اپنی مرضی سے منگنی رچائی تھی گل عابد دھوبی کی سالی سے۔ پر تیری اماں پر دل بھل گیا اس کا اور پھر جج تو یہ ہے کہ گل عابد دھوبی کی سالی اس کے معیار کی تھوڑی تھی۔ یوں بھی مومن کے لاہور آنے کے بعد وہ بھاگ گئی تھی کسی کے ساتھ۔“

”اچھا۔“ مریم ایک دم بے زار ہو گئی۔ ان لوگوں کی صحبت میں چند منٹ سے زیادہ بیٹھنا مشکل ہو جاتا

تھا اس کے لیے۔

”میں ذرا کمرے میں جا کر لیٹوں گی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ بیٹھیں گی یا.....؟“ مریم نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”لو میں خالی کمرے میں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ تمہیں دیکھ کر نیچے آگئی تھی ورنہ مومن نے منع کیا ہے کہ بلاوجہ نیچے نہ آیا کریں۔ تری ماں نے ہی کان بھرے ہوں گے اس کے۔“

”کس کے کان؟“ اماں اتنے دبے پاؤں بیڑھیوں سے نیچے اتر کر انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

”لو یہ کیا چوروں کی طرح چپکے سے آکر ڈرا دیا ہے بھائی۔ تمہاری عادتیں نہیں بدلیں گی۔“ عاصمہ نے اس کی آواز پر تقریباً اچھلتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا لیکن اس کی نگاہیں مریم کے سراپے پر یوں جمی تھیں جیسے ساکت ہو گئی ہوں۔

”سبحان اللہ۔“ کچھ دیر بعد اس کے لبوں سے نکلا اور وہ عاصمہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اس کی بات پر مسکرانے لگی تھی۔

”تو ادریشی دانت نکال رہی ہے اور ادھر اماں بے چاری کا ہاتھ جل گیا ہے۔ پکار رہی ہے تجھے۔“

”ہائے میں مرئی کیسے؟“ عاصمہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”چائے گرم گئی ہاتھ پر۔“

”گرم تھی۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

”نہیں ٹھنڈی تھی۔“ اماں قہقہہ مار کر ہنسا۔

”لیکن گرمی کیسے۔“ عاصمہ بدستور دل پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔

”تیری بھادج کا ہاتھ لگ گیا تھا۔ حبیب کو مارنے کے لیے اٹھایا تھا۔ اماں کے ہاتھ پر لگ گیا۔“

”جان بوجھ کر گرایا ہوگا۔ وہ تو ہے ہی اماں کی جان کی دشمن۔“

”لے اوپر اماں نے واڈیلا چھایا ہے اور نیچے تو یہی کہہ رہی ہے۔ جا کر اماں کو شہنشاہ کر۔ تو بھی اس کی

مزبان ہو گئی ہے۔“

”جانتی ہوں تیری بیوی کو کسی گتوں کی پوری ہے۔“ عاصمہ گھورتی ہوئی بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”سنجھل کر جائیو کہیں اماں کا ہاتھ جلا ہے تیری بڑی پلی نٹوٹ جائے۔“

”تجھ سے میں بعد میں بات کروں گی اماں پہلے میں اماں کو دیکھ لوں۔“

”ارے کیا بات کرے گی تو مجھ سے۔“ وہ ہنسا۔

مریم حیران کھڑی تھی۔ یہ کیسا انداز تھا اور کیسا طرز گفتگو۔ اگرچہ مریم بہت دنوں سے دیکھ رہی تھی مگر بھی ہر بار اسے حیرت ہوتی۔ ماں، بہنیں، بھائی سب ایک ہی انداز میں ایک دوسرے کو مخاطب

کرتے تھے۔

نہ کوئی ادب نہ کوئی احترام

”بڑی حسین لگ رہی ہو۔“ اماں ایک قدم آگے بڑھا۔

”شٹ اپ۔“ مریم کو از حد غصہ آیا۔

”لو میں نے کیا کہہ دیا۔ جس پر اتنی گرم ہو رہی ہو۔“

”پلیز آپ میرے ساتھ بات نہ کریں اور جائیں اوپر۔“

”واہ کیوں جائیں اوپر۔ ہمارے بھائی کا گھر ہے جہاں مرضی ہوگی بیٹھیں گے۔ کون روک سکے گا بھلا ہمیں۔“

”تو ٹھیک ہے بیٹھیں آپ۔“ مریم نے جل کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”ارے کہاں چلی ہو۔ ہم تو صرف تیری خاطر نیچے اترے ہیں ورنہ اس وقت تو حبیب کی اماں بھی

غضب ڈھار رہی تھی۔ صبح نہادھو کر لال جوڑا پہن کر دلہن بنی بیٹھی ہے۔ قسم سے سینے پر ہاتھ رکھ کر

آیا ہوں۔ اماں کو تو جلا پا ہے۔ بہو سے داویلا کرنے کی عادت ہے۔ ایک ساتھ بیٹھے نہیں دیکھ سکتی۔ اتنا شور

چھایا کہ عاصمہ کو بلاؤ کہ مجھے اٹھنا ہی پڑا حبیب کو نیچے نہیں بھیجا خود ہی آگیا کہ شاید تو نظر آجائے اور تجھے

دیکھ کر دل خوش ہو گیا اللہ قسم۔“

ضبط کی کوشش میں مریم کا چہرہ آگ کی طرح دھک اٹھا۔ وہ ہونٹ بھینچنے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

”دو گھڑی رک کر بات تو کرلو۔ اللہ قسم ایک بار تو ہاں کر دے تو پاؤں دھو دھو کر بیٹوں گا۔ پوچھ لے

حبیب کی اماں سے کیسے چار پائی پر ہٹا رکھا ہے۔ تجھے بھی خوش رکھوں گا۔ حبیب کی اماں کی فکر نہ کر تیری

نوکرانی بن کر رہے گی۔“

”کیا بکواس ہے۔“ مریم کے ہاتھ سے ضبط کی لگامیں گر پڑیں۔

”لودل کی باتوں کو بکواس کہتی ہو۔ اللہ قسم جب سے تمہیں دیکھا ہے رات رات بھر جاگتا ہوں۔“

”میں آج ماما سے آپ کی شکایت کروں گی۔“ مریم نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے غصے سے کہا۔

”لو میں نے کیا کیا ہے جو شکایت کرو گی اور تری اماں کیا کر لے گی میرا۔ ابھی تو مومن کو نہیں جانتی

بڑا ہاتھ چٹ ہے۔ چٹنی بنا کر رکھ دے گا تیری اماں کی۔ بھائی کی شکایت نہیں سنے گا وہ۔“

”کیا بات ہے بھو؟“ عاشری نے کمرے سے جھانک کر دیکھا اور باہر نکل آئی۔ وہ غالباً کہیں جانے

کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ مریم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”نہیں جارہی ہو کیا؟“

”ہاں نینا اور مور کو کہیں گھمانے لے جا رہی ہوں۔ آپ چلیں گی ساتھ۔“

”ہاں۔“ مریم نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔

”تو پھر آجائے میں گاڑی نکالتی ہوں۔“

”مور نینا تم بھی آ جاؤ۔ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔“ اس نے مڑ کر آواز دی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔

”واہ اکیلے اکیلے سیریں ہوں گی، ہمیں بھی لے چلو ساتھ۔“ اماں غلیظ نظروں سے عاشری کی طرف

دیکھ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ بڑی دیر سے یہاں تشریف فرما ہیں اب تشریف لے جائیے۔“

”واہ کیوں جائیں۔“

”کیوں نہ جائیں۔ زیادہ دیر تک فضول لوگوں کو میں اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی لہذا اٹھیے اور

اوپر چلے جائیے۔“

”عاشری لیواٹ۔“ مریم نے آہستگی سے کہا۔

”میں بہت دیر سے اس کی فضول گوئی سن رہی ہوں۔“ عاشری مریم کی بات کا جواب دے کر اس کی

طرف مڑی۔

”بہتر ہے کہ آپ صرف اوپر تک ہی محدود رہا کریں۔ جہاں ماما نے آپ کو رہنے کی اجازت دی

ہے۔ ہر جگہ پر اپنا استحقاق مت جتانیں۔“

”نہیں جاتے کیا کر لو گی تم۔“

”دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا کر لوں گی میں تو دیکھیں۔“ عاشری نے اسے گھورا۔

”اللہ قسم غصے میں بھی اچھی لگ رہی ہو۔ بیجا مرج لگ رہی ہو۔ بڑی تو بڑی چھوٹی سبحان اللہ۔ دیے

قسم اللہ پاک کی تیرے جیسی بیجا مرج کا حزا ہی اور ہے۔ غصہ تم کو دے۔ تیری بہن تو کچھ بھی نہیں تو

تو۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ ہلدی تو ہلدی ہے۔ سوٹھ کڑا کے دار۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری ”ایمان

سے تو ہی ہاں کہہ دے۔ اگر کہے تو حبیب کی ماں کی چٹنی کرادوں گا۔ بھاڑ میں جائے۔“

”شریف۔۔۔ شریف۔“ مریم کا رنگ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا ”خان بابا کو بلاؤ اور اس شخص

کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔“

”مگر وہ۔۔۔“ شریف ہچکچایا۔

”سانہیں تم نے۔“ عاشری کی آواز بہت بلند تھی۔

”جی۔ جی۔“ شریف باہر کی طرف لپکا۔

”رکو رکو بھائی بھائی۔ جار ہا ہوں اوپر لیکن دیکھ لیتا شکایت کروں گا تیری مومن سے۔ کہ

دوں گا تیرے گھر میں یہ عزت ہے میری۔ تم تو اتنی دور سے مارے محبت کے آئے ہیں اور یہاں۔۔۔۔۔“ وہ

بڑبڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

عاشری سر ہٹا کر بیٹھ گئی۔

تیور اور نینا خاموش کھڑے تھے۔ مریم نے آگے بڑھ کر عاشری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ریلیکس عاشری۔“

”بجو۔“ عاشری نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں اور پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے بجو۔ ماما آخر ان لوگوں کو کیوں نہیں روکتیں۔ کیوں اتنی ڈھیل دے رکھی ہے انہیں۔“

وہ روہنی ہو رہی تھی۔

”ٹیک اسٹ ایزی عاشری۔ میں آج ماما سے بات کروں گی۔“

”ہاں مومو۔ آپ ماما سے ضرور بات کرنا۔ یہ سب لوگ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ تیور نے بھی اس کا

ہاتھ ہلا کر اٹھا کر خیال کیا۔

”اوکے ڈیر۔“ مریم نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا ”آج ماما سے بات ہوگی۔ دراصل وہ اتنی بڑی

رائی ہیں اور انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ یہ لوگ کس طرح کے ہیں۔ اب میں بتاؤں گی تو پتا چلے گا۔“

”ہاں تو یہ ہے۔“ تیور نے سر ہلایا۔ عاشری خاموش بیٹھی تھی۔ سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ یک دم ہی

سر میں درد ہونے لگا تھا۔

”چلیں نا بجی۔“

”مور نہیں رہا مور کل چلیں گے۔“

تیور خاموش ہو گیا۔

”کم آن عاشری۔ اب بچے تیار ہیں تو چلتے ہیں۔ ذرا ان کی آؤٹنگ ہو جائے گی اور تم بھی فریش

ہو جاؤ گی۔“

”اور کیا گھر میں یوریت ہے اور پھر عادل بھائی بھی نہیں آئے اور عادل بھائی کتنے اچھے ہیں۔

یوں نا بجو۔“

ننانے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں واپسی پر عادل بھائی کی طرف جائیں گے۔“ تیور نے خوشی سے کہا ”اتنے دنوں سے وہ آئے

نہیں اور انہوں نے فون بھی نہیں کیا۔“

”کہیں بیمار نہ ہو گئے ہوں۔“ نینا نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں۔“ عاشری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دو تین دن قبل فون آیا تھا۔ مصروف تھے بہت۔ وقت نہیں مل سکا..... کامی کی طبیعت بہت خراب تھی اسے کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا تھا۔ کہہ رہے تھے کامی کو حویلی چھوڑ کر آؤں گا تو ادھر آؤں گا طے۔“

”تو بھی کیا حرج ہے دیکھ لیں گے۔ کیا خبر گھر میں ہی ہوں۔ کامی بھائی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ تیمور نے اصرار کیا۔

”ہاں چلے چلیں گے۔“

مریم کا جی بھی کامی کو دیکھنے کو چاہنے لگا۔ کس قدر معصوم تھا وہ..... لوگ سا۔ جن دنوں وہ حویلی میں تھی تو وہ کتنا مانوس ہو گیا تھا اس سے۔

”اور خدا جانے اتنا عرصہ کہاں رہا اور کیسے ملا۔ ماں جی تو بہت خوش ہوں گی۔ واپس آ کر وہ ضرور حویلی فون کرے گی۔“ مریم نے سوچا اور مور کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چلو بھئی اب دیر نہیں کرو۔“

اور پھر وہ منہ کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر سب کے ساتھ باہر آ گئی۔



پورچ میں نئب ملک کی گاڑی کھڑی دیکھ کر تیمور نے مریم کا ہاتھ دبایا۔

”ماما آ گئی ہیں۔“

”ہوں۔“ مریم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور مڑ کر گاڑی لاک کی۔

”وہ جو انکل ہیں! امن صاحب انہوں نے ماما سے آپ کی اور بچوں کی شکایت کر دی ہوگی۔ ہیں نا مومو۔“

”تو۔“ عاشری نے اسے گھورا ”کردی ہے تو کرتے رہیں۔“

”تو پھر ماما آپ کو ڈانٹیں گی۔“

”بالکل بھی نہیں ڈانٹیں گی۔“ مریم نے اس کے رخسار چھپائے۔

”تو اور کیا انہیں ڈانٹیں گی کہ وہ ہم سے لڑائی کیوں کرتے ہیں۔“ نینا نے بھی اس کی تائید کی۔

”ہاں مگر ماما کچھ عجیب سی ہو گئی ہیں۔ دیکھ لیتا اگر انہوں نے شکایت کی نا تو ماما مومو اور بچی کو ڈانٹیں گی۔“ تیمور نے بڑے مدبرانہ انداز میں نینا کو جواب دیا۔

مریم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ مور اسے کتنا پیارا تھا اور کتنا حساس تھا! اتنی سی عمر میں ہی۔ وہ سب سے خوش تھے۔ بہت انجوائے کیا تھا انہوں نے اور اس کا دھیان بھی نہیں رہا تھا کہ گھر سے نکلنے سے پہلے ماں سے کس قدر بد مزگی ہو گئی تھی۔ واپسی پر وہ پروفیسر عادل کی طرف بھی گئے تھے لیکن خدا بخش نے بتایا تھا۔ وہ حویلی گئے ہیں اور دو ایک روز میں ماں جی اور بی آپا کو لے کر آ رہے ہیں۔

خدا بخش نے اصرار کر کے انہیں روک لیا تھا اور چائے کے ساتھ شامی کباب کھلائے تھے اور عثمان احمد کے بچپن کی باتیں انہیں سناتے رہے تھے۔

”مور میاں بچپن میں آپ کے پاپا بالکل آپ کی طرح بہت سوال کرتے تھے اور ان کی پیشانی تو بالکل آپ جیسی تھی۔“

”اور میں..... کیا میں بھی پاپا جیسی ہوں۔“ نینا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہوں۔“ خدا بخش نے اسے غور سے دیکھا ”آپ کی ناک تو بالکل عثمان میاں جیسی ہے اور عاشری بچائی کی آنکھیں اور یہ کان کے پاس ننھا سا تل بالکل اپنے پاپا جیسا ہے۔“

”اچھا۔“ عاشری مسکرائی۔

”ہاں عثمان میاں کے دائیں کان کے پاس بالکل اسی جگہ پر ایسا ہی تل تھا۔ بس وہ ذرا بڑا تھا۔ یہ ذرے چھوٹا ہے۔“

”بابا آپ پاپا سے پیار کرتے تھے؟“ عاشری نے پوچھا۔

”ہاں وہ تھے ہی بہت اچھے نرم مزاج اور محبت کرنے والے۔“

مریم کا جی چاہا وہ پوچھے کیا میں..... کیا میں بھی پاپا جیسی لگتی ہوں..... لیکن وہ میرے پاپا تو نہیں ہیں۔ بھلا میں کیسے پاپا سے مل سکتی ہوں لیکن یہ خواہش اتنی شدت سے اس کے اندر پیدا ہوئی کہ خدا بخش کہہ کر وہ بھی اپنے پاپا سے ملتی ہے وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”اور بابا میں..... کیا میں بھی پاپا سے ملتی ہوں؟“

عاشری نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”اور شاید بچو کسی بھی یہ تسلیم نہ کر سکیں کہ پاپا ان کے پاپا نہیں تھے حالانکہ یہ حقیقت ہے۔“

”مریم بی بی آپ کا لہجہ آپ کا بات کرنے کا انداز بالکل اپنے پاپا جیسا ہے۔ بالکل وہی نرمابٹ وہی

ملی۔ وہی دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرنا۔“

اور وہ بے اندازہ خوش ہو گئی تھی۔

ہاتھیں کیوں۔

”دو آپ کو ڈر لگ رہا ہے ماما سے۔“ تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا ”میں ہوں نا آپ کے

بچہ۔“ اس نے گویا اسے تسلی دی۔ تو چونک کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”تم ہوتا میرے ساتھ میرے اپنے بھائی اپنے دوست تو پھر مجھے کسی کا بھی ڈر نہیں ہے۔“

عاشری اور نینا انداز چاچی تھیں۔ وہ بھی تیمور کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی آئی۔ خلاف توقع ماما اور غضنفر ملک ٹی لائونڈن میں ہی تھے اور ان کے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر نظریں

جمنے وہ ایش ٹرے گود میں رکھے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا اور ٹی وی پر کوئی اشتہار چل رہا تھا۔ غالباً چائے کا۔

عاشی سیدھی بچن کی طرف چلی گئی تھی کیونکہ تیور کی فرمائش پر انہوں نے رستے سے اسپرنگ چکن پیکر کروایا تھا۔

”السلام علیکم ماما“ مریم نے نذنب کو سلام کیا جس کا جواب انہوں نے سر کے اشارے سے دیا۔

مریم تیور کا ہاتھ پکڑے کچھ دیر وہاں ہی کھڑی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں بیٹھے یا اپنے کمرے میں چلی جائے۔ تب ہی عاشی مغو کو چکن دے کر بچن سے باہر نکلی اور نذنب کو سلام کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو نذنب نے اسے پکارا۔

”عاشی ادھر آؤ۔ مومو تم بھی اور مومو تم جاؤ اپنے کمرے میں۔“

مریم نے تیور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تیور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ وہ جانے یا رک جائے۔ مریم نے مسکرا کر اسے جانے کے لیے کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ماما کے سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

”دیر ازسم تھنک رانگ مومو“ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے تیور نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”ڈونٹ وری۔“ مریم نے مسکرا کر اسے تسلی دی اور عاشی کی طرف دیکھا جو ابھی تک دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

”عاشی میں نے تمہیں بلایا ہے۔“

”خیریت ہے؟“ عاشی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مریم کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے نذنب کو دیکھنے لگی۔

”عاشی اور مومو تم دونوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ اما من بھائی نے شکایت کی ہے کہ تمہارا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ اور یہ کہ تم ان کی انسٹل کرتی ہو۔ دونوں روز گھر سے جانے کا کہتی ہو ان سے۔“

”بہت خوب اور کیا فرمایا انہوں نے۔“ عاشی کی آنکھوں میں تمسخر تھا اور لہجے میں ہلکا سا طنز۔

”عاشی اپنا لہجہ درست کرو۔“ نذنب ملک کو غصہ آ گیا۔

”مرکز خفنر ملک صاحبہ آپ نے ان سے یہ تو پوچھا ہوتا کہ وہ کیا فرما رہے تھے۔ کیا انہوں نے اپنے

ارشادات سے آپ کو مستفید نہیں کیا۔“

”عاشی۔“ نذنب کا رنگ یک دم سرخ پڑ گیا ”میں تمہاری بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”اوکے م۔“ عاشی کھڑی ہو گئی ”تو میں جاؤں اپنے کمرے میں۔“

”شٹ اپ۔“ نذنب کی آواز بلند تھی ”آئندہ مجھے تمہاری کوئی شکایت نہ ملے اور نہ ہی میں یہ سنوں کہ تم نے انہیں گھر سے جانے کو کہا ہے۔ مہمان ہیں وہ ہمارے۔“

”مہمان۔“ وہ طنزیہ ہنسی۔

خفنر ملک خاموش بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ بلا کا تھل تھا اس میں اور کبھی بھی وہ ان کے آپس کی منگٹو میں دخل نہیں دیتا تھا۔ شاید اندر سے جانتا تھا کہ نذنب اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرے گی اور جو کچھ وہ چاہے گا وہی ہوگا۔

”عاشی میری بات سن لی ہے نا تم نے؟“ انہوں نے پھر اپنی بات دہرائی۔

”ہیں ماما لیکن آپ بھی سن لیں اور اپنے شوہر نامدار کے ان برادر محترم کو کہہ دیں کہ وہ اپنی حد میں رہیں۔ اگر انہوں نے آئندہ حد سے نکلنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا اور بہتر ہے کہ وہ اپنے حصے تک ہی محدود رہا کریں۔“

عاشی بات مکمل کر کے اٹھی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مریم حیران سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ماما نے اما من کی شکایت تو سن لی تھی لیکن ان سے پوچھا تک نہ تھا کہ آخر بات کیا تھی۔ عاشی کے کہنے پر بھی نہیں۔ وہ ایک شخص جس سے ان کی آشنائی زیادہ نہ تھی۔ اس کی بات پر انہوں نے فوراً اعتبار کر لیا تھا اور وہ جوان کی بیٹیاں تھیں ان کا اعتبار نہیں تھا انہیں۔

”اور مومو تم۔“ عاشی کے جانے کے بعد نذنب اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”زینی میں ذرا اوپر جا رہا ہوں اما من کی طرف۔“ بھیا بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت کچھ نامساز ہے۔“

خفنر ملک نے گود میں رکھا ہوا ایش ٹرے اٹھا کر میز پر رکھی۔

نذنب نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک گہری نظر مریم اور نذنب پر ڈالتا ہوا اوپر جانے کے لیے بیڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم نے عاشی کا دماغ خراب کیا ہے۔“

”میں نے۔“ مریم نے سراٹھا کر بے حد حیرت سے انہیں دیکھا۔

”ہاں تم نے۔“ بجائے اس کے کہ تم عاشی کو سمجھاتیں انا تم نے خود بھی اما من کو اوپر چلے جانے کو کہا۔“

”ماما آپ جانتی ہیں آپ کو پتا ہے کہ وہ شخص کیا فضول اور بے ہودہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ۔۔۔۔۔“

”کیوٹ مومو۔“ نذنب نے اس کی بات کاٹ دی ”اگر اما من نے مذاق میں کوئی بات کہہ بھی دی تھی تو کیا حرج تھا لیکن تمہارا ذہن ہمیشہ سے بہت محدود ہے۔ تم جی کے ساتھ بھی بدتمیزی کرتی تھیں اور عاشی نے بھی یہ تم سے ہی سیکھا ہے۔ اتنے اچھے اور اعلیٰ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود تمہارا ذہن اپنے

باپ کی طرح ہے۔ محمد دوسوچ، دقتا نوی خیال۔“

”اپنا باپ اپنا باپ۔“ مریم کے دماغ پر جیسے کوئی ہتھوڑے برسائے لگا۔

”کون ہے وہ؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”ماما پلیز“ آج مجھے بتادیں کہ وہ کون ہے، کہاں ہے، کس جگہ ہے؟“

اس کے لہجے میں التجا تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے لیکن اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ جیسے اپنے باپ سے باتیں کر رہی ہو۔ نہ نب نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور کھڑی ہو گئیں۔

”وہ غزنی کے بہن بھائی ہیں اور تمہیں نہ صرف خود ان کا احترام کرنا چاہیے بلکہ مور اور نینا کو بھی سمجھانا چاہیے۔“ انہوں نے ایک تنبیہی نظر سناکت کھڑی مریم پر ڈالی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ غالباً مختصر ملک کو خوش کرنے کے لیے اس کی والدہ کی مزاج پر سی کوجا رہی تھیں۔

”اور میں آج ہی عادل خان کو فون کرتی ہوں اور ڈاکٹر ہادی سے بھی کہتی ہوں۔ کوئی انتظار نہیں کروں گی اب سال دو سال کا۔“ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے انہوں نے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا لیکن مریم کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ خالی خالی ذہن کے ساتھ انہیں اوپر جاتے دیکھتی رہی۔

”اور ماما، میں بھی کبھی نہیں جان پاؤں گی کبھی نہیں۔ شاید آپ کو کسی سے بھی محبت نہیں ہے اور صرف اپنے آپ سے محبت ہے۔ عاشی صحیح کہتی ہے۔“

آنکھوں میں اکٹھے ہو جانے والے آنسو یک دم باہر نکل آئے۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسوؤں کو صاف کیا لیکن آنسو تھے کہ اندے چلے آرہے تھے۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے عاشی اور تیمور وغیرہ کے کمروں کی طرف دیکھا۔ ان کے دروازے بند تھے۔ عاشی کے کمرے سے میوزک کی آواز آرہی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ جب ڈسٹرب ہوتی تو فون آواز میں میوزک لگا دیتی۔ اس نے ایک قدم عاشی کے کمرے کی طرف بڑھا یا لیکن پھر یک دم واپس پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف تقریباً بھاگتی ہوئی چلی گئی اور اپنے بیڈ پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی۔



”چینی ون سے“ تیمور کی جینز لے کر مریم باہر نکلی تو اسے ایک دم گمان ہوا جیسے اس نے لالہ کی جھلک دیکھی ہو لیکن تیمور کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی بے دھیانی میں وہ پارکنگ کی طرف بڑھ گئی لیکن لالہ کی دروازہ کھولتے کھولتے اچانک اسے یاد آیا کہ ابھی جینز لے کر جب وہ باہر نکل رہی تھی تو کونے میں جہاں بیڈز وغیرہ تھے اس طرف مڑتے ہوئے ایک لڑکی پر اسے لالہ کا گمان ہوا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے کی ایک سائڈ پر اس کی نظر پڑی تھی اور اس کے ذہن کے اندر کہیں لالہ کا نام گونجا تھا مگر پھر وہ تیمور کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ مگر اب اچانک ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

وہ سونی صد لالہ تھی۔ یقیناً اس کے بالوں کا اسٹائل اور دائیں طرف گردن پر بڑا سائل۔ اس کے چہرے کا دایاں حصہ اور گردن اس نے دیکھی تھی لیکن بس..... شاید اسے لالہ کے یہاں ملنے کا امکان نہیں تھا اس لیے..... ”نہیں وہ لالہ ہی تھی۔“

اس نے بڑے یقین سے ایک بار پھر خود سے کہا اور جینز کا پیکٹ تیمور کے ہاتھ میں تھا کر واپس پلٹی۔ ”مور تم رکو یہاں میں ابھی آتی ہوں۔“

”کیا ہوا مومو؟“

”بہن ایک منٹ میری جان۔ میرا خیال ہے وہاں اندر میری ایک دوست ہے۔“

”کمال ہے مومو! آپ نے وہاں نہیں دیکھا تھا اسے؟ لگتا ہے آپ ڈنٹی طور پر حاضر نہیں ہوتی ہیں۔“

”ہاں۔“

تیمور کی بات کا جواب دیے بغیر وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھی اور پھر وہ اسے جو گزر خریدتی ہوئی نظر آگئی..... بلاشبہ وہ لالہ ہی تھی اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔

”لالہ۔ تم کب آئی ہو..... اور تم نے فون ہی نہیں کیا بے وفا۔ میں تمہیں کتنا یاد کرتی تھی اور.....“

”یہ مریم ہے میری دوست۔ ہاسٹل میں ہم اکٹھے رہتے تھے۔“ اس نے مریم کی بات کاٹ دی۔ مریم نے حیرت سے منہ کھولا اور بند کر لیا۔

ادھیڑ عمر خاتون نے سرسری سی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر شوکیس میں جوتے دیکھنے لگی۔

”کیسی ہو مومو؟“ لالہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا اور پھر اس کے کان میں سرگوشی کی

”میں رات میں تمہیں فون کروں گی۔ ابھی کچھ نہ کہنا۔“

”یہ مریم نے پھر کہا تھا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”مئی کیسی ہیں۔“ خاتون ذرا آگے بڑھیں تو اس نے پھر سرگوشی کی اور مریم کو پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔

”تم گھر نہیں گئیں۔ آئی سے نہیں ملیں۔ یہاں آ کر بھی۔“

”نہیں اور تم مئی کو مت بتانا میرا۔“

”لالہ..... کم آن ڈیزر یہ دیکھو۔ مئی کے لیے یہ ڈریس کیسا رہے گا۔“ خاتون نے اسے آواز دی تو وہ تھکاتی ہوئی جلدی سے خاتون کی طرف بڑھ گئی۔

”اوکے پھر رات میں۔“ جاتے جاتے اس نے سرگوشی کی تھی۔

لحہ پھر تو مریم حیران سی کھڑی اسے خاتون کے ساتھ دوسری طرف جاتے دیکھتی رہی پھر واپس آئی۔

”آپ کو اپنی دوست ملی مومو؟“ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تیمور نے پوچھا۔

”ہاں۔ نہیں تو وہ کوئی اور تھی۔“ وہ چونکی۔

”آپو رائٹ مومو؟“ تیمور نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”لیس۔“ مریم نے مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

لیکن اس کا ذہن لالہ میں الجھا ہوا تھا۔ لالہ کتنی بڑی لگ رہی تھی اور کس قدر کمزور بھی اور وہ خاتون کون تھی اور پھر اس خاتون کے سامنے لالہ نے جھوٹ بولا کہ وہ ہاسٹل میں اس کے ساتھ..... لالہ می سے بھی نہیں ملی۔

شاید وہ اس کے ڈیڑی کی کوئی عزیز ہوگی اور ممکن ہے کہ اس کے ڈیڑی نے منع کیا ہو کہ وہ می سے نہ ملے۔ مریم کو سب کچھ جان لینے کی از حد بے چینی تھی مگر لالہ تو خاتون کے بلانے پر چلی گئی تھی اور پتا نہیں رات کو فون بھی کرے گی یا نہیں۔

تیمور بولتا رہا لیکن اس کا ذہن راستے بھر لالہ ہی میں الجھا رہا۔ تیمور اور نینا کو صبح مری جانا تھا۔ ان کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ تیمور کا قد تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اس کی ساری چیزیں چھوٹی ہو گئی تھیں۔ عاشی اور نینا ڈاکٹر عبدالمعید کے گھر گئی ہوئی تھیں اور وہ تیمور کے ساتھ چین ون آئی تھی تاکہ اس کی پسند کی چیز اسے لے کر دے سکے۔

”مومو! اس بار میرا دل اس جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔“ تیمور نے باہر دیکھتے ہوئے اچانک کہا۔

”کیوں بھلا۔“ مریم نے اس کی طرف دیکھا۔

”بس یوں ہی دل ادا اس ہو رہا ہے۔“

”مگر پڑھائی تو کرنا ہے میری جان۔“

”مومو کیا میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔ آپ کے اور عاشی کے ساتھ رہ کر۔“

”ہاں لیکن ماما کی خواہش تھی کہ تم وہاں پڑھو۔“

”مگر اب تو ماما بہت بدل گئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے اب انہیں مجھ سے پیار نہیں رہا۔“

”وہم ہے تمہارا۔“ مریم نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھ رکھے دوسرے ہاتھ سے اس کا رخسار چھنچھایا۔

”ماما تم سب سے اب بھی پیار کرتی ہیں۔“

”شاید۔“ اس نے کندھے اچکائے..... ”آپ کو پتا ہے ماما اور وہ..... حبیب کے چاچو صبح اے کٹ

لینڈ جا رہے ہیں، فلم کی شوٹنگ کے لیے۔“

”نہیں تو۔“ مریم کو حیرت ہوئی۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ ماما اور غضنفر ملک نے کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ جانا ہے اور بات غالباً ماما نے ڈاکٹر عبدالمعید کے ہاں پارٹی پر بھی بتائی تھی اور بعد میں بھی اس کا ذکر ہوتا رہتا تھا لیکن

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ کب اور ماما نے رات سب کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا لیکن کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور آج صبح ناشتے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک لوگ روم میں بیٹھی رہی تھیں اور وہ بھی وہاں اخبار دیکھ رہی تھی..... لیکن ماما نے کوئی ذکر تک نہیں کیا تھا کہ وہ کل جا رہی ہیں۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے مور؟“

”حبیب نے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے چاچو اسکاٹ لینڈ سے بہت سے کھلونے لے کر آئیں گے اور عاصمہ آنٹی کے لیے بھی چیزیں لائیں گے اور دادا کے لیے ریڈیو لائیں گے۔“

”تمہاری حبیب سے دوستی ہو گئی کیا؟“

”نہیں تو..... وہ خود ہی آیا تھا میرے کمرے میں یہ بتانے کہ اس کے چچا اس کے لیے ویسی ہی ٹی وی تم لے آئیں گے جیسی میرے پاس ہے۔ مجھے تو وہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ روز ہی تو لڑائی ہوتی ہے اور وہ بڑھوٹا بھائی ہے اس کا نجیب اس نے مجھے گالی بھی دی تھی۔“

”اور ماما کتنی دور ہو گئی ہیں ہم سے کتنی اجنبی۔“ اس نے بے حد دکھ سے سوچا۔

”اور اب جائیں گی تو نہ جانے کتنے دنوں بعد آئیں گی۔ دو تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے اور پیچھے سے یہ لوگ ہوں گے۔ عاصمہ اور اس کی بہن اور والدہ تو پھر بھی گوارا تھے لیکن یہ اما سن صاحب کسی صورت قابل برداشت نہ تھے..... حالانکہ جب آئے تھے تو چند دن کا کہہ رہے تھے لیکن اب جانے کا نام نہیں لے رہے تھے اور ماما کے بعد پتا نہیں ان کا کیا رویہ ہوگا۔“

”دیکھ لیں گے اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو عادل بھائی اور معید بھائی بھی تو ہیں نا، میں ان سے کہہ دوں گی۔“

اس نے خود کو تسلی دی اور تیمور سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے ایک بار پھر اس کا ذہن لالہ کی طرف چلا گیا۔

”اور لالہ اس طرح کیوں کر رہی تھی۔ وہ آنٹی نرگس سے کیوں نہیں ملی۔ کیا وہ اعزاز سے ملنے آئی ہے۔ پتا نہیں اعزاز سے ملی بھی ہے یا نہیں اور پتا نہیں وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ کس کے پاس اگر وہ اپنے گھر آئی تو کیا وہ آنٹی سے اتنی ہی خفا ہے کہ گھر بھی نہیں گئی..... اور اگر رات کو اس نے فون کیا تو میں اسے بتاؤں گی کہ آنٹی نے کہا ہے کہ اگر وہ گھر لوٹ آئے تو وہ اعزاز سے اس کی شادی کر دیں گی اور یہ جان کر کہ اعزاز سے آنٹی کی بہت دوستی ہو گئی ہے اور اعزاز اکثر آنٹی سے ملنے جاتا رہتا ہے۔ وہ کس قدر خوش ہوگی۔“

یوں ہی لالہ کے متعلق سوچتی پیکٹ ہاتھ میں اٹھائے تیمور کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی اور پھر وہیں ٹھک کر رک گئی۔

لاؤنج کے عین وسط میں ماما کھڑی چیخ رہی تھیں اور ٹی وی پر ہاتھ رکھے عاشی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے روٹی رسی ہو اور ٹی وی پر رکھا اس کا ہاتھ جذبات کی شدت سے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

”تم..... تم عاشی حد سے بڑھ رہی ہو۔“ ماما کی آواز بہت بلند تھی۔ مریم ہم کرو ہیں کھڑی ہو گئی۔ تیور نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ لیا۔

”حد سے میں نہیں بڑھی“ آپ بڑھ رہی ہیں۔“ عاشی کی آواز آہستہ اور لہجہ مضبوط تھا ”ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ ہمارا مکان خالی کر دیں۔ میں مزید ایک دن بھی انہیں برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تم کون ہو انہیں گھر سے نکالنے والی۔“ ننب کی آواز بلند تھی اور غصے سے ان کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ مریم کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس کی طرف جائے۔ ماما کو خاموش کرانے یا عاشی کو منع کرے۔

”میں..... عثمان احمد کی بیٹی ہوں اور یہ عثمان احمد کا گھر ہے۔“

”یہ گھر میرا ہے۔ میرے نام ہے یہ گھر اور میرا جس کو جی چاہے گا اُسے میں اپنے گھر میں رکھوں گی۔“

”تو ٹھیک ہے“ آپ رکھیں ان کو اس گھر میں۔ ہم چلے جائیں گے اس گھر سے۔“

”میری طرف سے جنم میں جاؤ لیکن میں یہ برداشت نہیں کروں گی کہ اس گھر میں رہ کر تم امان بھائی سے یا کسی اور سے بدتمیزی کرو۔“

”اور آپ کے امان بھائی چاہے آپ کی بیٹی کو.....“ وہ تسخر سے ہنسی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سر اٹھا کر ایک تیز نظر ان پر ڈالی۔

”آپ کو آپ کا گھر مبارک ہو۔ میں صبح ہی چلی جاؤں گی اور سب کو ساتھ لے جاؤں گی۔“

”کہاں جاؤ گی؟“ اب کے ننب کے لہجے میں تسخر تھا۔

”اپنے باپ کے گھر۔“

”دیکھو گی کتنے دن رہتی ہو اپنے باپ کے گھر میں۔“

”نذرہ سکی تو آپ کی طرف لوٹ کر نہیں آؤں گی۔“

مریم ساکت کھڑی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اور کس طرح دونوں کو روکے۔ ماما حد سے بڑھ رہی تھیں اور عاشی..... خدا جانے اس کی عدم موجودگی میں کیا ہوا تھا۔ عاشی کب گھر آئی تھی۔ ماما بھی شاید

گھر پر نہیں تھیں۔ یقیناً امان نے کوئی بدتمیزی اور فضول بکواس کی ہوگی۔ کاش میں باہر نہ جاتی۔

”میری طرف سے اجازت ہے۔ ان سب کو بھی لے جانا ساتھ بہت مان ہے تمہیں ماں کی؟“

اور عادل بھائی کا۔“

”آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے لے جاؤں گی۔“

مریم کو گنا اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ اس نے اپنے بازو پر رکھے تیور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ تیور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے بازو پر رکھ کر ہولے سے دبایا۔

ننب غصے میں بوڑھائی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں تو مریم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی عاشی کی طرف آئی۔ عاشی ابھی تک ایک ہاتھ ٹی وی پر رکھے تھوڑا سا جھکی کھڑی تھی۔

”عاشی۔“ مریم نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”کیا ہوا تھا؟“

”بجو۔“ عاشی نیچے ہونٹ کو دانتوں تلے دبائے لمحہ بھر مریم کو دیکھتی رہی..... اور پھر ایک دم اس سے پٹ گئی۔

”بجو۔“ آنسوؤں سے اس کی آواز رندہ گئی۔

مریم نے اسے دونوں بازوؤں میں تھام لیا اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس کے گرد بازو لپیٹے آنسو بہاتی عاشی چند لمحے پہلے کی عاشی سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ کمزور، بزدل اور معصوم سی عاشی مریم اسے اپنے ساتھ لپیٹے ہوئے ہولے ہولے تھپکنے لگی ”زیلیکس گڑیا..... میری جان بتاؤ کیا ہوا۔ میں ہوں ناں..... ماما کی باتوں کی پروا نہ کرو، تمہیں پتا تو ہے غصے میں انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہتا..... جو منہ میں آتا ہے کہتی چلی جاتی ہیں..... بچپن سے تم دیکھتی چلی آ رہی ہو۔ بعض اوقات انہیں ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا تھا۔“

”ہاں۔“ اس نے روتے روتے سر اٹھایا ”لیکن میں اب یہاں نہیں رہوں گی اور آپ، مور اور نینا بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ عادل بھائی کے پاس ہم جو چلی جا کر رہیں گے ٹھیک ہے نا بجو۔“

”لیکن عاشی۔“ مریم نے بہت محبت سے اس کے آنسو پونچھے۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ وہ اس سے الگ ہو کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ”مجھے یہاں نہیں رہنا۔ یادہ

رہیں گے یا میں۔“

”وہ یہاں ہی رہیں گے تم جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔“ ماما پھر کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔ ان کا رنگ

سرخ ہو رہا تھا اور پیٹھانی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

”ماما پلیز۔“ مریم نے تپتی نظروں سے دیکھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اگر ضد پراڑ جاتی تھیں تو پھر اپنے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتی تھیں چاہے کتنا بڑا

نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

”آپ اپنے کمرے میں جائیں اور آرام کر لیں۔“

”او کے ماما.....“ عاشی آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔ ننب عثمان نے ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالی اور پھر

اپنی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”عاشی گڑیا، آؤ اپنے کمرے میں چلو۔“ مریم نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما لیکن اس نے آنکلی سے ہاتھ چھڑا لیا اور فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔

”ہیلو کون خدا بخش۔“ اس نے شاید عادل خان کی طرف فون کیا تھا۔

”اچھا عادل بھائی نہیں ہیں کہاں گئے ہیں؟“

”جتنی صاحب کی طرف ٹھیک ہے جس وقت بھی آئیں ان سے کہیے گا مجھے رنگ کر لیں۔“

وہ فون رکھ کر مڑی تو مریم نے اس کی طرف دیکھا ”تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے عاشی؟“

”ہاں.....“ وہ تیمور کی طرف مڑی ”مورتم میرے ساتھ چلو گے نا عادل بھائی کے گھر حویلی میں یا اما

کے ساتھ رہو گے یہاں؟“

”آپ کے ساتھ۔“ تیمور بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا ”ہم سب آپ کے ساتھ جائیں گے۔ ہم

یہاں نہیں رہیں گے حبیب اور نجیب دونوں مجھ سے لڑائی کرتے ہیں اور اما انہیں منع بھی نہیں کرتیں ’مومو

آپ بھی چلیں گی۔“

”میں۔“ مریم نے تیمور کی طرف دیکھا۔

”میں۔“ اس نے پھر زریب دہرایا اور اما کی بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

”تم..... تم بھلا کس رشتے سے جاؤ گی عادل کے ساتھ کیا لگتا ہے وہ تمہارا.....“

”مومو، ہم آپ کے بغیر نہیں جائیں گے۔ آپ چلیں گی نا عاشی، نجی کے ساتھ۔ آپ یہاں اکیلی کبے

رہیں گی۔ وہ اما امن انکل تو آپ کے ساتھ بدتمیزی کریں گے۔“

”ہاں۔“ اس نے پرسوج نظروں سے عاشی اور تیمور کو دیکھا۔ اس کا ذہن فی الحال کوئی بھی فیصلہ

کرنے سے قاصر تھا۔

”عاشی..... عاشی پلیز اس طرح غصے میں فیصلہ مت کرو۔ اما کا تو تمہیں پتا ہے نا وہ غصے میں۔“

”فیصلہ تو ہو چکا بھو..... اب سوچنے کی گنجائش نہیں ہے..... آپ پلیز اپنا ضروری سامان بیک

کر لیں۔ کیا خبر عادل بھائی ابھی آجائیں نہیں تو صبح سویرے ہم چلے جائیں گے۔“

وہ تیمور کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو مریم وہی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

”تو بالآخر یہ ہونا ہی تھا۔ زندگی اجیرن ہو گئی تھی جب سے اما نے اماں کی شکایت پر اسے ڈانٹا تھا وہ

اور بھی شیر ہو گیا تھا۔ آتے جاتے فضول فقرے چست کرتا۔ بری نظروں سے دیکھتا۔ حالانکہ انہوں نے ٹی

وی لاؤنج میں بیٹھنا کم کر دیا تھا۔ زیادہ تر کمروں میں رہتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھار سامنا ہو جاتا تھا۔ عامہ

اور چھوٹی تو جب جی چاہتا دھڑلے سے اس کے با عاشی کے کمرے میں آکر بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں ان

فضول باتوں سے انہیں بے زار کرتیں۔ مور کی الگ نجیب اور حبیب سے لڑائی رہتی۔ اما تو زیادہ تر اپنی

ڈیوٹو کے سلسلے میں گھر سے صبح سویرے ہی چلی جاتی تھیں۔ اکثر شام کو اور کبھی رات کو وہ اور غضنفر ملک

لوٹتے تھے۔

اور خدا جانے آج کیا بات ہو گئی تھی اور کس سے۔ اس نے ابھی تک عاشی سے تفصیل پوچھی ہی

نہیں تھی۔

”اور اب عاشی عادل بھائی کے ساتھ چلی جائے گی۔ مور اور نینا بھی..... اور وہ.....“

”وہ..... وہ کہاں جائے۔ کون ہے اس کا۔ بڑی حویلی یا عادل بھائی سے اس کا کیا تعلق..... کیا رشتہ ہے۔“

”اما نے ہی تو کہا تھا کس ناطے سے وہ جائے گی وہاں۔“

اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

”یعنی کے گھر چلی جائے۔“

”بابا اور ماں جی تو خوش ہوں گے۔“

”لیکن کب تک..... کب تک وہ رہے گی وہاں۔“

اور شاید..... یعنی کے چاچو اس کا وہاں رہنا کبھی پسند نہ کریں..... اور شہریار۔

”شہریار مجھے تمہاری اس وقت کتنی ضرورت ہے۔“

ایک دم اسے اپنا آپ بہت اکیلا لگا۔

جیسے اس بھری دنیا میں اس کا کوئی نہ ہو اور وہ تنہا ہو بالکل تنہا۔

پتا نہیں کتنی ہی دیروہ یوں ہی اکیلی بیٹھی رہی۔ اما اور غضنفر ملک نے کھانا اپنے کمرے میں منگوایا تھا۔

تیمور اور عاشی نے کھانے سے منع کر دیا تھا۔ ٹیبل پر تنہا بیٹھا تھی۔ جو چند لقمے لے کر اٹھ گئی۔

”جو کوئی بھی کھانا کیوں نہیں کھا رہا۔“

”بھوک نہیں ہے۔“

”اما کی لڑائی ہوئی ہے آپ سے؟“

”ہاں نہیں تو۔“

بہت دیر سے غالباً ساڑھے بارہ بجے فون کی بیل ہوئی۔ میکا کی انداز میں اس نے فون

بہت دیر سے غالباً ساڑھے بارہ بجے فون کی بیل ہوئی۔ میکا کی انداز میں اس نے فون

اٹھایا..... دوسری طرف عادل خان تھے اور بہت تشویش سے پوچھ رہے تھے۔

”خیریت ہے نامریم؟“ انہوں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔

”آپ عاشری سے بات کریں۔“

اور عاشری نے انہیں تفصیل بتاتے ہوئے اسی وقت آنے کو کہا۔

”حویلی کے دروازے ہر وقت تم سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر عاشری بیٹا ایک بار سوچ لو۔“

”میں نے سوچ لیا ہے عادل بھائی کہ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ ہاں اگر آپ.....“

”فضول کوئی بات مت کرنا عاشری ورنہ میرے دل کو دکھ ہوگا۔ عثمان احمد خان کی اولاد کے لیے حویلی

میں بہت جگہ ہے میری بہن بعض اوقات جذباتی فیصلوں پر آدمی کو بہت چھٹانا پڑتا ہے۔ اس لیے رات

بھر سوچ لو صبح نو بجے میں آؤں گا..... اور یوں بھی اس وقت اس طرح تمہیں لے جانا مناسب نہیں ہے۔

مستغفر ملک کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ہم صبح تیار ہوں گے، مورنیا کو میری بھی بھجوانا ہے۔ ان کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔“

عاشری فون رکھ کر مریم کی طرف بڑھی۔

”عادل بھائی صبح آئیں گے نوبے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”عثمان احمد خان کی اولاد۔“

”لیکن میں عثمان احمد خان کی اولاد نہیں ہوں عاشری۔“ اس نے بے حد دل گرفتگی سے کہا۔

”اوہ، جو فضول باتیں مت سوچیں۔ ماں جی آپ سے کتنا پیار کرتی ہیں اور بی آپا بھی کتنا پیار کرتی

ہیں..... اور عادل بھائی اس طرح کبھی آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ چلیں انہیں پھر صبح پیکنگ

نہیں ہو سکے گی۔“

”ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جائیں گے۔ یہ گھر ماما اور مستغفر ملک کو مبارک ہو۔“

عاشری اسے تاکید کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد تیل ہوئی۔ شاید عادل

بھائی نے پھر کوئی بات کہنے کے لیے فون کیا تھا۔ اس نے ریسپور اٹھایا۔ دوسری طرف لالہ تھی۔

”لالہ تم.....؟“

”سوری یار اس وقت تم سے بات نہیں کر سکی۔ دراصل.....“

”مگر کیوں لالہ.....“ وہ اپنی پریشانی بھول گئی۔

”سنو میں تمہیں مختصر آتاتی ہوں۔ یہاں سے میں اپنے ڈیڑی کے گھر چلی گئی تھی لیکن وہاں جا کر مجھے

اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت گھٹن تھی اور بہت پابندیاں۔ پھر ڈیڑی نے میری منگنی اپنے ایک بھتیجے کے

دی۔ میں نے بہت انکار کیا لیکن وہاں انکار کوئی گنجائش نہ تھی، میں تو وہاں اس لیے گئی تھی کہ ڈیڑی میری

اعزاز سے شادی کر دیں گے..... مگر میں نے مہی کے پاس واپس آنا چاہا تو راستے بند تھے۔ یوں کچھ لو کہ

میں ایک طرح سے قید تھی وہاں۔ اس سے پہلے کہ میرا نکاح ہو جاتا میں وہاں سے کسی طرح چھپ کر نکل

آنے میں کامیاب ہو گئی اور وہاں سے سیدھی کراچی آئی۔ مجھے پتا تھا کہ ڈیڑی میری تلاش میں لاہور

جائیں گے۔ کراچی میں میری ایک دوست رہتی تھی اور اتفاق سے اس کا فون نمبر مجھے یاد تھا۔ بس اسٹیشن

سے فون کیا اور اس کے پاس چلی گئی..... چند دن وہاں رہ کر میں نے ایک بوتیک میں جاب کر لی اور

پرائیوٹ ہاسٹل میں منتقل ہو گئی۔ سو وہ خاتون جو میرے ساتھ تھیں اس بوتیک کی مالک تھیں۔ مسز ارباب

اور ان سے میں نے کہا تھا کہ میرا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔ مطلب قریبی عزیز، ہاسٹل میں رہ کر تعلیم

حاصل کی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

مریم خاموشی سے ریسپور کان سے لگائے اس کی بات سن رہی تھی۔

”مسز ارباب آ رہی تھیں۔ کسی عزیز سے ملنے تو میں بھی آ گئی۔ مہی کو دیکھنے کو دل چل اٹھا۔ کل کو مہی کے

باہر کھڑی رہی۔ بہت دیر تک۔ بس ایک جھلک نظر آئی ان کی گاڑی میں سے۔“

”وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں لالہ اور اعزاز کے ساتھ شادی پر بھی انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے اعزاز سے شادی نہیں کرنا اور فی الحال مہی کے پاس بھی نہیں جانا۔“

”کیوں؟“

”پھر کبھی تفصیل بتاؤں گی بلکہ میں کراچی جا کر تمہیں خط لکھوں گی اور فون بھی کروں گی۔ تم سناؤ کچھ

یک لگ رہی تھیں۔ تمہارے ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے، کوئی پیش رفت ہوئی؟“

”لالہ..... لالہ میں۔“ مریم کی آواز بھرا گئی۔

”کیا ہوا مریم۔ شہر یا کیا بے وفائی کر رہے ہیں؟“

”نہیں۔ سنو۔ تم مجھے کل مل سکتی ہو۔“ مریم نے شعوری کوشش سے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا۔

”نہیں یار میں تو کل نوبے کی فلاح سے جا رہی ہوں مسز ارباب تو ابھی رہیں گی لیکن مجھے تو واپس

مانا گرائی کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“

”سنو، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو لالہ۔“

”خیریت ہے نامریم؟ کیا آٹنی سے لڑائی ہو گئی؟“

اور مریم نے اسے ہولے ہولے سب کچھ بتا دیا۔

”اوکے مومو صبح نوبے تیار رہنا میں تمہیں پک کر لوں گی اور پھر دعا کروں گی چانس سیٹ مل جائے۔“

”ہوپ۔ اوکے باقی باتیں ملنے پر۔ پریشان مت ہونا اور بی بریو۔“

”کاش ہم اکٹھے رہتے اور میں ان کا خیال رکھ سکتی اور ہر مصیبت اور پریشانی میں ان کے لیے ڈھال بن سکتی۔“

اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ عاشق، موزینا سب کی پیشانیوں پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔ انہیں خوب پیار کرے۔۔۔۔۔ جی بھر کر دیکھے لیکن منبٹ کیے کھڑی رہی۔ اور جب آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کے سامنے پردہ تان دیا اور پاؤں کھڑے کھڑے شل ہونے لگے تو وہ ایک آخری نظر ان پر ڈال کر اپنے کمرے میں آگئی۔۔۔۔۔ وہ بے حد حال اور تھکی تھکی سی تھی۔ نیچے پر سر رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں اور گرم گرم آنسو کیہ بھگونے لگے۔



”اور پتا نہیں لالہ نے اتنی دیر کیوں کر دی۔“ مریم نے بے چینی سے اپنی رست و اچ پر نظر ڈالی۔
لو بجتے والے تھے اور عموماً وہ چھ بجے تک آجاتی تھی۔ کبھی بہت دیر بھی ہو جاتی تو سات بج جاتے تھے لیکن اس سے زیادہ لیٹ نہیں ہوتی تھی۔
مریم نے اپنے اندر بے حد چینی محسوس کی۔

یہ کراچی تھا اور یہاں تو ٹریفک ہی اتنا زیادہ تھا کہ..... کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔
افوہ..... اس سے کس قدر بے وقوفی ہوئی۔ اس نے لالہ سے بلیک کا نمبر تک نہیں لیا تھا۔ شاید کسی اور کے پاس ہو۔ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سوچا سب کمروں کے دروازے بند تھے۔ سب ہی تھکی ہاری آکر آرام کر رہی ہوں گی اور پھر اس کی ابھی تک کسی سے جان پہچان بھی نہ ہوئی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں سین رہتی تھی جو کبھی کبھار ان کے کمرے میں آ جاتی اور جس سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ وہ کی گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی تھی اور اس کی فیکٹری بہت دور تھی۔ اور اسے سواری کا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے اسے اکثر دیر ہو جاتی لیکن لالہ کو پک اور ڈراپ کی سہولت تھی۔ پھر پتا نہیں کیوں دیر کر دی تھی اس نے۔

مریم نے گیٹ کے تین چکر لگائے اور پھر آکر بیٹھ گئی۔

اس ہاسٹل میں چھ کمرے تھے اور ہر کمرے کے ساتھ اپنا کچن اور باتھ تھا۔ اور ہر کمرے میں تقریباً ایک سو بیڈ تھے۔ لالہ کے کمرے میں اب وہ تین تھیں اور لالہ کی روم میٹ ان دنوں گاؤں گئی ہوئی تھی لیکن ان کے قریب تھا۔ مریم کے آنے کے دو دن بعد ہی وہ چلی گئی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی اور یہ کیسا عجیب اتفاق تھا جس روز ماما اور عاشق کی بات ہوئی تھی اسی روز لالہ آگئی تھی شاید خدا اس کی مدد کر رہا تھا۔
لالہ کا اس طرح اچانک ملنا.....

اس رات وہ لمحہ بھر کے لیے بھی نہ سو سکی تھی۔ اور پھر ماما اور غنیمت ملک بھی بہت جلد اٹھ گئے تھے۔ ان کی

”لالہ پلیز، بھول نہیں جانا۔“ اس نے التجا کی۔

”ڈونٹ وری مومو اور سنو سز ارباب کروٹ بدل رہی ہیں میں فون بند کر رہی ہوں۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”صبح سات بجے گیٹ پر آ جانا۔“

فون رکھ کر مریم نے کچھ دیر کے لیے بڑی طمانیت سی محسوس کی۔

وقتیی طور پر ٹھکانا بن رہا تھا۔ خدا کرے سیٹل جائے خدا کوئی نہ کوئی سبب بنا دیتا ہے۔ اگر لالہ نہ ملتی اس کا فون نہ آتا تو شاید اسے یہاں ہی رہنا پڑتا..... وہ ابھی اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ ایک ایچی میں اس نے اپنی سب ضروری چیزیں رکھ لیں۔ تو تھک کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ گھڑی کی سوئیاں دو بج رہی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی وہ طمانیت کہیں رخصت ہو گئی اور ایک بے چینی ایک اضطراب نے اسے بے کل کر دیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا پھر وہ اس گھر میں کبھی نہ آ سکے گی۔“

”ماما کو۔“

”عاشق کو نینا اور مور کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔“

وہ بیڈ سے نیچ اتری آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکلی۔ صفو اور شریف اپنے اپنے کوارٹر میں سونے جا چکے تھے۔ لاؤنج میں ہلکی روشنی تھی۔ اس نے عثمان احمد کی اسٹڈی روم کی طرف دیکھا۔ پھر لوٹک روم کی طرف نظر دوڑائی۔

”یہاں پاپا بیٹھتے تھے۔“

”آخری بار بیمار ہو کر وہ یہاں اس صوفے پر لیٹے تھے۔“ اس نے اس صوفے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر ماما کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازہ لاک نہیں کیا تھا اور وہ کبھی بھی دروازہ لاک کر کے نہیں سونے تھی۔ شاید اسے دروازہ بند کر کے سونے سے خوف آتا تھا۔

اس نے بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھولا۔ کمرے کے وسط میں ایچی اور بیگ پڑے تھے، جیسے وہینگ روم ہو۔ بیڈ پر تینوں آڑے تر جھے لیٹے ہوئے۔

عاشق کے چہرے پر تھکن تھی اور تیرو سوتے میں بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑی بلب کی روشنی میں انہیں دیکھتی رہی۔

”اور شاید میں اب۔ آج کے بعد انہیں کبھی نہ دیکھ سکوں۔“

”پاپا..... پاپا مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکی۔“

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

مقابلہ کرو گی۔“ سین اندری آگئی۔

”لیکن سین اس سے پہلے کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی۔“

”ہو جاتی ہے اسے کبھی کبھار دیر جس دن آڈٹ وغیرہ ہو۔“
”لو وہ آگئی۔“

گیٹ پر اس کی وین کا مخصوص پارن بجاتو ہاسٹل کے چوکیدار نے گیٹ کھولا۔

ہاسٹل کی مالک ایک بیوہ خاتون تھیں اور انہوں نے یہ ہاسٹل تقریباً تین سال پہلے شروع کیا تھا۔

لالہ پرس جھلاتی اندر آئی اور ایک طرف پرس اچھالا۔

”یار تمہاری سیکلی کا دل بہت چھوٹا ہے۔“ سین نے اسے بتایا۔

لالہ نے بے پروائی سے کہا اور پھر مریم کی طرف دیکھا۔

”یار قافٹ چائے کا ایک کپ تو بنا دو بہت تھک گئی ہوں۔ سچی یہ مزار باب کے بھائی اس قدر سکی

آدی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ ایک ماہ میں دو بار ضرور آتے ہیں اور پھر ایک ایک نکلے کا حساب لیتے ہیں۔ بھی مزار باب کا حوصلہ ہے۔ دراصل یہ سارا کاروبار آئی مین بوتیک ان کے بھائی کا ہی ہے۔ سارا پیسہ انہی کا لگا ہوا ہے۔

لالہ جولوں کے اسٹریپ کھولتے ہوئے بولتی رہی۔

”مزار باب تو سمجھ لو محض ایک نگران ہیں اور اس نگرانی کی تنخواہ لیتے ہیں۔“

وہ جو تے اتار کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور نکیہ گود میں رکھ کر اس پر کہنیاں لیتے ہوئے مریم کی طرف دیکھنے لگی۔
جائیکٹرک کیٹل میں پانی بواں کر چکی تھی اور اب ٹی بیگ پیالوں میں رکھ رہی تھی۔

”ہاں تو اب بتاؤ یہ سین کیا کہہ رہی تھی۔ روتی رہی ہو کیا؟“

اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”اتنے وہم آ رہے تھے مجھے لالہ۔ کیا بتاؤں تم نے پہلے کبھی اتنی دیر جو نہیں کی۔“

”یار زندگی ہمیں جس موڑ پر لے آئی ہے وہاں اس کمزور دل کے ساتھ گزارہ نہیں ہوگا۔ اپنا دل

بٹو کر دیو دنیا کمزوروں کو اور بھی دباتی ہے۔ اب دیکھو نا میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو ڈٹ کر وہاں ہی

رہتا اور اس اماں اور اس کے رشتے داروں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیتی۔

”مگر لالہ میں۔ میں وہاں کیسے رہتی جبکہ عاشی نینا اور مور۔۔۔ ان کے بغیر۔۔۔ نہیں۔“

”بہتر تو یہ تھا کہ تم بھی ان کے ساتھ حویلی چلی جاتیں۔“

”میں نے تمہیں حقیقت بتادی ہے لالہ پھر بھی تم یہ کہہ رہی ہو۔ میرا کیا رشتہ ہے ان سے۔ کس تانے

جا کر رہتی۔“

فلانٹ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ اہل لیے وہ پانچ بجے ہی گھر سے نکل گئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد اس نے کچن میں جا کر چائے بنائی تھی۔ صفو نے پوچھا بھی تھا کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے اسے جانے کے لیے کہہ دیا تھا اور خود چائے بنا کر باہر ٹی وی لائونج

میں آگئی تھی اور یہ گھر شاید آج کے بعد وہ اس گھر میں کبھی نہ آ سکے اور کبھی ان درود یو رو کو نہ دیکھ سکے۔

دل جیسے پھٹ جانے کو تھا لیکن وہ آنسو روکے ہوئے بیٹھ گئی وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی۔

عاشی نینا مور سب سو رہے تھے۔

سات بجے اس نے اٹیچی اٹھا کر گیٹ کے پاس رکھا تو خان بابا نے اسے چونک کر دیکھا۔

”آپ کہیں جا رہی ہو؟“

”ہاں ابھی مجھے لینے کے لیے گاڑی آئے گی۔“

”کہاں جائیں گی آپ؟“ اس نے پوچھا لیکن مریم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور واپس

اندر آئی۔ عاشی کے نام اس نے خط لکھ کر اس کے سر ہانے رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ جاگ گئی تو شاید

وہ اسے جانے نہ دے۔ اور پھر شاید مور اور نینا کے سامنے وہ خود بھی کمزور ہو جائے ان سے جدا نہ ہو سکے۔

وہ کتنی ہی دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی اور انہیں بانہواں میں لے کر پیار کرنے کو بے چین ہوتی رہی۔ اور آنسو

بہت آہٹگی سے اس کے رخساروں پر بہتے رہے۔

تب ہی گیٹ پر بیل ہوئی تو ایک آخری نظر اس نے ان پر ڈالی اور بہت تیزی سے باہر نکل آئی۔

باہر لالہ ہی تھی اور مزار باب کے عزیزوں کا ڈرائیور اسے چھوڑنے آیا تھا۔

”جلدی کرو مومو۔“

اور وہ ایک الوداعی نظر ”نہنہ ولا“ پر ڈالتی اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اور قسمت مہربان تھی کہ انہیں سیٹ بھی مل گئی۔

اور اب اتنے دنوں سے وہ یہاں تھی اور لالہ نے اس کے لیے نوکری تلاش کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن

ابھی تک نوکری ملی نہیں تھی اور وہ لالہ ہی کے ساتھ رہ رہی تھی۔

”اور ایسا کب تک ہوگا۔“ وہ لالہ پر زیادہ دنوں تک بوجھ بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔

سین نے اندر جھانک کر اسے دیکھا۔

”لالہ نہیں آئی یار۔ اس کے لیے ایک زبردست خبر ہے۔“

”نہیں۔“ مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سین۔“ اس کی آواز بھر گئی ”بہت دیر ہو گئی ہے تمہارے پاس اس کے بوتیک کا کوئی نمبر وغیرہ ہے؟“

”نہیں تو لیکن یار تم بڑی کمزور دل ہو۔ آجائے گی وہ ابھی۔ اس کمزور دل کے ساتھ تمہا کیسے دنیا کا

مریم اپنا کپ اٹھا کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔
 ”کیا تم میری میزبانی سے تھک گئی ہو؟“
 ”نہیں، مگر اس نے کرو۔“

لالہ نے اسے ڈانٹا۔

”میں نے تمہیں کہا بھی تھا لالہ کہ میرے لیے جاب.....“

”جب کی تمہیں اتنی پریشانی کیوں ہے، مسز ارباب سے کہا ہے۔ انہوں نے اپنے ملنے والوں سے کہا ہے۔ جہاں بھی کوئی جگہ خالی ہوگی، تمہیں رکھوا دیں گی لیکن یا زج اب ملنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ (آئی مین) I MEAN مطلب کی جاب بہر حال تمہیں تو جاب مل جائے گی۔ تم خواجہ اپنے ذہن پر برزوں نہ ڈالا کرو۔ ویسے ایک بات ہے مومن، اس نے خالی کپ بیڈ کی سائیڈ پر رکھا۔

”تم اپنے ڈیڈی کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں۔ تمہارے لیے شاید اس طرح لائف گزرا مشکل ہو۔“
 ”میرے ڈیڈی!“

مریم نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”مگر۔“

”میرا مطلب ہے تمہارے اپنے ڈیڈی حقیقی۔“

”ہاں مگر مجھے تو یہ تک نہیں معلوم کہ ان کا نام کیا ہے۔ وہ کون ہیں کہاں رہتے ہیں۔“
 مریم کے دل میں درد سا اٹھا۔

”کمال ہے مریم، تم نے انٹی سے پوچھا تھا کہ نہیں۔“ لالہ کو از حد حیرت ہوئی۔

”ایک دو بار سرسری سا پوچھا تھا لیکن ماما نے دھیان ہی نہیں دیا اور میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ ہاں نہیں کیوں لالہ شاید میرا دل اندر سے اس حقیقت کو ابھی تک تسلیم ہی نہیں کر رہا کہ پاپا میرے پاپا نہیں تھے اور شاید میں اندر سے ڈرتی بھی ہوں کہ ہاں نہیں کیسے ہوں گے وہ۔ مجھے ACCEPT بھی کریں گے یا نہیں اور کیا پتا وہ پاپا جیسے نہ ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی لیکن اس نے سخت شعوری کوشش سے آنسوؤں کو باہر آنے سے روک لیا۔

”بہر حال تمہیں پتا تو کرنا چاہیے مریم۔ حقائق کو فیس کرنا سیکھو۔ کیا خبر وہ تمہارے لیے بڑا ہی مضر ہے۔“
 مضطرب ہوں اور تم تک ان کی رسائی نہ ہو رہی ہو۔ اب دیکھو، تمہارے ڈیڈی بھی مجھے بے حد چاہتے ہیں۔ اگر چہ میں نے مجھے کبھی ان سے ملنے نہیں دیا لیکن وہ ہمیشہ اس کی کوشش کرتے رہے کہ میں ان سے ملنے دیں اور ان کے پاس رہنے دیں۔“

”پھر..... پھر تم ان کے پاس سے کیوں چلی آئی ہو۔“

”یہ ایک الگ مسئلہ ہے مریم۔ میری پرورش جس طرح ہوئی ہے۔ میں کسی بھی طرح کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہاں ڈیڈی کی حویلی میں بہت تھکن تھی، بہت پابندیاں تھیں۔ دن بھر بس پلنگوں پر بیڈ کر حکم چلاتے رہو۔ بہت ہوا توٹی وی دیکھ لو۔ شاپنگ کرنے کی اجازت نہیں۔ میرے لیے بہت مشکل تھا۔ تمہیں تو پتا ہے کہ میں سارا دن گاڑی لیے گھومتی پھرتی تھی اور وہاں جا کر تو جیسے رنگ ہی لگ گیا تھا مجھے اور پھر ڈیڈی کی خاندانی بیوی اور اس کے بیٹے مجھے بے لکل پسند نہیں کرتے تھے۔ اس پر ڈیڈی نے نورجہاں سے میری منگنی کر دی اور میں نے اسے دیکھا تک نہ تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے اسٹینڈس گیا ہوا تھا اور چند ایک روز میں آنے والا تھا۔ اس کے آنے پر نکاح ہو جاتا۔ ڈیڈی نے اس کی بے حد تعریفیں کی تھیں۔ بلاشبہ وہ اچھا ہوگا لیکن یا زوہ اعزاز تو نہیں تھا جس کے لیے میں نے می کو چھوڑا، مگر چھوڑا حالانکہ

YOU KNOW I LOVE HER

”پھر تم گھر کیوں نہیں گئیں اور اعزاز سے کیوں نہیں ملیں۔“

”دراصل میں نے تمہیں بتایا ہے نا، پہلے تو میرا خیال یہ تھا کہ ڈیڈی کا خیال لاہور کی طرف جائے گا اور وہ میری تلاش میں لاہور جائیں گے اس لیے میں کچھ دن یہاں اپنی دوست کے پاس رکوں گی اور پھر اعزاز کو بلا کر ہم دونوں نکاح کر لیں گے اور نکاح کے بعد می کو فون کر دوں گی اگر انہوں نے بلایا تو چلی جائیں گی لیکن اعزاز نہیں آیا۔ میں نے اسے گاؤں کے پتے پر تین خط لکھے۔ لاہور میں اس کے دوست کو MESSAGE دیا۔ وہ جب بھی لاہور آتا تھا اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرتا تھا اور میں وہاں پر اسے لے کر آتی تھی اگر کبھی ضرورت ہوتی لیکن۔“

”مگر آئی تو کہہ رہی تھیں کہ اعزاز تمہارے لیے بہت پریشان ہے، بہت اپ سیٹ رہتا ہے اور یہ کہ تم باؤں کی وہ تمہاری شادی اعزاز سے کر دیں گی۔ انہوں نے اعزاز سے بھی وعدہ کیا ہے بلکہ ان کی تو ندرت ہو گئی ہے اعزاز سے بہت تعریف کرتی ہیں۔“

”میں نے یہ بات تم سے کب کہی تھی مومن؟“

”نہیں چار ماہ پہلے۔“

”اور آئی کو بدلتے کہتے دیر لگتی ہے مومن۔ اعزاز بھی بدل گیا ہے۔“

”کیا خبر لالہ، اسے تمہارے خط نہ ملے ہوں۔“ مریم نے خیال ظاہر کیا۔

”فرض کرو خط نہ ملے ہوں تو کیا MESSAGE بھی نہیں ملا۔ میں نے تحسین کو خود فون پر تاکید کیا کہ وہ اعزاز کو میرا فون نمبر دے دے اور کہے کہ مجھ سے بات کرے اور تحسین نے کہا تھا کہ جب وہ اسے نمبر دے دے گا اور تحسین اس کا بہت اچھا دوست ہے۔ مریم ہاں نہیں یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔“
 ”نہیں ہوئی بھی ہے یا نہیں، شاید ہم یونہی دھوکے دھوکے میں زندگی گزار جاتے ہیں۔“

دھوپ بارش اور سناٹے

میں تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد درکنگ ویمین کے لیے ہاسٹل بنادیا تھا اور اس ہاسٹل کی شہرت کافی اچھی تھی بلکہ لالہ نے اسے بتایا تھا کہ یہاں وہ خود کو بہت سیف محسوس کرتی ہے۔ لینڈ لیڈی بہت مدبر خاتون تھیں۔ مریم کو بہت اچھی لگیں۔

”آئی کیسی ہیں آپ؟“

لالہ نے ان کے رخسار پر بوسہ دیا۔

”فائن گڈ گرل! تم کیسی ہو؟“

”فائن!“

لالہ مسکرائی اور اس نے مریم کی طرف اشارہ کیا ”یہ مریم ہے میری دوست۔“

”اچھا اچھا! یہ ہے تمہاری دوست۔ اس روز تم آئیں تو ملاقات نہ ہو سکی۔ ربی نے بتایا تھا کہ لالہ کی سبب بہت پیاری ہے ماشاء اللہ۔“

انہوں نے مریم کا ہاتھ تھام کر بہت پیار سے اس کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔

”بیٹی تمہارے والدین۔“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ مریم اور لالہ بھی بیٹھ گئیں۔

”آئی وہ میں نے بتایا تو تمہاری فوٹ ہوئے ہیں اور می نے دوسری شادی کر لی ہے اور ان کل ملک سے باہر ہیں۔“

”اوہ ویری سیڈ۔“ انہوں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”اور ایجوکیشن وغیرہ تمہاری کیا ہے؟“

”آئی میں نے ماسٹرز کیا ہے۔“

”ارے اتنی چھوٹی سی لگ رہی ہو۔ کس سبجیکٹ میں۔“ سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔ لالہ نے بے زار اور کان کی بات کاٹی۔

”SORRY آئی وہ ہم نے ایک فون کرنا تھا لاہور۔“

”ہاں ہاں کرو ضرور۔“ انہوں نے اٹھ کر فون کا کوڈ کھولا۔

”بات کرو میں ذرا تمہارے لیے چائے بناؤں۔“ انہوں نے مسکرا کر مریم کی طرف دیکھا۔

”میں آئی پلیز چائے تو ابھی پی کر آئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر میں ذرا کچن میں مصروف تھی۔“

فون ان کے حوالے کرتے ہوئے انہوں نے معذرت کی ”اوکے آئی آپ جائیں۔“

لالہ نے فون سیٹ گود میں رکھتے ہوئے نمبر ملایا۔

”اس فون کا بل؟“ مریم نے استفسار کیا۔

”تم ایک بار پھر فون کرو نا حسین کو۔“

”نہیں۔ اب نہیں۔“ اس کا انداز جتنی تھا۔

”پھر آئی کے پاس چلی جاؤ۔“

”فی الحال نہیں۔“

”کیوں؟“

”یونی کوئی خاص وجہ نہیں بس زندگی کو ذرا اس انداز میں بھی انجوائے کروں تھک گئی تو چلی جاؤں گی۔“

”آئی تم سے محبت کرتی ہیں لالہ۔“

”I KNOW“

اس نے بے پروائی سے کہا اور گود سے نکلیا کمر کے نیچے رکھتے ہوئے لیٹ گئی۔

”سنو تم کل میرے ساتھ چلنا زبانی آئی سے فون کر کے اپنے ڈیڑی کا نام اور پتہ لیتا۔“

”مگر ماما تو یہاں نہیں ہیں وہ تو اسکاٹ لینڈ گئی ہیں شوٹنگ کے لیے۔“

”تو..... پھر میری می سے بات کرو۔“

”ہاں۔ آئی میں نے سوچا تھا آئی سے پوچھوں گی لیکن۔“

”چلو صبح بات کر لیتا می سے بلکہ ابھی کیوں نہیں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کم آن۔“

”مگر اس وقت کہاں۔“

”یاز ذرا اپنی لینڈ لیڈی کی طرف چلتے ہیں۔ مہربان خاتون ہیں اور میں کبھی کبھی ان کا فون استعمال

کرتی رہتی ہوں۔“

”مگر.....!“

”آؤ یار۔“

لالہ نے بیڈ سے اترتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی سین آتی دکھائی دی۔

”اے کہاں جا رہی ہو لالہ؟“

سین نے نہیں جاتے دیکھ کر پوچھا۔ پھر کہا ”مجھے ایک خوش خبری سنا تھی۔“

”اچھا تم بیٹھو کمرے میں آکر تمہاری خوش خبری سننے ہیں۔ ذرا ایک فون کرنا ہے بہت ضروری۔“

سین کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ پکڑے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی لینڈ لیڈی اور

والی منزل پر رہتی تھیں۔ دو بیٹیاں بھی تھیں ان کی ایک یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی اور دوسری ابھی کان

”بل جب آئے گا تو میڈم آئی مین آئی کرائے میں شامل کر لیں گی۔“

ایرپیس کان سے لگاتے ہوئے لالہ نے مریم کی طرف دیکھا اور پھر دیک دم ریسورجھٹھا دیا۔

”الو..... بولتے کیوں نہیں آگے سے۔ معلوم نہیں۔ تمہیں یہ میڈم نرس کا گھر ہے۔“

ایرپیس کان سے لگاتے ہوئے آئی نرس کی طویل نہ بچھ میں آنے والی گالی سن کر مریم نے لالہ کی طرف دیکھا۔ وہ منہ نیچے کیے ہوئے ہولے ہولے ہنس رہی تھی۔

”آئی۔ یہ میں ہوں مریم۔“

اس سے پہلے کہ وہ ریسورجھٹھا دیتیں۔ اس نے چھٹی پھنسی آواز میں کہا۔

”مریم۔ مریم۔ مومو ڈرانگ۔ تم کہاں سے بات کر رہی ہو؟“

میڈم نرس کی آواز جتنی بلند تھی کہ ریسور سے باہر آ رہی تھی۔ لالہ نے اشارے سے منع کیا۔

”وہ۔ میں آئی ایک دوست کے گھر ہوں۔“

”جانو تم کہاں ہو۔ کہاں چلی گئی ہو۔ عاشری نینا وغیرہ تو حویلی چلی گئی ہیں عادل کے ساتھ۔ ما

تمہاری اسکاٹ لینڈ میں ہیں اور زنب و لا میں غنفر ملک کے رشتے دار دندنا تے پھر رہے ہیں۔“

وہ بغیر کے بولے جاری تھیں۔ مریم نے دو دفعہ بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے سنا ہی نہیں۔

”عادل خان اور عاشری آئے تھے تمہارا پتا کرنے۔ از حد پریشان تھے وہ تمہارے لیے اور یہ تمہیں کیا

سوچھی گھر چھوڑنے کی اور پھر تم عادل کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟“

”وہ آئی میں.....“ اس نے پھر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میڈم نرس نے اسے ٹوک دیا۔

”بھئی وہ زینی تو بہت غصے میں ہے اور بہت ناراض ہے۔ کہہ رہی تھی جہنم میں جائیں سب میری بلا

سے۔ اس کے غصے کا تو تمہیں پتا ہے ناجان، تمہیں گھر نہیں چھوڑنا تھا اور ادھر عادل خان بہت پریشان

ہے۔ تم اپنا پتا دو میں اطلاع دے دوں۔“

”آئی پلیز آپ عاشری کو بتا دیجیے گا۔ میں خیریت سے ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”تم بڑی تھیں مومو ڈرانگ تمہیں سمجھانا چاہیے تھا عاشری کو نہ کہ تم خود بھی۔ زینی تم سے بے حد خفا ہے بہت

ناراض ہے تم سے کہ شاید تم نے ہی سب کو۔“

”نہیں آئی یہ عاشری کا اپنا فیصلہ تھا عادل بھائی کے ساتھ جانے کا۔ آپ نہیں جانتیں ساری بات۔

عاشری کے لیے وہاں رہنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ ماہر بات میں غنفر ملک کے بہن بھائیوں کو ہم سب

پر ترجیح دینے لگی تھیں اور..... اور..... خیر میں نے دراصل اس لیے فون کیا تھا مریم نے ایک لمحہ رک کر

سائنس درست کیا۔

”آپ کو پتا ہے آئی کہ میرے ڈیڈی کون تھے؟“

”تمہارے ڈیڈی۔“

”اوہ..... نو..... بالکل بھی نہیں جانو۔ دراصل میری جب زینی سے ملاقات ہوئی تو وہ مسز عثمان تھیں

اور طویل عرصے تک تو مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ عثمان احمد زینی کے دوسرے شوہر ہیں اور تم عثمان احمد کی

بچی نہیں ہو۔ بہت بعد میں ایک بار زینی نے بتایا تھا۔“

”آئی پلیز۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”ڈرانگ صحیح کہہ رہی ہوں مجھے نہیں معلوم لیکن میں تمہیں زینی سے پوچھ کر بتا دوں گی کہ وہ

کون ہے۔“

”آپ..... آپ..... آپ ماما کو کب فون کریں گی؟“ اس نے بے اختیاری میں پوچھا۔

”چند روز میں ڈیڈی۔ آج کل تو وہ آؤٹ ڈور میں مصروف ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ کب ہوٹل واپس آئی

ہے۔ بہر حال فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں پتا کر کے فون کر دوں گی۔ نمبر مجھے بتا دینا۔“

”نہیں وہ آئی میں تو باہر سے فون کر رہی ہوں۔ میری دوست کے گھر میں فون نہیں ہے۔ میں خود

کر لوں گی چھ سات دن تک۔ آپ پلیز ماما سے پوچھ کر رکھیے گا۔“

”مومو کیا تم اپنے باپ کے پاس جانا چاہتی ہو اور یہ تم لڑکیاں کس قدر بے وفا ہوتی ہو لالہ کی

طرح۔ کس طرح نازوں سے پالا اور جا کر بیٹھ گئی ہے اپنے باپ کے پاس اور تم، تمہیں کیا خبر تمہارا باپ

تمہیں قبول کرے گا یا نہیں۔ کیا خبر.....“

”آئی پلیز۔ میں ان کے پاس جا کر رہنا نہیں چاہتی لیکن میں جانا چاہتی ہوں کہ وہ کون تھے۔ دیکھنا

چاہتی ہوں ملنا چاہتی ہوں۔ اگر ان کے دل میں یا گھر میں میری گنجائش نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گی لیکن ایک بار۔“

”او کے۔ اپنا خیال رکھنا۔“

”آئی صحیح کہتی ہیں لالہ۔“ ریسور رکھتے ہوئے اس نے لالہ کی طرف دیکھا۔

”کیا خبر میرے ڈیڈی مجھے قبول نہ کریں۔ جس شخص نے اب تک میری خبر نہیں لی پوچھا تک نہیں

میری ماما سے کہ میں کسی ہوں۔ حالانکہ ماما کو ڈھونڈنا مشکل تو نہیں ہے۔ وہ تو آئے دن شوہر کے حوالے

سے اخبارات میں ان کا ذکر کرتا ہی ہے۔“

”ہاں۔“ لالہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ ایک بار تم اپنی ڈیڈی کے پاس ضرور جاؤ۔ یہ دنیا تمہارے لیے نہیں ہے

مومو۔ ان چند ماہ میں مجھے اندازہ ہوا ہے کہ انسانوں بلکہ درندوں کے اس تالاب میں اکیلی لڑکی کے لیے

زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ تم جاب نہیں کر سکو گی۔ کچھ دن رہو میرے پاس اور جب ڈیڈی کا پتا چلے تو

ان کے پاس چلی جاؤ۔ میرے خیال میں کوئی مرد اتنا بے غیرت نہیں ہو سکتا کہ اپنی بیٹی کو یوں تنہا چھوڑ

دے۔ یہ مرد اپنی بیٹیوں کے متعلق بہت غیرت مند ہوتے ہیں میرے ڈیڈی کی طرح۔
”ہاں نہیں۔“ مریم اداس اور دل گرفتہ تھی۔

”سب لوگ ایک جیسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں ممکن ہے میرے ڈیڈی تمہارے ڈیڈی سے بہت مختلف ہوں۔ کیا خبر وہ مجھے بنی تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیں پھر۔“

”کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر واپس آ جانا۔“ لالہ نے اسے تسلی دی۔

”بلکہ میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی اور تمہیں چھوڑ کر آ جاؤں گی۔“

”تو تم۔ کیا تم ہمیشہ یہاں ہی رہو گی۔ لالہ تم بھی واپس چلی جاؤ آنٹی زمر کے پاس۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں اور اعزاز بھی۔“

”بعض اوقات واپسی کے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ شاید میرے پاس بھی واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا۔“ اس نے بہت آہستگی سے کہا، مریم نے تعجب سے اسے دیکھا۔
”لالہ۔“

”کم آن یار۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گئی اور جاتے جاتے کچن میں جھانکا، ”اوکے۔۔۔۔۔ آنٹی ہم جا رہے ہیں۔“

”ارے بٹھو! آج رات ہی نے کباب بنائے تھے وہ میں نے ابھی نکال کر فریج سے رکھے ہیں تمہارے لیے۔“
”نہیں آنٹی بہت تھکی ہوئی ہوں۔“ لالہ نے معذرت کی۔

”تم اتنے دنوں سے آئی ہی نہیں۔ رتی اور لیلی یاد کر رہی تھیں تمہیں۔“

”بس آنٹی بہت تھک جاتی ہوں۔ چھٹی والے دن آؤں گی پھر رتی کے بنے ہوئے کباب بھی کھاؤں گی اور گپ بھی لگاؤں گی آپ سے۔ میرا حصہ رکھ دیجیے گا۔“ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی مریم کے پاس آ گئی۔ جو بیڑھیوں کے پاس کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”میری آنٹی سے بہت دوستی ہے اور پتا ہے یہ سب بڑی جیلس ہوتی ہیں حتیٰ کہ میری روم میٹ بھی بہت جلتی تھی۔“

”ہاں تمہاری روم میٹ۔ وہ آگئی تو پتا نہیں وہ میرا یہاں رہنا پسند بھی کرے گی یا نہیں۔“

”بہت سڑی سی ہے وہ۔ تمہارا یہاں رہنا اسے پسند تو نہیں آئے گا لیکن اسے بہر حال کرائے کی کمی پسند آ جائے گی۔ ظاہر ہے اب یہ رقم دو میں تقسیم ہوتی تھی، تین میں تقسیم ہوگی۔“

بیڑھیوں سے اترتے ہوئے لالہ نے بتایا۔

سین باہر کھڑی مسز گلاب احمد سے باتیں کر رہی تھیں۔ جو کپڑے دھو کر تار پر لٹکا رہی تھیں۔

”اتنی دیر کر دی۔“ اس نے لالہ کی طرف دیکھا۔

”کچھ زیادہ تو نہیں بس فون کیا اور آ گئے۔“

”صرف فون کیا یا آنٹی کے کباب سمو سے کھا کر آ رہی ہو۔“

سین نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا اور زور سے ہنسی۔

”REALY کچھ بھی نہیں پوچھ لو مریم سے۔“

”اچھا چلو اب کمرے میں اور وہ خوش خبری سنا دو۔ مجھے پتا ہے تمہارے پیٹ میں مروڑا ٹھہر رہے ہوں گے۔“

”ہاں خوش خبری۔“

سین ایک دم پر جوش نظر آنے لگی اور مسز گلاب کو خدا حافظ کہتی ہوئی مریم اور لالہ کے پیچھے ان کے کمرے میں آ گئی۔

”ہاں اب ارشاد ہو۔“

لالہ نے بیڈ پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔

”لالہ وہ تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم ماڈلنگ کرنا چاہتی ہو اور انٹرنشنگ ہو ماڈلنگ میں۔“

”ہاں پھر۔“

لالہ نے بیڈ کی پائنتی سے کبل اٹھا کر اوپر لے لیا۔

”وہ ایک کولیگ ہے میری ان کے بھائی کی اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔ وہ کچھ نئی ماڈل کی تلاش میں ہیں۔ میری کولیگ نے بتایا تو میں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ آج اس کے بھائی آ گئے تھے وہاں اور ان کا اصرار تھا کہ ابھی انہیں آپ کی طرف لے جاؤں لیکن میں نے کہا کہ تمہارا اس وقت تو ملنا ممکن نہیں ہے، چھٹی والے دن رکھ لیں۔“

”بائے داوے یہ تمہاری کون سی کولیگ ہیں۔“ لالہ نے ہنسیوں اچکائیں۔

”وہ..... وہ مسز تنویر۔“

”اچھا وہ۔ تو تم نے ان سے نہیں پوچھا کہ ان کے بھائی کی اتنی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے اس پمپٹر فم میں کیا کر رہی ہیں۔“

”وہ دراصل ان کے سسکے بھائی نہیں ہیں، خیر تم بتاؤ انہیں لے آؤں چھٹی والے دن۔“

”نہیں یار، فی الحال تو میرا ارادہ نہیں ہے ماڈلنگ میں آنے کا۔“

”کیوں یار تم تو اتنی پیاری ہو اور دیکھ لیتا، تمہیں تو وہ بس ایک نظر دیکھ کر اوکے کر دیں گے۔“ سین نے اسے اکسایا۔

”لالہ یار، ایک بھی ماڈل تمہارے جیسی پیاری نہیں ہوگی اور پھر تم.....“

”نہیں..... نہیں سین تم انہیں منع کرو۔ میں فی الحال یہاں ہی سیٹ ہوں۔“

”کیا مسز ارباب نے تمہاری سیکری بڑھادی ہے؟“ سین نے پوچھا۔

”نہیں یار لیکن..... خیر چھوڑو اور سناؤ تمہاری انچارج کارو یہ تمہارے ساتھ ٹھیک ہوا یا نہیں؟“

”ہاں اب بہتر ہے۔“

”دیکھ لو بچہ ہمارے نسخوں پر عمل کرو گی تو یوں ہی کامیاب رہو گی۔“

مریم خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”تم..... تم مریم، مریم کیوں نہیں ماڈلنگ میں آ جاتیں۔“ سین ایک دم اس کی طرف مڑی۔

”فی الحال جہیں جا ب بھی نہیں مل رہی۔“

”نہیں ہرگز نہیں، مجھے بالکل پسند نہیں ہے ماڈلنگ۔“ مریم نے فوراً کہا۔

”کیوں۔ آج کل تو اچھی چھی لڑکیاں ماڈل بن رہی ہیں۔ میری اگر شکل ذرا بھی اچھی ہوتی تا تو

میں ضرور..... ماڈلنگ کرتی۔“

”خیر اتنی بھی بری نہیں ہے۔ خرائی کر کے دیکھ لو لیکن مریم کو مت ورغلاؤ۔“ لالہ نے کہا۔

”میں کہاں ورغلا رہی ہوں۔“

سین براہ منہ کر کھڑی ہو گئی۔

”شب بخیر۔“

لالہ نے شرارت سے سین کی طرف دیکھا اور چہرہ کھل کے اندر چھپا لیا۔ سین برا سامنہ بناتے ہوئے

کمرے سے باہر چلی گئی۔

”سنو مومو۔“ اس نے کھل سے ذرا سا چہرہ باہر نکالا۔

”مجھے کھانے کے لیے مت جگانا۔ میں نے آتے ہوئے دیکھا تھا، سبزی گوشت پک رہا تھا اور مجھے

نیند بھی آ رہی ہے۔“

”اچھا۔“ مریم نے چونک کر اسے دیکھا اور خود بھی چادر لے کر لیٹ گئی۔ اسے بھی بھوک محسوس

نہیں ہو رہی تھی اور ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ ”نینا، عاشی، تیمور، ماما، عادل اور..... اور شہزادہ۔“

سب ہی اسے یاد آ رہے تھے۔ بہت بہت زیادہ۔

اس نے آنکھیں بند کر کے چادر اوڑھ لی اور بند آنکھوں کے اندر آنسو چھلنے لگے۔



پروفیسر عادل کو کوریڈور میں ادھر سے ادھر ٹپکتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ پیشانی پر گہری

کیریں کسی اندرونی تفکر کا مظہر تھیں اور سیاہ و کُش خوب صورت آنکھوں کی سرخی کئی رت جگوں کی غماز۔ وہ

ہونٹ جھنجھٹے دانتوں پر دانت سختی سے جمائے ادھر سے ادھر ٹپکتے رہے تھے۔ خدا بخش کوئی تین دفعہ ان سے آکر پوچھ چکا تھا۔

”میاں کیا بات ہے۔ حویلی میں تو خیریت ہے نا۔ سب ٹھیک تو ہیں نا؟“

اور وہ سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دے کر پھر ٹپکتے لگتے تھے۔ وہ بے چین، بے حد مضطرب

تھے۔ کتنی راتیں ہو گئی تھیں۔ وہ ٹھیک سے سو نہیں پائے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں، کہاں

جائیں، کہاں تلاش کریں اسے۔ جہاں نہیں، کہاں کھو گئی تھی وہ۔ اتنی بڑی دنیا میں کہاں ڈھونڈیں گے وہ

اسے۔ وہ کتنے خوش، کتنے مطمئن اور کتنے پرسکون تھے کہ منزل تک پہنچ گئے ہیں لیکن منزل قریب آ کر دور

ہو گئی تھی اور پتا نہیں۔

درد بہت گہرا درد ان کے دل کو پھیلنے لگا تو وہ ٹپکتے ٹپکتے رک گئے۔

اس نے آخر ان کی ماں جی پر پی آپا پر اعتبار کیوں نہیں کیا۔ ایک بار آزما کر تو دیکھتی۔ انسانوں کے اس

ہجوم میں اس بھٹیر میں وہ اسے کہاں تلاش کریں، کہاں ڈھونڈیں۔

”مریم، تم نے کیوں کیا ایسا؟“

بے حد بے حال سے ہو کر وہ ہیں ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”اور شاید کچھ قصور ان کا بھی ہے۔“

کرسی کی پشت سے سر ٹپکتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ میں نے کب اس سے اپنے

جذبوں کا اظہار کیا تھا۔ کب بتایا تھا اسے کہ وہ میری عمر بھر کی ریاضت کا حاصل ہے۔ کب اسے وہ اعتماد دیا

تھا کہ وہ نہ جاتی لیکن میں تو..... میں تو صرف اسی خیال سے خاموش تھا اب تک کہ کہیں وہ HURT نہ

ہو۔ کہیں اس کا دل نہ دکھے، کہیں وہ بے اعتبار نہ ہو۔

اور کیا ان سے غلطی ہو گئی تھی۔ کیا انہیں اپنے جذبوں کا اظہار کر دینا چاہیے تھا۔ ایک پچھتاوا سا ان

کے دل میں اترنے لگا۔

ہاں شاید ان سے غلطی ہی ہوئی تھی۔

اگر وہ اپنے جذبوں کا اظہار کر دیتے، اگر وہ اسے بتا دیتے کہ کتنے انتظار کے بعد انہوں نے اسے پایا

ہے تو شاید وہ کہیں نہ جاتی لیکن وہ تو انتہائی مایوس، انتہائی دل گرفتہ ہو کر گھر چھوڑ گئی تھی اور اگر ماں جی کو ہی

بروقت فون کر دیتے اور نہ ب ملک کے جانے سے پہلے وہ آکر مریم کو ان کے نام کی انگلی پھینا دیتیں تو وہ

کتنے استحقاق سے اسے اپنے ہاں لے آتے لیکن اب کیا رہ گیا تھا صرف پچھتاوا اور دکھ اب کہاں تلاشیں

گئے وہ اسے۔ راہ چلتے چلتے وہ رک جاتے۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے بندیشوں کے پیچھے سے وہ

گھنٹوں دیکھتے رہتے کہ شاید آتے جاتے لوگوں میں وہ کہیں دکھائی دے جائے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آتی

تھی۔ کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تین ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ تین ماہ پہلے ہی کی تو بات تھی وہ مجبوری وغیرہ سے مل کر بہت دیر سے گھر آئے تھے اور خدا بخش نے انہیں بتایا تھا کہ زنب ولا سے فون آیا ہے اور پھر عاشی کی بات سن کر وہ کسی قدر بے چین ہو گئے تھے لیکن جب انہیں گمان تک نہ تھا کہ عاشی اس قدر سنجیدہ ہوگی اور وہ سچ سچ ان کے ساتھ حویلی آجائے گی نینا اور تیور سمیت۔ ان کا خیال تھا کہ عاشی وقتی طور پر غصے میں ہے۔ جانتے تھے کہ وہ ان دنوں بہت اپ سیٹ ہے اس پر غصہ فرملک کے رشتے داروں کا رویہ اسے مزید بھڑکا دیتا ہے۔ وقتی طور پر اس نے زنب کی شادی کو ہی ACCEPT نہیں کیا تھا پھر غصہ فرملک کے عزیز۔ انہوں نے اس وقت اسے بھلا دیا تھا اور سوچا تھا صبح تک اس کا غصہ اتر جائے گا لیکن جب صبح صبح وہ زنب ولا پہنچے تو تیور نے انہیں دیکھتے ہی بتایا۔

”مومو چلی گئی عادل بھائی۔“

”کہاں؟“ وہ ششدر ہو گئے۔

”پتا نہیں۔“ وہ رو ہانسا ہو رہا تھا۔

”مومو نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا بھائی۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا نا۔“

وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بلانے لگا لیکن وہ تو ساکت کھڑے تھے۔ انہیں لگا جیسے ان کے ارد گرد ساری روشنیاں مر گئی ہوں اور ایک دم اندھیرا ہو گیا ہو۔ وہ یونہی حیرانی سے تیور کو نکلے جا رہے تھے کہ عاشی نینا کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”عاشی۔ عاشی یہ سب کیا ہے؟“

وہ بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھے۔

”یہ مور کیا کہہ رہا ہے مریم کہاں چلی گئی ہیں کسی نے ان سے کیا کہہ دیا ہے۔“

”عادل بھائی۔“ عاشی بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور آنسو اس کی پلکیں جھگوٹے لگے۔

انہوں نے اسے تھکے ہوئے ہولے سے الگ کیا۔

”یہ گھر ہمارا نہیں ہے۔ ماما کا ہے۔ ماما نے کہا ہے ہم جہاں چاہیں چلے جائیں۔“

”اوہ نہیں!“

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی ماں ایسا بھی کہہ سکتی ہے۔

”بھائی آپ ہمیں گھر لے جائیں اپنے ساتھ حویلی میں۔“

عاشی نے آنسو صاف کرتے ہوئے دیکھا۔

”ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“

”اوہ ہاں۔“

ان کا ذہن مریم میں الجھا ہوا تھا۔

”عاشی پلیز مجھے سب بات شروع سے بتاؤ۔“

وہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

عاشی بھرائی آواز میں انہیں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

”اور صبح جب میں انھی تو بچو کا خط پڑھا تھا۔“

اس نے ٹٹھی میں بند خط عادل کی طرف بڑھا دیا۔

انہوں نے چند لائنوں کو کوئی چھ دفعہ پڑھا اور ہر دفعہ انہیں یوں لگا جیسے کسی نے ان کے دل میں خنجر بھونک دیا ہو۔

”کیوں..... کیوں کیا اس نے ایسا عاشی۔“

اضطرابی حالت میں خط کو اپنی مٹھیوں میں بھینچے ہوئے انہوں نے عاشی کی طرف دیکھا۔

”کیا اسے مجھ پر تم پر مایوسی پر اعتبار نہیں تھا۔ کیا ہم اسے اکیلا چھوڑ دیتے۔“

ان کی آواز بھرائی تو پوری شعوری کوشش سے انہوں نے خود کو سنبھالا۔

”آخر کہاں جا سکتی ہے وہ؟“

”شاید عینی کے گھر۔“

عاشی نے اظہار خیال کیا۔

”عاشی تم عینی کے گھر فون تو کرو۔ پتا کرو اس کا۔“

”اور ہم۔ ہم کیا آپ کے ساتھ جائیں گے۔ آپ ہمیں ساتھ لے جائیں گے؟“

تیور نے جو مسلسل انہی کی طرف دیکھ رہا تھا ان کی بات مکمل ہوتے ہی پوچھا۔

”تم۔“

وہ سوچ میں پڑ گئے۔

خدا جانے یہ اس طرح بچوں کو ساتھ لے جانا صحیح ہوگا یا نہیں۔ زنب کا رد عمل کیا ہوگا۔ عاشی تو جذباتی

ہو رہی ہے لیکن وہ بچے نہیں ہیں۔ انہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے لیکن اس وقت کچھ

دنوں کے لیے وہ انہیں ساتھ لے جائیں حویلی۔ بعد میں عاشی کو سمجھالیں گے۔ زنب کبھی یہ بات پسند

نہیں کریں گی اور وہ زنب کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”آپ کو ماما سے ڈر لگ رہا ہے عادل بھائی۔“

تیور نے ان کی طرف دیکھا۔

”اوہ ہاں نہیں تو۔“

انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”لیکن میں یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ آپ کی ماما اس طرح آپ کے چلے جانے پر ناراض ضرور ہوں گی۔“

”وہ تو ہے۔“

تیمور نے کندھے اچکائے۔

”لیکن جی بھی تو ماما سے ناراض ہیں۔ ماما نے بہت ڈانٹا تھا انہیں اور وہ..... وہ جو ہیں نا اکل اماں، وہ بہت فضول ہیں۔ ایسا کریں آپ جی کو اپنے ساتھ حویلی لے جائیں اور ہمیں تو ویسے بھی مری جانا ہے۔ کل چلے جائیں گے اور جب ماما آئیں گی تو آپ جی کو ادھر لے آنا۔ اب تو مومو بھی نہیں ہے نا اور یہ سب لوگ اچھے نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے نا عادل بھائی آپ پریشان نہ ہوں۔“

اس نے مدبروں کی طرح انہیں سمجھایا تو انہوں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگایا۔ مریم صحیح کہتی تھی وہ اپنی عمر سے بہت آگے ہے۔

”میں پریشان نہیں ہوں میری جان۔ تم سب مجھے بہت عزیز ہو اور میرے یا ماں جی کے لیے کوئی بوجھ ہرگز نہیں ہو، میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔“

”بھو! ادھر نہیں ہیں اور عینی باجی کہہ رہی ہیں کہ ان کے علاوہ کسی اور دوست کے گھر نہیں جاتی ہیں اور وہ بے وقوف لڑکی خدا جانے کہاں چلی گئی ہے۔“

انہیں یک دم جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

”عادل بھائی اب چلیں۔ اپنا سامان لے آؤں۔“

”ہوں۔“

انہوں نے پر خیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”عاشی۔“

وہ شاید اسے سمجھانا چاہتے تھے کہ اماں بیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔

”آہا۔“

اس نے بیڑھیوں سے آواز لگائی۔

”آج تو صبح صبح ہی بڑی رونقیں ہیں ادھر خیر ہے نا کہیں جانے کی تیاری ہے؟“

پروفیسر عادل نے یک دم مڑ کر اسے دیکھا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ ابھی تک وہ اماں سے نہیں مل سکے تھے۔

”اے۔“

اس نے عاشی کو مخاطب کیا۔

”یہ کونسا لہڈا ہے۔ بھائی اور بھادج کے جاتے ہی یہ کسے بلالیا۔“

”شٹ اپ۔“

عاشی کا چہرہ تپ اٹھا۔

”لو مومن مجھے خیال رکھنے کا کہہ گیا ہے تم سب کا اور تم نے ابھی سے پر نکالنے شروع کر دیے۔“

پروفیسر عادل نے انتہائی ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

”پلیز آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔“

”اور عاشی تم لوگ چل کر گاڑی میں بیٹھو اور مور بیٹا“ آپ شریف سے کہو آپ لوگوں کا سامان گاڑی میں رکھے۔“

اماں ہنوت سا بنا عاشی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر عادل جو اتنی بڑی ذمہ داری لیتے ہوئے متذبذب سے تھے۔ کچھ انہیں زنب کی ناراضی کا بھی خیال تھا لیکن اماں کی غلیظ نظریں جو عاشی پر جمی تھیں۔ انہیں دیکھ کر انہوں نے فوری فیصلہ کیا۔

مور صبح کہہ رہا تھا۔ عاشی کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہ شخص قطعی ناقابل اعتبار ہے۔ زنب آئیں تو وہ خود ان سے بات کر لیں گے۔ آخر عثمان احمد کی وفات کے بعد بھی تو سب لوگ حویلی میں رہے تھے۔

”اے عاصمہ! ادھر آ۔“

اماں نے پیچھے مڑ کر حلق پھاڑ کر آواز دی۔

”یہ تیرے بھائی کی سوتیلی جانی ہے کسی کے ساتھ۔“ عاصمہ نے بیڑھیوں کی ریلنگ سے تقریباً نیچے دیکھا اور شاہ شاہ کر کے ہنسنے لگی۔

”بھائی ہے اس کا تو کیوں ہلکان ہو رہا ہے۔“

”بھائی۔“

اماں کا منہ پورا کھل گیا اور عاصمہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتری اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔

”اوہ جی۔ یہ اماں میرا بھائی ہے۔ مومن سے بڑا ہے۔ اس نے پہلے آپ کو نہیں دیکھا نا۔ اس لیے

بک کر رہا ہے۔ آپ بڑے دنوں بعد آئے ہیں میں تو انتظار کرتی تھی روز۔“

”دبے کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے وہ چمک رہی تھی۔“

ایک انتہائی ناگوار نظر اس پر ڈالتے ہوئے عادل خان تیمور کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔

”میاں طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟“

خدا بخش پھر ان کے سر پر آکھڑا ہوا تھا۔

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”چائے لے آؤں؟“

”ہاں لے آؤ۔“

ایک دم ہی بہت ساری جھلک ان کی رگوں میں اتر آئی تھی۔

”کیا اب مریم کبھی نہیں ملے گی؟“

وہ کس قدر بے چین، کس قدر مضطرب رہے تھے۔ کہیں کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ یعنی اور بابا بھی پریشان ہو گئے تھے۔ عاشری کے ساتھ وہ خود ان کے گھر گئے تھے۔ میڈم نرگس کے فون سے انہیں یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی تھی محفوظ تھی لیکن جی کہاں کچھ پتا نہیں چلا۔ انہوں نے میڈم کے فون کے بعد کتنی ہی بار انہیں فون کیا تھا لیکن مریم نے پھر انہیں کوئی فون نہیں کیا تھا۔

”میڈم پلیز! آپ اسے سمجھائیں اس بے وقوف کو۔“

”بہت رشتے ہیں اس کے ہمارے ساتھ۔ وہ بابا کی بیٹی تھی نا اور حوبلی میں اس کے لیے بہت محبتیں ہیں۔ یہ بھی بتائیے گا کہ بابا کی خواہش کیا تھی۔ وہ یقیناً بابا کی خواہش کا احترام کرے گی۔“

لیکن اس نے پھر مڑ کر فون نہیں کیا تھا۔ میڈم ان کی بے چینی پر ہنستیں۔

”لگتا ہے عادل خان، تمہیں محبت ہو گئی ہے مریم سے۔“

وہ جڑ سے ہو جاتے، میڈم سے کچھ کہہ کر انہیں اپنا ریکارڈ لگوانا تھا کیا۔

”وہ بہر حال خود بخود ہی میری ذمہ داری بن گئی تھی میڈم۔“

”میں نے ابو سے وعدہ کیا تھا، سب کا خیال رکھنے کا۔“

وہ سنجیدہ ہی رہتے۔

لیکن میڈم ہنستی رہتیں۔

”تمہارے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے کیا عادل خان؟ کہو تو لائن لگا دوں۔ ایک سے ایک نازک بدن۔“

لڑکیوں کی کمی تو کبھی نہیں تھی اور یہ تو ان کا مسئلہ تھا ہی نہیں لیکن میڈم..... میڈم بھلا کیا سمجھ سکتی تھیں ان کے احساسات کو۔

”وہ اب نہیں آئے گی۔ لالہ کی طرح۔“

میڈم نے پورے یقین سے کہا تو انہیں لگا جیسے ان کا دل پھٹ جانے کو ہو۔

”پھر بھی۔“

انہوں نے خود کو حوصلہ دیتے ہوئے میڈم سے کہا۔

”وہ آپ کو فون تو کرے گی! اپنے والد کے متعلق جاننے کے لیے۔“

”ہاں۔“

”تو پلیز۔“

انہوں نے التجا کی۔

”او کے عادل خان!“

انہوں نے وعدہ کیا تھا لیکن مریم نے تو فون ہی نہیں کیا تھا۔ یا پھر کیا بھی تھا تو میڈم سے ان کی بات نہیں ہوئی تھی، کئی دنوں سے۔ کئی بار انہوں نے ریسیور اٹھایا تھا اور پھر رکھ دیا تھا۔

”کیا کہیں گی میڈم۔ انہوں نے کہا بھی تھا کہ وہ خود بتا دیں گی۔“

”اور کیا خبر اس نے میڈم کو فون کیا ہو اور میڈم کو اپنی مصروفیات میں خیال ہی نہ رہا ہو۔“

وہ ایک دم اٹھ کر فون کی طرف بڑھے۔

”ارے عادل خان! میں تمہیں فون کرنے لگی تھی۔“

میڈم نرگس ان کی آواز سن کر چپکس تو ان کا دل جیسے زور سے دھڑک کر سینے سے باہر آنے کو بے تاب ہونے لگا۔ انہوں نے اپنی ساری ساتھیوں کی طرف لگا دیں۔ دل کی دھڑکن خود انہیں سنائی دے رہی تھی۔

”عادل خان وہ تمہاری مریم کا فون آیا تھا..... پر۔“

”پر کیا۔“

انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

”اس نے کوئی فالتو بات ہی نہیں کی اور فون رکھ دیا۔ بس اپنے والد کے متعلق پوچھا اور.....“

انہیں لگا جیسے ان کا دل ڈوب جانے کو ہو۔ امید کی ایک چھوٹی سی لوجو کئی دنوں سے انہیں سہارا دیے ہوئے تھی اب ٹھٹھانے لگی تھی۔

”اور ان کے والد کا کچھ اتا تھا؟“

”نہیں عادل میاں۔ زینی کو اس کے متعلق کوئی علم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کس جگہ۔ زینی نے تو صاف انکار کر دیا نام تک نہیں بتایا۔“

”اس میں کچھ حرج تو نہیں تھا میڈم۔“

انہوں نے اپنے ڈوبتے دل پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں مگر عادل خان وہ زینی ہے۔ ابھی تم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ وہ بے حد ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔“

”مریم بے چاری تو از حد مایوس ہو گئی تھی۔ لگتا ہے وہ کسی دوست کے گھر ہے؟“

”مگر کون دوست؟“

انہوں نے ریسیور کرکریڈل پر ڈالتے ہوئے سوچا۔

”یعنی تو اس کی کسی دوست کے متعلق نہیں جانتی اور نہ ہی عاشی کو کچھ علم ہے۔“

”چائے عادل میاں۔“

خدا بخش ٹرائی دھکیلتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔

”ہاں بنا دو خدا بخش۔“

عاشی بی بی کا فون آیا تھا کمرے سے ان کی تین چھٹیاں ہو رہی ہیں اس لیے آپ لے جائیے گا۔“

چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے خدا بخش نے بتایا۔

”کب آیا تھا؟“

”صبح ہی جب آپ سو رہے تھے۔“

”اچھا کل یا دو لا دینا۔“

انہوں نے کپ ہونٹوں سے لگایا۔

عاشی کو انہوں نے ہاسٹل میں داخل کرادیا تھا۔ مور اور نینا بھی مری چلے گئے تھے۔ وہ چند دن حویلی میں رہی تھی لیکن اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا اور یہاں گھر میں انہوں نے اس کا تہوار ہننا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہاں ہر طرح کے لوگ آتے رہتے تھے۔ ان کے اسٹوڈنٹس ملنے جلنے والے ماں جی بھی اس کے خلاف تھیں۔

”عادل بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسے ہاسٹل بھجوا دو۔“

یوں عاشی ہاسٹل میں تھی اور ویک اینڈ پر وہ اسے حویلی لے جاتے تھے۔ ماں جی نے انہیں لگے

لگالیا تھا۔

”اور ماں جی کا ظرف اور دل کتنا بڑا ہے۔“

کئی بار کی سوچی ہوئی بات انہوں نے پھر سوچی تھی۔

اور ماں جی کے سینے سے لگی عاشی انہیں بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دی تھی۔

”ماں جی، کیا آپ ہمیں اپنے پاس رکھ لیں گی اپنے بچے سمجھ کر۔“

تیور نے سوال کیا تھا۔

”کیوں نہیں۔“

ماں جی نے عاشی کو الگ کر کے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

وہ عاشی وغیرہ کی طرف سے بے حد مطمئن ہو گئے تھے انہوں نے زینب سے رابطہ کرنے کی بے حد کوشش کی تھی لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز اور ڈاکٹر ہادی بھی ان کے جانے سے پریشان ہو گئے تھے لیکن انہوں نے انہیں تسلی

دی تھی۔

”کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بھی تو انہی کا گھر ہے اور انشاء اللہ منزل ملک کے آتے ہی وہ عاشی کی رخصتی کر دیں گے۔“

”اور چائے بناؤں؟“

انہوں نے خالی کپ ٹرائی میں رکھا تو خدا بخش نے پوچھا۔

”نہیں۔“

انہوں نے خدا بخش کی طرف دیکھا جو ہیں زمین پر بیٹھا انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہے خدا بخش۔ آپ یونہی پریشان ہو رہے ہو۔“ بے حد ملالت سے انہوں نے کہا۔

”آپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی میاں، گو دوں میں کھلایا ہے۔“

”جانتا ہوں خدا بخش۔“ ان کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

”مسرو اگر میری عدم موجودگی میں آئیں تو انہیں روک لینا ان کی EXHIBITION کے سلسلے

میں حتیٰ بات چیت ہو گئی ہے ایک صاحب سے۔ شاید اسی سلسلے میں ایک دوروز تک کراچی جاؤں۔“

”آپ اب کالج جائیں گے کیا؟“

”نہیں اب کالج کا وقت کہاں رہا۔ ذرا مجتبیٰ کی طرف جاؤں گا۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی

نرزار مسرور کی exhibition کے سلسلے میں مشورہ کرنا تھا ان سے۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مسرور میاں نے آج آنا تھا کیا؟“

”ضروری نہیں لیکن میں نے اسے پیغام بھجوایا تھا مانی کے ہاتھ کہ کچھ دنوں تک چکر لگائے۔“

خدا بخش کی بات کا جواب دے کر وہ تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ مجتبیٰ کی باتیں شاید اس بوجھل پن کو کم کر دیں۔

دور تک کہیں کوئی امید کا تار انہیں دمکتا تھا۔ وہ جو ایک ذرا سی آس تھی کہ شاید وہ میڈم کو اپنا پتا دے

دے وہ آس بھی دم توڑ گئی تھی۔ وہ اتنی ظالم تو نہیں تھی پھر اتنی ظالم کیوں ہو گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس

تہا بانیں کرتے ہوئے تیار ہونے لگے۔



”مجتبیٰ کے ہاں تصدیق احمد بھی تھے۔ سر جھکائے کچھ پریشان سے بیٹھے تھے اور مجتبیٰ ہو لے ہو لے

نکل کچھ سمجھا رہے تھے کہ پروفیسر عادل دستک دے کر اندر چلے آئے۔“

”اے عادل خاناں! آج یہ چاند غریب خانے پر کیسے طلوع ہو گیا۔“

مجتنی نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

”sorry مجتنی ان دنوں کچھ ایسا مصروف رہا کہ نہ آسکا۔“

”مصروف تو آپ ہمیشہ ہی رہتے ہیں عادل خان لیکن آپ سے اس بے وفائی کی توقع نہ تھی کہ آپ مزاج پر ہی تک کو نہ آئے۔ مجنی ہمیں تو بڑا یقین تھا کہ ہماری پیاری کاشتے ہی دوست احباب بھاگے چلے آئیں گے۔ جن پہ نیکر تھا وہی بچے ہو ادینے لگے۔“

انہوں نے لطف سا لگہ کیا۔

”بخدا مجھے آپ کی پیاری کا علم نہیں تھا بالکل بھی۔“

پروفیسر عادل نے بے حد حیرت سے کہا۔

”مجھے آپ کا پیغام ضرور ملا تھا لیکن کسی نے پیاری کا نہیں بتایا۔ بس حافظ صاحب نے اتنا ہی کہا تھا کہ آپ مجھے یاد کر رہے ہیں۔“

”یہ حافظ صاحب ان دنوں اپنے حواسوں میں کب رہتے ہیں۔ ایک غیر حاضر اور دو حاضر بیویاں ان کے ہوش و حواس بھلائے ہوئے ہیں۔ بہر حال اب گلہ نہیں رہا آپ سے۔“

”مگر آپ کو ہوا کیا تھا مجتنی؟“

فرشی نشست پر بیٹھے ہوئے پروفیسر عادل نے پوچھا۔

”بس یوں ہی ذرا دل بے ایمان ہو گیا تھا۔“

انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”ساری زندگی ہم اسے دعا دیتے رہے۔ اب یہ دعا دینے والا تھا لیکن ڈاکٹروں نے پکڑ دھکڑ کر اسے روک ہی لیا۔“

”کیا۔“ پروفیسر عادل کو شک سا لگا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ مجتنی!“

”ہاں عادل خان! دل کا دورہ پڑا تھا لیکن لوٹ پوٹ کر اٹھ ہی بیٹھے۔ ایک جھوم دلبر ان تھا اسپتال میں۔ کسی کی دعائیں لگ گئیں۔“

”اور مجھے معلوم تک نہیں ہوا۔ آپ نے بھی تصدق احمد مجھے فون نہیں کیا۔“

انہوں نے تصدق احمد سے گلہ کیا تو تصدق احمد نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ پیشانی پر ٹھکری گہری لکیریں اور چہرے سے جھلکتا اندرونی کرب۔

پروفیسر عادل چونک پڑے اور گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”Sorry Sir“

تصدق نے آہستگی سے کہا۔

”مجھے بھی کچھ دن پہلے ہی پتا چلا اور تب مجتنی صاحب گھر آچکے تھے اور مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ کو علم نہیں ہوگا۔“

”خیر۔“

انہوں نے سر کو ہلکا سا دائیں طرف جھکایا۔

”آپ کچھ پریشان لگتے ہیں۔ کیا جاب کا کوئی مسئلہ ہے؟“

”نہیں۔ زندگی میں اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔“

ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کی تراش میں گم ہو گئی۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
”be brave yong man“

انہوں نے تصدق احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”آپ جیسے یک لوگوں کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ مجتنی کو دیکھیں۔ کیسے دل کا درد بھگتا کر بھی خوش اور مطمئن بیٹھے ہیں۔“

”ان کی اور بات ہے سر! انہوں نے زندگی میں جو کچھ چاہا پالیا اور یہاں یہ حال ہے کہ بچپن سے ہی جو پانا چاہا ہاتھوں سے پھسل گیا۔ جو خواہش کی وہ خود ہی اپنی موت آپ مر گئی۔“

ایک مبہم سی طنز یہ مسکراہٹ پھر ان کے لبوں پر ابھر کر ختم ہو گئی۔

پروفیسر عادل نے مجتنی کی طرف دیکھا۔

”بہت دیر سے سن رہا ہوں میاں۔“

”تو آپ سمجھاتے کیوں نہیں انہیں! ابھی آگے زندگی پڑی ہے اور کیا خبر آنے والے لمحوں میں سب کچھ انہی کا ہو۔“

تصدق احمد نے کوئی جواب نہیں دیا اس نے پھر سر جھکایا۔

”اور جانے کیا پریشانی ہے اسے شاید کوئی ایسی پریشانی جو وہ ان سے share نہیں کرنا چاہتا۔“

پروفیسر عادل نے سوچا اور موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”آج کل کوئی کام ہو رہا ہے کیا؟“

”نہیں۔“

اس نے جھکے سر کے ساتھ جواب دیا۔

”دفتر گھر اور بس زندگی جیسے کسی ایک نقطے پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ برش اور رنگوں سے نانا ٹوٹے تو جیسے

صدیاں ہی بیت گئی ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات نہیں ہے تصدق احمد۔“

پروفیسر عادل نے تنبیہ کی۔

”برش اور رنگوں سے تو نا تا نہیں ٹوٹنا چاہیے یہ تو آپ ظلم کر رہے ہیں اس عظیم فنکار پر جو آپ کے اندر

چھپا بیٹھا ہے۔“

”عظیم فنکار۔“

وہ دھیرے سے ہنسا۔

”کمال کرتے ہیں آپ سر۔ بھول گئے ہیں شاید کہ ناقد مجھے deny کر چکے ہیں۔“

”نہیں تصدق احمد۔ انہوں نے تمہیں deny نہیں کیا..... ہاں۔“

”سر پلیز اس ٹاپک کو مت چھیڑیں۔ لہور سے لگتا ہے۔ سارے زخموں کے ٹانگے ادھڑ جاتے ہیں۔

میں اگر کسی بڑے دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا ہوتا تو یہ لوگ مجھے کبھی deny نہ کرتے بلکہ میرے کام کی تعریف میں صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیتے جیسے سلسلی اعوان کے کام پر انہوں نے تحریری مضامین اور مقالے لکھے۔ آپ نے تو سلسلی کا کام دیکھا ہے نا سر۔ کیا اس کا کام مجھ سے بہتر تھا۔ نہیں ہرگز نہیں لیکن فرق یہ تھا کہ وہ دولت مند تھی اور امراء کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھی کہ اگر وہ الٹی سیدھی لکیریں بھی کھینچ دیتی تو لکھنے والے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے۔“

اس کے ہونٹ زہر سے بھگ گئے تھے۔ پروفیسر عادل نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہتھکی دی۔

”relax.....relax تصدق احمد۔ وقت بہت بڑا منصف ہے۔ انشاء اللہ ایک دن آئے گا۔“

جب تمہارے کام کو تسلیم کر لیا جائے گا۔“

”کب کب آئے گا یہ وقت سر جب میں نہیں رہوں گا۔“

وہ بے حد تلخ ہو رہا تھا۔

”یہ اس ملک کی ریت ہے کہ بعد موت کے ہم فنکاروں کو ہار پہناتے ہیں۔ زندگی میں چاہے وہ

خیراتی اسپتال میں دوا کے لیے ترس ترس کر مر جائے۔“

”اتنی خفگی اچھی نہیں ہوتی یک مین۔“

پروفیسر عادل نے مسکرا کر اسے دیکھا لیکن تصدق احمد کے ہونٹ یوں ہی بچھنے رہے جیسے وہ سب سے

خفا ہو۔ سب سے زمانے سے اور اپنے آپ سے۔

وہ چند لمحے یونہی ہونٹ بچھنے سر جھکائے بیٹھا رہا پھر ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے کہیں جانا تھا بہت ضروری۔“

اس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اوکے تم جاؤ اور زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

جب تک حیدر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اور یہ کہ تم اکیلے نہیں ہو اور تمہارے ساتھ اور بھی کئی زندگیاں وابستہ ہیں۔ آدمی صرف اپنے لیے ہی

نہیں جیتا تصدق احمد۔ بعض اوقات اسے دوسروں کے لیے زندہ رہنا اور جینا ہوتا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب تم یہ جان لو گے کہ تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا۔“

”فیصلہ.....؟ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں بھی تھوڑا سا خوش ہو لوں۔ کچھ دن اپنی مرضی سے جی لوں۔“ وہ بات مکمل کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔ پروفیسر عادل نے اسے باہر جاتے حیرت سے دیکھا۔

”کیا بات ہے مجھے تصدق کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“

”اسے محبت ہو گئی ہے۔“ مجھے زور سے ہنسنے۔

”اور یہ شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”کس سے؟“

پروفیسر عادل ابھی تک حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”آمنہ صفی سے۔“

”اور آمنہ صفی کیا وہ بھی.....“

”نہیں وہ تو خود از حد پریشان ہے لیکن ابھی اتنی بہت سی ہمدردیوں اور دوستی کا کچھ نتیجہ تو نکلتا ہی

تھا نا تصدق احمد کے لیے جاب ڈھونڈی جا رہی ہے مکان تلاش کیا جا رہا ہے اس کے بچوں کے داخلے کے لیے بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔“

”لیکن اس سب کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا۔“

”عادل خاناں، مطلب کچھ بھی نہ ہو لیکن POSITIVE اور NEGATIVE جب ملیں

تو SPARKING تو ہوتی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ تصدق احمد کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ اس کی

بیوی سیدی سادی دیہاتی عورت ہے اور تصدق احمد فنکار۔ سر سے پاؤں تک مکمل فنکار۔ نہ دل ملے نہ

ذہن ایسے میں آمنہ صفی کا خلوص اور التفات۔ جو جذبہ بھی تصدق کے دل میں پیدا ہوا ہے اسے وہ محبت کا

نام دے رہا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آمنہ صفی مجھے کہتی ہے کہ اسے سمجھاؤں کہ اسے اپنی بیوی

اور بچوں کا خیال رکھنا چاہیے اور وہ کہتا ہے کہ آمنہ کو سمجھاؤں کہ اسے آمنہ کی رفاقت کی ضرورت ہے۔“

”تو پھر۔“

پروفیسر عادل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تو پھر کچھ نہیں میاں! آمنہ کسی عورت پر ظلم نہیں کر سکتی سو وہ کبھی تصدق سے شادی نہیں کرے گی چاہے وہ خود بھی کیوں نہ تصدق احمد کے عشق میں مبتلا نہ ہو چکی ہو۔“

”واقعی آمنہ صنفی ایسی ہی تھی۔“

پروفیسر عادل نے سوچا۔

”اوہ کاش وہ اس کے لیے کچھ کر سکتے۔ آمنہ صنفی کے لیے ان کے دل میں ہمیشہ ہی ایک نرم گوشہ رہا۔

پتا نہیں کیوں! نہیں ہمیشہ ہی یہ محسوس ہوا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

”چائے لو گے یا ٹھنڈا!“

بجٹی نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں نہیں، کچھ بھی نہیں۔ آپ پلیز بیٹھیں بجٹی۔“

پروفیسر عادل نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

”اور بتائیں مجھے ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟“

”ارے یار! کیا کہنا ہے۔ آرام کریں، میڈیسیں نہ چڑھیں، کولیسٹرول چیک کرتے رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”ہوں۔“

پروفیسر عادل کچھ دیر ان سے ان کی بیماری کے متعلق تفصیل پوچھتے رہے اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ارے اتنی جلدی بیٹھو نا۔“

”نہیں بجٹی! اب اجازت دیں۔“

ایک دم ان کا دل اچاٹ ہو گیا تھا حالانکہ گھر سے وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ بہت دیر تک بجٹی کے پاس

بیٹھیں گے شاید ان کی بے ساختہ گفتگو اور دلچسپ باتوں سے دل کا بوجھ کم ہو جائے۔ کئی دفعہ ان کا جی چاہا

وہ بجٹی سے پوچھیں کہ انہوں نے مریم کو دیکھا ہے کہیں انہیں پتا ہے کچھ کہ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ آخر وہ

عثمان احمد کے دوست تھے۔ ان کے گھر آنا جانا تھا ان کا لیکن پھر انہوں نے خود کو روک لیا۔

”کچھ پریشان لگتے ہو عادل خان؟“

ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بجٹی حیدر نے پوچھا۔

”ہاں نہیں تو۔“

پروفیسر عادل نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”کچھ کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور کبھی کبھی کوئی راہ بھی دکھائی دے جاتی ہے۔“

بجٹی حیدر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی بات ہوئی تو دل کا بوجھ آپ کے سامنے ہی ہلکا کر دوں گا۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے بجٹی حیدر کو خدا حافظ کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”اور اب کہاں جائیں وہ؟“

اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے ایک لمحے کو انہوں نے سوچا اور پھر عاشری کے ہاسٹل کی طرف گاڑی

موڑ دی۔



”مریم! کیا آج چلنا نہیں ہے؟“

لالہ نے مریم کو لینے دیکھا تو پوچھا۔

”نہیں۔“

مریم نے چہرے سے چادر ہٹائے بغیر جواب دیا۔

”کیوں خیر تو ہے نا۔ تمہیں پتا ہے نا، مسز ارباب بلا وجہ چھٹی کرنے پر کس قدر بولتی ہیں۔“

لالہ نے جلدی جلدی بالوں کو برش کرتے ہوئے کہا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“

لالہ نے برش نیل پر رکھ کر اس کی چادر کھینچی اور پھر چونک پڑی۔

”ارے تمہارا چہرہ تو ایک دم سرخ ہو رہا ہے۔“

اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”تمہیں تو ٹمبر پچر ہے۔ ٹھیک ہے میں بھی نہیں جاتی۔ مسز ارباب کو فون کر دوں گی۔ میں تمہارے

لئے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔ تم ایسا کرو تیار ہو جاؤ پھر تمہیں ڈاکٹر کی طرف لے جاتی ہوں۔“

”نہیں معمولی سی حرارت ہے تم جاؤ۔ ٹیبلٹ لوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

مریم نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا اور پھر کروٹ بدل لی۔

”نہیں یار اس قدر جل رہی ہو، معمولی ٹمبر پچر نہیں ہے۔“

لالہ اس کے بیڈ کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”پلیز لالہ! تم جاؤ۔“

اس کی اس ہمدردی پر مریم کا دل بھر آیا اور آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

”مومو!“

لالہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ادھر دیکھو نامیری طرف مجھے تمہاری طبیعت صحیح نہیں لگ رہی ہے۔ کل سے جب سے میں آئی ہوں

م بہت چپ چپ اور اداس لگ رہی تھیں بلکہ شاید روئی بھی تھیں۔ کیا مزار باب نے کچھ کہا ہے؟“

”ہاں نہیں تو۔“

مریم نے کروٹ بدلی۔

”کل تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”میں..... وہ..... میں۔“

لالہ شٹا گئی۔

”یوں ہی مزار باب نے کسی کام سے بھیجا تھا۔“

”اے لالہ۔“

سین نے دروازے سے جھانکا۔

”تم ابھی تیار نہیں ہوئیں ناشتا لگ گیا ہے۔“

”آئی ہوں۔“

لالہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہارا ناشتا یہاں ہی لے آؤں۔“ اس نے مریم سے پوچھا۔

”نہیں۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔ میں جب اٹھوں گی تو خود چائے بنا لوں گی۔ کچھ لے لو مریم۔ میں ماسی

سے کہتی ہوں، تمہیں دودھ دے جائے۔“ اس نے باہر جاتے جاتے کہا۔

”سنو لالہ تم چلی جانا۔ میرے لیے مت رکنا۔“

مریم نے کروٹ بدل کر اسے جاتے جاتے آواز دی۔

”ٹھیک ہے لیکن تم پلیز ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا۔ میں آئی سے کہہ دوں گی۔“

”اچھا۔“

مریم نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور بند آنکھوں کے اندر آنسو مچھلنے لگے۔

”میں اس بھری دنیا میں کس قدر تنہا اور اکیلی ہوں۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی اور پتا نہیں کوئی مجھے

بھی کرتا ہوگا یا نہیں اور خدا جانے ماما ابھی تک ملک سے باہر ہیں یا آگئی ہیں اور اگر آگئی ہیں تو پتا نہیں

شئی، مینا اور مور کو ساتھ لے گئی ہیں یا نہیں۔ کیا خبر وہ ابھی تک حویلی میں ہی ہوں اور پتا نہیں سب نے

میرے متعلق کیا سوچا ہوگا اور پتا نہیں مجھے یہاں آنا بھی چاہیے تھا یا نہیں لیکن میرا کیا رشتہ تھا عادل بھائی

سے ماں جی سے بی آپا سے۔ کس ناتے جاتی وہاں۔“ کتنی ہی بار اس نے سوچا تھا۔ شاید ماں جی اسے بھی

قبول کر لیتیں۔

لیکن اب تو وہ یہاں آگئی تھی۔ لالہ کے ساتھ آٹھ ماہ ہونے والے تھے اور ان آٹھ ماہ میں اس نے

زندگی سے جو کچھ سیکھا تھا وہ چوبیس پچیس سالوں میں نہیں سیکھ پائی تھی۔ اب وہ پہلے والی مریم نہیں رہی

تھی۔ ڈرنے خوف زدہ ہونے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو دینے والی مریم۔

ماما نے میڈم کو اس کے ڈیڈی کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ اس نے میڈم نرگس کے اصرار کے باوجود انہیں

نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں ہے اور خاموشی سے فون رکھ دیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے ڈیڈی کے متعلق زیادہ نہیں

سوچتی تھی۔ جب بھی وہ ان کا تصور کرتی سامنے عثمان احمد آکر کھڑے ہو جاتے لیکن پھر بھی کبھی بڑی

شدت سے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ ایک بار اس شخص کو دیکھے ضرور جو اسی دنیا میں

کہیں موجود ہے اور جس کے ساتھ اس کا بڑا گہرا بڑا مضبوط رشتہ ہے اور جسے شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ اس

دنیا میں کہیں ایک لڑکی ہے جو اس کی بیٹی ہے۔ اگر اسے علم ہوتا تو کبھی تو وہ اسے کھوجتا ہوا اس تک آتا۔ ماما

اتنی غیر معروف تو نہ تھیں کہ ان کو کھوجنا مشکل ہوتا۔

”مومنو تم می سے کہتیں تو کہ وہ ایک بار پھر تمہاری ماما سے بات کریں اور کچھ نہیں تو نام ہی پوچھ

لیتیں۔ شاید کہیں زندگی کے کسی موڑ پر وہ تمہیں مل جاتا اور تم بتا سکتیں کہ تم اس کی بیٹی ہو۔“

”کیا فائدہ لالہ اور پھر تم ماما کو نہیں جانتی ہو اگر انہوں نے ایک بار نہ کر دی ہے تو وہ زندگی بھر نہیں

مانیں گی اور پھر ایک نام کے نہ جانے کتنے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا کروں گی صرف نام معلوم کر کے اور پھر کیا

خبر ماما میرے باپ کے متعلق کیوں نہیں بتانا چاہتیں۔“ کوئی گہرا درد اس کے دل کو چھیل گیا۔

”کوئی اور..... کوئی اور شخص نہیں ہے جو تمہیں تمہارے اپنے ڈیڈی کے متعلق بتا سکے۔“

لالہ ابھی تک اسی میں الجھی ہوئی تھی۔

”شاید نہیں۔ پلیز لالہ لیواٹ اور اب میرے لیے کہیں جلدی جاب کا بندوبست کر دو۔“

”کوشش تو کر رہی ہوں لیکن میری خواہش تھی کہ تم یہاں نہ رہتیں اپنے گھر چلی جاتیں۔ ماما کے پاس

نہ سہی تو ڈیڈی کے پاس۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں مریم۔“ اس نے ایک دم چٹکی بجا لی۔

”ممی سے آئی کا نمبر لے کر انہیں خود کال کر لو۔“

”نہیں ماما کبھی کچھ نہیں بتائیں گی۔“

”پھر مجھے کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“

لالہ پتا نہیں کیوں چاہتی تھی کہ وہ ہر صورت اپنے ڈیڈی کے پاس چلی جائے اور پھر لالہ کے اصرار پر اس

نے میڈم نرگس سے نمبر لے کر اس کاٹ لینڈ فون بھی کیا تھا اور جواب حسب توقع ملا تھا۔ ماما نے اس سے

بات کرنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

”میرے ساتھ بات مت کرو تم مومو۔“

”ماما پلیز میری بات تو سنیں۔“

”مت کہو مجھے ماما۔“

انہوں نے چیخ کر کہا تھا اور فون بند کر دیا تھا اور تب ایک بار پھر اس نے لالہ، سین، پروین سب ہی سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے لیے کہیں جاب کا بندوبست کر دیں۔ خود صبح ہر روز اوپر آئی سے اخبار لے کر بیٹھتی اور اگر اسے کہیں کوئی اشتہار نظر آتا وہاں درخواست دے ڈالتی لیکن دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی کہیں جاب نہیں ملی تھی۔ لالہ کی روم میٹ بھی واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی شادی ہو گئی تھی اور لالہ ہی اکیلے کمرے کا کرایہ وغیرہ دے رہی تھی۔

”یہ صبح نہیں ہے لالہ پلیز۔“

ایک روز لالہ بوتیک سے واپس آئی تو مریم نے کہا۔

”کیا۔“

لالہ نے پرس بیڈ پر پھینکا۔

”بھی اس طرح تم پر بوجھ بننا۔“

”تمہیں کوئی تکلیف ہے یہاں؟“

”نہیں، لیکن لالہ۔“

”پور مت کرو مومو، جب تمہارے مطلب کی کوئی جاب مل گئی تو کر لیتا۔ جو جاب میں کرتی ہوں وہ

تمہارے مطلب کی نہیں ہے ورنہ وہ تو ایک دن میں مل سکتی ہے۔“

”تو پلیز لالہ کہو نا، مسز باب سے۔“

”تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟“ پھر خود ہی بولی۔

”اچھا کہوں گی۔“

اس وقت لالہ نے اسے ٹال دیا۔

اور بعد میں بھی کئی بار مریم نے پوچھا تو لالہ نے یہی کہا۔

”مومو ابھی جگہ نہیں ہے۔ مسز باب سے کہہ دیا ہے میں نے۔ جب بھی جگہ ہوئی تو.....“

وہ دو تین جگہ انٹرویو بھی دے چکی تھی اور کہیں سے ابھی کال لے نہیں آیا تھا۔ وہ از حد مایوس اور پریشان ہو رہی تھی کہ اس شام مسز باب لالہ کی مزاج پر سی کو آگئیں۔ لالہ کو تین چار دن سے ٹمبر پچر ہو رہا تھا اور وہ کام پر نہیں جا رہی تھی۔ تب مسز باب کے لیے چائے بناتے ہوئے اس نے درخواست کی کہ جب بھی کوئی جگہ خالی ہو وہ اس کا دھیان رکھیں۔

مسز باب نے چائے کا کپ لیتے ہوئے دھیان سے اسے دیکھا۔

”کیوں نہیں بھی؟ تم لالہ کی دوست ہو اور تمہارے لیے جگہ نہ بھی ہو تو بتائی جاسکتی ہے۔“

”سچ مسز باب۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

”بالکل سچ ایسا کرو تم کل ہی آ جاؤ۔“

”کل۔“

اسے یقین نہیں آیا۔

”لیکن ابھی لالہ کو تو ڈاکٹر نے ایک دور دور ریٹ بتایا ہے۔“

”تو لالہ نے کیا تمہیں اٹھا کر لانا ہے۔“

مسز باب نے قہقہہ لگایا۔

”بھئی دین جاتی ہے پک کرنے سب در کرز کو تمہیں بھی لے جائے گی۔“

وہ بے حد خوش تھی۔

”جھینک گا ڈال لالہ بالآخر مجھے بھی جاب مل گئی۔“

مسز باب کے جانے کے بعد اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

”لیکن لالہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ کرلوں گی نا میں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا مریم کہ تمہیں اتنی جلدی کیا تھی۔ یہ جاب تمہارے شایان شان نہیں ہے؟“

”اور کیا تمہارے شایان شان ہے۔“

”میری ایجوکیشن تمہاری جتنی تو نہیں ہے نا۔ تمہیں اچھی جاب مل سکتی تھی، بس تھوڑا انتظار کرنا پڑتا۔“

”اور کتنا انتظار کرتی۔ سارا بوجھ تم پر ہے۔“

”مگر ارا تو ہو رہا تھا نا۔“ لالہ بے حد چپ تھی۔

”میں نے تو بہت چاہا تھا مریم کہ تم یہاں جاب نہ کرو لیکن شاید..... تمہاری قسمت میں یہی لکھا تھا۔“

خیر اپنا خیال رکھنا۔“

صبح جب دین اسے لینے آئی تو لالہ نے آہستگی سے کہا۔

”don't worry لالہ۔“

اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”جب بھی اس سے بہتر کوئی جاب ملی تو یہ جاب چھوڑ دوں گی۔“

”خدا کرے، تمہیں کوئی اچھی جاب جلدی مل جائے۔ ورنہ بعض اوقات جب آدمی کہیں پھنس جاتا

ہا تو پھر پچھتاوا ہو جاتا ہے، لیکن تب اس نے لالہ کی بات پر بالکل غور نہیں کیا تھا۔ مسز باب کی بوتیک

شاب بہت بڑی تھی۔ Chen one کی طرز پر بنی ہوئی۔ بچوں بڑوں لیڈر، جینٹلس سب کے لیے الگ الگ شے تھے۔ بے حد قیمتی کپڑے، میچنگ جوتے، پرس، جیولری کے علاوہ بیڈ شیٹ وغیرہ بھی تھیں۔ وہاں اس کے علاوہ نو لڑکیاں اور بھی کام کر رہی تھیں۔ کچھ سیلز گرل تھیں۔ دو لڑکیاں کاؤنٹر تھیں۔ میل کے لیے الگ کاؤنٹر تھا۔ وہاں بھی ایک لڑکی کام کر رہی تھی۔

”لالہ یہاں اس کاؤنٹر پر کام کرتی ہے۔“

مسز ارباب نے سب لڑکیوں سے اس کا تعارف کروانے کے بعد اسے بتایا۔

”اور آج کل بے چاری افزا اکیلی کام کر رہی ہے۔ جب تک لالہ نہیں آتی تم اس کی ہیلپ کرو۔ پھر تمہیں تمہارا کام بتا دیا جائے گا۔“

افزا بہت کم کلوڑ کی تھی۔ اس نے سارے دن بہت کم بات کی اس سے۔ بس خریداروں سے چٹ لیتی، رقم دیکھتی اور وصول کرتی رہی۔ خریداروں کو قیمت کی چٹ متعلقہ شے کی سیلز گرل سے مل جاتی تھی جسے کاؤنٹر پر دکھا کر وہ پے منٹ کر دیتے تھے۔ افزا نے اس کی ذات کے حوا کے سے کوئی بات نہیں کی تھی بس لالہ کا پوچھا تھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ باقی لڑکیوں نے کم و بیش اس کی خوب صورتی کی تعریف کی تھی۔

دو پہر کا کھانا وہاں ہی سرو کیا جاتا تھا۔ سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا تھا اور کھانے کے بعد مسز ارباب نے اسے اپنے دفتر میں بلایا اور اس کے کاغذات دیکھے تھے۔

”بچوں کے شے میں فی الحال دو سیلز گرل ہیں اور بعض اوقات بیک وقت بہت سے کسٹمرز کو ڈیل کرنا انہیں مشکل ہو جاتا ہے اس لیے لالہ کے آنے کے بعد تم وہاں کام کرنا یہ سیلز گرل کی جاب بظاہر تمہیں اپنی ڈگری کے مقابلے میں بہت معمولی لگے گی لیکن یہ اتنی معمولی نہیں ہے۔“

”جی۔“

مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب دیکھو، یہاں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ ہائی جینٹری کے۔۔۔۔۔“

انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”ابھی لاسٹ ایر کی بات ہے، ہماری ایک کسٹمر کو میری ایک سیلز گرل اتنی پسند آئی کہ اس نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی اس سے۔ اب وہ دو کنال کی کونٹری میں رہتی ہے اور یہ لمبی گاڑیوں میں گھومتی ہے۔“

”جی۔“ مریم کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہے، مسز ارباب کی بات اسے بہت عجیب لگتی تھی۔

”وہ بھی کیا نام تھا اس کا؟ فریدہ۔ تم فریدہ سے زیادہ خوب صورت ہو۔ کیا خبر کبھی تمہاری بھی لاٹری

نکل آئے۔“

مریم کا چہرہ تپ اٹھا۔

”میڈم، میں اس مقصد کے لیے تو جاب نہیں کر رہی ہوں۔“

”اوہ۔ ہاں۔ تم نے برا مان لیا۔ خیر اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں، چلو ابھی نئی آئی ہوتا۔ تمہارے بیڑس۔ ہاں یاد آیا، وہ لالہ بتا تو رہی تھی کہ تمہاری والدہ نے دوسری شادی کر لی ہے۔“

”جی۔“ مریم کو ان کی باتوں سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

”تمہیں پہلے تین تین ماہ تین ہزار روپے ملے گی پک اینڈ ڈراپ کی سہولت۔ لیج اور چائے وغیرہ۔ کوئی اعتراض؟“

”نہیں۔“

مریم نے نفی میں سر ہلادیا۔

فی الحال یہ بھی غنیمت تھا۔ وہ لالہ کے ساتھ کچھ تو share کر سکتی تھی۔

اسے مسز ارباب کچھ زیادہ پسند نہیں آئیں تھیں اور نہ ہی ان کا انداز گفتگو اسے اچھا لگا تھا۔

”یہ مسز ارباب کچھ عجیب سی نہیں ہیں۔“ واپس آ کر اس نے لالہ سے کہا۔

”ہاں شاید۔ تم سے کیا بات ہوئی؟“

لالہ کے استفسار پر اس نے ساری بات بتائی۔ تب ایک بار پھر لالہ نے اسے روکا۔

”مریم، کیا تم کچھ انتظار نہیں کر سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پاؤ گی۔“

”لالہ لوگ ہمیشہ ہر جگہ ہماری مرضی کے نہیں ہوتے اور ہمیں ایڈجسٹ کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیا خبر کسی دوسری جگہ اس سے بھی بڑے لوگ ہوں پھر یہاں تو تم بھی ہو۔“

”ہوں۔“ لالہ خاموش ہو گئی۔

اس روز سین اور دوسری لڑکیاں اس سے ٹریٹ مانتے کمرے میں آئیں اور اس نے پہلی تنخواہ ملنے پر انہیں ٹریٹ دینے کا وعدہ کیا۔ وہ سب خوش تھیں کہ اسے جاب مل گئی ہے لیکن لالہ بہت چپ چاپ تھی شاید طبیعت کی خرابی کی وجہ سے سین نے پوچھا بھی ”کیا بات ہے لالہ اتنی چپ چاپ کیوں ہو۔ کیا کمی یاد آرہی ہیں۔“

”نہیں تو۔“

”سنو، تم مہی کے پاس واپس چلی جاؤ۔ مائیں زیادہ عرصے تک بچوں سے ناراض نہیں رہ سکتیں۔“

”ہاں سوچوں گی۔“

اور اس رات بیڈ پر لیٹتے ہوئے مریم نے پوچھا۔

”لالہ، کیا تم نے کبھی واپس مہی کے پاس جانے کے متعلق نہیں سوچا؟“

”سوچا تھا، جب میں لاہور سے واپس آئی تھی تو۔“

”لیکن کیا پھر میری وجہ سے؟“

”جہیں خیر صرف تمہاری وجہ سے نہیں۔“

”کیا تمہارا خیال ہے کہ مئی تم سے بات نہیں کریں گی۔“

”جہیں مجھے پتا ہے، مئی مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ جائیں گی۔ وہ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتیں۔“

”پھر تم چلی جاؤ نا۔ آئی بھی کہتی تھیں کہ اگر تم ان کے پاس چلی جاؤ تو وہ تمہیں اعزاز سے ملے اور اس سے شادی کرنے سے منع نہیں کریں گی۔“

”اعزاز۔“

”یہ مرد ذات اتنی بے وفا کیوں ہوتی ہے مومن۔“

”صرف مرد کی ذات۔ نہیں لالہ بے وفا کسی ایک صنف سے تو مخصوص نہیں ہے۔ کہیں مرد بے

وفا ہوتا ہے اور کہیں عورت۔“

”مریم، تم کچھ بدل نہیں گئی ہو۔“

”کس طرح۔“

”میرا مطلب ہے پہلے کے مقابلے میں کچھ سمجھ دار ہو گئی ہو۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ، کیا ڈاکٹر شہریار

کبھی یاد آتا ہے تمہیں؟“

وہ خاموش ہی رہی۔

”کیا وہ بے وفا تھا؟“

”جہیں۔“

مریم نے نفی میں سر ہلایا۔

”اب اگر تم کبھی کسی مشکل میں گھر جاؤ اور شہریار کو مدد کے لیے پکارو تو کیا وہ آجائے گا؟“

”ہاں۔“ مریم نے پورے یقین سے کہا۔

”مجھے بھی اعزاز پر اتنا ہی یقین تھا مریم مگر اس نے میرا یقین توڑ دیا۔“

”لیکن شہریار۔ شہریار ہرگز ایسا نہیں ہے۔“ اس رات آنکھیں موندے دیر تک وہ شہریار کے متعلق

سوچتی رہی تھی اور شاید اب کبھی وہ دوبارہ شہریار کو نہ دیکھ سکے لیکن کیا وہ اسے بھول سکے گی۔

کیا کوئی اور اس کی جگہ لے سکے گا۔

نہیں شاید کبھی نہیں۔

وہ مسز ارباب کے بوتیک میں جانے لگی تھی۔ ہولے ہولے وہ اس سے ہم آہنگ ہو گئی تھی حالانکہ

شروع شروع میں اسے بہت مشکل پیش آئی تھی۔ سارا دن کھڑے ہو کر کسٹرز کو اینڈ کرنا لیکن اب وہ عادی

ہو گئی تھی اور اسے یہ کام مشکل نہیں لگتا تھا۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے تقریباً دو ماہ ہو گئے تھے اور ابھی تک اپنی اہلیت کے مطابق کوئی جاب اسے نہیں ملی تھی۔ حالانکہ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی درخواست کسی نہ کسی ادارے میں دیا کرتی تھی کیونکہ لالہ کو اس کا یہاں کام کرنا پسند نہیں تھا۔ خود اسے کبھی مسز ارباب انتہائی پراسرار لگتی تھیں اور ان کی باتیں انتہائی ریش اور لغو۔ خاص طور پر جس طرح انہوں نے اس کا تعارف اپنے بھائی سے کروایا اور جس طرح ان کے بھائی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا وہ اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ خود اسے بھی مسز ارباب سے خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ اس خوف کی وجہ نہ جان سکی تھی حالانکہ بظاہر مسز ارباب کا رویہ سب کارکنوں کے ساتھ بہت نرم ہوتا تھا۔

اس روز آپریٹر لڑکی چھٹی پر تھی اور مسز ارباب نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اس کی جگہ ڈیوٹی دے اور خود لالہ کے ساتھ وہ کہیں چلی گئی تھیں۔ ہر ہفتے وہ کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ کپڑا وغیرہ خریدنے اور دوسرا سامان لینے جاتی تھیں۔

وہ دوسری سیز گرل کو بتا کر فون والے کیمین میں آ گئی۔ اسے یہاں آپریٹر لڑکی کی موجودگی کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر لالہ نے ایک دن اسے بتایا تھا کہ لوگوں کی سہولت کے لیے مسز ارباب نے یہ فون بیٹ یہاں رکھے ہیں۔ اس نے اکثر لڑکیوں کو یہاں آکر فون کرتے دیکھا تھا مگر جب اس کی ڈیوٹی لگی تو اسے پتا چلا کہ یہاں آنے والی زیادہ لڑکیاں اپنے بونے فرینڈز کو فون کرنے آتی تھیں۔ قریب ہی گرلز کاغ تھا اور آنے والی لڑکیوں میں زیادہ کاغ لڑکیاں تھیں۔ جب پہلی لڑکی نے کال کرنے کے بعد اس کے سامنے پچاس روپے رکھے تو وہ حیران رہ گئی۔

”ایک کال کے۔“

”جی۔“

لڑکی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”آپ شاید نئی ہیں۔“

وہ مسکرا کر چلی گئی تو وہ کتنی ہی دیر تک حیران بیٹھی رہی پھر بعد میں آنے والی لڑکیوں نے بھی پچاس روپے کی کال دیے۔

کچھ لڑکیاں تو کال کے بعد وہاں ہی موجود رہیں اور کچھ دیر بعد وہیں سے آکر کسی نے پک کر لیا۔

وہ حیران ہی یہ سب دیکھتی رہی۔

”تو بونیک کو اس مقصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔“

اگلے لالہ سے بات کی تو لالہ نے اسے سمجھایا۔

”مریم، تم اپنے کام سے کام رکھو۔ یوں سمجھو، تمہیں کچھ نہیں معلوم۔“

”کیا خبر لالہ وہ لڑکی خود ہی بیٹے لیتی ہو اور مسز ارباب کو کچھ علم نہ ہو۔“

”مسز ارباب کو سب پتا ہے، پلیز تم ان سے کچھ مت کہنا۔ بے خبری اچھی ہے۔ اگر تم باخبر ہو گئی
تو.....“

لالہ نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا اور کل..... کل جیسے سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ ایک خاتون نے اپنے بچے کے لیے جینز خریدی تھی اس کا سائز کچھ صحیح نہیں تھا۔ مریم کی ساتھی سیلز گرل نے کہا کہ وہ کچھ دیر بیٹھیں تو ابھی سائز صحیح کر دیا جاتا ہے۔ وہ جینز لے کر درزی خانے کی طرف جانے لگی تو کچھ اور خواتین آ گئیں۔ تو اس نے مریم سے کہا کہ وہ اسے ٹھیک کروا کے لے آئے۔ بوتیک کی بیک پر درزی خانہ تھا۔ جہاں مسز ارباب کے بوتیک کے لیے ڈریس تیار ہوتے تھے اور اگر کسی خاتون کی فٹنگ صحیح کرنی ہوتی تو فوری طور پر صحیح کر دی جاتی تھی۔ تقریباً سترہ اٹھارہ درزی وہاں پر کام کرتے رہتے تھے۔ مریم صرف ایک باری لالہ کے ساتھ درزی خانے میں آئی تھی اس لیے جب وہ بوتیک کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی تو الجھی گئی۔ اس کے سامنے دو دروازے تھے اور پتا نہیں درزی خانے کا دروازہ کون سا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اور پھر بالکل سامنے والے دروازے میں داخل ہو گئی لیکن اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

یہ درزی خانہ تو نہیں تھا۔

وہاں تو ایک بڑے ہال میں درزی بیٹھے کام کر رہے تھے جبکہ یہاں ہال نما کمرے میں صوفے پڑے تھے۔ قیمتی قالین تھا اور دونوں طرف دو کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ شاید وہ غلط جگہ آ گئی ہے۔ اسے ساتھ والے گیٹ میں داخل ہونا چاہیے تھا۔ یہ سوچ کر وہ واپس مڑی ہی تھی کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک لڑکی اور لڑکا باہر نکلے۔

وہ چونک پڑی۔

یہ تو وہی لڑکی تھی جس نے دو تین دن پہلے فون کال کے پچاس روپے دیے تھے اور شاید کسی کو آج کی تاریخ ہی بتا رہی تھی ملنے کے لیے۔

ابھی وہ حیران ہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے مسز ارباب کی آواز سنائی دی۔

”ارے مریم! تم یہاں کیسے!“

”وہ..... میں.....“

وہ گھبرا گئی۔

”یہ جینز ٹھیک کروانے آئی تھی۔“

”اچھا! اچھا وہ ساتھ والا گیٹ ہے۔“

”وہ دراصل ایک باری آئی تھی نا اس لیے۔“

اس نے پیشانی سے پینا صاف کیا اور جانے کے لیے پلٹی تو مسز ارباب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”سنو تمہیں بھی اگر ڈیٹ ویٹ مارنی ہو تو یہاں آ سکتی ہو۔ میں اپنی کارکن لڑکیوں سے کچھ چارج نہیں کرتی۔“ وہ زور سے نہیں۔

”بے چاری لڑکیاں پریشان رہتی تھیں کہ اپنے فرینڈز سے کہاں ملیں اور خوفزدہ کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ سو میں نے ان کے لیے یہ اربنچ کر دیا۔ نہ کسی کے دیکھ لینے کا ڈر نہ خوف۔ وہ کچھ پیسے خرچ کرتی ہیں اور میں انہیں یہ سہولت مہیا کرتی ہوں۔“

انہوں نے پھر قہقہہ لگایا تھا اور مریم کو یوں لگا تھا جیسے وہ کوئی بلا ہوں۔ خوف ناک۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھی اور پھر درزی خانے میں جانے کے بجائے واپس بوتیک میں آ گئی تھی۔

”یہ..... تم ہی لے جاؤ شانزہ۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سر چکر رہا ہے۔“

اور شانزہ حیرت سے اسے دیکھتی ہوئی جینز اس کے ہاتھ سے لے کر چلی گئی تھی۔

اور سارا ناٹم ہی وہ ڈسٹرب رہی تھی اور چھٹی سے کچھ دیر پہلے مسز ارباب نے اسے اپنے دفتر میں بلایا تھا۔ وہ بے حد عجیبہ لگ رہی تھیں۔

”مریم!“ ان کا لہجہ پتھر یا تھا۔

”میں اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتی کہ یہاں کی کوئی بات باہر نکلے۔“

”جی.....!“

”تم سمجھ رہی ہونا؟“

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اگر..... تو.....“ ان کے نامکمل فقرے میں جودھمکی تھی۔ اس نے مریم کو لڑا دیا۔

”اوکے اب جاؤ۔“

اور باٹل واپس آتے ہی وہ بیڈ پر گر گئی تھی اور چہرہ چادر میں چھپائے بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

لالہ مسز ارباب کے ساتھ واپس نہیں آئی تھی۔

”اگر مجھے دیر ہو جائے تو تم چلی جانا۔“

جاتے جاتے اس نے مریم سے کہا تھا۔ سو وہ اکیلے ہی گھر آئی تھی۔

اور اس کے آنے پر وہ سوتی بن گئی۔ لالہ سے بات کرنے سے پہلے وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی لیکن

ساری رات جاگنے کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ کتنی مشکل سے یہ جاب ملی تھی مگر یہ جاب کرنا

ناممکن تھا۔

اور مسز ارباب۔

اس نے جھرجھری سی لی۔

کس قدر پراسرار اور خوف ناک خاتون ہیں اور نہ جانے ان کی زندگی کے اور کتنے پہلو ہیں جو ابھی تک اس سے پوشیدہ ہیں۔

”نہیں وہ مسز ارباب کے بوتیک پر جاب نہیں کرے گی۔“

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور اٹھ بیٹھی۔ سر بے حد بوجھل ہو رہا تھا اور رونے سے آنکھیں سرخ اور بھاری ہو رہی تھیں۔

”یہ دودھ۔“

ماسی نے جو سب لڑکیوں کا کھانا بناتی تھی دروازے سے جھانک کر اسے دیکھا۔

”یہاں رکھ دو۔“

اس نے نیپل کی طرف اشارہ کیا۔

”لالہ بی بی نے بتایا تھا کہ آپ کو بخار ہے۔“

”ہاں معمولی سا۔“

اس نے مختصر ا کہا اور داش روم کی طرف بڑھ گئی۔



پانچ بج رہے تھے اور بس تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مریم نے بے چینی سے کلائی الٹ کر ناظم دیکھا۔

”اگر کچھ دیر تک مزید بس نہ آئی تو کوئی ٹیکسی یا رکشا کر لوں گی۔“

اس نے اپنے آس پاس کھڑی خواتین کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

شکر ہے کہ اسٹاپ پر کوئی بے ہودہ قسم کے لوگ نہیں تھے۔ ورنہ تو مشکل ہو جاتی۔ یہ اسٹاپ اس کے ہاسٹل کے قریب ہی تھا اور عموماً چار بجے وہ ہاسٹل سے نکلتی تو دس پندرہ منٹ بعد بس آ جاتی تھی مگر آج تو اسے کھڑے ہوئے ایک گھنٹا ہونے والا تھا۔ ہاسٹل سے نکلنے میں اسے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ لالہ کی طبیعت خراب تھی اور اس نے چھٹی کر رکھی تھی۔ سو اس کے لیے سوپ تیار کرنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اگرچہ اسے چند منٹ کی ہی دیر ہوئی تھی لیکن پہلے بس نکل گئی تھی اور دوسری ابھی تک نہیں آئی تھی۔

پتا نہیں اس روٹ پر دوسری بس آتی ہے یا نہیں۔ نئی نئی جاب تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ لوگ اس

کے متعلق کوئی غلط تاثر لیں۔ حالانکہ لالہ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب تھی کہ اس کا جانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا مگر لالہ نے بھی کہا تھا کہ ابھی تو اسے ادھر جاتے صرف پندرہ دن ہوئے ہیں لہذا اسے چھٹی نہیں کرنی چاہیے۔ یوں بھی پانچ بجے تک سین وغیرہ بھی آ جاتی ہیں۔ وہ دیکھ لیں گی۔

سو وہ چلی آئی تھی اور بس تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے مسز ارباب کی جاب چھوڑ دی تھی لالہ پریشان ہو گئی تھی۔

”کیوں مومنو یہ جاب چھوڑنے کا فیصلہ اچانک کیوں؟“

تب اس نے لالہ کو بتا دیا۔ لالہ خاموش سنتی رہی۔

”چلو اچھا ہوا کہ تم پر بہت جلد مسز ارباب کا ایک پہلو ظاہر ہو گیا۔ عام طور پر تین ماہ تک وہ کسی پر اپنی شخصیت کے دوسرے پہلو ظاہر نہیں کرتیں۔ مجھے بھی تین ماہ بعد پتا چلا تھا اس لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ تم وہاں جاب کرو۔“

”پھر پھر تم یہ جاب چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔“

”اگر تم بھی تین ماہ مکمل کر لیتیں تو شاید تم بھی یہ جاب چھوڑ نہ سکتیں۔ اگرچہ اب بھی مسز ارباب شور کریں گی لیکن میں سنبھال لوں گی۔ تم سے اگر براہ راست بات کریں تو کہہ دینا کہ تمہاری ماما نے تمہیں باہر بلوایا ہے۔“

”مگر لالہ۔“

”پلیز، تم نے مسز ارباب کی زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اس کے علاوہ بھی ان کے بہت سے روپ ہیں۔ تم اگر براہ راست ان سے بات نہ کرتیں تو میں کبھی بھی تمہیں مسز ارباب کے پاس جاب نہ کرنے دیتی لیکن تم نے خود ہی..... خیر۔“

اس نے کندھے جھٹکے۔

”لالہ تم آنٹی کے پاس چلی جاؤ۔ وہاں اعزاز.....“

”نہیں بھئی۔ مجھے کہیں نہیں جانا ہاں تم چلی جاؤ واپس ماما کے پاس یا پھر اپنے ڈیڑی کو تلاش کرو۔ ایک بار پھر می کو فون تو کرو۔“

اور لالہ کے کہنے پر اس نے ایک بار پھر میڈم نرس کو فون کیا تھا کہ ماما کا فون نمبر لے کر وہاں خود فون کر لے لیکن میڈم نرس چیک اپ کے لیے امریکا گئی ہوئی تھیں۔

تب لالہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ شہر یار سے رابطہ کرے۔

”مومنو زندگی سے میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ تم نے نہیں سیکھا۔ میں چاہتی ہوں کہ جو غلطیاں میں نے کی ہیں وہ تم نہ کرو۔ اچھے لوگ زندگی میں کبھی کبھی ملتے ہیں انہیں کھونا نہیں چاہیے۔ میں نے اعزاز کو

خط بھیجنے کے بعد کتنے دن تک اس نے بے چینی سے شہر یار کے خط کا انتظار کیا تھا لیکن شہر یار نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔

وہ جو اس کے لیے جان سے گزر جانے کی باتیں کرتا تھا، اس نے ایک حرف تلی تک نہیں لکھا تھا۔
 ”کیا ساری محبتیں ایسی ہی ہوتی ہیں بے وفا؟“ از حد مایوس ہو کر اس نے لالہ سے پوچھا۔
 ”شاید لیکن ہمتیں کیوں مجھے یقین تھا کہ شہر یار ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ..... اے دیکھ کر تو یہی احساس ہوتا تھا کہ اگر اس نے کسی سے محبت کی تو وہ جان تک سے گزر جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔“
 ”اور اعزاز.....“

مریم نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”اعزاز نے بھی تو تمہارے خطوط کا جواب نہیں دیا تھا اور نہ ہی تمہاری فون کالز کے بعد تم سے رابطہ کیا تھا۔“
 ”ہاں، جبکہ اعزاز بھی ایسا نہیں تھا۔“
 لالہ نے تبصرہ کیا۔

”لیکن شاید سب ایسے ہی ہوتے ہیں مگر شاید شہر یار کو تمہارا خط نہ ملا ہو۔ تم ایک اور خط لکھ کر دیکھو۔“
 لیکن وہ لالہ کے کہنے کے باوجود خود کو دوسرا خط لکھنے کے لیے تیار نہ کر سکی۔
 شاید محبت اس دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ ساری محبتیں دھوکا ہوتی ہیں۔ صرف فریب.....!
 اگر ماں کی محبت میں کھوٹ ہو سکتی ہے تو پھر کسی دوسرے کی محبت کیسے قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔
 وہ بے حد دل گرفتہ تھی۔

”محبتوں کا پھڑ جانا اتنا عذاب نہیں ہوتا۔ جتنا ان کا بے وفا ہونا عذاب ہوتا ہے۔“ ایک بار عاشری نے کہا تھا۔

اس کرب سے وہ پہلی بار گزر رہی تھی۔ یہ اذیت ناقابل برداشت تھی اور اس پر یہ احساس کہ وہ لالہ کے لیے بوجھ ہے حالانکہ لالہ نے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کی تھی بلکہ اب تو لالہ سے اس کی بات بہت کم دیتی تھی۔ وہ اکثر دیر سے آنے لگی تھی اور اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ آتے ہی بستر پر گر جاتی تھی۔
 ”لالہ! ہر روز تم دیر سے کیوں آتی ہو؟“

”مجبوری ہے یا ران دنوں کام زیادہ ہے۔ مسز ارباب اپنا مال باہر بھجوانے لگی ہیں۔“
 ”مگر میری جاب لالہ! تم کوئی کوشش کرو نا۔“
 ”میں ضرور کوشش کروں گی۔“

وہ کوئی بھی تسلی بخش جواب دیے بغیر اسے ٹال دیتی۔ تب اس نے آغوش سے بھی کہا اور ہاسٹل کی

کھو دیا۔ حالانکہ اعزاز نے مجھے کہا تھا کہ اپنی تعلیم مکمل کر لوں تو می کی مرضی نہ بھی ہوئی تو وہ مجھ سے شادی کر لے گا اور مجھے اس پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ جبکہ اس کے خیال میں می کو منانے کے لیے اس کے بھائی کا مہر ہمارے پاس تھا۔ تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔ می اس کے بھائی سے عشق کرتی ہیں۔ ایک بار مجھے اعزاز نے بتایا تھا کہ اس کے بھائی نے می سے شادی نہیں کی بلکہ می نے اس کے بھائی سے شادی کی ہے۔ میرے ڈیڈی سے طلاق لینے کے بعد کئی سال تک می اس کی محبت میں جتلا رہی تھیں۔ ان سے ملنے گاؤں چلی جاتی تھیں اور ان دنوں.....“
 وہ ہنسی۔

”می باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگی تھیں۔ صبح شام داتا دربار پر حاضری دیتیں۔ بڑا سادہ بٹا اوڑھے شلووار قمیض پہنے پوری گھریلو عورت بننے کی کوشش کرتی تھیں اور اعزاز کے ماں باپ سے ملنے گاؤں جاتیں۔ تو ان کے پاس زمین پر بیٹھ کر تنور کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھاتیں اور اعزاز کی ماں کو خوش کرنے کے لیے اس کا کام کرتیں۔ ایک مرتبہ اعزاز نے انہیں برتن دھوتے بھی دیکھا تھا۔“
 وہ زور سے ہنسی۔

”یہ محبت بھی کیا شے ہوتی ہے مومن میں آج تک نہیں جان سکی۔ کیسے آدمی کو دیوانہ کر دیتی ہے۔ میں بھی تو می کی ہی بیٹی تھی نا۔ ان ہی کی طرح محبت میں پاگل ہو گئی تھی۔ حالانکہ می نے کہا تھا کہ میں ابھی بہت چھوٹی ہوں اور..... خیر۔“

اس نے بات نامکمل چھوڑ کر مریم کی طرف دیکھا۔
 ”میں شہر یار کی بات کر رہی تھی اور بات کہاں جانگلی۔ مومنڈا اکثر شہر یار ایک بہت مخلص سادا اور محبت کرنے والا آدمی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ تم سے از حد محبت کرتا ہے۔ تم اسے خط لکھو اور اس سے شادی کر کے زندگی سکھ اور سکون سے گزاریو۔“

وہ بہت دیر تک اسے سمجھاتی رہی تھی اور تب اس نے شہر یار کا خط نکال کر پڑھا۔ کئی بار اس نے لکھا تھا مریم ایک بار تم آواز دو گی مجھے تو میں اڑتا ہوا تم تک آچہنچوں گا۔ تم کیوں پریشان رہتی ہو۔ مجھے خط لکھو۔ اپنے مسائل میرے ساتھ SHARE کرو۔ میں تم سے دور نہیں ہوں۔ تمہارے ان دیکھے آنسو میرے دل پر گرتے ہیں اور تصویر ہی تصویر میں اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان آنسوؤں کو پونچھتا ہوں۔ میرا اعتبار کرو مریم! میں ہر لمحے تمہارے ساتھ ہوں۔

اور تب اس نے شہر یار کے خط کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اب اس رات لالہ کے کہنے پر اس نے شہر یار کو خط لکھا۔ ایک ایک بات لکھ دی اس نے۔
 ”میں بہت اکیلی ہوں بہت تنہا ہوں اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

لڑکیوں کو تو پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ ایک روز سین نے اپنے ساتھ فیکٹری چلنے کو کہا تا کہ وہ خود اس کے پاس سے مل لے لیکن لالہ نے منع کر دیا۔

”تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہے مومو؟“

”ایسا کب تک چلے گا لالہ۔ میں کب تک تم پر بوجھ بنی رہوں گی۔“

وہ جلد از جلد کوئی کام کرنا چاہتی تھی۔

یوں بھی کبھی کبھی لالہ کے متعلق وہ بدگمان ہو جاتی۔

سین نے ایک دو بار دبے لفظوں کہا تھا کہ لالہ غلط راستوں پر چل رہی ہے اور اگر ان کی لینڈ لیڈی کو پتا چل گیا تو وہ اسے ہاسٹل میں نہیں رہنے دیں گی۔

”نہیں لالہ ایسی نہیں ہے۔“

اس نے سین کی سختی سے تردید کی تھی لیکن اندر ہی اندر وہ پریشان تھی۔ وہ لالہ سے بدگمان ہونا بھی چاہتی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ لالہ اس کے ساتھ بے حد مخلص تھی۔ اس نے اسے مزار باب سے بچانے کی کتنی کوشش کی تھی حالانکہ وہ خود ان کے پاس جا ب کرتی تھی اور اب کتنے دنوں سے وہ اس کا خرچ برداشت کر رہی تھی۔ مزار باب کو خدا جانے کیسے اس نے ہینڈل کیا تھا ورنہ۔

”اف۔“

اس نے خوف سے جھر جھری سی لی۔

کس قدر دہشت ناک آواز تھی ان کی جیسے کوئی سانپ پھنکار رہا ہو۔ جب لالہ نے انہیں بتایا کہ اب مریم کام پر نہیں آئے گی تو اسی رات انہوں نے فون کیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم اپنی والدہ کے پاس جا رہی ہو۔ جاؤ لیکن یاد رکھنا ہمارے بویٹک کے متعلق کہیں کوئی ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نکلا تو.....“

ان کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی لیکن اس کا پورا وجود لرز کر رہ گیا۔

ذرا سا ٹھہر کر انہوں نے سر دلچے میں جملہ مکمل کیا تھا۔

”زندگی تمہارے لیے ایک ایسی سزا بنا دی جائے گی کہ مرنا چاہوں گی تو مر نہ سکو گی۔“

اس کی زرد ہوئی رنگت کو دیکھ کر آنٹی نے جو پاس کھڑی تھیں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بیٹا تم ٹھیک تو ہونا۔ سب خیریت ہے نا؟“

”جی۔“

اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے ریسور کی طرف دیکھا۔

لائن بے جان ہو چکی تھی۔

”یونہی ذرا چکر اٹھ گیا تھا۔“

اس نے ریسور کو ریڈل پر ڈال دیا اور آنٹی کو خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ (ہاسٹل کی سب لڑکیاں ہی انہیں آنٹی کہتی تھیں) پھر کتنے ہی دن تک اس پر خوف سا طاری رہا۔

”اکیلے اور تنہا لڑکی جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو قدم قدم پر اسے بھیڑیے ملتے ہیں۔“ ایک بار اس نے کہیں پڑھا تھا۔

اور کتنا صحیح لکھا تھا لکھنے والے نے۔ اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔

سین اور دوسری لڑکیاں جو باتیں کرتی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ زندگی ان کے لیے کوئی اتنی زیادہ آسان نہیں ہے۔

”میرا پاس۔“

ایک بار سین نے ہنستے ہوئے اس کے متعلق بتایا تھا۔

”یوں دیکھتا ہے جیسے کچا کھا جائے گا۔ اگر میں ذرا سی بھی کمزور پڑوں تا تو بغیر چبائے نگل جائے۔“

”ہمارے دور کی عورت بہت بد قسمت ہے۔“

یہ مسز ساجدہ کی رائے تھی۔

”بہت کچھ پانے کی خواہش میں تھوڑے سے بھی محروم ہو گئی ہے اور ہم عورتیں جو مرد کا ہاتھ بٹانے کے لیے ان کے معاشی مسائل share کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکلی ہیں۔ اس کے تحفظ سے بھی محروم ہو گئی ہیں۔“

وہ سب جب کھانے کی میز پر اکٹھی ہوتیں تو وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی اور گھٹنوں تجزیہ کرتی رہتی کہ اس نے اس طرح آکر شاید غلط کیا ہے۔

• ماں جی اور عادل بھائی اور بی آپا وہ سب کتنے اچھے تھے۔

کبھی کبھی لالہ بھی اسے اسکاٹی کہہ چلی جائے واپس حویلی لیکن اب تیرکان سے نکل چکا تھا۔

مسز ساجدہ کا خیال تھا۔

”ایک بار جو گھر سے نکل آئے وہ کسی نیک مقصد کے لیے ہی کیوں نہ نکلے واپسی کی راہیں اس کے لیے مسدود ہو جاتی ہیں۔“

اور اس کا تو اپنا کوئی گھر تھا ہی نہیں اسے کہاں جانا تھا۔ کئی دفعہ اس نے سوچا تھا کہ وہ باہر نکلے اور خود کہیں نوکری تلاش کرے۔

کسی پرائیویٹ اسکول میں ہی جا کر پتا کرے لیکن مزار باب کے خوف سے اکیلے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

لیکن جب ہو لے ہو لے وہ مزار باب کے خوف سے آزاد ہو گئی تو پھر جاب تلاش کرنے لگی تھی۔
ایسے میں پندرہ دن پہلے آئی نے اسے بلایا تھا۔

”سنو مریم تم ٹیوشن کر لو گی؟“

”جی۔“

”میری جاننے والی ہیں بہت اچھی اور ٹائرس خاتون ہیں ان کے بچوں کو پڑھانا ہے۔ دو بیٹیاں ہیں بڑی میٹرک میں پڑھتی ہے اور دو بیٹے ہیں چھوٹے۔ ایک فقہ میں ہے اور ایک فورٹھ میں۔ تین ہزار ٹیوشن ملے گی پڑھا لو گی نا؟“

”جی کیوں نہیں۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔

فی الحال یہی غنیمت تھا۔ پھر لالہ کو بتا کر وہ آئی کے ساتھ مسز علی سے ملی تو وہ اچھی لگیں۔ بچے بھی بہت سلجھے ہوئے تھے۔ خاص کر رومی کو دیکھ کر اسے تیور بہت یاد آتا تھا۔

رومی اسے بالکل تیور کی طرح ہی لگا تھا۔

اس کی طرح ذہین۔

اور اس کی طرح چھوٹے چھوٹے سوال کرتا۔

ان پندرہ دنوں میں وہ ان سے خاصی مانوس ہو گئی تھی اور اب کبھی کبھار پڑھانے کے بعد مسز علی سے کپ شپ لگالیتی تھی۔ وہ واقعی بہت نرم مزاج کی نفسی خاتون تھیں اور ان کے شوہر کو آج تک اس نے دیکھا نہیں تھا۔ عموماً جب وہ پڑھا کر واپس آ رہی ہوتی تو ان کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوتی تھی۔

بچے اور مسز علی بھی اس کی پڑھائی سے مطمئن تھے اور آج دیر ہو گئی تھی ”کیلو چیس گی مسز علی۔“

مضطرب ہو کر اس نے پھر وقت دیکھا۔ تب ہی سفید کرولا قریب سے گزری تو اس میں سے جھانکتے ہوئے بچے پر اس کی نظر پڑی۔ وہ چونگی۔

گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

”یہ..... یہ مور تھا..... مور ہی تھا نا۔“ وہ بڑبڑائی۔

پلک جھپکتے میں اس نے دیکھا تھا۔ اس کی نظر اس سے ملی تھی۔ چہرے پر پہلے حیرت اور پھر خوشی کے رنگ پھیلنے اس نے دیکھے تھے۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا تھا اور کرولا آگے بڑھ گئی تھی بلاشبہ وہ مور تھا۔

”لیکن مور یہاں..... کون تھا اس کے ساتھ۔“ اس نے سوچا۔ تبھی پیچھے سے بس آگئی اور وہ تیزی سے بس کی طرف بڑھ گئی اور سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے دیکھا سفید کرولا ٹریک لے کر واپس

مڑ رہی تھی۔

”کیا تمہیں یقین ہے تیور وہ مریم ہی تھی؟“ پروفسر عادل نے کوئی گیارہویں بار تیور سے پوچھا۔
”بالکل وہ مومو ہی تھیں۔ کیا میں مومو کو پہچان نہیں سکتا۔“ تیور بہت ایکسائینڈ ہو رہا تھا ”وہ مومو تھیں انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ وہ ابھی مجھے بلائیں گی بھاگ کر ادھر آئیں گی۔ میں نے سوچا مگر وہ تو کہیں بھی نہیں اور بس میں بیٹھ کر چلی گئیں۔“

وہ پورے یقین سے کہہ رہا تھا لیکن پروفسر عادل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”وہ بھلا یہاں کیسے۔ کراچی میں کون ہے اس کا۔“ جب تک وہ تیور کی بات پر دھیان دیتے اسٹاپ پر موجود لوگ بس میں بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے یقین دے بیٹھنے کے درمیان گاڑی کو ٹرن دیا تھا اس لیے وہ بس کے پیچھے بھی نہ جا سکے تھے۔ اور جب انہیں تیور کی بات پر کچھ کچھ یقین آنے لگا تھا تب شام پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک انہوں نے اس اسٹاپ کے کتنے ہی چکر لگائے تھے لیکن وہ انہیں کہیں دکھائی نہ دی تھی۔

جب تیور نے انہیں بتایا تھا کہ وہاں اسٹاپ پر مومو کھڑی تھیں تو تھوڑی دیر کو تو انہیں اپنی ساعت پر اعتبار ہی نہیں آیا تھا۔

”وہاں۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے تیور کو دیکھا۔

”وہ..... وہ مومو تھیں، بلوی عادل بھائی۔ میں نے انہیں دیکھا ہے وہاں اسٹاپ پر اس کا چہرہ متیار ہا تھا اور انکھیں چمک رہی تھیں۔“

ایک لمحے کو انہیں یوں لگا تھا جیسے خدا کا چمک ہی ان پر مہربان ہو گیا ہو۔

وہ دو دن قبل کراچی آئے تھے۔ سرور کی ایگزیشن کے سلسلے میں آخری انتظامات دیکھنے آئے تھے۔ سرور کا کام مکمل تھا اور انتہائی چونکا دینے والا..... انہیں یقین تھا کہ وہ بہت جلد اپنا ایک نام اور مقام بنالے گا۔ اگرچہ وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھے لیکن وہ ایگزیشن میں تاخیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ویک اینڈ پر وہ عاشی کو لے کر حویلی گئے تو ماں جی اور بی آپا نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔

”اب تم نے کیا سوچا ہے عادل؟“ ماں جی نے پوچھا تو انہوں نے حیرانی سے ماں جی کی طرف دیکھا۔
”کس سلسلے میں؟“

”شادی کے متعلق۔“

”آپ جانتی ہیں ماں جی۔“

”لیکن اب جبکہ مریم کا کچھ اتنا پتا نہیں تو۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے۔ عادل زندگی کا کیا بھروسہ؟“
کب تک انتظار کروں گی۔ میں کہیں تمہاری خوشی دیکھنے کی حسرت لیے ہی نہ چلی جاؤں۔“
”ماں جی پلیر، ایسی باتیں مت کریں۔“ انہوں نے تڑپ کر ماں جی کی طرف دیکھا۔



اور وہ دل ہی دل میں بی آپا سے خفا ہو کر اپنے کمرے میں آگئے تھے۔
 ”مگر بی آپا کا بھی بھلا کیا قصور اپنے دل کی کیفیات سے وہ خود ہی باخبر تھے اور وہ خدا جانے کہاں
 چھپ کر بیٹھ گئی تھی اور کیا وہ اس لیے ٹلی تھی کہ اسے چھڑ جانا تھا اگر وہ نہ ملتی تو شاید ماں جی کی بات ماننا ان
 کے لیے اتنا مشکل نہ ہوتا..... مگر اب جبکہ وہ موجود تھی، یہیں کہیں اسی دنیا میں تو کسی اور کے سنگ زندگی بتانا
 کس قدر مشکل تھا۔

وہ اسے کہاں تلاش کریں.....

انہیں کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ پھر بھی ایک بار دوبارہ انہوں نے اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہ زینب
 ولا بھی گئے لیکن شریف اور صفو بھی اس کے کسی عزیز کا پتا نہ بتا سکے۔
 نہ ہی زینب واپس آئی تھیں۔

اور نہ ہی میڈم نرگس سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے چیک اپ کے لیے ملک سے باہر گئی ہوئی
 تھیں۔ ان کی گاڑی ایک بار پھر بے مقصد لاہور کی سڑکوں پر چکر لگانے لگی تھی۔ کالج سے آتے ہی وہ
 گاڑی لے کر نکل جاتے تھے لیکن مریم کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایسے میں سرور کی تصویروں کی ایگزیشن
 کا کام بھی مکمل ہو گیا تھا۔ مدنی صاحب کے کہنے پر ضرار صاحب نے انہیں فون کیا تو وہ خود کراچی جانے
 کے لیے تیار ہو گئے۔ کراچی کا پروگرام بنا کر حویلی آگئے تو تیور بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔
 ”عادل بھائی میں نے کبھی سمندر نہیں دیکھا۔ آپ مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔“

”مگر بیٹا آپ کی تو چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔“

وہ موسم بہار کی چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔

”نہیں ابھی دو تین دن رہتے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ تیور کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ اسے کوئی کمی محسوس نہ ہو۔
 اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ وہ مریم کو بہت پیارا تھا۔ سوانہیں بھی بہت پیارا تھا اس سے۔ وہ ان سے
 مریم کی باتیں کرتا تھا تو ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کی باتیں سننے رہیں۔

”مومو میری دوست ہے۔“ وہ انہیں بتاتا۔

اور انہیں اس کے پاس سے مریم کی خوشبو آتی ہے۔

پھر ماں جی نے اس کی سفارش کی تھی۔

وہ ماں جی کو بہت پیارا ہو گیا تھا۔ ویک اینڈ پر آتا تو ان ہی کے کمرے میں سوتا۔ ان سے کہانیاں سنتا
 کافی سے بھی اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ سو وہ تیور کو ساتھ ہی لے کر کراچی آگئے تھے۔
 ”وہ مومو ہی تھیں ناعادل بھائی۔“ تیور نے ان کا بازو پکڑ کر ہلایا تو وہ چوٹے۔

”عادل“ میں نے کبھی تمہاری کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ میری خواہش تھی کہ مریم تمہاری دلہن بن
 کر اس حویلی میں آئے۔ تمہارے دادا کی بھی یہی خواہش تھی لیکن تمہاری مرضی نہیں تھی تو میں نے کبھی
 تمہیں مجبور نہیں کیا، مریم اچھی بچی تھی۔ میں نے تمہاری خواہش کا احترام کیا لیکن اب وہ جب نہیں ہے۔“
 اور انہیں لگا جیسے کسی نے ان کا دل نوچ کر باہر پھینک دیا ہو۔

”وہ ہے ماں جی۔ ایسا مت کہیں۔ وہ ہے اس دنیا میں ہی ہے لیکن ہماری نظروں سے چھپ گئی ہے۔“
 انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔

”عادل“ تمہارے چاچا چند دن پہلے میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے پہلی بار اپنی زبان سے اس
 خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بھائی عبدالرحمن سے کہا ہے کہ تم سے بات کروں گی۔“
 ”ماں جی پلیز۔“ انہوں نے التجا کی۔

”دیکھو عادل“ اب زیادہ انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مریم کو واپس آنا ہوتا تو اب تک آپچی ہوتی۔ تم نے
 خود بتایا تھا کہ اس نے میڈم نرگس سے رابطہ کیا تھا۔ تم اجازت دو تو میں بھائی عبدالرحمن سے ہاں کر دوں۔“
 ”نہیں ماں جی۔“ وہ تڑپ گئے ”تھوڑا سا وقت دیں ماں جی۔ میں مریم کو تلاش کرنے کی کوشش
 کرتا ہوں ممکن ہے وہ اپنی ماما کے پاس باہر چلی گئی ہو۔ میں واپس لاہور جا کر میڈم سے ان کا ایڈریس
 لیتا ہوں۔“

”نہیں عادل“ پہلے ہی.....

ماں جی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تو بات نامکمل چھوڑ دی۔ اور ذرا دیر بعد پولیس۔

”ٹھیک ہے اگر وہ ماہ تک مریم کا پتا نہ چلا تو میں بھائی عبدالرحمن سے مریم کا رشتہ نامک لوں گی۔“
 اور وہ صرف بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

”بی آپا آپ ہی ماں جی کو سمجھائیں۔ مریم نہیں تو کوئی نہیں۔“ شام میں بی آپا کے پاس جا کر انہوں
 نے التجا کی۔

”عادل“ ماں جی ٹھیک کہتی ہیں۔ تم نے پہلے ہی انہیں بہت انتظار کروایا ہے۔“

”آپ تو سب جانتی ہیں بی آپا۔“ وہ رد ہانے ہو رہے تھے۔

”تم سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو عادل۔“ بی آپا نے انہیں سمجھایا ”ماں جی کی طبیعت نرم گرم رہتی
 ہے اور مراد بھائی جب بھی فون کرتے ہیں مجبور کرتے ہیں کہ ان کے پاس جا کر رہوں لیکن ماں جی کو اکیلا
 نہیں چھوڑ سکتی۔ تم شادی کر لو تو مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔“

”تو میں ماں جی کو ساتھ لاہور لے جاؤں گا۔ آپ مراد بھائی کے پاس چلی جائیں۔“

”یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے عادل۔“

”شاید“ انہوں نے اسے دیکھا ہی کب تھا کہ وہ اس کی تصدیق کرتے۔

”اب آپ ادھر ہی رہ کر انہیں ڈھونڈیں گے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”اس اتنے بڑے شہر کراچی میں وہ کہاں اسے ڈھونڈیں گے۔“ لیکن پھر بھی اس کا دیا جل اٹھا تھا۔

”کیا وہ مل جائیں گی؟“ تیمور اس بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”تم دعا کرنا سو رہے ہو۔“ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے ”خدا بچوں کی دعا سنتا ہے۔“

”میں دعا کروں گا لیکن میں ان سے بولوں گا نہیں۔ ناراض ہو جاؤں گا ان سے۔“

وہ مسکرا دیے ”وہ ملے تو۔“ انہوں نے سوچا۔

صبح انہوں نے واپس جانا تھا لیکن ایک ہفتے کے بعد پھر انہیں نمائش کے سلسلے میں آنا تھا۔

”صبح نہیں جائیں گے نا؟“ تیمور نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

”نہیں صبح تو واپسی ہے۔ آپ کو پتا ہے نا کہ آپ کی چھٹیاں آج ختم ہو گئی ہیں۔“

”جی۔“ تیمور اداس ہو گیا۔

آج تو وہ کسی صورت نہیں رک سکتے تھے لیکن انہیں آنا تھا یہاں..... اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ

کالج کے لیے چھٹی لیں گے اور یہاں کراچی میں رہ کر وہ اسے تلاش کریں گے۔

”میں آپ کو چھوڑ کر پھر آؤں گا نا۔“

”اور مومو مل جائیں گی آپ کو۔“

”بس آپ دعا کرنا۔“

”اور مومو کبھی تمہیں کہ میں ان کا دوست ہوں اور میرے ہوتے ہوئے انہیں کسی کا خوف نہیں ہے پھر

بھی وہ چلی گئیں۔“ تیمور بولتا رہا۔ وہ خاموش خالی الذہن سے بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے۔ ہمیشہ کی

طرح تیمور مومو اور پاپا کی باتیں کرتا کرتا سو گیا۔

نوبے ان کی فلائٹ تھی۔

ضرر صاحب نے سویرے ہی گاڑی ہوٹل بھیج دی تھی۔

ایئر پورٹ جانے سے پہلے وہ پھر اسی اسٹاپ پر آئے تھے۔ اسٹاپ تقریباً خالی تھا۔ ایک دو بوڑھے

سے شخص کھڑے تھے۔ بے حد مایوس ہو کر انہوں نے ڈرائیور کو ایئر پورٹ چلنے کا کہا اور سوچا۔

”کیا خبر تیمور کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ ایک جھلک ہی تو دیکھی تھی اس نے۔“

”پھر بھی۔“

انہوں نے سوچا جب وہ کراچی آئیں گی تو اس اسٹاپ کو ضرور چیک کریں گے۔ کیا خبر وہ کہیں آس

پاس ہی رہتی ہو یا جاب کرتی ہو ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے ان کی نظر ایک اسکول پر پڑی اور انہوں

نے سوچا تھا وہ اس اسکول کو ضرور چیک کریں گے۔ ممکن ہے مریم یہاں ہی اسی اسکول میں جاب کرتی ہو اور اسی یقین کے سہارے جب وہ دوبارہ آئے تو سیدھے اسکول پہنچ گئے۔

”سین! یہاں مس مریم ہیں تو پلیز انہیں بلا دیں۔“ انہوں نے چوکیدار سے کہا۔

چوکیدار نے سر سے لے کر پاؤں تک انہیں دیکھا۔

”آپ انتظار کریں۔ ابھی بلاتا ہوں۔“

”تو..... تو مریم یہاں ہی ہے۔“ ان کا دل جسم کے ہر حصے میں دھڑکنے لگا۔ تب ہی چوکیدار نے بتایا۔

”میڈم مریم پھر ملے لے رہی ہیں۔ فارغ ہو کر آتی ہیں آپ انتظار کر لیں۔“

دھک دھک ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔

”مریم آئے گی تو اس سے گلہ کریں گے۔ اس سے پوچھیں گے اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں ان پر

اعتبار نہ کیا..... آج وہ دل کی ہر بات اس سے کہہ دیں گے۔“

”وہ سب جو وہ اس کے متعلق سوچتے تھے۔“

”سارے جذبوں کا اظہار کر دیں گے۔“

”بہت انتظار کیا انہوں نے۔“

ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹپکتے ہوئے وہ سوچتے رہے۔

اور خدا خدا کر کے پھر یلڈم ہونے کی کھٹی بجی اور ان کی نگاہیں دروازے کی سمت لگ گئیں۔ تب ہی

ایک خاتون اندر داخل ہوئیں۔

گہرا سا نولا رنگ اور قدرے بھاری جسم۔

وہ جواہٹ پر ایک دم آگے بڑھے تھے وہیں ٹھک کر رک گئے۔

”آپ۔“ خاتون نے ان کی طرف دیکھا ”آپ پلیز کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے۔ کیا آپ کا کوئی

بچہ یہاں پڑھتا ہے؟“

”وہ تو میں مس مریم سے ملنے آیا تھا۔“

”جی میں مس مریم ہوں۔“

”کیا آپ کے علاوہ کوئی اور مس مریم نہیں ہیں؟“ انہوں نے ذوقی آواز میں پوچھا۔

”نہیں تو۔“

”سوری مجھے غلط فہمی ہوئی۔“

وہ انہیں حیران چھوڑ کر ایک دم باہر نکل گئے۔ نینا اور تیمور کو مریم چھوڑ کر انہوں نے سرور کو لاہور بلایا

تھا۔ ایک دو دن جو انتظامات میں لگے تھے۔ وہ بہ مشکل انہوں نے گزارے تھے۔ کل سرور کی تصاویر کی

نمائش شروع ہو رہی تھی اور کم از کم ایک ہفتہ یہ نمائش جاری رہنا تھی لیکن ان کا پروگرام زیادہ دن تک رہنے کا تھا۔ وہ یہاں رہ کر مریم کو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ ایک ماہ گزر گیا تھا اور ماں جی نے انہیں صرف دو ماہ کا وقت دیا تھا۔ انہیں لگتا تھا جیسے ہرگز رتاد ان کے گرد دائرہ تنگ کرتا جا رہا ہو۔

کبھی انہیں لگتا وہ ناکام و نامراد رہ جائیں گے۔
اور کبھی لگتا جیسے مریم انہیں مل جائے گی۔

اسکول سے باہر نکل کر بہت دیر تک وہ یوں ہی اسٹیزنگ کو تھامے خالی الذہن سے بیٹھے رہے۔ پھر قریب سے ایک گاڑی ہارن بجائی تو انہوں نے چونک کر گاڑی اشارت کر دی۔

ہوٹل میں سرور کے ساتھ شہریار کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔

”آپ شہریار! آپ کب لوٹے وطن؟“

”تقریباً تین ماہ ہو گئے۔“

شہریار انہیں پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور اور سنجیدہ سا لگا۔

”آپ کچھ بیمار رہے ہیں؟“

”ہاں کافی۔“ شہریار کے ہونٹوں پر دم مسمی مسکراہٹ ابھری۔

”اوہ یاد آیا کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ ہو گیا تھا آپ کا۔ سرور نے بتایا تو تھا۔“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے سرور کی طرف دیکھا۔

”ضرر صاحب کا فون وغیرہ تو نہیں آیا تھا؟“

”جی آیا تھا وہ کچھ دیر میں گاڑی بھیج رہے ہیں۔ تصادیر وغیرہ میں نے آپ کے جاتے ہی بھجوا دی تھیں۔

ضرر صاحب نے ہی آپ کو اب بھیجی تھی۔“ سرور نے تفصیل سے بتایا۔

”اور سنائیں ڈاکٹر شہریار۔ کسی رہی آپ کی اسٹڈی؟“ سرور کی بات سن کر وہ شہریار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”بس ہو گئی۔“

”اور آج کل کیا کر رہے ہیں۔“

”جیناح اسپتال میں جاب کر رہا ہوں۔“

”یعنی یہاں کراچی میں!“

”جی۔“

”اور وہ ارسلان اور ارمدغان دونوں کیسے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں؟ عرصہ ہوا وہ لوگ آئے نہیں۔“
”دونوں جاب کر رہے ہیں اور مزے میں ہیں۔ ارسلان تو ان دنوں پشاور میں ہے اور ارمدغان فیصل

آباد ہیں ہے۔“

”اور وہ ان کی سیاست سے دلچسپی اور شاعری کا سلسلہ کیسا چل رہا ہے؟“

سرور کو چائے منگوانے کا کہہ کر وہ شہریار کی طرف متوجہ ہوئے۔

”معلوم نہیں سر۔۔۔۔۔ میرے آنے پر دونوں آئے تھے طے، ایک دن رہ کر چلے گئے۔ زیادہ بات نہیں ہوئی۔ انہوں نے پھر چھٹی لے کر آنے کا کہا تھا لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی مجھے یہاں جاب مل گئی اور میں کراچی آ گیا۔“

”تم واپس رافح اسپتال میں کیوں نہیں گئے۔ وہاں اپنا گھر بھی تھا اور میرے خیال میں ڈاکٹر رافح تمہاری واپسی پر خوشی محسوس کرتے۔ ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی میری ان سے۔ تمہیں یاد کر رہے تھے۔“
”جی سر۔۔۔۔۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا جیسے میں لاہور میں رہ نہیں پاؤں گا۔ دم گھٹتا تھا میرا۔ یہاں میرا ایک کلاس فیلو جاب کر رہا تھا۔ اس سے بات ہوئی تو اس نے بلالیا کہ جگہ ہے آ جاؤ۔“
”لاہور میں دم گھٹتا تھا۔“

پروفیسر عادل نے دل ہی دل میں دہرا کر شہریار کی طرف دیکھا۔ انہیں شہریار بے حد ڈسٹرب اور پریشان لگا تھا۔ وہ اس شہریار سے بالکل مختلف تھا جو پہلے انہوں نے دیکھا تھا۔

”سر، بعض اوقات بڑا عجیب اتفاق ہوتا ہے۔“ انہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر شہریار نے کہا۔

”میں ابھی کل ہی سوچ رہا تھا کہ آپ سے ملوں، آپ کے پاس بیٹھوں اور آپ سے بہت ساری باتیں کروں شاید سکون ملے اور صبح ہی سرور کا فون آ گیا کہ وہ یہاں ہے آپ کے ساتھ۔ آج یوں بھی میری ٹائٹ تھی۔ میں نے سوچا کچھ وقت آپ کے ساتھ گزاروں۔“

”ہاں میں جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر شہریار آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی پریشانی میرے ساتھ شیئر کر سکتے ہیں۔ شاید میں آپ کے کام آ سکوں۔“

”پریشانی۔ کیا وہ اپنی پریشانی کسی کے ساتھ شیئر کر سکتا ہے۔“ شہریار نے سوچا۔

زندگی نے اس کے ساتھ کیسا مذاق کیا تھا۔

وہ ایک لڑکی جو دل کو اچھی لگی تھی۔

جس کے سنگ زندگی گزارنے کا خواب اس نے دیکھا تھا۔ وہ ایک لڑکی اس کا نصیب نہ بن سکی۔

وہ خواب بے تعبیر رہ گیا۔

اور اس کی آنکھوں سے یہ خواب چھیننے والے بھی اس کے اپنے تھے۔

وہ اپنے جن سے اس نے از حد محبت کی تھی۔

اور جنہوں نے اسے پالا پوسا اور بڑا کیا تھا۔

مجھتیں دی تھیں۔ مان دیا تھا اور تحفظ دیا لیکن پھر ان ہی چاہنے والوں نے اس سے ان مجبوتوں کا خراج لے لیا۔

صلے میں اس کی زندگی چھین لی۔

اور وہ انہیں روک بھی نہ سکا کہ اس کی گردن ان کے احسانوں کے بوجھ تلے چمکی ہوئی تھی۔

”بابا ایسے تو نہ تھے۔“

”وہ تو خود مریم سے پیار کرتے تھے۔ انہوں نے خود اسے مریم کے لیے سوچنے کو کہا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا۔“
دنیا اسے اتنی خوب صورت کہی نہ لگی تھی جتنی ان دنوں لگتی تھی مگر پھر جیسے اس کے گرد سارے رنگ مر گئے تھے۔

ساری خوبصورتیاں ختم ہو گئی تھیں۔

وہ کتنی ہی دیر حیران سا بابا کو دیکھتا رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ سکندر ماموں ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اسے لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا دل سینے سے کوچ کر پاؤں سے مسل ڈالا ہو اور مریم کتنی کمزور دل تھی۔
ذرا ذرا سی بات پر وہ رو دینے والی۔

اپنی ماما کے رویے سے شاکا۔

ہر وقت پاپا کے لیے پریشان..... گھبرائی گھبرائی سی لیکن اس کی محبت نے کتنا اعتماد بخش دیا تھا اسے..... اور پھر سارے خواب بکھر گئے۔ وہ مریم سے اپنی آخری ملاقات نہیں بھول سکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔

پھر اس نے ملک سے باہر جانے کا سوچا۔

یہاں رہ کر وہ مریم سے دور نہیں رہ سکتا تھا اور وہ اس سے ملتی نہیں تھی۔

”جو راتے منزلوں تک نہ لے جائیں شہر یا ران پر چلنے سے فائدہ۔“ ایک بار اس نے کہا تھا۔

”میرے راتے تو تمہاری طرف ہی آتے ہیں۔“

اس نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

”لیکن پتا نہیں کیوں وہ اتنی مایوس کیوں تھی۔ اسے خود پر اعتبار نہیں تھا یا اس پر۔“

کتنا یقین دلایا تھا اس نے اسے لیکن وہ جاتے لمحے اس سے ملنے بھی نہیں آئی تھی حالانکہ اس نے وعدہ بھی کیا تھا اور پھر اس نے وہاں سے اسے خط بھی لکھا تھا لیکن مریم نے اسے جواب نہیں دیا تھا جبکہ یعنی نے بتایا تھا کہ وہ پریشان ہے اور ایک بار پھر اسے یقین دلانا چاہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔

ہر دکھ اور ہر خوشی میں۔

جب وہ اسے آواز دے گی وہ آجائے گا۔

ساری زنجیریں اور سارے رشتے تو ذکر۔

لیکن اس نے اسے آواز نہیں دی تھی۔

اور وہ خود دنیا کی بھیڑ میں کھو گئی تھی۔

یعنی نے اسے بتایا تھا۔

وہ اپنی ماما سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہے۔ کہاں؟ یہ علم نہیں۔

”اس کی ماما نے غضنفر ملک سے بالکل اچانک شادی کر لی تھی۔ یہ دکھ یقیناً بہت بڑا تھا لیکن وہ اتنی ناکجھ تو نہیں تھی کہ وہ اس بات پر گھر چھوڑ دیتی جبکہ اسے عاشقینا اور تیور سے بہت پیار تھا۔ یقیناً کوئی بہت بڑی بات ہوگی۔ بہت ہی دکھ دینے والی۔“

اس نے سوچا تھا اپنی پڑھائی ناکمل چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ بے حد تھکا تھکا اور غڑغڑ حال سا۔

”تم شہر یار۔“ بابا اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”اچانک۔“ ماں جی نے بھی ان کی پیشانی چومتے ہوئے پوچھا تھا ”اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”بس یوں ہی۔“

بابا نے اسے گلے لگاتے ہوئے بہت غور سے دیکھا۔

”شیری اسٹڈی تو مکمل کر لیتے۔“

اس نے بے حد حیرت سے انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔

انہیں جیسے القا ہو گیا تھا کہ وہ یوں ہی چلا آیا ہے، تعلیم ناکمل چھوڑ کر۔

”بہت کمزور ہو گئے ہو۔“ صالح بیگم کی نظریں بار بار اس کے چہرے کی طرف اٹتی۔

اور کتنے محبت کرنے والے تھے یہ سب۔ کسی موڑ پر کسی لمحے انہوں نے اسے یہ احساس نہیں دلایا تھا

کہ وہ ماں باپ جیسے شفیق رشتوں سے محروم ہے انہوں نے اس کی ہر خواہش پوری کی تھی لیکن.....

اس روز بھی وہ کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ بابا چاہتے تو شاید سکندر ماموں کو مٹا لیتے۔

اور اس رات جب وہ بابا کے پاس ان کے بیڈ پر سر جھکائے بیٹھا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔

”شیری! میں نے سوچا، جب تم آؤ گے تو تمہیں سر پر انزدوں گا لیکن.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں نے سکندر سے کہا تھا یا نہیں نے زندگی میں آج تک کبھی شیری کی کوئی بات نہیں مانی۔ یاد ہے تمہیں؟ تم تیرا کی بکھنا چاہتے تھے لیکن تمہاری ماں کو پانی سے خوف آتا تھا اور جب ایک بار ارسل نے آکر بتایا کہ تم اسکول سے چھٹی کے بعد تیرے چلے جاتے ہو تو تمہاری ماں نے تمہیں سختی سے منع کر دیا تھا اور تم سے کہا تھا کہ اگر تم تیرے گئے تو وہ تم سے ناراض ہو جائیں گی اور تم سے کبھی بات نہیں کریں گی اور تم اگلے

روز اسکول سے سیدھے گھر آئے تھے لیکن کھانا کھا کر برآمدے میں افسردہ سے بیٹھ کر اسکول کا کام کرنے لگے تھے اور مجھ سے تمہاری افسردگی دیکھی نہ گئی تھی اور پھر میں خود ہی دوسرے دن تمہیں تیرا کی سکھانے کے لیے نہر پر لے گیا تھا اور صالحہ کو خبر تک نہیں ہوئی تھی یاد ہے نا؟“

”جی بابا۔“

وہ بھولا ہی کب تھا۔ اسے تو ایک ایک بات یاد تھی۔ بابا ارسل اور مرنے کو بعض اوقات نظر انداز بھی کر جاتے تھے لیکن اس کی ہر ضرورت کا انہیں خیال رہتا تھا کبھی وہ احتجاج بھی کرتا۔

”بابا میرے جوتے تو ابھی بالکل نئے ہیں آپ ارسل کو نئے جوتے خرید دیں۔“

لیکن بابا اس کے احتجاج کی رتی بھر پروا نہیں کرتے تھے۔

”تم میری بہت لاڈلی بہت پیاری بہن کے بیٹے ہو شیریں میرے اختیار میں ہو تو میں دنیا کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔“

اور یہی باتیں تو تھی جنہوں نے اسے زنجیر کر دیا تھا۔

وہ ایک بار بھی ان سے نہ کہہ سکا تھا۔

”بابا، مریم میری خواہش ہے۔“

”میری آرزو ہے۔“

”میں اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”میں نے صرف اس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہیں۔“

”صرف اسی کا ساتھ چاہا ہے۔“

”تو۔“ بابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں نے سکندر سے کہا میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے خبر دکھائی دیتی ہے۔ گلہ کرتی، شکوہ کرتی، شہریار کے لیے اداس اور پریشان۔ میں نے اس سے کہا سکندر یا زہم تم اپنی زندگی گزار چکے۔ اب ہمارے بچوں کی باری ہے۔ اگر کچھ غلط بھی ہے تو انہیں ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے دو۔“

انہوں نے مسکرا کر اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا دیا۔ ”میں نے سوچا تھا یا زہم آؤ گے تو پھر ہم مریم کی طرف جائیں گے۔ کتنا اچھا سر پرانز تھا میرے پاس تمہارے لیے۔ لیکن وہ بچی.....“ انہوں نے گہری سانس لے کر اس کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک یقین و بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے اسے کائنات اپنے ارد گرد رقص کرتی دکھائی دی۔

”مریم، مریم دیکھو میں نہ کہتا تھا، ہماری منزل ایک ہے۔ ہمارے راستے ایک ہیں۔“ اس نے دل کا دل میں اسے مخاطب کیا اور سر اٹھا کر بابا کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں تاسف اور دکھ کی ملی جلی کیفیت

تھی اور کائنات کی گردش ختم گئی۔ اس نے سر جھکا لیا اور انتہائی شعوری کوشش سے اپنے آنسوؤں کو اٹا آنے سے روکا۔

یہ کیسی خوش خبری سنا کی تھی بابا نے جو دکھ سے بوجھل تھی۔

رات کتنی ہی بار اس نے یحییٰ سے پوچھا تھا ”یعنی کیا مریم نے تم سے کچھ نہیں کہا؟“

”نہیں، بس مجھے اتنا پتا ہے کہ وہ بہت اب سیٹ تھی اپنی ماما کی شادی سے اور ان کے سسرالی عزیزوں

کی آمد سے جو زنب ولا میں مقیم تھے کیونکہ عاشری انہیں قبول نہیں کر رہی تھی۔“

”وہ تو تمہاری اتنی گہری دوست تھی۔ اتنے قریب تھی تمہارے پھر بھی اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ تم

اس سے اتنی دور کیوں ہو گئی تھیں۔“ اس نے گلہ کیا۔

”میں دور نہیں ہوئی تھی شیریں بھائی۔ بس وہ خود ہی دور چلی گئی تھی۔“

کوئی دوست، کوئی عزیز رشتے دار کہاں جاسکتی تھی۔ وہ سب کچھ تو جانتا تھا وہ ایک ایک بات بتائی

تھی مریم نے۔ یعنی کے علاوہ کسی اور سے اس کی دوستی نہ تھی۔ کوئی ایسا عزیز نہ تھا۔

حوالی وہ گئی نہیں تھی۔

پروفیسر عادل خود پریشان تھے یعنی نے بتایا تھا کئی بار انہوں نے اس کا پوچھا تھا۔ عاشری نے کئی بار

ذکر کیا تھا۔

وہ کہاں اسے ڈھونڈے؟

اس کا دم گھٹنے لگا۔ یہ وہی لاہور تھا۔ جہاں وہ اسے ملی تھی اور جہاں پچھڑ گئی تھی۔ سو وہ کراچی بھاگ آیا

لاہور۔ حالانکہ سکندر ماموں کی کتنی شدید خواہش تھی کہ وہ گاؤں آجائے اور ان کے ساتھ کام کرے۔

انگلینڈ جانے سے پہلے بھی انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور اب بھی انہوں نے اس

سے کہا تھا۔

”شیریں تم گاؤں کیوں نہیں آ جاتے۔ یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ اب تو آس پاس سے سب ہی

یہاں آنے لگے ہیں۔“

لیکن وہ سب کے سامنے نہیں رہتا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے دیکھ دیکھ کر بابا اور ماں جی

پریشان ہوں۔ اسے اپنے اوپر اعتبار نہیں رہا تھا۔ کئی بار وہ خود پر سے اعتبار کھو بیٹھا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے کسی

دن اس کا دل پھٹ جائے گا۔

”پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟“

”کیسی ہوگی۔“

اسے سوچتی بھی ہوگی یا نہیں۔

”کیا سوچنے لگے شہریار؟“ پروفیسر عادل نے اسے سوچتے دیکھ کر پوچھا تو وہ چونک کر مسکرا دیا۔

”بہت دل شکستہ اور افسردہ مسکراہٹ تھی۔“

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں شہریار؟“

”نوسر“ کچھ بوجھ میں تنہا اٹھانے ہوتے ہیں۔“

وہ ان سے کیسے اپنا دکھ شیر کر سکتا تھا۔ مریم ان کی بہن تھی۔ سوتیلی ہی سہی۔ یعنی نے بتایا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے پریشان تھے اور وہ کتنی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ جب عاشی چلی گئی تھی تو وہ کیوں نہیں گئی۔ جبکہ ماں جی اور بی آپا کی بہت تعریف کرتی تھی۔ جب وہ حویلی سے واپس نہ بولا آتی تھی تو اس نے اسے بتایا تھا۔ ”پتا ہے شہریار ماں جی کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ماں ایسی ہوتی ہیں..... ان کے سینے سے لگ کر ماں کی خوشبو آتی ہے۔“

”پھر وہ حویلی کیوں نہیں گئی۔“ اس سوال کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔

”ہاں تمہاری بات صحیح ہے ڈاکٹر۔ اپنا بوجھ تنہا ہی اٹھانا ہوتا ہے۔ پھر بھی کہہ دینے سے دل کا بوجھ

ہلکا ہوتا ہے۔“

”شاید۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور مسرور کی طرف دیکھا جو چائے لانے والے بیرے سے گاڑی

کا پوچھ رہا تھا۔

”گاڑی آگئی ہے سر۔“

اس نے مڑ کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔

”چائے پی کر چلتے ہیں۔“

”کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے سر۔“ اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

”کہ منزل سامنے ہوتی ہے اور راستے پائے نہیں جاسکتے۔ ناقابل عبور بنا دیے جاتے ہیں اور کبھی

یوں ہوتا ہے کہ راستے آسان ہو جاتے ہیں مگر منزل دکھائی نہیں دیتی۔“

”کیا تمہارے ساتھ ایسا ہوا ہے شہریار؟“ پروفیسر عادل نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ سر

جھکائے چائے پی رہا تھا۔

”ایسا ہے تو انتظار کرو یک مین۔ راستے آسان ہو گئے ہیں تو ایک دن منزل بھی مل جائے گی۔“

انہوں نے دھیمے انداز میں اسے سمجھایا ”تم جیسے یک آدمی کے چہرے پر مایوسی نہیں جتنی۔“

”سر کیا آپ زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوئے؟“

”کئی بار۔ آس و ناس کا یہ کھیل تو جاری رہتا ہے لیکن میں مایوسی کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے

دیتا..... پھر سے بھگتا دیا جلا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔“

اگرچہ کچھ دیر پہلے وہ خود اذ حد مایوس ہو رہے تھے لیکن انہوں نے اسے سمجھایا۔

پروفیسر عادل کی ذات میں یہ کمال تھا کہ وہ خود کتنے بھی پریشان ہوں دوسروں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔

”کمال آدمی ہیں پروفیسر عادل بھی۔“

پہلی بار جب ارسلان نے اسے ان کے متعلق بتایا تھا تو تبصرہ کیا تھا ”خود بھلے ڈوب رہے ہوں لیکن دوسروں کو بچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔ ضرر صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر پروفیسر عادل اٹھ کھڑے ہوئے ”ابھی تو ہم یہاں ہی ہیں شہریار۔ پھر دیکھیں گے کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں.....“ انہوں نے مہربان لہجے میں کہا تو وہ افسردگی سے مسکرا دیا۔

کوئی بھی اس کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ خدای تھا جو اس پر مہربان ہو جاتا اور مریم اسے مل جاتی۔

اور پتا نہیں مقدر یا وری کرے گا یا نہیں۔

وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”جی سر۔ ضرور آتا رہے گا۔“ اس نے جواب دیا ”اور سر مریم کے متعلق کچھ پتا چلا؟“

باہر نکلتے پروفیسر عادل ٹھنک کر رک گئے اور انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ ہٹا گیا۔ شاید اسے نہیں

پوچھنا چاہیے تھا لیکن بے اختیار ہی یوں سے نکل گیا تھا کہ ممکن ہے اس وقت تک وہ حویلی جا چکی ہو۔

”وہ..... دراصل یعنی بہت پریشان تھی اس کے لیے۔“

”نہیں۔“

ان کا جواب مختصر تھا اور ان کی پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئیں۔ انہیں شہریار کے منہ سے مریم کا نام سننا اچھا نہیں لگا تھا۔ انہوں نے دوبارہ اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے رخ موڑ لیا اور ہوٹل کی لابی میں اپنے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مسرور کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

”مسرور بھی تو عینی کا کزن ہے پھر اس نے تو ایک بار بھی مریم کے متعلق کوئی بات نہیں کی..... کیا وہ

مریم کی گم شدگی سے لاعلم ہے یا پھر اس نے مناسب نہیں سمجھا۔“

ممکن ہے شہریار یعنی سے زیادہ قریب ہو اور پھر وہ اسی گھر میں رہتا ہے جبکہ مسرور وہاں نہیں رہتا۔

یقیناً اس نے عینی سے مریم کا ذکر سنا ہوگا۔ وہ بھی کئی بار عاشی سے کہہ کر فون کروا چکے تھے اور خود بھی

انہوں نے پوچھا تھا اور عاشی کے ساتھ گھر بھی گئے تھے۔

انہوں نے ہولے سے کندھے جھٹکے اور مڑ کر پیچھے سر جھکائے آتے شہریار کو دیکھا اور پھر تیز تیز چلتے

ہوئے ہوٹل سے باہر نکل آئے۔



ماسی نے میز پر کھانا لگا دیا تھا لیکن لالا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ سین نے چاول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے مریم کو آواز دی۔

”اب آج بھی جاؤ مریم لالا اب نہیں آئے گی اور اگر آج بھی گئی تو کھانا کھا کر آئے گی۔“

”لالہ آخر جاتی کہاں ہے؟“ مسز ساجدہ نے کہا۔

”معلوم نہیں شاید بونیک پر رات کی شفٹ بھی شروع ہو گئی ہے۔“

صابرہ خاتون کے لہجے میں گہرا طنز تھا مریم کو بے حد برا لگا اور خاموشی سے آکر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ لالا پوری رات باہر رہی ہو۔ ہاں اسے دیر ضرور ہو جاتی تھی۔ خدا جانے کیا بات تھی اس نے کتنی بار پوچھا بھی تھا۔

”لالہ آج کل تم اتنی دیر سے کیوں آتی ہو؟“

”یاز تمہیں تو پتا ہے مسز اباب کا۔ آج کل دیر تک کام کرواتی ہیں یوں بھی بونیک دس بجے بند ہوتا ہے۔“

”لیکن یہ لوگ باتیں کرتی ہیں۔“

”کرنے دو۔“ لالا کو پروا نہیں تھی۔

”مگر لالا آج بھی پوچھ رہی تھیں۔“

”آج بھی میں خود بات کروں گی۔“

”لیکن تم بات تو کرو مسز اباب سے۔ آخر پہلے بھی تو تم پانچ بجے آ جاتی تھیں۔ آٹھ دس تک کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔“

”ہاں کی تھی میں نے بات لیکن مسز اباب نہیں مانتیں نا۔“

”تم یہ جاب چھوڑ دو نا لالا۔ یوں بھی مسز اباب کوئی اچھی خاتون نہیں ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے نا۔“

”چھوڑ دوں گی مریم۔ تم پریشان نہ ہو۔“ لالا نے اسے تسلی دی لیکن سین اور ساجدہ وغیرہ کی معنی خیز باتیں اسے نارچ کر کرتی تھیں۔

پتا نہیں کیوں وہ لالا سے بدگمان نہیں ہو سکتی تھی۔

”لالہ بہت اچھی ہے۔“

وہ سین وغیرہ سے کبھی کبھی تو بحث پر اتر آتی۔

”اس کی جاب ہی ایسی ہے۔ وہ کیا کرے اور نی کوئی جاب اسے ملتی نہیں تھی جبکہ اس کی انجکشن بھی مکمل تھی۔ خود ماسٹرزی ڈگری رکھنے کے باوجود اسے جاب نہیں مل سکتی تھی۔ یہ تو خدا کا شکر تھا کہ آج بھی اس کے لیے ٹیوشن تلاش کر دی تھی۔ اور لوگ بھی بہت اچھے تھے۔ اس روز اسے دیر ہو گئی تھی تو اس نے

مسز علی سے معذرت کی تھی۔

”سوری مسز علی آج بس نہیں مل سکی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ مسز علی نے حلیمی سے کہا تھا اور پھر انہوں نے اس کی سواری کا مسئلہ بھی حل کر دیا تھا۔

”ڈرائیور آپ کو لے بھی آئے گا اور چھوڑ بھی آئے گا۔“

یوں اب اسے بس اسٹاپ پر کھڑا نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اس کے لیے وہ مسز علی کی از حد ممنون تھی۔ دن کو فارغ ہوتی تھی تو آج کے پاس جا کر بیٹھ جاتی۔ آج بھی دو اور لڑکیوں کی ٹیوشن بھی اسے لے دی تھی جو ایف اے کے امتحان کی پرائیوٹ تیاری کر رہی تھیں اور انہیں انگلش کی تیاری کے لیے ٹیوٹر درکار تھی۔ وہ دونوں گیارہ بجے ہاسٹل آ جاتی تھیں اور گھنٹا بھر پڑھ کر چلی جاتی تھیں۔

آج بھی اس پر بہت مہربان تھیں اور انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ موسم گرما کی اب چھٹیاں ہونے والی ہیں اور چھٹیوں میں کئی مزید بچے ٹیوشن کے لیے مل جائیں گے۔

یوں ایک طرح سے وہ پرسکون ہو گئی تھی لیکن کیا وہ باقی ماندہ زندگی یہاں اسی ہاسٹل میں گزار دے گی۔

”اپنے ڈیڈی کو تلاش کرو۔“

لالہ اکثر اسے اکساتی تھی۔

”عاشی سے رابطہ کرو۔ حویلی میں بات کرو عادل بھائی سے۔ وہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ وہ لڑکی جس کو عثمان احمد نے اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے یوں اس طرح ہاسٹلوں میں رہے۔“

لیکن وہ نہ تو ڈیڈی کو تلاش کر سکتی تھی اور نہ ہی حویلی جانا چاہتی تھی۔ آگے کیا ہوگا اس کی اسے خبر نہ تھی۔

”سنو۔ لالا آگئی ہے۔“ باہر گاڑی کا ہارن بجا تو سین پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور بارے تجسس کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کھڑکی سے گیٹ کے سامنے والی سڑک نظر آتی تھی۔

ریڈ سوز کی ٹرن لے کر مڑ رہی تھی۔ اس نے سب کی طرف دیکھ کر اطلاع دی۔

”وہ آج بھی بونیک وین میں نہیں آئی۔“

”اچھا۔“ مسز ساجدہ نے بھی اچک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

مریم کو ازا حد برا لگا۔ وہ ان سب کے متعلق کتنی اچھی رائے رکھتی تھی لیکن وہ سب کس طرح لالا کے متعلق اندازے لگا رہی تھیں اور ہر ایک کو اپنے لگائے گئے اندازوں پر پورا یقین تھا۔

”کسی کے متعلق بدگمانی اچھی نہیں ہوتی سین۔“ اسی نے متنبہ نظروں سے سین کی طرف دیکھا۔

”بعض اوقات سچ وہ نہیں ہوتا جو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔“

”تمہاری تو وہ دوست ہے نا لیکن ہم جھوٹ کو سچ نہیں کہہ سکتے اور کیا یہاں سب شریف لڑکیاں رہتی

ہیں۔ میں آئی سے بات کروں گی۔ اس سے ہاسٹل کی شہرت پر خراب اثر پڑتا ہے۔“
مسز ساجدہ نے بھی رائے دی۔ ہاتھ میں پکڑا جھج مریم نے پلیٹ میں رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی تب ہی لالہ ڈائننگ ہال کے دروازے پر رکی۔

”ہیلو۔“ سب کی طرف دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔

”آجاؤ یا رپلاؤ پکا ہے۔“ سین نے دعوت دی۔

”اور کس قدر روٹلی ہے یہ سین۔“ مریم نے سوچا۔

”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔“ لالہ نے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔ مریم بھی اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

وہ بستر پر اوندھی لیٹی تھی۔

”لالہ۔“ مریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہوں.....“ اس نے یوں ہی چہرہ نکلیے میں چھپائے چھپائے جواب دیا۔

”تم کھانا کھا چکی ہو؟“

”نہیں، مجھے بھوک نہیں تھی۔“

مریم اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”لالہ ادھر دیکھو میری طرف، تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ”اور یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے کیا پھر کسی نے میرے متعلق کچھ

کہہ دیا؟“

اس نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن مریم سنجیدہ تھی۔

”تمہیں تو پتا ہے لالہ سب تمہارے متعلق فضول باتیں کرتی ہیں پھر تم کیوں انہیں موقع دیتی ہو بات

کرنے کا۔“

”کرنے دو باتیں۔ میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر میں صحیح ہوں تو مجھے اس بات کی کوئی پروا

نہیں کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔“

”مگر لالہ وہ آئی سے تمہاری شکایت کرنے کو کہہ رہی تھیں۔“ مریم پریشان ہو رہی تھی۔

”کرنے دو شکایت۔ آئی مجھے جانتی ہیں؟ اس نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے تو..... اسے

کھانسی آ گئی۔

مریم نے اس کی پیٹھ سہلائی اور پانی کا گلاس دیتے ہوئے نکلے سے اسے دیکھا۔

”لالہ تمہاری کھانسی بگڑتی جا رہی ہے اور تم کو کہ بے پروائی کر رہی ہو۔ دو ماہ سے زیادہ ہو گئے

ہیں..... رنگ دیکھو کس قدر زرد ہو رہا ہے۔ صبح بوتیک سے چھٹی کرو تو ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔“

”مٹی تو تھی میں ڈاکٹر کے پاس مسز ارباب کے ساتھ چلی گئی تھی اور وہ ابھی لے رہی ہوں۔“

”زہر لگتی ہیں مجھے تمہاری یہ مسز ارباب۔ وہ پاپا خداجانے کہاں لے گئی تھیں کس نیم حکیم کے پاس۔“

”بھئی ڈاکٹر کے پاس ہی لے گئی تھیں۔ دیکھ لو میرے بیک میں اب بھی ڈھیر دل دوائیں لے کر آئی ہوں۔“

”لیکن آخر ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

”کچھ نہیں سینے کا انفیکشن ہے۔ آج بہت درد ہو رہا تھا، پسلیوں میں ادھر ادھر ہر جگہ۔ میں نے سوچا

کہیں دل تو دغا نہیں دینے لگا۔ سوچھٹی میں ڈاکٹر کی طرف چلی گئی تھی۔“

”کچ بتاؤ ڈاکٹر کی طرف گئی تھیں؟“ مریم نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے اعزاز کی قسم میں ڈاکٹر کی طرف گئی تھی۔“

”اور وہ ریڈ سوزو کی کس کی تھی؟“

”ادہ تو میری جاسوسی کی جاتی ہے۔“ لالہ نے زیر لب کہا تو مریم شرمندہ ہو گئی۔

”وہ سین نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔“

”خیر۔“ لالہ نے کندھے اچکائے ”وہ سوزو کی بھی مسز ارباب کی ہے۔ ان کا ڈرائیور مجھے چھوڑ

کیا تھا۔“

”اچھا سنو مریم، تمہیں تکلیف تو ہوگی مجھے گرم پانی کی بوتل دے دو بہت درد ہو رہا ہے شاید سکون

ملے۔“ لالہ پھر لیٹ گئی۔

”نہیں بھلا تکلیف کیسی۔“ مریم ایک دم کھڑی ہو گئی ”ابھی لاتی ہوں۔“

وہ کچن جانے کے لیے ڈائننگ ہال کے پاس سے گزری تو اس نے سنا، ابھی تک ان کے درمیان لالہ

ہی موضوع گفتگو تھی۔

لالہ..... لالہ کیا تھی۔ وہ خود کو کچھ سمجھ نہیں پاری تھی لیکن وہ لالہ سے محبت کرنے لگی تھی۔

اس کی ممنون تھی۔

اس نے بہت مشکل لمحوں میں اس کا ساتھ دیا تھا اور اب بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

وہ لالہ کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

کوئی نہ کہ ٹی گڑبڑ ضرور تھی اس کے ساتھ۔

لیکن وہ کچھ بھی بتانے پر تیار نہ تھی۔

مسز ارباب بھی کوئی اچھی خاتون نہ تھیں۔

سین اور دوسری لڑکیاں لالہ کے بارے میں ایسی سیدھی باتیں کرتی تھیں حالانکہ بظاہر ایسی کوئی بات

بھی نہ تھی۔

وہ لالہ کے لیے پریشان تھی۔

اور اپنے لیے بھی اسے ڈرتا کہ کہیں ان کی باتوں میں آکر آئی اسے اور لالہ کو ہوٹل سے نکال نہ دیں..... پھر کیا ہوگا.....

اس رات لالہ کے سونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔

پاپا اور ماما کی لڑائیاں.....

شرجیل مرزا اور ماما کی اس سے خفگی اور پھر شہریار..... اس کی محبتیں۔ سب اس کی آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔

”مگر کتنی کمزور ہوتی ہیں یہ محبتیں بھی۔“

”اور کتنی عارضی۔“

جانے کب یہ سب سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی لیکن ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ لالہ کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”کیا ہوا لالہ؟“ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”مریم۔“ لالہ یہ مشکل بول رہی تھی۔

”بہت..... بہت شدید درد ہو رہا ہے مجھے۔“

”کہاں؟“ مریم اپنے بیڈ سے اتر آئی۔

”یہاں سینے میں۔“

”دل..... دل میں تو نہیں ہے۔“ وہ گھبرائی۔

”نہیں۔“ لالہ نے آہستگی سے جواب دیا۔

”کیا کرو لالہ؟“ مریم بے حد گھبرا رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے چار بج رہے تھے

پورے ہاسٹل پر خاموشی طاری تھی۔ سب سو رہے تھے۔

”آئی کو جگاؤں لالہ؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

مریم کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ لالہ کا رنگ ایک دم زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ تکلیف کی شدت سے سپید

ہو رہے تھے۔

”لالہ۔“ وہ بے چینی سے اس کا ہاتھ ہلانے لگی۔

”اس اوکے مریم۔“ لالہ نے مسکراتے کی کوشش کی ”گھبراؤ مت ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”مگر لالہ تمہیں ایک دم اچانک کیا ہو گیا ہے؟“

”ایک دم اچانک نہیں مریم۔ تمہیں پتا تو ہے بہت دنوں سے چیٹ انکلیشن ہے مجھے۔“

”اور تم اتنی بے پروائی کر رہی تھیں۔“

مریم نے ناراضگی سے اسے دیکھا اور پھر اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر اسے ویکس لگانے لگی۔ لالہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

”کچھ سکون ملا ہے لالہ؟“

لالہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”مریم اگر کبھی مجھے کچھ ہو جائے تو پلیز واپس چلی جانا۔ نینا، عاشی اور مورو کے پاس اور اگر وہاں نہ جانا چاہو تو اپنے گھر چلی جانا زنب دلا میں۔ وہاں تمہاری ماما تو ہوں گی نا..... اور تمہارا اپنا گھر۔“

”اچھا فضول نہ بولو۔ تمہیں کبھی کچھ نہیں ہوگا۔“ مریم نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ فضول نہیں ہے مریم۔“ لالہ آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹایا ”یہاں مت رہنا۔ تم نے مسز ارباب کو دیکھا ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ شہر بھرے پڑے ہیں جن کا اصل چہرہ کچھ اور ہوتا ہے

اور بظاہر وہ کچھ اور دکھائی دیتے ہیں۔“

”اتنی ساری لڑکیاں گھروں سے نکل کر جاب کر رہی ہیں۔“

”ہاں لیکن اکیلی لڑکی کے لیے جگہ جگہ بھڑے منہ کھولے کھڑے ہوتے ہیں بس پتا چل جائے کہ

اس کے سر پر کوئی سائبان نہیں ہے۔“

”لالہ کیا تمہارے ساتھ مسز ارباب نے کوئی زیادتی کی ہے؟“

”نہیں میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن مومنم میرے جیسی نہیں ہو۔ تم بہت معصوم ہو اور سنو ایسا

نہیں ہے جیسا بظاہر دکھائی دے رہا ہے بات کچھ اور ہے۔“

یہ تو اسے بھی یقین تھا کہ ایسا نہیں ہے جیسا سب سمجھ رہے ہیں لیکن بات کیا تھی یہ معلوم نہیں تھا اسے۔

وہ تو مسز ارباب کو ہی مجرم سمجھ رہی تھی۔

”مسز ارباب سے بھی برے لوگ ہیں اس دنیا میں۔“ لالہ نے آنکھیں موند لیں اور اپنے سینے پر

ہاتھ رکھتے ہوئے منہ کھولا اور لمبی لمبی سانس لی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے سانس لینے میں تکلیف ہو

رہی ہو۔

”لالہ لالہ۔“ مریم نے بے چینی سے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”مریم پلیز۔“ لالہ نے بے مشکل آنکھیں کھولیں ”میرے ہینڈ بیگ میں میڈلین ہیں ان میں ایک

لال رنگ کا پتا ہے پلیز اس میں سے ایک گولی نکال دو شاید کچھ درد کم ہو جائے۔“

مریم نے گولی اسے دی لیکن درد میں کمی نہیں ہوئی تھی صبح تک اس کی حالت خاصی خراب ہو گئی تھی۔

روشنی ہوتے ہی مریم اوپر آنٹی کی طرف بھاگی۔ آنٹی فوراً ہی اس کے ساتھ آگئی تھیں اور پھر آنٹی کے ساتھ لالہ کے منہ کرنے کے باوجود وہ اسے اسپتال لے گئی..... اور ایمر جنسی میں اسے فوری طبی امداد دینے کے بعد داخل کر لیا گیا۔ وہ سارا دن لالہ کے پاس رہی۔

”لالہ میں آنٹی کو فون کر دوں لاہور۔ وہ یقیناً واپس آگئی ہوں گی۔“

”نہیں۔“ لالہ نے سختی سے منہ کر دیا۔

”آنٹی تم سے محبت کرتی ہیں لالہ۔“

”میں بھی ان سے محبت کرتی ہوں۔“

”لیکن۔“ لالہ نے مریم سے درخواست کی ”میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی اور سنو مجھے گھر لے چلو۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں اور پھر تمہیں ٹیوشن پڑھانے بھی جانا ہوگا۔“

”آج اتوار ہے اور ابھی تمہیں گھر لے کر نہیں جانا۔ ڈاکٹر نے ایک دوا یکسرے بتائے ہیں۔ وہ کروانے ہیں۔“

”فضول۔“ لالہ ایکسرے کروانے کو تیار نہ تھی لیکن ڈاکٹر یہ ضد تھا کہ ایکسرے کیا جائے۔

”میں نے ایکسرے کروایا ہے۔ انفیکشن ہے، مجبوری ہے۔“

”بی بی یہی تو دیکھنا ہے کہ انفیکشن کس حد تک ہے تاکہ دوا تجویز کی جائے۔“ ڈاکٹر نے ناراض لہجے میں کہا تو لالہ چپ ہو گئی۔

”ایکسرے ہو جائے تو دوائیں وغیرہ لے کر چلے جائیں گے۔“

لالہ چپ ہو گئی۔ ایکسرے ہوا اور ڈاکٹر نے ایکسرے دیکھنے کے بعد مریم کو بلایا۔

”آپ ہیں مریم، یہ ہے ساتھ؟“

”جی۔“

”کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟“

”نہیں جی۔“

”مریم، آپ کی کیا گتتی ہیں؟“

”بہن۔“ مریم پریشان ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگی۔

”بی بی بیٹھ جائیے۔“ ڈاکٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایکسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایک پیچہ تو ایکسرے میں بالکل آیا ہی نہیں۔ مجھے شک ہے بی بی کہ آپ کی بہن کو پیچہ پڑا ہے۔“

سرطان (لنگو کینسر) ہے۔“

مریم کو لگا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔

”نہیں۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”بی بی، ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم یہ مندرجہ ذیل ٹیسٹ ہیں، یہ کروانے پڑیں گے۔“ اس نے مختلف ٹیسٹوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست اس کے ہاتھ میں پکڑوا دی ”بہتر ہے کہ کسی مرد کو بلا لیں۔“ اسے آج گھر لے جاؤں۔“

”نہیں ابھی یہاں ہی ایڈمٹ رکھیں۔ کچھ ٹیسٹ تو ادھر ہی ہوں گے اور کچھ آغا خان سے کروانے پڑیں گے اور پھر ابھی ان کا سانس کا مسئلہ صحیح نہیں ہوا۔“

”جی۔“ وہ مرے مرے قدموں سے لسٹ ہاتھوں میں لے کر وارڈ میں آگئی۔ لالہ ٹیکے کے سہارے بیٹھی ساتھ کے بیڈ والی بوڑھی عورت سے گپ لگا رہی تھی۔

”چلیں؟“ اسے آتے دیکھ کر لالہ نے اس سے پوچھا۔

”ہاں نہیں۔ ابھی ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔“

مریم نے انتہائی ضبط سے اپنے آنسو اس سے چھپانے کی کوشش کی۔

”ادھر دیکھو مریم، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ مریم نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا ”کچھ مزید ٹیسٹ بتائے ہیں۔“

”ٹیسٹ۔“ لالہ ایک لمحے کو چپ کر گئی ”رہنے دو مومن میں اب بہتر ہوں۔ درد بھی نہیں ہے۔ اینٹی بائیوٹک لے تو رہی ہوں اور مزید ٹیسٹوں پر پیسے بھی لگیں گے، ہم کہاں انورڈ کر سکتے ہیں۔“ اس نے مریم کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا جس پر ان سارے ٹیسٹوں کے متعلق لکھا تھا جو کروانے تھے۔

”لالہ ہم آنٹی کو اطلاع کر دیتے ہیں۔“

”نہیں پلیز مریم، ممی کو مت بتانا میں ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتی۔ کتنی محبت دی انہوں نے مجھے، کتنا چاہا اور میں نے ایک اجنبی شخص کے لیے انہیں چھوڑ دیا۔ ایک شخص کی محبت پر اعتبار کیا جس کی محبت ناقابل اعتبار تھی۔“

مریم خاموش ہو گئی۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا بہت سارا رو لے لیکن لالہ کے سامنے رونا میں چاہتی تھی۔ سو ضبط کیے بیٹھی رہی۔

”مومنو پلیز ڈاکٹر سے گھر جانے کی اجازت لے لو۔ میں اب بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“ اسے شوش دیکھ کر لالہ نے اصرار کیا۔

”اچھا۔“ مریم کھڑی ہو گئی ”میں پوچھتی ہوں ڈاکٹر سے۔“ یوں بھی وہاں اس سے بیٹھا نہیں جا رہا باہر آ کر کوریڈور میں دیوار سے ٹک لگا کر وہ بہت دیر تک روتی رہی۔

”یا اللہ لالہ کو کچھ نہ ہو۔ ڈاکٹر کا شک غلط ہو؟“

کوریڈور سے گزرتے ہوئے سب نے اسے روتے ہوئے دیکھا۔ ایک دو خواتین نے اس کے پاس رک کر پوچھا بھی "کون بیمار ہے تمہارا؟"

ہسپتال میں تو ایسے مناظر روز ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ سو کسی نے زیادہ پروا نہیں کی۔ کچھ دیر رونے کے بعد اس نے چہرہ صاف کیا اور جا کر ڈاکٹر سے واپس جانے اجازت مانگی۔ "نہیں بھئی ایک دور روز رکنا پڑے گا۔ ایک دو ضروری ٹیسٹ ہو جائیں تاکہ کچھ وضاحت سے معلوم ہو سکے کہ مرض کیا ہے۔" تب وہ خاموشی سے لالہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ سوئی تھی۔ شاید ڈاکٹر نے درد کے لیے جو انجکشن دیا تھا اس میں نیند کا بھی اثر تھا۔ وہ بے حد زرد اور کمزور لگ رہی تھی۔ مریم نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ لالہ کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ قدرے... لبریز لگ رہا تھا۔ وہ اتنا گہرا میک اپ کرتی تھی کہ اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی کمزور ہو رہی ہے۔ لاہور میں اس کا چہرہ کتنا شگفتہ اور کھلا ہوا رہتا تھا۔ ایک دم سرخ و سپید رنگ۔ جب اس نے انڈکس آپریٹ کروایا تھا تب بھی وہ کتنی فریش لگتی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اور ڈاکٹر شہریار کو اسے دوائیاں کھلانے کے لیے دمکی دینی پڑی تھی اور وہ پہلی بار وہ ڈاکٹر شہریار سے ملی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا ذہن ڈاکٹر شہریار کی طرف چلا گیا۔

"بعض لوگ کہتے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن آزمائش کے لمحوں میں ان کا پول کھل جاتا ہے۔" اس نے بے حد دکھ سے سوچا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شہریار کو نہ پکارتی۔ بھرم تو قائم رہتا کہ اس نے جس شخص سے محبت کی آزمائش کے لمحوں میں اسے چھوڑ گیا۔" لالہ نے کراہ کر روٹی لی تو وہ بھر چوک کر اسے دیکھنے لگی۔

"اور کیا لالہ کو بتا دوں کہ ڈاکٹر کو کیا شبہ ہے۔۔۔۔۔" اس نے سوچا۔

"مگر نہیں! ابھی نہیں۔ جب صحیح طور پر تشخیص ہو جائے گی تب ہی بتاؤں گی۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔"

اس نے دل ہی دل میں دعا کی اور جیسے اسے یقین سا ہو گیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ "بھلا لالہ کو کینسر کیسے ہو سکتا ہے وہ اتنی صحت مند تھی۔ نہیں ڈاکٹر کا خیال بالکل غلط ہے۔"

لالہ دن بھر دوائیوں کے زیر اثر سوتی جاگتی رہی۔ شام کو سبین مسز ساجدہ اور دوسری لڑکیاں بھی اسے دیکھنے آئیں تو وہ خوب ہنس کر ان سے گپ لگاتی رہی اور دوسرے روز صبح کے ہسپتال سے آگئی۔ جو دو تین ٹیسٹ ہوئے تھے ان سے کوئی بات واضح نہیں ہو سکتی تھی۔ مریم بہت پریشان تھی۔۔۔۔۔ اور لالہ کا بہت خیال رکھتی تھی۔

"لالہ پلیز ایک ہفتے کی چھٹی لے لو۔"

"نہیں اب ٹھیک تو ہوں۔ چھٹی کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں پتا ہے نامسز رباب تنخواہ کاٹ لیتی ہیں۔"

اور اتنا خرچ ہو رہا ہے میڈیسن پر۔"

"لیکن تمہیں آرام کی ضرورت ہے لالہ اور ابھی پیسے تو ہیں نا کرایہ اور میس کا خرچ الگ کر کے رکھ دیں۔ پھر بھی کچھ پیسے ہیں نا۔"

لالہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتی رہی اور پھر اٹھ کر کپڑے استری کرنے لگی۔

"صبح سے کام پر جاؤں گی۔"

"لالہ پلیز ایک دن تو رک جاؤ۔" مریم نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے استری لے لی۔

"کل ہم آغا خان جائیں گے اور جو دوسرے ٹیسٹ ڈاکٹر نے بتائے ہیں وہ کروالیتے ہیں اور پیسوں کی تم فکر نہ کرو ہو جائیں گے۔"

"کہاں سے؟" لالہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "اپنی جین وغیرہ فروخت کرو گی۔"

مریم کو از حد حیرت ہوئی۔ وہ جین بیچنے کا ہی سوچ رہی تھی۔ خاصی موٹی جین تھی "یہ لالہ بھی بلا کی ذہین ہے۔"

"تمہارے خیال میں کیا کینسر ہو گیا ہے مجھے اور فرض کرو کینسر بھی ہے تو ایک جین فروخت کرنے سے کینسر کا علاج ہو جائے گا۔" اس نے ہتھ بہہ لگایا۔

مریم سہکت کھڑی اسے دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ "کیا اسے پتا ہے۔ کیا وہ جانتی ہے۔"

"مومنو پریشان مت ہو میری جان۔" لالہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تقریباً دو ماہ پہلے جب ٹیپر چر ہوا تھا مجھے اور سبنے میں درد بھی بہت تھا تو میں ایک پرائیوٹ کلینک میں گئی تھی۔ وہیں ہے ہمارے بوتیک کے قریب تو اس نے بھی شبہ ظاہر کیا تھا اور کئی ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے۔"

"تو۔۔۔۔۔ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔ ذکر تک نہیں کیا۔"

"کیا فائدہ تھا تمہیں پریشان کرنے کا۔ یہ ڈاکٹر لوگ تو بس یوں ہی کہہ دیتے ہیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ دراصل جب میں ڈیڈی کے گھر سے آئی تھی تو آتے ہی مجھے نمونے کا شدید ایک ہو گیا تھا اور بس وہی بگڑ گیا ہے۔ اس لیے ذرا سی بے احتیاطی کروں تو انفیکشن ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں ہے۔"

"پھر بھی اگر۔۔۔۔۔ تسلی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"

"دیکھیں گے۔" لالہ نے کندھے اچکائے "فی الحال تو میرے کپڑے پر لیس کر دو صبح بوتیک جاؤں گی۔"

"لالہ اگر می کو اطلاع نہیں دینا چاہتیں تو ڈیڈی ہی کو خبر کر دو۔ کم از کم تمہارا علاج تو بہتر طریقے سے ہو سکے گا۔ فرض کرو فی الحال معمولی تکلیف ہے بعد میں بگڑ بھی تو سکتی ہے۔"

"نہیں ڈیڈی تو مجھے اپنی حویلی میں قید کر دیں گے۔ دم گھٹ جائے گا میرا وہاں۔ اگر مجھے اس وقت

کچھ نہیں ہے تو جب ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور یقین رکھو مجھے کچھ نہیں ہے۔ دو چار روز میں بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔“ اس نے مریم کو پھر تسلی دی لیکن رات اچانک ہی دوبارہ اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ سانس لینے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ اسے فوری طور پر دوبارہ اسپتال لے جانا پڑا۔ مریم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے آئی بہت ہیلپ کر رہی تھیں۔ آئی کی مدد سے اس نے ہر قابل ذکر چیز فروخت کر دی تھی۔ مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے اور ادویات دی جا رہی تھیں اس نے مسز علی کو فون کر کے چند دن کی چھٹی لے لی تھی اور مستقل لالہ کے پاس ہی تھی۔ اس روز لالہ کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ وہ اس کے بیڈ کے پاس بیٹھی اسے سوپ پلا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی۔

کسی نرس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا تیز قدم اٹھاتا شہر یار بیڈ نمبر چار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس کی مریم نے شور مچایا ہوا تھا۔

”شہر یار۔“ اس نے دوبارہ سراٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ بلاشبہ شہر یار ہی تھا اگرچہ اس کی رنگت کچھ سائولی ہو رہی تھی اور وہ کچھ کمزور لگ رہا تھا لیکن وہ اسے پہچان سکتی تھی۔ اس کا دل شیراز سے دھڑک اٹھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے سر جھکا لیا اور رخ بدل لیا تاکہ شہر یار کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔

”اور نہیں مریم۔“

لالہ لیٹ گئی تو وہ سوپ کا پیالہ میز پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”لالہ! میں ذرا واش روم تک جا رہی ہوں ابھی آتی ہوں۔“

وارد سے باہر اسے نرس مل گئی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ”کیسی طبیعت ہے اب لالہ کی؟“

لالہ اپنے مزاج کی وجہ سے سب میں بے حد مقبول ہو گئی تھی۔

”بہتر۔“

”ڈاکٹر راؤ غڈ برآ چکے ہیں۔“

”ڈاکٹر احسن تو نہیں ہیں کوئی اور ہے۔“

”ڈاکٹر شہر یار ہوں گے۔ وہ دو ہفتے کی چھٹی پر تھے۔ آج ہی آئے ہیں۔ ان کی تشخیص بہت صحیح ہوتی ہے۔“

”تو ڈاکٹر شہر یار یہ تم ہی تھے۔ محبتوں کے داعی اور جان نیک سے گزر جانے کا عہد کرنے والے۔“

وہ یکا یک بہت ہی بدگمان ہو گئی اور اس نے سوچا اگر ڈاکٹر شہر یار سے سامنا ہو گیا تو وہ اس سے کبھی

بات نہیں کرے گی اور یہاں رہ کر یہ ممکن نہیں تھا کہ ڈاکٹر شہر یار سے سامنا نہ ہو۔

”سنو۔“ کچھ دیر بعد جب وہ واپس وارڈ میں آئی تو شہر یار راؤ غڈ کر کے واپس جا چکا تھا اور لالہ بیڈ پر

چمکی آنکھوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

”تم ڈاکٹر شہر یار کو دیکھ کر بھاگی تھیں نا۔“

”ہاں۔“ مریم نے اقرار کیا ”تم نے میرے متعلق بتایا تو نہیں؟“

”وہ میرے بیڈ تک آئے ہی نہیں۔ وہیں سے چلے گئے لیکن میں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ چلو اچھا ہوا

اب دوبارہ بات ہو جائے گی۔ کم از کم میں تمہاری پریشانی سے آزاد ہو جاؤں گی۔“

”خبردار میرے متعلق کوئی بات مت کرنا شہر یار سے اور یہ کیا میں کوئی بچی ہوں کہ تم میرے لیے

پریشان رہتی ہو۔“

”ہاں بچی ہی ہو۔“ لالہ قہقہہ لگا کر ہنسی ”پتا ہے جب ڈاکٹر نے پہلی بار مجھے بتایا کہ مجھے شک ہے کہ

کہیں آپ کو لنگو کیسرنہ ہو تو سب سے پہلے مجھے تمہارا ہی خیال آیا تھا کہ.....“

”تم بہت بے درد ہو لالہ۔“ مریم نے غم آنکھوں سے اسے دیکھا ”کتنے آرام سے اپنی بیماری کا ذکر

کرتی ہو۔“

”تو اس میں بے دردی کی کیا بات ہے۔ ویسے چہرے پر اتنے رنگ کیوں آ رہے ہیں۔“ لالہ شوخ

ہو رہی تھی۔

”فضول نہیں لالہ مجھے اب اس شخص سے کوئی سروکار نہیں۔“

”آدمی کو چانس تو دینا چاہیے نا۔“

”تم نے اعزاز کو چانس دیا تھا۔“

”ہاں۔ میں نے تو کئی خط لکھے تھے۔ فون پر میج دیا تھا..... اور..... اور یہ کہ اعزاز بے وفائیں ہے اس

لیے ممکن ہے شہر یار بھی بے وفانہ ہو۔“

”کیا!“ مریم کو حیرت ہوئی۔

”اعزاز بے وفائیں ہے۔ اسے میرے خط نہیں ملے تھے اور نہ میرا میج۔“

لالہ سنجیدہ ہو گئی ”چند دن پہلے اس کا فون آیا تھا مسز ارباب کے آفس میں۔ میں نے تحسین کو وہی نمبر

دیا تھا۔ دراصل تحسین کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا تو وہ اپنے گاؤں چلا گیا اور واپس آ کر اسے خیال ہی

نہیں رہا جس روز اعزاز نے فون کیا تھا اس روز اچانک تحسین کو میرے فون کا خیال آ گیا اور اس نے اعزاز

کو بتایا کہ ایک بار لالہ کا فون آیا تھا اور اس نے نمبر بھی دیا تھا..... اور۔“ وہ سانس لینے کو رکھ کر ”اعزاز نے

اس سے نمبر لے کر اسی وقت مجھے فون کیا۔ وہ بے چین ہو رہا تھا اور اسی روز کی فلائٹ سے کراچی آنا چاہتا

تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔“

”کیوں تم نے اسے کیوں منع کیا؟“

”اب منع ہی کرتا تھا نا۔ پھر بھی مجھے پتا تھا وہ آجائے گا اس لیے میں نے مسز ارباب سے اور سب

پہری قبروں کی طرح۔“

اس کا سانس بکھرنے لگا تو مریم نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا ”ریلیکس لالہ“ کچھ دیر آرام کر لو تمہارا سانس خراب ہو رہا ہے۔“

”اچھا۔“

شاید وہ خود بھی تھک گئی تھی اس لیے آنکھیں موند کر لیٹ گئی اور کچھ دیر بعد سو گئی۔ مریم نے اسے آواز دے کر دیکھا اور پھر اٹھ کر باہر آگئی۔ اس کا دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔

”کیا اعزاز کی طرح شہر یار کو بھی میرا خط نہیں ملا ہو گا یا.....“ سر جھکائے وہ باہر لان کی طرف جاری تھی کہ کارڈ یو کی طرف سے آتے شہر یار کی نظر اس پر پڑی۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں لگا جیسے کائنات کی گردش ختم ہو۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے وہ اتنی تیزی سے اس کی طرف بڑھا جیسے پلک جھپکنے میں وہ غائب ہو جائے گی۔

”مریم..... مریم۔“ اس کے پیچھے آکر اس نے بے چینی سے آواز دی۔

مریم نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔

”مریم..... یہ تم ہوتا۔ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔“

”شاید خواب ہی ہے۔“ بے حد آہستگی سے جواب دے کر اس نے چہرہ موڑ لیا اور چلنے لگی۔

”مریم۔“ شہر یار کے لیے میں از حد حیرانی تھی ”اتنی اجنبی کیوں بن رہی ہو۔ کہاں کھو گئی تھیں۔ کتنا تلاش کیا ہے تمہیں جب سے پاکستان آیا ہوں تب سے ایک ایک چہرہ اس خیال سے دیکھتا ہوں کہ کہیں یہ تم ہی نہ ہو۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”جو راستے اپنے نہ ہوں ان پر چلنے سے فائدہ ڈاکٹر شہر یار۔ ہمارے راستے تو الگ ہو چکے۔“

”نہیں۔“ شہر یار نے تڑپ کر اسے دیکھا ”ہمارے راستے ایک تھے ازل سے اور ایک ہی رہیں گے۔“ وہ دونوں چلتے چلتے باہر لان میں آگئے تھی۔

”مریم۔“ شہر یار کا لہجہ بے حد نرم اور ملائم تھا ”چلو بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔ تم مجھ سے اتنی بدگمان کیوں ہو..... اتنی خفا کیوں ہو۔ اب جبکہ میں مایوس ہو رہا تھا اچانک تمہیں دیکھ کر میری جو کیفیات ہوئی ہیں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ مریم مجھ سے پوچھو کہ میں نے یہ سارے دن تمہارے بغیر کیسے گزارے ہیں۔ کس کس طرح تمہیں یاد کیا ہے۔ تمہارے تصور سے باتیں کی ہیں اور تم اپنے متعلق بتاؤ تمہارے ساتھ کیا بیتی۔ تم نے اچانک گھر کیوں چھوڑ دیا۔ یقین کر دو موی جب یعنی نے مجھے بتایا کہ تم اپنی ماما سے خفا ہو کر کہیں کسی دوست کے پاس چلی گئی ہو تو میں تڑپ اٹھا اور اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر پاکستان چلا آیا اور تب سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔“

سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ آئے تو اسے کہہ دیجیے گا کہ میں جاب چھوڑ کر جا چکی ہوں۔ خود میں نے تین دن کی چھٹی لے لی تھی اور پتا ہے۔“ ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھڑ گئی ”وہ اگلے ہی دن آ گیا تھا۔ مزار باب نے مجھے بتایا تھا وہ بہت اب سیٹ اور دھکی لگ رہا تھا لیکن انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ میں ان کی جاب چھوڑ کر دوسرے شہر جا چکی ہوں۔“

”تم نے اچھا نہیں کیا لالہ۔“

”شاید میں نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ اچھا کیا ہے۔“

”لالہ۔“ مریم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”فارگا ڈیسک لالہ اسے بلوالو۔ می ڈیڈی کو بھی نہیں بلاتی ہو۔ کوئی تو ہولالہ ہمارے پاس جو.....“

”نہیں مریم میں اسے کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی ممکن ہے وہ اس آزمائش میں پورا نہ اتر سکے اور میں اس خوشی سے محروم ہو جاؤں جو اس کے اس طرح آنے سے مجھے ہوئی ہے۔ میں اس احساس کے ساتھ اس یقین کے ساتھ مرتا جا رہی ہوں کہ اس نے سچ سچ مجھ سے محبت کی اور.....“

”پلیز لالہ خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ابھی ڈاکٹر ز نے ہم سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ ابھی تو وہ خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچے اور.....“ مریم کی آواز بھرا گئی تو اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”خیر۔ میں اسے آزمانا نہیں چاہتی۔ تمہیں نہیں معلوم میں کتنی خوش ہوں۔ کتنی زیادہ۔“ اس کے زرد چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی ”اور پتا ہے مزار باب بھی بڑی مکار بڑی چالاک ہیں انہوں نے اعزاز سے سب کچھ پوچھ لیا میرے متعلق ایک ایک بات اور یہ کہ میں میڈم نرسنگ کی بیٹی ہوں۔ حیرت سے ان کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ اعزاز کے آنے کے بعد تو میں صرف چند دن ہی کام پر گئی ہوں اور چند دنوں میں کئی بار مزار باب مجھ سے سواری کر چکی ہیں کہ وہ جو کبھی بکھارا ان سے زیادتی ہو جاتی تھی اس کا خیال نہ کروں اور می کو ان کے اور ان کے بوتیک کے متعلق کچھ نہ بتاؤں۔“

”یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی کی طرح دھیمی ہو گئی تھی۔

”کہاں کمزوریوں کو دبایا جاتا ہے۔ اکیلے اور تنہا لوگوں کو غلام بنایا جاتا ہے اور طاقتوروں کے آگے سر جھکا یا جاتا ہے۔ اگر موی کو پتا چلے کہ کس طرح مزار باب نے مجھے زنجیر کیا ہے اور کیسے..... تو وہ تو ان۔“

بوتیک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔“

وہ پھینکی ہی پھینکی ہوتی۔

”لیکن میں نے مزار باب سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں ان کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔“

”بعض لوگ ایسے کیوں ہو۔ تے ہیں مریم۔ باہر سے چپکتے دکتے اور اندر سے گھٹاؤنے“ کریہہ سفیدی

”اب کیا ہو گیا ہے؟“

”اب تو اور بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ شہر یا راب تو نہ میرا کوئی گھر ہے نہ پیمان۔“

”پاگل پنے کی باتیں مت کر دموں۔“ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے ڈانٹا ”تمہارا گھر ہے“

تمہاری ماما ہیں..... انہوں نے شادی کر لی تو کیا ہو گیا۔ اتنی سی بات پر تمہیں اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے

تھا..... وہ بہر حال تمہاری ماما ہیں۔ مجھے تم سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔“

”آپ کو شہر یا راب سب کچھ نہیں معلوم بات صرف ماما کی شادی کی نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہے مجھے بتاؤ سب کچھ۔ پاگل لڑکی پتا نہیں کیا کچھ کرتی پھر رہی ہو۔“ اس نے بے حد اپنائیت

سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں اب شروع ہو جاؤ۔“

اور مریم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

”ہوں، پھر بھی تمہیں گھر سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ عاشری وغیرہ کو بھی سمجھانا چاہیے تھا۔ الٹا تم ان کے لیے

گھر چھوڑ کر چلی آئیں اور شاید یہی وہ چاہتے تھے۔ خیر۔“ اس نے ہولے سے سر جھٹکا ”جو ہوا سو ہوا۔ کیا

اب تم اپنے ڈیڈی کے پاس ہو۔ کیا وہ یہاں کراچی میں رہتے ہیں؟“

”نہیں میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ شخص کون ہے کہاں رہتا ہے۔“

”کیا تم نے پوچھا نہیں ماما سے؟“

”پوچھا تھا لیکن ماما نے ٹال دیا۔“

”پھر اب تم یہاں کس کے پاس رہ رہی ہو؟“

”لالہ کے پاس۔“

”لالہ کے پاس؟“ شہر یا راب کو حیرت ہوئی۔

”وہ یہاں کیسے؟“

تب اس نے لالہ کے ساتھ اپنے آنے کی تفصیل بھی اسے بتا دی۔

”ہوں۔“ شہر یا راب چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا ”اب تم میرے ساتھ گھر چلو اور یہ جاب وغیرہ

چھوڑ دو اور لالہ کو بھی ساتھ لے چلو۔ تم دونوں انتہائی بےوقوف لڑکیاں ہو۔“

”نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”کیوں؟“ شہر یا راب کو حیرت ہوئی۔

”شہر یا راب کیا آپ کے بابا اور ماماں ایک ایسی لڑکی سے آپ کی شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں

گے جس کو اپنے حقیقی باپ کا علم نہیں اور جو ایک نجی ہاسٹل میں رہتی ہے اور بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے جبکہ

وہ بے حد دل گرفتگی سے کہہ رہا تھا۔ مریم نگاہیں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

”میں نے تمہیں کہا تھا کہ کوئی مشکل پڑے تو مجھے آواز دے لینا پکار لینا، لیکن تم نے مجھے پکارا ہی

نہیں آواز ہی نہیں دی مجھ پر اعتبار ہی نہیں کیا۔“

”پکارا تو تھا۔“ مریم نے نگاہیں جھکائے کہا ”خط لکھا تھا بلا دیا تھا۔“

”خدا گواہ ہے مریم۔ مجھے تمہارا خط نہیں ملا۔ اگر تمہارا خط مل جاتا تو میں یوں خوار نہ ہوتا پھرنا۔ پوچھ

لے نا یعنی سے۔“

مریم خاموش رہی۔

”کیا..... کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔ مریم کیا تم اتنا بدل گئی ہو۔“

شہر یا راب بے حد دکھی ہو رہا تھا۔ مریم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ سچ بول

رہے تھے۔

”مریم ادھر دیکھو میری آنکھوں میں تمہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔“

مریم کی نظریں جھٹک گئیں۔

اتنی تپش تھی اس کی آنکھوں میں۔

اتنی اپنائیت اور اتنی محبت کہ دل اس کی طرف سے ایک دم صاف ہو گیا۔

”آپ ٹھیک تو رہے۔“ ایک مدہم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

”شکر ہے کہ تم..... تمہارا لہجہ تو بدلا سچ بتاؤ مریم کیا تم اس لیے خفا تھیں کہ میں نے تمہارے خط کا

جواب نہیں دیا۔“

مریم نے سر ہلایا۔

”جھٹک گاؤ کہ کوئی اور بات نہ تھی۔ میں..... میں تمہیں سچ کس طرح بتاؤں کہ تمہیں اچانک دیکھ کر

میری کیا کیفیات ہیں۔ لگتا ہے جیسے میرے ارد گرد موجود کائنات کی ہر چیز رقص کر رہی ہو۔ اف اوہ کاش“

میں شاعر یا ادیب ہوتا تو تمہیں اپنے دل کی کیفیت بتاتا اور تم..... تمہارا روکھا روکھا رویہ مجھے یوں لگا جیسے

میں سب کچھ لٹا بیٹھا ہوں۔ کھوچکا ہوں تمہیں۔“

وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

”کھو تو چکے ہیں۔“ مریم نے بے حد ہستکی سے کہا۔

”نہیں غلط میں نے تمہیں کبھی نہیں کھویا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ تم ہمیشہ میرے پاس ہی رہی

ہو..... میرے دل میں میرے اندر..... اور..... میں تمہیں بتاؤں بابا مان گئے ہیں۔“

”مگر اب.....“ مریم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

آپ کے ماموں صرف اتنی سی بات پر ہی کہ ماما ایک ماڈل گرل ہیں اس رشتے سے انکار کر چکے تھے اب.....“

”اچھا فضول باتیں نہ کرو۔ یہ میرا مسئلہ ہے ان کا نہیں..... اور میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اگر کبھی تمہیں میری ضرورت ہوئی تو میں سب زنجیریں توڑ دوں گا تو..... تمہیں میری ضرورت ہے۔ اوکے سمجھ میں آیا۔“

مریم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کھڑی ہو گئی ”لالہ گھبرا گئی ہوگی۔“

”کیا لالہ یہاں داخل ہے۔ کیا ہوا ہے؟“ شہر یار نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اسے۔“ مریم کی آواز میں آنسو گھل گئے ”معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر کا خیال ہے کہ شاید لنگو کینسر ہے۔“

”اوہ نہیں۔“ شہر یار کوشاک لگا۔

”ابھی صبح طرح سے مرض کی تشخیص..... تو نہیں ہوئی لیکن وہ ٹھیک نہیں ہے شہر یار۔“

شہر یار نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا ”کم آن۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آیا تو لالہ سو رہی تھی۔

”اوکے میں کچھ دیر تک آتا ہوں۔ مچی کلینک میں بھی میرے کچھ مریض ہیں انہیں دیکھ آؤں اور لالہ کس ڈاکٹر کے زیر علاج ہے؟“

”ڈاکٹر احسن نے ہی پہلے داخل کیا تھا۔ ویسے دیگر ڈاکٹر زبھی آتے رہتے ہیں۔“

”اوکے ڈاکٹر احسن سے ڈسکس کرتا ہوں لالہ کا کیس۔ بھاگ نہ جانا کہیں۔“

جاتے جاتے اس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا لیکن جواباً مریم مسکرا نہ سکی۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا وارڈ سے باہر نکل گیا۔ مریم کا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اتنی اپ سیٹ کیوں تھی شاید وہ ابھی بھی بے یقین تھی۔

”خیر۔“ وہ آپوں آپ مسکرایا ”میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے منایا جا سکتا ہے۔ آج ہی بابا کو فون کر دوں گا کہ وہ اور ماں جی فوراً آ جائیں۔“

مریم اس کے جانے کے بعد لالہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”لالہ۔“ اس نے آہستہ سے پکارا لیکن وہ بے خبر سو رہی تھی۔

اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اعزاز کی طرح شہر یار بھی اپنی محبتوں میں سچا ہے اور لالہ کو کس قدر خوشی ہوگی یہ جان کر اور کیا وہ بھی خوش ہے۔

اس نے اپنا دل ٹٹولا لیکن وہاں ابھی تک تاریکی اور اندھیرا تھا۔

”راستے اسی طرح پر خارا ہیں شہر یار بلکہ اب تو اور بھی مشکل ہو گئے ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”اور ہمارے راستے الگ ہیں، کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اب تو میں بالکل ہی بے سائبان ہو گئی ہوں۔“

”کاش..... اے کاش پاپا کبھی نہ مرتے۔“ آنسو اس کی آنکھوں میں چلنے لگے تو اس نے زور سے آنکھیں پٹی لیں۔

”ہیلوس۔“ ڈاکٹر احسن وارڈ میں آتے ہی سیدھے لالہ کے بیڈ کی طرف آئے تھے۔

”جی سر، السلام علیکم۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”علیکم السلام۔“ ڈاکٹر احسن نے سر ہانے سے اس کی فائل اٹھائی اور دیکھنے لگے ”بھی یہ ٹیسٹ بہت

ضروری ہیں آپ جلدی کروائیں۔ ان کے لیے آپ کو آغا خان جانا پڑے گا۔“

”جی ذرا لالہ کی طبیعت ٹھیک ہو تو پھر۔“

”یہ اب کافی بہتر ہیں آپ ان کو لے جاسکتی ہیں لیکن پلیز، یہ ٹیسٹ لازمی ہیں۔ ٹیسٹ کروانے کے

بعد رپورٹ مجھے دیں۔“

”تو کیا میں کل جاسکتی ہوں سچ۔“ لالہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاید وہ جاگ گئی تھی۔

ڈاکٹر احسن نے مسکرا کر اسے دیکھا ”آپ کیسی ہیں؟“

”فائن سر۔“

”گڈ گرل۔“ ڈاکٹر احسن کی آنکھوں میں تحسین تھی ”ہر مریض کو آپ جیسا ہونا چاہیے حوصلہ مند۔“

”میں درحقیقت آپ کی قدر کرتا ہوں۔“

”تھینک یو ڈاکٹر۔“ لالہ مسکرا دی ”تو اب ہم جائیں؟“

”ضرور شو یو گڈ لک۔“

”چلیں مریم۔“ اس نے مریم کی طرف دیکھا جو متذبذب سی بیٹھی تھی۔

”اگر تمہاری طبیعت پھر خراب ہو گئی تو؟“

”میری طبیعت کی خرابی کا تو بہانہ ہے۔ یہ کہو ڈاکٹر شہر یار کا انتظار ہے۔ چلو جانے سے پہلے ملاقات

کر لیتے ہیں۔“

”ملاقات تو ہو گئی۔“

”اچھا کیا فرماتے ہیں؟“

”لالہ کیا تم واقعی بہتر محسوس کر رہی ہو؟“ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ لالہ نے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکا کر ”جلدی کر دو ورنہ اگر آگیا نا لے جے منہ والا ڈاکٹر تو اس

نے نہیں جانے دینا۔ وہ تو صبح بھی کہہ رہا تھا کہ ابھی دو تین دن اسپتال ہی میں رہیں۔“

مریم خاموشی ہی کھڑی ہو گئی اور سائنڈ کیبنٹ سے اپنی چیزیں سنبھالنے لگی۔

”تم ڈارکو میں حساب کلیر کر آؤں.....“

”نہیں اکٹھے چلتے ہیں۔ تم حساب کلے کرنا میں ذرا ڈاکٹر شہریار سے ملوں گی۔“
”ذرا اپنا پتا کرا جائیں نا۔“

مریم نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سامان اٹھایا۔ باہر کوریڈور میں آکر لالہ نے پاس سے گزرتی ایک نرس سے ڈاکٹر شہریار کا پوچھا۔

”ڈاکٹر شہریار۔“ نرس نے سر اٹھا کر لالہ کو دیکھا ”کہاں ہوتا ہے بھی ڈاکٹر روماکے کمرے میں ہوں گے۔“

پھر وہ اپنی ساتھی نرس کی طرف دیکھ کر کہی ”یہ ڈاکٹر شہریار اور روماکے آخر تک شادی کریں گے؟“
”تمہیں کیوں اتنی بے چینی ہے۔“ دونوں باتیں کرتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئیں۔
لالہ نے مریم کے چہرے کی طرف دیکھا جس کے چہرے کی رنگت اچانک مائل پڑ گئی تھی اور خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی اور ادائی کر کے وہ دونوں باہر نکل آئیں۔



مسز علی کو لالہ کے متعلق بتاتے ہوئے مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”وہ... بہت زیادہ بیمار ہے مسز علی اور اتنی بے پروائی کر رہی ہے۔“

”تم پریشان نہ ہو مریم، انشاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا اور آغا خان میں میرے چھوٹے بھائی ہیں سرجن ہیں۔ ابھی حال میں اسپتال نر کر کے آئے ہیں۔ میں ان کو فون کر دوں گی۔ تم لالہ کے ساتھ جانا وہاں ٹیٹ وغیرہ کے سلسلے میں وہ تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔“

”لیکن لالہ کہتی ہے وہاں... وہاں کے اخراجات کے ہم قائل نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ۔“ مریم ایک لھر کی اور پھر اس نے مسز علی کو لالہ کے متعلق بتا دیا ”اور آئی نرس کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ کیا ہیں۔ وہ تو فوراً لالہ کو باہر لے جائیں گی۔“

”مریم! ایک بات کہوں تم سے؟“

”جی مسز علی! آپ کہیں۔“

”تم لالہ کی کمی کو فوراً اس کی بیماری کی خبر کر دو۔ دیکھو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ کیا خبر... انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مریم کی طرف دیکھا ”وہ اتنی دولت مند ہیں کہ لالہ کو کہیں بھی لے جاسکتی ہیں اس کا علاج بہترین ڈاکٹر ز سے کروا سکتی ہیں۔“

”مگر وہ لالہ۔“ مریم نے ان کی طرف دیکھا۔

”یہ جھوٹی انا میں بہت خوار کرتی ہیں۔ لالہ محض اپنی انا کی خاطر اپنی مٹی کو بھی اطلاع نہیں کرنا چاہتی۔“

”جی، میں لالہ سے بات کروں گی۔“

”لالہ تمہیں اس کی اجازت نہیں دے گی۔ یہ تمام کام تمہیں خود کرنا ہے، اسے بتائے بغیر۔“

”جی، آپ اپنے بھائی کو فون کر دیں گی نا؟“

”میں ابھی بات کرتی ہوں زیر سے۔“

مسز علی اٹھ کر چلی گئیں تو وہ بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہ آج کئی دن بعد آئی تھی اور مسز علی کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کی روم میٹ لالہ بیمار ہے۔ لالہ اسپتال سے تو آگئی تھی لیکن اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ اسے سانس لینے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ آج بھی نہیں آنا چاہتی تھی لیکن لالہ نے اسے زبردستی بھیجا تھا۔

”دیکھو مریم ڈیر! اگر تمہاری ٹیوشن بھی ختم ہو گئی تو ہاسٹل کا کرایہ کہاں سے ادا کریں گے۔ میں بھی نہیں جا رہی۔“

تب آئی اور ساجد کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ چلی آئی تھی۔

”ارے تم نے فون کر دیا ہوتا میں گاڑی بھیج دیتی۔“

مسز علی بہت مہربان اور شفقت تھیں۔ وہ دل ہی دل میں ان کی بہت ممنون تھی۔

”دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔“ اس نے سوچا تھا اور واقعی مسز علی بہت اچھی اور شفقت تھیں۔ جب وہ جا رہی تھیں تو انہوں نے اسے تاکید کی۔

”لالہ صبح ضرور لے کر جانا، میں نے زیر سے کہہ دیا ہے۔ تم سیدھی اسی کے پاس چلی جانا۔“

”جی شکریہ مسز علی۔“

”جتنے بھی ٹیٹ ہیں کروالو اور ادائی کی فکر نہ کرنا، میں نے زیر سے کہہ دیا ہے۔“

”تھینک یو مسز علی، میں انشاء اللہ بہت جلد یہ رقم آپ کو لوٹا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“

اس رات وہ بستر پر لیٹی تو دیر تک مسز علی کے متعلق سوچتی رہی۔ پھر اسے شہریار کا خیال آیا۔

اور ڈاکٹر روماکے۔

جانے کون تھیں۔ شاید بہت خوب صورت ہوں گی۔ تب ہی تو شہریار ان سے شادی کرنے والا تھا۔

لیکن... اسے اپنے ساتھ شہریار کی گفتگو یاد آئی۔

”اور یہ مرد بڑے دوغلے ہوتے ہیں، ان کا کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

میڈم ہرگس ماما سے کہا کرتی تھیں۔

اور میڈم ہرگس کے متعلق سوتے ہوئے اسے مسز علی کی تاکید یاد آئی۔ اس نے آہستہ سے لالہ کو آواز دی۔

”ہوں۔“ لالہ نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا۔

”لالہ تم اتنی بیمار ہو، ہمیں آئی کو بتادینا چاہیے۔“

”کیوں تھک گئی ہو میری بیمار داری سے۔“

”لالہ۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ”مجھے تم سے ایسی فضول باتوں کی امید نہیں تھی۔“

”دیکھو مریم۔“ لالہ نے سنجیدگی سے کہا ”اگر کبھی مر بھی جاؤں تو میری کومت بتانا خاموشی سے مجھے دفن کر دینا تاکہ میری سبھی سبھی رہیں کہ میں ڈیڑی کے پاس ہوں اور ڈیڑی کے کسی بھتیجے سے شادی کر کے خوشگوار زندگی گزار رہی ہوں۔ پتا ہے میں نے بہت پہلے ایک خط لکھا تھا کہ ڈیڑی میری شادی اپنے کسی بھتیجے سے کر رہے ہیں جو امریکا میں ہے۔“

اس نے اندھیرے میں لالہ کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن لالہ کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ شاید رو رہی تھی۔

”لالہ تم رو رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ مریم مجھ سے ناراض تھیں مریم؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ مریم نے اسے یقین دلایا۔

”پھر بھی میں نے انہیں دکھ تو دیا نا اور مزید دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ پتا ہے مریم ماں باپ ہمارے لیے اپنی طرف سے اچھا اور بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی ان کے فیصلے ہمارے دلوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔“ مریم نے اگر یہ سوچا تھا کہ اعزاز میرے قابل نہیں ہے تو ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ صحیح کہتی تھیں تاکہ جتنی اس کی تنخواہ ہے اتنا میرا ایک دن کا خرچ بھی نہیں ہے اتنے روپوں کا تو میں ایک جوڑا جوتا خرید لیا کرتی تھی لیکن یہ دل..... یہ دل آدمی کو کتنا خوار کرتا ہے..... مجھے اعزاز اچھا لگتا تھا۔ اس کی بے نیازی متاثر کرتی تھی۔

اس کی بے رخی پسند آتی تھی۔

اس کا کھردارہ پن

اس کے لہجے کی تلخی

اس کے چہرے کے ناراض نقوش

سب مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے تھے مریم۔“

”اور پھر مریم اس سے دوستی ہوئی تو اس کی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ وہ میری سے خفا رہتا تھا اس لیے کہ اس کے خیال میں میری نے اس کے بھائی کو ان سے چھین لیا تھا اور مجھے میری سے گلہ تھا کہ وہ مجھے دقت نہیں دیتیں۔ میں سارا دن اکیلی اتنے بڑے گھر میں پاگل ہونے لگتی تھی اور پھر دونوں چھوٹوں کو بھی مری بھیج دیا تھا۔

یوں ایک مشترک دکھ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔ وہ میری کے خلاف بولتا تو میں اس کی تائید کرتی۔ ٹھیک ہے اگر میری اس کے بھائی سے شادی نہ کرتیں تو شاید میرے ڈیڑی ہمارے ساتھ رہتے۔ پھر شاید میری مجھے اس طرح نظر انداز نہ کرتیں۔ میں یوں ہی سوچا کرتی تھی مریم اور پھر پتا نہیں کب کیسے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اعزاز سے محبت کرنے لگی ہوں..... بہت شدید محبت اور اعزاز نے بھی ایسا ہی محسوس کیا۔

اور یہ کتنی عجیب بات تھی مریم کہ وہ میری کو پسند نہیں کرتا تھا اور میری محبت میں ملوث ہو گیا تھا۔

میں جو میری کی بیٹی تھی.....“

اس کا سانس الجھنے لگا تو مریم نے پیار سے اسے ٹوکا۔

”لالہ پلیز زیادہ باتیں نہ کرو۔ دیکھو تمہارا سانس خراب ہو رہا ہے۔“

”پتا نہیں اچانک میرے ساتھ یہ کیا ہو گیا ہے۔ شاید مجھے میری کا دل دکھانے کی سزا ملی ہے..... ہے نا۔“

”اور کیا اسے بھی کوئی سزا ملے گی۔ کیا اس نے بھی اس طرح سے ماما کا دل دکھایا ہے۔ نہیں بلکہ ماما نے خود ہی انہیں گھر سے چلے جانے کو کہا تھا۔“

”مریم۔“ لالہ نے اسے پکارا تو وہ چونک پڑی۔

”کیا بات ہے لالہ سو جاؤ۔ تھک جاؤ گی۔“

”نہیں صرف ایک بات مریم کیا تم بھی سین کی طرح سمجھتی تھیں کہ میں.....“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“

”مسز ارباب لڑکیاں ضرور سپلائی کرتی تھیں لیکن وہ اپنی کارکن لڑکیوں کو ان کی مرضی کے خلاف استعمال نہیں کرتی تھیں۔ ہاں وہ ان کی رازدار ضرور ہوتی تھیں..... اور میں انجانے میں مسز ارباب کے بہت سے رازوں سے واقف ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے مجھے پابند کر دیا تھا کہ میں کہیں نہ جاؤں اور یہ جو میں ان دو تین ماہ میں اکثر لیت آئے لگی تھی نا تو اس کی دو وجوہات تھیں۔

ایک تو یہ کہ ان دنوں مسز ارباب کے بھائی یہاں نہیں تھے اور وہ کئی جگہوں پر مجھے ساتھ لے جانے لگی تھیں اور دوسرے یہ کہ کبھی کبھار میری طبیعت اتنی خراب ہو جاتی تھی کہ ڈاکٹر کو اسے سبجین لگانی پڑتی تھی۔ بہت شفیق اور مہربان ڈاکٹر تھا۔ کسی دن اس کا شکریہ ادا کرنے چلیں گے۔“

”او کے لالہ۔ صبح ہم آغا خان جائیں گے مسز علی نے اپنے بھائی سے بات کر لی ہے۔“

”کیا فائدہ مجھے علم ہے کہ میں.....“

”اب فضول کوئی بات مت کرنا۔“ مریم نے اسے ڈانٹا ”اور سو جاؤ اب ورنہ طبیعت زیادہ خراب ہو

جائے گی۔“

”اچھا۔“ لالہ نے کہا لیکن کچھ دیر بعد پھر اسے آواز دی ”مریم ادھر میرے پاس آ جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اچھا۔“ مریم اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا ”دیکھو میں تمہارے پاس ہوں تم آرام سے سو جاؤ۔“ وہ اس کے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرنے لگی۔

”مریم! مرد بہت کمزور ہوتا ہے۔“ ممی کہتی تھیں۔

”شہر یا رہی مرد ہے یہ ممکن ہے تمہاری عدم موجودگی میں وہ کسی اور ڈاکٹر روم میں اوالو ہو گیا ہو لیکن اب اگر وہ تمہیں پر پوز کرے تو تم انکار مت کرنا۔“

”اچھا ٹھیک ہے پلیز اب سو جاؤ۔“ اس نے ننھے بچوں کی طرح اسے بہلایا۔

”اچھا۔“ لالہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں اور اس کے پاس لیٹے ہوئے مریم ہونٹ بھیچے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن آنسو تھے کہ اندے چلے آ رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ بے آواز دعا کرنے لگی.....

صبح لالہ کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ اس نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن مریم نے اس کی ایک نہ سنی اور آٹنی کو ساتھ لے کر وہ آغا خان اسپتال پہنچ گئی۔ آٹنی بھی بہت تعاون کر رہی تھیں اور لالہ کے لیے خاصی پریشان تھیں۔ جب جس وقت بھی ضرورت ہوتی، وہ اپنی گاڑی لے کر آ جاتیں۔

ڈاکٹر زبیر بہت اچھی طرح ملے اور انہوں نے پوری ہیلپ کی۔ خود انہیں ساتھ لیے لیے پھرتے

رہے۔

لالہ کے کچھ بلڈ ٹیسٹ اور ایک انکسیرے ہوئے تھے ”ان کی پوری رپورٹس دیکھنے کے بعد باقی ٹیسٹ ہوں گے۔“ انہوں نے مریم کو بتایا اور تسلی دی ”ویسے پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔“

”بھئی ایسا سمارٹ اور شاندار شخصیت والا ڈاکٹر ہو تو مریض کا آدھا مرض رہ جاتا ہے۔ دیکھ لو میں خود

کو کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“

واپس پر لالہ شرات کے موڈ میں تھی۔ مریم کو کافی اطمینان سا ہو گیا تھا لیکن دو روز بعد مسز علی نے اسے بتایا ”لالہ کو لنگو کینسر ہے۔ ایک پیچھے پڑا بہت خراب ہو چکا ہے۔ ابتدائی رپورٹس تو یہی کہہ رہی ہیں۔ آپریٹ کرنا پڑے گا تاہم ابھی کچھ ٹیسٹ ہوں گے۔ تم فوراً زبیر سے رابطہ کرو اور میری مدد کی جب بھی ضرورت ہو بلا جھجک کہنا اور تم نے اس کی ممی کو اطلاع دی تھی؟“

”جی وہ ابھی نہیں۔“ بہت سارے آنسوؤں نے اس کا حلق بھیج دیا۔

”مریم! تم فوراً اس کی ممی کو اطلاع کر دو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر لالہ کو کچھ ہو گیا تو زندگی بھر پیچھتاؤ گی کہ تم نے اس کی ممی کو خبر کیوں نہیں کی۔ مریم! یہ ایسا مرض نہیں ہے کہ تم اسے کسی عام سی فزیشن سے

دوا لے کر دے دو۔“

”جی۔“

مسز علی صحیح کہہ رہی تھیں۔ وہ تو مزید ایک ٹیسٹ بھی انورڈ نہیں کر سکتی تھی..... اس کے پاس اس وقت صرف دوسرو پے تھے۔ آٹنی سے پہلے ہی وہ دو ہزار ادھار لے چکی تھی۔

”تم لالہ کی پروا نہ کرو۔ اس کی ممی آگئیں تا تو وہ خود ہی سب کچھ بھول جائے گی۔“ مسز علی نے اسے سمجھایا تو اس نے عہد کر لیا کہ وہ آج ہی آٹنی کو فون کر دے گی۔

”تمہیں اگر نمبر معلوم ہو تو یہاں سے ہی فون کر لو۔“

مسز علی کی پیشکش پر وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میڈم نرس گھر پر نہ تھیں۔ کسی ملازمہ نے اینڈ کیا تھا۔

”آٹنی گھر نہیں ہیں پھر بات کروں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن دیر مت کرنا۔“

”جی۔“

وہ بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی اور پڑھانے میں بھی اس کا جی نہیں لگ رہا تھا بچوں کا کام چیک کرتے ہوئے ان کی اغلاط کی طرف اس کا دھیان نہیں لگ رہا تھا اور نہ ہی اس نے انہیں انڈر لائن کیا تھا۔

”مس! یہ بھائی نے اسپینگ غلط کیے ہیں۔“ رومی نے کہا تو وہ چونک پڑی۔

”سواری! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا۔“

”تو پھر آج آپ چھٹی کر لیں۔“

اس نے کتاب بند کر دی۔

”ٹھیک یو۔“ اسے تیور یاد آ گیا ”لیکن آج پڑھ لو۔ کیا خبر کل نہ آ سکوں۔“

”کوئی بات نہیں آپ نہ ہوں تو امی! میں خود پڑھا دیتی ہیں۔ ہم وقت ضائع نہیں کرتے ہیں۔“

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

بے پناہ ذہین آنکھیں تیور کی طرح۔

”مریم! تمہارا فون ہے۔“ مسز علی نے اسے آواز دی تو وہ انہیں اسٹڈی میں چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

مسز علی ریسیور کریڈل پر ڈال رہی تھیں۔

”آٹنی کا فون آیا تھا۔ لالہ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اور وہ لوگ اسے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔

اسی اسپتال میں جہاں پہلے لے جایا جاتا تھا۔“

اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔

ہو کس قدر پریشان کیا تم نے مجھے۔ لگتا تھا پاگل ہو جاؤں گا۔ مریم۔
 ”پلیز۔“ مریم نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا ”پھر کبھی بات کریں گے۔“ اس کا انداز سراسر اجنبیت لیے ہوئے تھا۔ شہر یار نے اسے بے حد حیرت کے ساتھ دیکھا۔

”مریم۔ تم..... کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا کہ مجھے تمہارا خط نہیں ملا تھا۔ کیا اتنی بے اعتبار ہو گئی ہو تم۔ کیسے کس طرح یقین کرو گی میرا۔ کہو تو قرآن پر ہاتھ رکھ دوں مریم۔“

”قارا گاڈ سیک شہر یار میں اس وقت لالہ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“ مریم نے نرم لہجے میں کہا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لالہ آئی۔ سی۔ یو میں ہے۔ اور۔“

”او کے۔“ شہر یار نے ایک نظر اس پر ڈالی ”میرے ساتھ آؤ۔ ڈاکٹر احسن سے بات کرتے ہیں۔“

اور وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔



لالہ اسپتال میں ہی تھی اور آئی ٹی مل نہیں رہی تھیں۔ فی الحال جناح ہی میں تھی۔ کبھی وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی اور کبھی یک دم اس کا سانس اکڑ جاتا۔ یوں لگتا جیسے چند لمحوں کی مہمان ہو۔ شہر یار اس کا بہت خیال رکھ رہا تھا اور لالہ بھی شہر یار سے ضرور گپ لگاتی۔ مریم سارا دن اس کے پاس رہتی تھی۔ ہاں شام کو دو گھنٹے کے لیے مسز علی کے بچوں کو پڑھانے چلی جاتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں شہر یار فارغ ہوتا تو اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ اس روز اتوار تھا اور مریم کو پڑھانے... نہیں جانا تھا۔ وہ لالہ کے پاس بیٹھی آئی ٹی مرس کے متعلق سوچ رہی تھی کہ جانے وہ ملتان سے کب واپس آئیں گی۔ ملازم نے اسے بتایا تھا کہ وہ ملتان اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی ہیں اور ملتان کا کوئی رابطہ نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔

میڈم مرس کو اطلاع دینا از حد ضروری تھا۔ سب میڈیسن وغیرہ شہر یار لا رہا تھا اور اسپتال کا بھی جانے کتنے بل بن چکا تھا۔ ادھر ڈاکٹر زبیر نے کئی بار مسز علی سے کہلوایا تھا کہ وہ بقیہ ٹیسٹ بھی کروالے تاکہ حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس کا علاج شروع کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ تشخیص واضح ہو جانے کے بعد آپریشن لازم ہوگا اور وہ پریشان تھی کہ کیا کرے۔

”خدا کرے آئی ٹی جلدی ملتان سے آجائیں۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ الہ ناموشی سے آنکھیں بند کیے بیڈ پر لیٹی تھی۔ شہر یار وارڈ میں آتے ہی سیدھا اس کے بیڈ کے پاس آیا۔

”ہیلو۔“ اس نے باری باری مریم اور لالہ دونوں کو دیکھا۔

”ہیلو۔“ لالہ نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

”نہیں، نہیں، لیٹیں رہیں آپ پلیز۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لیٹنے کو کہا اور خود

مسز علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں اسے تسلی دی اور ساتھ ہی ملازم کو آواز دی کہ ڈرائیور سے کہے کہ گاڑی نکالے۔

”میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

”نہیں پلیز، آپ تکلیف نہ کریں۔“

”مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی ”پہلے بھی کئی بار لالہ کی طبیعت یوں ہی خراب ہو جاتی ہے اور پھر ڈاکٹر احسن وہاں جو ریٹ منٹ دیتے ہیں اس سے بہتر ہو جاتی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ کوئی بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔ تکلف نہ کرنا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور باہر آگئی جہاں ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

سین اور آئی سی اسے باہر ہی مل گئیں۔

”سین کیسی ہے لالہ؟“ اس نے بچپنی سے پوچھا۔

”فی الحال تو آئی سی یو میں لے گئے ہیں اور آکسیجن لگا دی ہے۔“ سین نے بتایا اور آئی ٹی کی طرف دیکھا۔

”اب مریم آگئی ہے تو میرا خیال ہے تم نہیں۔ مریم تم کو مگی نایاباں؟“

اس نے سر ہلادیا اس کی آنکھوں میں دھند آ رہی تھی۔ وہ وہیں پڑے ایک بیچ پر بیٹھ گئی۔

”بے چاری لڑکیاں۔“ آئی ٹی نے تاسف سے اسے دیکھا ”ان کا کوئی نہیں اپنا اور لالہ..... لالہ کتنی

خوش اخلاق! نہں کھو اور پیاری بچی ہے۔“ انہوں نے تاسف سے مریم کو دیکھا۔

”تم کہو تو میں رک جاتی ہوں۔“

”نہیں آئی ٹی، پلیز آپ جائیں۔ کوئی پرابلم ہوا تو میں آپ کو فون کر دوں گی۔“

”گھبرانا نہیں۔“ انہوں نے جاتے جاتے اسے تسلی دی۔

”تم یہاں اسکی نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔“ انہوں نے سین کی طرف اشارہ کیا۔

”جھینک یو آئی۔“ اس نے آنسو پینے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا اور سوچنے لگی پتا نہیں ڈاکٹر احسن

کہاں ہوں گے وہ ان سے جا کر لالہ کے متعلق بات کرے۔ اس کے متعلق پوچھے لیکن اسے لگا جیسے اس

کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے اور پتا نہیں لالہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کا دل بھرا آیا تھا اور وہ سر

جھکائے بیٹھی تھی۔

”مریم۔“ شہر یار نے اس کے بالکل قریب آ کر اسے آواز دی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ شہر یار

اس کے سامنے کھڑا ناراضی سے اسے دیکھ رہا تھا ”یہ تم اس روز بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ جاؤ

”پھر تمہارا یہ گریز یہ اجنبیت یہ سب کیا ہے مریم۔“ شہر یار نے اپنا رخ اس کی طرف کر لیا ”اتنے فاصلے کیوں پیدا کر لیے تم نے اپنے اور میرے درمیان۔ یہ سب تکلیف دہ ہے مریم۔“

”فاصلے تو خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔“

”ہاں لیکن اب تم ان فاصلوں کو ختم کرنے کے بجائے بڑھا رہی ہو۔“ اس کا لہجہ بدستور شکوے کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

”وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے ڈاکٹر شہر یار۔ زندگی کے اس سفر میں کچھ اور لوگ بھی تو آپ کے شریک ہو چکے ہوں گے اور کسی کو مایوس کرنا اچھی بات نہیں ہے..... اور پھر میرا آپ کا ساتھ تو یوں بھی غیر یقینی ہے۔ سو جن کی رفاقت یقینی ہو سکتی ہے انہیں کیوں دکھ دیا جائے۔“

شہر یار نے بے حد الجھ کر اسے دیکھا ”تم کیا کہہ رہی ہو مریم۔ تمہارا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ تم کن رفاقتوں کی بات کر رہی ہو۔ پلیز، کھل کر بات کرو۔“

”کھوں کھوں۔“ لالہ نے کھانسنے پر انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”لالہ پلیز۔ یہ تمہاری دوست مجھے پاگل کیے دے رہی ہے سچ میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔“

”ارے ڈاکٹر شہر یار آپ یہاں ہیں اور وہاں آپ کی تلاش ہو رہی ہے۔“ ایک بے حد خوب صورت اور نازک سی ڈاکٹر ہاتھوں میں سفید گاؤن ڈالے اسے پکارتی ہوئی لالہ کے بیڈ کے قریب آ گئی۔

”تو یہ ہیں ڈاکٹر روم، واقعی بہت خوب صورت ہیں۔“ مریم نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

”اور اگر زندگی کے سفر میں چلتے چلتے تھک کر شہر یار نے اس کی رفاقت چاہی تھی تو کچھ غلط تو نہیں کیا۔“

اچھا تو یہ تمہاری وہ رشتے دار ہیں جن کا تم بتا رہے تھے، کیسی ہیں اب؟“

”بہت بہتر۔“ شہر یار نے اس کی طرف دیکھا۔

”خیر بتائیے کیوں تلاش کیا جا رہا ہے۔“

”بھئی، وہ ادھر ڈاکٹر شہر یار سینئر اور ڈاکٹر روم کی بات پکی ہونے کی خوشی میں مٹھائی کھا رہی ہیں۔“

”کفر تو ناخدا خدرا کر کے، شہر یار کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔“

”وہاں سب نے ڈاکٹر شہر یار اور ڈاکٹر روم کو گھیر رکھا ہے اور کوئی بھی ڈنر سے کم پر راضی نہیں ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے ڈاکٹر عابدہ۔“

شہر یار اس سے بات کر کے لالہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ڈاکٹر شہر یار ہمارے سینئر ڈاکٹر ہیں اور روم ان کی کزن ہیں۔ بچپن میں متکفی ہو چکی ہے لیکن کچھ گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے شادی میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔“

مریم کا منہ تھوڑا سا کھلا اور پھر بے اختیار مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا۔ لالہ نے

اسٹول کھینچ کر بیڈ کے پاس بیٹھ گیا۔

عام وارڈ میں عام مریضوں کی طرح آنکھیں بند کیے لیٹی لالہ کو دیکھ کر اسے رافع اسپتال کا منظر یاد

آ گیا۔

وی آئی پی روم۔

میڈم نرس کا ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کرنا۔

ڈاکٹر رافع کی ڈانٹ ڈپٹ

اس کا دل لالہ کے لیے گداز ہونے لگا۔

”لالہ، کیسی طبیعت ہے اب؟“

”فائن۔“ وہ مسکرائی اور مریم جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ذرا باہر جا رہی ہوں لالہ ابھی آتی ہوں۔“

”مریم۔“ شہر یار نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا ”تم اس طرح کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ؟“

مریم خاموش ہی رہی۔ شہر یار بے حد الجھا ہوا تھا، اس کا یہ گریز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی تک وہ یعنی بابا یا کبھی اس کے مل جانے کے متعلق نہیں بتا سکا تھا۔

وہ مل کر ایک بار پھر گھونگی تھی۔

کس قدر پریشان ہوا تھا وہ۔

لگتا تھا جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

کیوں آخر کیوں وہ اس سے ملے بنا بتائے بنا چلی گئی۔

کیا وہ بدل گئی ہے یا مجھ سے بدگمان ہے اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ اسے کہاں تلاش کرے..... اور

جب وہ پاگل ہونے کے قریب تھا تو وہ پھر اسے نظر آ گئی تھی۔

لیکن اجنبی اور بے گانہ سی بنی۔

اس سے بھاگ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ ناموس۔“ لالہ نے ہلکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ نہ جانے لالہ کی نظروں میں کیسی حسرت۔

تھی کہ وہ پھر بیٹھ گئی اور اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”چلو بیٹھ گئی ہوں خوش۔“

”ہاں۔“ لالہ مسکرا دی ”سنو یہ ڈاکٹر شہر یار پوچھ رہے تھے کہ تم ان سے کیوں ناراض ہو۔“ اس نے

شرارت سے مریم کی طرف اور پھر شہر یار کی طرف باری باری دیکھا۔

”نہیں میں ناراض نہیں ہوں۔“

بے اختیار تہقہہ لگایا۔ شہر یار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیچے ڈاکٹر شہر یار آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔“

شہر یار نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے میں آتا ہوں ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دے آؤں۔“

اور اس کے جانے کے بعد بھی لالہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔

”سنو ڈاکٹر عابدہ ہی نام لیا تھا نا ڈاکٹر شہر یار نے۔ تمہیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ورنہ تو تم بہت سخت بدگمان تھیں ڈاکٹر شہر یار سے اور دیکھو اتنے نفیس اتنے پیارے بندے کو کھونا مت۔۔۔۔۔ اس کا دل مت توڑنا اور۔۔۔۔۔“ لالہ کو کھانسی آگئی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

مریم نے اٹھ کر اس کی پیٹھ ملی لیکن اس کا سانس اکھڑ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر پاس سے گزرتی نرس کو بلالیا۔۔۔۔۔ کچھ دیر بعد اس کا سانس بحال ہو گیا لیکن وہ غڈ حال ہو چکی تھی۔

”مومو۔۔۔۔۔ اس نے نجیف آواز میں کہا ”سنو تم کسی طرح مجھے باہر لے جا سکتی ہو۔ میں۔۔۔۔۔ میں می کی آواز سننا چاہتی ہوں۔ ایک بار آخری بار۔۔۔۔۔ تم می کو فون کرنا اور جب وہ پولیس تو ریسور مجھے دے دینا۔“

”مکروہ۔۔۔۔۔“ مریم بتانا چاہتی تھی کہ وہ تو گھر پر نہیں ہیں ملتان گئی ہوئی ہیں لیکن پھر رک گئی۔ بھلا وہ کیا کہے گی کہ اسے کس طرح معلوم ہے کہ آنٹی گھر پر نہیں ہیں ”ٹھیک ہے“ ذرا تنہا ہی طبیعت بہتر ہو جائے نا تو چلتے ہیں۔“

”نہیں ابھی چلو پلیز۔“ لالہ نے ضد کی۔

”اچھا چلو اٹھو۔“ مریم نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ وارڈ سے باہر نکلتے ہی اسے ڈاکٹر شہر یار مل گئے۔

”یہ تم کہاں جا رہی ہو؟“ اسے شک گزرا کہ وہ پھر بتائے بغیر بھاگ رہی ہے۔

”وہ لالہ کو فون کرنا ہے ضروری ہم باہر ملی ہی اوتیک جا رہے ہیں۔“

”ادھر میرے کمرے میں آ جاؤ۔“ شہر یار واپس پلٹ پڑا تو وہ لالہ کا ہاتھ تھامے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

اس نے سہر ملایا۔ دوسری طرف سے میڈم نرس نے ہی ریسور کیا۔ ان کی مخصوص بلند چینی ہوئی آئی۔

میں ہیوسن کر اس نے ریسور لالہ کی طرف بڑھا دیا۔ لالہ نے انہیں کانوں سے لگایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور آنکھوں کے آنسو بہت آہستگی کے ساتھ اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ریسور کیئر پر ڈال دیا اور مریم سے سرگودھا کی۔

”ماما نے ریسور رکھ دیا ہے اور پتا ہے می بالکل ویسی ہی ہیں ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔۔ وہی لہجہ وہی اشارات وہی انداز۔۔۔۔۔“

وہی انداز۔۔۔۔۔“ اور میں مجھے دیکھو میں کتاب بدل۔۔۔۔۔“

”ایک ایک بار پھر فون کر لوں۔“ اس نے ہلتی نظروں سے شہر یار کی طرف دیکھا اور شہر یار نے سر ہلادیا تو اس نے پھر نمبر ملایا۔ دوسری بار پھر میڈم نرس نے ہی اٹینڈ کیا اور ان کی دہاڑ ریسور سے باہر تک

سنائی دی۔ پھر بلار کے گالیاں۔۔۔۔۔

لالہ انہیں کان سے لگائے مسکراتی رہی اور جب انہوں نے فون رکھ دیا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

”ٹھیک یو ڈاکٹر شہر یار۔“

شہر یار نے سر ہلادیا۔

”پتا ہے مومو می کی آواز سن کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے می بالکل ادھر ہوں میرے پاس اور۔۔۔۔۔“

”لالہ میں آنٹی کو تمہارے متعلق بتا دوں نا۔“

”نہیں۔“ اس کے مسکراتے لب پہنچ گئے لیکن مریم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج ہی کسی وقت آنٹی کو فون کر دے گی۔ کل ڈاکٹر احسن کہہ رہے تھے کہ لالہ کو اس سے بہتر ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے جو اسے

یہاں مل رہا ہے۔

”مریم سنو۔۔۔۔۔ مجھے تھوڑا سا وقت دے دو مجھ سے کھل کر بات کرو۔ میں بہت الجھ گیا ہوں بہت اپ

سیٹ ہوں۔“

”کچھ بھی تو نہیں ہے۔“ مریم نے مڑ کر اسے دیکھا ”میں یونہی لالہ کی وجہ سے اپ سیٹ ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں وہی رنگ تھے۔ محبت اور حیا کے ملے جلے رنگ۔ چہرے پر شوق اندر ہی تھی اور ہونٹوں پر

مدھم سی مسکراہٹ تھی ”جو پریشانی تھی وہ تو آپ نے واضح کر دی تھی۔“ اور ڈاکٹر شہر یار کو حیران چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔

لالہ بے حد غڈ حال ہو رہی تھی اس لیے بستر پر لیٹتے ہی سو گئی اور اس کے سونے کے بعد اس نے میڈم نرس کو فون کرنے کا سوچا اور وارڈ سے باہر آ گئی۔ شہر یار کی ڈیوٹی آف ہو چکی تھی وہ اسے کوریڈور میں مل گیا۔

”کہاں جا رہی ہوں لالہ تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں سو رہی ہے لیکن مجھے آنٹی کو اس کے بارے میں مطلع کرنا ہے۔ مسز علی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ مجھے آنٹی کو بتادینا چاہیے۔“

”ہاں یہ ضروری ہے۔“ شہر یار اس کے ساتھ واپس پلٹ پڑا ”میں لالہ کو دیکھنے ہی آ رہا تھا اور ساتھ تمہیں بھی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

مریم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نظریں ملیں اور جھک گئیں۔

”مریم تم نے مجھے حیران کیا ہے۔ تمہاری پل پل بدلتی کیفیتوں نے ابھی جب ہم وارڈ میں تھے تو تم کس قدر اجنبی لگ رہی تھیں اور اب کتنی اپنی لگ رہی ہو۔ کبھی زندگی کی نوید دیتی ہو۔ کبھی چھین لیتی ہو۔“

”ارے گولی مارو لالہ کو..... بے وفا خون..... نہیں پتا مجھے اس کا کہاں ہے۔“

”آئی وہ یہاں ہے کراچی..... اسپتال میں۔“

”کیا!“ وہ زور سے دہاڑیں ”تمہیں کیسے مل گئی۔“

”آئی پلیز وہ بیمار ہے بہت زیادہ آپ فوراً آ جائیں کراچی یہاں جناح اسپتال میں۔“ اس کی آواز

بھرا گئی۔

”کیا ہوا ہے اسے؟“ ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

”وہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ.....“ وہ رک گئی۔

”اسے کوئی سیریس بات ہے کوئی خطرناک بات۔“

”کہتے ہیں ڈاکٹر وہ تو اتنی صحت مند تھی اسے کوئی بیماری نہیں ہو سکتی۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ اس کا

باپ کہاں مر گیا ہے اسے اسپتال چھوڑ کر۔“

”نہیں آئی وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ مریم کا ضبط جواب دے گیا اور وہ بے اختیار رو دی۔

”اچھا“ اچھا رو نہیں ڈارنگ“ میں صبح ہی آ رہی ہوں پہلی فلائٹ سے۔ مجھے پتا ہے وہ یونہی بہانہ کر

رہی ہوئی تاکہ میں اسے لے جاؤں..... لے جاؤں گی۔“

مریم اور شدت سے رونے لگی تو وہ اسے بہلانے لگیں۔

”مجھے پتا ہے تمہارا دل بہت کمزور ہے بہت چھوٹا ہے۔ چڑیا جیسا..... مگر حیرت ہے تم نے اتنا حوصلہ

کیسے کر لیا۔ زینی کو بھی حیرت ہو رہی تھی..... وہ تم سے بہت خفا ہے لیکن تم فکر نہیں کرو میں اسے منالوں گی۔

تم میرے ساتھ ہی لاہور آ جانا اور دیکھو بے وقوف لڑکی تمہیں کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی میرے

پاس چلی آتمیں خیر ساری تفصیل وہاں آ کر معلوم کروں گی۔“

وہ ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں تیز تیز بولتی نکلیں اور مریم خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی

اور آنسو اس کے رخساروں پر بہتے رہے۔

”اوکے جانو۔“ میڈم نرس نے اسے خدا حافظ کہا تو اس نے ریسور رکھ دیا۔ شہر یا اس کے پاس ہی

کھڑا گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مومنو۔“ اس نے انگلی کی پور سے اس کے رخسار پر اٹکا ہوا آنسو پونچھا ”تمہارے آنسو مجھے تکلیف

دیتے ہیں مت رویا کرو۔“

”وہ آئی کتنی خوش لگ رہی تھیں لیکن جب انہیں پتا چلے گا کہ لالہ کو کینسر ہے تو۔“ وہ پھر رو دی۔

”بس اب رونا نہیں۔“ شہر یار نے تنبیہ کی ”اور بیٹھو ادھر میرے سامنے آج میں تمہیں جی بھر کے

دیکھوں گا ترس گیا تھا تمہیں دیکھنے کو۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا اور خود اس کے سامنے کرسی کھینچ کر

”شہر یار میں بہت الجھی ہوئی ہوں بہت اب سیٹ ہوں۔“

”جانتا ہوں میری جان۔ میری زندگی۔ تم مجھ پر اعتبار تو کرو۔ اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔ مجھے

اختیار دے دو مریم۔“ اس کی آواز بوجھل ہو گئی ”میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم سب دکھ بھول جاؤ گی۔

میں تمہاری راہوں کے سارے کانٹے چننے لوں گا مریم۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا دھیسے مگر جذباتی لہجے

میں بولتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

”مجھے..... مجھے آپ پر اعتبار ہے شہر یار.....“

مریم نے اسے یقین دلایا تو شہر یار کو یوں لگا جیسے اسے زندگی مل گئی ہو۔ جیسے کوئی ہوئی مریم کو اس

نے سچ سچ پایا ہو.....

”تھینک یو مریم۔“ تھینک یو۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی ”میں..... میں بہت خوش ہوں کہ آج سچ سچ

مجھے مریم واپس مل گئی ہے..... ورنہ مجھے تو یوں لگے لگا تھا جیسے اب میں تمہیں کبھی نہ پاسکوں گا۔ کھودوں گا

تمہیں تم اتنی ظالم کیوں ہو گئی تھیں۔ کیوں بدگمان ہو گئی تھیں مجھ سے..... بیٹھو بیٹھ جاؤ نا آج بہت دیر

باتیں کریں گے.....“

”پہلے آئی کو فون کرتا ہے۔“ مریم نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں کرلو۔“ شہر یار نے بیٹھے ہوئے فون اس کی طرف بڑھایا۔ دوسری طرف میڈم نرس ہی تھیں۔

”آئی یہ میں ہوں مریم۔“ اس نے ان کی ہیلو سنتے ہی فوراً کہا۔

”ارے تم جانو۔ کہاں ہو..... فون ہی نہیں کیا پھر.....“

”آئی میں یہاں ہوں کراچی میں۔“

”کس کے پاس ہو؟ اپنے باپ کے پاس چلی گئی ہو لالہ کی طرح.....“

”وہ آئی ماما کیسی ہیں اور عاشی وغیرہ۔“ اس نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

”عاشی وغیرہ سب مزے میں ہیں..... اپنی سوتیلی ماں کے پاس حویلی میں ہیں اور تمہاری ماما آئی

تھیں میں نے کہا کہ بچوں کو جا کر لے آؤ..... آخر کار وہ تمہارے بچے ہیں لیکن زینی بڑی ضدی ہے اس

نے انہیں لانے سے انکار کر دیا کہتی ہے سب میرے لیے مر گئے ہیں۔“

مریم کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چھو دی ہو۔

”تیمور نے بھی فون کیا تھا اور شاید عاشی نے بھی لیکن زینی نے بات نہیں کی کسی سے۔“ میڈم نرس

بغیر رکے بولے جارہی تھیں ”اور سنو مریم تم اپنا فون نمبر دے دو وہ تمہارا عادل خان بہت مضطرب ہے بار

بار فون کرتا ہے کہ شاید تم کبھی مجھے فون کرو۔“

”جی وہ دے دوں گی۔“ اس نے گہری سانس لی ”آئی وہ لالہ۔“

جاری رکھے۔ یوں عمارت تقریباً اب مکمل ہو گئی تھی اور اس کا اصرار تھا کہ وہ ایک بار اس کے ساتھ چلیں اور مشورہ دیں کہ مزید کیا کیا جائے لیکن ان کا دل تو جیسے ہر کام سے اچاٹ گیا تھا۔

عاشی نینا اور مور اپنی پڑھائی میں مصروف تھے اور بہت حد تک ایڈجسٹ ہو گئے تھے۔ تیمور کے اصرار پر وہ نذیب کے ملک واپس آنے کے بعد اسے لے کر نذیب ولا گئے تھے لیکن نذیب نے ان سے اور تیمور سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور نہ ہی ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیار ہوئی تھیں۔ نذیب ان سب سے بہت ناراض تھیں۔ نذیب ولا پر غضنفر ملک کے رشتے داروں کا قبضہ تھا۔ عاصمہ نے ہی آکر انہیں بتایا تھا کہ بھابی سوری ہیں۔

وہ ان کے جاگنے کے انتظار میں بیٹھے عاصمہ کی فضول باتیں سنتے رہے اور جب نذیب بیدار ہوئیں تو انہوں نے عادل سے ملنے سے انکار کر دیا۔ تب وہ خود ہی ڈرائنگ روم سے نکل کر ٹی وی لاؤنچ میں آ گئے۔

”مسز نذیب پلیز آپ میری بات تو سن لیں، بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ عاشی بہت جذباتی ہے اگر میں اس وقت انہیں ساتھ نہ لے کر جاتا تو نہ جانے کہاں چلی جاتیں وہ۔“

”ٹھیک ہے مجھے آپ سے گلہ نہیں ہے عادل خان لیکن میں اب عاشی وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتی۔“

”ماما۔۔۔ تیمور۔۔۔ بے قرار سا ہو کر ان کی طرف لپکا تھا لیکن اس کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر انہوں نے ایک ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹا دیا تھا اور تیمور یوں حیران کھڑا رہ گیا تھا جیسے کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔ انہوں نے بہت آہستگی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا لیکن وہ ان کا ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

”مسز ملک۔۔۔۔۔ آپ کے خیال میں مریم کہاں جاسکتی ہے؟“ بالآخر انہوں نے پوچھ لیا لیکن انہوں نے کندھے اچکا کر لاٹلی کا اظہار کیا۔ وہ مریم کے والد کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے کہ غضنفر ملک اپنے بیٹروم کا دروازہ کھول کر لاؤنچ میں آ گیا اور انتہائی طنزیہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

”اوہ تو عادل خان اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کی وکالت کے لیے آئے ہیں۔ کیا جی بھر گیا ان کی مہمانداری سے لیکن اب ان کی اس گھر میں جگہ نہیں ہے۔ گھروں سے نکل جانے والوں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔“

انہوں نے اس فضول شخص کی بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور مسز نذیب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئے۔ سیٹ کی پشت پر سر رکھے تیمور زاروں زار رو رہا تھا۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس کے آنسو پونچھے اور حیرت سے سوچتے رہے کہ کیا کوئی ماں اتنی ظالم اتنی بے نیاز بھی ہو سکتی ہے۔ یقیناً غضنفر ملک نے انہیں حد سے زیادہ ورغلا دیا تھا۔ وہ بے حد اپ سیٹ تھے۔ ایسے میں حویلی

بیٹھ گیا۔
”میں تم سے بہت ناراض ہوں بہت خفا ہوں تم نے مجھے بہت تنگ کیا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مریم کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور ان کی آنکھوں میں اتنے رنگ تھے اتنی پیش تھی کہ مریم کی نظریں اٹھ نہیں رہی تھیں۔ اپنے لبوں پر دھیمی سی مسکان سجائے وہ نگاہیں جھکائے شہر یار کی باتیں سن رہی تھی۔



اس مخصوص اسٹاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے پروفیسر عادل نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور اسٹاپ پر کھڑے ہجوم کو دیکھا۔ ان سارے چہروں میں کوئی ایک چہرہ بھی مریم کا نہیں تھا۔ کتنی ہی بار وہ یہاں سے گزرے تھے لیکن مریم انہیں کہیں دکھائی نہیں دی تھی اور اب تو انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ شاید تیمور کو غلط فہمی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اگر وہ یہاں تھی تو کبھی تو دکھائی دیتی۔ مسرور کی ایگزیشن کے دوران وہ کتنی بار یہاں آئے تھے اور جب بھی فارغ ہوتے ادھر ادھر گھومتے رہتے۔

طارق روڈ۔

ساحل سمندر پر۔

وہ ہر قابل ذکر جگہ پر گئے تھے کہ شاید ہجوم میں کہیں وہ دکھائی دے جائے۔ ضرار صاحب نے گاڑی مستقل طور پر ان کے حوالے کر دی تھی۔ مسرور کی ایگزیشن بہت کامیاب رہی تھی۔ لوگوں نے اس کے کام کو بہت سراہا تھا۔ کافی تصاویر یک بھی گئی تھیں اور وہ بہت خوش تھے۔ انہیں ڈرتھا کہ اگر تصدق احمد کی طرح مسرور کو پکڑ پکڑائی نہ ملی تو کہیں وہ بھی مایوسی کا شکار نہ ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ نقادوں نے بھی اس کے فن کو سراہا تھا۔ جب تک ایگزیشن جاری رہی وہ اسی بہانے کراچی میں مقیم رہے لیکن پھر انہیں واپس جانا پڑا تھا لیکن دل جیسے کہیں ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں کراچی میں ہی ٹھکا جائے لیکن شاید وہ کہیں کسی سڑک کسی دکان کسی اسٹاپ پر نظر آجائے لیکن یہ ممکن ہی کب تھا۔ لاہور میں بے شمار کام تھے۔ کالج سے بھی وہ اتنی لمبی چھٹی نہیں لے سکتے تھے۔ ان کے طلباء کا بہت حرج ہو رہا تھا۔ ادھر تہجیبی بار بار انہیں بلا رہے تھے کہ وہ تصدق احمد اور آمنہ صغی کا معاملہ سلجھانے میں ان کی مدد کریں۔۔۔۔۔

تصدق احمد جان دینے پر تھلا تھا۔

آمنہ صغی رضا مند نہیں ہو رہی تھی۔

اور اس کے بیوی بچے الگ پریشان ہو رہے تھے۔

مانی انہیں روز فون کرتا تھا کہ وہ کسی دن اس کے ساتھ جا کر ادارے کا کام دیکھیں۔ کامی مل گیا تھا لیکن انہوں نے سلطان سے کہا تھا کہ جو اس کا پروگرام تھا معذور بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کا وہ

”ماں جی کا فون آگیا۔
”عادل بہت ہو گیا۔ دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں اور اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

”جی ماں جی۔“

ایک دم ہی بہت ساری تھکن ان کی رگوں میں اتر آئی۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر ان کے لبوں سے نکلا ”میں دو تین دن کے لیے کراچی جا رہا ہوں واپس آ کر حویلی آتا ہوں تو۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔“ ماں جی نے فون بی آپا کو دے دیا ”عادل کراچی جا رہے ہو تو مراد بھائی سے ضرور ملنا اور انہیں کہنا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہارٹ بینک بہت زیادہ ہے اور جہاز کے سفر سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لیے وہ خود ہی آجائیں۔ مرنے والوں کی قسمیں تو ان کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ بہت دل چاہ رہا ہے ان سے ملنے تو تمہاری زبان میں تاثیر ہے عادل تو انہیں قائل نہیں کر سکتی شاید تم کر لو۔“

”جی بی آپا ضرور جاؤں گا۔“ انہوں نے بی آپا سے پتا اور فون نمبر وغیرہ لے لیا تھا۔ کراچی میں ان کو کوئی کام تھا نہیں بس یوں ہی بے اختیاری میں ان کے لبوں سے کراچی جانے کا نکل گیا تھا۔ شاید لا شعور۔ میں کہیں امید تھی کہ انہیں کہیں مریم نظر آجائے۔ ایک آخری کوشش اور سہی سو کراچی آنے کے بعد انہوں نے ضرار صاحب سے گاڑی منگوائی تھی اور مراد علی کے گھر جا رہے تھے اور بی آپا کی طبیعت واقعی بہت خراب رہنے لگی تھی۔ مراد علی کے گھر جاتے ہوئے وہ اس اسٹاپ کے پاس سے گزرے تو انہوں نے رفتار کم کر دی تھی لیکن مریم تو کہیں نہیں تھی۔

مریم کے متعلق اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے انہیں پتا ہی نہ چلا کہ گلشن اقبال آگیا۔ مراد علی کے گھر کے سامنے گاڑی پارک کی تو انہوں نے بیل دی اور اپنا کارڈ اندر بھجوا دیا۔۔۔۔۔ تو مراد علی خود ہی بھاگتے ہوئے چلے آئے اور انہیں اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ کتنے سالوں بعد انہوں نے مراد علی کو دیکھا تھا۔ صحت کی سرفی سے چمکتا چہرہ۔

شخصیت سے جھانکتا طمینان۔
وہ اسے بازوؤں کے حلقے میں لیے لیے اندر آئے اور اندر آتے ہی اپنی بیوی کو آوازیں دینے لگے۔
عادل میاں کو ان سے مل کر بہت خوش ہوئی بچے کچھ دیر بعد معذرت کر کے چلے گئے تھے۔
”دراصل ان کی ٹیوٹر پڑھانے آئی ہوئی ہے۔“ مراد علی نے وضاحت کی۔

خوب صورت، سلیقہ مند بیوی۔

سلجھے ہوئے ذہن بچے۔ ان کی زندگی ہر طرح سے مکمل تھی۔

”مراد بھائی اتنی پرسکون اور مکمل زندگی ہے آپ کی۔ کبھی پچھتاوا ہوا؟“
”نہیں پچھتاوا تو نہیں خلش ضرور ہے زندگی میں کہ والدین کی رضا اس میں شامل نہ تھی۔ کبھی کبھی تو

بہت زیادہ۔۔۔۔۔ بے قرار اور بے چین ہوتا ہوں جب اپنا گھر اپنا گاؤں یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے یہاں کی فاسٹ زندگی کو خیر یاد کہہ کر چند دنوں کے لیے کسی پرسکون جگہ چلا جاؤں۔ کئی دفعہ بچوں کو لے کر سوات کاغان وغیرہ چلا گیا لیکن یہ بے سکونی ختم نہیں ہوئی وہاں جا کر۔ یہ دکھ تو عمر بھر رہے گا آخری سانس تک کہ نہ والدین کی خدمت کر سکا۔ نہ ان کے جنازے کو کندھا دے سکا۔

لیکن عادل میاں زندگی میں سب کچھ نہیں مل سکا۔ آدمی کچھ پاتا ہے تو کچھ کھوتا بھی ہے۔ میں نے ایک خوشی پائی تو دوسری سے محروم ہو گیا۔“

”مراد بھائی جانے والے تو چلے گئے اب آپ کو آنا چاہیے بچے بھی تو دیکھیں کہ ان کے باپ کا گاؤں کیسا ہے۔ بی آپا نے کہاں لے کر جانا ہے سب۔ ماں جی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں بلکہ آپ میرے ساتھ ہی چلیں۔“

”اب کیا جانا ہے عادل میاں جب ماں باپ کی زندگی میں نہیں گیا تو۔۔۔۔۔“
”یہ تو آپ کی فضول کی ضد ہے۔“ پروفیسر عادل نے انہیں ٹوک دیا ”بی آپا کے لیے سفر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔“ پروفیسر عادل نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ مراد علی اپنے ارادوں میں اٹل تھے۔
”مجھے زمین جائداد کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے بی آپا سے کہہ دیا ہے جو جی چاہیں کریں۔“
انہوں نے وضاحت کی لیکن پروفیسر عادل انہیں قائل کر کے ہی اٹھے اور انہوں نے بالآخر وعدہ کر لیا کہ بچوں کے امتحان کے فوراً بعد وہ آئیں گے۔

وہ مصر تھے کہ پروفیسر عادل وہاں ہی قیام کریں جتنے دن وہ کراچی میں ہیں لیکن پروفیسر عادل نے انہیں ٹال دیا۔

”بھئی عادل میاں میرا جی نہیں بھرا تم سے باتیں کر کے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور ہوٹل سے تمہارا سامان لے آتا ہوں۔“ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مراد علی نے ان سے کہا تو کوریڈور میں رک کر پروفیسر عادل نے ان کی طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔

”میں نے آپ کو بتایا ہے تاکہ مجھے کچھ لوگوں سے ضروری ملنا ہے اور صبح کو میری واپسی ہے لیکن انشا اللہ پھر آیا تو سیدھا دھر ہی آؤں گا۔“

”عادل بھائی پرامس کریں۔“ بیگم مراد علی نے ان کی طرف دیکھا ”یقین کریں میں آج اتنی خوش ہوں کہ میرے سسرال سے کوئی میرے گھر آیا ہے۔“

”پرامس بھابی انشا اللہ سیدھا یہاں ہی آؤں گا۔“ پروفیسر عادل ان کے خلوص سے بے حد متاثر ہوئے تھے ”اب اجازت دیں۔“ انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور تب ہی رومی کے ساتھ بات کرتے ہوئے مریم اسٹڈی سے باہر نکلی اور پروفیسر عادل کے لب ذرا سے کھلے اور پھر بند

ہو گئے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا..... مریم اور یہاں۔“ انہوں نے آنکھوں کو بند کیا اور کھولا۔

مریم کی نظر بھی ان پر پڑی تو وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

”یہ مس مریم ہیں، بچوں کی ٹیوٹر۔“ مسز مراد علی نے پروفیسر عادل کی طرف دیکھتے پا کر بتایا۔
”مریم۔“ وہ ان کی بات کا جواب دے بغیر ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ ”مریم آپ نے اچھا نہیں کیا۔ ہمارے ساتھ عاشری نینا اور مور کے ساتھ۔“

ان کا دل ان کے وجود کے ہر حصے میں دھڑک رہا تھا۔ وہ ان کے سامنے تھی جسے تلاش کرتے کرتے وہ جھٹکنے لگے تھے۔ اب جبکہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا انہیں لگتا تھا جیسے وہ ہار جائیں گے تو وہ مل گئی تھی..... اور آسانوں پر رہتا خدا کتنا مہربان کتنا شفیق ہے۔

”مریم بتائیں نائیکوں کیا آپ نے ایسا۔“ وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے شکوہ کر رہے تھے۔
مریم نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔

”وہ نینا عاشری اور مور کیسے ہیں؟“
”آپ کو ان کی کیا پروا۔ آپ تو انہیں چھوڑ کر چلی آئیں تھیں۔“ وہ مسلسل شکوہ کیے جا رہے تھے۔
حالانکہ اندر رقص جاری تھا۔

”نہیں مجھے ان کی بہت پروا ہے۔“ مریم نے انہیں تڑپ کر دیکھا۔
”تب ہی چلی آئی تھیں۔“ ان کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے لڑیں خوب لڑیں۔ کتنا پریشان کیا تھا اس نے۔ کیسے کیسے آزمایا تھا اس نے اور اب آج اگر وہ نہ ملتی تو.....“ مراد علی اور مسز علی حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”عادل تم انہیں جانتے ہو؟“ مسز علی نے پوچھا۔
”جی بھائی۔“ پروفیسر عادل نے بہت سرشار لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ مریم ہیں پاپا کی بیٹی۔ آپ کو بی آپانے بتایا ہوگا۔“

”لیکن یہ یہاں بی آپا کہہ رہی تھیں کہ تم بچوں کو حویلی میں لے گئے ہو۔“
”جی۔“ وہ اسی سرشار لہجے میں بولے ”لیکن انہیں ہم پر اعتبار جو نہیں تھا۔“ انہوں نے پھر پر شکوہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ارے پھر تو تم ہماری اپنی بچی ہو۔ عثمان بھائی کی بیٹی۔“ مراد علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
”عادل یار عثمان بھائی کی ڈھک دھک ہوا تھا مجھے۔ بہت نفیس انسان تھے۔ بہت محبت کرنے والے۔“

”بیگم صاحب! وہ آج مریم بی بی کو چھوڑنے جانا ہے یا نہیں؟ ادھر زیر صاحب کی طرف سے گڑیا کو

بھی لانا ہے۔“ ڈرائیور نے آکر پوچھا تو بیگم علی کے جواب دینے سے پہلے ہی پروفیسر عادل نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں میں مریم بی بی کو پہنچا دوں گا۔“

”آئیے۔“ انہوں نے مریم کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر مراد علی اور ان کی وائف کو خدا حافظ کہا۔
”عادل! بچی بالکل جی نہیں چاہ رہا کہ تم جاؤ مگر.....“ مراد علی نے ایک بار پھر انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن مسکرا کر معذرت کرتے ہوئے وہ مریم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر آگئے۔ مریم خاموشی سے ان کے پیچھے باہر نکل آئی۔

”آئیے۔“ انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ مریم خاموشی سے بیٹھ گئی۔ مریم کو ان کا یہ اپنائیت بھرا انداز اچھا بھی لگ رہا تھا اور خوف بھی آ رہا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسا ہی رعب تھا۔ جب انہیں غصہ آیا تھا تو عاشری بھی خوف زدہ ہو گئی تھی اور اب پتا نہیں وہ اس سے کیا کہیں گے۔ ڈانٹیں گے، خیر میں بھی کہہ دوں گی۔ سب صاف صاف۔ کس ناتے، کس رشتے سے حویلی جاتی ہیں۔

”ہاں اب بتائیے کیوں کیا آپ نے ایسا۔“ گاڑی سڑک پر لانے کے بعد انہوں نے مریم کی طرف دیکھا۔ ”آپ جانتی ہیں آپ کو پتا ہے آپ کے اس اقدام سے کتنی اذیت اٹھائی ہے کس قدر مشکل اور عذاب میں یہ دن رات کاٹے ہیں ہم نے آپ کو اتنا سوچ لینا چاہیے تھا مریم کہ آپ کا یہ اقدام.....“
”پلیز عادل بھائی میں کیا کرتی۔ ماما نے گھر سے چلے جانے کو کہہ دیا تھا۔ تو مجھے جانا ہی تھا۔“

”آپ عاشری کے ساتھ حویلی آ سکتی تھیں۔“
”لیکن حویلی سے میرا کیا ناتا تھا۔ آپ بھول رہے ہیں کہ ماما نے آپ کے سامنے ہی یہ بات کہی تھی۔ میں کس ناتے، کس رشتے سے حویلی جاسکتی ہوں۔“
”یاد ہے مجھے لیکن مریم ناتا یا رشتہ بن بھی تو سکتا تھا۔“

مریم نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ مریم کی نظریں جھٹک گئیں۔

”تم..... آپ کا عاشری نینا اور مور سے تو رشتہ تھا نا۔ بہت مضبوط۔ اس رشتے یا ناتے کو تو جھٹلا نہیں سکتیں، آپ اس رشتے سے تو حویلی آ سکتی تھیں۔ پھر پاپا کو آپ کتنی عزیز تھیں۔ جانتی ہیں نا آپ۔ آخری لمحوں میں انہوں نے مجھ سے خصوصاً آپ کا خیال رکھنے کا کہا تھا اور آپ سے نینا عاشری اور مور کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔“

”جی۔“ مریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”پھر آپ نے ہمارا اعتبار کیوں نہیں کیا۔ کیا اتنے عرصے میں آپ اتنا بھی نہیں جان سکیں، مجھے یاد ہے

اس پر ظاہر نہ کیا تو وہ اسے کھودیں گے۔

”مگر“ مریم نے سراٹھا کر انہیں دیکھا۔

”مگر کیا مریم؟“ انہوں نے اپنا رخ اس کی طرف کیا۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی دلکش سی مسکان تھی۔

”پلیز کوئی ایسی بات نہ کرنا کوئی فضول بات۔ میں آج اس وقت اس لمحے اتنا خوش ہوں جتنا زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔ مریم! آپ اس خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ روئے زمین پر آج اس وقت مجھ سے زیادہ خوش قسمت کوئی شخص نہیں ہے۔ اس شخص کی خوش قسمتی میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ مریم جس نے پہلے ایک احساس کو اپنے دل میں جگہ دی پھر اس احساس کو ایک پیکر ملا اور پھر وہ پیکر آپ کی صورت میں مجسم ہو گیا۔ یقین کرو مریم! میں نے طلوع ہوتی صبحوں میں غروب ہوتی شاموں اور رات کی تہائیوں میں آپ سے باتیں کی ہیں..... مدتوں آپ کو سوچا ہے کہ کبھی کوئی لمحہ ایسا بھی میری زندگی میں آئے کہ آپ میرے روبرو ہوں اور میں اپنا آپ آپ پر کھول دوں۔ یہ لمحے بہت طویل انتظار کے بعد آئے ہیں۔ پلیز انہیں کوئی فضول بات کہہ کر راز نگاہیں نہ کرو۔“

مریم بے بسی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کس طرح، پروفیسر عادل کو یہ سب کچھ کہنے سے روک دے۔

”پلیز عادل بھائی یہ سب کچھ جو آپ کہہ رہے ہیں صحیح نہیں ہے۔ مناسب نہیں ہے۔“ بالآخر اس نے کہہ دیا۔

اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ رکھے پروفیسر عادل نے مریم کی طرف دیکھا اور ذرا سا چونکے۔ وہ بے حد سنجیدہ اور اپ سیٹ لگ رہی تھی۔

”مریم سوری شاید میں نے اس طرح اچانک اپنے جذبات کا اظہار کر کے آپ کو پریشان کر دیا ہے لیکن میں نہیں کیا کرتا مریم۔“ انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے لگتا تھا جیسے اب..... اب بھی اگر میں نے کچھ نہ کہا تو میں پھر آپ کو کھونٹوں میں آپ کو اعتبار دینا چاہتا تھا مریم۔ آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ آپ کا کیا ناتا ہے مجھ سے حویلی سے۔ مجھے ڈرتا تھا کہ کہیں آپ حویلی جانے سے انکار نہ کریں۔ آپ کو میرے ساتھ جانا ہے حویلی۔ آپ نے اس طرح سب کو کھجی کیا ہے لیکن اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کا خیال ہے کہ مجھے اس طرح یوں اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ سکون سے اطمینان سے جب آپ.....“ وہ ذرا سارے مسکرا کے اسے دیکھا اور اپنی بات مکمل کی ”بلکہ میں نے تو سوچا تھا مریم کہ آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد آپ کو بتاؤں گا کہ آپ میرے لیے کیا تھیں اور کس طرح میں آپ کو سوچتا تھا لیکن آپ اتنی بے اعتبار اور اتنی بے گانہ ہو رہی تھیں تو.....“

”پلیز عادل بھائی۔“ مریم نے التجا کی ”پلیز میری بات تو سن لیں۔“

میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ ہر پریشانی مجھے دے دیں اور.....“

”سوری عادل بھائی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“

”صرف سوری سے کام نہیں چلے گا۔“ پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی ”بلکہ سزا بھی ملے گی۔“

”کیا؟“ مریم کی نظریں پھر بے اختیار ان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ مسکراہٹ سجائے آنکھوں میں

جذبوں کا ایک جہان بسائے اسے دیکھ رہے تھے۔

”عمر قید بھی ہو سکتی ہے۔“ مسکراہٹ ابھی تک ان کے لبوں پر جمی تھی اور انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک

دم ہلکے ہلکے ہو گئے۔ جیسے کئی ماہ سے سینے پر دھری وزنی سل آپوں آپ سرک گئی ہو۔ مریم کچھ نہ سمجھتے

ہوئے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”مریم۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے ”میں نے جب آپ کو پاپا کے کمرے میں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے

بھی میں آپ کو دیکھ چکا تھا اور اس سے بھی بہت پہلے آپ میرے تصور میں تھیں۔

ایک خیالی پیکر

جو واضح نہ تھا۔

جس کی کوئی شبیہ نہ تھی۔

بس ایک احساس تھا جو آپ کو دیکھ کر ایک پیکر میں ڈھل گیا۔“

آہستہ روی سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ہلے ہلے بول رہے تھے اور مریم ہاتھ گود میں دھرے

ساکت بیٹھی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں میں کوئی رنگ اترے تھے اور نہ چہرے پر کوئی چمک آئی تھی بلکہ اس کا چہرہ

پسید پڑ گیا تھا جیسے کسی نے سارا خون رگوں سے نچوڑ لیا ہو۔

”مریم۔“ ان کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی ”میں کبھی اپنے جذبات کا اظہار آپ کے سامنے

نہ کر سکا کہ آپ اصل رشتے کی نوعیت سے بے خبر تھیں مجھے ڈرتا تھا کہ آپ پاپا سے ایسی محبت کرتی تھیں

تو حقیقت آپ کو اذیت دے گی سو میں اپنے اوپر جبر کرتا رہا۔ صرف آپ کے دل کو اس دکھ سے بچانے

کے لیے جو حقیقت جان کر ہوتا۔ آپ کو یاد ہوگا؟ جب ماں جی اور بی آپا حویلی آئیں تھیں تو پتا ہے

انہوں نے میرے لیے آپ کو مانگا تھا اور آپ کی ماما نے یہ پروپوزل قبول کر لیا تھا۔“

”اوہ!“ اس نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔

”جب ہی ماما کہا کرتی تھیں کہ وہ عاشق کی اور اس کی رخصتی ایک ساتھ کر دیں گی اور وہ حیران ہوتی تھی

”کون..... کون شخص ہے جسے ماما نے اس کے لیے منتخب کیا ہے تو وہ پروفیسر عادل تھے۔“

”مریم! میں نے ایک طویل عرصہ انتظار کیا ہے کہ آپ کی طبیعت سنہلے تو.....“ وہ اس کی حالت سے

بے نیاز دل کی کیفیات بیان کرتے رہے۔ یوں جیسے انہیں خوف ہو کہ اگر اب بھی انہوں نے اپنا آپ

گھر سے الگ اس طرح ہاسٹل میں رہنے سے اگرچہ اس میں کافی اعتماد آ گیا تھا پھر بھی وہ عادل سے حقیقت کہتے ہوئے جبک رہی تھی۔

”مریم“ پروفیسر عادل ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور ان کا دل جیسے ڈوبنے لگا ”مریم کیا آپ کو میری جسامت بری لگی۔ میرے جذباتوں کا اظہار پسند نہیں آیا۔ کیا آپ.....“ کچھ کہتے کہتے وہ ٹھہرے گئے جو بات کہنے والے تھے اسے کہتے ہوئے ان کا دل کسی نے منہ میں لے لیا ہو۔ پھر بھی ہمت کر کے انہوں نے بات مکمل کر دی۔

”کیا آپ کسی اور کے.....“

مریم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سر جھکا لیا۔

پروفیسر عادل کے چہرے پر سایہ سا آ کر گزر گیا اور آنکھوں میں دھول سی اڑنے لگی..... نہیں بھلا ایسا کب سوچا تھا، انہوں نے کہ مریم کسی اور کو بھی پسند کر سکتی ہے۔ کوئی اور بھی اس کی زندگی میں شامل ہو سکتا ہے۔ وہ تو انہیں اب ملی تھی اور اب سے پہلے بہت سارے سال وہ گزرا چکی تھی۔ وہ اتنی پیاری، اتنی دلکش اور اتنی سلجھی ہوئی تھی کہ کوئی بھی اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔ انہوں نے یہ کیسے فرض کر لیا تھا کہ اس کا دل ان کی طرح بالکل صاف شفاف ہوگا اور اس کے دل کی حنقی پر لکھا جانے والا پہلا نام ان کا ہی ہوگا۔

پتا نہیں کون تھا وہ

اور کس قدر خوش نصیب

جس نے اس کے دل کی حنقی پر اپنا نام لکھا تھا۔

دل جیسے کوئی دبائے جا رہا تھا۔

کچھ پانے سے پہلے ہی سب کچھ کھو بیٹھے تھے وہ۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے اسٹیرنگ سے ہاتھ اٹھایا۔

”یہ پاپا کی بھی خواہش تھی مریم۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مریم بہت پیاری ہے اور عادل تم مریم کا

بہت خیال رکھنا۔“ ان کی آنکھوں میں کانچ سے چھینے لگے۔

”اور یہ خواہش“ ان کے ہونٹوں پر ایک زنجی سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔

”میری اپنی خواہش، میری اپنی آرزو بھی تھی۔“

”پاپا کی خواہش“ مریم نے استعجاب سے انہیں دیکھا۔

”ہاں ان کی خواہش۔“

اور پاپا اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے۔

”آپ ہی کی باتیں تو سننی ہیں ساری عمر۔ آج تو مجھے بولنے دیں۔ پھر تو آپ ہی کو بولنا ہے۔“

آج وہ بہت موڈ میں تھے۔ ایسا شوخ انداز تو انہوں نے کبھی زندگی میں نہیں اپنایا تھا، مگر آج تو ان کا ہنسی چاہ رہا تھا کہ وہ خوب بولیں۔ مریم کو تنگ کریں اور خوب خوش ہوں۔ ان کے لیے دنیا تاتی خوب صورت کبھی نہ تھی جتنی زیادہ خوب صورت اس لمحے لگ رہی تھی۔ جب وہ انتہائی مایوس اور دل گرفتہ تھے جب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ اسے پا کر کھو چکے ہیں۔ تو وہ انہیں مل گئی تھی۔ ان کا دل کسی ننھے بچے کی طرح ان کے اندر دھمال ڈال رہا تھا..... جیسے کوئی بچہ کسی بات پر بہت خوش ہو کر آنکھیں بند کر کے چک پھیریاں کھائے۔

اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے انہوں نے مریم کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھ گود میں دھرے از حد پریشان نظر آ رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کس طرح اس شخص کو بتائے کہ وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ ناممکن ہے۔

”کوئی اتنا پتا کوئی منزل۔“

ان کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔

”ویسے آپ کے ساتھ بغیر کسی منزل کا تعین کیے بھی ساری زندگی چل سکتا ہوں۔“

مریم نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر رنگ ہی رنگ تھے۔ مسکراہٹ ان کی آنکھوں میں چھپی بیٹھی تھی۔

”مریم“ اسے اپنی طرف یوں دیکھتا پا کر وہ چونکے ”مریم میں اپنی بے اختیاری میں نہ جانے کیا کیا

کہہ گیا ہوں۔ آپ کو برا تو نہیں لگا۔ آپ سے تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ میری جسامت.....“

”عادل بھائی“ مریم نے نگاہیں جھکا لیں..... ”یہ جو آپ کہہ رہے ہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ میں

نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ آپ.....“

”تو اب سوچ لیں۔ میں آپ کے سامنے ہوں جیسا بھی ہوں۔ کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیں۔ جانے

ہو تو جان لیں۔“

”آپ بہت اچھے ہیں عادل بھائی، میں جانتی ہوں بالکل پاپا کی طرح مہربان اور شفیق۔ جب پہلا

بار میں نے آپ کو دیکھا تھا تو آپ مجھے بالکل پاپا کی طرح لگے تھے۔ ویسے ہی مہربان اور مجھے ایک

تحفظ کا احساس ہوا تھا، جیسے پاپا کے بعد بھی میں اکیلی نہیں ہوں کوئی.....“

”مریم“ پروفیسر عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پلیز، پہلے میری بات سن لیں۔“

”ہاں کہو۔ جو کہنا ہے کہہ لو۔“ وہ مسکرائے۔

”میں..... میں عادل بھائی میں..... مجھے۔“

نرم نرم لہجے میں باتیں کرتے ہوئے۔

ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے ہوئے حسرت سے کہتے ہوئے۔

”کاش“ مجھے اتنی مہلت مل جاتی کہ میں..... میں نے تمہارے لیے جو سچا ہے مریم وہ بہت خوش کن

ہے۔ بس تمہاری ماما سے ڈر لگتا ہے کہ وہ.....“

ان کی بہت ساری ادھوری باتیں یاد آکر اس کی آنکھیں نم کر گئیں۔

پاپا کی خواہش اس کے لیے بہت محترم تھی..... لیکن

کاش..... اے کاش شہر یا اس کی زندگی میں شامل نہ ہوتا..... کیا وہ محض پاپا کی خاطر ان کی خواہش

پوری کرنے کے لیے شہر یا رکو چھوڑ سکتی ہے۔

کیا شہر یا رکو کے علاوہ کسی اور کے سنگ زندگی بتائی جاسکتی ہے۔

بلاشبہ پروفیسر عادل بے حد نفیس انسان تھے۔

چاہے جانے کے قابل۔

لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو شہر یا رکو کے علاوہ کسی کی رفاقت کا متمنی نہیں تھا۔

ایک لمحے صرف ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ وہ پاپا کی خواہش کے احترام میں اس بے حد نفیس

شخص کا ساتھ قبول کر لے تو اسے لگا جیسے اس کا دل اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہو۔ اس کی رنگت یک دم سپید پڑ گئی

کسی انجانے درد سے مغلوب ہو کر بے اختیار اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔

”میں پاپا کی خواہش.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پروفیسر عادل نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے

سے روک دیا۔

”مریم پلیز اپنے اوپر جبر مت کریں۔“ وہ انتہائی تکلیف سے گزر کر اب ضبط کی انتہاؤں پر تھے۔

”مگر پاپا کی خواہش۔“ مریم نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور اس کی آنکھوں کی سطح نمی پھیل گئی۔

”مرنے والوں کی خواہشات زندہ انسانوں کی آرزوؤں سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں مجھے یقین ہے۔“

انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”اگر پاپا زندہ ہوتے تو وہ اپنی خواہش پر آپ کی آرزو کو ترجیح دیتے اور مریم میں اپنی جلت پر نارم

ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جائیے گا۔ مایوسی کی انتہا پر پہنچ کر اچانک امید کی کوئی

کرن دکھائی دے جائے تو شاید آدمی یوں ہی بے اختیار ہو جاتا ہوگا۔ میں اتنا بے صبر تو کبھی بھی نہیں تھا

مریم کہ میرا بیٹا نہ جھلک جاتا لیکن آپ کو اس طرح اچانک پا کر میں..... بہر حال اسے بھول جائیے گا۔“

وہ اشیئہ نگ پر ہاتھ رکھ سیدھے ہو بیٹھے..... ”اب بتائیے کدھر جاتا ہے۔ کس ہاسٹل میں قیام ہے۔ اپنے

ڈیوڑ وغیرہ ادا کیجیے اور سامان وغیرہ پیک کر لیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آج ہی کسی فلائٹ سے کوئی

سیٹ مل جائے“ نہیں تو کل صبح ہم یہاں سے چلیں گے۔“

”مگر میں.....“

”مریم کوئی آرگنٹ نہیں۔ آپ عثمان احمد کے حوالے سے جانی جاتی ہیں۔ نینا، عاشر اور تیمور ان سے

بہت مضبوط رشتہ ہے آپ کا بہت گہرا۔ وہ وہاں ہیں حویلی میں آپ کو بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا

وہاں۔ ان کے ناتے سے آپ کے لیے حویلی میں بہت گنجائش ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں بات پوری

کر گئے ”اور اگر آپ حویلی نہیں جانا چاہتے پھر بھی میں آپ کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ

چلنا ہوگا۔ میں آپ کو آپ کی ماما کے پاس چھوڑ دوں گا۔“

”نہیں، نہیں ماما کے پاس نہیں۔“

ماما تو اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ کتنی بار اس نے فون کیا تھا لیکن انہوں نے بات

کے بغیر فون رکھ دیا تھا۔

”ماما پلیز میری بات سن لیں ایک بار۔“ اس نے ایک دن التجا کی تھی۔

”میں تم سب کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی۔ آئندہ فون مت کرنا۔ میرے لیے تم سب مر گئے ہو۔“

”تو ٹھیک ہے“ آپ حویلی چلیں۔ آپ میری ذمہ داری ہیں مریم۔ میں نے پاپا سے وعدہ کیا تھا

کہ..... چلیں بتائیں نا آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔ باقی مسائل کا حل گھر چل کر ڈھونڈیں گے۔“

”کیا اسے عادل کے ساتھ جانا چاہیے۔“ مریم نے سوچا اور اس کا دل عاشر اور مور کے لیے بے

تاب ہو گیا۔

انہیں ایک نظر دیکھنے کو ان سے ملنے کو ان سے باتیں کرنے کو..... ایک بار عادل بھائی کے ساتھ چلی

جاؤں پھر دیکھوں گی اور یہاں اکیلے رہنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ لالہ..... لالہ پتا نہیں کب ٹھیک ہوگی۔

ڈاکٹر ٹھیک طرح سے بتا ہی نہیں رہے تھے۔ بس ٹیسٹ ہو رہے تھے میڈیسن دی جا رہی تھیں اور لالہ روز

بروز اور کمزور ہوتی جاتی جا رہی تھی۔ میڈم نرگس اس کا فون ملنے ہی کراچی آگئی تھیں اور لالہ کو دیکھ کر لکھ بھر

کے لیے تو وہ بالکل سارکت سی کھڑی رہ گئی تھیں۔

”یہ..... یہ لالہ ہے؟“

”یہ..... یہ کیا کر لیا تم نے لالو..... تمہارے باپ نے تمہیں قید کر رکھا تھا۔ خون چوس لیا تمہارا۔“ وہ

اس سے لپٹ گئیں۔ لالہ کے آنسو خاموشی سے اس کے رخساروں پر بہتے رہے۔

”ارے“ دیکھ لوں گی اس سومرو کو۔ مقدمہ کروں گی۔ عدالت میں گھسیٹوں گی۔“ وہ بولتی رہیں۔ بڑی

دیر بعد سنبھلیں تو لالہ نے شکایتی نظروں سے مریم کو دیکھا۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا مریم کہ می کو پریشان نہ کرنا۔“

شدید لہر دل میں اٹھی اور آنکھوں کے سامنے دھند سی آگئی۔ مگر اردو بے دردی سے ان کے دل کو چھلنے لگا۔ یہ دنیا جو چند لمحے پہلے بے انتہا خوب صورت اور روشن لگ رہی تھی۔ اب ایک دم ہی اس کی ساری خوبصورتیاں اور سارے رنگ مر گئے تھے۔

حالانکہ دن اتنا ہی روشن تھا۔

اور آسمان اتنا ہی نیلا تھا۔

لیکن انہیں سب کچھ میلا میلا اور ڈل ڈل لگ رہا تھا۔

اتنی دیر سے وہ ضبط کیے مریم سے باتیں کر رہے تھے مگر اب ایک ایسی ان کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مریم کو یہیں چھوڑ کر گاڑی بھگاتے ہوئے دور نکل جائیں۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ان کے ماتھے پر ابھرتے پسینے کے قطرہوں کو دیکھ کر اس نے تشریف سے پوچھا۔

”رومانس کے لیے یہ جگہ انتہائی نامناسب ہے۔“ قریب سے گزرتے ہوئے ایک اسکورسوار نے فخر اچھالا تو ناگواری کی ایک لہری ان کے چہرے پر آ کر گزر گئی۔ یہ تو غنیمت تھا کہ یہاں اس روڈ پر زیادہ رل نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے گاڑی سائیڈ پر کر رکھی تھی پھر بھی یہ مناسب نہیں تھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی اور گاڑی روڈ پر لے آئے۔

”اور اب ذرا رہنمائی کیجیے کس سمت جانا ہے۔“

”وہ اس وقت تو میں آغا خان جاتی ہوں لالہ کو دیکھنے۔“

”اوکے۔“

غیر ارادی طور پر انہوں نے ایک سیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ ان کے اندر آندھیاں چل رہی تھیں اور انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کا وجود کسی تنکے کی طرح شدید طوفان کی زد میں آیا ہوا ہو۔ ادھر سے ادھر ہنچو لے کھا رہا ہو۔ بار ران کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گاڑی کسی شے سے ٹکرا دیں اور لمحوں میں سب ختم ہو جائے۔

ساری تکالیف۔

اور سارے درد ماند پڑ جائیں۔

ایک ناقابل بیان سی اذیت تھی۔

اور ایک انجانا درد تھا جو اندر ہی اندر انہیں گیلے کپڑے کی طرح چوڑ رہا تھا، ان کے ہاتھ سختی سے بڑنگ پر جمے تھے اور وہ ہونٹ بھیچنے ڈراؤ کر رہے تھے۔

”آغا خان کی پارکنگ میں انہیں میڈم نرگس مل گئیں۔ وہ شاید کسی کو خدا حافظ کہنے باہر آئی تھیں۔ ان آنکھیں شدت گرہ سے سوچی ہوئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار مریم نے ان کے ہونٹوں کو لپ اسٹک

”نہیں ہوتی“ میں پریشان وغیرہ اور یہ تم عام وارڈ میں پڑی ہو۔ میڈم نرگس کی بیٹی اور عام وارڈ میں۔“ انہوں نے منٹھیاں بھیچیں ”اور وہ جاگیر دار الو..... وہ اس نے یہاں عام وارڈ میں بیٹی کو داخل کرا دیا۔ کہاں مر گیا ہے وہ..... پوچھوں گی اس سے بیٹی کے علاج کے لیے پیسہ نہیں تھا تو بھیک مانگ لیتا۔“ ”مہی پلین“ ڈیڑی کو تو کچھ معلوم نہیں۔ میں تو جاب کر رہی تھی یہاں.....“ لالہ کا سانس اکھڑنے لگا۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے پورے اسپتال میں ہنگامہ کر ڈالا تھا۔ پہلے فوری طور پر لالہ کو دی۔ آئی۔ پی روم میں منتقل کیا گیا اور دوسرے ہی دن وہ اسے آغا خان لے گئیں۔ ایک سے ایک بڑا ڈاکٹر اور اسپیشلسٹ لالہ کو چیک کر رہے تھے۔ اس کا کیس ڈسکس کرنے کے لیے پورا ایک ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا تھا اور بالآخر انہوں نے متفقہ فیصلہ دے دیا تھا کہ لالہ کو کیمنر ہے..... لکھنؤ میں اور اس کا ایک پھیپہڑا ختم ہے۔ ”نہیں“ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ سب ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں۔ میں لالہ کو امریکا لے جاؤں گی۔ انگلینڈ لے جاؤں گی۔ جہاں بھی ممکن ہوا۔“

میڈم نرگس کو ڈاکٹروں کی بات پر اعتبار نہ تھا اور لالہ کی حالت بہتر نہ تھی۔ اب تو وہ وقفے وقفے سے کومے میں چلی جاتی تھی۔ میڈم کے بیٹوں نے انٹرنیٹ پر ساری دنیا سے رابطہ قائم کیا تھا اور بالآخر لالہ کو انگلینڈ لے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ انتظامات تقریباً مکمل تھے۔ دو چار روز میں شاید میڈم لالہ کو لے جائیں۔ ”مریم“ آپ کیا سوچنے لگیں۔ ہم پر اعتبار کریں مریم اور پلینز بتائیں آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔“

پھر اچانک جیسے مریم کی خاموشی سے انہوں نے خود ہی مطلب اخذ کر لیا۔

”کیا..... کیا یہاں آپ ان کے ساتھ ہیں۔ آئی مین وہ.....“ وہ خود ہی جھجک گئے۔

”نہیں..... نہیں“ شہر یار کو تو پتا بھی نہیں تھا کہ میں یہاں ہوں۔“ ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے

اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا ”میں تو لالہ کے ساتھ آئی تھی۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کون لالہ؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ تب لالہ کے وہاں اچانک ایک روز ”چین دن“ میں نظر آنے سے لے کر اب تک کی ہر بات مریم نے بتادی۔

”تو شہر یار، یعنی کا بھائی ہے۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے ہونٹ کے

کمرے میں الجھا الجھا سوال کرتا ہوا شہر یار آ گیا۔

”جی۔“ مریم کو عادل سے حیا آگئی اور اس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں اور شہر یار کے نام

چہرے پر اتر آئے والے رنگوں نے عادل کو بتا دیا کہ شہر یار کا نام اس کے دل کی سختی پر کتنا گہرا ہو چکا ہے۔

”ہاں بے شک ہی ازاے ویری ٹاکس مین.....“ انہوں نے بے ساختہ تعریف کی اور مسکرائے۔

”فی الحال آپ حویلی چلیں پھر یہ فیصلہ ماں جی کریں گی کہ آپ کو پہلے رخصت کر دیا جائے یا پھر عا

کے ساتھ ہی..... دراصل ڈاکٹر عبدالعید کا اصرار ہے کہ عاشری جیسے ہی فارغ ہو.....“ ایک دم درد کی آ

سے بے نیاز دیکھا تھا۔ وہ وہی کل والی آسانی ساڑی باندھے ہوئے تھیں۔ کل اسی وقت وہ لالہ کو دیکھنے آئی تھی۔ تو لالہ کا سانس یہ مشکل آ رہا تھا لیکن اس نے مسکرا کر مریم کی طرف دیکھا تھا۔
”مومنو یہاں نہ رہنا۔“ اس نے سرگوشی کی تھی ”اور شہر یار سے شادی ضرور کر لینا اور مری کو اور اعزاز کو

حوصلہ دینا۔“

میڈم نرس کے آنے کے فوراً بعد ہی اعزاز بھی آ گیا تھا، خفا خفا اور ناراض سا۔

”تم بے وفا لڑکی، کیوں کیا تم نے ایسا کیوں چھپ گئی تھیں تم مجھ سے؟“

”یہ ضروری تھا اعزاز۔ میں بیمار جو تھی پھر کیا فائدہ تمہیں پریشان کرنے کا۔“

اور اعزاز تو سارا وقت اسپتال ہی میں رہتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اسے لحوں میں اچھا کر دے

اور میڈم نرس دن میں دس مرتبہ اس سے کہتیں۔

”اعزاز لالہ اچھی ہو جائے تو پھر میں دھوم دھام سے اس کی تمہارے ساتھ شادی کروں گی۔ دیکھنا“

اتنی دھوم دھام سے کروں گی کہ یہ شادی لوگوں کو مدتوں یاد رہے گی اور وہ گلبرگ والی کوشی میں لالہ کو جینر

میں دے دوں گی اور تمہارا لیمہ پی سی میں ارنج کروں گی۔“

وہ بولتی رہیں اور لالہ کی آنکھوں میں جگنو چمکتے رہے اور وہ سب سے نظر بچا کر ان جگنوؤں کو اپنی

انگلیوں کی پوروں میں سموتی رہی۔

”تم..... تم آگئی ہو مومنو؟“ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف بڑھی تھیں۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

”آئی لالہ کیسی ہے؟“

”لالہ..... وہ اسے لے گئے کل تمہارے جانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا تھا ”مئی آئی لو یو۔“

”جھلی پائل مجھے اسے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں۔ جب وہ اپنے باپ کے پاس جا

رہی تھی تب بھی مجھے پتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

”آئی۔“ مریم نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر اس کا سانس اکھڑ گیا۔ اس نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں اور کوسے میں چلی گئی۔ وہ اسے آئی۔

پھر اس کا سانس ایسے ہی رہا۔ پھر..... پھر انہوں نے مجھے بتایا۔

انہوں نے پیچھے مڑ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو شاید ان کے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔

”انہوں نے اسے دینی لیٹر لگا دیا ہے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مریم نے اپنے بازوؤں ان کے گرد حائل کر دیے ”آئی پلیز گھبرا نہیں، رو میں نہیں، وہ ٹھیک

جائے گی..... انشاء اللہ۔“

”اچھا، وہ ٹھیک ہو جائے گی نا۔“ انہوں نے اپنے آنسو پونچھے پھر ان کی نظر عادل خان پر پڑی۔

اپنے ہی کسی خیال میں کھوئے ہوئے کھڑے تھے۔

”ارے عادل خان تم..... ڈھونڈ لیا، بالآخر تم نے اپنی مریم کو۔“ انہوں نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن

ہونٹ صرف پھیل کر رہ گئے۔ پروفیسر عادل نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”اب لالہ کیسی ہے؟“

”وہ..... عادل خان، وہ جاری ہے، مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ میں اسے لندن لے جا رہی تھی لیکن

وہ..... پروفیسر عادل کے بازو سے سر نکا کدور زور سے رونے لگیں۔

”مئی پلیز۔“ ان کے بیٹے نے آگے بڑھ کر ان کے گرد اپنے بازو حائل کر دیے۔

”چلیں، اندر چلتے ہیں۔“ پھر اس نے معذرت طلب نظروں سے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا اور

انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

”نہیں میں اندر نہیں جاؤں گی اس کمرے میں جہاں اس کا خالی بیڈ ہے۔“ میڈم نرس چل گئیں۔

”اوکے مئی..... ہم دزیروم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

اور ابھی وہ اسپتال کے لان میں ہی تھے کہ اندر سے تیز تیز چلتا ہوا اعزاز اس کے پیچھے سید امتیاز شاہ

اور ان کے پیچھے میڈم کا دوسرا بیٹا نکلا اور پھر وہ سب میڈم کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ میڈم

نرس نے ان کی طرف دیکھا۔ اعزاز کی آنکھیں ابورنگ ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دم میڈم کے قدموں کے

پاس بیٹھ گیا جیسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی سکت نہ ہو۔

”وہ چلی گئی۔“ اس نے سر اٹھا کر سرگوشی کی ”وہ چلی گئی میڈم۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔

کبھی نہیں۔ میں اس سے ناراض ہوں بہت زیادہ ناراض ہوں۔ بہت زیادہ۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ

چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میڈم نرس ساکت کھڑی تھیں خاموش۔ میڈم کے بڑے بیٹے ایک

قدم آگے بڑھے۔ ”ابھی وینی لیٹر اتارنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ شاید دو تین یا چار دن لیکن اچانک ہی

سب کچھ ختم ہو گیا۔ سارے نظام نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اور.....“

”نہیں۔“ میڈم نرس کی آنکھیں خشک تھیں مگر ہونٹوں پر مدھم مدھم مسکراہٹ نمودار ہوئی ”وہ بڑی ایکٹر

ہے۔ بچپن ہی سے قماشے کرتی آئی ہے میرے توجہ حاصل کرنے کے لیے۔

مجھے روکنے کے لیے۔ ایک بار اس نے میٹرھیوں سے چھلانگ لگا دی تھی۔ مہینوں پلاسٹر پڑھا رہا تھا

پھر ایک بار اس نے تھیلی میں چاقو کھینچ لیا تھا، تمہیں تو پتا ہے مومنو۔ تم ہی بتاؤ سب کو۔“ انہوں نے مریم کی

طرف دیکھا ”وہ ایسے ڈرامے کرتی رہتی ہے۔ اب وہ چاہتی تھی نا کہ میں اس کے پاس خود آؤں تو بیمار بن

کر بیٹھ گئی۔ کچھ نہیں ہوا اس کو۔ میں خود دیکھتی ہوں جا کر اسے۔“

”مئی مئی۔“ دونوں بیٹے ایک ساتھ ان کی طرف لپکے تھے اور دونوں نے ہی انہیں سنبھالنے کی کوشش

حویلی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ پاپا کے بیٹے کا گھر تھا اور وہاں عاشی بیٹا اور مور تھے۔

وہ عادل کے ساتھ آتو گئی تھی کہ اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ لالہ چلی گئی تھی اور وہ اکیلی تھی۔ اسے تو کچھ ہوش نہیں تھا۔ کب لالہ کو اسپتال سے گھر لے جایا گیا۔ میڈم کے بیٹوں کے گھر وہاں ہی تھے کراچی میں اور کب اس کی میت لاہور پہنچی..... اسے کچھ خبر نہیں تھی..... اسے بالکل خبر نہیں تھی۔ پروفیسر عادل ہی تھے جو اسے سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ اس کی آنکھوں کے آگے تو بار بار اندھیرا اُجاتا تھا۔ میڈم کے گھر کے وسیع و عریض لاؤنج میں لالہ کی میت رکھی تھی۔ اس کے بھائیوں نے اسے پھولوں سے لاد دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یوں جیسے ابھی ایک لمحے میں تہقہہ لگا کر اٹھ بیٹھے گی اور ہنستے ہنستے بے حال ہو جائے گی۔

”ارے میں تو یونہی ایکٹنگ کر رہی تھی۔“

لیکن وہ تو اسی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ اسے لاہور لے جانے کے انتظامات ہو رہے تھے اور میڈم نرس کی حالت پاگلوں کی طرح ہو رہی تھی۔

کبھی وہ سمر کو گالیاں دیے لگتیں، کبھی لالہ کو جھنجوڑنے لگتیں۔

”بس بہت ہو گیا اب اٹھ جاؤ۔“

کبھی وہ اعزاز کو آوازیں دیتیں۔

”جاؤ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ شادی کی تیاری کرو۔“ اور مریم کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

وہ اس کی پٹی پر سر رکھے بیٹھی تھی کہ اسے اپنے کندھوں پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ مسز ارباب تھیں۔

”تم اپنی ماما کے پاس انگلینڈ نہیں گئی ہو اب تک؟“

وہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

ان کی تیز نظریں اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئیں اور ان کی انگلیاں اسے اپنے بازوؤں میں جھمتی ہوئی لگیں۔

”تو پھر کل سے جا ب پر آ جاؤ۔ تم وہیں ہونا آنٹی کے ہاسٹل میں؟“

وہ پیچھے ہٹ گئی تھیں لیکن کتنی دیر تک اس کے وجود میں سنسنی سی طاری رہی۔ اسے لگتا تھا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔

لالہ کے جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ جب اسے لے جانے لگے تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی

کی تھی اور بیٹوں کی بانہوں کا سہارا پاتے ہی وہ بکھر گئیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ان کے بیٹے بھی رو رہے تھے۔

”دیکھو لالہ تم کہتی تھیں ناکہ وہ می کے بیٹے ہیں میرے بھائی نہیں ہیں۔“ مریم نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

وہ سب کس بری طرح رو رہے تھے۔ ان سارے بیٹے دنوں میں مریم جب اسپتال آئی تھی اس نے انہیں وہاں ہی پایا تھا۔ چوبیس گھنٹے وہ ان کی بیویاں ان کے بچے وہاں ہی ہوتے۔ لان میں بیٹھے یا اس کے پاس سب رو رہے تھے اور مریم کا دل جیسے ہولے ہولے ڈوب رہا تھا۔ اس کی رنگت ہلدی کی سی ہو رہی تھی اور آنکھوں کے آگے دھند سی چھاری تھی۔ اس نے سہارے کے لیے بے اختیار نزدیک کھڑے پروفیسر عادل کے بازو پر ہاتھ رکھا..... پروفیسر عادل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اسے سہارا دیتے ہوئے قریب ہی نشست پر بٹھا دیا۔

”مریم حوصلہ کریں پلیز۔“

”عادل بھائی۔“ مریم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر ان کے بازو سے سر ٹکا کر رونے لگی۔



”بجو۔“ عاشی نے مریم کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا ”آپ نے بتایا نہیں ماما نے کیا کہا تھا۔ وہ آپ سے اچھی

طرح ملی تھیں، انہوں نے میرا پوچھا تھا؟“

بتانے کے لیے تھا ہی کیا جو وہ عاشی کو بتاتی۔ سوائے اسے دھی کرنے کے۔ وہ تو جب سے نوبت والا سے ہو کر واپس آئی تھی چھپ کر یہاں بی آپا کے گھر بیٹھی تھی صرف اس لیے کہ وہ عاشی کو دیکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عاشی کو کس طرح بتائے کہ ماما انہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

”تیور نے کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں وہ کہہ رہا تھا بجو سے پوچھ لو۔“

”اچھا۔“ مریم نے افسردگی سے اسے دیکھا ”کیا ماما بہت خفا ہوئی تھیں۔ بہت ناراض ہوں گی ہے

نا۔“ وہ مسکرائی ”لیکن مجھے پتا ہے پھر انہوں نے معاف کر دیا ہوگا۔ کیا انہوں نے گھر آنے کے لیے کہا ہے

اور عاصمہ! ماما وہ سب لوگ کیا ابھی وہاں ہی ہیں ہمارے گھر؟“

عاشی کی آنکھوں میں جگنو سے اتر آئے تھے۔ مریم نے ایک گہری سانس لی۔ ماما کا رویہ عاشی کی

توقعات کے بالکل برعکس تھا اور وہ خود کتنے یقین سے گئی تھی نوبت والا حالانکہ پروفیسر عادل نے بڑے

رسان سے سمجھایا تھا کہ وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ جانا چاہتی تھی۔

ماما کے سوا اس کا اپنا کون تھا۔

تھی۔ پروفیسر عادل اس کے پاس آگئے۔

”مریم! آگلی فلائٹ سے دو بیٹیں مل گئی ہیں۔“

اس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ ابھی اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ پروفیسر عادل کے ساتھ جائے یا نہیں۔ وہ یوں ہی کھڑی تھی خاموش۔

”مریم چلیں پلینز۔ ابھی آپ کو ہاسٹل سے اپنا سامان بھی لینا ہوگا۔“

”مومو یہاں نہ رکنا۔ حویلی یا ماما کے پاس چلی جانا۔“ لالہ نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اسے اپنے بازوؤں میں مزار باب کی اٹھکیاں کھینچتی محسوس ہوئیں۔

”اگلی لڑکی کے لیے قدم قدم پر بھیڑے موجود ہیں۔“

لالہ عمر میں اس سے چھوٹی تھی لیکن اس کی باتیں کتنی میٹھورڈ ہوتی تھیں وہ ہمیشہ لالہ سے متاثر رہی تھی جب وہ لاہور میں تھی تب بھی اور اب جب لالہ کے ساتھ یہاں ہاسٹل میں تھی تب بھی لالہ نے ہمیشہ اسے حیران کیا تھا..... اور اب بھی حیران کر کے چلی گئی تھی۔

وہ خاموشی سے عادل کے ساتھ ہاسٹل چلی آئی۔

لالہ کی موت کا سن کر وہاں کھلبلی مچ گئی۔ سب ہی اس کے کمرے میں اکٹھے ہو گئیں۔ وہ خاموشی سے سامان سمیٹتی رہی۔

اس کے جانے کا سن کر سب کو حیرت ہوئی تھی لیکن سب اسے گیٹ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی تھیں۔ لاہور آ کر وہ میڈم نرگس کی طرف آگئی تھی۔ وہ لالہ کی آخری رسوم میں شریک ہونا چاہتی تھی..... آخری لمحے تک اسے دیکھنا چاہتی تھی۔

پروفیسر عادل اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے ایر پورٹ سے سیدھے میڈم نرگس کے گھر ہی لے گئے تھے۔ جہاں ایک کھرا م چا تھا۔ لالہ کے سوئم تک وہ وہاں ہی تھی میڈم نرگس کے پاس۔ وہ اسے اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی رہتیں۔

”مجھے بتاؤ لالہ کیا کرتی تھی۔ کیا کہتی تھی۔ کیا باتیں کرتی تھی۔ اس کے ایک ایک لمحے کا حال بتاؤ جو تم نے اکٹھے گزارے تھے۔“

وہ یاد کر کے بتاتی رہتی۔ وہ اشتیاق سے سنتی رہتیں اور جب وہ بات ختم کرتی تو وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگتیں۔ اس روز لالہ کا سوئم تھا۔ وہ میڈم نرگس کے پاس بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھی کہ اس نے ماما کو آتے دیکھا۔

سیاہ لباس میں نچرل لک دیتے ہوئے میک اپ کے ساتھ وہ ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہی تھیں۔ وہ میڈم نرگس کی فاسٹ فرینڈ تھیں سولالہ کی موت کی خبر سننے ہی آگئی تھیں۔

”یوں بھی چند روز میں ہمیں آنا ہی تھا۔“

”ماما۔“ وہ مسز آفندی کو بتا رہی تھیں جب مریم نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کہا۔ انہوں نے بغیر اس کی طرف دیکھے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”ماما۔“ وہ ان کے سامنے آگئی۔ مسز آفندی کسی اور خاتون کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”مومومت کرو مجھ سے بات۔“

”ماما پلینز میری بات سن لیں۔“

”نہیں ہوں میں تمہاری ماما۔“

”ماما۔“ اس نے سسکی لی ”ماما آپ چلی گئی تھیں..... عاشی عادل بھائی کے ساتھ جا رہی تھی۔ میں وہاں نہیں جاسکتی تھی۔ آپ ہی نے تو کہا تھا۔ اس لیے میں لالہ کے ساتھ کراچی چلی گئی تھی۔ وہ مجھے اچانک مل گئی تھی اور ماما وہاں گھر میں وہ امان تھا۔ بہت غلیظ انسان۔“

”فضول مت بولو۔ تم ہمیشہ سے یہ ہی کرتی آئی ہو۔ عاشی کو بھی تمہاری شہمہ تھی۔ تمہیں ہر شریف آدمی فضول لگتا ہے۔“

”ماما پلینز میرا یقین کریں میں نے عاشی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ امان سے چڑتی تھی۔ وہ اچھا آدمی نہیں تھا ماما۔ وہ تنگ کرتا تھا ماما۔ مجھے عاشی کو اور.....“

”زنی یار یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔“ ماما کی کوئی جاننے والی ان کے قریب آگئی تھیں اور ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر نفس رہی تھیں ”بڑا حوصلہ ہے بھئی۔ اس عمر میں رسک لے لیا۔“

”آخر غصہ نرگس کو بھی تو اپنا نام لیوا چاہیے تھا نا۔“ یہ مسز آفندی تھیں۔ وہ خاموش کھڑی تھی اور ماما کے چہرے پر شفق سی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں جیسے تارے اتر آئے تھے۔ وہ اسے یکسر نظر انداز کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

”ارے یہ مریم ہے نا تمہاری بیٹی۔“ ان کی جاننے والی خاتون نے اس کی طرف دیکھا ”میں نے پہچانا نہیں دراصل کافی عرصے بعد دیکھا ہے اور پھر یہ کچھ کمزور لگ رہی ہے۔ شاید بیمار ہے کچھ۔“

تب ماما نے پہلی بار نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر نرم نرم سا تاثر تھا۔ جیسے انہیں بھی اس کی کمزوری پر تشویش ہو اور مریم کے چہرے پر ایک نامعلوم سی خوشی اتر آئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ ماما اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہیں گی تو وہ ان کے ساتھ نینب ولا چلی جائے گی۔ وہ پروفیسر عادل کے ساتھ حویلی نہیں جائے گی اور پھر ماما کو منا کر وہ عاشی نینا اور مومو کو بھی لے جائے گی لیکن اسے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ قرآن خوانی اور کھانے کے بعد ماما کب چلی گئی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی اسے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا گر ا تھا اور وہ خاموشی سے پروفیسر عادل کے

ساتھ ان کے گھر چلی آئی تھی۔

”کل صبح ہم حویلی چلیں گے۔ اس وقت دیر ہوگئی ہے۔ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ رات آرام کر لیں۔ جانے کتنی راتوں سے آپ سوئی نہیں ہیں۔ صبح سویرے ہی حویلی چلیں گے۔“ پروفیسر عادل نے اس سے کہا تھا لیکن وہ حویلی جانے سے پہلے ماما سے ملنا چاہتی تھی مگر فون پر عاشری اس کی آواز سنتے ہی اس بری طرح روئی تھی کہ خود اسے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ عاشری کے کالج کی چھٹیاں تھیں اور وہ حویلی میں تھی۔

”آپ..... آپ کب آرہی ہیں۔“

”جانتیں آؤں گی بھی یا نہیں۔“ اور کیا خبر ماما کے پاس ہی رک جاؤں۔ اس نے سوچا۔

”جیسے پلیر“ آپ صبح ہی آجائیں۔ میں بہت زیادہ آپ کے لیے اداس ہوں بہت زیادہ۔ پھر تیسرے روز بھی بہت تیز بخار ہے۔ وہ مدہوشی میں بھی آپ کو بلاتا ہے، کبھی ماما اور پاپا کو۔“ وہ پھر رو دی اور وہ بے چین سی ہو گئی۔

”مور وہاں ہے۔ اسے کب سے نمبر بچر ہے؟“

”اسے کئی دن سے نمبر بچر ہے۔ اس کے ہاسٹل سے فون آیا تھا تو ڈرائیور جا کر اسے لے آیا تھا۔ عادل بھائی کراچی گئے ہوئے تھے نا اور آپ کہاں چلی گئیں تھیں۔ بچو۔ آپ نے نہ اپنی خبر دی نہ ہماری لی۔“ شاید عادل نے ابھی کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

”تیور بیمار تھا۔“ وہ ٹرپ اٹھی۔

”میں کل عادل بھائی کے ساتھ آ جاؤں گی تو سب بتا دوں گی۔“

اس نے سوچا تھا وہ عاشری اور تیور سے مل کر پھر واپس آ جائے گی ماما کے پاس لیکن.....

بی آپا اور ماں جی سب کتنی محبت اور چاہت سے ملے تھے۔

اسے بی آپا کی خفگی، ماں جی کی اپنائیت بھری سرزنش۔ وہ ان محبتوں کی پھوار میں کتنی ہی دیر تک بھگتی رہی اور اس نے سوچا تھا کیا اس نے کراچی جا کر غلطی کی تھی..... لیکن نہیں ہر بات میں کوئی نہ کوئی خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ اگر وہ لالہ کے ساتھ نہ جاتی تو..... شاید کسی کو خبر بھی نہ ہوتی اور وہ خاموشی سے ایک دن مرجاتی۔ تیور تو اس سے سخت ناراض تھا بے حد نفخا۔

”مجھ سے بات مت کریں مومو۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لہلہاں بھری ہوئی تھیں لیکن مریم نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور کتنی ہی دیر تک اپنے ساتھ لپٹائے روتی رہی۔

اسے ٹائیفاؤ ڈھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا اور اگرچہ وہ میڈسن بھی لے رہا تھا اور کافی بہتر تھا پھر بھی پروفیسر عادل چاہتے تھے کہ ایک بار لاہور لے جا کر وہ کسی اسپیشلسٹ کو دکھادیں تو مریم بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

”ہم رات تک واپس آ جائیں گے مریم۔ آپ کو محض سفر کی تکلیف ہوگی۔“

”وہ دراصل میں ماما سے بھی ملنا چاہتی ہوں۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں مریم پھر بھی آپ کی خواہش ہے تو۔“ انہوں نے نگاہیں جھکائے اسے اپنی اور نذیب کی گفتگو بتا دی لیکن اس کا خیال تھا کہ تب ماما کو بہت غصہ تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ ان کا غصہ اتر چکا ہے۔ ان کے چہرے پر جو نرم نرم سا تاثر اسے دکھائی دیا تھا اس نے بڑی تقویت دی تھی اسے اور عاشری بھی پر امید تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ ماما کو بہت مس کر رہی ہے اور اپنے گھر کو بھی۔

”بجو ماما کی خفگی ختم ہو چکی ہوگی ہے نا۔ شاید میں نے غلط کیا تھا۔ مجھے اس طرح عادل بھائی کے ساتھ آنا نہیں چاہیے تھا لیکن ماما کو بھی دیکھا تھا، آپ نے کس طرح انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہم ان کے گھر سے چلے جائیں لیکن بجو اگر ماما بہت زیادہ ناراض نہ ہوئیں تو ہم چلیں گے اور بجو ماما کو بتانا کہ میں اب بی بی اے فاسٹل میں ہوں اور میرے مارکس ہر سبجیکٹ میں بہت اچھے آتے ہیں اور سب اساتذہ میری بہت تعریف کرتی ہیں۔“

”ضرور بتاؤں گی۔“ مریم نے اس کے رخسار تھپتھپائے لیکن وہ تو ماما سے کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ ماما کا موڈ بہت خراب تھا وہ اپنے بیڈروم میں تھیں اور لیڈی ڈاکٹر ان کا بی بی چیک کر رہی تھی۔ پروفیسر عادل گاڑی اندر نہیں لائے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ یہاں ہی ان کا انتظار کرتے ہیں۔ تیور نے بھی اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”کیوں۔“ اسے حیرت ہوئی تھی ”ماما سے نہیں ملو گے؟“

”نہیں۔“ تیور نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا ”وہ بھی تو ہم سے ملنا نہیں چاہتیں۔“

”اور میں اکیلی جاؤں اندر۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ اس کی آنکھیں نم سی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا کتنا دل چاہ رہا ہوگا ماما سے ملنے اور ان کو دیکھنے کو۔ وہ کس قدر سنجیدہ اور خاموش ہو گیا تھا لیکن وہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ وہ انہیں مس کرتا ہے۔

”میرا بھائی ہے نا میرے ساتھ۔ میرا حافظہ تو پھر میں اکیلی کیوں جاؤں اندر۔“

”آپ پہلے بھی تو چلی گئی تھیں اکیلی کراچی۔“ ناراض سے لہجے میں کہتا ہوا وہ اس کے ساتھ اندر چلا آیا تھا اور مریم کو اس کی ناراضی پر بے حد پیارا آیا تھا۔

”غلطی ہو گئی میری جان۔ سوری نا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر آئی تھی۔ اندرون کی گیٹ صفو نے کھولا تھا اور پھر جیسے خوشی سے پاگل ہو کر شریف کو آوازیں دینے لگی تھی۔ پھر شریف، صفو، جیناں سب ہی لوگ روم میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

”ارے بی بی، شکر ہے، آپ آ گئے ہو۔“ شریف نے شکر ادا کیا تھا۔ وہ سب ہی ان کی آمد پر خوش

ہو گئے تھے۔

”اے کون ہے۔ کیوں شور مچا رکھا ہے؟“ ٹی وی لاؤنج سے اماسن نے آواز دی تھی۔

”ماما کہاں ہیں؟“ اس نے صفو سے پوچھا تو اس نے بتایا۔

”اپنے بیڈروم میں ہیں لیڈی ڈاکٹر آئی ہوئی ہے۔“

”طبیعت خراب ہے کیا؟“

”جی بس۔“ صفو مسکرائی تو وہ ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر اماسن نیم

دراز کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

”آہا! آج تو بھرتی صلیب کی سواری باد بہاری آئی ہے۔ تب ہی اتنا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ خیر چیز ہی ہنگامہ

پاکر نے والی ہو۔“

مریم اسے نظر انداز کر کے ماما کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تیمور کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور پھر

دروازے پر دستک دے کر وہ اندر چلی گئی۔ نذیب لیٹی ہوئی تھیں اور ڈاکٹر ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔

مریم اور تیمور کو دیکھ کر ان کی پیشانی پر ناگوار سی شکلیں پڑ گئیں اور انہوں نے رخ موڑ لیا۔

”ماما۔“ مریم تڑپ کر آگے بڑھی ”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

وہ خاموش رہیں۔

”ماما پلیز آپ خفا نہ ہوں میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ.....“

”مومو۔“ انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا ”کیوں یہاں آئی ہو اب..... کس لیے؟“

”ماما آئی لو یو ماما، بلیوی۔“

”چلی جاؤ یہاں سے مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے اب۔“

”ماما۔“ مریم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن وہ یک دم غصے سے چلا اٹھیں۔

”یہ گھر میرا ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے اسے چھوڑا تھا مومو اور اب جہاں جی چاہے رہو میرے لیے تم

سب مر چکے ہو۔“

مریم لمحہ بھر ساکت کھڑی رہی۔ ماما اتنا بدل چکی ہیں انہوں نے تیمور کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

”آپ جاتی کیوں نہیں۔“ غضنفر ملک واش روم سے باہر آیا تھا ”چلی جائیں اور آئندہ یہاں قدم نہ

رکھیے گا اور آنے سے پہلے سوچ لیجئے گا۔ یہ نذیب ولا نہیں ملک ہاؤس ہے۔“

وہ غضنفر ملک جو خاموش رہتا تھا ان کے کسی معاملے میں کبھی نہیں بولتا تھا اب تیز لہجے میں بول رہا تھا۔

اس نے پھر ماما کی طرف دیکھا جنہوں نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا تھا۔

”زینی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور آپ کی آمد ان کی طبیعت کو مزید خراب کر رہی ہے اس سے پہلے کہ

مجھے خود آپ کو نکلوانا پڑے آپ چلی جائیں یہاں سے۔“

”ہاں جاؤ جاؤ چلی جاؤ اور جلی جا کر رہو۔“

ماما چھین تو اس کی ساکت وجود میں جنبش ہوئی اور وہ تیمور کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلی آئی۔ ٹی وی لاؤنج

میں پھر اماسن صوفے پر نیم دراز ہو چکا تھا۔ عاصمہ اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے

ایک طنزیہ نظر اس پر ڈالی۔ گویا اس کا کمرہ اب اس کے قبضے میں تھا۔ اماسن نے اسے دیکھ کر آنکھ دبا لی ”کہو

تو سفارش کر دیں میری جان۔“

غصے سے لال چہرے کے ساتھ وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئی..... پروفیسر عادل نے کچھ نہیں پوچھا تھا اور

نہ ہی تیمور نے کچھ کہا تھا۔

”بتائیں نا بوجو ماما نے کیا کہا تھا؟“ عاشری نے اس کا گھٹنا ہلایا تو وہ چونکی۔

”عاشری۔“ مریم نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ”ہاسل میں مسز ساجدہ کہتی تھیں کہ جو

لڑکیاں ایک بار اپنے گھروں سے نکل جاتی ہیں ان کے لیے واپسی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں لیکن بوجو ہم کسی کے ساتھ بھاگے تو نہیں ہیں اپنے بھائی کے گھر آئے ہیں۔“

”پھر بھی ماما کے دل میں ہماری گنجائش نہیں رہی۔ مور کی بھی نہیں اور جب دل میں گنجائش نہ ہو تو گھر

میں گنجائش کیسے ہو سکتی ہے۔“

عاشری کے چہرے پر زردی سی کھنڈ آئی تھی۔

”وہاں میرے کمرے میں عاصمہ تھی اور.....“ مریم نے عاشری کی طرف دیکھا اور پھر اس کا چہرہ دونوں

ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چوم لی ”تم اتنی پریشان نہ ہو۔ بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں

نا اور تمہارے پاس مان ہے اپنے بھائی کا (سو تیرا ہی سہی) ہے تو۔ اپنے باپ کے گھر رہ رہی ہو اور میرے

پاس تو یہ مان بھی نہیں ہے۔“ اس کی آواز بھیک گئی ”اور خوش قسمتی سے سب لوگ بہت اچھے ہیں۔“

”لیکن بوجو ماما ہمیں معاف بھی تو کر سکتی تھیں۔ عاصمہ وغیرہ کو کوئی اور گھر لے کر دے سکتی تھیں۔“

”ہاں لیکن ایسا نہیں ہے نا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے جو ہم نہیں سوچتے۔“ اس نے انگلی کے

پوروں سے اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”اور دیکھو تمہارا اصل گھر تو ڈاکٹر عبدالعزیز کا گھر ہو گا نا۔“ مریم نے مسکرا کر اس کا ذہن بٹانے کی

کوشش کی۔

”عادل بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ بہت جلد شاید ایک دو ماہ تک ڈاکٹر عبدالعزیز کو تمہاری شادی کی تاریخ

لے دیں گے۔“

”اور آپ؟“ عاشری نے پوچھا۔

”میں..... میرا خیال ہے کہ عادل بھائی سے کہہ کر کوئی اچھی سی جاب کر لوں گی اور پھر وہاں ہی کوئی گھر کرائے پر لے کر نینا اور مور کو بھی اپنے پاس رکھ لوں گی۔“

”عادل بھائی مان جائیں گے۔“

”ہاں انہیں ماننا ہی ہوگا۔ میں کب تک یہاں رہ سکتی ہوں عاشی۔“ مریم کے لہجے میں ایک دم تھکن سی اتر آئی۔

”بجوا ایک بات کہوں۔“ عاشی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ضرور۔“ مریم نے بے حد پیار سے اسے دیکھا۔

”بجوا وہ ڈاکٹر شہریار..... میرا مطلب ہے عینی کے بھائی۔ اگر وہ پاکستان آ گئے ہوں تو انہیں کہیں تاکہ وہ عادل بھائی کے پاس آئیں اور آپ کے لیے بات کریں ان سے۔“

”پاگل ہو تم عاشی۔“

”نہیں بجوا اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔ میں جانتی ہوں آپ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ماما شاید ڈاکٹر شہریار کا پو پو ل بھی قبول نہ کرتیں لیکن عادل بھائی.....“

”نہیں عاشی یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیا بات ممکن نہیں ہے بھئی؟“

”پروفیسر عادل نے اندر آتے ہوئے پوچھا تو مریم شپٹا گئی۔“

”یہ عادل بھائی یہ جو بوجو ہیں نایہ.....“

مریم نے تنبیہی نظروں سے عاشی کی طرف دیکھا اور اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ دراصل میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیوں؟“ پروفیسر عادل نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا اور پھر فوراً نگاہیں جاے۔ رخصتی بھلے سال بعد ہو اور ماں جی گھبرائی بیٹھی تھیں۔

”جھکا لیں..... وہ دانستہ اس کے سامنے آنے اور اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے تھے۔ کس قدر مشکل لمحے ہوتے تھے ان کے لیے جب وہ ان کے سامنے ہوتی تھی اور وہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھتے نہیں تھے۔ وہ ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی تو انہیں لگتا تھا جیسے وہ اختیار کھو بیٹھیں گے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مریم کو نرس کے گھر چھوڑ کر دل پر بے انتہا بوجھ لیے وہ گھر آئے تو ماں جی کا خون دل ایسا کروبی آپا کو لے کر لاہور چلے جاؤ اور نئے زمانے کا اچھا سا سیٹ لے آؤ نکاح پر وہی ایک سیٹ

بھا دیں گے۔ باقی کا زیور بعد میں دے دیا جائے گا۔“ اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”کہاں جا رہے ہو عادل؟“ انہوں نے انہیں کھڑے ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”بی آپا کی طرف۔“

”اچھا ادھر اگر عاشی ہو تو اسے ادھر بھیج دینا اور بی آپا کو کہنا فارغ ہو کر آئے۔“

”عادل۔ سراب کے پیچھے بھاگنے سے فائدہ بیٹا۔ میرے پاس زیادہ وقت کہاں رہا ہے عادل کہ.....“

”ٹھیک ہے ماں جی آپ نے جو مناسب سمجھا۔“ بہ مشکل انہوں نے کہا اور پھر جیسے بے اختیار سے ہو گئے اور ریسیور کیڈل پر ڈالتے ہوئے رو دیے۔ کتنی ہی دیر تک بازوؤں پر سر رکھے وہ روتے رہے تھے۔ پھر بھی جیسے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ اس روز کے بعد سے مریم سے ان کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے حوصلی بھی لے آئے تھے لیکن خود اس سے بی آپا اور ماں جی سے بچتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ماں جی ان سے کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن انہوں نے انہیں کہنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

”بس ماں جی کچھ مت کہیے گا۔“

”مریم کب کہاں اور کیسے ملی تم نے بتایا کیوں نہیں۔“

”ماں جی پلیز یہ چیئر اب کلوز ہو چکا ہے۔“

”تم تو نہیں ہو عادل۔ میں رحمن بھائی سے معذرت کر لیتی ہوں۔“

”نہیں ماں جی..... لیکن پلیز مجھے تھوڑا سا وقت ضرور دیں..... رخصتی میں جلدی مت کیجیے گا۔ بھلے منگنی وغیرہ کی رسم کر دیں۔“

”عادل بیٹا مجھے معاف کر دینا۔“ انہوں نے پروفیسر عادل کے ہاتھ تھام لیے تو وہ شرمندہ ہو گئے۔

”ماں جی پلیز آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

”حریم بہت اچھی لڑکی ہے مجھے یقین ہے تم خوش رہو گے اس کے ساتھ۔“

”جی ماں جی۔“ انہوں نے ماں جی کو تسلی دے دی تھی لیکن خود ان کا دل کسی طور بہل نہیں رہا تھا..... ماں جی کپڑے نکالنے بیٹھی تھیں۔ عبدالرحمن چاچا کا خیال تھا کہ منگنی کے ساتھ نکاح بھی کر دیا جائے۔ رخصتی بھلے سال بعد ہو اور ماں جی گھبرائی بیٹھی تھیں۔

”نکاح کی رسم ہے تو مہمان بھی سب ہوں گے۔“

”ماں جی پلیز انہوں نے درخواست کی ”سادگی سے کر دیں جو بھی کرنا ہے۔“

”پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ میرا پناز یور تو سارا پڑا ہے جوں کا توں مگر نئے زمانے کا بھی ہوتا

ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی تو انہیں لگتا تھا جیسے وہ اختیار کھو بیٹھیں گے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مریم کو نرس کے گھر چھوڑ کر دل پر بے انتہا بوجھ لیے وہ گھر آئے تو ماں جی کا خون دل ایسا کروبی آپا کو لے کر لاہور چلے جاؤ اور نئے زمانے کا اچھا سا سیٹ لے آؤ نکاح پر وہی ایک سیٹ

بھا دیں گے۔ باقی کا زیور بعد میں دے دیا جائے گا۔“ اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”کہاں جا رہے ہو عادل؟“ انہوں نے انہیں کھڑے ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”بی آپا کی طرف۔“

”اچھا ادھر اگر عاشی ہو تو اسے ادھر بھیج دینا اور بی آپا کو کہنا فارغ ہو کر آئے۔“

”نہیں کروں گی۔“

”جی ماں جی۔“ آواز جیسے ان کے حلق میں ہی گھٹ گئی۔

اور یہاں عاشی کے ساتھ مریم بھی تھی۔ مریم یہاں حویلی میں تھی تو وہ اس سے کتنا بھاگتے اور مریم کے ہوتے خود کو سنبھالنا ضبط کرنا کتنا مشکل تھا انہوں نے سوچا تھا کہ واپس لاہور جانے سے قبل وہ سرور سے مل کر اسے کہیں گے کہ شہر یار سے کہو وہ اپنے والدین کو ماں جی کے اور ان کے پاس بھیجے۔ شاید مریم اور شہر یار کی شادی کے بعد ان کا بے قابو دل سنبھل جائے۔

”آپ نے بتایا نہیں مریم، کیوں جاب کرنا چاہتی ہیں آپ؟“ اپنے خیالات کو جھٹک کر انہوں نے پوچھا۔

”میں۔“ مریم نے سراٹھا کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کھڑے تھے۔

”مجھے کسی پر بوجھ نہیں بننا اور میں یہاں حویلی میں کب تک رہ سکتی ہوں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے عاشی کی شادی تک میں یہاں رکوں گی۔ پھر مجھے جانا ہی ہے اور جاب بھی کرنا ہے۔ میری خواہش ہے عادل بھائی کہ مجھے اگر کوئی اچھی جاب مل جائے تو میں مور اور نینا کو اپنے ساتھ رکھوں۔ میں نے پاپا سے وعدہ کیا تھا کہ میں ہمیشہ ان کا خیال رکھوں گی۔ پاپا جانتے تھے کہ ماما زیادہ عرصے تک ہمارے ساتھ نہیں رہ پائیں گی۔ میں نہیں جانتی کہ میں نے اس طرح لالہ کے ساتھ جا کر غلطی کی تھی یا نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اور عاشی کو اس طرح گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھے لیکن اب جو ہوا سو ہو اگر آئندہ کے لیے میں نے بہت سوچا ہے اور مجھے آپ کے تعاون اور ماں جی کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور پروفیسر عادل خاموشی سے سن رہے تھے۔

”لیکن میں نے تو آپ کے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا مریم۔“

”کیا؟“ مریم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تب ہی ملازمہ نے آکر عاشی سے کہا ماں جی اسے

بلارہی ہیں۔

”اوہ مجھے خیال ہی نہیں رہا عاشی آپ سے کہنا۔ ماں جی بلارہی تھیں۔“ وہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے اور عاشی کے جانے کے بعد مریم کی طرف دیکھا ”میں نے تو سوچا تھا مریم کہ میں شہر یار کو پیغام بھجواتا ہوں کہ وہ اپنے والدین کو حویلی بھیجیں، ماں جی کے پاس۔ آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن فی الحال آپ ماں جی کی سرپرستی میں ہیں۔۔۔۔۔ بے شک آپ کے نزدیک حویلی سے آپ کا کوئی ناتانہ ہو لیکن کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا بظاہر کوئی نام نہیں ہوتا لیکن وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔“ انہوں نے بات مکمل کر کے مریم کی طرف دیکھا وہ خاموش بیٹھی تھی۔

”مریم۔“ انہوں نے پھر آہستگی سے اسے بلاتے ہوئے بات شروع کی ”میں آج سرور سے

کہوں گا کہ وہ شہر یار۔۔۔۔۔“

”پلیز نہیں۔۔۔۔۔ بالکل نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے؟“ انہوں نے حیرت سے مریم کی طرف دیکھا ”شہر یار کا کوئی پرالہم ہے؟“

”وہ دراصل۔۔۔۔۔“ مریم نے مختصر آساری بات بتادی۔

”مگر یہ تو کوئی جواز نہیں ہے مریم۔ میں خود بات کروں گا ان سے۔ شہر یار سے ان کے والدین سے۔“

”نہیں پلیز نہیں۔“

وہ مریم سے محبت کرتے تھے اور اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ سر جھکائے بے حد مضطرب اور بے چین لگ رہی تھی۔

”انہیں لگا، جیسے اس کا دل ان کے دل میں اتر آیا ہو۔“

”مریم میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ آپ جاب کریں اور اکیلی رہیں۔ آپ اپنے آپ کو بوجھ نہ سمجھیں۔ پلیز آئی ریکونسٹریو اور مجھے اجازت دیں کہ میں شہر یار۔“

”پلیز عادل بھائی۔“ مریم نے سراٹھایا تو اس کی آنکھیں ٹیلی ہو رہی تھیں ”شہر یار نے بتایا تھا کہ اس کے بابا مان گئے ہیں لیکن میں خود ایسا نہیں چاہتی۔“

وہ شہر یار سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی پھر کیوں اس نے ان کے جذباتوں کی پذیرائی نہیں کی کیوں انہیں ہمیشہ کے لیے جی دامن کر دیا۔ کیا وہ ان کی شدتوں کو نہیں جان سکتی تھی یا پھر ان کے جذباتوں میں ہی کہیں کسی جگہ کی کوئی کمی تھی۔۔۔۔۔ مگر نہیں ان کے جذباتوں میں تو کہیں کوئی کھوٹ نہیں تھا کہیں کوئی میل نہیں تھا۔

ان کا جی چاہا، وہ اس سے گلہ کریں۔ اس سے پوچھیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ ان کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں۔۔۔۔۔ اور پھر جیسے اس کے چہرے سے ہٹا بھول گئیں۔۔۔۔۔ بے حد بے چین مضطرب سی اپنی انگلیوں کو مسلتی ہوئی وہ ان کے دل کی دنیا کو تہہ وبالا کیے جا رہی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں کے کناروں سے پھسل کر رخساروں پر آٹھ رہے تھے۔

کاش۔۔۔۔۔ اے کاش وہ اپنی انگلیوں سے ان آنسوؤں کو پونچھ سکتے۔

”مریم پلیز، روسی نہیں۔“ ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں ”مجھے بتائیں اور مجھ پر اعتبار کریں اور بھول جائیں وہ سب کچھ جو چند کمزور لمحوں میں آپ سے کہہ بیٹھا تھا۔“

”میں۔۔۔۔۔ میری کیا شناخت ہے مجھے تو یہ تک نہیں معلوم کہ میرا باپ کون تھا۔۔۔۔۔ ماما نے میرے اصرار پر بھی نہیں بتایا اور وہ لوگ جن کے لیے ماما کا اداکارہ اور ماڈل گرل ہونا ہی قابل قبول نہیں تھا وہ یہ کیسے گوارا کریں گے کہ میری شناخت ہی نہ ہو۔۔۔۔۔ نہیں عادل بھائی، مجھے اپنی اپنا خوداری بہت عزیز ہے۔ پلیز آپ سرور سے شہر یار سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں شہر یار کو اپنے حلق بتا دیتا تھا کہ عثمان احمد میرے پاپا نہیں تھے اور میرا باپ کون تھا، یہ مجھے معلوم نہیں۔“

”کیا خبر مانے میرے باپ سے شادی بھی کی تھی یا نہیں۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیک گئی۔
 ”آپ بہت فضول سوچ رہی ہیں مریم۔“ پروفیسر عادل نے خفگی سے کہا ”اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ
 آپ کے والد سے آپ کی ماما نے امریکا میں علیحدگی اختیار کی تھی۔ مجھ سے ایک بار بچی حیدر نے ذکر کیا تھا۔“
 ”تو پلیز۔“ مریم نے روتے روتے ایک دم ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ مجھے میرے باپ کا نام
 بتادیں۔ مجھے ان سے ملو ادیں ایک بار صرف ایک بار میں اس شخص سے ملنا چاہتی ہوں۔ اسے دیکھنا چاہتی
 ہوں جس نے پھر مڑ کر اور پلٹ کر نہیں دیکھا کہ۔۔۔۔۔“

مریم کے ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھے اور ان کے رگ و پے میں جیسے بجلیاں سی دوڑنے لگی تھیں ان
 دکش اور خوب صورت ہاتھوں کو چھونے کی کتنی شدید خواہش تھی انہیں۔ بارہا انہوں نے سوچا تھا کہ ان نرم
 نازک اور مومی انگلیوں والے ہاتھوں کو جب میں اپنے ہاتھوں میں لوں گا تو جانے کیسا لگے گا اور اب۔۔۔۔۔
 انہوں نے آہستگی سے مریم کے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے اٹھائے اور اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں پر
 قابو پاتے ہوئے اسے تسلی دی ”رہلیکس مریم پلیز“ آئی پر اس کہ میں بہت جلد آپ کو آپ کے والد سے
 ملوانے کے لیے بے جاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے اور باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ انہوں نے مسکرانے کی کوشش
 کی ”اب منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو کر آئیں۔ ماں جی ادھر جانے کیا کیا کھولے بیٹھی ہیں۔“
 ”کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کو میرے والد کا پتا چل جائے گا۔“

”یقیناً۔“

انہیں یاد تھا کہ ایک بار مجتبیٰ خود بڑی تفصیل سے انہیں زنب عثمان کے متعلق بتا رہے تھے لیکن پھر ان
 کی ناگواری محسوس کرتے ہوئے انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
 ”آپ کب پتا کریں گے پلیز آپ کل ہی لاہور چلے جائیں اور۔۔۔۔۔“
 ”اچھا کل ہی چلا جاؤں گا۔“
 ”آپ بہت اچھے ہیں عادل بھائی بہت اچھے۔ پلیز مجھے معاف کر دیجیے گا میں نے آپ کو

دکھ دیا۔ میری وجہ سے۔۔۔۔۔“

”پلیز مریم۔“ پروفیسر عادل نے انہیں روک دیا۔
 ”میں نے آپ سے کہا کہ آپ بھول جائیں جو میں نے کہا تھا۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ
 آدمی ایک عمر کا سفر طے کر کے اپنی منزل پر پہنچتا ہے اور اسے پتا چلتا ہے کہ یہ تو اس کی منزل نہ تھی۔ مریم
 میں آپ کی خوشیوں کا خواہش مند ہوں۔“
 مریم نے انہیں دیکھا ”میں منہ چھپا کر روئی۔“
 ”پلیز مریم۔“ انہوں نے بے بسی سے اسے دیکھا ”اس طرح مجھے مت آزمائیں۔ میں نے کہا نا آپ

سے کہ میں اپنے جذباتوں کے اظہار کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی جلد بازی پر ندامت ہے۔“
 ”آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں عادل بھائی؟“ مریم نے روتے روتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
 ”نہیں مریم بالکل بھی نہیں۔“
 وہ تو ان کے لیے موت بھی صادر کر دیتی تو وہ اس سے خفا نہیں ہو سکتے تھے۔
 ”اور ناؤ پلیز اب آپ بالکل رلیکس ہو جائیں۔ میں صبح ہی انشاء اللہ لاہور جاؤں گا اور۔۔۔۔۔“ وہ
 کھڑے ہو گئے۔

”اور یہ بی آپ کہاں ہیں۔ نظر نہیں آئیں۔“
 ”وہ تو کچھ دیر کے لیے حرم کے گھر گئی ہیں۔ چاچی نے بلوایا تھا۔ ابھی تک آئی نہیں۔ مجھے کہا تھا کہ
 میرے آنے تک تم ادھر ہی رہنا۔“

”اچھا پھر میں چلتا ہوں مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔
 انہیں لگتا تھا کہ جیسے وہ کچھ دیر اور رک گئے تو ان کا دل دھڑکنے لگے گا۔ مریم کے سامنے بیٹھ کر اس
 سے بات کرنا اور یہ احساس کہ وہ ان کا نصیب نہیں حالانکہ وہ ان کا خواب تھی یہ لمحے ان کے لیے امتحان
 بن جاتے۔ سو وہ خواہش کے باوجود نہیں رکے تھے اور یوں ہی بے مقصد حویلی سے باہر نکل آئے تھے۔



”ارے مجتبیٰ آپ!“ پروفیسر عادل جو خدا بخش سے کوئی بات کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ رہے
 تھے انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے ”میں آپ کی طرف ہی آ رہا تھا۔“ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے ان
 سے مصافحہ کیا۔

”زہ نصیب آج آپ کو ہمارا خیال کیسے آ گیا۔ ورنہ ہم تو ترس ہی گئے ہیں۔“ مجتبیٰ نے حسب
 معمول خوشگوار سے لہجے میں کہا۔

”سوری مجتبیٰ میں بہت شرمندہ ہوں کہ پھر نہیں آ سکا۔ دراصل کچھ ایسی ہی مصروفیات ہو گئی تھیں۔
 پہلے سرور کی ایگزیشن۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔“ وہ انہیں ساتھ لیے لیے ڈرائیونگ روم میں آ گئے اور ان کے
 سامنے بیٹھتے ہوئے مسکرائے۔

”خیر آج تو میں آ رہا تھا۔ آپ بتائیے کیسے ہیں۔ آپ کی طبیعت کیسی رہی؟“
 ”اللہ کا شکر ہے ماں! اتنے حسین مزاج پر سی کو آ رہے ہوں تو طبیعت کو بحال ہونا ہی ہے۔“
 ”اچھا تو یہ حسینوں کا کرم ہے۔“ پروفیسر عادل نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
 ”بالکل۔ اسپتال سے آئے اتنے دن گزر گئے لیکن ابھی تک حسینوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔“
 ”بائے داوے یہ اتنے حسینوں سے کہاں ملاقات ہوتی ہے۔“

”بھئی کیا بتائیں۔ کچھ خطوط کے ذریعے کچھ اپنی اسٹوڈنٹ سے اور کچھ ادھر ادھر محفلوں میں سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے بھئی۔“

”ایک بات مجھے سمجھ میں نہیں آتی مجبئی۔ یہ لڑکیاں لکھنے والوں کو ماورائی مخلوق کیوں سمجھتی ہیں حالانکہ وہ بھی عام انسان ہوتے ہیں۔“

”بھئی وہ ایسا نہ کریں تو ہم لوگ کہاں جائیں جن کے سینے میں سانسوں کی آمدورفت ان ہی کی مہربانیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔“

”چائے لاؤں صاحب یا ٹھنڈا؟“ خدا بخش نے اندر آ کر پوچھا تو مجبئی حیدر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارے میاں خدا بخش اتنے برسوں سے اس دروازے پر حاضری دے رہے ہیں۔ ابھی تک آپ کو پتا نہیں چلا کہ ہمیں کیا مرغوب ہے۔“

”آپ بیمار ہو گئے تھے نا تو میں نے سوچا شاید ڈاکٹروں نے چائے وغیرہ منع کر دیا ہو ورنہ تو۔۔۔۔۔“

”ڈاکٹر کی کون پر داکرتا ہے خدا بخش صاحب۔ چائے لائیں تیز گرم۔۔۔۔۔ اور ہاں۔“ وہ پروفیسر عادل کی طرف مڑے۔

”کل تصدق احمد آئے تھے تمہارے پاس؟“

”نہیں تو میں جو ملی گیا تھا رات آیا ہوں ممکن ہے میری عدم موجودگی میں آئے ہوں خیریت تھی؟“

”ارے میاں خیریت کہاں دماغ چل گیا ہے اس کا۔“

”کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا یا۔ بتایا تو تھا اس دن تمہیں کہ آمنہ صنی سے شادی کرنے پر تیار ہوا ہے جبکہ آمنہ اس پر تیار نہیں۔ اس کے خیال میں یہ اس کے بیوی بچوں کی حق تلفی ہے جبکہ تصدق کا کہنا ہے کہ وہ ان کی حق تلفی نہیں کرے گا۔“

”جب آمنہ رضامند نہیں تو بات ختم ہو جاتی ہے۔“

”بات ختم نہیں ہوتی میاں تصدق نے دھمکی دی ہے کہ اگر آمنہ نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اپنی زندگی ختم کر لے گا۔ میں نے اسے تمہارے پاس بھیجا تھا بہانے سے کہ تم اسے کچھ سمجھاؤ۔“

”کوشش کروں گا مجبئی لیکن یہ جذبے بڑے اندھے ہوتے ہیں بعض اوقات کچھ سمجھائی نہیں دیتا اور یہ تصدق احمد کو ہوا کیا ہے کہ اسے بیوی بچوں کا بھی خیال نہیں۔“

مردے سکتا ہے۔“

”مے بی۔“ پروفیسر عادل نے کچھ سوچتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور ہمیشہ کی طرح مجبئی حیدر نے ان کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا۔

”مجبئی۔“ پروفیسر عادل نے تنبیہی نظروں سے انہیں دیکھا ”ڈاکٹر نے آپ کو سگریٹ پینے سے منع کیا ہے۔“

”منع تو ڈاکٹر نے بہت سازی باتوں سے کیا ہے لیکن کیا میں ان سے باز ہو گیا ہوں۔ یار زندگی روز روز تھوڑا ہی ملتی ہے۔ جی بھر کے انجوائے کیوں نہ کریں اور اب ہر کوئی تمہاری طرح تو نہیں ہو سکتا ہے کہ اور گرد کی خوبصورتیوں سے آنکھیں بند کر کے عابد و زاہد بنار ہے۔“ انہوں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے پروفیسر عادل کی طرف دیکھا۔

”وہ ایک ملی بھی تھیں خاتون مگر شاید خواب میں۔ میاں اب قسم توڑ ہی ڈالو اور کسی مہ جین سے شادی کر ہی لو۔“

”مجبئی اگلی اتوار کو میرا نکاح ہے۔“ پروفیسر عادل نے آہستگی سے کہا تو مجبئی اچھل پڑے۔

”سچ کہہ رہے ہو میاں؟“

”ہوں۔“ پروفیسر عادل نے سر اثبات میں ہلایا۔

”تمہاری اسی تصوراتی پیکر سے۔“

”نہیں۔“ پروفیسر عادل بے حد عجیبہ تھے ”ماں جی نے مجھے مجبور کر دیا۔ ورنہ شاید یوں زندگی زیادہ بہتر گزر جاتی۔“

”مگر اس سے کیوں نہیں جو آپ کے عین تصوراتی پیکر کی طرح تھی۔“

”کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔“ پروفیسر عادل نے دھیرے سے کہا۔

”مگر وہ کون تھی۔ کیا مسئلہ ہو گیا۔ آپ نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں عادل میاں۔ ہم کوئی غیر تو نہیں تھے۔۔۔۔۔“ مجبئی حیدر نے گلہ کیا۔

”کیا بتانا وہ کون تھی۔ وہ تو کسی اور ہی دنیا سے آئی تھی اور اس نے مجھے غم آشنا کر دیا۔“ پروفیسر عادل کے چہرے پر ملال کے رنگ اتر آئے ”وہ جتنی آہستگی اور نرمی سے میری دنیا میں اتری تھی اسی کو ملتا اور نزاکت سے چلی گئی۔ وہ تو ایک آب گینہ ہے مجبئی۔ کانچ کی کار گیری کا شاہکار۔“

”کسی آنکھ کی طرح معصوم۔“

ان کا لہجہ سرگوشی کی طرح مدہم ہو گیا۔ جیسے اپنے آپ سے بات کر رہے ہوں۔

”وہ میری دنیا کی نہیں تھی لیکن میرا تو سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ میرے دن رات میری نیندیں“

میرے سب خواب، میرا اپنا پن۔ یہ جو میں آپ کے سامنے ہوں یہ تو کوئی اور عادل ہے۔“
مجتبیٰ حیدر نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ یوں چونکے جیسے کسی خواب سے بے دار ہوئے ہوں۔

”سوری مجتبیٰ میں پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ خیر مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔ ایک بار آپ نے ذکر کیا تھا زینب عثمان کا کہ آپ انہیں بہت پہلے سے جانتے تھے۔“

”ہاں جانتا تھا یار۔ بڑی دوستی تھی ان سے۔ عثمان احمد کے ساتھ شادی کرنے سے بہت پہلے سے۔ بلکہ یار براندہ ماننا۔ وہ تو اپنے شوہر سے علیحدگی حاصل کرنے کے بعد مجھ سے شادی کرنا چاہ رہی تھی لیکن یار میں.....“
”آپ ان کے پہلے شوہر کو جانتے تھے.....“
”پروفیسر عادل نے ان کی بات کاٹ دی۔ وہ از حد بے چینی محسوس کر رہے تھے اور چاہتے تھے بات جلد از جلد ختم ہو جائے۔ زینب عثمان احمد کا اس طرح موضوع گفتگو ہونا انہیں ذرا بھی پسند نہ تھا۔

”ہاں کبھی باقاعدہ ملاقات تو نہ ہوئی لیکن میں نے اسے دیکھا تھا دو تین بار..... بڑا شریف آدمی تھا۔ سیدھا سادہ سا..... ڈاکٹر تھا۔ سکندر نام تھا اس کا۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے رافع اسپتال میں اسے دیکھا ہے۔ غالباً وہ بھی پاکستان ہی میں ہے۔ ویسے آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“
”یوں ہی خیال آ گیا تھا۔“ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپانے کے لیے انہوں نے جھک کر ایئر ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

”ویسے زینب عثمان بھی کمال کی شے ہیں عادل میاں۔ اس عمر میں بھی کیا شان ہے..... تب ہی تو وہ.....“
”مجتبیٰ وہ پھر کیا خیال ہے تصدق کی طرف نہ چلیں۔“

پروفیسر جانتے تھے کہ مجتبیٰ یوں ہی بے سوچے سمجھے بولے چلے جائیں گے چاہے وہ باتیں کسی کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچا رہی ہوں اس لیے انہوں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔
”خیال تو اچھا ہے لیکن تصدق احمد کا ٹھکانا مجھے معلوم نہیں۔“

”کیا مطلب۔ کیا انہوں نے گھر بدل لیا۔“

”ہاں انہیں ایک اور قدرے بہتر گھر مل گیا تھا جس کا کرایہ بھی مناسب تھا۔ ویسے شاید تصدق خود ہی آجائیں۔ میں نے کہلوادیا تھا انہیں کہ ادھر آجائیں۔ سوچا تھا مل جل کر گھیر لیں گے اسے۔ بے چاری آمنتی پریشان ہے اور وہ اس قدر جذباتی ہے کہ کچھ بعید نہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کبھی گزرے۔“

”کیا آپ انہیں فون کر کے نہیں بلوا سکتے؟“

”بلوایا جا سکتا ہے لیکن کیا آپ کو کہیں جانا ہے۔“ مجتبیٰ حیدر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
”ہاں نہیں تو۔“ پروفیسر عادل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ دراصل وہ جلد از جلد ڈاکٹر سکندر کے متعلق

معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کون شخص ہیں اور انہوں نے کیوں مڑ کر مریم کی خبر نہ لی۔ وہ جوان کے وجود کا حصہ تھی اور جانے کیا کیا کچھ..... سوچ رہی تھی اس کی آنسو بھری آنکھیں ان کے تصور میں جھللائے لگیں۔
”تو پھر میاں! ایسی جلدی کیا ہے۔ بیٹھو گپ لگاؤ۔ کچھ حال دل سناؤ کچھ سنو کتنے دنوں بعد تو ملے ہیں۔“
ان کے پاس سانے کے لیے کیا تھا ”جھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی قصہ۔ کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تور کے ہوئے ہیں۔“
وہ افسردگی سے مسکرائے۔

”لیجئے حضرت تشریف لے آئے۔“ مجتبیٰ حیدر نے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے تصدق احمد کو دیکھتے ہوئے کہا ”آئیے آئیے تصدق احمد آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا۔“ مجتبیٰ حیدر کا لہجہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور خوشگوار تھا۔

”جی سر آپ نے کیوں بلایا۔“ تصدق احمد نے پروفیسر عادل سے مصافحہ کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میں نے!“ پروفیسر عادل چونکے اور ان کی نظریں مجتبیٰ حیدر سے ملیں ”اوہ ہاں۔ جی چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو اور پھر سنا تھا کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔“
”ہاں بہت پریشان ہوں۔ زندگی عذاب لگنے لگی ہے۔ اپنے ہونے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ جو زندگی کسی کے کام نہ آ سکے وہ بے معنی اور بے کار ہے۔“ وہ مجتبیٰ حیدر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
پروفیسر عادل نے اسے سراٹھا کر دیکھا۔

”شکں آلود لباس بڑھا ہوا شیو۔ سرخ آنکھیں رت جگوں کی غماز۔ یک دم ہی ان کا دل اس کے کیے گداز ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تصدق احمد! زندگی انسان سے بعض اوقات بڑے بڑے امتحان لیتی ہے۔ بہادر تو وہ ہے تصدق احمد جو ان آزمائشوں سے گزر جائے۔“

”لیکن میں بہادر نہیں ہوں سر۔“ اس نے سراٹھا کر ایک لمحے کے لیے پروفیسر عادل کی آنکھوں میں جھانکا ”میں جانتا ہوں سر کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میں بے بس ہوں۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ قطعی بے بس ہوں۔ اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں پاتا..... میں چاہتے ہوئے بھی اسے کوئی اعتبار نہیں دے سکتا۔“

”کیا آپ آہ سے محبت کرتے ہیں تصدق احمد؟“ مجتبیٰ حیدر نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
”محبت۔ پتا نہیں آپ محبت کی کیا تعریف کرتے ہیں۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میں آہ سے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے دکھ کے اس حصار سے باہر لانا چاہتا ہوں جس میں گھر کر اس کی شخصیت کی

روشنیاں چھپ گئی ہیں۔ گرد آلود ہو گئی ہیں۔ میں اس کا مان اسے لوٹانا چاہتا ہوں کہ وہ فخر سے سراٹھا کر کھڑی ہو۔ میں ناکردہ گناہوں کی سیاہی اس کے دامن سے دھونا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھی ہے اس کی روح بہت خوبصورت ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں اس کا ہاتھ تھام لوں اور آپ لوگ بجائے اسے سمجھانے کے مجھے سمجھا رہے ہیں۔ آپ کو تو چاہیے جتنی کہ آپ اسے سمجھائیں تاکہ وہ فخر سے سراٹھا کر کھڑی ہو سکے۔

”لیکن ایسا کر کے کیا تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ظلم نہیں کرو گے تصدق؟“

”نہیں بلکہ میں ایسا نہ کر کے اپنے ساتھ ظلم کروں گا اور ساری عمر یہ احساس ستا رہا ہے گا کہ میں ایک خوب صورت روح کی خوب صورتی کو اس کے حسن کو بچا سکتا تھا مگر میں بھی اس روح کے قاتلوں میں شامل تھا۔ وہ جو ایک بہت اچھی اور بہت مہربان لڑکی ہے۔ نہیں، نہیں جتنی حیدر میں اس احساس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”لیکن کوئی اور..... کوئی اور بھی تو اس کا ہاتھ تھام سکتا ہے تصدق احمد۔“ پروفیسر عادل نے نرمی سے کہا۔

”کوئی اور۔“ اس نے جھٹکے سے مڑ کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا اور ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔

”کون..... کون کرے گا اس سے شادی..... آپ..... آپ کر لیں گے اس سے شادی؟“

”میں۔“ پروفیسر عادل نے از حد حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں آپ۔“ اس کے ہونٹ زہر میں بھیگ گئے۔ ”مگر میں جانتا ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے حالانکہ اس کی زندگی میں تاریکیاں گھولنے والا آپ ہی میں سے ایک تھا..... آپ کا عزیز۔ وہ یہیں تو آئی تھی اور آپ جانتے ہیں اس انوار سے ٹھیک تین روز بعد اس کی مٹگئی تھی لیکن وہ شخص جو اسے سمجھنے اور اسے چاہنے کا دعویٰ کرتا تھا اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ایک انوار شدہ لڑکی کو اپنے گھر کی عزت بناتا۔“

”میرا عزیز۔“ پروفیسر عادل نے الجھ کر اسے دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تصدق احمد!“

بہت پہلے آمنہ صفی کی کبھی ہوئی باتیں ان کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

”ہاں..... اسے انوار کرنے والا آپ کا سہارا چچا زاد مانی تھا۔“ تصدق احمد جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔

”مانی!“ انہوں نے بے یقینی سے پوچھ لیں جس کی خاطر مانی نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

”یقین نہ آئے تو مسرور سے پوچھ لیں جس کی خاطر مانی نے اسے چھوڑ دیا تھا۔“

”اوہ نہیں۔“ پروفیسر عادل کا دل جیسے کسی گہرے صدمے تلے دب سا گیا تھا۔

”اور اگر کسی بھی طرح سے میں سارے واقعے میں ملوث ہوا آمنہ صفی تو میں اس کا کفارہ ادا کرنے

کے لیے تیار ہوں۔“

اپنے ہی کپے لفظوں کی بازگشت سے چونک کر انہوں نے سراٹھایا۔

”اور اگر ایسا ہے تصدق احمد تو میں آمنہ سے شادی کے لیے تیار ہوں..... جرم اگر کسی میرے اپنے نے کیا ہے تو اس کا کفارہ مجھے ہی ادا کرنا ہے۔“

جب انہوں نے تصدق احمد کی طرف دیکھا تو ان کی آواز ٹھہری ہوئی مضبوط تھی اور دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑے سلطان کو یوں لگا جیسے حرم بننے سے پہلے ہی اجڑ گئی ہو۔

وہ کل شام پروفیسر کے ساتھ ہی حویلی سے آیا تھا اور ابھی چند لمبے قبل سوکراٹھا تھا اور واپس جانے کے لیے پروفیسر عادل کو خدا حافظ کہنے ادھر آیا تھا اور تصدق احمد کے منہ سے اپنا نام سن کر وہیں دروازے کے پاس ٹھنک کر رک گیا تھا۔

اور کیا میری غلطی کا خمیازہ حرم کو جھگٹنا پڑے گا کتنے سارے دنوں بعد اس نے حرم کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی اور اسے لگا تھا جیسے اداسی کے ہالے میں ہمہ وقت لپٹی رہنے والی اس کی بڑی بہن کی آنکھوں میں روشنیاں سی اتر آئی ہیں اور چہرے پر کوئی انہونی چمک آ کر ٹھہر گئی ہو اور اماں جان کتنی خوش نظر آتی ہیں۔ جیسے کبھی بیمار ہی نہ تھیں۔ ساری حویلی میں ان کی آواز گونجنے لگی ہے۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”نہیں عادل بھائی غلطی میری ہے اور مجھے ہی اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ میں آمنہ سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ بشرط یہ کہ وہ مجھے قبول کر لے۔“

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور پیشانی پر ندامت کے قطرے تھے۔

پروفیسر عادل کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو گئے اور وہ قدرے پرسکون ہو کر صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سلطان کے لیے ان کی آنکھوں میں محبت، پیارا اور فخر تھا۔

”ارے کیسے قبول نہیں کرے گی میاں۔“ جتنی حیدر چپکے ”کیا کی ہے تم میں۔“

سلطان سر جھکائے پروفیسر عادل کے سامنے کھڑا تھا۔

”سوری عادل بھائی وہ میں۔“

”اٹ ازاو کے۔“ پروفیسر عادل نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا اور تصدق احمد کی طرف دیکھا جو کسی حد تک حیران سامانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیوں تصدق احمد کیا آپ ہمیں اس قابل سمجھتے ہیں کہ ہم مانی کا پروپوزل آمنہ صفی کے لیے لے کر ان کے گھر جائیں۔“

”سر۔“ تصدق احمد نے پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے ”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں یوں ہی جذباتی ہو گیا تھا۔“

”جی کیا آپ پہلے ان سے کبھی نہیں ملے؟“

ڈاکٹر رافع کو حیرت ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ پروفیسر عادل شاید ڈاکٹر سکندر کے جاننے والوں میں سے ہیں۔ شہریار نے انہیں ایک بار پروفیسر عادل سے متعارف کروایا تھا اور وہ پروفیسر عادل کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

”نہیں، بس کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ہاں ان سے ملنے کا اشتیاق بہت تھا۔“

”اوہ ہاں شہریار نے ذکر کیا ہوگا۔ بہت قابل ڈاکٹر ہیں اور میں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ وہ یہاں میرے اسپتال میں ہفتے میں دو دن سرجری کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے۔“

”عام طور پر کہاں ہوتے ہیں۔ کس اسپتال میں؟“

”اپنے گاؤں میں اپنا ذاتی کلینک بنایا ہے انہوں نے اور وہاں اپنا ٹیلنٹ ضائع کر رہے ہیں۔ بہت مشکل سے راضی ہوئے ہیں، یہاں ہفتے میں دو دن آنے کے لیے۔“

تب ہی ڈاکٹر سکندر دوش روم سے باہر نکلے اور تھکے تھکے سے کرسی پر بیٹھ گئے اور کرسی کی پشت پر سر رکھتے ہوئے ڈاکٹر رافع کی طرف دیکھا۔

”آج کے آپریشن نے تو بے حد تھکا دیا۔ مسلسل چار گھنٹے۔ ایک بار تو لگا شاید وہ ایکسائز ہو گیا ہے۔ مگر پھر سانس بحال ہو گیا۔ تھینکس گاڈ آپریشن کامیاب رہا۔ ورنہ مجھ میں اس نوجوان کے باپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔“

پروفیسر عادل بہت گہری نظروں سے ان کی شخصیت کا جائزہ لے رہے تھے۔ بے حد باوقار اور متاثر کن شخصیت تھی۔ کنپیٹوں پر سے جھانکتے کہیں کہیں سفید بال ان کی گریس فلنس میں اضافہ کر رہے تھے۔

بولنے کا دھیمادھیمہ انداز انہیں اپنے پاپا کی طرح لگا۔ بلاشبہ انہیں ہی مریم کا پاپا ہونا چاہیے تھا۔ آنکھیں بالکل مریم کی طرح۔ کشادہ لانی پلکوں والی اداس براؤن جھلک لیے بے حد دلکش آنکھیں۔

بات مکمل کر کے انہوں نے پروفیسر عادل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ریلیکس ہونے کے لیے انہوں نے نرسای طرح کرسی کی پشت پر رکھا ہوا تھا اور ٹانگیں پھیلائی ہوئی تھیں۔

”یہ پروفیسر عادل ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کافی دیر سے آپ کے منتظر تھے لیکن آپ آپریشن تھیر میں مصروف تھے۔“ ڈاکٹر رافع نے بتایا تو وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پروفیسر عادل کی طرف متوجہ ہوئے۔

”جی۔“

”آپ ڈاکٹر سکندر ملک۔“ پروفیسر عادل نے جو بہت غور سے ان کا جائزہ لینے میں مصروف تھے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ سکندر ملک نے اثبات میں سر ہلایا۔

”نہیں تصدق احمد۔۔۔۔۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ورنہ میں کبھی بھی اپنے آپ سے نظر نہ ملا سکتا۔ آپ آمنہ صغی سے کہہ دیجیے گا کہ ہم ایک دو روز تک ان کے گھر آئیں گے۔ مجھے ایک ضروری کام ہے یہاں ورنہ اتنی تاخیر بھی نہ ہوتی اور میں آج ہی حویلی چلا جاتا اور آمنہ سے یہ بھی کہیے گا کہ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں اور غلطیوں پر شرمندہ ہونے والے لوگ بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ہاں مانی۔۔۔۔۔ وہ سلطان کی طرف مڑے۔

”تم غالباً جا رہے تھے۔“

”جی عادل بھائی میں حویلی واپس جا رہا تھا۔“ سلطان کا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔

”تو پھر دیر ہو جائے گی اٹھو چلو میں خود آکر چا چاچی سے بات کر لوں گا۔“

”جی۔“ سلطان کھڑا ہو گیا اور کچھ سوچ کر وہ بھی کھڑے ہو گئے اور معذرت طلب نظروں سے مجتبیٰ حیدر اور تصدق احمد کی طرف دیکھا۔

”میں ذرا مانی کو چھوڑ آؤں۔“ وہ تصدق احمد کے مطمئن چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سلطان کے پیچھے ہی باہر نکل آئے۔

”مانی۔“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے کہا ”میں جانتا ہوں کہ تم نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا لیکن مجبوری کے تحت کیے جانے والے فیصلے زیادہ دیر پا نہیں ہوتے۔ ابھی کچھ دن سوچ لو اچھی طرح میں حویلی آؤں گا۔۔۔۔۔“

اور آمنہ صغی کا سر اپاس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

وہ بے نیاز اور لا پرواہی آمنہ صغی جو اگر ہونٹوں پر لب اسٹک لگا لیتی اور آنکھوں میں کاجل ڈال لیتی تو اس کا سر اپادال میں کھینچے لگتا تھا۔ اس کی بے نیازی میں کتنی کشش تھی اور اس کے نقوش میں کتنی جاذبیت تھی لیکن وہ خود اس بات سے بے خبر تھی۔

”نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں کونسا سا لپکا تھا ”آپ پریشان نہ ہوں عادل بھائی۔ میں کبھی نہیں پچھتاؤں گا۔“

”آر یو شیور؟“ پروفیسر عادل نے پوچھا۔

”لیس۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو پروفیسر عادل کے ہونٹوں پر ایک پُرطمینان سی مسکراہٹ بکھر گئی۔



”تو یہ ہیں سرجن سکندر ملک۔“ پروفیسر عادل نے سر سے پاؤں تک ڈاکٹر سکندر کو دیکھا جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئے تھے اور معذرت کر کے دوش روم میں چلے گئے تھے۔

”یہ ڈاکٹر سکندر ملک ہیں؟“ پروفیسر عادل نے ڈاکٹر رافع سے پوچھا۔

سکندر ملک نے یک دم چونک کر پروفیسر عادل کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے کے نقوش میں ایک دم نئی سی آگئی۔

”پھر بھی میں آپ کی آمد کا مقصد نہیں سمجھا۔“

”نہب ملک۔“ پروفیسر عادل کی نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں ”میرے والد سے شادی کرنے سے پہلے آپ کی.....“

”پلیز.....“ ڈاکٹر سکندر ملک نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا ”آپ نے جو کچھ کہنا ہے کہیں تمہید نہ باندھیں۔“ ان کا لہجہ سناٹ تھا اور کچھ دیر پہلے کی نرمی اور ملاحت ایک دم رخصت ہو گئی تھی۔

”جی میں وہی کہنے لگا ہوں..... آپ کو غالباً علم نہ ہو کہ نہب عثمان احمد اب نہب غنفر ملک ہے۔“

”جی میں جانتا ہوں لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ نہب عثمان احمد اب نہب غنفر ملک جو بھی ہیں میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ انہیں میری زندگی سے نکلے تقریباً پچیس برس ہو چکے اور میں آپ کی ان باتوں کا مقصد اب تک نہیں سمجھ پایا ہوں۔“ وہ بے زار سے ہو گئے تھے۔

”بجائے فرمایا آپ نے۔ نہب ملک سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے اب لیکن اپنی بیٹی سے آپ کا جو رشتہ ہے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اور آپ اس سے کبھی انکار نہیں کر سکتے۔“

”کیا..... کیا مطلب ہے آپ کا؟“

ڈاکٹر سکندر نہ صرف الجھ گئے تھے بلکہ ان کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں اور یکا یک مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔

”میرا مطلب آپ کی بیٹی سے ہے۔“

”مگر میری تو کوئی بیٹی نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے شاید۔“ ڈاکٹر سکندر کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور وہ غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھوں کو مسل رہے تھے۔

”تو ڈاکٹر سکندر کو معلوم نہیں ہے کہ ان کی کوئی بیٹی بھی ہے.....“ پروفیسر عادل نے گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ بے حد مضطرب اور بے چین لگ رہے تھے اور ان کی نگاہیں پروفیسر عادل کے چہرے پر تھیں۔

”پلیز۔“ انہوں نے التجائی ”کھل کر بات کریں صاف صاف سنیں ختم کریں۔ جب نہب نے مجھ سے علیحدگی اختیار کی تو ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ نہب اتنی جلدی بچوں کے حق میں نہیں تھی جبکہ میں.....“ وہ خاموش ہو گئے۔ پھر لہجہ بھر کر بولے۔ اب کے ان کے لہجے میں یقین سا تھا۔

”یقیناً آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ عثمان احمد سے نہب کی اولاد.....“

”ڈاکٹر سکندر شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ۔“ پروفیسر عادل نے دل ہی دل میں لفظوں کو ترتیب دیتے ہوئے بہت نرمی سے کہا۔

”سر میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“

”خیریت ہے جناب۔ کیا کوئی مریض ہے۔“

”نہیں ڈاکٹر سکندر مجھے کچھ نئی کام ہے آپ نے اگر آپ مجھے چند منٹ دے دیں۔“

”جی۔ جی کہیے۔“ سکندر نے کسی قدر الجھن کے سے انداز میں انہیں دیکھا تو پروفیسر عادل کی نظریں ڈاکٹر رافع کی طرف اٹھیں جو غالباً سمجھ گئے تھے کہ پروفیسر عادل غالباً تنہائی میں ان سے بات کرنا چاہتے ہیں اس لیے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوکے میں ڈرار اوڈ پر جا رہا ہوں ڈاکٹر سکندر آپ اپنے مہمان سے گپ شپ کریں اور پلیز ذرا جانے سے پہلے میرے کمرے میں آئیے گا۔ ذرا اس ٹاگ والے مریض کے بارے میں بات کرنا ہے۔ ڈاکٹر عابد کا خیال ہے کہ ٹاگ کا نئی پڑے گی۔ لیکن میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا اس لیے یہاں موجود تھا آپ کے کمرے میں۔“

”نہیں، نہیں میرے خیال میں ٹاگ کا نئے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

ڈاکٹر سکندر نے فوراً کہا۔

”دیکھتے ہیں اسٹڈی کرتے ہیں۔ اوکے پروفیسر عادل۔“ ڈاکٹر رافع کمرے سے باہر چلے گئے تو پروفیسر عادل نے ڈاکٹر سکندر کی طرف غور سے دیکھا۔

”جی عادل صاحب کہئے میں منتظر ہوں۔ دراصل میں اندازہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ آخر آپ کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے جبکہ میرے خیال میں ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے۔“

”بجائے فرمایا۔ مجھے پہلی بار آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔“ پروفیسر عادل نے بچے تلے الفاظ میں کہا ”میرا نام عادل ہے۔ پڑھنا میرا شوق بھی ہے اور جاب بھی۔ میرے والد کا نام عثمان احمد تھا۔“

”عثمان احمد۔“ وہ ذرا سا چونکے۔ یہ نام جانا پہچانا تھا لیکن نہ جانے اس دنیا میں کتنے عثمان احمد ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی شخص عثمان احمد ہوں..... جس نے ان کی زندگی کے سارے رنگ چھین لیے تھے۔ یہی تو بتایا تھا صبح صادق نے ایک بار انہیں کہ ڈولی نے جس شخص سے شادی کی ہے اس کا نام عثمان احمد ہے اور وہ یونیورسٹی میں کبھی ڈولی کا کلاس فیور ہا تھا۔ تب انہیں یاد آ گیا تھا کہ ایک بار جب وہ ڈولی کے ساتھ یونیورسٹی گئے تھے تو اس نے انہیں عثمان احمد سے متعارف کروایا تھا اور پھر وہ کبھی عثمان احمد سے نہ ملے تھے۔ ہاں جب وہ بھانٹار کے ساتھ ”نہب ولا“ گئے تھے شیری کے رشتے کے لیے تو انہوں نے وہاں عثمان احمد کی تصویر دیکھی تھی انہوں نے پروفیسر عادل میں عثمان احمد کی شباهت تلاش کرنے کی

کوشش کی لیکن پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”میرے والد نے نہب ملک سے شادی کی تھی۔ وہ میری سوتیلی والدہ تھیں۔“

”آپ کی ایک بیٹی ہے۔ میرے والد نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے اور خود مریم کو کبھی معلوم نہیں تھا کہ شاید میرے حقیقی والد مرحوم عثمان احمد اس کے والد نہیں ہیں..... بلکہ ڈنی طور پر وہ ابھی تک اس بات کو قبول نہیں کر سکی ہے..... دراصل.....“

انہوں نے سر اٹھا کر سکندر ملک کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھے تھے۔

”بچوں نے زینب ملک کی شادی کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی ماما سے ناراض تھے، خفا تھے اور میرے ساتھ حویلی آنا چاہتے تھے..... اور زینب ملک نے تب انکشاف کیا تھا کہ مریم کا حویلی سے کوئی ناتانہیں اس لیے کہ وہ عثمان احمد کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ انکشاف مریم کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ حواس کھوٹ چکی اور بہت دن اسپتال میں رہی.....“

”مریم..... مریم.....“ ڈاکٹر سکندر کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ دلکش آنکھوں والی پیاری سی لڑکی مریم۔

جسے سب چاہتے تھے بے حد۔ بھانٹا رہا اور شیریں۔

اور جسے انہوں نے محض اس لیے مسترد کر لیا تھا کہ وہ زینب کی بیٹی ہے..... اور وہ جانتے تھے کہ زینبی کبھی بھی شہر یار کا پروپوزل قبول نہیں کرے گی۔ بلکہ وہ انکار کر کے انہیں دکھا اور اذیت پہنچا کر خوش ہوگی۔ اور وہ مریم.....

وہ ان کا اپنا خون تھی۔

ان کے اپنے وجود کا حصہ اور وہ اس سے بے خبر تھے۔ تب ہی تو ان کا دل اس کے لیے دکھا تھا۔ تب ہی تو انہوں نے سوچا تھا کہ وہ واپس امریکا چلے جائیں گے۔ یہاں رہ کر تو ناممکن تھا کہ ان کا ڈولی سے سامنا نہ ہوتا مگر پھر بھانٹا نے انہیں روک لیا تھا۔

اپنی محبت کی زنجیریں ان کے قدموں میں ڈال دیں۔

یہ کتنا ظلم کیا تھا، زینب نے ان پر۔

مریم کو ان سے دور رکھ کر۔

جدا کر کے۔

انہیں اس کے متعلق نہ بتا کر۔

”ابو نے مجھے بتایا تھا کہ جب زینب انہیں ملی تو وہ.....“

پروفیسر عادل آہستہ آہستہ انہیں سب بتانے لگے۔ وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھے از حد مضطرب اور بے چین سے ان کی بات سن رہے تھے اور ان کا دل جیسے سینے کے اندر پھل رہا تھا..... ترپ رہا تھا کہ وہ اڑتے ہوئے جائیں اور مریم کو اپنے سینے سے لگا لیں۔

”اور وہ بہت اپ سیٹ اور بہت پریشان ہے۔“ ساری تفصیل بتا کر پروفیسر عادل نے آہستگی سے کہا۔ مریم کا دکھ ان کے لہجے میں اتر آیا تھا۔

”وہ ایک بار آپ کو دیکھنا اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اپنی شناخت پانا چاہتی ہے۔ زینب ملک نے جب اسے آپ کے متعلق سب کچھ نہیں بتایا تو وہ اور بھی ڈسٹرب ہوگئی تھی۔“

”وہ ایسی ہی ہے اتنی ظالم اور اتنی ہی بے درو۔“ وہ اضطرابی حالت میں کھڑے ہو گئے۔

”پلیز..... پلیز عادل صاحب مجھے..... مجھے لے چلیے ابھی اسی وقت اس کے پاس..... آپ نہیں جانتے، وہ ہم سب کو کتنی عزیز ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ میں خود بہت پہلے ہی اور انجانے میں اس کے ساتھ کیا زیادتی کر بیٹھا ہوں۔“

”میں آپ کو لینے ہی آیا ہوں۔ میں نے مریم سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں آپ سے ملواؤں گا۔ میں آپ سے ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ مریم ہمارے لیے غیر نہیں ہے۔ میں نے ابو سے مرے دم وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ اس کا اور سب کا خیال رکھوں گا۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں اس لیے آپ کو کھوجتا ہوں آپ تک آیا ہوں کہ حویلی میں مریم کے لیے جگہ نہیں ہے۔ میری ماں جی اسے اپنی بیٹی ہی کی طرح چاہتی ہیں اور.....“

”عادل میاں! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں..... پلیز اس وقت میں صرف اور صرف مریم کو دیکھنا چاہتا ہوں مجھے لگ رہا ہے جیسے میرا دل سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر نکل آئے گا۔“

”ریلیکس پلیز۔“ پروفیسر عادل نے نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں بٹھا دیا۔

”عادل بیٹے! میں آپ کا بہت احسان مند ہوں، بہت ممنون۔“ ان کی آواز ہلکی گئی ”اگر آپ مجھے نہ بتاتے تو میں زندگی بھر اس بات سے بے خبر رہتا اور یہ کتنا بڑا ظلم کیا زینب نے مجھ پر۔ آپ کو کس شخص نے میرا ہاتھ بتایا۔ کون یہاں تک لایا۔ میں اس کا بھی شکر گزار ہوں بے حد۔“ وہ جذباتی ہو رہے تھے۔

”مجتبیٰ حیدر شاید آپ نے نام سنا ہوگا، معروف کہانی نگار ہیں۔ ایک بار انہوں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ بس انہی سے آپ کا نام دہتا معلوم ہوا۔“

”مجتبیٰ حیدر۔“ ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا..... یہ تو وہ نام تھا جو برسوں ان کے اعصاب کو جھنجھوڑتا رہا تھا۔ برسوں اس نام سے ان کے وجود میں آگ سی دھک اٹھتی تھی۔ جب زینب نے انہیں خدا حافظ کہا تھا تو یہی نام تو تھا جس کے ساتھ زینب کا نام لیا جا رہا تھا۔

اور وہ برسوں یہی سمجھ رہے تھے کہ یہی وہ شخص تھا جس کی وجہ سے ڈولی ان کی زندگی سے نکل گئی تھی لیکن پھر مدتوں بعد ایک بار صبح صادق نے انہیں بتایا تھا کہ ڈولی اب زینب عثمان احمد ہے..... اور..... وہ شخص مجتبیٰ حیدر جو اُس آف امریکا میں اپنی خوب صورت آواز کا جادو جگاتا تھا اور جس کے ڈپارٹمنٹ میں خوب صورت لڑکیوں کا جھگمکا لگا رہتا تھا، معلوم نہیں زینب نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔ شاید

کیسی سائیں سائیں تھی..... ایک دم ویرانی تھی..... جیسے وہاں کبھی بھی..... پھول نہیں کھلے تھے اور کبھی کوئی رنگ نہیں دیکھے تھے۔

اس ایک چہرے کے تصور سے کیسے چراغاں رہتا تھا اندر کیسی روشنائی سی جلتی بجھتی رہتی تھیں۔

انہوں نے آہستگی سے طوطے کا پنجرہ ہلایا تو وہ پھر چیخنے لگا۔ اندر حویلی میں کتنی رونق تھی۔

خوشی، مسرتیں اور رنگ۔ جیسے ایک دم ہجوم کر کے آگئے تھے اور مریم کتنا خوش تھی۔

اس کی آنکھیں اس کا چہرہ اس کا پورا وجود اس خوشی کا اظہار کر رہا تھا جو اچانک ہی اسے ملی تھی وہ کتنے خوش کن لمحے تھے جب وہ ڈاکٹر سکندر سے ملی تھی۔

اسے اپنے ساتھ لگائے اسے چومتے ہوئے وہ بے تحاشا رو رہے تھے..... اور یہ کتنی ستم ظریفی تھی کہ وہ اس کے وجود سے بے خبر تھے اور مریم وہ تو جیسے خود اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔ بلند ہو گئی تھی۔

”میں نے سمجھا تھا عادل بھائی۔“ اس نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا ”میرے پاپا شاید بہت سخت بہت وقیانوسی اور ماما کے معیار سے بہت کمتر ہوں گے مگر پاپا تو.....“ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جگمگ کر رہے تھے۔

”اور میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ بہت مشکور..... اور میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ میں پاپا کی خواہش پوری نہیں کر سکی میں نے بہت سوچا تھا کہ میں پاپا کی خواہش پوری کروں لیکن شاید میں آپ کو خوشی نہ دے سکتی۔ مجھے قطعی حق نہیں ہے عادل بھائی کہ میں ایک خائن دل کے ساتھ آپ کی زندگی میں شامل ہوتی..... آپ نرم دل، نرم خیزم مزاج اور اتنے اچھے انسان ہیں۔ آپ کے لیے تو کوئی آپ کے جیسے ہی شفاف دل اور شفاف روح والی شریک حیات ہونی چاہیے۔“

اور وہ خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے تھے اور پھر از حد کوشش کے ساتھ اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”اٹ از او کے مریم..... وہ صرف ابو کی خواہش تھی کہ اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ زندہ لوگوں کی خواہش مردہ لوگوں کی خواہشوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ زندگی میں کسی موڑ پر بھی میری ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے لیجیے گا۔ میں آپ کے آس پاس ہی رہوں گا۔“

ڈاکٹر سکندر انہیں اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے سہولت سے منع کر دیا۔

”یہ جاننے کے بعد کہ ڈاکٹر شہر یار آپ کا بھتیجا ہے میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ مریم اس حویلی سے رخصت ہو۔ پاپا نے مریم کو بیٹیوں کی طرح چاہا ہے..... بی آپا کی..... ماں جی کی اور میری خواہش

عثمان احمد جتئی حیدر سے زیادہ خوب صورت، زیادہ مند ہوگا۔ انہوں نے خود ہی سوچ لیا تھا اور جو مدتوں ان کے دل میں جتئی حیدر سے کدورت رہی تھی آج وہ کدورت ان کے دل سے نکل گئی تھی اور آج وہ پروفیسر عادل سے کہہ رہے تھے۔

”عادل بیٹا میری طرف سے جتئی حیدر کا بھی شکریہ ادا کر دینا بے حد بے حساب۔ اگر آپ مجھے نہ کھوجے تو میں تو محروم ہی رہ جاتا..... اور وہ مریم..... میری بیٹی۔ میرے وجود کا حصہ ہمیشہ بدگمان رہتی، بے یقین رہتی.....“ وہ پھر جذباتی ہونے لگے تو پروفیسر عادل اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوکے تیار رہیے۔ مجھے ایک آدھ کام ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد آپ کو یہاں سے پک کر لیتا ہوں۔“

”اور حویلی میرا مطلب ہے حویلی کتنی دور ہے یہاں سے؟“

”ہمارا گاؤں یہاں سے تقریباً چار پانچ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔“

”اچھا۔“ ڈاکٹر سکندر کی کیفیت بالکل معصوم بچے کی طرح ہو رہی تھی۔ جو جلد از جلد اپنا پسندیدہ کھلونا حاصل کرنا چاہتا ہو۔

”بہت دیر مت کیجیے گا عادل، آپ میری کیفیت سمجھ رہے ہیں نا؟“

”آپ فکر مت کیجیے۔“

پروفیسر عادل ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرائے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں تسلی دی..... اور خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔

”میاں مٹھو۔ میاں مٹھو! طوطا پنجرے کے اندر اچھل رہا تھا اور طوطے کے پنجرے کے پاس کھڑے پروفیسر عادل بے دھیانی میں اسے دیکھے جا رہے تھے۔

”میاں مٹھو۔ میاں مٹھو۔“ طوطے نے پنجرے کے اندر زور زور سے پر پھڑ پھڑائے تو وہ چونک پڑے اور ان کی آنکھوں کے سامنے وہ شام آگئی جب اسی جگہ یہاں پر انہوں نے مریم سے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بے اختیاری میں نہ جانے کیا کہتے کہتے خاموش ہو گئے تھے اور مریم ان سے بدگمان ہو گئی تھی اور اس کے جانے کے بعد وہ کتنے مضطرب، کتنے بے چین سے کتنی ہی دیر تک یہاں کھڑے بی آبا

کو دیکھتے رہے تھے..... اور آج مریم..... کسی اور کے نام منسوب ہو گئی تھی۔

سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

سارے خواب بے تعبیر رہ گئے تھے۔

اور سارے رنگ مر گئے تھے۔

اندر کیسا اندھیرا ہو رہا تھا۔

ہے مریم کی اور عاشری کی رخصتی ایک ساتھ یہاں سے ہی ہو۔“

اور ڈاکٹر سکندر نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے عادل بیٹا، جیسا تم چاہو اور حقیقت تو یہ ہے کہ میرا مریم پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔ میں نے کیا دیا ہے اسے۔ عثمان احمد زندہ ہوتے تو وہی وارث تھے اس کے اور وہی اس کے باپ۔“

انہیں ڈاکٹر سکندر بے حد اچھے لگے تھے بہت بلو قار اور بہت شفیق اور پھر آج سب حویلی میں موجود تھے۔ چوہدری ثار اور ان کی بیوی۔

ڈاکٹر سکندر

شہریار اور ارسلان، ارغمان، یعنی سب ہی تھے اور حویلی کے ہال میں رونق لگی تھی۔ مریم چوہدری ثار کے سینے سے لگی بیٹھی تھی اور سب کہانیوں جیسے اس اتفاق پر اذ حد حیران تھے۔

ارسلان اور ارغمان کے برجستہ فخرے سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے تھے۔ عاشری بھی بے حد خوش تھی اور شہریار کو پھینچ رہی تھی۔

”ہمیں تو پہلے سے پتا تھا کہ آپ بچوں میں انٹرنلڈ ہیں لیکن بچوں میں مانتی تھیں۔“

”اور تمہاری یہ بچو۔ ان سے تو میں پوچھوں گا بعد میں۔“ شہریار چمک رہا تھا۔

”اب کی بار پھر بغیر اطلاع کے بھاگ آئی تھیں۔ وہ تو بھلا ہوان کی دوست کا جس نے اطلاع دے

دی کہ محترمہ حویلی میں پروفیسر عادل کی کھڑی میں ہیں۔“

”نہیں میں خود کہہ کر آئی تھی سین کو کہ آپ کو بتائے۔“ مریم کا دھیان غالباً ادھر ہی تھا ”انتا اچانک آنا پڑ گیا تھا..... وہ لالہ۔“

اور لالہ کے ذکر سے اس کے اندر اداسی اتر آئی اور آواز بھیگ گئی۔ کچھ دیر کو شہریار بھی اداس ہو گیا تھا۔ کس قدر انوکھی اور مختلف تھی وہ۔

چوہدری ثار ماں جی سے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔

”ڈاکٹر ہادی سے بات کر کے آپ کو شادی کی تاریخ دے دیں گے۔“ ماں جی نے وضاحت کی۔

”دراصل وہ بھی عاشری کی رخصتی کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔“

”تو پھر بہن جی، جلدی کیجیے۔ اب مزید صبر نہیں ہوتا۔ برسوں کی تھکنی یوں لمحوں میں کیسے ختم ہو سکتی ہے۔“ چوہدری ثار اپنے بازو اس کے گرد لپیٹے بیٹھے تھے۔

”میں بھی حیران ہوتی تھی کہ آخر کیا ہے اس بچی میں کہ دل اس طرف کھینچتا ہے۔“ صالحہ بیگم بھی مسرور تھیں۔

”یہ شگون کی انوکھی ہے۔ میں مریم کو پہنا دوں۔“ وہ انہیں تو سب نے ہی مریم کو گھیر لیا۔

قیہنہ شور ہنگامہ۔ ایک دم انہیں لگا، جیسے ان کے دل پر بہت بھاری بوجھ آگرا ہو۔ وہ گھبرا کر صرف

باہر ہی نہیں آئے بلکہ بی آپا کے پورشن میں چلے آئے تھے۔

”ربا، مجھے حوصلہ دے۔“ انہوں نے اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹیک لیا۔ آنسو دل کی دیواروں سے ٹھوکریں مار رہے تھے اور وہ آنکھیں پھینچنے پھینچانی دیوار سے ٹکائے ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہے تھے۔

”عادل۔“ بہت آہستگی سے کسی نے انہیں آواز دی تو انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے حریم کھڑی تھی۔ ہلکے فیروز رنگ کے سوٹ اور ہم رنگ جیولری کے ساتھ ہلکے ہلکے میک اپ میں بھی سنوری وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے ہمیشہ کے اداس اور حزیں چہرے پر ایک چمک سی تھی۔

اور آنکھوں میں روشنی کو بند رہی تھی۔

اور چند دنوں بعد اس لڑکی سے ان کا نکاح تھا اور پھر کچھ عرصے بعد وہ ان کے شب و روز پر قابض ہونے والی تھی۔

یہ لڑکی جس کے لیے اپنے دل میں سوائے ایک نہ ماہٹ، ایک گداز اور ایک خونی رشتے کے لگاؤ کے وہ کوئی جذبہ نہیں رکھتے تھے۔

جس کی اچھائی اور دلکشی میں کوئی شبہ نہ تھا پھر بھی دل نے اس کی کبھی کوئی تمنانہ کی تھی اور پتا نہیں وہ اس لڑکی کو وہ سب کچھ دے بھی سکیں گے یا نہیں جو اس کا حق ہے۔

”آپ ایک دم اٹھ کر چلے آئے تھے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں۔“ انہوں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے پیشانی کو دبایا ”کچھ سر میں درد اور گرمی محسوس ہو رہی تھی۔“

”وہاں سب پوچھ رہے تھے کہ آپ ایک دم کہاں چلے گئے؟“ اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا ”آپ اپنے کمرے میں چل کر آرام کریں۔ میں شہریار سے کہتی ہوں وہ آپ کو دیکھ لیتا ہے۔“

دو ہی ملاقاتوں میں سب لوگ کیسے کھل گئے تھے۔

پروفیسر عادل نے سوچا اور اسے منع کر دیا۔

”نہیں نہیں حریم آپ چلیں میں آتا ہوں۔“

”آپ۔“

حریم نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دلکش آنکھوں میں کا جل کی دھاریں انہیں ساحر بنا رہی تھی۔

”آپ خوش نہیں ہیں نا۔ کیا ماں جی نے آپ کو مجبور کیا ہے؟“

دھمکتا چہرہ، جھجھ سا گیا تھا اور کا جل بھری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

وہ لمحہ بھراس کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ یہاں ملگنی سی روشنی تھی اور فیروز رنگی دوپٹے کے ہالے میں ملگنی

روشنی میں اس کے چہرے پر یک دم اتر آ جانے والا حزن اسے بے حد دلکش بنا رہا تھا۔ چچی اس کے یہاں

آنے کے خلاف تھیں۔

حریم جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔
 ”عادل میں..... کیا میں آپ کے دکھوں کو شیر نہیں کر سکتی..... وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو
 زنجیر کر رکھا ہے۔ کیا وہ کوئی لڑکی ہے..... کیا.....“
 ”پلیز۔“ وہ جھپٹکے سے اس کی طرف مڑے اور پھر نگاہیں اس کی نم پلکوں پر پڑھ رہی تھیں۔
 نہ زخمِ دل کا حساب پوچھو۔

نہ مجھ سے میرے عذاب پوچھو۔
 ابھی گلابوں کی نیم وا آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔
 شکستہ خوابوں کی کرچیاں سی۔
 ابھی تو پوروں میں چہرہ رہی ہیں۔
 ابھی تو دل جوئی بھی گراں ہے۔
 ابھی تسلی عذاب جاں ہے۔

وہ لمحہ بھر ہونٹ پیچنے یوں ہی اس کی پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو دیکھتے رہے۔
 ”حریم! ایسا مت کریں! آپ جانتی ہیں ناکہ آپ کے آنسو ہمیشہ مجھے تکلیف دیتے ہیں۔“
 ”لیکن میں کیا کروں۔ پلیز مجھے بتائیں۔ کیا میں اپنی زندگی ختم کر لوں۔ کیا اب اس طرح.....“
 ”حریم۔“ انہوں نے بات کاٹ دی ”ایسا نہیں ہے جو آپ سوچ رہی ہیں۔ بس ایک تصور
 ہے..... ایک خیال ہے جس نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔“

ایک خواب
 جس کے طلسم نے محرومہ کر رکھا ہے لیکن.....

انہوں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”بہت جلد میں اس سحر سے نکل آؤں گا۔ ابھی.....“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اسے دیکھنے لگے۔
 ابھی تو تجدیدِ غم کا مجھ میں نہ حوصلہ ہے۔
 نہ آرزو ہے۔

انہوں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے جمائے سوچا۔
 کہ

جو بستیاں زیرِ آب ہوں تو
 نئی بنا پانیوں میں رکھنا
 فطرتِ حیات کی انتہا ہے

”ارے ایک ہفتے کے بعد تو نکاح ہے اور.....“
 لیکن بی آپا سے زبردستی لے آئی تھیں۔
 ”مریم کے سرال والے تاریخ لینے اور مانگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔ اتنی رونق ہوگی پھر سرال کیسا
 اپنے چچا کا گھر ہے اور میں اسی لیے آگئی تھی بی آپا کے ساتھ۔“
 اس نے نظریں جھکالی تھیں اور اب وضاحت کر رہی تھی۔
 ”آپ خوش نہیں ہیں نا تو..... اگر آپ کہیں تو میں..... میں انکار کر دوں..... آپ پر حرف نہیں آئے
 گا۔“ اس کی آواز بیگم تھی۔
 ”نہیں حریم۔“ اس کے اس بے غرض جذبے پر ان کے دل میں ممنونیت پیدا ہو گئی ”ایسا نہیں ہے۔“

ماں جی نے مجھے مجبور نہیں کیا۔“
 ”پھر۔“ اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں ”آپ اتنے دل گرفتہ کیوں ہیں..... اور آپ کو یاد ہوگا۔
 ایک بار آپ نے کہا تھا کہ آپ نے میرے لیے اس طرح کبھی نہیں سوچا۔“
 ”بھئی نہ سوچنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے نا حریم کہ آئندہ بھی کبھی نہیں سوچا جاسکتا۔ آدمی کبھی بھی کسی
 وقت کوئی بھی بات سوچ سکتا ہے۔“

ہلکی سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کے کونوں کو چھوا لیکن وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔
 ”حریم! میں جانتا ہوں آپ میرے متعلق شکوک کا شکار ہیں۔ میں خوش ہوں..... نہیں ہوں۔ مجھے خود
 بھی نہیں پتا۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ شاید میں آپ کے قابل.....“
 ”نہیں پلیز! اس طرح مت کہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ہی آپ کو DESERVE نہیں
 کرتی۔“ حریم نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

وہ حریم کی طرف سے ذرا سارخ موڑے طوطے کے پنجرے پر انگلی رکھے کھڑے تھے۔
 ”حریم۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے آہستگی سے کہا ”مجھے کچھ وقت درکار ہے۔“
 تھوڑا سا.....

ابھی تو آنکھیں دھواں دھواں ہیں۔

ابھی تو ہونٹوں پہ ہیں فغاکیں۔

ابھی تو نس نس میں اک جطن ہے۔

کہ زہرِ غم خون بن کے رگ رگ میں دوڑتا ہے۔

وہ بدستور اس طرح طوطے کے پنجرے پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے اور ان کے دل و دماغ میں جھکڑے

چل رہے تھے۔

انہیں یوں خاموشی سے اپنی طرف تکتے پا کر حریم نے نظریں اٹھائیں۔
”تھوڑا سا وقت حریم.....“ انہوں نے آہستگی سے کہا اور ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔
غصہ مہر جا۔

ذرا سانس انتظار کر لے۔

انہوں نے مسکراتے کی کوشش کی اور اس کی پلکوں پر اٹکے ہوئے موتیوں کو اپنی انگلی کے پوروں سے پونچھا۔
”آؤ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ حریم نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور مضبوطی سے اسے تھامتے ہوئے انہوں نے بڑی حویلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔



نہنبل والا کے پاس سے گزرتے ہوئے مریم نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور یہ ہمیشہ ہی ہوتا تھا ایسا ہی جب بھی وہ یہاں سے گزرتی تھی غیر ارادی طور پر وہ گاڑی کی رفتار کم کر دیتی تھی۔ نگاہیں بے اختیار ”نہنبل والا“ کے گیٹ کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور وہاں ”نہنبل والا“ کے بجائے ملک غنفر ملک کی نیم پلیٹ دیکھ کر اندر کہیں جل تھل ہونے لگتی تھی۔ غنفر ملک کی نیم پلیٹ دیکھنا اس کے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ گاڑی ایک طرف پارک کر کے اترے گیٹ کے پاس جا کر دیکھے اندر جھانکے پتا نہیں وہی پرانا چوکیدار ہے یا کوئی اور۔

یہ وہ گیٹ تھا جس سے وہ برسوں اندر جاتی اور باہر آتی رہی تھی۔ اس گھر سے کتنی یادیں وابستہ تھیں اس کی۔
خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم۔

لیکن اب اس گھر کے دروازے اس کے لیے بند ہو چکے تھے ہمیشہ کے لیے۔ کتنا جی چاہتا تھا اس کا کہ وہ پاپا کی اسٹڈی میں جائے۔

ان کی کتابوں کو چھو کر دیکھے
انہیں محسوس کرے۔

ان کے وجود کو۔

وہ اس گھر میں چلتے پھرتے تھے۔

اپنی اسٹڈی میں اپنی مخصوص کرسی پر۔

اور وہ ان کا بڑا سا پورٹریٹ۔

پتا نہیں اب وہاں ہو گا یا نہیں۔

لیکن شدید خواہش کے باوجود اب وہ نہنبل والا میں نہیں جا سکتی تھی۔

ماما کس قدر ضد اور غصے میں آگئی تھیں۔

عادل بھائی نے حتیٰ کہ ماں جی نے بھی ان کی منت کی تھی۔ وہ خود گئی تھیں ان کے پاس کہ مریم اور عاشر کی شادی میں وہ شریک ہوں..... لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

”میرے لیے عاشر اور مریم سب ختم ہو چکے ہیں۔ میں ان کی کچھ نہیں۔“

اور وہ ایسی ہی تھیں جب کسی بات پر اڑ جاتی تھیں تو کوئی بھی ان سے بات نہیں منوا سکتا تھا۔

اسے کتنی آس تھی کہ شاید ماما ساری ناراضی چھوڑ کر آجائیں..... بلکہ اسے تو یقین تھا کہ ماما کہیں گی کہ وہ ان کی رخصتی اپنے گھر سے کریں گی نہنبل والا سے لیکن ماما تو انہیں معاف کر دینے کو ہرگز تیار نہ تھیں۔

”پلیز ماما۔“ اس نے خود فون کر کے ان سے التجا کی تھی۔ ”عاشر بہت اداس ہے..... مور اور نینا بھی۔“

لیکن انہوں نے فون رکھ دیا تھا اور تھوڑے عرصے کے پاس ہی کھڑا تھا اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”مومو! آپ یوں ہی فضول کوشش کر رہی ہیں۔ ماما کو اب ہماری ضرورت نہیں رہی..... اور شاید انہیں کبھی ہماری ضرورت تھی ہی نہیں مومو۔“

”مور۔“ وہ اسے بازوؤں میں لیے کتنی ہی دیر تک روتی رہی تھی اس وقت اسے اور عاشر کو ماما کی کتنی ضرورت تھی۔

اگرچہ ماں جی اور بی آپا اور عادل بھائی بہت کچھ کر رہے تھے لیکن پھر بھی..... پھر بھی ماما تو ماما تھیں ان کا ہونا کس قدر ضروری تھا۔

”دراصل غنفر ملک کو ڈر ہو گا کہ اگر ہم نہنبل والا گئے تو ماما کو ہماری شادیوں پر پیسہ خرچ کرنا پڑے گا۔ اس لیے اس نے ماما کو منع کر دیا ہو گا کہ ہمیں واپس نہ بلائیں اور ہماری شادیوں میں شریک نہ ہوں۔ ورنہ ماما ایسی تو نہ تھیں۔ وہ غنفر ملک کے ٹرانس میں ہیں جو وہ کہتا ہے وہی کرتی ہیں۔“

عاشی کا خیال تھا۔ بھلے سے ماما کچھ بھی خرچ نہ کرتیں، بس ان کی رخصتی میں شریک ہو جائیں تو کیا تھا۔ زچہ نہیں خرچ کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ڈاکٹر سکندر تھے جو بے حساب خریداری کر رہے تھے اس کے اور عاشر دونوں کے لیے۔

عادل بھائی تھے جو بہت دھوم دھام سے یہ شادی کرنا چاہ رہے تھے۔

سبھی کچھ تھا بس ماما نہیں تھیں۔

وہ ان سے دور چلی گئی تھیں شاید ہمیشہ کے لیے۔

رخصتی والے دن وہ انہیں یاد کر کے بے تحاشا روتی تھی۔

پاپا بھی اسے بہت یاد آئے تھے۔

اگرچہ ڈاکٹر سکندر اس کے پاس کھڑے تھے اور انہوں نے ایک باپ کی طرح ہی عاشر کو بھی رخصت

کیا تھا لیکن عاشی بھی بے پتہ تشارور رہی تھی۔ شاید پاپا اور ماما کو یاد کر کے۔
ماما نے ڈاکٹر ہادی کی بات بھی رد کر دی تھی اور وہ حویلی سے رخصت ہو کر شہر یار کے گھر آ گئی تھی۔ یہ
خوب صورت گھر ڈاکٹر سکندر نے شہر یار کو اور اسے دیا تھا۔

سب کچھ ہی مل گیا تھا۔

شہر یار کی محبتیں

چوہدری ثار اور صالحہ بیگم کی شفقتیں

ارسلان اور ارمغان جیسے بھائی

اور پھر سب سے بڑھ کر ڈاکٹر سکندر ملک

برسوں کی تشنگی ختم ہو گئی تھی۔

وہ بیٹے میں تین دن ان کے پاس رہتے تھے

نینا اور تیمور بھی اس کے پاس ہی تھے۔ نینا کو اس نے لاہور ہی میں داخل کر دیا تھا مگر تیمور مری ہی میں
تھا۔ ڈاکٹر سکندر کا خیال تھا کہ وہ وہاں سے ہی سینئر کیمرنگ کرے۔ نینا اور تیمور کو ڈاکٹر سکندر نے اتنا ہی
پیار دیا تھا جتنا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔

”یہ کوئی احسان نہیں ہے مریم..... عثمان احمد نے تمہیں جو محبتیں دیں یہ ان کا فرض ہے۔ تیمور میں ان
کی جان لگی ہوئی تھی۔ اتنا ہی پیارا ہو گیا تھا وہ انہیں۔ عادل بھی آتے رہتے تھے۔ عاشی بھی ڈاکٹر
عبدالعزیز کے ساتھ بہت خوش تھی..... کہیں کوئی کی نہ تھی۔

مگر ایک کک تھی جو رہ کر دل میں اٹھا کرتی تھی..... کاش ماما..... ان سے خفا نہ ہوتیں۔

کبھی وہ ماما کو دیکھنے جاسکتی۔

انہیں مل سکتی..... ادھر ادھر سے ماما کے متعلق خبریں ملتی رہتی تھیں۔

غففر ملک نے راجہ رحیم سے شادی کر لی ہے۔

زننہ ملک سے علیحدگی کا امکان

جھگڑے بڑھ گئے ہیں۔

یہ سب خبریں اسے از حد اذیت دیتی تھیں۔

”ماما کبھی ہوں گی۔“

”ماما کیلی ہوں گی۔“ وہ سوچا کرتی تھی۔

پھر ہولے ہولے اخبارات میں ان کے متعلق خبریں آنا بند ہو گئیں۔ ٹی وی پر بھی ان کے ڈرامے
اشتہارات وغیرہ آنے تقریباً بند ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار کوئی پرانا اشتہار لگتا تو وہ دکھائی دے جاتیں۔

ایک بار اچانک ایک پارٹی میں بیگم آفندی مل گئی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ زنب اور راجہ رحیم اکٹھی
رہتی ہیں۔ علیحدگی نہیں ہوئی۔

راجہ اور منزل پر اور زنب بچے ہی۔

”بہت بدل گئی ہے وہ اور غففر کا رویہ اس کے ساتھ بہت خراب ہے۔ سنا ہے سب کچھ غففر ملک نے
اپنے نام کر دیا ہے..... مگر..... سرگودھا والی زمینیں اور بینک میں موجود رقم۔“
”اور ماما نے سب کچھ لکھ دیا۔ وہ اتنی کمزور تو نہ تھیں۔“ اسے از حد حیرت ہوئی تھی۔

اور اس روز وہ کتنی ہی دیر تک ماما کے لیے دھبی ہوئی رہی تھی اور اس نے ماما کو فون کرنے کی کوشش بھی
کی تھی..... لیکن ماما نہیں تھیں۔

اور آج کتنے دنوں بعد وہ ادھر سے گزری تھی۔

”اور ماما پتا نہیں کہاں ہیں۔“

بہت دنوں سے اس نے ان کے متعلق کچھ نہیں سنا تھا۔ میڈم زمرس بھی ملک سے باہر تھیں۔ اس نے
فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تیمور کی طرف دیکھا جو بے نیاز سا باہر دیکھ رہا تھا۔
بھینکتی مسوں والا تیمور کتنا سنجیدہ اور بردبار لگنے لگا ہے..... حالانکہ بچپن میں وہ خاموش بھی ہوتا تو

شرارت اور ہنسی اس کی آنکھوں سے پھوٹی رہتی تھی۔

”دیر ہو جائے گی مومو۔“ اپنی طرف دیکھتے پا کر تیمور نے کہا۔

”اوہ ہاں۔“ وہ چونکی۔

ڈاکٹر فخر الملک صرف دو گھنٹے بیٹھے تھے اور چند مریضوں کی آنکھیں چیک کرتے تھے۔ تیمور کی آنکھوں
سے کئی دنوں سے پانی بہہ رہا تھا اور اس نے شکایت کی تھی کہ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں میں دھند آ جاتی
ہے چند دن قبل ہی ڈاکٹر سکندر مری سے اسے لائے تھے اور انہوں نے گاؤں جاتے ہوئے تاکید کی تھی کہ

وہ ڈاکٹر سے اس کی آنکھیں چیک کروالے۔ سو وہ ادھر ہی جا رہی تھی۔

”تیمور کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے ایکسی لیٹر پر دباؤ ڈالا۔

”کچھ نہیں مومو۔“ اس نے نظریں چرائیں۔

”اور شاید تیمور ماما کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو۔“ مریم نے سوچا ”اٹس اوکے مومو۔“

تیمور کھڑی سے باہر دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر فخر الملک کمرے سے باہر نکل کر وینٹنگ روم میں ڈرامی دیکھ کر گئے۔ تیمور بھی اندر ہی تھا کہ اس کی
نظر ایک بچے پر پڑی۔ بہت معصوم اور پیارا سا بچہ سب کی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا بے اختیار جھک کر اس
نے اٹھا لیا اور اس کے رخساروں کو چومتے ہوئے اس نے اسے زمین پر کھڑا کرتے ہوئے سر اٹھایا تو ماما کو

دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بچان سے لپٹ گیا۔ وہ ساکت کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کس قدر بڑھ چلا اور تنہی تنہی لگ رہی تھیں۔ میک اپ کے باوجود یہ تھکن ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”مومو کیسی ہو؟“ تلخ بھر بعد انہوں نے پوچھا۔

آواز اس کے حلق میں ہی پھنس گئی اور آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہہ آئے۔

”شہر یار کیسا ہے.....؟ عاشی نینا اور مور۔“

وہ خاموشی کھڑی تھی اور آنسو یوں ہی بے آواز اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخسار بھگوتے جا رہے تھے۔ تب ہی تیمور ڈاکٹر فخر الملک کے کمرے سے باہر نکلا ”چلیں مومو..... یہ نمبر عینک کے لیے دیا ہے انہوں نے۔“

”مور میری جان۔“ نہ ب ملک تڑپ کر اس کی طرف بڑھیں تیمور ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

”مور.....“ ویننگ روم میں موجود مریضوں کی پروا کیے بغیر انہوں نے ہاتھ پھیلائے..... ”بیٹا۔“

تیمور نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر تقریباً بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ ان کے پھیلے ہوئے بازو نیچے گر گئے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”مور! یہ مور۔“ ان کی آواز ٹوٹ سی گئی اور انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔

”مور! یہ سنی۔“ بچے کے انداز میں ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور پھر ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے منب بچان کے ساتھ لگے کھڑے بچے کے رخساروں کو تھپتھپایا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی..... مرنے منب بچے کے پیچھے نکل آئیں ”مومو۔“ ان کے لب ذرا سے کھلے۔

”ماما۔“ بچے نے انہیں شرٹ سے پکڑ کر اچانک اپنی طرف کھینچا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا اور ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ مریم کو دیکھنے لگیں جس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کر انہیں دیکھا اور پھر فوراً ہی رخ موڑ کر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔

تیمور دونوں بازوؤں میں منہ چھپائے سسکیاں لے رہا تھا۔

”مور میری جان۔“

اس نے تیمور کو بے اختیار اپنی ہانہوں میں لے لیا اور درگرو سے بے نیاز خود بھی اس کے خوب صورت بالوں والے سر پر چہرہ رکھے آنسو بہانے لگی۔

(ختم شد)